رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲
ٹیلیفون ۵۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

شمارہ ۱۳۶
دسمبر ۱۹۸۷ء

بانی
محمد طفیل

مدیر
جاوید طفیل

ادارہ فروغ اردو ○ لاہور

قیمت ۱۲۰ روپے

ترتیب

محمد طفیل نمبر کی تقریبِ رُونمائی کی ایک جھلک

(۱) خطبۂ صدارت	صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاءُ الحق صاحب	۹
(۲) کم گو شرمیلا شخص	ڈاکٹر وحید قریشی	۱۷
(۳) نقوش کے مرشد	ڈاکٹر جمیل جالبی	۱۹
(۴) محمد طفیل کی یاد میں	پروفیسر مختار الدین احمد	۲۲
(۵) اچھا آدمی سچا ادیب	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	۲۵
(۶) نقوش کا طفیل نمبر	اشفاق احمد	۲۹
(۷) بہ یادِ مرحوم	رشید حسن خاں	۳۱
(۸) خطبۂ استقبالیہ	جاوید طفیل	۳۳

نوادرات و مقالات

(۱) "جاگیرِ غالب" میں غالب کی قلمی تحریریں	ڈاکٹر معین الرحمٰن	۳۹
(۲) سراج اورنگ آبادی پر نئی روشنی	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	۴۶
(۳) میر کی دریائے عشق کا ایک نادر و نایاب مخطوطہ	اکبر حیدر کاشمیری	۷۴
(۴) سرسیّد کے ایک رفیق منشی نجم الدّین	پروفیسر مختار الدین احمد	۹۳
(۵) دیوانِ ناسخ — ایک نادر قلمی نسخہ	محمد حنیف نقوی	۱۱۶
(۶) کجدار و مریز	عبد العزیز خالد	۱۴۹
(۷) انیس — نطقِ عظیم	مجتبیٰ حسین	۲۷۳
(۸) زبان کی مکانی حقیقت	ڈاکٹر سہیل بخاری	۲۹۵
(۹) جلال الدین اکبر اور ان کی غزل گوئی	بشیر ساجد	۳۰۷
(۱۰) تنقیدی اشیرباد	ڈاکٹر سلیم اختر	۳۲۹
(۱۱) میر امن دِلی والے	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	۳۳۴

گوشہ قدرت اللہ شہاب

(۱) ماں جی	قدرت اللہ شہاب	۳۶۷
(۲) چکور صاحب	"	۳۷۵
(۳) اللہ کا ،... قدرت اللہ شہاب	ممتاز مفتی	۳۸۷
(۴) پیر و مرشد	احمد بشیر	۴۰۳

(۵) قدرت اللہ شہاب — پروین عاطف — ۴۲۶

افسانے

(۱) فقیرا فقیری دُور ہے — اعجاز حسین بٹالوی — ۴۳۷
(۲) خدوخال — آغا بابر — ۴۵۱
(۳) گولڈن گیٹ کی بلیاں — احمد سعید — ۴۸۲
(۴) ہسٹری شیٹرز — احمد شریف — ۴۸۹
(۵) بے یقینی کا عذاب — غلام الثقلین نقوی — ۴۹۴
(۶) پہاڑوں کی کہانیاں — جوگندر پال — ۴۹۹
(۷) جزیرے — رام لعل — ۵۰۸
(۸) زندگی کی بند گلی — سائرہ ہاشمی — ۵۱۳
(۹) بجری، شیر اور گھاٹ — محمد منشا یاد — ۵۲۳
(۱۰) صراطِ مستقیم — عرفان علی شاد — ۵۳۹
(۱۱) باوفا / بے وفا — وحید رضا بھٹی — ۵۴۷
(۱۲) اپنا اپنا قرض — خورشید عالم — ۵۵۰
(۱۳) فاختہ — انیق احمد — ۵۵۵

میرزا ادیب، ایک تفصیلی مطالعہ

(۱) لاٹو پُتر — میرزا ادیب — ۵۶۱
(۲) گریٹ مین — " — ۵۷۲
(۳) دو بہنیں (ایک تمثیل ریڈیو تکنیک میں) — " — ۵۷۹
(۴) لہو اور قالین — " — ۶۰۱
(۵) ابنِ بطوطہ — " — ۶۱۰
(۶) ایک خوب صورت انسان — محمد طفیل — ۶۲۸
(۷) حباب آسا — ڈاکٹر انور سدید — ۶۳۷

انتظاریہ

(۱) فتح مبین — شیخ منظور الٰہی — ۶۴۳

(۲) روشنی کی لکیر	ڈاکٹر آغا سہیل	۶۵۵
(۳) بیس سو بیس	ارشد میر	۶۵۸

حمد و نعت، نظمیں، غزلیں

(۱) حمدِ باری تعالیٰ	حافظ لدھیانوی	۶۶۷
(۲) حمد باری تعالیٰ	حافظ لدھیانوی	۶۶۹
(۳) حمد باری تعالیٰ	حافظ لدھیانوی	۶۷۰
(۴) حمد	فضا ابنِ فیضی	۶۷۱
۵) مناجات	حفیظ تائب	۶۷۴
(۶) نعت	حفیظ تائب	۶۷۵
(۷) نعت	حمایت علی شاعر	۶۷۶
(۸) اُمّی حرف آشنا	فضا ابنِ فیضی	۶۷۷
(۹) نعت	تحسین فراقی	۶۷۹
(۱۰) اگر چاہو تم اپنی حسرتوں کو تازہ دم رکھنا	قتیل شفائی	۶۸۰
(۱۱) رہبری کے نشاں سائے کے سائے برمحل رکھنا	قتیل شفائی	۶۸۰
(۱۲) نہ جانے ہم فقیروں کو یہ کس نے بددعا دی ہے	جگن ناتھ آزاد	۶۸۱
(۱۳) دیدۂ بے نیاز دوست! یوں میری زندگی نہ دیکھ	جگن ناتھ آزاد	۶۸۱
(۱۴) زندگی میں ہر قدم پر مات کھاتا رہ گیا	جگن ناتھ آزاد	۶۸۲
(۱۵) اے دلِ ناداں، نہ کر تو نکتہ آرائی بہت	جگن ناتھ آزاد	۶۸۲
(۱۶) بے آب آئینے تھے، شجر بے لباس تھے	مظہر امام	۶۸۳
(۱۷) جلی کتاب کا اک اقتباس لگتا ہے	مظہر امام	۶۸۳
(۱۸) ہاتھ اُٹھتے ہی کہا چلیے یہاں سے چلیے	مظہر امام	۶۸۴
(۱۹) آسمانوں سے فرشتے جو اتارے جائیں	امید فاضلی	۶۸۵
(۲۰) ناز کر ناز کہ یہ ناز جدا ہے سب سے	امید فاضلی	۶۸۵
(۲۱) اقبال و مفکر اسلام و فلسفی	امید فاضلی	۶۸۷
(۲۲) زندگی میں ہیں آلام بہت	رفعت سلطان	۶۸۹
(۲۳) دیکھ کر مجھ کو پریشان بہت	رفعت سلطان	۶۸۹
(۲۴) بامعنی	صدیق کلیم	۶۹۰

(۲۵) درد کی روشنی	صدیق کلیم	۶۹۰
(۲۶) مرے ہمراہ منزل بھی رواں ہے	شہزاد احمد	۶۹۲
(۲۷) اجاڑ ہونے لگیں بستیاں چلا جائے	شہزاد احمد	۶۹۳
(۲۸) شہر کا شہر اگر آئے بھی سمجھانے کو	شہزاد احمد	۶۹۴
(۲۹) وہ گردباد تھا کوئی غبارِ جادہ تھا	راسخ عرفانی	۶۹۵
(۳۰) زندگی کے پہاڑ سر کرنا	راسخ عرفانی	۶۹۵
(۳۱) سلطنت	جمیل ملک	۶۹۶
(۳۲) ضمیر کی موت	جمیل ملک	۶۹۸
(۳۳) تو مری ساری تمناؤں کا حاصل ٹھہرے	جمیل ملک	۷۰۰
(۳۴) تیری آنکھوں میں گھلاوٹ ہے شرابوں جیسی	جمیل ملک	۷۰۰
(۳۵) خود اپنے بوجھ سے بت گر کے پاش پاش ہوئے	جمیل ملک	۷۰۱
(۳۶) یہ تپتے سے دن، یہ سلگتی سی خاموش راتیں	جمیل ملک	۷۰۱
(۳۷) احباب کے خلوص سے جب واسطہ پڑا	علی احمد جلیلی	۷۰۲
(۳۸) مٹ گیا غم، خلش وہی ہے ابھی	علی احمد جلیلی	۷۰۲
(۳۹) قربت میں بارہا جسے پتھر سمجھ لیا	احمد ظفر	۷۰۳
(۴۰) قاتل نے مجھے سمجھا مقتل نے مجھے جانا	احمد ظفر	۷۰۴
(۴۱) چھپ کے اُس یارِ طرحدار نے دیکھا مجھ کو	احمد ظفر	۷۰۴
(۴۲) بجھے نہ دل کا دیا	احمد ظفر	۷۰۵
(۴۳) سرِ شاخِ طوبیٰ	احمد ظفر	۷۰۶
(۴۴) اپنے آپ سے ایک مکالمہ	احمد ظفر	۷۰۸
(۴۵) رقمطرازِ بہار	احمد ظفر	۷۰۹
(۴۶) بجز لاحاصلی کیا اور بام و در پہ رکھا ہے	فضا ابنِ فیضی	۷۱۱
(۴۷) اُسے پڑھنا ہے مشکل جو کچھ آئینے پہ لکھا ہے	فضا ابنِ فیضی	۷۱۱
(۴۸) کسی شکستہ آئینے کا ٹکڑا بھیج دینا	فضا ابنِ فیضی	۷۱۲
(۴۹) زخموں کو گلاب لکھ رہا ہوں	فضا ابنِ فیضی	۷۱۳
(۵۰) فولاد میں ڈھل رہی ہے دنیا	محسن احسان	۷۱۴
(۵۱) کرن، شبنم کرچی کر خوشبوؤں پر پاؤں دھرتی ہے	محسن احسان	۷۱۴
(۵۲) چلا ہے اوڑھ کے زر کا پیرہن مہتاب	محسن احسان	۷۱۵

(۵۳) ذہن اور دل کی کشاکش میں گرفتار ہیں ہم	محسن احسان	۴۱۵
(۵۴) کرو دل کو تم فروزاں، ہوا گر سحر کے پیاسے	کسریٰ منہاس	۴۱۶
(۵۵) غم ترا وقت کے دریا میں بہا جاتا ہے	ڈاکٹر مظفر حنفی	۴۱۷
(۵۶) آلامِ روزگار سے فرصت نہیں ملی	ڈاکٹر مظفر حنفی	۴۱۷
(۵۷) آخر آخر وہ کافر بھی اِس نکتے کو مان گیا	ڈاکٹر مظفر حنفی	۴۱۸
(۵۸) جب سے دن بھر دل تھامے تو بیٹھا رہتا ہے	ڈاکٹر مظفر حنفی	۴۱۸
(۵۹) کل شب دلِ آوارہ کو سینے سے نکالا	اقبال ساجد	۴۱۹
(۶۰) لگا دی کاغذی ملبوس پر مہر ثبات اپنی	اقبال ساجد	۴۱۹
(۶۱) گو ایک پل بھی اِس سے الگ بسر نہ ہو	شبنم شکیل	۴۲۰
(۶۲) دوستوں کا ذکر کیا دشمن ہیں جب بدلے ہوئے	شبنم شکیل	۴۲۰
(۶۳) میں ایک پیکرِ نادیدہ کے حصار میں ہوں	ناصر زیدی	۴۲۱
(۶۴) اِسس توقع پہ کھلا رکھا گریباں اپنا	ناصر زیدی	۴۲۱
(۶۵) دل و نگاہ کو تسکین عمر بھر نہ ملی	ناصر زیدی	۴۲۲
(۶۶) جس کے جلووں سے مری شام اُجالی جائے	ناصر زیدی	۴۲۲
(۶۷) کہیں تاب لا نہ پائے، مرے دل، ذرا سنبھل کے	ناصر زیدی	۴۲۳
(۶۸) روح اور جسم کا وصال کرے	ناصر زیدی	۴۲۳
(۶۹) وہ میرے دل کی ہر بات جان لیتا ہے	ناصر زیدی	۴۲۴
(۷۰) مہک اُٹھے ہیں دہکتے گلاب آنکھوں میں	ناصر زیدی	۴۲۴
(۷۱) دل میں جو آنکھ کے رستے سے سمایا جائے	ناصر زیدی	۴۲۵
(۷۲) صدائیں دی ہیں بہاروں میں تتلیوں نے مجھے	ناصر زیدی	۴۲۵
(۷۳) بابِ حیرت سے مجھے اِذنِ سفر ہونے کو ہے	پروین شاکر	۴۲۶
(۷۴) دیکھنے کا جسے کل رات میں ڈھنگ او رہی تھا	پروین شاکر	۴۲۶
(۷۵) لوگ جو تجھ سے لو لگاتے ہیں	اکبر کاظمی	۴۲۷
(۷۶) بھلانا چاہوں تجھے خود کو بھول جاؤں میں	اکبر کاظمی	۴۲۷
(۷۷) حالِ دل ان کو سنانا چاہوں	اکبر کاظمی	۴۲۸
(۷۸) جب بھی جھونکا ہوا کا آیا ہے	اکبر کاظمی	۴۲۸
(۷۹) جب بھی تیرے نگر میں آتا ہوں	سلمان سعید	۴۲۹
(۸۰) چپ چاپ رہنا سیکھ لیا ہے	سلمان سعید	۴۲۹

(۸۱) افق پر شمس ڈھلتا جا رہا تھا — سلمان سعید — ۷۳۰
(۸۲) جب سے اُس کو پایا ہے — سلمان سعید — ۷۳۰
(۸۳) اپنے شہر کا ایک منظر — سلمان سعید — ۷۳۱
(۸۴) ایک نظم — سلمان سعید — ۷۳۱
(۸۵) نہاں نظر سے ہے اور دو بدو پکارتا ہے — تحسین فراقی — ۷۳۲
(۸۶) زیادہ کیا بھلا اب حُسن کی تفصیل میں ہوگا — ڈاکٹر طارق عزیز — ۷۳۳
(۸۷) دن کٹ گیا سفر کا، پھر شام لوٹ آئی — ڈاکٹر طارق عزیز — ۷۳۳
(۸۸) نظم — ڈاکٹر طارق عزیز — ۷۳۴
(۸۹) زمانہ میرے قدموں میں پڑا تھا — منور ہاشمی — ۷۳۶
(۹۰) سوچتا ہُوں حاصلِ احساس کیا کیا رہ گیا — منور ہاشمی — ۷۳۶

یادِ رفتگاں

(۱) زندگی کی ایک شام (خواجہ احمد عباس کے نام) — وحید انور — ۷۳۷
(۲) ابنِ حسن برنی — شیخ منظور الٰہی — ۷۴۶
(۳) ابو الفضل صدیقی مرحوم — ڈاکٹر انور سدید — ۷۵۶
(۴) حاذقین، خورشید مثال شخص — رشید نثار — ۷۶۷
(۵) فکر تونسوی کا مزاح — ڈاکٹر انور سدید — ۷۷۴

گوشۂ محمد طفیل

(۱) عظمتِ شیخ (ایک خاکہ) — محمد طفیل — ۷۸۵
(۲) محمد طفیل، میرا دوست — رشید اختر ندوی — ۷۹۰
(۳) میرا یار طفیل (ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے) — جگن ناتھ آزاد — ۷۹۲
(۴) م۔ط۔ شخصیت و کردار (خطوط کے آئینے میں) — ڈاکٹر نثار احمد — ۸۱۲
(۵) نذرِ جناب محمد طفیل — احمد ظفر — ۸۲۱
(۶) قطعاتِ تاریخِ وفات — سیّد قدرت نقوی — ۸۲۲

تبصرے

غزل نما، ہمسفر بگولوں کا، کاکلِ غم، دخل در معقولات، اردو گیت — ۸۲۳ —— ۸۳۶

◆

جاوید اقبال پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا

طلوع

یارانِ باصفا! ادب کا ایک خدمت گزار آپ کو سلام کہتا ہے۔

۱۹۴۰ء سے لے کر آج تک ادب میں جو تغیر رُونما ہُوا میں اُسے ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا رہا۔ بہت سے نامور لکھنے والے سدھار گئے، کچھ نامور لکھنے والے زندہ ہیں مگر سدھارے ہوئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کم لکھتے ہیں یا اُن کے لکھنے کا معیار پہلے جیسا نہیں۔ کچھ نئے لکھنے والے سامنے آئے ہیں وہ سب کے سب اچھا لکھتے ہیں کیونکہ وُہ اچھا لکھنے والوں کو مانتے ہی نہیں!

ادب میں میرا رول عافیت پسندوں جیسا ہے۔ میں ادب میں کسی ایسے گروہ سے تعلق نہیں رکھتا جو دوسرے کو بُرا بھلا کہتا ہو، کیونکہ فی زمانہ رواج یہ ہے کہ دُوسرے کو بُرا ہی کہو بھلا نہ کہو۔ یاروں نے محاورہ ہی غلط کر ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی میری اپنی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ ادیب ایک دوسرے کی طرف مُنہ کرکے پُوچھتے ہیں یہ شخص اِدھر ہے یا اُدھر۔ اصل میں مَیں نہ اِدھر ہوتا ہُوں نہ اُدھر، میں تو اُس طرف ہوتا ہُوں جدھر ادب کی پری کھڑی ہو۔

میرا مسلک نئے ادب کی ترویج تھا اور ہے۔ وہ کون سا بڑا ادیب اور شاعر ہے جس کی رفاقت مجھے نصیب نہ ہُوئی ہو، کوئی ایک نام بھی نہیں لیا جا سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ادب کی متعدد قد آور تحریریں 'نقوش' میں چھپیں!

ادب میں جاندار تحریروں کا زمانہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کا ہے۔ پھر ذہنوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔ بڑے بڑے لکھنے والوں کے قلم ہندو ہو گئے، مسلمان ہو گئے۔ انسانی قدریں شرمندہ ہونے لگیں، ادیب سنبھلا تو ادب بھی سنبھل گیا۔ بڑی تحریریں وجود میں آنے لگیں۔ یہ دور ۱۹۷۰ء تک چلا ہوگا!

میں یہ نہیں کہتا کہ ۱۹۷۰ء کے بعد اچھی تحریریں وجود میں نہیں آئیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ تناسب کم ہو گیا، جو کم ہوتا چلا گیا۔ بے شک گھُپ اندھیرے میں ایک دِیے کی روشنی بھی بہت ہوتی ہے مگر میں تو سوچتا ہُوں پہلے والی جگ مگ کب ہوگی!

محمد طفیل

اِس شمارے میں

- "نوادرات و مقالات" کے عنوان سے چند اہم تحریریں شامل ہیں جن کی اہمیت مستقل ہے۔
- "گوشۂ قدرت اللہ شہاب" میں افسانوں کا انتخاب نقوش میں اُن کے طبع شدہ افسانوں میں سے کیا گیا ہے۔
- "میرزا ادیب ایک تفصیلی مطالعہ" میں چند مطبوعہ تحریریں بھی شامل ہیں جن کے متعلق میرزا ادیب صاحب کا خیال ہے کہ یہ اُن کی قابلِ ذکر تحریریں ہیں۔

◆

جاوید طفیل

ترتیبِ تصاویر

تقریبِ رُونمائی ' محمد طفیل نمبر '

صفحہ نمبر ۱ :

صدرِ پاکستان جناب جنرل محمد ضیاءالحق خطبۂ صدارت فرما رہے ہیں ۔

صفحہ نمبر ۲ :

جاوید طفیل ، صدرِ پاکستان جناب جنرل محمد ضیاءالحق ، گورنر پنجاب جناب مخدوم سجاد حسین قریشی ، قاری امجد علی حبیب علوی تلاوتِ قرآن پاک فرما رہے ہیں ۔

صفحہ نمبر ۳ :

(۱) حاضرین (۲) جنابِ سراج منیر (سٹیج سیکرٹری) (۳) جاوید طفیل

(۴) صدرِ پاکستان جناب محمد ضیاءالحق ' محمد طفیل نمبر ' کو ملاحظہ فرما رہے ہیں ۔

(۵) صدرِ پاکستان ' محمد طفیل ادبی ایوارڈ ' کو ملاحظہ فرماتے ہوئے ۔ (۶) جناب زبید حسن خان (نئی دہلی ، بھارت)

صفحہ نمبر ۴ :

(۷) جنابِ ڈاکٹر فرمان فتح پوری (۸) جنابِ اشفاق احمد خان

(۹) جناب ڈاکٹر جمیل جالبی (۱۰) جناب مختار الدین احمد (علی گڑھ ، بھارت)

(۱۱) ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۸۶ء کا ' محمد طفیل ادبی ایوارڈ ' صدرِ پاکستان سے حاصل کر رہے ہیں جو اُنکی اَدبی خدمات کے اعتراف میں انھیں پیش کیا گیا ۔

(۱۲) جناب ڈاکٹر وحید قریشی

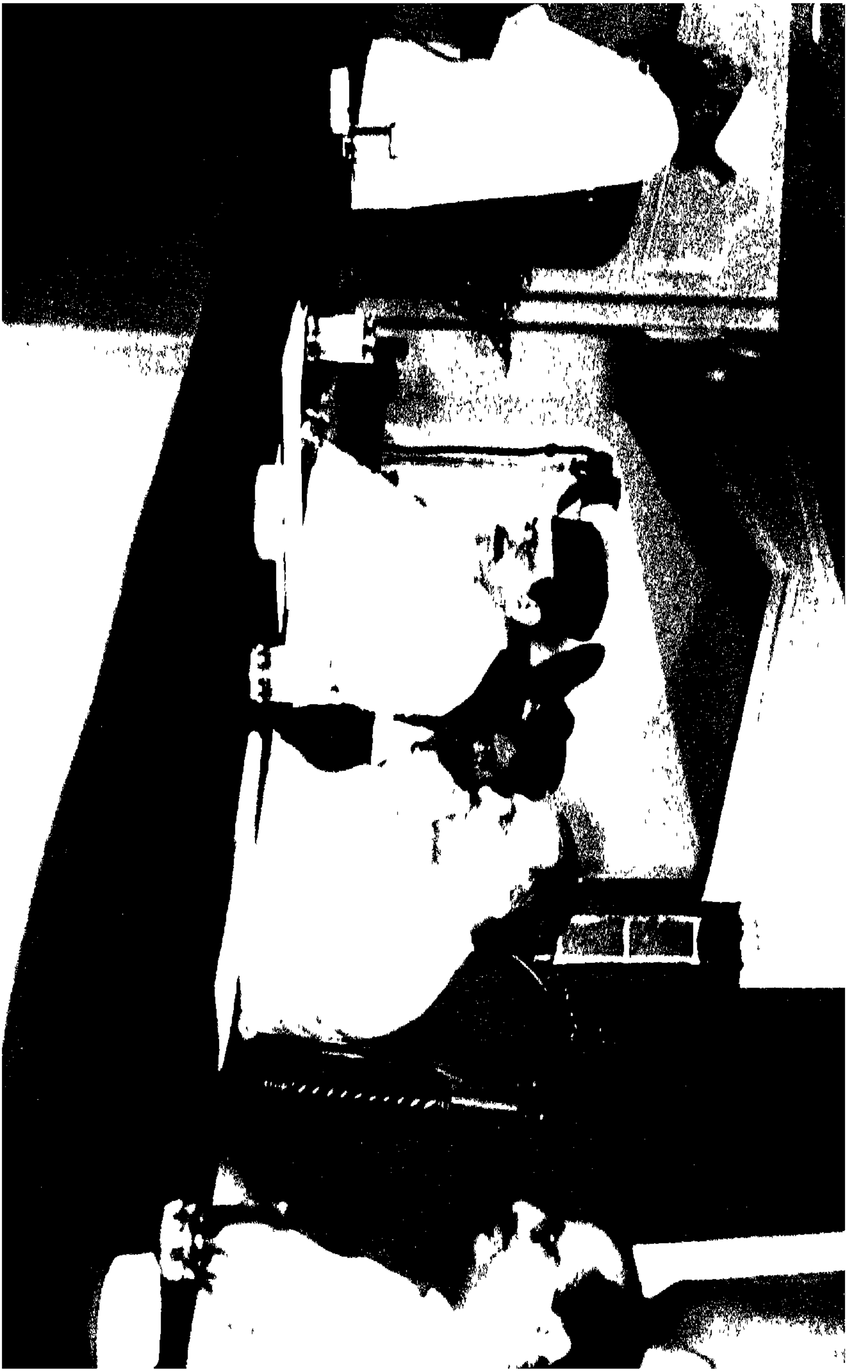

1

2

3

4

7

8

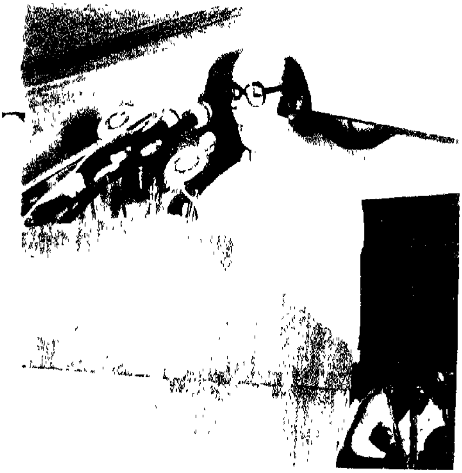

9

10

خطبۂ صدارت

صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم
الحمد للہ ربّ العٰلمین و الصّلوٰۃ و السّلام علیٰ خاتم النّبیّینؐ

محترم مخدوم سجاد حسین قریشی صاحب گورنر پنجاب،

محترمہ بیگم طفیل صاحبہ،

محمد طفیل مرحوم کے فرزند ارجمند اور مدیر "نقوش" جناب جاوید طفیل صاحب،

ادیب حضرات،

دانشورانِ کرام

اور

معزز خواتین و حضرات!

السلامُ علیکم!

آج کی یہ تقریب ایسے شخص کی یاد میں منعقد ہو رہی ہے جس نے ہمارے مذہبی و قومی ادب اور ثقافت پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے ہیں۔ "نقوش" محمد طفیل مرحوم کا نقشِ جاوداں ہے۔ محمد طفیل نے "نقوش" کو زندہ کیا ہے اور "نقوش" نے محمد طفیل کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔

میں کوشش کروں گا کہ آپ کی توقعات پر پُورا اتر سکوں لیکن جیسا کہ میں نے ایسے کئی مواقع پر اپنی مجبوری کا اظہار کیا ہے کہ محفل خواہ ادبی ہو، خواہ ثقافتی ہو، خواہ سائنسی ہو مجھ جیسے گنہگار اور کم علم سے توقع کی جاتی ہے کہ سارے کا سارا علم یہ شخص بتائے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ ضرور اس کا احساس فرمائیں گے، بہرحال میں اپنی کوشش ضرور کروں گا کہ جو آپ کی توقعات ہیں ان پر پُورا نہیں اتر سکتا تو کم از کم ان کے نصف تک ضرور پہنچ سکوں۔

"نقوش" کے ارتقاء پر دیگر ادیبوں اور مقالہ نگاروں کے علاوہ جناب جاوید طفیل نے بھی بھرپور اور خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی اور خود محمد طفیل مرحوم کے الفاظ میں "اس لاڈلے کی پرورش اور اس کی بلوغت کی کہانی" سنائی۔ اس کے بعد جاوید صاحب نے "نقوش" کے بارے میں اس کے مربیوں اور عشّاق کے جذبات اور تاثرات بیان

نوٹ: ہوٹل ملٹن (لاہور) میں نقوش محمد طفیل نمبر کے سلسلے میں منعقدہ تقریب مورخہ ۶ جولائی ۱۹۸۷ء میں صدارتی خطاب۔

کیے جن میں مجھے بھی انہوں نے احتراماً شامل کیا ہے بلکہ آغاز ہی مجھ سے کیا ہے۔ یہ ان کی مہربانی ہے ورنہ میں اس مقام کا اہل نہیں ہُوں۔ ہاں اس سے اگر میری عقیدت، محبّت اور تعلق خاطر کی عکّاسی منظور ہے تو مجھے اس پر بڑا فخر ہے۔

مجھ سے پہلے بلند پایہ ادیبوں اور دانشوروں نے 'نقوش' کی علمی اور ادبی اہمیّت اور محمد طفیل مرحوم کی خدمات پر بھرپور انداز میں روشنی ڈالی ہے اس پر اضافہ میرے بس کی بات نہیں البتّہ اظہارِ عقیدت کے طور پر خلوصِ دل سے چند الفاظ آپ کے گوش گزار ضرور کروں گا۔

طفیل صاحب میری دانست کے مطابق کوئی چمکیلی یا چمکدار شخصیت کے مالک نہ تھے جو لاکھوں کے مجمع میں اپنی وضع قطع، قد کاٹھ، عمدہ لباس یا شوخ گفتگو کی وجہ سے پہچانے جائیں۔ ان کا جوہر ان کی محنت ہے۔ وُہ چیونٹی کی طرح کام میں جُت جاتے اور چپکے چپکے بڑے سے بڑا پہاڑ کھودنا شروع کر دیتے۔ ان کی ہمّت اور حوصلے کا پتا اس وقت چلتا جب وہ پہاڑ کو اپنے سر پر اٹھا کر "نقوش" کے خصوصی نمبر کی شکل میں ہمارے سامنے رکھ دیتے تب ہمیں اندازہ ہوتا کہ یہ نحیف سا شخص کتنا سخت جان ہے۔ یہ خاموش طبع مدیر کتنے شوریدہ سر کارنامے انجام دیتا ہے اور یہ مدھم مدھم شخص اندر سے کتنا چمکیلا اور دلکش ہے!

وہ "نقوش" کی اور "نقوش" ان کی پہچان تھا جیسا کہ آپ نے مجھ سے پہلے بہت سے مقررین سے سنا ہے اور سچ پُوچھیے تو نقوش ہی ان سے میرے تعارف کی بھی وجہ بنا۔ میں شروع سے ہی "نقوش" کا خریدار، قاری اور ذخیرہ اندوز رہا ہُوں۔ نقوش کے بعض عشاق میرے ذخیرے، دفینے اور خزینے میں وقتاً فوقتاً نقب بھی لگاتے رہے ہیں لیکن میں کبھی نقوش سے تہی دامن نہیں ہُوا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ لائبریری یا الماری میں سجے ہوئے بڑے اچھے لگتے ہیں بلکہ ان کے مطالعہ سے انسان ادب کے لیے اپنی پیاس بُجھاتا ہی نہیں بڑھاتا بھی ہے۔ کم از کم میں نے ہمیشہ یہ ہی محسوس کیا ہے کہ میں نے جتنا پڑھا ہے اس سے اور پڑھ لوں اور جتنا محفوظ کیا ہے اس سے اور زیادہ محفوظ کر لوں اور اب ماشاء اللہ میرے دل و دماغ کے علاوہ میری لائبریری میں 'نقوش' کے تقریباً تمام یادگار نمبر محفوظ ہیں۔

مقصد اظہارِ تعلّی نہیں حرصِ مطالعہ ہے۔ آپ نے جاوید طفیل کی زبانی سنا کہ جب طفیل مرحوم نے 'نقوش' کو گود لیا تو اس کی عمر اڑھائی برس تھی۔ بچّہ کم عمر ہونے کے علاوہ ذرا بیمار بھی تھا۔ یہاں طفیل صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہُوئے بجا طور پر یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے اس کم سن اور کمزور بچّے کی خوب پرورش کی، اسے پالا پوسا، پروان چڑھایا اور جوان بنایا۔ لیکن اس بات کا بہت کم لوگوں نے نوٹس لیا ہے کہ انہوں نے اس کی صورت کے علاوہ اس کی سیرت پر بھی خاصی توجہ دی اور وہی "نقوش" جو کبھی نام نہاد ترقی پسند خیالات کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا ان کی ادارت میں رفتہ رفتہ اسلامی رنگ میں ڈھلتا گیا اور میری نظر میں بطور مدیر ان کا نقطۂ عروج اور "نقوش" کا عالمِ شباب اس وقت آیا جب تیرہ جلدوں پر مبنی رسول ؐ نمبر شائع ہوا۔

ان کارناموں کی وجہ سے جناب محمد طفیل خود بھی اپنی ذات میں ایک ادارے کی حیثیت اختیار کر گئے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے بے شمار خُوبیاں اور صلاحیتیں ودیعت کی تھیں اور انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو صحیح سمت میں تعمیری کاموں کے لیے صَرف کیا۔ ان کے مرتّبہ " نقوش " کے خصوصی نمبروں کی تعداد، ضخامت اور معیار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر اَن تھک، محنت کرنے والے اور وقت کا شعور رکھنے والے انسان تھے۔ وقت کے اسی احساس اور زمانے کے اسی ادراک نے انھیں اعلیٰ پایہ کا مدیر بننے میں مدد دی۔ وہ علمی اور تحقیقی پہلوؤں پر گہری نگاہ رکھتے تھے اور محض خیال آرائی اور ٹھوس تحقیقی سرگرمیوں کے فرق سے بخوبی آگاہ تھے۔

طفیل مرحوم کے حوالے سے جو ایک اہم بات مجھے یاد آ رہی ہے وُہ یہ ہے کہ زندگی کے سفر میں عام طور پر لوگ بنے بنائے راستوں پہ چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے لیے نئے راستے تلاش کرتے ہیں کیونکہ اس میں محنت بھی کرنا پڑتی ہے، دقتیں بھی پیش آتی ہیں اور انجام بھی غیر یقینی ہوتا ہے لیکن جن اصحاب نے دنیا میں اپنا نام چھوڑا ہے انھوں نے اپنا راستہ خود تراشا ہے۔ محمد طفیل کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ادب کے سفر میں جنگل کاٹ کر اپنا راستہ تراشا ہے۔ محمد طفیل کو رنگ و نور کا یہ راستہ تراشنے میں جن مراحل سے گزرنا پڑا ہے اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو آدابِ کوہ کنی سے واقف ہیں۔

محمد طفیل نے ادب کی صرف خدمت ہی نہیں کی بلکہ ادب سے عشق کیا ہے اور ایک سچے عاشق کی طرح اپنا ایک ایک لمحہ اس کے سپرد کیا ہے۔ انہوں نے نقوش کو اپنا خونِ جگر دے کر پروان چڑھایا حتیٰ کہ یہ ایک سایہ دار تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ اس پُورے عمل کے دوران محمد طفیل نے اپنے آپ کو فراموش کیے رکھا۔ ان کی سوچیں، ان کے جذبے اور ان کی تخلیقی توانائیاں سب " نقوش " کی آبیاری کے لیے وقف رہیں۔

مجھے یہ کہنے میں ذرّہ بھر بھی تامل نہیں کہ " نقوش " ایک لیجنڈ (LEGEND) بن چکا ہے۔ ادب کی دنیا میں اسے ایک روایت کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ادب کا شاید ہی کوئی اہم موضوع ہو جس پر " نقوش " کا خاص نمبر شائع نہ ہوا ہو اور پھر کمال یہ ہے کہ اس کا ہر نمبر اردو ادب میں مستقل حیثیت کا حامل ہے۔ ادب کی تاریخ پر تحقیق کرنے والا کوئی شخص ان سے صَرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ شاید یہ میرے ہی خیالات ہیں لیکن جب میں نے جناب رشید خاں صاحب کے مقالے میں اس کے متعلق سُنا تو میری بڑی ڈھارس بندھی کیونکہ کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ تحقیق کے میدان میں اگر رشید حسن خاں صاحب سے آپ نے تعاون حاصل کر لیا تو سمجھ لیجئے کہ واقعی آپ نے صحیح کہا ہے۔

یُوں تو محمد طفیل نے اَن گنت ادبی کارنامے سرانجام دیے ہیں اور کئی علمی معرکوں میں کامرانیوں نے ان کے قدم چُومے لیکن ان کی ارفع تر سعادت بلاشبہ رسولؐ نمبر کی اشاعت اور ارفع ترین خدمت قرآن نمبر کی ترتیب و تدوین ہے جو ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا۔ اہلِ نظر اس کے منتظر تھے کہ خدا نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ تاہم

وُہ اپنے حصّے کا کام کر چکے تھے اور یہ نیکی ان کی اولاد کی طرف منتقل ہونا تھی۔ کسی فرزند کے لیے اس سے زیادہ خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے عظیم باپ کے اس قدر عظیم اور مقدس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے۔

رسولؐ نمبر اور قرآن نمبر اس خاندان کی دو نسلوں کے لیے توشۂ آخرت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ”نقوش“ کے رسولؐ نمبر کی تیرہ ضخیم جلدیں گواہی دے رہی ہیں کہ آج بھی چودہ صدیوں کے فاصلے پر ہمارے درمیان ایسے عشّاق موجود ہیں جو صرف اپنی ذاتی لگن سے، اپنے لہو سے دِیے جلا سکتے ہیں اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں ایسا محبت بھرا تحفہ پیش کر سکتے ہیں۔

رسولؐ نمبر کی پہلی جلد میں دیباچے کے طور پر ”طلوع“ کے عنوان سے محمد طفیل نے لکھا تھا کہ ”مجھ سے جو کام مولا نے لینا ہے وہ لے رہا ہے کیونکہ میں تو اپنی ذات میں نارسائیوں کی پوٹ ہُوں اور کچھ بھی نہیں۔ میری گنہگاری اپنی جگہ، توفیقِ ایزدی اپنی جگہ، مگر سوال یہ ہے کہ میرے اس سفرِ شوق کا حال کچھ میرے رسول صلیّ اللہ علیہ وسلم کو بھی معلوم ہے۔ میں حاضر ہوں یا رسولؐ اللہ، میں حاضر ہوں، میں حاضر!“ اور پھر وُہ واقعی حاضرِ دربار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو گئے ؎

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے
یہ بڑے نصیب کی بات ہے

وہ قرآن نمبر کے متعلق بڑے سنجیدہ اور سرگرمِ عمل تھے۔ وُہ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اس کا خاکہ سنایا کرتے تھے، اس کی فہرستِ مضامین دکھایا کرتے تھے اور بڑے فخر اور اعتماد سے کہتے تھے کہ قرآن نمبر بھی ان شاء اللہ نقوش کی اعلیٰ روایات کا حامل ہوگا۔

قرآن شعر نہیں لیکن اس کی نثر میں شاعری جیسا اعجاز، بلاغت اور ایمائیت ہے۔ ہر عہد کے بڑے نقادوں، شاعروں اور ادیبوں نے اسے ادبِ عالیہ قرار دیا ہے۔ قرآن کی علامات، استعارات، تلازمات، لسانی جاذبیت اور تاثیر نے ہر زبان کے ادب کو متاثر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام ذہن وعقل کو مسخر کر کے دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔

”نقوش“ کے قرآن نمبر کی طباعت کے آغاز کی نوید سے ہمیں ایک گونہ اطمینان ہُوا ہے کہ مرحوم محمد طفیل نے جو شمع روشن کی تھی اس کی لو مدھم نہیں ہوئی اور اس مشعل کو اب ان کے بیٹے جاوید طفیل نے تھام لیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں کامیابی عطا فرماتے۔

طفیل صاحب کے جاری کردہ کام کو آگے بڑھانے کے علاوہ جاوید طفیل نے ایک اور کارنامہ سرانجام دیا ہے انھوں نے، جیسا کہ ابھی آپ نے دیکھا ۱۸۵۰ صفحات پر مبنی ”طفیل نمبر“ شائع کر کے اپنی مدیرانہ اور ناشرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں انہیں اس کارنامے پر مبارکباد دیتا ہُوں۔ میں اس خصوصی نمبر پر تفصیلاً کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ پرچہ ابھی وصول ہُوا ہے۔ اس کے مختلف حصّوں پر کچھ سرسری سی نظر ڈالنے سے یہ اندازہ

کیا جا سکتا ہے کہ یہ خاصا جامع پرچہ ہے جس میں طفیل صاحب کی شخصیت پر بھی مضامین ہیں اور ان کے کام کا بھی بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں طفیل صاحب بطور مدیر، ادیب اور خاکہ نگار، بہت سی تحریروں کا موضوع ہیں۔ پھر خود ان کی اپنی تحریروں کا انتخاب اس مجلے میں شامل ہے۔ یقیناً یہ ایک قابلِ ستائش کوشش ہے اور ادبی حلقوں میں اس کی ضرور پذیرائی کی جائے گی۔ لیکن ایک خیر خواہ اور ہمدرد کے طور پر میں جاوید صاحب کو انہیں آیندہ کی دشوار گزار گھاٹیوں سے آگاہ کرنے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی برسی ہمیشہ دلگداز ہوتی ہے۔ پہلا یادگاری نمبر ترتیب دینا نسبتاً آسان ہوتا ہے کیونکہ کچھ تو مرحوم کا بکھرا ہوا کام ہوتا ہے جسے آسانی سے سمیٹا جا سکتا ہے اور کچھ مرحوم کے دوست، کم از کم ایک سال تک بڑے بامروت ہوتے ہیں کہ پسماندگان کے لیے کچھ نہ کچھ لکھ دیتے ہیں۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں، احباب ٹوٹ جاتے ہیں، ادبی پرچے دم توڑ دیتے ہیں۔ اللہ کرے "نقوش" کا یہ حال نہ ہو۔ لیکن دوسرے ادبی پرچوں کی مثالیں بڑی حوصلہ شکن ہیں اور میں سمجھ رہا تھا کہ شاید میں ہی اس کا ذکر کروں گا لیکن جمیل جالبی صاحب نے پھر میری حوصلہ افزائی فرمائی، لیکن میں کسی اور پہلو سے آپ کی توجہ ان کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ میں صرف چند ایک حوالہ جات دینے پر اکتفا کروں گا، اور آپ کی دعا سے میں نے یہ سب پرچے پڑھے ہیں۔

"ساقی" نے طویل عرصے تک تشنگانِ ادب کی پیاس بجھائی اور شعر و ادب کے خُم لنڈھائے لیکن جب شاہد احمد دہلوی اُٹھ گئے تو پوری محفل برخاست ہو گئی۔

"شیرازہ" مولانا چراغ حسن حسرت کا چشم و چراغ تھا لیکن حسرت صاحب فوت ہوئے تو یہ چراغ بھی گُل ہو گیا اور ہم آج تک حسرت سے ہی اسے یاد کرتے ہیں۔

"مخزن" کا خزانہ سر عبدالقادر کے سبکدوش ہونے کے ساتھ ہی لُٹ گیا۔

"ادبی دنیا" مولانا صلاح الدین احمد کی آنکھیں بند ہونے کے ساتھ ہی اُجڑ گئی۔

"ہمایوں" اور "عالمگیر" جو نام اور کام کے لحاظ سے سلطنتِ مغلیہ کا سا طمطراق رکھتے تھے اپنے بانیوں کے انتقال کے ساتھ ہی سلطنتِ مغلیہ کے سے انجام کو پہنچے۔

نیاز فتحپوری اور حکیم یوسف حسن کی وفات کے بعد اگر "نگار" اور "نیرنگِ خیال" زندہ بھی رہے تو نیم دروں، نیم بروں والی کیفیت رہی۔

اب امتحان کا یہ دور "نقوش" پر آیا ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا بلکہ ملک کا کوئی بھی شخص یہ نہیں چاہے گا کہ "نقوش" سابقہ ادبی پرچوں کے انجام کو پہنچے۔ اسے بچانے، پروان چڑھانے اور باغ و بہار رکھنے کی ذمہ داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے کیونکہ "نقوش" دورِ حاضر کی ایک ادبی روایت ہے، ہماری ادبی شناخت ہے، ہماری تخلیقی صلاحیتوں کا عنوان ہے، اس عنوان کو ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ جہاں تک حکومت کا

تعلق ہے وہ "نقوش" کو بالخصوص اور دیگر ادبی پرچوں کو بالعموم سہارا دینے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ پچاس ہزار روپے کا سالانہ "نقوش ایوارڈ" ان شاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ وفاقی حکومت سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ادبی پرچوں کے لیے نیوز پرنٹ یا دوسرا کاغذ رعایتی قیمت پر مہیا کرنے کا جائزہ لے۔ اس کے علاوہ ہم اکادمی ادبیات پاکستان سے توقع کریں گے کہ وہ ادبی جرائد کے مدیران یا ان کی انجمن سے مشورہ کر کے حکومت کو ایسی سفارشات پیش کرے جن سے ادبی پرچوں کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ جن قوموں میں ادبی سوتے خشک ہو جاتے ہیں وہ بہت جلد بانجھ ہو جاتی ہیں اور جو قومیں بانجھ ہو جاتی ہیں وہ تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتی ہیں پھر نہ شعر و ادب کی دنیا میں کوئی تخلیقی جوہر دکھا سکتی ہیں، نہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں۔ لہٰذا میں ایک طرف ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور دوسری طرف ادبی پرچوں کے مدیروں اور ناشروں سے اور تیسری طرف تمام وفاقی اور صوبائی محکموں سے اپیل کروں گا کہ وہ شعر و ادب کے فروغ کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کریں اور ملک کو صحت مند ادب سے مالا مال کرنے میں مدد دیں۔

میں ادب اور اس کے سرچشموں کے بارے میں طویل تقریر نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ آپ میں سے اکثر و بیشتر خواتین و حضرات ادیب ہیں، یا ادب پسند ہیں۔ میں صرف، اتنی یاد دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ادب کے دھارے ملی روایات کے سرچشمے سے پھوٹتے ہیں۔ ادیب ہماری تہذیبی ولایت کے سفیر ہیں اور اس حیثیت سے وہ اپنے تمدن کی اعلیٰ ترین جمالیاتی اور اخلاقی قدروں کے امین ہیں۔ ادب محض کسی قوم کا آئینہ نہیں ہوتا بلکہ پیش بین ہوتا ہے۔ لہٰذا ادیبوں کو اس امانت کا تحفظ بھی کرنا ہے اور آئندہ کے لیے پیش بینی بھی۔

آج ہمیں بار بار فکر و عمل اور جذبوں کی وحدت کی ضرورت کا شدید احساس ہے اور یہ خیال بار بار سر اٹھاتا ہے کہ دلوں کے درمیان وحدت کیسے پیدا ہو۔ اس کا جواب یہی ہے کہ جس طرح پہلے پیدا ہوئی تھی۔ رسول پاک کی محبت نے دورِ اول میں بھی دلوں کو جوڑا تھا اور آج بھی یہی قوت ان شاء اللہ دلوں کو جوڑ سکے گی اور ہمارے ادیب اس ضمن میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

پاکستان کو کس قسم کا ادب چاہیے اس کا فیصلہ میں نے یا حکومت نے نہیں کرنا، ادیبوں نے اور قارئین نے کرنا ہے۔ لیکن جہاں تک میرے خیالات کا تعلق ہے میں کئی مواقع پر اور خاص کر اسلام آباد میں منعقدہ قلم کاروں کے سالانہ اجتماعات کے سامنے اس موضوع پر مفصل اظہار کر چکا ہوں جس کا خلاصہ اس طرح سے ہے کہ:

سرزمینِ پاکستان کے بعض حصوں میں سیم اور تھور بہت ہے وہ ہماری زمین کی پیداواری صلاحیتوں کو ختم کر رہی ہے ہم پوری توجہ اور زور سے اس لعنت کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم ملک کی نظریاتی سرزمین میں بھی کسی قسم کی سیم اور تھور کو برداشت نہیں کریں گے۔ سیم اور تھور کے جزیروں پر ہماری نظر ہے ہم ان شاء اللہ ملک کی نظریاتی سرحدیں کھوکھلا کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میں آزادیِ اظہار کا پورا قائل ہوں لیکن آپ کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ مادر پدر آزادی کا تصور نہ تو کسی ملک یا عہد میں رہا ہے اور نہ آج کہیں ہے۔ آزادانہ بہنے دو"

دریا بھی کناروں کے درمیان بہنے پر مجبور ہے۔ کناروں سے اچھل جائے تو تباہی، کناروں کے اندر رہا تو سیرابی اور خوشحالی۔ لہٰذا ملک کی نظریاتی حدود کے اندر رہیئے، ملک کو صحت مند لٹریچر دیجئے، نئی نسل کو اعلیٰ مطالعاتی مواد مہیا کیجئے۔ اس سے ملک کی بنیادیں مضبوط ہوں گی، اس سے پاکستانیت فروغ پائے گی اور اسی سے پاکستان کے مستقبل میں نئی نسل کا اعتماد مضبوط ہوگا۔

مجھے امید ہے کہ محمد طفیل مرحوم نے "نقوش" کے رسولؐ نمبر کی تکمیل اور قرآن نمبر کی ابتدا کر کے جس روایت کی بنیاد رکھی ہے وہ پاکستانی ادب کو ایک نیا رُخ دے گی، ان شاء اللہ! اور اردو ادب ہمارے اسلامی اور ملی تشخص کو پوری طرح نمایاں کرے گا۔ ہمارا ادب اور ہماری ثقافت اسلام سے ابھرتی ہے اور اسلام سے ہی راہنمائی حاصل کرتی ہے کیونکہ اسلام سے ہی ہماری بقا ہے اور اسلام ہی ہماری صحیح شناخت ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں اپنا یہ مقالہ ختم کروں میں دو چیزوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، ایک تو پھر رشید حسن صاحب کے حوالے سے۔ میں نے جاوید صاحب سے پُوچھا کہ بھئی! یہ جو اتنے نقوش نمبر چھاپے ہیں ان کے نسخے بھی آپ کے پاس موجود ہیں یا نہیں، میرے پاس تو نہیں تو انہوں نے فرمایا کہ فائلوں میں موجود ہیں۔ پہلی تو میں ان کی خدمت میں یہ گزارش کروں گا کہ ان تمام نمبروں کو باقاعدہ طور پر دوبارہ چھپوائیں اور چھپوا کر محفوظ رکھیں میں یہ کوشش کروں گا کہ ان کے تمام نمبروں کی کم از کم ایک ایک جلد ہر اچھے کتب خانے میں موجود ہو۔ اِن کتب خانوں کے لیے یہ میرا تحفہ ہوگا۔

دوسری چیز جس کا مجھے خود احساس نہیں تھا وہ بھی رشید حسن صاحب نے بتائی اور آپ یقین کیجئے کہ سرحد کے اس پار سے جو آوازیں آتی ہیں وہ نقارخانے کی آوازیں ہیں۔ گھر کے اندر تو گنبد کی آواز ہمیں سنائی نہیں دیتی لیکن اس طرف سے جو آواز آتی ہے اسے خصوصی طور پر آپ کو سننا چاہیے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ تحقیق کے میدان میں نقوش کے بعض بعض مقالے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہم نے یہاں مرحوم طفیل صاحب سمیت ایک بورڈ بنایا تھا جس کے لیے میں نے پچاس ہزار روپے کی رقم رکھی تھی اور کہا تھا کہ نقوش میں جو سب سے اچھا مضمون چھپے اسے پچاس ہزار روپے دے دیجئے۔ اِس موقع پر میں نے ان سے کہا تھا کہ بھئی دیکھیے اسے اپنے پاس ہی نہ رکھ لیجئے، اس کے لیے ایک بورڈ تشکیل کیجئے، کوئی روایت ایسی قایم کریں کہ ہمارے اور آپ کے جانے کے بعد یہ چیز جاری رہے۔ تو انھوں نے بھی اپنا ایک بورڈ بنایا ہوا ہے جس سے کہ ہر سال یہ پچاس ہزار روپے کا انعام دیتے تھے۔ آج جاوید صاحب نے ایک نئی روایت قایم کی ہے اللہ تعالیٰ ان کی اس روایت کو قایم رکھے اور میں انھیں بھی اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو بھی مبارکباد دیتا ہُوں کہ انھوں نے اس کی پہلی اینٹ رکھی اور پہلی خشت یا اینٹ جو ہے وہ بھی وحید قریشی صاحب کے ہاتھ میں آئی۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو جاری رکھے لیکن آج کے جو مقالہ نگار ہیں میں ان کی خدمت میں گزارش کروں گا جس میں جناب رشید حسن خاں صاحب، جناب

مولوی اشفاق احمد صاحب، جناب پروفیسر فرمان فتحپوری صاحب، ڈاکٹر مختار الدین صاحب، جناب جمیل جالبی صاحب اور محترم جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب' ان کی خدمت میں میری گزارش ہے کہ ایک رضاکارانہ بورڈ بنائیے اور از خود یا اپنے احباب کے ذریعے "نقوش" کی تمام جلدوں کا مطالعہ کیجئے اور اس میں سے وُہ مضامین چھانٹیے جو کہ صحیح معنوں میں تحقیق کے اعلیٰ معیار پر پُورے اُترتے ہوں۔ اس کا پھر ایک خصوصی نمبر شائع کیجئے اور اس کا نام طفیل نمبر رکھیے۔ "نقوش تحقیق طفیل نمبر" اور اس کی تمام کی تمام قیمت میں ادا کروں گا تاکہ یہ تحقیق کا کام جو ہے وہ بھی جاری رہے اور طفیل صاحب کا نام فقط نقوش ہی کی خاطر نہیں بلکہ نقوش کے ساتھ جو تحقیق کا عمل ہے اس کے ذریعے بھی زندہ رہے۔

میں نے شروع میں جو بیگم طفیل صاحبہ کا نام لیا تھا وُہ صرف اس وجہ سے لیا تھا کہ کسی محقق، ادیب یا مورخ کا مقولہ ہے کہ ہر بڑے آدمی کے پیچھے کسی نہ کسی خاتون کا ہاتھ ہوتا ہے بیگم طفیل کے طفیل کے متعلق کیا تاثرات ہیں جب تک وہ نقش سامنے نہیں آئیں گے یہ طفیل نمبر ادھورا رہے گا، کیونکہ (مولوی) اشفاق صاحب نے کہا تھا کہ اگر طفیل خود اپنی سوانح عمری لکھ جاتے اور اپنے لیے ایک طفیل نمبر مرتب کر جاتے تو وہ چیز واقعی بلند ہوتی، اب یہ کام تو انہوں نے کیا نہیں۔ اب اس چیز کو لیتے ہُوئے مَیں بیگم طفیل کی خدمت میں عرض کروں گا کہ وہ اپنے فرزند ارجمند کی مدد سے اپنے تاثرات ایک ایسے شخص کے متعلق ریکارڈ کرائیں جس کے لیے ہم آج پچھلے دو گھنٹوں سے باتیں کر رہے ہیں اور وہ پچاس ہزار صفحات کا مالک ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ ایک خصوصی نمبر ایک تحقیقی نمبر ہوگا اور ہر لحاظ سے اچھوتا ہوگا۔

ان الفاظ کے ساتھ میں جاوید طفیل صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہُوں اور انہیں یہ تقریب منعقد کرنے پر مبارکباد دیتا ہُوں۔ اس تقریب کا مزاج تہنیتی بھی ہے اور تعزیتی بھی۔ تہنیتی اس لحاظ سے کہ نقوش کے طفیل نمبر کی یہ تقریب رُونمائی ہے اور تعزیتی اس لیے کہ آج طفیل صاحب کی برسی ہے۔ طفیل صاحب جو یادگار نمبر نکالنے کے لیے مشہور تھے آج خود ایک یادگاری نمبر کا موضوع ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین

پاکستان پائندہ باد

کم گو اور شرمیلا شخص

ڈاکٹر وحید قریشی

جناب صدر و خواتین و حضرات!

طفیل صاحب کا انتقال میرے لیے ایک ذاتی سانحہ بھی ہے۔ میرے اُن کے تعلقات کا آغاز اُس وقت ہُوا جب میں نے مضمون نگاری کا آغاز کیا تھا اُن کی زندگی کے چار رُوپ یا چار رنگ میں نے دیکھے ہیں اُس کی تفصیل میں جانے کا تو موقع نہیں ہے۔ مختصراً پہلا دَور جو کئی برسوں میں محیط ہے اُس میں میں نے طفیل صاحب کو ایک خاموش، کم گو اور شرمیلے شخص کے طور پر دیکھا جو دیرآشنا تھا اِس لیے اُن ابتدائی چند برسوں میں محض آشنائی کا یا واقفیت کا دعویٰ کر سکتا ہُوں۔

بعد میں جب اُنھوں نے تیزی کے ساتھ ادب کا سفر شروع کیا تو اُن کے بارے میں کئی افواہیں بھی پھیلائی گئیں افواہیں تو زندگی بھر اُن کا تعاقب کرتی رہیں کیونکہ ہمارے ہاں دوسرے کی ترقی دیکھتے ہُوئے جل جانے کا رواج کچھ زیادہ ہی ہے۔ لیکن طفیل میں ایک خاص کمال تھا جو انھیں تیسرے مرحلے میں لے آیا وُہ یہ تھا کہ وُہ اپنی لگن میں کام کرتے جاتے تھے اور بہت کم لوگوں کو اپنا حریف جانتے تھے۔ یہ دور محض کم گوئی کا بھی نہیں ہے اور کم آمیزی کا بھی نہیں۔ چنانچہ ادب کی سیاسی بساط پر اُنھوں نے بھی کئی مُہرے بڑھائے، ادب کی شطرنج بھی کھیلی اور اُس کی تلخیوں کا سامنا بھی کیا۔ اس کے بعد چوتھا دور آخری بیس برس کا ہے جب اُن کے مزاج میں بہت بڑی تبدیلی آ گئی تھی یہ غالباً سنہ ۶۰ء یا سنہ ۶۱ء کی بات ہے جب اُن پر دل کا دورہ پڑا۔ اُس زمانے میں وُہ گڑھی شاہُو میں رہتے تھے اور وہاں سے سمن آباد کے لاہور ہسپتال میں اُنھیں کچھ دن گزارنا پڑے تھے۔ اس کے بعد سے اُن کی زندگی میں ایک بنیادی تبدیلی آئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب میرا ان کا قریبی ساتھ ہُوا۔ یہی وُہ دور ہے جب دیگر اصناف کے مقابلے میں تحقیق میں اُن کی دلچسپی بڑھی اور 'نقوش' کی بنیادی روایت ادب کے علاوہ تنقید اور تحقیق بھی بن گئی۔ وہ اس سلسلے میں بڑے سخت تھے، مضامین کی چھان پھٹک میں دوستوں کا لحاظ بھی نہیں کرتے تھے۔ ایک مدیر کی حیثیت سے اُنھوں نے اِس پرچے میں جان ڈالی۔ اور میں سمجھتا ہُوں کہ اُن کی زندگی کا آخری دور اِس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ادب کی آنے والی نسلیں اُنھیں ہمیشہ ادب کے ایک محسن کی حیثیت سے جانتی رہیں گی۔

اِس دَور میں جو مذہب کے ساتھ اُن کا لگاؤ تھا وہ ان کے مزاج کا ایک ایسا رنگ ہے جو شروع کے ادوار میں نہیں تھا۔ اِسی بنا پر انھیں اس موضوع پر کام کے لیے بے پناہ محنت کرنا پڑی اور ڈاکٹر نے ان کی صحت کے پیشِ نظر انہیں زیادہ کام کرنے سے منع بھی کر رکھا تھا تاہم یہ چوری چھپے کام کر لیتے تھے۔ انتقال سے کچھ پہلے انہیں ایک

جبری بن باس پر باہر بھی جانا پڑا۔ ملک سے گئے تو وہ صحت کی بحالی کے لیے گئے تھے مگر اس پر بھی اُنھوں نے کام بند نہ کیا اور سفر میں بھی اپنے منصوبے پر کام کرتے رہے، اُن کے مزاج کے دو تین پہلو بہت نمایاں تھے۔ ایک تو ان کے مزاج میں ایک خاص طرح کی طنز شامل ہوتی تھی جس کا وار وُہ بالکل چپکے سے کرتے تھے، خاموشی سے بیٹھے بیٹھے اچانک کوئی ایسا جملہ نکلتا جو اپنی کاٹ کر جاتا تھا اور اُس کے بعد سُننے والا دیر تک اپنے زخم سہلاتا رہتا تھا۔

زندگی کے آخری دنوں میں اُن کے مزاج میں ایک تبدیلی یہ بھی آگئی تھی کہ جتنی دشمنیاں اُنھوں نے زندگی میں پالی تھیں اُن سب کی تلافی کرنے کی کوشش کی اور اُن سب لوگوں سے اپنے تعلقات دوبارہ استوار کیے جن سے جوانی میں لڑائیاں لڑی تھیں۔ ایک چیز وُہ کبھی برداشت نہیں کرتے تھے اور آخر وقت تک اُنھوں نے برداشت نہ کی وُہ یہ کہ جو لوگ 'نقوش' کے سلسلے میں مخصوص قسم کی افواہیں پھیلانے کے درپے تھے اُنھیں اُنھوں نے کبھی بھی معاف نہیں کیا کیونکہ یہ سلسلہ اُن کے مشن کا تھا اُن کے مسلک کا تھا اور مسلک میں سمجھوتے کی بات نہیں ہوتی۔ زندگی کے آخری برسوں میں اُنھوں نے بے تحاشا کام کیا، کام سے اُن کی لگن کی بنا پر ہی 'نقوش' کا ہر شمارہ ادب میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

ہوٹل ہلٹن لاہور میں 'نقوش طفیل نمبر' کی منعقدہ تقریب میں مورخہ ۷ جولائی ۱۹۸۷ء کو پڑھا گیا۔ (ادارہ)

نقوش کے مرشد[٥]

جمیل جالبی

معزز خواتین و حضرات!

ہر نسل کا نوجوان خواب دیکھتا ہے اور ان خوابوں کی تعبیر سے وہ اپنے راستے اور اپنی منزلیں مقرر کرتا ہے۔ میری نسل کا نوجوان جب خواب دیکھتا تھا تو اس میں بڑا مصنف، بڑا شاعر، بڑا صحافی، بڑا موحد یا علم حاصل کر کے بڑا آدمی بننے کی خواہش مضمر ہوتی تھی اور وہ نوجوان خود کو اپنے خواب کی تعبیر کے لیے وقف کر دیتا تھا۔ یہ وہ خواب تھے جن سے معاشرے میں بڑے آدمی پیدا ہوتے تھے اور معاشرہ ہر دم سرسبز و شاداب رہتا تھا آج کا نوجوان بھی بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھتا ہے لیکن ان خوابوں میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی آرزو شامل ہوتی ہے۔ آسائش سے معمور زندگی' اور دولت کی ریل پیل۔ یہی آج بڑے آدمی کی پہچان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں آسائش سے معمور بڑے گھروں اور کاروں کی تو کثرت ہے لیکن بڑے آدمیوں کا کال پڑ گیا ہے۔ محمد طفیل مرحوم نے بھی' اپنی نسل کے خوابوں کے عین مطابق' بڑا مدیر اور بڑا ناشر بننے کا خواب دیکھا اور ساری عمر اسی خواب کی تعبیر میں لگا دی اور پھر یہ ہوا کہ محمد طفیل کو ساری دنیا زمانے نے اپنے دور کا سب سے بڑا مدیر تسلیم کر لیا۔ یہی ان کا کارنامہ ہے اور اسی کارنامے سے ان کا نام نہ صرف آج روشن ہے بلکہ آنے والے زمانوں میں بھی روشن رہے گا۔

محمد طفیل کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ نوجوان تھے۔ سیدھے سادے۔ خاموش طبع۔ کم آمیز لیکن ملنسار۔ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے غم گسار۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی نظم "پن چکی" کی طرح دن رات کام میں لگے رہنے والے۔ دھن کے پورے۔ کام کے پکے۔ نقوش کے مرشد بھی اور نقوش کے مرید بھی۔ یہی کام تھا۔ یہی مقصدِ حیات تھا۔ کثرتِ ذکر سے دونوں ایک ہو کر ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔ محمد طفیل کا ذکر کیجیے تو وہ محمد نقوش کا ذکر ہو گا، محمد نقوش کا ذکر کیجیے تو وہ محمد طفیل کا ذکر ہو گا۔ تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ اسی لیے دونوں اسی طرح لازم و ملزوم ہیں جس طرح میاں بشیر احمد اور ہمایوں، مولانا صلاح الدین احمد اور ادبی دنیا، نیاز فتحپوری اور نگار، شاہد احمد دہلوی اور ساقی، حکیم یوسف حسن اور نیرنگِ خیال۔ یہ ادبی جرائد کا عظیم دور تھا اور محمد طفیل اور نقوش اسی روایت کی آخری کڑی تھے۔

"نقوش" نے کسی فکری یا ادبی تحریک کو جنم نہیں دیا لیکن اردو ادب کے بہترین شہ پاروں کو گھر گھر

---

[٥] ہوٹل ہلٹن لاہور میں نقوش محمد طفیل نمبر کی تقریب منعقدہ ۶ جولائی ۱۹۸۷ء میں پڑھا گیا۔

پہنچا کر فروغِ ادب کی عظیم خدمت انجام دی۔ اس میں معاصر ادب بھی شامل ہے اور کلاسیکی ادب بھی۔ نقوش کی مقبولیت کا راز یہ تھا کہ محمد طفیل اسے معیاری مواد سے مزین کر کے حسنِ ترتیب اور ذوقِ جمال کے ساتھ اس طرح پیش کرتے کہ جو پڑھتا داد دیتا اور پھر سنبھال کر محفوظ کر لیتا۔ اسی لیے نقوش وہ واحد رسالہ تھا جو پڑھا بھی جاتا تھا اور سینت کر سنبھال کر رکھا بھی جاتا تھا۔ نقوش کی شہرت کا راز یہ بھی تھا کہ محمد طفیل نے ایسے معیاری اور بلند پایہ خاص نمبر شائع کیے کہ جو مواد کے اعتبار سے منفرد اور حسنِ ترتیب کے اعتبار سے بے مثل تھے اور جن کی مجموعی تعداد ۴۳ ہے۔ محمد طفیل معیاری ادب کا اتنا بڑا گلاس لبالب بھر کر پیش کرتے کہ قارئین ادب کے ذوق کی پوری طرح آسودگی ہو جاتی۔ غزل نمبر، شخصیات نمبر، منٹو نمبر، مکاتیب نمبر، شوکت تھانوی نمبر، آپ بیتی نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، میر نمبر اور آخر میں رسولؐ نمبر وہ خاص شمارے ہیں جو اب ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہیں اور جن کا ڈنکا سارے برعظیم میں بج رہا ہے۔

محمد طفیل مرحوم نے نقوش میں بلند پایہ تحقیقی مقالات شائع کر کے جدید اور قدیم کی حدِ فاصل کو پاٹ دیا۔ اس سے ایک طرف جدید تحقیقات کی روشنی نے علم و ادب کے حلقوں کو منور کیا اور دوسری طرف خود نقوش نئی تحقیق کا حوالہ بن گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ حوالے پھیلتے اور بڑھتے جائیں گے اور انہیں حوالوں کے تعلق سے نقوش کی اہمیت بھی قائم و دائم رہے گی۔ نقوش اور دوسرے علمی و ادبی رسالوں میں یہی بنیادی فرق ہے اور اسی لیے نقوش نئے اور پرانے دونوں حلقوں میں یکساں مقبول تھا اور مقبول رہے گا۔

محمد طفیل کی شخصیت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ کم گو تھے۔ یہ خصوصیت اس نسل کے دور کے ادیبوں کی ایک عام مشترک خصوصیت تھی۔ اس دور کے ادیب کم بولتے اور زیادہ لکھتے تھے۔ آج کے دور کے ادیب کی مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام طور پر زیادہ بولتے اور کم لکھتے ہیں۔ زیادہ بولنے میں فائدہ یہ ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ رنگ چوکھا آتا ہے اور کم بولنے اور زیادہ لکھنے میں نقصان یہ ہے کہ فائدے کا پتا بہت دیر میں چلتا ہے۔ محمد طفیل کے نفع نقصان کا پتا بھی اسی لیے دیر سے چلا اور اسی لیے وہ مرنے کے بعد آج بھی زندہ ہیں۔

محمد طفیل کے نام، کام اور شخصیت کے ساتھ مثنوی مولانا روم کی وہ حکایت مجنوں یاد آتی ہے جس میں ایک صحرانورد نے مجنوں کو تنہا بیٹھے اور اپنی انگلیوں کے قلم سے "ریت پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا" صحرانورد نے مجنوں سے پوچھا کہ یہ خط کس کے نام لکھ رہے ہو۔ ابھی تیز ہوا کا ایک جھونکا آئے گا اور سب کچھ مٹا کر رکھ دے گا۔ مجنوں نے جواب دیا،

گفت شرحِ حسنِ لیلیٰ می دہم
خاطرِ خود را تسلی می دہم
تا چشیدم جرعۂ از جامِ او
عشقبازی می کنم با نامِ او

یہی سچے عاشق کی پہچان ہے اور محمد طفیل، خدا انہیں کروٹ کروٹ چین دے، ایک ایسے ہی عاشق تھے جو ساری عمر اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ادب سے عشق بازی کرتے رہے۔ ان کے کام کی خوشبو آج بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور ہمارے مشامِ جاں کو معطر کیے ہوئے ہے۔ شاید جرأت نے یہ شعر ایسے ہی عاشقوں کے لیے کہا تھا:

جو مریض تھا پڑا جاں بہ لب خبر اور کچھ نہیں اس کی اب
مگر اتنا کہتے ہیں لوگ سب کہ بڑا یہ نیک خصال تھا

معزز خواتین و حضرات!

بس آج کی شام مجھے آپ سے یہی کہنا تھا۔

شکریہ!

محمد طفیل کی یاد میں

ڈاکٹر مختار الدین احمد (بھارت)

مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے کہ آج محمد طفیل مرحوم کی پہلی برسی پر اُردو دنیا نے اپنا ایک فرض پُورا کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ ایسا فرض جس کی تکمیل ضروری تھی۔ یعنی بلند پیمانے پر ایک باوقار تقریب کا انعقاد جس میں محمد طفیل مرحوم کی شخصیت اور اُن کے کارناموں پر روشنی ڈالی جا رہی ہے اور جس میں صدر مملکت، رسالہ 'نقوش' کے محمد طفیل نمبر کی رسم اجرا ادا فرما رہے ہیں۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے رسالہ 'نقوش' کے شخصیات نمبر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے طفیل مرحوم کو لکھا تھا:

"آپ کا ہر نمبر خاص ہوتا ہے مگر شخصیات نمبر سب پر بازی لے گیا۔ اب صرف ایک ہی شخصیت رہ گئی ہے جو عجیب و غریب ہے۔ اس کا لکھنے والا ایک نہیں ہو سکتا کئی ہوں گے، عجب نہیں کسی روز وہ پورا نمبر ایک ہی شخصیت پر نکلے۔"

عجیب و غریب شخصیت سے مولوی صاحب کی مُراد محمد طفیل سے تھی۔

اس مُبارک کام کی ابتدا تو آج سے چار سال پہلے اُردو کے مشہور اُستاد اور مصنّف طفیل صاحب کے دوست اور پروفیسر سیّد مُعین الرحمٰن صاحب نے 'محمد نقوش' مرتب اور شائع کر کے کر دی تھی، آج کے جلسے کا انعقاد اس کام کی تکمیل کی طرف دوسرا قدم ہے۔ جب محمد طفیل کے بارے میں 'نقوش' کا ضخیم نمبر طبع کرا کے صدر مملکت کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، اور اس طرح بابائے اُردو کی ایک بشارت کی تکمیل ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ 'نقوش' کا موجودہ شمارہ طفیل مرحوم کی شخصیت کو سمجھنے اور اُن کے ادبی اور علمی کارناموں کو پرکھنے کے لیے ہر طرح مفید ثابت ہو گا۔

آج مجھے اس محرومی کا احساس ہو رہا ہے کہ مرحوم سے زیادہ ملنے اور اُن کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کی مسرّت سے محروم رہا۔ ان سے تعلقات کی عمر تو وہی ہے جو رسالہ 'نقوش' سے ان کی وابستگی کی ہے، لیکن مُلاقاتیں ان سے صرف چند ہوئیں۔ ابتدا میں وہ کم کم کھُلے، اندازہ ہُوا کہ وہ طبعاً کم آمیز اور کم گو ہیں۔ ساتھ ہی ایک مغربی مفکّر کا مقولہ یاد آیا کہ زیادہ باتیں کرنے والے بیشتر لوگ کارکردگی کی صلاحیّت کھو بیٹھتے ہیں جب کہ خاموش طبیعت کے لوگ یادگار کارنامے انجام دے جاتے ہیں۔ طفیل صاحب خاموشی سے ایک گوشے میں بیٹھے اپنے کام میں لگے رہے اور بلندی کی منزلوں تک پہنچ کر اُنھوں نے دم لیا۔ اُنھوں نے خصوصی شماروں کی اشاعت میں ایک نئے عہد کا آغاز کیا اور ضخیم، مفید، معیاری شمارے شائع کر کے ایسی مثال قائم کر دی کہ اس کی پیروی کی آرزو تو کی جا سکتی ہے پیروی نہیں کی جا سکتی۔

محمد طفیل ایک جامع الصفات انسان تھے، اُنھوں نے اپنی زندگی میں متعدد کارنامے انجام دیئے، سوال یہ ہے کہ اُن کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے؟

وہ ممتاز ناشر تھے، بے مثال آرگنائزر تھے، کامیاب ایڈیٹر تھے، زبردست انشا پرداز تھے اور منفرد قسم کے خاکہ نگار۔ ان کی شگفتہ و شاداب تحریروں نے ہمیشہ ہمارے دلوں پر ایک گہرا نقوش چھوڑا ہے۔ خاکہ نگاری ان کا خاص میدان تھا، جس شخصیت پر اُنھوں نے قلم اُٹھایا اُسے زندہ جاوید بنا دیا۔ موضوع اور اُصول کی مطابقت و ہم آہنگی کسے کہتے ہیں یہ دیکھنے کے لیے ان کے لکھے ہوئے خاکوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

لیکن کہا جاسکتا ہے کہ ان صفات سے کسی نہ کسی درجے میں کچھ اور لوگ بھی ان کے عہد میں متصف ہیں اور آئندہ بھی متصف ہوتے رہیں گے۔ کامیاب ناشر بھی پیدا ہوں گے اور ایڈیٹر بھی۔ انشا پرداز بھی اور خاکہ نگار بھی۔ میری ناچیز رائے میں جو چیز اُنھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے اور جسے ان کا اصل کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے وہ 'نقوش' کی ادارت اور اس کی خصوصی اشاعتوں کی معرکۃ الآرا ترتیب و تدوین ہے۔ اس معاملے میں **محمد طفیل** بلاشُبہ منفرد ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں رسالوں کے خصوصی نمبر شائع کرنے کا رواج نہ تھا۔ نیرنگِ خیال، عالمگیر، شاہکار، ادبی دُنیا، ہمایوں کے سالنامے شائع ہُوا کرتے تھے۔ بعض رسالے عید نمبر نکال لیتے تھے۔ نیاز فتح پوری نے خصوصی نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا، نگار کا ایک شمارہ اُنھوں نے غالبؔ کے لیے مخصوص کیا، پھر مصحفی نمبر شائع ہُوا جنھیں قدر و منزلت کی نگاہیں اب بھی تلاش کرتی ہیں۔ نیرنگِ خیال کا اقبالؔ نمبر نکلا اور جوہر دہلی کا عبدالحق نمبر ۱۹۴۹ء میں علی گڑھ میگزین کا غالبؔ نمبر۔ یہ غالبؔ پر پہلا خصوصی شمارہ تھا، جس میں ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے ممتاز ماہرینِ غالبیات نے حصّہ لیا تھا۔ بعض دوسرے رسالوں کے بھی خاص نمبر شائع ہوئے لیکن مختصر پیمانے پر۔

محمد طفیل نے ۱۹۵۱ء میں نقوش کی ادارت اپنے ہاتھ میں لی اور وہیں سے 'نقوش' کے ایک نئے عہد کا آغاز ہُوا۔ اُنھوں نے کوئی سو سوا سو شمارے اس کے شائع کیے۔ جن کے اوراق کی مجموعی تعداد پچاس ہزار صفحات سے زائد ہوتی ہے۔ اہلِ قلم کے ایسے تعاون کی مثال مشکل سے ملے گی۔ خصوصی شماروں کی ابتدا اُنھوں نے افسانہ نمبر سے کی جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہُوا، پھر تو خاص نمبروں کی گویا یلغار شروع ہو گئی۔ نمبر پہ نمبر شائع ہونے لگے۔ غزل نمبر، شخصیات نمبر، منٹو نمبر، مکاتیب نمبر، خطوط نمبر، طنز و مزاح نمبر، پطرس نمبر، ادب عالیہ نمبر، لاہور نمبر، شوکت تھانوی نمبر، آپ بیتی نمبر، جنگ نمبر، غالبؔ نمبر، اقبالؔ نمبر، میرؔ نمبر، انیس نمبر، ادبی معرکے نمبر اور عصری ادب نمبر۔ 'نقوش' کے یہ نمبر اتنے وقیع ثابت ہوئے کہ اُنھوں نے حوالے کی کتاب جیسی اہمیت حاصل کر لی۔

محمد طفیل کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک مثالی ایڈیٹر تھے جو اپنے پیچھے ایسے متعدد شمارے چھوڑ گئے جو ادب کا حصّہ بن گئے۔ 'نقوش' کے بعض شماروں کے متعلق ہم بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ذکر کے بغیر ادب کی تاریخ مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ یہ وہ شمارے ہیں جن کا اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ ذکر آئے گا۔

میں نے ایک بار جب لاہور میں ان کے یہاں مقیم تھا ان کے حالات دریافت کیے اور ان کی کامیابی کا راز جاننا چاہا۔

اُنھوں نے جو کچھ کہا اس کے چند فقرے مجھے یاد آتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا:

”اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے مجھے کچھ شرم آتی ہے بلکہ بسا اوقات وحشت ہوتی ہے۔ جہاں تک میری زندگی کی کامیابی کا

تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کامیاب ہے اور مجھے اس کی خوشی ہے۔ میں نے اب تک کوئی کام ایسا انجام نہیں دیا ہے، جسے اپنا کارنامہ کہوں۔ جو کام میں نے کئے ہیں، ان میں کچھ کام مجھے پسند آئے، کچھ نہ آئے، لیکن کوشش برابر جاری رکھی اور خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رہی۔"

اس خوب تر کی تلاش نے انھیں رسولؐ نمبر کی ترتیب کی طرف متوجہ کیا اور اس تلاش میں انھیں قرآن نمبر اور خدا نمبر مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انھیں بڑی محبت تھی۔ رسولؐ نمبر کے مجلدات میں "طلوع" کے عنوان سے جو شذرات انھوں نے لکھے ہیں انھیں پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ وہ محبتِ رسولؐ میں کتنے اور کیسے ڈوبے ہوئے تھے۔ رسولؐ نمبر کے دوران ترتیب ان کی توجہ رسولِ پاکؐ پر جو کتاب نازل ہوئی تھی اس طرف ہوئی چنانچہ انھوں نے قرآن نمبر مرتب کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے مضامین جمع کرنے لگے۔ اپنی آخری ملاقات (مئی ۱۹۸۶ء) میں وہ کہنے لگے۔ قرآن نمبر کے جمع شدہ مضامین دیکھ کر مجھے اس ہستی کا خیال آیا کہ جس نے اپنے بندے اور آخری رسولؐ پر قرآن نازل کیا تھا۔ اب میرا خیال ہوا کہ کیوں نہ قرآن نمبر کی پہلی جلد کو خدا نمبر کے نام سے شائع کروں۔

اس طرح ان کا دماغ نت نئے ارادوں اور تصورات کے جالے بُنتا رہا اور نئے نئے خاکے بناتا رہا۔

ادب سے اسلامیات کی طرف محمد طفیل کے ذہنی سفر کے متعلق قیاس آرائیاں بھی ہوئیں۔ مجھے تو ان کا وہ اداریہ یاد آیا جس میں انھوں نے باری تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:۔

(جو کوئی آخرت کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اسے اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے)

اور بے اختیار دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی کہ اے خدا مرحوم کی نذر کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔ انھیں اپنی بے پایاں رحمتوں سے نواز اور اپنے وعدے کے مطابق آخرت میں لگائی ہوئی کھیتی کو ترقی دے اور ساتھ ہی ساتھ اس دنیا میں بھی ان کی لگائی ہوئی کھیتی کو شاداب رکھ۔

ان کی لگائی ہوئی کھیتی کی سربلندی اور شادابی مجھے اس کے ہمہ صفت بیٹے عزیزی جاوید طفیل کے ہاتھ اور روپ میں فروزاں اور فراواں دکھائی دیتی ہے۔ جس حسن و خوبی اور خوش قامتی اور جس درجہ مستعدی، مستقل مزاجی اور وضع داری کا پچھلے ایک برس میں جاوید طفیل نے ثبوت فراہم کیا ہے میں اس میں محمد طفیل مرحوم کے ارادوں اور عزم کی بشارت پاتا ہوں۔ باپ کے ادبی ورثے اور معتبر سلسلے کو اس طرح پانا، سنبھالنا اور نباہ لینا، اس حوالے سے بھی شاید طفیل مرحوم اپنی خوش نصیبی میں یکتا دکھائی دیں، یہ ہم سب کے لیے سرور و سکون کا باعث بھی ہے اور قابلِ رشک بھی۔

ہلٹن ہوٹل لاہور میں منعقدہ نقوش "طفیل نمبر" کی تقریب رونمائی مورخہ ۶؍جولائی ۱۹۸۷ء میں پڑھا گیا۔

اچھا آدمی سچا ادیب[1]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

جنابِ صدر، خواتین و حضرات!

اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ آج ہم ایک ایسے اچھے آدمی اور سچے ادیب کی یاد تازہ کرنے کے لیے جمع ہُوئے ہیں جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ادب اور اہلِ ادب کے لیے وقف تھا۔ پھر بھی زندگی، خواہ کسی کی ہو، کتنی ہی خوبصورت اور بامقصد کیوں نہ ہو، مختصر و بے ثبات ہے، اتنی بے ثبات کہ اگر اس کے اثبات کے بارے میں سوال کیجئے تو سوال کرنے والے کی سادہ لوحی پر فطرت کے بے جان عناصر کو بھی ہنسی آجاتی ہے۔ میر کے لفظوں میں:

کہا میں نے کتنا ہے گُل کا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسّم کیا

لیکن زندگی کے مقابلے میں زندگی کا حُسن کارانہ عکس یا اظہار جسے فن کہہ لیجئے بے کران و لازوال ہے۔ آدمی مرجاتا ہے، نام زندہ رہتا ہے۔ واقعات بھلا دیے جاتے ہیں۔ واقعات کی تہ سے اُبھرنے والا فن زندہ رہتا ہے۔ پھر یہی فن ایک ایسی کہانی کو جنم دیتا ہے جسے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے

سُنتے اور کہتے رہتے ہیں۔ اور آج ہم ایک ایسی ہی کہانی سننے اور بیان کرنے کے لیے جمع ہُوئے ہیں۔

فن کی ایک شاخ کا نام ادب ہے اور ادب کا دوسرا نام فنِ لطیف ہے۔ فنِ لطیف کی اور بھی شاخیں ہیں مثلاً مصوّری، نقاشی، مجسّمہ سازی اور فنِ تعمیر۔ لیکن ادب ان سب سے لطیف تر ہے۔ اس میں کثافت کا عنصر برائے نام یعنی صرف حرف و صوت کی حد تک ہوتا ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

(غالب)

---

[1] "نقوش" کے "طفیل نمبر" کی تقریب منعقدہ ۶ جولائی ۱۹۸۷ء بمقام لاہور کی تقریر، جسے بعد میں قلمبند کیا گیا۔

تبھی تو اسپین کی مسجدِ قرطبہ مسلمانوں کے لیے ایک تاریخی نشان کی حیثیت رکھتی ہے اور علامہ اقبال کی مسجدِ قرطبہ ایک زندۂ جاوید عالمی شاہکار تھی۔ لیکن اس نوع کی صورت گری محض زورِ بازو سے ممکن نہیں ہوتی اس کے لیے غالب کے لفظوں میں دیدۂ بینا و دلِ گداختہ اور علامہ اقبال کے لفظوں میں "خونِ جگر" درکار ہوتا ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

خونِ جگر کی یہ سُرخی، اُس ادیب کی تحریروں اور اس کے صحیفے میں صاف نظر آتی ہے جس کے طفیل میں آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ حُسنِ اتفاق سے اُس ادیب کا نام بھی طفیل ہے۔ طفیل نے اپنے خونِ جگر سے حرف ایک نقش نہیں بلکہ "نقوش" کو روشن رکھنے کا کام لیا ہے۔ طفیل کا 'نقوش' اس کے خونِ جگر کی لالی سے آج بھی شاداب و سرخرو ہے اور طفیل صاحب، نقوش کے حوالے سے زندۂ جاوید ہیں اور ہم "زندۂ جاوید" کا ماتم نہیں کرتے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہُوں کہ "نقوش" کو تازہ ولولوں کے ساتھ زندہ رکھنے اور اس میں نئے رنگ بھرنے کے لیے محمد طفیل کے بڑے صاحبزادے جاوید طفیل ہمارے درمیان موجود ہیں۔ میں ان کی ہمّت کی داد دیتا ہُوں۔ ان کے حوصلوں کو سلام کرتا ہُوں کہ انھوں نے میراثِ پدر کی قدر و منزلت کو پہچانا اور اس کے تحفّظ و توسیع کو ضروری جانا۔ مجھے ان کی ذہانت اور علمی سُوجھ بُوجھ سے، کامل یقین ہے کہ وُہ "آنچہ پدر نتواند پسر تمام کند" کے قول پر پُورے اتریں گے اور باپ کے خوابوں کی تعبیریں بن جائیں گے۔

البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ادب اور ادیب کی اس جانشینی اور "نقوش" کی پاسبانی کو بہت سے لوگ شغلِ بیکاراں قرار دیں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو علامہ اقبال کے پیغام کے برعکس زندگی کو "پیمانۂ امروز و فردا" ہی سے ناپیں گے۔ ہر بات سُود و زیاں کے حوالے سے کریں گے۔ اخوت، محبت، درد مندی، غم گساری، شرافت و انسانیت اور دوسرے جذباتی رشتوں کو بالائے طاق رکھ کر عقلِ عیاری ہی کو اپنا رہنما بنائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو یہ بھی نہیں جانتے کہ جو محسوس نہیں کر سکتا وُہ دیکھ بھی نہیں سکتا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے یاد رکھیے کہ ادب اور ادیب کی دنیا، اُس حیوانی سطح سے بہت بلند اور بہت مختلف ہوتی ہے جس میں جسم پروری ہی کو سب کچھ خیال جانا ہے۔ ادیب صرف عقل و جسم کی سطح پر نہیں احساس اور جذبے کی سطح پر بھی جینے پر اصرار کرتا ہے اور اِسی طرزِ احساس کو اصل زندگی جانتا ہے۔ اس کا یقین ہے کہ ادب اساسی طور پر علم و فکر کے پشتارے سے نہیں جذبات کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ حکمت و دانش کی یورش سے نہیں جذبوں کے ارتعاش سے وجود میں آتا ہے۔

غالب کے لفظوں میں

مجھے ارتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی
ہوسِ غزل سرائی تپشِ فسانہ خوانی

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب
کریں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

"خوانِ گفتگو" پر دل وجان کی میہمانی کا استعارہ دراصل ارتعاشِ جذبات کو حرف وصوت سے ہم آہنگ کرنے کا اشارہ ہے۔ جذبے اور حرف وصوت کا ہم آہنگ ہونا ایک لطیف اظہاری اسلوب کو جنم دیتا ہے۔ یہ اسلوب ایک طرف خود اپنے وجود کے لازوال ہونے کی ضمانت دیتا ہے دوسری طرف حیوانِ ناطق کو حیوانی اور جبلی سطحوں سے بلند کرکے روحانیت اور انسانیت کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ اسی منصب پر پہنچ کر انسان کی زندگی اصل کی نقل یا نقل کی نقل نہیں رہتی، بلکہ اصل کو اس کی جملہ صداقتوں اور کج ادائیوں کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔ تبھی تو ارتعاشِ جذبات سے عاری صاحبانِ علم وفکر کے لیے گلاب کا پھول صرف ایک قسم کا پھول ہے لیکن احساس اور جذبے کی سطح پر جینے والوں کے لیے، گلاب صرف ایک پھول نہیں اور بھی بہت کچھ ہے اگر ایسا ہوتا تو اس طرح کی باتیں نہ کہی جاتیں کہ "اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری"۔

یہی وہ جذباتی صداقتیں اور آرزومندیاں ہیں جو اہلِ دل کے نزدیک منطقی خواہشوں اور صداقتوں سے زیادہ حیات افروز و کارکشا ہیں۔ یہ وہ سچائیاں ہیں جو زندگی کے ہر مرحلے میں انسان کی دستگیری کرتی ہیں۔ علم وفضل اور فکر ودانش کے قافلے کو آگے بڑھاتی ہیں، ذہنِ انسانی کی ایجادات واختراعات کا وسیلہ بنتی ہیں۔ ایمان، عقیدہ، نظریہ، اخوت، محنت، انسانیت، تہذیب، تمدن، شائستگی، سچائی، دردمندی اور غم گساری کی جملہ حیات آفریں اقدار، انہی جذباتی صداقتوں کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہیں۔ یہی صداقتیں ہیں جو ایک محبِ وطن شہری کو ملک وملت کے تحفظ کے لیے سینہ سپر رکھتی ہیں۔ ایک سپاہی کو جامِ شہادت نوش کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ قوموں کا عروج وزوال انہی صداقتوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ جس وقت تک یہ صداقتیں کسی قوم میں زندہ رہتی ہیں اسی وقت تک وہ قوم بھی ممتاز وفعال رہتی ہے۔ ان صداقتوں کی وحدت ومرکزیت کا نام دل ہے۔ دل کا مرجانا عملاً آدمی کا مرجانا اور آدمی کے وجود کا ختم ہوجانا ہے۔ خواجہ میر درد نے اسی لیے کہا ہے کہ

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اور علامہ اقبال نے اسی بنیاد پر تلقین فرمائی ہے کہ

دلِ مُردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اس لیے جاوید میاں! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ادب اور ادبی کاوشیں کارِ بیکاراں نہیں ہے۔ یہ انسان اور انسانیت کے سر پر امن وآشتی کی چادر ہے۔ ثقافتی زندگی کا جگمگاتا نشان اور شائستگیِ قلب وذہن کی پہچان ہے۔

اس پہچان اور نشان کو گُم نہ ہونے دینا۔ ادب جیسا رُوح پرور اور عالمگیر وسیلۂ حیات' آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔ یہ وسیلہ، انسان کو ہر قسم کی تنگ نظری و تعصب سے نجات دلاتا ہے، رنگ و نسل اور مذہب و قومیت کے دائروں سے نکال کر وسیع تر انسانی دائرے میں لے جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو علامہ اقبال جیسا شاعر جس کا یقین و پیغام یہ ہو کہ

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بُولہبی ست

وہ، کرشن جی، تُلسی داس، گرو نانک، گوئٹے، شیکسپیئر، برگساں اور قرۃ العین طاہرہ کی توصیف میں رطب اللسان نہ ہوتا۔

ادب کی اسی معنوی وسعت و بلند قامتی سے قطع نظر، اس وقت دنیا میں جتنے اسالیب اظہار کارفرما ہیں ان میں ادب واحد اسلوبِ اظہار ہے جو لطیف سے لطیف اور کثیف سے کثیف خیالات و جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کر سکتا ہے۔ ہزاروں باتیں جو ہنوز ناگفتہ ہیں اور جو محض فسادِ خلق کے خوف سے آدمی کسی اور طرح نہیں کہہ سکتا ادب کی معرفت کہی جا سکتی ہیں۔ ادب، کنایات و استعارات کی مدد سے سماج دشمن عناصر اور جابر حاکموں پر ضرب لگاتا رہتا ہے۔ مضروب تلملاتے رہتے ہیں۔ لیکن الفاظ کے تہ بہ تہ معنے کے سبب سچے اہلِ ادب کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ خود "نقوش" کے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ اس پر پابندیاں لگائی گئی ہیں، کاپیاں ضبط کی گئی ہیں اور پریس کو ضبط کرنے کی دھمکی دی گئی ہے، لیکن "نقوش" بطرزِ خورشید جیتا رہا ہے، اُدھر ڈوبتا اِدھر نکلتا رہا ہے۔

جاوید میاں! قلم کو صرف لکڑی یا لوہے کا ایک ٹکڑا سمجھنا غلطی ہوگی۔ یہ ایک ادیب کا سب سے قیمتی اور دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور ہتھیار ہے۔ اسے ہاتھ میں لیے رہنا، اسی ہتھیار سے ہر بدی، ہر ظلم، ہر بدصُورتی، ہر زیادتی، ہر سماجی ناانصافی اور معاشرتی ناہمواری کے خلاف آواز بلند کرتے رہنا۔ ہاتھ کو قلم ہی کیوں نہ بنانا پڑے جنوں کی حکایاتِ خُوں چکاں لکھتے رہنا۔ باپ کے بلند کیے ہوئے نشانِ امتیاز کو جُھکنے نہ دینا۔ حالات کتنے ہی ناسازگار کیوں نہ ہو جائیں باپ کے روشن کیے ہوئے نقوش کو مدھم نہ ہونے دینا، اُنھیں روشن تر بناتے رہنا۔ ایسا کرنے سے باپ کی رُوح خوش ہوگی اور خود بھی اَمر ہو جاؤ گے۔ موت آئے گی لیکن مار نہ سکے گی، خالی ہاتھ جائے گی، پھر بھی کوئی ڈرائے دھمکائے تو خوف زدہ نہ ہونا۔ نقوش کے مدیرِ اوّل احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر سنا کر آگے بڑھ جانا کہ:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

نقوش کا طفیل نمبر

اشفاق احمد

زندگی کی اس طویل مدت میں طفیل صاحب کے ساتھ کوئی اڑتیس برس کا یارانہ رہا لیکن اس کے اولین حصے میں، یعنی پہلی دہائی کے آخری سالوں میں (یا اس سے بھی قدرے بعد) پورے تین برس تک ان سے کچھ خفگی رہی، خفگی کیا اچھی خاصی ناراضگی رہی۔ اچھی خاصی ناراضگی ان معنوں میں کہ ان کے ساتھ سلسلۂ کلام بند رہا۔ اس عرصہ میں کچھ رقعہ بازی البتہ ہوئی لیکن اُن کا مضمون بھی واحد تھا کہ مہربانی فرما کر مجھے خط نہ لکھا کریں اور اس خط وکتابت کو طول نہ دیں۔ میں نے تو اس پر سختی سے عمل کیا لیکن طفیل صاحب خطوط نویسی سے باز نہ آتے اور ہر بات کی باقاعدہ اطلاع دیتے رہے۔ اس دورانیے کا سب سے مشکل وقت وہ ہوتا تھا جب گرمیوں میں ان کی آم پارٹی کا دعوت نامہ آتا تھا اور مجھے اس میں شرکت کرنا پڑتی تھی۔ میں ان سے بات نہیں کرتا تھا صرف آم کھاتا تھا وہ بھی مجھ سے بات نہیں کرتے تھے صرف کاٹ کاٹ کے آگے رکھے جاتے تھے۔ میں چونکہ اُن متکبر لوگوں میں سے ہوں جو اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا کرتے اس لیے میں نے تجدیدِ کلام میں پہل نہ کی۔ وہ چونکہ ماننے والے لوگوں میں سے تھے اس لیے ایک روز میرے گھر آکر سارا قصور اپنے ذمّے ڈال کر مجھے منا کر چلے گئے۔ میں چونکہ ظالموں میں سے ہوں اس لیے آخر دم تک قصوروار انہی کو گردانتا رہا۔ اپنی طرف سے معافی مانگنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی اور وہ ہمیشہ کے لیے سلسلۂ کلام بند کر کے چلے گئے۔ اب جو نقوش کا طفیل نمبر نکلا ہے تو خیال آتا ہے کہ ہمارے درمیان میں سے کتنا بڑا آدمی چپ چاپ آگے چلا گیا۔ یہ چپ چاپ آگے چلے جانا طفیل کے مزاج کا بنیادی خاصا تھا۔ وہ زندگی میں بھی جب سب لوگوں سے آگے نکلا ہے تو اسی طرح خاموشی سے اور نرم مزاجی سے آگے نکلا ہے۔ ڈھول بجا کر اور چھنج ڈال کر اور لُڈی گا کر آگے نہیں نکلا، ساتھ ساتھ رہتے ہوئے ہی ہم سب سے زیادہ کامیاب ہو گیا اور ہم میں سے کسی پر بھی بوجھ نہ پڑا۔ دراصل ترقی اور کامیابی محمد طفیل کا وہ لباس تھی جسے وہ پہن کر ہی سو جاتا رہا۔ اس کی استری ٹوٹتی رہی اور اس پر شکنوں اور سلوٹوں کے اتنے گہرے نشان پڑتے رہے کہ حلقہ یاراں میں ہم سب اس کے مقابلے میں زیادہ کلف یافتہ رہے۔ اگر آپ نے کبھی میجر کے بیٹ مین کو صاحب کی وردی سائیکل پر لاتے دیکھا ہو تو آپ پر یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو سکتی ہے کہ بیٹ مین کا بایاں ہاتھ سائیکل کے ہینڈل پر ہوتا ہے دائیں ہاتھ میں ہینگر کا سوالیہ نشان پکڑا ہوتا ہے۔ ہینگر پر کلف شدہ وردی ہوتی ہے۔ وردی سر سے بلند، بلکہ سارے ٹریفک سے بلند ہوتی ہے۔ پہننی میجر صاحب کو ہوتی ہے لیکن

سینہ بیٹ مین کا اکڑا ہُوا ہوتا ہے آدھا پیڈل مارتا ہے اور پُورے پیڈل والوں کا رستہ کاٹ کے BEE LINE بناتا ہُوا آگے نکل جاتا ہے ——— اعزاز سارا طفیل کا اپنا ہوتا تھا لیکن عزت ہمیں عطا کئے جاتا تھا۔ کام وُہ کرتا تھا نام ہمارا چاہتا تھا۔ میں نے اُس جیسا عجیب وغریب آدمی آج تک نہیں دیکھا، پڑھا ضرور ہے۔ لیکن پڑھے ہُوئے میں اور ملے ہُوئے میں بڑا فرق ہے۔

ہمّت اور کوشش اپنی جگہ، جدّوجہد اور سعی کا اپنا ایک مقام۔ لیکن یہ کامیابی کے ضروری عنصر نہیں ہیں۔ اس دنیا کے کروڑہا انسان السر کروا کے بھی کامیاب نہیں ہوسکے۔ اس وقت زندہ میں ایک چھوڑ دو دو تین تین السر لیے ہوتے ہیں لیکن کامیابی ان سے ابھی تک کوسوں دُور ہے ——— جس طرح ایک اعلیٰ درجے کی منظم بیوی کی سنبھال کے رکھی ہوئی چیز کو ڈھونڈنا مشکل ہے اسی طرح یہ راز پانا بھی بہت مشکل ہے کہ کامیابی حاصل کرنے کا فارمُولا کیا ہے، بس جیسے اللہ دے ——— اس معاملے میں طفیل مرحوم بہت ہی خوش نصیب تھے اور اس عطا کو اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔ کہتے تھے مَیں کوشش، محنت، جدّوجہد، مشقت بالکل نہیں کرتا بس ہمّت نہیں ہارتا ——— میں نے پُوچھا وُہ کیوں؟ کہنے لگا ہمّت چھوڑ دینے سے رُوح پر جُھریاں پڑ جاتی ہیں، مجھے چہرے کی جُھریاں قبول ہیں لیکن روح کی جُھریاں میری برداشت سے باہر کی چیز ہیں۔

چند برس پہلے مَیں ایک بزرگ سے ملنے جُواسیدن شاہ گیا تو پتا چلا کہ اس وقت شاہ صاحب اپنے مقبرے میں ہوں گے۔ میں چونکا تو انہوں نے بتایا کہ شاہ صاحب نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی میں ہی بنا لیا ہے اور اب اپنی قبر میں اتر کر صبح و شام تلاوت کیا کرتے ہیں۔ اپنی زندگی میں اپنی لحد کے اندر اتر کر اپنے مستقبل کا راستہ طے کرنا بڑے مضبوط لوگوں کا کام ہے۔ ان کو اپنے انجام کا علم تو ہوتا ہی ہے، انجام کے انجام کی آگہی وہ خود استوار کر لیتے ہیں ——— نقوش کا طفیل نمبر ہم نے طفیل کی غیر موجودگی میں تیار کیا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہونے کے باوصف وُہ کچھ نہیں ہے جو نمبروں والے محمد طفیل کے نمبروں میں ہُوا کرتا تھا۔ اگر کہیں محمد طفیل کو اپنی زندگی میں طفیل نمبر نکالنے کا خیال آجاتا اور وہ حقیقت کی لحد میں اُتر کر تلاوتِ وجود کی جزئیات ضرور بہم کرتے۔ پھر وُہ صحیفہ اردو ادب میں حق سچ اور خود احتسابی کا پہلا جزو ہوتا جس پر آیندہ آپ بیتیوں، خود نوشت سوانحوں اور MEMORIES کی مضبوط بنیاد استوار ہوتی ——— لیکن خیر یہ بھی اچھا ہے کہ ہم نے نکالا ہے اور اُس شخص کے حوالے سے ہے جس نے نمبروں کو ایک نئی فہم، ایک نئی شخصیت، پُورا وجدان اور TOTAL GEOTALT عطا کیا۔

شکریہ!

ہوٹل ہلٹن لاہور میں نقوش محمد طفیل نمبر کی تقریب منعقدہ ۶ جولائی ۱۹۸۷ء میں پڑھا گیا۔

بہ یادِ مرحوم

رشید حسن خاں

طفیل صاحب اور رسالہ 'نقوش'، ایک ہی وجود کی دو جہتیں ہیں۔ ایک کا نام لیا جائے تو دوسرے کی یاد خود بہ خود آ جائے گی۔ اِن دونوں کے سلسلے میں کہنے کے لیے ضروری باتیں تو بہت سی ہیں، مگر اِس جلسۂ یادگار میں تفصیل کی گنجائش نہیں، یوُں بہت اختصار کے ساتھ صرف ایک بات عرض کی جائے گی۔

'نقوش' کے پچھلے شماروں میں مختلف موضوعات سے متعلق اعلا درجے کے مضامین شائع ہوُئے ہیں اور تخلیقات چھپی ہیں۔ ان کو پڑھ کر، اِن میں سے ہر ایک موضوع سے تعلق رکھنے والا شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مرحوم کو اِس موضوع سے سب سے زیادہ دلچسپی تھی۔ بہ ظاہر یہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص کو اِس قدر ہمہ جہت قرار دیا جائے، مگر ہے یہ واقعہ۔ مجھے ادبی تحقیق اور تدوین سے تعلقِ خاطر ہے تو مَیں یہ کہتا ہُوں کہ طفیل صاحب اِن دونوں موضوعات کو شاید سب سے زیادہ اہمیّت دیتے تھے۔ اصطلاحی معنوں میں طفیل صاحب نہ تحقیق کے آدمی تھے اور نہ تدوین کے، مگر شروع سے آخر تک اُنھوں نے 'نقوش' میں جیسے معیاری تحقیقی مقالات شائع کئے، اُن کو پڑھ کر قدرتی طور پر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ مرحوم کو اِن موضوعات کی اہمیّت کا خاص طور پر اندازہ تھا، جبھی تو اُنھوں نے اپنے زمانے کے لائق ترین اہلِ علم سے اِن موضوعات پر تحریریں حاصل کیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہاں، یعنی پاکستان میں طریقِ کار کیا ہے، میں ہندستان کے متعلّق عرض کروں کہ ہمارے یہاں پی ایچ ڈی میں داخلے سے پہلے دو سال کا ایک خاص نصاب مکمل کرنا ہوتا ہے جسے اِم فِل کہتے ہیں۔ اِس میں اصولِ تحقیق اور اصولِ تدوین باضابطہ پڑھائے جاتے ہیں۔ اس نصاب میں کام آنے والی کتابیں کم اور بہت کم ہیں۔ اچھے طالب علم اِدھر اُدھر سے مختلف مقالات بھی جمع کرتے رہتے ہیں، تب کام چل پاتا ہے۔ میں آپ سے عرض کروں کہ اِس سلسلے میں 'نقوش' میں شائع شدہ کئی مقالے ایسے ہیں جن کو وہ خاص طور پر تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر غلام مصطفا خاں کا مقالہ جو "فنِ تحقیق" کے عنوان سے 'نقوش' کے شمارہ ۱۰۴ میں چھپا تھا یا مثلاً ڈاکٹر نذیر احمد کا مقالہ "تحقیق و تصحیحِ متن کے مسائل" جو شمارہ ۹۷ میں شائع ہوا تھا (وغیرہ) اس رسالے کے شمارے بہتوں کے پاس ہیں، مگر سب کے پاس نہیں اور کم لوگ ایسے ہیں جن کے پاس سب شمارے محفوظ ہوں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ طالب علم ایسے مقالات کے لیے اِن شماروں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں، کبھی مل جاتے ہیں کبھی نہیں ملتے۔ اِس سلسلے میں ایک توجّہ کے قابل بات یہ بھی ہے کہ ایسے لکھنے والوں کے مقالے بھی اِن شماروں میں

محفوظ ہیں جن کے مجموعۂ مضامین اب تک نہیں چھپے ہیں اور مستقبل قریب میں چھپنے کی امید بھی نظر نہیں آتی۔ میں مثال کے طور پر قاضی عبدالودود مرحوم کا نام لُوں گا۔ قاضی صاحب تو ہمارے زمانے میں تحقیق کی نسبت سے استاذ الاساتذہ کا منصب رکھتے تھے، اُن کے متعدد مقالے 'نقوش' میں چھپے ہیں۔ میں ایسے صرف ایک مقالے کی نشان دہی کروں گا۔ شمارہ ۶۹-۷۰ میں "متفرقات" کے عنوان سے اُن کا ایک نہایت درجہ معلوماتی مقالہ شائع ہوا تھا۔ یا جیسے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا ایک مضمون جو تدوینِ کلامِ غالب کی ایک بحث کے سلسلے میں شمارہ ۱۰۱ میں شامل ہے یا جیسے نجم الاسلام صاحب کا ایک مفصل مقالہ بیاضِ مرزا جان طپش سے متعلق جو شمارہ ۱۰۸ میں چھپا تھا۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے مضامین جو کتابی صورت میں اب تک نہیں آسکے ہیں، مگر جو ہمارے طلبہ کے لیے بے حد مفید ہیں اور ازبس ضروری ہیں۔

وہ سب لوگ جو ادبی تحقیق سے متعلق ہیں اور وہ سب طالبِ علم جو تحقیق و تدوین کے مسائل کو نصابی طور پر پڑھتے ہیں، یہ سب لوگ محمد طفیل مرحوم کا احسان مانتے ہیں کہ اتنے اور ایسے اعلا درجے کے مقالات اُنھوں نے اپنے رسالے میں محفوظ کردئے ہیں جو ہمیشہ ان کے کام آتے رہیں گے اور تحقیقی بحثوں میں جن کے حوالے دئے جاتے رہیں گے۔

حضرات! یہ کوئی معمولی کام نہیں۔ ہر اڈیٹر اِس قدر اہم تحریروں کو یکجا نہیں کرسکتا جب تک کہ اُس کو اِن کی اہمیت کا اندازہ نہ ہو اور وہ ان کا قدر شناس اور ذائقہ شناس نہ ہو۔ ہمارے بڑے لکھنے والے، جو عموماً اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور آسانی سے کسی کا کہنا نہیں مانتے، وُہ اِس شخص کا اِس قدر لحاظ کرتے ہوں کہ اُس کی بات کو ٹال نہ سکیں یہ شرف کم اور بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

یہ جو دو تین حوالے ابھی میں نے دئے ہیں بعض مقالات کے، یہ محض بطورِ مثال ہیں۔ ایسے مقالات کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ 'نقوش' کی فائلوں میں بند ایسے سب مقالوں کو ایک خاص نمبر کی صورت میں شائع کردیا جائے۔ اِس سے بہت فائدہ پہنچے گا تحقیق اور تدوین کے اُن طلبہ کو، جنھیں ایسی تحریریں جمع کرنے کے سلسلے میں سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وُہ لوگ بھی اِس سے استفادہ کرسکیں گے جو اِن مباحث سے دلچسپی رکھتے ہیں، مگر جن کی دسترس سے یہ سارا مواد باہر ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب سے اچھا ہدیۂ عقیدت ہوگا جو مرحوم کی رُوح کو پیش کیا جاسکے گا۔ یہ مجموعہ خیرِ جاری کی صورت میں اُن کی یاد دلاتا رہے گا مگر سب سے زیادہ ہمارے اِم فِل کے طالب علم آپ کے شکرگزار ہوں گے اور مرحوم کو ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے۔

میں تحقیق کے ایک معمولی طالبِ علم کی حیثیت سے طفیل صاحب کی رُوح کے سامنے خراجِ عقیدت پیش کرتا ہُوں کہ مَیں نے برسوں تک اِس رسالے کے تحقیقی مضامین سے استفادہ کیا ہے، اِن میں ادبی تحقیق اور لسانی تحقیق، دونوں سے متعلق تحریریں شامل ہیں اور ہر بار اِس رسالے کے باکمال اڈیٹر کو دُعائیں دی ہیں جس نے ہم جیسے لوگوں کے لیے ایسے گراں قدر مقالات حاصل کئے اور شائع کئے۔

ہلٹن ہوٹل لاہور میں نقوش "طفیل نمبر" کی تقریب منعقدہ ۹؍جولائی ۱۹۸۷ء میں پڑھا گیا۔

خطبۂ استقبالیہ

جاوید طفیل

محترم المقام صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاءُ الحق صاحب ،
گورنر پنجاب مخدوم سجاد حسین قریشی صاحب ،
اور معزّز خواتین و حضرات !

سب سے پہلے مجھ پر واجب ہے کہ میں صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاءُ الحق صاحب کا شکریہ ادا کروں جو اپنی مصروفیات کے باوجود جناب محمد طفیل مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر تشریف لائے۔ آپ کی اس کرم فرمائی کے لیے میں ذاتی طور پر ممنون ہوں۔

اِس موقع پر جب کہ ہم محمد طفیل مرحوم کی اردو ادب کے لیے خدمات پر اُن کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اکٹھے ہُوئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی خدمات کا ایک مختصر سا جائزہ بھی لیں۔

پاکستان بننے کے چند ماہ بعد مارچ ۱۹۴۸ء میں 'نقوش' کا اجرا لاہور سے ہُوا۔ نقوش کی کارگزاری کا جائزہ لینے کے لیے ہم اِس کو چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلے تین ادوار کا ذکر والدِ محترم کی تحریر کے مطابق کچھ یوں ہے :

"ادب کی براتیں اِس سے پہلے بھی چڑھی ہیں اور بڑے دُھوم دھڑکوں کے ساتھ چڑھی ہیں۔ ماضی کی یادوں میں گُم ہو جایئے گا تو شہنائیوں کی آوازیں آج بھی سنائی دیں گی۔

اور لاڈلوں کی طرح 'نقوش' بھی اِس دُنیا میں آیا۔ پہلے اِس کی پرورش کے فرائض میرے بڑے بھائی احمد ندیم قاسمی اور چھوٹی بہن ہاجرہ مسرور کے سپرد ہُوئے۔ سیانے کہتے ہیں بچپن کی تربیت ہی مستقبل کی نشان دہی کرتی ہے۔

پھر 'نقوش' میرے سب سے بڑے بھائی سیّد وقار عظیم کی آغوش میں پلتا رہا۔ کسر کسی نے بھی اٹھا نہ رکھی۔ سب ہی نے لاڈ پیار سے رکھا۔ ابھی 'نقوش' تین ماہ ہی کا ہُوا تھا کہ سخت بیمار ہو گیا۔ اصل بات یہ تھی کہ شرارتی بچوں کو اِس کی پھبن بھاتی نہ تھی۔ انھوں نے ایسی چال چلی کہ یہ بے چارہ چھ ماہ تک بے سدھ پڑا رہا۔

ہوٹل ہلٹن لاہور میں نقوش محمد طفیل نمبر کی تقریب منعقدہ ۶ جولائی ۱۹۸۷ء میں پڑھا گیا۔

> جب 'نقوش' ہمکنے اور ٹُوں ٹاں کرنے لگا تو اِس کی پرورش میرے سپرد ہُوئی ۔ ہماری سمیت اُس وقت اس کی عمر اڑھائی برس ہوگی ۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی ۔ میری راتوں کی نیند اُچٹ گئی ۔ میں سوچتا تھا اتنا خوب صُورت اور ہونہار بچّہ ۔ اگر میری نگرانی میں پنپ نہ سکا تو کتنی جگ ہنسائی ہوگی ۔ میں تو لاجوں مرتا رہا ۔
>
> میرے مالی حالات بھی زیادہ اچھے نہ تھے مگر میں یہ چاہتا تھا اسے ولایت تک بھیجوں حوصلے اتنے ، وسائل محدود ، اللہ کی بارگاہ میں دن رات دُعائیں مانگیں ۔ پھر تو کرنا خدا کا یہ ہُوا نقوش نے اپنے پرائے کا مَن موہ لیا ۔ وہاں سے یہاں تک پہنچنے کے لیے اتنی محنت کی اور اتنے خلوص سے کی کہ اس نے ایک سال میں دو دو تین تین امتحان دینے شروع کر دیے اور اللہ کی مہربانی سے اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا ۔ اس کے کیے ہوئے پرچے آج پاکستان اور ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں رکھ کر دیکھ لیں اِس شان سے کوئی بھی پاس نہ ہوا ہوگا ۔
>
> ماشاء اللہ نقوش اب جوانی میں قدم رکھ رہا ہے ۔ کوئی اِس کا بانکپن تو دیکھے ۔ ڈرتا ہوں کہیں اسے میری ہی نظر نہ لگ جائے ۔
>
> واللہ آپ میری باتوں پر یقین نہ کریں اسے میری نظروں سے نہ دیکھیں میں تو دیوانہ ہُوں ، دیوانہ نہ ہوتا تو آج نقوش کو یہ مرتبہ نصیب نہ ہوتا ۔ مگر مجھے اتنا ہوش ضرور ہے آج میرے لاڈلے کی بارات چڑھی ہے ۔"

اگر مَیں اپنی زبان سے نقوش کے اِس دَور پر کچھ کہنے کی جسارت کروں تو ہو سکتا ہے اِس کو خود نمائی یا خود ستائشی کے زمرے میں لایا جائے ، اِس لیے نقوش کے کاموں کو مختلف موقعوں پر جس طرح اِس ملک کے بہت ہی قابلِ ذکر لوگوں نے سراہا اُن میں سے چند ایک کا ہی ذکر کروں گا ۔

اِس موضوع کا آغاز مَیں صدرِ پاکستان جناب جنرل محمد ضیاءُ الحق سے کرتا ہُوں ، اُن کا کہنا یہ ہے :

> "میرے اپنے نقطۂ نگاہ سے نقوش ایک وزنی پرچہ ہے جس سے قلی سے لے کر قاری تک سبھی متاثر ہوتے ہیں ۔ قلی اور اُس کی برادری سے تعلق رکھنے والے عموماً نقوش کی عظمت کا اندازہ اِس کے حجم سے کرتے ہیں جبکہ پڑھے لکھے لوگ اِس کی معنوی عظمت کی داد دیتے ہیں ۔ میں نقوش کو ایک اعلیٰ پایہ کا عظیم ادبی پرچہ سمجھتا ہُوں جس کی نظیر مجھے پاکستان یا اس کے باہر نہیں ملتی ۔ اِس پرچے کی اپنے قارئین پر گرفت اتنی مضبوط ہے کہ جو کوئی ایک بار اِس کا اسیر ہوا اُس نے کبھی اس کی گرفت سے نجات نہیں پائی ۔ میں گزشتہ تیس سال سے خود

اِس کا اسیر ہُوں۔ نقوش کے زیادہ تر نمبر میرے پاس محفوظ ہیں، کچھ بعض حضرات لے کر غائب ہوگئے ہیں۔ لیکن اس سے یہ چیز ضرور نظر آئی کہ وہ نقوش کے شیدائی ہیں اور جو کوئی نقوش کا کوئی نمبر ادھار مانگ کر یا چوری کر کے لے جائے، میرے خیال میں اس پر چوری کی حد واجب نہیں ہوتی۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے نقوش کے شخصیات نمبر پر کچھ یُوں تبصرہ کیا:

"نقوش شخصیات نمبر یہ پوٹ کی پوٹ، اکٹھے سات سو صفحات، خدا کی پناہ! اسے رسالہ کون مسخرہ کہتا ہے، یہ تو ابوالرسائل ہے۔ اِس پر اظہارِ رائے آسان نہیں۔ اتنی ساری شخصیتیں اور لکھنے والوں کی شخصیتیں اور اُن پر مقالے، ایک طومار ہے۔ یہ نمبر دراصل قاموس شخصیات ہے جو مدتوں یادگار رہے گا، اور لوگ حوالے اور استناد کے لیے اسے ڈھونڈا کریں گے۔ آپ کا ہر نمبر کسی خاص موضوع پر ہوتا ہے اور یہ آپ کا کمال ہے کہ ہر موضوع پر اچھے اچھے لکھنے والے آپ کو مل جاتے ہیں، مگر تازہ شخصیات نمبر سب پر بازی لے گیا ہے۔ اب صرف ایک ہی شخصیت رہ گئی ہے جو عجیب وغریب ہے۔ اِس کا لکھنے والا ایک نہیں ہو سکتا، کئی ہوں گے۔ عجب نہیں کسی روز پُورا نمبر آپ ہی کی شخصیت پر نکلے۔"

پطرس بخاری نے نقوش کے بارے میں کہا:

"طفیل صاحب کا ہر پرچہ ایک خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر خاص خاص موقعوں پر شائع ہوتے ہیں۔"

جناب ابو الاثر حفیظ جالندھری نے جنابِ محمد طفیل کو یُوں خراجِ عقیدت پیش کیا:

"میں داد دیتا ہُوں جنابِ طفیل کو، کہ یہ لڑکا سا ہمارے سامنے آیا تھا، پتلا، دُبلا، چھریرا۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی جالندھر کا ہے۔ کیونکہ ایسے ہی ہوتے ہیں جو کچھ کام کرتے ہیں۔ مار بھی کھاتے ہیں مگر کام کرتے ہیں۔ سیالکوٹ سے تو ایک ہی آیا اور اس نے ایسی ضرب لگائی کہ ہم سب سر سہلاتے رہ گئے۔ باقی یو۔ پی سے بہت استاد آئے وہ ہم سب کے استاد ہیں۔ یہ ہم دل سے مانتے ہیں۔ طفیل چاہے تو ہم سے عالمِ نزع میں بھی مضمون لکھوا لے۔"

ایک دوسرے موقع پر کہا:

"میں نے انگریزی بھی پڑھی ہے، ہندی بھی پڑھی ہے، فارسی بھی پڑھی ہے، عربی سے بھی واقف ہُوں، اردو کو بھی کھنگالا ہے، اس لیے اعتماد سے کہتا ہُوں کہ دنیا میں اور میرے تصوّر میں کوئی ایسا مدیر، صحافی اور نقاد نہیں آیا جس نے طفیل صاحب جتنی مشقت اختیار کی ہو۔"

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے مجلاتی صحافت میں "نقوش کا مقام" کے عنوان سے یہ تحریر کیا:

"مجلاتی صحافت میں "نقوش" کے مقام کا تعین کرنے کے لیے ہمیں اِس کا مطالعہ عوام پسند

رسائل کی روشنی میں نہیں، خواص پسند رسائل کی روشنی میں کرنا ہوگا۔ ایسے رسائل کے لیے دنیا میں مختلف اصطلاحات رائج ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں اِن رسائل کے لیے ” کوالٹی میگزین “ کی اصطلاح رائج ہے اور اشتراکی دنیا میں ” کلچرل میگزین “ کی۔ بعض مغربی ممالک میں انھیں HIGH BROW ہائی برو میگزین بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ جاننے والے لوگ جانتے ہیں کہ کون سے رسالے عوام پسند ہیں کون سے خواص پسند۔ کون سے کم و بیش تفریحی مواد پیش کرتے ہیں اور کون سے خیال افروز تحریریں مہیا کرتے ہیں۔

میرے نزدیک ” نقوش “ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جو کام پہلے اِکّا دُکّا رسالہ کبھی کبھی اور نامکمل اور غیر جامع انداز میں کرتا تھا۔ وہ اِس نے بڑے پیمانے پر ایک منظم انداز میں اور جامعیّت کے تمام تقاضوں کے ساتھ کر کے مجلّاتی صحافت کو ایک انسائیکلوپیڈیائی رنگ بخش دیا۔

نقوش کا ہر نمبر اپنے اپنے موضوع پر انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے اِن میں ضخامت کو محدود کرنے کی کوئی شعوری کوشش کی جاتی تو اِن کی جامعیّت میں فرق آجاتا۔ ضخامت اور مواد کے اعتبار سے یہ مستقل تصانیف اور تالیفات کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ جو کام نقوش نے کر دکھایا ہے وہ معجزے سے کم نہیں۔ کتاب ” انسائیکلو پیڈیا اور مجلّے کو ایک جگہ سمو کر اور اسے حُسن بخش کر ” نقوش “ نے مجلّاتی صحافت کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور ثابت کر دکھایا ہے کہ کام کرنے کی نیّت ہو، خلوص اور لگن ہو تو جو کام بڑے بڑے ادارے نہیں کر سکتے وہ فردِ واحد سرانجام دے سکتا ہے۔ “

ہمارے عہد کے بڑوں نے ” نقوش “ کے بارے میں کیا کہا، یہ آپ نے سُنا۔ میرا احساس یہ ہے کہ نقوش کے تیسرے دَور میں اردو ادب کے ہر اہم موضوع پر بہت ہی نمایاں کام ہُوا۔ اِس دَور میں ’نقوش‘ نے جن موضوعات پر فکر انگیز کام کیا اور نقوش کے خاص نمبر چھاپے وُہ یہ ہیں :

افسانہ، غزل، شخصیات، منٹو، مکاتیب، طنز و مزاح، پطرس، ادب عالیہ، لاہور، شوکت تھانوی، آپ بیتی، جنگ ۱۹۶۵ء، خطوط، غالب، اقبال، میر تقی میر، عصری ادب، ادبی معرکے اور میر انیس۔

اِن میں سے بعض موضوعات پر بعض ایسی نادر تحریریں محفوظ ہُوئیں جو اردو ادب کی جان قرار دی جا سکتی ہیں۔

کئی تحریریں نقوش کے ذریعے دنیا میں پہلی دفعہ منظرِ عام پر آئیں جن میں غالب، میر تقی میر اور میر انیس ایسے اکابرین کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ اردو ادب سے شغف رکھنے والے کسی بھی ریسرچ سکالر کے لیے نقوش کے

اِن اہم نمبروں کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

اب میں اُس کام کا ذکر کروں گا جس کے بارے میں والدِ محترم خود فرمایا کرتے تھے کہ "یہ کام میری زندگی کا حاصل ہے اور میرے کاموں کی معراج بھی، ملّتِ اسلامیہ نے بھی اِسے ناقابلِ فراموش کام قرار دیا۔" میری مراد نقوش کے رسولؐ نمبر سے ہے۔

سیرتِ رسولؐ پر کام کا ذہنی آغاز ۱۹۶۰ء میں ہُوا۔ ۱۹۶۶ء میں اِس کا سب سے پہلا اظہار غالبؔ مجھ سے کیا۔ اِس کی کتابت کا آغاز ۱۹۷۲ء میں ہوا اور تقریباً دس ہزار صفحات پر مشتمل ۱۳ جلدیں جنوری ۱۹۸۵ء تک مکمل ہُوئیں۔ اُن کے اِس کام کو لوگوں نے کس طرح دیکھا، اگر میں چند ایک کا ذکر کر دُوں تو یہ بے محل نہ ہوگا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی (دار العلوم دیوبند) فرماتے ہیں:

> "اسے نمبر کیوں کہیے یہ تو اردو زبان میں سیرتِ طیبہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔"

مولانا نعیم صدیقی نے کہا:

> "علامہ شبلی اور مولانا سُلیمان ندویؒ نے سیرت نگاری کے میدان میں ایک سنگِ میل قایم کیا تھا اب ویساہی دوسرا سنگِ میل شاید کچھ زیادہ بڑا اور اونچا ادارۂ نقوش نے قایم کیا ہے۔"

مولانا عبدالمتین ہاشمی فرماتے ہیں:

> "میرا ذاتی خیال ہے کہ سیرتِ پاک سے متعلق مواد کا ایسا گلدستہ اور مجموعہ اردو تو کیا دنیا کی کسی زبان میں نہ ملے گا۔"

خود والد مرحوم نے اِس نمبر کے بارے میں فرمایا:

> "اِس نمبر کی اشاعت میرے لیے سعادت ہے کہ جس کی تڑپ ایک عرصہ سے میرے دل میں تھی۔ میں نے اِس نمبر کے لئے بڑی محنت کی اور محنت سے زیادہ اللہ کی بارگاہ میں دعائیں مانگیں۔ جذبۂ اوّل کا ثمر محدود ہو سکتا ہے اور جذبۂ دوم کا ثمر لامحدود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں بھی کسی قابل ہُوا ہوں۔"

کسی نے کہا اہلِ وطن کے لیے کوئی پیغام! اُن کا جواب تھا:

> "مجھے اہلِ وطن سے یہ کہنا ہے کہ ابتدا سے لے کر اب تک میں نے اپنی زندگی اُن کے نام لکھ دی ہے اب وہ میرے لیے دُعا کریں کہ مجھے میرا مقصود ملے اور یہ کہ دربارِ رسالت کی آخری صف میں جو آدمی کھڑا ہو وہ محمد طفیل ہو۔"

اِس طرح نقوش کے تیسرے دَور میں جناب محمد طفیل نے اپنی ۳۵ سال اور ۶۶ دن کی ادارتی زندگی میں ۵۳۸۵۹ فکر انگیز صفحات نقوش کے ذریعے اہلِ علم تک پہنچائے، جن میں دس ہزار صفحات سب موضوعات سے اعلیٰ

موضوع سیرتِ رسولؐ پر بھی شامل ہیں ۔

۵ جولائی ۱۹۸۶ء کو والدِ محترم کی اچانک وفات پر مَیں حیران و پریشان رموزِ قدرت کو سمجھنے کی ناکام کوششیں کر رہا تھا کہ یہ بات مجھ پر عیاں ہُوئی کہ نقوش ہی تو ہمارا سب سے قیمتی اثاثہ ہے ۔ والدِ محترم کی ۳۵ سالہ ریاضت کا نتیجہ ہماری شناخت اور پہچان ، اِس طرح ناقابلِ یقین قیمت کی ادائیگی کے بعد نقوش کی ذمہ داری میری طرف منتقل ہُوئی ۔ اور نقوش کے چوتھے دَور کا آغاز ہُوا ۔

آج میں ایک ایسے شخص پر نمبر پیش کر رہا ہُوں جس نے زندگی بھر قابلِ ذکر نمبر چھاپے اور ہر موضوع کا حق ادا کیا ۔ سب کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ ایسا نمبر صرف نقوش ہی چھاپ سکتا تھا ۔ میری ذمہ داری دوہری ہے ۔ مجھ پر دو قرض واجب ہیں ، ایک اردو ادب کی اِس نمایاں شخصیت کا حق ادا کرنے کا اور دوسرا ایک کم علم بیٹے کا اپنے والد کو قابلِ ذکر انداز میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کا ۔ اِس نمبر کی اشاعت کے ساتھ ہی بابائے اردو مولوی عبدالحق کی وہ پیش گوئی بھی پُوری ہو گئی جو اُنھوں نے کوئی ایک تہائی صدی پہلے ۱۹۵۶ء میں کی تھی ۔

میں اللہ تعالیٰ کی رحمت پر شاکر ہُوں اِسی لیے ہر دم اُسی سمت میں محوِ سفر ہُوں جو سمت والدِ محترم نے متعین کی تھی ۔

سب سے اہم یا افضل کام جس کا ان شاء اللہ آغاز ۱۹۸۸ء سے ہوگا وہ نقوش کا قرآن نمبر ہے جو کم و بیش دس ہزار صفحات پر مشتمل ہوگا ۔ اِس کی تکمیل آیندہ تین چار برسوں میں ہوگی ۔ مجھے پُوری اُمید ہے کہ نقوش کا قرآن نمبر رسولؐ نمبر کی طرح بہت ہی قیمتی اور بے حد قابلِ ذکر دستاویز ثابت ہوگا ۔

آخر میں ایک بار پھر جنابِ صدرِ پاکستان ! مَیں آپ کا ، گورنرِ پنجاب اور سب خواتین و حضرات کا بہ صمیمِ قلب شکر گزار ہُوں کہ آپ " نقوش " کی اِس تقریب میں تشریف لائے اور ہمیں سرفراز اور سرخرو کیا ۔

---

(۱)

نوادرات

(۲)

مقالات

"جاگیرِ غالب" میں غالب کی قلمی تحریریں

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

غالب کی پنشن کے بارے میں بعض دستاویزات پنجاب آرکائیوز، لاہور میں محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر نے کچھ دستاویزات کی عکسی نقول اپنی کتاب "حیاتِ غالب کا ایک باب" میں شائع کی ہیں (مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۷ء)۔ کتاب کے "پیش لفظ" میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ:

> "...... اس تحقیقی کام کے دوران مجھے معلوم ہُوا کہ "جاگیرِ غالب" کے نام سے ان دستاویزات (یا ان میں سے بعض دستاویزات) کو ہندوستان میں شائع کیا جاچکا ہے۔ میں نے پاکستان میں غالبیات کے ماہرین سے رابطہ قائم کیا مگر یہ کتاب کہیں سے نہ مل سکی۔ مشہور محقق جناب رشید حسن خاں صاحب کو اس کی فراہمی کے لیے ہندوستان خط لکھا تو ان کا جواب آیا کہ "جاگیرِ غالب کے نام سے کوئی کتاب یہاں نہیں ملتی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ پرتھوی[۱] چند صاحب نے اس نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔ یہ اب سے دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ اس میں شاید کچھ دستاویزات کے عکس تھے مگر پھر کچھ ایسا جھگڑا پڑا کہ وہ کتاب منظرِ عام پر نہیں آسکی۔ شاید کچھ قانونی موشگافیاں تھیں۔ پھر نہیں معلوم کہ اس کا کیا ہُوا اور وہ ذخیرہ کہاں ہے؟ پرتھوی[۲] چند مرحوم ہو گئے۔ اُن کے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ اب میں وہاں کسی کو نہیں جانتا۔" اس خط سے معلوم ہُوا کہ اس کتاب کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کتاب میں کیا کچھ تھا۔ ممکن ہے کہ ہماری جن کاغذات تک رسائی ہُوئی اُن میں سے بعض پرتھوی[۳] راج کو بھی دستیاب نہ ہُوئے ہوں۔"

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ "جاگیرِ غالب" کتنی نادر کتاب ہے ــــ پرتھوی چندر کی نویں برسی (نومبر ۱۹۸۷ء) کے موقع پر "جاگیرِ غالب" کی شایانِ شان اشاعت یونیورسل بکس (۴۰۔ اے، اردو بازار، لاہور) کے پیشِ نظر ہے۔

"جاگیرِ غالب" پچاس سے زیادہ دستاویزات کی عکسی نقول پر مشتمل ہے۔ ان میں سے تئیس (۲۳) عرضداشتیں غالب کی ہیں۔ مقدمۂ پنشن کے سلسلے کی یہ ساری عرضیاں انگریز حکّام کے نام ہیں اور غالب نے انھیں کسی مددگار یا عرائض نویس سے انگریزی میں لکھوا کر پیش کیا ہے۔

---

[۱] و [۲] و [۳] صحیح نام: پرتھوی چندر

"جاگیرِ غالب" میں شامل غالب کی ان تئیس (۲۳) عرضیوں میں سے سات، غالب کی اصل عرضداشتوں کی مصدقہ نقول ہیں اور سولہ اصل ہیں۔ ان سولہ میں سے دو پر غالب کی صرف مُہر ہے اور بقیہ چودہ پر مہر ثبت کرتے یا دستخط کرتے ہُوئے غالب نے ایک آدھ بات اردو/فارسی میں اپنے قلم سے بڑھادی ہے جو ان کے اضطرابِ دلی کو ظاہر کرتی ہے۔ ذیل میں غالب کی ان سولہ عرضیوں کے اختتامی حصّوں سے غالب کی دستخطی تحریروں اور مُہروں کے عکس پیش کیے جا رہے ہیں :

۱

جارج سوئنٹن سیکریٹری حکومتِ ہند شعبۂ سیاسی فورٹ ولیم (کلکتہ) کے نام انگریزی حروف میں غالب کی دستخطی و مُہری عرضی مورخہ ۲۹ مارچ ۱۸۳۱ء کے آخر میں غالب نے اپنی مہر ثبت کی ہے۔ مُہر میں ان کا نام اور سنہ "محمد اسد اللہ خاں ۱۲۳۸ھ" کندہ ہُوا ہے۔ ("جاگیرِ غالب" میں غالب کی عرضیوں پر جہاں جہاں یہی مُہر لگائی گئی ہے) مُہر کے نیچے غالب نے اردو میں اپنا نام اور حوالہ وغیرہ اس طرح درج کیا ہے: "عرضداشت اسد اللہ خاں برادرزادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیردار سونک و سونسا"

عرضداشت اسد اللہ خاں برادرزادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیردار سونک و سونسا

۲

عرضداشت دستخطی و مُہری اسد اللہ خاں غالب مورخہ ۱۴۔ نومبر ۱۸۳۶ء بنام ڈبلیو۔ ایچ۔ میکناٹن سیکریٹری حکومتِ ہند فورٹ ولیم (کلکتہ) — اس انگریزی عرضداشت کے آخر میں بھی غالب کے نام کی ۱۲۳۸ھ کی مہر لگی ہوئی ہے اور اس کے نیچے ان کے قلم سے یہ عبارت اور تاریخ درج ہے، "خستہ دل، دردمند، حق طلب، دادخواہ، امیدوارِ لطف و کرم اسد اللہ، نگاشتہ چاردہم نومبر ۱۸۳۶ عیسوی"

1836.

۳

عرضداشت دستخطی و مُہری اسد اللہ خاں برادرزادہ مرحوم نصر اللہ بیگ خاں، مورخہ ۱۴ نومبر ۱۸۳۶ء (مع فہرست کاغذاتِ متعلق) بنام: لارڈ جی۔ آک لینڈ، گورنر جنرل ہند بہ کونسل، فورٹ ولیم (کلکتہ) ــــ ۱۲۳۸ھ کی مہر اور اس کے ساتھ بخطِ غالب یہ عبارت: "عرضداشت اسد اللہ خاں معروضہ چاردہم نومبر ۱۸۳۶ عیسوی"

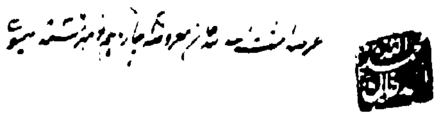

عرضداشت اسد اللہ خاں معروضہ چاردہم نومبر ۱۸۳۶ عیسوی

۴

عرضداشت دستخطی و مُہری اسد اللہ خاں، مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۸۳۶ء، بنام: ڈبلیو۔ ایچ۔ میکناٹن چیف سیکریٹری حکومت، امورِ سیاسی ــــ ۱۲۳۸ھ والی مہر اور اس کے ساتھ بخطِ غالب کچھ یہ عبارت درج ہے: عرضداشت

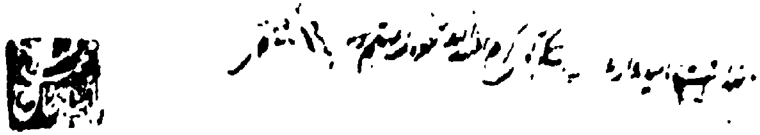

اُمیدوارِ (عنایت، سزاوارِ) کرم اسد اللہ معروضہ بستم دسمبر ۱۸۳۶ عیسوی

Accession Number
.......131406...
Date....12.4.96

۵

ڈبلیو۔ ایچ۔ میکناٹن، سیکریٹری حکومتِ ہند، فورٹ ولیم (کلکتہ) کے نام غالب کی دستخطی و مُہری عرضداشت، مورخہ یکم اپریل ۱۸۳۷ء کے زیریں حصّے میں مُہر کے نیچے بخطِ غالب چند کلمات اور تاریخ کا اندراج اس طرح ہوا ہے:

"معروض از اسد اللہ در عالمِ درماندگی و اضطراب بہ تمنائے حصول جواب مناسب باصواب فقط یکم اپریل ۱۸۳۷ء"

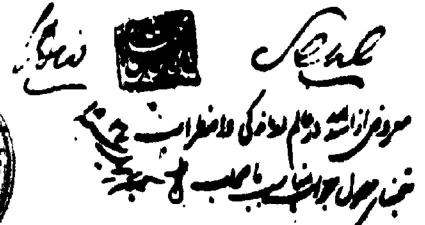

معروض از اسد اللہ در عالم درماندگی و اضطراب

بہ تمنائے حصول جواب مناسب باصواب

Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. N. Delhi

۶

سیکریٹری حکومتِ ہند فورٹ ولیم (کلکتہ) ڈبلیو۔ ایچ۔ میکناٹن کے نام غالب کی دستخطی و مُہری عرضداشت مورخہ ۹۔ اگست ۱۸۳۷ء کے آخر میں ۱۲۳۸ھ والی مہر کے ساتھ غالب کے قلم سے یہ عبارت: "حق طلب، دادخواہ اسد اللہ، فقط نہم اگست سنہ ۱۸۳۷ عیسوی"

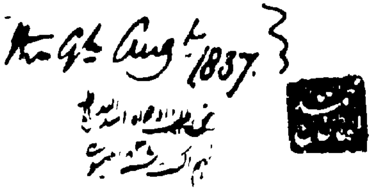

Recd 9th Aug 1837

حق طلب دادخواہ اسد اللہ

نہم اگست سنہ عیسوی

۷

لارڈ جارج آک لینڈ، گورنر جنرل ہند بہ کونسل، فورٹ ولیم (کلکتہ) کے نام غالب کی دستخطی و مہری عرضداشت، مورخہ ۹۔ اگست ۱۸۳۷ء کے آخر میں ۱۲۳۸ھ والی مہر کے اوپر بقلم غالب یہ عبارت: "عرضداشت فدوی اسد اللہ نگاشتہ نہم اگست سنہ ۱۸۳۷ عیسوی"

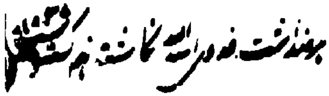

عرضداشت فدوی اسد اللہ نگاشتہ نہم اگست سنہ ۱۸۳۷

۸

ڈبلیو۔ ایچ۔ میکناٹن سیکریٹری حکومت، فورٹ ولیم (کلکتہ) کے نام غالب کی دستخطی و مہری عرضداشت مورخہ ۱۶۔ ستمبر ۱۸۳۷ء — ۱۲۳۸ھ والی مہر کے ساتھ بقلم غالب: "حق طلب، دادخواہ اسد اللہ ۱۶ ستمبر سنہ ۱۸۳۷ عیسوی"

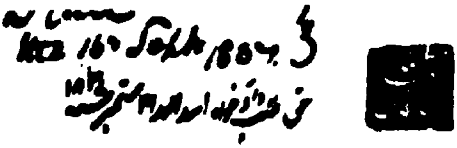

حق طلب دادخواہ اسد اللہ ۱۶ ستمبر سنہ ۱۸۳۷

۹ اور ۱۰

غالب کی ۵- جون ۱۸۴۲ء کی دو عرضداشتوں (بنام : لارڈ ایڈورڈ ایلن برو ، گورنر جنرل ہند، الہ آباد اور ایف - ایچ - میڈک ، سیکریٹری حکومت ہند، الہ آباد) پر غالب کی ۱۲۳۸ھ والی مہریں ثبت ہیں -

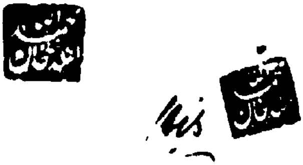
اسد اللہ خان
اسد اللہ خان

۱۱

غالب کی ۲۶- جنوری ۱۸۴۴ء کی دستخطی و مہری عرضداشت بنام : کیوری ، سیکریٹری حکومت ہند، پر ۱۲۳۸ ہجری والی مہر کے ساتھ غالب کی قلمی تحریر : "ہوا خواہ آرزومند لُطف وکرم نیازمند اسد اللہ نگاشتہ بست و ششم جنوری ۱۸۴۴ء"

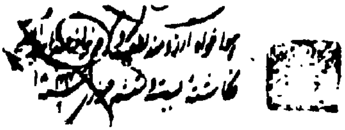

ہوا خواہ آرزومند لطف و کرم نیازمند اسد اللہ
نگاشتہ بست و ششم جنوری ۱۸۴۴ء

۱۲

عرضداشت دستخطی و مہری اسد اللہ خاں مورخہ ۲۶- جنوری ۱۸۴۴ء بنام ایڈورڈز لارڈ ایلن برو گورنر جنرل ہند، پر ۱۲۳۸ ہجری والی مُہر کے نیچے بخطِ غالب یہ عبارت درج ہوئی ہے : "عرضداشت فدوی اسد اللہ برادر زادہ نصراللہ بیگ خاں جاگیردار سونک سونسا ، معروضہ بست و ششم جنوری ۱۸۴۴ء عیسوی"

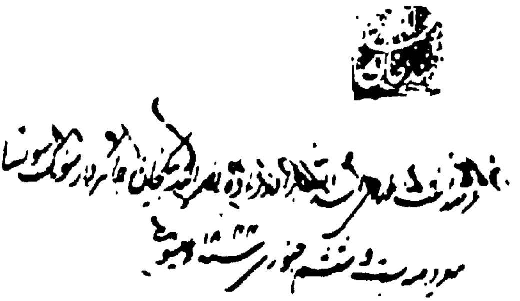

عرضداشت فدوی اسد اللہ برادر زادہ نصر اللہ بیگ خان جاگیردار سونک سونسا
معروضہ بست و ششم جنوری ۱۸۴۴ عیسوی

۱۳

عرضداشت دستخطی و مہری اسد اللہ خاں، مورخہ ۲۵ - اکتوبر ۱۸۴۴ء بنام: جے - کیوری، سیکریٹری حکومتِ ہند، فورٹ ولیم (کلکتہ) کے اختتام پر ۱۲۳۸ ہجری والی مہر کے اوپر بخطِ غالب یہ عبارت درج ہے، "رقیمہ نیاز، اُمیدوارِ لطف و کرم اسد اللہ"

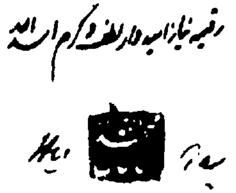

۱۴

غالب کی دستخطی و مُہری عرضداشت مورخہ ۲۳ - اکتوبر ۱۸۴۴ء بنام: لیفٹننٹ جنرل لارڈ سر ہنری ہارڈنگ، گورنر جنرل ہند، فورٹ ولیم (کلکتہ) کے آخر میں ۱۲۳۸ ہجری والی مُہر کے اوپر غالب نے اپنے قلم سے لکھا ہے: "عرضداشت اسد اللہ خاں برادرزادہ نصر اللہ خاں جاگیردار سونک سونسا"

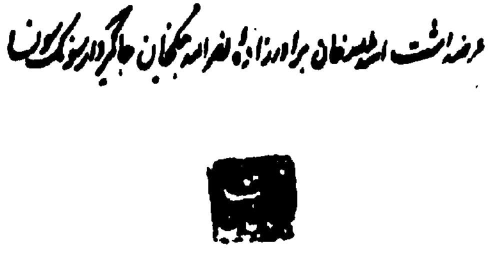

۱۵

غالب کی ۸ - دسمبر ۱۸۵۶ء کی دستخطی عرضداشت (بنام: جی - ایف - ایڈمنسٹن، سیکریٹری حکومتِ ہند بہ کونسل، فورٹ ولیم) کے آخر میں یہ عبارت ہے: "رقیمہ اسد اللہ خاں برادرزادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیردار سونک سونسا مرقومۂ ہشتم دسمبر ۱۸۵۶ء عیسوی"

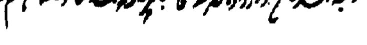

۱۶

عرضداشت دستخطی اسد اللہ خاں، مورخہ ۸۔ دسمبر ۱۸۵۶ء، بنام: چارلس جان وائی کاؤنٹ کیننگ گورنر جنرل ہند بہ کونسل، فورٹ ولیم (کلکتہ) ——— کے اخیر میں غالب کی قلمی یہ عبارت ہے: "عرضداشت اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیردار سونک سونسا، معروضہ ہشتم دسمبر سنہ ۱۸۵۶ عیسوی"

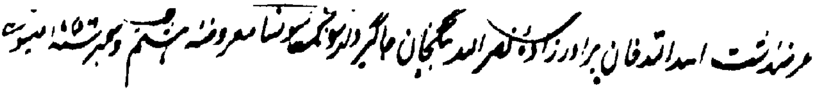
عرضداشت اسد اللہ خان برادر زادہ نصر اللہ بیگ خان جاگیردار سونک سونسا معروضہ ہشتم دسمبر سنہ ۱۸۵۶ عیسوی

"جاگیرِ غالب" میں یہ غالب کی آخری عرضی ہے۔ اس عرضی کے بارے میں سیکریٹری شعبۂ اُمورِ خارجہ، فورٹ ولیم کی ایک دفتری یادداشت مورخہ ۱۷۔ دسمبر ۱۸۵۶ء ——— "جاگیرِ غالب" کی آخری دستاویز ہے۔ اس کے کوئی پانچ ماہ بعد انقلاب ۱۸۵۷ء کا سلسلہ شروع ہوگیا اور غالب نئے مسائل، مصائب اور امکانات سے دوچار ہوئے جو اُن کا ایک الگ باب ہے۔

سراج اورنگ آبادی پر نئی روشنی

نثار احمد فاروقی

سراج اورنگ آبادی اردو کے شعرائے متقدمین کی صف میں ایک اہم اور ممتاز مقام رکھتے ہیں، اردو شاعری کا آغاز دکن ہی سے ہوا، اس کا میر نے بھی اعتراف کیا ہے[1] شمالی ہندوستان میں دورۂ ایہام گویاں کے بعد میرزا مظہر، عبدالحی تاباں، سجاد اکبرآبادی، میر، سودا، درد وغیرہ کے زمانے تک اردو شاعری کا لب و لہجہ اور اسلوب و آہنگ قائم ہو چکا تھا۔ سراج اورنگ آبادی کو باعتبار درجہ بندی ہم ولی دکنی اور میرزا مظہر کی درمیانی کڑی کہہ سکتے ہیں۔

سراج کی اہمیت اور ادبی عظمت کا اعتراف بہت دیر میں کیا گیا۔ وہ بھی ہنوز ناقص ہے اس لئے کہ سراج کے بارے میں بہت سی ضروری معلومات بھی ہمیں حاصل نہیں ہیں

حالات سراج کے مآخذ

سراج کا بہت ہی مختصر حال اور نمونہ کلام شعراء کے اُن قدیم تذکروں میں ملتا ہے جو زیادہ تر دکن میں لکھے گئے۔ شمالی ہند کے تذکرہ نگار بھی اُن سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔ چنانچہ بعض تذکروں میں ان کا صرف نام ہی لکھا گیا ہے۔ کلام میں اکثر تذکرہ نگاروں نے اُن کی غزل۔

خبر تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا، نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ وہ میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

سے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ گویا یہ غزل ہر دور میں مقبول رہی ہے۔

حالات سراج کے اہم اور اولین مآخذ یہ ہیں

۱۔ قائم چاندپوری مخزن نکات تالیف قبل ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱-۱۷۵۲ء
۲۔ میر تقی میر نکات الشعراء تالیف ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱-۱۷۵۲ء نظامی پریس بدایوں مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی
۳۔ افضل بیگ قاقشال تحفۃ الشعراء تالیف ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱-۱۷۵۲ء آصفیہ
۴۔ عنایت اللہ فتوت خلف لشکر جنگ برادر کلاں خواجہ ابوالبرکات خاں عشرت سنٹرل رکارڈز آندھرا

---

[1] میر : نکات الشعراء ص ۱/۱

۵	فتح علی گردیزی	تذکرہ ریختہ گویان	تالیف ۱۱۶۶ھ / ۱۷۵۲ - ۱۷۵۳ء	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۳ء
۶	سبزواری	تذکرہ اولیائے دولت آباد	تالیف ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳-۱۷۷۴ء	جامعہ عثمانیہ
۷	لچھمی نرائن شفیق	چمنستان شعراء[1]	۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۱ - ۱۷۶۲ء	طبع انجمن ترقی اردو
۸	لچھمی نرائن شفیق	گلِ رعنا	۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۵-۱۷۶۶ء	(مشمولہ تین تذکرے)
۹	قدرت اللہ شوق	طبقات الشعراء	۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء	کتب خانہ آصفیہ / طبع لاہور ۱۹۶۵ء
۱۰	میر حسن	تذکرہ شعرائے اردو	۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء	طبع انجمن ترقی اردو
۱۱	اسد علی خاں تمنّا اورنگ آبادی	گلِ عجائب[2]	۱۱۹۴ھ / ۱۷۸۰ء	طبع انجمن ترقی اردو (آصفیہ)
۱۲	سیّد عبدالوہاب افتخار دولت آبادی	تذکرہ بے نظیر[3] مرتبہ سید منظور علی	۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۸-۱۷۵۹ء	سینٹ ہاؤس الہ آباد ۱۹۴۰ء
۱۳	علی ابراہیم خاں خلیل	گلزار ابراہیم	۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۳-۱۷۸۴ء	انجمن ترقی اردو
۱۴	شاہ تجلی علی	تزکِ آصفیہ	۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳-۱۷۹۴ء	طبع حیدر آباد
۱۵	حکیم قدرت اللہ قاسم	مجموعۂ نغز	۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶-۱۸۰۷ء	طبع لاہور
۱۶	حکیم بیگ حاکم لاہوری	تذکرہ مردم دیدہ		طبع لاہور

لچھمی نرائن شفیق، افتخار دولت آبادی اور حاکم لاہوری، سراج سے ملے ہیں، اور انہوں نے ہی بعض سوانحی اشارے لکھے ہیں۔ شفیق نے "منتخب دیوانہا" کے دیباچے کا اقتباس نقل کر کے سراج کے بارے میں کچھ مستند معلومات فراہم کر دی ہیں۔ باقی تذکروں سے ہمیں کوئی قابلِ ذکر مدد نہیں ملتی۔

یہ وہ تذکرے ہیں جن کے مؤلفوں نے کم و بیش سراج کا زمانہ پایا تھا۔ اُن کے بعد جن تذکروں میں سراج کے حالات یا انتخاب کلام ملتا ہے، وہ ثانوی درجہ کے مآخذ ہیں اور بیشتر نے اپنے پیش رو تذکرہ نگاروں ہی سے اخذ کیا ہے۔ دیباچہ انوار السراج میں انصاف حیدر آبادی، سید صالح علی خاں اور مرزا الہ یار استجلو کا تذکرہ بھی ان لوگوں میں کیا گیا ہے، جنہوں نے سراج کے حالات میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے

---

[1] "شفیق اورنگ آبادی سلمہ اللہ تعالیٰ درین ولا تذکرہ ریختہ گویان مسمی بہ چمنستان شعراء پرداختہ" (دیباچہ دیوان سراج از ضیاء الدین پرواز) شفیق کی سراج سے ذاتی ملاقات تھی۔ اس نے سب تذکرہ نگاروں سے زیادہ تفصیل سے سراج کے حالات لکھے ہیں (گل رعنا مشمولہ تین تذکرے مرتبہ نثار احمد فاروقی صفحہ ۲۳۳، ۲۳۷)۔ [2] گل عجائب ۶۰-۶۱ (دس شعرا انتخاب کیے ہیں۔ حالات میں نری لفاظی ہے)۔

[3] سید عبدالوہاب افتخار دولت آبادی میر غلام علی آزاد بلگرامی کے شاگرد (ریختہ میں بیکل تخلص تھا (گل عجائب ۱۵) اور میر عبدالولی عزلت سے تلمذ رکھتے تھے۔ (گردیزی ۲۹-۳۰)

لیکن سراج کے مآخذ میں سب سے زیادہ اہم وہ تالیفات ہیں جنہیں خود سراج نے یا اُن کے شاگردوں نے مرتب کیا ہے[1]

انوارالسراج (کلیات سراج)

یہ سراج اورنگ آبادی کی کلیات ہے جسے سب سے پہلے بقول ضیاء الدین پروانہ شاہ عبدالرسول چشتی نے مرتب کیا تھا۔ جمع و ترتیب کا سال ۱۱۵۲ھ/ ۱۷۳۹ء بتایا جاتا ہے[2]

اسے پروفیسر عبدالقادر سروری نے ۱۹۴۰ء میں 'کلیات سراج' کے نام سے شائع کیا تھا۔

اسی کا عکسی ایڈیشن، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی نے ۱۹۸۲ء میں چھاپا ہے۔

کلیات سراج کے متعدد قلمی نسخے دستیاب ہیں، جن نسخوں سے عبدالقادر سروری نے استفادہ کیا تھا ان کی تفصیل مقدمہ کلیات میں درج کر دی ہے۔ ان میں سے بعض اہم نسخے یہ ہیں۔

۱ نسخہ مکتوبہ ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء

یہ قدیم ترین نسخہ ہے جو سراج کی زندگی میں لکھا گیا۔

۲ آصفیہ کے نسخوں میں ایک ۱۱۸۹ھ/ ۱۷۷۵- ۱۷۷۶ء کا لکھا ہوا ہے جس کے آخر میں یہ عبارت ہے

"نسخہ دیوان سراج سلمہ اللہ تعالیٰ باتمام رسید"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نقل کسی ایسے نسخے سے ہوئی ہے جو سراج کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

منتخب دیوانہا (۱۱۶۹ھ) ۵۶-۱۷۵۵ء

سراج کا ذوق شعری بہت بلند تھا، کسی شاعر کا دیوان اگر قیمتاً دستیاب ہوتا تھا تو وہ خرید لیتے تھے ورنہ پڑھنے کے لئے مانگ لیا کرتے تھے، جب دواوین کا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا تو انہیں خیال ہوا کہ اتنے دواوین کا محفوظ رکھنا دشوار ہے اور انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں بھی پریشانی ہوگی اس لئے اُنہوں نے تمام دواوین سے اپنے پسندیدہ شعروں کا انتخاب کیا' اور اس طرح تقریباً ۴۷ شعراً کا انتخاب کلام تین جزو کے رسالہ میں فراہم کر لیا۔ اس پر ایک مقدمہ بھی لکھا۔

"منتخب دیوانہا" تاریخی نام ہے جس سے ۱۱۶۹ھ/ ۱۷۵۵- ۵۶ء برآمد ہوتے ہیں

اس کا مکمل مخطوطہ جس میں دیباچہ بھی شامل ہے عبدالقادر سروری کو ترتیب کلیات کے وقت نہیں مل سکا تھا حالانکہ وہ کتب خانہ سالار جنگ[3] میں موجود تھا مگر فہرست مخطوطات مرتب کرنے والوں کی سہل انگاری کی وجہ سے اس کا انکشاف نہ ہوسکا تھا۔

دیباچہ منتخب دیوانہا کا ایک اقتباس لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے چمنستان شعراء میں درج کیا تھا۔ لیکن مکمل مخطوطہ دریافت ہونے پر اس کی بقیہ عبارت عبدالقادر سروری نے شائع کردی تھی[4]

---

[1] تمکین سروری: سراج اور پروانہ رسالہ اُردو اپریل ۱۹۵۱ء

[2] ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۰ء کے مکتوبہ نسخہ کلیات (مملوکہ آصفیہ) میں بھی سال ترتیب ۱۱۵۲/ ۱۷۳۹ء بتایا گیا ہے۔

[3] مخطوطہ نمبر ۱۲۲ یہ ۲۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اور سنہ کتابت درج نہیں[4] سہ ماہی نوائے ادب (بمبئی) جولائی ۱۹۶۰ء، عبدالقادر سروری: شاہ سراج کا منتخب دیوانہا ج ۱۱، شمارہ ۳

اضواء السراج

کلیات سراج (انوار السراج) کے دیباچہ نوشتہ ضیاء الدین پروانہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سراج اورنگ آبادی کے ملفوظات بھی اضواء السراج کے نام سے جمع کئے گئے تھے، یہ ابھی تک دستیاب نہیں ہیں لیکن یقین ہے کہ کسی گوشے میں روپوش ہوں گے اور جب بھی یہ مخطوطہ دریافت ہو جائے گا اس سے ہم سراج کی زندگی اور زمانے کے بارے میں بہت سی نئی باتیں جان سکیں گے۔

مکتوبات سراج

عبدالقادر سروری نے دیباچہ کلیات میں سراج کے فارسی خطوط اور فارسی کلام کا ذکر کیا ہے یہ نسخہ سالار جنگ (رقم ۱۲۶- الف) میں موجود ہیں۔ سروری اس کو منتخب دیوانہا کا نامکمل نسخہ بتاتے ہیں اور ان کا بیان ہے کہ یہ شاہ ضیاء الدین پروانہ کا مرتبہ ہے فارسی خطوط اور فارسی کلام سوائے اس نسخے کے کہیں اور دستیاب نہیں ہوا جو خطوط پروانہ کے موسومہ ہیں ان سے اس کا پتا چلتا ہے کہ یہ غالباً پروانہ ہی کا لکھا ہوا بھی ہے"[1]

ان خطوط پر بھی تفصیل سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

مجھے کلیات سراج اورنگ آبادی اور منتخب دیوانہا کا ایک مکمل اور مستند نسخہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ سراج کے شاگرد اور مرید و خلیفہ شاہ ضیاء الدین پروانہ نے مرتب کیا ہے اور اس میں ایک مفصل دیباچہ بھی ہے جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا ہے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ پورا نسخہ سراج کے ایک اور ممتاز شاگرد میرزا عطا ضیا برہان پوری نے سراج کے انتقال سے تقریباً ۸ ماہ کے بعد اپنے قلم سے لکھا ہے (تعداد اوراق ۱۵۵) اس کی کتابت کا کام چہار شنبہ (۱۷ جماد الثانیہ ۱۱۷۸ھ (مطابق ۱۲ دسمبر ۱۷۶۴ء) کو تمام ہوا۔

ترقیمہ یہ ہے:-

"کاتب الحروف اضعف العباد میرزا عطا ضیا برہان پوری بتاریخ ہفدہم شہر جمادی الثانی روز چہار شنبہ ۱۱۷۸ھ صورت اتمام یافت"

اس نسخہ میں منتخب دیوانہا مع دیباچہ بھی شامل ہے[2] اور دیوان سراج کا دیباچہ نوشتہ ضیاء الدین پروانہ بھی ہے جس سے سراج کے بارے میں بعض ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جن کی طرف ابھی تک کسی تذکرہ نگار یا محقق نے اشارہ نہیں کیا ہے۔

دیباچہ منتخب دیوانہا

اس نسخہ کی ایک اہم خصوصیت منتخب دیوانہا کا دیباچہ ہے جس کا فارسی متن درج ذیل ہے[3]

رب یسّر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وتمم بالخیر

---

[1] عبدالقادر سروری: کلیات سراج (مقدمہ) ص ۱۴۲-۴۳۔

[2] اس دیباچہ کا ایک اقتباس، جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، بعض معمولی لفظی اختلافات کے ساتھ شفیق اورنگ آبادی کے تذکرہ گل رعنا (ص ۲۲۴-۲۲۵) اور چمنستان شعرا میں موجود ہے اور جو عبارت شفیق نے حذف کر دی تھی، اسے عبدالقادر سروری نے نوائے ادب جولائی ۱۹۶۰ء میں شائع کر دیا ہے۔

[3] یہ متن اصل نسخے کے عکس کی مدد سے یہاں درج ہوا ہے، عکس میں بعض الفاظ صاف نہیں آئے ہیں، ان کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے نسخہ پختہ خط شکستہ میں باریک قلم سے لکھا ہوا ہے شفیق اورنگ آبادی نے میرزا عطا ضیا برہان پوری کی تاریخ ولادت، شوال ۱۱۴۳ھ (۴ اپریل ۱۷۳۱ء) لکھی ہے (گل رعنا ص ۲۴۴) گویا اس نسخہ کی کتابت کے وقت ان کی عمر ۳۰ سال تھی۔

دیباچہ کتاب شرح دبیان حمد سخن آفریں ست کہ فہرست جمیع اسماء صفاتی راجع بذات خود اوست و مطلع قصیدہ کلام وزبان نعت صاحب دین ست کہ رباعی اصحاب اخیار موزوں از حمائد صفات او خصوصاً فرد منتخب غزل کائنات کہ حدیث لحمک لحمی وکلام انا و علی من نور واحد بذات او شامل است و مثنوی رنگین آل طٰہٰ ویٰسین کہ کریمہ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت در شان او نازل ورد جان معنی آشنایان اسرار رحمانیست و وظیفہ زبان سخن سنجان فیض سبحانی، چنانچہ این کج مج زبان دبستان تحقیق سراج الدین حسینی اورنگ آبادی متخلص بہ سراج زبان قال باین مقال مترنم دارد لمولفہ

ز دیوان قضا دارم دو بیت منتخب ازبر
محمد مطلع است و حسن مطلع حیدر صفدر

لیکن زبان درین مقدمات معترف بعجز و قصور است و طوالت کلام درین امور نزدیک مختصر پسندان نامنظور لہذا تحریر ما وجب رخصت روانی قلم می دہد، کہ این فقیر از سن[2] دوازدہ سالگی بغلبہ شوق بے جہت ہفت سال جامہ عریانی دربر داشت و بہ تکلیف نشہ بے خودی اکثر درسواد روضہ متبرکہ حضرت برہان الدین غریب قدس سرہ، شبہا بروز می آورد و از جوش ہماں مستی اشعار شور انگیز و ابیات درد آمیز بزبان فارسی از مکمن جان بعرصۂ زبان می آمد آورد و باقتضاے احوال خامہ را بتحریر آں آشنا نمی ساخت احیاناً اگر شوقی مندے حاضر الوقت می بود بجہت حلاوت ذائقہ طبع خود کاغذ را سیاہ می نمود اگر آں اشعار تمام تحریر می آمد دیوانے ضخیم ترتیب می یافت۔ چوں تقاضاے عمر قابل آں ہمہ سخن سنجی ہا نبود، باستماع آن موزونات حالی حالے دردرطہ تعجب می افتاد و از جملہ الہامات معتبر می آورد، بعد انقضاے مدت مسطورہ تلاش لذت تحقیق محرک رگ جاں گردیدہ، تا بآن وساطت بجناب (حامی شریعت غرا سالک طریقۃ الاخفی واقف حقیقۃ المولی عارف معرفۃ الکبری قبلہ مریداں راسخ الیقین و صاحب الایمان۔

کعبۂ مستفیضان کامل الصدق و ثابت البرہان حضرت خواجہ سید شاہ، عبدالرحمٰن چشتی قدس اللہ سرہ العزیز کہ وصال (شریفش) مقدس در سنہ احدی وستین ومایۂ والف[3] اتفاق افتاد مستعد ارادت گشتہ فیض یاب ارشاد گردیدہ جرعۂ از بزم عنایت آن ساقی شراب ہدایت موافق حوصلہ خود چشیدہ دران ایام لہئے پاس خاطر عزیز عبدالرسول خاں (صاحب) کہ برادر طریق این فقیر (اند) است، اکثر اشعار آبدار درزبان ریختہ بسلک سطور منسلک گشتہ۔

ایشان (انشائے) آن جواہر (   ) متفرق را کہ قریب پنج ہزار بیت بود بہ ترتیب (حروف) دیوان نارد (مردف) نمودہ حصہ مشتاقان خاص (گردید) گردانیدند ورفتہ رفتہ شہرۂ (ت) تمام (یافت گرفتہ) کہ بعام ہم رسید وفقیر بعد چندے بلباس فاخرہ الفقر فخری ممتاز گردید (ہ)

---

[1] ملاحظہ ہو تذکرہ گلِ رعنا مشمولہ تین تذکرے مرتبہ نثار احمد فاروقی ص ۲۲۴ سے ۲۲۵، (دہلی ۱۹۶۸ء)

[2] سراج کی ولادت ۱۱۲۴ھ/ ۱۲/ ۱۷۱۱ء کی ہے اس لئے یہ کیفیت جنون تقریباً ۱۱۳۶ھ/ (۲۳-۱۷۲۴ء) سے شروع ہوئی۔

[3] ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۷-۱۷۴۸ء

واز ہمان روز موافق امر مرشد برحق تا حالت تحریر کہ سال ہفدہم است دست زبان از دامن سخن موزوں کشید[1] سرشت ازلی بود اکثر بسیر دیوانہا اشعار استادان عندلیب طبع خود را مسرور می ساخت و ہر جاکہ دیوان استادے می شنید اگر بہ قیمت میسر می آمد غنیمت می شمرد والا عاریۃً بوعدۂ اتمام سیر می گرفت۔ لمولفہ

می شناسد ہر کہ شد دلدادۂ زلف سخن
بیت رنگین را بجائے بیت ابروے بتاں

آخر بخیال گذشت کہ این دردِ سر بے دماغی رود و اگر اتفاق سفر افتد بر داشتن این بارگران صورت نمی بندد لاعلاج اکثرے از دیوانہائے شعرائے قدیم و جدید و بعضے از تذکرہ ہا من اولہ الی آخرہ سیر نمودہ چیزے کہ مرغوب طبع صاف پسند افتاد آن را جدا بر صفحہ قرطاس ثبت نمودہ بہ ترتیب تہجی اسمائے شعرا و رعایت ردیف دیوانے علیحدہ ترتیب داد و نامش دیوان منتخب نہاد تا ہرگاہ خار خار شوق رگِ جان بخراشد سیر این مجموعہ رنگین تسلی می تواند بخشید و بعد فنائے ترکیب عنصری ہر قدردان سخن کہ گلگشت این گلشن بے خزان میل نمود، بحلاوت طبع خورسند گردد و بفاتحہ خیر روح مولف را شاد نماید چون تالیفش در سنہ تسع و ستین و مایہ والف صورت بست رباعی بدینگونہ بر صفحہ مربع نشست۔ لمولفہ۔

این نسخہ کہ دارد ز سخن عنوانہا　　یک قطعہ زمین است، در دلبستانہا
چون منتخب کلام ہر دیوان شد　　تاریخ شدہ منتخب دیوانہا　(۱۱۶۹ھ)

چون خزف پارہائے موزونات سابق این فقیر لیاقت آن ندارند کہ در سلک گوہرہائے آبدار اشعار سخن سنجان کامل عیار منسلک شوند ازین جہت مشتے نمونہ از خروار بیتے چند بطریق یادگار در این جا نگارش می رود تا سخن فہمان رنگین فطرت (دستے) بہ تحسین برآرند و دریابند کہ مولف این دیوان منتخب طبع موزوں داشت و آن اینست[2]

دیباچہ انوار السراج

اسی قلمی نسخہ میں دوسرا دیباچہ انوار السراج یعنی کلیات سراج مرتبہ شاہ ضیاء الدین پروانہ برہان پوری کا ہے اس کا متن ہم پہلی بار شائع کر رہے ہیں اس سے سراج کے بارے میں کئی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کی طرف آگے اشارہ کیا جائے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

---

[1] یہ دیباچہ ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۵ء میں لکھا گیا اس لئے سراج نے اس بیان کے مطابق ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں شاعری ترک کی۔
تذکرہ گل رعنا شفیق اورنگ آبادی میں اقتباس "این فقیر از سن دوازدہ سالگی" سے "موزوں کشید" تک ہے۔ (ص ۲۲۴ - ۲۲۵

[2] دیباچہ منتخب دیوانہا (قلمی) ورق ۸ - الف۔

سپاس تنزہ اساس کلیمے را سزاست کہ بر السنۂ خاصان بارگاہ خود کلام وحی الہام جاری ساخت وثنائے بے منتہا علیمے را رواست کہ بر الواح صدور پاکان حضرت خود نقوش علوم غیب وشہادت نگاشت و درود نامحدود وتحفۂ جناب مستطابے کہ مفہوم انا افصح العرب والعجم، زمزمہ از توصیف اوست ومضمون انا ارسلناکَ شاھداً ومبشراً ونذیراً وداعیاً الی اللہ باذنہٖ وسراجاً منیراً پرتوے از تعریف او وآل او کہ در چار موجہ طوفان سفینۂ نجات امت اند واصحاب او کہ در ظلمت آباد جہاں کواکب رہنمائے سالکان طریقت ۔

اما بعد این گلدستہ ایست نضارت بخش چشم بینایان وشمامہ ایست روح افزائے طبیعت دانایان یعنی کلیات معجز سمات وارشاد کرامت بنیاد قطب فلک تمکین مربع نشین چار بالش حق الیقین فرد الحقیقت بنیاد المعرفت واصل مقام ختام سراج بزم اولیائے کرام وارث علم خاتم النبیین حضرت خواجہ سید شاہ سراج الملت والحق والشرع والدین الحسینی نسباً والچشتی طریقۃً والاورنگ آبادی وطناً قدس اللہ سرہ العزیز وأفاض علینا من برکاتہ ومن فیوضاتہ کہ فقیر حقیر ضیاء الدین الحسینی المتخلص بہ پروانہ الحنفی مذہباً الصوفی مشرباً والچشتی طریقۃً والبرہانپوری مولداً ومنشاءً والاورنگ آبادی وطناً بجمع آن پرداختہ وسرمایہ سعادت ابدی حاصل ساختہ۔ پوشیدہ نماند کہ میر عبدالوہاب، المتخلص بہ افتخار دولت آبادی سلمہ اللہ تعالیٰ تذکرۃ الشعرائے مسمی بہ بے نظیر در ۱۱۷۲ھ ۱۱۵۸ ۔ ۱۷۵۹ اثنین وسبعین ومأیہ والف تالیف کردہ وکتاب خود را بترجمہ والائے خواجہ ما بقدر علم خود زینت دادہ می گوید۔

"سید سراج الدین اورنگ آبادی است در مبادی نشو ونما برنگ گل خرقۂ درویشی در بر کردہ واز تباشیر صبح شعور لسان بلبل مشق سخن زمزمہ سنجی پیش گرفتہ وشعر ریختہ یعنی ہندی وفارسی آمیز بمرتبہ کمال رسانید وشہرتے تمام پیدا کرد وامروز در اورنگ آباد بوارستگی می گذراند ووابستگی با سلسلہ عالیہ چشتیہ دارد۔ گاہے زبان قلم را با شعر فارسی آشنا می سازد۔" ۴

ودیگر ترجمہ عالی خواجہ ما حاجی حکیم بیگ خان حاکم تخلص لاہوری سلمہ اللہ تعالیٰ در تذکرہ مسمی بمردم دیدہ آنچہ دیدہ وفہمیدہ در سلک تحریر کشیدہ می گوید:

"سید شاہ سراج الدین سراج تخلص اورنگ آبادی درویش وعزیزے کسے است۔ تکیہ (خوشے) بنا کردہ وآنجا بسر بردہ مشق ریختہ بسیار کردہ ( ) دیوانے در ریختہ دارد، مشہور است واشعار فارسی ہم جستہ جستہ می گوید۔ یکبار بخانہ سید غلام علی آزاد۔ اتفاق ملاقات افتاد ویکبار بخانہ اش رفتم۔ بسیار خلیق واہل دل است خدائش سلامت دارد۔ ۵ شفیق اورنگ آبادی سلمہ اللہ تعالیٰ درین ولا تذکرہ ریختہ گویان مسمی بچمنستان شعراء پرداختہ واز شمع ترجمہ خواجہ ما سواد صفحہ بیاض خود را موافق فہم روشن ساختہ می گوید۔ "میر سراج الدین متخلص بہ سراج شمع چرب زبان روشن بیانی سراج منیر محفل آتش زبانی است بازار ریختہ گویان در ہند۔

از دگرم گردیدہ وانوار طبع روشنش از شرق تا غرب رسیدہ شعر پرسوزش دلفروز وسخن پختہ اش گلوسوز۔"

ودیگر تذکرہ نویسان ہند ودکن موافق فہم واستعداد خود ستودہ اند ورخسار صفحہ را بطرہ مشکیں آراستہ مثل سید فتح علی خان گردیزی وخواجہ عنایت اللہ خان وانصاف حیدر آبادی وسید صالح علی خان ومیرزا الریار اسجلو وغیرہم کہ تفصیل آنہا بسیار است ودرین مختصر نگنجیدن

---

۴ عبدالوہاب افتخار: تذکرہ بے نظیر ص ۷۵ ۔ ۵ حاکم: تذکرہ مردم دیدہ (طبع لاہور)

دشوار لمولفہ۔

شاعری ننگ سید ما بود
دیگران افتخار می دانند

راقم ضعیف گوہر حسب و نسب حضرت خواجہ بگوش حقیقت نیوش می رساند کہ خواجہ ما از سادات کاظمیہ است، سید محمد کہ بچہار واسطہ جد کلان خواجہ ماست در مدینہ منورہ سکونت داشت از انجا رخت سفر جانب ہندوستان کشید، در سرزمین بارہہ کہ او وکہ ایست در حدود شمالی دار الخلافہ دہلی رسیدہ قصبۂ[1] جانسٹھ را دل نہاد توطن ساخت با بعضے سادات آں جا واسطی الاصل پیوند قرابت درمیان آوردہ متزوج و متاہل شد و اخلاف او در انجا بطناً بعد بطنٍ روزگار با عتبار تمام بسر بردند تا آنکہ سید درویش محمد والد ماجد خواجہ ما در اواخر عہد خلد مکان از جانسٹھ برآمدہ سرے بدیار دکن کشید و باورنگ آباد رسیدہ در انجا طرح اقامت ریخت۔ جناب سید در علوم متداولہ صاحب استعداد شایستہ بود و ہمیشہ بافادہ طلبہ اوقات شریف معمور می داشت، نقش نگین آں جناب این مصراع است۔

درویش گوہریست ز دریاے اولیا

لطف سجع ایں است کہ نام سہ پشت دارد یعنی سید درویش بن سید گوہر بن سید دریا بن سید اولیا بعد چندے صبیہ سید عبد اللطیف شہید قادری کہ از عمدہ ہاے دکن است در موضع دیول گھاٹ از نواحی اورنگ آباد آسودہ در سلک ازدواج کشید واز بطن آں سیدہ خواجہ سیزدہم صفر روز دوشنبہ سنہ اربع وعشرین و مایہ والف در اورنگ آباد بعرصۂ و(   ) فرمودند والد ماجد "ظہور احد" تاریخ یافت بعد وصول سن تمیز در خدمت والد ماجد تلمذ نمودند و در جمیع علوم استعداد عالی، بہم رسانیدند۔ اکنوں ترجمہ آں حضرت کہ بہ نفس نفیس در عنوان تالیف خود مسمی بہ منتخب دیوانہا کہ ہمیں تاریخ تالیف است رقم فرمودہ اند بعبارتہا نقل می کنم و آں اینست...[3]

.... تتمہ احوال آں حضرت از حد و د سنہ احدی وستین و مایۂ والف تا وصال مقدس فقیر حقیر در اضواء السراج کہ ملفوظات آں حضرت است بہ تفصیل نوشتہ ام۔ در ذیلا کر خدمت بستہ بجمع این جواہر زواہر کہ جلا بخش دیدہ ارباب بصیرت است یعنی کلیات نتائج طبع والا پرداختم و بانوار السراج کہ مشتمل بر صنعت ایہام است موسوم ساختم و تاریخ جمع چنیں بخاطر فاتر القا شد ؎

۱ شکر گیتی آفرین کاین کلیات
۲ یافت در اقصاے ہر کشور رواج

---

[1] سادات بارہہ نسباً زیدی الواسطی ہیں، یہ سید ابو الفرح واسطی کی اولاد میں ہیں۔ تقریباً ساتویں صدی ہجری میں یہ خاندان ہندوستان میں آیا تفصیل کے لئے رک دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۳/ ۹۱۸ - ۹۲۰۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین اس لفظ کی اصل باہرہ بتاتے ہیں۔ دیوان بادشاہ گر/ ۱۰/ لاہور ۱۹۷۵ء

[3] اس کے بعد منتخب دیوانہا کا دیباچہ جو ہم نے اوپر درج کیا ہے، اس کا اقتباس ہے "این فقیر از سن دوازدہ سالگی... سے تا "دست زبان از دامن سخن موزوں کشید۔"

داد ہاتف سال تاریخش ندا   شد منور بزم ز انوار السراج (۱۲۰۹ھ ٭)

مخفی نماند کہ این بے بضاعت قلیل الاستطاعت بیست و ششم رجب روز دوشنبہ در سنہ خمس و اربعین و مایہ و الف لباس ہستی پوشید و از انکشاف صبح شعور کہ سنہ سبعۃ و خمسین و مایہ و الف باشد در خدمت فیض موہبت سید عالی نسب سرور والا حسب در فن ریختہ استاد شاگرد خواجہ عالی نژاد سرخوش نشاط تند شوری میر مہدی المتین النیشاپوری البرہانپوری بقدر مساعدت وقت شعر ریختہ مشق کرد و در ہمان ایام سعادت انجام مطابق سنہ احد و ستین و مایۃ و الف آستان بوس جناب تقدس انتساب شمع محفل اولیا حضرت سراج الاتقیا پیشانی بخت افروخت و بشرف بیعت والا سرمایہ دولت نسائتین اندوخت و قریب شانزدہ سال در حضور پرنور آن آفتاب مشرق ہدایت و عرفان راہ نمائے اہل عشق و وجدان تربیت ظاہر و باطن یافت و در حدود سنہ سبعہ و سبعین مایۃ و الف چہار ماہ و بست و دو روز قبل از وصال مقدس کہ روز عرس شیخ آن حضرت بود خواجہ ما در حضور جمہور فقرا و عصر و مشائخ شہر این بے استعداد محض را مجاز و مرخص د (   ) خویشتن گردانیدند و ذرہ بے مقدار را از تحت الثریٰ باوج فلک الافلاک رسانیدند و در سنہ مسطور چہارم شوال روز جمعہ وقت نماز پیشین[1] خاطر را از اقامت این بزم فانی پرداختند و بمقدم فیض توام محفل باقی را نورانی ساختند۔

مورخان تاریخ ہائے فراوان تحفہ روح پرفتوح مقدس مطہر نمودند از ان جملہ حضرت میر غلام علی آزاد مدظلہ العالی کہ ذکر شریفش ہم آمد این قطعہ انشا نمودہ اند۔ قطعہ۔

شاہ سراج آنکہ ز نور سخن   از ہمہ آتش نفساں گوے برد
ہاتف دلسوختہ تاریخ او   گفت سراج شعرا حیف مرد

ونیز برادرزادہ آن جناب[1] میر اولاد محمد مخاطب بسید امتیاز خاں متخلص بذکا سلمہ اللہ تعالیٰ این قطعہ گفتہ

چراغ دودہ آل عباس سراج الدین   کہ بود روشن ازو محفل سخندانی

٭ اولاد محمد خاں ذکا کے قطعہ تاریخ میں جو آگے درج ہوا ہے "چارم شوال صبح آدینہ" نظم ہوا ہے، مگر اس قلمی نسخہ میں "چارم شوال روز آدینہ" ہے اور یہ صراحت ہے کہ نماز پیشین (ظہر) کے وقت ان کا انتقال ہوا۔

[1] اولاد محمد خاں ذکا، میر غلام علی آزاد بلگرامی کے بھتیجے ۲۰ رجب ۱۱۵۱ھ / ۳۰ اکتوبر ۱۷۳۸ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے ۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۸-۵۹ء میں اپنے چچا آزاد بلگرامی کے پاس اورنگ آباد آ گئے۔ پانچ سال رہ کر ۱۱۷۷ھ / ۱۷۶۳-۱۷۶۴ء کے اواخر میں بلگرام چلے گئے۔ رجب ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۵-۶۶ء میں پھر دکن واپس آئے نواب صمصام الدولہ شاہنواز خاں کے فرزند میر عبدالحی خاں نے خطاب خانی اور پانچ ہزار سالانہ کی جاگیر والی ریاست سے مقرر کروا دی تھی پھر یہ حیدرآباد چلے گئے۔ (گل عجائب ۵۲-۵۳)

نمود چارم شوال روزن آدینہ　　بشمع انجمن عمر دامن افشانی
زتیرہ بزم جہان فنا بدار بقا　　فروغ ناصیہ خویش کرد ارزانی
کشید شعلہ تاریخ سرز طبع ذکا　　"سراج بزم ارم را نمودہ نورانی" (۱۱۷۷ھ)

رائے لچھمی نراین شفیق تخلص از تلامذہ حضرت آزاد این قطعہ نذر گذرانید۔

قطعہ

سید حق پرست عرفان سنج　　کہ از دیانت شعر حسن و حسن رواج
سال رحلت شفیق کرد رقم　　رد برجنان نمود شاہ سراج (۱۱۷۷ھ)

و سید بزرگ میر غلام علی تنہا تخلص این مادہ تاریخ یافتند "سراج راہ بہشت" و تن مبارک را حساب موافق لفظ "احمد" کہ پنجاہ و سہ است و خاتم الولایۂ تاریخ تولد و تاریخ وصال اقدس خاتم الولایۂ احمد یافت۔ (۱۱۷۷ھ)

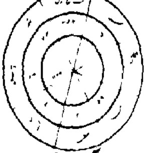

و نیز فقیر دائرہ تاریخ کہ ہرگز نشاندہ و از ان تواریخ لاتعداد ولاتحصیٰ برمی آید دائرہ اینست۔

برارباب شعور مخفی و مستور مباد کہ این دائرہ تاریخ وضع کردہ حضرت میر موصوف است مدظلہ العالی و فقیر این دائرہ برآن تراشیدہ و پیش ازین دائرہ تاریخ چہار دہ خانگی شخصے وضع کردہ و اساس آن بر دو تاریخ گذاشتہ در بین الانام مشہور است و آن دائرہ مشہورہ اعداد مستثنیٰ دارد کہ بآن۔ استخراج تاریخ راست نمی آید یعنی واحد و چہار دہ و اضعافش و اول (　　　) حضرت میر صاحب در کتاب سبحۃ المرجان دائرہ مثمنہ یعنی ہشت خانگی وضع کردہ اند و بناء آن بیک تاریخ گذاشتند (　　　) دائرہ مثمنہ اینست کہ اعداد مستثنیٰ اصلا ندارد از واحد تا لانہایت بہر عددے کہ شمارند تاریخ برمی آید۔

طریق استخراج تاریخ از دائرہ مثمنہ اینکہ ہر خانہ کہ خواہند مبدأ قرار دہند و بہر عددے کہ بخاطر رسد شمار نمایند و بہر خانہ کہ شمار تمام شود عددش بگیرند پس اعداد مختار اگر فرد است ہمسایہ خانہ منتہی مبدأ گردانیدہ تعداد نمایند مرۃ بعد اخریٰ دورۃ فدورۃ تا آنکہ منتہی خانہ قبل مبدأ اصل شود اکنون اعداد غایات را جمع کنند پس مجموعہ آن تاریخ شود و اگر زوج است خود منتہی را مبدأ گردانند ہمین نمط بشمار منجر شود تا آنکہ مبدأ اصل گردد پس مجموع اعداد تاریخ شود۔

و نیز حضرت میر روشن ضمیر در سبحۃ المرجان نوشتہ اند کہ دائرہ چہار خانگی و یازدہ خانگی ہم اعداد مستثنیٰ ندارد و دیگر بر یاران کرم گستر معروض می شود کہ بعد توجہ جناب خواجہ قدس سرہ ازین خاکدان بجوار لامکان فقدان این دولت عظمیٰ و لحوق حالت تنہائی طرفہ کدورتے آورد و دل وحشت زدہ را کہ خوگر صحبت ارباب کمال بود وسیلہ اطمینان ناگزیر افتاد طبیبے کہ معالجہ امراض روحانی تواند کرد در کار شد خود را بعالی خدمت قدوۂ فضلائے دہر زبدہ کملائے عصر وحید زمان فرید جہان امام ائمۃ المتقدمین مقدمۃ الجیش متاخرین حسان ہندوستان سحبان این کشور جنت نشان علامہ فنون عرب و عجم فہامہ افتخار لوح و قلم صاحب حسب و نسب گرامی سیدی سندی حضرت میر غلام علی آزاد الحسینی الواسطی البلگرامی ادام اللہ ظلالہ خلد بالافضالہ رساند و بدولت تلمذ سرمایہ فراوان حاصل کرد و نیز کمند جذب کاملے عنان مرا سوے خود کشید اعنی حضرت سیدنا لاتقیاد آبرو دستے خاندان سید علا برزخ کبری غیب و شہادت مرج البحرین شریعت و طریقت واقف رموز معنوی وارث اسرار نبوی مرآۃ تجلیات (ربانی) (شعر) انوار سبحانی نکہت حسن خلقش معطر (　　) دماغ جہانیان و سر رشتہ تواضع اش کمند انداز دلہائے زمانیان سید الغوث اوالمتمکین

حضرت میر فخر الدین[1] مد اللہ ظلہ علی رؤس المخلص الحمد للہ کہ بدستیاری توفیق گلہا از ریاض محفل عالی چیدم و خوشہا از خرمن مزرع والا برداشتم دبا خواہد ما قدس اللہ سرہ العزیز این دو برگزیدہ انفس و آفاق را اخلاص بمرتبہ اتم بود و اختلاط شیر و شکر جلوہ مے نمود حالا بعونہ تعالیٰ شروع در مقصد اصلی می نمایم و با فتتاح آن ابواب فیض روے مطالعہ کنندگان می کشایم و در خاتمہ کتاب برخے از ترات خود ہم اثبات خواہم کرد و خادم زادہا را در صف نعال مخدوم زادہا جا خواہم داد ؎

اگرچہ نیک نیم خاک پاے نیکانم
عجب کہ تشنہ نمانم سفال ریحانم

حسبی اللہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر"

۲

پروفیسر عبدالقادر سروری نے کلیات سراج کی ترتیب و تدوین اور تصحیح متن میں خاصی محنت کی ہے۔ انہوں نے دستیاب مواد کی مدد سے کلیات کا مقدمہ بھی خاصی تفصیل سے لکھا ہے، لیکن اس کے سوانحی حصے میں بہت سی بنیادی معلومات بھی نہیں آ سکی ہیں، سروری نے اعتراف کیا ہے کہ ان کے خاندان کے متعلق ہم اب بھی بہت کم جانتے ہیں، ان کے اجداد کے حالات دریافت کرنے کا فی الحال کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں"

ہم نے مخطوطہ کلیات کا جو مقدمہ اوپر درج کیا ہے اس سے کچھ باتیں پہلی بار منظر عام پر آ رہی ہیں۔ یعنی (۱) سراج اورنگ آبادی نسباً کاظمی سید تھے، چار پشت اوپر ان کے دادا سید محمد مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے اور انہوں نے سادات بارہہ کے علاقے جانسٹھ ضلع مظفر نگر میں سکونت اختیار کی تھی۔ سید محمد کے بیٹے سید اولیا، ان کے بیٹے سید دریا، ان کے فرزند سید گوہر اور ان کے فرزند سید درویش محمد تھے۔ سادات بارہہ میں ان کی رشتہ داریاں بھی ہوئیں۔ اورنگ زیب (ف ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) کے آخری زمانے میں سید درویش محمد نے دکن کی طرف ہجرت کی تھی اور اورنگ آباد میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہ نقل مکانی بارہویں صدی ہجری کی پہلی دہائی میں ہوئی ہو گی، یہاں انہوں نے سید عبداللطیف شہید قادری کی دختر سے نکاح کیا جن کے بطن سے سراج الدین پیدا ہوئے ان کے اور کسی بہن بھائی کا حال معلوم نہیں ہوتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درویش محمد سید درویش کہے گئے۔ خاتم پر یہ سجع کندہ کیا ہوا تھا: "درویش گوہر لیست ز دریاے اولیا" اس میں ان کے تین اجداد کے نام آ گئے ہیں۔ رائج الوقت علم و فضل کے مطابق عربی فارسی، علوم دینیہ اور فارسی ادبیات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ وہ بچوں کو تعلیم دینے میں اپنا وقت صرف کرتے تھے اور سراج کی تعلیم بھی انہیں کی نگرانی میں ہوئی تھی۔

سراج کی ولادت دوشنبہ ۱۲ صفر ۱۱۲۴ھ (مطابق ۱۱ مارچ ۱۷۱۲ء) کو اورنگ آباد میں ہوئی۔ "ظہور اسعد" (اور خاتم الولایہ سے تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے سروری نے قیاس و تخمین سے سنہ ولادت ۱۱۲۸ھ متعین کیا تھا اور قاضی عبدالودود نے بھی ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۵-۱۶ء ہی

---

[1] میر فخر الدین حسینی ترمذی حاجی عبداللہ جنید ثانی کے نواسے اور سید محمد حیات کے داماد، ابتدا میں سپاہی پیشہ تھے، ترک لباس کر کے راہ فقر اختیار کی۔ شیخن صاحب نے انہیں مجاز کر کے خرقہ پہنایا۔ (گل عجائب ۱۲۳)

+ عبدالقادر سروری :- مقدمہ ۳۸

لکھا ہے۔ ضیاء الدین پروانہ نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پنجشنبہ ۲۶ رجب ۱۱۴۵ھ / مطابق یکم جنوری ۱۷۳۳ء کو پیدا ہوئے، ان کا نام میرزا عطا ہے، (جیسا کہ خود ترقیمہ میں بھی لکھا ہے مثل قبیلہ برلاس سے تعلق تھا۔ ان کے نانا میر برہان اللہ سادات حسینی میں سے ہیں برہان پور سے ۲۰ کوس پر ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ (۷ شوال ۱۱۴۳ھ / ۴ اپریل ۱۷۳۱ء) سن شعور کو پہنچ کر برہان پور آئے اور یہاں سراج اورنگ آبادی سے ملاقات ہوئی پھر یہ اورنگ آباد چلے گئے۔ آزاد بلگرامی سے استفادہ کیا، ان کی مدح میں اشعار بھی لکھے ہیں۔ گل عجائب کی تالیف کے وقت میر حامد یار خان ارسلان جنگ برادر اعیانی میر موسیٰ خاں رکن الدولہ وکیل مطلق آصف جاہ ثانی کے متوسل تھے۔ مبیّن برہان پوری کے والد میر محمد امین مرزا عبد القادر بیدل کے شاگرد تھے۔

۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء - ۱۷۴۸ء میں سراج اورنگ آبادی سے بیعت ہوئے اور سولہ سال تک ان کی خدمت میں رہ کر فیض حاصل کرتے رہے۔ اپنے انتقال سے چار ماہ ۲۲ یوم قبل (یعنی ۱۵ جمادی الاول ۱۱۷۷ مطابق ۲۱ نومبر ۱۷۶۳ء) جو سراج کے مرشد حضرت شاہ عبد الرحمٰن چشتی علیہ الرحمہ (ف ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) کے عرس کا دن تھا، سراج نے شہر کے مشائخ اور معزز حضرات کی موجودگی میں شاہ ضیاء الدین پروانہ کو خلعت و اجازت سے بھی سرفراز کیا تھا

آخر سراج نے ۵۲ سال عمر پا کر جمعہ ۴ شوال ۱۱۷۷ھ / مطابق ۶ اپریل ۱۷۶۴ء ظہر کے وقت اورنگ آباد ہی میں انتقال کیا۔ وہ ساری عمر مجرّد رہے لفظ احمد سے ان کی عمر کے اعداد اور خاتم الولایت احمد سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔

مقدمہ انوار السراج سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی سے سراج کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ حکیم بیگ حاکم نے بھی سراج سے دو بار اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے۔ ایک بار وہ سراج کے گھر پر ان سے ملا تھا۔

ضیاء الدین پروانہ برہان پوری نے سراج کے انتقال کے بعد علامہ غلام علی آزاد بلگرامی سے شعر و ادب میں تلمذ کا رشتہ قائم کیا اور میر فخر الدین اورنگ آبادی سے فیوض روحانی حاصل کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے سراج کے ملفوظات بھی انوار السراج کے نام سے فراہم کئے تھے اس میں ان کے آخر زمانۂ عمر اور مرض وفات و رحلت کا حال تفصیل سے لکھا۔ اگر یہ مجموعہ دریافت ہو جائے تو سراج کی زندگی کے بہت سے گوشے روشن ہو جائیں گے۔

اپنے بارے میں خود سراج نے جو کچھ دیباچہ منتخب دیوانہا میں لکھا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲-۱۳ سال کی عمر تک تحصیل علم میں مشغول رہے تیرہ سال کے ہوئے تو سلطان عشق کا غلبہ ہوا اور یہ بیخودی کے عالم میں سات سال تک حضرت برہان الدین غریب کے روضے پر پڑے رہے، راتوں کو جاگتے اور دشت نوردی کرتے تھے، اور والہانہ انداز میں شعر کہتے تھے، اس کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا اسی عالم میں کچھ زمانہ وہ بھی گذرا جب ان کے والد سید درویش محمد نے ان کے پیروں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

کچھ زمانے کے بعد افاقہ ہوا اور انہیں تقریباً ۱۱۴۴ھ / ۱۷۳۱ء) سید عبد الرحمٰن چشتی کا دامن ہاتھ آ گیا انہوں نے فقر و فنا کی ساری منزلیں طے کرا دیں۔ سراج نے بیعت کے کچھ زمانے کے بعد مرشد کے حکم کی تعمیل میں شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔ ان کا جو اردو کلام ہمیں ملتا ہے وہ صرف ۲۸ سال کی عمر تک کہا ہوا ہے اور ان کی شعر گوئی کا کل زمانہ ۱۵-۱۶ سال قرار پاتا ہے اتنی کم عمر اور اتنی تھوڑی مدت میں بہت کم فن کاروں نے اتنا شاندار اور لازوال سرمایہ یادگار چھوڑا ہے سراج نے جب شعر گوئی ترک کی ہے (۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء) اس وقت تک

میر اور سودا نے شعر کہنا شروع بھی نہیں کیا تھا[13]

مجھے بعض تذکرہ نویسوں کا یہ بیان صحیح ماننے میں تردد ہے کہ "در سلک سپاہیاں نوکری می کرد، الحال ترک روزگار کردہ"[14] سادات بارہہ فوج ہی نوکری تو کیا کرتے تھے اور اسی کے لئے وہ مشہور تھے، مگر سراج کو اس کا وقت ہی کہاں ملا؟ یہ ممکن ہے کہ بہت ہی تھوڑے وقفہ کے لئے اور محض اُن کو نفسیاتی علاج کے طور پر شغل دنیا میں پھنسانے کے لئے انہیں کسی رسالے میں بھرتی کرایا گیا ہو مگر اس کی اور کوئی شہادت نہیں ہے۔

سراج کے بارے میں اور بھی بہت سے بے سروپا افسانے مشہور ہو گئے ہیں بعض نے لکھا ہے کہ رسول خاں نامی اُن کے منظورِ نظر تھے حالانکہ عبدالرسول خاں اُن کے پیر بھائی تھے اور سب سے پہلے اُنہوں نے ہی کلام سراج جمع کیا تھا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے کسی ہندو عورت پر عاشق ہونے کی داستان بیان کی ہے لیکن یہ سب خیالی قصے اور بے سروپا باتیں ہیں شیفتہ اور خوشگو نے لکھا ہے کہ یہ کسی ہندو پر عاشق ہو گئے اور جب لڑکی کے باپ نے اپنے مرشد کے حکم سے دونوں عاشق و معشوق کو یکجا ہونے کا موقع دیا دونوں کا ایک ساتھ دم نکل گیا" چون کام پروانہ از وصل جاناں غیر از جان دادن نیست، سراج پروانہ وار گرد آن چراغ محفل حسن گردیدہ جان بجان آفرین سپرد او نیز شمع کردار لختے بر سر نعش سوختہ خویش گریستہ مرد"[15]۔ محمد حسین خاں مولف ریاض الفردوس نے بھی یہی کہانی دہرا دی ہے کہ "عشق شمع روئیں ہنگام وصال جان دے گیا"[16]۔

اپنی داستان عشق البتہ سراج نے مثنوی بوستان خیال میں نظم کر دی ہے بعض دوسری مثنویوں میں بھی کچھ سوانحی اشارے مل جاتے ہیں۔ ان کے آخری زمانے اور بیماری کی کیفیت سراج کے خطوط میں موجود ہے۔ جن کے اقتباسات سروری نے مقدمہ کلیات میں درج کئے تھے، شفیق اورنگ آبادی کی سراج سے ذاتی ملاقات تھی اس نے لکھا ہے کہ "شاہ سراج خیلے صاحب سوز و گداز بود"[17] اُن کے کلام سے بھی طبیعت کے سوز و گداز اور رقت طبع کا پتا چلتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُن کے گھر پر ہر ہفتہ محفل سماع منعقد ہوتی تھی جس میں ہم مشرب اور ہم ذوق احباب شریک ہوتے تھے اور وجد و حال کا ہنگامہ گرم ہوتا تھا۔

۳

سراج اورنگ آبادی آج اُردو کے نہایت اہم اور اُن سربرآوردہ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اُردو شاعری کی بنیادیں مضبوط کی ہیں، لیکن اپنے زمانہ حیات میں وہ ایک صاحبِ حال صوفی اور درویش کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے اور شاعری اُن کے لئے

---

[13] سراج کو بعض تذکرہ نگار نکات جلد ۱/۱۰۱، مثلاً میر حسن ۸۰، شوق/۲۲) سید حمزہ علی دکنی کا شاگرد لکھتے ہیں لیکن قدیم تر مآخذ سے یہ بات ثبوت کو نہیں پہنچتی۔

[14] تحفۃ الشعراء (قاقشال) قلمی۔ آصفیہ (بحوالہ مقدمہ کلیات سراج)

[15] گلشن بے خار ص گلشن ہمیشہ بہار ۱۷۲

[16] ریاض الفردوس ص ۹۱ (لاہور ۱۹۶۸ء) [17] گل رعنا (مشمولہ تین تذکرے) ۲۲۵

ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ (پروانہ نے لکھا ہے۔

شاعری ننگِ سید ما بود   دیگراں افتخار می دانند[1]

اُنہوں نے اسے اپنے واردات قلبی کے اظہار کا وسیلہ بنا لیا تھا' اس لئے ہمیں اُن کی شاعری میں تصوف کا وہ رنگ نہیں ملتا جسے برائے شعر گفتن خوب است' کہا گیا ہے، بلکہ وہ ایک عملی صوفی (PRACTISING) کے وجد و حال، ذوق و شوق، ولولہ و غرام اور کرب و نشاط کی سچی تصویر ہے۔ انہوں نے مصطلحات تصوف کا استعمال زیادہ نہیں کیا ہے' لیکن کیفیات وہی بیان کی ہیں' جنہیں اصطلاحی زبان میں کہا جاتا ہے تو وہ مسائل تصوف بن جاتی ہیں۔

سراج چشتی سلسلہ میں بیعت ہیں' اگرچہ ابھی تک اُن کے پیر و مرشد شاہ عبدالرحمٰن چشتیؒ کے بارے میں کچھ معلومات نہیں مل سکی ہیں لیکن غالب گمان یہ ہے کہ وہ سلسلہ چشتیہ نظامیہ سے وابستہ رہے ہوں گے کیونکہ اس سلسلے کی اور کوئی شاخ اس وقت تک دکن میں رائج نہیں ہوئی تھی اور اس سلسلہ کی ایک بڑی خانقاہ حضرت نظام الدین اورنگ آبادی (ف ۱۲ ذی قعد ۱۱۴۲ھ / ۱۸ مئی ۱۷۳۰ء) کی اورنگ آباد میں موجود ہے جو حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی (متوفی ۲۴/ ربیع الاول / ۷ اکتوبر ۱۷۲۹ء) کے مرید و خلیفہ ہیں اور حضرت شاہ نظام الدین کے فرزند حضرت شاہ فخر الدین محب النبی نظامی (۲۷ جمادی الثانیہ ۱۱۹۹ھ / ۷ مئی ۱۷۸۵ء) اپنے زمانے میں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے مجدد ہوئے ہیں۔ ممکن ہے شاہ عبدالرحمٰن چشتی کو حضرت شاہ نظام ہی سے فیض روحانی ملا ہو کیونکہ دونوں کا زمانہ ایک ہی ہے۔

چشتی سلسلہ کی خصوصیات میں سوز و گداز' وجد و شوق اور عشق و محبت بہت نمایاں ہیں اس کے علاوہ سلسلہ چشتیہ کے اکثر بزرگ مسلک وحدت الوجود کے قائل رہے ہیں۔ سراج کے کلام سے سوز و گداز یا وجد و شوق کی مثالیں دینا تو باعث طول کلام ہوگا البتہ اُن کے نظریۂ توحید کی طرف اشارہ کرنے والے بعض اشعار پیش کرتا ہوں۔ ؎

اے بت پرست دیدۂ بینا سے دیکھ توں   یک ذات میں ظہور ہوا کئی صفات کا   (۷/۹)
مت کر دو شمع کوں بدنام، جلاتی وہ نہیں   آپ سے شوق پتنگوں کون ہے جل جانے کا   (۳/۱۸)
پردہ ستری کھلا ہے جس اوپر   عالم ظاہر کا وہ غافل ہوا   (۳/۲۲)
یار کا دیدار پا کر اے سراج   شکر رحمٰن کر کہ تو واصل ہوا   (۷/۲۲)
کفر و ایماں دو ندی ہیں عشق کی   آخرش دونوں کا سنگم ہوئے گا   (۴/۳۰)
جو کوئی شغل کثرت سے خالی ہوا   وہ اسرار وحدت کا حالی ہوا   (۱/۵۵)
ہرگز نہیں ہے اُس کو حقیقت کی چاشنی   جن نے مزہ چکھا نہیں عشق مجاز کا   (۱۱/۶۰)
جسے شغل ہے نحو اور صرف کا   کہاں ہوش ہے عشق کے حرف کا   (۱/۶۱)
اپنی آنکھوں سے جو پنہاں نہ ہوا   اس نے کچھ علم ہی پیدا نہ کیا   (۲/۶۳)
جو اٹھا مجلس ناسوتی سے   محرم خلوت لاہوت ہوا   (۱/۶۵)

---

[1] کلیات سراج / ص ۲۸۵

نظر کو دیکھ ہر شے مظہر نور الٰہی ہے　　سراج اب دیدۂ دل سے صمد دیکھا صنم بھولا　　(۷/۶۶)
دو رنگی خوب نئیں یک رنگ ہو جا　　سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا　　(۱/۸۱)
مری چشم حیران کے درپن میں ظالم توجہ تری بے نیازی کو کہاں ہیں　　اگر دیکھتا ہے تو دیکھ آئینے میں خدائی و پیغمبری کا تماشا　　(۲/۸۹)

جس کون ہوا ہے آئینہ دل خیال دوست　　روشن ہے اس کی چشم میں نور جمال دوست　　(۱/۸)
دیکھتا ہوں سب طرف نگہ امتیاز میں　　کوئی دوسرا نظر نہیں آیا جمال دوست　　(۵/۸)
جب تلک عکس دوئی ہے تب تلک ہے گفتگو　　طوطی تصویر آئینہ نہیں گویا ہنوز　　(۵/۴)
حیرت کے مقامات میں قانون نوا نہیں　　ہے ساز خموشی لب تصویر کی آواز　　(۴/۶)

صنم ہزار ہوا تو وہی صنم کا صنم　　کہ اصل ہستی نابود ہے عدم کا عدم　　(۱/۲)
راہ خدا پرستی اول ہے خود پرستی　　ہستی میں نیستی ہے اور نیستی میں ہستی　　(۱/۵)
عشق میں اول فنا درکار ہے　　دل میں ترک ماسوا درکار ہے
ترک مقصد عین مقصد ہے اسے　　جس کو دل کا مدعا درکار ہے

●

زبان پر عاشق وحدت نوا کی　　بیان لیس فی دلق ہوا ہے
شراب معرفت پی کر جو کوئی مجذوب ہوتا ہے　　در و دیوار اس کو مظہر محبوب ہوتا ہے
بوالہوس کیوں تو راہ بھولا ہے　　عالم ظاہری ہیولا ہے

سراج کے کلام میں تصوف کے فلسفیانہ مباحث کی تلاش کرنا عبث ہوگا، وہ نظریۂ تصوف سے زیادہ عملی تصوف کے آدمی ہیں ہاں اُن کی شاعری کا مطالعہ بھگتی تحریک کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔ اُنہوں نے صاف اور سہل زبان میں عشق مجازی کے مضامین چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑی خوبی سے باندھے ہیں، وصل و فراق، بادہ و ساغر، چشم و گیسو، خال و خط کی قدیم علامتوں اور استعاروں سے اُنہوں نے اپنی سرمستی و سرشاری، بے خودی و بیقراری، والہانہ کیفیات و واردات کا بڑا پُرتاثیر بیان کیا ہے۔ کیفیات عشق اور سوز و سرمستی کے اظہار کی قدرت رکھنے والے ہمارے صوفی شعراء کی فہرست میں سراج اورنگ آبادی کا نام سب سے پہلا ہے، اُن کے بعد ہم خواجہ میر درد، شاہ نیاز احمد بریلوی، امجد حیدر آبادی اور بیدم وارثی ہی کا ذکر کر سکتے ہیں۔

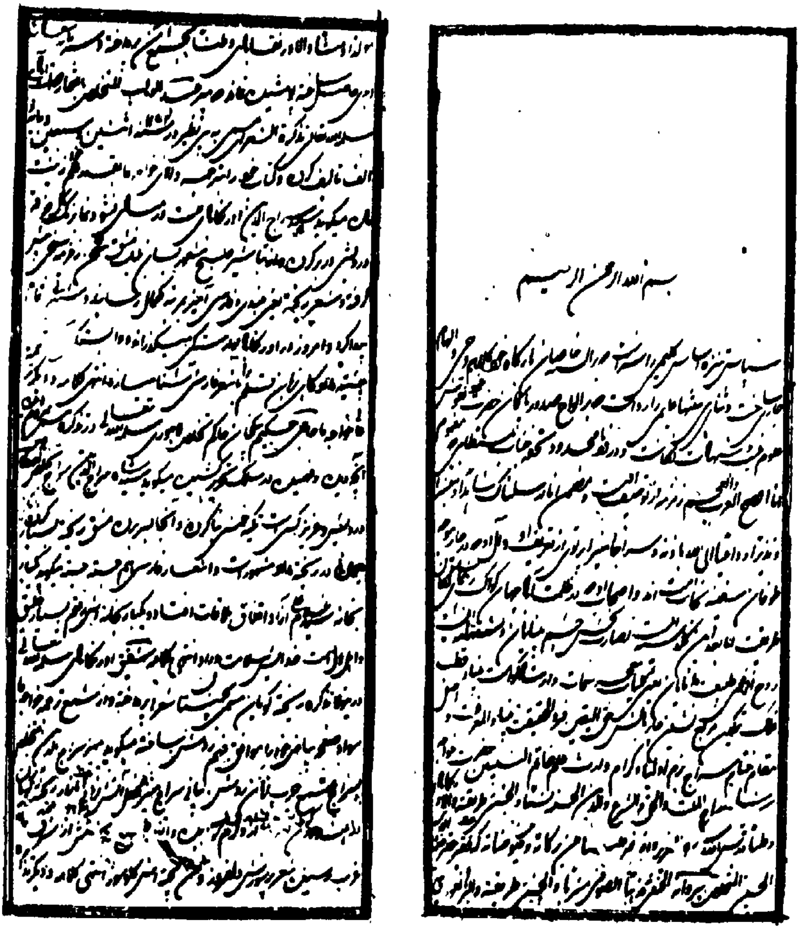

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ کلیات سراج اورنگ آبادی مکتوبہ ۱۱۸۷ھ کا پہلا ورق

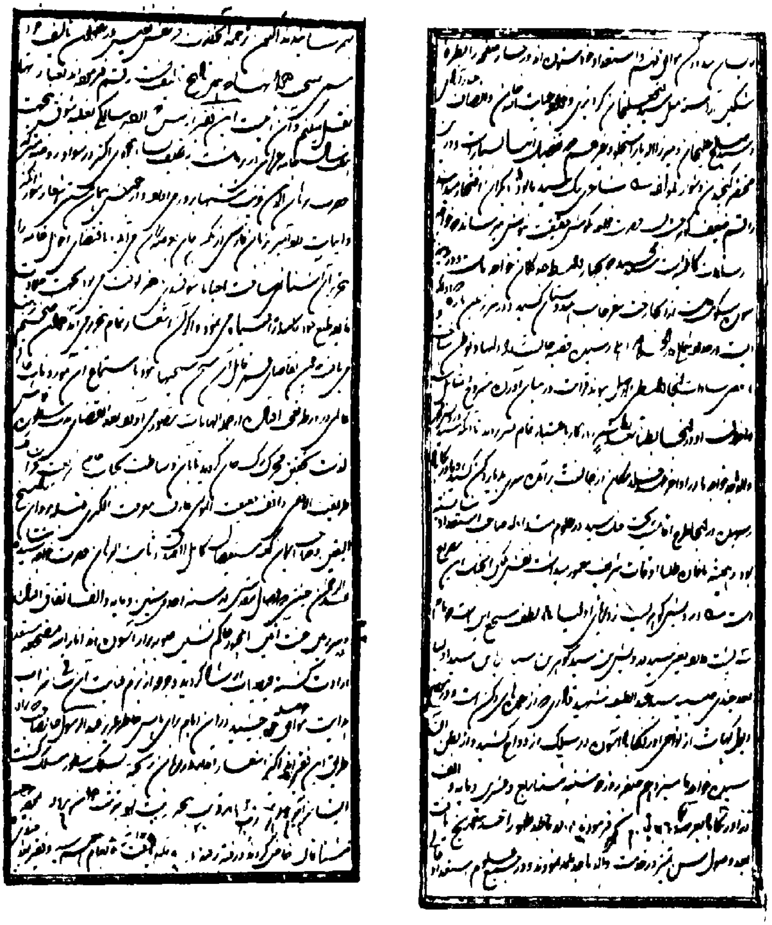

دیباچہ کلیات سراج اورنگ آبادی کا دوسرا ورق

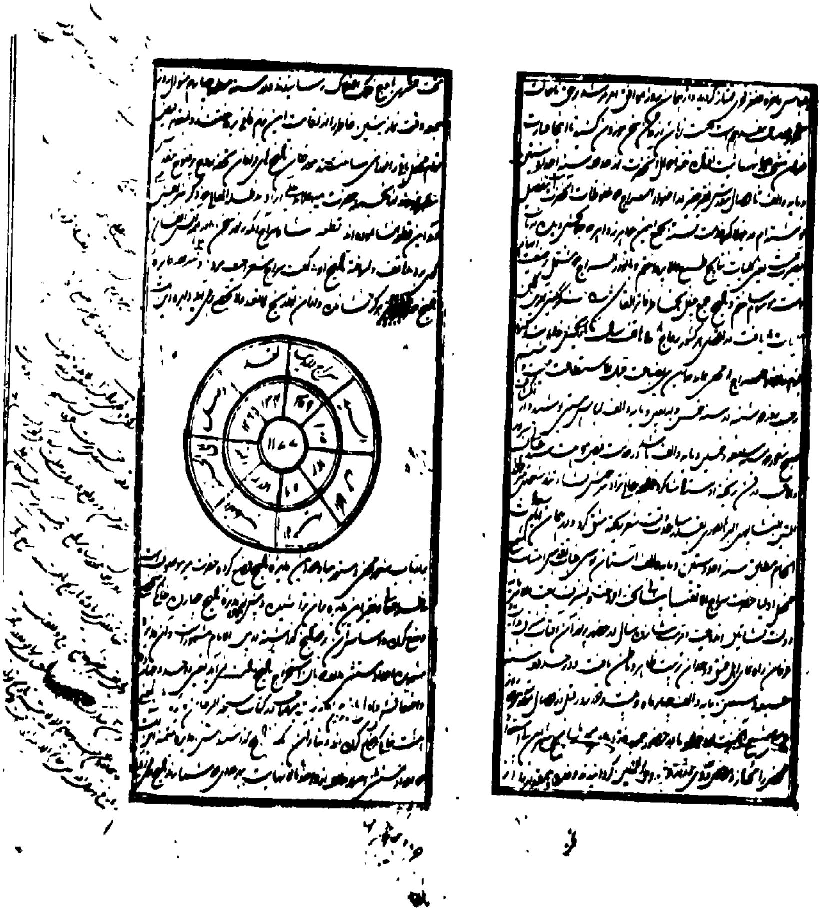

دیباچہ کلیات سراج اورنگ آبادی مکتوبہ سنہ ۱۱۸۷ھ کا تیسرا ورق

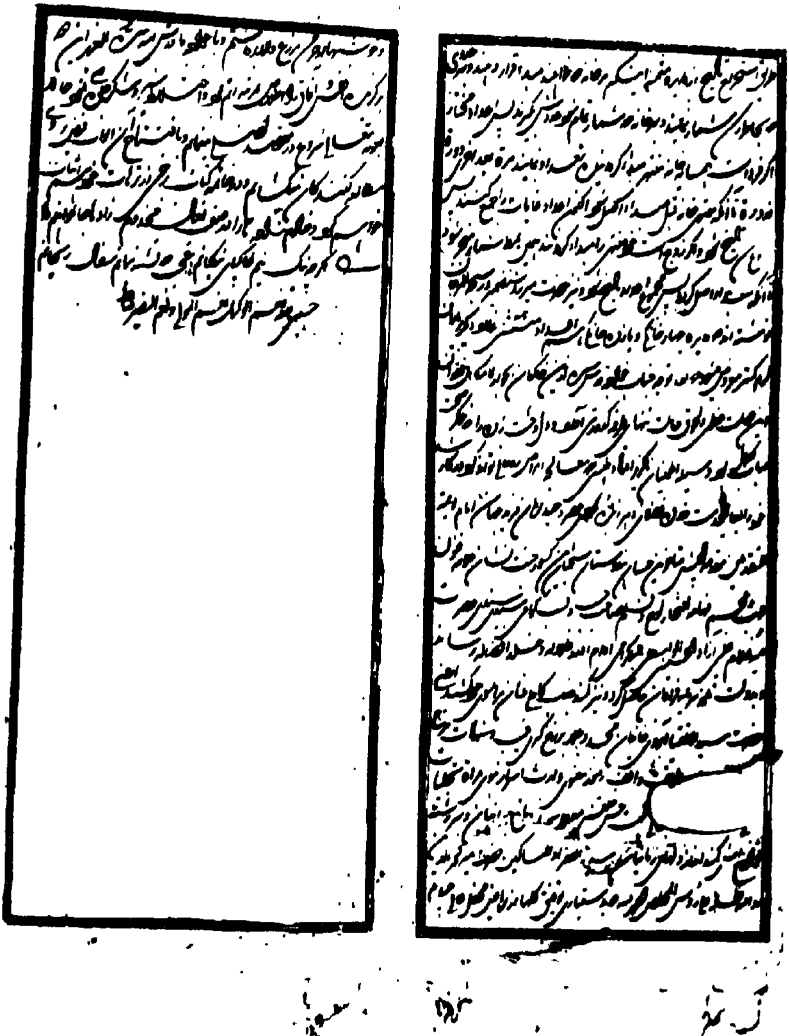

دیباچہ کلیات سراج اورنگ آبادی کا چوتھا ورق

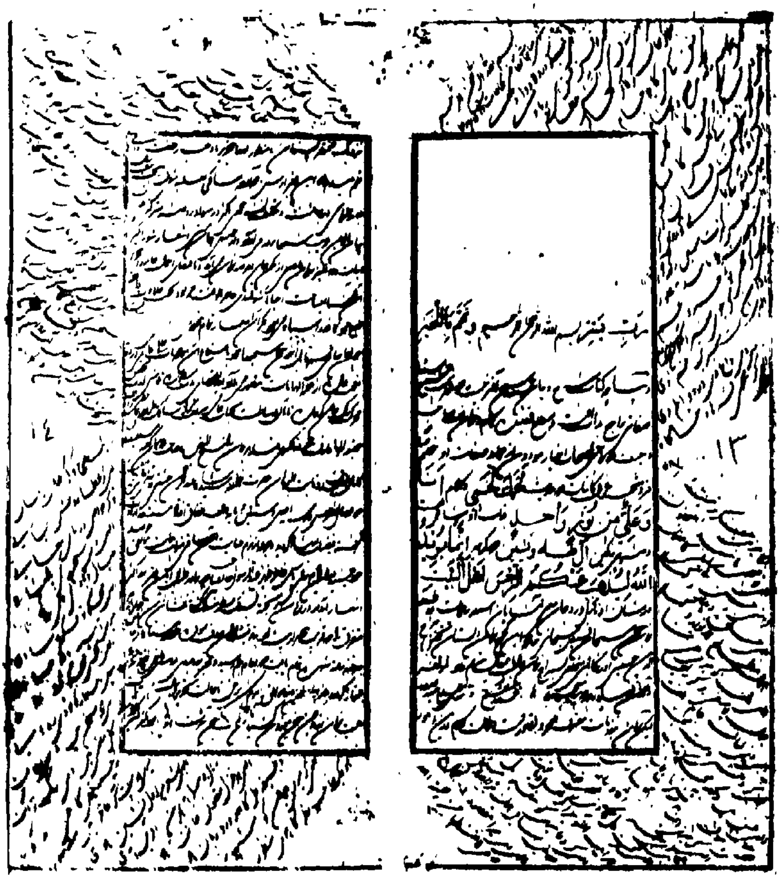

"منتخب دیوانہا" مولفہ دیباچہ سراج اورنگ آبادی مکتوبہ ۱۱۸۷ھ

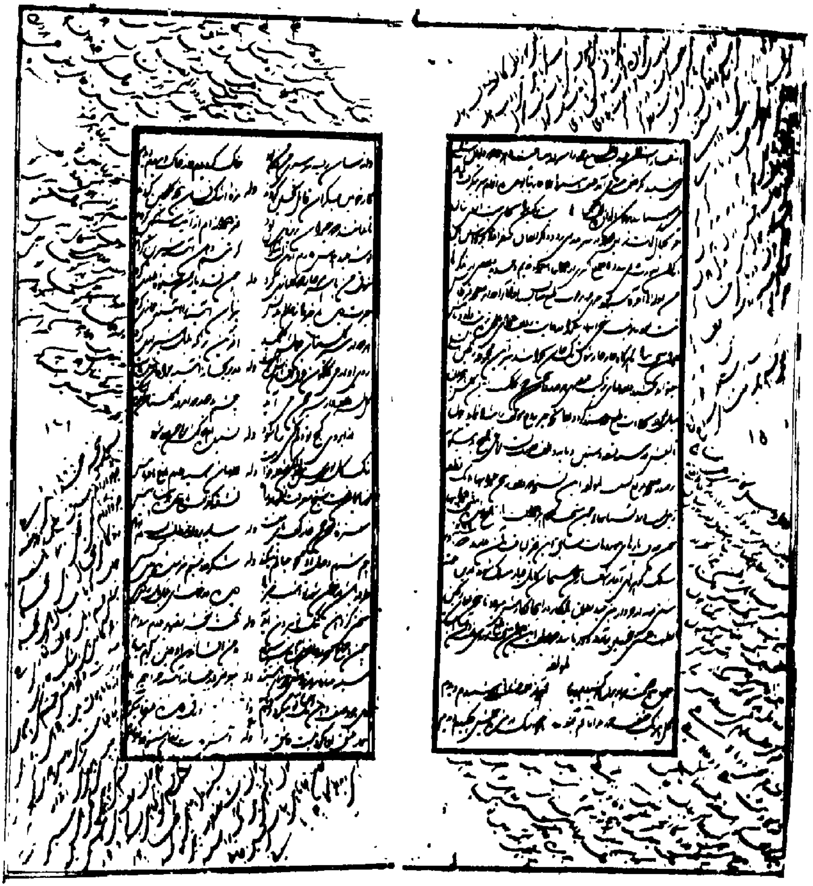

دیباچہ "منتخب دیوانہا" نوشتہ سراج اورنگ آبادی

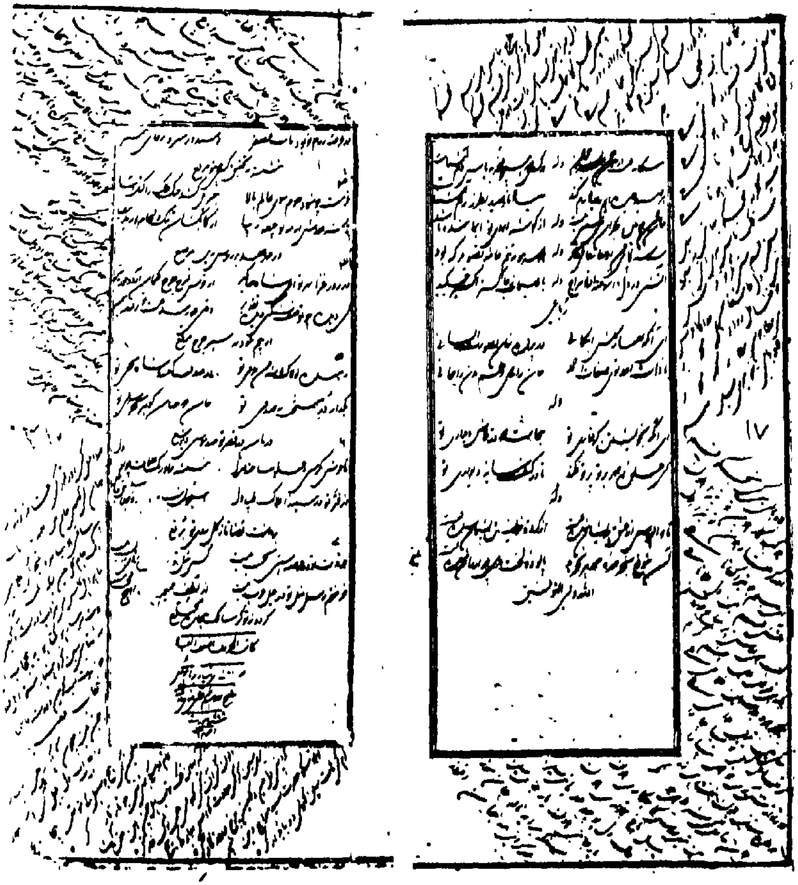

کلیات سراج اورنگ آبادی نوشتۂ ضیا برہان پوری مکتوبہ ۱۱۸۷ھ کا آخری ورق

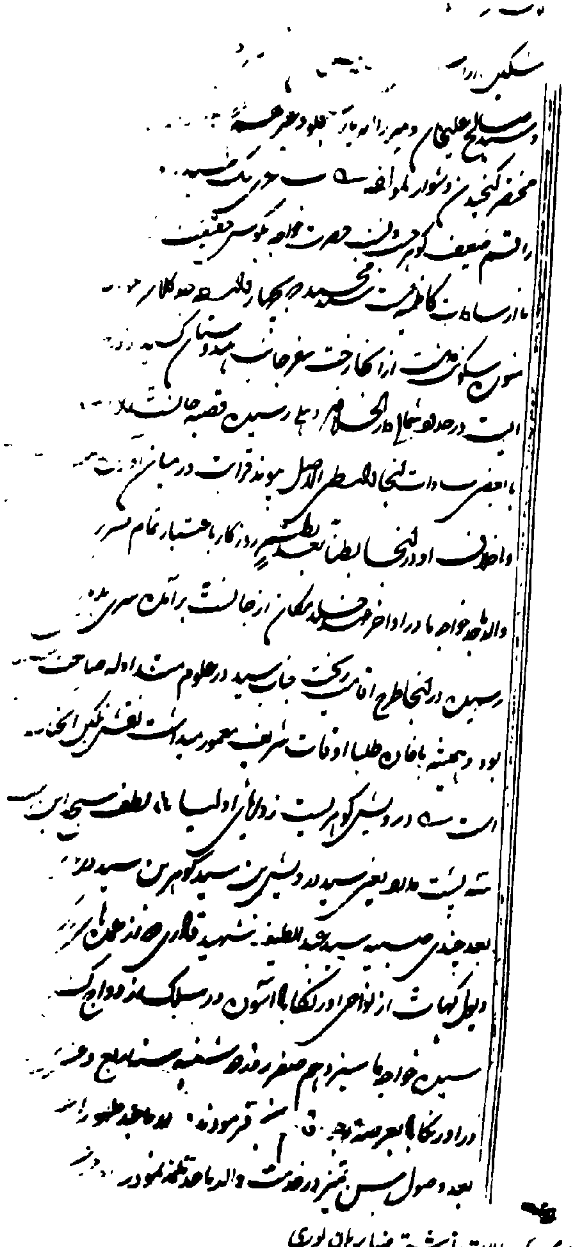

سراج اورنگ آبادی کے حالات نوشتہ ضیا برہان پوری

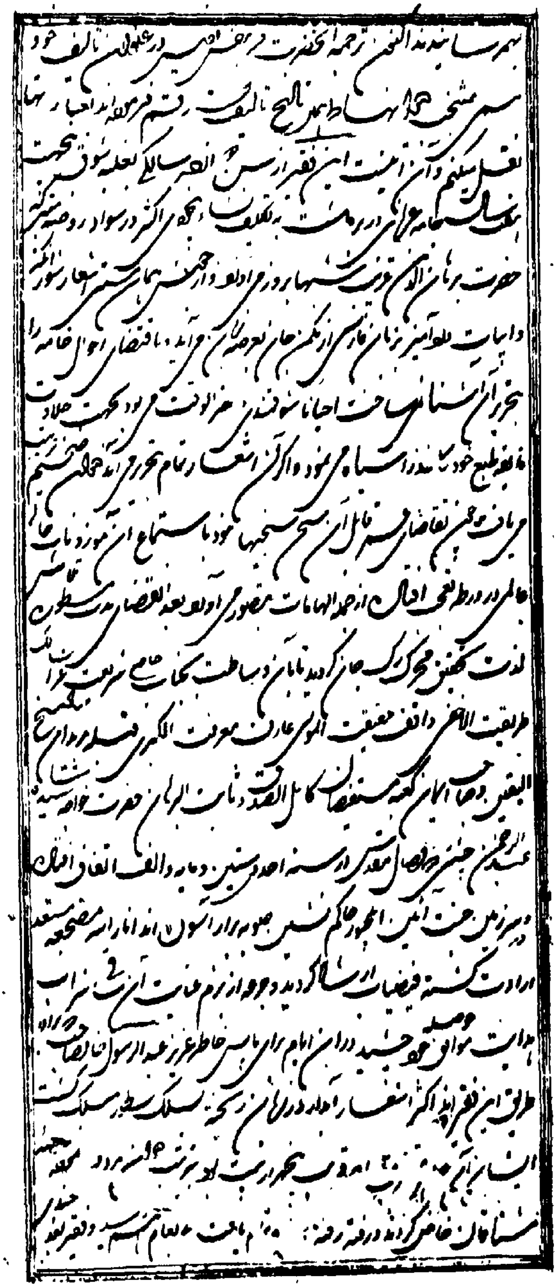

سراج اورنگ آبادی
کے حالات نوشتہ
ضیا برہان پوری

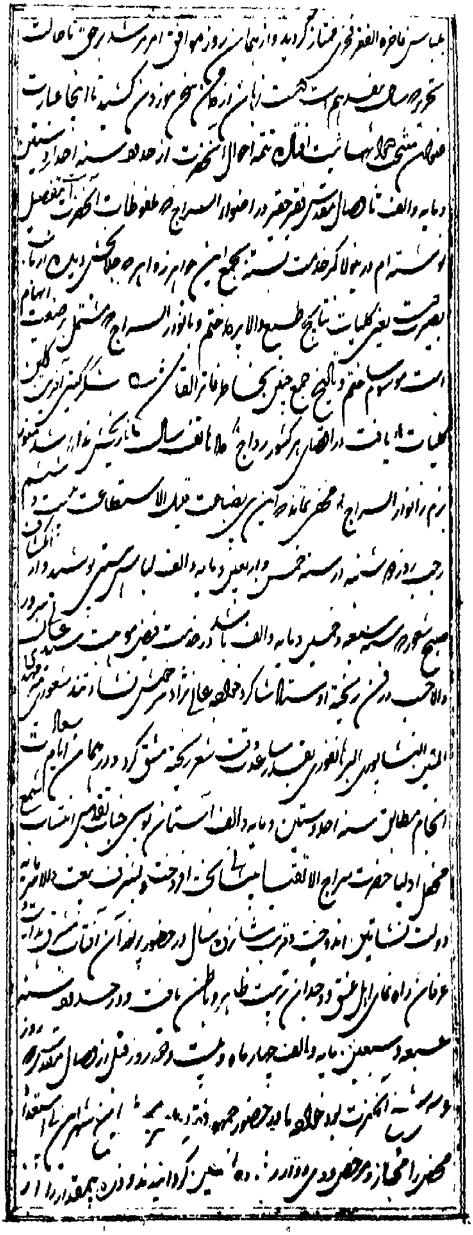

جامه لباس فاخره الفقر فخری ممتاز گردید و از همان روز موافق امر مرشد برحق تا حالت
تحریر رساله [illegible] است هشت سال از زمان سخن موزون کشیده تا اینجا عبارت
[illegible] ثبت است نقل تمام احوال آنحضرت از حدود سنه احدی و ستین
و مائه و الف تا وصال [illegible] فقیر حقیر در اضواء السراج که ملفوظات آنحضرت است مفصل
نوشته ام [illegible] نسخه مجمع این جواهر زواهر که جلا بخش دید ارباب
بصیرت یعنی کلیات نتائج طبع الابرار [illegible] و بانوار السراج مشتمل بر صنعت ایهام
است موسوم [illegible] و تاریخ جمع چنین [illegible] نسخه [illegible] کلیات
کلیات یافت در اقصای هر کشور رواج [illegible]
بزم را انوار السراج [illegible] الاستطاعت [illegible]
رجب روز دوشنبه در سنه خمس و اربعین و مائه و الف [illegible] نوشیده و از
صبح شعور در سنه سبع و خمسین و مائه و الف تا [illegible] در خدمت فیض موهبت سید عالی [illegible]
والا حسب در فن ریخته [illegible] خواجه عالی نژاد [illegible]
[illegible] شعر ریخته مشق کرد و در همان ایام
انجام [illegible] سنه احدی و ستین و مائه و الف [illegible]
محفل ادبا حضرت سراج الالقاب [illegible]
دولت نشاتین [illegible] سال در حضور [illegible] آن آفتاب [illegible]
عرفان راه نمای اهل عشق و وجدان تربیت ظاهر و باطن یافت و در [illegible] سنه
سبع و سبعین و مائه و الف چهار ماه و بیست [illegible] روز قبل از وصال [illegible]
[illegible] آنحضرت [illegible]
[illegible]

سراج اورنگ آبادی
کے حالات نوشتہ
ضیا برہان پوری

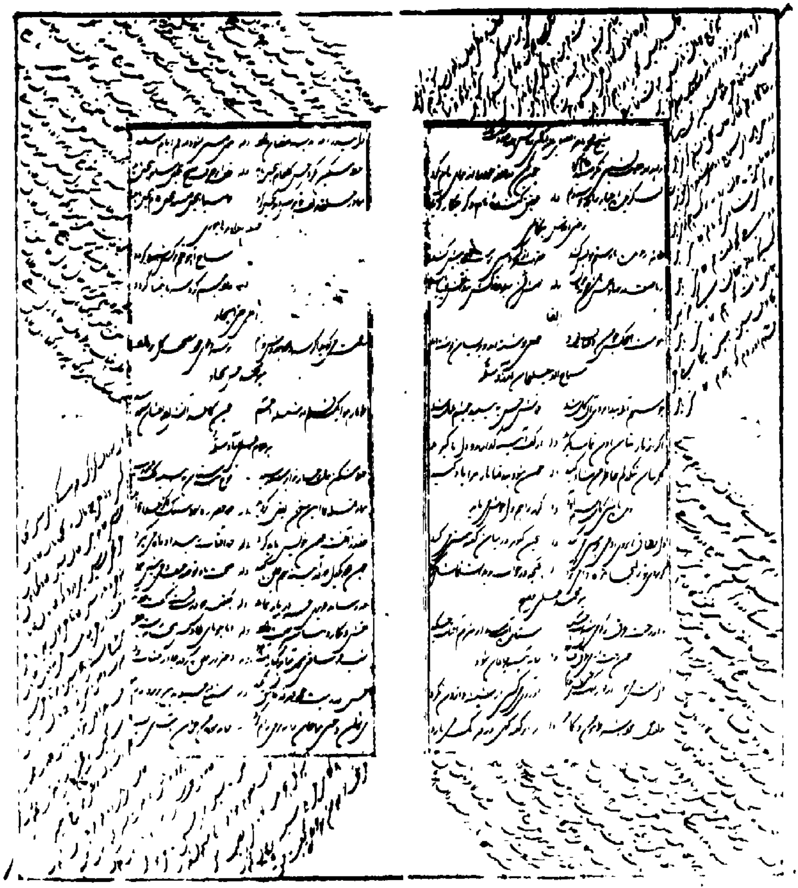

منتخب دیوانہا مرتبہ سراج اورنگ آبادی کا ایک ورق

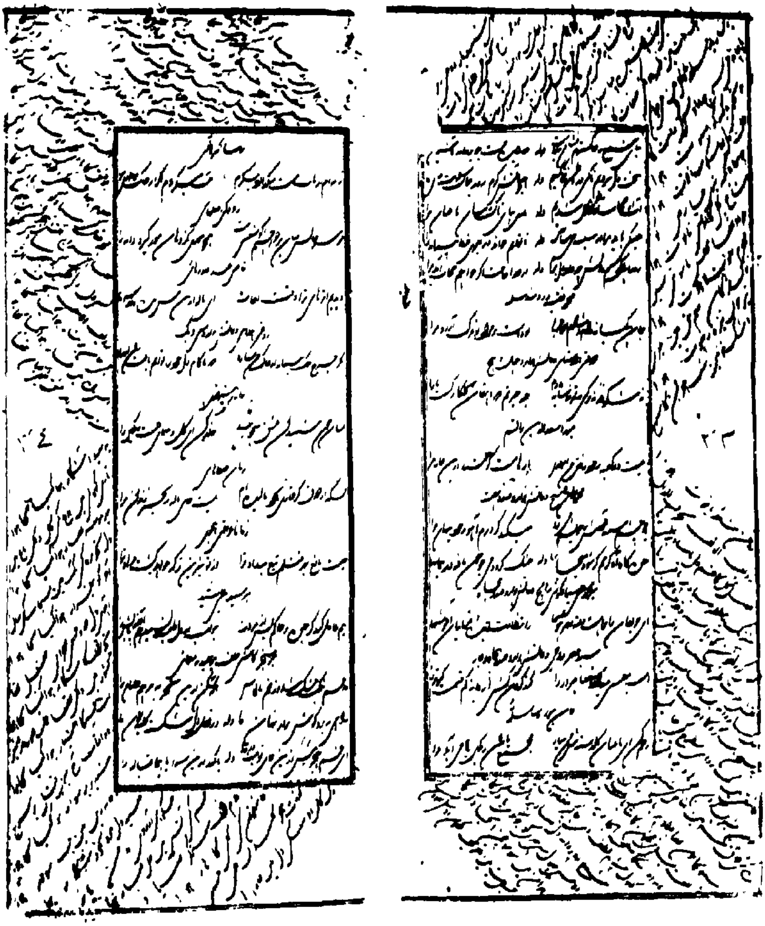

منتخب دیوانہا مرتبہ سراج اورنگ آبادی کا ایک ورق

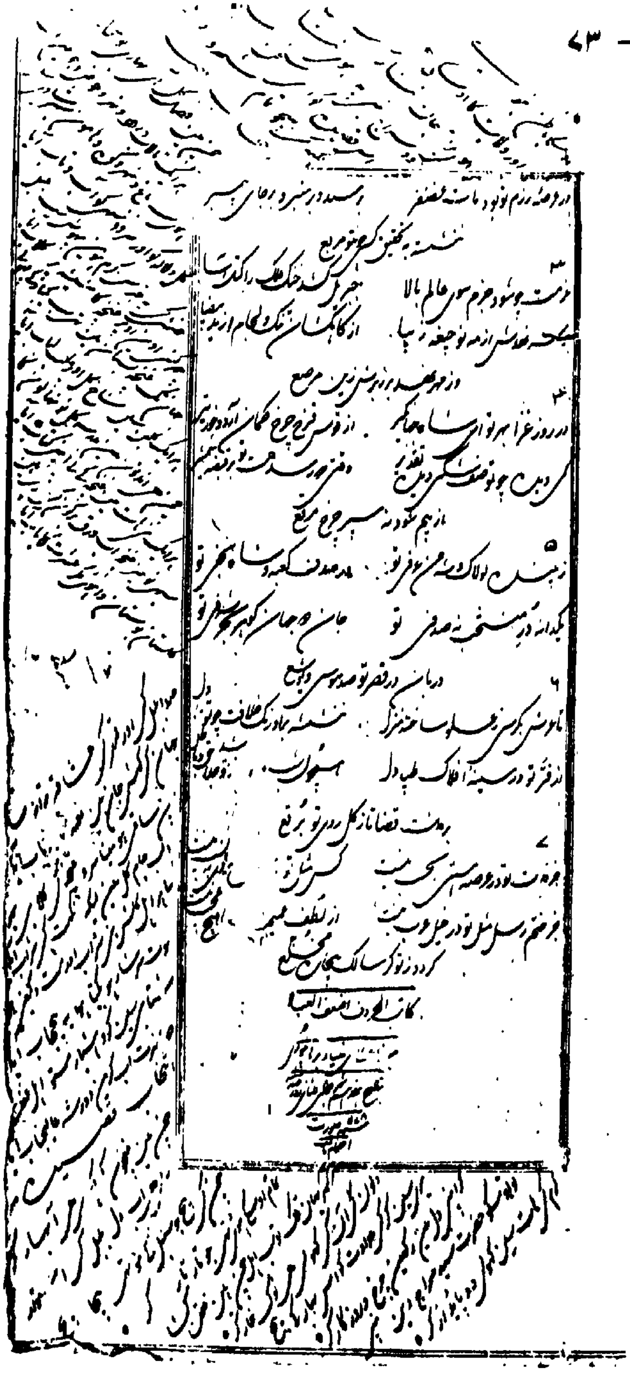

کلیات سراج
اورنگ آبادی مکتوبہ
۱۱۸۷ھ کا آخری ورق

میرؔ کی دریائے عشق کا ایک نادر و نایاب مخطوطہ

مکتوبہ سنہ ۱۲۰۶ ہجری (مطابق سنہ ۱۷۹۳ء) اور

میرؔ کا غیر مطبوعہ کلام[1]

اکبر حیدری کاشمیری

میرؔ کی دریائے عشق اُردو کی ممتاز مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ دلّی میں تصنیف ہوئی تھی اور غالباً میرؔ کے عالم شباب میں۔ کتب خانۂ ادبیات اُردو حیدرآباد میں دیوان میرؔ کا قدیم ترین مخطوطہ محفوظ ہے۔ یہ دیوان دوم ہے۔ اس میں دریائے عشق بھی صفحہ ۲۲۶ سے صفحہ ۲۴۴ تک شامل ہے۔ دیوان "قصیدہ در شکایت نفاق یاران زمان" ورق ۱۷۵ کے دوسرے صفحہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ قصیدے کا آخری شعر یہ ہے: ؎

کہاں تلک میں کروں اس نفاق کا شکوہ
خموشی اب تو ہے اولیٰ کہ اس میں راحت ہے

اس کے بعد ذیل کا ترقیمہ ہے:-

"تمت تمام شد دیوان میر تقی بتاریخ بست و نہم شہر شوال روز پنجشنبہ سنہ ۲۰ جلوس شاہ عالم مطابق سنہ ۱۱۹۲ ہجری

---

[1] میرؔ کے تفصیلی حالاتِ زندگی اور اُن کے غیر مطبوعہ کلام دیوان میرؔ نسخۂ محمود آباد (مطبوعہ "نقوش" لاہور اکتوبر ۱۹۸۰ء) کی طرف رجوع کیجیے۔ ذیل میں چند مزید غیر مطبوعہ شعر درج کیے جاتے ہیں تاکہ ایک جا محفوظ رہ سکیں۔

۱۔ بے جرم تہ تیغ کیا اس نے گلے کو — کچھ بات ہوئی منہ سے نکلتی تھی بھلے کو — (بیاض قدیم آگرہ)
۲۔ دیکھ رونا میرا اُس نے ہنس دیا — برق چمکی ابر باراں تھم گیا — (مجموعہ انتخاب ۱۸۶۳ء)
۳۔ غضب ہے کہ کھینچا ہے ڈھڈوں نے سر — نکالے ہیں دو چار چینٹیوں نے سر — (مثنوی اژدر نامہ۔ کلیات میرؔ نسخۂ رامپور)
۴۔ چھیڑیں نہ مجھ خاطرِ افسردہ کو — مردہ ہلکا جھانٹ اکھاڑے سے نہ ہو — (در مذمت آئینہ دار۔ نسخۂ رامپور)
۵۔ سائل ترے در پر کون آ کر بولا — جس کو نہ موتیوں میں تُو نے تولا — (دیوان فریدی مطبوعہ ۱۲۵۶ھ لکھنؤ
یہاں تک تو ترے ہاتھ نے بخشے یاقوت — جو طشت نے وقت فصد دامن کھولا — راجہ صاحب محمود آباد)

ان اشعار کے علاوہ، ایک پوری غزل نسخۂ سالار جنگ کے ضمن میں مضمون میں شامل کی گئی ہے۔ وہ بھی کلیات میرؔ کے مطبوعہ نسخے میں نہیں ملتی ہے (اکبر حیدری)

بحسب فرمائش میاں محمد شکر اللہ من مقام شاہ جہاں آباد و بخط احقر العباد بندہ رادھاکشن کاتب تحریر یافت ۔"

مثنوی دریائے عشق کا جو دوسرا پرانا مخطوطہ راقم حروف کو دستیاب ہوا ہے وہ ۱۲۰۶ھ مطابق ۱۷۹۲ء کا مکتوبہ ہے۔ اس میں غیر مطبوعہ اشعار بھی ملتے ہیں، جن کی نشان دہی متن کے حواشی میں کی گئی ہے۔ یہ اشعار پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ مخطوطے کی ابتدا میں کچھ اشعار غائب ہیں۔ جب اسے ہم نے دوسرے نسخوں سے ملایا اور مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ اشعار میں اختلاف ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً میر نے اس پر نظرِ ثانی کی ہو۔ راقم کو یہ بیش بہا نسخہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے کتب خانے میں دستیاب ہوا۔ اس کے عکس کی فراہمی کے لیے جناب مہتمم کتب خانۂ ہذا شکریہ کے مستحق ہیں۔ تفصیلات یہ ہیں :۔

سائز ۶" × ۸½"، متن ۴½" × ۴½"، خط جلی نستعلیق مائل بہ شکست، سطر ۱۲۔ ترقیمہ: "مثنوی (کذا) میر تقی برائے خواہش خود بتاریخ دوازدہم ذوالحجہ ۱۲۰۶ھ تحریر یافت ۔

نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید

دریائے عشق کے جو قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں دستیاب ہیں ان کی تعداد ۱۶ ہے۔ تفصیلات کے لیے جائزہ مخطوطات اردو حصہ اوّل مطبوعہ ترقی اردو بورڈ لاہور مرتبہ جناب مشفق خواجہ ملاحظہ ہو۔ جن نسخوں سے ہم نے استفادہ کیا ہے ان کا ذکر خواجہ صاحب نے نہیں کیا ہے۔ اس لیے ان کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں :۔

۱۔ نسخۂ آگرہ (ا) آگرہ میں کچہری کے قریب ایک عربی مدرسہ شعیب محمدیہ اینگلو اورینٹل کالج ہے۔ مدرسہ میں ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں ایک مخطوطہ "بیاضِ قدیم" مدش نمبر ۳۲ کے تحت موجود ہے۔ بیاض میں میر تقی میر، میر درد، شاہ نصیر دہلوی، میاں روشن شاہ، مصحفی، سودا، افسوس، میر سوز، انشا، ماشاء اللہ خاں، بقا، خسرو وغیرہ وغیرہ شعرا کے اردو و فارسی کلام کا انتخاب درج ہے۔ اس میں فارسی میں کئی مجلسیں واقعۂ کربلا کے حال میں نقل کی گئی ہیں۔ بیاض میں میر کا یہ قطعہ بھی ہے جس کے بارے میں قاضی عبدالودود، پروفیسر آل احمد سرور اور علی سردار جعفری وغیرہ کہتے تھے کہ یہ میر کا نہیں ہے بلکہ اسے محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو !

اس قطعے سے پہلے میر کی مثنوی دریائے عشق بغیر کسی عنوان کے درج ہے۔ آغازِ مثنوی میں درج ذیل عبارت موجود ہے:

"تقی میر شروع مثنوی"

ابتداء:۔ عشق ہے تازہ کار تازہ خیال　　ہر جگہ اس کی اک الگ ہے چال
خاتمہ:۔ میر اب شاعری کو کر موقوف　　عشق ہے اک فتنۂ معروف
بس ہو اب مہرِ خامشی بہتر　　یہاں سخن کی فرامشی بہتر

پھر ذیل کا ترقیمہ درج ہے :-

"تمام شد مثنوی میر تقی بروز چہارشنبہ بتاریخ اوّل رجب المرجب ۱۲۱۶ھ ہجری" تاریخ کے بعد میر کا یہ غیر مطبوعہ شعر بھی ملتا ہے : ؎

بے جرم تہ تیغ کیا اس نے گلے کو
کچھ بات ہوئی موںہہ سے نکلتی تھی بھلے کو

۲۔ **نسخۂ سالار جنگ (س)** سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں شاہ کمال کا تذکرہ "مجمع الانتخاب" مکتوبہ ۱۲۱۹ھ ہجری، (۱۸۰۴ء) موجود ہے۔ اس میں میر کا انتخاب ورق ۶۹۱ ا سے شروع ہو کر ورق ۷۳۲ پر ختم ہوتا ہے۔ انتخاب اتنا بھرپور ہے کہ کتابی صورت میں ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ پہلی غزل یہ ہے ؎

تھا مستعار حُسن سے اس کے جو نور تھا — خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا — ۱۰ شعر

ورق ۷۰۴ الف سے مثنوی دریائے عشق شروع ہوتی ہے۔ کمال نے اسے غلطی سے "مثنوی بجذب عشق" کے عنوان کے تحت درج کیا ہے۔ مثنوی ورق ۷۱۳ ب میں ختم ہوتی ہے۔ ورق ۷۰۸ الف میں اس شعر ؎

یار دریا کی جلد رخصت کی — اس طـــرح نکر رفع تہمت کی

کے بعد پانچ شعر کا ایک قطعہ ہے۔ پہلا اور آخری شعر یہ ہے۔ ؎

گہہ لوہو ٹپکتا ہے گہہ لخت دل آنکھوں سے — یا ٹکڑے جگر ہی کے ہر آن نکلتے ہیں۔
ان آئینہ رولوں کے کیا میر بھی عاشق ہیں — جب گھر سے نکلتے ہیں حیران نکلتے ہیں،

اس کے بعد "ولہ" کے نیچے خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ اُوپر کا قطعہ یہاں کیوں نقل کیا گیا۔ جب کہ یہ اس سے قبل مجمع الانتخاب میں انتخاب میر میں ورق ۶۹۷ الف میں پوری غزل کے ساتھ جس کا مشہور شعر یہ ہے۔ ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ملتا ہے۔ کمال نے دریائے عشق "انتخاب دیوان پنجم" میں شامل کی۔ اس میں ۲۵۵ شعر ہیں۔ کمال نے مثنوی میں ذیل کے عنوانات قرار دیئے ہیں :-

۱۔ مثنوی بجذب عشق — ورق ۷۰۴ الف
۲۔ ثابت شدنِ عشق برآں جوان و بدگماں شدنِ اہل۔ — ورق ۷۰۶ ب
۳۔ دربیان رخصت شدن دختر از پدر ۔ — ورق ۷۰۸ الف
۴۔ داستان فریب خوردن — ورق ۷۰۹ ب
۵۔ بردن دایہ دختر را با آشنائے پدرش و پس از یک ہفتہ آمدن دختر بخانہ و غرق شدن بہانۂ دریا۔ — ورق ۷۱۰ ب

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مجمع الانتخاب سے میرؔ کی وہ غزل بھی درج کی جائے جو ورق ۲۳، الف میں درج ہے۔ یہ غزل کلیاتِ میرؔ کے کسی نسخے میں نہیں ملتی ہے۔ کمال نے اسے "انتخاب دیوان سیوم" دو غزل سر دیوان۔ انتخاب دیوان سیوم میرؔ صاحب کے تحت نقل کیا ہے۔ غزل سے پہلے یہ شعر ہے ؎

بسکہ ہے گردون دون پروردنی
ہووے پیوند زمیں یہ کُشتنی

اس کے بعد غزل شروع ہوتی ہے ؎

شب اس سے کن کے بناوٹ سے لا جواب لے کے چلے (کذا)　　فسانہ دل کا جو ہم وقتِ خواب لے کے چلے
کیا ہے حکم غضب محتسب نے یہ کر کوئی　　بغل میں شیشہ نہ مست شراب لے کے چلے
سمندِ ناز کو ڈپٹے ہوئے تو جاتا ہے　　جو حکم ہو تو یہ فدوی رکاب لے کے چلے
کرے ہے یاد مجھے دیر سے شہِ خوباں　　کوئی حضور میں اس کے شتاب لے کے چلے
کبھی نہ لے گئے ہم دل کو اُس تک اچھی طرح　　جو لے چلے تو بہ حالِ خراب لے کے چلے
یہ سرنوشت میں تھا جاوے راہ میں مارا　　وہاں سے خط کا جو قاصد جواب لے کے چلے
یہ شیخ جی کی مشیخت ہے آگے جاویں آپ　　اور ایک آدمی پیچھے کتاب لے کے چلے

مُوا جو میرؔ ہے ان کا وہ اس کی تربت پر
گل اور شمع برائے ثواب لے کے چلے

(۳) **نسخۂ لندن** (ل) اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے کتب خانے میں "تین مثنویاں" کے نام سے فوٹو اسٹیٹ کی کاپیاں کتابی صورت میں مجلد ہیں جو انڈیا آفس لندن سے منگوائی گئیں۔ تینوں مثنویوں کو اب مخطوطے کی حیثیت حاصل ہے۔ مثنویاں یہ ہیں :- (۱) دریائے عشق میرؔ (۲) مثنوی مصحفی در جواب میر تقی (۳) مثنوی دیگر میر تقی۔

تیسری مثنوی کا پہلا شعر یہ ہے : ؎

ثنائے عشق آفریں ہے محال
زباں اس میں جنبش کرے کیا مجال

یہ مثنوی "اعجاز عشق" کے عنوان سے کلیاتِ میرؔ میں شامل ہے۔

(۴) **مطبع مسیحائی** (م) دریائے عشق کے کئی اڈیشن مطبع مسیحائی کانپور اور مطبع مصطفائی لکھنؤ میں چھپے تھے۔ ان میں سنہ ۱۲۶۲ ہجری اور سنہ ۱۲۶۷ ہجری کے نسخے قابلِ ذکر ہیں۔ مطبع مسیحائی کے نسخے کے ساتھ اعجاز عشق (میرؔ) شعلۂ عشق (میرؔ) او

---

[1] مصرعہ غیر موزوں ہے۔ "سے لا" سہو کاتب کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

نسخہ مجاہ بادشاہ بھی شامل ہیں۔ ان دونوں مطبعوں کے یہ دونوں اڈیشن اب بہت کمیاب ہیں۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

(۵) **نسخۂ کلکتہ (ک)** کلیاتِ میرؔ پہلی مرتبہ ۱۲۲۶ھ ہجری مطابق ۱۸۱۱ء میں کلکتہ میں چھپا تھا۔ یہ نسخہ نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ کتب خانہ شبلی نعمانی ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اچھی حالت میں موجود ہے۔ تفصیلات کے لیے دیوانِ میرؔ نسخۂ محمود آباد مرتبہ اکبر حیدری ملاحظہ ہو۔ نسخۂ کلکتہ میں ص۸۹ سے ص۱۰۹ تک مثنوی دریائے عشق بغیر عنوان کے درج ہے۔ فی صفحہ میں ۱۲ شعر دو کالمی ہیں۔ اس کے بعد یہ مثنوی کلیاتِ میرؔ کے سبھی اڈیشنوں میں چھپی ہے۔ مثنوی کے حواشی میں مخففات سے مراد ہے:

ا = نسخۂ آگرہ، س = نسخۂ سالار جنگ میوزیم، ل = نسخۂ لندن، م = نسخۂ مسیحائی۔ اصل = بنیادی نسخۂ زیرِ ترتیب، ندارد = موجود نہیں ہے۔ غیر مطبوعہ = شعر ابھی تک نہیں چھپا ہے۔

میرؔ نے دریائے عشق کو فارسی نثر کے قالب میں بھی ڈھالا ہے۔ کلیاتِ میرؔ (نسخہ رضا لائبریری رامپور) میں موجود ہے۔

دریائے عشق کے ماخذ کے بارے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا مضمون "میرؔ کی مثنوی دریائے عشق کا ایک ماخذ" سہ ماہی اُردو کراچی (بابت اپریل ۱۹۵۱ء) اور "نقوش" لاہور، میر تقی میرؔ نمبر ۲ میں ملاحظہ ہو۔

آخر میں قارئین کی سہولت اور دلچسپی کے لیے دریائے عشق کا خلاصہ مختصر الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

خلاصہ

ایک جا ایک جوانِ رعنا، سرو بالا، لالہ رخسار، اسیرِ زلفِ خمدار، آفت زدۂ لیل النہار، عاشق طرحدار سیرِ چمن سے گھر واپس جا رہا تھا۔ ناگاہ غرفے میں ایک مہ پارہ سے آنکھ لڑ گئی اور اُسے دیکھتے ہی صبر و قرار، ہوش و خرد اور دین و دل کھونے لگا۔ رفتہ رفتہ مہ پارہ کے اعزہ کو خبر ہوئی اور آپس میں یہ مشورت ہوئی کہ عاشقِ خستہ حال کو جان سے مار دیا جائے۔ پھر یہ خیال آیا کہ اس غیرتِ ماہ کو بدنامی سے بچنے کے لیے کسی آشنا کے گھر بھیجا جائے اور دایہ کے ساتھ کشتی میں سوار کر کے پارِ دریا کیا جائے۔ جونہی گھر سے محافہ نکلا تو جوانِ خانہ خراب بھی آہ و فغاں کرتا ہوا ہمرکاب ہوا۔ دایہ تو پرلے درجے کی مکار اور عیار تھی۔ اس نے عاشقِ جگر کباب کو بھی کشتیِ ہلال میں سوار کیا۔ جب کشتی بیچ دریا پہنچی تو دایہ نے رشکِ ماہ کی کفش پانی میں پھینک دی اور اس عاشقِ نیم جاں سے کہا کہ اگر غیرتِ عشق ہے تو اسے باہر نکال۔ اس کی گفتگو سے وہ کشتۂ مہتاب مثلِ سیماب تڑپنے لگا۔ بیچارہ دل گرفتہ معاملاتِ عشق سے نابلد تھا۔ نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ایک بیخودگی سے دریا میں کود پڑا۔ امواجِ گرداب زنجیرِ پا ہو گئیں اور ایسا ڈوبا کہ پھر نہ نکلا۔ دایۂ مکار، دشمنِ عاشقِ دل افگار شاداں ہوئی اور کشتی اس گلِ نو کو پار لے گئی۔ بعد یک ہفتہ وہ رشکِ حور، سراپا نور دایہ سے کہنے لگی کہ وہ عاشقِ نامراد عدم آباد کو چل دیا۔ اب میرا دل یہاں بے قابو ہو رہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ آج کل ہی جنون سوار ہونے والا ہے۔ پس یہی بہتر ہے کہ مجھے گھر لے چل۔ دایہ بولی ؎

کون مانع ہے گھر کے چلنے کا، سدِ رہ کون ہے نکلنے کا

صبح وہ غیرتِ خورشید دایہ کے ساتھ گھر سے روانہ ہوئی اور دوپہر کے وقت دونوں کشتی میں سوار ہوئیں۔ جب کشتی بیچ دریا کے

پہنچی تو دایہ سے یوں حرف زن ہوئی کہ جہاں وہ آرزومند ڈوبا تھا، اس جگہ کا نام و نشان بتا۔ دایہ نے نشان بتایا۔ مہ پارہ کہاں کہاں” کرتے عین اسی جگہ کود پڑی۔ کشش عشق اس کو بھی تہ دریا کھینچ گئی۔ مہ پارہ کے اعزہ اور خواص کو خبر ہوئی۔ وہ دریا میں کود پڑے‘ غوطہ زن ہوئے لیکن وہ دُرِ نایاب کہیں دستیاب نہ ہوا۔ اس کے والدین اور بھائی خاک بر سر چاک گریباں نوحہ کناں کنارے پر آن پہنچے۔ دام داروں نے جال بچھائے۔ آخرکار دونوں جواں مرگ عاشق و معشوق کی لپٹی ہوئی لاشیں برآمد ہوئیں۔

مثنوی دریائے عشق

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال　　ہر جگہ اس کی اک نئی[1] ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا　　کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا　　کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں رونا ہوا ندامت کا　　کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا
گہ نمک اس کو داغ کا پایا　　گہ پتنگا چراغ کا پایا
واں طپیدن ہوا جگر کے بیچ　　یہاں تبسم ہے زخم تر کے بیچ
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے　　کہیں یہ خونچکاں شکایت ہے
تھا کسی[2] دل میں نالۂ جانکاہ　　ہے کسو لب پہ ناتواں اک آہ
تھا کسو کی پلک کی نمناکی　　ہے کسو[3] خاطرِ دل کی غمناکی
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا　　کہیں موجب شکستہ رنگی کا
کہیں اندوہ جانِ آگہ تھا　　سوزشِ سینہ ایک جاگہ تھا
کہیں عشاق کی نیاز ہوا　　کہیں اندوہ جاں گداز ہوا
ہے کہیں دل جگر کی بیتابی　　تھا کسو مضطرب کی بے خوابی
کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا　　کسو محمل کی رہ کی گرد ہوا
طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا　　بیستوں میں شرار تیشہ رہا

---

[1] و۔ الگ۔

[2] س۔ کسو۔

[3] س۔ کہیں۔

کہیں نے بست کو لگائی آگ   کہیں تیغ و گلو میں رکھی لاگ
کبھو افغان مرغِ گلشن تھا   کبھو قمری کا طوقِ گردن تھا
کسو مسلخ جا تنارہ ہوا   کوئی دل ہو کے پارہ پارہ ہوا
ایک عالم میں دردمندی کی   ایک محفل میں جابہندی کی'
ایک دل سے اُٹھّے ہے ہو کر دُود   ایک لب پر سخن ہے خون آلود
اک زمانے میں دل کی خواہش تھی   اک سمیں میں جگر کی کاہش تھی
کہیں بیٹھے ہے جی میں ہو کر چاہ   کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
خار خارِ دلِ غریباں ہے   اِنتظارِ بلا نصیباں ہے،
کہیں شیون ہے اہلِ ماتم کا   کہیں نوحہ ہے جانِ پرغم کا
آرزو تھا اُمیدواروں کی   دردمندی جگر فگاروں کی

نمکِ زخمِ سینہ ریشاں ہے   نگہِ پاسِ مہرکیشاں ہے
حسرت آلود آہ تھا یہ کہیں   شوق کی یک نگاہ تھا یہ کہیں
کشش اس کی ہے ایک اعجوبا   ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا
کون محرومِ وصل یاں سے گیا   کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا
کام میں اپنے عشق پکّا ہے   ہاں یہ نیرنگ ساز پکّا ہے
جس کو ہو اس کی التفات نصیب   ہے وہ مہمانِ چند روزہ غریب

ایسی تقریب ڈھونڈ لاتا ہے
کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

آغاز قصہ جوانِ رعنا عاشق تن و دخترِ ماہ پیکری کند[۴۲] ۔

ایک جا اک جوان رعنا تھا   لالہ رخسار سرو بالا تھا
عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم   دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
شوق تھا اس کو صورتِ خوش سے   اُنس رکھتا تھا وضعِ دلکش سے
تھا طرحدار آپ بھی لیکن   رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
کوئی ترکیب اگر نظر آتی   صورتِ حال اور ہو جاتی

---

[۴۲] یہ عنوان م میں درج ہے۔ ک میں اس طرح ہے۔ "آغاز قصۂ جانگداز"

دیکھتا گر وہ کوئی خوش پرکار   رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار
زلف ہوتی کسو کی گر برہم   دیکھتے اُس کے حال کو درہم
دیکھتا گر کہیں وہ چشمِ سیاہ   دل سے بے اختیار کرتا آہ
سر میں تھا شورِ شوق دل میں تھا   عشق ہی اس کے آب و گل میں تھا
الغرض وہ جوان خوش اسلوب   ناشکیبا رہے تھا بے محبوب
ایک دن بے کلی سے گھبرایا   سیر کرنے کو باغ میں آیا
کسو گل پاس وہ صنم ٹھہرا   کہیں سبزے میں ایک دم ٹھہرا
اِک خیابان میں سے ہو نِکلا   ایک سایے تلے سے رو نِکلا
نہ تسلّی ہوا دلِ بے تاب   نہ تھا چشمِ تر سے خونِ ناب
دل کی واشد سے بے توقع ہو   ہر شجر کے تلے بہت سا رو
دیکھ گلشن کو نااُمیدانہ   مونہہ کیا اُس[5] نے جانبِ خانہ
دل رُکنے کا اس کو اک غم تھا[6]   راہ چلنے میں حال مدھم تھا
ناگہ اک[7] کوچے سے گذار ہوا   آفتِ تازہ سے دو[8] چار ہوا
ایک غرفے میں[9] ایک مہ پارہ   تھی طرف اُس کے گرمِ نظّارہ
جا پڑی[10] اُس پہ اک نظر اس کی   پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ   صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی   وہ نظر ہی وداعِ طاقت تھی
بے قراری نے کچھ ادائی کی   تابِ طاقت نے بے وفائی کی
مونہہ جو اس کا طرف سے اس کے پھرا   مضطرب ہو کے خاک پر وہ[11] گرا
وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اُس کا   ہو اسی[12] طرح گو کہ حال اُس کا
جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ   اُٹھ گئی سامنے سے یکبارہ
وہ گئی اُس کے سر بلا آئی   خاک میں مل گئی وہ رعنائی

---

[5] ک۔ اُن نے ، [6] س۔ دل کے دُکھنے کا اس کو اک غم تھا ، [7] ک۔ اس [8] ک۔ دُچار۔
[9] ک، س، ل۔ سے۔ [10] ک، س۔ پڑ گئی ، [11] ک۔ س۔ یہ۔ [12] ک۔ س۔ ل۔ بے طرح ہوئے
گو کہ حال اُس کا۔

دل میں[13] کرنے لگا طپیدنِ ناز   رنگ چہرے سے کر چلا پرواز
ہاتھ جانے لگا گریباں تک   چاک کے پہنچے پاؤں داماں تک
طبع نے اک جنوں کیا پیدا   اشک نے رنگِ خوں کیا پیدا
سوزشِ دل نے جی میں جا گہ کی   داغ نے آ جگر کو آتش دی
بسترِ خاک پر گرا وہ زار   درد کا گھر ہوا دلِ بیمار
خاطرِ افگار خار خار ہوئی   جاں تمنّا کشِ فگار ہوئی
اس کے موہنہ پر پڑی جو اس کی نگاہ   نا اُمیدی کے ساتھ تھی سرِ راہ[14]
خوں[15] ہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ   رابطہ آہِ آتشیں کے ساتھ
ہونٹھ سوکھے تو خونِ ناب ملا   خواب و خور دونوں کو جواب ملا[16]
خلق اُس کی ہوئی تماشائی   پر نہ وہ دیکھنے اُسے[17] آئی
کچھ کہا گر کسی[18] نے شفقت سے   رو دیا اُس[19] نے ایک حسرت سے
جاکے اُس کے قریب در بیٹھا   قصد مرنے کا اپنے کر بیٹھا
دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا   شوق نے کام کو خراب کیا

ثابت شدن عشقِ جواں و بدگماں شدن وارثانِ جاناں[20]

جو کہ سمجھے تھے اس کو دیوانہ   رحم کرتے تھے آشنا یا نہ
عاشق اُس کو کسو کا جان گئے   سب بُرا اس ادا کو مان گئے
کیونکہ باہم معاش تھی سب کی   ایک جا بود و باش تھی سب[21] کی
وارث اس کے بھی بدگمان ہوئے   درپئے دشمنیِ جان ہوئے
مشورت کی[22] کہ مار ہی ڈالیں   دفعتاً اس بلا کے تئیں ٹالیں
پھر یہ ٹھہری کہ ہوں گے ہم بدنام   سن کے آخر کہیں گے خاص و عام
کیا گنہ تھا جو[23] یہ جواں مارا   کنّے[24] مارا اُسے کہاں مارا
ہووے یہ خونِ خفتہ گر بیدار   کھینچنی ہو گی[25] خفّتِ بسیار

---

[13] ک۔ بس۔ یہ۔ [14] ک۔ نا اُمیدی کے ساتھ ہی سر کی آہ۔ [15] اصل۔ خون۔ [16] اصل۔ خواب اور خورد کو جواب ملا، [17] ک۔ بس۔ کبھو، [18] ک۔ بس۔ کنہوں، [19] ک۔ اُنے۔ [20] اصل۔ عنوان ندارد مک۔ ندارد بس میں یوں ہے: "ثابت شدن عشق بر آں جواں و بدگمان شدن اہل" [21] اصل۔ ندارد، [22] ک، ل۔ تھی، [23] ک، بس۔ کر۔ [24] ک، بس، ل۔ کس نے، [25] ک۔ ہووے۔

کیجیے ایک ڈھب سے اس کو تنگ   تا نہ عاید ہو اپنی جانب ننگ
تہمتِ خبط رکھیے اس کے سر   کیجیے سنگسار اس کو پھر
دے سکے[26] دلوا نہ اس جواں کو قرار   ہو گئے سارے درپئے آزار
کی اشارت کہ کودکانِ شہر   آئیں لبریز غصہ پُر زہر[27]
ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا   ایک نے آکے زیرِ سنگ کیا
ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر   ایک بولا کہ اب ہے کیا تاخیر
ایک نے ابتدا، ملامت کی   ایک نے شورشِ قیامت کی[28]
ایک اُسے تیر سے ڈراتا تھا   ایک برچھی اُسے دکھاتا تھا[29]
ایک کہنے لگا کہ اے بے ننگ   زندگی کا ہے یہ بھی کوئی ڈھنگ[30]
گرچہ ہنگامہ اس کے سر پر تھا   لیک رُو دے دل اس کا اودھر تھا
محو تھا اس کے وہ خیال کے بیچ   تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ
ہونٹھ پر حسن کا بیاں اس کا   سر تھا اور سنگِ آستاں اس کا[31]
ایک دم سرد آہ پھر اُٹھا   نالۂ گرم گاہ کر اُٹھا[32]
دل[33] میں کہتا کہ آہ مشکل ہے   اس طرف یک نگاہ مشکل ہے
دوست کو میرے نام سے ہے ننگ   دشمنوں سے ہے جی پہ عرصہ تنگ
چشمِ تر سے لہو بہا کرتا   صبح[34] کی باد[35] سے کہا کرتا
کاے نسیمِ سحر تو[36] اس سے کہہ   مت تغافل کر اور غافل رہ
ان بلاؤں میں کوئی کیونکہ بچے   جان پر آبنی ہے تیرے لیے
جان دوں تیرے واسطے سو، تو   آنکھ اُٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو
رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی   دُور پہنچی ہے میری رُسوائی
نام کو بھی ترے نہ جانا آہ   تجھ سے کیونکر سخن کی نکلے راہ
ناامیدانہ جب[37] کروں ہوں نگاہ   دیکھتا ہوں ہزار روزِ سیاہ
کوئی مشفق نہیں ہے کوئی شفیق   بےکسی بن نہیں ہے کوئی رفیق[38]

---

[26] ک۔ دیں گے۔ [27] ک س۔ آئے لبریز غصہ و پر قہر۔ [28] غیر مطبوعہ۔ [29] غیر مطبوعہ۔ [30] غیر مطبوعہ۔ [31] س، س، ل۔ تھا سر و سنگ و آستاں اس کا۔ [32] ک س ل۔ ایک دم سرد آہ پھر اٹھتا نالۂ گرم گاہ کر اٹھتا [33] ک س ل جی [34] آتی کے [35] ک وقت [36] ک یہ [37] ک س۔ گر۔

[38] ک، س، ل۔ کوئی مشفق نہیں کہ ہووے شفیق   بےکسی بن نہیں ہے کوئی رفیق

شوقِ مفرط نے بے تہی کی سخت   ناشکیبی نے دل سے باندھا رخت[۷۰]
رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے   اڑنے لاگے جگر کے پرکالے
اضطرابِ دلی نے زور کیا   اُس نے بے اختیار شور کیا
دل کے غم کو زبان پر لایا   آتش[۷۱] خفتہ جان پر لایا
کائے ستم دیدۂ تغافل کیش[۷۲]   اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش
موہنہ چھپایا ہے تُو نے اس پہ بھی   نگہِ التفات ادھر بھی
صبر کس کس بلا[۷۳] سے کر گزروں   چارہ اس بن نہیں کہ مر گزروں
منزلِ وصل دور میں کم پا   تجھ کو اس مرتبے میں استغنا[۷۴]
ہے تو نزدیک دل سے اے طناز   لیک تجھ تک سفر ہے دُور دراز[۷۵]
ناز نے یک نفس نہ رخصت دی   آئینے نے تجھے نہ فرصت دی
زلف کو تو واں بنایا کی[۷۶]   جاں یاں پیچ و تاب کھایا کی
تجھ کو مدِ نظر تھی اپنی چال   میں جفا کشتہ ہو گیا پامال[۷۷]
تھی تجھے خالِ رُخ پہ اپنی نگاہ[۷۸]   دل مرا مبتلائے داغِ سیاہ
بسترِ خواب پر تجھے آرام   مجھ کو خمیازہ کھینچنے سے کام
واں لبِ لعل تیرے خنداں تھے   یاں فشردہ جگر پہ دنداں تھے
ناز و خوبی نے دل دیا نہ تجھے   رحم سے آشنا کیا نہ تجھے[۷۹]
اب تغافل نہ کر تلطف کر   حال پہ میرے ٹک تاسف کر[۸۰]

فریب خوردن جوان از سخنان دایۂ غدار و غرق شدن در آں بحرِ زخار[۸۱]

گوش زد دایہ کے ہوئے یہ سخن   تھی وہ اُستادِ کارِ حیلہ و فن
پاس اس کو بلا تسلی کی   وعدۂ وصل سے تشفی کی
کائے ستم دیدۂ غمِ دوری   ہو چکا اب زمانہ[۸۲] مہجوری

---

[۷۰] س ۔ ندارد ۔ [۷۱] ک، س ۔ آفت تازہ ، [۷۲] ک، س، و، ل ۔ کائے جفا پیشہ و تغافل کیش ، [۷۳] س، یہ ۔ [۷۴] اور [۷۵] اصل میں دونوں شعر نہیں ہیں ۔ [۷۶] ک، س ۔ تو تو واں زلف کو بنایا کی ۔ [۷۷] ک ۔ میں ستم کش ہوا کیا پامال ، س ۔ میں ستم کا ہوا گیا پامال ۔ [۷۸] ک، س ۔ تجھ کو تھی اپنے خال رخ پہ نگاہ ۔ [۷۹]، [۸۰] اصل میں دونوں شعر نہیں ہیں ۔ [۸۱] م میں یہی سرخی ہے ۔ س کی سرخی یہ ہے "داستان فریب خوردن" [۸۲] ک، س، و ۔ زمان ۔

زار نالہ[۸۳] نہ کر شکیبا ہو   عشق کا راز تا نہ افشا ہو[۸۴]
سخن دل تنگ ہے[۸۵] یہ غیرت ماہ   قطع تجھ بن نہ ہو سکی تھی راہ
گرچہ یہ حسن اتفاق سے ہے   اس کو[۸۶] بھی جذب اشتیاق سے ہے
جلد آ اب نہ جی کو کاہش دے   چل کوئی دم میں درد خواہش لے[۸۷]
تیرے آنے سے دل کشادہ ہو   نشۂ دوستی زیادہ ہو[۸۸]
بزم عشرت کریں گے باہم ساز   ہو جواب اپنے دوست کا دم ساز[۸۹]
دے کر اس کو فریب ساتھ لیا   دل عاشق کو اپنے ہاتھ لیا[۹۰]
موج کا ہر کنارہ[۹۱] طوفاں پر   مارے چشمک حباب عماں پر
ہمکنار بلا ہر اک گرداب   لجۂ سرمایہ بخشش تیرہ سحاب[۹۲]
گزرِ موج جیب نہ تب دیکھا   ساحل اس کا نہ خشک لب دیکھا[۹۳]
لیک در پردہ اس نے یہ ٹھانی   کیجیے اس سے خصمی[۹۴] جانی
یہ تو دل تفتہ محبت تھا   سخت وارفتہ محبت تھا[۹۵]
وقت نزدیک تھا جو آ پہونچا   تا سر آب پا بہ پا پہونچا،
آب کیا کہ بحر تھا زخار   تند مواج، تیرہ د تہ دار
کشتی اک آن کر ہوئی موجود   ہو فلک سے ہلال جیسے نمود
کی کنارے پہ لا کے استادہ   تھا محافہ رکوب آمادہ
جلد کشتی کے پاس جا پہونچا[۹۶]   یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہونچا
بیچ دریا کے دایہ نے جا کر   کفش اس گل کی اس کو دکھلا کر
پھینکی پانی کی سطح پر اک بار   اور بولی کہ اے[۹۷] جگر افگار
حیف تیرے نگار کی پاپوش   موج دریا سے ہووے ہم آغوش
غیرت عشق ہے تو لا اس کو   چھوڑیو مت برہنہ پا اس کو

---

[۸۳] ک، س ــــ زار نالی، [۸۴] ک، س ـ رسوا، [۸۵] ک، س ـ تھی ـ [۸۶] ک ـ کی ـ [۸۷] ک، س، م، و ــــ دل قوی رکھ نہ جی کو کاہش دے   چل کوئی دم کو داد خواہش دے ـ [۸۸] اصل ندارد ـ [۸۹] اور [۹۰] اصل میں نہیں ہے ـ [۹۱] ک ـ کنایہ ـ [۹۲]، [۹۳] اصل ندارد ـ [۹۴] م ـ دشمنی [۹۵] اصل ندارد ـ [۹۶] ک، س، م، و ـ اس سفینے میں جلد جا پہنچا ـ [۹۷] ک ـ او ـ

اس طرف آب کے اترنا ہے   اس نواحی کی سیر کرنا ہے
پاؤں اس کے جو ہیں نگار آلود   ظلم ہے ہوویں گر غبار آلود
جس کفِ پا کو رنگ گل ہو بار   منصفی ہے کہ خار سے ہو فگار[۹۸]
ان پہ نرمی میں گل سے ہوں جو پرے   آبلہ چشم کو سیاہ کرے[۹۹]
یہ روا ہے تو اپنے خال پہ رو   مفت ناموسِ عشق کو مت کھو[۱۰۰]
جی اگر تھا عزیز اے ناکام   کیوں عبث عشق کو کیا بدنام
سن کے یہ حرفِ دایہ مکّار   دل سے اس کے گیا شکیب و قرار

بے خبر کارِ عشق کی تہ سے   جست کی اس نے اپنی جاگہ سے
تھا وہ کشتی میں یا کہ دریا میں[۱۰۱]   موج زنجیر ہو گئی پا میں
کھینچ گیا قعر کو وہ گوہرِ ناب   تھی کشش عشق کی گر تہِ آب
کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں   ایسے ڈوبے کہیں نکلتے ہیں[۱۰۲]
یوں جو ڈوبے کہیں تو جا نکلے[۱۰۳]   غرق دریائے عشق کیا نکلے
عشق نے آہ کھو دیا اس کو   آخر آخر ڈبو دیا اس کو

بردنِ دایہ دختر را با آشنائے پدرش و پس از ہفتہ آمدن دختر بخانہ و غرق شدن بہ ہماں دریا۔[۱۰۴]

جب کہ دریا میں ڈوب کر وہ جواں[۱۰۵]   کھو گیا گوہرِ گرامیِ جاں
دایہ حیلہ گر ہوئی دل شاد   واں سے کشتی چلی بہ رنگِ باد
خار خارِ دلی سے فارغ ہو   لے گئی پار اس گلِ نو کو
یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے   فتنہ سازی میں اک قیامت ہے[۱۰۶]
خاک ہو کیوں نہ عاشقِ بیدل   کام سے اپنے یہ نہیں غافل[۱۰۷]
وصل جیتے نہ ہو میسر اگر   لا دے معشوق کو یہ تربت پر[۱۰۸]
یہاں سے عاشق اگر گئے ناشاد   خاکِ خوباں بھی ان نے دی بر باد[۱۰۹]

---

[۹۸] اصل۔ جس کفِ پا کو دیکھ گل ہو نثار   منصفی ہے کہ خار سیتی فگار۔ [۹۹]، [۱۰۰] اصل ندارد۔ [۱۰۱] ک، س، ل۔ تھا سفینے میں یا کہ دریا میں، [۱۰۲] ک، س، لیکن ایسے کوئی نکلتے ہیں۔ [۱۰۳] س، ک، ل۔ ڈوبے جو یوں کہیں وہ جا نکلے۔ [۱۰۴] م۔ آمدن دختر بسوئے خانہ و غرق شدن درہماں دریا۔ [۱۰۵] اصل۔ جس گھڑی یار ڈوب کردہ جواں۔
[۱۰۶] تا [۱۰۹] اصل ندارد۔

قصہ کوتاہ ہے بعد یک ہفتہ   آئی وہ رشکِ مہ ز خود رفتہ
کہنے[۱۱۰] لاگی کہ اب تو اے دایہ   ہو گیا غرق وہ فرو مایہ
اب تو وہ ننگ درمیاں سے گیا   آرزومند اس جہاں سے گیا
تھے جو ہنگامے اس کے حد سے زیاد   ساتھ اس کے گئے وے شور و فساد[۱۱۱]
شور فتنے تھے اس تلک سارے   اب تو بدنامیاں گئیں[۱۱۲] بارے
مجھ کو گھر میں نہیں ہے اب آرام   رنج شام و سحر ہے مجھ کو مدام[۱۱۳]
دل کوئی دم میں خون ہووے گا   آج کل میں جنون ہووے گا
دل تڑپتا ہے متصل میرا   مرغِ بسمل ہے یا کہ دل میرا[۱۱۴]
وحشت طبع اب تو افزوں ہے   حال جی کا مرے دگرگوں ہے[۱۱۵]
بے دماغی کمال ہوتی ہے   جان تن کے وبال ہوتی ہے[۱۱۶]
بے کلی دل کو تاب دیتی ہے   طاقتِ دل جواب دیتی ہے
دل[۱۱۷] میں آتا ہے ہوں بیابانی   پر کہوں ہوں کہ ہے یہ نادانی
بس یہ بہتر ہے مجھ کو لے چل گھر[۱۱۸]   ایک دو دم رہیں گے دریا پر
گاہ باشد کہ دل مِرا وا ہو   ورنہ کیا جانئے کہ پھر کیا ہو
دایہ بولی کہ اے سراپا ناز   حسن کا تیرے در پہ روئے نیاز[۱۱۹]
اب تو فتنے کو میں سلایا ہے[۱۲۰]   اس بلا کے تئیں ڈوبایا ہے[۱۲۱]
کون مانع ہے گھر کے چلنے کا   سدِ رہ کون ہے نکلنے کا
ہو محافے میں تو خوشی[۱۲۲] سے سوار   شاد و شاداں کر آب سے تو گزار
دل سے اپنے پدر کا[۱۲۳] غم کر کم   مادرِ مہرباں کو خرم کر
کر ملاقات ہمدموں سے تو   گرم بازی ہو محرموں سے تو
یہ نہ سمجھی[۱۲۴] کہ بد بلا ہے عشق   گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق

---

[۱۱۰] م: لگی کہنے [۱۱۱] اصل: ندارد [۱۱۲] ک، س: وینہیں [۱۱۳] غیر مطبوعہ اس میں دوسرا مصرعہ یوں ہے — دل کو شام و سحر ہے رنج تمام [۱۱۴] تا [۱۱۶]
اصل ندارد۔ [۱۱۷] ک، س: جی۔ [۱۱۸] ک، س، ام، و: مصلحت ہے کہ مجھ کو لے چل گھر۔ [۱۱۹] ک، س: حسن کا د
تیرے روتے نیاز۔ [۱۲۰] ک: اب تو میں فتنے کو سلایا ہے۔ [۱۲۱] ک، س، ل، م: اٹھا۔ [۱۲۲] ک، س، ل، م
دل خوشی سے [۱۲۳] ک، س: کے۔ [۱۲۴] ک، س: سوچی۔

جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے   آخرش[۱۲۵] اس کو مار رکھتا ہے
جذب اپنے سے جب کرے ہے کلام   عاشقِ مُردہ سے بھی لے ہے کام
خاک ہو کیوں نہ عاشقِ بیدل   کام اپنے سے وہ نہیں غافل[۱۲۶]
صبح گاہاں وہ غیرتِ خورشید   اس جگہ سے رواں ہوئی نومید[۱۲۷]
پہنچی نصف النہار دریا پر   روئی بے اختیار دریا پر
حد سے افزوں جو بیقرار ہوئی   دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ   یہاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش   تھا تلاطم سے کس طرف ہمدوش
پھر جو ڈوبا تو کس طرف جا کر[۱۲۸]   تجھ کو آیا نظر کہاں آ کر
مجھ کو دے جو نشان اس جا کا   میں بھی دیکھوں خروش دریا کا
ہوں میں نا آشنائے سیرِ آب   ناشناسائے موجۂ گرداب[۱۲۹]
لُجّہ کیا لطمہ[۱۳۰] کس کو کہتے ہیں   گھر میں ہم نام سُنتے رہتے ہیں
ہے میسّر کہاں یہ سیرِ عبور   اتفاقاً ہے اس طرح کا امور[۱۳۱]
مکر میں گرچہ دایہ تھی کامل   لیک تہ سے سخن کے تھی غافل
یہ نہ سمجھی کہ ہے فریبِ عشق   ہے وہ مہ پارہ ناشکیبِ عشق
بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف   یہاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف
یہاں وہ بیٹھا حباب کے مانند   پھر نہ تھا کچھ سراب کے مانند[۱۳۲]
سُنتے ہی یہ کہاں کر کے[۱۳۳]   گر پڑی قصدِ ترکِ جاں کر کے[۱۳۴]
موجِ ہر اک کمندِ شوق تھی آہ   لپٹی اس کو برنگِ مارِ سیاہ
دامِ گسترِ عشق تھا تہِ آب   جس کے حلقے تمام تھے گرداب[۱۳۵]
حُسن موجوں میں یوں نظر آوے   نورِ مہتاب جیسے لہرا وے
نقش[۱۳۶] یہ اس کی حنائے انگشتاں   غیرت افزائے پنجۂ مرجاں

---

[۱۲۵] ک س م عاقبت [۱۲۶] ک غیر مطبوعہ شعر [۱۲۷] اصل ندارد [۱۲۸] ک بس رم مصرعِ ثانی [۱۲۹] اصل ندارد [۱۳۰] م۔ موج [۱۳۱] ک بس ——— ہیں میسّر کہاں یہ سیرِ عبور   اتفاق ہیں اس طرح کے امور [۱۳۲] اصل ندارد۔ [۱۳۳] ، [۱۳۴] ک بس۔ کرکر، [۱۳۵] اصل جس کا حلقہ تمام تھا گرداب۔ [۱۳۶] م ۱۔ دہ بس۔ وے۔

سر پہ جس دم کہ آب ہو کے بہا   سطحِ پانی کا آئینہ سا رہا[۱۳۷]
کششِ عشق آخر اس تہ کو   لے گئی کھینچتی ہوئی تہ کو[۱۳۸]
جا ہم آغوشِ مردہ یار ہوئی   تہ میں دریا کے ہم کنار ہوئی
پاک کر زندگی کی آلائش   ہو کے دست و بغل کی آسائش

خبر کردنِ دایہ بخانۂ جاناں و برآوردنِ عاشق و معشوقِ چسپاں از دریا بہ وسیلۂ دام و ختمِ قصہ۔[۱۳۹]

کودے غواص و آشنا سارے   تا بہ مقدور دست و پا مارے
کھینچ کر کوفت ہو گئے بے تاب[۱۴۰]   نہ لگا ہاتھ وہ دُرِ نایاب
سر پٹکتی جو گھر گئی دایہ   آفتِ تازہ لے گئی دایہ
اب و عم مادر و برادر سب   خاک افشاں و آہ نالہ بلب
دار و دستہ تمام اس گل کا   ترک کر آئینِ تجمل کا[۱۴۱]
سوئے دریا رواں ہوئے گریاں   آتشِ غم سے دل جگر بریاں
خلق یکجا ہوئی کنارے پر   حشر برپا ہوئی کنارے پر
دام داروں سے سب نے کام لیا   آخر ان کو اسیرِ دام کیا
نکلے[۱۴۲] باہر وے مُوے نکلے   دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ربطِ چسپاں بہم ہویدا تھا   مر گئے پر بھی شوق پیدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کی بالیں   ایک کے لب سے ایک کو تسکیں
جو نظر ان کو آن کرتے تھے   ایک قالب گمان کرتے تھے،
عشق میں آہ کھو دیا اُس کو   آخر آخر ڈبو دیا اس کو[۱۴۳]
مل رہے تھے وہ دونوں[۱۴۴] وصلی وار   ہم دگر سے جدا ہوئے دشوار
کیوں نہ دشوار ہوئے ان کا فصل[۱۴۵]   جان دے[۱۴۶] کر ہوا جن کا وصل
حیرتِ کارِ عشق سے مردم،   شکلِ تصویر آپ میں تھے گم

۱۳۷-۱۳۸ اصل مذارد۔ ۱۳۹ یہ عنوان م میں درج ہے۔ ۱۴۰ ک، س: کھینچ کر کوفت سب ہوئے بیتاب۔ ۱۴۱ ک، س، م: ترک آئین کر تجمل کا۔ ۱۴۲ ک: باہم۔ ۱۴۳ غیر مطبوعہ۔ ۱۴۴ ک: کیا کھوں مل رہے ہے وہ وصلی وار۔ س: کیا کہوں مل رہے تھے وصلی وار۔ ۱۴۵ س: وصل، ۱۴۶ ک: دیدے، س: دیتے۔

مقولۂ شاعر[۱۴۷]

میر اب شاعری کو کر موقوف   عشق ہے ایک فتنۂ معروف
اپنی قدرت جہاں دکھاتا ہے   اُسے جو کچھ کہو، سو آتا ہے[۱۴۸]
کتنی وسعت ترے بیاں میں ہے   کتنی طاقت تری زباں میں ہے
لب پہ اب مہر خامشی بہتر
یہاں سخن کی فرامشی بہتر

---

[۱۴۷] یہ عنوان صرف ک میں درج ہے۔ [۱۴۸] ک، س، م، ل، ا۔
قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہے   اس سے جو تو کہے سو آتا ہے

سرسید کے ایک رفیق

منشی نجم الدین

پروفیسر مختار الدین احمد

"ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے ایک دشوار گزار رستے میں رہ نورد ہے۔ بہت سے جو اس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں۔ بہت سے ابھی اس کے ساتھ افتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں، پیروں میں چھالے پڑے ہیں.... لیکن وہ اولوالعزم آدمی جو ان سب کا رہنما ہے۔ اسی طرح تازہ دم ہے۔ نہ اسے رستے کی تکان ہے، نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پروا ہے۔ نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے۔ اس کی چتون میں غضب کا جادو بھرا ہوا ہے کہ جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔ یعنی برسوں کے تھکے ہارے خستہ و کوفتہ اسی دشوار گزار رستے پر پڑ لیے......

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بُردش بیک نگاہے

حالی

"وہ جغرافیائی طور پر علی گڑھ شہر کے پٹواری اور ساس کے گھروں کی وائی تھے۔ ڈیوڑھی (محمودہ بیگم مرحوم) کا شہر کا سارا کام بلا مطالبۂ دانہ و علف کرتے تھے اور یوں بھی دوسروں کی دست نگری کے معاملے میں عموماً خوددار تھے۔

منشی نجم الدین، اپنے زمانے کی مضحکہ خیز (اگر فکر بیز و علم ریز) جماعت "جہل مرکب" کے بھی حاشیہ نشین تھے، جس کے خان بہادر مولوی بشیر الدین مرحوم صدر نشین تھے اور اب صرف منشی نجم الدین ہی رہ گئے تھے، جو مجھے "مائی لارڈ" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔" (محمد مرتضیٰ خاں شروانی)

اکتوبر ۱۹۴۳ء میں جب میں علی گڑھ پہنچا تو بعض ایسے بزرگوں سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی جنھیں سرسید کو دیکھنے اور جنھیں ان کی خدمت میں حاضری کے اکثر مواقع ملے تھے۔ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ ان میں بابائے اردو

مولوی عبدالحق صاحب (۱۸۷۱-۱۹۶۱ء) کے علاوہ جو اس زمانے میں دہلی میں مقیم تھے اور اکثر علی گڑھ کورٹ کے جلسوں میں تشریف لاتے تھے۔ خان بہادر مولوی بشیرالدین صاحب (۱۸۵۸-۱۹۵۶ء) اخبار "البشیر" اور اسلامیہ کالج اٹاوہ کے روح رواں رہے۔ وہ اٹاوہ میں مقیم تھے اور خان بہادر الحاج حبیب اللہ خاں صاحب (۱۸۶۷-۱۹۳۰ء) اور خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب (۱۸۷۴-۱۹۶۵ء) علی گڑھ میں قیام پذیر تھے۔ اوّل الذکر نے ۱۹۴۷ء میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی بڑی مفصل اور مستند سوانح حیات شائع کی ہے اور وہ اپنی زندگی کے آخری زمانے میں علی گڑھ کالج کی تاریخ اور اس کی تحریک پر ایک کتاب لکھنے میں مصروف رہے۔ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا اخبار "علی گڑھ" انہی کی نگرانی میں شائع ہوتا رہا۔ خان بہادر شیخ محمد عبداللہ نے مسلم گرلز کالج کی بنیاد ڈالی اور اس ادارے کو بڑی کامیابی سے چلایا اور پوری زندگی سرگرم عمل رہے۔

میرا ارادہ تھا کہ سرسیّد کی زندگی پر ایک کتاب لکھوں جس میں مطبوعہ مآخذ سے قطع نظر کر کے اُن اصحاب سے جنھوں نے سرسیّد کا زمانہ دیکھا ہے اور جن لوگوں کو انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اُن سے سرسیّد کے ذاتی حالات و کوائف سے متعلق معلومات جمع کروں اور سرسیّد کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ خطوط سے ان کی سیرت و شخصیت کی ایک مکمل تصویر پیش کروں، گویا سرسیّد کے معاصرین کی یادداشتوں اور خطوط سے اس کتاب کے تانے بانے کا کام لیا جائے۔

سرسیّد کے ذاتی حالات و عادات و فضائل اور ان کے غیر مطبوعہ خطوط یا آثار کی تلاش و جستجو ہی نے مجھے منشی نجم الدین صاحب سے روشناس کرایا۔

انھیں میں نے علی گڑھ میں معلوم نہیں کتنی بار دیکھا لیکن یہ بات کبھی ذہن میں نہ آئی کہ وہ عرصے سے علی گڑھ میں مقیم ہیں اور ان کا تعلق سرسیّد اور ان کے معاصرین سے رہا ہے۔ ایک دن میں نمبر ۵ حالی روڈ کے بنگلے میں بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا کہ چک کے پیچھے ان کی شکل دکھائی دی۔ جون کا مہینہ دوپہر کا وقت اور علی گڑھ کی سرزمین، وہ پسینے سے شرابور تھے اور گرمی سے بدحواس! میں نے انھیں آرام سے بٹھایا اور میز کے پنکھے کا رُخ ان کی طرف کر دیا۔ گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر میں ملازم ہیں اور کانفرنس کے تعلیمی قرضے کی رقم کی واپسی اور اس کی تحصیل کی ذمہ داری منشی صاحب ہی کے سپرد ہے اور اس کی پہلی قسط وصول کرنے کے لیے موصوف اس بلا کی تپش اور لُو میں یہاں تشریف لائے ہیں۔

میں نے اُن سے پوچھا آپ کتنے دنوں سے کانفرنس میں ہیں؟ کہنے لگے تقریباً جب سے کانفرنس کا وجود ہے۔ میں نے کچھ اور پوچھا، وہ کچھ اور کھلے، معمر اصحاب کو بھولی بسری باتیں سنانے کا ویسے ہی شوق ہوتا ہے۔ وہ سرسیّد اور ان کے رفقا کے قصے اور اس عہد کے واقعات تفصیل سے سناتے رہے۔ مجھے متوجہ پا کر اُنھوں نے بتایا کہ جس کمرے میں تم بیٹھے ہوئے ہو اس میں ایک زمانے تک ایجوکیشنل کانفرنس کا دفتر تھا۔ اور فلاں فلاں اصحاب اس کمرے میں ان ان جگہوں پر بیٹھا کرتے تھے اور پھر ان لوگوں کی عادات و خصائل کے متعلق گفتگو کرنے لگے۔ یہاں تک کہ سلسلۂ خیال انھیں اس سڑک کے پہلے بنگلے کی طرف لے گیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ ۱۔ حالی روڈ میں سرسید رہ چکے ہیں اور حالی مرحوم نے ایک زمانے تک اس میں سکونت اختیار کی ہے اور اسی مناسبت سے اس سڑک کا نام "حالی روڈ" رکھا گیا۔

یہ کمرہ سرسید ہال کے مطبخ اور یونین کی عمارت کے درمیان واقع ہے اور ابھی تک بہت اچھی حالت میں ہے کئی سال پہلے تک علی گڑھ کے قدیم دستور کے مطابق اس پر بھی پھوس کی چھپر تھی۔ اب اسے بدل کر نئی چھت تعمیر کر دی گئی ہے۔ کچھ سرسید کا فیض ہے یا حالی کی کشش کہ کچھ عرصہ سے یہ بنگلہ اُردو میگزین اور یونیورسٹی گزٹ کے مدیرین کے لیے مخصوص سا ہو کر رہ گیا ہے۔ میرے زمانہ ادارت سے پہلے ڈاکٹر محمود فاروقی صاحبؒ جنھوں نے میر حسن پر ریسرچ کر کے اُردو میں ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی اور ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۶ء کے سشن میں علی گڑھ میگزین کے مدیر تھے یہیں رہا کرتے تھے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی جو علی گڑھ میگزین اور مسلم یونیورسٹی گزٹ دونوں کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ انجم اعظمی صاحب کے ساتھ یہیں فروکش تھے اور یاد نہیں ان کے ساتھ میں نے کتنی شامیں اس مقدس کمرے میں گزاری ہیں۔ جہاں سرسیّد اور حالی کسی زمانے میں قیام پذیر تھے۔

معمر اصحاب سے گفتگو میں ایک بڑی دقت ہوتی ہے۔ جب تک آپ ان کی گفتگو سننے میں مصروف ہیں اور آپ ان کے معمول بنے ہوئے ہیں اُس وقت تک حالات ٹھیک ہیں لیکن جونہی آپ نے ان کی باتوں میں غیر معمولی دلچسپی لینی شروع کی، کچھ سوالات کیے۔ ان کی گفتگو میں جرح کی کوشش کی، بعض نکات کی تشریح چاہی، یا اپنے مقصد کی طرف اُنھیں لانا چاہا تو پھر معاملہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب میں نے سرسید کی خانگی زندگی کے متعلق سوالات کرنے شروع کیے اور نوٹ لینے چاہے تو انھیں فوراً اس بلا کی گرمی اور غضب کی تپش میں کوئی اور کانفرنس کا قرضدار یاد آگیا۔ اُنھوں نے اپنا بستہ سنبھالا، رسیدیں درست کیں، ٹوپی اوڑھی، چھتری ہاتھ میں لی اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

منشی نجم الدین علی گڑھ کے شیخ زادوں میں سے تھے۔ جن کا خاندان عرصے سے اس شہر میں آباد ہے۔ وہ محلہ بالائے قلعہ میں رہتے تھے جہاں اُن کے بعض اعزہ اب بھی سکونت پذیر ہیں۔

منشی صاحب گندمی رنگ کے چھوٹے قد کے آدمی تھے۔ عینک لگاتے تھے اور خشخشی داڑھی رکھتے تھے اور خاص بات یہ تھی کہ بہت تیز چلتے تھے۔ بڑھاپے میں بھی اُن کی رفتار نوجوانوں جیسی تھی۔

سرسید اُنھیں بہت چاہتے تھے اور اُنھیں اپنے عزیز کی طرح سمجھتے تھے۔ یہ بڑی جفاکشی، محنت اور محبت سے ان کی خدمت بجا لاتے۔ ہر موقع پر ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ ان کے مزاج داں ہو گئے تھے جس کی وجہ سے سرسید کو بھی بڑا آرام ملتا تھا۔ سفر ہو یا حضر منشی صاحب سرسید کا ساتھ دینے پر آمادہ رہتے۔ سرسید اُنھیں پیار سے "ٹٹو" کہتے تھے۔ اس لیے کہ وہ پستہ قد آدمی تھے۔ اور تیز رفتار اور اس لیے بھی کہ وہ ہمیشہ ان کے رفیق اور مصاحب بنے رہے۔ آج پرانے لوگ انھیں اسی عرفیت سے پہچانتے ہیں۔ سید صرف یہ کہنے پر قناعت نہ کرتے کہ "بھئی میرا ٹٹو کہاں ہے لاؤ اُسے" بلکہ بعض خطوط میں بھی نام کے ساتھ یہ حرف لکھنے میں مضائقہ نہ سمجھتے۔ سرسید تو سرسید، اس زمانہ کے انگریز اساتذہ بھی خندۂ زیر لب کو دبا نہ سکے۔ تھیوڈر بک نے ۱۸۹۱ء میں جو ان کی ایک درخواست پر سفارش لکھی ہے اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہے:

NAJMUDDIN IS AN EXCELLENT "LITTLE MAN"

میرے مشفق اور کرم فرما، محمد مقتدیٰ خاں شروانی، خدا ان پر اپنی رحمت کے پھول برسائے، سرسید اور علی گڑھ کے چلتے پھرتے انسائیکلوپیڈیا تھے، مجھ پر بڑے مہربان تھے، اکثر و بیشتر تشریف لاتے اور ان کی باتوں میں گھنٹوں گزر جاتے اور وقت کا پتا نہ چلتا۔ ایک دن ان سے منشی صاحب کا ذکر آیا۔ انہوں نے منشی جی کی بہت سی باتیں سنائیں، کچھ گفتنی کچھ ناگفتنی، میں نے ان کے ارشادات سپردِ قلم کرنے چاہے۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر انھوں نے مجھے روک دیا کہ اس کی ضرورت نہیں، میں ان پر بشرط فرصت ایک مضمون لکھ کر آپ کو دوں گا۔ "بشرط فرصت" کی بات ایسی تھی کہ میں اس پر راضی نہ ہو سکا۔ میں نے عرض کیا مضمون ضرور لکھیے لیکن فی الحال ایک مختصر سا نوٹ ان پر تحریر کر دیجیے جو انھوں نے چند ہی دنوں کے بعد مجھے لکھ کر دے دیا۔ یہ نوٹ شروانی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے اس لیے انھیں کے الفاظ میں یہاں پیش کرتا ہوں۔

"سرسید منشی نجم الدین کو "میرا ٹٹو" کہتے تھے۔ نام شاذ و نادر ہی لیتے تھے، چونکہ اُن کا قد پست سے بھی پست تر تھا، بدن گٹھا ہوا تھا، ملے ہوئے قدموں سے کافی تیز گامی کے ساتھ کھٹ کھٹ چلتے تھے۔ نیز ان کا اُردو کا خط اصلاح گرفتہ تھا اور ان کا فرسِ خامہ نہایت گرم رفتار اور دوردم تھا، راہواری میں لفظوں کے نشیب و فراز کی مطلق پروا نہ کرتا تھا، لہٰذا سرسید کو اپنی گشتی چٹھیاں بجائے چھپوانے کے ان سے نقل کرا کے جاری کرنے میں سہولت ہوتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ کفایت بھی۔ گویا سرسید ان کی پیٹھ پر چڑھے اور اُٹے اُٹے پھرتے تھے۔ پھر جیسے ٹٹو اور اس کے تمام چھوٹے بڑے، اعلیٰ و ادنیٰ ابنائے جنس، شاذ و نادر ہی بیٹھتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں یا کھڑے رہتے ہیں، اسی طرح سرسید کے ٹٹو صاحب بھی تحریر کا سارا کام ہمہ وقت سرسید کی طولانی میز کے ایک گوشے پر کھڑے کھڑے کرتے تھے، کرسی، تھان پر اپنی جگہ محض زیبِ آستاں کے لیے رہتی تھی، اس لیے ٹٹو کا خطاب ان کے لیے ہر طرح موزوں تھا۔

وہ شیخ زادہ تھے، جلبِ زر کا کوئی نہ کوئی حیلہ ملازمت کے علاوہ بھی رکھتے تھے۔ مختلف دوستوں کی شرکت میں پھلوں کی تجارت کی، مگر کوئی پھل نہ پایا اور ان کا سرمایہ پال ہی میں پڑا اور سڑا، صرف حنظل کی تلخی کا مزہ پایا۔

ایک زمانے میں سٹہ بازوں میں گھر کر پھنسے، سید زین الدین مرحوم اس وقت علی گڑھ ہی میں سٹی مجسٹریٹ تھے۔ تعلقات کے باوجود ان کے اجلاس میں فیصلہ ان کے خلاف ہوا، مگر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے "قانونی مشورے اور رزاق بخش قادری مرحوم (اپنے وقت کے کامیاب اور مشہور بیرسٹر) کی پیروی سے اپیل میں وہ بری ہو گئے۔

کانفرنس اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے عروج سے اس کے زوال تک بے مبالغہ لاکھوں روپے ان کے ہاتھوں ڈھل گیا اور سیل کی طرح ڈھل گیا۔ ہر سال حساب کی جانچ ہوتی تھی جو بارہا مولوی نظام الدین حسن مرحوم (ناظر الدین حسن نواب ناظر یار جنگ کے والد) یا مولوی سید عبد الباقی مرحوم (ریسر چیف اکاؤنٹنٹ مسلم یونیورسٹی) نے کی مگر کوئی قابلِ تنبیہ گرفت نہیں ہوئی۔ آخر زمانے میں منشی صاحب بنولے کی تجارت میں لپٹ گئے جس نے ان کا بیڑا غرق کر دیا اور کانفرنس سے ملنے والا بونس جو کئی ہزار روپے کا تھا، اس میں ایک دم سلفا اور دھواں ہو کر اڑ گیا۔

سرسید کی وفات کے بعد جب نواب محسن الملک آنریری سکریٹری مقرر ہوئے اور کالج کے بڑے شعبے دو قرار پائے، کالج اور

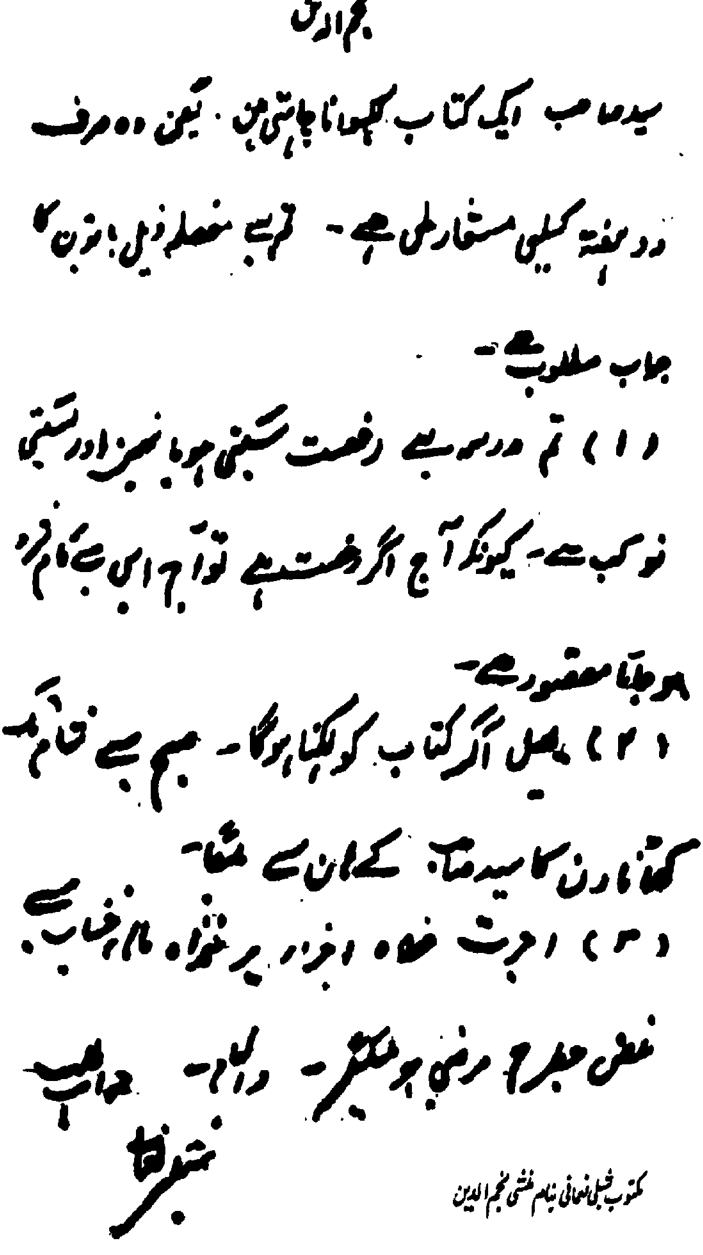

نجم الدین

سید صاحب ایک کتاب لکھوانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ صرف
دو ہفتہ کیلئے مستعار ملی ہے۔ تم سے مفصلہ ذیل باتوں کا
جواب مطلوب ہے۔

(۱) تم مدرسہ سے رخصت لے سکتے ہو یا نہیں اور لے سکتے
تو کب سے۔ کیونکہ آج اگر رخصت ہے تو آج ہی سے کام شروع
ہو جانا مقصود ہے۔

(۲) یہاں آکر کتاب کو لکھنا ہوگا۔ جس سے تم کو
کھانا دن کا سید صاحب کے ہاں سے ملیگا۔

(۳) اجرت خواہ اجزاء پر خواہ ماہوار حساب سے

مفصل جلد جو مرضی ہو لکھئے۔ والسلام۔ جواب

شبلی

مکتوب شبلی نعمانی بنام منشی نجم الدین

کانفرنس اور جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ کالج میں اُس وقت کے نواب مزمل اللہ خاں مرحوم اور کانفرنس میں ہمیشہ کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم۔ تو کانفرنس کے ساتھ جہیز کی طرح لگے ہوئے منشی نجم الدین "ٹٹو" صاحب زادہ صاحب کی بیٹھی میں آئے۔ اب چونکہ کانفرنس کے ہاتھ میں آنے سے اس کا کام بڑھا رہا یہ کہنا چاہیے کہ انھوں نے بڑھایا، تو ظاہر ہے کہ "ٹٹو" سے یہ لمبی منزل ہرگز طے نہ ہو سکتی تھی" بلکہ ضرور ایک تیز ذی رُوح برق رفتار سواری کی ضرورت تھی۔ چنانچہ صاحب زادہ صاحب نے حساب داری (اکاؤنٹ) کا کام ان کے سپرد کیا جو اُنھوں نے ۱۹۱۰ء (صاحب زادہ صاحب کے انڈیا کونسل کا ممبر ہو کر ولایت جانے کے زمانے) تک انجام دیا، پھر صدر یار جنگ کے کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری ہونے اور کالج کے یونیورسٹی ہو جانے اور کانفرنس کا ایک مستقل شعبہ یونیورسٹی سے جُدا ہو جانے اور نئے قواعد کے بموجب اُن کے کانفرنس کے سکریٹری ہونے تک بھی نواب صاحب ہی کے زمانے میں کانفرنس سے اپنی علیحدگی تک کانفرنس کی حساب داری کا کام منشی صاحب دیکھتے رہے۔ کانفرنس سے سبکدوشی کے بعد اُنھیں کانفرنس کا قرضۂ حسنہ وصول کرنے کے کام پر مقرر کر دیا گیا، جو وہ آخر عمر تک جوں توں کرتے رہے۔"

سرسید سے منشی نجم الدین کی پہلی ملاقات غالباً علامہ شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) کے توسط سے ہوئی۔ منشی صاحب خوش نویس اور زود نویس ہونے کے ساتھ ساتھ صحیح نویس بھی تھے۔ شبلی کی ان سے ملاقات کتابوں کی نقل یا اپنے مسودات کی تبییض کے سلسلے میں ہوئی ہوگی۔ موصوف اس وقت علی گڑھ کے فری اسکول میں نائب مدرس تھے، تنخواہ پانچ روپے ماہوار تھی، تنخواہ کی کمی کی تلافی وہ نقل نویسی کی اُجرت سے لیا کرتے ہوں گے۔ حسن اتفاق کہ اس زمانے میں سرسید کو ایک کتاب کی فوری نقل کی ضرورت ہوئی۔ شبلی سے ذکر آیا تو انھوں نے بظاہر نجم الدین صاحب کا ذکر ان سے کیا اور خود ایک خط انھیں لکھا :

> نجم الدین!
>
> سید صاحب ایک کتاب لکھوانا چاہتے ہیں، لیکن وہ صرف دو ہفتے کے لیے مستعار ملی ہے۔ تم سے مفصلہ ذیل باتوں کا جواب مطلوب ہے :۔
>
> ۱۔ تم مدرسے سے رخصت لے سکتے ہو یا نہیں، اور لے سکتے ہو تو کب سے، کیونکہ آج رخصت ملے تو آج ہی سے کام شروع ہو جانا ہے۔
>
> ۲۔ یہیں آ کر کتاب کو لکھنا ہوگا، صبح سے شام تک۔ کھانا دن کا سید صاحب کے ہاں سے ملے گا۔
>
> ۳۔ اجرت خواہ اجزا پر خواہ ماہانہ حساب سے۔ غرض جس طرح مرضی ہو مل سکے گی۔ والسلام
>
> جواب طلب شبلی نعمانی

شبلی مرحوم کے اس خط پر تاریخ تحریر موجود نہیں، لیکن حسب روایت مکتوب الیہ یہ خط ابتدائے جون ۱۸۸۹ء کا لکھا ہوا ہے۔ منشی صاحب نے آمادگی ظاہر کی اور ۱۵؍جون سے اُنھوں نے سرسید کے یہاں جانا شروع کر دیا۔ وہ یہ نہ بتا سکے کہ کتاب کیا تھی جس کی نقل سرسید کو مطلوب تھی، لیکن انھیں اس قدر اب بھی یاد ہے کہ کتاب قلمی تھی، عربی زبان میں تھی اور کتب خانہ رام پور

منشی نجم الدین کی درخواست کا یہ مسودہ مولانا شبلی کے قلم کا لکھا ہوا ہے ۔

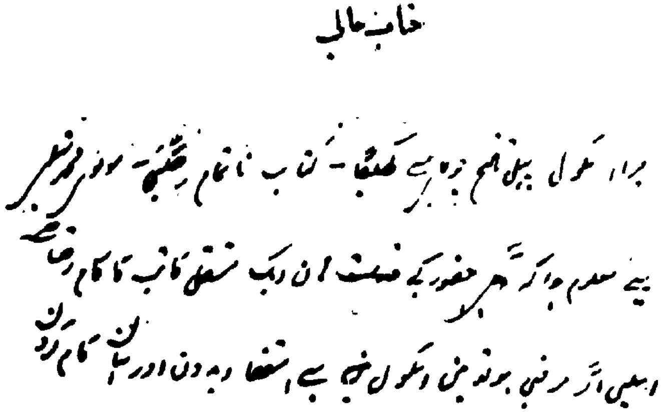

جناب عالی

میرا معمول یہی تھا جو بڑا ہے لکھتا تھا ۔ کتاب ناتمام پڑی تھی ۔ مولوی محمد نصیر

بیچ میں معلوم ہوا کہ آپ بھی حضور کی خدمت ان دنوں مستقل کاتب کا کام رخصت

ابھی اگر مرضی ہو تو میں معمول سے ہی ہے استعفا دے دوں اور یہاں کام کروں

سے سرسید نے مستعار منگوائی تھی۔ یہ قلمی کتاب صرف دو ہفتے کے لیے آئی تھی لیکن ضخامت کی زیادتی کی وجہ سے اس مختصر عرصے میں کتاب مکمل نقل نہ ہو سکی۔ شبلی منشی صاحب میں برابر دلچسپی لے رہے تھے۔ انھیں خیال ہوا کیوں نہ ان کا تعلق سرسید سے ہمیشہ کے لیے قائم کر دیا جائے۔ وہ اسکول کی معلمی سے یہاں رہنا زیادہ پسند کریں گے اور سرسید کو ایک نقل نویس کی عام طور پر ضرورت رہتی ہے، اس طرح ان کے لیے بھی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ شبلی نے نہ صرف یہ کہ انھیں سرسید کے پاس ایک عرضی لکھ کر لے جانے کو کہا بلکہ جیسا کہ انھوں نے مجھے بتایا خود ہی عرضی کا مسودہ تیار کر کے ان کے حوالے کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی موصوف کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ شبلی کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ مسودہ منشی صاحب کے ذخیرے میں اب بھی موجود ہے۔

جناب عالی!

میرا اسکول پہلی تاریخ جولائی سے کھلے گا۔ کتاب ناتمام رہ گئی۔ مولوی محمد شبلی سے معلوم ہوا کہ حضور کے ہاں ایک مستقل کاتب کا کام رہتا ہے اس لیے اگر مرضی ہو تو میں اسکول سے استعفا دے دوں اور یہاں کام کروں۔

ان کی درخواست منظور ہوئی۔ انھوں نے اسکول سے استعفا دے دیا اور سرسید نے انھیں اپنی ملازمت میں لے لیا اور وہ کتابوں کی نقل، سرسید کے مسودات کی تبییض کا کام کرنے لگے۔ کچھ دنوں بعد سرسید اپنے خطوط بھی انہی سے لکھوانے لگے۔

سرسید کی تصانیف میں ازالۃ الغین، ترقیم، ابطال غلامی کی تبییض اس زمانے میں منشی صاحب نے کی، یہ تین کتابیں اور سرسید کے کچھ اور رسالے اور یہ چند خطوط نجم الدین صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کتب خانہ جامع علی گڑھ میں اب بھی موجود ہیں۔

اب تک سرسید ان کی تنخواہ دس روپیہ ماہوار اپنی جیب سے دیتے رہے تھے۔ انھوں نے اس عرصے میں اندازہ کر لیا کہ ان سے اور خدمات بہ وجوہ احسن انجام پا سکتی ہیں۔ انھوں نے منشی صاحب کا تقرر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں کر دیا، ساتھ ہی ساتھ تنخواہ میں دو روپے کا اضافہ بھی ہو گیا۔ سرسید نے فروری سنہ ۱۸۹۳ء کو جو خط الٰہ آباد سے ان کی تقرری کے سلسلے میں دفتر کے ہیڈ کلرک کو لکھا تھا وہ ذخیرۂ نجم الدین میں موجود ہے۔

مشفق منشی شیام بہاری لال صاحب!

نجم الدین عرف "نٹو" کو یکم جنوری سے بارہ روپیہ ماہواری کے حساب سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے تنخواہ ملا کرے گی۔ آپ لالا سری لال کے ہاں سے منجملہ مبلغان کانفرنس عـــہ روپیہ منگوا لیجیے۔ بارہ روپیہ تو نجم الدین کو بابت ماہ جنوری دے دیجیے اور کانفرنس کے اخراجات میں لکھیے اور یہ روپیہ بابت کرایہ ریل آمد و رفت نجم الدین کانفرنس کے حساب میں لکھیے اور وہ آٹھوں روپیہ میری امانت روزنامچۂ مدرسہ میں جمع کر دیجیے۔ والسلام

خاکسار سید احمد

۲ فروری سنہ ۱۸۹۳ء

اب نجم الدین صاحب مستقل طور پر ان کی پیشی میں رہنے لگے اور اپنے کاموں میں ترقی کرتے رہے۔ زمانہ گزرتا گیا اور سرسید سے ان کے تعلقات بڑھتے گئے۔ اب وہ اس عمر کو پہنچ چکے تھے جب ان کے احباب اور اعزہ انھیں شادی کرنے پر مجبور

قرض کے لئے منشی نجم الدین کی درخواست اور اس پر سید صاحب کی منظوری

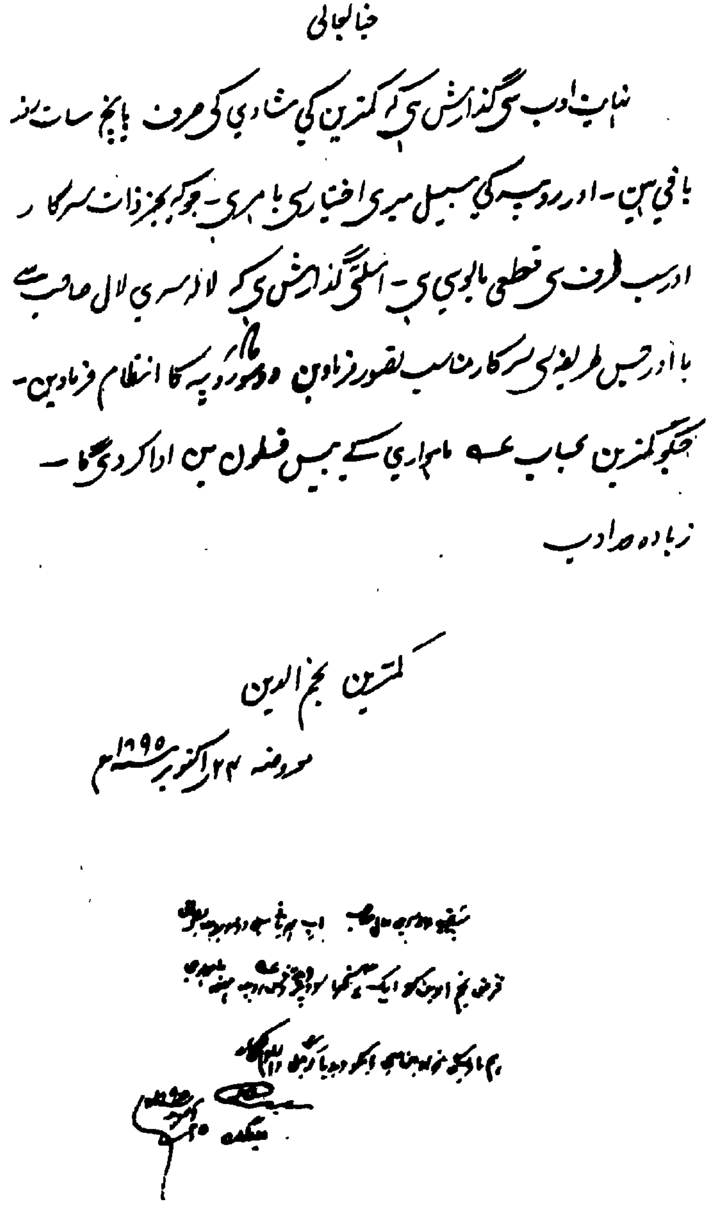

جناب عالی

نہایت ادب سے گذارش ہے کہ کمترین کی شادی کو صرف پانچ سات روز
باقی ہیں - اور روپیہ کی سبیل میری اختیار سے باہر ہے - جو کہ بجز ذات سرکار
اور سب طرف سے قطعی مایوسی ہے - اسلئے گذارش ہے کہ لالہ سری لال صاحب سے
یا اور جس طریقہ سے سرکار مناسب تصور فرماویں دوسو روپیہ کا انتظام فرمادیں -
جسکو کمترین بحساب عہ ماہواری کے بیس قسطوں میں ادا کردیگا -

زیادہ حد ادب

کمترین نجم الدین
مورخہ ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۸۹۵ء

[illegible]
قرضہ نجم الدین کو ایک [illegible]
[illegible]

کرنے لگے۔ علی گڑھ ہی میں مولوی نیاز علی مرحوم جو عدالت میں مختار تھے ان کی صاحب زادی سے نکاح کی بات پختہ ہوگئی، تاریخ بھی مقرر ہوگئی لیکن دقت یہ تھی کہ شادی کے لیے ان کے پاس رقم جمع نہ تھی، دوستوں اور عزیزوں سے جب مایوسی ہوئی تو انھیں بے اختیار سرسید اور ان کی شفقت و محبت یاد آئی اور انھوں نے بلا تکلف انھیں ایک عریضہ لکھ بھیجا جس میں اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کی شادی کے لیے دوسو روپوں کا سامان کردیں۔

فل اسکیپ سائز کے ایک ڈول دار کاغذ پر جس کا رنگ اِمتدادِ زمانہ سے مٹیالا ہوگیا ہے منشی نجم الدین عرف مٹھو کی عرضداشت بابت شادی اب بھی پڑھی جاسکتی ہے۔

جناب عالی!

نہایت ادب سے گزارش ہے کہ کمترین کی شادی کے صرف پانچ سات روز باقی ہیں اور روپیہ کی سبیل میرے اِختیار سے باہر ہے جو کہ (چونکہ) بجز ذات سرکار اور سب طرف سے قطعی مایوسی ہے اس لیے گزارش ہے کہ لالا سری لال صاحب یا جس طریقے سے سرکار مناسب تصور فرمادیں دوسو روپیہ کا انتظام فرما دیں جس کو کمترین بحساب عہ ماہواری کے بیس قسطوں میں ادا کردے گا۔ زیادہ حد آداب

کمترین نجم الدین

معروضہ ۲۴؍ اکتوبر ۱۸۹۵ء

سرسید کو ان کا بڑا خیال تھا، وہ فوراً لالا سری لال کو لکھتے ہیں کہ دوسو روپے بطور قرض منشی نجم الدین کے حوالے کردیجیے۔

سرسید کی یہ مختصر تحریر ان کی عرضداشت پر موجود ہے۔

مشفقی لالا سری لال صاحب!

آپ مہربانی سے دوسو روپے بطریقِ قرض نجم الدین کو ایک روپیہ سینکڑہ سُود پر دے دیں۔ دس روپیہ مہینہ ماہواری ہم اوس کی تنخواہ میں سے آپ کو دے دیا کریں گے۔ والسلام

خاکسار سید احمد

علی گڑھ ۲۵؍ اکتوبر ۱۸۹۵ء

کسی وجہ سے سری لال سے انھیں یہ رقم نہ مل سکی، سرسید کو ان کی ضرورت کا اس قدر خیال تھا کہ انھوں نے یہ رقم خود ہی مہیا کر کے انھیں دے دی۔

''فکر ونظر'' کے مدیر ڈاکٹر نورالحسن نقوی کے سامنے ایک بار منشی نجم الدین کا ذکر آیا تو انھوں نے منشی صاحب سے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ سنایا جس سے سرسید کی بذلہ سنجی کا بھی پتا چلتا ہے اور ان کے جذبۂ ایثار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ پُرلطف قصہ سنائے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ تو عرض کیا ہی جاچکا کہ علامہ شبلی کی تحریک پر وہ اسکول سے مستعفی ہو کر بارہ روپے ماہانہ پر سرسید کے نقل نویس ہو گئے تھے۔ یہ پہلے ہی طے پا گیا تھا کہ منشی صاحب دن بھر سرسید کے مکان پر رہ کر کام کریں گے اور

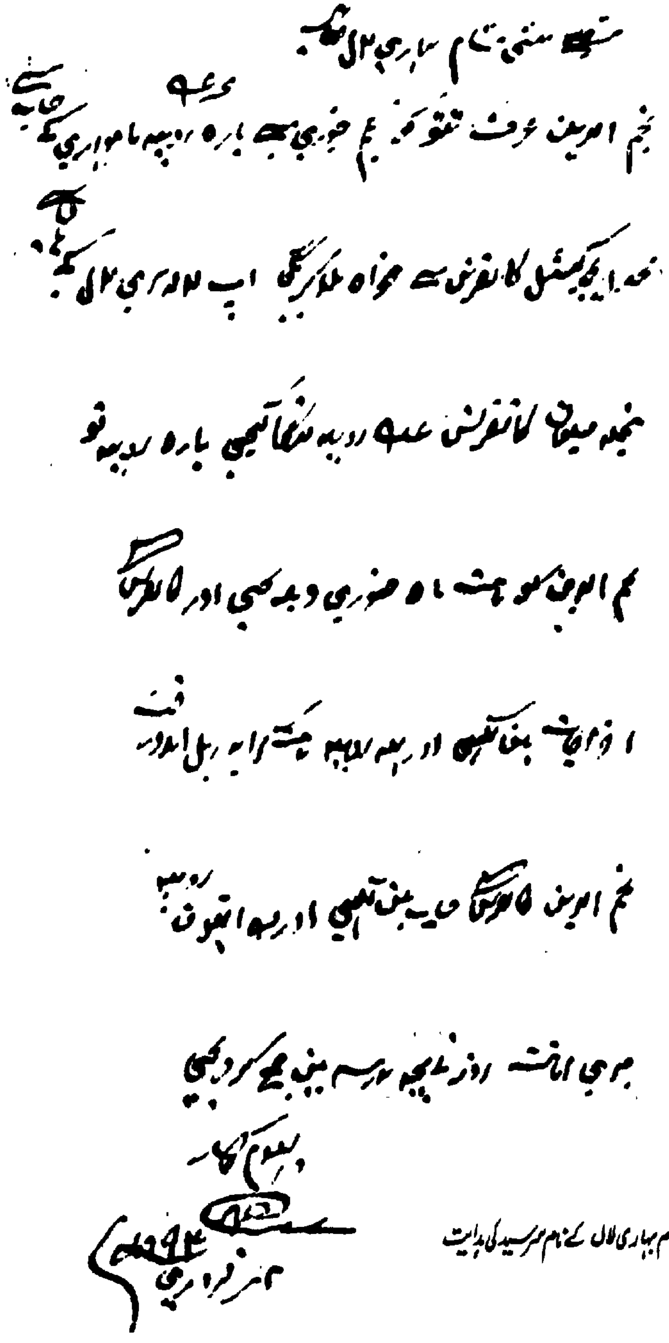

مشفقی منشی شام بہاری لال صاحب

بعوض ۹ کے

محمد امین عرف چھٹو کو ہم خوشی سے بارہ روپیہ ماہواری کے حساب سے

بعہدہ ایجوکیشنل کانفرنس سے تنخواہ ملا کریگی آپ لالہ بہاری لال کو کہدیں

محمد میاں کو کانفرنس سے ۹ روپیہ ملتا تھا اب بارہ روپیہ ہو

محمد امین کو ہمیشہ [illegible] ضروری [illegible] کبھی اور کالج کی

از [illegible] بند آتی ہیں اور یہ روپیہ ہمیشہ [illegible] ادا

محمد امین کا کورس کا حساب بند آتی ہی اور یہ اتفاق روپیہ

میری امانت روز [illegible] مدرسہ میں جمع کر دیجیے

والسلام خاکسار

سید احمد

۲ فروری ۹۴

منشی شیام بہاری لال کے نام سرسید کی ہدایت

دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھائیں گے آگے چل کر منشی صاحب کے ناشتے اور رات کے کھانے کی ذمہ داری بھی سرسید نے قبول کر لی بلکہ دیگر اخراجات کی کفالت بھی کرنے لگے۔ دراصل وہ بہترین خوش نویس ہی نہ تھے بلکہ زود نویس اور درست نویس بھی تھے، اور بہت محنت سے کام کرنے کے عادی تھے۔ سرسید قدرشناسی، حوصلہ افزائی اور غریب پروری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور منشی صاحب پر ان کی یہ عنایات درحقیقت اُن کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ منشی صاحب کی شادی کا موقع آیا اور کہیں سے قرض نہ مل سکا تو سرسید نے یہ بوجھ خود اُٹھایا۔ غرض جب کوئی ضرورت پیش آئی تو سرسید نے ان کی ہر ممکن مدد کی۔

منشی صاحب سرسید کے کاموں سے فارغ ہوگئے تو انھیں ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر میں ملازمت دلا دی گئی۔ کانفرنس کے مالی حالات اچھے نہیں تھے اس لیے تنخواہ میں اضافہ تو ممکن نہیں تھا لیکن سرسید منشی صاحب کے کھانے، کپڑے اور بہت سے دیگر اخراجات کا بوجھ خود اُٹھا کر اُس کی تلافی کر دیتے تھے۔ آج تو جگہ جگہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اہلِ اختیار ملازموں سے کام تو ذاتی لیتے ہیں اور اُن کی تنخواہ قومی اداروں سے ادا کراتے ہیں، مگر سرسید کا طریقہ اس کے برخلاف تھا۔

منشی صاحب کی ذمہ داریاں زیادہ تھیں۔ اس لیے یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ کسی طرح تنخواہ میں اضافہ ہو۔ اُدھر سرسید کانفرنس کے مالی حالات سے مجبور تھے۔ ایک دن موقع پاکر منشی صاحب سرسید سے مخاطب ہوئے۔

"جناب والا! آپ میری تحریر کو تو بہت پسند فرماتے ہیں۔ اکثر کہا کرتے ہیں کہ میں لکھتا نہیں موتی پروتا ہوں۔"

"جی ہاں اس میں کیا شک ہے۔" سید صاحب نے جواب دیا۔

"آپ اکثر یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں بہت تیز لکھتا ہوں اور نہایت صحت سے لکھتا ہوں۔" منشی صاحب نے حوصلہ پاکر عرض کیا۔

"بالکل درست" سید صاحب نے فرمایا۔

یہ سب کچھ ہے تو پھر میری تنخواہ میں اضافہ کیوں نہیں ہوتا؟ منشی صاحب نے سوال کیا۔

سید صاحب ذرا دیر کو لاجواب ہوگئے۔ مگر فوراً ہی بولے "آپ کی تنخواہ میں اضافہ تو نہیں ہو سکتا۔"

آخر کیوں؟

"آپ کی داڑھی جو ٹیڑھی ہے۔" سید صاحب اس کے سوا اور کیا جواب دیتے!

اس وقت بات ہنسی میں اُڑ گئی۔ کچھ دنوں بعد کانفرنس کے مالی حالات قدرے بہتر ہوگئے تو منشی صاحب نے ذرا تلخی سے کہا کہ آخر کیا دشواری ہے، اب میری تنخواہ میں اضافہ کیوں نہیں ہوتا؟" مگر سید صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے، مسکرا کے فرمایا "وہی داڑھی والی بات۔" سید صاحب نے منشی صاحب کی تنخواہ میں اضافہ تو نہیں کیا، مگر خود برابر زیرِ بار ہوتے رہے، اور ہمیشہ خیال رکھا کہ منشی صاحب کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ یہ تھا سرسید کا جذبۂ ایثار۔!

سرسید کے آخری زمانے میں سید محمود مرحوم کی سوء مزاجی کی وجہ سے بعض ناخوشگوار باتیں پیش آئیں۔ سرسید ان کی کچھ عادات و افکار سے اس طرح عاجز آگئے کہ کوٹھی چھوڑ کر ہال روڈ کے بنگلہ نمبر ۱ میں منتقل ہوگئے۔ سید محمود (۱۸۵۰-۱۹۰۳ء) کی دماغی حالت مشتبہ تھی لیکن یہ ضرور ہے کہ جب وہ صحیح حالت میں ہوتے تو انھیں اپنے کیے پر بعض مرتبہ پشیمانی بھی ہوتی، اور وہ حتی الامکان اس کی تلافی کے لیے بھی تیار ہو جاتے۔ بعض اعزہ چاہتے تھے کہ دونوں میں مصالحت ہو جائے۔ اس خاندان کے ایک رکن سرسید کو لکھتے ہیں :-

جناب اموی صاحب قبلہ مدظلہ العالی !

بعد تسلیم۔ بغیر آپ کے یہاں تشریف لائے بعض امور اہم طے نہیں ہو سکتے۔ ہر امر میں ضرورت ہوتی ہے کہ آپ سے کچھ حالات اس کے دریافت کیے جائیں۔ اس لیے ایک گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد مرزا عابد علی بیگ صاحب اور میں اور سید محمود آپ کے پاس آویں گے اور آپ کو یہاں لے آویں گے اور آپ کو یہیں رہنا ہوگا۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ آپ اپنا اسباب اور سامان سب یہاں بھیج دیں۔ تاکہ یہاں آکر آپ کو تکلیف نہ ہوتے۔ زیادہ آداب۔

(عریضہ سیّد محمد احمد ۱۳ راکتوبر ۱۸۹۷ء علی گڑھ)

سرسید دوبارہ حاجی اسماعیل خاں کی چھوٹی کوٹھی میں چلے گئے۔ منشی صاحب بھی برابر ان کے ساتھ رہے اور پیشی کا کام کرتے رہے۔ سرسید کی خدمت کرتے ابھی انھیں نو ہی سال ہوئے تھے کہ سرسید کا انتقال ہوگیا۔

سرسید کی وفات کے بعد انھیں اپنی ملازمت کی فکر ہوئی۔ اس درمیان میں اُنھوں نے مڈل ورنیکلر کا امتحان درجۂ اوّل میں پاس کرلیا تھا۔ انھیں اطلاع ملی کہ محکمہ چونگی میں ہیڈ محرری کی جگہ خالی ہے، وہ فوراً درخواست دیتے ہیں۔

جناب عالی !

گزارش یہ ہے کہ کمترین عرصہ تین سال تک فری اسکول نمبر اوّل میں بہ عہدۂ نائب مدرسی مامور رہا، بعد اس کے عرصہ نو سال تک جناب آنریبل ڈاکٹر سرسید احمد خاں بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی سیکرٹری ایم۔ اے۔ او کالج کی پیشی کا کام انجام دیتا رہا اور اسی اثنا میں امتحان مڈل ورنیکولر درجہ اوّل میں پاس کیا۔ چونکہ بوجہ وفات سرسید مرحوم فدوی بیکار رہ گیا ہے اور سررشتہ چونگی کی ہیڈ محرری کا عہدہ خالی ہے اس لیے گذارش ہے کہ کمترین کی پرورش اس عہدہ پر فرمائی جاوے۔

کمترین محمد نجم الدین ساکن علی گڑھ محلہ بالائے قلعہ

معروضہ ۳۰ رمارچ ۱۸۹۸ء

اس درخواست کی پیشانی پر تھیوڈور بیک نے چند سطریں سفارش میں لکھ دی ہیں کہ میں اس درخواست کی پُرزور سفارش کرتا ہوں۔ نجم الدین چھوٹے سے قد کے بڑے لائق آدمی ہیں۔ انھوں نے سرسید احمد مرحوم کے ساتھ رہ کر بڑی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ اُن کی خدمات مجھے مطلوب نہیں، کیونکہ مجھے انگریزی دان کلرک کی ضرورت ہے۔ اس درخواست پر دو اور مختصر سی سفارشیں ہیں۔ آخر میں نواب مزمل خان کی پُرزور سفارش ہے جو یکم اپریل ۱۸۹۸ء کی لکھی ہوئی ہے۔

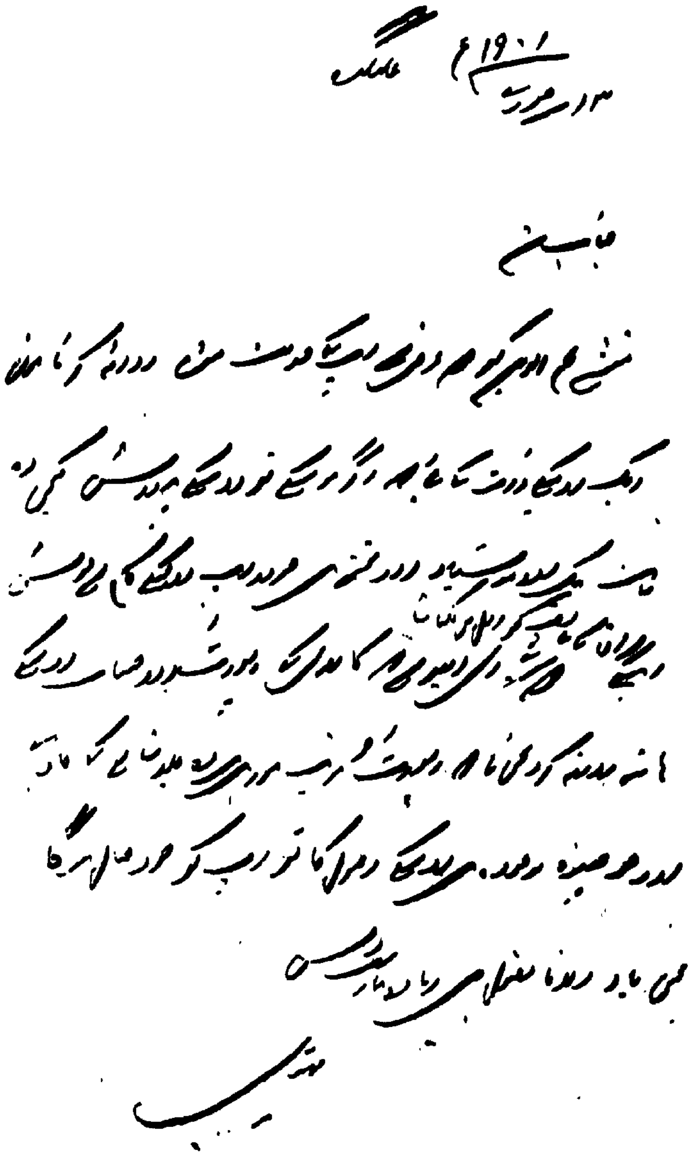

۳۰ ستمبر ۱۹۰۱ء علیگڈھ

جناب من

منشی نجم الدین [illegible]

[illegible]

مہدی

منشی نجم الدین کے بارے میں محسن الملک کا سفارشی خط

یہ درخواست تو منظور نہیں ہوئی، لیکن سید محمود مرحوم نے انھیں اپنی پیشی میں لے لیا۔ موصوف سید محمود کی حاضر جوابی، ظرافت اور ان کی ذہانت اور قوتِ حافظہ کے بڑے دلچسپ واقعات سناتے تھے۔ منشی صاحب نے ان کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا، لیکن مطمئن نہ تھے۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ سید محمود کی تلوّن طبعی اور درشت مزاجی سے گھبراتے ہوں اور طوفان ابر و باد سے پہلے ہی ایک جائے پناہ کی تلاش میں لگ گئے ہوں۔

۱۲ جنوری سنہ ۱۹۰۱ء کا محسن الملک کا لکھا ہوا ایک خط اس ذخیرے میں ملتا ہے جو اُنھوں نے علی گڑھ سے مولوی عبدالغفور خاں مدارالمہام رام پور کو منشی صاحب کے متعلق لکھا ہے:۔

جنابِ من!

منشی نجم الدین کو دو غرض سے آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں، ایک اس کی ذات کے لیے اگر ہو سکے تو اس کی پرورش کیجیے، وہ نہایت نیک، ہوشیار اور محنتی ہے۔ ضرور آپ اُس کے کام سے خوش رہیں گے۔ ان کے لیے آپ کو دہلی میں لکھا تھا ـــــ دوسرے اس اُمید سے کہ کانفرنس کی رپورٹ اور حساب اس کے ہاتھ روانہ کر دیجیے تاکہ رپورٹ جو مرتب ہو رہی ہے وہ جلد شائع کی جاوے اور جو چندہ موعودہ ہے۔ اس کی وصولی کا تو آپ کو خود خیال ہوگا۔ مجھے یاد دلانا فضول ہے۔ زیادہ نیاز۔ مہدی

محسن الملک کے اس خط کا اثر کیا ہوا معلوم نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ رام پور نہ جا سکے اور علی گڑھ میں محسن الملک کے پاس رہ کر ہی (اس لیے کہ اب وہ ان کے تحت کام کر رہے تھے) سرکاری ملازمتوں کی طرف توجہ کرنے لگے۔

سرکاری ملازمت کے حصول میں انگریزوں کی سفارشات کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور وہ اس سے ناواقف نہ تھے۔ تعجب نہیں کہ اس خیال نے انھیں پروفیسر تھیوڈور مارسن سے ملایا ہو۔ ایم۔ اے۔ او کالج کے یہ انگریز پرنسپل ۲ اپریل سنہ ۱۹۰۲ء کو انھیں سند دیتے ہوئے لکھتے ہیں "میں نجم الدین سے واقف ہوں جو ایک عرصے تک سر سید خاں کے تحت کام کر چکے ہیں اور جنھوں نے انہی کی نگرانی میں اپنا کام سیکھا ہے۔ جو خوش نویس میں نے اپنی زندگی میں دیکھے ہیں ان میں یہ بہت بہتر ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان میں یہ خوبی ہے کہ بہت تیز لکھتے ہیں، بہت اچھے اخلاق کے مالک ہیں اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ سر سید احمد خاں ان پر کس قدر بھروسا رکھتے تھے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ غیر معمولی جفاکش ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ ایک بہترین محرر ہونے کی ساری صلاحیتوں کے مالک ہیں"

افسوس ہے کہ ان سفارشوں اور اسناد کے باوجود انھیں کوئی معقول جگہ نہ مل سکی۔ وہ بدستور محسن الملک کی ماتحتی میں منشی کی خدمت انجام دیتے رہے اور دونوں میں کوئی بھی اس بات سے غافل نہیں رہا کہ کسی اور موزوں جگہ کی تلاش ضروری ہے۔

ان کاغذات میں اپریل ۱۹۰۶ء کی لکھی ہوئی ایک انگریزی درخواست کی ٹائپ شدہ نقل ملتی ہے۔ جو اُنھوں نے انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن آگرہ و اودھ کو رجسٹراری کے لیے بھیجی ہے۔ اس درخواست کی پیشانی پر اس زمانے کے انگریز پرنسپل مسٹر آرچ بولڈ کے قلم کی لکھی ہوئی مختصر سی سفارش ہے۔

۱۱ جولائی سنہ ۱۹۰۹ء کی لکھی ہوئی ایک اور درخواست اُردو میں ملتی ہے جو ڈسٹرکٹ و سیشن جج بہادر ضلع فرخ آباد کے لیے

لکھی گئی تھی :-

حضور عالی!

فدوی ضلع علی گڑھ کے ایک معزز اور شریف خاندان سے ہے۔ فدوی کو سرسید مرحوم نے صغر سنی سے مثل اپنے بچّے کے پرورش کیا، تعلیم دی اور تربیت کی اور اپنی پیشی کی خدمت سپرد فرمائی۔ فدوی نے نو برس تک اس خدمت کو نہایت محنت اور دیانت داری سے انجام دیا، اور اس اثنا میں امتحان مڈل ورنیکولر اوّل درجہ میں پاس کیا۔ بعد وفات سرسید مرحوم فدوی نے آنریبل سید محمود مرحوم آنریری سیکرٹری ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی پیشی کی خدمت انجام دی اور ان کی وفات کے بعد سے جناب نواب محسن الملک بہادر موجودہ آنریری سیکرٹری ٹرسٹیان کی پیشی کی خدمت انجام دیتا ہے ....

اب فدوی بذریعہ درخواست ہذا مستدعی ہے کہ پرورش فدوی کی صیغۂ دیوانی میں کسی عہدے پر فرمائی جاوے۔ زیادہ آداب

فدوی نجم الدین محرر پیشی نواب محسن الملک

معروضہ ۱۱ر جولائی ۱۹۰۶ء

دونوں درخواستوں کا نتیجہ صفر ہی رہا۔

سرسید کے بعد اُن کی ذات سے دلچسپی رکھنے والوں میں محسن الملک سب سے زیادہ ہیں۔ وہ ہمیشہ اُن کی ترقی کے لیے کوشش کرتے رہے۔ اس ذخیرے میں ان کے لکھے ہوئے متعدد خطوط ملتے ہیں جو اُنھوں نے دوستوں یا افسروں کو ان کی سفارش کے سلسلے میں لکھے ہیں اور اس پر متعدد سارٹی فیکیٹ مستزاد جو اُنھوں نے لکھ کر وقتاً فوقتاً دیے ہیں۔

اردو کے مکتوب الیہ ریاست رام پور کے مدار المہام ہیں۔ دوسرا خط انگریزی میں ہے۔ اور تاریخ تحریر ۸ر جون ۱۹۰۶ء ہے۔ بدقسمتی سے مکتوب الیہ کا نام دریافت نہ کر سکا، لیکن "مائی ڈیئر" سے خط کی ابتدا ہوتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مکتوب الیہ سے جو غالباً انگریز ہے، بے تکلفی کے تعلقات نہیں رکھتے۔ پھر بھی منشی صاحب کی محبت میں اسے چار صفحوں کا طویل خط لکھنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس خط میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ حامل رقعہ ہذا ستّرہ سال سے کالج اور کانفرنس میں اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں اور ان کی خدمات کے معترف مسٹر گارڈن براؤن بھی ہیں جن کی دی ہوئی سارٹی فیکیٹ ان کے پاس موجود ہے، مجھے یقین ہے کہ ان کے معاملے کو آپ خاص اہمیت دیں گے اور اس صوبے میں سب رجسٹرار کی جگہ پر تقرر میں آپ پوری مدد فرمائیں گے۔

دوسرا انگریزی خط اُنھوں نے G C. C. INGRAM کو لکھا ہے۔ جو اُس زمانے میں علی گڑھ کے کلکٹر اور مجسٹریٹ تھے۔ خط پر تاریخ تحریر درج ہے لیکن سال کا اندراج نہیں۔ یہ خط اٹاوہ سے لکھا گیا ہے۔ اور قیاس غالب ہے کہ خود منشی صاحب اسے صاحب موصوف کے پاس لے کر پہنچے ہوں گے۔ اس لیے کہ لفافے پر نہ ٹکٹ چسپاں ہے نہ ڈاک کی مہر کے نقوش ہیں۔ محسن الملک نے لکھا ہے کہ آپ کے دفتر میں ایک اسامی خالی ہونے کی مجھے اطلاع ملی ہے۔ اگر اس جگہ پر آپ نجم الدین

مولانا حالی کا خط منشی نجم الدین کے نام

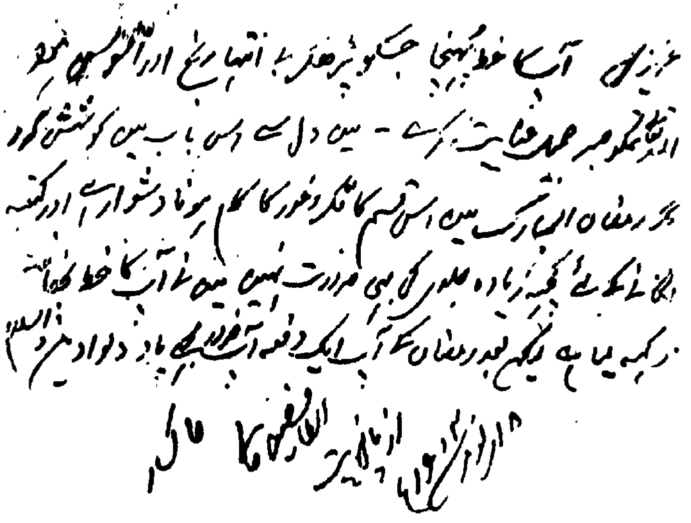

عزیز من آپ کا خط پہنچا جسکو پڑھکر بے انتہا رنج اور اللہ سے امید
انشاء اللہ تمکو صبر جمیل عنایت کرے - میں دل سے اس باب میں کوشش کرو
مگر رمضان المبارک میں اس قسم کا فکر و غور کا کام ہونا دشوار ہے اور کچھ
اسکا لکھنے کی کچھ زیادہ جلدی کی بھی ضرورت نہیں میں نے آپ کا خط اٹھا
رکھ لیا ہے لیکن بعد رمضان کے آپ ایک دفعہ آپ ضرور مجھے یاد دلوا دیں والسلام

الطاف حسین حالی
از پانی پت
[illegible] ۱۹۱۰

کا تقرر کردیں تو میں غایت درجہ ممنون ہوں گا اور مجھے یقین ہے کہ اس انتخاب کے بعد میں خود آپ کو بڑی مسرت حاصل ہوگی۔ محسن الملک نے اپنا پرانا خط کا کاغذ استعمال کیا ہے جس پر ان کے نام کا مونوگرام نقش ہے اور پتے میں حیدرآباد دکن۔

محسن الملک نے انھیں مختلف موقعوں پر چار سندیں بھی لکھ کر دی ہیں۔ یہ علی الترتیب ۱۸۹۹ء، ۱۹۰۲ء، ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء کی لکھی ہوئی ہیں۔

اس ذخیرے میں کچھ اور سندیں بھی ہیں، جن میں ایک انگریزی سند گارڈن براؤن کی ہے۔ یہ علی گڑھ میں پروفیسر تھے اور کچھ دنوں تک محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے سند ۲۶ مئی ۱۹۰۶ء کو لکھ کر دی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب منشی صاحب سب رجسٹراری کی کوشش کر رہے تھے۔

براؤن نے انھیں صرف ایک سند ہی لکھ دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ اسی دن انھوں نے ایک خط بھی الف ای ٹیلر آئی سی ایس کے نام لکھ کر ان کے حوالے کیا ہے۔ جو اس زمانے میں دوسرے سفید آقاؤں کی طرح ہندوستان کی دھوپ اور تپش سے بچنے کے لیے نینی تال کی شاداب پہاڑیوں پر فروکش تھے۔ منشی صاحب صعوبتِ سفر برداشت کرتے، روپیہ بہاتے اور محنت ضائع کرتے، ہانپتے کانپتے پہاڑی کی چوٹی پر صاحب کے درِ دولت پر پہنچے تو معلوم ہوا صاحب مصروف ہیں اور کسی سے مل نہیں سکتے۔ انھوں نے براؤن کا خط بھجوا دیا۔ علیحدہ جواب دینے کے بجائے اُس نے بے تمیزی سے اسی خط کی پیشانی پر سُرخ
CAN NOT DO ANYTHING FOR NAJMUDDIN
روشنائی سے لکھ دیا۔

اس ذخیرے میں اور بھی بعض کاغذات ہیں، جن کا ذکر کسی اور موقع پر کیا جائے گا۔

محسن الملک سے وابستگی کے زمانے ہی میں منشی صاحب کو ایک حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ میں مضمون کی ابتدا میں ان کی شادی کا ذکر کر چکا ہوں ۱۸۹۳ء میں ان کی علی گڑھ میں شادی ہوئی۔ ۲۷ر اگست ۱۸۹۷ء کو ان کے گھر ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کا نام اُنھوں نے تاج دار بیگم رکھا۔ افسوس ہے کہ یہ سات سال کی عمر میں جولائی ۱۹۰۴ء میں دیوار کے نیچے آکر انتقال کر گئی۔ شبلی، سرسید اور محسن الملک کے علاوہ ان کے تعلقات حالی سے بھی کچھ کم نہ تھے۔ منشی صاحب نے اس حادثے کی انھیں اطلاع دی اور اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ وہ بچی کی وفات پر کوئی قطعۂ تاریخ لکھ دیں جسے وہ کتبہ مزار پر نقش کرا سکیں۔ حالی نے انھیں فوراً جواب لکھا۔

عزیزِ من!

آپ کا خط پہنچا جس کو پڑھ کر بے انتہا رنج اور افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ تم کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ میں دل سے اس باب میں کوشش کروں گا مگر رمضان المبارک میں اس قسم کا فکر و غور کا کام ہونا دشوار ہے اور کتبہ لگانے کے لیے کچھ زیادہ جلدی کی بھی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کا خط بہ حفاظت رکھ لیا ہے۔ لیکن بعد رمضان کے آپ ایک دفعہ ضرور مجھے یاد دلوا دیں۔ والسلام

خاکسار، (الطاف حسین حالی، از پانی پت ۱۸ر نومبر ۱۹۰۴ء)

محسن الملک کی وفات کے بعد انھیں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی سرپرستی حاصل ہوئی اور سنہ ۱۹۰۷ء سے سنہ ۱۹۱۷ء تک ایجوکیشنل کانفرنس میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی ماتحتی میں خدمات انجام دیتے رہے۔ دو سال بعد حسنِ خدمت کے صلے میں انھوں نے بہت اچھی سند انھیں لکھ کر دی۔ یہ ۲۴؍ فروری سنہ ۱۹۱۹ء کی تحریر کردہ ہے۔ اور اس میں منشی صاحب کے حسنِ خدمات کے علاوہ ان کی خوش نویسی کی بھی تعریف کی ہے۔ ان کی تیز نویسی کے سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے: HE USES HIS PEN AS ONE USES A TYPE-WRITER ۔

ایم، اے، او کالج اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اصحاب سے ان کے تعلقات کی داستان ابھی ختم نہیں ہوتی۔ ابھی اس خانوادے کے ایک نامور فرزند کا ذکر ضروری ہے۔ جو منشی صاحب کو دوستوں کی طرح عزیز سمجھتے تھے۔

سرسید کے پوتے سر راس مسعود (۱۸۸۹-۱۹۳۷ء) حیدرآباد میں ہیں۔ منشی صاحب بظاہر کوئی معقول اسامی حیدرآباد میں چاہتے ہیں۔ مسعود مرحوم کو اُن کا پورا خیال ہے، وہ محکمۂ امور مذہبی میں چاہتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی جگہ نکل آئے جس کے معتمد اس زمانے میں نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی مرحوم (۱۸۶۷ء - ۱۹۵۰ء) تھے۔ مسعود مرحوم لکھتے ہیں:-

ڈیئر انجم تسلیم!

میرے خطوں کے جواب نہ دینے سے شاید تم یہ سمجھتے ہوگے کہ میں تم کو بھول گیا۔ دیر کی وجہ یہ ہوئی کہ شروانی صاحب مئی کے مہینے میں کئی ہفتے تک دورے پر رہے۔ ان کے آتے ہی میں نے اُن سے پورے طور پر تمھاری سفارش کر دی اور آج میں پھر ان سے ملوں گا اور تمھارے بارے میں پھر کہوں گا۔ اگر تم کو میرے ذریعے سے کوئی کامیابی ہوگئی تو مجھ کو بے انتہا خوشی ہوگی۔ دو ہفتے کے اندر میں ان شاء اللہ ولایت روانہ ہو جاؤں گا۔ بہر حال میں تمھاری ہر طرح سے مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ فقط

خاکسار سید مسعود

میں ابھی شروانی صاحب سے ملا تھا۔ انھوں نے وعدہ کر لیا ہے۔

لیکن یہ وعدے کام نہ آئے اور سرسید، سید محمود، محسن الملک، شبلی، حالی، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، تھیوڈر بیک، ماریسن، براؤن، راس مسعود، صدر یار جنگ کی ساری سندیں، تحریریں اور سفارشیں منشی صاحب کے ذخیرۂ کاغذات میں اور ان بزرگوں کی مساعیٔ حسنہ ان لوگوں کے نامۂ اعمال میں جمع ہوتی رہیں۔ وہ علی گڑھ اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔ وہ علی گڑھ میں سنہ ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ تقریباً ۹۰ سال کی عمر پا کر انھوں نے سنہ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں یہیں وفات پائی۔ اس طرح منشی نجم الدین کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا یہیں علی گڑھ میں گزرا۔ زندگی کا آخری وقت بھی وہ علی گڑھ کی خدمت میں گزار کر یہیں خاک میں پیوست ہو گئے۔

حواشی

۱؎ ڈاکٹر محمود فاروقی تقسیمِ ہند کے بعد کراچی چلے گئے۔ میر حسن دہلوی پران کا مقالہ لاہور سے شائع ہوا، اور مقبول ہوا۔ لیکن اس موضوع کا حق پروفیسر وحید قریشی نے "میر حسن اور ان کا زمانہ" لکھ کر ادا کیا جو لاہور سے شائع ہوا۔ اس کتاب پر انھیں جامعہ پنجاب نے ڈاکٹریٹ تفویض کی۔ ڈاکٹر قریشی، تاریخ، فارسی اور اُردو کے نہایت ممتاز ادیب اور محقق ہیں۔ ہندوستان اور علی گڑھ کی تاریخ سے بھی ان کی واقفیت بہت گہری ہے۔ میری فرمائش پر اُنھوں نے مضمون پر ایک نوٹ تحریر کیا جو آخر میں ان کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

۲؎ انجم اعظمی صاحب، خلیل مرحوم کے عزیز ترین دوستوں میں ہیں۔ علی گڑھ سے اُردو میں ایم اے کر کے بمبئی کی کسی درسگاہ میں معلّم ہو گئے تھے۔ غالباً سنہ ۱۹۵۵ء میں کراچی منتقل ہوئے۔ آپ کراچی میں اُردو کے ممتاز اساتذہ اور نامور نقادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ایک نغز گو شاعر بھی ہیں، متعدد کتابوں اور شعری مجموعوں کے مصنف ہیں۔

۳؎ میں نے بھی ان سے متعدد کتابیں اور مضامین نقل کرائی تھیں، خیراتی لال بے جگر کے "تذکرہ شعرائے اُردو کا واحد قلمی نسخہ وزارت ہند (لندن) کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کا عکس جناب مالک رام صاحب کے لیے میں نے حاصل کیا تھا۔ اور انھی کی فرمائش پر منشی نجم الدین صاحب سے اس کی نقل تیار کرائی تھی۔ ہم دونوں کا ارادہ اسے مل کر مرتب کرنے اور شائع کرنے کا تھا جو دوسرے کاموں کی وجہ سے اب تک معرضِ التوا میں پڑا ہوا ہے۔ کوئی پانچ سو صفحہ کی کتاب اُنھوں نے بہت کم مدت میں لکھ کر دے دی تھی، معاوضہ جہاں تک یاد آتا ہے سات آنے فی صفحہ کے حساب سے اُنھوں نے لیا تھا۔ کبر سنی کے باوجود تحریر ان کی صاف تھی۔

۴؎ یہ وہی مشفق ہیں جنھوں نے جعلی چیکوں کے ذریعہ کالج کی رقم میں سے ایک لاکھ سے زائد کا غبن کیا تھا اور قومی رقم کے اس طرح ضائع ہونے کا غم سرسید کو عمر بھر رہا۔

۵؎ اصل مسودے میں سیّد صاحب سے "ن" رہ گیا ہے اور صرف محمد ایجوکیشنل کانفرنس لکھ گئے ہیں۔

۶؎ افسوس کہ بیگم صاحبہ کا سنہ ۱۹۶۳ء کے اوائل میں انتقال ہو گیا۔

۷؎ یہاں قبل بھی ؟ یا اوّل بھی ؟ پڑھا جا سکتا ہے۔

۸؎ اس ذخیرے میں ایک لفافہ مسٹر ٹیلر آئی سی ایس سیکرٹری گورنمنٹ آگرہ و اودھ کے نام ہے۔ اس لفافے میں کوئی خط موجود نہیں۔ میرا خیال ہے کہ محسن الملک کا خط اس ٹیلر کے نام ہے جو صحیح معنوں میں سنہ ۱۹۰۶ء سے انگریز آئی سی ایس حضرات کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اس نے محسن الملک کے لفافہ پر بڑی شان بے نیازی سے سُرخ روشنائی سے یہ فقرہ لکھ دیا ہے۔

I AM AFRAID I CANNOT HELP HIM

۹؎ پتے پر یہ عبارت درج ہے۔ بمطالعہ عزیزم منشی نجم الدین صاحب دفتر آنریری سیکرٹری محمڈن کالج، علی گڑھ۔

اس مقالے میں علی گڑھ اور اس کے بعض فرزندوں کا ضمناً ذکر آیا ہے جو اصحاب علی گڑھ کے حالات سے آگاہ نہیں ان کے لیے ممکن ہے ایک آدھ جگہ الجھن پیدا ہو اس لیے یہاں بعض تصریحات ضروری ہیں۔

یہ نوادر جس دور سے متعلق ہیں اس میں علی گڑھ کے آنریری سیکرٹری مندرجہ ذیل اصحاب تھے :۔

سر سید ۱۸۷۵ء تا مارچ ۱۸۹۸ء
سید محمود مارچ ۱۸۹۸ء تا ۱۸۹۹ء
محسن الملک ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۷ء
وقار الملک ۱۹۰۷ء تا ۱۹۱۳ء
محمد اسحاق خاں ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۸ء
سید محمد علی ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۰ء

اور پرنسپل اس ترتیب سے :۔

سڈنس
تھیوڈور ماریسن
آرچبولڈ
ٹول
ڈاکٹر ضیاء الدین احمد تا ۱۹۲۰ء

سر سید کے آخری زمانے کے تین واقعات اہم ہیں :۔ (۱) ایک لاکھ روپے کا غبن جس کا اثر کالج کی مالی حالت پر ہوا، اور سر سید کی وفات پر اس کی حیثیت ایک دیوالیہ ادارے کی سی ہو گئی (تفصیل کے لیے دیکھیے تذکرہ محسن محمد امین زبیری ص۱۹) (۲) انگریز پرنسپل مسٹر بیک کا کالج اور انجمن کے معاملات میں پورا دخل (۳) سر سید اپنے بعد اپنا جانشین اپنے لڑکے سید محمود کو بنانا چاہتے تھے، اور اپنی زندگی ہی میں اس کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ ٹرسٹیوں میں بڑا اختلاف ہو گیا اور سر سید کے دستِ راست مولوی سمیع اللہ نے تو سخت مخالفت کی۔ جب سر سید نے "مجموعہ قواعد و قوانین ٹرسٹیان" پاس کرا کے یورپینوں کو کالج میں من مانی کرنے کی اجازت دینی چاہی اور سر سید کو فتح اور مولوی صاحب کو شکست ہوئی تو عرصے تک فریقین میں پمفلٹ بازی ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ مولوی سمیع اللہ مستعفی ہو کر کالج اور انجمن سے الگ ہو گئے (مطائبات و مضحکات سر سید جلد دوم ص۱۳۲ ، ص۱۳۳) نواب وقار الملک نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی (تذکرۂ وقار۔ امین زبیری)

سید محمود کی مادہ پرستی نے انھیں کسی کام کا نہ چھوڑا تھا جج بھی اُن سے چھوٹی۔ اس کے بعد علی گڑھ میں پریکٹس شروع کی اور کالج کے معاملات میں باپ کا ہاتھ بٹایا۔ لیکن مدرستہ العلوم کا کام جیسا کہ ابتدا میں اُنھوں نے کیا تھا، بعد میں قائم نہ رکھ سکے۔ کیونکہ آخر عمر میں شراب ان پر غالب تھی (دیارِ ایام۔ عبدالرزاق ص۲۶۸) سر سید کی وفات کے بعد سید محمود سیکرٹری بن گئے لیکن سال بھر کے بعد ۲۱ جنوری

۱۸۹۹ء کو ٹرسٹیان کالج کا جلسہ نواب محمد حیات خاں (سر سکندر حیات کے والد) کی صدارت میں ہوا۔ ایک طرف سید محمود اور دوسری طرف محسن الملک موجود تھے۔ سید محمود کے خلاف مسٹر بیک کو ہموار کر لیا گیا تھا۔ اس لیے محسن الملک کامیاب ہوئے۔ سید محمود کو چونکہ اپنی زندگی میں سر سید لائف جائنٹ سکریٹری بنا گئے تھے۔ تو اعد کی رُو سے ان کی موجودگی میں کسی اور کو سکریٹری نہیں چُنا جا سکتا تھا۔ لہٰذا حاجی اسمٰعیل خاں صاحب سید محمود کی حمایت میں تھے۔ جب ٹرسٹیوں نے سید محمود کی جگہ محسن الملک کو سکریٹری بنایا تو اس پر بڑا جھگڑا ہوا، سر رضا علی لکھتے ہیں: "سید محمود کی حالت زخمی شیر کی تھی۔ بپھرے ہوئے تھے اور جو منہ میں آتا تھا کہہ رہے تھے۔ سب اِدھر اُدھر دبکے ہوئے تھے۔ ...... ٹرسٹیوں کی کوشش تھی کہ جس طرح بن پڑے خوشامد درآمد کر کے غضب آلودہ شیر کو چیتے کی طرح رام کریں۔ اس کوشش میں سب سے نمایاں حصہ لینے والے مسٹر بیک تھے ...... بالآخر اس شخص کی طرف توجہ کام آئی جس کی فراست و ذکاوت اور ہوشمندی کا اب سے چند سال پہلے حیدر آباد میں ڈنکا بج رہا تھا۔ محسن الملک بڑھے اور سید محمود کے قدموں کی طرف جھکے۔ آن کی آن میں ایک سید کی ٹوپی دوسرے سید کے قدموں پر تھی۔ سید محمود نے ہاتھ پکڑ کر محسن الملک کو اُٹھایا اور فرمایا مہدی تو کیا کہتا ہے۔؟" محسن الملک کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا: "میں یہ کہتا ہوں کہ اس وقت قوم کی کشتی کو ڈوبنے سے سوائے تمھارے کوئی نہیں بچا سکتا۔" سید محمود بولے: "اچھا تو کہتا ہے تو میں راضی ہوں۔" سید محمود کی آواز میں افسوس کا ذرا بھی شائبہ نہ تھا، ہم سب محوِ حیرت تھے کہ این چہ می بینم، بیداری است یا رب یا بخواب" (اعمالنامہ سر رضا علی صفحہ ۸۴، ۸۵) اس کے بعد مسٹر بیک انجمن پر حاوی ہوتے گئے اور انجمن کے حسابات کے رجسٹر تک اپنی تحویل میں لے لیے۔ محسن الملک بے دست و پا تھے۔ اس انتشار کا اثر یہ ہوا کہ کالج کے انگریز پروفیسر طلبہ سے بدتمیزی سے پیش آنے لگے اور ٹرسٹیوں کے مقابلے میں ان کی خود سری زیادہ ہوتی گئی۔ مارلیسن کی پرنسپلی کے زمانے میں بھی یہ مواد جمع ہوتا رہا، اور طلبہ اور انگریزی اسٹاف سے اختلافات بڑھتے گئے۔ اگرچہ مالی حالت سنبھل رہی تھی، لیکن انگریزوں کی فرعون دماغی کی وجہ سے کالج شورشوں کا مرکز بننے لگا۔ مارلیسن کا اثر لوکل گورنمنٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا میں بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس لیے کالج کے معاملات میں کوئی علانیہ دم نہیں مار سکتا تھا۔ طالب علموں میں بھی پرنسپل کے خلاف نیز انگریز قوم کے خلاف جذبات بھڑکنے لگے۔ مارلیسن اپنے بعد پروفیسر کارنا کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے جو بڑے دریدہ دہن آدمی تھے۔ اور کالج سے اپنی نفرت کا اظہار برملا کیا کرتے تھے۔ مارلیسن کے ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود زبردست مخالفت ہوئی۔ محسن الملک نے مارلیسن کی حمایت کی، لیکن وقار الملک ڈٹ گئے (تذکرۂ وقار، امین زبیری صفحہ ۲۸) اور آرچبولڈ کا تقرر عمل میں آیا جو انگلستان سے علی گڑھ آئے۔ انھیں علیگڑھ کے حالات سے زیادہ واقفیت نہ تھی۔ اس لیے مسٹر گارنر براؤن پروفیسر علی گڑھ کے ہاتھوں میں کھیلنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طلبہ کی نفرت رنگ لائی اور ۱۹۰۷ء میں ہڑتال ہوگئی۔

ان واقعات کا نتیجہ یہ تھا کہ محسن الملک کی انگریز اسٹاف سے کبھی نہ بنی۔ انھوں نے حالات کے اظہار کی بجائے ہمیشہ اخفا سے کام لیا۔ باوجودیکہ آرچبولڈ اور محسن الملک ایک دوسرے کے بڑے مخالف تھے۔ محسن الملک نے عموماً اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ محسن الملک اُردو ہندی کے مقابلے میں حکومت کے زیرِ عتاب بھی تھے۔ انگریزی ملازمت کے لیے ان کی سندیں کسی کام نہ آسکتی تھیں۔ اس لیے نجم الدین نے اس زمانے میں گارنر براؤن اور دوسرے انگریزوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تو سب

نہیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اس کا راز معلوم نہیں ہو سکا۔

محسن الملک نے اپنی نرم پالیسی کی وجہ سے ٹرسٹیوں میں سے بعض کو اپنا مخالف بنا لیا تھا۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر نے اس زمانے میں بڑا ہنگامہ برپا کیا اور ٹرسٹیوں کے جلسوں میں بھی محسن الملک کی مخالفت شروع کر دی۔ اس زمانے میں علی گڑھ کے افق پر صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کا ستارہ طلوع ہوا، اور محمد علی جوہر کے مقابلے میں ان کی سیاست زیادہ کامیاب ہوا کرتی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر کا ایک فقرہ محسن الملک اور آرچبولڈ کے بارے میں قابلِ ذکر ہے۔

THE PRINCIPAL IS ARCHBOLD AND THE SECRETARY ARCH WEAK

جس کا ترجمہ سر رضا علی نے یوں کیا ہے کہ پرنسپل مہامن چلا ہے اور سیکرٹری مہا بودا (اعمال نامہ صـ۲۳۲)

محسن الملک کے بعد وقار الملک آنریری سیکرٹری ہوئے۔ محسن الملک انگریز پرنسپلوں اور وقار الملک کے علاوہ کانفرنس کے نائب سیکرٹری نواب مزمل اللہ خاں اور علی گڑھ کی پارٹی بازی کے رُوحِ رواں صاحب زادہ آفتاب احمد خان صاحب سے بھی منشی صاحب کے مراسم رہے۔ علاوہ ازیں سید محمود کے فرزند سر راس مسعود بھی منشی نجم الدین کے لیے ملازمت کی تلاش میں کوشاں ہوئے۔ راس مسعود ایک زمانے میں علی گڑھ میں مقیم ہو گئے تھے، اور کالج کی ترقی پر توجہ صرف کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برادرانِ یوسف نے اُنھیں چلتا کیا۔ اور بدنامی کا داغ لے کر وہ ریاستوں کی ملازمتیں کرنے لگے۔

منشی نجم الدین صاحب کی سفارشات کو اگر پس منظر میں دیکھا جائے، تو پڑھنے والوں کے لیے شاید زیادہ قابلِ فہم ہو۔

دیوانِ ناسخ —— ایک نادر قلمی نسخہ

محمد حنیف نقوی

ناسخ کا کلیات پہلی بار ان کی وفات (پنجشنبہ، ۲۴ر جمادی الاولیٰ ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۶ر اگست ۱۸۳۸ء) کے ساڑھے چار سال بعد ۲۱ر ذی الحجہ ۱۲۵۸ھ (۲۳ر جنوری ۱۸۴۳ء) کو میر حسن رضوی کے مطبعِ محمدی، لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہُوا تھا۔ خاتمہ سے قبل کے ایک اندراج کے مطابق یہ کلیات تین دیوانوں کا مجموعہ ہے۔ پہلے دیوان کا نام "دیوانِ ناسخ" ہے جس سے بہ قاعدۂ زبر و بیّنات ۱۲۳۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ نام میاں غنی شاگردِ ناسخ نے تجویز کیا تھا۔ دوسرا دیوان جلاوطنی کے ایام میں مرتب ہُوا تھا۔ اسی مطابقت سے اس کا تاریخی نام "دفترِ پریشاں" خود مصنف کا رکھا ہوا ہے جس کے مطابق اس کا سالِ ترتیب، ۱۲۴۳ھ قرار پاتا ہے۔ تیسرا دیوان "دفترِ شعر" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ نام میر علی اوسط رشک (شاگردِ ناسخ) کا مجوزہ ہے اور ۱۲۵۴ھ پر مشعر ہے۔[1] خاتمہ کے مطابق اس تیسرے دیوان کی غزلیں ردیف وار دیوانِ دوم کی غزلوں میں ضم کر دی گئی ہیں۔ کلیات کا یہ پہلا ایڈیشن بہ ظاہرِ حال رشک کی نگرانی میں تیار ہُوا تھا۔ رشک نے اس اشاعت کا ایک مفصل غلط نامہ بھی مرتب کیا تھا جو "تصحیحِ اغلاط و تنقیدِ الفاظِ کلیاتِ شیخ امام بخش ناسخ از میر علی اوسط متخلص بہ رشک" کے زیرِ عنوان اس کے آخر میں شامل ہے۔[2] انہوں نے اس غلط نامے کی ترتیب کی تاریخ بھی کہی ہے جس کے یہ اشعار بہ طورِ خاص قابلِ غور ہیں، ؎

مرتّب ہوا جب کہ دیوان سب — مجھے قصدِ صحت کا پیدا ہُوا
تلمّذ میں ناسخ کے سیکھا جو تھا — وُہ تحریر میں آشکارا ہُوا
ہُوئیں سہوِ کاتب کی لفظیں درست — بنا جو کہ نسیانِ املا ہوا
مجھے دخل اس سے زیادہ نہ تھا — تبدّل میں جو کچھ ہویدا ہوا

رشک کی اس وضاحت کے باوجود ان کے مرتّبہ غلط نامے کی رُو سے "تبدّل میں جو کچھ ہویدا ہوا ہے" اسے محض "سہوِ کاتب" اور "نسیانِ املا" کی تصحیح نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ جناب رشید حسن خاں نے "انتخابِ ناسخ" کے مقدمے میں اس خیال کا اظہار کرتے ہُوئے کہ "غلط نامے میں بعض غلطیوں کی تصحیح اس طرح کی گئی ہے جس پر تصحیح کے بجائے ترمیم کا گمان ہوتا ہے"، الفاظ کی تبدیلی کے پہلو بہ پہلو پورے مصرعوں کی تبدیلی کی کئی مثالیں پیش کی ہیں۔[3] ظاہر ہے کہ کسی مکمل مصرعے کی تبدیلی کو سہوِ کاتب سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ رشک نے ناسخ کے کلام میں صرف لفظی تبدیلیاں ہی نہیں کی ہیں، مصرعے کے مصرعے بدلے ہیں یا خارج کیے ہیں۔ اس کا ایک حتمی ثبوت محض اتفاقی طور پر محفوظ رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین کو لکھنؤ کے مشہور کتب فروش نادر آغا سے جموں یونیورسٹی کے لیے خریدے ہُوئے ناسخ کے دیوانِ دوم کے ایک غیر معروف قلمی نسخے میں رکھا ہوا ایک رقعہ دستیاب ہوا ہے جس میں کسی نامعلوم الاسم شخص کو یہ اطلاع دی گئی ہے:

> "دیوانِ اوّل و ثانی شیخ صاحب نوشتۂ میر حامد علی و یکے دیوان محررہ دستِ مبارک شیخ صاحب به اعتبارِ تبرک و فقط برائے ملاحظۂ "حدیثِ مفصل" را ترسیل کردہ ام کہ ہمیں نسخہ را جناب میر علی اوسط صاحب گرفتہ و اصلاح فرمودہ بہ طبع در آوردند بعض اشعارِ شیخ صاحب را چناں از قلم محو فرمودہ اند کہ خواندہ نمی شود۔"؎

اس رقعے کا آخری حصہ ضائع ہوگیا ہے اس لیے مکتوب الیہ کی طرح مکتوب نگار کا نام معلوم کرنے کا بھی کوئی ذریعہ موجود نہیں تاہم یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس کے لکھنے والے کو ناسخ سے تقرب کا شرف حاصل تھا۔ مذکورۂ بالا دواوین کے علاوہ مکتوب الیہ کو عروض و قواعدِ فارسی سے متعلق چند رسائل پر مشتمل دو جلدیں اور "برہانِ قاطع" کی دو جلدیں بھی بھیجی گئی تھیں۔ ان کتابوں کے متعلق مکتوب نگار کی یہ وضاحت بھی کہ "پیشِ نظر شیخ صاحب اکثر بودہ"، ناسخ سے اس کے قریبی تعلق پر دلالت کرتی ہے؎۔ ان شواہد کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ناسخ کا جو کلام اس وقت مطبوعہ صورت میں ہمارے پیشِ نظر ہے وہ قطعاً مستند نہیں اور اس کی روشنی میں ان کے شاعرانہ مرتبے اور لسانی خدمات کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے، ان پر ازسرِ نو غور و فکر کی ضرورت ہے۔

ایک اور اہم بات جو ناسخ کے تین دیوانوں کے متعلق کلیات کے آخر میں پیش کردہ وضاحت سے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ یہ دیوان زمانۂ تصنیف کے لحاظ سے ترتیب دیے گئے ہیں یعنی دیوانِ اوّل آغازِ شاعری سے ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۷ء) تک کے کلام پر مشتمل ہے، دیوانِ دوم ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۷ء) کے بعد سے ۱۲۴۷ھ (۳۲-۱۸۳۱ء) تک کے کلام کا مجموعہ ہے دیوانِ سوم میں عمر کے آخری سات برسوں کا کلام یکجا کر دیا گیا ہے۔ تحقیقی اعتبار سے یہ بیان بھی ایک مفروضے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ دیوانِ اوّل کے سلسلے میں پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ اس میں ۱۲۳۲ھ کے بعد بھی اضافے ہوتے رہے ہیں؎۔ ہم اپنے مطالعے کی روشنی میں پروفیسر صاحب موصوف کے اس قول پر اس اضافے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ دیوانِ اول میں ۱۲۳۲ھ کے بعد صرف اضافے ہی نہیں کیے گئے ہیں بلکہ بعض غزلیں اس دیوان سے خارج کرکے دیوانِ دوم میں بھی داخل کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں شواہد کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(۱) کلامِ ناسخ کا قدیم ترین ماخذ جو اس وقت ہماری دسترس میں ہے، وہ مصحفی کا تذکرہ "ریاض الفصحا" ہے اس تذکرے کا آغاز ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں اور اتمام ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) میں ہُوا۔ قرائن کے مطابق اس تذکرے میں ناسخ کا حال ۱۲۲۲ھ میں لکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نمونۂ کلام کے طور پر جو اشعار پیش کیے گئے ہیں، وہ اس سے پہلے کہی ہُوئی غزلوں سے ہی انتخاب کیے گئے ہوں گے۔ ان اشعار میں سے جن کی مجموعی تعداد سینتالیس ۴۷ ہے۔

ایک[۲۱] شعر کسی مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں جب کہ مندرجہ ذیل تین اشعار دیوانِ دوم کی غزلوں میں ملتے ہیں: ؎

ملا عکسِ شفق کو رتبۂ اکسیر پانی میں — طلائی ہو گئی ہر موج کی زنجیر پانی میں
وہ مجنوں ہوں کہ ہر عالم میں لیلیٰ میرے شامل ہے — دلِ نالاں جرس ہے، سینۂ بے کینہ محمل ہے
ترقی ہے شبِ فرقت میں مجھ کو صبح ہونے کی — معاذ اللہ کتنا موت سے انسان غافل ہے

(۲) اعظم الدولہ سرور کا تذکرہ "عمدۂ منتخبہ" اضافوں اور ترمیموں کے مختلف مراحل سے گزر کر ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۹ء) میں مکمل ہوا لیکن اس کا نقشِ اوّل ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) کے قریب تیار ہو چکا تھا۔ اس کے دستیاب قلمی نسخوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی نسخے کی کتابت محرم ۱۲۲۴ھ (فروری ۱۸۰۹ء) میں مکمل ہوئی تھی۔ اس تذکرے میں ناسخ کے نمونۂ کلام میں جو اشعار پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک کے علاوہ وہ تمام اشعار جو کلیاتِ مطبوعہ اور اس تذکرے میں مشترک ہیں، دیوانِ اوّل سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی ماندہ ایک شعر جس غزل سے تعلق رکھتا ہے، وہ کلیاتِ مطبوعہ کے دیوانِ دوم میں شامل ہے۔ یہ شعر درج ذیل ہے: ؎

دو شبِ تارے تشبیہ ہمارے دن کو
تیرگی سے نظر آتے ہیں ستارے دن کو[۲۲]

(۳) دیوانِ دوم (مطبوعہ) کی ایک غزل کا مقطع ہے: ؎

ناسخ ہے میر سلّمہ اللہ کی زمیں — اک معنیٔ شگفتہ کو باندھا ہزار رنگ

جیسا کہ اس مقطع سے ظاہر ہے یہ غزل میر کی زمین میں ہے اور ان کی زندگی میں یعنی ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) سے پہلے کہی گئی ہے[۲۳]۔ اس اعتبار سے اسے دیوانِ اوّل میں شامل ہونا چاہیے۔

(۴) دیوانِ اوّل کے بعض قلمی نسخوں کے مطالعے سے بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس دیوان کی بعض نا تمام غزلیں بعد میں مزید اشعار کے اضافے کے ساتھ دیوانِ دوم میں شامل کر دی گئی ہیں۔

اس صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ کلامِ ناسخ کی ازسرِ نو تدوین کی جائے۔ یہ کام کئی اعتبار سے اہم ہے اور پہلے دو دیوانوں کے مخطوطات کی وافر تعداد میں دستیابی کی بنا پر بہ آسانی انجام دیا جا سکتا ہے۔ جناب رشید حسن خاں نے "انتخابِ ناسخ" کے مقدمے میں اس ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے:

> "کلامِ ناسخ کے بہت سے مخطوطات مختلف مقامات پر محفوظ ہیں۔ ان میں ایسے مخطوطات بھی ہیں جن میں کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہے۔ اور ایسے مخطوطات بھی ہیں جن کی مدد سے ناسخ کے تیسرے دیوان کی غزلوں کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ضرورت ہے کہ ان مخطوطات کی مدد سے کلامِ ناسخ کا ایک اچھا ایڈیشن مرتب کیا جائے جس میں تینوں دیوان الگ الگ ہوں۔ زبان اور متروکات کی بحث کے نقطۂ نظر سے تینوں دیوانوں کا تعین ضروری ہے لیکن اس سے زیادہ ضرورت

> یُوں ہے کہ اشاعتِ اوّل کے غلط نامے سے بعض شبہات تعینِ متن کے متعلق پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے ازالے کی واحد صورت یہی ہے کہ کلامِ ناسخ کو پھر سے مرتب کیا جائے"۔[۹]

کلامِ ناسخ کی طرف از سرِ نو توجہ اور اصولِ تدوین کے مطابق اس کی ترتیبِ جدید کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر سطورِ ذیل میں دیوانِ اول موسوم بہ "دیوانِ ناسخ" کے ایک نادر قلمی نسخے کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ کلیاتِ مطبوعہ اور قلمی نسخوں کے مشمولات میں کتنا فرق ہے اور متداول متن پر انحصار تحقیقی نقطۂ نظر سے کس حد تک درست ہے۔

زیرِ تعارف قلمی نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے ذخیرۂ لالہ سری رام سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کل پچاسی[۸۵] اوراق پر مشتمل ہے۔ مسطر عام طور پر انیس[۱۹] سطری ہے لیکن کسی کسی صفحے پر اٹھارہ یا بیس سطریں بھی ملتی ہیں۔ کاغذ کی قدامت اور کرم خوردگی کے باوجود متن بڑی حد تک محفوظ ہے۔ اس مخطوطے میں ورق ۱۔ الف سے ورق ۵۰۔ الف کے وسط تک ردیف وار غزلیں درج ہیں۔ ردیفوں کی ترتیب عام طور پر حروفِ تہجی کے مطابق ہے لیکن کہیں کہیں یہ سلسلہ برقرار نہیں رہ سکا ہے۔ مثلاً ردیف السین کے بعد پہلے ردیف الغین اور اس کے بعد ردیف العین کی ایک ایک غزل، اس کے بعد ردیف الصاد کی ایک غزل اور بعد ازاں ردیف الغین کی ایک اور غزل نقل ہوئی ہے۔ بعض ردیفوں مثلاً ردیف بائے فارسی، ردیف الحا، ردیف رائے ہندی، ردیف الزا، ردیف الشین، ردیف الضاد، ردیف الطاد، ردیف الظا اور ردیف القاف میں کوئی غزل موجود نہیں۔ ردیف یاء کی آخری غزل کے بعد بالترتیب ردیف لام اور ردیف الف کے دو دو متفرق اشعار منقول ہیں۔ اس کے بعد ورق ۵۰۔ الف ہی کی اٹھارھویں سطر سے رباعیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ کل سات رباعیاں ہیں جو سب کی سب غیر مطبوعہ ہیں۔ ورق ۵۰، ب کی آخری سطر پر "تواریخ" کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ تاریخوں کا یہ سلسلہ ورق ۸۵۔ الف کی آخری سطر پر ختم ہوتا ہے۔ ان قطعاتِ تاریخ کی مجموعی تعداد اٹھاسی[۸۸] ہے جن میں بیشتر عنوانات کے التزام سے محروم ہیں۔ صرف پندرہ قطعوں کی پیشانی پر واضح یا نیم واضح الفاظ میں متعلقہ واقعات کی طرف اشارے کر دیے گئے ہیں۔ بہ اعتبارِ زمانہ قدیم ترین قطعاتِ تاریخ میر روشن علی کے مکان کی تعمیر اور نواب آصف الدولہ کے سانحۂ وفات (۱۲۱۲ھ) سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دونوں قطعے بالترتیب تیرھویں[۱۳] اور پینتالیسویں[۴۵] نمبر پر درج ہیں۔ چھبیسویں[۲۶] اور ستائیسویں[۲۷] نمبر کے دو قطعات ۱۲۳۲ھ کے دو[۲] واقعات سے متعلق ہیں جب کہ آخر کے گیارہ[۱۱] قطعوں سے ۱۲۳۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ ان میں سے نو[۹] قطعے صرف مرزا قتیل کے سالِ وفات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ نسخے کا اختتام اسی سلسلے کے آخری قطعے پر ہوتا ہے۔ ترقیمہ جو ورق ۸۵ ب کی ابتدائی پانچ سطروں کو محیط ہے، درج ذیل ہے:

> "تمت تمام شد دیوانِ شیخ امام بخش متخلص بہ ناسخ بتاریخ بست ہفتم شہر صفر سنہ یک ہزار و دو صد پنجاہ پنج ہجریہ حسبِ فرمائش نواب مستطاب، معلی القاب ملجاء اہلِ کمال، ملاذ الغربا حسن علی خاں

بہادر دام اقبالہٗ بدست خطا اضعف العباد محمد حسین علی تحریر یافت فقط تمت تمام شد فقط۔"

اس ترقیمے کے مطابق اس نسخے کی کتابت ناسخ کی وفات کے نو ماہ بعد مکمل ہوئی ہے لیکن صفحۂ اول کی لوح پر شنگرفی روشنائی سے "دیوانِ شیخ محمد ناسخ دام ظلہٗ" کا اندراج یہ ظاہر کرتا ہے کہ کتابت کی ابتدا شیخ صاحب کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی۔ اس کے برخلاف یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نسخہ جس نسخے سے منقول ہے، اس کی لوح پر بھی یہ عبارت اسی طرح مرقوم ہو یا لکھنے والا جس نے مصنف کا نام تک صحیح نہیں لکھا ہے، "دام ظلہٗ" کے مفہوم ہی سے ناواقف ہو۔ یہ نسخہ جن "نواب مستطاب معلی القاب" کے لیے لکھا گیا ہے وہ بہ گمانِ غالب امیر الدولہ مرزا حیدر بیگ کے صاحبزادے اور ناسخ کے شاگردِ رشید نواب حسین علی خاں اثرؔ ہیں۔ کاتب نے غلطی سے ان کا نام "حسن علی خاں" لکھ دیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نسخہ اصلاً نواب موصوف کے لیے خود لکھا گیا ہو بلکہ ان کی فرمائش پر لکھے ہوئے کسی نسخے سے منقول ہو۔ اس کے باوجود اعتبار و استناد کے نقطۂ نظر سے اس نسخے کی اہمیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

دستیاب معلومات کے مطابق "دیوانِ ناسخ" کا قدیم ترین قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے ذخیرۂ سبحان اللہ میں محفوظ ہے۔ ترقیمے کی رُو سے اس کی کتابت سہ شنبہ، ۲۱ ربیع الاول ۱۲۳۴ھ (۱۹ جنوری ۱۸۱۹ء) کو مکمل ہوئی تھی۔ گیارہ سطری مسطر کے پینسٹھ اوراق پر مشتمل اس نسخے میں ہر سطر میں دو شعر اور ہر صفحے پر اوسطاً بیس شعر نقل ہوئے ہیں۔ نسخۂ بنارس کے مندرجات سے متعلق گزشتہ سطور میں پیش کردہ تفصیلات کے مطابق اس کا اختتام غزلیات کے آخر میں درج چار متفرق اشعار میں سے تیسرے شعر ؎

صدمہ اُٹھے گا مجھ سے نہ غوغا سے زاغ کا
ہوں بے دماغ نغمہ سرایانِ باغ کا

پر ہوا ہے۔ اسی سلسلے کا ایک اور نسخہ سرسالار جنگ میوزیم، حیدر آباد میں بھی موجود ہے۔ یہ نسخہ ہماری نظر سے نہیں گزرا، لیکن ثانوی ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کے بموجب اِس کے اوراق کی تعداد ایک سو چھ اور فی صفحہ سطروں کی تعداد چودہ ہے۔ کتابت کی تکمیل دوشنبہ، ۱۶ ربیع الثانی ۱۲۴۴ھ (۲۷ اکتوبر ۱۸۲۸ء) کو ہوئی ہے۔ نسخۂ علی گڑھ کی طرح اس نسخے کا خاتمہ بھی سلسلۂ متفرقات کے مندرجہ بالا تیسرے شعر پر ہی ہوا ہے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ اور حیدر آباد کے یہ دونوں نسخے کسی ناتمام یا ناقص الآخر نسخے پر مبنی ہیں۔ اس کے برخلاف نسخۂ بنارس ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ "دیوانِ ناسخ" کا قدیم ترین قلمی نسخہ ہے۔

نسخۂ بنارس "دیوانِ ناسخ" کے دُوسرے تمام نسخوں سے اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ بہ ظاہر حال ایک طرف تو اس میں ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۷ء) تک کا وہ تمام کلام درج ہے جسے ناسخ شاملِ دیوان کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف ۱۲۳۳ھ اور ۱۲۴۴ھ کے پانچ مختلف واقعات سے متعلق تیرہ قطعاتِ تاریخ کے علاوہ کوئی ایسی چیز موجود نہیں جسے بدیہی طور پر اس کے معلوم زمانۂ ترتیب کے بعد کی تصنیف کہا جا سکے۔ ان تیرہ قطعات میں سے بھی نو قطعے صرف ایک

واقعے یعنی مرزا قتیلؔ کی وفات سے متعلق ہیں جو سہ شنبہ، ۲۳ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ (۳۱ جنوری ۱۸۱۸ء) کو واقع ہوئی تھی[1]۔ چونکہ اس نسخے کا آخری صفحہ اسی سلسلے کے قطعات پر مشتمل ہے، اس لیے عین ممکن ہے کہ ناسخؔ ترتیبِ دیوان کے کام سے اصلاً اسی زمانے میں فارغ ہوئے ہوں۔ اور انھوں نے ایک موزوں ترین تاریخی نام (دیوانِ ناسخؔ) کی خاطر اس سے حاصل شدہ سنہ (۱۲۳۲ھ) اور اصل زمانۂ اتمام کے اس معمولی فرق کو نظرانداز کر دیا ہو۔ باقی چار قطعات میں سے میر نوروز علی کی وفات (۱۲۳۳ھ) کا قطعۂ تاریخ قتیلؔ کے انتقال کے دوسرے اور تیسرے قطعے کے درمیان درج ہے۔ اس سے یہ شبہ گزرتا ہے کہ ممکن ہے یہ قطعہ اور اسی طرح باقی تین قطعے بھی اصل نسخے میں حاشیے پر بعد میں اضافہ کیے گئے ہوں اور اس نسخے کے کاتب نے انھیں متن میں شامل کر لیا ہو۔ ان قیاسات کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا جائے تب بھی یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس نسخے میں کوئی ایسی چیز درج نہیں جو حتماً ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۹ء) کے بعد کی تصنیف ہو۔

یہ نسخہ از اوّل تا آخر نہایت پختہ اور صاف نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر عجلت پسندی یا تیز نویسی کے نتیجے میں تحریر کی روش کسی قدر مختلف ہو گئی ہے لیکن کاتب کم سواد بھی ہے اور غیر محتاط بھی۔ چنانچہ وہ الفاظ کی ہیئتِ اصلی پر غور کرنے کی بجائے انھیں ان کی ہیئتِ ظاہری کے مطابق لکھ دینے میں مطلق تامل نہیں کرتا۔ املا کے معاملے میں بھی اُس کے معمولات و مختارات اپنے زمانے کے عام کاتبوں سے مختلف نہیں۔ کتابت کی مجموعی کیفیت کا اندازہ مندرجہ ذیل مثالوں سے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے:

نہیں جھکتی ہیں مسجد میں جبیں سا تیری کونچی میں　　خمِ مہراب پر اونکو یقیں ہے تیغِ بُرّاں کا
جھکتے　　تیرے کوچے　　محراب　　اُن کو
سراپنا کاٹ ڈالوں آپ اگر شوقِ شہادت ہی　　اولھاؤں بوج کیوں سر پر کسی قاتلکی احساں کا
ہے　　اگر　　اٹھاؤں　　بوجھ　　قاتل کے
وہ ہی دل زندۂ جاوید ہی جو پہس گیا اسمیں　　کہ دام زلف کا چشمہ ہے چشمہ آبِ حیواں کا
وہی　　ہے　　پھنس گیا اس میں
کوئی قاتل پی پہونچ کر سر ہوا مجکو وبال　　بوجہہ اوترنیکی جگہہ دم چہڑے گیا مزدور کا
کوسے　　میں پہنچ　　مجھ کو　　بوجھ اترنے کی جگہ　　چڑھ گیا
یادِ وحشت آ ڈراتی ہی مجھی فصلِ بہار　　ہاتہہ آتا ہے میری تختِ سلیماں ہر برس
بادِ　　(پر) اڑاتی ہے مجھے　　ہاتھ　　مرے
پہلی اپنی عہدسی افسوس سودا اوٹھہ گیا　　کسی مانگیں جاکی ناسخ اس غزلکی داد ہم
پہلے اپنے　　سے　　اُٹھ　　گیا　　کس سے مانگیں جاکے　　غزل کی

بام و در تیری تجلی سی منور ہیں تمام
سے
ہیں صباں طور کی اطوار تیری کوچی میں
عیاں کے ترے کوچے

حالِ دل کہنی کی ناسخ جو نہیں پاتا یار
کہنے
پھینک جانا ہی وہ اشعار تیری کوچی میں
پھینک جاتا ہے ترے کوچے

یوں دلا تجکو شب ہجراں میں ہم شاد کریں
تجھ کو ہجر
وصل میں عیش میں سو اونہیں یاد کریں
(کیسے) ہیں انھیں

گور زنجیروں سی ڈہان پو عوض چادرِ کل
گور سے ڈھانپو گل
تہا میں دیوانہ میری روح بھی دیوانی ہے
تھا مری بھی

کیا ہی ناتواں ایسا ہمیں آزارِ فرقت نی
نے
جسم اپنی بدن کی سامھنی ہر تارِ بستر ہی
اپنے کے سامنے ہے

ہمصفیر اس باغکا کیا ہوا ناساز ہی
ہم صفیر باغ کی کیسی ہے
طائر زنگ چمن تنک بل پرواز ہی
رنگ مائل ہے

نہیں عشاق کو آرام بعدِ مردن بھی
آرام (ممکن) بعد بھی
دلا سا کرو راہِ عشق میں پہلی ہی منزل ہی
یہ گور ہے

غبارِ خط کمالِ حسن میں آیا تیری موںہہ پر
ترے منہ
خروق ایمہ جبیں جیسے تصیب ماہِ کامل ہی
خسوق اے مہ جبیں ہے

یارب مدد طلب ہوں تیری بارکاہ سی
تری بارگاہ سے
شرمندہ کی کمال ہی عذر کناہ سی
شرمندگی ہے گناہ سے

یہ قلمی نسخہ اس اعتبار سے بے حد اہم اور توجہ طلب ہے کہ اس میں متعدد ایسی غزلیں اور صدہا ایسے اشعار موجود ہیں جو کلیاتِ مطبوعہ اور عام قلمی نسخوں میں نہیں ملتے۔ دوسری طرف کلیاتِ مطبوعہ کی تقریباً اتنی ہی غزلیں اور اتنے ہی اشعار اس نسخے میں نہیں پائے جاتے۔ یہ صورتِ حال تاریخی اعتبار سے کلامِ ناسخ کی ترتیب کے سلسلے میں اس نسخے کی غیر معمولی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ مصحفی کے تذکرے "ریاض الفصحا" کے سلسلے میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ اس میں شامل ناسخ کے نمونۂ کلام میں سے اکیس ۲۱ شعر مطبوعہ کلیات میں موجود نہیں اور تین شعر دیوانِ اوّل کی بجائے دیوانِ دوم میں پائے جاتے ہیں۔ یہ تمام اشعار اس نسخے میں موجود ہیں۔ اعظم الدولہ سرور کے تذکرے "عمدۂ منتخبہ" یعنی ناسخ کے کلام کا انتخاب ایک سو سینتیس ۱۳۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ستاون شعر کلیاتِ مطبوعہ میں نہیں ملتے۔ پیشِ نظر قلمی دیوان میں ان ستاون ۵۷ اشعار میں سے سینتالیس شعر موجود ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے احمد حسین کاکوروی کے تذکرے "بہارِ

بے خزاں" کے ایک تحقیقی جائزے میں آتش کے انتخابِ کلام میں شامل ایسے پندرہ[۱۵] اشعار کی نشان دہی کی ہے جو اصلاً ناسخ کی تصنیف ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل شعر کے بارے میں ان کا بیان ہے کہ "یہ ناسخ کے کسی دیوان (قلمی یا مطبوعہ) میں نہیں ملتا" ؎

ایک جھٹکے میں جُدا حلقے سے حلقہ ہو گیا
جوشِ وحشت خانۂ زنجیر کو سیلاب تھا

یہ شعر بھی اس قلمی نسخے میں موجود ہے۔ جہاں تک اس تذکرے (بہارِ بے خزاں) میں خود ناسخ کے انتخابِ کلام کا تعلق ہے، ڈاکٹر اکبر حیدری نے دیوانِ ناسخ کی اشاعتِ اوّل اور تین قلمی نسخوں سے مقابلے کے بعد ایسے بیس[۲۰] اشعار کی نشان دہی کی ہے جو "ناسخ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں لیکن ان کے کسی قلمی یا مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے" اور جو ان کے خیال میں "الحاقی ہیں"۔ ان بیس[۲۰] اشعار میں سے مندرجہ ذیل ایک شعر "کلیاتِ ناسخ" طبع اوّل کے پہلے دیوان میں صفحہ ۴۶ پر موجود ہے ؎

اُس پری رُو کے کفِ پا میں ہے عالم نور کا
سنگِ پا کے واسطے منگوائیں پتھر طور کا

باقی ماندہ انیس[۱۹] شعروں میں سے مندرجہ ذیل نو شعر "دیوانِ ناسخ" کے زیرِ بحث قلمی نسخے میں شامل ہیں ؎

فروغِ دل کُوچۂ سفّاک کو گلشن سمجھا   تیغ کو طائرِ جان شاخِ نشیمن سمجھا
آئی صحرا میں جو اس گرم عناں کی امِ یاد   چشمِ آہُو کو میں نقشِ سمِ توسن سمجھا
خوب دھوکا مجھے مستی کی اُداہٹ نے دیا   دہنِ یار کو میں غنچۂ سوسن سمجھا
کس نے انگشت رکھی فاتحہ کو خندق بند   شمعِ معکوس لحد میں جو میں روشن سمجھا
خاک برباد رہی دشتِ جنوں میں میری   بس بگولے ہی کو میں گنبدِ مدفن سمجھا

کاٹنے کھاتی ہے مجھے فکرِ سخن اے ناسخ
دو زبانی قلم اپنی کو (میں) ناگن سمجھا

رنگ میں شوخ ہے ایسا بدنِ سُرخ ترا   جس پہ سر سبز نہیں پیرہنِ سُرخ ترا
ہو ہمیشہ ترے کُوچے میں شہیدوں کی بہار   رہے سر سبز الٰہی چمنِ سُرخ ترا
ایک بوسے کے تصوّر میں یہ ہوتا ہے کبود   نہیں محتاجِ مسی کا دہنِ سُرخ ترا

ناسخ کے سوانح نگار ان کی زندگی کے بعض اہم واقعات کے سلسلے میں اُن کے جن اشعار سے استشہاد کرتے رہے ہیں، ان کے معاملے میں بھی یہ قلمی نسخہ غور و فکر کے بعض نئے زاویوں کی طرف رہبری کرتا ہے۔ مثلاً ناسخ کی تاریخِ ولادت کا تعیّن ان کے مندرجہ ذیل شعر کی بنیاد پر کیا گیا ہے ؎

رہے کیوں کر نہ دل ہر دم نشانہ ناوکِ غم کا
کہ ہے میرا تولد ہفتم ماہِ محرم کا

یہ دیوانِ اوّل (مطبوعہ) کی چھبیسویں[۲۷] غزل کا مطلع ہے۔ پیشِ نظر قلمی دیوان میں یہ غزل تیرھویں نمبر پہ درج ہے لیکن اس میں یہ مطلع موجود نہیں۔ اس دیوان میں غزل کا آغاز مندرجہ ذیل مطلع سے ہوا ہے جو دیوانِ مطبوعہ میں نہیں ملتا ؎

مرے رونے کے آگے قلزم اک قطرہ ہے شبنم کا
شرر سے کم ہے پیشِ سوزِ دل رتبہ جہنم کا

ناسخ ابتدائی سنی العقیدہ تھے۔ بعد میں انھوں نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے ابتدائی کلام میں بعض ایسے اشعار موجود تھے جو ان کے بعد میں اختیار کردہ عقیدے کے خلاف تھے۔ جب کچھ لوگوں نے ان اشعار کی موجودگی پہ اعتراض کیا تو ناسخ نے ان کی زباں بندی کے لیے ایک غزل کے مقطع میں یہ اعلان کیا : ؎

کیا ہوا اگر شعرِ ناسخ ہیں عقیدے کے خلاف
آیۂ منسوخ کیا موجود قرآن میں نہیں

مطبوعہ دیوانِ اوّل میں اس زمین میں دو غزلیں موجود ہیں۔ یہ شعر ان میں سے پہلی غزل کا مقطع ہے لیکن دیوانِ قلمی میں ان میں سے کوئی غزل نہیں ملتی۔

صاحبِ "خوش معرکۂ زیبا" کے بیان کے مطابق سیوا رام شائق شاگردِ آتش نے کلامِ ناسخ کو منسوخ کرنے کی نیت سے ان کی ہر غزل کا جواب لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ خبر ناسخ تک پہنچی تو انھوں نے ایک غزل میں مندرجہ ذیل دو شعر کہے : ؎

کہہ رہا ہے ایک جاہل میرے دیواں کا جواب   بومسلم نے کہا تھا جیسے قرآں کا جواب
کیا کلیم اللہ سے نسبت ہے اس ناپاک کو   چاہیے فرعون کو دے اپنے ہاماں کا جواب[۲۸]

متداول کلیات میں نہ یہ اشعار موجود ہیں اور نہ اس زمین میں کوئی غزل ہی ملتی ہے جب کہ قلمی دیوان میں نو اشعار کی ایک مکمل غزل میں یہ دونوں شعر موجود ہیں۔ اس غزل کے باقی اشعار بھی اسی حریفانہ کیفیت کی غمازی کرتے ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ ایک بار مشاعرے میں شیخ صاحب ایسے وقت پہنچے جب کہ جلسہ ختم ہو چکا تھا مگر خواجہ حیدر علی آتش اور کچھ اور شعرا موجود تھے۔ ان لوگوں نے شیخ صاحب سے ان کا کلام سننے کا اشتیاق ظاہر کیا تو انھوں نے یہ مطلع پڑھا : ؎

جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہِ عام نہیں   شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

چونکہ نام بھی امام بخش تھا، اس لیے تمام اہلِ جلسہ نے نہایت تعریف کی۔[15] دیوانِ اوّل (مطبوعہ) میں اس زمین میں ایک غزل موجود ہے جس میں دو مطلعے ہیں لیکن اُن میں مندرجہ بالا مطلع شامل نہیں۔ دیوانِ قلمی میں نہ تو یہ مطلع ملتا ہے اور نہ اس زمین میں کوئی غزل پائی جاتی ہے۔

پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی نے امیر الدولہ مرزا حیدر بیگ (متوفی ۱۶ رشوال ۱۲۰۶ھ) کی وفات کے قطعۂ تاریخ کو قیاساً ناسخ کی شاعری کا قدیم ترین نمونہ قرار دیا ہے۔ اس قطعے میں ان کا تخلص موجود نہیں۔ اس کے بعد روہیل کھنڈ کے معرکے میں آصف الدولہ کی فتح یابی کے قطعۂ تاریخ کو جس سے ۱۲۰۹ھ برآمد ہوتا ہے اور جس میں تخلص موجود ہے، پیش کرکے یہ رائے قایم کی ہے کہ شیخ صاحب نے "ناسخ تخلص ۱۲۰۶ھ اور ۱۲۰۹ھ کے درمیان اختیار کیا ہوگا۔"[16] پیشِ نظر قلمی نسخے میں یہ دونوں قطعاتِ تاریخ موجود نہیں۔

ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنے ایک مضمون "ناسخ اور کلیاتِ ناسخ کے چند اہم مخطوطات" میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے اس بیان کو کہ ناسخ ۱۱۸۷ھ میں پیدا ہوئے تھے، تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور مولانا محمد حسین آزاد کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہ انھوں (ناسخ) نے تقریباً سو برس کی عمر پائی ہوگی (کیونکہ) وہ اکثر عہدِ سلف کے معرکے اور نواب شجاع الدولہ (متوفی ۱۱۸۸ھ) کی باتیں آنکھوں سے دیکھی بیان کرتے تھے"[17]، نواب شجاع الدولہ اور انگریزوں کے درمیان بکسر کی لڑائی (۱۱۷۸ھ) کا قطعۂ تاریخ بطور شہادت پیش کیا ہے۔[18] نسخۂ بنارس میں یہ قطعۂ تاریخ بھی موجود نہیں۔

قلمی نسخے اور دیوانِ مطبوعہ کے تقابلی مطالعے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ دیوانِ اول کی بعض غزلیں یا ان کے منتخب اشعار نئے شعروں کے اضافے کے ساتھ دیوانِ دوم میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ "ریاض الفصحاء" میں منقول نمونۂ کلام کے سلسلے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کے تین اشعار دیوانِ دوم میں شامل ہیں۔ ان میں سے پہلا شعر (اکسیر پانی میں، تصویر پانی میں) یا اس زمین میں کوئی غزل اس قلمی دیوان میں موجود نہیں۔ دیوان دوم (مطبوعہ) میں کل چار شعر ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ اشعار ۱۲۳۲ھ اور ۱۲۳۶ھ کے درمیان کہے گئے ہوں۔ بعد کے دونوں شعر (شامل ہے، محل ہے۔ غافل ہے) جس غزل سے ماخوذ ہیں، وہ اس قلمی دیوان میں اکیس[21] اشعار پر مشتمل ہے۔ ان میں سے سولہ[16] شعر دیوانِ دوم میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ اس غزل کا ایک اور شعر جو مصحفی کے انتخاب میں شامل ہے لیکن دیوانِ دوم (مطبوعہ) میں جگہ نہیں پا سکا، درج ذیل ہے:

ٹپکتا ہے لہو لکھتے ہیں جب اشعار رنگیں ہم
ہمارے ہاتھ میں خامہ گلوے مرغِ بسمل ہے

دیوانِ اوّل سے دیوانِ دوم میں اشعار کی منتقلی کے وقت اُن میں مختلف النوع تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں متن کی تبدیلی ہے۔ اس نوع کی تبدیلیاں چونکہ عام ہیں اور ان کے متعلق ابتدا ہی میں شک کا اظہار

کیا جا چکا ہے، اس لیے تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف چند مثالیں پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) پیشِ نظر قلمی نسخے میں ردیف سین کی ایک ناتمام غزل مندرجہ ذیل تین اشعار پر مشتمل ہے ؎

خارِ پہلو ہوتی ہے یادِ گلستاں ہر برس
اے جنوں آباد کرتا ہوں میں زنداں ہر برس
بادِ وحشت (پر) اُڑاتی ہے مجھے فصلِ بہار
ہاتھ آتا ہے مرے تختِ سلیماں ہر برس
ہیں جو تیرے خنجرِ موجِ تبسم کے شہید
گل انھیں کی خاک سے ہوتے ہیں خنداں ہر برس

دیوانِ دوم (مطبوعہ) میں اِس زمین میں سترہ اشعار کی ایک مکمل غزل شامل ہے (طبع اول صفحات ۱۲۴ و ۱۲۵، حاشیہ)۔ اس غزل میں دیوانِ قلمی کے ان تین شعروں میں سے صرف دو شعر جگہ پا سکے ہیں۔ ان اشعار میں جو ترمیمیں کی گئی ہیں، ان کا اندازہ ان کے اس بدلے ہوئے متن سے کیا جا سکتا ہے ؎

فصلِ گل میں گھر مرا ہوتا ہے ویراں ہر برس
اے جنوں آباد کرتا ہوں میں زنداں ہر برس
فصلِ گل میں بادِ پُر وحشت اُڑاتی ہے ہمیں
ہاتھ آجاتا ہے اورنگِ سلیماں ہر برس

(۲) قلمی دیوان میں "ردیف الیاء" کے تحت ایک زمین میں صرف یہ دو شعر ملتے ہیں ؎

بتوں کے عشق میں یہ دل مدام روشن ہے
چراغِ دیر سے بیت الحرام روشن ہے
وُہ بام پر نہیں ہر چند پر تصوّر سے
بسانِ مطلعِ خورشید بام روشن ہے

دیوانِ دوم (مطبوعہ) میں اس زمین میں تین اشعار پائے جاتے ہیں (طبع اول، حاشیہ ص ۲۶۹) جن میں مندرجہ بالا دونوں شعروں میں سے کوئی شعر شامل نہیں، لیکن دیوانِ دوم کے لیے جو نیا مطلع کہا گیا ہے، وُہ دیوانِ قلمی کے دوسرے شعر سے ماخوذ ہے۔ نیا مطلع درج ذیل ہے ؎

کمال آپ کے جلوے سے بام روشن ہے
برنگِ مطلعِ ماہِ تمام روشن ہے

(۳) سرسری تقابلی مطالعے کے دوران ارکانِ بحر کے ساتھ ایک دیوان کے اشعار دُوسرے دیوان میں منتقل کرنے کی بھی ایک مثال سامنے آئی ہے۔ دیوانِ قلمی میں ردیف الیاء کی ایک ناتمام غزل ان تین اشعار پر مشتمل ہے ؎

غم نہیں، دشمن اگر میرا سوارِ فیل ہے
کافی اس کے واسطے اک ریزۂ سجّیل ہے
ایسے ہیں رُو پوش لوگ آئینۂ انصاف سے
نازنیں، رشکِ پری ہیں دیو سا گر ڈیل ہے
میں کسی کو کیا سمجھتا ہُوں، وہ میرا ہے امیر
جس کے نوبت خانے میں قرنائے اسرافیل ہے

ان میں سے دوسرے شعر کے علاوہ باقی دونوں شعر ایک رکن کی تخفیف اور الفاظ کے معمولی ردّ و بدل کے ساتھ دیوانِ دوم (مطبوعہ) کی آٹھ اشعار پر مشتمل ایک غزل میں شامل کر لیے گئے ہیں (طبع اول، حاشیہ صفحات ۲۵۵ و ۲۵۶)۔ یہ دونوں شعر درج ذیل ہیں ؎

کیا اگر دشمن سوارِ فیل ہے — کافی اس کو ریزۂ سجّیل ہے
کیا کہوں شان اس کے نوبت خانے کی — جس میں اک قرنائے اسرافیل ہے

(۴) دیوان دوم (مطبوعہ) بحر اور ردیف دونوں کی تبدیلی کی بھی ایک مثال موجود ہے۔ دیوان قلمی میں ردیف الیاء کے تحت تین اشعار کی ایک ناتمام غزل کا مطلع ہے:

یہ ضعف ہے، دب جاؤں میں کہسار کے نیچے
آجاؤں اگر سایۂ دیوار کے نیچے

یہ مطلع الفاظ کے بہت معمولی سے فرق کے ساتھ کلیاتِ مطبوعہ کے دوسرے دیوان کی نو اشعار پر مشتمل ایک غزل میں، جس کی بحر اور ردیف دونوں مختلف ہیں، شامل کر لیا گیا ہے (طبع اول، حاشیہ ص ۲۹۵)۔ تبدیل شدہ شکل حسب ذیل ہے:

یہ ضعف ہے کہ دب مروں کہسار کے تلے
آجاؤں میں جو سایۂ دیوار کے تلے

پیشِ نظر قلمی دیوان اور دیوانِ مطبوعہ میں اشعار کے متن میں جو لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں وہ تعداد کے اعتبار سے اتنے زیادہ ہیں کہ اس تعارفی مضمون میں اُن کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں بہ نظرِ اختصار صرف ردیف الف کی غزلوں سے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ نودریافت متن اور متداول متن (طبع اول) کے فرق کی نوعیت کا اندازہ ہو جائے۔ ملاحظہ ہوں:

صریرِ خامہ کو وہ شبیر کا نعرہ سمجھتے ہیں — یقیں اعدا کو ہے میرے قلمداں پر نیستاں کا (دیوان قلمی)
صریرِ کلک کو اب (دیوان مطبوعہ)

کسی سے دل نہ اس وحشت سرا میں میں نے اٹکایا — نہ اُلجھا خار سے دامن کبھو میرے بیاباں کا (قلمی)
کبھی (مطبوعہ)

صبح دم یہاں خانۂ دل میں ہوا روشن چراغ — عالمِ پیری میں عشقِ نوجواں پیدا ہوا (قلمی)
خانۂ دل میں چراغِ شام آیا صبح دم (مطبوعہ)

طوق ہالے کا پڑا اس کے گلے میں کس لیے — ماہ بھی شاید کہ تیرے عشق میں مجنوں ہوا (قلمی)
چاند اسی کے (مطبوعہ)

رحلتِ یاراں میں کیا کہیے جو ہم کو غم ہوا — گر مرا دشمن کوئی اُس کا بھی اک ماتم ہوا (قلمی)
کیا کہیں مرگِ احبا میں (مطبوعہ)

بن گیا ہر روزنِ دیوار چشمِ انتظار — بس کہ ہے شوق اپنے گھر (کو) آمدِ سیلاب کا (قلمی)
شوق ہے کیا (مطبوعہ)

چاند چھپتا ہے جو دو دن ہوتی ہے حیران خلق   یہاں ہوئی قدر اس کی جو نظروں سے پنہاں ہوگیا (قلمی)
مشتاق   ہو گئی (مطبوعہ)
پھر پڑا پھرتا ہوں میں مدہوش مستوں کی طرح   پھر تصور بندھ گیا مجھ کو کسی مے نوش کا (قلمی)
رہتا   بیہوش بدمستوں طرح   (مطبوعہ)
گیا جو اس کے کُوچے میں وہ باچشمِ پُرآب آیا   حرم سے لاتے ہیں جس طرح زائر آبِ زمزم کا (قلمی)
جس طرح لاتے ہیں (مطبوعہ)
مانعِ رفتار مجھ وحشی کے ہوں کیا خارِ دشت   تیز رو کرتا ہے توسن کو خلش مہمیز کا (قلمی)
کو   کرنا فرس کو کام ہے (مطبوعہ)
عشق کے آزار میں مرتا ہے پر ہے گردِ یار   ہے خدا حافظ دلِ بیمار بدپرہیز کا (قلمی)
بے پرہیز (مطبوعہ)
جلوہ گر از بس کہ ہے دل میں خیال اک ماہ کا   طور کا شعلہ دُھواں ہے میری شمعِ آہ کا (قلمی)
نورافشاں جب سے ہے   اس (مطبوعہ)
سفلہ ہو جاتا ہے وقتِ امتحاں بے آبرو   ٹوٹ جاتا ہے بُہت کھینچے سے پانی چاہ کا (قلمی)
ہے دلیل اس اِدّعا پر ٹوٹ جانا (مطبوعہ)
...... ہوتی جو کچھ مہر و محبت تم میں   بخدا کوئی بھی کافر نہ مسلماں ہوتا (قلمی)
اے بتو! اگر   کوئی کافر بھی نہ واللہ (مطبوعہ)
کیا سخن سنجی سے حاصل جب سخنداں ہی نہیں   فکر کے زانو سے اے ناسخ تو اپنا سر اٹھا (قلمی)
زانوئے فکرت (مطبوعہ)
بس کہ یہاں افتادوں کی ہے دست گیری کا رواج   خاک پر گرتا نہیں سایہ مری دیوار کا (قلمی)
دست گیری ایسی افتادوں کی ہے منظورِ طبع (مطبوعہ)
رات بھر ہر ایک اختر سے لڑا کی میری آنکھ   بس کہ تھا دل میں خیال اس رخنۂ دیوار کا (قلمی)
تھا تصور دل میں تیرے (مطبوعہ)
پاؤں پھیلائے (ہیں) جادوں کی طرح ہر خاک ہیں   یہاں گریباں اے جنوں! صحرا کا دامن ہوگیا (قلمی)
چاک نے   اب (مطبوعہ)
ایسی دلچسپ اس کی صورت ہے، پڑے اس کا جو عکس   آئینے میں حشر تک ہووے گماں تصویر کا (قلمی)
شکل اس کی ایسی ہے دلچسپ گر پڑ جائے عکس   تا قیامت آئینے میں شبہ ہو (مطبوعہ)

آشیاں باندھے جو آکر چمنِ ناسخ میں　　بیضۂ زاغ سے ہو مرغِ خوش الحاں پیدا (قلمی)
آشیاں میرے چمن میں جو لگائے آ کر　　(مطبوعہ)
عیاں ہے ہر حبابِ بحر میں کیفیتِ دُنیا　　برائے چشمِ بینا ہیں ہزاروں جامِ جم پیدا (قلمی)
سے　　دیدۂ بینا　لاکھوں　　(مطبوعہ)
بارِ احسانِ فلک سے تو ملی آزادی　　یہ بھی حاصل ہے اگر کچھ مجھے حاصل نہ ہوا (قلمی)
بارے　　جو یہاں　　(مطبوعہ)
مزہ تجھ بن ہوا ہے تلخ عیشِ زندگانی کا　　چراغِ گور ہے ساغر شرابِ ارغوانی کا (قلمی)
مزہ یہ تلخ فرقت میں ہے　　(مطبوعہ)
کس کے کوچے میں جبیں سا تو ہوا ہے ناسخ　　داغ ہے چاند سے روشن تری پیشانی کا (قلمی)
چاند سا داغ ہے　　(مطبوعہ)

دیوانِ قلمی اور دیوانِ مطبوعہ میں غزلوں کی تعداد اور اشعار کی کمی بیشی کے اعتبار سے جو فرق پایا جاتا ہے، فی الوقت اس کی تفصیل کا موقع نہیں تاہم اس فرق کی اہمیت اور مضمون کی محدود گنجایش، دونوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ان دونوں دیوانوں سے سلسلہ وار بارہ بارہ غزلوں کی تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں جن سے متن کی دونوں روایتوں کے اختلاف و اشتراک کی مجموعی کیفیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے:

(و) دیوانِ ناسخ (قلمی)

(۱)　مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا　　طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

یہ غزل اکیس ۲۱ اشعار پر مشتمل ہے، ان میں سے سات شعر (اشعار نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۶، ۱۲ و ۱۴) دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر ۳ میں شامل ہیں۔

(۲)　کوئی مضموں اگر لکھتا میں اس حالِ پریشاں کا　　کبھی بندھتا نہ شیرازہ مرے اجزائے دیواں کا

اس غزل میں کل بائیس ۲۲ اشعار ہیں جن میں سے دس ۱۰ شعر (اشعار نمبر ۳، ۴، ۶، ۹، ۱۰، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۲۱ و ۲۲) دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر ۳ میں شامل ہیں۔

(۳)　عالم کے آگے یار مرا منفعل ہُوا　　مر کر غمِ فراق میں کیا میں خجل ہُوا

سات اشعار کی یہ غزل دیوانِ مطبوعہ میں موجود نہیں۔

(۴)　جب زمینِ شعر کا میں باغباں پیدا ہوا　　گلشنِ رنگیں بیانی بے خزاں پیدا ہوا

اس غزل کے شعروں کی مجموعی تعداد اٹھارہ ہے ان میں سے صرف سات شعر (اشعار نمبر ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۴، ۱۵

و ۱۸) دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر۴ میں شامل کیے گئے ہیں۔

(۵) خنجرِ ناز سے ناسخ جو تو بسمل ہوگا   ہاتھ میں حشر کے دن دامنِ قاتل ہوگا

یہ غزل تیرہ[۱۳] اشعار پر مشتمل ہے جن میں سے صرف چار شعر (اشعار نمبر ۶، ۷، ۸ و ۱۳) دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر ۱۶ میں تیسرے، چوتھے، پانچویں اور آٹھویں نمبر پر شامل ہیں۔

(۶) پریوں کو عمل سے میں تسخیر نہیں کرتا   جز نقشِ درم کچھ بھی تاثیر نہیں کرتا

سات اشعار کی یہ غزل دیوانِ مطبوعہ میں غزل نمبر ۲۴ کی حیثیت سے شامل ہے۔

(۷) سبزۂ خط گورے گالوں پر نمایاں ہوگیا   یاسمن زارِ صباحت سنبلستان ہوگیا

اس غزل میں کل سولہ[۱۶] اشعار ہیں جن میں سے نو شعر (اشعار نمبر ۱، ۲، ۷، ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۴، ۱۵ و ۱۶) دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر ۱۱ میں شامل ہیں۔

(۸) دوست ہر اک میرے جی کو دشمنِ جاں ہوگیا   یہاں دمِ عیسیٰ دمِ شمشیرِ بُرّاں ہوگیا

گیارہ اشعار پر مشتمل اس غزل کے پانچ شعر (اشعار نمبر ۳، ۶، ۸، ۹ و ۱۱) مذکورۂ بالا غزل نمبر ۱۱ میں شامل ہیں۔

(۹) رنگ میں شوخ ہے ایسا بدنِ سُرخ ترا   جس پہ سرسبز نہیں پیرہنِ سُرخ ترا

سات اشعار کی یہ غزل دیوانِ مطبوعہ میں موجود نہیں ہے[۱۹]

(۱۰) کیا اثر میری سیہ بختی کے آگے نور کا   ماہ ہے اک خالِ رخسارِ شبِ دیجور کا

یہ غزل پندرہ[۱۵] اشعار پر مشتمل ہے۔ ان میں سے دس[۱۰] شعر (اشعار نمبر ۱، ۲، ۴، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ و ۱۴) دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر ۱۴ میں (نمبر ۱، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰ و ۱۱ پر) شامل ہیں۔ غزلِ مطبوعہ میں کل بائیس[۲۲] اشعار ہیں۔

(۱۱) مر گیا ہوں دیکھ کر جلوہ رخِ پر نور کا   میری لوحِ قبر کو زیبا ہے پتھر طور کا

اس غزل میں کل انیس[۱۹] شعر ہیں جن میں سے بارہ شعر (اشعار نمبر ۱، ۳، ۴، ۵، ۷، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۱۷ و ۱۹) دیوانِ مطبوعہ کی مذکورہ غزل نمبر ۱۴ میں (نمبر ۲، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱ و ۲۲ پر) شامل ہیں۔ اس مطبوعہ غزل میں کوئی شعر ایسا نہیں جو دیوانِ قلمی میں موجود نہ ہو۔

(۱۲) لبریز اُس کے ہاتھ میں ساغر شراب کا   بنتا ہے عکسِ رُخ سے کٹورا گلاب کا

یہ غزل آٹھ اشعار پر مشتمل ہے ان میں سے پہلا شعر دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر ۲۲ (کل ۲۰ اشعار) میں اور اشعار نمبر ۵، غزل نمبر ۲۱ (کل ۱۷ اشعار) میں بالترتیب چودھویں[۱۴] اور گیارھویں[۱۱] نمبر پر شامل ہیں۔

(ب) دیوان ناسخ (مطبوعہ) طبع اول ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۳ء

(۱) بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا   رُوح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

سترہ ۱۷ اشعار پر مشتمل یہ غزل دیوان قلمی میں موجود نہیں۔

(۲) دکھا اس کو جہاں میں غل ہے جس کی آمد کا   الٰہی ہوں بہت مشتاق دیدارِ محمدؐ کا

سترہ ۱۷ اشعار کی یہ دُوسری غزل بھی دیوان قلمی میں نہیں ملتی۔

(۳) مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا   طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

سترہ ۱۷ اشعار پر مشتمل اس غزل کے سات شعر (اشعار نمبر ۱، ۳، ۸، ۹، ۱۲، ۱۳ و ۱۵) دیوانِ قلمی کی غزل نمبر ایک سے اور باقی دس ۱۰ شعر (اشعار نمبر ۲، ۴، ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۴، ۱۶ و ۱۷) غزل نمبر ۲ سے لیے گئے ہیں[۲]

(۴) جس جگہ ہے حسن فوراً قدرداں پیدا ہوا   چاہ میں یوسف گرا تو کارواں پیدا ہوا

اس غزل میں کل گیارہ ۱۱ اشعار ہیں۔ ان میں سے سات شعر (اشعار نمبر ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸ و ۱۱) دیوانِ قلمی کی چوتھی غزل سے ماخوذ ہیں۔ باقی چار شعر بعد میں کہہ کر شامل کیے گئے ہیں۔

(۵) گل فشاں عکس ہُوا کس کے رُخِ رنگیں کا   ہے جو آئینے میں عالم سبدِ گل چیں کا

بارہ ۱۲ اشعار پر مشتمل یہ غزل دیوانِ قلمی میں موجود نہیں۔

(۶) مہندی سے ہے شعلہ قدم اُس رشکِ پری کا   پاپوش نے سیکھا ہے چلن کبکِ دری کا

گیارہ ۱۱ اشعار کی یہ چھٹی غزل بھی قلمی دیوان میں نہیں ملتی۔

(۷) زلف سے کیجیو شانے کو نہ زنہار جدا   کاٹ کھاتا ہے جو ہوتا ہے سرِ مار جدا

یہ غزل بیس ۲۰ اشعار پر مشتمل ہے اور دیوان قلمی میں موجود نہیں۔

(۸) خلق کی تسخیر کو ہر نقشِ پا افسوں ہوا   سایہ دیکھا اُس پری کا جس نے وہ مجنوں ہوا

اس غزل میں کل انیس ۱۹ اشعار ہیں جن میں سے چھ ۶ شعر (اشعار نمبر ۳، ۷، ۱۰، ۱۳، ۱۶ و ۱۷) دیوان قلمی کی غزل نمبر ۳۰ سے (بالترتیب اشعار نمبر ۲، ۴، ۵، ۸، ۱۰ و ۱۱) ماخوذ ہیں باقی تیرہ ۱۳ شعر بعد میں کہے گئے ہیں۔ دیوانِ قلمی کی غزل چودہ ۱۴ اشعار پر مشتمل ہے۔

(۹) اپنے ابرو آئینے میں دیکھ کر بسمل ہوا   کھینچ کر تلوار اپنا آپ وہ قاتل ہُوا

یہ غزل اکیس ۲۱ اشعار پر مشتمل ہے، ان میں سے صرف چار ۴ شعر (اشعار نمبر ۷، ۱۳، ۱۶ و ۱۹) دیوانِ قلمی کی غزل نمبر ۳۵ سے (بالترتیب اشعار نمبر ۴، ۶، ۸ و ۹) لیے گئے ہیں، باقی سترہ ۱۷ اشعار بعد کا اضافہ ہیں۔ دیوانِ قلمی کی غزل میں کل دس ۱۰ اشعار ہیں۔

(۱۰) رُخِ جاناں کا تصور میں جو نظارا ہُوا   دل میں تھا جو داغِ حسرت، عرش کا تارا ہوا

اکیس۲۱ اشعار کی یہ غزل دیوانِ قلمی میں نہیں ملتی۔

(۱۱) سبزۂ خط گورے گالوں پر نمایاں ہوگیا   یاسمن زارِ صباحت سنبلستاں ہوگیا

اکیس۲۱ اشعار کی اس غزل کے نو شعر (اشعار نمبر ۱، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹ و ۱۲) دیوانِ قلمی کی غزل نمبر ۷ سے اور پانچ۵ شعر (اشعار نمبر ۱۱، ۱۸، ۱۹، ۲۰ و ۲۱) غزل نمبر ۸ سے ماخوذ ہیں۔ باقی سات شعر بعد میں کہہ کر شامل کیے گئے ہیں۔

(۱۲) کیا کہیں مرگِ احبا میں جو ہم کو غم ہُوا   گر موا دشمن کوئی اُس کا بھی اک ماتم ہوا

یہ غزل سولہ۱۶ اشعار پر مشتمل ہے ان میں سے صرف دو۲ شعر (اشعار نمبر ۱ و ۱۱) دیوانِ قلمی کی غزل نمبر ۲۸ سے لیے گئے ہیں۔ مؤخر الذکر غزل میں کل تین اشعار ہیں۔ تیسرا شعر جو دیوانِ مطبوعہ میں جگہ نہیں پا سکا، درج ذیل ہے: ؎

یادِ گیسو ہوگئی ہے سانپ کے کاٹے کی لہر
دیکھنا سنبل کی لٹ کا میرے حق میں سم ہوا

دونوں دیوانوں کی ابتدائی بارہ بارہ غزلوں کے اس تقابلی جائزے کے نتیجے میں جو صورتِ حال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ دیوانِ قلمی کی بارہ۱۲ غزلوں میں سے دو۲ مکمل غزلیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد چودہ۱۴ ہے، دیوانِ مطبوعہ میں نہیں ملتیں اور باقی دس غزلوں کے کل ایک سو پچاس شعروں میں سے چھہتر۷۶ شعر بھی اس دیوان میں موجود نہیں۔ جب کہ دیوانِ مطبوعہ کی بارہ۱۲ غزلوں میں سے اٹھانوے اشعار پر مشتمل چھ مکمل غزلیں اور باقی چھ غزلوں کے ایک سو پانچ شعروں میں سے پچپن اشعار دیوانِ قلمی میں نہیں پائے جاتے۔ اگر مؤخر الذکر دیوان میں زاید اشعار اور غزلوں کی دستیابی تحقیق و تدوین کے نقطۂ نظر سے اس انتہائی اہم حقیقت کی مظہر ہے کہ ترتیبِ جدید کے وقت اس کے نقشِ اول میں وسیع پیمانے پر تبدیلیاں کی گئی ہیں تو دیوانِ قلمی میں فاضل غزلوں اور شعروں کی موجودگی لسانی و فنی پہلوؤں سے کلامِ ناسخ کے مطالعے کے نئے امکانات کی طرف رہبری کرتی ہے۔ قلمی دیوان میں غیر مطبوعہ اشعار جس کثرت سے پائے جاتے ہیں اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف ردیف الف میں ایسے اشعار کی تعداد تین سو چھہتر ہے جو نہ مطبوعہ کلیات میں موجود ہیں اور نہ عام قلمی نسخوں میں ملتے ہیں۔ رباعیات کے بارے میں پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ ان کی مجموعی تعداد سات ہے اور یہ سب کی سب غیر مطبوعہ ہیں۔ قطعاتِ تاریخ کی کیفیت بھی غزلوں سے کچھ مختلف نہیں۔ بہ طورِ مثال مرزا قتیل کی وفات پر ناسخ نے ہماری معلومات کے مطابق کل دس قطعے کہے ہیں۔ ان میں سے نو اس قلمی دیوان میں موجود ہیں۔ دسواں قطعہ جو صرف لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری کے نسخۂ جان بامر میں پایا جاتا ہے اور بہ گمانِ غالب دیوان کی ابتدائی ترتیب کے بعد کہا گیا ہے، درج ذیل ہے: ؎

آرام و قرار و صبر و تابم   ہیہات قتیل بُرد اے وائے

تاریخ وفاتِ او نوشتم   ہیہات قتیل مُرد اے وائے[21]

نسخۂ بنارس کے نو قطعات میں سے ایک قطعہ کلیاتِ ناسخ کے تمام مطبوعہ ایڈیشنوں میں شامل ہے اور چار اور قطعے مختلف مضامین اور کتابوں کی وساطت سے سامنے آ چکے ہیں[22]۔ باقی چار قطعات ہنوز غیر مطبوعہ ہیں اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے، دیوانِ ناسخ کے کسی اور نسخے میں موجود نہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں ناسخ کا جو مقام ہے، بالخصوص اصلاحِ زبان کے سلسلے میں ان کے مختارات و متروکات کو جو اہمیت دی جاتی رہی ہے، اس کے پیشِ نظر اس تمام نو دریافت کلام کی اشاعت بے حد ضروری ہے۔ فی الوقت ردیف الف کے کچھ منتخب اشعار، پانچ رباعیاں[23] اور چند قطعاتِ تاریخ بہ طورِ ارمغاں ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

انتخابِ غزلیات

تباہی کا ہے اندیشہ جہازِ اہلِ دُنیا کو   نہیں ہے کشتیٔ درویش کو کچھ خوف طوفاں کا
قدم رکھا ہے میں نے جب سے اقلیمِ قناعت میں   مری پاپوش کو رتبہ ملا ہے تاجِ سلطاں کا
شبِ فرقت جلاتے ہیں یہ اسبابِ طرب مجھ کو   کہ کارِ برق کر جاتا ہے پرتو ماہِ تاباں کا
بنائے عالمِ ایجاد ہے برباد نظروں میں   فلک کہتے ہیں جس کو، اک بگولا ہے بیاباں کا
نہ کیوں چھا جائے تیرے سامنے زردی مرے منہ پر   طلائی خاک کو کرتا ہے پرتو مہر تاباں کا

دریا کا نام چشم ہوا میرے چہرے پر   دوزخ کا نام سینۂ سوزاں میں دل ہوا
دیکھا جو غور سے تو مسمّٰی ہے ایک ہی   نافے میں مُشک نام ہوا، رُخ پہ تل ہوا
کیا چین سے ہم اس کے تصور میں محو تھے   کنجِ لحد میں شورِ قیامت مخل ہوا
ہو روشنی چراغوں کی روغن سے جس طرح   مرہم سے اور داغِ جنوں مشتعل ہوا
ثابت قدم ہم اپنی وفا پر جو ہیں سو ہیں   ناسخ ہزار بار وہ پیماں گسل ہوا

تا بہ ہستی بس تڑپتا ہی عدم سے آ گیا   زخمِ تیغِ عشق سے میں نیم جاں پیدا ہوا
آزماتا ہے مجھی پر جب نہ تب تیغِ جفا   کیا جہاں میں میں ہی بہرِ امتحاں پیدا ہوا
گبر و مومن کی پرستش کو بنا دیر و حرم   میرے سجدے کو وہ سنگِ آستاں پیدا ہوا
یہاں ازل سے جوششِ سودا بہ رنگِ لالہ ہے   داغ سے سینہ ہمارا تو اماں پیدا ہوا

ہوں زمانے میں زمانے سے جُدا مثلِ گہر
قطرہ میرا کبھی دریا سے نہ واصل ہو گا
کبر اتنا نہ کر اے لیلیٰ جمّازہ نشیں
ایک دن تختۂ تابوت ہی محمل ہو گا
یہ دہن، یہ مژہ، یہ آنکھ، یہ ابرو ہے کہاں
ماہ کس منہ سے ترے رُخ کے مقابل ہو گا
اے فلک! غم سے مرا دل ہے لبالب، نہ رُلا
دیکھ سارا کرۂ ارض ابھی گِل ہو گا
بھیج واعظ مجھے کعبے کو نہ بت خانے سے
کُوچ دنیا سے مرا اوّلِ منزل ہو گا

یہاں نہ تھی تابِ نظارہ، وہ تو آیا بے حجاب
کچھ قصور اس کا نہیں، میں آپ حیران ہو گیا
صبح کے گمراہ کرنے کو شبِ فرقت میں آہ
ہر ستارہ دیدۂ غولِ بیاباں ہو گیا

سبز ہوتا نہیں جب سرخ ہوا سیب ولے
خط سے ہے سبز یہ سیبِ ذقنِ سُرخ ترا
ہو گیا قہر مری جان کو نظارۂ گل
آ گیا یاد چمن میں بدنِ سُرخ ترا
بوئے گل پیرہنِ گل میں یہ پنہاں ہے وبا
تنِ نازک ہے تہِ پیرہنِ سُرخ ترا
گور میں بھی جسم ہے خوں زخموں سے جاری ناسخ
حشر کو دے گا شہادت کفنِ سُرخ ترا

کر دیا ہے حشر کا ساماں خرامِ یار نے
میرے نالوں کو ہے لازم پھونکنا اب صور کا
بن گیا خمیازہ ناسخ خندۂ جامِ شراب
جب خیال آیا کسی کی نرگسِ مخمور کا

نامہ بسانِ ماہیِ بے آب ہو طپاں
مضموں لکھوں میں اپنے اگر اضطراب کا
وہ رند ہوں میں روزِ ازل سے کہ محتسب!
دل کے عوض بغل میں ہے شیشہ شراب کا

غمِ یارانِ رفتہ یہ ہمارا دل جلاتا ہے
کہ اپنا جسم ہے فانوس گویا شمعِ ماتم کا
جو آیا اس کے دم میں، جہاں سے ماورا وہیں اُس کو
دمِ عیسیٰ سے کیا برعکس اثر ہے یار کے دم کا
خوشی کا ایک دن دیکھا نہیں میں نے آ کے دنیا میں
رہا ہر ماہ پر مجھ کو یقیں ماہِ محرم کا
ملالِ خاطرِ سامع کا ہے طولِ سخن موجب
بس اب خاموش ہو ناسخ، کہاں تک شکوہ عالم کا

ہے یقیں سر کٹ کے میرا تیرے قدموں پر گرے
شوق ہے قاتل بہت مجھ کو ترے پابوس کا

پھر ہوئی بوئے شرابِ عشق ناسخ موج زن   کوہِ غم سے پھر بھڑا شیشہ مری ناموس کا

لا سکا تاب نہ جب عکس کے نظارے کی   دیکھنا آئینے کا وقتِ سحر چھوڑ دیا

دشمنوں سے دل مرا ایمن ہے قیدِ زلف میں   طائرِ آزاد کو رہتا ہے ڈر شہباز کا
خط سے قشقے کے جو دو حصے ہوا ماہِ جبیں   اے بُتِ مغرور! تو دعویٰ نہ کر اعجاز کا

ہے خُوں سے پُر جام چشمِ تر کا، وفور نالوں میں ہے شرر کا   انیس ہے خارِ غم جگر کا ہے داغ ہمدم دلِ حزیں کا
ہوا ہے جینا جہاں میں مشکل، زمانہ ہے میرے جی کو قاتل   نہ تڑپوں کیوں کر لبانِ بسمل، بنا ہوں چو زنگ تیغِ کیں کا

مینائے سبز گرد ہے کیوں نہ مثلِ خضر   یہاں ہر خُم شراب ہے چشمہ حیات کا
ہر آستانِ یار کے سجدے سے ہے غرض   پابند کعبے کا ہُوں نہ میں سومنات کا

حقارت سے نہ دیکھ مجھ کو، ہوں میں تیرہ روز ایسا   فتیلہ ہے مرا نالہ چراغِ آسمانی کا
کرے کوئی نہ میرا ذکر ہرگز اپنی محفل میں   کہ خوابِ مرگ لاتا ہے اثر میری کہانی کا
سُنے ہیں جب سے عالم نے ہمارے نالۂ موزوں   نہیں ہے اب کوئی مشتاق دیوانِ فغانی کا

بے دماغی سے کہاں تالیفِ دیواں کا خیال   اپنی خاطر ہی کا مجموعہ پریشاں رہ گیا

تیشۂ اوّل میں کام اپنا کیا اے کوہ کن!   مُجھ میں تجھ میں فرق ہے شاگرد اور استاد کا
بس کہ تھا ہر ایک مُجھ کُشتے کا باطن میں رقیب   خلق کے نوحے میں ہے عالم مبارکباد کا
سینہ کوبی میں نے ایسی کی، مٹایا داغ کو   بے نشاں صیقل سے جوہر کر دیا فولاد کا
بانگِ ناقوسِ برہمن سے بتوں کو ربط ہے   کیوں ہُوا میرا صنم مانع مری فریاد کا

جس طرف جاتا ہے تو، وہ بھی قدم کے ساتھ ہے   فتنۂ محشر قدِ بالا کا مفتوں ہو گیا
مے کشو! جب سے پیا ہے بادۂ خمِ غدیر   میں خمِ گردوں میں رشکِ صد فلاطوں ہو گیا

ہوں وہ بسمل تا قیامت بس تڑپتا ہی رہا
دامنِ محشر تمام آلودۂ خوں ہو گیا

رحم میرے حال پہ آیا نہ ایک اُس کو کبھی
ہر پری کو ورنہ افسانہ مرا افسوں ہوا
روشنی سے منحرف ، مائل بہ سُوئے تیرگی
شپّرہ گویا کہ نجمِ طالعِ واژوں ہوا
میں نے اے ناسخ کیا ظاہر میں گر تقوٰی تو کیا
دل گزرگاہِ خیالِ نرگسِ میگوں ہوا

جو گیا وھاں نہ جہاں میں وہ نظر پھر آیا
کُوئے قاتل ہے مگر ملکِ عدم کا ناکا
کوئے جاناں کو ہم اشکوں میں گئے بہتے ہوئے
جس طرح کرتے ہیں زوّار سفر دریا کا

پیشتر شامِ شبِ فرقت سے پھاڑے پیرہن
گر سحر سُن پائے نالہ مجھ گریباں چاک کا
ہو گئیں اس میں تمنائیں مری یکسر شہید
دل مرا شاید بنا ہے کربلا کی خاک کا
بھیج دے دھوبی کے بدلے تو جو خوشبو ساز پاس
عطرِ وُہ کھینچے تری اتری ہوئی پوشاک کا
جز خجالت صحبتِ ممسک سے کچھ حاصل نہیں
سرنگوں انساں کو کرتا ہے اثر تریاک کا
ہر شرر مجھ دل جلے کی خاک کا اختر بنا
ہر بگولے میں ہے عالم گردشِ افلاک کا
کیا عجب دیواں مرا جل جائے یا غرقاب ہو
سب بیاں ہے سوزِ آہ و دیدۂ نمناک کا
کام میرا نا امیدی نے کیا ناسخ تمام
دھیان میرے قتل پر آیا نہ اُس سفّاک کا

نحوست سے نہ دُنیا میں کوئی خالی نظر آیا
ستارے سب کے سب افلاک پر منحوس ہیں گویا
شگفتہ غنچۂ تصویر ہوں، ممکن نہیں صاحب !
تمھارے عاشقوں کے یہ دلِ مایوس ہیں گویا
تجسس کرتے ہیں دل کا جو آ کر میرے سینے میں
ستم گر! یہ ترے ناوک نہیں، جاسوس ہیں گویا
پئے گلگشت جا کر داغِ عشق ایسے دیے تو نے
چمن میں عندلیبوں کے جگر طاؤس ہیں گویا
نہیں اوّل سے تا آخر نشاں مضمونِ شادی کا
ورق سب میرے دیواں کے کفِ افسوس ہیں گویا
لحد سے جاتی ہے آواز دو دو کوس نالوں کی
بتوں کے غم میں اپنے استخواں ناقوس ہیں گویا
نہ چھوٹا سوزِ غم مجھ ناتواں سے بعدِ مردن بھی
کفن میں استخواں شمعِ تہِ فانوس ہیں گویا
لغات ایسے ہیں جن سے صاحبِ فرہنگ حیراں ہیں
ترے دیوان ناسخ نسخۂ قاموس ہیں گویا

رحمتِ حق نے نہ دیکھا کوئی بھی میرا عمل   نامۂ اعمال سر مشقِ خطِ باطل ہُوا
تھی مجھے ہر حال میں جو کوششِ اخفائے راز   خون سے میرے نہ رنگیں دامنِ قاتل ہوا
یار کے آنے کا تھا ناسخ جو مجھ کو انتظار   نزع میں تن سے نکلنا جان کا مشکل ہوا

زلف سے اُس کی جو تشبیہ نہ دیتے شاعر   اس قدر حال نہ سنبل کا پریشاں ہوتا
دوش پہ ریگِ بیاباں کے جنازہ ہے مرا   شہر میں کیوں سببِ داغِ عزیزاں ہوتا
لے گیا داغِ غمِ آلِ نبی دنیا سے   گورِ ناسخ میں نہ کس طرح چراغاں ہوتا

مت کرو زنجیر، میں دیوانۂ نازک مزاج   موجِ بوئے گل سے پابندِ سلاسل ہوگیا
سایہ بن کر ساتھ قدموں کے لگا پھرتا ہے وہ   سرو یہ اُس کے قدِ موزوں کا مائل ہوگیا
دم بدم پھرتی ہے اے ناسخ جو شمشیرِ نگاہ   جو پتنگ اس نے اڑایا، بس وہ گھائل ہوگیا

شوق اسے کہتے ہیں، مجنوں جو لحد سے نکلا   شورِ محشر کو بھی آوازِ حُدی خواں سمجھا
کاتبِ خط کے قلم کیجیے ہاتھ اے ناسخ   یار نامے کا نہ مضموں کسی عنواں سمجھا

آسماں پر کچھ جوانی میں نہیں پہنچا دماغ   عرش سے، طفلی میں، آویزاں مرا گہوارہ تھا
پہلا سی پارہ کیا مکتب میں جب تو نے شروع   دِل مرا اُس دن بھی تیرے عشق میں صد پارہ تھا
کُوچۂ قاتل کو سب کہتے تھے گلشن جن دنوں   نہر تھی میرے لہو کی، زخم کا فوّارہ تھا

دریا ہیں دو کہ جاری ہیں آنکھوں سے رات دن   دو دن میں جس مکاں میں رہا، وہ مکاں گرا
بادِ نخوت یہ ہُوئی موج زن اب عالم میں   کہ ہر اک مور کو دعویٰ ہے سلیمانی کا

نظر آتے ہیں وقتِ فکر بالکل دور کے مضموں   دکھاتا ہے مجھے عکسِ دروں آئینہ زانو کا
نسیمِ زلف مجھ وحشی تلک پہنچی جو زنداں میں   بنا ہر حلقۂ زنجیر، حلقۂ نافِ آہو کا

اس کو صرصر نے کہا: مجھ سے بھی کیا جلدی ہے؟   قیس جب دشتِ جنوں میں مرے شامل دوڑا
قیس پیغام ہی کہتا ہُوا، اللہ رے شوق!   ساتھ قاصد کے گیا کتنی ہی منزل دوڑا

جستجو جو کہ ہمیں تھی، وہی تھی اُس کی تلاش رات بھر ساتھ ہمارے مہِ کامل دوڑا
مارِ رہ ہے ترے کُوچے کے سوا ہر جادہ اپنے جاسوس نہ پیچھے مرے قاتل دوڑا

خیالِ مے کدہ آیا جو دشت گردی میں ہر ایک نقشِ قدم ساغرِ شراب ہوا

چراغِ زیست مرا جب تلک کہ روشن تھا فتیلہ نالۂ دل تھا تو اشک روغن تھا
نہ کیوں لطیف کو ہووے کثیف سے نفرت کہ رُوح کو تنِ خاکی غبارِ دامن تھا
جو موجِ ریگ تھی سنبل تو گردباد تھے سرو نشاں تھے پاؤں کے گل مجھ کو دشت گلشن تھا
وہ آشنا ہو ترا جو کہ غیر ہو سب سے میں شیخ دیر میں تھا، کعبے میں برہمن تھا
میں نالہ زن تھا فقط اور تھے سبھی خنداں میں عندلیب تھا شاید، زمانہ گلشن تھا

خواب میں تُو نے جو منہ اپنا دکھانا چھوڑا خواب ہی نے مری آنکھوں میں اب آنا چھوڑا
تجھ سے، انصاف تو کر، چھٹ نہ سکا ایک رقیب ہم نے کیوں کر تری الفت میں زمانا چھوڑا
کیا خبر تھی کہ تری غیر کے دل میں ہے جگہ رات ہم نے نہ کوئی تیرا ٹھکانا چھوڑا
اس قدر خوف ہمیں خلق کے بہتان کا ہے کہ تصور میں بھی پاس اس کو بٹھانا چھوڑا
حرفِ مطلب جو نکلتے تھے کچھ اُس میں ناسخ اُس نے اشعار کا بھی ہم سے پڑھانا چھوڑا

شمع ساں مرنے نہیں دیتا مجھے اعجازِ عشق تن سے اُس قاتل نے میرا سر جُدا اکثر کیا
وائے بر حالِ دلِ حسرت نصیب عشقباز سیم تن تجھ کو کیا حق نے، مجھے بے زر کی
تُو نے جو پہنا قلادہ، ہم نے بھی تقلید کی جوشِ وحشت میں غل و زنجیر کو زیور کی

انتظار یار ابھی باقی ہے گو میں مر گیا رُوح گھر میں رہ گئی لاشہ اگر باہر گ
میرے مرنے کا تو قاتل کو نہ آیا کچھ خیال اُلٹے کہتا ہے، عبث خنجر لہو میں بھر گ
رُخ دکھا کر داغ مثلِ لالہ گل کو دے گیا سرو کو قامت دکھا کر بیدِ مجنوں کر گ
یہ کڑی ہیں منزلیں، راہِ دیارِ عشق میں خضر بھی گزرا تو ہر ہر گام پہ مر مر گ
عاشقوں کی محفلِ جاناں، شہادت گاہ ہے پاؤں رکھا جس نے، مثلِ شمع اُس کا سر

تری گلی سے کبھی اپنا نامہ بر نہ پھرا   کہ جیسے جا کے عدم کو کوئی بشر نہ پھرا
غبارِ خاطرِ یاراں نہ کر صبا مجھ کو   مرے غبار کو ناحق تو در بدر نہ پھرا
مجھے تو بیٹھ کے رونے دے ایک جا دلِ زار!   بس اضطراب میں مانندِ ابرِ تر نہ پھرا
اگرچہ گردش اسے صبح و شام ہے ناسخ!   مگر یہ چرخ کبھی میرے کام پر نہ پھرا

ہرزہ گردی ترک کر گر چاہتا ہے آبرو   بن گیا گوہر سکونت ہی سے قطرہ آب کا
صاف دل پر تو بزرگوں کا اٹھا لیتے ہیں جلد   آسمانی ہو گیا ہے رنگ جیسے آب کا

تھی شہادت سے غرض سو اس ادا میں ہو گئی   گو نہ قاتل سے نزاکت کے سبب خنجر اٹھا
روکتا ہے نزع میں دم کو کسی کا انتظار   سخت جانی کا نہ بہتان اے اجل ہم پر اٹھا

رات سب بے کل رہے سُن کر ہمارا حالِ دل   دشمنِ خوابِ عزیزاں اپنا افسانہ ہوا
آبِ آتش رنگ کی گرمی سے ہونٹوں پر ترے   جو پڑا بتخالہ سو انگور کا دانہ ہوا
غیر کی محفل میں شغلِ مے کشی ہے اُس کو آہ   آج اپنی عمر کا لبریز پیمانہ ہوا
اُس کی زلفِ عنبر افشاں تک تو ہوتا دسترس   وائے قسمت ہاتھ ہی اپنا نہ کیوں شانہ ہوا
ان دنوں، سنتے ہیں، ناسخ کو ہوا سودائے عشق   جو کہ تھا فرزانہ عالم میں سو دیوانہ ہوا

سایۂ گلبن پہ اگر پڑ جائے مجھ دل گیر کا   ہووے ہر غنچے میں عالم غنچۂ تصویر کا
درد سے بے درد کیا واقف کہ ہر صیاد کو   رقصِ شادی ہے تڑپنا، لوٹنا نخچیر کا

عالمِ سودا میں ہے ناسخ یہ میرا مرتبہ   کان میں مجنوں کے حلقہ ہے مری زنجیر کا

مست کہتا ہے جہاں کو جام چشم یار کا   مسجدوں پر بھی گماں ہے خانۂ خمار کا
کیا رکھیں صیاد و گل چیں میرے گلشن میں قدم   تیرِ ناوک ہے ہر اک نالہ مری منقار کا
پوچھوں گر حالِ دلِ شیدا تو کہتا ہے مجھے   غیر سے کیوں کہ کروں شکوہ جفائے یار کا

پایا جو حسد گبر و مسلماں میں تو ہم نے   مذہب ہی جُدا گبر و مسلماں سے نکالا
رہ رہ کے مجھے یاد دلاتیں تری آنکھیں   یوں مجھ کو غزالوں نے بیاباں سے نکالا
پھیلائے ہیں پھر پاؤں مرے دستِ جنوں نے   پھر چاک نے سر چاکِ گریباں سے نکالا

رنگِ نافرماں کرے پیدا جبینِ لالہ گوں   روندے وہ نازک بدن گر برگِ سوسن زیرِ پا

گفتگو میری سمجھتا نہیں تم سے کوئی   دوستو! ہے یہی باعث مری خاموشی کا
ذہن اک وہم ہے، باطل ہے گمانِ خفگی   شکوہ بے جا ہے دلا! یار کی خاموشی کا
برملا رازِ نہاں ہونے پہ اب ہے ناسخ   جام سے قصد صراحی کو ہے سرگوشی کا

ترکِ مطلب کا کرے وصف جو انساں پیدا   ظلمتِ گور میں ہو چشمۂ حیواں پیدا
سرمۂ گردِ قناعت جو لگے آنکھوں سے   روزنِ مور سے ہو ملکِ سلیماں پیدا

سنبلِ جنت ہوئی لیلیٰ کی زلفِ عنبریں   قیس کی دیوانگی کا سلسلہ جاتا رہا

تلف کر دم نہ اسے بے قدر! جو دم ہے غنیمت ہے   دمِ آخر جو ڈھونڈے گا، نہ ہوگا ایک دم پیدا

شاخِ طوبیٰ کا نشیمن جو اسے یاد آیا   مُرغِ رُوحِ قفسی مائلِ پرواز ہُوا
ترکِ ظاہر سے درِ دولتِ باطن پایا   آنکھ جب بند ہوئی، دیدۂ دل باز ہوا
تھا تو صیادِ فلک فکرِ گرفتاری میں   لیک ناسخ نہ اسیرِ قفسِ آز ہوا

میں دمِ وحشت جو اپنے ساتھ دوڑاتا اسے   چرخ سا آوارہ دم لینے کی فرصت مانگتا
پاس ہوتا میرے گر تجھ سا صنم معجز بیاں   دیر میں پیرِ مغاں سے جا کے بیعت مانگتا

کیا نزاکت ہے کہ دم میں عارضِ گلرنگِ یار   لطمۂ بادِ صبا سے مثلِ سوسن ہو گیا
ہے یہ کس کافر صنم کے عشق کا سودا مجھے   جیب کا ہر تار زنّار برہمن ہو گیا

جو ترقی کا ہے طالب، چاہیے ہو خاکسار   خاک میں ملتے ہی ہر (اک) دانہ خرمن ہو گیا
جی گیا، ایماں گیا، دولت گئی، عزت گئی   دوست دل سا کیا بغل کا ہائے دشمن ہو گیا

گلہ نہ یار کا باقی رہا نہ شکوۂ غیر   اجل نے خوب مرے مجھلے کو پاک کیا
عوض شراب کے انگور سے چوسے گا لہو   جو بعدِ مرگ مجھے دفن زیرِ تاک کیا

ہوا پرتو فگن وہ ماہ رو، پانی پہ بت ہم نے   حبابوں کو ستارہ، گومتی کو کہکشاں باندھا
ہر اک بلبل بہ رنگِ بلبلِ تصویر حیراں تھی   چمن میں نالۂ موزوں کا ہم نے وہ سماں باندھا
وفورِ داغِ ہجراں سے ہوا گلزار کا عالم   نہیں سینے میں دل، بلبل نے آ کر آشیاں باندھا

رات بھر مجھ کو خیالِ ساقی و مے خانہ تھا   جو ستارہ تھا، مری نظروں میں اک پیمانہ تھا
کس نگاہِ مست نے تقویٰ کیا میرا خراب ؟   قطرۂ مے بن گیا، تسبیح میں جو دانہ تھا
یہ حریمِ دل ہی کیا، ہر جا بتوں کا ہے مکاں   فی الحقیقت پیش ازیں کعبہ بھی اک بُت خانہ تھا

رباعیات

کرتی ہے فزوں قدرِ بشر خاموشی   ہر عیب کو کرتی ہے ہنر خاموشی
ہو مردمِ چشم ساں سراپا بینا   انسان سے ہو سکے اگر خاموشی

ہے اب کی مخلِ صوم ہجرِ جاناں   ہر دم مجھے کھاتا ہے غمِ زہر چکاں
کیا دیکھوں ہلالِ رمضاں تیغ کے ساتھ   ہے تیغ مرے جی کو ہلالِ رمضاں

اب کے رمضاں میں جو بہ ہوش آتا ہوں   جائے سحری خونِ جگر کھاتا ہوں
بے یار جو افطار کا وقت آتا ہے   بھر آتے ہیں اشک آنکھوں میں، پی جاتا ہوں

جب سے رمضاں کا نظر آیا ہے ہلال   ہے آٹھ پہر ابروئے جاناں کا خیال
اِفطار کا ہوس، بے خودی میں ہے کسے   رکھتا ہوں فراقِ یار میں صومِ وصال

شبیر کے، دوپہر میں، اصحاب قلیل   پہنچے سرِ سلسبیل ہو ہو کے قتیل
لی راہ عدم کی سب نے ہو کر سیراب   رکھی تھی قضا نے آبِ آہن کی سبیل

قطعاتِ تاریخ

(تاریخِ وفاتِ شاہ عالم بادشاہ)[۲۳]

جہاں تیرہ گردید مانند گور   چو شد دفنِ سلطان عالی جناب
رقم گشت تاریخ ایں واقعہ   نہاں شد "بزیرِ زمیں آفتاب"
۲۰ ھ ۱۲

تاریخِ تعمیرِ مکان میر روشن علی

میر روشن علیِ روشن دل   کرد تعمیر خانۂ روشن
سالِ تاریخِ ایں بنا ناسخ   کرد تحریر "خانۂ روشن"
۱۲ ھ ۱۲

تاریخ وفاتِ فرزند مہر؟

ماتمِ پور اشک ماہ نہاد   بر دلِ مہر داغ ہم چو قمر
سالِ ایں ماتمِ قیامت زا   کلکِ ناسخ نوشت "داغِ جگر"
۲۸ ھ ۱۲

تاریخ وفاتِ دخترِ مہر

اول زجہاں گذشت چوں مہر پسر   شد بعد ازیں ہلاک چوں مہر دختر
تاریخِ غمِ نخست شد "داغِ جگر"   تاریخِ غمِ دگر شدہ "داغِ دگر"
۱۲ ۲۹   ۲۹ ھ ۱۲

تاریخِ وفات محمد علی؟

چوں محمد علی بہ عینِ شباب   ناگہاں گشت مائلِ فردوس
ریخت تاریخ فوتش از قلم   "آہ گردید داخلِ فردوس"
۲۹ ھ ۱۲

"تاریخ بنائے ..... معتمد الدولہ بہادر"

گوید آں کس کہ ببیند ایں قصر   ایں چنیں قصر مبارک باشد
گفت تاریخ بنایش ناسخ   "یارب ایں قصر مبارک باشد"
۳۴ ھ ۱۲

تاریخ عطائے خلعتِ وزارت بہ معتمد الدولہ بہادر

یافتی خلعتِ مبارک را   روز افزوں شود جاہ و جلال
سالِ تاریخ خامۂ ناسخ   کرد تحریر "خلعتِ اقبال"
۳۴ ھ ۱۲

تاریخ وفاتِ سید صاحب؟

جنابِ سیدِ والا مناقب   چو عزمِ گلشنِ فردوس بنمود
پئے تاریخ ایں اندوہ ہاتف   "نصیبش جامِ کوثر باد" فرمود
۲۹ ھ ۱۲

تاریخ وفات خواجہ حسین

گفت بے اختیار: صد افسوس   ہرکہ بشنید موتِ خواجہ حسین
بہرِ تاریخ موتِ او ناسخ   ہاتفے گفت "فوتِ ۲۹ خواجہ حسین" ۱۲

تاریخ وفاتِ میر فتح علی شیدا

جہان سے سوئے دارالسلام جب چلے شیدا   تو نکلی سنتے ہی بے اختیار دل سے مرے آہ
خیال آیا کہ اس سانحے کی چاہیے تاریخ   کہا خرد نے "موئے ۲۶ ہائے میر فتح علی شاہ" ۱۲

"تاریخ وفات نواب معلی القاب..... نواب یمین الدولہ (سعادت علی خاں) بہادر

نوابِ پادشاہ غش چوں وفات یافت   دل داغ گشت و چشم پر آب و جگر کباب
رفتم بہ فکر چوں پے تاریخ ایں الم   ہاتف بگفت: "آہ ۲۹ شد لکھنؤ خراب" ۱۲

تاریخ وفاتِ میر حیدر علی

میر حیدر علی چو یافت وفات   ز مصیبت دلم شدہ نالاں
گشت تاریخ ایں غمِ جاں کاہ   "بود ۲۶ اے وائے پنجم رمضاں" ۱۲

تاریخ وفاتِ میر باقر

میر باقر کہ بود مومنِ پاک   روحِ او را ملک بہ رضواں برد
بود چوں واعظِ زمانۂ خویش   گشت تاریخ: "آہ ۲۷ واعظ مرد" ۱۲

(تاریخ وفات نواب آصف الدولہ بہادر)

کرد ہند از وفاتِ خویش خراب   وائے افسوس آصف الدولہ
گشت سالِ وفات آں جم جاہ   "ہائے ۱۲ افسوس آصف الدولہ" ۱۲

"تاریخ تولد فرزند جناب والا مناقب منیر علی صاحب"

پسرے داد حق بہ سیدِ ما   خرمی را سزد کہ عام بود
نامِ آبا بہ او شود روشن   فخرِ اجدادِ نیک نام بود
یک صد و بست سال عیش کند   صاحبِ جاہ و احتشام بود
حق نگہبانش از ہمہ آفات   بہ حقِ سیدِ انام بود
گفت تاریخ مولدش ناسخ   "چو پدر ۳۰ ذاکرِ امام بود" ۱۲

"تاریخ وفاتِ دخترم مرضعہ خود گفتہ شد"

چوں بہ فردوس کنیز زینب   رفت در خدمتِ اولادِ علی

گفت تاریخ وفاتش ہاتف   "بود ۲۹ اثنا عشری ۱۲ بیگم جی"

تاریخ وفات فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر، جعفر تخلص[۲۵]

خوں می شود ز دیدہ رواں وا مصیبتا   سر می زند ز سینہ فغاں وا مصیبتا
مہرِ سپہرِ عزت و قدر و جلال شد   امروز زیرِ خاک نہاں وا مصیبتا
جعفر لقب، امیر فلک قدر، فخرِ دیں   بر لبست رخت سوئے جناں وا مصیبتا
نگذاشت چرخ ہیچ دلے را کہ خوں نہ کرد   زیں ماتم نشور نشاں وا مصیبتا
اقلیدس زمان و ارسطوئے وقت رفت   زیں کہنہ عالمِ گزراں وا مصیبتا
ایں غم بود غمے کہ جہاں را شکست ازاں   صد نیشِ درد در رگِ جاں وا مصیبتا
در عینِ فصلِ گل بہ گلستانِ عشرتم   ناگہ وزید بادِ خزاں وا مصیبتا
یارائے ضبط کم شدہ، طاقت بہ دل گداخت   بے خواست می رسد بہ زباں وا مصیبتا
از ما جوئے صبر کہ اکنوں ز جائے رفت   پائے شکیب و تاب و تواں وا مصیبتا
بگذشت از جہان و بہ دل ہا گذاشت داغ   جانِ جہاں، وحیدِ زماں وا مصیبتا
از حکمت و بیان و بدیع و اصول و فقہ   بے او نماند ہیچ نشاں وا مصیبتا
تاریخ نمود سالِ وفاتش چنیں رقم   "شد گنجِ چند ۳۰ علم نہاں وا مصیبتا" ۱۲

تاریخِ ورودِ نواب غازی الدین حیدر بر مکانِ قمر الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی قمر

امروز چوں حضورِ مقدس قدم گذاشت   شان و شکوہِ خانۂ مرزائے ما فزود
بودم بہ فکرِ سال کہ آمد ندا ز چرخ   "ہاں ۳۴ آفتاب جلوہ ببرجِ قمر نمود" ۱۲

تاریخ عطائے خطاب بہ مہاراجہ میوہ رام

بود اے افتخارِ دولہ با ترقیِ تام و جاہ و حشمت   جہاں نوازی شود مبارک، جہاں پناہی شود مبارک
حضورِ پرنور دام اقبالہ خطابت عطا چو فرمود   برائے تاریخ گفت تاریخ: "خطاب ۳۱ الٰہی شود مبارک" ۱۲

تاریخ صحت یابی شیخ احمد بخش

شفیقی شیخ احمد بخش صحت یافت اسے تاریخ   بگو ہر دم: مبارک یا الٰہی جشنِ ایں صحت
پئے تاریخِ ایں جشنے کہ راحت زا و روح افزاست   رقم کردم: "مبارک ۳۲ یا الٰہی جشنِ ایں صحت" ۱۲

تاریخ تیاریٔ سفینہ

چوں جناب وزیرِ اعظم ہند   کرد پیدا دگر سفینۂ نوح
بعدِ چندیں ہزار سال شدہ   زیبِ دریا دگر سفینۂ نوح

چشمِ ہر کس کہ اوفتاد بگفت   شد مہیا اگر سفینۂ نوح
بہرِ الزامِ منکراں گردید   لجّہ پیما اگر سفینۂ نوح
سالِ تاریخِ آں بگو ناسخ   "گشت زیبا اگر سفینۂ نوح"
۴۳ ھ ۱۲

تاریخ وفاتِ میر نوروز علی

میر نوروز علی واویلا   زجہاں شد بجناں عہدِ شباب
گفت تاریخِ وفاتش ہاتف   "حیف رفتہ زجہاں عہدِ شباب"
۴۳ ھ ۱۲

تاریخ وفات مرزا قتیل

عزمِ جنت کرد چوں مرزا قتیل   شد خزاں در بوستانِ شاعری
گفت ناسخ سالِ تاریخش کہ ہائے   "آفتابِ آسمانِ شاعری"
۴۳ ھ ۱۲

ایضاً

تیرہ چوں گور شد از مرگِ قتیل   دہر در دیدۂ من واویلا ۲۶
سالِ تاریخِ وفاتش گفتم   "شمعِ بزمِ سخن واویلا"
۴۳ ھ ۱۲

ایضاً

چوں محمد حسن قتیل اے وائے   رفت از باغِ دہر سوئے بہشت
سالِ تاریخ خامۂ ناسخ   "وائے استادِ وقت مرد" نوشت
۴۳ ھ ۱۲

ایضاً

زیں جہاں رفت بہ فردوس قتیل   بود کو پشت و پناہِ شعرا
سالِ تاریخِ وفاتش ناسخ   زد رقم "شاہنشاہِ شعرا"
۴۳ ھ ۱۲

حواشی

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: "کلیاتِ ناسخ" طبع اول صفحات ۳۹۸ و ۳۹۹ — "دیوانِ ناسخ" سے ۲
بہ قاعدۂ زبر و بینہ نکالا گیا ہے۔

[2] غلط نامے کے اس عنوان میں لفظ "تنقید" بہ ظاہر "تنقیح" کی تصحیف معلوم ہوتا ہے۔ بہ صور
یہ اردو میں اس لفظ (تنقید) کے استعمال کی قدیم ترین مثال قرار پائے گی۔

[3] "انتخاب دیوانِ ناسخ" شائع کردہ مکتبہ جامعہ، دہلی، اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۱۲۲۔

[4] "حقائق" مطبوعہ الٰہ آباد، جون ۱۹۷۸ء، ص ۳۰۲ و ۳۰۶۔

[5] ممکن ہے کہ یہ خط مرزائی صاحب ٹکسال والے کی تحریر ہو جو سعادت خاں ناصر کے بیان کے مطابق ناسخ کے انتقال کے بعد "ان کے تمام مال اور اسباب اور املاک پر حسبِ وصیت ان کے ..... قابض و متصرف ہوئے تھے۔" (خوش معرکۂ زیبا، مرتبہ مشفق خواجہ، شائع کردہ مجلس ترقیِ ادب، لاہور، جلد دوم مطبوعہ مارچ ۱۹۷۲ء، ص ۲۰۶)

[6] "ناسخ — تجزیہ و تقدیر" شائع کردہ اردو پبلشرز، نظیر آباد، لکھنؤ، نومبر ۱۹۷۴ء، ص ۲۰۸۔

[7] "کلیاتِ ناسخ" طبع اول (ص ۲۰۸) اور بعد کے ایڈیشنوں میں اس شعر کا مصرع ثانی اس طرح نقل ہوا ہے:

تیرگی ہے کہ نظر آتے ہیں تارے دن کو

[8] یہ غزل نہ تو زیرِ بحث قلمی دیوان میں موجود ہے اور نہ "کلیاتِ میر" میں اس زمین میں کوئی غزل ملتی ہے۔ یہ صورتِ حال اس سلسلے میں مزید تحقیق کی طالب ہے۔

[9] "انتخابِ ناسخ" ص ۱۲۱

[10] "مقالاتِ حیدری" شائع کردہ اردو پبلشرز، لکھنؤ، فروری ۱۹۷۷ء، ص ۲۱۵ و ۲۱۶ و "جائزہ مخطوطاتِ اردو" از مشفق خواجہ، شائع کردہ مرکزی اردو بورڈ، لاہور، فروری ۱۹۷۹ء، ص ۶۷۴۔

[11] "بیاضِ رفعت" بہ حوالہ ماہنامہ "شاعر" بمبئی شمارہ نمبر ۵ و ۶ برائے ۱۹۸۱ء، ص ۶۸۔

[12] "تحقیقِ نوادر" از ڈاکٹر اکبر حیدری، شائع کردہ اردو پبلشرز، لکھنؤ، ستمبر ۱۹۷۴ء، ص ۴۶۲۔

[13] ایضاً "تحقیقِ نوادر" ص ۵۱۶۔

[14] "خوش معرکۂ زیبا" مرتبہ مشفق خواجہ، جلد دوم، ص ۵۶ و ۵۷۔

[15] "آبِ حیات" فوٹو آفسٹ ایڈیشن (مبنی بر طبع ۱۹۰۷ء) شائع کردہ اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ، ص ۳۵۴ و ۳۵۵۔

[16] "ناسخ — تجزیہ و تقدیر"، ص ۳۴۴ — کسی قطعۂ تاریخ یا غزل کے آخری شعر میں تخلص کا موجود نہ ہونا ہرگز اس امر کی دلیل نہیں بن سکتا کہ اس کی تصنیف کے وقت شاعر نے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا تھا۔

[17] یہ بیان ناسخ کے شاگرد مولوی عظیم اللہ رغمی غازی پوری کا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اسے غلطی سے مولانا محمد حسین آزاد کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ دیکھیے "آبِ حیات" ص ۳۳۹۔

[18] "مقالاتِ حیدری" ص ۱۹۹ و ۲۲۱

[19] مولانا محمد حسین آزاد نے اس زمین میں مصحفی کی تین غزلیں (صفحات ۳۱۸ و ۳۱۹) اور شاہ نصیر کی ایک غزل (ص ۴۰۰ و ۴۰۱) نقل کی ہے۔ مصحفی نے "دہنِ سرخ ترا" کو ردیف اور "گل، بلبل، سنبل" وغیرہ

کو قوافی قرار دے کر بھی ایک غزل کہی ہے۔ یہ بھی "آبِ حیات" میں موجود ہے۔

۲۰؎ کلیاتِ مطبوعہ اور دیوانِ قلمی میں مشترک اشعار سے متعلق ان تفصیلات میں دونوں روایتوں کے درمیان ترتیب کی مطابقت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ بہ طور مثال کلیاتِ مطبوعہ کی اس تیسری غزل کے اشعار نمبر ۱، ۳، ۸، ۹، ۱۲، ۱۳ و ۱۵ بالترتیب دیوانِ قلمی کی غزل نمبر ۱ کے اشعار نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۶، ۱۳ و ۱۴ کے اور اشعار نمبر ۱۶، ۱۴، ۱۱، ۱۰، ۷، ۶، ۵، ۴، ۲ و ۱۷ بالترتیب دیوانِ قلمی کی دوسری غزل کے اشعار نمبر ۳، ۴، ۶، ۹، ۱۰، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۲۱ و ۲۲ کے مطابق ہیں۔

۲۱؎ بہ حوالہ "ناسخ – تجزیہ و تقدیر" ص ۱۵۲ و "مقالاتِ حیدری" ص ۲۲۵ — اوّل الذکر کتاب میں اس قطعے کے چوتھے مصرعے کے آغاز میں اور ثانی الذکر مجموعۂ مضامین میں تیسرے مصرعے کے آخر میں شاعر کا تخلص (ناسخ) بھی موجود ہے جو ظاہری فرق کے باوجود اصل نسخے کی نقل پر مبنی معلوم ہوتا ہے لیکن وزنِ شعر کے اعتبار سے زائد از ضرورت ہے۔

۲۲؎ پہلی دو رباعیاں حضرت علیؓ کی منقبت میں ہیں۔ انھیں اس لیے شاملِ انتخاب نہیں کیا گیا کہ ان میں دیگر اصحابِ رسولؐ کی منقصت کا پہلو نکلتا ہے۔

۲۳؎ دیوانِ قلمی کے اکثر قطعات عنوانات سے محروم ہیں اس لیے ہم نے یہ طریقِ کار اختیار کیا ہے کہ جس قطعے کی پیشانی پر کوئی عنوان درج ہے، اسے واوین " " کے اندر من و عن نقل کر دیا ہے۔ اور جن موضوعات سے متعلق قطعات قلمی دیوان اور کلیاتِ مطبوعہ میں مشترک ہیں، ان کی نشان دہی کے لیے کلیاتِ مطبوعہ کے عنوانات مستعار لے
انھیں قوسین کے اندر جگہ دی ہے۔ باقی عنوانات قطعات کی داخلی شہادتوں کی بنیاد پر خود ہم نے قائم کیے ہیں۔

۲۴؎ اس مادۂ تاریخ (ہائے آصف الدولہ) سے مطلوبہ سنہ (۱۲۱۲ھ) بہ قاعدۂ زبر و بینہ حاصل کیا گیا ہے تفصی
حسب ذیل ہے:

ہائے	افسوس	آصف	الدولہ	
ہے الف یے	الف فے سین واؤ سین	الف صاد فے	الف لام دال واو لام ہے	
۲۰+۱۱۱+۱۵	۱۲۰+۱۳+۱۲۰+۹۰+۱۱۱	۹۰+۹۵+۱۱۱	۱۵+۷۱+۱۳+۳۵+۷۱+۱۱۱	
۱۴۶	۴۵۴	۲۹۶	۳۱۶	=۱۲۱۲

۲۵؎ مرزا جعفر کی وفات سے متعلق ناسخ نے کل چھ ۶ قطعات کہے ہیں۔ یہ سب کے سب فارسی میں ہیں اور ان کے ا
کی مجموعی تعداد بیالیس ۴۲ ہے۔ دستیاب معلومات کے مطابق ان میں سے کوئی قطعہ دیوان کے کسی دوسرے
میں موجود نہیں۔

۲۶ و ۲۷ ناسخ نے ان دونوں قطعات کے مادہ ہائے تاریخ میں تسکینِ اوسط کے قاعدے کے تحت فَعِلاتُن کو مُفعُولُن کر دیا ہے جس کے نتیجے میں بہ ظاہر یہ دونوں مصرعے ناموزوں معلوم ہوتے ہیں۔ قتیل ہی کی تاریخ وفات سے متعلق ایک اور قطعے کے مادۂ تاریخی "شمعِ بزمِ سخن واویلا" کی بھی یہی کیفیت ہے۔

کجدار و مریز

عبدالعزیز خالد

اس مضمون کی ابتدائی قسط (مطبوعہ "فنون" لاہور سالنامہ جنوری - فروری ۱۹۸۱ء) میں ہم نے اقبال اور رُومی کی شاعری میں قرآن و حدیث کے اس استعمال کا جائزہ لیا تھا۔ جس میں ضرورتِ شعری کے لیے منصوص الفاظ میں یا تو حک و اضافہ کیا گیا تھا یا اِشباع سے کام لے کر زیر، زبر، پیش (کسرہ یا جَرّ، فتحہ یا نَصَب، ضمّہ یا رُفَع) کو کھینچ کر لطور ایک سببِ خفیف کے شمار کیا گیا تھا۔ بعد میں خیال آیا کہ کیوں نہ اسی نقطۂ نگاہ سے دوسرے فارسی اور اردو شعراء کا مطالعہ کیا جائے۔ ناتمام حاصلِ مطالعہ ادب و انکسار کے ساتھ نذرِ اہلِ نظر ہے۔ اس "حرف گیری" سے بقولِ تمنّا عمادی،

"نہ کسی کی تضحیک مقصود ہے نہ تنقیص۔ نہ اپنے تفوّق کا اظہار۔ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیدًا۔"

فارسی شعروں کو جیسے ایران کے چھپے ہُوئے نسخوں میں ہیں ویسے ہی نقل کیا گیا ہے (اردو کے بھی کم و بیش ایسے ہی) اس سے اندازہ ہوگا کہ اہلِ اُردو کی طرح اہلِ ایران بھی کس قدر سہل انگار، سُست کوش اور بے توفیق واقع ہوئے ہیں اور اپنی زبان کو کس بُری طرح مسخ کر رہے ہیں۔

شعر صحیح پڑھنا ہی کارے دارد ہے۔ کہیں اعراب (حرکات و سکنات) کا وجود نہیں۔ عربی کے متولے مصرعے، شعر آ رہے ہیں مگر اشاراتِ املائی کا دُور دُور پتا نہیں۔ یائے مجہول، ہمزہ اور نُون غُنّہ کا اُنھوں نے خاتمہ ہی کر دیا۔ نُون غُنّہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ تقطیع میں محسوب نہیں ہوگا۔ مگر اس کے برعکس نون معلن ہوگا۔ جب سب نُون، نُون معلن ہیں تو مصرع وزن میں کیسے پڑھا جائے گا؟ یائے معروف بھی ہر جگہ یائے مجہول کی جگہ نہیں لے سکتی اور لے تو غلط مبحث پیدا کرے گی۔

یہی وجہ ہے کہ اردو اور فارسی زبانوں کا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ فارسی کے ایران کی حدوں سے باہر نکلنے کا اب بظاہر کوئی امکان نہیں۔

اردو کے ساتھ بھی اردو کے سرکاری ادارے یہی سلوک کر رہے ہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ تک ——

زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن

عجب لاتعلق، لاپروا○، بے بہرہ لوگوں سے واسطہ پڑا ہے جنھیں نئی نسل کی صحیح تربیت سے، ان کی تہذیبِ نفس سے، ان کی صحیح خطوط پر نشوونما سے سرِمُو کوئی سروکار نہیں —— بلند بانگ دعوے مگر طبلِ تہی کی صدا۔

○ لاپروا میں جو بات ہے، بے پروا میں نہیں۔

جب نصاب کی ابتدائی کتابوں تک میں تلفظ کے ضبط کا اہتمام نہیں ہوگا تو بچے صحیح زبان کیسے سیکھیں گے ؛ کیسے بولیں گے ؛ کیسے لکھیں گے ؛

اے ہمنفساں بودن و آسودنِ ما چیست ؛

علم و فن نوکری پیشہ نہیں، عشق پیشہ لوگوں کا کام ہے۔ مگر یہاں ہر چیز جنسِ بازار ہے۔

وَقِیمَةُ المَرءِ مَا قَدْ کَانَ یُحْسِنُه
وَالجَاهِلُونَ لِاَهْلِ العِلمِ اَعْدَاءُ

ضمیر کا، خود آگاہی کا، احتساب کا، فکرِ فردا کا، خوفِ خدا کا، شرمِ خلائق کا کوئی وجود نہیں۔

نہ خریدار کا حصّہ ہیں نہ حقِ بائع کا
یہ وہ دانے ہیں جو گر جائیں کفِ میزاں سے

یہ وہ اسم ہیں جن کا کوئی مسمّٰی نہیں۔ وہ سیپیاں ہیں جن میں کوئی موتی نہیں۔

بروزِ حشر کہ ابرار لاتخف شنوند
بگوشِ خاطرِ ایشان رسان کہ لا بُشریٰ

-مذکورہ قسط میں ہم نے دونوں شاعروں کے اَحسَنِ تقویم ۹۵ ، ۴ کو اَحسنُ التقویم بنانے پر ادباً ایراد کیا تھا۔ بعد میں جامی، سعدی، عطّار اور پیر مہر علی شاہ گولڑوی کے یہاں بھی یہ بدعت نظر آئی۔

جامی ؛

روی تو در احسن التقویم اگر دیدی حکیم　　کی نہادی ز آفتاب و مہ رقم تقویم را

سعدی ؛

اے پری روی احسن التقویم　　حذر از اتباعِ دیو رجیم

عطّار ؛

حق تعالیٰ ہم بتو تعلیم داد　　ہم ز قدرت احسن التقویم داد

مہر علی ؛

خلقت ما کردی از ماءِ مہین　　احسن التقّویم کردی ذُو الیقین

بیدل اور امیر خسرو نے البتہ قرآنی الفاظ کا احترام کیا۔

بیدل ؛

بہ حسنِ خویش نگاہی کہ در جہانِ ظہور　　خطابِ احسنِ تقویم داری از خلاق

امیرخسرو ؛

تختۂ خاکی بکنارش نهاد   ز احسن تقویم شمارش نهاد

" احسن التقویم" پر ہمارا اعتراض یہ تھا کہ اس طرح مرکّبِ توصیفی مرکّبِ اضافی میں بدل جاتا ہے جس سے مفہوم بالکل فرق ہوجاتا ہے۔ مرکّبِ توصیفی میں جو اعرابی حالت موصوف کی ہوتی ہے وہی صفت کی۔ یعنی معرفہ ہو تو دونوں معرفہ، نکرہ ہو تو دونوں نکرہ۔ جب کہ مرکّبِ اضافی میں مضاف پر نہ تو لام تعریف (ال) داخل ہوتا ہے نہ تنوین برخلاف مضاف الیہ کے۔ مگر یہ بھی فارسی شعرا کا ایسا تصرّف و اجتہاد ہے جو صرف اسی ایک ترکیب تک محدود نہیں۔ اس میں منجملہ اور الفاظ مثلاً "بیت الحرام"، "بیت المقدس" کے "کرام الکاتبین"، "جبل المتین" اور "صراط المستقیم" بھی شامل ہیں اور ان کے ساتھ "مُزَّمِّل" اور "مُدَّثِّر" کی تخفیفِ شد بھی۔ یعنی دونوں کو بجائے مفعولن کے فعولن کے وزن پر باندھنا —— مُزَمِّل ، مُدَثِّر۔

مثلاً

۱۔ کِرَامُ الکَاتِبِین

رشید الدین وطواط ؛

آن فتوحی کامد از اعلام تو اندر وجود   عاجز است از شرحش اقلام کرام الکاتبین

عطار ؛

ملایک چاوشان آستانت   کرام الکاتبین دو پاسبانت
کجا لائق بود در قدس و پاکی   کرام الکاتبین را جرم خاکی

عبدالواسع جبلی ؛

گاہ تحریر صفات حربهای تو مداد   خون شود بر نوک اقلام کرام الکاتبین

نظیری ؛

از کرام الکاتبین منت نظیری کی کشم   ما ز دیوان عمل حرف ثواب افگنده ایم

فیضی ؛

نہ بر خال و نہ بر رخ مشک چیں ریخت   سیاهی از کرام الکاتبین ریخت

صائب ؛

در زمان رحمت سرشار عصیان سوز او   مد آهی می کشد گاهی کرام الکاتبین

سنائی :

عاجز آمد از مشیت زلت عصیان تو   دفترت در دوده می مالد کرام الکاتبین
تا توسلمانی دگرگشتی مرا در مدح تو   بوذر دیگر همی خواند کرام الکاتبین

امیر معزی :

از کمال حسن زیبد زیور کرسی و عرش   هرچه بنویسد ز اعمالت کرام الکاتبین
ای خداوندی که عالم را بعدل تو همی   تهنیت گویند هر روزی کرام الکاتبین
بارگاه ملک دولت را بدین و داد تو   تهنیت گویند هر روزی کرام الکاتبین
از تو بر کردارهای خوب تو هر ساعتی   پیش یزدان شکرها گفته کرام الکاتبین

قرآنی الفاظ یہ ہیں ،

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۸۲ : ۱۰، ۱۱

(حافظ :

تو پنداری که بدگو رفت و جان برد   حسابش با کراماً کاتبین است)

یہ مرکبِ توصیفی ہے لیکن درج بالا شکل میں مرکبِ اضافی بن گیا ہے۔ مگر بعض اوقات رواج قانون اور عُرف منہاج بن جاتا ہے۔ بقول انگریزی شاعر شیلے کے ،

شاعر دنیا کے قانون ساز ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ قلمروِ ادب میں اُولُوا الامر ہیں۔ اور بمصداق فَاِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ان کی خطا کو بھی صواب کا درجہ مل جاتا ہے۔ بقول سیبویہ ، اِنَّهٗ يَجُوْزُ فِي الشِّعْرِ مَا لَا يَجُوْزُ فِي الْكَلَامِ ——— يَجُوْزُ لِلشَّاعِرِ مَا لَا يَجُوْزُ لِغَيْرِهٖ ——— پوئیٹک لائیسنس ——— اَلشُّعَرَاءُ اُمَرَاءُ الْكَلَامِ ———

۲۔ حَبْلُ الْمَتِيْن

سنائی :

بوده چو یوسف بچه و رفته باز   تا فلک از جذبه حبل المتین
خال تو بس با کمال و فضل تو بس با جمال   روی تو نور مبین و رای تو حبل المتین
خلق را در دین و دنیا از برای مصلحت   عروة الوثقیٰ تویی امروز و هم حبل المتین

حافظ :

لبانت معجز عیسیٰ ست لیکن
حدیث طرهٔ ات حبل المتین است

خاقانی ؛
شب رو کہ دید ساختہ نور مبین چراغ   بختی کہ دید بافتہ حبل المتین زمام

فیضی :
بہ ترتیب مسعود او تاد قایم   کہ خواہم بحبل المتین بست داماں

خواجو کرمانی ؛
حلقۂ مفتول جعدت روح را حبل المتین

امیر معزی :
ای موکد در کف احباب تو حبل المتین   ای معطل در تن اعدای تو حبل الورید

اہلی شیرازی :
رشتۂ مہرش کمند جان بود بر بام عرش   ذرہ را خط شعاع مہر شد حبل المتین

صائب ؛
رشتہ ای از تار و پود جامہ ات حبل المتین

ناصر خسرو ؛
اگر لافی زنی ہم لاف دین زن   ہمیشہ دست در حبل المتین زن

فرخی :
اینجہان وآنجہان از خدمتش حاصل شود   خدمت محمود اوشاخیست از حبل المتین
برترین جای مرا پایگہ خدمت اوست   پایۂ خدمت او نیست مگر حبل المتین

امیر خسرو ؛
بہر مہار گردن بینی سرکشان   حبل المتین زمام بہ کف کفایتست

جوش ملیح آبادی ؛
خون کی گردش میں مضمر ہے جہاں ذکرِ حبیب   نبض کی جنبش میں غلطاں ہے جہاں حبلِ متین

احسن مارہروی :
ہے جماعت کی کرامت یہ مثل مشہور ہے   نام اس رشتے کا ہے اسلام میں حبل المتین

جعفر طاہر ؛
یہ وارث حبل المتین
یہ خاتم دیں کے نگیں

قرآن میں یہ ترکیب نہیں ۔ اس میں حَبْلٌ مِّنَ اللہ ۳ : ۱۱۲ ، حَبْلُ اللہ ۳ : ۱۰۳ ، حَبْلٌ مِّنَ النَّاس ۳ : ۱۱۲ ، حَبْلُ الْوَرِیْد ۵۰ : ۱۶ اور حَبْلٌ مِّنْ مَّسَد ۱۱۱ : ۵ کے الفاظ ملتے ہیں۔

ویسے ایک اعتبار سے یہ ترکیب صحیح بھی ہوسکتی ہے عبدُالمتین کی طرح۔ اَلْمَتِیْن اللہ تعالےٰ کے اسمائے حُسنٰی میں سے ایک اسم ہے۔ اس لحاظ سے اس کے معنی ہُوئے اَلْمَتِین کی رسّی ، یعنی خداوند کی رسّی۔ البتہ جبل متین کے معنی ہوں گے مضبوط رسّی (مرکّب توصیفی)

۳۔ صِرَاطُ الْمُسْتَقِیْم

حافظ :

در طریقت پیش سالک هر چه آید خیر اوست
بر صراط المستقیم ای دل کسی گمراه نیست

صائب :

موجه ای از ریگ صحرایت صراط المستقیم

سعدی :

ای که در دنیا نرفتی بر صراط المستقیم　　در قیامت بر صراطت جای تشویش است و بیم

نظیری :

رویت خیر الهدیٰ حق الیقینش کرده دل　　بر صراط المستقیمش عقل دانا ساخته

اہلی شیرازی :

راستان را راهِ عشق آمد صراط المستقیم　　پای لغز ما بود از عقل ناهموار ما

ہم نے اُس قسط میں رومی کے اس شعر سے بحث کی تھی :

بهر این مومن همی گوید ز بیم
در نماز اهد صراط المستقیم

مثنوی کے دفترِ چہارم میں ایک اور شعر نظر آیا :

اهدنا گفتی صراط المستقیم
دستِ تو بگرفت بردت تا نعیم

(شمس تبریز :

دایم ره بخاک درت اهدنا الصراط　　المستقیم من هو یهدی الی الیقین)

قرآن میں اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیمَ دو[۲] جگہ ۱ : ۶ اور ۳۷ : ۱۸ میں وارد ہوتا ہے

صراطِ مُستقیم	۲۴ جگہ
صراطًا مُستقیما	۴ جگہ
صراطی مستقیما	ایک جگہ
صِراطَ رَبِّكَ مُستقیما	ایک جگہ
صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیمَ (مَ)	ایک جگہ ۷ : ۱۶

اسمِ معرفہ کی سات قسمیں ہیں ؛

۱۔ اسمِ عَلَم
۲۔ اسمِ ضمیر
۳۔ اسمِ اشارہ
۴۔ اسمِ موصُول
۵۔ اسم جو مُنادیٰ ہو
۶۔ وہ اسم جو مُعرّف باللام ہو۔
۷۔ وہ اسم جو معرفہ کی مذکورہ قسموں میں سے کسی ایک کی طرف مُضاف ہو۔

چنانچہ آخری اصول کی رُو سے صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیمَ میں صِراط (اسمِ نکرہ) ضمیرِ مخاطب متّصلہ (کَ) کا مضاف ہونے کی وجہ سے اسمِ معرفہ بن گیا جب کہ صراط المستقیم میں ایسی کوئی شق موجود نہیں۔

۴۔ مزمّل ، مدثّر

جامی ؛

بوصفش سورہ طٰہٰ مزمل ہم دگر یٰسین بموجودات عالی ذات تلک الرسل فضّلنا

حکیم ازرقی ؛

گل در لحاف غنچہ خوش خفتہ بد سحرگہ بادِ صبا برو خواند یا ایّھا المزمل!

کمال اسمٰعیل ؛

واں گردش مزمل زریں شگفت را گوئی بر دشنی چو روان اندر روان

اھلی شیرازی ؛

چو بک زن سرایت بر پاسبان گردون در مھد چرخ خواند یا ایّھا المزمّل!

خواجہ عبد الباقی، باقی ؛

تاج است از لعمرک لولاک بر سرت یٰسین قبای تست مزمل ردای تو

(جامی نے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا ۲ : ۲۵۳ کے الرُّسُلُ کو بھی الرّسَل باندھا ہے)

اثر لکھنوی؛

خود کہا حق نے مزمل اے زہے حسنِ قبول   اللہ اللہ وہ عبادت وہ ریاضت آپ کی

پیر مہر علی؛

مجھے کیا غم ہے محشر کا مرا حامی ہے جب وہ شاہ   کہا لولاک و طٰہٰ و مزمل جس کے شان میں

جعفر طاہر؛

تو حرمتِ یٰسین و مزمل ہے بجا ہے   آدابِ رسالت سے ترا دل ہے خبردار

عزیز لکھنوی؛

داعی و مقدّر و مذکّر   اُمّی و مزمّل و مُدثّر

طوفان: اٹھا جو مدثر کا گھونگھٹ حوروں نے بلائیں لیں چٹ چٹ   بلبل کی ہوئی گل سے کھٹ پٹ شرما دیا کملی والے نے
ہر لفظ کے گھونگھٹ میں جلوہ ہے محمّد کا   تفسیر مدثر کی دیوان ہے طوفاں کا

۵۔ ہم نے لفظ اَرِنی کو آرْنی باندھنے پر پیرِ رومی و مریدِ ہندی سے مودّبانہ اختلاف کیا تھا۔ مگر اب جو دیکھا تو معلوم ہُوا کہ اُن کا ہم مسلک

تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

سنائی؛

رب ارنی بر زبان راندن چو موسٰی وقتِ شوق   پس بدل گفتن انا الاعلیٰ چو ہامان شرط نیست

قاآنی؛

بترسیدم اگر ارنی بگویم   ز دربان پاسخ آید لن ترانی

شمس تبریز؛

طیور نعرہ ارنی ہمی زنند چرا   کہ طور یافت ربیع و کلیم جان میقات

نظامی؛

موسٰی ازیں جام تہی دید دست   شیشہ بہ کہپایۂ ارنی شکست

عطار؛

رب ارنی بگوش خود خود گفت   خود بخود کرد حسرت دیدار

جمال الدین ناصر العلوی؛

بقا گویدش ہر زمان رب ارنی
فنا گویدش تا ابد لن ترانی

آشکارا (سچل سرمست) :
گاہ ارنی گہ ترانی ہر دو جاری حکم او   گاہ ہجر و گہ وصال او صدا و او ندا

خواجہ معین الدین معینی (اجمیری)؟ :
موسیٰ دل کہ بطور بدنم گفت ارنی   یعنی از جام بقا بادہ بدہ مخمورم

ویسے اسے اَرِنی بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

احمد جام ژندہ پیل :
رب ارنی چو کلیم اللہ می باتید گفت   لن ترانی باز موسیٰ وار می باید شنید
گاہ ارنی میزنم بر کوہِ طور   گاہ شکلی ہمچو موسیٰ می کنم

دارا شکوہ (سکینۃ الاولیا) :
ترا تا کوہ ہستی پیش باقی است   جواب رب ارنی لن ترانی ہست

احمد رضا خاں بریلوی :
ارنی اگر کہا تو یہی ہے سزائے دل   آہستہ پاؤں رکھنا مدینے کے راہرو!
میں نے ارنی کہا تو یوں بولا   جب تلک تو ہے لن ترانی ہے
ہر اک جانب ظہورِ نورِ روئے جانی ہے   کہاں ارنی کہاں موسیٰ کہاں کی لن ترانی ہے

ویسے شمس تبریز، عطّار اور اقبال نے اسے اَرِنی بھی باندھا ہے حافظ و غالب کی طرح

حافظ :
با تو آں عہد کہ در وادی ایمن بستیم   ہمچو موسیٰ ارنی گوی بمیقات بریم

غالب :
رفت آنکہ ما ز حسن مدارا طمع کنیم   سررشتہ در کف ارنی گوی طور بود

شمس تبریزؔ :
بگو بموسیٰ عمران کہ شد ہمہ دیدہ   کہ نعرہ ارنی خیزد از دم دیدار

عطّار :
گویم ارنی و زار گریم   ترسم ز جواب لن ترانی
ارنی گر بسے خطاب کنی   بانگ آید بر لن ترانی باز

اقبال :
قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل   التجائے اَرِنی سرخیِ افسانۂ دل

اردو کے اکثر شعرا نے اسے اَرِنی ہی باندھا ہے۔

انیس :
وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور   دیکھے تو غش کرے ارنی گوے اوجِ طُور

آتش :
منہ دکھاؤ بہت رہی تکرار   ارنی اور لن ترانی کی

فانی :
فانی ارنی نہ اپنے منہ سے نکلا   احسانِ تجلّی بھی اٹھایا نہ گیا

قربان علی سالک :
سُن کے تیری حدیثِ شیریں کو   ارنی گو کی صاف ہو تقریر
ہم زمزمہ سنجِ ارنی بن نہیں سکتے   تو بام پہ کیا جلوہ نما ہو نہیں سکتا

جلیل :
سب جنھیں سیّدِ مکّی مدنی کہتے ہیں   ان سے ہم حضرتِ موسیٰ ارنی کہتے ہیں

وحیدالدین سلیم :
گیتی پہ نظر ڈال ذرا ناز و ادا سے   آتی ارنی کی ہے صدا ارض و سما سے

حسرت عظیم آبادی :
مقتبس اس کے نور کا تھا ارنی کا نعرہ زن   بازوی زور نُور بخش تھا وہی دستِ بُت شکن

خواجہ معین الدین معینی (اجمیری)ؒ نے اَرِنی کو یُوں بھی باندھا ہے :

مسکیں دلم بہ خُوی شد   جویای آں مہ روی شد
رب ارنی گوی شد   بیچارہ موسای دلم

یعنی اَرِنی کو اری نی   ربِّ اَرِ = ربِّ اَرِی   بہ وزن مستفعلن

۶ - اُس قسط میں دفترِ اوّل میں درج رُومی کے اس شعر پہ

لی مع اللہ وقت بود آں دم مرا   لا یسع فیہ نبیٌّ مجتبی

ہم نے یہ حدیث نقل کی تھی :

لِی مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِی فِیْہِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ اَو (وَلَا) نَبِیٌّ مُرْسَلٌ۔ (ہ، یَسَعُ مَعِی)

اقبال نے بھی لی مع اللہ کی ترکیب استعمال کی ہے جس سے ہم نے اس وقت اعتنا نہیں کیا تھا

تا کجا در روز و شب باشی اسیر   رمز وقت از لی مع اللہ یاد گیر
لی مع اللہ ہر کرا در دل نشست   آں جوانمردے طلسم من شکست
گر تو خواہی من نباشم درمیاں   لی مع اللہ باز خواں از عینِ جاں

اب دیکھا تو بکثرت شاعروں کے ہاں یہ ترکیب نظر آئی۔ خصوصاً احمد جام ژندہ پیل کے ہاں تو اس کی تکرار ملتی ہے

احمد جام ژندہ پیل ؛
درحریم لی مع اللہ خیمہ می باید زدن   در رسوم کفر و دین بیزار می باید شدن
ہر کہ دریابد رموز سرّ توحید خدا   درمقام لی مع اللہ مست عاشق وار بہ
برفرق کلاہ لی مع اللہ   در ملک فقر بادشاہیم
لی مع اللہ درمیان لوح دل می باید نوشت   کنت کنزاً از لبش بسیار می باید شنید
نکتہ ازد ہو معکم خواندہ ایم   لی مع اللہ آشکارا دیدہ ایم
ز جام لی مع اللہ جرعہ خوردیم   ز سرمستی رہ دیگر گرفتیم

شمس تبریز ؛
فرشتہ گرچہ دارد قرب درگاہ   نگنجد درمقام لی مع اللہ

امیر خسرو ؛
اے خاصۂ قرب لی مع اللہ   سرخیل مقربان درگاہ

قاآنی ؛
ہمنشین لی مع اللہ معنی نون و القلم   رہسپار لیلۃ الاسریٰ سوی پروردگار

نظیری ؛
اتصال لی مع اللہ کردہ حاصل در نماز   ماسوی اللہ را ز استغراق افنا ساختہ

خواجہ معین الدین معینی (اجمیری)؛
درمقام لی مع اللہ از کمال اتصال   از خدا نبود جدا ہمچو شعاع از آفتاب

گرامی ؛
تاج رمز لی مع اللہ بر سرش   خرقۂ الفقر فخری در برش

جمالی دہلوی ؛
ز قدر او قبای لی مع اللہ   بہ شمشاد بلندش بود کوتاہ

اوحد الدین کرمانی ؛
بردہ مقام لی مع اللہ   از مجمر سینہ نکہت آہ

صفی علی شاہ ؛
تا دل نشود بریدہ از دلخواہت   نبود بحریم لی مع اللہ راہت
[illegible]

خوشی محمد ناظر:

چپکے چپکے کان میں یہ کہہ رہا ہے دل کہ ہم   لی مع اللہ ہر نفس ہر دم خدا کے ساتھ ہیں

احمد رضا خاں بریلوی:

نبی سرورِ ہر رسول و ولی ہے   نبی رازدارِ مَعَ اللّٰہ لی ہے

یہاں لی مع اللہ کو مَعَ اللّٰہ لی کر دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ کچھ اور جملے بھی بہت سے شاعروں میں مشترک نظر آتے ہیں

۷۔ لِمَنِ الْمُلْکُ وَاحِدِ الْقَہّار

عطار:

پس بخود گوی و بخود شنوی   لمن الملک واحد القہّار
ہزار زلزلہ در جوہر جہان/زمین افتد   ز نعرہ لمن الملک واحد القہّار

سنائی:

تا ز خود بشنود نہ از من و تو   لمن الملک واحد القہّار

فیض کاشانی:

بسوخت غیر سراسر در آتش غیرت   منادی لمن الملک واحد القہّار
لمن الملک واحد القہّار   زین ندای تو می شنویم ھلاک

بیخود موہانی:

یکے بہ ہمہمۂ قہر واحد القہّار   یکے بہ زمزمۂ دلربای انت غفور

قرآن میں ہے:

لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ ؕ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّارِ ۴۰ : ۱۶

موجودہ شکل میں اس کے کوئی معنی نہیں بنتے اور الفاظ مفہوم کا ساتھ دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اَلْوَاحِدِ کو ہر جگہ واحد باندھا گیا ہے۔

جامی نے اسے یوں باندھا ہے:

ہم مقربا تو گفتہ ہم حامد   لمن الملک لِلّٰہ الواحد

اَلْیَوْمَ اور اَلْقَہَّار ساقط ہیں لیکن مصرع بامعنی ہے اور قرآنی الفاظ میں ہے۔

سید انشا کہتے ہیں:

تھے ریاضی میں جو ماہر حکمائے یونان   سب بجاتے تھے وہ نقارۂ اَلْمُلْکُ لِمَنْ؟

الفاظ کا تفاوت ظاہر ہے۔

۸۔ یَفعَلُ اللہ مـا یشـا

سنائی:

این یکی گوید بفرمان کاستجیبوا للرسول   واندگر خواند ز ایمان یفعل اللہ مایشاء
این کمر ز ایاک نعبد لبست در فرمان شرع   واندگر تاجی نہاد از یفعل اللہ مایشاء

ابن یمین:

فلا تفرح ولا تحزن بحال   بأن الحال لیس لہ بقاءُ
لئن ترضی وان تسخط سواءٌ   بانّ اللہ یفعلُ ما یشاءُ

امیر معزی:

تا دلیل تولست وتا نشان قدر تست   یَفعل اللہ مایشاء یحکم اللہ ما یرید

شمس تبریز:

یا این دل خونخوارہ را لطف ومراعاتی بکن   یا قوّتِ صبرش بدہ در یفعل اللہ ما یشا
کی برکشایی گوش را؟ کو گوش مرد ہوش را؟   مخلص نباشد ہوش را جز یفعل اللہ ما یشا
زین رنگہا مفرد شود در خنب عیسی در رود   در صبغۃ اللہ رو نہد تا یفعل اللہ ما یشا
در مجلس ما سرخوش آ برقع ز چہرہ برکشا   زان سان کہ اول آمدی ای یفعل اللہ ما یشا
ای معاف یفعل اللہ ما یشا   بی محابا رو زبان را برکشا
آن چہ باشد کو کند کان نیست خوش   قد رضینا یفعل اللہ ما یشا
اوست مر ہر بادشہ را بادشا   حکم او را یفعل اللہ ما یشا
گوش بی گوشی درین دم برکشا   بہر راز یفعل اللہ ما یشا

رومی:

اسمٰعیل میرٹھی: لگاؤں شیأً للہ کی صدا کیوں   بھلا دوں یفعل اللہ ما یشا کیا

قرآن میں ہے:

وَیَفْعَلُ اللہُ مَا یَشَاءُ   ۱۴ : ۲۷
اِنَّ اللہَ یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ   ۳ : ۱۸

سب شعرا نے اَللہُ کو اَللہْ ساکن باندھا ہے حالانکہ آیت کے دوران میں متحرک کو ساکن نہیں کیا جاسکتا۔ اور یشاءُ کو یشا (یشاء) باندھا ہے جو البتہ ایک حد تک جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

ابنِ یمین نے اِنَّ کو بہ اِزادِ ب بِاَنَّ باندھا ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی کے پہلے مصرع میں شَیْئاً لِلّٰہ درج ہے لیکن تقطیع میں شَیْئاً لِلّٰہ آتا ہے۔ باقی وہی اللّٰہ کا ہ ساکن اور یشاء کا ء ساقط۔

شمس تبریزی کا شعر ہے :

گفتم کہ ز آتشہای دل   برروی مفرشہای دل
می غلط در سودای دل   تا بحر یفعل ما یشا

قرآنی الفاظ ہیں :

كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ   ۳ : ۴۰
اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ   ۲۲ : ۱۸

یَفْعَلُ کو یَفْعَلْ باندھا گیا ہے۔

۹۔ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَه

امیر خسرو :

تنِ پاکت کہ زیرِ پیرہن است   وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ چہ تن است
او ہمی رفت و خلق در عقبش   وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ می گفت

بیکجز لاہور کے ایڈیشن میں لَہٗ چھپا ہے حالانکہ یہ دیدہ زیب نسخہ خاص اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ وزن میں لَہْ آتا ہے۔ قاری اسے ظاہر ہے لَہٗ پڑھے گا تو وزن کا کیا بنے گا!

شاہ نعمت اللّٰہ دہلوی :

وحدہ لا شریک لہ گفتم   غیر او نیست شاہد و مشہود
وحدہ لا شریک لہ گفتم   کردم اقرار، کی کنم انکار
وحدہ لا شریک لہ گوئیم   مومن و صادق و مسلمانیم

جامی :

روی خود را کہ او شریک مہ است   در نکوئی کہ لا شریک لہ است

سنائی :

کفر و دین ھر دو در رھت پویان   وحدہ لا شریک لہ گویان

گلزار اردکانی :

ھمہ اشیا بہ وحدتت پویان   وحدہ لا شریک لہ گویان
ہر گیاہے کہ از زمین روید   وحدہ لا شریک لہ گوید ؟

فیضی (انشاے ابوالفضل؟) :

کفر و اسلام در رہش پویان   وحدہ لاشریک لہ گویان

عطا ٹھٹھوی :

بخدای یگانۂ واحد   وحدہ لاشریک لہ سبحان

حسرت عظیم آبادی :

جس طرف ہم نے بھر نگہ دیکھا   وحدہ لاشریک لہ دیکھا

قرآن میں لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۶ : ۱۶۳ ہے۔
سب جگہ لَہٗ کو لَہٗ باندھا گیا ہے اور وَحْدَہٗ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

فیضی (ابوالفضل؟) کا شعر ہے :

اے نام تو ز زد کرستو   سبحانک لاشریک یاھُو

ناصر خسرو بھی کہتا ہے :

نومید مشو ز رحمتِ یزدان   سبحانک لا الٰہ اِلّا ھُو

سُبْحَانَكَ ضمیر مخاطب کے بعد دونوں جگہ ھُو استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ قواعد کی رُو سے یا سُبْحَانَہٗ ہونا چاہیے تھا یا ھُو کی جگہ اَنْتَ۔ 'یاھُو' کا جواز تو کسی حد تک نکل سکتا ہے مگر 'اِلّاھُو' کا مشکل ہے۔

میر تقی میر :

جس کو کہتے ہیں لاشریکَ لہ

یہاں بھی لَہٗ کو لَہٗ باندھا گیا ہے۔ مخمّس کے دوسرے ہم قافیہ مصرعوں کے مطابق :

اعرج و اعمیٰ و ابرص و اکمہ   سن کے کبک دری ہنسے قہقہہ

دیکھتے ہیں ادھر ہی مہر و مہ

۱۰۔ کُلُّ شَیْءٍ ھالك اِلّا وَجْهُهٗ

نظیری :

ھر چہ از بحر و بر ھستی بروں آوردہ سر   خرج وجہ کل شیٍٔ ھالک الّا ساختہ

قاآنی :

در حقیقت ماسوی نبود اندر ماسوٰی   کلّ شیٍٔ ھالک الّا وجہہ پیداستی

عطار :

کل شی ھالك الّا وجھہ   سلطنت بنمود و برخوردار شد

رُومی:
می نماند در جهان یک تار مو — کل شی هالک الّا وجهه

شاہ نعمت اللہ:
کل شی هالک الّا وجهه — خوش بخوان نصّ کلام لایزال

محسن کاکوروی:
رفت سوئے عرشِ اعلیٰ رُوحِ اُو — کل شیٔ هالك الّا وجههٗ

احمد رضا خاں:
کل شی هالك الّا وجهه اے آنکہ خلق — در تو مستهلک تُو در ذاتِ خدا، امداد کُن

قرآن میں ہے:
كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ط ۲۸ : ۸۸

ط وقف مطلق کی علامت ہے اور اس پر ٹھہرنا چاہیے۔ یعنی آخری ہ کو ساکن پڑھنا چاہیے۔ سب جگہ هَالِكٌ کو هَالِكْ باندھا گیا ہے اور وَجْهَهٗ کو وَجْهُهْ۔ رُومی کے تین شعروں سے جن میں یہ آیت واقع ہوئی ہے، ہم نے اعتنا کیا تھا۔ اس کے بعد چند اور نظر سے گزرے۔

ہر کہ اندر وجهه ما باشد فنا — کل شی هالك نبود جزا
وز ملک ہم بایدم جستن ز جو — کل شی هالك الّا وجههٗ
وقت رحلت آمد و جستن ز جو — کل شی هالك الّا وجهه
خصم بر شیر آمد و ہر رو بہ او — کل شی هالك الّا وجهه

پہلے شعر میں هَالِكٌ پورا باندھا گیا ہے مگر وَجْهَهٗ صرف وجْه۔

۱۱۔ اَنْبَتَهُ اللّٰهُ نَبَاتًا حَسَنًا۔

سلمان ساوجی:
روح امینش ز سر سدرہ گفت — انبته الله نباتاً حسن

حسن سنجر:
انبت اللّٰہ نباتاً حسنا گفت و گزشت — خضر آنگہ کہ بگرد شکرت سبزہ دہد

غالب:
کلکم از تازگی مدح تو در بارۂ خویش — شارح انبتہ اللّٰہ نباتا حسن است

ذوق: جوشِ روئیدگی سبزہ پہ یاد آئی ہے — آیت انبتهُ الله نباتاً حسنا

محسن کاکوروی :

جملہ انبتہ اللہ نباتاً حسنا ان دونوں فصلِ بہاراں میں ہے طغرائے چمن

نظیر اکبرآبادی :

دیکھ سبزوں کی طراوٹ کو زمیں کہتی ہے پڑھتی ہے دم بدم انبتہ اللہ نباتاً حسنا

آیت یہ ہے :

وَ اَنْبَتَهَا نَبَاتاً حَسَنًا ۳ : ۳۷

حسن سنجر کو چھوڑ کر سب شاعروں نے اَنْبَتَهَا کو اَنْبَتَهٗ باندھا ہے اور بیچ میں اللہ ڈال دیا ہے۔ نبات مؤنث ہے لیکن اس کے ضمیر ھا کو ھو مذکر سے بدل دیا۔ حسن سنجر نے اَنْبَتَ باندھا ہے۔

۱۲ - نُوٓن والقلم

حافظ :

چو من ماہی کلک آرم بہ تحریر تو از نون والقلم می پرس تفسیر

خاقانی :

در صف سجدہ از قد و پیشانی ملوک نون والقلم رقم زدہ بر آستانِ اوست
پشت خم، راست دل بخدمت او ھمچو نون والقلم ھمہ کمر است
ماہ سر انگشت خلق این چون قلم آن چو نُون خلق چو طفلان نوشاد بنون والقلم

قاآنی :

ھمنشین لی مع اللہ معنی نُون والقلم رھسپار لیلۃ الاسرٰی سوی پروردگار

شمس تبریز :

چو تو نونی در رکوع چون قلم اندر سجود پس تو چون نون والقلم پیوند با مایسطرون

رُومی :

تا مشرف گردی از نون والقلم تا بکارد در تو تخم آن ذوالکرم

امیر خسرو :

آنکہ ز پے گزشتن نہ دریا نون والقلم آن کشتی لاصوت نگر
گیسو و رو نورد دخانش بہم ابروی او با مژہ نون والقلم

جامی :

ابرو و قد خوشست صورت نون والقلم نقش خط دلکشست معنی مایسطرون

نظیری:
آیۂ نون والقلم را دیدہ از انوار خویش   سر باطن را بلفظ ظاہر املا ساختہ

خواجو کرمانی:
دلم بہ غمزہ و ابروی او بہ مکتب عشق   امیدوار چو طفلان بہ نون والقلم است

عطار:
قوس قدرت را توی زہ لاجرم   گشت نازل زین سبب نون والقلم

حسن ؟:
نون والقلم از فضلِ خداوند تعالیٰ   معلوم نمودہ بہ ہمہ خوی محمّد

قرآن میں ہے:
نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۶۸ : ۱

نُوْن وَالْقَلَمِ زیادہ سے زیادہ مْ کو ساکن کرکے فاعلن فعَل کے وزن پر باندھا جاسکتا ہے حالانکہ وہ بھی نص میں دخل اندازی ہوگی۔ مگر خواجو کرمانی کے علاوہ جس نے ایسے ہی باندھا ہے باقی شاعروں نے نون وقلم = نُوں وَالْقَلَمْ = یعنی مستفعلن کے وزن پر باندھا ہے۔

۱۲- قرآن میں ہے، سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ ۱۵ : ۸۷
حدیث میں سورۃ الفاتحہ کی فضیلت میں آتا ہے: هِیَ اُمُّ الْقُرْاٰن وَهِیَ فَاتِحَةُ الْكِتَابِ وَ هِیَ السَّبْعُ الْمَثَانی۔ لیکن شعرا نے اسے یا تو سبعُ المثانی استعمال کیا ہے یا سبع مثانی۔

شمس تبریز:
در رکعات نماز هست خیال تو شہ   واجب و لازم چنانک سبع مثانی مرا
چراغ پنج حست را بنور دل بفروزان   حواس پنج نماز است و دل چو سبع مثانی

نظیری:
سبع المثانی آن ولد ثانیم نماند   ام الولد برفت کہ ام الکتاب شد
دو بار سبعۂ الوان کشیدہ در هر روز   چو نزل سبع مثانی ز خوان سبع شداد

خواجو کرمانی:
مرا از شاعری و شعر ننگ است   بحق و حرمت سبع المثانی

قاآنی:
مدح تو بود حرز تنم زانکہ درو هست   از فضل خدا خاصیت سبع مثانی

خاقانی:
کلامش تالی عقد اللآلی   بیانش ثانی سبع المثانی

سنائی ؛

زسبعِ سماوات تا بر نیری   ندانی تو تفسیر سبع الثانی

امیر معزّی ؛

هر آن سرود که در عشق عاشقانه بجاست   مرا چو سبع مثانی و چون تمیا تست

رشید الدین وطواط ؛

علیک لدی الوری ماعشت اثنی   نعم وبحرمة سبع المثانی

وحشی بافقی ؛

بود خوبتر وصف صوف مرقّع   به گوش خروشان ز سبع المثانی

۱۴ ۔ "وھو معکم" کی ترکیب بھی مرغوبِ شُعرا معلوم ہوتی ہے خصوصاً احمد جام ژندہ پیل کے ہاں تو بکثرت نظر آتی ہے۔

احمد جام ژندہ پیل ؛

از رموز وھو معکم بالیقیں   حق بدان وحق بین ارض وسما
طیلسان وھو معکم را بسر باید کشید   نحن اقرب از لب دیدار می باید شنید
حدیث وھو معکم گوش جان   رموز نحن اقرب بر تو ایماست
من زجام وھو معکم مست وبیهوش آمدم   وز رموز نحن اقرب سرِ پنهان یافتم
من شراب وھو معکم خورده ام   مست وبیهوشم ازان در هر زمان
از جوب وھو معکم بالیقیں   مرغِ دل را هر زمانی دانه کن
در سرای وھو معکم گوشه می باید گزید   در فضای کن فکان اظهار می باید شدن
ز سرِ هو معکم راز گفتم   رموز نحن اقرب باز گفتم
رموز وھو معکم گفت بر ما   چو دریا شد نهان آنگاه دریا

سب جگہ وَھُوَ مَعَکُمْ کو وَھُوَ مَعْکُمْ باندھا گیا ہے۔

قرآن میں ہے، وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ ۵۷ : ۴

احمد جام ہی کے دو شعر اور ہیں ؛

هو معکم رمز حق است بالیقیں   رمز حق را هم بمعنی پایدار

بالیقین غالباً الیقین ہوگا کیونکہ بِلْ سے مصرع ساقط الوزن ہو جاتا ہے ھُوَ مَعَکُمْ کو ھُوْ معاکُم بروزن فاعلاتن باندھا گیا ہے۔

نکتہ از وھو معکم خواندہ ایم　　لی مع اللہ آشکارا دیدہ ایم

وَھُوَ مَعَکُمْ کو وَھُوَ معاکُم باندھا گیا ہے۔

شمس تبریز :

آنکہ کہ تو می جوئی ھم در طلب او را جو　　وھو معکم یعنی با تست درین جستن

وَھُوَ مَعَکُمْ یعنی کو وَھُوَمَ عَکُمْ یعنی بروزن مفعول مفاعیلن باندھا گیا ہے۔

عطار :

ثم وجہ اللہ آیدت بہ نظر　　وھو معکم نمایدت دیدار

یہاں بھی وَھُوَ مَعَکُمْ ہے۔ پہلے مصرع کا مخرج یہ آیت ہے، فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللہ ۲ : ۱۱۵

سچل سرمست :

وھو معکم اینما کنتم بشنو　　از خیال ما و من خود شو بدر
ھو معکم زین حقیقت حق چہ خواست　　یعنی واجب را ز ممکن جلوہ ہاست

یہاں بھی وَھُوَ مَعَکُمْ کو وَھُوَ مَعْ کُمْ اور ھُوَ مَعَاکُمْ باندھا گیا ہے۔

—— اب ہم فرداً فرداً شاعروں سے بحث کرتے ہیں :

سنائی

(۱) جوھرش چون ز اضطرار عقل و نفس اندر گزشت　　گفت در گوشش کہ الرحمٰنُ علی العرشِ استوا

[خاقانی :

پس آسمان بگوش خرد گفت تنک مکن　　کان قدر مصطفیٰ است علی العرش استویٰ

عطار :

چون بر کشید آینۂ کل کائنات　　عرش آفرید ثمَّ علی العرش استوا

شمس تبریز :

گر درد و فریادی بود در عاقبت دادی بود　　من فضل رب محسن عدل علی العرش استوی

میر تقی میر :

اے مرتفع نشین علی العرش استویٰ　　ذی عز ماسوای خدا، خویش مصطفیٰ]

قرآن : اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ۲۰ : ۵

پہلے شعر میں اَلرَّحْمٰنُ کو اَلرَّحْمَاں (بنون غُنّہ) باندھا گیا ہے حالانکہ نِ ملفوظ کے اوپر بالالتزام پیش ڈالا گیا ہے۔

رومی؛ تخت دل معمور شد پاک از ھوا   بروی الرحمٰن علی العرش استوی

یہاں بھی الرحمٰن نون غُنّہ کے ساتھ آیا ہے۔

قرآن میں شِ اسْتَوٰی ہے بروزنِ فاعلن مگر تینوں اشعار میں شِ اِسْتَوٰی باندھا گیا ہے تحریکِ ا کے ساتھ بروزنِ مفاعلن (لُ فاعلن)۔ عطّار نے ثم علی العرش استوا باندھا ہے حالانکہ قرآن کے الفاظ ہیں؛

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ   ۷ : ۵۴   ۲۵ : ۵۹
۱۰ : ۳   ۳۲ : ۴
۱۳ : ۲   ۵۷ : ۴

(۲) خستہ دل من در حزن گفتی مرا لا تَعْجَلَن   چوں گفتی با دیدہ من اِنّا صَببنا الماء صبّ

قرآن : اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۸۰ : ۲۵

صَبًّا کو صَبّ باندھا گیا ہے اور اَنّا کی بجائے اِنّا ہے جو مرتّب و ناشر دونوں کی بے پروائی پر دال ہے۔

(۳) نرم دار آواز بر انساں چو انساں زانکہ حق   اَنکرالاَصوات خواند اندر نُبی صَوت الحمیر

قرآن : اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۳۱ : ۱۹

نُبی = نبی = نوی = نپی = نوشتہ، نامہ، قرآن مجید، مُصحف

معلوم نہیں اس لفظ کا مادۂ اشتقاق کیا ہے؟

لَصَوْتُ کو صَوْت باندھا گیا ہے۔ اَنْكَرَ الْاَصْوات اِنّ حرفِ عاملہ کے بغیر تو اَنْكَرُ الْاَصْوات پڑھا جائے گا۔ یعنی رَ کی بجائے رُ۔

(۴) چونت عمرو زید باشد کارساز نیک و بد   در نُبی پس کیست نعم المولیٰ و نعم النصیر

قرآن : نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ۸ : ۴۰

لیٰ وَ کو د کی زبر کو حذف کر کے لَىٔوَ = علا کے وزن پر باندھا گیا ہے۔

(۵) اِن لم یکن طودٌ فسل ان لم تکن وَبلٌ فطَل   اِن لَم یکن خمرٌ فخلٌ اِن لم یکن شہدٌ فسَم

[شمس تبریز؛

یا من ھُوَ سیدی و اعلا و اجل   یا من انا عبدہ و ادنیٰ و اقل
حاشاك تملنی و یوشیك تمل   ان لم یکن الوابل با لوصل فطل]

قرآن : فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۲ : ۲۶۵

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔ طباعت میں فخل ہے جو وزن سے خارج ہے۔ لامِ مُنْتَوْنَ مجزوم ہونا چاہیے تھا۔

(۶) ہرگز از بارِ حسد خستہ نہ گردد پشت ما
کز قُلِ اللہ ثُمَّ ذَرْهُمْ مومیائی یافتیم
باشِ حق را و سوای حق گزار
ہاں قل اللہ ثم ذرھم یاد دار

(فیض کاشانی:
زحق چہ بہرہ برد آنکہ روش باغیر است
خدا قل اللہ و ذرھم بہ بندہ فرمودہ)

قرآن: قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ۶: ۹۱

اَللّٰہُ کو اَللّٰہْ بہ اسکان ہ باندھا گیا ہے۔

فیض کاشانی کے شعر میں ثُمَّ کی جگہ و ہے۔ اور اللّٰہُ کی ہ ساکن اگر ساکن نہیں تو پھر وزن [illegible] اس کے باوجود اسے فرمودۂ خدا کہا ہے۔

(۷) ازیں پس کہ ہمہ نَحنُ غالبُون گفتند
فگند در دل شان کُلُّ مَن عَلَیہا فان
لاف نَحنُ الغالبُون بسیار کس گفتند لیک
غالبونشان گشت آمنّا چون ثُعبان شد عصا

قرآن: اِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُوْنَ ۲۶: ۴۴

پہلے شعر میں اَلْغالِبُوْنَ کو غالبون اور دوسرے میں الغالبون باندھا گیا ہے لَنَحْنُ دونوں میں نَحْنُ ہے۔

(۸) ھر چہ از بیشی و بیشی ہست در اطراف ما
ما بر آن از دل صلای مَن عَلَیہا فان کنیم

[سلمان ساوجی:
براندہ چرخ و باے کردہ پیدا
ز کل من علیہا فانِ و یبقیٰ

نظیری:
ہر چہ ہتی بود با اصل و ولد در باختم
من علیہا فان رقم کردند بر دیوان من]

قرآن: کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ۵۵: ۲۶، ۲۷

تینوں شعروں میں فانٍ کو فان باندھا گیا ہے۔

سلمان ساوجی نے وَّ کو بہ تخفیف باندھا ہے۔

(۹) ایں کنوں کمر ز الحکم للہ نقش دارد بر نگین
واندگر ز ایّاک نعبد حلقہ دارد بر کمر
بامداد ایّاک نعبد گفتہ ای در فرض حق
چاشت گہ خود را مکن در خدمت دونی حقیر
ایں کمر ز ایّاک نعبد بست در فرمان شرع
واندگر تاجی نہاد از یفعل اللہ ما یشاء

قرآن: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۱: ۴

تینوں شعروں میں نَعْبُدُ کو نَعْبُدْ باندھا گیا ہے حالانکہ دوسرے شعر میں د کے اوپر پیش بھی ڈالی گئی ہے

اس سے سخن فہمیِ عالم بالا معلوم ہوتی ہے۔

[شمس تبریز :

ایاک نعبد است زمستان دعای باغ   در نو بہار گوید ایاک نستعین
در طرہاش نسخۂ ایاک نعبد است   در چشمہاش غمزۂ ایاک نستعین

استاد جمال الدین :

کورا دریں سفر ہمہ تعویذ بدرقہ   ایاک نعبد آمد و ایاک نستعین]

ان تینوں شعروں میں بھی نَعْبُدُ کو نَعْبُدْ ہی باندھا گیا ہے۔

[امیر خسرو :

نعبد ایاک طرا ز علم   فاخلع نعلیک مقام قدم
وصف شرف تو بیش از ادراک آمد   سبق ادبت نعبد و ایاک آمد

عطا ٹھٹھوی :

یا رب کریم ایزد پاک   ای نعبد نستعین ایاک]

یہاں دونوں شاعروں نے ترتیب الفاظ ہی بالکل بدل دی ہے۔

(۱۰) چون الم نشرح شنیدی ربّ یسّرلی بگوی   چون ز جنت در گذشتی وصف ملک چین مکن

قرآن : رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَ یَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِی ۲۰ : ۲۵، ۲۶

یَسِّرْلِیْ سے پہلے رَبِّ نہیں بلکہ وَ ہے۔

(۱۱) امر امر تست یا رب با پیمبر در نبی   گفتہ ان اَبْرَموا امرا فانّا مُبرمون

قرآن : اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ۴۳ : ۷۹

شعر میں اَمْ کی بجائے اِنْ ہے حالانکہ اَمْ بآسانی آسکتا تھا اور مُبْرِمُوْن کی ر پر زیر کی جگہ زبر ہے۔

(۱۲) زبعد آنکہ چون سیمین سپر گردد در افزودن   کہ کاہد ماہ را ہر ماہ حتی عادَ کالعُرجُون
اے شدہ ماہ تمام از غایت حُسن و جمال   چاکر از ھجران رویت عادَ کالعُرجُون شود

قرآن : وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْم ۳۶ : ۳۹

کَالْعُرْجُوْنِ کے نِ کو ساکن اور غنّہ باندھا گیا ہے۔

دوسرے شعر میں عادَ اور شود ہم معنی ہیں اس لیے "شود" محض حشو ہے۔

(۱۳) الخبیثات للخبیثین گفت ایزد در نُبی   تا بپرھیزند اھل طیّبات طیّبین
(از خبیثات و خبیثین تو بہ پرھیزی ھمی   روی را بر طیّبات و طیّبین باید نھاد)

قرآن : اَلْخَبِیْثَاتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ ۲۴ : ۲۶

پہلے مصرع میں للخبیثین کو صرف خبیثیں پڑھنا پڑے گا تاکہ مصرع وزن سے خارج نہ ہو۔ معلوم نہیں مرتب نے لِل کا اضافہ کس لیے کیا ہے ضروری نہیں کہ ذوقِ سلیم بھی علم کا ہم سفر ہو۔

(۱۴) برزین ناکسان و دیگران گبیر   کثیرُ الناسِ ارضِ اللّٰہِ واسع

قرآن : اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ ۴ : ۹۷
وَاَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ ۳۹ : ۱۰

شاعر نے وَاسِعَۃٌ کو وَاسِعْ باندھا ہے اور یُوں ارض مونّث کو مذکر بنا دیا ہے۔

[رومی : گر زوید خوشہ از روضات ھو   پس چہ واسع باشد ارض اللّٰہ بگو
شمس تبریز : وارض اللہ واسعۃٌ فسبح   الی رب رءوف بالوفود]

پہلے مصرع کی تقطیع یُوں ہوگی : مفاعیلن مفاعلتن فعولن ۔ عیلن کی جگہ علتن اس بحر میں عربی میں عام ہے گو اردو میں نہیں۔ مثلاً

اَلاهُبّی بِصَحْنِكِ فَاصْبَحِیْنَا   وَلَا تُبْقِی خُمُوْرَ الْاَنْدَرِیْنَا
وَكَاْسٍ قَدْ شَرِبْتُ بِبَعْلَبَكٍّ   وَاُخْرٰی فِیْ دِمَشْقَ وَقَاصِرِیْنَا
اَلَا لَا یَجْهَلَنْ اَحَدٌ عَلَیْنَا   فَنَجْهَلَ فَوْقَ جَهْلِ الْجَاهِلِیْنَا
تَمَتَّعْ مِنْ شَمِیْمِ عَرَارِ نَجْدٍ   فَمَا بَعْدَ الْعَشِیَّةِ مِنْ عَرَارِ

(۱۵) درشب میلاد او دایۂ دولت چہ گفت   آمد بانگ خروس اذھب عنا الحزن

قرآن : ۔۔۔ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۳۵ : ۳۴

[ابنِ یمین : آنکہ تابخت بہ درگاہ ویم راہ نمود   وردم الحمد لمن اذھب الحزن است]

ابنِ یمین نے عَنّا کو حذف کر دیا۔

(۱۶) ہر کہ لاخوفٌ علیہم گوید اندر گوش تو   ھم تو اندگفت در گورت وھم لایحزنون

قرآن : فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۴۶ : ۱۳

فَلَا کو لا اور وَلَاهُمْ کو وَهُمْ لا باندھا گیا ہے۔

(۱۷) شونجوان التائبون العابدون الحامدون   السابحُون الراکعون الساجدون الآمرون

قرآن : اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۹ : ۱۱۲

دوسرے مصرع میں اَلسَّابِحُوْن کو سَابِحُوْن پڑھنا پڑے گا مصرع کی صحت کے لیے۔ ئِحُو کو بِحُو چھاپا گیا ہے۔ بالمعروف محذوف ہے۔

شمس تبریز : کی شنود این بانگ را بی گوش ظاہر دم بدم   تایبون العابدون الحامدون السائحون

التائبون کو صرف تایبون باندھا گیا ہے ال تعریف کے بغیر۔

(۱۸) دست در فتراک صاحب شرع زن کا یزدھی   گوید او را بھر امرش یفعلوا ما یؤمرون

قرآن : وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۱۶ : ۵۰

۶۶ : ۶

يَفْعَلُوْنَ کو يَفْعَلُوْا باندھا گیا ہے۔

(۱۹) اے منزّہ ذات تو عما یقول الظالمون   گفت علمت جملہ را مالم تکونوا تعلمون

قرآن : اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ ۱۷ : ۴۷

عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۲ : ۲۳۹

اِذْ کو عَمّا بنا دیا ہے اور تَعْلَمُوْنَ کو تَعْمَلُوْن۔ یہ تصرّف بداھتًا مرتّب و ناشر کا ہے یہ سلوک قرآن سے ایک اسلامی ملک میں ہو رہا ہے

چو کفر از کعبہ برخیزد . . . . . .

(۲۰) ای گلی کز گلبنت عالم ہمہ گلزار شد   وز گلت بوی تبارک ربّنا الاعلیٰ زند

[سلمان ساوجی :

بھر کاری کہ خواہی کرد اول بر زبان آور   مبارک نام یزدان را تبارک ربّنا الاعلیٰ

عُبَید زاکانی :

مسبّحان فلک در سجود گاہ افول   زبان کشادہ بہ تسبیح ربُّنا الاعلیٰ

قرآن : تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۷ : ۵۴

۴۰ : ۶۴

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ۵۵ : ۷۸

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى ۸۷ : ۱

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۷۹ : ۲۴

قرآن میں رَبُّنَا الْاَعْلٰى کے الفاظ نہیں۔ نماز میں بحالتِ سجود البتّہ یہ پڑھتے ہیں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى۔

(۲۱) گوش حس باطنم کر باد اگر نشنودہ ام   بانداے اِرْجِعِيْ كُلٌّ اِلَيْنَا يَرْجِعُوْن

قرآن : اِرْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۸۹ : ۲۸

يَرْجِعُوْن سے پہلے كُلٌّ اِلَيْنَا کے الفاظ کسی آیت میں نہیں كُلٌّ اِلَيْنَا رَاجِعُوْن ۲۱ : ۹۳ البتّہ ہے

(۲۲) بامدیحش مداٸح مطلق   زهق الباطل است وجاءالحق

قرآن : وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۱۷ : ۸۱

نص میں جا سے پہلے و نہیں ہے۔

[فیض احمد فیض :   قَدْ جاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ البـا طـل

پہلے تو قُلْ کو قَدْ سے بدل دیا ہے۔ پھر اَلْحَقُّ کو اَلْحَقْ پڑھنا پڑے گا مصرع کو وزن میں رکھنے کے لیے۔ حذفِ وَ کے ساتھ۔ بصورتِ دیگر : قودا بروزنِ فعلن۔

(۲۳) بدست رد و قبول تو چون بدست کریم   عزیز و خوارم چون سیم قل هو اللٰهی

قُلْ هُوَ اللّٰهُ کے اللّٰهُ کو اللّٰهی باندھا گیا ہے بعینہٖ جیسے

تو از ملک ماه تا بماہی   نامزدِ شد خلیفۃ اللٰهی   میں۔

(۲۴) اندرین عالم غریبی زان همی گردی ملول   تا ارحنا یا بلالت گفت باید بر ملا

[رُومی :   آفتابی رفت در کازۂ هلال   در تقاضا کہ اَرِحنا یا بلال!

جان کمالست و ندای او کمال   مصطفٰی گویان ارحنا یا بلال!

زاختلاط خلق یابد اعتدال   آن سفر جوید کارحنا یا بلال!]

حدیث کے الفاظ ہیں : اَرِحْنا بِها یا بِلالُ

(اذان دے کر، نماز کے ذریعے ہم کو راحت و آرام دے)

(۲۵) آدمی چون برداشت دست از حیات   هرچه خواهی بکن کہ فاصنع شیت

حدیث : اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ

شِئْتَ کو شِیْت باندھا گیا ہے اور ماقبل کا ما غایب ہے۔

حافظ

(۱) چشم حافظ زیر بام قصر آن حوری سرشت   شیوۂ جنات تجری تحتها الانهار داشت

قرآن میں ہے :

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۲ : ۲۵   ۳ : ۱۵

اور مزید ۳۴ جگہ

اور ہر جگہ تَجْرِیْ کے بعد مِنْ آیا ہے۔ جنّٰتٍ کو جنّات فکّ تنوین کے ساتھ باندھا گیا ہے۔

نامی پریس کانپور کے نسخے میں حورِ سرشت ہے۔ ایک نسخے میں حوریں سرشت ہے۔ تہران کے مطبوعہ نسخوں میں کسی میں حوری سرشت اور کسی میں حوراسرشت ہے۔

[رومی : روبرسلطان و کاروبار بین   حس تجری تحتها الانہّار بین (ھ پرشَد ؟)
اصل وسرچشمہ خوشی آنست آں   زود تجری تحتها الانہّار خوان (")

شمس تبریز :
تن چو سایہ بر زمین وجان پاک عاشقان   در بہشت عشق تجری تحتها الانہار ست

ولی دکنی :
چہرۂ گلرنگ و زلف موج زن خوبی منتیں   آیت جنّات تجری تحتها الانہار ہے]

ان شعروں میں بھی تجری کے بعد کا مِنْ غایب ہے۔ آخری شعر میں جنّاتٍ تنوین کے بغیر صرف جنّات باندھا گیا ہے شعر حافظ کی طرح۔

(۲) ومن یتق اللہ یجعل لہ   ویرزقہ من حیث لا یحسب

یہ شعر دیوانِ ابنِ یمین میں بھی پایا جاتا ہے۔ ابنِ یمین ہی کا شعر ہے:

چو چرخ کہن ہر دم از نو غمی   نہد پیش من حیث لا یحتسب

قرآن میں ہے: وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۶۵ : ۲، ۳

مَخْرَجا مقدر و محذوف ہے۔

(۳) محتسب خم شکست و من سر او   سن بالسن والجروح قصاص

قرآن : وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۵ : ۴۵

یہاں شروع کے اَلسِّنَّ کو صرف سِنّ باندھا گیا ہے بغیر الف لام تعریف کے۔

(۴) چو ہست آب حیاتت بدست تشنہ میر   فلا تمت و من الماء کُل شیءٍ حَیّ

[ابن یمین :
ز آب زر باشدم حیات بلی   و من الماء کلّ شیءٍ حی

انوری :
میر آبست و حق ھمی گوید   و من الماء کلّ شی حی

فیضی :
نوشتہ اند بطاق رواق میخانہ   کتابہ و من الماء کل شیءٍ حی

وقار شیرازی؛
نظم پر آیت بر اہل فضل عیاں کرد   رمز من الماء کل شئی حی را

صفی علی شاہ؛
چو آبی بود آن آبی کہ فرمود   جعلنا کل شئی حی من الماء]

قرآن میں ہے؛
وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۲۱ : ۳۰

آخری شعر میں تو ترتیبِ الفاظ ہی اُلٹ دی گئی ہے باقی شعروں میں وَ مِنْ کے بیچ میں سے جَعَلْنَا حذف کردیا گیا ہے۔

(۵) شاہا روا مدار کہ مفعول من یراد   گردو بہ روزگار تو فعال ما یرید

ابن یمین؛
شاہا روا مدار کہ مفعول من اراد   گردو بروزگار تو فعال ما یرید

غالب؛
بسکہ فعّال ما یرید ہے آج   ہر سلحشور انگلستاں کا

قرآن؛ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۱۱ : ۱۰۷
۸۵ : ۱۶

لُ لِّمَا بروزنِ فاعلن کو ل ما بروزنِ فعل باندھا گیا ہے۔

(۶) لمع البرق من الطور و آنست بہ   فلعلی لک آتی بشہاب قبسی

قرآن؛ اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ ۲۰ : ۱۰
اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ——— اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ ۲۷ : ۷

اختلافِ الفاظ ظاہر و باہر ہے۔

(۷) ارچہ بعد میکشی تیغ جفا بکین من   فکر نمی کنی مگر فی عمدٍ ممددی
[اقبال سہیل؛ عشق نے فاش کر دیا سرّ حریم کبریا   ورنہ یہ خاکداں تو تھا فی عمدٍ ممدّد]

قرآن؛ فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۱۰۴ : ۹
مُمَدَّدَةٍ کو مُمَدَّدِیْ ، مُمَدَّد باندھا گیا ہے۔

(۸) نگارا در غم سودای عشقت   توکلنا علی رب العبادی

قرآن؛ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا ۶۰ : ۴

عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۷ : ۸۹

فرق درو لبست ظاہر ہے۔

(۹) مضمون کی پہلی مطبوعہ قسط میں ہم حافظ کے دو شعروں کا ذکر کر چکے ہیں۔

شب قدر است وطی شد نامۂ ہجر سلامٌ فیہ حتّٰی مطلع الفجر

جہاں ہِیَ کو فیہ سے بدل دیا گیا ہے۔ ایک دو نسخوں میں ہِیَ بھی ہے جو تقطیع میں ھی ی محسوب ہوگا کسرہ کے اشباع کے ساتھ۔ مگر صاحبِ قواعد العروض ـــــ قدر بلگرامی لکھتے ہیں کہ اس بحر میں مکفوف و سالم کا اجتماع جائز ہے یعنی مفاعیلن مفاعیلن فعولان ـــــ مفاعیل مفاعیلن فعولان۔ انہوں نے مصرع ہِیَ کے ساتھ لکھا ہے اور تقطیع یوں کی ہے: مفاعیل مفاعیلن فعولان۔ ساتھ ہی کہا ہے کہ، کسی ناواقف عروض نے یہاں ناموزونی کے وہم سے قرآن میں اصلاح دے کر بجائے ہِیَ لفظ فیہ کا نسخہ بنایا۔ اور صحیح کو غلط کیا۔

حافظ کا ایک اور مصرع ہم نے یوں نقل کیا تھا:

اِفتَحِ یا مفتّح الابواب

اب ایک نسخے میں دیکھا تو پورا شعر یوں ہے:

در میخانہ بستہ اند مگر اِفتَحِ یا مفتّح الابواب

فیض کاشانی کے ہاں بھی یہی دوسرا مصرع یوں نظر آتا ہے:

در وصل تو می زنند احباب اِفتح یا مفتح الابواب
در وصل تو چو بستہ ای بر فیض ” ” ”
بر رخم بستہ تا بکی در وصل ” ” ”

ہمارا استدلال حافظ کے مصرع سے یہ تھا کہ افتح کی ح ساکن کو بضرورتِ شعری تحریک دی گئی ہے۔ وہ نکتہ تو موجودہ شکل میں ساقط ہوگیا۔ البتہ قرۃ العین طاہرہ کے ہاں مصرع کی وہی شکل نظر آتی

در وصل تو می زنند احباب افتح یا مفتح الابواب

وہی فیض کاشانی والا شعر ہے صرف افتح کی بجائے افتح ہے جس سے اُس قسط میں پیش کردہ ہمارے نکتے کو تقویت ملتی ہے۔ ویسے ”افتح یا“ کو مفعولن کے وزن پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ فعلاتن کا قائم مقام تسکینِ اوسط کی رُو سے۔

(۱۰) مشورت با عقل کردم گفت، حافظ می بنوش ساقیا می دہ بقول مستشار مؤتمن

[فیضی:
عشق را مستفیض معتقدیم عقل را مستشار مؤتمنیم]

رُومی: گفت پیغمبر بکن ای رای زن مشورت کالمستشارُ مؤتمن

حدیث: اَلْمُسْتَشَارُ مُؤتَمَن وَهُوَ بِالخِیَارِ مَا لَمْ یَتَکَلَّمْ ——— اَلْمُسْتَشِیْرُ مُعانٌ وَالْمُسْتَشَارُ مُؤتَمَنٌ

دونوں شعروں میں اَلْمُسْتَشَار کا اَل غایب ہے۔

عطّار

(۱) سبحان من یمیت و یحیی ولا الٰه   الا هو الذی خلق الارض والسما

(یہ شعر شیخ سعدی کے ہاں بھی ملتا ہے)

قرآن : وَاللّٰهُ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۳ : ۱۵۶

هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۱۰ : ۵۶

اَلَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۲۳ : ۸۰

خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی ۲۰ : ۴

پہلے مصرع میں بجائے یُحیی و یمیت کے یمیت و یحیی ہے اور دوسرے مصرع میں وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی کی بجائے صرف وَالسَّما ہے۔

(۲) موسیٰ بہ لن ترانی جاں سوز چربہ خورد   واو توبہ زد کہ ماکذب القلب ما رآ

قرآن : مَاکَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی۔ ۵۳ : ۱۱

مصرع میں اَلْفُؤَادُ کی جگہ اَلْقَلْبُ ہے۔ قلب اور فؤاد میں جو ایک نازک فرق ہے وہ اس حدیثِ قدسی سے واضح ہوتا ہے:

اِنَّ فِی الْجَسَدِ آدَمَ لَمُضْغَةً وَفِی الْمُضْغَةِ قَلْبٌ وَفِی الْقَلْبِ فُؤَادٌ وَفِی الْفُؤَادِ ضَمِیْرٌ وَفِی الضَّمِیْرِ سِرٌّ وَفِی السِّرِّ اَنَا۔

(۳) چو نرگس از نظارۂ گلشن نگاه داشت   بشگفت در رخش گل مازاغ و ما طغا

[شمس تبریز:

سرّ مازاغ و ما طغیٰ را من   جز از و از کجا بیاموزم؟

شاہ فضل اللہ فضل:

طاق ابروی تو محراب دعای خلق است   چشم حق بین ترا سرّ مازاغ و ما طغیٰ

الیاس برنی:

چشمِ حق میں کیا ہے مازاغ البصر و ما طغیٰ]

قرآن : مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ۵۳ : ۱۷

پہلے تینوں شعروں میں اَلْبَصَرُ غایب ہے اور غَ دَما بروزنِ فِعلن کو غُ ما ـ غُما بروزن فعل باندھا گیا ہے۔ آخری شعر کو دَ کو دا اشباع کے ساتھ باندھا گیا ہے۔

(۴) کاروان نفخت من روحی — بسرای تو برکشاید بار
کرد تنزیہہ جلوہ در تشبیہ — نعمت اللہ نفخت روحی فیہ

قرآن : نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ ۱۵ : ۲۹
۳۸ : ۷۲

[حافظ :
تا نفخت فیہ من روحی شنیدم شد یقین — بر من این معنی کہ ما زان وی ہم وی زان ماست]

پہلے شعر میں فِیْہ غایب ہے اور دوسرے میں مِنْ غایب ہے اور ترتیبِ الفاظ بدلی ہوئی۔

(۵) فتمنوا الموت ان کنتم — صادقین آمد است در اخبار

قرآن : فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ ۲ : ۹۴
اَلْمَوْتَ کی جگہ موت پڑھا جائے گا حالانکہ چھپا الموت ہے۔ فَتَمَنّ نَّ کی زبر کے اشباع کے ساتھ فَتَمَنَّا بن جائے گا۔

(۶) نحن اقرب الیہ آمدہ است — دور افتادی تو از پندار
نحن اقرب الیہ فی القرآن — غوث ما و علی ماست ہمان

[احمد جام :
زستر نحن اقرب باز گویم — ترا از خود جدا گردانم امروز
نحن اقرب گفت در معنی خدای — راہ حق را در حقیقت گوش دار]

قرآن : وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۵۰ : ۱۶
اَقْرَبُ کو اَقْرَبْ باندھا گیا ہے۔

(۷) کل شئی محیط می بینم — آنچہ می بینمش بہ نقش و نگار

قرآن : اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ ۴۱ : ۵۴
بِکُلِّ کو کُلّ (غالباً پیش کے ساتھ) باندھا گیا ہے۔

(۸) رمز من کان ہٰذہ الاعمی — بشنوید اے خران کو دن کار ساز

قرآن : وَمَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی ۱۷ : ۷۲
ایک نسخے میں مصرع میں اَلْاَعْمٰی کی جگہ اَعْمٰی بھی ہے۔ فی بہرحال غایب ہے۔

(۹) من طلبنی وجدنی آمده است   عاشقان را بدست اوست قرار

طَلَبَنی اور وَجَدَنی کو طَلَبْنی اور وَجَدْنی باندھا گیا ہے۔

(۱۰) تا امل اللسان شود خاموش   تا بطل اللسان کند اقرار

اَمَل کے اَمَ کو اَما اور بَطَل کے بَطَ کو بطا باندھا گیا ہے اشباعِ فتحہ کے ساتھ۔

(۱۱) من عرف نفسہ نمی فرمود   گرنمی دید حیدر کرار

من عرف نفسہ شود معلوم   ہرکہ خود شناخت شد مخدوم

من عرف زاں گفت شاه اولیا   عارف خود شو کہ بشناسی خدا

[نظیر اکبر آبادی: اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیا ہے اے نظیر!   ہیں حرف من عرف کے یہی معنی اے نظیر!]

عَرَفَ کو عَرَفْ باندھا گیا ہے۔

(۱۲) فسبحان الذی اسریٰ بعبده   الی الجبروت والملکوت کلہ

[قاآنی :

بسر از لطف حق تا جت طریق شرع منہاجت   بساط قرب معراجت فسبحان الذی اسری

خاقانی :

سبحان من اسری بخاطر عبده   لیلا الی الاقصی بذی الاسراء

استاد جمال الدین :

بر مسند شرع دیده گردون   مثل تو نہ دید والذی اسری

امیر معزّی :

گفتم چو دیدم آسمان آراستہ چون بوستان   سبحان من اسریٰ بنا لیلا اتی بدر الدجا

شمس تبریز :

ولکن بریق القرب افنی عقولهم   فسبحان من ارسی وسبحان من اسری

یہ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ سے ظاہر ہے   کہ تھی منظورِ حق کس درجہ ان کی عزّت افزائی]

قرآن : سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ۱۷ : ۱

پہلے دونوں شعروں میں فَ کا اضافہ ہے۔ خاقانی اور امیر معزّی اور شمس تبریز نے سبحان الّذی اسریٰ کو سُبْحَانَ مَنْ اسریٰ باندھا ہے۔ شمس تبریز کا ارسیٰ غالباً وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ۷۹ ، ۳۲ سے مستنبط ہے۔ استاد جمال الدین نے وَ کا اضافہ کر دیا ہے اگرچہ ایک دوسرے شعر میں انہوں نے صحیح باندھا ہے۔

ہر تو وقت تفکر چو کند معراج عقل   آسمان آواز سبحان الذی اسریٰ دہد

اردو کے شعر میں یعبُدِہٖ کو مفاعیلن باندھا گیا ہے دِ کو اشباعِ کسرہ کے ساتھ دی بنا کر۔

(۱۳) چون در ثنات افصح آفاق دم نزد   لا احصی بگفت و زبان بست ہمچو لا
گفت پیغمبر کہ لا احصی ثنا   حامد تو ہم توئی یا ربنا

[رُومی :
لاتکلفنی فانّی فی الفنا   کلّت افہامی فلا اُحصی ثنا]

حدیث : لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ۔
پہلے شعر میں اُحْصِیْ کو اُحْصِیَ باندھا گیا ہے اور تینوں میں ثناءً صرف ثنا ہو کر رہ گیا ہے۔

(۱۴) اے چراغِ خلد ازین مشکوٰۃ مظلم کن کنار   تا شوی نور علیٰ نور کہ لم تمسسہ نار

[میرزادہ عشقی :
نور علیٰ نور مہیا شدہ]

قرآن : وَلَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ۲۴ : ۳۵
پہلے شعر میں نورٌ علیٰ نور کا ٹکڑا بجائے مؤخر کے مقدم ہو گیا ہے اور وَ لَو حذف۔ عشقی نے نُورٍ کو نُور باندھا ہے۔

(۱۵) اسبابِ رباقی شود ساقی بخود ساقی شود   جان ربی الاعلیٰ کند دل ربی الاعلم زند
قُرآن : رَبِّیْٓ اَعْلَمُ   ۱۸ : ۲۲   ۲۸ : ۳۷
۲۶ : ۱۸۸   ۲۸ : ۷۵

رَبِّیْٓ اَعْلَمُ کی جگہ شعر میں رَبِّیَ الْاَعْلَمُ ہے۔

(۱۶) بنمائی بخلق رُخ کہ خود گفتی   با ما کہ تخلقوا باخلاقی
قولِ ماثور تو یہ ہے : تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ

(۱۷) فداک ابی و امی این تمشی   براق آمد مگر بر عزم عرشی
پہلا رکن نظر بظاہر مفاعلتن ہے۔

[حالی :
اے چشمۂ رحمت بِاَبِیْ اَنْتَ وَ اُمّی   دنیا میں ترا لطف سدا عام رہا ہے

انیس :
حُر پکارا بِاَبِی انتَ و اُمّی یا شاہ   قابلِ عفو نہ تھے بندۂ عاصم کے گناہ

فصیح :
السلام اے جگر فاطمہ و جانِ نبی   انت مولائی فافدیک بِاُمّی و ابی]

(۱۸) شد پردہ آں قوم بیک بار دریدہ   من مطلع اقبال اذا الصبح تنفس

قرآن، وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۸۱ : ۱۸

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۹) ساحران دیدہ عصای را این   گفتہ آمنا برب العلمین

قرآن : قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۷ : ۱۲۱

گفتہ کی جگہ بآسانی قَالُوْٓا آ سکتا تھا۔

(۲۰) شعر پر حکمت پناہی یافتست   کو یؤتی الحکمۃ راھی یافتست

قرآن، يُؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۲ : ۲۶۹

يُؤْتِى کو يَؤْتِى اور اَلْحِكْمَةَ کو اَلْحِكْمَه باندھا گیا ہے۔ میر درد نے بھی یونہی باندھا ہے،

سوی شعرا بچشم تحقیر مبین   گر انّ من الشعر لحکمہ خوانی

حدیث کے الفاظ ہیں، اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً

(۲۱) زانکہ سالی دہ ہزار است ز عدد   تا الست ربکم گفتست احد

قرآن، اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۷ : ۱۷۲

بِ ساقط کر دیا۔

(۲۲) فالق الحب از نوی دادہ ترا   حبہ حب صد نوی دادہ ترا

قرآن، فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ۶ : ۹۵

وَ کو از سے بدل دیا۔

(۲۳) گر بدانی کاین کدامین منبع است   قصہ بی یبصر و بی یسمع است

حدیثِ قدسی : مَا زَالَ الْعَبْدُ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعُهُ الَّذِىْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرُهُ الَّذِىْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدُهُ الَّذِىْ يَبْطِشُ بِهٖ وَرِجْلُهُ الَّذِىْ يَمْشِىْ بِهٖ۔

يُبْصِرُ بِی اور يَسْمَعُ بِی کی بِی کو بجائے موخر کے مُقدّم کر دیا گیا ہے۔ درمیان میں و زاید ہے يَسْمَعُ بھی يَسْمَعْ ہے بروزنِ منبع۔

امیر خسرو

(۱) ہست اعتصام خلق بمنشور او کہ آن   زنجیر بیت من دخل کان آمنا ست

قرآن، اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ   وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۳ : ۹۶، ۹۷

دَخَلَهٗ کو دَخَلَ باندھا گیا ہے اور بَیْتٍ کو بَیْت باندھا گیا ہے فکّ تنوین کے ساتھ۔ اور بَیْتٍ اور مَنْ کے درمیانی الفاظ ساقط۔

(۲) روزہ کرم نامۂ روزی دہ ست　　نامۂ حرفش انا اجزی بہ است

حدیث ؛ قَالَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ کُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ لَهٗ اِلَّا الصِّیَامُ هُوَ لِی وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ۔

بِهٖ کو بِهْ باندھا گیا ہے۔

(۳) طاقت بہ دلم نماند یا رب　　انزل لقلوبنا سکینہ
طاقت بہ دلم نماند یا رب　　بفرست ز بھر من سکینہ
گویان بخدا از درد سینہ　　انزل لقلوبنا سکینہ
[؛ قرآن نے دیا مجھے دم صبح　　پیغام و انزل السکینۃ]

قرآن ؛ اَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۴۸ : ۴
فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ ۴۸ : ۱۸

دُعاے رسولؐ ہے ؛ فَاَنْزِلَنْ سَکِیْنَةً عَلَیْنَا۔

تفاوتِ عبارت ظاہر ہے۔

(۴) کارشناسی کہ رخ از کار تافت　　داغِ جبین حمل اسفار یافت

قرآن ، کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ۶۲ : ۵

اَسْفَارًا کو اَسْفَار باندھا گیا ہے۔

(۵) یافتہ از درگہ تو فتح باب　　بارگہ اِنَّ الینا ایاب

قرآن ، اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَهُمْ ۸۸ : ۲۵

اِیَابَهُمْ کو اِیاب باندھا گیا ہے۔

(۶) من کنم آنچہ از دلم آمد بکسب　　باقی الاتمام علی اللہ فحسب
[آنچہ در دل من آید بآں ابتدا می کنم　　لیکن اتمام موقوف بر تائیدِ باری تعالیٰ است]

حدیث کے الفاظ ہیں ؛

اَلسَّعْیُ مِنِّی وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللهِ

شاعر نے مِن کی بجاے علیٰ باندھا ہے۔

[واقف لاہوری ؛

فریاد کہ بہر دوست شد دشمن کام　　در کندن جوی شیر چون کرد اقدام

می گفت دمی کہ تیشہ می زد بر سنگ   منّی السّعی رب منک الاتمام]

آخری مصرع میں اختلافِ الفاظ واضح ہے۔

(۷) نجا المخففون برخوان و کن بداں عملی   کہ دروی از هلک المثقلون شعار بود

[قرآن : اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا ۹ : ۴۲   ای مُوسِرِیْنَ وَ (اَوْ) مُعْسِرِیْنَ]

اَلْمُخِفّ   القلیل المالِ   الخفیف الحال
وَاَخَفَّ الرَّجُلُ اِذَا کَانَ قَلِیْلُ الثِّقْلِ فِی سَفَرِہٖ اَوْ حَضَرِہٖ ـــــ سبکبار ۔ ہلکا
مُثْقِل ـــــ گرانبار ۔ بوجھل

(یعنی ـــ بہتر ہے اُٹھے جتنا سبک بار مسافر ـــ انیس)
حدیث : هَلَكَ الْمُثْقِلُوْنَ وَنَجَی الْمُخِفُّوْنَ ۔ (کشفُ المحجوب میں اسے حَسَنُ البصری سے منسوب کیا گیا ہے)
المخفّفُون مرتّب و ناشر کی فروگزاشت معلوم ہوتی ہے۔

[سنائی :

هلک المثقلون بخوانده و بس   خانه و جفت سازم اینت هوس
چکنم جفت خانه و بنیاد   مونس من نجی المخفون باد]

(۸) به که شهادت کنی از حق پدید   که تو گواهت کفی الا شهید

دوسرا مصرع یوں بھی مروی ہے :

کوست گواهیت و کفٰی به شهید

قرآن : کَفٰی بِاللہِ شَهِیْدًا ۴ : ۷۹   ۱۰ : ۲۹
۴ : ۱۶۶   ۱۳ : ۴۳
۱۷ : ۹۶
۴۸ : ۲۸

فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۹) از قلمت یافتہ حرف صواب   جائزۃ انّ علینا حساب
پس بود از وے بخطا و صواب   〃 〃 〃 〃

قرآن : وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ ۱۳ : ۴۰   ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَهُمْ ۸۸ : ۲۶
حِسَابَهُمْ صرف حساب رہ گیا ہے۔

[فیض کاشانی :
یحاسب نفوسنا و لما اتی   علینا حساب ما قدرنا جحوده]

یہاں اَلحِسَاب صرف حِسَاب ہے۔

(۱۰) چو سحر دو چشم تو بینم   ھٰذانِ لساحران بخوانم

قرآن : اِنَّ ھٰذٰانِ لَسَاحِرَانِ ۲۰ : ۶۳

حِرَانِ کو حِراں (بہ نون غُنّہ) باندھا گیا ہے۔

(۱۱) سرنہم برکف پایت وانگاہ   لیتنی کنتُ ترابا گویم

قرآن : وَیَقُوْلُ الْکَافِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا ۷۸ : ۴۰

یا حذف کردیا گیا ہے۔ متعدد شعرا نے ترابا کو تراب باندھا ہے۔

رُومی : کافران گویند در وقت عذاب   ھریکی یالیتنی کنت تراب

قاآنی :
خاک را بوترا البست این ملک کز رشک او   آسمان گوید همی یالیتنی کنت تراب
تا قدومش گشت زیب فرش خاک از عرش پاک   قدسیان را ذکر لب یالیتنی کنت تراب

سلمان ساوجی :
ساقی بزمت اگر بر خاک ریزد جرعہ ای   زھرہ گوید بر فلک یالیتنی کنت تراب

(۱۲) پیکجز لاہور کے ایڈیشن میں یہ شعر ہے :
از شرابِ شب نشینان در خمار   ھاتٗ کاساً یا حبیبی بالغدات

ھَاتٗ کو ھاتِ ہونا چاہیے۔ ھات = اَعْطِ = دِہ = دے = اُحْضُرْ = لا = حاضر کر

حافظ کہتا ہے :
ھَاتِ الصَّبُوْحَ ھُبُّوا یا اَیُّھَا السُّکَارا

(تثنیہ ھاتِیا ، جمع ھاتُوا)

ھَاتِ الصَّبُوْحَ : (ساقیا) مے دِہ ! صَبُوحی لا !

(۱۳) اسی ایڈیشن میں یہ شعر ہے :
ہر کہ دعویٰ کند ز خوبان صبر   نشود کُلُّ مُدَّعٍ کذّاب

سعدی :
تو باز دعوی پرہیز می کنی سعدی   کہ دل بکس ندہم کل مدع کذاب

رومی : خواب می بینم ولیکن خواب نی   مدعی ہستم ولی کذاب نی
عراقی : نشنیدی تو این حدیث صواب   از نبی : کل مدع کذاب

اوّل تو لفظ مُدَّعٌ ہے م کی پیش کے ساتھ۔ دوسرے کُلُّ کا مضاف الیہ ہونے کے باعث یہ مجرور ہوگا یعنی مُدَّعٍ۔

(۱۴) تہران کے ایڈیشن میں جو آقای سعید نفیسی کا مرتّب کردہ ہے۔ یہ شعر ہے :

چہ ملامت کنید خسرو را   فاتقوا اللّٰہ یا اولوا الالباب

مرکبِ اضافی پر حرفِ ندا داخل ہو تو مضاف کو فتحہ پڑھتے ہیں کیونکہ حرفِ ندا ناصبِ مضاف ہے۔ اولُوا حالتِ نصبی میں اولی پڑھا جائے گا۔ لاہور ایڈیشن میں البتّہ یہ لفظ صحیح چھپا ہے۔

(۱۵) بر سر سرنامہ کہ آصف نوشت   قد رحم اللّٰہ من انصف نوشت

اَنْصَفَ کو اَنْصَفْ باندھا گیا ہے۔

(۱۶) چو گشت آبہا شیشہ گر گفت بلبل   قواریرُ من فضۃٍ قدّروھا

قرآن : قَوارِیْرَا مِنْ فِضَّۃٍ قَدَّرُوْھا تَقْدِیْرا ۷۶ : ۱۶

قواریرا کو قواریرُ باندھا گیا ہے تقدیرا محذوف ہے۔

نظیری

(۱) در نہاد ما عبودیت سرشتہ از الست   نقش آب و خاک ما طوعا اطعنا ساختہ

قرآن : فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ ۴۱ : ۱۱

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

[سنائی :
چون تو راہ گلبن توبوا الی اللّٰہ آمدی   پای بر فرق اتینا طائعین باید نہاد]

یہاں طائِعِین کو طائعِیں باندھا گیا ہے۔

(۲) بر معاند طی لاف لا نبی بعدی زدہ   ما انا الا بشر نزال اجبا ساختہ
دیدہ اش از سرمہ مازاغ روشن کردہ اند   منزلش در لا نبی بعدی معین کردہ اند

قرآن : قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۱۸ : ۱۰   ۴۱ : ۶

حدیث : لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔

اِنَّمَا کو ما، بَشَرٌ کو بَشَرْ اور نَبِیَّ کو نبی باندھا گیا ہے۔

(۳) زندہ از اوحیٰ الیٰ عبدہ دل شب داشتہ ‌ ‌ ‌ از ابیت عند ربی نزل احبا ساختہ

قرآن : فَاَوْحٰی اِلیٰ عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی ۵۳ : ۱۰

فَاَوْحٰی کو اَوْحٰی اور عَبْدِہٖ عَبْدِہْ باندھا گیا ہے۔

حدیث : اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ (فَاکْلَفُوْا مِنَ الْاَعْمَالِ مَا تُطِیْقُوْنَ)

شاعر نے یُطْعِمُنِیْ کی جگہ عِنْدَ ڈال دیا ہے۔ مگر وہ اس تصرف میں تنہا نہیں۔ حدیث کے الفاظ یوں بھی مروی ہیں: اِنِّیْ لَسْتُ کَاَحَدِکُمْ اِنِّیْ اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّیْ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِیْ۔ اس کے حساب سے شاعر برسرِ صواب ہیں۔

سعدی : صاحب دل لا ینام قلبی ‌ ‌ ‌ مہمان ابیت عند ربی

رومی :

چون ابیت عند ربی فاش شد

جمال الدین اصفہانی :

خواب تو ولا ینام قلبی ‌ ‌ ‌ خوان تو ابیت عند ربی]

(۴) اقتدار توبہ و اشک سحرگاہیش دہ ‌ ‌ ‌ تا کند در جنب ہم مستغفرین جا ساختہ

قرآن : وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ۳ : ۱۷

وَبِالْاَسْحَارِ ھُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ۵۱ : ۱۸

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔ نَ کو ں (نونِ غنہ) باندھا گیا ہے۔

(۵) کار عالم را کفایت کردہ از یک ماجرا ‌ ‌ ‌ ورد خود در ہر دعا رزقاً کفافاً ساختہ

حدیث کے الفاظ ہیں : اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ آلِ مُحَمَّدٍ کَفَافًا (یا قُوْتًا)

(اَللّٰھُمَّ ارْزُقْ آلَ مُحَمَّدٍ قُوْتًا)

——— اَنَّہٗ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ ھُدِیَ اِلَی الْاِسْلَامِ وَرُزِقَ الْکَفَافُ وَقَنَعَ بِہٖ

——— طُوْبٰی لِمَنْ ھُدِیَ لِلْاِسْلَامِ وَکَانَ عَیْشُہٗ کَفَافًا وَّقَنَعَ

رِزْقًا کا لفظ حدیث میں نہیں۔

(۶) انی انا اللہ از شجر آمد بگوش آن ‌ ‌ ‌ این را ز عرش عبدی موسیٰ ندا رسید
نار شجر زانی انا اللہ زبان گزد ‌ ‌ ‌ ایمانش ار بوادی ایمن در آدرم
نعرہ انی انا اللہ ز آتش وادی رسید ‌ ‌ ‌ مال و زن بگزاشت در رہ موسی عمران من

قرآن : اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۲۸ : ۳۰

اَللّٰہُ کو اَللّٰہْ باندھا گیا ہے۔

(۷) چو حق بشود عیان نظیری   گوییم کہ لا الاہ الّا

[نسیم امروہوی: توڑا موسائیت کا چلّہ   کلمہ پڑھا لا الٰہَ اِلّا]

کلمہ تو پورا یہ ہے:

لا الٰہَ اِلَّا اللہُ (مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ)

(۸) اخلع نعلیک گفت زان کہ نہ درخور بود   حرف تقدس زدن فکر غنم داشتن

[امیر خسرو: نعبد ایاک طٰہٰ از علم   فاخلع نعلیک مقام قدم

قرآن، فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ - ۲۰ : ۱۲

یا تو دونوں شاعروں نے (اخلع) فاخلع کی ساکت عین کو متحرک باندھا ہے یا پھر تسکین اوسط کے عمل سے مفتعلن کو بروزن مستفعلن۔ نظیری نے ف ساقط کردی (بے وجہ)

(۹) غیرت من گر نہ در شکل بشر ظاہر شدی   لم یکن کفوا احد نازل شدی در شانِ من

قرآن، لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۱۱۲ : ۴

لَہٗ کو حذف اور کُفُوًا کی مضموم ف کو ساکن کر دیا۔

(۱۰) ای در ہوای نعرہ طوبیٰ لہ مآب   از شوق قامتش دل طوبیٰ صنوبری

قرآن، طُوْبٰى لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ ۱۳ : ۲۹

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۱) بصدق دعوی او حق شہادت آوردہ   ز لعبد اشہد ان لا الاہ الا الاہ

ہر کہ بیند شکوہ او گوید   وحدہ لا الاہ الا الاہ

سپہر و ہر چہ خدا آفرید سایۂ تست   شبیہ نیست ترا لا الاہ الا الاہ

تینوں شعروں میں آخری لفظ الاہ ہے اللہ نہیں۔ اور آہنگ سے خارج ہے۔

اس شعر:

ستون شرع محمد عزیز اعظم خان   پناہ دین نبی پاسدار قول الاہ

سے مزید تصدیق ہوتی ہے کہ الاہٗ الاہ ہی ہے، اللہ نہیں پڑھا جا سکتا۔ جہاں شاعر کو اللہ کہنا ہوتا ہے وہاں شعر یوں چھپتا ہے:

تو خود نظیری خودی لا الٰہ الّا اللہ   ہمان یکی ست کہ خود اول ہست و خود ثانی

جامی

(۱) ابلهاں را زند سر از خاطر   انه عارض لهم ممطر

(احمد رضا خان بریلوی:

چوں بہ بینند آں سحاب ایشاں ز دور   عارض ممطر بگویند از غرور
بل هو ما استعجلوا رخزی عظیم   ارسلت ریح بتعذیب الیم

قرآن : قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۲۴:۴۶

تفاوتِ الفاظ واضح ہے۔

(۲) وبقوم یحبهم و یحب

قرآن : يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ ۵۴ : ۵

يُحِبُّوْنَهٗ مصرع میں سمٹ کر صرف يُحِب رہ گیا ہے۔

(۳) بکنج خانہ ماندہ روز تا شب   فَاَرسلہ غدًا نرتع ونلعب
شد فرش دیبا از سبزہ صحرا   ارسلہ معنا یرتع ویلعب

قرآن : اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ ۱۲ : ۱۲

پہلے شعر میں تو لفظ بالکل فرق ہیں۔ دوسرے میں غدًا کے علاوہ باقی الفاظ قرآن ہی کے ہیں مگر مَعَنا کو مَعْنا باندھا گیا ہے اسکانِ ع کے ساتھ۔

(۴) می پسندم ازیں صحیفہ خجل   یوم یطوی السما کطی سجل

قرآن : يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۱۰۴ : ۲۱

تفاوتِ عبارت ظاہر ہے۔

(۵) قال فیها هدی و ارشاداً   وجعلنا الجبال اوتاداً

قرآن : اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۷ ، ۶ : ۷۸

"جَعَلْنَا" ایزادِ شاعر ہے۔

(۶) طالباں را بلطف کرد خطاب   گفت فاتوا البیوت من ابواب

قرآن : وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۱۸۹ : ۲

وَ کو فَ سے تبدیل کر دیا گیا اور اَبوابِهَا کی ها گرا دی گئی۔

(۷) غرق آتش جوارح و اعضا   یلعن البعض منهم بعضا

قرآن : وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۲۹ : ۲۵

تفاوتِ الفاظ کے علاوہ، مصرع میں مِنْهُمْ کو مِنْهُمُ باندھا گیا ہے تحریکِ م ساکن کے ساتھ۔

(۸)
نیست گفتند صدق این روشن پیش ما ان نظن الا الظن

قرآن : اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا ۴۵ : ۳۲

ظَنًّا کو اَلظَّنْ بنا دیا گیا ہے۔

(۹)
تاجدارانِ مسند تمکین جملہ ظل اللہ فی الارضین

مصرع ثانی اس قولِ ماثور سے ماخوذ ہے : اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ۔

بعض اسے قولِ رسولؐ بھی کہتے ہیں (بحوالہ لغات الحدیث حصہ ۴) مگر واحد کو جمع بنا دیا گیا ہے۔

(۱۰)
کل ما کان عندکم ینفد وام ما عندہ الی السرمد

[نظیری :
عزت تو عندنا باق نوشتہ بر نگین انفدوا ما عندکم نقش رخ ما ساختہ

فیض کاشانی :
ما ہمہ فانیم و تو باقی ما لنا ینفد و مالک باقی]

قرآن : مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۱۶ : ۹۶

الفاظ کا فرق واضح ہے۔

(۱۱)
بر سماوات و ارض و ما فی البین قد عرضنا الامانۃ فابین
لیس فی الکون کائنا ما کان کاملی حملھا سوی الانسان

قرآن : اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۳۳ : ۷۲

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۲)
کشد آں سنگ تخت تو ز ادبار تحت نار وقودھا الاحجار

قرآن : (فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ) وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۲ : ۲۴ ، ۶۶ : ۶

وَالْحِجَارَۃُ کو الاحجار میں ڈھال دیا اور بیچ میں سے اَلنَّاس کو حذف کر دیا۔

(۱۳)
گوش بر مدح مدح گو کم نہ بلکہ احث التراب فی وجھہ

حدیث : اُحْثُوا التُّرَابَ فِیْ وُجُوْهِ الْمَدَّاحِيْنَ۔

——— (اُحْثُوْا فِیْ وُجُوْهِ الْمَدَّاحِيْنَ التُّرَابَ،
اَفْوَاہِ

دوسرا مصرع حدیث سے ماخوذ ہے لیکن ترکیبِ الفاظ شاعر کی اپنی ہے۔

(۱۴) گفت ویحک قطعت عنق اخیک　　ساختی روز روشنش تاریک

وَیْحَکَ کو وَیْحَکْ اور عُنُقِ کو عُنْقِ باندھا گیا ہے سکونِ نونِ مضموم کے ساتھ۔

(۱۵) اصل جنات جنۃ الذات است　　عرضہا الارض والسماوات است
گلشنی کان بود اوان العرض　　جنۃ عرضہا السماء و الارض
ذات حق را کہ جنت آئین است　　عرضہا الارض والسما این است

قرآن: وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۳ : ۱۳۳

الفاظ کا فرق واضح ہے۔

(۱۶) تا کنی در محیط ز آں شط رہ　　گفت ولّو وجوھکم شطرہ

قرآن: فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۲ : ۱۴۴

فولوا کی ف ساقط کر دی گئی ہے۔

(۱۷) ان تحبوا اللہ فاتبعونی　　نیست کار از متابعت بیروں

قرآن: اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ ۳ : ۳۱

فرقِ الفاظ کے علاوہ فَاتَّبِعُوْنِی کے فَاتَّبِ کو فَتْ تبی بہ اشباعِ زیر باندھا گیا ہے۔

(۱۸) از ہمہ در صفات و ذات جدا　　لیس شئ کمثلہ ابدا

[سنائی:
اَحَدٌ، لیس کمثلہ صمدٌ لیس لہٗ ضد　　لمن الملک تو گوئی کہ مر آنرا تو سزائی
اسمٰعیل میرٹھی: نیست جای گفت و تشبیہ و مثال　　لیس شئی کمثلہ کم کن خیال]

قرآن: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۴۲ : ۱۱

سنائی نے تو شَیْءٌ کو حذف کیا ہے۔ باقی دونوں شعروں میں ترتیبِ الفاظ بدلی ہوئی ہے۔ بلکہ آخری شعر میں تو مطبوعہ کَمِثْلِہٖ، مِثْلُہٗ پڑھا جائے گا۔

(۱۹) قدوہ عارفان بستہ قدم　　قطب حق صاحب فصوص حکم

شیخ اکبر کی کتاب کا نام فُصُوْصُ الْحِکَم ہے نہ کہ فصوصِ حِکَم۔ یعنی حِکَم معرّف باللام ہے۔

(۲۰) بلکہ آں پیش صاحب عرفان　　نیست الّا اعوذ بالشیطان

تعوّذ یا استعاذہ قرآن سے مستخرج اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

قرآن: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۱۶ : ۹۸

اَعُوْذُ بِاللہ کو اَعُوْذُ بِالشَّیْطَان بنا دیا۔ تعوّذ میں شیطان سے پناہ مانگی گئی ہے، یہاں شیطان کی۔ ببیں تفاوتِ راہ۔ رُومی کا قول بھی کچھ اسی قسم کا ہے : استعاذت خواہ از ربّ الفلق (اَعُوْذُ بِاللہ = التجیٰ الی اللہ ب = الیٰ)

(۲۱) حَسَدُ المرءِ یاکل الحسنات   وان اعتاد کسبہا سنوات

حدیث : اَلْحَسَدُ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ

اَلْحَسَدُ کو حَسَدُ الْمَرءِ بنا دیا گیا ہے۔

(۲۲) علم اللہ آدم الاسماء   کلہا ای حقایق الاشیاء
بعد ازان گفت ملائکہ را   اَنْبِئُوْنِیْ بِھٰذِہِ الاسماء
ما علمنا وراء ما علمت   ما فہمنا خلاف ما فہمت

[قاآنی : نداند ذوق ابلیسی رموز علّم الاسماء

نظیری : تاج فخر علّم الاسما نہادہ بر سرش   بر سریر اسجدوا از عز تنش جا ساختہ

رُومی : اسم ہر چیزی تو از دانا شنو   رمز و سر علم الاسما شنو

صفی علی شاہ :
فانی فی الشیخ داند سر اسماء صفات   شیخ خود دریای علم الاسماستی

پیر مہر علی گولڑوی :
علّم الاسما طراز جان تست   اسجدوا لآدم ہم اندر شان تست

اسداللہ تابع :
ہر دو کم اصل را ابہام علم اصل کو   علم الاسماءُ آدم را گواہ آوردہ ام

اقبال : رازدانِ عَلَّمَ الاسما کہ بود ؟   مست آں ساقی و آں صہبا کہ بود ؟
مدعاے علّم الاسما ستی   سرّ سبحان الذی اسریٰ ستی

نسیم امروہوی :
باعمل تھے نہ عمل ہی نے جنم پایا تھا   علّم آدم الاسماء تو جب آیا تھا]

قرآن : وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِکَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ ھٰٓؤُلَآءِ
قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۲ : ۳۱، ۳۲

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کو آخری اردو شاعر کے سوا باقی سب شاعروں نے عَلَّمَ الْاَسْمَآء باندھا یعنی حذف اسم آدم کے ساتھ۔

أَنْبِئُوْنِي بِأَسْمَاءِ هٰؤُلَاءِ کو عطار نے أَنْبِئُوْنِي بِهٰذِهِ الْأَسْمَاء سے بدل دیا ہے اور لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا کو ما علّمنا وراء ما علمت۔ معناً یکساں لفظاً مختلف۔

پیر مہر علی نے اُسْجُدُوا اٰدَمَ باندھا ہے۔ قرآنی الفاظ ہیں:

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۲ : ۳۴

لِ کو حذف کر دیا گیا ہے اور اسْجُدُوْا کے ا کو تحریک دی گئی ہے۔

(۲۳) حق آفتاب و جہاں ہمچو سایہ است اے دل   اما رایت الی الرب کیف مدّ الظل

قرآن: أَلَمْ تَرَ إِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۲۵ ، ۴۵

دونوں عبارتوں کا فرق ظاہر ہے۔

(۲۴) شد برقع روی چو هست زلف شب آسا   سبحان قدیر جعل اللیل لباسا

قرآن: وَّجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۷۸ : ۱۰

جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا ۲۵ ، ۴۷

لَكُمْ شاعر نے ساقط کر دیا۔

(۲۵) خاص کر بے خاصیت عاشقی است   عام کالانعام بود بل اضل

قرآن: أُولٰٓئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۷ : ۱۷۹

ایک نسخے میں کالانعام کی بجائے کا نعام ہے عوام کی جگہ عام ہے اور بَل ہُم کی بجائے بُود بَل۔

(۲۶) سر آمد حسن او و دوزخی شد   فاغشی وجہ قطعاً من اللیل

قرآن: كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ۱۰ : ۲۷

فرقِ الفاظ واضح ہے۔ دُوسرے مصرع کے دُوسرے رکن کا وزن مفاعیلن کی بجائے مفاعلۃ

(۲۷) بر درت جا کنند اہل نجات   رفع اللہ قدرہم درجات

قرآن: مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۲ : ۲۵۳

وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ ۶ ، ۱۶۵

فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۲۸) توبہ کردی شراب خور جامی   اتّبع سیآت بالحسنات

یہ قرآن کی ترکیب نہیں حالانکہ بادیٔ النظر گمان یہی ہوتا ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۱۱ : ۱۱۴

يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۲۵ : ۷۰

کلیاتِ شمس تبریز میں ہے :

زعشقِ روی تو روشن دل بنین و بنات بیا کہ از تو شود سیّاٰتِھم حَسَنات
(۲۹) طراز آستین دلق تجرید وما توفیقی اِلّا بالھُمّ بس

قرآن ، وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ ۱۱ : ۸۸

باللّٰہِ کو بِاللّھَمّ با اضافۂ میم باندھا گیا ہے جس سے ہاے مکسور ہاے مفتوح میں بدل گئی ہے۔ طباعت میں م پر جزم نہیں بلکہ شد اور زبر ہے حالانکہ شد ل پر ہونی چاہیے تھی۔ م پر زبر سے مصرع وزن سے گر جاتا ہے۔

(۳۰) نقد عمر زاھداں در توبہ ازمی شد تلف قل لھم ان ینتھو لیغفر لھم ماقد سلف

قرآن ، قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَھُوْا یُغْفَرْ لَھُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ۔ ۸ : ۳۸

شعر میں لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا کی جگہ لَھُمْ نے لے لی ہے۔

(۳۱) جرم جامی ھوای خوبان است حسبی اللّٰہ وحدہ وکفیٰ

قرآن ، حَسْبِیَ اللّٰہُ ۹ : ۱۲۹ ۳۹ : ۳۸

رُومی ، عقل قربان کن بپیش مصطفیٰ حسبی اللّٰہ گو کہ اللّٰہ ام کفیٰ

متعدد آیات میں اس کے بعد صفت حَسِیْبًا ، وَلِیًّا ، نَصِیْرًا ، عَلِیْمًا ، شَہِیْدًا ، وَکِیْلًا ہے وحدہٗ کہیں نہیں۔

(۳۲) سرمایۂ فلاح چو باشد شراب لعل یا معشر الاحبّہ حیّوا علی الفلاح

اذان میں حَیَّ عَلَی الْفَلَاح بولا جاتا ہے۔ حافظ نے بھی حَیُّوْا استعمال کیا ہے شراب ہی کے ضمن میں

در حلقۂ گل و مل خوش خواند دوش بلبل ھاتِ الصبوح حیّوا یا ایھا السکارا!

رُومی : عیب باشد اول دین وصلاح لحن خواندن لفظ حیّ علی الفلاح

(۳۳) دوستان این دشمنان آن می ندانم درمیان تا بکی باشم مذبذب لا الیٰ و لا الیٰ

قرآن ، مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ ۴ : ۱۴۳

ذکر ادیا دا باندھا گیا ہے۔

سعدی

(۱) در بصد پارہ ام کنی زین رنگ بنگردم کہ صِبْغَۃَ اللّٰھَم

[جامی ؛

جامہ زغم کبود کنم چون نمی رسد جز نیل معصیت زخم صبغۃ اللّٰھَم]

قرآن : صِبْغَةُ اللّٰهِ ۲ : ۱۳۸

دونوں شاعروں نے اللّٰہ کو اللّٰھمّ باندھا ہے۔

[جامی نے ایک اور شعر میں بھی باللّٰہ کو باللّٰھمّ باندھا ہے۔ جس سے ہم کچھ دیر پہلے بحث کر چکے ہیں۔

طراز آستین دلق تجرید
وما توفیقی الّا باللّٰھم بس]

ظہیر فاریابی اور ابن یمین نے اسے صِبْغَة اللّٰہی = صِبْغَة الالٰہی باندھا ہے۔

ظہیر فاریابی :
زلست چہرۂ دین را طراوت از پی آنک   تبیغ حجت آثار صبغۃ اللّٰہی

ابن یمین :
تو نیکہ رنگ رخت را جہانیان گویند   کہ چشم بد مرساد ت کہ صبغۃ اللّٰہی

حافظ نے البتہ صِبْغَةُ اللّٰہ ہی استعمال کیا ہے
با فریب این خم زنگار گون نیل فام   کار بر وفق مراد صبغۃ اللّٰہ کنی

(۲) یا طیف ان عذر الحبیب تجانبا   بینی و بینک موعداً لن تخلفا

قرآن : وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۲۰ : ۹۷
فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ ۲۰ : ۵۸

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۳) وما ابری نفسی و لا ازکیہا   کہ ہر چہ نقل کنند از بشر در امکان است

قرآن : وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۱۲ : ۵۳
فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۵۳ : ۲۲
يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۴ : ۴۹

وَلَا اُزَكِّيْهَا آخری دونوں آیتوں سے مقتبس ہے۔

(۴) چون دل ببردی دین مبر ہوش از من مسکین مبر   با مہربانان کین مبر لا تقتلوا صید الحرم

قرآن : لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۵ : ۹۵

بُعدِ لفظ و معنی ظاہر ہے۔

(۵) ہیچ پوشیدہ از تو پنہاں نیست   عالم السر و الخفیات
زیر و بالا نمی توانم گفت   خالق الارض و السماوات

[انوری :

بخدای کہ در ولایت غیب عالم السر و الخفیا تست

صفی علی شاہ :

با ھمہ بے خودی و نادانی عالم السر و الخفیاتم]

دونوں ترکیبیں قرآن کی نہیں۔

قرآن میں صرف یہ ہے :

اِنَّکَ تَعۡلَمُ مَا نُخۡفِیۡ وَمَا نُعۡلِنُ : ۱۴ : ۳۸

قرآن میں خالق کے بعد الارض والسماوات کے الفاظ بھی کہیں نہیں۔ یہ جملہ البتّہ اکثر ملتا ہے : خَلَقَ السماوات والارض (۲۴ بار)۔ سوائے ایک مقام کے (تَنۡزِیۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَ السَّمٰوٰتِ الۡعُلٰی ۲۰ : ۴) ہر جگہ سماوات' ارض سے پہلے ہے۔

(۶) یقدسون له بالخفی و الاعلان یسبّحون له بالغدوّ و الآصال

(عبدالمجید سالک کے مجموعے "راہ و رسم منزلہا" میں بھی یہ شعر بعینہٖ موجود ہے)

[رشید الدین وطواط :

کامران فی العلو و البسطه شادمان فی الغدوّ و الآصال
فلک متابع تو بالعشی و الابکار جہان مسخر تو بالغدوّ و الآصال

قرآن : یُسَبِّحُ لَهٗ فِیۡهَا بِالۡغُدُوِّ وَ الۡاٰصَالِ ۲۴ : ۳۶

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۷) و لکن من هداه الله افلح۔

یہ قرآنی جملہ نہیں۔ اَفۡلَحَ کو اَفۡلَحۡ باندھا گیا ہے۔

(۸) چنان تنگش آوردہ اندر کنار کہ پنداری اللیل یغشی النهار

قرآن : یُغۡشِی الَّیۡلُ النَّهَارَ ۷ : ۵۴

۱۳ : ۳

شاعر نے یُغۡشِی الَّیۡلُ کو اَللَّیۡلُ یغشی باندھا ہے۔

(۹) بدی را بدی سہل باشد جزا اگر مردی احسن الی ما اسا

محمد علی فروغی کے مرتبہ ایڈیشن میں "الیٰ ما" ہے اور عباس اقبال والے میں "الیٰ من" من جو درست تر معلوم ہوتا ہے

قرآن میں صرف یہ ہے : وَاَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَیۡكَ ۲۸ : ۷۷

حدیث میں ہے :
وَاَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَساءَ اِلَیْكَ (وَقُلِ الْحَقَّ وَلَوْ عَلٰی نَفْسِكَ)
شاعر نے آخری الیك حذف کر دیا اور اَساءَ کو اَسا باندھا

(۱۰) یا غافر الذنب هل ترعن نفسك فی　　قیل الاساری و اخوانٌ علٰی سُرُرٍ ؟

قرآن : اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ ۱۵ : ۴۷
اِخْوَانًا کو اِخْوَانٌ باندھا گیا ہے یا چھاپا گیا ہے۔

(۱۱) او یحسب الانسان ما سلك اهتدی　　لا من هدا الا الله فهو المهتدی

قرآن : مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِی ۷ : ۱۷۸
فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۱۲) طل عمری تصابیا ولعمری　　یحدث اللّٰهُ بعد ذلك امرا

[ابن یمین :
خرد گفتا مشو یکبارہ نومید　　لعل اللّٰه یحدث بعد ذلك

قرآن : لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۶۵ : ۱
پہلے شعر میں اللّٰهَ يُحْدِثُ کو یحدث اللّٰهُ باندھا گیا ہے۔ دوسرے شعر کے مصرعِ ثانی کا دوسرا رکن بجائے مفاعیلن کے مفاعلتن ہے۔ اَمْرا محذوف و متقدر ہے۔

(۱۳) ما علی العاقل من لغوی اذا مرّوا کراما　　لکن الجاهل ان خاطبنی قلت سلاما

قرآن : اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۲۵ : ۷۲
اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا ۲۵ : ۶۳

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۴) علیهم سلام الله فی کل لیلة　　بمقتل زوراء الی مطلع الفجر

قرآن : سَلَامٌ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۹۷ : ۵
فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۱۵) گو نظر باز کن و خلقت نارنج ببین　　ای کہ باور نکنی فی الشجر الاخضر نار
وافانین علیها جلّنارٌ　　علّقت بالشّجر الاخضر نارٌ

قرآن : جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا ۳۶ : ۸۰
مِنَ کو فی اور ب سے بدل دیا گیا ہے نارًا کو نار اور نارٌ سے۔

(۱۶) طوبیٰ لمن جمع الدنیا و فرقها   فی مصرف الخیر لا باغ ولا عاد
قرآن : غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ۲ : ۱۷۳
۶ : ۱۴۵

غیر کو لا بنا دیا گیا ہے۔

(۱۷) من استحمی بجاہ جلیل قدر   لقد اوی الیٰ رکنٍ شدید
قرآن : اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ ۱۱ : ۸۰

مصرعِ ثانی میں اَوْ، لَقَدْ بن گیا ہے۔

(۱۸) اَیُّہا الظاعنون من حیّ لیلیٰ   عجباً کیف تستطیعون صبرا
قرآن : اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ۱۸ : ۷۲
۱۸ : ۷۵

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۹) بہ تہدید اگر برکشد تیغ حکم   بمانند کرّ و بیان صُمٌّ بُکْمٌ
قرآن : صُمٌّ بُکْمٌ ۲ : ۱۸

صُمٌّ بُکْمٌ کو صُمُّ بُکُم باندھا گیا ہے۔

(۲۰) از آب و گل چنین صورت کہ دید است   تعالیٰ خالق الانسان من طین
قرآن : اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۳۸ : ۷۱
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ طِیْنٍ ۲۳ : ۱۲
وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۳۲ : ۷

فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۲۱) چنان ماند قاضی بجورش اسیر   کہ گفت ان ھذا لیومٌ عسیر
قرآن : فَذٰلِکَ یَوْمَئِذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ ۷۴ : ۹

فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۲۲) وَ اَخُوا العداوۃ لایمرّ بصالحٍ   الا ویلمزہ بکذّابٍ اَشِرٍ
قرآن : بَلْ ھُوَ کَذَّابٌ اَشِرٌ ۵۴ : ۲۵

کَذَّابٌ اَشِرٌ کو بِکَذَّابٍ اَشِرٍ باندھا گیا ہے۔

(۲۳) کادمی کہ نہ در مقام خود است   اسفل السافلین دیو دد است

[جوش ملیح آبادی :

گہے بستۂ اوج عرشِ بریں   گہے خستۂ اسفلُ السافلیں]

قرآن : ثُمَّ رَدَدْنَاہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ۹۵ : ۵

سَافِلِیْنَ کو اَلسَّافِلِیْنَ باندھا ہے۔ (احسن التقویم کی مانند جس کی بحث پہلے گزر چکی)

شمس تبریز

(۱) فرمود رب العالمین با صابرانم ہمنشین   اے ہمنشین صابراں! افرغ علینا صبرنا

رُومی : ربنا افرغ علینا صبرنا   لاتزل اقدامنا فی ذا الوحول

قرآن : رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا ۲ : ۲۵۰

صَبْرًا کو صَبْرَنَا باندھا گیا ہے۔

(۲) ویل لکل ھمزہ بر زبان بد بود   ھمّاز را لمّاز را جز چاشنی نبود دوا

قرآن : وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۱۰۴ : ۱

ھُمَزَةٍ کو ھُوْمَزَاۃٍ اشباع ضمہ اور فتحہ کے ساتھ باندھا گیا ہے۔

(۳) شرح جدائی و در آمیختگی سایہ و نور   لایتناھی و لئن جئت بضعف مددًا

قرآن : وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِہٖ مَدَدًا ۱۸ : ۱۰۹

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۴) اربا حکم تجلی البصر یعقوبکم یلقی النظر   یا یوسفینا فی البشر جودوا بما اللہ اشتریٰ

نے مشتری بے نوا بل نور اللہ اشتریٰ   گر یوسفی باشد ترا زین پیرھن بُوی بری

[رُومی :

لب بہ بستہ ہست در بیع و شریٰ   مشتری بے حد کہ اللہ اشتریٰ
مشتری من خدا است و مرا   می کشد بالا کہ اللہُ اشتریٰ
اے خداوند ایں خم و کوزۂ مرا   در پذیر از فضل اللہُ اشتریٰ]

قرآن : اِنَّ اللہَ اشْتَرٰی ۹ : ۱۱۱

پہلے شعر میں اِنَّ کی جگہ بما ہے۔ دوسرے میں اَللہَ ، اَللہِ اور باقی تینوں میں اَللہُ پڑھا جائے گا۔

(۵) الشمس خرت والقمر نسکا مع الاحدی عشر   قدامکم فی یقظة قدام یوسف فی الکریٰ

قرآن : اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ۱۲ : ۴

فرقِ الفاظ و عبارت ظاہر ہے۔

(۶) ازاں خرما کہ مریم را ندا کرد   کلی واشربی و قری عینا

قرآن : فَکُلِیْ وَاشْرَبِیْ وَقَرِّیْ عَیْنًا ۱۹ : ۲۶

مصرع یُوں پڑھا جائے گا : کُلِیْ وا اَشْرَبِیْ وا قَرِّیْ عَیْنا

قرآن میں وَشْ ہے مصرع میں وا اَشْ۔

(۷) چو بر براق سفر کرد در شبِ معراج   بیافت رتبۂ قاب قوسین او ادنی

قرآن : فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۵۳ : ۹

قَوْسَیْنِ (فعلان) کو قَسَیْن (فعول) باندھا گیا ہے۔

چو بر براق سفر کرد در شب معراج   بیافت مرتبہ قاب قوس او ادنی
زجان و تن برمیدی بجذبۂ جاناں   زقاب و قوس گزشتی بجذب او ادنی

ان دونوں شعروں میں قابَ قَوْسَیْن بالترتیب قاب قوس اور قاب و قوس ہو گیا ہے۔

(۸) اے بندہ باز گرد بدرگاہ ما بیا   بشنو از آسمانہا حیَّ علی الصّلا

اذان کے الفاظ ہیں : حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ

نیم شب چون صبح شد آواز دادند موذنان   ایہا العشاق قوموا واستعدوا للصلا

الصّلا مخففِ اَلصَّلٰوۃ۔

(۹) قد وجدت امرأۃ تملکہم   اوتیت من کل شی ولہا

قرآن : اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَۃً تَمْلِکُهُمْ وَاُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِیْمٌ ۲۷ : ۲۳

اِمْرَاَۃً کو اِمْرَاَۃْ ، تَمْلِکُهُمْ کو تَمْ لِ کُهُمْ ، وَلَهَا کو والَهَا باندھا گیا ہے۔

(۱۰) کز چہرہ می نمودی لم یتخذ ولدا را

قرآن : وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا ۲۵ : ۲

وَلَدًا کو وَلَدْ باندھا گیا ہے۔

(۱۱) ای عشق باتو استم و ز بادۂ تو مستم   وز تو بلند و پستم وقت دنا تدلی

[خواجہ معین الدین اجمیریؒ]

زاند شدن دنا تدلّٰی   آن دائرہ گشتہ قاب قوسین

احمد رضا خان بریلوی :

یہ ان کا بڑھنا تو نام کا تھا حقیقتًہ فعل تھا ادھر کا   تنزّلوں میں ترقّی افزا دنیٰ تدلّٰی کے سلسلے تھے

نسیم امروہوی؛
آئینہ دَنا فَتَدَلّٰی تو خیر ہے   پردہ اٹھائیے کہ یہ خلوت میں غیر ہے]

قرآن؛ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۵۳ : ۸

آخری شاعر کے علاوہ باقیوں نے ثَ حذف کر دیا ہے۔

(۱۲) نگر بہ عیسیٰ مریم کہ از دوام سفر   چو آب چشمہ حیوان ست یُحیي الموتیٰ
زدم زدن کی شود ماندہ پاکی سیر شود   تو آن دمی کہ خدا گفت یحیي الموتیٰ

قرآن؛ وَاَنَّہٗ یُحْیِ الْمَوْتٰی ۲۲ : ۶
اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰی ۴۶ : ۳۳ ، ۷۵ : ۴۰

(۱۳) چو بوی یوسف معنی گل از گریبان یافت   دہان کشاد بخندہ کہ ھائی یا بُشرا

قرآن؛ قَالَ یٰبُشْرٰی ۱۲ : ۱۹

شاعر نے ھائی کا لفظ بڑھا دیا۔

(۱۴) کافراں را گفت حق ضرب الرقاب

قرآن؛ فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۴۷ : ۴

فَضَرْبَ کو ضَرب باندھا ہے۔

(۱۵) روح بخش ایں حماء مسنون را

قرآن؛ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۱۵ : ۲۸

ءٍ کو ء اور نٍ کو ں (نونِ غُنّہ) باندھا ہے۔

(۱۶) بانگ تسبیح بشنو از بالا   پس تو ھم سبّح اسمہ الاعلیٰ

قرآن؛ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی ۸۷ : ۱

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۷) تشنہ را کی بود فراموشی   چون سنقرِئک فلا تنسی

قرآن؛ سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰٓی ۸۷ : ۶

رِ کو اشباعِ کسرہ کے ساتھ رِی باندھا گیا ہے۔

(۱۸) ای یوسف صد انجمن یعقوب دیدا ستی چو من   اصفر خدی من جوی و ابیضّ عینی من بکا

[امیر معزّی:
طال اللیالی بعد کم و ابیضّ عینی من بکا   یا حبّذا ایا منا فی وصلکم یا حبذا]

قرآن : وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ ۱۲ : ۸۴

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۹) جان باز اندر عشق او چون سبط موسی را بگو   اذهب وربك قاتلا انا قعودها هنا

قرآن : فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ۵ : ۲۴

فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۲۰) سقانا ربنا كاساً دهاقاً   فشكرا ثم شكراً ثم شكراً

قرآن : وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۷۶ : ۲۱

(اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا) ——— وَّكَاْسًا دِهَاقًا ۷۸ : ۳۱، ۳۴

كاساً دِهاقاً سے پہلے سَقَاهُمْ کے الفاظ نہیں سقاهُمْ رَبُّهُمْ مصرع میں سقانا ربنا بن گیا ہے

(۲۱) فيا داؤد قدر حلقة السرد   ان داؤد قدروا فی السرد
ان جالوت بارز الطالوت

قرآن : وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ ۳۴ : ۱۰
اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِی السَّرْدِ ۳۴ : ۱۱
وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۲ : ۲۵۰

فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۲۲) چو لاتعاف من الكافرين ديارا   دعای نوح نبی است و او مجاب دعاست

قرآن : وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۷۱ : ۲۶

شاعر نے لَا تَذَرْ کو لاتعاف بنا دیا ہے اور درمیان سے عَلَى الْاَرْضِ کو نکال دیا ہے۔

(۲۳) مونس احمد مرسل بجهان کیست بگو   شمس تبریز شهنشاه که احدی الکبر است
من خمش گردم ای خواجه ولیکن زنهار   هله منگر سوی ماست که احدی الکبریم
قلت لروح القدس ما هی قل لی عجباً   قال اما تعرفها تلك لاحدی الكبر

قرآن : اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ۷۴ : ۳۵

پہلے دو شعروں میں لَ غایب ہے اور آخری شعر میں اِنَّهَا کی بجاے تلك ہے۔

(۲۴) چونک مثقال ذره یره است   ذره زله بے نکایت نیست

قرآن : ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۹۹ : ۷
ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۹۹ : ۸

فرق ظاہر ہے۔

(۲۵) قد رجعنا قد رجعنا جائیاً من طورکم   انظرونا انظرونا نقتبس من نورکم

قرآن : اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۵۷ : ۱۳

ایک اُنْظُرُوْنَا زاید ہے۔

(۲۶) حیث ماکنتم فولّوا شطرہ   بازجاجہ دل پری خوان توایم

قرآن : وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۲ : ۱۴۴

شَطْرَهٗ سے پہلے وُجُوْهَكُمْ غایب ہے۔

(۲۷) قلب میا ور بدانک غرّہ کنی مشتری   ترس ز ویل لکل جمع مالا و عد

قرآن : وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۱۰۴ : ۱، ۲

عَدَّدَهٗ کی جگہ صرف عَدْ ہے اور جَمَعَ کے جَ کو اشباعِ فتحہ کے ساتھ جا باندھا گیا ہے

(۲۸) در فتوح فتحت ابوابھا   گرودت دشوارھا آسان بلی

قرآن : وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا ۳۹ : ۷۳

فُتِحَتْ کی فُ کو اشباعِ ضمّہ کے ساتھ فُو باندھا گیا ہے۔

(۲۹) کاہ راکوہ کند ذاک علی اللّٰہ یسیر

قرآن : وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۶۴ : ۷

ذٰلِكَ کو ذاک باندھا گیا ہے۔

(۳۰) نیم آن شاہ کہ از تخت بتابوت روم   خالدین ابدًا شد رقم منشورم

قرآن : خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۹۸ : ۸

فِيْهَا کو حذف کر دیا گیا۔

(۳۱) جانم شدہ زینہا خنک یا ذا السّماءِ والحبک   ای گلرخ و گلزار من ای روضہ و ازھار من

قرآن : وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ۔ ۵۱ : ۷

نظم و ترتیبِ کلمات کا فرق ظاہر ہے۔

(۳۲) از قل الروح امر ربّی فہم شد   شرح جان ای جان نیاید در دہن

قرآن : قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ۱۷ : ۸۵

مِنْ غایب ہے اَلرُّوْحُ کو اَلرُّوْحْ باندھا گیا ہے یا حُ اُمْ کو حُمْ۔

(۳۳) بانگ آید هر زمانی زین رواق نیلگون   آیت انّا بنیناها و انّا موسعون

[فیض کاشانی :

در مقام شرح انّا موسعون   گنبد دوار می گوید سخن]

قرآن : وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۵۱ : ۴۷

پہلے شعر میں اِنّا اضافۂ شاعر ہے۔ بِاَیْدٍ غایب۔ اور دونوں شعروں میں لَمُو کو مُو باندھا گیا ہے۔

(۳۴) نردبان حاصل کنید از ذی المعارج بر روید   تعرج الروح الیه والملایك اجمعون

قرآن : تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ ۷۰ : ۴

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۳۵) امشب صدقات می دهد شاه   انّ الصدقات للمساکین

قرآن : اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ ۹ : ۶۱

لِلْفُقَرَآءِ ساقط   اِنَّما = اِنَّ   اور وَلْ = لِلْ

(۳۶) یومئذ مسفره ضاحکه بود چنان   ناعمه لسعیها راضیه بود چنین

قرآن : وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ ۸۰ : ۳۸، ۳۹

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۸۸ : ۸، ۹

شعر کا وزن مفتعلن مفاعلن ہے اس لیے مُسْفِرَةٌ کو مُسَفِّرَه پڑھنا پڑے گا۔

(۳۷) زِ یسقون رحیقاً نوش می کن   وخل ذا التحدث یا کلیمی

قرآن : يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۸۳ : ۲۵

مِنْ رَّحِيْقٍ کو رَحِيْقًا باندھا گیا ہے۔

(۳۸) کهه کنزاً کنتُ مخفیاً فاحببتُ بان اعرف   برای جان مشتاقان برغم نفس امّاره

حدیثِ قدسی : قَالَ دَاوٗد : يَا رَبِّ لِمَاذَا خَلَقْتَ الْخَلْقَ ؟

قَالَ : كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِكَيْ اُعْرَفَ۔

[حق تعالی خواست که صنع خود ظاہر کند عالم آفرید

خواست که خود را ظاہر کند آدم را آفرید]

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۳۹) لیک تو اشتاب کم کن صبر کن   گرچه فرموداست که الانسان عجول

قرآن : وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۱۷ : ۱۱

کَانَ غایب ہے اور عَجُولًا کو عَجُول سے تبدیل کردیا ہے۔

(۴۰) چون لاتاسُوا علیٰ مافات گفت است　　ثمن ارزد برنج دام ، دانہ
قال، لاتاسُوا عـلیٰ مافـاتکم　　از بدی بدر خروق لحجاب

قرآن : لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ ۵۷ : ۲۳

دونوں شعروں میں لِکَیْلَا صرف لَا ہے اور پہلے میں فَاتَکُمْ فَاتَ۔

(۴۱) خاموش کن ای خاسر انسان لفی خسر　　از گلشن دیدار بہ گفتار رسیدہ

قرآن : اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۱۰۳ : ۲

اَلْاِنْسَان کا ال (تعریف کا) غایب ہے۔

(۴۲) چون یخرج حی من میّت عیان شد　　جماد مردہ شد صاحب عنانی

قرآن : یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ ۶ : ۹۵

۱۰ : ۳۱

۳۰ : ۱۹

یُخْرِجُ کو یُخْرِجْ ، اَلْحَیَّ کو حَیّ ، الْمَیِّتِ کو مَیِّتْ باندھا گیا ہے۔

(۴۳) چہ فرمود است حق کالصّلح خیر　　رہا کن ماجرا را ای یگانہ
بوی رسالت رسید روضۂ رضوان دمید　　صلح کن الصلح خیر کوری دیو لوند

قرآن : وَالصُّلْحُ خَیْرٌ ۴ : ۱۲۸

پہلے شعر میں وَالصُّلْحُ کالصُّلح اور دوسرے میں اَلصُّلح باندھا گیا ہے۔

(۴۴) بخوان قرآن نسوّی تا بنانہ

قرآن : بَلٰی قَادِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ۷۵ : ۴

نُسَوِّیَ کو نُسَوِّیْ باندھا گیا ہے۔ تا اضافۂ شاعر ہے۔ تا کی ضرورت نہیں تھی نُسَوِّیَ بنانہ سے وزن پورا ہوجاتا ہے دِ اور یَ کے اشباع کے ساتھ۔

(۴۵) رحما بینھم آید ھمچو آبیم　　چون اشدّآءُ علی الکفر بود پولادیم

قرآن : اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ۴۸ : ۲۹

اَلْکُفّار کی بجاے الکفر استعمال کیا گیا ہے اور رُحَمَاءُ کا رُ حذف کردیا گیا ہے۔

(۴۶) ای شمس تبریزی کہ تو از پردۂ شب فارغی　　لا شرقی و لا غربی اکنون سخن کوتاہ کن
زانکہ لاشرقیہ بود است و لاغربیہ　　زانکہ شرق و غرب باشد در زمین و در زمان

قرآن : لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۲۴ : ۳۵

فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۴۷) یرزقون فرحین بخوریم آن می و نقل   مقعد صدق چون شد منزل عشاق کن

قرآن : يُرْزَقُوْنَ ۳ : ۱۶۹

۴۰ : ۴۰

فَرِحِيْنَ بِمَآ آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۳ : ۱۷۰

دو مختلف آیتوں کے الفاظ کو ملا دیا ہے۔

(۴۸) ای سنائی رو مدد خواه از روان مصطفیٰ   مصطفیٰ ما جاء الّا رحمۃ للعالمین

قرآن : وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ ۲۱ : ۱۰۷

مَا جَاءَ اضافۂ شاعر ہے۔

(۴۹) شرالبش ده بخوابانش برون برازگلستانش   که تا درگردن او فردا زغم جبل مسد بیند

ازبولهب و جفتی او چونک بریم   ببینم زخود جبل مسد را بکلیده

قرآن : فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۱۱۱ : ۵

دونوں شعروں میں حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ کی بجائے حبلِ مسد ہے۔

(۵۰) آنکه باشد بر زبانها لا احب الآفلین   باقیات الصالحات است آنکه در دل حاصل است

[حالی :

چھوڑ جائیں گے جہاں میں جو کہ تجھ جیسے نشاں   چھوڑ جائیں گے وہی کچھ باقیات الصّالحات

احسن مارہروی :

اے مسلمانوں کی عزت بخش یونیورسٹی   تو ہے ایسے نیکدل کی باقیات الصالحات

قرآن : وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا۔ ۱۸ : ۴۶

۱۹ : ۷۶

تینوں شعروں میں والباقیات کی جگہ صرف باقیات ہے۔

سنائی اور عطار نے والباقیات کی جگہ الباقیات استعمال کیا ہے

سنائی :

ای چون ملک ای چون پری بر سامری کن ساحری
تا بر تو خوانم یک سری الباقیات الصّالحات

عطّار :

ذکر باقی را بزرگان عمر ثانی خوانده اند
ایں ذخیرہ بس تو را الباقیات الصالحات

(۵۱) نی ہاو خاصہ نیشکر بر طمع ایں بسمہ کمر   رقصاں شدہ در نیستان یعنی تعزّ من تشا

عطّار :

شاہ یک روزی بدو گفت ای عقل   وتعز من تشاء و تذل

پیر مہر علی شاہ :

انت تھدی انت تضلل من تشاء   انت تعز انت تذ لل ہو کرا
انت تھدی من تشاء وتضلّ من تشا

قرآن : وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۳ : ۲۶

پہلے شعر میں تشاءُ کو تشا باندھا گیا ہے دُوسرے میں تُذِلُّ کو تذل —— اور دونوں جگہ و کو اشباع کے ساتھ وا باندھا گیا ہے۔ تیسرے کے مصرع ثانی میں قرآنی مفہوم کو انت تعز انت تذلل کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے۔

پہلے دونوں مصرعے اس آیت سے مستخرج ہیں :

تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ تَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ ۷ : ۵۵ —فرق بیّن ہے۔

(۵۲) باز کنی صد در و گوئی بار آ   فالق اصباحی و رب الفلق

قرآن : فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۶ : ۹۶
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۱۱۳ : ۱

الاصباح کی جگہ اصباحی ہے۔ بِرَبِّ کی جگہ صرف رَبِّ۔

(۵۳) الف بدر حول بدری سجّداً خرّوا لہ   طیبو ما حولنا واستشرقوا دیجورنا

قرآن : وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۱۲ : ۱۰۰

ترتیبِ الفاظ تبدیل شدہ ہے۔

(۵۴) سومی بحر رو چو ماھی کہ بیافت در شاھی   چہ بگوید او چہ خواھی تو بگو ایک فارغب

احمد رضا خاں بریلوی :

وَاِلَی الْاِلٰہ فارغب کرو عرض سب کے مطلب
کہ تمہیں کو تکتے ہیں سب کرو ان پہ اپنا سایہ   بنو شافعِ خطایا

قرآن : وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ ۹۴ : ۸

فرقِ الفاظ دونوں شعروں کا واضح ہے۔

امیر خسرو نے البتہ قرآنی الفاظ کو بعینہٖ استعمال کیا ہے

منم و قامت شاهد برو ای خواجہ ما ذن
تو در مسجد خود زن وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ

(۵۵) اقسم بالعادیات احلف بالموریات   غیرک یا ذا الصلات فی نظری کالمدٌ

قرآن : وَالْعَادِیَاتِ ضَبْحًا فَالْمُوْرِیَاتِ قَدْحًا ۱۰۰ : ۱، ۲

وَ اور فَ کو دونوں جگہ بِ سے بدل دیا گیا ہے۔

(۵۶) یا من ولی انعامنا ثبت لنا اقدامنا   ای بے تو راحت ھا عنا ای بی تو صحت ہا سقم

قرآن : وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا ۲ : ۲۵

۳ : ۱۴۷

لَنَا اضافہ شاعر ہے۔

(۵۷) زمین لرزید ای خاکی بہ آن قدس و آن پاکی   اذا ما زلزلت برخوان نظر را در زلازل کش

قرآن : اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۹۹ : ۱

زُلْزِلَتِ کی تِ کو ساکن باندھا گیا ہے اور ماقبل 'ما' کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

(۵۸) ما رمیت اذ رمیت ھم ز خدا ست   تیر ناگہ کزین کمان آید

[ما رمیت اذ رمیت از شکارستان غیب   می جهاند تیرها ی بے کمان اے عاشقان]

قرآن : مَارَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ ۸ : ۱۷

پہلے شعر میں پہلے رَمَيْتَ کو رَمَيْتْ باندھا گیا ہے یا پھر تَ اِذْ کو تَذْ۔

(۵۹) انا منذ رایتھم انا صرت بلا انا   صورۃ فی زجاجۃ نور الارض والسما

قرآن : اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْ
فِیْ زُجَاجَةٍ ۲۴ : ۳۵

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۶۰) ربنا اتمم لنا یوم التلاقی نورنا   ربنا واغفر لنا ثم اکسنا ذاک الغفار

قرآن : رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا ۶۶ : ۸

بیچ میں یوم التّلاقی کے الفاظ شاعر نے ڈال دئے ہیں۔

(۶۱) چون درّ سخن با سفت والارض مهادا گفت   این میخ زمین گشتہ وز شہر دل آوارہ
قرآن : اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا   ۷۸ : ۶
وَ اضافۂ شاعر ہے۔

(۶۲) هلا برجه که ان اللّٰه یدعوا   غریبی را رها کن رو بخانه
قرآن : وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا   ۲ : ۲۲۱ ، ۱۰ : ۲۵
مصرعِ اُولیٰ میں وَ کی جگہ اِنَّ ہے۔

(۶۳) سماح آمد رباح از قولِ یزدان   کہ عشقی بہ زصد قنطار، برجسہ
اَلسَّمَاحُ رَبَاحٌ وَالْعُسْرُ شُوْم

——— مگر یہ قولِ یزداں نہیں
رُومی نے بجا کہا ہے: تا بگفتہ مصطفیٰ شاہ نجاح   السماح یا اولی النعمی رباح

(۶۴) یارب ظلمت نفسی بر در حجاب حتّی   گر مس نمودی منتی آخر تو کیمیائی
قرآن : قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ   ۲۷ : ۴۴
رَبِّ ، یا رب بن گیا ہے اور ما بعد کا اِنّی غائب

(۶۵) جاء ربک والملائک چون رسید   بر محال اکنون شدہ امکان ، بلی
قرآن : وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا   ۸۹ : ۲۳
وَالْمَلَكُ کو وَ الْمَلَائك باندھا ہے اور رَبُّكَ کو رَبُّكْ۔

(۶۶) من الکلیم و لا و الرب قد تجلی   انی آنست نارا کن . هکذا حبیبی
قرآن : اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا   ۲۰ : ۱۰ ، ۲۷ : ۷ ، ۲۸ : ۲۹
آنستُ کو آنَسْتُ باندھا ہے۔

(۶۷) ما غریبان فراقیم اے شہان   بشنوید از ما الی اللّٰہ المآب
[جامی : بحر بقای توئی و عالم بر آب   منك البدا و الیك المآب
قرآن : اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰب   ۱۳ : ۳۶
پہلے شاعر نے اِلَیْہِ مآب کو الی اللّٰہ المآب باندھا ہے اور دوسرے نے الیك المآب۔

(۶۸) سرو چہ ماند بخسی ؟ زر بچہ ماند بمسی ؟   تو بچہ مانی بکسی ؟ ای ملک یوم الدین
قرآن : مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ   ۱ : ۳   مٰلِك کو مَلِك باندھا گیا ہے اور یوم الدّین کو تسکینِ اوسط کے عمل سے مفعولن کے وزن پر۔ یعنی رکنِ مفتعلن کو مفعولن سے بدل دیا گیا ہے جس میں بظاہر کوئی حرج نہیں۔

(۶۹) بسم اللّٰہ ابتدای کلام من الیقین   رحمٰن و الرحیم ترحم لخاطبین

دارند ہر کسی بتو چشم ترحمی   رحمٰن والرحیم بہ بخشش وخطا میں
قرآن: بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۱ : ۱
۲۷ : ۳۰

اَلرَّحْمٰن کو رحمان باندھا ہے اور اس کے بعد کا و اضافۂ شاعر ہے۔

رُومی ——— مثنوی

مثنوی پر دوبارہ نظر ڈالی تو چند شعر اور نظر آئے جو پہلے جائزے میں سہواً نظر انداز ہو گئے تھے۔

دفترِ اوّل

(۱) گفت طوبیٰ من رانی مصطفیٰ   وَالّذی یُبصرلمن وَجھی یرٰی
یُبْصِرُ کو یُبْصِرْ باندھا گیا ہے۔ الذی کے ل کی بجائے اپر زبر ہے یا للعجب! رأی

(۲) ھکذا تعرج وتنزل دائما   ذا فلا زالت علیہ قائما
قرآن: مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا۔ ۳۴ : ۲
اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْہِ قَآئِمًا۔ ۳ : ۷۵

تَعْرُجُ اور تَنْزِلُ کو تَعْرُجْ اور تَنْزِلْ باندھا گیا ہے۔ باقی اختلافِ الفاظ دونوں مصرعوں کا ظاہر ہے۔

(۳) چون پی یسکن الیہاش آفرید   کی تواند آدم از حوّا برید
قرآن: وَجَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا ۷ : ۱۸۹
لِیَسْکُنَ کو یَسْکُنْ باندھا گیا ہے۔

(۴) زان امام المتقین داد این خبر   گفت اذا جاءُ القضا عمی البصر
آدما تو نیستی کو راز نظر (بصر)   لیک اذا جاء القضا عمی البصر
سبلتت را برکند یک قدر   تا بدانی کالقدر یعمی البصر

سنائی:
من تدّتی کردم حذر از عشقت ای شیرین پسر   آخر در آمد دل بسر جاء القضا عمی البصر

امیر معزی:
قل ان حالی ذو خطر والقول فیہ مختصر   جاء القضا عمی البصر شکر الھاً منعما

رُومی :

مرحبا یا مجتبیٰ یا مرتضیٰ   اِن تغب جاء القضا ضاق الفضا
ہست ہر چندین فنون ہای قضا   گفت اذا جاء القضا ضاق الفضا
جملہ گفتند ای امیر با خبر   الحذر دع لیس یغنی عن قدر
حکیم

شمس تبریز :

برخار پشت ہر بلا خود را مزن تو ہم ھلا   ساکن نشین وین ورد خوان جاء القضا ضاق الفضا

سنائی :

تنگ شد بر ما فضای عافیت بے ہیچ جُرم   اینچنین باشد اذا جاءُ القضا ضاق الفضا
عقل می گفت این اذا جاء القضا ضاق الفضا   جان می گفت اذا جاء القدر ضاع الحذر

اذا جاءَ القدر عمی البصر (یا غشی البصر) ——— قولِ علیؓ

یوم ما قدر لم اخشی الردی   واذا قدر لم یغن الحذر
اذا دخل القدر بطل الحذر

عَمِیَ البَصَر کو شاعروں نے عَمْیَلْ اسکانِ م کے ساتھ باندھا ہے۔

(۵) آں جمادی گشت از فضلش لطیف   کل شی من ظریف ھو ظریف

ھُوَ کو ھُوْ باندھا گیا ہے۔

(۶) چون ابیت عند ربی فاش شد   یطعم ویسقی کنایت زاش شد

عطار :

گر نیابی تا ابد بوی طعام   قوت یطعمنی و یسقینی تمام

قربان علی سالک :

حدیث یطعمنی یسقنی ہی کافی ہے   دلیل قرب خداوند بے عدیل و ہمال

قرآن : ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۲۶ : ۷۹

حدیث : اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِی رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِی۔ (نظیری کے ذکر میں اس حدیث کا بیان گزر چکا ہے) ——— رُومی نے یُطعمنی ویسقینی کی جگہ یطعم ویسقی استعمال کیا ہے۔ سالک نے یسقینی کی جگہ یسقنی۔ عطار نے یُطعِمُنی کی مُ کو مْ باندھا ہے۔

(۷) ہمچو گرگ آں شیر بر درّاندش
فانتقمنا منہم بر خواندش

قرآن : فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ   ۷ : ۱۳۶

۱۵ : ۷۹

۴۳ : ۲۵

۴۳ : ۵۵

مِنْهُمْ کو مِنْهُمُ باندھا گیا ہے تحریک مْ کے ساتھ۔

(۸) گفت الیس اللہ بکاف عبدہ   تا نہ گردد بندہ ہر سو حیلہ جو

قرآن : اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ   ۳۹ : ۳۶

اللّٰہُ کو اللّٰہْ باندھا گیا ہے۔ اَلَیْسَ بھی وزن میں لَیْسَ ہی پڑھا جاتا ہے کیونکہ لَ کے ساتھ وزن پہلے رکن کا بجائے فاعلاتن کے فاعلتن بن جاتا ہے۔ ویسے ایک لحاظ سے اسے شاعرانہ رخصت بھی کیا جا سکتا ہے۔

(۹) بومسیلم را لقب کذاب بود   مر محمد را اولوا الالباب بود
ماند   ماند

اولوا الالباب جمع کو واحد استعمال کیا گیا ہے۔

چوں عقل شریف حضرتش بیش از حد زیاد بود
شخص شریف شان بنا بقاعدۂ واحد کا لالف

برمنزلۂ جمع تنزیل و اولوا الالباب —— صاحبان عقلہا ، ارباب عقول —— نامیدہ شد

ایسے ہی جیسے اولوا العزم اور اولی الامر (اولوا الامر) کو واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سودا :

جیسے کہ کہیے اولی الامر ہے حُسینِ شہید   امام برحق و معصوم پاک از اجداد

فیض احمد فیض :

ہر اک اُولی الامر کو صدا دو

انیس :

آؤں طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم   خیبر کی خبر لائے مری طبع اولوا العزم
سرکش ہیں سب ہماری زبردستیوں کے زیر   دادا شجاع باپ اولوا العزم ہم دلیر

(کاشف الحقائق میں اولوا العزم کی جگہ جوانمرد درج ہے)

میر مونس :

جانباز، سرفراز، اولوالعزم، نامدار   شایستہ، شیر دل، سمن اندام، بردبار

میر نفیس :

عالی دماغ، شیر اولوالعزم، قلعہ گیر   ذی مرتبت، سپہر وغا کا مہ منیر

جعفر طاہر :

ذی قدر، اولوالعزم، جگر دار، سخن سنج

(۱۰) اطلب المعنی من الفرقان و قل   لانفرق بین آحاد الرسل

قرآن : لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۲ : ۲۸۵

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۱) اَبْشِرُوْا یا قوم اذ جاء الفرج   اِفرحوا یا قوم قد زال الحرج
سوی نخچیران دوید آن شیر گیر   کابشروا یا قوم اذ جاء البشیر

قرآن میں اَبْشِرُوْا کا لفظ صرف اس آیت میں استعمال ہوا ہے

وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۴۱ : ۳۰

اس مصرع کا ماخذ انوری کا یہ شعر معلوم ہوتا ہے :

ابشروا یا اھل نیشا پور اذ جاء البشیر   کاندر آمد موکب میمون منصور وزیر

تاج الدین سمرقندی کا بھی شعر ہے :

وقت مولود تو آمد این ندا از جبرئیل   ابشروا یا اھل نیشاپور اذ جاء البشیر

احمد جام ژندہ پیل کا شعر ہے :

بوی خلقش تازہ گردانید عیسیٰ را نفس
زان نفس بر خلق پیدا کردہ قد جاء البشیر

دفتر دوم

(۱۲) ماکران بسیار لیکن در کمین   ماکر او دان و ھو خیر الماکرین

قرآن : وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ۳ : ۵۴
۸ : ۳۰

وَاللّٰهُ کی جگہ وھو ہے جسے وَھُوَ باندھا گیا ہے۔

[اہلی شیرازی :
ہرجا کہ بستند ز مکر و مشورت ناحق ز تو   مکر حق جانش ستد و اللہ خیر الماکرین]

(۱۳) در خبر خیر الامور اوسطہا

[ابن یمین :
وسط گزین کہ گزیداست سید عربی   بدین حدیث کہ خیر الامور اوسطہا

حدیث : اَمْرٌ بَیْنَ اَمْرَیْنِ وَ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوساطُہا (اوسطہا)
اوسطہا کو اوساطہا پڑھا جائے گا۔ اُمودِ کی دِ کو ساکن ڈ۔

(۱۴) گفت یزدانت فمنکم مؤمنٌ   باز منکم کافر و گبر کہن
قرآن : فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَ مِنْکُمْ مومِنٌ ۴ : ۹۲
نشست الفاظ کا اختلاف مبرہن ہے۔

(۱۵) قول ان من امۃٍ را یاد گیر   تا بہ اِلاَّ و خلا فیہا نذیر
قرآن : وَ اِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ ۳۵ : ۲۴
اِنْ سے پہلی وَ کو اِلاَّ اور خَلا کے درمیان میں خواہ مخواہ دھانس دیا ہے اور اسے بروزن وا باندھا ہے اِشباعِ فتحہ کے ساتھ۔

(۱۶) پس عدم گردم عدم چون ارغنون   گویدم کانّا الیہ راجعون
قرآن : اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۷ : ۱۵۶
وَ اِنَّا کو کَاَنَّا باندھا ہے۔

دفتر سوم

(۱۷) اجعل الخضر لامری سببا   ذاك او امضی و اسری حقبا
قرآن : فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۱۸ : ۸۵، ۸۹، ۹۲
اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا ۱۸ : ۶۰
سَبَبًا کو سابیا ، اَمْضِیَ کو اَمْضِیْ اور حُقُبًا کو حوقُبا باندھا گیا ہے۔

(۱۸) آخرون السابقون باش ای ظریف   بر شجر سابق بود میوہ لطیف

[عطار : لا جرم گفت آن رسول ذو فنون   رمز نحن الآخرون السابقون
او نبی بود از درون و از برون   قال نحن الآخرون السابقون
شمس تبریز : گر آخر آمد عشق تو گردد ز اولہا فزون   بنوشت توقیع خدا کالاخرون السابقون]

قرآن ، وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ ۹ : ۱۰۰   وَالسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ ۵۶ : ۱۰
حدیث : نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔
پہلے شعر میں رومی نے الآخِرُوْن کو آخرون اور اَلسَّابِقُوْنَ کے نَ کو ں (نون غنّہ) باندھا ہے۔

(۱۹) دست شد بالای دست این تا کجا   تا بہ یزدان کہ الیہِ المنتہٰی

[احمد رضا خاں بریلوی :
نیست عون از غیر تو بل غیر تو خود ہیچ نیست   یا الٰہ الحق الیک المنتہٰی امداد کن]
قرآن : وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی ۵۳ : ۴۲
اِلٰی رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا ۷۹ : ۴۴
فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۲۰) بر جہد آن کشتہ را آسیبش ز جا   در خطاب اضربوہ بعضہا
قرآن : فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۲ : ۷۳
بِ ساقط ہے۔

(۲۱) من خلیلم تو پسر پیش بچک   سر بنہ انی ارانی اذبحک
قرآن : اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُكَ ۳۷ : ۱۰۲
اَرٰی اَنِّیْ کو ارانی باندھا ہے۔

(۲۲) ثالثاً تا از تو بیرون رفتہ ام   گوئیا ثالث ثلاثہ گفتہ ام
قرآن : لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۵ : ۷۳
ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ کو ثالث ثلاثہ باندھا گیا ہے۔

(۲۳) سابع از ثامن ندانم ضالّہ ام   خون ھمی گرید فلک از نالہ ام
قرآن : وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۹۳ : ۷
ضالّہ کا وزن فاعلن ہے جب کہ اسے فاع باندھا گیا ہے لفظ ضالّا ہے نہ کہ ضالّہ، جو کہ ضالّ کا مونث ہے۔ ضالّہ کے معنی گمشدہ چیز کے ہیں (اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ)؛ ضالّا (ضالّ) کے گمراہ، سرگشتہ کے۔
مثنوی ہی کا شعر ہے : زین سبب کہ علم ضالّہ مومنست   عارف ضالّہ خود است و موقنست

دفتر چہارم

(۲۴) تا بگوید چون ز چاہ آئی پیام   جان کہ یا بُشرٰی لی ھٰذا غلام

قُرآن: قَالَ یَا بُشْریٰ ھٰذَا غُلام ۱۲ : ۱۹
بُشْریٰ کے بعد لی اضافۂ شاعر ہے جسے لیَ پڑھا جائے گا۔

(۲۵) تیرہ کردی زنگ دادی در نہاد　　این بود یسعون فی الارض فساد
قرآن: وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا ۵ : ۶۴
فَسَادًا کو فساد باندھا گیا ہے۔

(۲۶) حاصل آنکہ کم مکن ای بی سرور　　صیقلی واللہ اعلم بالصُّدور
ہمچنیں ہمراہ بد دوری گزین　　زینہار اللہ اعلم بالیقین
قُرآن: اَوَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِی صُدُوْرِ الْعَالَمِیْنَ ۲۹ : ۱۰
پہلے شعر کے مصرع ثانی میں لَیْسَ اللّٰہُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِی صُدُوْر کو وَ اللّٰہُ اَعْلَمْ بِالصُّدُوْر باندھا گیا ہے اور دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں بِاَعْلَمَ کو اَعْلَمْ۔

دفتر پنجم

(۲۷) این اَلَمٓ و حٰمٓ این حروف　　چون عصای موسیٰ آمد در وقوف
این الم و حم ای پدر　　آمداست از حضرت خیر البشر
معلوم نہیں پہلے مصرعوں کی تقطیع کیسے ہوگی؟
اور پھر اَلَمٓ حٰمٓ حضرت خیر البشر سے نہیں بلکہ خالق البشر کی طرف سے آئے ہیں۔ اقبال کا شعر ہے:
حمد بے حد مر رسولِ پاک را　　آنکہ ایماں داد مشتِ خاک را　　(پس چہ باید کرد)
حمد کا لفظ صرف خدا کے لیے مخصوص ہے اور ایمان دینے والا بھی وہی ہے۔ رسول صرف بشارت دینے والا، ڈرانے والا اور خدا کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے والا ہے۔ شعر واوین میں ہے۔ نیچے درج ہے: (خواجہ عطار بہ تغیرِ لفظی)۔ تغیر یہی ہے کہ "خدائے" کو "رسولِ" سے بدل دیا۔

(۲۸) یاریت در تو فزاید فی درد　　گفت حق ان تنصروا اللہ ینصر
قرآن: اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ ۴۷ : ۷
اَللّٰہُ کو اَللّٰہ اور یَنْصُرْکُمْ کو یَنْصُرُ باندھا گیا ہے۔

(۲۹) نی تو اعطیناک کوثر خواندہ ای　　پس چرا خشکی و تشنہ ماندہ ای
قرآن: اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ ۱۰۸ : ۱
اَلْکوثر کو صرف کوثر باندھا گیا ہے۔

(۳۰) عقل را با عقل دیگر یار کن　　امر شوری بینہم را کار کن

قرآن : اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ ۴۲ : ۳۶ اَمْرُهُمْ کو صرف اَمْر باندھا گیا ہے۔

دفتر ششم

(۳۱) در نبی بشنو بیانش از خدا آیت اشفقن ان یحملنها

قرآن : فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا ۳۳ : ۷۲ فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

دفترِ اول میں ہے : خود بہم این دم بے منتہا بازخوان فَاَبَین ان یحملنها

فَاَبَیْنَ کو فَاَبَیْنَ باندھا گیا ہے۔

(۳۲) کیست کز ممنوع گردد ممتنع چونکہ الانسان حریص ما مُنع
بود شان حرص لقای ممتنع چون حریص است آدمی فیما منع

حدیث : اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ عَلٰی مَا مُنِعَ
اِنَّ ابْنَ آدَمَ حَرِیْصٌ مَا مُنِعَ

درمیانی عَلٰی غایب ہے۔

خاقانی

(۱) اصلها ثابت صفات آن درخت فرعها فوق الثریا دیده ام

قرآن : اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ ۱۴ : ۲۴

ثَابِتٌ کو ثابث باندھا گیا ہے فِی السَّمَآءِ کو فَوْقَ الثُّرَیا سے بدل دیا گیا ہے۔

رُومی : شد درخت کژ مقوم حق نما اصله ثابت وفرعه فی السما

اَصْلُهَا اصلهٗ ہے، ثَابِتٌ ثابث ، فَرْعُهَا فَرْعُهٗ اور اَلسَّمَاءِ سماء

(۲) ہاتف همت عسی ان یبعثک آواز داد

قرآن : عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَكَ ۱۷ : ۷۹ کَ کو کْ باندھا گیا ہے۔

(۳) لاتلومونی ولوموا انفسکم انما المعشوق فینا مختلف

قرآن : فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَ لُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۱۴ : ۲۲

لُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مصرع میں لُوْمُنْ فوسکُمْ پڑھا جائے گا۔

(۴) از من آموزدم زدن بصبوح دم مستغفرین بالاسحار

[خواجو کرمانی :
بسوز و ساختن صابرین فی الافات باه و زاری مستغفرین بالاسحار]

قرآن: وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۳ : ۱۷

وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ کو مُسْتَغْفِرِیْنْ باندھا گیا ہے۔

(۵) رضیت بما قسم اللہ لی　　وفوضت امری الی خالقی
لقد احسن اللہ فیما مضی　　کذلک یحسن فیما بقی

یہ شعر کلّیاتِ شمس تبریز میں بھی ہیں۔ اور دونوں میں کہیں تصریح نہیں کہ یہ اشعار حضرت علیؓ سے منسوب ہیں۔

پہلے شعر کا مصرع ثانی اس آیت سے مستخرج ہے:

وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَى اللّٰهِ ۴۰ : ۴۴

چوتھے مصرع میں ل کو لی اور مِ کو سی اشباع کسرہ کے ساتھ باندھا گیا ہے۔

سورۂ زلزال سے مستخرج حضرت علیؓ سے ایک اور نظم بھی منسوب ہے:

اذا قَرُبَتْ سَاعَۃٌ یا لَـھَا　　وَزُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَـھَا
تَسِیْرُ الْجِبَالُ عَلٰی سُرْعَـتِہٖ　　کَمَرِّ السَّحَابِ تَرٰی حالَـھَا
وَتَنْفَطِرُ الارضُ مِنْ نَفْخَـتِہٖ　　هُنَالِكَ تُخْرِجُ اَثْقَالَـھَا
وَلَا بُدَّ مِنْ سَائِلٍ قَائِلٍ　　مِنَ النَّاسِ یَوْمَئِذٍ مَا لَـھَا؟
تُحَدِّثُ اخبارَھا رَبَّـھَا　　وَرَبُّكَ لَا شَكَّ اَوْحٰی لَـھَا
تری النَّفْسَ مَا عَمِلَتْ مُحْضَرًا　　وَلَوْ ذَرَّةٍ کَانَ مِثْقَالَـھَا

قرآن: اِذَا زُلْزِلَةِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا　وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا　وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا　يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا　بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا　يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ　فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ　وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۹۹ : ۱-۸

(۶) یحیی صفات بود چو یاسین وخصم او　　من ینکر المھیمن ان یحی العظام

[جامی:

منکر حشر را شود روشن　　سرّ یحی العظام و ھی رمیم
قدت را پایہ گردوں خرامی　　لبت را مایۂ یحی العظامی

استاد جمال الدین:

بصنع فایض یحیی العظام وھی رمیم　　بقھر صاعقہ کل من علیھا فان

حسرتؔ:

پوچھا اعجاز سے تیرے جو مسیحا نے سخن　　قالَ حییت عظامًا ھِیَ قد کان رمیم

میر تقی میر :

وہی احیا کن عظام رمیم   وہی رحماں وہی رؤف و رحیم]

قرآن : قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ ۳۶ : ۷۸

خاقانی نے اَنْ یُّحْیِ الْعِظَام باندھا ہے اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰی ۴۶ : ۳۳ ، ۷۵ : ۴۰ کے قیاس پر جامی اور جمال الدین کے شعروں میں وَہِیَ کو وَھِیَ باندھا گیا ہے۔ جامی نے دوسرے شعر میں العظامَ کو العظامِ باندھا ہے۔

(۷) برزبان ان نعبد الاصنام راندم تاکنون   دل بانی لا احب الآفلین شد رہبرم

قرآن : قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۶ : ۷۶

اِنّیِ کا اضافہ کرکے نَ کو ں (نون غیر ملفوظ) باندھا گیا ہے۔

(۸) ظفر برد زبرت چتر جاءِ نصر اللہ   اجل دہد بعدو زھر مالھم من واق

قرآن : اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ ۱۱۰ : ۱

جَآءَ کو جاءِ چھاپا گیا ہے۔

وَمَا لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ وَّاقٍ ۱۳ : ۳۴

مِنَ اللّٰہِ مصرع سے غایب ہے۔

(۹) ابلھم تا فضلۂ ماءِ الحمیم   برلب مومن جاں خواھم فشاند

قرآن : لَھُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۶ : ۷۰ ، ۱۰ : ۴

ماءِ الحمیم کی ترکیب شاعر کی خانہ ساز ہے۔

(۱۰) ملک ہر آنکہ آمین کند کہ بخشش را   دعوت قد سمع اللہ دعوتی و اجاب

قرآن : قَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّتِیْ ۵۸ : ۱

اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۲ : ۱۸۶

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۱) اگر نہ فضل تو فریاد من رسد بیم است   کہ قتل من کند او وقت خشیۃ الاملاق

جمال الدین اصفہانی :

دست جودت چناں برفشاند است   کز جہان برد خشیۃ الاملاق

قرآن : وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ۔ ۱۷ : ۳۱

دونوں شاعروں نے اِملاق پر ال کا اضافہ کر دیا ہے حالانکہ بادیٔ النظر اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

(۱۲) آوردہ روزنامۂ دولت در آستین   مہرش نہادہ سورہ والنجم اذا ھوی
قرآن : وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى ۵۳ : ۱
مصرع میں ھ اور ذ کی دونوں زیروں میں سے ایک کو ساقط کرنا پڑے گا اسے وزن سے مذگرنے دینے کے لیے۔

(۱۳) حسب رزق از خدای دارم و بس   حسبنا اللّٰہ وحدہٗ ابدا
چون تمسکت بحبل اللّٰہ از اول دیدند   حسبنا اللّٰہ وکفیٰ آخر انشا بینند

[نشاط اصفہانی :
عاشقاں را عشق بس باید کفیل   حسبنا اللّٰہ ربّنا نعم الوکیل

احمد رضا خاں بریلوی :
کیست مولائے بہ از ربّ جلیل   حسبنا اللّٰہ ربّنا نعم الوکیل]

قرآن : وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۳ : ۱۷۳
نشاط اور بریلوی نے وَ کو حذف کر کے بیچ میں ربّنا کا اضافہ کردیا ہے۔ خاقانی نے وحدہ ابدا کے الفاظ بڑھا دیے ہیں۔

[اقبال :
ما ہمہ خاک و دل آگاہ اوست   اعتصامش کن کہ حبل اللّٰہ اوست]

مگر حَبْلُ اللّٰہ کے ساتھ قرآن میں وَاعْتَصِمُوْا ہے :
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ ۳ : ۱۰۳
اور عُرْوَةُ الْوُثْقٰى کے ساتھ استمسك :
فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۲ : ۲۵۶ ، ۳۱ : ۲۲

(۱۴) اگرچہ ھر چہ عیال مند خصم منند   جواب ندھم الا انھم ھم السفھا
قرآن : أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ ۲ : ۱۳
آخری ءُ غایب ہے۔ دُوسرے مصرع کی تقطیع یُوں ہوگی :
جواب ند ہُم لا = ہمُلا

(۱۵) ولی وخصم تو مخصوص جنت وسقراند   کہ این ندای قد افلح شنود و آن قد خاب
قرآن : قَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ۲۰ : ۶۴
قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۲۳ : ۱

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰی ۸۷ : ۱۴
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۹۱ : ۹
وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰی ۲۰ : ۶۱

اَفْلَحَ کو اَفْلَحْ باندھا گیا ہے۔

(۱۶) قنوت من بہ نماز نیاز درین است — کہ عافنا وقنا شر ما قضیت لنا

مصرع ثانی پر بادیٔ النظر قرآن کی آیت کا گمان ہوتا ہے۔

(۱۷) معتقد گردد از اثبات دلیل — نفی لا تدرکہ الابصارش

قرآن: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَار ۶ : ۱۰۳

ہُ کے بعد ش کا اضافہ محض حرف مکرر ہے۔ دونوں ہی واحد غایب کی ضمیریں ہیں۔

(۱۸) دعاش گفتم و اکنون پناہ من بخدا ست — الیہ ادعوا بر خواندم و الیہ اناب

قرآن: اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَآب ۱۳ : ۳۶

مآب کی جگہ اناب چھپا ہے حاشیہ میں مناب اور متاب بھی لکھے ہیں۔ مگر مآب نہیں جو اصل لفظ ہے۔

(۱۹) فردان چار اند و مملکت دو — یزدان و قران و کعبہ و تو (تحفۃ العراقین)

مُصحفی: یوں پھر آخر کو دکوں سے کہا — یعنی جو طفل ہو قران پڑھا

میر تقی میر: مت مانیو کہ ہوگا یہ بیدرد اہلِ دین — گر آوے شیخ پہن کے جامہ قران کا

انیس: جو حرف قران کا ہے وہ ہے لائقِ تعظیم

[مرزا غلام احمد:
بخدا ہست ایں قران مجید — از دھان خدای پاک و وحید (دُرِّثمین)]

قُرآن بروزنِ فُعلان کو زبان و بیان کی طرح بروزنِ فعول باندھا گیا ہے۔

(۲۰) آسمان بر درش رکوع آورد — گفت سبحان ربی الاعلیٰ

سبحان ربی الاعلیٰ تو حالتِ سجدہ میں پڑھتے ہیں ورد در رکوع سبحان ربّی العظیم ہے۔

(۲۱) گویم کہ چهار اساس عمرت — چون سبع شداد باد محکم

[ظہیر فاریابی: ہمیشہ تا کہ بتقدیر صنع بی علت — بود فراختہ ایں چار طاق سبع شداد

محمد حسین آزاد: ترے مصالح حکمت جو دلویں استحکام — حباب بحر ہوں رشک بُرج سبع شداد

ہیں ایک دم میں بدلتے جہاں کے سو رنگ — عجب بنا پہ ہے بنیاد قصر سبع شداد

اهلی شیرازی:
چشمهٔ آبی که شد جمع در و هفت بحر   صورت تیغ علی است منبع سبع شداد

عرفی:
خدایگانا ز آنگونه سر بلندم کن   که همتم بکند همسری بسبع شداد

نظیری:
دو بار سبعهٔ الوان کشیده در هر روز   چو نزل سبع مثانی ز خوان سبع شداد]

قرآن: وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۷۸ : ۱۲

شاعروں نے سَبْعًا شِدَادًا کو سبع شداد میں ڈھال دیا ہے۔

(۲۲) این نامه بر سر دو جهان حجت منست   کو نامه نیست عروهٔ وثقی است لا انفصام

قرآن، فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۲ : ۲۵۶

تغیّرِ الفاظ ظاہر ہے۔

فیض کاشانی

(۱) شد قمر شق و ساعت اقتربت   نقد ساعات صرف ساعت کن

قرآن: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۵۴ : ۱

فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۲) کند طلوع چو خورشید ماحی الاعلان   چه جای نور سنا برق یذهب الابصار

قرآن: يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ۲۴ : ۴۳

بَرْقِهِ کو بَرق اور بِالْاَبْصَار کو صرف اَبصار باندھا گیا ہے۔

(۳) دل بےچارہ چون افتاد درین ورطہ نخست   روز و شب ورد منی اخرج منها می کرد

قرآن: قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا ۷ : ۱۸

یا تو شاعر نے جْ کو جُ باندھا ہے یا پھر فعلاتن کو

فعْلاتن = مفعولن کے وزن پر تسکینِ اوسط کے عمل سے۔

(۴) کیف یحی الارض بعد الموت را نظارہ کن   تا عیان گردد ترا البعث که حشر اکبر است

قرآن: وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۳۰ : ۲۴

فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۵) فیض از خود اگر بہ پرہیزی ان للمتقین حسن مآب

قرآن ؛ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ لَحُسْنَ مَاٰب ۳۸ : ۴۹

لَحُسْنَ کو حُسْنَ باندھا گیا ہے

[گفتمش مُرد فیض در غم تو گفت طوبیٰ لھم و حسن مآب

قرآن، طُوْبٰی لَھُمْ وَ حُسْنُ مَاٰب ۱۳ : ۲۹]

اسم واحد کے لیے ضمیر جمع غایب لائی گئی ہے۔

(۶) طوبیٰ لھم کہ سر بہ او فگندہ اند بشریٰ لھم کہ از دو جہان پا کشیدہ اند

قرآن ؛ لَھُمُ الْبُشْرٰی ۱۰ : ۶۴ ، ۳۹ : ۱۷

لَھُمُ الْبُشْرٰی کو بُشْرٰی لَھُمْ باندھا گیا ہے۔

(۷) شہود عشق زنجوای نحن اقرب مست جنود زھد ینادون من مکان لعبید

قرآن ؛ اُولٰٓئِکَ یُنَادُوْنَ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ ۴۱ : ۴۴

مَکَانٍ کو مَکَانِ باندھا گیا ہے۔

(۸) ولیس ذلك الا لمن رجا وغدی ولیس ذلك الا لمن یخاف وعید

قرآن ؛ فَذَکِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْد ۵۰ : ۴۵

مَنْ کو لِمَنْ باندھا گیا ہے۔

(۹) اِن نحن عصینا فیہ معترفونا غفرانک یا رب لنا غیر بعیدی

قرآن ؛ غُفْرَانَکَ رَبَّنَا ۲ : ۲۸۵

رَبَّنَا ، یارب بن گیا ہے۔

(۱۰) یا من ھو اقرب لی من حبل الوریدی فی حبک فارقت قریبی و بعیدی

قرآن ؛ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۵۰ : ۱۶

الْوَرِیْدِ ، وریدی بن گیا ہے۔ باقی فرق بھی واضح ہے۔

(۱۱) از سببہا گزاشتہ اندر حجب خرقوا الحجب ارتقوا الاسباب

قرآن ؛ فَلْیَرْتَقُوْا فِی الْاَسْبَاب ۳۸ : ۱۰

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۲) ھر بدی سر زند از من ھمہ از من باشد لیس ربّی و لہ الحمد بظلّام عبید

قرآن ؛ وَاَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ۳ : ۱۸۲ ، ۸ : ۵۱ ، ۲۲ : ۱۰

ہ کو ہ اور لِلعَبِید کو عبید باندھا گیا ہے۔

(۱۳) کو خلیلی کہ رو بحق آرد   لا احب بما سوا گوید

قرآن: لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۶ : ۷۶ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱۴) گر تو ما را برانی از در خود   ما لنا منک من ولی واق

قرآن: مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا وَاقٍ ۱۳ : ۳۷

وَلَا ساقط ہے۔

(۱۵) ہم تو ما را نگاہ دار از خود   ما لنا منک ربنا من واق

قرآن: مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۱۳ : ۳۴   ماکانَ لَھُمْ مِنَ اللّٰہِ من وّاق ۴۰ : ۲۱

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۶) تا یادگاری از فیض ماند   گفتار او را ما یسطرون کن

اس غزل میں شاعر نے لا یَفْقَهُون، لا یعقلون، ہم ینظرون، لا یبصرون، ما یؤمرون، ما یعقلون سب کے نون معلن کو نونِ غنّہ باندھا ہے، دوسرے شعرا کی طرح۔

(۱۷) تعالوا الی فیض فیض سنا برقہ   تخطف بہ الابصار تمنع ھمودہ

قرآن: یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۲ : ۲۰

یَکَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَار ۲۴ : ۴۳

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۸) مستم ز ندای لا الٰہ الا ھو   ھستم ز برای لا الٰہ الا ھو
این مستی من ز لا الٰہ الا ھو   جانم بہ فدای لا الٰہ الا ھو

دیدیم جمال لا الٰہ الا اللہ   دیدیم جمال لا الٰہ الا اللہ
از دوزخ و بہشت آزاد شدیم   جستیم وصال لا الٰہ الا اللہ

دونوں رباعیوں میں الٰہ کو اِلٰہٗ باندھا گیا ہے اقبال کی طرح

چو گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

(۱۹) کردہ بالنفس و باھوا غزوات   ھزموا الجند قاتلوا الاحزاب

قرآن: جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَاب ۳۸ : ۱۱

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۲۰) خدا گواہ و ملایک گواہ و دانایان   کفی بهم شهدا لا الہ الا هو
قرآن: وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یَشْہَدُوْنَ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا ۴ : ۱۶۶
فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۲۱) یا من احاط بکل شئ   والکل احصی انت الجمیع
قرآن: وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْہِمْ وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ۷۲ : ۲۸
بِکُلِّ کو بی کُلِ باندھا گیا ہے اشباعِ کسرہ کے ساتھ۔

قاآنی

(۱) وز سلیمان حشمت اللہ گر خطای نامدی   چیست القینا علی کرسیہ ثم اناب
بر سلیمان قہرش از یک ترک استثنا نمود   سر القینا علی کرسیہ ثم اناب
قرآن: وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ۳۸ : ۳۴
ثُمَّ سے پہلے جَسَدًا کو شاعر نے حذف کر دیا۔ (استثنا: انشاء اللہ گفتن)

(۲) ز مہر روی تو ببریدہ ام ز حب وطن   اگرچہ دانی حب الوطن من الایمان
وجود او وطن جان عارفان خداست   بدو گرای حب الوطن من الایمان
قولِ ماثور: حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ
الْوَطَنِ کو الْوَطَنْ باندھا گیا ہے اسکانِ نونِ متحرک کے ساتھ۔

(۳) ادعوک راجیا و انا ربک فاستجب   یا من یجیب دعوۃ داع اذا دعا
قرآن: اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۲ : ۱۸۶
اُجِیْبُ کو یُجِیْبُ اور دعانِ کو دعا باندھا گیا ہے۔

(۴) فاستغفری لذنبک یا نفس واہتدی   باللہ ان ربک یہدی لمن یشا
قرآن: وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْبِکِ ۱۲ : ۲۹
وَاللّٰہُ یَہْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۲ : ۲۱۳ (آٹھ جگہ اور)
وَاللّٰہُ کو باللہ ان ربک سے بدل دیا گیا ہے اور مَنْ میں لَ کا اضافہ کر کے اسے
لِمَنْ بنا دیا گیا ہے اور آخری ءُ غایب ہے۔ شروع شعر میں و کی جگہ ف ہے۔

(۵) شعاع روی ترا دید در مشیت حق   چہ گفت گفت الا ان هذه لعجاب

والذی فی کفه الکفار لما ابصروا   کلم الحصباء قالوا انه شئ عجاب
گاه می گفتم که خورشید است گردون راز اصل   باز می گفتم۔ نه حاشا انه شئ عجاب

[گرامی:
شاعر خاص شہنشاہم و لیکن مفلسم   انه حرف غریب انه شئ عجاب
موج دریای وفا کان نمک گنج شکر   انه رمز غریب انه شئ عجاب

سپہر کاشانی:
آب و آتش گر ندیدستی بر آید توامان   برق و باران مرا بین انه شئ عجاب]

قرآن: اِنَّهٗ لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۳۸ : ۵

تینوں شاعروں نے لَشَیْءٌ کو شَیْءٌ باندھا ہے سقوطِ لَ کے ساتھ۔

(۶) الذی ردت الیه الشمس وانشقّ القمر   کان امیاً و لکن عنده امّ الکتاب

قرآن: وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ۱۳ : ۳۹

اس آیت کا پہلا ٹکڑا ہے: یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ

ۂ کے ضمیر کا مرجع اللّٰہُ ہے۔ یعنی اُمُّ الکتاب خدا کے پاس ہے۔ شاعر اسے رسولِ اُمّی کی طرف منسوب کرتا ہے (ویسے وہ اس انتساب میں تنہا نہیں)

(۷) وگر یتیمی باشد مران بقهرش از آنک   خدا می گوید امّا الیتیم لا تقهر

خدا تو کہتا ہے: فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۹۳ : ۹

شاعر نے دونوں ف اڑا دیے۔ پہلا تو خیر۔ لیکن درمیان کا نہیں اڑایا جا سکتا تھا۔

(۸) مصطفیٰ فرمود ان الناس فی الدنیا ضیف   حاصلش یعنی لدوا للموت وابنوا للخراب
―― بزایید برای مرگ و بسازید برای خراب شدن

ضیف کی جگہ ضیوف یا اضیاف کا محل تھا۔ لدوا للموت وابنوا للخراب کے الفاظ حضرت آدم کی طرف منسوب ہیں۔ منقول قول یہ ہے: کُوْنُوْا فِی الدُّنْیَا اَضْیَافاً

(۹) بر رخ دو زلف مشک فشان چون فگند یار   شاهدت لیلتین علی طرفی النهار

قرآن: وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ۱۱ : ۱۱۴

شاعر نے طَرَفَیِ کو طَرْفِیْ باندھا ہے۔

سلمان ساوجی

(۱) بزم احبابت ھمہ جنّات عدن خالدین   روز اعدایت ھمہ یوماً عبوساً قمطریر

[احمد رضا خاں بریلوی :

یا طلیق الوجہ فی یوم عبوس قمطریر   یا بہیج القلب فی یوم الاسیٰ امداد کُن

قرآن : جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۲۰ : ۷۶

یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا ۷۶ : ۱۰

قمطریرا کو قمطریر باندھا گیا ہے۔ عدنٍ کے بعد خالدین ہے —— درمیان کی عبارت غائب۔ "خالدین" بھی "فیھا" کے بغیر نامکمل ہے۔

(۲) تا دعای دولتت را از سر امن و امان   من کنم اندر اناءِ اللیل و اطراف النہار

قرآن : وَمِنْ اٰنَآءِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ ۲۰ : ۱۳۰

آناء کو اَناء باندھا گیا ہے اور وَ کو صرف و۔

(۳) تا ز در بستہ نہ گردی ملول   نصر من اللہ و فتح قریب

قرآن : نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ۔ ۶۱ : ۱۳

نَصْرٌ کو صرف نَصْر باندھا گیا ہے۔

(۴) این آن اساس نیست کہ گردد خلل پذیر   لو دکت الجبال و انشقت السما

علم ترا چہ باک و لو بست الجبال   ملک ترا چہ وہم و لو دکت السما

[سنائی ہر آن بود کہ دوستی او بود بجای   ما بست الجبال و ما انشقت السما]

قرآن : وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۶۹ : ۱۴

كَلَّاۤ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۸۹ : ۲۱

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا ۷ : ۱۴۳

وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۵۶ : ۵

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ ۵۵ : ۳۷

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۸۴ : ۱

دکت الجبال اور دکت السماء کے جُملے قرآن میں نہیں پہلے شعر میں فَاِذا کی جگہ و ہے اور تیسرے میں وما تینوں سے غایب ہے۔

(۵) نوح را در شکر اگر عبداً شکورا گفت   اذ رایت سعیکم مشکورا اندر ھل اتیٰ

قرآن: وَ كَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُوْرًا ۷۶ : ۲۲

اِذ رَاَیتُ —— شاعر کے اپنے الفاظ ہیں۔

(۶) ہر صبح فرستند عروسان ریاحین
بروست صبا غالیہ خیرات حسان را

قرآن: فِيْهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ ۵۵ : ۷۰

خَیْرَاتٌ کو خیراتِ اور حِسان کو حِسانِ باندھا گیا ہے۔

(۷) ہمہ عقل و روحست و روحی لدیہ
ایا معشر الناس صلوا علیہ

قرآن: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ ۳۳ : ۵۶

ایا معشر الناس شاعر کی اپنی ترکیب ہے۔

(۸) ویبقی وجہ کل ذو الجلالش
شدہ باقی وجہ لایزالش

قرآن: وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۵۵ : ۲۷

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۹) بدل رسید سحرگاہ در مقام حضور
ندای آیت استغفروا ز ربّ غفور

قرآن: وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۲ : ۱۹۹، ۷۳ : ۲۰
اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۱۱ : ۵۲
۱۱ : ۹۰
۷۱ : ۱۰

استغفروا کے بعد ز (مِن) نہیں آسکتا کیونکہ طلب بابِ اِستفعال کی خاصیات میں شامل ہے۔ لیکن اگر ز یہاں 'سے' 'منجانب' کے معنی میں ہے تو درست ہے۔

(۱۰) صورت اقبال ترا بر جبین
اِنّا فتحنا لک فتحاً مّبین

قرآن: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۴۸ : ۱

مُبیناً کو مُبِین باندھا گیا ہے۔

شعر کی تقطیع یُوں ہوگی:

مفتعلن مفتعلن فاعلات
مستفعلن مفتعلن فاعلات

بقول صاحبِ قواعد العروض: "جو لوگ دوسرے مصرع کے پہلے رُکن کو بھی مفتعلن کے وزن پر پڑھتے ہیں وہ اِنّا کے الف ساکن کو بلا قاعدہ حذف کرکے عبارتِ قرآنی کو غلط کرتے ہیں۔"

(۱۱) بقادریکہ سماوات بے ستون برپاست   بقدرتش وعلیٰ کل ما یشاء قدیر
قرآن ، عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ   ۳ : ۱۶۵ (۳۲ جگہ)
وَھُوَ عَلیٰ جَمْعِھِمْ اِذَا یَشَاءُ قَدِیْر   ۴۲ : ۲۹
شیءٍ کی جگہ شاعر نے ما یشاء کے الفاظ رکھ دیے ہیں۔

(۱۲) تا ملائک بر فلک منشور حکمش خوانده اند   ز اختران هر دم ندا سمعا و طاعا می رسد
[رُومی ،
بود مغلوب او بہ تسلیم و رضا   گفت سمعاً طاعۃ اصحابنا]
قرآن ، سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا   ۲ : ۲۸۵
۵ : ۷
۲۴ : ۵۱
فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۳) ببوی رحمت و غفران بدرگاہ آمدیم اینک   گنہ گار و خجل فاغفرلنا یا رب وارحمنا
قرآن ، فَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا   ۲۳ : ۱۰۹
یا رب کے الفاظ شاعر کے ہیں۔

فیضی

(۱) صنمی در دل ما یافتہ راہ   نحن لا نعبد الّا ایّاہ
قرآن ، اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ   ۳ : ۶۴
فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۲) اللہ انجح سعیک الاعلیٰ الاجل   ما کان للانسان الّا ما سعیٰ
قرآن ، وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی   ۵۳ : ۳۹
اَنْجَحَ کو اَنْجَحْ باندھا ہے اور لَیْسَ کو ما کانَ میں تبدیل کر دیا ہے۔

(۳) رفتم و ماندہ دل و جان بر درت   قد جعل الجنۃ مثواھا
جَعَلَ کے جَعَ کو جَعَا باندھا گیا ہے اشباع فتحۂ عین کے ساتھ۔
قرآن میں مثویٰ کا لفظ تنہا صرف جہنّم کے ساتھ آیا ہے۔ ۳ : ۱۵۱، ۳۹ : ۶۰،
۴۱ : ۲۴، ۶ : ۱۲۸، ۳۹ : ۷۲، ۴۷ : ۱۲، ۱۶ : ۲۹، ۴۰ : ۷۶، ۲۹ : ۶۸، ۳۹ : ۳۲

ضمیرِ مخاطب و غائب و متکلم کی اضافت تملیکی کے ساتھ مطلق ٹھہرنے، رہائش اور قیام کے معنوں میں تین بار آیا ہے: مَثْوَاكُمْ ۴۷: ۱۹   مثواهُ ۱۲: ۱۲   مَثْوایَ ۱۲: ۲۳

(۴) در دبس گاہ علمِ لدُن درسِ غیب خوان

امیر خسرو: عقلِ کل است علمِ لدنی عارفاں

صائب: ز نورِ علمِ لدنی نہ از رہِ تعلیم   چنانکہ هست بداند حقائقِ اشیا]
[ذوق: صاحبِ علمِ لدن واقفِ اسرارِ خفی   حال کونین سے ہے قلب مطهّر آگاہ]

رُومی: اے برادر دست بردار از سخن   خود خدا پیدا کند علمِ لدن
از چہ رو دیگر نمی گوئی سخن؟   بهر چہ بستی در علمِ لدن

اس نے البتہ مِنْ لَدُنْ بھی باندھا ہے:

با سیاستهای جاهل صبر کن   خوش مدارا کن بہ عقلِ من لدن
باز آمد کان محمد عفو کن   ای ترا الطاف علمِ من لدن
کسب کن سعی نما و جهد کن   تا بدانی سرِّ علمِ من لدن

شمس تبریز کے ہاں بھی دونوں ترکیبیں ملتی ہیں:

چون بسوزد پردہ دریابد تمام   قصّهای خضر و علمِ من لدن
کی سیر شود ماهی زتری   یا تشنۂ حق از علمِ لدن؟

قرآن: مِنْ لَدُنْ ۱۱: ۱   ۲۷: ۶   مِنْ ساقط کر دیا ہے۔

(۵) صردم تیغ تو قصد کرده نفسش   انت حدید لک باسٌ شدید
قرآن: وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ ۵۷: ۲۵

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۶) جانِ من و سلسلۂ زلفِ تو   علقت الروح بحبل الورید
قرآن: وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۵۰: ۱۶

فرق ظاہر ہے۔

(۷) گهی عشاق را غم گاه شادی   الم تر انهم فی کُلِّ وادی
قرآن: اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۲۶: ۲۲۵

قرآن میں شاعروں کا ذکر ہے شعر میں عاشقوں کا۔ مصرعِ ثانی کا پہلا رکن بجای مفاعیلن کے مفاعلتن ہے۔

اهلی شیرازی

(۱) به شهد حکمت او از پی شفاء الناس طبیب نحل برد مرهم شفای را

قرآن: فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ۱۶ : ۶۹

عُ لِلنّاس کو عُ النّاس باندھا گیا ہے۔

(۲) این رحمتیت شامل عالم که خواجه گفت الصالحون للّٰه والطالحون لی

[سعدالدین هروی

سعید طائیؔ

از بهر آنکه سیّد کونین گفته است الصالحون للّٰه والطالحون لی

حالی:

گر بد ہیں تو حق اپنا ہے کچھ تجھ پہ زیادہ اخبار میں الطالح لی ہم نے سنا ہے]

(۳) ز سوره شعرا رب نجنی اهلی ز سیرت شعرا یتبعهم الغاودون

[عطا ٹھٹھوی:

به شعر و شاعری آخر هزار نفرین باد بوفق والشعراء یتبعهم الغاودون

قرآن: وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗن ۲۶ : ۲۲۴

دونوں شعروں میں یَتَّبِعُ کو یَتْبِعْ باندھا گیا ہے سکونِ عین کے ساتھ۔ دوسرے شعر میں وَالشُّعراءُ لکھا ہے مگر وزن میں صرف وَ الشُّعرا آتا ہے ءُ کے بغیر۔

(۴) هم او در ظاهر و باطن هم او در اوّل و آخر هو الاول هو الآخر هو الظاهر هو الباطن

[ساقی خراسانی:

فهذا هو الحق فی کلّ حین کما قاله فی کتاب المبین

هو الاولم من هو الآخرم هو الباطنم بل هو الظاهرم]

آشکارا (سچل سرمست):

هو الاوّل هو الآخر هو الظاهر هو الباطن نه مخفی آشکارانی ازین حیرت که هیهات است]

قرآن: هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۵۷ : ۳

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

خواجوی کرمانی

(۱) عارض ترکان نگر در چین جعد مشک فام   تا جمال حور مقصورات بینی فی الخیام

قرآن : حُورٌ مَّقصُوراتٌ فِی الخِیَامِ ۵۵ : ۷۲

رٌ اور تٌ کو ر اور ت باندھا گیا ہے۔

(۲) ملازمان جناب تو خالداً فی الخلد   مخالفان رضای تو دایما فی النار

قرآن میں خالداً تین جگہ آیا ہے اور تینوں جگہ ۴ : ۱۴ ، ۴ : ۹۳ ، ۹ : ۶۳ نار ، جہنم اور نارِ جہنّم کے ساتھ۔

دایمًا قرآن میں استعمال نہیں ہوا، دائمٌ البتہ ہوا ہے وہ بھی جنّت کے میووں کے لیے ۱۳ : ۳۵

(۳) تا نہ گویند پیش عذب و فرات   در عذوبت حدیث ملح و اجاج

قرآن : ھٰذَا عَذبٌ فُرَاتٌ وَّھٰذَا مِلحٌ اُجَاج ۲۵ : ۵۳

فرقِ الفاظ ظاہر۔

عَذبٌ : میٹھا	مِلحٌ : کھاری
فُراتٌ : پیاس بجھانے والا	اُجاج : کڑوا

(۴) گفتمش ای لعبتی کہ مثل تو صورت   کی متصور شود ز نطفہ و امشاج

قرآن : مِن نُطفَۃٍ اَمشَاجٍ ۷۶ : ۲

اَمشاج : مخلوط

شاعر نے مرکبِ توصیفی کو مرکبِ عطفی بنا دیا جس کے بظاہر کوئی معنی نہیں بنتے۔

(اُستاد) جمال الدین اصفہانی

(۱) عفو تو دلیل چشمۂ حیوان   خشم تو نشان طامۃ الکبرٰی

قرآن : فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّۃُ الکُبرٰی ۷۹ : ۳۴

اَلطَّآمَّۃُ کو طَامَۃُ باندھا گیا ہے۔

(۲) آوازہ فارتد بصیرا سوی دولت   اندر پی وابیضت عیناہ برآمد

قرآن : وَابیَضَّت عَینَاہُ مِنَ الحُزنِ فَھُوَ کَظِیمٌ ۱۲ : ۸۴

شاعر نے وَابۡیَضَّتۡ کی ساکن ت کو متحرک کردیا ہے۔

(۳) مسند تو چو کرد رای قضا گفت شرعش بلی الیک مساق

قرآن : اِلٰی رَبِّكَ یَوۡمَئِذِنِ الۡمَسَاقُ ۷۵ : ۲۹

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۴) از یعصمک اللہ اینت جوشن وز یغفر اللہ آنت مغفر

قرآن : وَاللّٰہُ یَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاس ۵ : ۶۷

لِیَغۡفِرَ لَكَ اللّٰہُ ۴۸ : ۲

فرقِ عبارت ظاہر ہے

(۵) چشم بلبل برو فتاد از دور گرد ربّی و ربک اللھی

قرآن : رَبِّیۡ وَرَبُّکُمۡ ۲ : ۵۱ ۱۹ : ۳۶

۵ : ۷۲ ۴۴ : ۲۰

۱۱ : ۵۶

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۶) حاسداں درگھت را عقل شیطان می شمرد مھتر فکرت ندا کردش کہ لا بلھم اضل

قرآن : اُولٰئِكَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ ھُمۡ اَضَلّ ۷ : ۱۷۹

لا اضافۂ شاعر ہے۔

(۷) ہر روز کہ صبح دم زند گوید درگوش ولی تو لک البشریٰ

قرآن : بُشۡرٰی لَکُمۡ ۳ : ۱۲۶

لَھُمُ الۡبُشۡرٰی ۱۰ : ۶۴

لَھُمۡ کو شاعر نے لَكَ بنادیا ہے۔

امیر مُعزّی

(۱) بخط عدل و سیاست بروی عالم پیر نوشت ھمت او میتا فاحییناہ
سخای مردہ بدو زندہ گشت و از کرمش درست گشت بدو میتا فاحییناہ

قرآن : اَوَمَنۡ کَانَ مَیۡتًا فَاَحۡیَیۡنٰہُ ۶ : ۱۲۳

دونوں شعروں میں مَیۡتًا کو مَیِّتًا باندھا گیا ہے۔

(۲) انّا غفرنا ذنبکم تولوا فاوحی ربکم   ان تنتھو نغفر لکم ما قد سلف عن مامضی

قرآن : یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ۳۳ : ۷۱

قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِنْ یَّنْتَھُوْا یُغْفَرْ لَھُمْ مَّا قَدْ سَلَفْ ۸ : ۳۸

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۳) رعایت تو و عدل تو و عنایت تو   بدین و دنیا پیوستہ تا بیوم الدین
نظام دین ھدی باد و عزّ دین ھدی   ترا وزیر و سپھدار تا بیوم الدین
شمار ملک بدست تو تا بروز شمار   جمال دین ببقای تو تا بیوم الدّین

[قاآنی :
بیک نظر ھمہ اسرار دہر را نگرد   ز اوّلین دم ایجاد تا بیوم الدّین]

بیومِ کی ب ع بدریا درمنافع بے شمار است، کے ب کی طرح محض آرائشی اور برائے وزنِ بیت دکھائی دیتی ہے۔

گرامی

(۱) جہل ما از لوح ما آ و خ زدود   نکتہ تفسیر اوفوا بالعھود

قرآن : یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۵ : ۱

بِالْعُقُوْدِ کو بلاوجہ بِالعُھود سے بدلا گیا ہے۔

شمس تبریز کا شعر ہے :

یُنادی ربّنا عُوْدُوا الینا   اجیبونا و اوفوا بِالْعُقُوْدِ

نشاط اصفہانی

(۱) ذکر آموز ذاکران طیور   راقدًا بالعشی والابکار

قرآن : سَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَار ۳ : ۴۱

یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ ۳۸ : ۱۸

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَار ۴۰ : ۵۵

راقدًا شاعر کا اپنا لفظ ہے یہ قرآن میں استعمال نہیں ہُوا۔

(۲) شد کمال آیت زوال اے دل   عسعس الیل کادت الاسحار

قرآن : وَالَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۸۱ : ۱۷

[محمود خاں کاشانی :
چون در آمد بخواب چشم عسس — اظلم اللیل و ھو قد عسعس]
فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۳) ایاک نستغیث و ایاک نستعین — منک الیک سرت بنا اھدنا الصراط

قرآن : اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۱ : ۴
اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۱ : ۵

[نسیم امروہوی :
ایاک نعبد میں وہ خالق سے اختلاط — جس کی ادا پہ خضر کہیں اِھدِنا الصّراط]
اس ردیف کے ساتھ فیض کاشانی کی پُوری غزل ہے :

ای رہنمای گم شدگان اھدنا الصراط
وی نور چشم راہ روان اھدنا الصراط

نَعْبُدُ کی جگہ شعر میں نستغیث ہے اور المستقیم غایب ہے۔

قُرّۃُ العَین طاہرہ

(۱) روز قیام است اسے مہان معدوم شد لیل غسق

قرآن : اِلیٰ غَسَقِ الَّیْلِ ۱۷ : ۸۷

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۲) طلعت مبین ناگہ طالع از حجاب عزّ — مشنو ای عزیز من نطق لن ترانیٔ را

قافیہ بہائیٔ، طائیٔ وغیرہ ہے۔ لَن ترانی ۷ : ۱۴۳ کے نی کو ئ سے بدل دیا گیا ہے جس کے بظاہر کوئی معنی نہیں بنتے۔

مجمع الفصحا (۱) میں اوحد الدین کرمانی کے اس شعر میں "لن ترائی" طبع ہُوا ہے :

ناخواستہ رؤیت مکانی
نشنیدہ جواب لن ترائی

لیکن یہ فروگزاشت مطبع کی ہے۔ مکانی کے مقابل ترانی ہی آنا چاہیے۔

(۳) ھکل جمال ز طلعتش قلل جبال ز رفعتش — ودل جلال ز سطوتش متخشعاً متزلزلا
چہ شود کہ آتش حیرتی زنیم بقلۂ طور دل — فسلکتہ، و دککتہ، مستدکدکا متزلزلا

قرآن : لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ
خَشْيَةِ اللّٰهِ ۵۹ : ۲۱
فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا ۷ : ۱۴۳
فرقِ نظم و ترتیبِ کلمات ظاہر ہے۔

سلطان ولد

(۱) شرح اللہ صدرکم رفع اللہ قدرکم   طلع البدر لایحاً معنا اللیل اشرلوا
قرآن : اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۳۹ : ۲۲
رَفَعَ بَعْضَهُمْ درجات ۲ : ۱۵۳
صَدْرَهٗ کو شاعر نے صدرکم بنا دیا ہے۔

(۲) ز افلاک و ملک گزشتہ ئی گفت حقت   لولاک انا لما خلقت الافلاک

امیر خسرو :
توقیع تو کز صحیفۂ پاک آمد   لولاک لما خلقت الافلاک آمد
ما لاقی لہ خطاب الاک   لولاک لما خلقت الافلاک

سنائی :
با نقش تو گفتہ نقش بندت   لولاک لما خلقت الافلاک

استاد جمال الدین :
نقش صفحات رایت تو   لولاک لما خلقت الافلاک
محسن کاکوروی : ہے کس کو خطاب ایزد پاک   لولاک لما خلقت الافلاک
عطا ٹھٹھوی : کن عفو عطا بحق ممدوح   لولاک لما خلقت الافلاک

پہلے شعر میں اَنَا کا اضافہ ہے اور آخری میں الافلاک کی جگہ افلاک ہے۔ حالانکہ الافلاک بآسانی آ سکتا تھا۔

عراقی

(۱) رحمت عالم رسول اللہ آن کو قدسیان   بر درش لبیک اوحی اللہ ما اوحی زنند
قرآن : فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۵۳ : ۱۰

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۲) کم اصبر قد صبرت حتی   روحی بلغت الی الستراق

قرآن: کَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ۷۵ : ۲۶

اِلیٰ درمیان میں اضافۂ شاعر ہے۔

(۳) تبارک اللّٰہ وارت عینہ حجب   فلیس یعلم الا اللّٰہ ما اللّٰہ

قرآن: حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۳۸ : ۳۲

وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰہُ ۳ : ۷

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۴) خُذ حیث شئت فان اللّٰہ ثم وقل   ما شئت منہ فان الواسع اللّٰہ

قرآن: وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْم ۲ : ۲۴۷ ۵ : ۵۴

۳ : ۷۳ ۲۴ : ۳۲

جو مصرع میں فان الواسع اللّٰہ بن گیا ہے۔

(۵) حمد بے حد کردگار احد   صمد لم یلد و لم یولد

[نظم طباطبائی:

اور کہیں ہم کہ الاہ واحد   صمدٌ لم یلد و لم یولد]

صہبا اختر:

دل میں ذوق خود نگر   لب پہ اللّٰہ صمد

قرآن: قُلْ هُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ اَللّٰہُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ۱۱۲:۱-۳

اَلصَّمَدْ کو صرف صمد باندھا گیا ہے۔

آخری شعر میں الصمد آسکتا تھا۔ اس کا اَل مکتوب تو ہے مگر تقطیع میں غیر ملفوظ و غیر محسوب ہے۔

انوری

(۱) آدم از نسبت وجود تو یافت   اختصاص خلقتہ بیدی
دزد را نیک داند از کالا   پاسبان خلقتہ بیدی

[ظہیر فاریابی:

نفس کل از برای راتب رزق   بے اساس خلقتہ بیدی]

قرآن ؛ قَالَ یَا اِبْلِیْسُ مَا مَنَعَکَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ۳۸ : ۷۵

خَلَقْتُ بِیَدَیَّ تینوں شعروں میں خلقته بیدی بن گیا ہے۔ یَدَیَّ تثنیہ کا صیغہ ہے جبکہ یَدِی واحد کا۔

(۲) زلزلہ قہر تو شان پست کرد زلزلة الساعة شئ عظیم

قرآن ؛ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْم ۲۲ : ۱

مصرع میں زَلْزَلَۃَ کی منصوب ت کو مرفوع پڑھا جائے گا اِنَّ کے عمل کے معطّل ہو جانے سے۔

(۳) غرض ذات تو بود ار نہ گشتی بنی آدم بکرمنا مکرم

قرآن ؛ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ ۱۷ : ۷۰

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۴) صفای صفہ صورت بصف صابرین دین چو وصف جنت الفردوس د ماء منهمر بادا

قرآن ؛ فَفَتَحْنَا اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۵۴ : ۱۱

یہ طوفانِ نوح کے آبِ باراں کا ذکر ہے جس کا جنّت الفردوس کے آبِ رواں سے کوئی تعلق نہیں۔

(۵) برنبشتہ برکران نان او خط سیاہ لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفسی

قرآن ؛ لَمْ تَکُوْنُوْا بٰلِغِیْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ۱۶ : ۷

ہِ اور لِ میں سے ایک زیر کا ادغام کرنا پڑے گا حالانکہ قرآن میں دونوں کا اعلان ہے۔

ابنِ یمین

(۱) ندا ایزد چنین گفت در وحی منزل مع العسر یُسرا مع الیُسر عُسرا

قرآن ؛ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرا ۹۴ : ۵، ۶

مَعَ الْیُسْرِ عُسْرا کے الفاظ جنھیں شاعر نے قرآن سے منسوب کیا ہے قرآن کے نہیں۔

(۲) اُخلائی انبئکم جمیعا بانّ الله فعّال لما شا

قرآن ؛ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۱۱ : ۱۰۷ ۸۵ : ۱۶

یُرِیْدُ کی جگہ شا ہے، حالانکہ ویسے بھی اسے یَشَاءُ ہونا چاہیے تھا (فعل مضارع)

ایک لحاظ سے شا بھی درست ہے کیونکہ خلّاقِ وجود و خالقِ زماں کا زمانہ ایک مُرُورِ دوام ہے جس میں ماضی، حال، مستقبل کی کوئی تقسیم و تقویم نہیں۔

(۳) برو اقتدا کن با بن یمین توکّل علی الله فی کل حال

قرآن ؛ وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ۴ : ۸۱، ۳۳ : ۳، ۳۳ : ۴۸

فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ۔ ۳ : ۱۵۹

۳۷ : ۷۹

(۴) یَقُوْلُوْنَ فِی الْبُسْتَانِ لِلْعَیْشِ لَــذَّۃٌ وَفِی الْخَمْرِ وَالْمَاۤءِ الَّذِیْ غَیْرِ اٰسِنِ

قرآن : فِیْھَاۤ اَنْھٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ وَ اَنْھٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّۃٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ۴۷ : ۱۵

وَفِیْھَا مَا تَشْتَھِیْہِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْیُنُ ۴۳ : ۷۱

فرقِ الفاظ ظاہر ہے ۔ مَّآءٍ کو الماۤءِ الّذی بنا دیا گیا ہے ۔

ظہیر فاریابی

(۱) شبی بخیمہ ابداعیان کن فیکون حدیث عشق تو می رفت والحدیث شجون
حسن

یُقَالُ اَلْحَدِیْثُ ذُو شُجُوْن ۔ ای یدخل بعضہ فی بعض ۔

سخن از سخن خیزد ۔ سخن سخن را کشد ، سخن سخن آرد ۔ حرف حرف می آرد ۔ از حدیث حدیث شگافد سخن از سخن شگافد ۔ والکلام یجر الکلام ۔

(۲) عنایتش علم ساکنان گردون را طراز ان علیکم لحافظین برزد

قرآن : وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۸۲ : ۱۰

ظِیْنَ کو ظِیْش باندھا گیا ہے ۔

غمام ھمدانی

(۱) ترا می جستم از روز نخستین ترا خواھم الیٰ یوم القیامی
ہر کہ جام از دست ایں ساقی گرفت مست می افتد الیٰ یوم القیام

رُومی : تاکہ این ہفتاد و دو ملت مدام در جھان ماند الیٰ یوم القیام

قرآن : اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ۵ : ۱۴

۵ : ۶۴

۶ : ۱۲

اَلْقِیٰمَۃِ پہلے شعر میں اَلْقِیامی اور باقی دونوں میں اَلْقِیام بن گیا ہے ۔

غالب

(۱) خوب ست کہ نشنوم ز هر خود رائی   گلبانگ انا ربّکم الاعلائی
قرآن : فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۷۹ : ۲۴
شاعر نے اَلْاَعْلٰى کو اَلْاَعْلائی بنا دیا وزنِ شعر کے لیے۔ رومی کے یہاں ربی الاعلای من کی ترکیب ملتی ہے۔

نظامی گنجوی

(۱) برآورده مؤذن با دل قنوت   کہ سبحان حیّ الّذی لایموت
قرآن : وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۲۵ : ۵۸
اَلْحَیِّ کو حیّ باندھا گیا ہے۔

[قاآنی :
یارب بروزگار بنیاد هیچکس   پایان دولت تو بجز حی لایموت

ریاض بروجردی :
نان و بریان جسم را طعمہ است و قوّت   قوّت جان از نور حی لا یموت

سپہر کاشانی :
ہم تو ذات لایزالی ہم تو حیّ لا ینام]
تینوں شعروں میں فرقِ الفاظ واضح ہے۔

حسن سنجر دہلوی

(۱) ہم آخر ازیں فتح مژده دهد   ندای اذا جاء نصر اللّٰہُمْ
قرآن : اِذَا جَاۤءَ نَصْرُ اللّٰهِ ۱۱۰ : ۱
اَللّٰہُ کو اللّٰهُمْ باندھا گیا ہے۔
(۲) شهنشهای کہ اندر بہ پنج وقت آوازۂ فتحش   همی خیزد ز نوبت خانۂ نصرٌ من اللّٰهی
قرآن : نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ ۶۱ : ۱۳
اللّٰہِ کو اللّٰهی باندھا گیا ہے۔
(۳) حسن از تو سر طلبند تو بشکرانہ بده   طالب سر شدۂ ذلک من فضل اللّٰہ

قرآن : ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۴ : ۷۰
ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ ۵ : ۵۴
۵۷ : ۲۱
۶۲ : ۴

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۴) گر لاف زنند فاعف عنہم فاصفح   ہر طائفہ بما لدیہم فرحون
قرآن : فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۵ : ۱۳
شعر میں وَاصْفَحْ کی جگہ فَاصْفَحْ ہے۔
دُوسرا مصرع قرآن کی اس آیت سے ماخوذ ہے :
كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۲۳ : ۵۳
جو بذاتِ خود رباعی کا مصرع ہے مفعولن فاعلن مفاعیل فعول
شاعر کو کُلُّ حِزْبٍ کی جگہ "ہر طائفہ" لانے کی ضرورت نہیں تھی۔

(۵) ای روی تو والنّہار اذا جلّٰہا   گیسوی تو واللّیل اذا یغشٰہا
قرآن : وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۹۱ : ۴
پہلے مصرع میں رِ اور لِ کی دونوں زیروں میں سے ایک زیر غایب ہو جاتی ہے۔

میرزادہ عشقی

(۱) بگفتمش کہ لکم دینکم و لی دین
قرآن : لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۱۹ : ۶
وَلِیَ کو وَلِی یا باندھا گیا ہے۔ یا اگر دین کو دینِ پڑھیں تو وَلِیَ کو وَلِیْ پڑھنا پڑے گا۔

واقف لاہوری

(۱) مبارک است بنام تو افتتاح کلام   تبارک اسمک یا ذا الجلال و الاکرام
قرآن : تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۵۵ : ۷۸
فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

کمالُ الدّین اصفہانی

(۱) فزلزلت الارض زلزالھا واخرجت الارض اثقالھا

قرآن: اِذَا زُلْزِلَتِ الاَرْضُ زِلْزَالَھَا ۹۹ : ۱

اِذا کی جگہ ف تصرفِ شاعر ہے۔ زُلزِلَتْ کے زِلْ کو زِلا اور اَخْرَجَتْ کے رَ کو را باندھا گیا ہے۔

(۲) خشبٌ مُسَنَّدٌ ز برای تو منزل است

قرآن: کَاَنَّھُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ ۶۳ : ۴

شاعر نے خُشُبٌ کو خُشْبٌ بہ اسکان ش باندھا ہے اور مُسَنَّدَۃٌ کو مُسَنَّدٌ جس نے تانیث کو تذکیر میں بدل ڈالا۔

شیخ علی حزیں

(۱) برتافت است رُوی دلم از بلند و پست وجّہت للّذی فطر الارض والسما

قرآن: اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفاً ۶ : ۷۹

فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۲) زندانی جسم کہنم ربّ ترحّم! اقبل لقبول حسن ربّ دعائی

قرآن: فَتَقَبَّلَھَا رَبُّھَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ ۳ : ۳۷

فرقِ الفاظ واضح ہے۔

نواب نظامت جنگ (حیدرآباد دکن)

(۱) یاد فضلش داشتم در دل مدام گفتم انّ اللہ معنا صبح و شام

[حفیظ جالندھری:

کہا اللہ ساتھی ہے تو کیا اندیشۂ دشمن رکھ انّ اللہ معنا پر نظر اے دوست لاتحزن

اقبال سُہیل:

قُرب انّ اللہ معنا جس کی عظمت کا مقام جس کو جبریل امیں اللہ کا لائیں پیام]

قرآن: لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللہَ مَعَنَا ۹ : ۴۰

تینوں شاعروں نے اللہَ کو اللہْ اور مَعَنَا کے مَعَ کو معا باندھا ہے اشباعِ فتحہ کے ساتھ۔

آشکارا — سچل سرمست

(۱) فرمودہ است اللہ نور السما والارض است   پس ارض وآسمان را من خوب می شناسم

قرآن : اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ   ۲۴ : ۲۵

اَللّٰہُ کو اَللّٰہُ اور اَلسَّمَاوَات کو اَلسَّمَا باندھا ہے۔

شمس تبریز : انا منذ رایتھم انا صرت بلا انا   صورۃ فی زجاجۃ نور الارض والسما

منذ ، منذ چھپا ہے۔ باقی فرق الفاظ بیّن ہے۔

مسعود سعد سلمان

(۱) اصبحت شمس العلی فی دولۃ من مشرق   نحمد الرحمٰن حمداً و ھو ربّ العٰلمین

وَھُوَ کو وَھُوَ باندھا گیا ہے۔

(۲) شاہ باشد دران ثواب شریک   وھو عند الالہ لیس یضیع

وَ کو وا باندھا گیا ہے۔

قرآن : اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ   ۹ : ۱۲۰

۱۱ : ۱۱۵

۱۲ : ۹۰

” ” اَلْمُؤْمِنِیْنَ   ۳ : ۱۷۱

السی

(۱) گل بخندید کہ ای خیرہ هم اندر قرآن   اثم تو اکبر گفت است خدا نفع تو کم

(گُل و مُل کا مناظرہ

قرآن : قُلْ فِیْھِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاس وَ اِثْمُھُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا ۲ : ۱۹

شاعر نے واحد حاضر کا صیغہ استعمال کیا ہے جبکہ قرآن میں تثنیہ غایب ہے یعنی اثمک اک
من نَفْعِکَ نہیں بلکہ اثمھما اکبر من نفعھما۔

آخوند انور

(۱) من کمال العجب یحسب ان مالہ اخلدہ   جان ناپاکش لبسوزانی بنارِ موقدہ

قرآن : یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗ اَخْلَدَہٗ   ۱۰۴ : ۳

نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ ۱۰۴ : ۷

پہلے مصرع کو بحسب اِنَّ مَالَہٗ اَخْلَدَہٗ پڑھا جائے گا دوسرے میں نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ کو نارِ مُوقدۃ باندھا گیا ہے۔

کمال الدین مسعود خجندی

(۱) صلاح کار نقل است دمی لعل　　لعل اللّٰہ یرزقنی صلاحا

دوسرا مصرع اعراب کے ساتھ یُوں ہوگا:

لَعَلَّ اللّٰہَ یَرْزُقُنِیْ صلاحا

اور اس کا دوسرا رکن بجای مفاعیلن کے مفاعلتن ہوگا۔

عطا عرازی

(۱) چشمکانش چنانکہ یوسف گفت　　انّ ربی لکیدھن عظیم

قرآن: اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِھِنَّ عَلِیْمٌ ۱۲ : ۵۰

غالبًا فرقِ الفاظ طباعت میں ہُوا ہے یا شاعر نے دُوسری آیت سے یہ لفظ لیا ہے:

اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ ۱۲ : ۲۸

خجستہ کاشانی

(۱) زھی دادار حی فرد بیچون　　تعالیٰ شانہ عمّا یقولون

قرآن: سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا ۱۷ : ۴۳

شانہٗ اضافۂ شاعر ہے۔

صفی علی شاہ

(۱) زن بنام من حمی بے ترس و بیم　　دم ز بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

الرّحمٰن تقطیع میں صرف رحمان آتا ہے۔

(۲) بلیس نام او برد با ادب　　اعوذ باللّٰہ من الجاھلین

قرآن: قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجَاھِلِیْنَ ۲ : ۶۷

اَنْ آکُوْن ساقط ہے۔

(۳) فینظرا الانسان مـمّ خلق تبارك اله احسن الخالقین
قرآن : فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّا خُلِق ۸۶ : ۵
فَتَبَارك اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِین ۲۳ : ۱۴
فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۴) ولن اجد من دونه ملتحد ایاه نعبد و به نستعین
قرآن : وَّ لَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۷۲ : ۲۲
اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۱ : ۴
فرقِ الفاظ واضح ہے۔

ولی دکنی

(۱) تمام پات یسبّح بحمدہ کے بحکم زبانِ حال سوں کرتے ہیں ذکر سبحانی
قرآن : يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ۱۷ ، ۴۴
حُ اور ہٖ دونوں کو ساکن باندھا گیا ہے۔

(۲) توں ہے حق ستی ہم زباں ہم کلام ترا قاب قوسین ادنیٰ مقام
قرآن : فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۵۳ : ۹
شاعر نے اَوْ اَدْنٰی کی جگہ ادنیٰ (مقام) لکھ کر قرآنی ترکیب سے انحراف کرتے ہوئے بھی، ایک ذومعنی معنویت پیدا کی ہے۔

داغ نے ادنیٰ مقام کی جگہ مقامِ عالی لکھ کر ایک نئی کیفیت پیدا کی ہے :

قاب قوسین کا پایا ہے مقام عالی
اللہ اللہ رے یہ مرتبہ و رفعت و جاہ

(۳) وجہ پاوے مطلب راضیۃً مرضیہ محض للہ جگ میں جو اعمال پنہانی کرے
قرآن : رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۸۹ : ۲۸ (وجہ = وہی)
رَاضِيَةً وزن مفتعلن یا فاعلتن کو راضیاً گا بروزن فاعلاتن باندھا گیا ہے یَ کے اشباع کے ساتھ۔ مَرْضِيَّةً کو مرضیہ بروزن فاعلن باندھا گیا ہے۔

(۴) اے ولی ترک کر یہ حرف دراز کہ ہے خیر الکلام قل و دل

قولِ ماثور : خَیْرُ الکلامِ ما قَلَّ وَ دَلَّ
اِنَّ خَیْرَا لکلامِ ما قَلَّ وَ دَلَّ

ما درمیان سے غایب ہے۔

میر تقی میر

(۱) کچھ مجنّوں کا معتقد مت پُوچھ ہے علی ہی ھُوَ العَلیِ کبیر
قرآن : وَاَنَّ اللہَ ھُوَ العَلِیُّ الکَبِیْرُ ۲۲ : ۶۲
الکبیر کو صرف کَبِیْر اور یُ کو یِ باندھا گیا ہے۔
(علیؑ کو مقامِ الوہیت پر فائز کر دیا ہے نُصَیریوں کی طرح
قَاتَلَھُمُ اللہُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْن ۹ : ۳۰)

سودا

(۱) سن چکے احوال ساتوں شعر کا اب کہو تم آپ ہی یا بلغ العلیٰ
بَلَغَ لَ کو بَلْغَ لَ باندھا گیا ہے۔
(۲) ہے مجھے فیضِ سخن اس کی ہی مدّاحی کا ذات پر جس کی مبرا ہن کنہ عزّ و جل
کُنْہ کو کُنَہ یعنی "ساکن الاوسط کو متحرک الاوسط موزون کیا ہے"
[فیضی : از کُنہِ کمال او چہ نالیم ما ہیچ مدان آفرینش]
فائز دہلوی : عقل باشد ز کُنہِ اُوْ اَعْمیٰ
عطار : گر بکُنہِ خود ترا باشد رہی از خدا و خلق بے شک آگہی
عُرفی : حد کُنہ تو بہ ادراک نشاید دانست ویں سخن نیز باندازۂ ادراک منست

نظیر اکبر آبادی

(۱) کیا مجھ سے جس نے عداوت کا پنجہ سنلقی علیك قولاً ثقیلا

(حاشیہ میں " علیھم عذاباً ثقیلا)

قرآن : اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلاً ثَقِیْلاً ۷۳ : ۵

مصرع کو باوزن پڑھنے کے لیے قَوْلًا قَوْلا = قَوَالًا پڑھنا پڑے گا۔ ویسے بھی ضمیر مجھ (واحد متکلم) اور جس (ضمیر واحد غایب) کی رعایت سے عَلَیْہِ آنا چاہیے۔

(۲) کہستاں میں ماروں اگر آہ کا دم فکانت جبالٌ کثیبًا مھیلا

قرآن : وَکَانَتِ الْجِبَالُ کَثِیْبًا مَّھِیْلًا ۷۳ : ۱۴

وَکَانَتِ الْجِبَالُ = مفاعلن فعولن کو فکانت جبالٌ = فعولن فعولن باندھا گیا ہے۔

(۳) نظر اس کے فضل و کرم پر نظر رکھ فقل حسبی اللہ نعم الوکیلا

قرآن : فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ ۹ : ۱۲۹

وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیل ۳ : ۱۷۳

الوکیل کو الوکیلا باندھا گیا ہے۔ نعم الوکیلا کی ترکیب قرآن میں نہیں۔

[آغا حشر:

السّلام اے ما تہیدستانِ محشر را کفیل السلام اے یوم پرسش حسبنا نعم الوکیل]

قربان علی سالک

اے رشکِ مہر، ماہ کو نسبت ہے تجھ سے کیا ہے وصف تیرے چہرے کا والشمس والضحیٰ

قرآن : وَالشَّمْسِ وَ ضُحٰھَا ۹۱ : ۱

شاعر کے ذہن میں بداہتاً یہی قرآنی ترکیب تھی ویسے مقسم بہ کے طور پر صرف وَ الضُّحٰی ۹۳ : ۱ میں استعمال ہوا ہے۔ وَالشمس ۶ : ۹۶ ، ۷ : ۵۴ ، ۱۲ : ۴ ، ۱۶ : ۱۲ ، ۲۱ : ۳۳ ، ۲۲ : ۱۸ ، ۳۶ : ۳۸ ، ۴۱ : ۳۷ میں واؤ کہیں بھی قسم کے طور پر نہیں آئی۔

سیّد انشا

(۱) آپس میں سحر گہ کی جھلیں اور پھر بالصّوم غدٍ نویت اونکا کہنا

نیتِ روزہ : وَ بِصَوْمِ غَدٍ نَّوَیْتُ (مِنْ شَھْرِ رَمَضَان) یعنی الصّوم نہیں بلکہ صوم۔ اور غدًا نہیں بلکہ غدٍ۔

(۲) خویش را کن بیادش ملتصق فاعتصم باللہ تب ماسبق

قرآن : وَ مَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰہِ ۳ : ۱۰۱

وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ۲۲ : ۷۸

فاعتصم باللہ قرآن سے مستخرج تو ضرور ہے۔ مگر قرآنی ترکیب نہیں۔

(۳) انشا اللہ جنتی خواہد شد   گوینده لا اله الا اللہم

اِنْشَاءَ اللّٰه اِنشَا اللّٰه چھپا ہے بہ سقوطِ ء حالانکہ ء وزن میں شامل ہے اور اللّٰہ کو اللّٰهم باندھا ہے باضافۂ میم۔

(۴) فَاحْفَظُوا اوقاتکم حین الصّلوٰۃ   نیست غافل را سرورے از حیات

قرآن: حَافِظُوا عَلَی الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی ۲ : ۲۳۸

پہلے مصرع کا صرف مضمون قرآن سے مقتبس ہے۔ الفاظ شاعر کے اپنے ہیں

(۵) دایم سوال از تو چوں ابراہیم   رب ارنی فکیف تحی الموتیٰ

قرآن: رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ۲ : ۲۶۰

کیف پر ف کا اضافہ شاعر کا خانہ ساز ہے یہ ضرورتِ شعری !

(۶) ازوادی اضطراب ما را بہ رہاں   اے قایل قول من یجیب المضطر

قرآن: اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ ۲۷ : ۶۲

اَمَّنْ کو مَنْ باندھا ہے۔

(۷) بہار کہتی ہے یہ شعر واجب التعظیم   ہے امر تم کو بھی صَلُّوا وَ سَلِّمُوا تسلیم

قرآن: صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۳۳ : ۵۶

تَسْلِیْمًا کو تسلیم باندھا ہے عَلَیْہِ حذف کر دیا۔

(۸) معنی آیہ و اولی الامر منکم   گویا بر آفتاب جبینت نوشتہ اند

قرآن: وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۴ : ۵۹

شاعر نے مِنْکُمْ کو مِنْکُمُ باندھا ہے۔

(۹) انت انزلت علی قومك الیوم کما   انزل اللہ من العرش علیٰ موسیٰ مَنْ

قرآن: وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی ۲ : ۵۷
وَاَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی ۷ : ۱۶۰
وَنَزَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی ۲۰ : ۸۰

شاعر کے الفاظ سراسر اس کے اپنے ہیں۔

(۱۰) ناقوس صنم سے ہم بھی یہاں سنتے ہیں   سبحانك ما خلقت هٰذا باطل

قرآن: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّار ۳ : ۱۹۱

بَاطِلًا کو باطل باندھا گیا ہے اور رَبَّنَا کی بجائے سُبْحَانَكَ ہے۔

مومن

(۱) تا سحر شام عبادت تری شب بیداری شارح آیت کرسی پس حیّ القیّوم

[درد :

فرمود چنیں حضرت حیّ القیّوم درگوشِ دلم کہ اے طلسمِ موہوم!]

قرآن : اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۲ : ۲۵۵

اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ یا حیّ و قیّوم ہونا چاہیے تھا لیکن یہ ترکیب ایسی ہی خانہ ساز اور عامۃ الورود ہے جیسی کہ غفور الرحیم کی، جسے الغفور الرحیم یا غفور و رحیم ہونا چاہیے۔

مرزا دبیر:

تقصیر بخش دیجئے مجھ دل دونیم کی مولا تجھے قسم ہے غفور الرحیم کی
اے جل شانہٗ وہ غفور الرحیم ہے رحمان و مستعان و رؤف الرحیم ہے

میر حسن :

پرستش کے قابل ہے تو اے کریم کہ ہے ذات تیری غفور الرحیم

انیس :

کیوں تجھ کو اتنی وحشت نارِ جحیم ہے بھائی خدا کی ذات غفور الرحیم ہے

جوش ملیح آبادی :

سُن مری بات میرا کہنا مان یا غفور الرحیم یا رحمان

نیّر واسطی:

خدا کو لوگ غفور الرحیم کہتے ہیں گناہ شوق کریں، شوق سے گناہ کریں

پروین شاکر :

زیرِ لب ایک ہی اسم پڑھتی ہوئی
——— یا غفور الرحیم!
——— یا غفور الرحیم!

(۲) تیر باراں سے ترے کیونکہ نہ بھاگیں اعدا جانتے ہیں کہ شہب بہر شیاطیں ہے رجوم

قرآن : وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَجَعَلْنٰھَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ ۶۷ : ۵
حِفْظًا مِّنْ کُلِّ شَیْطٰانٍ مَّارِدٍ ــــ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَۃَ فَاَتْبَعَہٗ شِھَابٌ ثَاقِبٌ
۳۷ : ۷،۰

قرآن میں شہاب کا لفظ ہے جسے شاعر نے شہب بنا دیا ہے۔

ذوق

(۱) جو ہوویں اس کے ہوا خواہ وہ رہیں سرسبز   ہوں اس کے دشمن بدکیش خالداً فی النّار

قرآن : کَمَنْ ھُوَ خَالِدٌ فِی النَّار ۴۷ : ۱۵

خَالِدٌ کو خالداً باندھا گیا ہے اور پھر صیغۂ جمع کی رعایت سے خَالِدِیْنَ ہونا چا

(۲) مصحفِ رُخ ترا اے سایۂ ربّ العزّت   کھول دے معنیِ اَتْمَمْتُ علیکُمْ نعمت

[نسیم امروہوی :

علم توفیقِ ازل، علم عطائے قدرت   علم مصداق و اتممتُ علیکُمْ نعمت :

قرآن : وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ ۵ : ۳

نِعْمَتِیْ کو نعمت باندھا گیا ہے۔

[اسمٰعیل میرٹھی :

قالَ : اتممتُ علیکم نعمتی   ہوگئیں سب خُوبیاں اس پر تمام :

اس شعر میں و کو حذف کر کے قالَ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

(۳) جو ہو نہ تابعِ امرِ تشاوَروا فی الاَمر   تو عقلِ کل کو کرے تو نہ ہرگز اپنا مشیر

قرآن : وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ ۳ : ۱۵۹

عَنْ تَرَاضٍ مِّنْھُمَا وَتَشَاوُرٍ ۲ : ۲۳۳

شَاوِرْھُمْ کو شاعر نے تَشَاوَرُوْا بنا دیا۔

(۴) الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے   کہ آج کوچے میں اس کے شور بِاَیِّ ذَنْبٍ قَتَلْ

قرآن : وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ، بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ؟ ۸۱ : ۹

قُتِلَتْ کو شاعر نے قَتَلْتَنِیْ بنا دیا ہے۔

(۵) کبھی کرتا تھا قدم چرخ کا ثابت بہ حیات   اور کبھی کرتا تھا باطل بسماءِ انشقّت

قرآن : فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَاءُ ۵۵ : ۳۷

وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ ۶۹ : ۱۶

اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ ۸۴ : ۱

فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۶) گر قتل ہی کرنا ہے قاتل کہیں کر جلدی   لاحول ولا قوّت کیا دیر لگائی ہے
حدیث: لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ   قرآن، لَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ۱۸ : ۳۹
قُوَّۃَ کو قُوَّتْ باندھا گیا ہے۔

حالی

(۱) جزاھم بما صبروا جنّات و حریرا
قرآن: وَجَزَاھُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّۃً وَّحَرِیْرا ۷۶ : ۱۲
تاریخ وفات غفران مآب نواب مصطفیٰ خان مرحوم رئیس جہانگیر آباد متخلص بہ حسرتی و شیفتہ
"چونکہ تاریخ وفات میں ایک عدد کی کمی رہتی تھی اس لیے "جَنَّۃً" کی جگہ "جنّات" کر دیا گیا ہے جیسا کہ نوّاب آصف الدّولہ کی مشہور تاریخ میں بجائے "فروح و ریحان و جنت النعیم" کے "ھٰھنا روح و ریحان و جنّات النعیم" کر دیا گیا ہے۔"

(۲) کانہ صرح ممرد من القواریر
قرآن:
اِنَّہٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْر
۲۷ : ۴۴

"تاریخ بنائے آئینہ خانہ در ریاست گاہ بہاول پور
"بہ ضرورتِ تکمیل اعداد اور نیز بمقتضائے مقام انہ کی جگہ کانہ کر دیا گیا ہے۔ مگر چونکہ اس سے بھی اعداد پُورے نہیں ہوتے اس لیے "قواریر" میں الف لام بڑھا کر القواریر کر دیا گیا ہے۔"

(۳) لحاش للہ ما ھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم
قرآن، حَاشَ لِلّٰہِ مَاھٰذَا بَشَرًا اِنْ ھٰذَا اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْمٌ ۱۲ : ۳۱
"تاریخ ولادت فرزند در حرم سرائے نواب آسمان جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی
اصل آیت میں "حاشَ" ہے۔ مگر بہ ضرورت لام اضافہ کر کے "لحاشَ" کر دیا گیا ہے۔"

اکبر الہ آبادی

(۱) بگڑ جائے گی میری اس بُت کی اک دن   اِلیٰ اَصْلِہٖ یَرْجِعُ کُلَّ شَیٍٔ
قولِ ماثور، کُلُّ شَیٍٔ یَرْجِعُ اِلیٰ اَصْلِہٖ

(۲) کام کو اٹھو چڑھاؤ آستین   لَا یُضِیعُ اللہُ اجرَ المُحسنین

قرآن: فَاِنَّ اللہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۱۱ : ۱۱۵

ترتیبِ الفاظ بدل دی ہے جس کے نتیجے میں اَللّٰہَ کو اَللّٰہُ لکھنا پڑا۔ یعنی منصوب کو مرفوع۔

(۳) ہو جاؤ کھڑے کہیں جو قُوۡ مُوا   بیٹھے جو رہیں فلا تلوموا

قرآن: فَلَا تَلُوۡمُوۡنِیۡ ۱۴ : ۲۲

نی حذف کر دیا گیا۔

(۴) وہ جنرل کہ دبتی تھی جن سے زمین   ہیں گرجا میں راکع مع الراکعین

قرآن: وَارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ۲ : ۴۳

وَارۡکَعِیۡ مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ۳ : ۴۳

(۵) نجات کے لیے کافی ہے سینۂ صافی   پیادہ پائی پہ خوش رہ اِلی الابلُ انظُر

قرآن: اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ ۸۸ : ۱۷

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔ اِلَی کے بعد الابِل مجرور ہونا چاہیے نہ کہ مرفوع۔

انیس

(۱) کہیں شاباش کہیں واہ کا غُل برپا تھا   عرش تک اَجرَکُمُ اللہ کا غُل برپا تھا

قرآن: اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللہِ ۱۰ : ۷۲
۱۱ : ۲۹
۳۴ : ۴۷

اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۲۶ : ۱۰۹   ۲۶ : ۱۶۴
۲۶ : ۱۲۷   ۲۶ : ۱۸۰
۲۶ : ۱۴۵

اَجۡرُھُمۡ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ ۲ : ۶۲   ۲ : ۲۷۷
۲ : ۲۶۲   ۳ : ۱۹۹
۲ : ۲۷۴

اَجۡرَکُمُ اللہ کے الفاظ قرآن میں نہیں۔ ویسے بھی انہیں اجرُکُم عند اللہ یا عَلَی اللہ ہونا چاہیے تھا۔

دبیر

(۱) پانی بھرا گھٹا نے یہ طوفان عیاں ہوا   یا اَرْضُ اِبْلَعی سبقِ آسماں ہوا
قرآن: یَآ اَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ ۱۱ : ۴۴
ا کو اِ بنایا گیا اور نتیجۃً ضُبْ کو ضُ اِبْ باندھا گیا ہے۔

(۲) قرآن کا بطن ہوں خلف انزع البطین   قائم مقام قائد غُرّ المحجّلین
اَلْاَنْزَعُ الْبَطِیْنُ ——— حضرت علی کی صفت، سر کے سامنے کا حصّہ کُھلا ہُوا، بڑے پیٹ والا۔
قَائِدُ الْغُرِّ الْمُحَجَّلِیْنَ ——— سفید منہ اور سفید ہاتھ پاؤں والوں کے قائد
غُرًّا مُحَجَّلُوْنَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوْءِ
اَلْاَنْزَعُ اور اَلْغُرِّ کو اَنْزَعْ اور غُرّ باندھا گیا ہے۔

شاہ نصیر

(۱) لکھی ہیں ہر ورق گل پہ بقول شخصے   اِنَّ فی الجنۃ نُہرلبنٍ
قرآن: فِیْهَا ...... وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ ۴۷ : ۱۵
فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔ دوسرے مصرع میں ایک رکن کم ہے؛ مگر بحر الفصاحت میں یونہی ہے۔

قائم

(۱) یارب احباب ترے شاد رہیں تا بہ ابد   ہوئیں پامال جو اعدا ہیں الیٰ یوم عسیر
قرآن: فَذٰلِكَ یَوْمَئِذٍ یومَ عسیر ۷۴ : ۹
اِلیٰ کی وجہ سے یومَ کو یومِ پڑھنا پڑے گا۔ نصب کی بجائے جر۔

احمد حسن رُسوا

(۱) چوں نظر افگند بر ایوان جاہت شد بلند   از فلک آوازۂ سبحان ذی العرش المجید
قرآن: وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ ۸۵ : ۱۵
فَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ ۲۱ : ۲۲
فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۲) شدت بطش تو بر اعدائے جاہ و دولت   من نماید آشکارا شان ذوالبطش الشّدید
قرآن ؛ إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۸۵ : ۱۲
فرقِ الفاظ واضح ہے۔

مظفّرالدّین مُعلّٰی

(۱) بیان فاتبعونی سے یہ حجّت مسلّم ہے   کہ طاعت احمد مرسل کی عین حق پرستی ہے
قرآن ؛ فَاتَّبِعُوْنِي ۳ : ۳۱
۲۰ : ۹۰
تَ بِ کو زیر کے اشباع کے ساتھ تبی باندھا گیا ہے۔

(۲) جو آیا ہے فعلنا کن لہ مضمون قرآں میں   بیان حال وصف صنعت چالاک دستی ہے
قرآن ؛ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۶ : ۷۳   يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۲ : ۱۱۷
قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۳ : ۵۹
اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۱۶ : ۴۰
قرآن میں فعلنا کُن لہٗ کے الفاظ کہاں ہیں؟

اکبر میرٹھی

(۱) کہا اس کے دشمن کے حق میں خدا نے   فدعوا ثبورا و یصلیٰ سعیرا
(۲) ہر آنکس کہ بر مصطفیٰؐ بغض ورزد   فیدعوا ثبورا وّ یصلیٰ سعیرا)
قرآن ؛ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا وَّ يَصْلٰى سَعِيْرًا ۸۴ : ۱۱، ۱۲
دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۲۵ : ۱۳
وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ۲۵ : ۱۴
فَدَعَوْا (فعلن) کو فَدَاعَو بروزن فعولن باندھا گیا ہے۔ ویسے اگر ف لگانا ہی تھا تو یدعوا پہ لگاتے تاکہ باقی الفاظ قایم رہتے۔

حسرت ؟

(۱) کیا حمد کہوں تیری مجھے کچھ نہیں یارا   یا من خلق الخلق ولیلاً و نہاراً

قرآن، وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۲۱ : ۳۳
خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۵۵ : ۳
۹۶ : ۲

خلق الخلق کے الفاظ قرآن میں نہیں۔

فرق عبارت ظاہر ہے۔

شبلی

(۱) ھٰذا ولقد بلغت انتہاہ فاسعوا وتوکلوا علی اللہ

بَلَغَتْ کو بلاغَتْ باندھا گیا ہے لؔ کے اشباع کے ساتھ۔

نظم طباطبائی

(۱) مگر اتنا کہا تو مانو مرا کہ خذ وا ما صفا دعوا کدرا

قولِ ماثور: خُذْ ماصفا وَدَعْ ماکَدِرَ

(۲) اپنی میراث بانٹ دی بے جا ویلنا تلک قسمۃ ضیزیٰ
(ہائے کیا بھونڈی تقسیم ہے منہ ۱۲)

قرآن: تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِیْزٰی ۵۳ : ۲۲

اِذًا حذف کر دیا اور ویلنا کا اضافہ کر دیا، جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ بھی آیت کا حصہ ہے۔

(۳) جمع المال ثم عَدَّدَهٗ ماله فی الجحیم اَخْلَدَهٗ

قرآن: نِ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ ۱۰۴ : ۲، ۳

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۴) پیٹ کے واسطے یہ مکاری فَاتَّقُوْا حُفْرَةً مِّنَ النَّارِ

قرآن: عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ ۳ : ۱۰۳

فَاتَّقُوْا سے بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ آیت کا حصہ ہے حالانکہ نہیں۔

(۵) مالکم تحسبون مِن فی ءٍ مالکم لستم علیٰ شیءٍ

قرآن: لَسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ۶ : ۱۵۹

فرقِ الفاظ ظاہر ہے لَسْتَ کو لَسْتُمْ باندھا گیا ہے۔

مُحسن کاکوروی

(۱) ہوئے پھر بھی جو سیہ دل متبنی گمراہ　　ختم اللہُ علیٰ قلبھم انشاء اللہ

قرآن : خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ　۲ : ۷

قلوبھم کی بجائے قلبھم اور پھر فعل ماضی کے بعد انشاء اللہ ؟

(۲) کہتا ہے اشارۃً لجالو　　موتوا من قبل ان تموتُوا

قولِ ماثور، حدیث ؟ : مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا (اِسْتَعِدَّ لِلْمَوتِ قَبْلَ اَنْ نزولِ الْموتِ)

ترتیبِ الفاظ مختلف۔

(۳) چمن پرور رنگ و بوئے کلم　　بالہام انبئے باسمائھم

قرآن : قَالَ یٰاٰدَمُ اَنْبِئْھُمْ بِاَسْمَآئِھِمْ　۲ : ۳۳　　اَنْبِئْھُمْ کی بجاے اَنْبِئْ۔

(۴) رکھے گا مرا رب مری آرزو　　فمن رحمۃ اللہ لا تقنطوا

قرآن : لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ　۳۹ : ۵۳

ترتیبِ الفاظ تبدیل کر دی اور مِنْ پر ف کا اضافہ کر دیا۔

(۵) جسے لائے گا تی ہُوتی حُورِ عیں　　یطاف علیھم بکاس مُعیں

قرآن : یُطَافُ عَلَیْھِمْ بِکَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ　۳۷ : ۴۵　　م پہ پیش نہیں ہے۔

مِنْ حذف کر دیا۔

(۶) کرم اس کا ہے فتح باب فرح　　کہ من دق باب الکریم الفتح

فعل کے ساتھ ال ؟

(۷) نوید انّ ابرارھم فی نعیم　　وعید انّ فجّارھم فی جحیم

قرآن : اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ　۸۲ : ۱۳　　۸۳ : ۲۲

وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ　۸۲ : ۱۴

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔ اَلْاَبْرَار کی بجائے ابرارھم، الفُجّار کی بجائے فجّارھم اور دونوں جگہ لَفِی کی بجائے صرف فی۔

(۸) آنکھوں سے لکھوں صفت وہ آنکھیں　　ما لا عینٌ رات وہ آنکھیں

حدیث : مَنْ دَخَلَ الْجَنَّۃَ ینعم لا یبأس، لا تبلی ثیابُہٗ ولا یفنی شبابُہٗ و فی الجنّۃ ما عینٌ رَاَتْ ولا اذنٌ سَمِعَتْ ولا خَطَرَ علٰی قلبِ بَشَرٍ۔

شاعر نے ان الفاظ کو جو جنّت کے نظاروں کے بارے میں ہیں حضورؐ کی آنکھوں پر منطبق کیا ہے۔

(۹) عیاں فرما کے نورِ علمک مالم تکن تعلم   کلام پاک کے تارے اتارے قلبِ انور میں

قرآن : وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۴ : ۱۱۳

عَلَّمَكَ کے کَ کو ساکن باندھا گیا ہے۔

(۱۰) ملا اس سے تھی جس کی جس کو طلب   بمصداق المرء مع من احب

حدیث : اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ

(اِنَّكَ (اَنْتَ) مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ)

مَعَ کو مَعْ باندھا گیا ہے اور اَحَبَّ کو اَحَبْ۔

ظفر علی خاں

(۱) سُن لو جبرِیل امیں کا یہ پیام   لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا

یہ پیام خدا کا ہے جبرِیل امیں تو صرف پیامی ہیں۔

عرشی امرتسری

(۱) گرچہ نہیں اب کوئی سہارا   لَمْ اَکُ بِدُعَائِكَ شَقِیا

قرآن : وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۱۹ : ۴

وَلَمْ اَكُ بَغِيًّا ۱۹ : ۲۰

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔ اَكُ کو اَكْ باندھا گیا ہے چھپا اگرچہ اَكُ ہی ہے۔

(۲) از نکتۂ لا اُحب الآفل   عرشی بخدائے ہست شاغل

قرآن : لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۶ : ۷۶

اَلْاٰفِلِين کو الآفل باندھا گیا ہے۔

(۳) شَرِبْنَا طَرِبْنَا سَكِرْنَا لَهَوْنَا   اِلٰی ان بدا الفجر و النجمُ آفِل

قافیہ : نوافِل ، غافِل۔

نیچے حاشیے میں معنی لکھے ہیں ——— تارے ماند پڑنے لگے۔

آفِل اسمِ فاعل ہے۔ یہاں تقاضا فعل ماضی کا ہے اَفَلَ آنا چاہیے تھا۔ اَفِلَ نہیں آسکتا

اَفِلَ (المُرضِعُ) کے معنی ہوتے ہیں : (دودھ پلانے والی کا) دُودھ سُوکھ گیا۔

عبدالباری معنی اجمیری

(۱) جس کے حُسنِ خلق کی آیت علیٰ خلق عظیم   جس کا سایہ درحقیقت سایۂ ربِّ ودود

قرآن : وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۶۸ : ۴

لَعَلٰی کو عَلٰی اور خُلُقٍ کو خُلْقٍ باندھا گیا ہے۔ یعنی لامِ مضموم کو ساکن۔

شاد عظیم آبادی

(۱) کہا فقط غفر اللہُ ذنبہم میں نے   ہمیشہ سخت کلامی سے محترز تھی زبان
تھے سادہ دل وہ سب غفر اللہ ذنبہم   پہلے مجھے خلش تھی نہ اب ہے کوئی حسد

قرآن : یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ۳ : ۳۱

۴۳ : ۷۱

۴۶ : ۳۱

فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِہِمْ ۳ : ۱۳۵

اِغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا ۳ : ۱۴۷

غفر اللہُ ذنبہم قرآنی ترکیب نہیں۔ اور پھر محل ذَنْب کا نہیں ذُنُوب کا ہے۔

(۲) وسائط اس میں بڑھیں جس طرح کثیر رماد   تو اس سے ہوگا پراگندہ ذہن سامع کا

حاشیے میں درج ہے : "کثیر الرماد۔ بہت سی راکھ جمع رکھنے والا۔ یعنی جس کے ہاں کھانا زیادہ پکتا ہو اور مہمان زیادہ آتے ہوں۔"

بالکل صحیح۔ مگر یہ معنی کثیر الرّماد کے ہیں کثیرِ رماد کے نہیں۔ جس کا مطلب ہے زیادہ راکھ۔

——— چند شاعروں نے (خصوصاً مرثیہ گویوں نے) ۔ فاطِمَةُ بُضْعَةُ مِنِّیْ استعمال کیا ہے۔

حدیث کے الفاظ ہیں : فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِّنِّیْ یا مُضْغَةٌ مِنِّی (۵ : اَنَّ فَاطِمَةَ)

یعنی بَضْعَةٌ کو بُضْعَةُ باندھا ہے۔

نسیم امروہوی نے اپنے شعر میں مِنّی کو حذف کر دیا ہے۔

وہ ہوگیا وہیں جسے بی بی نے کُن کہا   جب تو نبی نے فَاطِمَةٌ بُضْعَةٌ کہا

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

جعفر طاہر

(۱) کس شخص کی ہے شان میں لِاِیلافِ قریشٍ   اے سورۃ الفیل دکھا کعبے کا محسن !
لِایلافِ قریشٍ سے عیاں شانِ پدر ہے   الفیل کی سُورت ہے کہ تعریفِ پسر ہے
قرآن ، لِاِیْلَافِ قُرَیْشٍ ۱۰۶ : ۱
لِ اِ ی (وتد) کو لی (سبب) باندھا گیا ہے۔

اقبال سُہیل

(۱) چمن پیرائے کُن صدقے تری نیرنگ سازی کے   لبِ ہر غنچہ پر ہے کُلّ یومٍ ھُوَ فی شانٍ
قرآن : کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فی شَاْنٍ ۵۵ : ۲۹
ھُوَ کے ھُ کو اشباعِ ضمّہ کے ساتھ ھُو = بروزنِ لُنْ باندھا گیا ہے۔ شانٍ کو شانِ (شانی

ریحانٍ کی جگہ ریحانِ (ریحانی)۔

(۲) دونوں تفسیر ترکت فیکم الثقلین ہیں   آج بھی دونوں رفیق سیّد الکونین ہیں
حدیث : وَاِنِّیْ (و اَنا) تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابُ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِیْ
—— اولھما کتاب اللّٰہ فیہ الھدیٰ و النور فتمسکوا بکتاب اللّٰہ و خذوا بہ الحث
علیہ ورغب فیہ —— ثمّ قال : وَ اَھْلُ بَیتی اذکرکم اللّٰہ فی اھل بیتی ثلاث مرّات.
تَارِکٌ کی جگہ تَرَکْتُ ہے۔ الثَّقَلَین کے قَ کو ساکن باندھا گیا ہے۔

(۳) عام ہو اس کی مروّت فیض عالمگیر ہو   حلم اس کا بَیْنَھُمْ رُحَمَاءُ کی تفسیر ہو
قرآن : رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ۴۸ : ۲۹
ترتیبِ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ رُحَمَآءُ کی مُتحرک ح کو ساکن باندھا گیا ہے۔

نصراللہ خاں عزیز

(۱) زندگی تیری ہے تفسیرِ صحابی کالنجوم   تو چلے جس پر وہی دینِ ھُدیٰ کی بھی ہے راہ
حدیث : اَصْحَابِی کالنُّجوم بِاَیِّھِمْ اِقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ (یا) اِنَّمَا اَصْحَابِیْ مِثْلُ النُّجُوْمِ فَاَیَّۃً
اَخَذْتم بقولِہٖ اِھْتَدَیْتُم۔
اگر صحابی، ص مکسور کے ساتھ پڑھا جائے پھر لفظاً تو صحیح ہے لیکن اگر ص مفتوح ہے (واحد) یا شا
نے صَحابہ سے یہ ترکیب بنائی ہے تو اس میں فیہہ ہے۔ (صِحاب = اَصحاب = صِحابہ (جمع) صَحابی (ا

احمد رضا خاں بریلوی

(۱) تا بما ہم آید انشاء العظیم   آں نصیب الارض من کاس الکریم

دوسرا مصرع بدیع الہمدانی کے اس مصرع سے مستفاد و مستخرج ہے:

وَلِلْاَرْضِ مِنْ کَاسِ الْکِرَامِ نَصِیْبٌ

فرق الفاظ ظاہر ہے۔ پہلے مصرع میں انشاءُ اللہ کی بجائے انشاء العظیم ہے۔

(۲) دو گروہ باشند مسعود و لئیم   کل فرق کان کالطود العظیم

قرآن: فَکَانَ کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ ۲۶ : ۶۳

گروہ جو فعول کے وزن پہ ہے اُسے فَعَل کے وزن پہ پڑھنا پڑے گا۔

(۳) عذرہا در حشر باشد ناپذیر   قاریا برخواں اَلَم یأت نذیر

قرآن: اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَذِیْرٌ ؟ ۶۷ : ۸

کُمْ کو حذف کر دیا اور تاثر یہ دیا کہ آیت یُونہی ہے۔ کانَ اضافہ شاعر ہے۔

(۴) حق فرستاد ایں صحاب باصفا   کے یطہرنا و یذھب رجسنا

قرآن: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْہِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا ۳۳ : ۳۳

فرقِ الفاظ ظاہر ہے یُطَھِّرُ اور یُذْھِبَ۔ یُطَھِّرُ اور یُذْھِبُ نظم ہوئے ہیں۔

(۵) اے وقاھم ربھم امنت ز شر مستطیر   مجرمم میجوئم از کیفر وفا امداد کن

قرآن: وَوَقٰھُمْ رَبُّھُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ۵۲ : ۱۸

یَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا ۷۶ : ۷

دو مختلف آیتوں کے الفاظ حسبِ منشا ملا دیے۔

(۶) ربنا انا ظلمنا رحم کن   جاہلانہ گفتہ بودیم ایں سخن

[پیر مہر علی شاہ:

ربنا انا ظلمنا الاماں   ان نسینا تو ز دستش وا رہاں

قرآن: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۷ : ۲۳   فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۷) خرمنے کش سوخت برق غیظ او   گفت قرآں السقر مثویٰ لہ

قرآن: سَاُصْلِیْہِ سَقَرَ ۷۴ : ۲۶

فَالنَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ ۴۱ : ۲۴   وَالنَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ ۴۷ : ۱۲

قرآن نے مصرع میں اس سے منسوب الفاظ بالکل نہیں کہے۔

(۸) ما خطا آریم و تو بخشش کنی   نعرهٔ انّی غفورٌ می زنی
قرآن ، نَبِّیْٔ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۱۵ : ۴۹
نعرہ اَنَا الْغَفُوْرُ ہے یا اَنّی انا الغفور نہ کہ انّی غفور۔

(۹) ربنا سبحٰنك لیس لنا   علم شی غیر ما علمتنا
قرآن ، قَالُوْا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۲ : ۳۲
الفاظ کا فرق ظاہر ہے۔

(۱۰) پندہا دادیم وحاصل شد فراغ   ما علینا یا اخی الّا البلاغ
قرآن ، وَمَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۳۶ : ۱۷
یا اَخی کا اضافہ شاعر کا ہے۔

(۱۱) سوف یعطیكَ ربك فترضی   حق نمودست چہ پاسداری ہا
قرآن ، وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی ۹۳ : ۵
لَسَوْفَ کو صرف سوف باندھا گیا ہے فترضٰی کا ف وزن سے باہر ہے۔

(۱۲) نیست فضلش بہر قوم بے ادب   یخطف ابصارھم برق الغضب
قرآن ، یَكَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۲ : ۲۰
قرآن کے اَلْبَرْقُ کو شاعر نے برق الغضب بنا دیا اور الفاظ کی ترتیب بدل دی۔

(۱۳) قل کزرع اخرج الشطا الٰی   آزر ، فاستغلظ ثمّ استوٰی
یعجب الزراع کالماء المعین   کے لیغیظ الکافرین الظالمین
قرآن ، كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۴۸ : ۲۹
فرقِ الفاظ واضح ہے۔

(۱۴) احسن اللہ لھم رزقا سے دے رزق حسن   بندهٔ رزاق تاج الاصفیا کے واسطے
قرآن ، قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۶۵ : ۱۱
لَهٗ مصرع میں لَهُمْ بن گیا ہے۔

(۱۵) ان پہ کتاب اتری بیانا لکل شئی   تفصیل جس میں ما عبر و ما غبر کی ہے
قرآن ، وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ ۱۶ : ۸۹

تِبْیَانًا کو بیاناً کردیا ہے۔ شَیٔ کو شَیٔ باندھا ہے۔

(۱۶) من زار تُربتی وجبت لہٗ شفاعتی   ان پر درود جن کے نوید ان بشر کی ہے

لَہٗ کو لَہٗ باندھا گیا ہے۔ اگرچہ لکھا لہٗ ہی گیا ہے۔

(۱۷) لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ تھا وعدۂ ازلی   نہ منکروں کو عبث بدعقیدہ ہونا تھا

قرآن : لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ   ۷ : ۱۸

۱۱ : ۱۱۹

۳۲ : ۱۳

۳۸ : ۸۵

جَهَنَّمَ کو جَهَنَّمْ باندھا گیا ہے۔

(۱۸) لیلۃ القدر من مطلع الفجر حق   مانگ کی استقامت پہ لاکھوں سلام

قرآن : لَيْلَةُ الْقَدْرِ ...   ۹۷ : ۳

هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ   ۹۷ : ۵

حَتّٰی کو مِنْ میں بدل دیا جس کے بظاہر کوئی معنی نہیں بنتے۔

(۱۹) ایسا اُمّی کس لیے منت کشِ استاذ ہو   کیا کفایت اس کو اقراء ربک الاکرم نہیں؟

قرآن : اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ   ۹۶ : ۳

درمیانی و حذف کردیا۔

(۲۰) مومن ہوں مومنوں پہ رؤف و رحیم ہو   سائل ہوں سائلوں کو خوشی لَانَهَر کی ہے

قرآن : وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ   ۹۳ : ۱۰

تَنْهَرْ کو نَهَرْ میں بدل دیا اور فلا کا ف حذف کردیا۔

(۲۱) وصف اہل بیت آمد اے رشید   فوق ایدیهم ید اللہ المجید

[غالب :

گر بحکم ید اللّٰہِ فوق ایدیهم   کرامت تو برونم ازیں فشار کند]

قرآن : يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ   ۴۸ : ۱۰

اس آیت کا پہلا حصہ یہ ہے : اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ۔ یعنی اہل بیت کا ذکر نہیں بلکہ ان کا ہے جو حضور کے دستِ حق پرست پر بیعت کرتے ہیں۔ یہ ایک لحاظ سے تحریف معنوی ہے جس سے عام آدمی گمراہ ہوتا ہے۔ ویسے ہوسکتا ہے شاعر نے اہلِ بیعت لکھا ہو کاتب نے

ازراہِ عقیدت بیعت کو بیت سے بدل دیا ہو۔

(۲۲) ماہ من لا ینبغی للشمس ادراک القمر   خاصہ چون از عاد کالعرجوں در اطمیناں توئی

قرآن : لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِيْ لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ   ۳۶ : ۴۰

حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْم   ۳۶ : ۳۹

فرقِ الفاظ ظاہر ہے مصرعِ ثانی میں عُرْجُوْں باندھا گیا ہے یعنی نونِ معلن نونِ غُنّہ بن گیا ہے۔

(۲۳) واں عمرِ حق گو زبان آنجناب   ینطق الحق علیہ والصواب

حدیث : اَلْحَقُّ يَنْطِقُ عَلٰى لِسَانِ عُمَرَ

(ع : يَنْطِقُ الْحَقُّ عَلٰى لِسَانِ عُمَرؓ)

یا خدا بہرِ جنابِ مصطفیٰ امداد کن   میں یہ مصرع آتا ہے:

اے ثروتِ بے ثروتاں اے قوّتِ بے قوتاں

یعنی بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

ویسے شروع کا اے گرا دیں تو پھر یہ سقم ذو بحرین دُور ہو جاتا ہے۔

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام   میں یہ شعر اور مصرعے ملتے ہیں:

۱۔ گل باغ رسالت پہ لاکھوں سلام

۲۔ شبِ اسریٰ کے دُولہا پہ لاکھوں سلام

۳۔ سببِ ہر سبب منتہائے طلب

۴۔ نمک آگیں صباحت پہ لاکھوں سلام

۵۔ حجرِ اسود کعبۂ جان و دل

۶۔ برکاتِ رضاعت پہ لاکھوں سلام

۷۔ جلوہ گیانِ بیت الشرف پر درود   پردگیانِ عفت پہ لاکھوں سلام

[اقبال :

خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل   حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد]

۸۔ گل روض ریاضت پہ لاکھوں سلام

معلوم نہیں اہلِ عقیدت ان کے خارج از بحر و وزن ہونے کی کیا توجیہ پیش کریں گے؟

پیر مہر علی شاہ گولڑوی

(۱) ذالك فضلُ منه اَللّٰهُ یصطفی   من یّشاءُ من عبادہٖ یا اخی
لیك یختصّ بذالك من یّشا   از عبادش انبیاء و اولیا

قرآن ، اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاس ۲۲ : ۷۵

فرق ظاہر و باہر ہے ۔

(۲) ظرف اذکر اذ نسیت کے بود   منسی و مذکور ہر گاہ وے بود

قرآن ، وَاذْکُرْ رَّبَّكَ اِذْ نَسِیْتَ ۱۸ : ۲۴

وَاذْکُرْ کو اُذْکُرْ باندھا ہے ۔ اور رَبَّكَ کو حذف کر دیا ہے ۔ گاہ کو بھی گہ ہونا چاہیے ۔

(۳) مالك الملکی و اللّٰهُ احد   لم یلد لم یولد اللّٰه الصمد
لم یکن احدٌ لك کفواً و لم   لیس شیئًا مثلك یا ذاالکرم

قرآن : قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَد ۱۱۲

وَاللّٰهُ کو وَ اَللّٰهُ باندھا ہے ۔ دوسرے مصرع میں یَلِدْ کے بعد کی و غایب ہے ۔

ترتیب الفاظ بھی مختلف ہے ۔

اَحَدٌ کو اَحَدٌ باندھا گیا ہے اور کُفُوًا کو کُفْوًا ۔ غالبًا یہ رومی کے تتبع میں ہے :

باز باش ای باب رحمت تا ابد   بارگاہ ما لهٗ کفواً احد (انیس نے بھی غیر کفو لکھا ہے)

(۴) دوست داریدش کہ او محبوب اوست   وَرَفَعْنَا لَكَ ذِکْرَكْ را سزا ست

قرآن ، وَرَفَعْنَا لَكَ ذِکْرَكَ ۹۴ : ۴

وَ کو وا باندھا گیا ہے اشباعِ فتحہ کے ساتھ ۔ لَ کو بھی یونہی لا باندھا گیا ہے ۔ ذِکْرَكَ کا كْ ساکن ہے ۔

(۵) شب ز روز و روز از شب شد عیاں   فَمَحَوْنَا آیتَ اللیلِ بیاں

قرآن : فَمَحَوْنَا آیَةَ الَّیْلِ ۱۷ : ۱۲

تَ کو اشباعِ فتحہ کے ساتھ تا باندھا گیا ہے ۔

(۶) قد کان و ما معه ما کان من الاکوان   الآن کما کان مشہود دل زارم

مَعَهٗ کو مَعْهٗ باندھا گیا ہے ۔

(۷) قل لهم قولاً بلیغا لیتما   ولهم بین بیاناً هیّناً

قرآن ، وَقُلْ لَّهُمْ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِیْغًا ۴ : ۶۳
فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا ۲۰ : ۴۴

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔ وَ کو وا اشباعِ فتحہ کے ساتھ باندھا گیا ہے۔

(۸) آں علیؓ غیُوّر و منّان و صمد راجی خود را کجا رسوا کند

غیُور کو غیُوّر باندھا ہے (ویسے معلوم نہیں کاتبوں نے شاید کوئی پوشیدہ ایکا کیا ہُوا ہے کہ اس لفظ کو ہمیشہ تشدید کے ساتھ لکھیں گے۔ شاذ و نادر ہی یہ لفظ غیر مشدّد نظر سے گزرا۔ مگر یہاں تو فاضل سخنور نے خود اسے مشدّد باندھا ہے)

میر حسن : اگرچہ وہ بے فکر و غیور ہے سودا : عہد میں جس کے یہ غیور بزرگ و کوچک

علی کے اوپر رضؓ کی علامت نہ ہوتی تو اسے منجملہ اسماے حُسنیٰ سمجھتے ہُوئے منّان و صمد کی صفات پر آمنّا و صدقنا کہتے اور دُوسرے مصرع کی بھی تہِ دل سے تصدیق کرتے۔

دتاتریہ کیفی

(۱) بالقوے سب کچھ ہے تو بالفعل لیکن کچھ نہیں تیرے آگے غیر ممکن اور ممکن کچھ نہیں

لفظ بِالقوٰے نہیں بلکہ بِالقُوَّۃ (POTENTIAL) ہے بِالفِعْل (ACTUAL) کے مقابل۔

(۲) قدرت کو تو سب کہتے ہیں نا مُتناہی جس کی نہیں انتہا کسی کو معلوم

لفظ مُتَناہی ہے نہ کہ مُتّناہی۔

[مرزا منوّر : سمٹے بھی وُہ داماں تو رہے لامُتَناہی]

(۳) مطلع ہے یہ سحر غزل کائنات کا یہ وقت حسن مطلع ہے نظم حیات کا

دوسرے مصرع میں مطلع کی ع ساقط الوزن ہے۔ یعنی تقطیع میں مطلع کی بجائے صرف مَطْلَ محسوب ہ

(۴) ہے آج رنگ اور ہی لیل و نہار کا آئینہ ہے قضا صنع کردگار کا

لفظ صُنْع ہے نہ کہ صُنَع

(۵) دعوت ابناے وطن کو جو عمل کی دی تھی لایحہ کار میں اس کے نہ ہوئی تبدیلی

[جوشؔ ملیح آبادی :
انفاسِ زندگی کا مرتّب ہُوا حساب اک لایحۂ عمل کی مدوّن ہُوئی کتاب]

پہلے شعر میں لایحۂ کار کو لایحہ کار بغیر ہمزۂ وصل کے یا لایحِ کار بروزن فاعلاتن باندھا گیا ہے۔
دُوسرے میں بھی لایحۂ عمل کو لایحہ عمل باندھا گیا ہے بغیر ہمزۂ وصل کے۔ اگرچہ کتابت میں ء دیا گیا ہے

(۶) موقع بن باس کا یوں رام کو جو پیش آیا جامۂ تعمیل کا تخئیل کو اب پہنایا
موقع کی عین ساقط الوزن ہے۔ یعنی اسے مُوقَی باندھا گیا ہے۔

(۷) منطق لاکھ کہے اس کی ہے پانی پہ بنا عالم آب ثبوت قطعی ہے اس کا
لفظ قَطْعی ہے نہ کہ قَطَعی۔

(۸) نار دوزخ کی طرح سُنتے ہیں "ھل من" کی صدا وہ کچہری ہو کہ دفتر کہ ہو گھر یا بازار
صدا، هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۵۰ : ۳۰
ہے نہ کہ صرف هَلْ مِنْ
جس کے اپنی جگہ کوئی معنی نہیں بنتے!

فیض احمد فیض

(۱) نائب اللہ فی الارض
یہ نائبان خداوند ارض کا مسکن

قرآن کے الفاظ ہیں: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَه ۲ : ۳۰
اس میں مجرّد خلیفہ کا لفظ ہے خلیفۃ اللہ کا نہیں۔
اگرچہ ڈپٹی نذیر احمد نے اس کا ترجمہ یُوں کیا ہے کہ زمین میں (اپنا ایک نائب) بنانے والا ہوں۔
مولانا فتح محمد جالندھری اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا ترجمہ بھی یہی ہے اپنا نائب۔
اور مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی اس کی تفسیر یُوں کی ہے: یعنی وُہ میرا نائب ہوگا کہ اپنے احکامِ شرعیہ کے اجرا و نفاذ کی خدمت اس کے سپرد کروں گا۔
'معالم' کی رائے بھی یہی ہے: خلیفۃ اللہ فی ارضہ لاقامۃ احکامہ وتنفیذ قضایاہ۔
ویسے عام عقیدہ بھی یہی ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ہے وَهُوَ الَّذِی جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ ۶ : ۱۶۶
شاہ عبدالقادر: نائب زمین میں شاہ رفیع الدّین: جانشین زمین کا شاہ ولی اللہ: بادشاہانِ زمین

(۲) حسرت دید میں گزراں ہیں زمانے کب کے
لفظ گُذَراں ہے نہ کہ گُزْراں
فراق: وہی اندازِ جہانِ گزَراں ہے کہ جو تھا

(۳) کچھ بھی ہو آئینۂ دل کو مصفّا رکھیے جو بھی گزرے مَثَل خسرو دوراں چلیے
مَثَل = ضرب المَثَل = کہاوت

مِثل = مانند، طرح

یہاں مِثل کا محل ہے جسے مُثل کے وزن پر باندھا گیا ہے۔

(۴) دل سے بس ہوگی یہی حرف ودع کی صورت

ودع پنجابی میں تو صحیح ہے اور اردو میں بھی شاید مفرد صُورت میں کسی حد تک گوارا ہو جائے

جیسے

عکس جاناں کو ودع کرکے اُٹھی میری نظر

مگر فارسی ترکیب کے ساتھ ـــــ محض ایجادِ بندہ

(۵) جس راہ چلے جس سمت گئے یُوں پاؤں لہو لہان ہُوئے

لُہان کو لوہان پڑھنا پڑے گا۔

(۶) یہ مہندی کیوں لگائی ہے

یہاں بھی لگائی کو لگّائی پڑھنا پڑے گا۔

(۷) اس بھرے شہر کی نا سُودگیاں

بھر ناسودگی مچلے تو منائے نہ بنے

لفظ ناآسودگی ہے نہ کہ ناسودگی

(۸) کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا

یہاں مسیحا کا الف گرانا کسی صُورت بھی جائز نہیں۔

(۹) تیری آنکھوں کے سوا دُنیا میں رکھا کیا ہے

ایسے ہی یہاں زورآوری سے دنیا کا الف گرایا گیا ہے۔ یہاں دہر کا لفظ بڑی آسانی سے لایا جا سکتا تھا اور اس سے پہلے شعر کے غمِ دہر (تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے) کو غمِ زلیست میں بدلا جا سکتا تھا۔

(۱۰) یہ رعب کا عالم کہ کوئی پہل نہ کرتا

لفظ پَہَل ہے بروزنِ خَلَل نہ کہ پَہْل سکونِ ہ کے ساتھ۔

[عزیز لکھنوی: دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا]

(۱۱) شاعر نے ایک جگہ وَطَن کو بھی وُطَن باندھا ہے (میں اسے جائز سمجھتا ہُوں؟)

جوش ملیح آبادی

(۱) شق ہوا اے گنبدِ طلسمِ ظلمات   لو دے اے وجہِ ذوالجلال والاکرام
—— مہتاب میں رخشندگی وجہ ذُوالاکرام
—— دائماً تاباں رہیں گے مثلِ وجہ ذوالجلال

قرآن: وَیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَام ۵۵ : ۲۷

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔ پہلے شعر میں لِ وَالْاِکْرَام کی بجائے ل و اکرام ہے۔

(۲) تکیہ گاہ کافران و مومنین   آدمی ہے رَحْمَةُ اللعالمین
زندگی فرمانروائے کشور دنیا و دیں   موجد حرفِ خدا و رحمۃُ اللعالمین

دونوں شعروں میں اللعالمین ہے حالانکہ الف حشو محض ہے۔ پہلے شعر میں دوسرے لام کے نیچے بھی ا ہے معلوم نہیں کیوں۔ حالانکہ یہ لام مجزوم ہے۔ جوش صاحب کو جا و بیجا حرکات و سکنات لگانے کا بہت شوق تھا تاکہ اشعار وزن دار اور گمبھیر نظر آئیں اور یوں شاید قحطِ خیال کی تلافی ہو سکے۔ پہلے لام کے نیچے بھی صرف ِ ہونی چاہیے نہ کہ ا کھڑی زیر جو کہ ی کی قائم مقام ہے۔

(۳) ہاں اس طرف قریب ذرا اور کچھ قریب   اچھا جناب خضر ہیں و علیکم السلام
"وَ عَلَے" کو "وائے" باندھا گیا ہے۔

(۴) عجب نہیں کہ بنے ایک روز نغمۂ قُم   مری صدائے "سلام" علیکم اہلِ قبور
سلام کے اوپر واوین ہیں حالانکہ م منوّن ہونا چاہیے تھا۔ اہلِ قبور کی جگہ یا اَھْلَ الْقُبُوْر کا محل تھا۔ اگر فارسی طریقے سے اہلِ قبور لانا تھا تو پہلے "اے" ہونا چاہیے تھا۔

(۵) کہ دہر کا ہے بشر قَادُرٌ علی الاطلاق   ورائے کُرسی و تحتِ الثرٰی کی بات نہ کر
قَادِرٌ کی جگہ قَادُرٌ ہے اور تَحْتَ الثَّرٰی کی جگہ تَحْتِ الثرٰی ہے۔ عام حالات میں انہیں کاتب کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا تھا لیکن جوش صاحب کو اعراب کے بارے میں جو غلو تھا اسے دیکھتے ہوئے اسے کاتب کا سہو کہنا مشکل ہے۔

(۶) اے جوش دل میں ہے کہ جگر میں کہاں ہے درد   اے شاہدِ بتون دو عالم کہیں نہیں
بُطون کی جگہ بُتون؟ کہیں یہ بُتان کی جگہ تو نہیں آیا؟

(۷) اور کہنے لگی پیار سے لے لے کے بلائیں   اے نورِ نظر سلمہ اللہ تعالےٰ
حاشیے میں لکھا ہے: ہر چند سلمکم اللہ درست ہے مگر اردو نے اسے سلمہ اللہ بنا دیا ہے اور اب یہی درست ہے۔

اردو نے کب اور کیسے بنا دیا ہے؟ اس کی کوئی سند؟

درست سلمک اللہ ہے نہ کہ سلمکم اللہ۔ محل صیغہ واحد حاضر کا ہے نہ کہ جمع حاضر کا۔

نظیر اکبر آبادی نے یوں باندھا ہے:

کیا جانیے کس حال میں ہووے گا عزیزو!
دل آج مرا سلمہ اللہ تعالےٰ

یہاں واحد غایب استعمال ہُوا ہے اور یہی اس کا محل تھا۔ جوش صاحب کو صراحتاً تسامح ہوا ہے۔

اکبر الہ آبادی نے یوں استعمال کیا ہے:

احباب میں مرحوم بہت سَلَّمہ کم

یہاں محل سَلَّمَہُم کا تھا۔

سراج اورنگ آبادی:

ہر صبح فلک پر ملک عالم بالا   قد دیکھ سجن کا
تسبیح کریں سلمہ اللہ تعالےٰ   من کا لٹے من کا

ڈاکٹر تاثیر

(۱) غازیوں کی، شہدا کی میں قسم دیتا ہوں، جن کے گھوڑوں کے سموں کی تو قسم کھاتا ہے

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ۱۰۰ : ۱

اس آیت میں سُموں کا کوئی ذکر نہیں۔

شاہ عبد القادر: قسم ہے دوڑتے گھوڑوں کی ہانپتے!

شاہ رفیع الدین: قسم ہے گھوڑوں دوڑنے والوں کی ہانپ کر

شیخ الہند محمود الحسن: قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپ کر

ڈپٹی نذیر احمد: (غازیوں کے) ان گھوڑوں کی قسم جو دوڑتے دوڑتے ہانپ اُٹھتے ہیں

عبد الماجد دریابادی: قسم ہے گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں

مولوی فتح محمد جالندھری: ان سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ہانپ اُٹھتے ہیں

غالباً شاعر کے ذہن میں اس کے بعد کی آیت تھی، فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا جس کا ترجمہ انہی بزرگوں نے

---

٥ والعادیات ضَبْحًا

بالترتیب یوں کیا ہے:

۱۔ پھر آگ سلگاتے جھاڑ کر

۲۔ پھر آگ نکالنے والوں کی پتھر جھاڑ کر

۳۔ پھر آگ سلگانے والے جھاڑ کر

۴۔ پھر (پتھروں پر اپنی ٹاپوں کے) مارنے سے چنگاریاں نکالتے ہیں

۵۔ پھر ٹاپ مار کر آگ جھاڑتے ہیں

۶۔ پھر (پتھروں پر نعل) مار کر آگ نکالتے ہیں

مگر قسم پہلی آیت کی طرح گھوڑوں کی ہے، ان کے سُموں کی یا ان کی ٹاپوں کی نہیں۔

امجد حیدر آبادی

(۱) صَلِّ کاَنَّکَ تراہُ ہوگیا قابلِ عمل رفع یدین کر سکے کون اب اس نماز سے

شعر کا وزن ہے مفتعلن مفاعلن ——— بحرِ رجز مُطوّی مخبُون

تراہُ کا ہُ وزن سے خارج ہے۔ تقطیع میں صرف ترا آتا ہے۔

حدیث: اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ ——— اُعْبُدُ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔

(۲) ان کا کہنا ہے وحی ما یوحی نہ بناوٹ نہ اس میں کچھ ہے قصور

قُرآن: اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۵۳: ۴

وَحْیٌ کو تنوین کے بغیر صرف وحی باندھا گیا ہے اور بیچ میں ما کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

سراج اورنگ آبادی

(۱) جی سیں یبقی وجہ ربّك کی سدا سمرن کوں پھیر دُور کر من سے خیال من علیھا فان کا

قُرآن: کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَام ۵۵: ۲۷

رَبِّكَ کو رَبِّكِ اور فانٍ کو فان باندھا گیا ہے۔ خیال بھی خیالِ پڑھا جاتا ہے حالانکہ اضافت کا کوئی محل نہیں اگر ہے تو "کا" کا نہیں۔

مخدوم محی الدّین

(۱) او آفتاب رحمت دوراں طلوع ہو او انجم حمیت یزداں طلوع ہو

شاعر نے مصرعِ ثانی میں انجم کو سہواً نجم کے معنی میں استعمال کیا ہے اس گمان میں کہ یہ لفظ واحد ہے حالانکہ یہ جمع ہے نجم کی، نجوم، نُجم اور اَنجام کے ساتھ۔

(اقبال :
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا)
اس کی جگہ اختر بآسانی آسکتا تھا۔

وحید الدّین سلیم پانی پتی

(۱) دینے لگے اس میں صدا خوف وبیم زَلْزَلَۃُ السَّاعَۃِ شَیْءٌ عظیم
قرآن : اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ۲۲ : ۱
شاعر نے ۃَ کو ۃُ یعنی منصوب کو مرفوع باندھا ہے اِنَّ کے حذف کی وجہ سے۔
انوری کا یہ شعر ہم پہلے نقل کر چکے ہیں :
زلزلۂ قہر توشاں پست کرد زلزلۃ الساعۃ شیءٌ عظیم

احسن مارہروی

(۱) فرض ہے جانا وہاں کا عمر بھر میں ایک بار غَیْرَ ذِی ذَرْعٍ جسے کہتا ہے قرآن میں
قرآن : بِوَادٍ غَیْرِ ذِی زَرْعٍ ۱۴ : ۳۷
مطبوعہ شعر میں غَیْرَ اور ذَرْعٍ ہے۔ ر مکسور کی جگہ مفتوح اور ز کی جگہ ذ۔ مصرعِ ثانی میں غالباً ہے کے بعد وہ تھا جو چھوٹ گیا ہے۔
(۲) جو خلافت اِنّی جاعل فی الارض ہے مستحق بن کر اسے ثابت کیا مخلوق پر
قرآن : وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ۲ : ۳۰
پہلا مصرع یونہی چھپا ہے۔ ایک سببِ خفیف غایب ہے۔

پہلی قسط میں ہم نے غالب کے اس مصرع
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار
سے بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ قرآن کی دونوں متعلقہ آیتوں ۲ : ۲۰۱ اور ۳ : ۱۶ میں رَبَّنَا کا لفظ نہیں۔

ساتھ ہی ہم نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ غالباً غالب نے یہ مصرع گلستانِ سعدی سے لیا ہے۔ گلستاں کا شعر ہم نے نقل نہیں کیا تھا، وُہ یہ تھا :

زینہار از قرینِ بد زنہار   وقنا ربّنا عذاب النّار
——— در اخلاق درویشاں

اس کے بعد اور بہت سے شاعروں کے ہاں بھی یہی مصرع نظر آیا۔

عطّار : اذکروا اللہ اولیں فرمود   وقنا ربّنا عذاب النّار
گفتم ایں بد خلاف در توحید   وقنا ربّنا عذاب النّار

صاحب مازندرانی :

چوں ز تو نور و نار بہرہ برند   وقنا ربّنا عذاب النّار

غلام علی آزاد (بلگرامی) :

زن بود در زبانِ ہندی نار   وقنا ربّنا عذاب النّار

قائم :

ہم نے دیکھا ہے داغِ دل قائم   وقنا ربنا عذاب النار

گویا :

کہا کرے یہ عدو سوزِ آتشِ غم سے   جلا جلا وقنا ربنا عذاب النار

جوش ملیح آبادی :

ہر سخن آگ، ہر نفس بجلی   وقنا ربّنا عذاب النّار !

انیس ـــــ نطقِ عظیم

مجتبیٰ حسین

انیس پر لکھنا آسان نہیں۔ اُن کی دنیا اردو شاعری کی جانی پہچانی دنیا سے اگر یکسر نہیں تو بڑی حد تک مختلف ہے جس میں غزل، قصیدہ اور مثنوی کی ہلکی ہلکی آوازیں کبھی کبھی ذرا دیر کے لیے سُنائی دیتی ہیں مگر پھر جلد ہی اِس دُنیا کی بلند تر آوازوں میں ڈوب جاتی ہیں۔ اِس کی آب و ہوا، اِس کی مٹّی، اِس کی پیداوار، اِس کے رسم و رواج، آدابِ زندگی ہماری شاعری کے موسم، خُوبو اور رہن سہن سے الگ ہیں۔

اِس کی آب و ہوا گرم ـــــ بے حد گرم ہے۔ مٹّی سُرخ ہے اور یہاں بے سر لوگ اُگتے ہیں۔ یہاں کے رسم و رواج میں دانا پانی بند ہے اور آدابِ زندگی میں لازم قرار دے دیا گیا ہے کہ آدمی "نفس و اموال و ثمر" کو لے کر بہ رضا و رغبت قربان گاہ میں پہنچ جائے۔

مثنوی کے شہزادے، شہزادیاں، قصیدے کے سلاطین اور غزل کے لیلیٰ مجنوں، قیس و فرہاد، رقیبانِ روسیاہ اور رندانِ باصفا یہاں نہیں ملتے، یہاں بالکل دوسرے قسم کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ مائیں، بہنیں، بیٹے، بھائی، بھانجے، بھتیجے، باپ، دوست احباب ایک طویل اور صبر آزما سفر کرتے ہوئے اُس بے آب و گیاہ سرزمین پر پڑاؤ ڈال دیتے ہیں جس کا نام کربلا ہے، جہاں تشنگی سے ایک ایسا چشمہ پھُوٹتا ہے جو آنے والی صدیوں کو مستقلاً سیراب کرتا رہتا ہے۔ اردو، فارسی کی کسی مثنوی یا نظم میں ایسا چشمہ نہیں ملتا۔

ہماری شاعری میں، ظاہر سی بات ہے کہ یہ دنیا انیس سے پہلے موجود نہیں تھی۔ فصیح، خلیق اور ضمیر نے اِس دنیا کو کچھ کچھ آباد ضرور کیا تھا۔ لیکن اِس کو پُوری طرح آباد انیس ہی نے کیا ہے۔ اُن کے مرثیوں میں ہمیں اِس کی مردم شماری ہی نہیں، مردم شناسی بھی مکمل طور پر مل جائے گی۔

ہمارے بیشتر ناقدین اِس دنیا سے ناآشنا یا کم آشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وُہ اِس نئی دنیا کی سرحدوں کا چکّر کاٹ کر گزر جاتے ہیں اور کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے رہ جاتے ہیں۔ صرف شبلی نے کلاسیکی انداز میں اِس دنیا پر قلم اٹھایا ہے۔ موازنہ آج بھی انیس پر حرفِ آخر ہے۔ ہمارے نقادوں نے بات اِس سے آگے نہیں بڑھائی، البتہ احتشام حسین کا مضمون انیس پہ نئے انداز سے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور اِس لحاظ سے اہم ہے۔

ہمارے ان تنقید نگاروں نے جو انگریزی تنقیدیں پڑھ کر تنقید نگار بنے ہیں میر انیسؔ سے کچھ اُسی قسم کا مطالبہ روا رکھا ہے جو ارسطو کی بوطیقا میں پایا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ان ناقدین نے انیسؔ کو کھو دیا اور انیسؔ کو کھو دینے کا معنیٰ قطعی طور پر ذوقِ سخن کو کھو دینا ہے۔ اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے اُسی پر بحث و تنقید کی یہاں گنجائش ہے نہ ضرورت۔ صرف اُس کا خلاصہ سن لیجئے ان کا فرمانا ہے کہ انیسؔ المیے اور رزمیے کے مفہوم سے ناواقف تھے۔ انیسؔ کے کردار اودھ کے کردار ہیں بلکہ ہندوانہ کردار ہیں۔ انھوں نے تاریخ کو افسانہ بنا دیا ہے۔ کیا خُوب کہا ہے انیسؔ نے :ؔ

اِک افسانۂ بیکسی رہ گیا
نہ قاتل رہا اور نہ سرور رہے

مرثیوں میں اکتا دینے والی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

یہ بالکل سچ ہے کہ انیسؔ نے یونانی ڈرامے نہیں پڑھے تھے۔ غالباً بوطیقاؔ کے نام سے بھی وہ واقف نہیں تھے (ہمارے عالم فاضل ناقدین کو اتنی بات تو معلوم ہونی چاہیے تھی) انیسؔ نے فارسی عربی کے علاوہ اگر بہت پڑھا ہوگا تو شاہ نامہ، مہابھارت اور رامائن۔ اِس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ وہ مہابھارت اور رامائن کے مندرجات سے آگاہ تھے۔ "محلّے میں ایک مندر تھا (یہ فیض آباد کا ذکر ہے) وہاں ایک سادھو کسی قدر عربی فارسی پڑھا ہُوا بیٹھا کرتا تھا۔ آپ (میر انیسؔ) گھڑیوں ٹہل ٹہل کر فارسی اشعار اور دُہڑے اُس کو سنایا کرتے تھے۔ وُہ بھی پڑھا کرتا تھا اجودھیا میں کسی دوست کی تقریب میں گئے وہاں سیتاجی کی رسوئی اور بہت سے مندر ہیں، وہاں کسی سنیاسی سے آپ کی ملاقات ہوگئی۔ تین دن تک وہاں اس سے گھڑیوں بات چیت ایسی رہی کہ وہ بے حد معترف ہوگیا اور کہنے لگا کہ آپ تو حقیقت میں جوگی اور سنیاسی ہیں
شاد عظیم آبادی۔"

مزید برآں آلہا اُودل کی رزمیہ نظم کو وہ بڑے شوق سے سُنتے تھے۔ چنانچہ انیسؔ پر لکھنے کے لیے اتنے پاکھنڈ کی ضرورت نہیں کہ شرح و بسط سے مغربی رزمیہ نظموں اور یونانی ڈراموں پر باتیں کر کے اُن کو انیسؔ پر مسلّط کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان میں مماثلت البتہ تلاش کی جا سکتی ہے مگر ان کے ذریعے سے انیسؔ کو پرکھنا تنقیدی مبادیات سے بے خبری ہے۔ انیسؔ ہر بڑے شاعر کی طرح اپنا معیار آپ ہیں۔

جہاں تک اُن کے کرداروں کا معاملہ ہے وہ یقیناً اودھ کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ مگر اس لباس میں بھی وہ حسنؑ، حسینؑ، عباسؑ، قاسمؑ و اکبرؑ، عون و محمدؑ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بدعت نہیں جو شاعری اور ادب میں ہوتی نہ آئی ہو۔ ڈنمارک کا شہزادہ ہیملٹ، شیکسپیئر کے یہاں انگلستان کا شہزادہ بن گیا ہے۔ داستانوں میں پرندے کہانیاں سناتے ہیں۔ غزل میں مُردے قبروں سے بولتے ہیں اور قصیدے میں

کاشی کی سمت سے متھرا کی جانب بادل اُٹھتے ہیں اور خانۂ کعبہ پر رحمت کی گھٹا چھا جاتی ہے۔ ڈانٹے کے یہاں علیؑ، محمد مصطفےٰؐ کی وفات پر نوحہ کناں ہیں اور اُس مخصوص انداز میں نوحہ کناں دکھائے جاتے ہیں جو خاص مغربی تخیّل کا تراشا ہُوا ہے۔

اب رہ گیا یہ معاملہ کہ اِن کرداروں کا تعلق اودھ کے جاگیری طبقے سے ہے سو وہ اتنا بھی تشویشناک نہیں کہ ہمارے ناقدین اِس صدمے سے سنبھل نہ پائیں۔ بلاشبہ اِن کرداروں کا تعلق اودھ کے جاگیری طبقے سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ سارے کردار مظلوم ہیں ظالم نہیں۔ ساری بحث یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس قسم کی مُوشگافیاں وہی تنقید نگار کر سکتے ہیں جو اِس نکتے سے واقف نہیں ہیں کہ کوئی بھی موضوع یا اُس سے متعلق کردار ہو، وہ شاعری یا مصوّری میں پہنچ کر شاعر یا مصوّر کی اپنی تخلیق بن جاتا ہے۔ لازمی نہیں ہے کہ ظاہری شباہت پائی جائے البتہ ہم باطنی شباہت کو تلاش کر سکتے ہیں۔ مِیرؔ سے لے کر داغؔ تک کی شاعری پر جاگیردار طبقے کے خیالات اور معاشرت اثر انداز ہوتی رہی ہے تو پھر اِس پر چراغ پا ہو کر کیا ہم ان تمام حضرات کی شاعری کو توم دیں۔

بالکل یہی معاملہ اُس تاریخ کا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انیسؔ نے اس میں ملاوٹ کر دی ہے۔ پڑھے لکھے ناقدین کو یہ بتانا کیسی عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ انیسؔ تاریخ نہیں کہہ رہے تھے وہ تاریخ سے پیدا ہونے والے اُس عالمی انسانی شعور پر لکھ رہے تھے جو ہم سے آج بھی پُوچھتا ہے کہ کب تک فرات پر ظلم کے پہرے بٹھائے جائیں گے۔

اب اُس یکسانیت پر دو ایک باتیں کہتا چلوں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انیسؔ کے مرثیوں میں اکتاہٹ پیدا کر دیتی ہے۔ انیسؔ نے کہا ہے ؎ ع

اک پھُول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

یہ لفّاظی نہیں ہے بلکہ موضوع کی جامعیت اور پہنائی پر گفتگو ہے۔ غزل کا مرکزی موضوع حُسن و عشق ہے۔ مِیرؔ کا دیوان مختصر نہیں ہے، بہت ضخیم ہے۔ اِس موضوع کو انھوں نے جتنا پھیلایا اور جتنی تہیں دی ہیں اُس میں اُکتا دینے والی کون سی بات ہے! اب یہ اور بات ہے کہ ہم ضخیم دواوین اور طویل نظموں ہی سے اُکتا جائیں یا زیادہ دیر تک شاعری کے بوجھ کو سہار نہ سکیں۔

انیسؔ کا ایک ہی کردار مختلف مواقع پر مختلف امکانات کا حامل ہوتا ہے اور اِسی لحاظ سے اُس کردار کے نشوونما کی نوعیت اور اُس کی جذباتی اور فکری کیفیت بدلتی جاتی ہے —— کہیں وُہ باپ ہے، کہیں بھائی، کہیں شوہر، کہیں دوست۔ یونانی المیہ ڈراموں کی ساری کہانیاں کم و بیش ایک سی ہیں۔ یہی نہیں اِن ڈراموں کے تمام تماشائی اِن کہانیوں سے پہلے ہی واقف ہوتے تھے۔ مگر ڈرامہ نگار اپنے اندازِ فکر اور اندازِ بیان سے اُنھیں

نیا بناتے گئے ہیں۔ راگ ایک ہی ہوتا ہے۔ بڑا کلاکار اپنے فن سے اِس میں ہزاروں جھروکے کھول دیتا ہے۔

یہ تو ہوئی اُن عالم ناقدوں پہ مختصر سی گفتگو جنھوں نے ہمارے زمانے میں انیسؔ پہ طبع آزمائی کی ہے۔

انیسؔ کا ایک مصرعہ ہے: ع

ہُنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

اب پھر اُس بستی کی طرف آئیے جو انیسؔ نے بسائی ہے۔ نظیرؔ اکبر آبادی نے بھی اردو شاعری کی عام فضا سے ہٹ کر ایک نئی بستی بسائی ہے اور غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مدتوں ناقدین کی نظر اِس بستی پہ نہیں پڑی۔ نظیرؔ کی یہ بستی طربیہ ہے جبکہ انیسؔ کی المیہ ہے۔ نظیرؔ کے یہاں ارتکازِ فکر کی جگہ انتشارِ فکر ہے۔ انتشارِ فکر سے مراد بے ربطی یا الجھن نہیں ہے بلکہ وہی ہے جو میرؔ نے کہا تھا: ع

آئینہ کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

نظیرؔ کہیں ٹھہرتے نہیں۔ اُن کے کردار زندگی کو ڈرامہ سمجھتے ہیں ڈرامہ پیدا نہیں کرتے۔ وہ اسٹیج پر نظر آتے ہیں مگر اسٹیج کے بعد یا اسٹیج کے پیچھے وہ کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ پھر بھی نظیرؔ کی یہ دنیا نئی ہے اگرچہ اِس میں مناسب منصوبہ بندی (PLANNING) کی بہت کمی ہے۔

انیسؔ نے جو بستی بسائی ہے اُسے دیکھنے، سمجھنے اور اس سے گزرنے کے لیے ایک الگ اندازِ فکر اور اندازِ نظر درکار ہے۔

ہومرؔ، دیاسؔ، فردوسیؔ، والمیکی اور تُلسی داس کی دنیا عالمی شاعری میں مختلف ہے۔ اِن کو پڑھتے ہوئے ہم شیکسپیئرؔ اور گوئٹے یا حافظؔ، خسروؔ، میرؔ اور غالبؔ کو ہم راہ نہیں لے جا سکتے۔ اس کا مزاج مختلف ہے۔ یہاں کا ہر کردار "جوہری کردار" ہے جو چھٹ پڑے تو زلزلہ آ جائے، پہاڑ دھواں بن کر اُڑ جائیں۔ دریا الٹے بہنے لگیں۔ یہ کردار قدِ آدم نہیں کائنات گیر ہیں۔ اِن میں بڑی قوت، بڑی جرأت، محبت، نفرت، ہیبت اور سطوت ہوتی ہے۔ یہ کلاسس" (CLOSSUS) ہیں۔ یہ چلتے ہیں تو زمین سے دھمک پیدا ہوتی ہے۔ سر اُٹھاتے ہیں تو آسمان کو چھو لیتے ہیں۔ بھیمؔ اگر گُرز مار دے تو پہاڑ شق ہو جائے۔ ارجنؔ کے تیروں کا توڑ نہیں۔ بھیشمؔ پتا تما تیروں کا تکیہ لگا کر جنگ کا نظارہ کرتے ہیں۔ ہنومان جی پُورے پہاڑ کو اُٹھا لاتے ہیں۔ اصل میں یہ عنصری (ELEMENTAL) کردار ہیں۔ اِن میں اساسی قوت پائی جاتی ہے۔ یہ علمِ نفسیات یا فلسفۂ جذبات کے محتاج نہیں ہوتے۔ یہ اپنی جگہ بلا شرکتِ غیرے خود قائم ہیں۔ اِن کو دیکھ کر ہم حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ ہم میں خوف، دہشت اور کبھی کبھی جذبۂ رحم پیدا ہوتا ہے۔

انیسؔ کے یہاں بھی کم و بیش یہی فضا ہے مگر انیسؔ کا موضوع اساطیری نہیں ہے، تاریخی اور حقیقی ہے اور تاریخ بھی کوئی قدیم تاریخ نہیں، جس میں ماقبلِ تاریخ کا عمل دخل زیادہ ہو۔ اُن کے کردار "دیوتا کردار" بھی نہیں ہیں

اور نہ یہ یونانی دیوتاؤں کی طرح نیک و بد کو سمجھے بغیر کسی جنگ میں فریق بن کر دونوں طرف کی فوجوں کو لڑواتے اور تماشا دیکھتے ہیں۔ وُہ خواہ مخواہ جنگ نہیں کرتے۔ صرف اُس وقت میدان میں اُترتے ہیں جب جنگ، جنگ نہ رہے شہادت بن جائے ؎

شہ نے فرمایا مجھے خود ہے شہادت منظور　　نہ لڑائی کی ہوس ہے نہ شجاعت کا غرور
جنگ منظور نہ تھی اِن سے پر اب ہیں مجبور　　خیر لڑلو کہ ستاتے ہیں یہ بے جُرم و قصور
ذبح کرنے کے لیے لشکرِ ناری آئے
کہیں جلدی مجھے سر دینے کی باری آئے

انیسؔ نے اپنے کرداروں کو ظلم کے لشکرِ جرّار کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ یہ کردار دھوپ میں تپتے، بھوک اور پیاس میں زخم کھاتے اور بیٹوں کی لاش پر آنسو بہاتے ہیں۔ مگر میدان سے اِن کے قدم ہٹتے نہیں۔ اِن کی ذمہ داری بڑی ہے۔ اِن پر آدمی کی تشخیص اور تشخّص (IDENTITY) کو قائم رکھنے کی ذمہ داری ہے۔ یہ آدمی کو پہچنواتے ہیں شاید ہی اتنی بڑی ذمہ داری کسی اور شاعری میں کسی کردار پر عائد ہوتی ہو۔ یہ دیومالوی کرداروں کی طرح نقاب پوش (MASK) نہیں ہیں بلکہ خالص آدمی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں وہی طاقت پائی جاتی ہو جو ویاسؔ، ہومرؔ، فردوسیؔ، والمیکی اور تلسی داس کے یہاں ملتی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب ہم انیسؔ کے کرداروں کی بات کرتے ہیں تو اِس سے مراد یزیدی لشکر کے کردار نہیں ہیں۔ انیسؔ کے یہ کردار عظیم الجثّہ نہیں ہیں لیکن عزم کے قوی ہیں۔ اِن میں وہی قوّت ہے جو بڑے رزمیوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ کردار بھی زمین کو شق اور آسمان کو اُلٹ سکتے ہیں۔ انیسؔ امام حسینؑ کا سراپا بیان کرتے ہوئے پاؤں کے بارے میں کہتے ہیں ؎

وہ پاؤں معرکے سے کبھی جو نہیں ہٹے　　یہ کیا ہٹیں، ہٹے تو صفِ فوج کہیں ہٹے
دشوار ہے یہ امر کہ رُکنِ رکیں ہٹے　　سرکیں نہ، آسماں ہٹے یا زمیں ہٹے
مسکن سے منھ پہاڑ کبھی موڑتے نہیں
ثابت قدم ہیں جو وہ جگہ چھوڑتے نہیں

ایک اور جگہ رجز میں یہی توانائی گرجتی ہے ؎

دُنیا ہو اِک طرف تو لڑائی کو سر کروں　　آئے غضب خدا کا اُدھر، رُخ جدھر کروں
بے جبرئیل کارِ قضا و قدر کروں　　انگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں
طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآبؐ کی
رکھ دُوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

رزمیوں میں مظلوم کرداروں کی گنجائش ذرا کم ہوتی ہے۔ مگر انیسؔ کے یہاں رزمیے کا تصوّر مختلف ہے

اُن کے کردار قوی بھی ہیں اور مظلوم بھی۔ مظلومیت اُنھیں کم زور اور ناتواں نہیں بناتی بلکہ قوی تر بنا دیتی ہے۔ وُہ بہیمانہ قوت (BRUTE FORCE) کے قائل نہیں ہیں اور نہ وُہ پہاڑ ایسے ہیں۔ اس قسم کے کردار انیسؔ نے فوجِ یزید کے لیے مخصوص کر دیے ہیں جو بادل کی طرح گرجتے اور ہاتھی کی طرح جھومتے مقابلے پر آتے ہیں مگر جب بھوکے پیاسے، نحیف و زار آدمی سے ٹکراتے ہیں تو یہ پہاڑ ایسے کردار ریت کے ذرّوں کی طرح اُڑ جاتے ہیں۔ انیسؔ نے مظلوم کرداروں ہی میں بنیادی اور حقیقی قوت کو دریافت کیا ہے۔ اُن کے مرکزی کردار اپنی خداداد طاقت کو مخفی رکھتے ہیں۔ اصل میں یہ وہ کائنات گیر قوت ہے جو اب تک آدمی میں محفوظ اور مخفی ہے۔ یہ کردار اپنی اِس قوت کو میدانِ جنگ میں صرف کر کے ختم نہیں کر دیتے۔ یہ محفوظ رہتی ہے اور اُس وقت سامنے آتی ہے جب وہ قتل کر دیے جاتے ہیں قتل کے بعد یہ قوتِ مخفی پورے وقار اور اعتبار کے ساتھ اُبھرتی ہے۔

یہاں ایک اور بات کی توضیح مناسب معلوم ہوتی ہے۔ انیسؔ کے کردار اگرچہ غیر ارضی نہیں ہیں مگر ان کی یہ مخفی روحانی قوت انہیں عرش تک پہنچا دیتی ہے۔ اِن کرداروں میں "سماوات" اور "ارض" کا فطری اور ضروری نقطۂ اتصال پایا جاتا ہے۔ لیکن بہرحال وہ ارضی ہی رہتے ہیں۔ اِن کرداروں سے مائتھولوجی ضروری وابستہ ہے۔ مگر یہ مائتھولوجی دشمن کو پسپا کرنے میں کام نہیں آتی۔ اِن کے ساتھ کوئی لشکرِ جرار بھی نہیں ہے نہ یہ کسی "ٹرائے" پر حملہ آور ہیں۔ یہ میدانِ جنگ کو تنہا جاتے ہیں اور مر کر ہزار بن جاتے ہیں۔ اِن کی جنگ کسی عورت پر بھی نہیں ہے، پانی پر بھی نہیں ہے، دانے پر بھی نہیں ہے۔ پھر کس چیز پر ہے؟ انیسؔ کے تمام مرثیے اسی سوال کا جواب ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ بچّوں سے کیا خطا ہوئی ہوگی؟ عورتوں نے کیا قصور کیا ہوگا؟ بوڑھے بچارے کیوں قتل کئے جا رہے ہیں؟ ہم سوچتے جاتے ہیں اور جواب نہیں ملتا بجز اِس کے کہ تاریخ کو انسان بنانے کے عمل کو اور تیز ہو جانا چاہیے۔

انیسؔ کے مرثیوں بلکہ اُن کے بعد آنے والے تمام مرثیہ نگاروں کے کلام کی ایک اور خصوصیت مدِ نظر رکھنی چاہیے کہ دوسری رزمیہ نظموں اور اِن مرثیوں میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ اِن میں حُسن و عشق کا کوئی چرچا نہیں۔ شاید ہی دنیا کی کوئی بڑی نظم ایسی ہو جو "سایۂ زلفِ بُتاں" سے "بھاگی" ہو۔ مگر انیسؔ اور دوسرے مرثیہ نگاروں کے کلام کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ حُسن و عشق کے جنسی رجحانات کا شائبہ تک اُس میں نہیں پایا جاتا اور اِس کے باوجود یہ اعلیٰ ترین شاعری سے معانقہ کرتا ہے۔

بہرحال رزمیہ نظموں اور انیسؔ کے کلام کے رزمیہ حصّوں کے اِن امتیازات اور اختلافات کے باوجود ایک چیز جو ان میں مشترک ہے۔ وہ ہے اساسی قوت جو عناصر کے ہیجان اور برہمی سے یک بہ یک زمین و آسمان کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ انیسؔ کے کلام میں عناصر کا رزمیہ جس طرح اور جس بڑے پیمانے پر گرجتا اور کڑکتا ہے۔ اس کی مثال دنیا کی رزمیہ شاعری میں خال خال ملتی ہے (ایک طویل مدت بعد جوشؔ کی شاعری میں ان عناصر

کی رزم آرائی ملتی ہے، وہ بھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی) انیس کے مرثیوں میں یہ اساسی قوت قیامت بن کر نمودار ہوتی ہے۔ فضا تیرہ و تار ہو جاتی ہے۔ خوف، دہشت، سراسیمگی پھیل جاتی ہے۔ درندے، پرندے بدحواسی کے عالم میں بھاگے جاتے ہیں۔ سمندر اُبل پڑتے ہیں اور زمین کانپنے لگتی ہے ؎

حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا   لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا

نکلی جو رن میں تیغ حسینی غلاف سے   اُڑنے لگے شرر دمِ خارا شگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشتِ مصاف سے   صاف آئی الاماں کی صدا کوہِ قاف سے
طبقے فلک کے صورتِ گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

شہ کا غضب نمونۂ قہرِ الٰہ تھا   تلوار کیا علم تھی کہ عالم تباہ تھا

راحت میں جن و انس و ملک کے خلل پڑے   قلزم میں ڈر کے مردمِ آبی اُچھل پڑے
کھا کھا کے جوش خاک سے چشمے ابل پڑے   بیرالعلم سے غول جنوں کے نکل پڑے

اٹھا جو الحفیظ کا روحانیوں میں شور   مُردے دہل کے چونک پڑے سب میانِ گور
چلائے گرگ و شیر و غزالان و مار و مور   ہے بازوئے حسینؑ میں دستِ خدا کا زور
اے اُس مثلِ شیرِ خدا آستین کو
اے کردگارِ عرش بچالے زمین کو

جنگل میں تھی علم جو وہ شمشیرِ خونچکاں   تھرا کے آسمان میں چھپتا تھا آسماں
تیغِ علیؑ علم تھی جو دشتِ قتال میں   چیتوں نے منہ چھپائے تھے گینڈوں کی ڈھال میں

آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے   گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

نیزہ زمیں پہ آپ نے گاڑا جو یک بیک   ماہی سے دب کے گاؤ زمیں نے کہا مرک

شاید قیامت آئی زمیں پر گرا فلک   بس یا حفیظ کہہ کے لرزنے لگی سمک
غل تھا اُلٹ چکے میں حسینؑ آستین کو
یا بُوتراب آکے بچا لو زمین کو

لفظوں میں اتنی طاقت، اتنی ہیبت، اتنا جلال، اتنا شکوہ، اتنی آتش فشانی اور قہرمانی اور لفظوں پر اتنی حکمرانی انیسؔ کے زورِ بیان اور قدرتِ کلام کی دلیل اتنی نہیں جتنی اس بنیادی بات کا ثبوت ہے کہ انیسؔ نے شاعری کو وہاں پہنچا دیا ہے جہاں فلسفے، نفسیات اور جذبات کا علم اور ان کا شعری اظہار سب کا سب بے بس اور معذور ہو جاتا ہے۔ اِس فضا میں اُن کا گزر مشکل ہے۔ عنصری طاقتوں کا جلال جس انداز میں انیسؔ کے کلام میں رجز خواں ہے وہ ان کے کلام کو منفرد بنا دیتا ہے۔ نظامِ شمسی میں اگر اختلال پیدا ہو جائے تو نفسیاتی اور فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ شعر گوئی، کردار نویسی اور نفاست و نزاکت کے ساتھ غزل سرائی کی ساری صلاحیتیں چشم زدن میں ختم ہو سکتی ہیں۔ انیسؔ کو پڑھتے وقت دوسرے بڑے شاعروں کی قوتِ شعر گوئی کم زور معلوم ہونے لگتی ہے اور ہم انیسؔ کی شاعری کی قوتِ خالص کے حیران کُن اثرات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

یہ نہیں ہے کہ شاعری کے نازک مقامات اور کرداروں کی نفسیاتی کیفیات سے انیسؔ آگاہ نہیں تھے۔ وہ مکمل آگاہی کے شاعر ہیں۔ فنِ شعر کے رموز و نکات پر اُن کی گہری نظر تھی۔ اُن کا کلام شاعرانہ شعور کا معجزہ ہے ؎

قلمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ   شمعِ تصویر پہ گرنے لگیں آآ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ   خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

روز مرہ شرفا کو ہو سلاست ہو وہی   لب و لہجہ ہو وہی سارا، متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی   یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

ہے کجی عیب مگر حُسن ہے ابرو کے لیے   سُرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے   زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گل رو کے لیے
داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

شاعری کے اتنے مدارج اور مراحل سے واقف ہو کر ہی بڑی شاعری کی جا سکتی ہے۔ اُوپر جو کچھ

انیسؔ نے کہا ہے اگر ہمارے ناقدین اُسے پیش نظر رکھیں تو اُن کی شعر فہمی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ انیسؔ نے لانجائنس پڑھا تھا نہ کولرج نہ میتھو آرنلڈ۔ مگر انیسؔ کے جو دو تین بند دیے گئے ہیں ان میں "متانت"، "مضمون بھی عالی ہوتے" اور "موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی" کے الفاظ رکھ کر انھوں نے ان تمام مباحث کو سمیٹ لیا ہے جن سے "ترفع" (SUBLIME) "اعلیٰ سنجیدگی" (HIGH SERIOUSNESS) او (BEST WORDS IN BEST ORDER) "مناسب لفظوں کی مناسب ترین نشست" کے مفاہیم سے بحث کرتے ہوئے لانجائنس، آرنلڈ اور کولرج نے شعر و ادب کے نکات پر روشنی ڈالی ہے۔

اسی سخن فہمی اور سخن سنجی نے انیسؔ کے کلام میں رزمیہ اور المیہ کا نہایت خوشگوار اور متناسب امتزا اور عمل پیدا کر دیا ہے۔ وہ تمام عناصر جو دنیا کی بڑی رزمیہ نظموں اور المیہ ڈراموں میں ملتے ہیں انیسؔ کے ایک ہی مرثیے میں موجود ہیں۔

یونانی ڈراموں کی طرح انیسؔ کے یہاں بھی ارواحِ جلیلہ کربلا کی جنگ کو دیکھتی ہیں۔ مگر جیسا کہ پہلے بیا کیا جا چکا ہے کہ فرق یہ ہے کہ یہ جنگ میں شرکت نہیں کرتیں اور نہ حریفوں کو لڑوانے اور خود فریق بن جانے در پے ہیں۔ انیسؔ کے یہاں ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ اُن کے مرثیوں میں صداقت غیر منقسم ہے۔ البتہ اس غیر منق جاں گداز صداقت کی عملی صورت اختیار کرنے کا نظارا عرش و فرش دونوں کرتے ہیں۔ آسمان کے در کھل جاتے ہیں انبیائے کرام اور ملائکہ کربلا کی جنگ دیکھتے ہیں۔ سرزمینِ کربلا پر اجنۃ کا ہجوم ہو جاتا ہے جو حسینؓ کی کمک کو آتے ہیں مگر ان کی التجا اور استعانت قبول نہیں کی جاتی۔ حسینؓ آدمیوں سے آدمی کی طرح جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ شہدا جب ز کھا کر زمینِ گرم پر گر جاتے ہیں تو ارواحِ مقدسہ اُن کے سرہانے پہنچ جاتی ہیں۔ حسینؓ کے نانا، ماں باپ ا بھائی جنت سے آکر شہیدوں کا پُرسا اور جنت کی بشارت دیتے ہیں۔ اس طرح موت زندگی کی تصدیق اور تقد بن جاتی ہے۔ حُرؔ زخم کھا کر گر چکا ہے، حسینؓ اُس کے پاس ہیں ؎

نیم وا چشم سے حُرؔ نے رُخِ مولا دیکھا   زیرِ سر زانوئے شبیرؑ کا تکیا دیکھا
مسکرا کر طرفِ عالمِ بالا دیکھا   شہ نے فرمایا کہ اے حُرؔ جری کیا دیکھا
عرض کی حُسنِ رُخِ حور نظر آتا ہے
فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے

باغِ فردوس دکھاتا ہے مجھے اپنی بہار   صاف نہریں ہیں رواں جھوم رہے ہیں اشجار
شاخوں سے میری طرف بڑھتے ہیں میوے ہر بار   حُوریں لاتی ہیں جواہر کے طبق بہر نثار
ہے یہ رضواں کی صدا دھیان کدھر ہے تیرا
دیکھ لے شاہ کے مہماں یہ گھر ہے تیرا

مجھ کو لینے چلے آتے ہیں فرشتے یا شاہ   ملک الموت بھی کرتا ہے محبّت کی نگاہ
خُلد سے شیرِ خدا نکلے ہیں اللہ اللہ   لو برآمد ہوئے شبّر بھی پدر کے ہمراہ
ننگے سر احمدِ مختار کی پیاری آئی
دیکھئے آپ کے نانا کی سواری آئی

موت کی اتنی بڑی اور شاداب و فرحناک تصویریں (IMAGES) ہمارے یہاں ناپید ہیں۔ یہ امیجز انیسؔ کے یہاں بار بار ملتی ہیں اور زندگی کے تمام تصادم اور نزاع (COMFLICT) کو منوّر اور حسن آفریں بنا کر حل کر دیتی (RESOLVE) ہیں جو ہر بڑی شاعری کا کام ہے۔

حسن اور موت کو دوسرے شعرا نے بھی ایک بنا کر پیش کیا۔ آتشؔ کے یہاں موت "حُور" بن کر آتی ہے۔ جگرؔ کے یہاں موت کی آمد بڑی دلآویز ہے ؎

خوشا حیاتِ عاشقاں کہ موت بھی جب آئی ہے
تو ساتھ ایک حلقۂ پری وشاں لیے ہوئے

فانیؔ نے کہا ہے؛ ع

مری قضا کو وہ لائے دلھن بنائے ہوئے

انیسؔ کے یہاں بھی اسی طرح موت سے شادی رچائی جاتی ہے ع

دُولھا برات لے کے چلا ہے بہشت کو

اِس گھریلو امیج کو دیکھئے جس کے سامنے اردو شاعری کی عنایت کردہ عاشقانہ امیجز پیش پا افتادہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

انیسؔ کے مرثیوں میں المیہ، موت کے سبب نہیں پیدا ہوتا۔ مرجانے کا نام المیہ نہیں ہے۔ اُن کے یہاں سارا المیہ آدمی اور اُس کے مرتبے کو نہ پہچاننے سے مرتب ہوتا ہے ع

سیّد کے مرتبے کو نہ جانا ہزار حیف

یہاں ایک اندھی قوت سے سابقہ ہے جو پھُولوں اور کلیوں کو روندتی اور ہرے بھرے درخت کو کاٹتی چلی جاتی ہے۔

ہاتف غیبی (ORACLES) کی آواز بھی انیسؔ کے مرثیوں میں بار بار آتی ہے؛ ع

ہاتف نے دی ندا کہ سمجھ کر اُٹھا قدم

یہ ندائیں، یہ صدائیں ان کے مرثیوں کو کائناتی (COSMIC) بنا دیتی ہیں۔ اُن کے مرثیوں کے بعض چہروں پر کبھی کبھی کورس (CHORUS) کا گمان گزرتا ہے جو آنے والے واقعات کی نشان دہی کرتے ہیں۔

انیسؔ کے مرثیوں کے اِن عناصر کی طرف توجہ دلانے کا مقصد دُنیا کی دوسری رزمیہ اور المیہ تخلیقات سے

اُن کا موازنہ اور مقابلہ منظور نہیں ہے بلکہ دکھانا یہ ہے کہ انیسؔ کے مرثیوں کی فضا اردو شاعری کی فضا سے کتنی مختلف ہے اور اُن کو پڑھنے کے لیے بہت سی رَٹی رٹائی باتوں کو بھول جانے ہی میں عافیت ہے۔

یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ رزمیہ عناصر انیسؔ کے معاصر اور بعد میں آنے والے مرثیہ نگار شعرا کے یہاں بھی کم و بیش ملتے ہیں البتہ اُن میں اتنی ڈرامائی حرکت اور مرکوز قوت نہیں پائی جاتی۔ افسوس کہ مرثیے کی صنف کی طرف ہمارے ناقدین نے بہت کم توجہ دی ہے ورنہ انھیں معلوم ہو جاتا کہ اِس صنف نے ہماری شاعری کو جتنی جہتیں اور ڈرامائی امکانات دیئے ہیں وہ اور کسی صنف میں بمشکل ہی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ خاندانِ انیسؔ ہی میں چند مرثیہ نگار ایسے گزرے ہیں کہ ہماری شاعری اُن کا جواب پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ اُن کے ایک مرثیے میں جتنی چستی، درستی، زندگی کی جہتیں، شعری تسلسل اور تکمیل ہے۔ وہ اِس دور کے شعرا کے یہاں مفقود نظر آتی ہے۔ ایک مرثیے میں ہمارے شعرا کے دو تین مجموعے سما سکتے ہیں۔ اِس سے نئے شعرا کی تنقیص یا تحقیر مقصود نہیں۔ بات صرف اتنی کہنی ہے کہ اِن شعرا میں اتنی توانائی اور بوتا (STAMINA) نہیں ہے۔ مرثیہ گو شعرا نے شاعری کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا ہے۔

اقبالؔ نے اپنے ایک خط میں ادبیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ”خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ اُن کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔“

اقبالؔ کا یہ جملہ اگرچہ ایک دوسرے سیاق و سباق سے تعلق رکھتا ہے جس میں اِس امر پر گفتگو کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے عہدِ زوال میں شاعری بھی زوال آمادہ تھی۔ مگر اقبال کے اس جملے میں مرثیہ نگاری کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف پھر بھی موجود ہے۔ رہ گیا یہ کہنا کہ عہدِ زوال میں ادبیات بھی لازماً زوال پذیر ہوں گی اگر یکسر غلط نہیں تو متنازعہ ضرور ہے۔ خود اقبالؔ کی شاعری عہدِ غلامی کی شاعری ہے۔ آج اردو شاعری سے بحث کرنے والے اِس ”جبریت“ کے قائل نہیں ہیں ورنہ میرؔ سے لے کر غالبؔ تک سب کی شاعری اکارت ہو جائے گی۔ اِس کے علاوہ اگر اقبالؔ ہی کے نقطۂ نظر کو مدِنظر رکھا جائے تو واضح طور پر یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ مرثیوں نے مسلمانوں کے زوال پذیر معاشرے کا تہذیبی، روحانی اور اخلاقی تزکیہ کر دیا ہے۔

بہرحال گفتگو یہ تھی کہ انیسؔ کے مرثیوں کا رنگ مختلف ہے۔ اور اُن کے شعری مقامات تک پہنچنے کے لیے ایک مختلف شعری تربیت کی ضرورت ہے۔ غزل، قصیدہ اور مثنوی کی تربیت ایک حد تک اُن تک پہنچنے میں مدد پہنچا سکتی ہے۔ مگر آگے چل کر ”فروغِ تجلّی“ سے اِس تربیت کے پروں کے جل اُٹھنے کا اندیشہ بھی ہے۔

انیسؔ کے مرثیوں میں جو ڈرامہ ہے اُس میں بالعموم بارہ گھنٹے کا عمل پایا جاتا ہے۔ یہ صبح سے شروع ہوتا ہے اور شام ہوتے ہوتے ختم ہو جاتا ہے ـــــ صبح، دوپہر، شام ـــــ یہ تین ساعتیں انیسؔ کی منفرد رنگ آمیزی کی معنویت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اِس میں روشنی، جھٹپٹا، اندھیرا ـــــ اُمنگ، حوصلہ، دکھ اور درد سب کچھ ہے۔

یہ "کلر اسکیم" اردو شاعری میں انیسؔ سے پہلے اور انیسؔ کے بعد شاید ہی کہیں اور ملے۔

دیکھیے یہ صبح ہے ؎

تھا بسکہ روزِ قتلِ شہِ آسماں جناب
نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب

؏ پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح

؏ وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور

؏ ناگاہ چرخ پر خطِ ابیض ہُوا عیاں

صبح ہوئی ؏

تلوار پر ٹیک ٹیک کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے

اور ؏

سجادے بچھ گئے عقبِ شاہِ انس و جاں

نماز ختم ہُوئی اور اب دھوپ چڑھنے لگی اور فوجِ مخالف آمادۂ جنگ ہے ؏

نقارۂ وغا پہ لگی چوبِ ناگہاں

جنگ شروع ہُوئی۔

اور اب دُھوپ کی تمازت ؎

وہ لُو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب

؏ لو چلتی ہے، خاک اُڑتی ہے، ہے ظہر کا ہنگام

پھر دھوپ ڈھلنے لگی۔ کربلا گرد و غبار سے اَٹی ہوئی ہے۔ حسینؑ کی دردناک صدا آتی ہے ؏

عباسؑ دُھوپ چہرے پہ آئی ہے اب اُٹھو

اِس کے بعد شام ہو جاتی ہے۔ پُورا منظر سسکیاں بھرنے لگتا ہے۔ ماں اپنے بچوں کو پکار رہی ہے ؎

دن ڈھل گیا قریب ہے شام اے مسافرو   کس بن میں ہوگا شب کو قیام اے مسافرو

کچھ تو کرو زباں سے کلام اے مسافرو   بھیجو گے کب پیام و سلام اے مسافرو
پیٹوں گی پہلوؤں میں جو تم کو نہ پاؤں گی
میں شب کو ڈھونڈتی ہوئی جنگل میں آؤں گی

ہر لفظ میں تاریکی داخل ہو رہی ہے۔ دن ڈھل گیا، شام، بَن، شب، کچھ تو کرو کلام کی خاموشی۔ ہر لفظ رات کی طرف بڑھ رہا ہے ؎

کہتا تھا باپ شب کو نہ بچے نکلنے پائیں   بھولے ہیں راستہ نہیں گھر کا بھول جائیں
دربار میں بھی ہوں تو سویرے سے گھر کو آئیں   ہے ہے یہ دشت ظلم جو کرتا ہے سائیں سائیں
پہنچوں گی کس طرح میں جو ڈر ڈر کے رؤ گے
واری اندھیری رات میں کس طرح سوؤ گے

خون کے رنگ پر سیاہی غالب آگئی ؎

ہے ہے یہ دشت ظلم جو کرتا ہے سائیں سائیں

پوری فضا سوگوار ہے اندھیرے نے مظالم کی شہادتوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔

اِن تین رنگوں میں انیسؔ نے انسانی تقدیر کا پورا المیہ کھیر دیا ہے۔

انیسؔ کا یہ ڈرامہ جو بارہ گھنٹے میں بظاہر ختم ہو جاتا ہے ہمارے ذہن کو اِس کے بعد بھی پکارتا رہتا ہے۔ اور یہ بارہ گھنٹے ازل اور ابد کے درمیان طناب کی طرح کھنچ جاتے ہیں۔ انیسؔ کے کردار اپنی ذمہ داریوں کو بڑے اعتماد اور اثباتی انداز میں تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ یہ کردار حالات اور واقعات کے منطقی نتائج سے بھی اُبھرتے ہیں اور بعد میں ان حالات اور واقعات پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ انیسؔ کردار نگاری کو کئی پہلو سے اُجاگر کرتے ہیں۔ کبھی وہ براہِ راست اپنے کرداروں کے اوصاف بیان کرتے ہیں کبھی رجز کے مواقع پر خود ان کرداروں کی زبان سے ان کے طبعی میلانات، خصائص اور طرزِ زیست کا اظہار کرواتے ہیں۔ اِن مواقع پر انیسؔ کے اندازِ بیان کی صداقت ہمیں یقین دلا دیتی ہے کہ جو کچھ اِن کرداروں کے بارے میں کہا گیا ہے یا جو کچھ خود اُنھوں نے اپنے بارے میں کہا ہے وہ سچ ہے اِس کی گواہی وہ دشمن سے بھی دِلوا سکتے ہیں۔

امام حسینؑ فوجِ یزید کے سامنے تقریر کر رہے ہیں ؎

میں ہوں سردارِ شبابِ چمنِ خلدِ بریں   میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمدؐ کا مکیں
میں ہوں انگشترِ پیغمبرِؐ خاتم کا نگیں   مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منور ہے زمیں
ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
محفلِ عالمِ امکاں میں اندھیرا ہو جائے

اِس کے بعد براہِ راست ایک واقعے کی طرف اشارا کرتے ہیں : ؎

گرچہ یہ امر نہیں اہلِ سخا کے شایاں   کہ کسی شخص کو کچھ دے کے کرے سب پہ عیاں
پُوچھ لو حُر تو ہے موجود، عیاں راچہ بیاں   اُسی جنگل میں مع فوج تھا وہ تشنہ دہاں
شور تھا آج چلیں جسم سے جانیں سب کی
منھ سے باہر نکل آئی تھیں زبانیں سب کی
زیست ہر شے کی ہے پانی سے شجر ہو کہ حجر   مجھ سے دیکھا نہ گیا میں تو سخی کا ہُوں پسر
میں نے عباسؑ دلاور سے کہا گھبرا کر   مشکوں والے ہیں کہاں، اونٹ ہیں پانی کے کدھر
کرمِ ساقیِ کوثر کو دکھا دو بھائی
جتنا پانی ہے وہ پیاسوں کو پلا دو بھائی
ایک دن وُہ تھا اور اک دن یہ ہے اللہ اللہ   کہ اُسی طرح ہمیں پیاس میں پانی کی ہے چاہ
چشمِ اُمید ہو کیا سب نے پھرائی ہے نگاہ   کوئی اک جام بھی بھر کر ہمیں دیتا نہیں، آہ
ہر مسلماں پہ نبی زادے کا حق ہوتا ہے
بچے روتے ہیں تو سینہ مرا شق ہوتا ہے

انیسؔ اِس بند تک پہنچتے پہنچتے بڑی فنی چابک دستی کے ساتھ اِس تقریر کی صداقت میں سُننے اور پڑھنے والوں کو شریک کر لیتے ہیں۔ اور اب پڑھنے والے کی دلچسپی تقریر کے ردِ عمل کو جاننے پر مرکوز ہو جاتی ہے ؎

شہ کی مظلومی پہ گریاں ہوئی ظالم کی سپاہ   عمرِ سعد نے کی مُڑ کے رُخِ حُر پہ نگاہ
بولا وُہ اشہدُ باللہ بجا کہتے ہیں شاہ   مُحسن و منعم داتا ہے مرا یہ ذی جاہ
اُن کے احسان کا کیوں کر کوئی منکر ہو جائے
سخی حق میں جو شک لائے وہ کافر ہو جائے

اِس بند میں دیکھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ حُر نے کلامِ حسینؑ کی تصدیق کی بلکہ انیسؔ نے پُورے بند میں ایک کلیدی مصرع رکھ دیا ہے جو اِس تقریر کی صداقت بن گیا ع

عمرِ سعد نے کی مُڑ کے رُخِ حُر پہ نگاہ

اِس مصرعے میں جو خفیف سی ڈرامائی حرکت ہے اور نگاہ کے مُڑنے نے جو کام کیا ہے وہ فنی بلاغت کا انمول جوہر ہے۔

انیسؔ نے اپنے کرداروں کو کئی جگہ اسی طرح بالواسطہ طور پر پہچنوایا ہے۔ مرثیے میں گھوڑے اور تلوار کی تعریف بعض نازک طبع حضرات کو ناگوار گزری ہے اور اُن کا فرمانا ہے کہ اِس قسم کی تعریف قدرتِ کلام کے بے جا اظہار اور شاعرانہ مبالغے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اِس سلسلے میں کیا عرض کیا جا سکتا ہے بجز اِس کے کہ انیسؔ کو قدرتِ کلام کے

اظہار کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ وُہ تمام تر قدرتِ کلام ہیں۔ گھوڑا اور تلوار، رزمیہ کے جُزوِ لازم ہیں۔ انھیں انیسؔ نکال کر کہاں پھینک دیتے۔ اِس کے علاوہ گھوڑا اور تلوار انیسؔ کے کرداروں کو بالواسطہ طور پر اُبھارنے اور ان سے متعارف کرانے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ رُستم سے اگر رخش لے لیجئے تو وہ قریب قریب آدھا رہ جاتا ہے انیسؔ کے مرثیوں میں بھی گھوڑا جہاں جنگ آزما اور غازی مرد ہے وہاں وُہ اپنے سوار کی عظمت اور جلالت کی نشانی بھی بن جاتا ہے ؎

نزدیک تھا کہ پھاند کے ندی کے پار ہو
روکے وہی حسینؓ سا جو شہسوار ہو

ع سینے میں دل قوی تھا کہ ہیں پُشت پر حسینؓ

؎ دعویٰ کہ میں بُراق کی توقیر پائے ہُوں
نازِ اِس پہ تھا کہ بارِ امامت اٹھائے ہُوں

اور یہ تلوار ہے: ع

معراج دستِ شاہ میں پائی ہزار بار

ع جیسی وہ ذوالفقار تھی ویسا ہی ہاتھ تھا

یہ گھوڑے اور تلوار کی تعریف اتنی نہیں ہے جتنی حسینؓ کی شجاعت کا ڈرامائی اظہار ہے۔

انیسؔ کے کلام میں کردار نگاری کا پورا ہُنر اُس وقت سامنے آتا ہے جب وُہ دو یا دو سے زیادہ اشخا مکالمہ نظم کر رہے ہوں۔ ان مکالموں میں ڈرامہ بھی ہے، نفسیات بھی ہے۔ سن و سال اور مراتب کا فرق ملتا ہے۔ وقوع پذیر ہونے والی صورتِ حال کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ رشتوں کی پاکیزگی بھی ہمیں خود اپ طینت سے آگاہ کرتی ہے۔ یہ مکالمے گھر بھی ہیں، دشت و در بھی ہیں۔ تلوار بھی ہیں، زخم بھی ہیں ——— زندگی ہیں۔

انیسؔ کے کلام میں فلسفہ تلاش کرنے والوں کو قدرے مایُوسی ہوگی۔ وہ فلسفہ نہیں کہہ رہے تھے نہ پیغام دے رہے تھے۔ وہ حسینؓ کی حقانیت کو ثابت کرنے کی سعی میں بھی مبتلا نہیں تھے۔ کربلا اُن کے سا ہو رہی تھی اور وہ اُس میں اُسی طرح موجود تھے جس طرح اصحابِ حسینؓ۔ کربلا اُن کے لیے محتاجِ دلائل نہیں بلکہ حقیقتِ ثابتہ تھی ——— آفتاب آمد دلیلِ آفتاب ——— یہی وجہ ہے کہ زندگی کی فلسفیانہ تاویلات سے اُ

کلام گرانبار نہیں ہے۔ زندگی کا ہر بنیادی کردار اُن کے سامنے چل پھر رہا تھا۔ گفتگو کر رہا تھا اور اپنے فرائض سے عُہدہ برآ ہو رہا تھا۔ انیسؔ کے مکالموں سے زندگی کا یہی مشاہدہ اور مطالعہ نمودار ہے۔ اُن کے مکالمے کچھ اِس انداز میں ادا ہُوئے ہیں جس میں خود زندگی بولتی ہے۔ یہ مکالمے کبھی آگے بڑھتے ہیں، کبھی مُڑتے ہیں، کبھی رُکتے ہیں، کبھی دیکھتے ہیں، کبھی سوچتے ہیں اور کبھی جنبشِ لب میں بدل جاتے ہیں۔ پھر سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ قافیے اور ردیف میں مقید ہونے کے باوجود انیسؔ کے زندگی شناس قلم نے اِن کو قافیہ و ردیف کی قید سے اِس طرح آزاد کر دیا ہے کہ بڑے سے بڑا آزاد نظم لکھنے والا بھی ایسی آزادی اور لب و لہجے کے اتنے فطری اتار چڑھاؤ کے ساتھ شعر نہیں کہہ سکتا۔ انیسؔ کو پڑھتے وقت یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ قافیے لائے جا رہے ہیں۔

جس مرثیے کو بھی دیکھ لیجئے یہی رنگ ملے گا۔ ایک جگہ انیسؔ نے دکھایا ہے کہ امام حسینؑ نے حضرت عباسؑ کو علم سپرد کر دیا ہے۔ اِس بات پر جناب زینبؑ کے فرزند عونؑ و محمدؑ بچپن کی وجہ سے کچھ ملول ہیں۔ ماں اُن کی افسردہ خاطری کو سمجھ گئی ہے۔ اب مکالمے دیکھئے :ؔ

پھر کر اُدھر سے ماں نے جو بیٹوں پہ کی نظر   سمجھیں علم نہ ملنے سے بیدل ہیں یہ قمر
ہٹ کر کیا اشارا کہ آؤ ذرا اِدھر   آئے عقب سے شہ کا سعادت نشاں پسر
بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس ہیں
قربان جاؤں کیا ہے جو چہرے اداس ہیں

اِس کے بعد کچھ اور گفتگو ہوتی ہے پھر ماں کہتی ہے :ؔ

کچھ ملگجے ہیں آؤ میں کپڑے اتار دُوں
سُرمہ لگا دُوں، گیسوئے مشکیں سنوار دوں

یہ میدانِ جنگ میں بھیجنے کی تیاری ——— اور مکالمے ماں کے ہیں ———!!

اور پھر یہ بند :ؔ

شب سے تو صبح تک یہ دُعا تھی ہر ایک پل   تینوں میں پہلے ہم کو کرے سرخرو اجل
اب کیا ہُوا، یہ کون سا غصّے کا ہے محل   آنکھوں میں اشک رُخ پہ عرق، ابروؤں پہ بل
وہ خوش مزاجیاں نہ وہ باتوں کے طور ہیں
اِس وقت دیکھتی ہُوں کہ تیور ہی اور ہیں
اِس کا نہیں خیال کہ کیوں کر جئے گی ماں   ہوتا ہے آفتوں میں محبت کا امتحاں
تم میری دس برس کی ریاضت ہو میری جاں   مجھ سے سوا ہے کون تمھارا مزاج داں
جس پر یہ برہمی ہے وہ سب جانتی ہُوں میں
غصّے کی آنکھ کاہے کو پہچانتی ہُوں میں

دونوں صاحبزادے شکوے کے لہجے میں جواب دیتے ہیں : ؎

کیا ورثہ دارِ جعفرِ طیار ہم نہ تھے
اِس عہدۂ جلیل کے حقدار ہم نہ تھے

اور اب انیسؔ نے اِس مرحلے پہ جو مصرعہ ٹانک دیا ہے اُس کی دھیمی آواز ایک مکمل ڈرامہ کی گونج میں تبدیل ہو گئی ہے ع

انگشت رکھ کے دانتوں میں ماں نے کہا کہ ہا

پھر اِسی سلسلے میں بہت نازک نفسیات کو سموئے ہُوئے یہ مصرع آتا ہے : ع

دیکھو سُنیں نہ زوجۂ عباسؑ باوفا

ہمارے بعض ناقدین کو انیسؔ پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ انہوں نے صبر و ضبط کی جگہ مردوں، عورتوں کو روتے دھوتے دکھایا ہے۔ جو ان برگزیدہ شخصیتوں کے رتبے سے فروتر ہے۔ معلوم نہیں اِس اعتراض میں یہ حضرات کتنے سنجیدہ ہیں شاید یہ چشم و دل کے فرائض اور انسانی زندگی کی طہارتوں اور عظمتوں سے آگاہ نہیں ہیں۔ نظریوں کو سب کچھ سمجھ لینا اور آدمی کی فطرت کو نظر انداز کر دینا کوئی قابلِ تحسین بات نہیں ہے۔

انیسؔ کے کردار صبر و ضبط کا پیکر ہیں۔ مگر وہ دل کے کٹھور اور بے رُوح نہیں ہیں اُن میں بھرپور آدمیت پائی جاتی ہے۔ ان میں انانیت ہے۔ اُن کا عمل موقع و محل کی مناسبت سے غیر فطری نہیں ہوتا ہے۔ ماں باپ جوان بیٹے کو میدانِ جنگ میں پُورے صبر و ضبط کے ساتھ بھیج دیتے ہیں مگر جب اُس کی لاش آتی ہے تو آنکھیں چھلک پڑتی ہیں۔ یہ وہی کرتے ہیں جو دنیا کا ہر باپ اور ماں اس موقعے پر کرتی یا اُسے کرنا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ سب کچھ ہو سکتے ہیں مگر ماں باپ نہیں ہو سکتے۔ انیسؔ جن آدمیوں کو پیش کر رہے ہیں اُن کا مقابلہ شقی القلب فوجِ گراں سے ہے۔ لہٰذا اُن کے پیش کردہ کردار کسی صورت میں بھی شقی القلب نہیں ہو سکتے۔ اُن کے کردار زندہ کردار ہیں جو ہر حال میں اپنی انسانی خصوصیات برقرار رکھتے ہیں۔

عونؑ و محمدؑ کی لاش آتی ہے ؎

بیٹھی تھیں ایک گوشے میں زینبؑ جو ننگے سر   واں جا کے بولیں بانوئے ناشاد نوحہ گر
پُرسے کو لوگ جمع ہیں، چلیے ذرا اُدھر   فرمایا میں نہ جاؤں گی بچوں کی لاش پر
آنچ آتما کی دل کو جلائے تو کیا کروں
گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں

دیکھئے یہ ماں ہے۔ اِس ماں سے اب اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ انیسؔ کے کردار اپنے مکالموں کی وساطت سے عالمی کردار بن کر اُبھرتے ہیں۔ وہ کربلا سے نکل کر ہر گھر کی روشنی بن جاتے ہیں۔

ماں کا ایک اور رُخ دیکھئے۔ یہی ماں ہے، یہی بچے ہیں۔ گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے۔ بچے فوج میں دھنسے

چلے جا رہے ہیں۔ انیسؔ نے اِس منظر کو اپنے مرقع نگار قلم سے امر بنا دیا ہے۔ بڑی ملی جلی کیفیتیں لہروں کی طرح اُٹھتی بیٹھتی رہتی ہیں۔ ماں میدانِ جنگ سے دُور بھی ہے اور میدانِ جنگ میں موجود بھی ہے۔ دُکھ، محبت، شجاعت، امتنان سب کچھ اِس منظر میں ہے ؎

زینبؑ کھڑی تھیں پردے کے پیچھے جو بے قرار   فضہ خبر یہ دیتی تھی جا جا کے بار بار
کیا لڑ رہے ہیں جعفرؓ و حیدرؑ کے یادگار   حضرت سے مدح کرتے ہیں عباسؑ نامدار
جس وقت ذکرِ معرکہ آرائی ہوتے ہیں
رومال رکھ کے آنکھوں پہ حضرت بھی روتے ہیں

رو کر کہا کہ روتے ہیں کس واسطے امام   ہیں اِک کنیز اُن کی وہ دونوں پسر غلام
مجھ کو دکھا تو دے کہ کدھر ہیں وہ لالہ فام   اُس نے کہا کہ چھائی ہے جنگل میں فوجِ شام
لاکھوں سے معرکہ ہے مگر با حواس ہیں
بی بی وہ ابن سعد کے خیمے کے پاس ہیں

اب اِس کے بعد کا بند سُنیے۔ شاعری میں دُوری یا فاصلے (DISTANCE) کا احساس دلانا بے حد مشکل کام ہے۔ محض دُوری اور فاصلے کے الفاظ لانے سے دُوری کا احساس اور اندازہ ممکن نہیں۔ انیسؔ نے "چھائی ہے جنگل میں فوجِ شام" اور "بی بی وہ ابنِ سعد کے خیمے کے پاس ہیں" کہہ کر فاصلے کی طرف چند اشارے کیے ہیں مگر یہ اشارے ناکافی ہیں۔ اِن اشاروں کی تکمیل اور آنکھوں سے 'فاصلہ' دکھانے کے لیے اب وہ مزید اہتمام کرتے ہیں۔ "بی بی وہ ابنِ سعد کے خیمے کے پاس ہیں" کے مصرعے سے وہ آنکھوں کو دُور تک دیکھنے پر پہلے ہی مجبور کر چکے ہیں۔ اب آگے دیکھیے: ؎

تلوار چل رہی ہے کہ اللہ کی پناہ   ڈھالوں کی بدلیوں میں چھُپے ہیں وہ رشکِ ماہ
کثرت ہے اِس قدر کہ پہنچتی نہیں نگاہ   وہ بھاگتی ہے اور پلٹتی ہے سب سپاہ
آواز دار و گیر کی گردوں پہ جاتی ہے
دونوں کے نیمچوں کی چمک یاں تک آتی ہے

آخری مصرعے میں بڑی دُور سے بجلی کوندتی ہے جس نے ڈھالوں کی سیاہی میں ڈوبے ہوئے فاصلے کو حدِ نگاہ تک روشن کر دیا ہے۔ کوئی اور شاعر ہوتا تو اِس فاصلے کو دکھانے اور جتانے کے لیے نہ معلوم کتنے جتن اور کتنی "امیجز" وضع کرتا۔

لڑائی کا ذکر یہاں تک کرنے کے بعد انیسؔ کا قلم اچانک ایک خونچکاں تصویر دیتا ہے جو تصور کی آنکھ سے دیکھی جا سکتی ہے۔ دفعتاً فوجِ مخالف میں فتح کا غلغلہ بلند ہوتا ہے ؏

طبلِ ظفر پہ چوب پڑی یک بیک اُدھر

عونؑ و محمدؑ مارے گئے۔ اِس کے بعد کے مصرعے کی حرکت سُست پڑ جاتی ہے اور وُہ یُوں آہستہ آہستہ چلتا ہے جیسے زخموں کو سنبھال کر چل رہا ہو۔ پُورا شعر یُوں ہے : ؎

طبلِ ظفر پہ چوب پڑی یک بیک اُدھر
ڈیوڑھی سے آئیں خیمے میں زینبؑ جھکا کے سر

المیے کی تکمیل ہو گئی ع

ڈیوڑھی سے آئیں ـــــ خیمے میں زینبؑ ـــــ جھکا کے سر

مصرعے کا ہر لفظ خاموش، سوگوار اور سر جھکائے ہوئے ہے۔ سمندر متلاطم تھا اب پُرسکون ہو گیا۔ لفظ غم ناکی میں ڈوب گئے۔

مگر انیسؔ بند کو یہیں تک لا کر نہیں چھوڑ دیتے۔ وُہ یکایک آنے والے مصرعوں میں برقی رَو دوڑا دیتے ہیں۔ ماں اُدھر خیمے میں جاتی ہے۔ اِدھر بچوں کی شہادت کا حال سُن کر جوانانِ حسینی کا رنگ بدل جاتا ہے ــ اور مرثیے کے مصرعے رزمیہ رفتار سے میدانِ جنگ کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ لفظ اُٹھی ہوئی تلوار بن جاتے ہیں ؎

تلوار لے کے قاسمِؑ شیریں سخن بڑھے
عباسؑ کیا بڑھے شہِ خیبر شکن بڑھے

رزمیے اور المیے کا ایسا امتزاج انیسؔ کے کلام کے قاری اور ناقد کو اُن کے مرثیوں کی ایک نئی تعریف وضع کرنے پر مجبور کرتا ہے جس کے لیے ہمیں یونانی ڈراموں اور مغربی ادبیات میں المیے اور رزمیے کے اصول و آئین کی طرف پلٹنے کی حاجت کم پڑتی ہے۔

انیسؔ کے کلام میں جو ڈرامہ پایا جاتا ہے اُسے انیسؔ ہی کے معیار سے پرکھنے اور پہچاننے کی ضرورت ہے۔ اسی ضمن میں دو اور باتوں کی طرف اشارا کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اُن کے مرثیوں میں جا بجا تعلّی پائی جاتی ہے۔ قطع نظر اِس سے کہ وہ اِس قسم کی تعلّی میں حق بجانب ہیں۔ یہ تعلّیاں اُن کے مرثیوں میں جس انداز اور جس محل پر داخل کی جاتی ہیں وُہ بجائے خود ڈرامے کو اور گرمانے میں مدد دیتی ہیں۔ یہ ایک قسم کی انتظاریہ کیفیت اور وقفۂ راحت (RELIEF) کا کام انجام دیتی ہیں۔

عین اُس وقت جب دونوں طرف تلواریں کھنچ چکی ہیں اور وار ہُوا ہی چاہتے ہیں۔ انیسؔ بیچ میں بول اُٹھتے ہیں : ؎

اے شہسوارِ ملکِ سخن صفدری دکھا   گیتی کو زلزلہ ہو وہ زور آوری دکھا
جمعیتِ سپاہ کی پھر ابتری دکھا   ہاں زور شورِ معرکۂ حیدری دکھا

کٹ جائیں رنگ سینۂ اعدا فگار ہوں
پڑھنے میں دونوں لب جو کھلیں ذوالفقار ہوں

گر طبع میں کسی کی روانی ہوئی تو کیا
کیا کہہ سکے گا، تیز زبانی ہوئی تو کیا
بالفرض قوتِ ہمہ دانی ہوئی تو کیا
مثلِ انیس سحر بیانی ہوئی تو کیا
فقروں کے ذوالفقار کا مطلب ادا نہ ہو
کٹ جاتے ساری عمر پہ اس کی ثنا نہ ہو

یہ اشعار قاری یا سُننے والے کے اشتیاق کو اور تیز کرتے ہیں اور اُسے آئندہ پیش آنے والے واقعات کی طرف مزید متوجہ کرواتے ہیں۔

دُوسری بات جو انیس کے کلام میں ڈراماتی المناکی کو تیز و شدید کر دیتی ہے۔ وُہ ہے حالات کی المیہ ستم ظریفی (TRAGIC IRONY) کا عمل۔ وہ بڑی خوش اسلوبی سے مناسب ترین مواقع اور مقامات پہ اس نازک حربے کو کام میں لاتے ہیں۔

کربلا میں سب جانباز کام آ چکے ہیں اور حسینؑ تنہا زخموں سے چُور میدانِ جنگ میں کھڑے ہیں۔ اتفاق سے ایک مسافر اُدھر آ نکلتا ہے ؏

آ پہنچا اک مسافر غربت زدہ ادھر

وہ حسینؑ کے پاس پہنچتا ہے۔ اُنھیں اِس عالم میں صابر و شاکر پا کر اپنے حق میں دعا کا خواستگار ہوتا ہے کہ اُسے نجف اور مدینے کی زیارت نصیب ہو۔ امام پُوچھتے ہیں کہ مدینے میں کیا کام ہے، جواب ملتا ہے: ؏

اُس سرزمیں پہ ہے مرا آقا، مرا امام

اِس مصرعے ہی سے المیہ مصرعے سے نکل کر ہم تک پہنچ جاتا ہے۔ اور وُہ تمام امور جو مرثیے میں اس کے بعد وقوع میں آتے ہیں یا جن پر گفتگو ہوتی ہے، مختلف نوعیت اختیار کر لیتے ہیں۔ کربلا میں اُن کا عمل الگ ہے اور ہمارے دل پر جو کچھ گزرتی ہے اُس کا عمل الگ ہے۔ اِس میں التزام یہ رکھا گیا ہے تنہا ہم اس المیے میں شریک ہو سکیں۔ جو کچھ کربلا میں ہو رہا ہے اب وُہ ہمارے دل میں ہو رہا ہے۔ یہ ”غربت زدہ مسافر“ اس کے بعد جو کچھ کہتا ہے اُس سے ٹریجڈی اور گمبھیر ہو جاتی ہے ؎

دنیا ہو اور فاطمہؑ کا نورِ عین ہو
دیکھوں اُنھیں صحیح و سلامت تو چین ہو

پھر وُہ امام کے گھرانے کے ایک ایک فرد کی خیر خیریت پُوچھتا ہے اور سب کی درازیِ عمر کی دعائیں دیتا ہوا

علی اکبرؑ کے بارے میں کہتا ہے : ؎

اُس رشکِ گُل سے دُور خزاں کی بلا رہے
یارب چمن حسینؑ کا پھُولا پھلا رہے

زمین ایک بار تیزی سے اپنے محور پر گھوم کر رک جاتی ہے اور درد پھٹ پڑتا ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ مسافر نے یہ کیا کہہ دیا! المیہ ستم ظریفی کی ایسی مثالیں ہمارے ادب و شعر میں تلاش کرنا خاصا دشوار کام ہے۔

ہیئتی اعتبار سے انیسؔ کے اکثر و بیشتر مرثیے مسدس میں ہیں۔ اِس صنف کو اُنھوں نے اپنے لیے منتخب کر لیا تھا اور یہ کچھ اس طرح اُن سے مختص ہو گئی ہے کہ اب کوئی بھی مسدس کہے وہ انیسؔ کی چھاؤں سے نکل نہیں سکتا خواہ وہ حالیؔ ہوں، اقبالؔ ہوں یا جوشؔ ہوں۔ اقبالؔ کے "شکوہ" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں : ؎

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

اور اب انیسؔ کو سُنیے : ؎

زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے ابراروں میں
عابد ایسے تھے کہ سجدے کیے تلواروں میں

گو مصیبت میں، تلاطم میں، تباہی میں رہے
سر کٹے پاؤں مگر راہِ الٰہی میں رہے

مسدس کی صنف کی پہنائی، اُس کے مصرعوں کا تسلسل اور یکے بعد دیگرے قوی سے قوی تر ہوتے جانا اور بیت پر پہنچ کر تکمیل کی بھرپور گونج بن جانا۔ اِن امکانات اور رموز کو انیسؔ سے بہتر شاید ہی اور کوئی پا سکا ہو۔

انیسؔ اور مسدس کے تعلق سے طویل گفتگو کی جا سکتی ہے مگر اس مضمون میں انیس کے پورے کلام کے

احاطے کی گنجائش نہیں ہے۔ جو کچھ بھی کہا جا رہا ہے وہ بہت سرسری ہے۔ انیسؔ کے ہزاروں مرثیوں کا جائزہ لینے اور اُن سے بحث کے لیے ضخیم کتابیں درکار ہیں۔

اب آخر میں اُن کے ایک اور بنیادی عنصر پر اُچٹتی سی نظر ڈالنی ضروری ہے۔ جہاں انیسؔ کے جذبِ دروں، مشاہدے، بصیرت اور کائناتی ادراک کی بات چل نکلتی ہے وہاں اُس دائرے کا ذکر بھی لازمی ہو جاتا ہے جو اُن کی پُوری شاعری کا احاطہ کئے ہُوئے ہے —— یہ دائرہ اُن کی زبان کا ہے۔ اردو انیسؔ کی زبان نہیں ہے بلکہ انیسؔ کی زبان اردو بن گئی ہے۔ یہ میر تقی میرؔ، شیخ ابراہیم ذوقؔ اور نواب مرزا خاں داغؔ کی اردو نہیں ہے جس میں "اردو پن" کی نرمی، براقی اور چاشنی تلاش کی جائے۔ انیسؔ کی زبان کی پہچان اُس کی چاشنی یا فصاحت و بلاغت سے ہی نہیں کی جا سکتی۔ اس کو پہچاننے کے لیے ہمیں وہاں جانا پڑتا ہے جہاں پُورا کنبہ بستا ہے اور اپنی گھریلو زبان بولتا ہے۔ اردو شاعری میں خالص دیسی (VERNACULAR) کا پہلی بار استعمال انیسؔ کے یہاں ہُوا ہے۔ بر سرِ منبر انیسؔ نے بارہا کہا ہے — صاحبو! یہ مرے گھر کی زبان ہے۔ اردو کے جملہ شاعروں کے پاس فارسی یا اردو ہی میں زبان کے ایسے نمونے موجود تھے جس میں مثنوی، قصیدہ یا غزل کہی جا سکتی تھی۔ مگر انیسؔ نے زبان کے جس دائرے کو اپنایا ہے وُہ اُن کا اپنا کھینچا ہوا ہے۔ اِس میں پہلی بار وہ تمام چیزیں ملتی ہیں جن سے اردو شاعری ناواقف تھی۔ انیسؔ زبان کے جس نازک، بلاخیز اور ہلاکت آفریں پُلِ صراط کو تعمیر کرتے ہیں اور جس قدر سہل سے اس پر سے گزر جاتے ہیں اس کے تصور ہی سے اردو شاعری کی سانس اکھڑنے لگتی ہے۔ اُن کا کلام زبان آوری اور زبان دانی ہی نہیں ہے۔ یہ شعر و شاعری کی کاشت، آبیاری اور برومندی کا سب سے نتھرا، صاف شفاف سرچشمہ ہے۔ لفظوں کے جملہ امکانات اور محلِ استعمال سے گہری باخبری کا نام انیسؔ کی زبان ہے۔ اُن کی زبان زندگی پر بھرپور گرفت ہے۔ اُن سے پہلے اردو کم گو، کم سماعت، کم بصارت تھی۔ انیسؔ نے اسے بولنے کے آداب سکھائے۔ دیکھنے کے زاویے دئے اور زیرِ لب گفتگو کو سُننے کی قوت بخشی۔ اُن کا دعوٰی کچھ غلط نہیں ہے ؎

ایک قطرے کو جو دُوں بسط تو قُلزم کر دوں   بحرِ مواجِ فصاحت کا تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں، ذرّے کو انجم کر دوں   گُنگ کو ماہرِ اندازِ تکلّم کر دوں
دردِ سر ہوتا ہے، بے رنگ نہ فریاد کریں
بُلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

اگر کوئی پُوچھے کہ انیسؔ نے اردو کو کیا دیا تو ایک لفظ میں کہا جا سکتا ہے — نطق! وہ نطقِ عظیم جو صرف و محض انیسؔ کے پاس ہے: ؎

مری قدر کر اے زمینِ سخن   تجھے بات میں آسماں کر دیا

زبان کی مکانی حقیقت

ڈاکٹر سہیل بخاری

پوری انیسویں صدی عیسوی میں لسانیات کے مطالعے پر تاریخیت چھائی رہی ہے اور کسی زبان کے تشریحی مطالعے کو اس تاریخیت سے ہٹ کر قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اس تاریخی لسانیات کا نظریہ یہ تھا کہ عام زبانیں کسی ایک ہی قدیم زبان سے نکلی ہیں۔ اسی لیے ان میں کچھ مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ ان مشابہتوں کی بنیاد پر اُنھیں مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح ممکن ہے آگے چل کر ان خاندانوں کی مشترک مشابہتوں کی بنیاد پر تاریخی لسانیات کسی ایک قدیم ترین زبان تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے جو دنیا بھر کی تمام زبانوں کی مورث اعلیٰ قرار پائے لیکن لوگ ایسی کسی زبان کا سراغ نہیں لگا پائے اور بندگلی میں پھنس کر رہ گئے۔ اسی لیے لسانیات کی تحقیق میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی اور لوگوں میں ایک طرح کی بددلی اور بیزاری سی پیدا ہو گئی۔

فرڈی نینڈ دی ساسر پہلا ماہرِ لسانیات ہے جس نے اپنی کتاب کورس ان جنرل لنگوئسٹکس" میں زبان کے مطالعے کو مندرجہ ذیل دو قسموں میں بانٹ کر ان دونوں خیالات کو الگ الگ کیا۔

۱۔ ہم وقتی: کسی ایک مقام پر کسی ایک دور میں زبان کی حالت کا مطالعہ جسے تشریحی لسانیات کا نام دیا گیا ہے۔

۲۔ ہمہ وقتی: کسی ایک مقام پر زبان کی دور بدور حالتوں کا مطالعہ جسے تاریخی لسانیات کا نام دیا گیا ہے۔

ساسر کی یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس نے تشریحی لسانیات کو تاریخی لسانیات کی غلامی سے آزاد کر کے پہلی بار اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی لیکن ابھی اس کا جائز اور واحد منصب دلانے کے لیے کسی پس و پیش کے بغیر دو ٹوک الفاظ میں یہ اعلان کر دینا بھی ضروری اور باقی ہے کہ تاریخی لسانیات نہ صرف الٹی اس کی پابند اور محتاج بلکہ خود اپنی جگہ ایک بے کار مشغلہ اور گمراہ کن مفروضہ بھی ہے جس نے لسانیات کے مطالعے کو ایک غلط راستے پر ڈال کر اس کی تحقیق اور فروغ میں بے شمار رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔

ذرا سا غور کرنے پر یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مطالعہ زبان کے متعلق ماہرین کا نظریہ اب تک ٹیڑھا رہا ہے، تشریح اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب تک کسی ایک مقام پر رک کر زبان کی کسی ایک دور کی حالت کا مطالعہ نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت تک اس دور بدور حالتوں کا موازنہ کیسے ہو سکے گا، اور اس کی تاریخ کیسے مرتب کی جا سکے گی۔ کیونکہ خط مستقیم مختلف نقاط کے تسلسل کو کہتے ہیں اور تاریخ مختلف ادوار کے تسلسل کا دوسرا نام ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم وقتی مطالعہ جسے تشریحی لسانیات کہتے ہیں، ہمہ وقتی مطالعے یعنی تاریخی لسانیات کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس

تاریخی لسانیات تشریحی لسانیات کی مدد کی محتاج ہے۔

پھر اسے اس پہلو سے بھی دیکھیے کہ کائنات میں زمان کی تشریح مکان کے حوالے سے ہی کی جا سکتی ہے کیونکہ زمان مکان کی ہی ایک مجرّد شکل ہے۔ وقت کی اکائیاں بنیادی طور پر مکانی ہیں، زمان کی پیمائش کے طریقوں کی اساس بھی مکان ہے، فوقانی تصور تحتانی تصور کا محتاج ہے اور تاریخ جغرافیائی سرحدوں سے ہی اپنے طویل سفر کا آغاز کرتی ہے۔ زبان کی تاریخ جاننے کے لیے اور جاننے سے پہلے اس کی دور بدور حالتوں کا علم ناگزیر ہے۔ یعنی لسانی مطالعے میں بنیادی بلکہ واحد اہمیت مکانی لسانیات کو حاصل ہے اور مکانی لسانیات کو زمانی لسانیات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اب اس حقیقت کو ایک اور زاویے سے دیکھیے۔ تاریخ ہمیں زیادہ سے زیادہ چھ ہزار سال قبل مسیح تک لے جا سکتی ہے۔ اس سے پہلے کے کوئی آثار ہم تک نہیں پہنچے۔ تاریخی لسانیات والے یہ نہیں بتاتے کہ انھوں نے لسانی تحقیق کی غرض سے اس مدّت کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور کی مدّت کتنی رکھی ہے؟ کیا ایک ایک ہزار سال کا ایک ایک دور مقرّر کیا جا سکتا ہے؟ کیا اتنی تحریریں دستیاب ہیں کہ انھیں آٹھ ادوار (چھ ہزار قبل مسیح + دو ہزار بعد مسیح) میں تقسیم کر دیا جائے یا پانچ پانچ سو سال کا ایک ایک دور ٹھیرا کر اس پورے عرصے کو سولھا ادوار میں بانٹ دیا جائے۔ اور زبان کے سولھا سو نمونے تقابلی مطالعے کے لیے سامنے رکھ لیے جائیں؟ مجھے یقین ہے کہ ان کے پاس اتنے تحریری نمونے اس یکساں حدبندی کی شرط کے ساتھ موجود نہیں ہیں۔

دوسرا سوال یہ بھی ہے کہ کس تحریر کو اپنے دور کی نمائندگی کا حق حاصل ہے؟ تاریخی لسانیات کے ماہرین کے پاس وہ کونسا معیار ہے جس کی رُو سے وہ یہ طے کر سکتے ہیں کہ فلاں زمانے کی اتنی تحریروں میں سے صرف فلاں تحریر اس دور کی نمائندہ ہے اور اس کے علاوہ دوسری کوئی تحریر نمائندگی کی اہلیت نہیں رکھتی؟ یا کسی نمونے کی دستیابی ہی کو اس کی نمائندگی کا معیار بنا لیا گیا ہے۔؟ غالباً بات کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے کہ جس زمانے کی جو تحریر مل گئی ہے وہ اس دور کی نمائندہ تحریر مان لی گئی ہے۔

فرض کیجیے کہ ایک ہی زمانے میں ایک شاعر شعر کہتا ہے اور دوسرا شخص جغرافیے کی کتاب لکھتا ہے تو دونوں میں سے کس کی تحریر اُس زمانے کی زبان نمائندہ مانی جائے گی؟ اُردو کے مشہور شاعر مرزا اسد اللّٰہ خاں غالب دہلوی کی زبان انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کی نمائندہ زبان مانیں گے یا اس جغرافیے کی کتاب کی زبان کو نمائندگی کا حق دیں گے جو اسی زمانے میں لکھی گئی تھی۔

اگر ایک ہی شخص کی دو تحریریں سامنے آ جاتی ہیں۔ ایک اُس کی شاعری اور دوسری اس کی نثر، دونوں میں زبان کے اعتبار سے فرق ہے تو اس کی کون سی تحریر اس کے دور کی نمائندگی کرے گی؟ اگر اس کی شاعری میں بھی دو قسم کی زبان استعمال ہوئی ہے تو اس کی شاعری کا کون سا جزو اس دَور کی زبان کا نمائندہ ہوگا؟ مثلاً مرزا غالب دہلوی کے خطوط کی زبان

ان کے اشعار کی زبان سے مختلف ہے اور پھر خود اشعار بھی دو قسم کی مشکل اور آسان زبان میں کہے گئے ہیں تو ان کی زبان کا کون سا نمونہ اور کون سا جزو نمائندہ مانا جائے گا۔؟

آج سے گیارہ سال پہلے میں نے ۱۹۶۱ء میں تشریحی یعنی مکانی لسانیات پر "اُردو کا رُوپ" نامی ایک کتاب لکھی تھی جس میں زیادہ سے زیادہ کھری اور بے میل اُردو لکھنے کی حتی المقدور کوشش کی تھی تاکہ اُردو کو حقیر اور بے مایہ سمجھنے والوں کو یہ دکھا سکوں کہ اُردو خود اپنے پیروں پر اور اپنی ہی سکت سے کھڑی ہوتی ہے اور اس میں فنی اور علمی موضوعات پر بھی لکھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کی زبان میری موجودہ تحریر کی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اگر مستقبل میں تاریخی لسانیات کے کسی ماہر کو صرف میری ہی دونوں تحریریں دستیاب ہو جاتی ہیں تو کیا وہ میری اُردو کو پورے موجودہ دور کی زبان کی نمائندہ سمجھنے میں حق بجانب ہوگا؟ اور اگر وہ صرف ان کی دستیابی ہی کی بنیاد پر اُنھیں نمائندگی کا حق دے دیتا ہے تو اس دور کی زبان کے نمونے کے طور پر ان دونوں تحریروں میں سے کون سی تحریر پیش کرے گا۔؟ پھر اگر زبان اور ایام ہی سے تبدیل ہوتی ہے تو کیا وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوگا کہ اُردو زبان صرف تیرہ سال کے عرصے میں اس قدر بدل گئی ہے؟ اور اگر وہ یہ نہیں کہتا، زبان کے فرق کی کیا توجیہ کرے گا۔؟

میر امن دہلوی کی کتاب "باغ و بہار" (سن تصنیف ۱۸۰۲ء) اور رجب علی سرور کی کتاب "فسانۂ عجائب" (تصنیف ۱۸۲۴ء) کی اُنعد میں جو فرق نظر آتا ہے اُس کی وجہ بائیس سال کا بُعد زمانی ہے یا دہلی اور لکھنؤ کے درمیان کا مکانی فاصلہ؟ اعظم علی اعظم اکبر آبادی کی طرح ابتدا میں رجب علی بیگ سرور بھی آگرے کے باشندے تھے، لیکن بعد میں لکھنؤ میں جا بسے تھے۔ ۱۸۲۴ء میں یعنی جس سال رجب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" لکھا۔ اعظم علی اعظم نے "قصہ سرور افزا" لکھا، لیکن دونوں کی اُردو میں فرق ہے اور جب دونوں کی تحریروں میں زمانی فاصلہ نہیں ہے تو لکھنؤ اور آگرے کے مکانی فاصلے کے سوا فرق کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

یہ پچھلی صدی کی بات تھی اور ڈیڑھ سو سال پُرانی بات تھی۔ اب میں آپ کے سامنے اسی صدی بلکہ اس سے بھی نصف آخر کی اُردو بول چال کے تین نمونے پیش کرتا ہوں۔ یہ نمونے میں نے تقریباً تیرہ چودہ سال کی عمر کے لڑکوں کی امتحانی کاپیوں سے جو اُردو زبان زبانِ اول حیثیت سے پڑھ رہے تھے۔ ان کے نمائندہ اور چیدہ جملے یکجا کر کے ۱۹۷۱ء میں تیار کیے تھے۔ ان کے سلسلے میں میرا کام بطور مدیر صرف اتنا رہا ہے کہ میں نے مضمون مختصر کر دیا ہے۔ لیکن جملوں کے انتخاب میں یہ دھیان رکھا ہے کہ ان کے خیالات کا تسلسل برقرار رہے اور مقامی بول چال کی زیادہ سے زیادہ خصوصیات سامنے آجائیں۔

۱۔ ڈھاکے کی اُردو :

ہم لوگ کا اسکول ساڑھے بارہ باجے بیٹھتا ہے اور ایک باجے چھٹی پڑتی ہے۔ سب سے بعد میں اپنے کلاس سے نکلتا ہوں میں جب اسکول سے آتے ہیں تو اس وقت ڈیڑھ بجتا ہے۔ اس وقت اتنا گرمی ہوتا ہے کہ سب کوئی اپنا ہوش و حواس اڑا دیتا ہے۔

اسکول سے آنے کے بعد ہم گوسول کرتا ہوں۔ کپڑا بدلی کر نشتہ کرتے ہیں۔ پھر تھوڑا آرام کرتے ہیں۔ ایک گھنٹہ مولبی صاحب سے پڑھتے ہے۔ تین بلجے سے اسکول کا کام بناتا ہوں۔ پھر ہم دوسرا کپڑا بدل کر اپنے دُستوں کے یہاں چلے جاتا ہوں۔ سب کوئی کو ساتھی کی ضرورت ہے۔ بغیر اس کے کوئی رہے نہیں سکتا۔ اس طرح لوگ کے کافی دوست ہو جاتے۔ میرے بھی بہت سے دوست ہیں، ان لوگ ہمارے مکان کے پاس ہی رہتے ہیں۔ اس کا باپ بہت اچھے ہیں۔ میں کوئی دن کرکٹ کھیلتا ہوں۔ کوئی دن فٹ بال کھیلتا ہوں۔ دو تین گھنٹا کھیل کرنے کے بعد گھر آئے۔ کپڑا بدلی کیا۔ پھر میں سائیکل پر بیٹھ کر نانی کے گھر چلے جاتا ہوں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے گھر کے طرف ہو لیا۔ گھر جاتے تک سات باج جاتے ہے۔ پہلے گوسول کرتے ہیں، پھر کھانا کھاتے ہیں۔ سردی میں گوسول کے لیے گھنٹا پہلے سے پانی گرم کرنا پڑتا ہے۔ پھر گوسول کر کے گُرم کپڑا نہ پہنے تو ٹھنڈا لگتا ہے۔ کھانا بعد میں رات کی سنسانی میں اپنا پڑھائی نکالتے ہیں اور پڑھنا کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔ اپنی امتحان کا تیاری شروع کرتے ہیں۔ اگر کچھ سوجھ میں نہیں آئے تو اپنا بڑا بھائی سے سمجھ لیتے ہے۔ اس کے علاوہ کوئی کہانی کی کتاب پڑھتے ہے۔ اس طرح ساڑھے دوش باج جاتے ہیں۔ سوتا وقت امی ابا کو سلام کرتے ہے۔ پھر کلمہ پڑتا ہیں اور گیارہ باجے سو جاتا ہیں۔ دوسرا دن جب آنکھ کھلتی ہے تو پھر آپنا کام شروع کرتا ہیں۔ سب کوئی گھر کے یہاں ٹھیک ہیں۔ پر والد صاحب ہماری امتحان سے پرسان ہیں۔ وہ بچہ لوگ کی امتحان کے بعد چٹاگام جائیں گا۔

۲۔ پشاور کی اُردو:

جب ہمارا اسکول کا چھٹی کی گھنٹی بجی تو ہم اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔ ساڑھے ایک بجے گھر کو پہنچوں گا۔ ماں باپ کا سلام کرتا ہوں۔ پھر کپڑے بدل کرتا ہوں۔ منہ ہات دوتا ہوں۔ جب روٹی کھاؤں تو توڑا دوپہر کا نیند کرتا ہوں۔ جب اُٹھ جاتا ہوں تو وضو کر کے نماز کروں۔ نماز کے بعد ہم چائے پیتا ہے۔ پھر فٹ بال کرنے جاؤں۔ میرا فٹ بال کے ساتھ بہت شوق ہے، کچھ شاہی باغ جا کر میچ باندھتے ہیں۔ چلانگیں لگاتے ہیں، نشانہ بناتے ہیں۔ لڑکے شام تک کھیلوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کے بعد ذرا دھوپ کمزور ہو جاتا ہے۔ جب میں کھیلنے سے آجاؤں تو پھر بازار کو چکر لگاؤں گا۔ اس کے بعد قرآن شریف کا تلاوت کرتا ہوں۔ تلاوت کے بعد میں اپنے بہن کی گھر جاؤں۔ بہن کی خاوند بابو ہے۔ جب بہن کی گھر سے آجاؤں تو پڑھائی کرتا ہوں، باپ ہم کو پڑھائی میں بہت کوشش کرتے ہیں اور بعد میں اس پر خوب سمجھتا ہوں، کچھ دیر بعد مجھ سے پوچھنا کہ میں نے اب کیا کیا بنایا اور میں اس کو بتاتا ہوں۔ جب کسی چیز مجھے غلط ہو جائے تو پڑھائی کا کام ختم کرنے کے بعد پھر میں عشاء کا نماز پڑھوں اور پھر کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے کے بعد میں اپنا دماغ کو تازہ کریں۔ پھر پڑھائی کا کام شروع کرتا ہے۔ پھر میں اپنا بستہ بند کر دوں اور پھر بڑے بھائی کے ساتھ مجھ سے لطیفے پیش کرتے ہیں۔ پھر سائیکل کا صفائی کرتا ہوں اور سو جاتا ہوں۔ اس لیے میں اس کام کو ہمیشہ اس طرح آباد رکھیں گے تو کامیاب ہوں گے۔ ضروری ہے کہ ہم اپنی کاموں کو وقت پر کریں۔

۳۔ لاہور کی اُردو :

مجھے سکول سے تقریباً ایک بجے چھٹی ہوتی ہے۔ سکول سے آنے کے بعد کیونکہ بہت تھکاوٹ ہوتی ہے لہٰذا بستہ رکھ کر ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھاتا ہوں۔ کھانا کھانے کے بعد تھوڑا سو جاتا ہوں اور تین بجے تک سویا رہتا ہوں۔ اُس وقت میں کھلا کرتا اور کھُلی شلوار پہنتا ہوں۔ گرمی اتنی ہوتی ہے کہ اُٹھنے کو دل نہیں کرتا۔ پھر اپنا کام جو دیا گیا ہوتا ہے وہ میں نے کرنا ہے۔ اس کے بعد نزدیکی نہر پر نہاتا ہوں۔ اس سے ایک تو ورزش ہو جاتی ہے دوسرا گرمی سے نجات مل جاتی ہے۔ پھر میرا دل کھیلنے کو کرتا ہے تو میں کھیلنے چلا جاتا ہوں۔ میں بہت سی کھیلیں کھیلتا ہوں۔ مرضی آئے تو ہم اتوار کو مخالف ٹیم سے میچ بھی ڈالتے ہیں۔ آگے میرا دوست بلو ہوتا تھا۔ جب دیکھو اس نے کتاب ہاتھ میں پکڑی ہوتی ہے۔ وہ امتحان میں اچھے نمبر لیتا تھا۔ اب وہ دھوبی کا مانیٹر لگا ہوا ہے۔ تین چار دنوں کے بعد میں اس کے پاس بھی چلا جاتا ہوں۔ جب گھر واپس لوٹا تو آگے شام کی چائے میز پر پڑی ہے۔ اور صحن میں چھڑکاؤ ہوا ہوا ہے۔ پھر میں پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ اس وقت تک پسینہ سوکھ چکا ہوتا ہے۔ سکول کا کام کرنے کا میں نے ٹائم ٹیبل بنایا ہوا ہے۔ اکثر تو میں اپنا کام سکول میں ہی ختم کر کے آتا ہوں۔ گھر میں ہر کوئی مجھ پر خوش رہتا ہے کیونکہ میں روزانہ کا کام روزانہ کرتا ہوں۔ اس وقت میں چھوٹے بھائی کو پڑھنے کو کہتا ہوں۔ سکول کے کام کو ختم ہوتے ہوتے مغرب آ جاتی ہے۔ جب سورج غروب ہوتا ہوا دکھائی دینے لگ جاتا ہے اور پرندے اپنے گھونسلوں کو جا رہے ہوتے ہیں تو تب بجلی کا بلب جگاتا ہوں اور ٹی وی دیکھنے لگ جاتا ہوں۔ کیونکہ میں نے کام کر لیا ہوتا ہے اور میرے دوست ٹی وی دیکھنے آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ٹی وی ہم گرمیوں میں اس لیے کم دیکھتے ہیں کیونکہ راتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ پھر ماسٹر صاحب نے جو مضمون یاد کرنے کو دیا ہوتا ہے وہ یاد کر لیتا ہوں۔ اگر کوئی سوال بھول جائے تو ابا جان سے وہ سوال پوچھ لیتا ہوں۔ رات کو سوتے وقت میں اور میرے بہن بھائی آپس میں پہیلیاں بھی ڈالتے ہیں۔ اس طرح پہیلیاں ڈالتے ڈالتے کوئی دس بجے کے قریب چادر لے کر سو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی سونے کے پہلے میں ابا جان کو بھی دباتا ہوں۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ زبان کبھی اور کہیں بھی ہموار اور یکساں نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں ماہرینِ لسانیات کی چند آراء ملاحظہ فرمائیے

ایڈورڈ سپیر کہتا ہے: ”ہر شخص جانتا ہے کہ زبان رنگ برنگی ہوتی ہے۔“[1]

اسٹیفن المین کہتا ہے: ”عام زبان کبھی یکساں نہیں ہوتی ..... ہم چاہے تین ہزار سال قبل مسیح کی بات کریں چاہے سنہ ۱۹۵۱ء کی مکمل طور پر یک رنگ زبان ایک مغالطہ ہے۔“[2]

جون لیونز کہتا ہے: ”کوئی زندہ زبان مکمل طور پر یکساں نہیں ہے۔“[3]

اگر آپ زبان کی مکانی وسعت اور رنگا رنگی کا اندازہ کرنا چاہیں تو کرۂ ارض کے محیط کے ساتھ ساتھ شرقاً غرباً یا شمالاً جنوباً

---

[1] لینگویج۔ باب ہفتم [2] دی پرنسپلز آف سیمانٹکس صہ ۱۲ [3] لینگویج اینڈ لنگوسٹکس صہ ۱۸۴ ؛

سفر کرتے چلے جائیے آپ کو یوں لگے گا کہ جیسے یہ صفحۂ زمین نہیں ایک وسیع و لبسیط خطۂ چمن ہے جس میں بھانت بھانت کی چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ انسان زمین کے مختلف خطوں اور علاقوں میں بسے ہوئے مختلف زبانیں بول رہے ہیں، جن میں پڑوسی ایک دوسرے کی بول چال سمجھ لیتے ہیں، لیکن جیسے جیسے دو علاقوں کا درمیانی فاصلہ زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے اُن کے باسی ایک دوسرے کی بات سمجھنے میں دقّت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی ملک کے دو سروں پر بسنے والے باہمی افہام و تفہیم سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ زبانوں کا تدریجی فرق جغرافیائی خطوں کے درمیانی فاصلے بڑھنے کے باعث آخر میں آ کر مکمل اجنبیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ زبانوں کی تقسیم ہے جن کا تشخص درمیانی فاصلے قائم کرتے ہیں۔

خود ایک زبان کے سماج میں بھی لوگ یکساں زبان نہیں بولتے۔ ایک ہی زبان کی معیاری اور غیر معیاری دو مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ بعض لوگ معیاری زبان بولتے ہیں بعض غیر معیاری۔ ایک ہی شخص دو مختلف موقعوں پر، دو مختلف اوقات میں اور دو مختلف موضوعات سے متعلق گفتگو میں مختلف زبان استعمال کرتا ہے۔ جسے اس کا انفرادی اسلوب یا طرزِ بیان کہتے ہیں۔ دو بولنے والوں کی زبان میں بھی فرق ہوتا ہے کیونکہ ان کے ذخیرۂ الفاظ مختلف اور اسلوب بیان جدا جدا ہوتے ہیں۔ پھر ایک ہی لسانی سماج مختلف طبقات میں بٹا ہوتا ہے جن میں سے ہر طبقہ اپنی اپنی مخصوص زبان بولتا ہے۔ علمی زبان، مذہبی زبان، قانونی زبان، طبّی زبان، فنّی زبان اور عورتوں کی زبان وہ طبقاتی زبانیں ہیں جو الگ پہچان لی جاتی ہیں۔ یہ معیاری زبانیں ہیں۔ اعلیٰ اور متوسط طبقے کے افراد، عالم اور عامی، مختلف پیشے والوں مثلاً مذہبی عالموں، ڈاکٹروں، سوداگروں، انجینیروں، وکیلوں، طبیبوں، نجومیوں، سائنسدانوں اور فن کاروں کی زبان میں بھی فرق ہوتا ہے۔ کھیلوں کی اور تفریحات کی زبان بھی الگ الگ ہوتی ہے۔[1]

عورتیں مردوں سے الگ ہی بولی بولتی ہیں۔ ان کے لغات، محاورے، لہجے، روزمرّے، دُعائیں، بد دُعائیں، کوسے، قسمیں اور اسالیب بیان بالکل بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ قدامت پرست ہوتی ہیں اور قدیم رسوم اور عادات سے وابستہ رہنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ ان پر بیرونی اثرات بھی اتنے نہیں پڑتے جتنے مردوں پر پڑتے ہیں، کیونکہ مردوں کا تعلق باہر کی دنیا سے اور عورتوں کا تعلق گھروں کی اندرونی دنیا سے زیادہ ہوتا ہے اور گھر ایک قلعہ ہوتا ہے جس میں باہر کے اثرات کا نفوذ مشکل سے ہو پاتا ہے۔ عورتوں کے چند اُردو الفاظ، مرکبات اور محاورات وغیرہ کی مثالیں دیکھیے۔

اُوپر والیاں (چڑیلیں۔ پریاں)۔ اُوپر والا (چاند)۔ اندر والا (دل)۔ سبب (موت۔ انتقال)۔ اتر جانا (بچّے کا مر جانا)۔ سدھارنا (رخصت ہونا۔ چلا جانا)۔ فرآن درمیان (ایک زندہ اور ایک مردہ انسان کا ساتھ ساتھ ذکر کرتے وقت)۔ بہشتی (مرحوم۔ مرا ہوا)۔ بی بی کا دانہ (حضرت خاتونِ جنّت کی نذر)۔ راجا باسک، ماموں، رسّی (سانپ)۔ سُدھارنا (جانا، رخصت ہونا)۔ چوڑیاں ٹھنڈی کرنا (چوڑیاں توڑنا) اجلی (دھوبن)۔ اللہ رکھے (دُعا۔ خدا عمر دراز کرے)۔ مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے (دُعا

---

[1] وینڈرے، لینگوئج ص ۲۴۹۔ مثالوں کے لیے دیکھیے سہیل بخاری کی کتاب اُردو کی کہانی ص ۲۰۱۔

شوہر اور اولاد سلامت رہے)۔ مانگ اُجڑنا (شوہر کا مرجانا)۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو (دعا۔ خدا مال و دولت اور اولاد عطا کرے) کوکھ جلی (وہ عورت جس کا بچہ مرجائے)۔ بڑی کتاب (قرآن مجید)۔ مردوا (مرد) آیا لگایا (غیر، اجنبی جیسے اپنا یا جائے)۔ کھوجڑے پٹیا (بددُعا)۔ موا (بددعا)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان مردوں کی داشتہ اور عورتوں کی سہیلی ہے۔ چنانچہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی بول چال میٹھی، آسان اور ہلکی پھلکی اور لہجے میں رسائی اور نرمی ہوتی ہے۔ زبان میں خوف، وسواس، شگون، شرم، لحاظ اور شدید نیک و بد خواہشات اور آرزوئیں شامل رہتی ہیں۔

غیر معیاری زبان بولنے والوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً مچھیروں، مزدوروں، قسائیوں، بھٹیاروں، چڑی ماروں، مختلف کاریگروں، اور ریلوے مستریوں وغیرہ کی اپنی اپنی فنی اور اصطلاحی زبان ہوتی ہے۔ جہازی مزدور اپنی غیر معیاری بولی بولتے ہیں۔ ٹھگوں، لٹیروں، چوروں، عادی مجرموں، غنڈوں اور قانون شکنوں کی بولی الگ ہوتی ہے۔ مداری، بازی گر اور سرکس تماشے والے اپنی اپنی بول چال رکھتے ہیں۔ بعض لوگوں میں زرزری جیسی خفیہ زبانیں بھی بولی جاتی ہیں تاکہ کوئی دوسرا ان کی بات نہ سمجھ پائے[1]۔

غرض جس طرف دیکھئے مختلف زبانوں اور لہجوں کا ایک گھنا جنگل اور ایک گتھا ہوا تانا بانا نظر آتا ہے اور زبان کی مختلف آوازوں کا ناہموار، اونچا نیچا اور مبہم سا شور سنائی دیتا ہے۔

علاقائی فرق سے بھی ایک زبان کی مختلف شکلیں ہو جاتی ہیں۔ جب ایک زبان کسی سیاسی، کاروباری یا مذہبی سلسلے میں کسی دوسری زبان کے علاقے میں پہنچ جاتی ہے تو وہاں کے لوگ اُسے اپنی مادری زبان کے ساتھ ملا کر بولنے اور لکھنے پڑھنے لگتے ہیں۔ اس طرح زبان کو سفر کرنے والی زبان کا مقامی محاورہ کہتے ہیں، جیسے ویدک اور سنسکرت جو آریاؤں کی سعدی بولی میں ہندوستان کی مختلف بولیوں کی ملاوٹ سے تیار ہونے والا محاورہ ہے۔ امریکی انگلش اور انڈین انگلش برطانوی انگریزی کے امریکی اور ہندوستانی محاورے ہیں جو امریکا اور ہندوستان کی مقامی زبانوں کی آمیزش سے بنے ہیں۔ سبک ہندی ایران کی فارسی کا ہندوستانی محاورہ ہے جو فارسی میں ہندوستانی زبانوں کے میل سے تیار ہوا ہے۔ اکبر آبادی، دہلوی، لاہوری اور حیدرآبادی اور ہماری زبان کے مقامی محاورے ہیں جو معیاری اُردو میں بالترتیب برج بھاشا، ہریانی، پنجابی اور دکنی زبانوں کے میل سے اُبھرے ہیں[2]۔

ایک زبان کا دوسری زبان پر اثر مستعار لیے جانے والے الفاظ تک ہی محدود نہیں رہتا، بلکہ آوازوں، لہجوں اور روزمروں، محاوروں، تلمیحوں، استعاروں، کہاوتوں اور اسالیب بیان وغیرہ تک جا پہنچتا ہے۔ جیمس اینڈرسن کہتا ہے کہ

---

[1] بلوم فیلڈ لینگویج ص ۴۹ و ۵۰۔

[2] اُردو کی کہانی — پانچواں انگ ص ۱۹۹۔

اسپین میں لاطینی زبان آئبیرین لہجے میں بولی جاتی تھی۔ اٹلی کے کچھ علاقوں میں اسے لوگ آسکن امبرین لہجے میں اور دوسرے علاقوں میں اٹرسکن یا یونانی لہجے میں بولتے تھے۔ رومانیا میں بلقانی زبانوں نے لاطینی کے تلفظ کو متاثر کر دیا تھا۔ ویدک اور سنسکرت میں ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ مع ن اور مع ش کی آوازیں ہندوستان کی مختلف مقامی زبانوں سے داخل ہوئی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ آوازیں دوسری آریائی زبانوں مثلاً فارسی اور یونانی وغیرہ میں نہیں ملتیں[1]۔

آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ آجکل آئرلینڈ کے نئے نئے انگریزی زدہ علاقوں کا مقامی محاورہ صوتیات اور صرف و نحو میں آئرش زبان سے متاثر ہے اور پیراگوئے کی گوارانی انڈین زبان نے اس علاقے میں بولی جانے والی ہسپانوی زبان پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں[2]۔

دوسری طرف جو زبان اپنے ہی علاقے میں کسی دوسری آنے والی زبان سے ملتی ہے۔ وہ بھی اس کے اثرات قبول کرتی ہے، اور اگر آنے والی زبان سیاسی یا ثقافتی بالادستی بھی رکھتی ہے تو یہ اثرات اور بھی گہرے اور دُور رس ہو جاتے ہیں۔ اس برصغیر کی قریب قریب تمام زبانوں پر سنسکرت، فارسی، عربی اور انگریزی کے اثرات اور ان اثرات کے تحت چھوٹی بڑی رد و بدل اس کا ثبوت ہیں[3]۔

مختصر یہ کہ زبان پوری زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ زمین کے مختلف خطوں اور علاقوں میں اس کی مختلف قسمیں بولی جاتی ہیں۔ ہر علاقے میں انسانوں کا ایک ہی سماج بستا ہے۔ جو ایک زبان بولتا ہے اور ہر دو علاقوں کے درمیان میں ایک ملواں زبان پائی جاتی ہے جس میں دونوں پڑوسی زبانوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ہر لسانی علاقے کا ایک مرکز ہوتا ہے جہاں زبان کا معیاری محاورہ بولا جاتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے مرکز سے نکل کر سرحد کی طرف بڑھنے لگتے ہیں اس کے معیار میں رعایت اور ضوابط میں نرمی ملنے لگتی ہے، پڑوسی زبان کی خصوصیات کا میل شروع ہو جاتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے زبان کا گہرا رنگ ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔ یعنی ایک لسانی علاقے میں بھی دو مختلف مقامات کے رہنے والوں کی زبان بالکل ایک سی نہیں ہوتی۔ زبان کا دائرہ عمل کبھی جیومیٹری کی سی معین شکل میں نہیں ملتا اور دو زبانوں کے درمیان میں کوئی واضح حدِ فاصل بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ایک لسانی علاقے کی حد پار کر کے دوسرے لسانی علاقے میں دُور تک نہیں پہنچ جاتے سرحد کے گزرنے کا علم تو علم احساس بھی نہیں ہو پاتا۔

ہر زبان میں بیک وقت متعدد رنگ نظر آتے ہیں۔ ہر لسانی علاقے میں سماج کے مختلف طبقوں کی بول چال میں

---

[1] جیمس اینڈرسن کی بیان کی ہوئی ان آوازوں کے ساتھ ساتھ بھاری آوازیں (مہاپران) بھی ہندوستانی زبانوں سے ویدک اور سنسکرت میں گئی ہیں، کیونکہ یہ بھی دوسری آریائی زبانوں میں نہیں ملتیں۔ سہیل بخاری۔

[2] اسٹرکچرل اسکیچز ص۸۹ تا ص۹۲۔

[3] لارڈ اٹو یسپرن۔ لینگویج ص۲۰۸۔

تھوڑا تھوڑا سا فرق ملتا ہے۔ یہ طبقے پیشے، مشغلے، علم و فن، جنس (مرد، عورت)، مالی حیثیت اور تہذیب و ثقافت وغیرہ کے لحاظ سے بنتے ہیں۔ ہر طبقے کے افراد کی گفتگو بھی ایک دوسرے سے قدرے جدا ہوتی ہے اور خود ایک فرد بھی مختلف اوقات میں، مختلف حالات کے تحت مختلف موضوعات کے متعلق مختلف زبان استعمال کرتا ہے۔

زبانوں میں سدا سے لین دین ہوتا آیا ہے۔ جب دو زبانیں قریب آتی ہیں تو ایک کے دوسری پر اثرات پڑنے لگتے ہیں، اور ان میں کچھ نہ کچھ فرق آجاتا ہے جس کے باعث وہ اپنے معیاری محاوروں سے ذرا سی ہٹ جاتی ہیں۔

زبان کے اتنے کثیر رنگ اور اتنے بہت سے متبادل روپ جو ایک ہی وقت میں نہ صرف ایک ہی سماج اور ایک ہی علاقے میں بلکہ دوسرے سماج اور دوسرے علاقے میں پہلو بہ پہلو مل جاتے ہیں، اس کی ثروت کے منہ بولتے ثبوت اور اس کی مکانی وسعت کے آئینہ دار ہیں۔

زبان کی یہ بوقلمونی قوسِ قزح سے مشابہ ہے جس کے رنگ کی دھاریاں الگ الگ دور تک چلی جاتی ہیں اور کبھی ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہوتیں۔ زبان کی طبقاتی شکلیں اور مقامی محاورے دراصل اس کے اصطلاحی رنگ ہیں جن کے متوازی خطوط کبھی ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوتے۔

”تاریخی لسانیات کی دلدل میں ماہرین کے پھنس کر رہ جانے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اُنھوں نے زبان کے مکانی مطالعے یعنی مکانی لسانیات کو پسِ پشت ڈال کر زبان کی بوقلمونی اور رنگا رنگی کو جو اس کی مکانی خصوصیت ہے، تاریخی تبدیلی کا نام بھی دے دیا اور پھر اس نام نہاد تاریخی تبدیلی کے اسباب کا سراغ لگانے کو بھی چل کھڑے ہوئے۔

ظاہر ہے کہ اس بگڑی ہوئی صورتِ حال میں خیر کی کوئی اُمید نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے خود دھوکا کھایا اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ جون لیونز اپنی اس غلطی کا اعتراف دبے لفظوں میں یوں کرتا ہے:

”مکانی بوقلمونی اور تاریخی تبدیلی میں واضح طور پر امتیاز کرنا ناممکن ہے[1]۔“ اور جیمس اینڈرسن کہتا ہے۔

”زبانوں کی بوقلمونی کو ہم وقتی اور زبان کی تبدیلی کو ہمہ وقتی تصور کیا جاتا ہے[2]۔“

میرے نزدیک حقیقت ایک ہے جس کے دو نام رکھے گئے ہیں (۱) مکانی یا تشریحی لسانیات اور زمانی یا تاریخی لسانیات (۲) بوقلمونی اور تبدیلی۔ فی الواقع زبان کا ایک ہی مطالعہ درست ہے جسے مکانی یا تشریحی لسانیات یا صرف لسانیات کہہ سکتے ہیں اور اس کی ایک ہی خصوصیت ہے جسے رنگ برنگا پن یا بوقلمونی کہتے ہیں۔

زبان کا مطالعہ کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ اس کے متعلق ولیم انٹوئسٹل کہتا ہے کہ زبان کا ایک نظام ہے اس لیے اس کے تجزیے کے قواعد ہونے چاہئیں۔ وہ باہر سے جیسے نظر آتی ہے اس کے لحاظ سے اُس نے اس مطالعے کے مندرجہ ذیل چار عنوانات قرار دیے ہیں[3]۔

---

[1] لنگویج اینڈ لنگوسٹکس ص ۵۸ ، [2] اسٹرکچرل آسپکٹش ص ۱۹۴ [3] آسپکٹس آف لینگویج ص ۹

۱۔ فونیٹکس (علم آواز)
۲۔ فونیمکس (فونیم کا علم)
۳۔ صرف
۴۔ نحو

پی ایچ میتھیوز نے زبان کے تجزیے کو مندرجہ ذیل چار شاخوں میں تقسیم کیا ہے[1]۔

۱۔ آوازوں کا مطالعہ
(ا) صوتیات (ب) فونیٹکس (علم آواز)
۲۔ نحو۔ جملوں اور فقروں کی ساخت۔
۳۔ معنویات۔ لفظوں کے معانی کا مطالعہ
۴۔ صرف۔ مختلف استعمالات میں لفظوں کے رُوپ اور اُن کی ساخت۔ جون لیونز زبان کے تجزیے کی مندرجہ ذیل چار سطحیں قرار دیتا ہے[2]۔

۱۔ صوتیات
۲۔ صرف
۳۔ نحو
۴۔ معنویات

بیشتر ماہرین لسانیات کم و بیش انھیں چار پہلوؤں پر متفق ہیں البتہ بہت سے "صرف" کی اصطلاح استعمال کرتے اور اس کا مواد صوتیات اور نحو کے عنوانات میں بانٹ دیتے ہیں۔

پروفیسر ایل ایچ گرے نے اپنی کتاب میں البتہ ان سے ہٹ کر ایک اور راہ نکالی ہے اور زبان کے مندرجہ ذیل پہلو بتائے ہیں[3]۔

۱۔ مادی یا میکانکی
(ا) صوتیات (ب) صرف
۲۔ اشتقاقیات (مادّہ)

---

[1] مارفولوجی ص ۳
[2] نیو ہورائزنز ص ۲۳
[3] دی پرنسپلز آف سیمانٹکس ص ۲۴

۳ ۔ نفسیاتی یا غیر میکانکی۔

(و) نحو (ب) معنویات

یہ تقسیم بھی مندرجہ بالا تقسیموں سے تقریباً ملتی ہے۔ البتہ ناموں میں ذرا سی تبدیلی ہوگئی ہے اور اس تبدیلی میں گرے کا ذاتی نقطہ نظر جھلکتا ہے۔

میرے خیال سے زبان کے مطالعے کا طریقہ طے کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم کوئی ایسی ٹھوس بنیاد فراہم کریں جو طبعی ہو اور قانونِ قدرت سے مطابقت رکھتی ہو۔ چنانچہ میں نے وظائف زبان کی بحث میں زبان کا جو آخری لیکن جامع اور ہمہ گیر وظیفہ بیان کیا ہے۔ اسی سے مطالعہ زبان کا طریقہ اخذ کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

زبان سے دنیا کا گہرا تعلق ہے۔ وہ دنیا کو بیان کرنے کے لیے وضع ہوئی ہے، اسی لیے اس میں پوری دنیا جھلکتی ہے یعنی دنیا جیسی پہلے تھی، جیسی اب ہے، جیسی آئندہ ہوگی اور جیسی ہونا چاہیئے۔ سب کچھ ہمیں زبان ہی بتاتی ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا سے زبان کی مشابہت دور تک چلی جاتی ہے اس لیے ہمیں زبان کا مطالعہ کرنے کے لیے دنیا پر نظر ڈالنا چاہیے، جسے عالم موجودات کہتے ہیں، یعنی جو نہ صرف مادّی موجودات کا ذخیرہ ہے بلکہ غیر مادی موجودات یعنی ہمارے خیالات و افکار کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ جس طرح دنیا زمان و مکان سے محدود ہے اسی طرح ہمارا تفکر اور تخیل بھی زمان و مکان سے اس قدر جکڑا ہوا ہے کہ ہم ان سے ہٹ کر سوچنا بھی چاہیں تو نہیں سوچ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے دنیا کو جس طرح سمجھا ہے اور اس کا جو نمونہ سامنے رکھ کر سوچا ہے اُسی کے مطابق زبان کی تخلیق و تعمیر کی ہے۔

دنیا موجودات کے ذخیرے کا نام ہے اور زبان الفاظ کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ جس طرح اشیاء دنیا کی اکائیاں ہیں اسی طرح الفاظ زبان کی اکائیاں ہیں۔ شے دنیا کی جان نہیں بلکہ خود دنیا ہے۔ لفظ بھی زبان کی رُوح نہیں زبان ہے۔ ہمارے بزرگوں کے پیشِ نظر یہی حقیقت تھی جنھوں نے زبان کو "بولی" کہا ہے اور بولی کا لفظ "بول" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں لفظ۔ اس طرح بولی کا مطلب ہوا "بول والی" یا "بول کی" اس طرح اُردو میں زبان کے مطالعے کے لیے لفظ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جو زبان کی اصل اور بنیاد ہے۔ اس لیے زبان کے مطالعے کی ابتداء لفظ سے کرنا چاہیئے اور اسی پر اس کی انتہا ہونا چاہیے۔

پھر جس طرح اشیائے عالم عناصر اربعہ کے ملنے سے بنی ہیں اسی طرح الفاظِ زبان بنیادی آوازوں کے ملنے سے تیار ہوئے ہیں۔ عجب دانا تھا جس نے حروف کو جو آوازوں کی بصری شبیہیں ہیں۔ عناصر اربعہ کے خواص عطا کر کے چار درجوں خاکی، مادی، آبی اور ہوائی میں تقسیم کر دیا۔ اس طرح دنیا یعنی اشیاء کی بنیاد عنصر پر اور زبان یعنی لفظ کی بنیاد آواز پر قائم ہوئی جو علم آوازوں سے متعلق ہے اسے لسانیات میں صوتیات کہتے ہیں۔

سائنس (طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات وغیرہ) تحلیل و ترکیب کے عمل سے اشیائے عالم کو جانچتی پرکھتی اور قدرت کے ان قوانین کا سراغ لگاتی ہے جو ان میں کام کر رہے ہیں۔ تحلیل و ترکیب کا یہی عمل لفظ پر بھی ہوتا ہے جو آوازوں کی اینٹیں چُن چُن کر تیار کیا جاتا ہے اور یہی عمل جس علم سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے لفظیات کہتے ہیں۔

خدا نے جو اشیائے عالم خلق کی ہیں ان کی غرض و غایت خود اسی نے طے کی ہے کیونکہ خالق ہی اپنی یہ مصلحت خوب جانتا ہے کہ اس کی کونسی مخلوق سے کس مقصد کی تکمیل ہو سکے گی اسی طرح واضع زبان نے بھی ہر لفظ کی گھڑت کے وقت اپنی مصلحت وقت کے مطابق اسے مناسب معنی عطا کر دیئے۔ یہ علم جو لفظ اور معنی کے رشتے اور معنی کی اقسام وغیرہ سے تعرض کرتا ہے۔ معنویات کہلاتا ہے۔

اس سلسلے میں مشابہت کی آخری بات یہ ہے کہ جس طرح اشیائے عالم الگ الگ غیر مربوط اکائیاں نہیں ہیں بلکہ ربط باہم سے ایک سلسلے میں منسلک ہو کر کائنات کی تنظیم قائم کرتی ہیں اسی طرح مختلف الفاظ باہم مل کر ایک مربوط انسانی کلام کا نظام قائم کرتے ہیں اور جو علم اس نظام سے بحث کرتا ہے اسے نظامیات کہتے ہیں، جسے عرف عام میں گرامر یا قواعد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ زبان یا لفظ کے مطالعے کی یہ چاروں پرتیں مندرجہ ذیل شجرے سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔

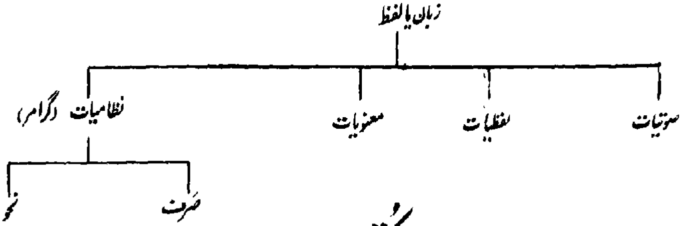

کتب حوالہ

انگریزی

۱۔ لینگویج مصنفہ ایڈورڈ سیپیر۔ نیویارک سنہ ۱۹۲۱ء
۲۔ دی پرنسپلز آف سیمانٹکس۔ اسٹیفن اُلمین بیسیل بلیک ویل آکسفورڈ سنہ ۱۹۶۷ء
۳۔ لینگویج اینڈ لنگوئسٹکس۔ جون لیونز۔ کیمبرج سنہ ۱۹۸۱ء
۴۔ لینگویج مصنفہ وینڈریے مترجمہ پال ریڈین لندن سنہ ۱۹۵۲ء
۵۔ لینگویج مصنفہ لیونارڈ بلوم فیلڈ۔ نیویارک سنہ ۱۹۶۶ء
۶۔ اسٹرکچرل اسپکٹس آف لینگویج چینج۔ جیمس اینڈرسن۔ نیویارک سنہ ۱۹۶۳ء
۷۔ لینگویج مصنفہ آر۔ ٹی۔ پوٹر سن، لندن سنہ ۱۹۶۴ء
۸۔ آسپکٹس آف لینگویج مصنفہ ولیم اینڈ ٹسل۔ لندن سنہ ۱۹۵۳ء
۹۔ مارفولوجی مصنفہ پی، ایچ میتھیوز۔ کیمبرج سنہ ۱۹۷۴ء
۱۰۔ نیو ہورائزنز ان لنگوئسٹکس۔ جونز لیونز۔ پینگوئن بکس لمیٹڈ۔ انگلینڈ سنہ ۱۹۸۰ء۔

اُردو: (۱) اُردو کی کہانی، مصنفہ ڈاکٹر سہیل بخاری مطبوعہ آزاد بکڈپو سرگودھا۔

جلال الدّین اکبر اور اُن کی غزل گوئی

بشیر ساجد

۱۹۲۳ء میں مشرقی پنجاب کا ایک دیہاتی نوجوان گورنمنٹ کالج لاہور کی فرسٹ ایئر کلاس میں داخل ہوا۔ وہ میٹرک کے امتحان میں وظیفہ حاصل کرکے آیا تھا۔ لیکن گورنمنٹ کالج کے انگریزیت زدہ، فیشن پرست، سوٹڈ بوٹڈ طلبہ سے اس کا رنگ ڈھنگ بالکل جُدا تھا۔ ابتداً میں بعض طلبہ نے اس کے کھدر کے کُرتے، کھدر کی شلوار، کھدر کی پگڑی اور دھوڑی کی جُوتی کا مذاق اڑایا لیکن جب اس کے جوہر کھلنے شروع ہُوئے تو سبھی اس کے قائل ہوتے گئے جلدی ہی اس کی شعرگوئی کے چرچے کالج کی فضا میں پھیلنے لگے اور پھر تو یہ عالم ہُوا کہ اِدھر اس نے کوئی تازہ شعر کہا اور کسی ہم جماعت کو سنایا اور اُدھر نہ صرف گورنمنٹ کالج بلکہ دوسرے کالجوں کے طلبہ کی زبانوں پر بھی جاری ہوگیا۔

ابھی یہ نوجوان تھرڈ ایئر میں تھا کہ بیس سال کی عمر میں اس کا پہلا مجموعۂ کلام "نقشِ ارژنگ" کے نام سے شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پہلے دو دنوں میں گورنمنٹ کالج ہی میں دو سو نسخے فروخت ہوگئے۔ ماہنامہ ہزار داستان (لاہور) کے دفتر میں جو نسخے رکھوائے گئے وُہ بھی گرماگرم ٹکیوں کی طرح بِک گئے۔ پھر دُور دور سے فرمائشیں آنے لگیں مشہور صاحبِ طرز ادیب اور نقّاد اور ماہنامہ "نگار" کے مدیر نیاز فتحپوری (مرحوم) نے بھی پچاس نسخے منگوائے اور ماہنامہ الناظر (لکھنؤ) نے پچیس نسخے۔ متعدد نسخے سُرمۂ مفت نظر کی طرح احباب کی نذر ہوئے۔ حلقۂ احباب میں صرف ایک استثناً چودھری محمد علی (مرحوم، سابق وزیر اعظم پاکستان) کی ذات تھی جو مصنف سے دو سال سینئر اور ایم۔ ایس سی (کیمیا) کے طالب علم تھے اور بہت عمدہ علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے۔ مصنف نے ایک نسخہ انھیں بھیجا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہاسٹل کا ملازم ایک بند لفافہ ان کی طرف سے مصنف کو دے گیا جس میں ایک رقعہ اور سوا روپیہ (نقش ارژنگ کی قیمت) تھا۔ چودھری محمد علی نے اپنے ایک رقعہ میں ایک انگریز مصنف کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر کسی مصنف کے دوست اس کی تصانیف خرید کر اس کی حوصلہ افزائی نہیں کریں گے اور مفت نسخے حاصل کرنے کے متوقع ہوں گے تو مخالف تو اس کی کتابیں خریدنے سے رہے۔ لہٰذا اس مصنف کے حشر کا تصور کیا جا سکتا ہے میں نسخہ کی قیمت بھیج رہا ہُوں۔ اگر میرے حالات اجازت دیتے تو میں کہیں زیادہ ہدیہ پیش کرتا۔ پروفیسر سراج الدین مرحوم اور حافظ عبدالمجید (سابق چیف سیکرٹری حکومت پنجاب) بھی آپ کے عزیز دوستوں میں شامل تھے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ طالب علم کون تھا؟ شاید نہیں۔ آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل کا عمل دنیائے شعر و ادب میں بھی جاری ہے۔ بہرحال یہ تھے جناب جلال الدین اکبر — سولھویں صدی کے ہندوستان کے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے ہم نام۔ وُہ جو

فرماتے ہیں : ؎

نہ پستیوں پہ مری جا بلندیوں کو بھی دیکھ
کہ آج ملکِ معانی کا تاجدار ہُوں میں

مختصر حالاتِ زندگی

جناب چودھری جلال الدین اکبر دسمبر ۱۹۰۵ء میں مشرقی پنجاب کے ایک پُرفضا گاؤں علی پور نہراں والا (تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور) میں پیدا ہُوئے۔ یہ دریائے راوی سے نکلنے والی نہروں کا سرسبز و شاداب خطہ تھا۔ لاہور کی شریان نہر اپر باری دوآب کی شاخ بھی وہیں سے نکل کر آتی ہے۔ جناب اکبر کے والد محترم چودھری فتح علی ایک معمولی زمیندار تھے لیکن اپنی شہزوری اور سیر چشمی اور فیاضی کی وجہ سے علاقے میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ نے اپنی محنت اور ذہانت کے بل پر تعلیم حاصل کی اور ہر امتحان میں وظیفہ حاصل کرتے رہے۔ آپ سکول کے زمانے ہی سے تحریکِ خلافت اور اس کے زعما مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی وغیرہ سے متاثر تھے، شاعری میں بھی اور عام زندگی میں بھی۔ کھدر پوشی بھی اسی کا نتیجہ تھی۔ ایک دفعہ انگریز پرنسپل مسٹر ہیمی نے آپ کو کھدر پوشی کی حالت میں دیکھ لیا تو سخت بگڑا اور اگلے دن دفتر میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ لیکن آپ گول کر گئے اور اپنی وضع پر قایم رہے۔

شاعری کا آغاز

"نقش ارژنگ" کے تعارف نگار "فلسفی"[1] نے جناب اکبر کی شاعری کے سلسلے میں یہ عجیب واقعہ لکھا ہے کہ "مئی ۱۹۱۸ء میں جب آپ چھٹی جماعت میں تعلیم پاتے تھے، ایک روز ادائے نماز جمعہ کے بعد حساب کا ایک سوال حل کرنے بیٹھے۔ سوچتے سوچتے بےخود سے ہو گئے اور تخیل میں عالمِ بالا کی سیر کرنے لگے۔ جب ہوش میں آئے تو دیکھا کہ سوال کے حل کی بجائے کاغذ پر نو شعروں کی ایک مناجات لکھی پڑی ہے۔ ہم نے مناجات دیکھی ہے، کافی اچھی ہے۔ صرف دو تین جگہوں پر اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس وقت سے شاعری کا شوق دامنگیر ہُوا۔ نہم جماعت تک ہمیشہ مذہبی، اخلاقی اور ملکی نظمیں لکھتے رہے۔ میں بخوفِ طوالت نمونے درج نہیں کرتا۔ نہم جماعت میں حسرت

---

[1] ہادی حسین مرحوم جو ماہنامہ 'ہزار داستان' (لاہور) کے ایڈیٹر تھے۔ پھر آئی، سی، ایس ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وفاقی حکومت کے سیکرٹری رہے۔ بہت اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ سرکاری مصروفیات نے ان کی ادبی صلاحیتوں کو دبائے رکھا۔ سیّد امیر علی کی مشہور کتاب "دی سپرٹ آف اسلام" کا ترجمہ اردو میں "روحِ اسلام" کے نام سے کیا رلکے کے بعض نوحوں کا ترجمہ بھی اُردو میں کیا۔ ساجد

کی غزل جس کا مطلع ہے :؎

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ الفت پر وُہ کیونکر یاد آتے ہیں

دیکھ کر غزل کا شوق پیدا ہُوا۔ اُس وقت سے غزل ہی کہتے ہیں۔ کبھی کبھی نظم بھی لکھتے ہیں۔ جناب اکبر نے حسرت کے رنگِ تغزل کو اس کامیابی سے اپنایا کہ اہلِ زبان شاعروں اور نقادوں نے، جن میں سید سلیمان ندویؒ، مولانا تاجور نجیب آبادی، نیاز فتحپوری جیسی عظیم ادبی شخصیتیں شامل ہیں، آپ کو پنجاب کا حسرت موہانی کہا۔ سکول کے زمانۂ طالبعلمی ہی میں آپ کا کلام مختلف رسالوں میں چھپنے لگا تھا۔

شاعری میں تلمذّ

۱۹۲۵ء تک جناب اکبر نے شعر گوئی میں کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ ذوقِ سلیم ہی کو رہنما بنایا۔ ان دنوں پنجاب میں حکیم فیروز الدین طغرائی امرتسری کی استادِ فن کی حیثیت سے شہرت تھی۔ صوفی تبسّم، عابد علی عابد، محمد حسین عرشی، اظہر امرتسری وغیرہ بہت سے شعرا ان کے شاگرد تھے۔ اکبر صاحب ایک غزل اور نظم لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہُوئے۔ طغرائی صاحب افیون کے عادی تھے، اکثر پینک میں رہتے۔ بہرحال انھوں نے غزل دیکھی۔ کوئی خاص اصلاح نہیں دی آپ لاہور واپس چلے آئے۔ کچھ دن بعد طغرائی صاحب کے ایک حاضر باش شاگرد کا خط آیا کہ اگر حکیم صاحب کی شاگردی کرنا ہے تو دس روپے ماہوار ادا کرنا ہوں گے۔ یہ ادائیگی آپ کے بس کی بات نہ تھی۔ سید عابد علی مرحوم ان دنوں وکالت کرتے تھے۔ طغرائی کے شاگرد رہ چکے تھے اور لاہور کے شعرا میں خاصے نمایاں تھے۔ اکبر صاحب نے ان کی طرف رجوع کیا۔ چند غزلیں انھیں دکھائیں۔ بعد میں دوستانہ تعلقات رہے۔

علاّمہ اقبال کی مجالس میں حاضری

جناب اکبر نے گورنمنٹ کالج کے زمانہ طالب علمی کے دوران ہی میں علاّمہ اقبال کی مجالس میں حاضری دینا شروع کی اور تعلیم سے فراغت کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ آپ نے ان مجالس میں بہت فیض اٹھایا۔

انقطاعِ تعلیم

جناب اکبر نے بی اے آنرز کے امتحان میں انگریزی اور فارسی میں بہت اچھی پوزیشن حاصل کی۔ انگریزی میں ایم۔ اے کرنا چاہتے تھے لیکن فارسی میں ایم۔ اے کرنے کے لیے وظیفہ ملا۔ فائنل امتحان میں علاّمہ اقبال ممتحن تھے۔ انھوں نے عام دستور کے برعکس اکثر سوالات کے جوابات فارسی میں مانگے۔ جناب اکبر سے سہو ہُوا۔ انہوں نے

یونیورسٹی کی سابقہ پریکٹس کے مطابق انگریزی میں جوابات دئے۔ بعد میں ایک دوسرے طالب علم سے تبادلۂ خیال سے اپنی غلطی کا احساس ہُوا۔ آپ پروفیسر شیخ محمد اقبال (مرحوم)، جو اورینٹل کالج، لاہور کے شعبۂ فارسی کے صدر تھے (بعد میں پرنسپل ہو گئے)، کو ساتھ لے کر علامہؒ کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور صورتِ واقعہ بیان کی۔ علامہ آپ کو اچھی طرح جانتے تھے، لیکن پرچے کے سلسلے میں انھوں نے یہ کہہ کر کوئی بات سننے سے انکار کر دیا کہ طلباء کی فارسی دانی کا امتحان مقصود تھا نہ کہ انگریزی دانی کا۔ اس کے بعد اکبر صاحب علامہ کے قریبی دوست سر شیخ عبدالقادر مرحوم کے ہمراہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ لیکن انہوں نے سر عبدالقادر کو بھی وہی جواب دیا۔ نتیجہ یہ کہ آپ ایم۔ اے فارسی کے امتحان میں فیل قرار دئے گئے۔ اس سے آپ اس قدر بددل ہُوئے کہ دوبارہ ایم۔ اے کا امتحان نہیں دیا۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی۔ ٹی کی ڈگری حاصل کی اور درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے تاہم علامہ سے آپ کی عقیدت کسی طرح کم نہیں ہُوئی۔ علامہ کی شان میں آپ کی تین نظمیں اس پر شاہد ہیں۔ آپ اب بھی علامہ کی زندگی کے بعض واقعات بڑے حُسنِ عقیدت سے بیان کرتے ہیں۔

ذریعۂ معاش اور علمی و ادبی مشاغل

۱۹۳۰ء میں آپ انجمن حمایت اسلام کے اسلامیہ ہائی سکول، شیرانوالہ دروازہ لاہور میں استاد مقرر ہُوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور اسی عہدے سے اسلامیہ ہائی سکول، ملتان روڈ لاہور سے ۱۹۷۰ء میں ریٹائر ہُوئے۔ انجمن نے خلافِ دستور آپ کو ریٹائرمنٹ کی مقررہ عمر سے کئی سال بعد تک بھی ملازمت پر برقرار رکھا۔ انجمن کے کارپرداز آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔

طالب علمی ہی کے دوران میں شاعری کے علاوہ آپ صحافیانہ اور دوسری سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ سید حبیب مرحوم کے روزنامہ 'سیاست' میں پہلے مترجم، پھر اداریہ نویس اور پھر ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ مشاہرہ محض ساٹھ روپے۔ وہ بھی کبھی یکمشت نہ ملا۔ کبھی تین روپے مل گئے، کبھی پانچ، کبھی سات۔ جناب اکبر نے بتایا کہ اخبار کا عملہ صفحہ پری کے لیے بہت سی بے بنیاد خبریں غیر ممالک کے متعلق گھڑ گھڑ کر چھاپتا اور دُوسرے دن خود ہی تردید شائع کر دیتا۔ ایک دفعہ رُہتک کے ڈپٹی کمشنر کے خلاف کسی کا شکایتی مراسلہ شائع کر دیا۔ حکومت نے اخبار سے جواب طلبی کر لی۔ تھوڑے دن بعد ایک اور ایسا ہی واقعہ ہو گیا۔ اخبار کے مالک سید حبیب نے آپ کے علم کے بغیر اعتذار شائع کر دیا۔ اس پر آپ نے استعفا دے دیا جو بخوشی منظور کر لیا گیا۔

آپ انجمن ارائیاں، لاہور کے ترجمان اخبار 'الراعی' کے ایڈیٹر بھی رہے اور اس میں ادبی مضامین بھی لکھتے رہے۔ ساتھ ہی اپنا ذاتی رسالہ 'طور' بھی شائع کرتے رہے۔ شاعروں، ادیبوں اور نقادوں سے ملاقات اور خط و کتابت رہتی۔ آپ کے پاس برصغیر پاک و ہند کے بہت سے چوٹی کے مشاہیر شعر و ادب کے خطوط کا

بیش بہا ذخیرہ تھا جو کئی سال پہلے پنجاب پبلک لائبریری (لاہور) کے سابق لائبریرین محمد حنیف شاہد آپ سے اشاعت ے وعدہ پر لے گئے۔ اب یہ صاحب ملک سے باہر ہیں۔ پتا نہیں ان قیمتی خطوط کا کیا حشر ہُوا۔ کاش یہ شائع ہو جاتے!

اس زمانے میں لاہور میں دو ادبی گروہ پیدا ہو گئے تھے، ایک کے سربراہ تاجور نجیب آبادی مرحوم تھے۔ اس میں سید عابد علی عابد، تصدق حسین خالد، احسان دانش، اودھے سنگھ شائق، اختر شیرانی، میلا رام وفا، ستہ پرشاد خدا اور بعض دوسرے حضرات شامل تھے۔ جناب اکبر کا تعلق اسی گروہ سے تھا۔ دوسرے گروہ میں محمد دین اثیر، عبدالمجید سالک، صوفی تبسم، ہری چند اختر، حفیظ جالندھری وغیرہ شامل تھے[1] مشاعروں اور ادبی جلسوں ں باہمی نوک جھونک، تعریض و تنقیص اور ہنگامہ آرائی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن جناب اکبر فطرتاً خاموش طبع، صلح کل، مرنجاں رنج اور منکسر المزاج واقع ہُوئے ہیں۔ آپ کے خلوص، انکسار پسندی، صلح جوئی اور شریف النفسی کے سبھی معترف تھے۔ س لیے آپ کی سب سے بنتی تھی اور تعلقات خوشگوار رہے۔ روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹروں کی جوڑی (مولانا عبدالمجید سالک ور مولانا غلام رسول مہر) سے آپ کے گہرے تعلقات تھے۔ آپ اکثر 'انقلاب' کے دفتر تشریف لے جاتے اور سالک، مہر اور آپ تینوں کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتے اور شعر و شاعری کا دور چلتا۔ زیادہ تر آپ کا کلام سُنا جاتا۔ ملک صراللہ خاں عزیز (مرحوم) سے آپ کا گہرا یارانہ تھا۔ اکثر دونوں ہم طرحی غزلیں کہتے۔ جب عزیز مرحوم سہ روزہ 'مدینہ' بجنور) کے ایڈیٹر تھے تو آپ ان سے ملنے بجنور جاتے رہے۔ پھر آپ ہی کی کوشش سے عزیز روزنامہ زمیندار (لاہور) میں گئے۔ سید سلیمان ندویؒ سے بھی آپ کے قریبی روابط تھے۔ ان سے ملنے کے لیے لکھنؤ اور میرٹھ کا سفر کیا۔ سید صاحبؒ کے ت سے قیمتی خطوط آپ کے نام تھے جو اب محمد حنیف شاہد صاحب کی تحویل میں ہیں۔ آپ نے خاصی مہم جویانہ اور سیاحانہ ندگی گزاری۔ جب صحت و توانائی میسر تھی تو تعطیلات کے ایام میں سیر و سیاحت کے لیے دور دراز سفروں پر نکل جاتے۔ اعروں، ادیبوں اور روحانی بزرگوں سے ملاقاتیں کرتے۔ اس مضمون کے کئی اشعار آپ کے کلام میں موجود ہیں۔ مثلاً ؎

پھر وہی شوقِ جستجو مجھ کو لگا ابھارنے
دشت کا ذرہ ذرہ پھر مجھ کو لگا پکارنے

ور: ؎

ہے ستم خوردۂ جنوں اکبر
اس کی خانہ بدوشیاں نہ گئیں

---

[1] پطرس بخاری اور امتیاز علی تاج کی شمولیت کے ساتھ یہی حضرات 'نیاز مندانِ لاہور' کہلاتے تھے اور کبھی کبھی پنجاب کے ادبا و عرا کے خلاف یو۔ پی کے اہلِ زبان حضرات کی معترضانہ تحریروں کا جواب بھی دیا کرتے تھے۔ حضرت اکبر کے بقول یہ 'پطرس، اثیر، تاج، سالک، حفیظ کی تحسین باہمی کی انجمن تھی' اور یہ حضرات زیادہ تر اپنے حلقہ کے ارکان کی تعریف اور دفاع میں لکھا کرتے تھے۔
ساجد

اہلِ قلم میں احترام

جنابِ اکبر اپنی شاعری اور دوسری ادبی اور صحافیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے جلدی ہی کالجوں کے طلبہ کے علاوہ عام ادبی و شعری حلقوں میں معروف و مقبول ہو گئے تھے۔ اس پر آپ کی سادگی، انکسار، شرافت، رواداری اور صلح کل طبیعت سونے پر سہاگہ۔ ۱۹۴۰ء کے قریب جب تصوّف میں زیادہ انہماک ہُوا تو شعر گوئی میں دلچسپی کم ہو گئی اور عزلت گزینی بڑھتی گئی تاہم کبھی کبھار اہم ادبی انجمنوں کی دعوت یا کسی دوست کے اصرار پر چلے جاتے۔ کئی دفعہ فیض احمد فیضؔ مرحوم سے ملاقات ہُوئی۔ وہ آپ کو دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو جاتے اور جب تک آپ کو بٹھا نہ لیتے خود بھی نہ بیٹھتے۔ ایک دفعہ حلقۂ اربابِ ذوق کے ایک اجلاس میں جانے کا اتفاق ہُوا اور پچھلی صف میں بیٹھ گئے۔ 'نقوش' کے مدیر محمد طفیل مرحوم صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے آپ کو دیکھ لیا۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر آئے اور اصرار کر کے اپنے قریب لے جا کر بٹھایا۔ ۱۹۶۹ء میں جب غالب کی صد سالہ برسی منائی گئی تو پروفیسر حمید احمد خاں (مرحوم) لاہور میں یادگارِ غالب کمیٹی کے صدر اور روحِ رواں تھے۔ ممتاز حسن مرحوم بھی اس میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ وہ کراچی سے لاہور آئے تو حمید احمد خاں مرحوم اکبر صاحب کو ہمراہ لے کر ان سے ملنے ان کی قیام گاہ پہنچے۔ عند الملاقات اکبر صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ممتاز حسن سے کہا: "کیا آپ انھیں جانتے ہیں؟" ممتاز حسن آپ سے لپٹ گئے اور کہا: "انہیں کیوں نہ جانوں گا!" ان کا یہ شعر جس نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا، مجھے آج تک یاد ہے ؎

ایک آنسو میں کہہ دیا غمِ دل
کس قدر ہم نے اختصار کیا

پھر بڑے احترام سے بٹھایا اور دیر تک ادبی گفتگو رہی۔

جنابِ اکبر کا تغزّل

لغت میں غ ز ل کے تین حروف پر مشتمل دو لفظ ملتے ہیں:

غَزَل اور غَزْل۔

غیاث اللغات کے مصنف نے غَزَل (بفتحتین) کے معنی "بازی کردن بمحبوب و حکایت کردن از جوانی و حدیثِ محبّت و عشقِ زنان" درج کیے ہیں۔ یعنی محبوب سے لہو و بازی، شباب کے تذکار و حکایات اور عورتوں کے عشق و محبت کی باتیں۔ دوسرے لفظ غَزْل (زبر جزم) کے معنی "رشتن و رسیدن، بمعنی رشتہ و ریسمان و رسن آرند" لکھے ہیں یعنی کاتنا، تانا بانا، دھاگا، رسّہ وغیرہ۔ دیکھا جائے تو دونوں الفاظ کے معنی کا ایک لطیف ربط باہمی ہے۔ غزل شاعر حسن و شباب و محبت کے حرف و حکایت سے اپنے کلام کا تانا بانا تیار کرتا ہے اور اس تانے بانے کے

ڈیزائنوں، رنگوں، نوعیتوں، کیفیتوں کی کوئی حد نہیں۔ ہر شخص کے اپنے اپنے احساسات، جذبات، مشاہدات، تجربات اور واقعات ہوتے ہیں۔ بہرحال غزل کا بنیادی موضوع اپنے تمام تنوعات کے ساتھ حسن و عشق ہی ہے۔ اس کی رُوداد میں دنیا کے افسانے بھی آجاتے ہیں۔ غزل کے سانچے میں ڈھل کر ہر غم غمِ جاناں کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور سرِّ دلبراں حدیثِ دیگراں کے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے۔ غزل کی شاعری بھی معشوق طرحدار کی طرح ہزار شیوہ ہے اور ایک فارسی شاعر کے بقول: ع

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اگر آپ اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ غزل مملکت شاعری کی شہزادی ہے۔ اس کی ہزار شیوگی اور جلوہ ہائے رنگا رنگ مسلّم۔ شہزادیوں کی طرح غزل کا مزاج بھی متلون اور من موجی ہے۔ اس کے مُوڈ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ آپ اس پہ کوئی منطق عائد نہیں کرسکتے۔ شہزادیوں کی طرح جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ پھر آپ اس کے ہجے کرتے رہیں اور کسی نظام کے تحت لانے کے لیے نفسیاتی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، روحانی اندیشہ ہائے دُور و دراز سے کام لیتے رہیں۔ مختصر یہ کہ اس کا بنیادی اور امتیازی وصف اس کی داخلیت اور ایمائیت ہیں اور نقطۂ پرکار عشق اپنی تمام گُوناگونیوں اور اپنے بدلتے ہوئے تصوّرات و معیارات کے ساتھ۔ اس کی وسعت افق تا افق ہے۔ دُنیا جہان کا کوئی مضمون نہیں جس سے اس کا دامن خالی رہا ہو بعینہٖ جس طرح ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں سما جاتے ہیں۔ موجودہ صدی شعر و فکرِ اقبال کی صدی ہے۔ وہ اردو غزل کے بھی مجدّد ہیں۔ بالِ جبریل میں اقبالؒ کی اردو غزل اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ یہ غزلیں ان کے تفکّر، تفلسف، اسلامیّت، تصوف، رُوحانیت، انسان دوستی اور آفاقیت کی آئینہ دار ہیں۔ حرکت و حیات سے مملو، صحت مند اور توانا زندگی کے پیغام کی حامل۔ گوشت پوست کے بنے ہوئے کسی فردِ واحد کی بجائے ملّت اور انسانیت کا عشق اور غمِ بیکراں لیے ہُوئے۔ اقبال غزل کے غزالِ رعنا پر گھاس لادنے میں اس طرح کامیاب ہُوئے کہ وہ گھاس مُشک و زعفران میں تبدیل ہوگئی۔ یہ معجزہ رگ ساز میں صاحبِ ساز کے لہو کی روانی سے ظہور میں آیا۔ اقبالؒ کی متجددانہ غزل گوئی کے پہلو بہ پہلو روایتی غزل کے فریم ورک میں رہتے ہُوئے غزلگو شعرا کا ایک طبقہ اُبھرا جس نے روایتی غزل کی عروقِ مُردہ میں خونِ زندگی دوڑایا اور اسے نئی توانائی اور نئی معنویت بخشی۔ اس طبقہ کے نمایاں ترین شعرا حسرت موہانی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، یگانہ چنگیزی اور جگر مراد آبادی ہیں۔ ان میں رئیس المتغزلین حسرت موہانی ہیں۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی پاکیزگی، شائستگی، شرافت، صداقت، خلوص اور عشق کی حرارت کی آئینہ دار ہے۔ جناب جلال الدین اکبر ابتدا ہی سے حسرت موہانی سے متاثر ہیں اور انھوں نے غزلگوئی میں حسرت کا رنگ اپنانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ترے اشعار میں اکبر نمایاں
سراسر رنگِ حسرت دیکھتا ہوں

اس میں غالباً حسرت اور اکبر کے مشترک طبعی میلانات کو بڑا دخل ہے۔ یعنی خیالی محبوبوں کی بجائے گوشت پوست کے بنے ہوئے حقیقی انسان سے پاکیزہ محبّت، شرافتِ نفس، فکر و جذبہ و احساس کی شائستگی، خلوص، قومی و ملّی حمیّت، اسلام پسندی، اخلاقی روایات کی پابندی اور بالآخر روحانیت اور تصوف۔ اکبر کو کھدر پوشی کی تحریک بھی غالباً اسوۂ حسرت سے ہُوئی۔ حسرت نے تحریکِ خلافت کے دوران میں کانپور میں کھدر کی فروخت کے لیے بہت بڑا اسٹور کھول رکھا تھا۔

رشید احمد صدیقی مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے :

> "جو شاعر ذہن و فکر کے اعتبار سے محبوب سے قریب اور جسم و جاں کے اعتبار سے دُور سے دُور ہو، وہ اس شاعر سے بالعموم بہتر اور برتر ہو گا جس کی پوزیشن اس کے برعکس ہو۔"

حسرت اور اکبر دونوں پر یہ قول صادق آتا ہے۔ مولانا حسرت موہانی کی طرح جناب اکبر بھی تہذیب رسمِ عاشقی، وضعداری، شائستگی اور رکھ رکھاؤ کے قائل ہیں۔ 'نقشِ ارژنگ' کی اشاعت پر علامہ سید سلیمان ندویؒ مدیر معارف (اعظم گڑھ) نے آپ کو ایک خط میں لکھا کہ :

> "آپ کی غزلیں نہایت ہموار، نہایت شیریں ہیں۔ فارسی ترکیبوں کا اعتدال، ابتذال سے پرہیز، اظہارِ جذبات میں احتیاط اور بلندی، الفاظ میں سادگی آپ کو پنجاب کا حسرت موہانی کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی بحروں میں آپ کی غزلیں حسرت کا نقشِ ثانی معلوم ہوتی ہیں۔ میں آپ کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ کبھی کبھی 'معارف' کو بھی یاد رکھیے گا۔"

مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم نے آپ کو "حسرت کا مثنیٰ" کہا۔ متعدد دُوسرے مشاہیرِ ادب مثلاً نیاز فتحپوری، برجموہن کیفی، جوش ملیح آبادی، خواجہ حسن نظامی وغیرہ نے بھی آپ کے کلام کی رنگینی و شیرینی، مضمون آفرینی، اسلوب کی دلآویزی، سلاست، نفاست، ارتفاعِ جذبات اور اثر انگیزی کی تعریف کی۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے ستمبر ۱۹۲۶ء کے سہ ماہی 'اردو' میں اور سید سلیمان ندویؒ نے 'معارف' میں بہت عمدہ، حوصلہ افزا اور خاصے طویل تبصرے کیے۔ 'الناظر' (لکھنؤ) اور بعض دوسرے مؤقر رسائل نے بھی تحسین و تعریف کی۔

'نقشِ ارژنگ' کی اشاعت کے ساتھ جناب اکبر پنجاب میں آج سے ساٹھ سال قبل کی اردو غزلگوئی کے اُفق پر ایک نیا روشن ستارہ بن کر نمودار ہوئے۔ پنجاب کے اس وقت کے غزلگو شعرا میں کوئی ایسا شاعر دکھائی نہیں دیتا جسے زبان و بیان کی وہ سلاست، لطافت، فصاحت، عذوبت، ندرت، رنگینی، پاکیزگی اور نغمگی نصیب ہوئی ہو جو جنابِ اکبر کے حصّے میں آئی۔ ان کی غزل کو دیکھ کر کوئی بڑے سے بڑا اہلِ زبان شاعر یا نقاد بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی غیر اہلِ زبان کا کلام ہے۔ جادو بیاں داغ مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

تم نے جادوگر اسے کیوں کہہ دیا؟
دہلوی ہے داغ بنگالی نہیں

اکبر نے کہا : ؎

اس کے اندازِ بیاں سے ہے عیاں
دہلوی اکبر ہے پنجابی نہیں

یہ حقیقت ہے کہ ان کی شعری زبان اور اندازِ بیان میں 'پنجابیت' نام کو بھی نہیں ملتی (شاید پنجاب کے جدید شعراء ادبا اُسے ایک عیب قرار دیں) کہیں کہیں خوب صورت فارسی تراکیب کا برجستہ استعمال انھیں غالب اور اقبال کی اسلوبی روایت کے قریب کر دیتا ہے۔ ان کا اسلوب پختہ اور سہل ممتنع انداز لیے ہُوئے ہے۔ جوانی کا کلام بھی پاکیزگی اور شائستگی کا حامل ہے۔ جنسیت زدگی، فحش گوئی اور لذت پرستی سے پاک ہے۔ بقول اسد ملتانی مرحوم ؎

پسندِ خاطرِ اہلِ صفا ہے میری غزل
کہ اس میں کوئی ہوا و ہوس کی بات نہیں

اگرچہ اس میں حسن و شباب اور رومانیت کا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ جناب اکبر نے اپنی عہدِ جوانی کی حُسن پرستی کا برملا اعتراف کیا ہے : ؎

وہ جنّت نگاہ ہے پیشِ نظر مدام
اکبر مری تو حسن پرستی ہے زندگی

لیکن یہ حسن پرستی ہوس پرستی نہیں۔ جوانی میں غموم و ہموم کے باوجود انسان زندگی کی لذّتوں سے سینہ بھر لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اکبر کہتے ہیں : ؎

مری رگ رگ میں لطفِ زندگی کی موج رقصاں ہے
طبیعت بادۂ غم سے جواں معلوم ہوتی ہے

جناب اکبر کے ہاں حسرت کی غزلیہ روایت کا تسلسل ملتا ہے۔ زبان و بیان کی پاکیزگی و صفائی، تہذیبی و اخلاقی اقدار کی نگہداری، کمال دلسوزی[1] کے باوجود کھل کر نہ مل سکنے کی حزنیہ کیفیت۔ غم عشق انہیں عزیز ہے کہ یہ انہیں ایک احساسِ نشاط بخشتا ہے ؎

عشق میں مغموم رہنا ہے خوشی میرے لیے   باعثِ تسکیں ہے دل کی بیکسی میرے لیے

نیز : ؎

کھل کے ہم سے کبھی وہ مل نہ سکے
باوجود کمال دلسوزی   (حسرت)

تیرا کرم عزیز تیرا غم عزیز تر
یہ جانِ آرزو ہے وہ جانانِ آرزو

جناب اکبر کی شاعری قلبی واردات واحساسات، تہذیب جذبات اور جذبہ و فن کے خلوص اور سچائی کی شاعری ہے۔ غالب نے کہا تھا: ؎

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

دل گداختہ کے بغیر شاعری، خاص کر محبت کی شاعری ممکن نہیں جیسے حضور قلب کے بغیر مقبول بارگاہ ایزدی نماز ممکن نہیں۔ اکبر کے نزدیک عشق خود ایک دردِ لا دوا ہے لیکن دردِ انسانیت کا علاج بھی ہے اس لیے متاع عزیز ؎

اس دردِ لا دوا میں ہے انسانیت کا راز
کیونکر کہوں کہ عشق غنیمت نہیں مجھے

اس لیے محبوب کے جور و ستم کا ذکر محض رسمی ہے کیونکہ عاشق کو محبوب سے کوئی شکایت ہو ہی نہیں سکتی ؎

کرتا ہُوں میں بیان ستم بر سبیلِ ذکر
ہر چند ان سے کوئی شکایت نہیں مجھے

اس کے برعکس متضاد المعنی ایک دُوسرا خوب صورت شعر ملاحظہ ہو۔ اندازِ بیان کی دلکشی و رنگینی اور نفسیاتی کیفیت داد سے مستغنی ہیں، عشق است و ہزار بدگمانی ؎

ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے
اللہ! مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے

جناب اکبر جب محبت کی نازک حسیات کا بیان کرتے ہیں تو ندرت تخئیل کے ساتھ لہجے کا انوکھا پن، ایمائی اور استعجابی انداز قاری کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے ؎

ہو گیا حسن شرمسار جفا   عشق نادم ہوا گلہ کر کے
آئے تسکین اضطراب کو وُہ   اور بھی کچھ چلے سوا کر کے

ظلم بھی ان کے لطف ٹھہرائے   دل کی نازک خیالیاں نہ گئیں

تجھ کو اللہ نے بخشا ہے یہ کیا حسنِ کلام   تیرے انکار میں اقرار نظر آتا ہے

غالب کی زمین میں چند اور اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

اب انتہاے شوق نے بیخود بنا دیا   اب امتیازِ خلوت و جلوت نہیں مجھے
کچھ بات تھی کہ ان سے محبت ہوئی مجھے   کچھ بات ہے کہ ان سے محبت نہیں مجھے
آتا نہیں ہے چین بھی ان کے سوا کبھی   کہتا ہوں یہ بھی آپ سے الفت نہیں مجھے

عذاب محبت لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ کا بیان ؎

ان کے بغیر سخت پریشان تھی زندگی
وہ آ گئے تو اور پریشان ہو گئی

محبوب سے محبّت کے باوجود اکبرؔ اس کی ناروا تمکنت پر اپنی خودداری بلکہ خودداریوں کو قربان کرنے پر تیار نہیں، حتیٰ کہ لبِ شکایت بھی وا نہیں کرتے ؎

تمکین ناروا میں وہ پرسش نہ کر سکے
خودداریوں میں ہم سے شکایت نہ ہو سکی

محبت میں خودداری سے متعلق ایک اور شعر: ؎

جب حد سے بڑھ چکی ہوں تری بے نیازیاں
کیوں اپنی احتیاج کو رسوا کرے کوئی

جناب اکبرؔ اپنی فطری خودداری اور قناعت کی وجہ سے کسی کا احسان اٹھانے کا دماغ نہیں رکھتے کیونکہ اس سے خودی ضعیف ہوتی ہے۔ دوسروں کو بھی یہی مشورہ دیتے ہیں ؎

سر زیرِ بارِ منّت اہلِ جہاں نہیں   صد شکر ہے کہ مجھ پہ کوئی مہرباں نہیں

جینا اگر نہ آئے تجھے تو خوشی سے مر   مرہونِ منّت دمِ عیسیٰ مگر نہ ہو

قناعت دل سراپا ہے مرا گنج غنا اے اکبرؔ   میں سمجھتا ہی نہیں ہوتی ہے عسرت کیسی

نقشِ ارژنگ کے بعد

اگلے دس بارہ سال میں جناب اکبرؔ کی غزل پختگی کی منزل کو پہنچ گئی جس میں حسرتؔ کے رنگ سے انحراف بھ نظر آتا ہے اور کہیں کہیں مومنؔ کا رنگ بھی۔ عشق و محبت کی چاشنی کے ساتھ متانت، گھلاوٹ، سوز و گداز، اظہا ذات، کیف و سرمستی اور تصوّف کی بین السطوری کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ آج کل کے فیشن کے مطابق اکبر کی غزل میں کسی مخصوص نظامِ فکر کی تلاش شاید کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے ہاں 'بڑا تجربہ' اسلامی تصوف ہے

جس کا ذکر آگے آئے گا۔ جناب زکی زاکانی نے خوب کہا ہے کہ ؎

میں اپنے فکر کی شیرازہ بندی کا نہیں قائل
کہ اُڑتے بادلوں سے خود بخود بنتی ہیں تصویریں

"نقشِ ارژنگ" کے فوراً بعد کی ایک غزل کے چند اشعار دیکھئے ؎

سوز و گداز عشق کے قابل بنا دیا   جس دل کو تُو نے دیکھ لیا دل بنا دیا
اس کی نگاہِ لطف کی کیفیتیں نہ پُوچھ   انجام عشق سے مجھے غافل بنا دیا
اس جانِ انجمن کے تصور کی رونقیں   خلوت کو میری رونقِ محفل بنا دیا
یارانِ کور ذوق کی خوش اعتقادیاں   مہرِ کج روش کو رہبرِ منزل بنا دیا

(بد قسمتی سے آزادی کے بعد یہ سانحہ ہمارے ہاں بار بار پیش آ رہا ہے)

محبت میں ایک ایسی بھی منزل آتی ہے کہ عاشق ہجر و وصال سے بے نیاز ہو جاتا ہے ؎

بے نیاز وصال و فرقت ہُوں
دور جا پہنچا ہُوں محبت میں

بیخودیٔ محبت ؎

اللہ اللہ یہ بیخودی میری
پاس ہے اور کوئی پاس نہیں

محبوب کے ناز و انداز کی ہر لحظہ نئی شان ہے۔ تجلی کو اعادہ نہیں ؎

میں ہُوں اس نازِ مجسّم کی اداؤں کا شہید
کہ جو اک بار ہُوا ناز دوبارا نہ ہُوا[1]

غالب کی زمین میں ایک سہل ممتنع غزل کے چند اشعار ؎

جہاں میں اور ہے تیرے سوا کیا
میں تجھ کو دیکھ کر پھر دیکھتا کیا

(فیض مرحوم نے بہت بعد میں کہا : ع
تیری آنکھوں کے سوا دہر میں رکھا کیا ہے!)

؎ پسند شوق ہے ہر ناز جاناں   محبت میں وفا کیا ہے جفا کیا

---

[1] کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِی شَاۡنٍ (سورۂ رحمٰن آیہ ۲۹)

میں تاثیرِ وفا کو رو رہا ہوں   ترے تمکین بے حد کا گِلہ کیا !
پلٹنا ہی پڑے گا سُوئے کعبہ   نہیں ہوگا درِ میخانہ وا کیا !

محبوب کی نگاہِ تغافل کا گلہ بھی ہے اور اس کی نگاہِ ہوشربا کی تاب بھی نہیں ؎

اس امتیازِ رمزِ تغافل کے میں نثار   ہر اک کو دیکھتے ہیں اِدھر دیکھتے نہیں
تابِ نگاہِ ہوشربا بھی نہیں مجھے   ان سے گلہ بھی ہے کہ اِدھر دیکھتے نہیں

عشق نبرد پیشہ راضی برضا ہونے کا متقاضی ہے ؎

غم جو بھی ملے عشق میں سہنا ہی پڑے گا   راضی برضا عشق میں رہنا ہی پڑے گا
اے دل غمِ الفت کے جو انداز یہی ہیں   خوں ہو کے تجھے آنکھ سے بہنا ہی پڑے گا

یہ اور ایسے متعدد اشعار جو الجاقی اور ضرب المثلی کیفیت کے حامل ہیں۔

جلوۂ حُسنِ یار سے قلبِ عاشق میں جذبات کا جو مدّ و جزر پیدا ہوتا ہے، اس کی خوبصورت تصویر کشی ؎

یہ عالم ہے ترے جلووں سے قلبِ ناشکیبا کا
تلاطم جس طرح دریا میں ہو امواجِ دریا کا

اکبر کے ہاں محبت کے اظہار میں دھیما پن، نرمی اور شائستگی ہے۔ آج کل کا 'دھواں دھار' انداز نہیں ؎

اضطرابِ وفا کا حال نہ پُوچھ   دل دھڑکنے کی سُن ذرا آواز

ضبطِ الفت کی تاب ہے مجھ میں   بدگماں تو اگر نہ ہو جائے

اس زباں آوری پہ اس کے حضور   بات کہنے کا ڈھب نہیں آتا

ایک سادہ و پرکار، سلاست و نفاست بکنار غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو ایک مشاعرے میں پڑھی گئی اور زباں زدِ عام ہو گئی ؎

ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے   اللہ مجھ کو کتنی محبّت ہے آپ سے
دل میں ہیں آپ، آپ میں لاکھوں تجلّیاں   دل کیا ہے ایک حسن کی جنّت ہے آپ سے
کیا آپ جانتے ہیں مجھے تو خبر نہیں   کہتے ہیں لوگ مجھ کو محبّت ہے آپ سے
اس دل کی آرزوئے محبت کو کیا کہوں   جس دل میں آرزوئے محبّت ہے آپ سے

ایک طرحی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ مطالب کی جدّت و رنگینی اور اسلوب کی سلاست و شیرینی کے لحاظ سے یہ اپنے عہد کی ایک نمایندہ غزل ہے ؎

وہ جائیں تو در و دیوار سے تاریکیاں برسیں   وہ آئیں تو سراپا نور یہ کاشانہ ہو جائے
مری اک آرزو ہے اور ایسی آرزو یارب!   مجھے ڈر ہے کہیں دنیا تہ و بالا نہ ہو جائے
تمہاری جلوہ گاہ ناز کی تابانیاں توبہ!   یہ وہ محفل ہے جس میں شمع بھی پروانہ ہو جائے
محبت کو سمیٹوں میں تو آنسو میں سما جائے   جو پھیلانے پہ آؤں مستقل افسانہ ہو جائے
دل دیوانہ اے کاش اس قدر دیوانہ ہو جائے   جہاں ویرانہ ہو کر خلوت جانانہ ہو جائے
بحسب ذوق ہیں اس حسن کے جلوے کی تاثیریں   کوئی دیوانہ ہو جائے کوئی فرزانہ ہو جائے
انہیں اپنے ادا و ناز سے مطلب ہے اے اکبرؔ!   بلا سے کوئی ہو جائے اگر دیوانہ ہو جائے

رنگِ مومنؔ

مومن خاں مومنؔ کے رنگ کے چند خوب صورت اشعار :ـ

شبِ غم کی سحر نہ ہو جائے   زندگی مختصر نہ ہو جائے
جوشش سجدہ میں سر کہیں میرا   آپ کا سنگ در نہ ہو جائے
حسن کی بد گمانیاں توبہ   عاشقی معتبر نہ ہو جائے

خلوصِ عشق کو شکوے بہت ہیں   تمہارے التفات بدگماں سے
مرا پھر امتحاں مدِ نظر ہے   کہ رہتے ہیں وہ اکثر بدگماں سے
ہوائے شوق اڑائے جا رہی ہے   بڑھا جاتا ہوں آگے کارواں سے
تمہاری ہمدمی کا ایک لمحہ   کہیں بڑھ کر ہے عمرِ جاوداں سے

محفلِ ناز میں ہے حشر بداماں کوئی   آج ثابت نہیں رہنے کا گریباں کوئی
بدگماں مجھ سے ہیں بے وجہ بتانِ کافر   کوئی کہہ دو مرا ایمان نہیں ایماں کوئی
دل میں جو دردِ محبت کی کسک باقی ہے   رہ گیا مگر اس شوخ کا پیکاں کوئی
جس میں پیوند نہ ہوں عشقِ بتاں کے اے شیخ!   مجھ کو ایسا نظر آتا نہیں ایماں کوئی

اب راقم الحروف یہاں ایک ایسی غزل درج کرتا ہے جو جنابِ اکبرؔ کے کلام میں اپنی مثال آپ ہے جو مسلسل موڈ کی ہے اور حسرتؔ کے رنگِ تغزل کی حدود کو پھاند کر میرؔ کی سادگی اور درد و حرماں کے کوچے میں داخل ہوتی معلوم ہوتی ہے :ـ

خاموش ہیں لب اور آنکھوں سے آنسو ہیں کہ پیہم بہتے ہیں
ہم سامنے ان کے بیٹھے ہیں اور قصۂ فرقت کہتے ہیں

اب حُسن و عشق میں فرق نہیں، اب دونوں کی اک حالت ہے
میں ان کو دیکھتا رہتا ہُوں وہ مجھ کو دیکھتے رہتے ہیں
اس شوقِ فراواں کی یا رب! آخر کوئی حد بھی ہے کہ نہیں
انکار کریں وہ یا وعدہ، ہم راستہ دیکھتے رہتے ہیں
ہمدرد نہیں، ہمراز نہیں، کس سے کہئے، کیونکر کہئے
جو دل پہ گزرتی رہتی ہے، جو جان پہ صدمے سہتے ہیں
اکبر شاید دل کھو بیٹھے، وہ جلسے وہ احباب نہیں
تنہا خاموش سے پھرتے ہیں، ہر وقت اداس سے رہتے ہیں

اسلامی/صوفیانہ شاعری

جنابِ اکبر کی حسن و شباب و محبّت کی شاعری اپنے عروج پر تھی کہ انہیں تصوّف ہو گیا ؎

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

یہ حادثہ ۳۳ ۔ ۳۴ سال کی عمر (۱۹۳۸ء) ہی میں پیش آیا اور شاعری میں "شالا جوانیاں مانیں" والی کیفیت باقی نہ رہی۔ فرمایا: ؎

گئے وہ دن کہ ان کی جستجو تھی
اب اپنی جستجو ہے اور میں ہوں

آپ کو ایک صاحبِ دل بزرگ حضرت حاجی حافظ ابوالرضا حاکم علی (رحمۃ اللہ علیہ) سے ارادت پیدا ہوگئی، جس سے آپ کی زندگی اور شاعری دونوں میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ غزل پر رنگینی و مستی اور حسن پرستی کی بجائے متانت، پاکیزگی اور معرفت کا رنگ غالب آگیا۔ روحانیت کے جذب و کیف سے سرشار ہو کر انہوں نے جو کچھ کہا وہ عارفانہ شاعری میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے انقلابِ طبیعت کا اعلان اس شعر میں کیا ؎

اکبر کہ جس کے عشق و محبت کی دھوم تھی
سنتے ہیں آج عابدِ شب زندہ دار ہے

مزید فرمایا: ؎

میں گنہگار اور تیری یاد![1]
انقلاب! انقلاب زندہ باد!

---

[1] یہ دلچسپ بات ہے کہ اگر لفظ 'اکبر' کو الٹ دیں تو 'ربکا' ہوجاتا ہے یعنی اللہ والا۔ ساجد

جناب اکبر اسلامی روحانی نظامِ فکر، توحیدِ خالص، اطاعتِ خدا و رسولؐ، تزکیۂ باطن، اخلاقِ عالیہ، توکل علی اللہ، صبر و رضا وغیرہ کے شاعر ہو گئے۔ لب و لہجہ میں خود اعتمادی اور روحانی رہنمائی کا انداز پیدا ہو گیا۔ فرماتے ہیں: ؎

زندگانی جسے نہ راس آئے   آئے آئے وہ بے ہراس آئے
جانتا ہوں میں زہرِ غم کا علاج   جسے جینا ہو میرے پاس آئے

جناب اکبر فنِ تصوف کی تکنیکوں اور باریکیوں میں نہیں اُلجھے، نہ وحدت الوجود اور عجمی رہبانیت کے چکّر میں پڑے۔ ان کے لیے تصوف تزکیۂ نفس کا نام ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بے مقصد اور بے خدا شاعری عبث ہے ؎

سخن اگر نہیں ارشاد کا ترے حامل
تمام قافیہ سنجی ہے بادپیمائی

تصوّف کی دنیا میں پہنچ کر انہوں نے اپنی گزشتہ زندگی کا جائزہ لیا اور محاسبۂ نفس شروع کیا۔ فرمایا: ؎

اتنے دھبّے پڑے ہیں دامن پر
کوئی دھبّہ نظر نہیں آتا

مادیّت پرستی سے دامن چھڑا کر رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تھام لیا: ؎

شاہوں کی بارگاہیں اوروں کو ہوں مبارک
میں بندۂ حقیر عشقِ محمدی ہُوں

مندرجہ ذیل عارفانہ غزل میں سالک کے بعض انتہائی نازک احساسات، روحانی تجربات اور احوال و مقامات کو بڑی حُسن کاری سے بیان کیا ہے ؎

مرے سامنے ہیں وہ جلوہ گر مری بیخودی کا کمال ہے
یہ وصال ہے کہ فراق ہے یہ فراق ہے کہ وصال ہے
ترے ذکر و فکر کے فیض سے مرے دل کا اب تو یہ حال ہے
ترا ذکر مجھ کو وبال ہے ترا فکر مجھ کو محال ہے
مرا لاکھ حال خراب ہو، میں تری رضا کا غلام ہوں
مجھے اپنا حال عزیز ہے مرا حال تیرا خیال ہے
میں ہُوں در پہ اس کے پڑا ہوا مجھے اور چاہیے کیا بھلا
مجھے بے پری کا ہو کیوں گلہ؟ مری بے پری پہ وبال ہے

قرآن مجید میں اللہ کا بندوں سے ارشاد ہے:

فاذکرونی اذکرکم (تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا)

جناب اکبر نے اس عظیم ارشاد کو ایک خوب صورت شعر میں ڈھال دیا ہے : ؎

اب اس سے بڑھ کر اوجِ طالعِ عشاق کیا ہوگا
کہ جب ہم یاد کرتے ہیں تو وہ بھی یاد کرتے ہیں

۔جناب اکبر جب 'رب کا' ہو رہے تھے تو فرمایا : ؎

اللہ کی ہے مجھ کو طلب
اللہ جس کا اس کے سب
یاد میں اس کی گریۂ شب
میرے لیے ہے وجہِ طرب
غیروں کا محتاج نہ رکھ
اے مرے مولا اے مرے رب!
میرے لیے مشعلِ راہ
اُسوۂ روشن ماہِ عرب
آنسو اُمڈے آتے ہیں
اور نہیں ہے کوئی سبب

یہ اشعار پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی سالک شب کی تاریکی میں ذکرِ جہر میں مصروف ہو۔ ایک دوسری غزل کے ایک شعر میں انہوں نے اپنا منشورِ حیات بیان کر دیا ہے ؎

میرا پیمانہ ذکر و سوز و گداز
میرا میخانہ مسجد و محراب

ارشادِ خداوندی ہے :

الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب (اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے)

جناب اکبر نے اسے شعر کی صورت دے دی ؎

جب سے کہ تیرا ذکر ہُوا ہے انیسِ دل
کوئی بھی اضطراب کی صورت نہیں رہی

جناب اکبر قیامِ پاکستان سے پہلے ایک دفعہ دہلی گئے اور حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مزار پر حاضری دی۔ باہر نکلے تو ذیل کی غزل بے اختیار زبان پر جاری ہوگئی۔ تعلق باللہ، یادِ خدا اور لاشریک لہ کے حوالے سے کیا نادر اشعار ہیں

موحدانہ غزل : ؎

یہ بھول بھی کیا بھول ہے یہ یاد بھی کیا یاد
تو یاد ہے اور کوئی نہیں تیرے سوا یاد
وابستہ تری یاد سے تسکینِ دروں ہے
مجھ کو تو ہے لے دے کے یہی ایک دوا یاد
درس ایسا دیا پیرِ طریقت نے رضا کا
مطلب ہے کوئی یاد نہ مطلب کی دعا یاد
اس حسنِ تعلق کا ادا شکر ہو کیونکر
میں نے جو کیا یاد تو اس نے بھی کیا یاد

کیا خُوب ہے یہ بیخودیٔ شوق کا عالم   اب کوئی عطا یاد ہے تیری نہ بلا یاد
اللہ! تیری رحمتِ کامل کا کرشمہ!   خود مجھ کو نہیں آج کوئی اپنی خطا یاد
اب عشق ہے اور حسنِ رخِ دوست کی مستی   دوزخ کی سزا یاد نہ جنت کی جزا یاد
حقا کہ تری یاد بھی ہے شرک سے بالا   آیا ہے جو تو یاد تو پھر کچھ نہ رہا یاد
اس مردِ خدا مست کی کیا بات ہے اکبرؔ!   جس کو نہ رہا کچھ بھی بجز یادِ خدا یاد

جناب اکبرؔ رجائیت، قناعت، اطمینانِ قلب کی دولت اور اُسوۂ رسولؐ کی پابندی سے بہرہ ور ہیں۔ ذیل کی غزل سے غم و آلام جہاں کے مقابلے میں صبر و رضا، ذکرِ الٰہی میں مشغولیت، دولتِ دنیا سے بے نیازی اور روحانی سرشاری ابلی پڑتی ہیں۔ جذب و جوش و کیف و مستی کا عجیب عالم اس غزل میں دکھائی دیتا ہے۔ جوشِ بیان، روانی اور دوسرے ادبی محاسن اپنی جگہ۔ یہ غزل اس لائق ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے ؎

کیا غم اگر ہجومِ بلا میرے ساتھ ہے   مونس ہے میرا صبر، رضا میرے ساتھ ہے
تقلیدِ کفر میرے لیے وجہِ عار ہے   جب اُسوۂ رسولؐ خدا میرے ساتھ ہے
ایماں کو میرے کوئی نہیں خطرۂ زوال   جب تیرا خوف اور رجا میرے ساتھ ہے
دنیا کی منزلوں میں نہیں خوفِ گمرہی   جب تیرا شوق راہنما میرے ساتھ ہے
یہ دم کا کارواں ہے تری یاد میں رواں   دل کیا ہے ایک بانگِ درا میرے ساتھ ہے
اک تیرا ذکر روح میں ساری ہے روز و شب   اک تیری یاد صبح و مسا میرے ساتھ ہے
اب گوشِ دل ہے اور محبت کے زمزمے   یہ کون ہے جو نغمہ سرا میرے ساتھ ہے
صف بستہ ہیں نعیمِ دو عالم مرے لیے   دستِ دعا و ذوقِ دعا میرے ساتھ ہے
میرے عمل ہیں دوزخ و جنت مرے لیے   حقا مری جزا و سزا میرے ساتھ ہے
اوروں کے پاس دولتِ دُنیا کے ڈھیر ہیں   اور تیرا درد روح فزا میرے ساتھ ہے
صبر و صلوٰۃ و ذکر سے ہے واسطہ مجھے   وُہ ذات جو ہے سب سے جُدا میرے ساتھ ہے
اکبرؔ بتوں کے لطف سے محروم ہوں اگر   کچھ غم نہیں کہ میرا خدا میرے ساتھ ہے

تصوف تزکیۂ نفس کے ساتھ انسان دوستی کی تعلیم دیتا ہے۔ اکبر فرماتے ہیں: ؎

جن کے دل میں نہیں انسان کا درد اے اکبر
حق تو یہ ہے کہ وہ ظالم کبھی انسان نہ ہوئے

انہیں سارے انسان برابر نظر آتے ہیں ع

میری نظر میں ہر کوئی یوسف جمال ہے

حقیقت اور مجاز کے سنگم پر واقع دو خوب صورت موحدانہ شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

ذکر تیرا جہاں نہیں ہوتا   ہوں بھی تو میں وہاں نہیں ہوتا
ہم کو اس آستاں سے کیا مطلب   جو ترا آستاں نہیں ہوتا

غالب و اقبال کی زمین میں ایک سادہ و پرکار اہتزاز آفریں عاشقانہ و صوفیانہ غزل کے چند اشعار ؎

دنیا کا غم نہ خواہشِ عقبیٰ کرے کوئی   میری طرح جو تیری تمنا کرے کوئی
جب اُن کو دیکھنے کی تمنا کرے کوئی   پہلے خود اپنے آپ کو دیکھا کرے کوئی

(حلوہ خوردن را روئے باید!)

ہر ایک آن تازہ تجلی ہے رُوبرو   میری نگاہ سے تجھے دیکھا کرے کوئی
ان کو تو اپنی جلوہ نمائی سے کام ہے   دیکھا کرے کوئی کہ نہ دیکھا کرے کوئی
سرمایۂ نشاط دو عالم ہے دردِ عشق   اچھا کرے کوئی جو نہ اچھا کرے کوئی

ایک سچے توحید پرست مسلمان کی حیثیت سے جناب اکبر کا ایمان ہے کہ بالآخر فتح حق ہی کی ہوتی ہے، باطل اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا ؎

عشق مغلوب ہوس ہو کبھی ممکن ہی نہیں
سامنے حق کے نہ ٹھہرا ہے نہ باطل ٹھہرے

"جدید شعرائے اردو" کے مصنف ڈاکٹر عبدالوحید رقم طراز ہیں:

> "ان (حضرت اکبر) کے تغزل میں ایک سادگی، ایک دھیما پن اور ایک مخصوص رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے اکبر صاحب کے جذبات عام طور پر بلند ہیں لیکن ساتھ ہی وُہ چونکہ بڑے سلیقہ اور احتیاط کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں اس لیے ان میں بڑی کشش ہے۔ غزل میں 'یُوں بھی کیا کہا ہے' کے مقابلے میں 'کیونکر کہا ہے' کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ یہ ایسا جادُو ہے جو پیش پا افتادہ خیالات میں بھی ایک نئی رُوح پھونک دیتا ہے۔ اکبر صاحب اس 'کیونکر کہا ہے' کے گر سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ ان کی اکثر غزلیات اپنے سادہ مگر حسین اسلوب اور زبان کی بے پناہ لطافت اور روانی کے محاسن سے آراستہ ہیں۔"[1]

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

"جہاں تک زبان کا تعلق ہے یقیناً حضرت اکبر قابلِ مبارکباد ہیں۔ ان کی زبان ایسی صاف، سادہ او

---

[1] تذکرہ جدید شعرائے اردو صفحہ ۹۴۱

شستہ ہے کہ پڑھنے والا ان کی دلّی اور لکھنؤ کی زبان میں کوئی خاص امتیاز نہیں پیدا کر سکتا پھر وہ جذبات کے بیان میں ایسے برمحل و پُر تاثیر الفاظ سے کام لیتے ہیں کہ کلام میں درد و لطافت کی ایک عام کسک محسوس ہوتی ہے۔"[1]

مصنف نے اپنی رائے اور تبصرہ کو جناب اکبر کی قبل تصوف کی شاعری تک محدود رکھا ہے۔ بعد کی شاعری میں جو متانت، سنجیدگی، پاکیزگی، سوز و گداز، روحانی تب و تاب، اسلامی اقدار اور انسان دوستی ابھری اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہاں راقم الحروف جناب اکبر کی دو غزلیں جو غالباً ۱۹۵۷ ـ ۵۸ء میں لکھی گئیں اور ان کے آخری دور کے اسلوب کی نمایندہ ہیں درج کرتا ہے:

غزل نمبر ۱ :

مہرباں وہ نہ ہوئے اور کسی عنواں نہ ہوئے
عقدۂ شوق کہ مشکل نہ تھے آساں نہ ہوئے
وہ بھی عالم ہیں نگاہوں میں، نہیں جو موجود
وہ بھی جلوے ہیں نظر میں جو نمایاں نہ ہوئے
سر سے جاتا ہی نہیں عشقِ بُتاں کا سودا
ہم تو آزاد بھی ہونے پہ مسلماں نہ ہُوئے
ہم نے تائیدِ الٰہی پہ بھروسہ رکھا
اور کبھی کثرتِ اعدا سے ہراساں نہ ہُوئے
یہ الگ بات ہے برہم ہے مزاجِ گلچیں
میرے نغمے کبھی آشوبِ گلستاں نہ ہُوئے
بے ہُنر بن کے رہے ان کی نگاہوں میں سدا
ہم کبھی باعثِ آزارِ حریفاں نہ ہُوئے

غزل نمبر ۲ :

کبھی جو ترکِ وفا کا ارادہ ہوتا ہے
جنونِ عشق و محبت زیادہ ہوتا ہے
نصیب ہوتی ہے تشنہ لبی کی دولت بھی
مقدروں میں اگر ذوقِ بادہ ہوتا ہے
کسی کا نام مرے لوحِ دل کی زینت ہے
اس سے شام و سحر استفادہ ہوتا ہے
اسی کے واسطے ہے یاں متاعِ عشقِ غیور
جو خوش نصیب کہ یکرنگ و سادہ ہوتا ہے
جہاں بھی اٹھتے ہیں حرص و ہوس کے ہنگامے
وہاں ضرور کوئی شاہزادہ ہوتا ہے
وہی ہے قوم کا رہبر وہی ہے ہادیِ دیں
فریب و مکر کا جس پر لبادہ ہوتا ہے
یہ تجربہ ہے کہ دستِ طلب ہو جتنا دراز
تو اتنا دستِ کرم بھی کشادہ ہوتا ہے

عہدِ شباب کی عشق و مستی میں ڈوبی ہُوئی غزلگوئی اور عہدِ شیب کی پختہ فکری کی غزلگوئی کے متعلق یہاں جگر مراد آبادی مرحوم کا ایک شعر یاد آ گیا ؎

---

[1] تذکرہ جدید شعرائے اردو صفحہ ۹۴۲

شباب میں اسے گر غزل تو حقیقتاً ہی غزل تھی لیکن
غزل میں یہ وسعتیں کہاں تھیں شعورِ فکر و نظر سے پہلے

چند مزید اشعار:

موت و حیات: ؎

موت سے اس قدر جو ڈرنا ہے   یہ تو جینا نہیں ہے، مرنا ہے
کہہ رہا ہے ہر ایک نقشِ حیات   کہ مجھے مٹ کے پھر ابھرنا ہے
کہہ رہی ہے کشودِ غنچۂ گل   یہ بگڑنا نہیں سنورنا ہے

حُسن دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے: ؎

یہ کائنات یہ بزمِ ظہور کچھ بھی نہیں   تری نظر میں نہیں ہے جو نور کچھ بھی نہیں
نگہ اگر ہو تو ہر ذرہ میں ہزاروں طُور   نگہ اگر نہ ہو، بالائے طُور کچھ بھی نہیں

غیب و حضور: ؎

یہ نکتہ مجھ پہ کھلا ہے فتوحِ غیبی سے
جو آنکھ وا ہو تو غیب و حضور کچھ بھی نہیں

پیغامِ دوست دل زندہ کے لیے: ؎

دلِ مُردہ پہ ہیں مسدود سب راہیں محبّت کی
جو دل زندہ ہو ہر دم دوست کا پیغام آتا ہے

ماورائے غزل

جناب اکبر نے غزل کے علاوہ نعت، نظم اور رباعی؎ بھی کہی ہے لیکن یہ اصنافِ سخن ہمارے موضوع سے خارج ہیں اور ویسے بھی درحقیقت وہ غزل کے شاعر ہیں۔ نعت میں ان کا اپنا رنگ ہے۔ چند نعتیہ اشعار تبرکاً درج کیے جاتے ہیں: ؎

وہ ہر اک مرحلۂ فکر و نظر سے گزرے   ہوش جس کو ہو وہ اس بحثِ بشر سے گزرے
یہی مخصوص ہے اب منزلِ جاناں کے لیے   جس کو جانا ہو اسی راہگزر سے گزرے

؎ آپ کی رباعیات کا مجموعہ آپ کے عزیز دوست میاں محمد شفیع (مرحوم، سابق ڈپٹی کمشنر، لاہور) اشاعت کے لیے لے گئے تھے لیکن ان کی اچانک وفات ہوگئی اور مجموعۂ رباعیات کھو گیا، واپس نہ مل سکا۔ "جدید شعرائے اردو" کے مصنف نے ان کی چند رباعیاں درج کی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب اکبر ایک قادر الکلام رباعی گو ہیں اور بلند مرتبہ کے مالک۔ ساجد

بلند و پست سب پہ ہوگئیں رحمت کی برساتیں
وہ بہر لطف خاص آیا وہ بہر فیض عام آیا
تعلق کی کوئی حد ہے کہ اکبر نام پاک اس کا
خدا کے نام کے ساتھ ہر جگہ بالالتزام آیا

ترے سخن کا یہ اعجاز ہے برب ودود
شہود غیب ہے اور غیب ہوگیا ہے شہود
خدا گواہ کلام خدا ہے تیرا کلام
ہزار تجھ پہ سلام اور ہزار تجھ پہ درود

حرفِ آخر

راقم الحروف نے جناب اکبر کے تغزل کے بارے میں متعدد مستند اور مشہور ادیبوں اور نقادوں کی آرا کے حوالے دئے ہیں جن پر اضافہ کرنا مشکل ہے۔ موصوف خود فرماتے ہیں : ؎

یہ کلام اکبر خوشنوا ہے کمال فکر کا معجزہ
یہ صداقتوں کی لطافتوں کی بلاغتوں کی مثال ہے

یہ محض شاعرانہ تعلّی نہیں۔ انہوں نے بلند جذبات اور نازک تخیلات کو بڑی حسن کاری، سادگی و پرکاری سے پیش کیا ہے۔ وہ صحتِ زبان و بیان کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کی غزل اپنے عہد اور ان کی شخصیت کی خوب صورت نمایندگی کرتی ہے۔ ان کے لہجہ کی دلکشی، شیرینی اور پاکیزگی ان کے اپنے مجلسی اندازِ گفتگو کی یاد دلاتی ہے۔ اگر غزل شاعر کی اپنی ذات کو منعکس نہ کرے تو وہ فن کاری تو ہوسکتی ہے، سچی شاعری نہیں ہوسکتی۔ جناب اکبر کے مزاج اور کردار کی طرح ان کی غزل میں بھی لطافت، صداقت، نفاست، طہارت اور متانت پائی جاتی ہے۔ قاری ذہنی، جذباتی اور اخلاقی ترفع محسوس کرتا ہے۔ جناب اکبر حُسن و عشق کے بیان میں کبھی کھل کھیلتے نہیں۔ کہیں عامیانہ پن ہے نہ جنسیت زدگی نہ لذت پرستی۔ رکھ رکھاؤ ان کی زندگی اور شاعری دونوں کا نمایاں وصف ہے۔ ان کا تصوف برائے شعر گفتن نہیں بلکہ اظہارِ ذات کا وسیلہ ہے اور دلوں کے کنول کھلا دیتا ہے۔ ان کا عارفانہ کلام عصری رویوں سے اپنی الگ پہچان رکھتا ہے اور من تو شدم تو من شدی کی کیفیت کا احساس دلاتا ہے۔ نئی نسلوں کی مغرب پرستی اور تجدد پسندی کے باوجود ان کا کلام اپنی باطنی قوت کے سہارے زندہ رہے گا۔

"تنقیدی اشیرباد"

ڈاکٹر سلیم اختر

مقام : شہر کا فائیو سٹار ہوٹل
وقت : سہ پہر
منظر : ایئر کنڈیشنڈ ہال میں شہر کی خوش پوش خواتین اور حضرات جمع ہیں۔ سٹیج پر ایک وزیر صاحب بطور صدر تشریف فرما ہیں ایک اور وزیر صاحب مہمانِ خصوصی ہیں۔ ان کے ساتھ صاحبِ کتاب براج رہے ہیں۔
ایکشن : خطبہ کی کارروائی شروع ہوتی ہے ایک ایک نقاد آتا ہے اور حقِ دوستی یا حقِ نمک ادا کرتا ہے، تالیوں کی گونج میں نقاد آتا ہے اور تالیوں کی گونج میں نقاد جاتا ہے۔ تعریف کی حلیم تیار ہو رہی ہے اور ہر نقاد بقدرِ ہمت اوست اس میں گرم مصالحہ ڈالتا جاتا ہے۔
نتیجہ : تعریفیں سُن سُن کر صاحبِ کتاب کا نفس موٹا ہو رہا ہے اور کئی ہزار کے بل کے باوجود تقریب مہنگی نہیں محسوس ہوتی۔
حاصل : ٹائیں ٹائیں فش!

کسی تنقیدی مقالہ کا ایسا ڈرامائی آغاز کوئی اچھی بات نہیں کہ تنقیدی عمل کا ڈرامہ بازی سے کوئی تعلق نہیں لیکن کتابوں کی رونمائی کی تقریبات جس کثرت سے ہو رہی ہیں اس نے اب سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا اب تنقید کا منصب صرف یہی رہ گیا ہے کہ نقاد تعریف کے ڈرامہ کا ایک کردار بن کر رہ جائے ؛ اس لیے بعض اوقات کسی کا نقاد کہنا الزام لگا انگلی کی صورت اختیار کر کے گویا کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے، میں کمزور اعصاب کا نقاد ہوں اس لیے فوراً اقبالِ جرم کر کے معافی کا خواستگار ہوتا ہوں لیکن یہ نہ سمجھ لیے کہ سب نقاد میری مانند کمزور اعصاب کے حامل نہیں ہوتے اس لیے بیشتر کا خود کو مجرم سمجھنا تو درکنار انھیں تو شاید کسی طرح کے جرم کا بھی احساس نہ ہوتا ہوگا۔ ہر نقاد نے دوستوں کی فرمائش پر کتابوں کی رونمائی کی تقاریب کے لیے کبھی نہ کبھی ایسے مضامین ضرور لکھے ہوں گے جنھیں لکھتے وقت وہ شرمایا ہوگا چاہے جلسے میں پڑھتے وقت نہ گھبرایا ہو۔ لیکن بعد میں کتاب کے معیار اور اپنی تعری میں تفاوت کا احساس کر کے یقیناً پشیمان ہوا ہوگا اسے کہتے ہیں :

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

"تقریبی مضامین" کا تو بطورِ مثال تذکرہ کیا جا رہا ہے ورنہ دیباچے، پیش لفظ، مقدمے، فلیپ اور بروش

کے لیے آرا سبھی کا یہ عالم ہے کہ ان میں دوست کے لیے خلوص تو بہت ملتا ہے مگر تنقید نہیں ہوتی اس لیے انہیں تنقید کی بجائے "تنقیدی اشیرباد" کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں بھی اس تنقیدی گناہ کا مرتکب ہوا ہوں اور میں نے بھی دل کھول کر تنقیدی اشیرباد دی ہے ہر چند کہ نہ میں تنقید کا گرو ہوں اور نہ میرا کوئی چیلا — لیکن ٹھہریئے! میں جو غیر مشروط طور پر تقریبی مضامین کی مربیانہ تنقید کے خلاف لکھ رہا ہوں تو اس ضمن میں پہلے یہ تو طے کر لیں کہ تنقید بذاتِ خود کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ کیا تنقید کا مربیانہ بن جانا یا مضمون کا تقریبی ہو کر تعریفی ہو جانا بذاتِ خود خرابی کا باعث ہے یا یہ کہ محض ناقص تنقید میں خام آرار کی علامات کی حیثیت رکھتا ہے۔

خوابِ جوانی کی مانند تنقید کی بھی متعدد اور متنوع تعریفیں کی گئی ہیں اور سب کلیتاً درست نہ ہونے پر بھی جزوی صداقت کی حامل تو یقیناً ہوتی ہیں، اس لیے اس ضمن میں معروف ناقدین کی آرا جمع کر کے ان کے حسن و قبح کی جانچ کے برعکس ہم مختصر ترین مگر اساس صداقت کی حامل یہ سیدھی سی بات کرتے ہیں کہ تنقید تخلیق کی میزان ہے۔ اور عملِ نقد تخلیقات کی خوبیوں اور خامیوں کی بیلنس شیٹ مرتب کرنے کا نام ہے، اس لیے نقاد کو منصف یا جج سمجھنے پر اعتراض ہو تو پھر بیلنس شیٹ کی رعایت سے اسے آڈیٹر تو یقیناً قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس طرح آڈیٹر ڈیبٹ اور کریڈٹ کی صورت میں میزانیہ تیار کرتا ہے اس طرح نقاد بھی ڈیبٹ اور کریڈٹ جیسی اصطلاحات استعمال کیے بغیر تخلیقی میزانیہ تیار کرتا ہے۔ تنقید کا عمل محدود رہے تو یہ محض تخلیق کی پرکھ تک محدود رہتی ہے۔ لیکن تنقید اپنی وسیع تر صورت میں جب فلسفیانہ طرزِ استدلال اپناتی ہے تو اگر ایک طرف وہ نظریہ سازی کرتی ہے تو دوسری طرف اُن نظریات کی روشنی میں فرد، معاشرہ، اجتماعی شعور، تاریخ اور عصر کا تجزیاتی مطالعہ بھی کرتی ہے۔ تنقید کی اصل اہمیت اور اس کا جواز بھی اس سے مہیا ہوتا ہے، اس لیے اگر بلحاظِ معیار اور اسی بنا پر بلحاظِ اہمیت محض شارح اور نقاد میں خاصا تفاوت ملتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ شارح شعر میں علمِ بیان کی خوبیاں اجاگر کر کے اور مشکل الفاظ کے معانی بیان کر دینے کے بعد جب خیال کی تشریح کر دیتا ہے تو اس کی دانست میں اس کا کام ختم ہو جاتا ہے جبکہ نقاد کا کام وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں پر شارح نے اپنا کام ختم کیا تھا۔ ادھر بیشتر تقریبی مضامین کا یہ عالم ہے کہ وہ تشریح سے آگے نہیں بڑھتے اور یہ تشریح بھی باندازِ مدح ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے مضامین کو مدلل مداحی بھی تو نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اپنے لب و لہجہ کے باعث یہ تو غیر مدلل مداحی ثابت ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایسے مضامین تعلقاتِ عامہ کے فروغ کا باعث بنتے ہیں، لیکن وُہ حضرات جن کا یہ شوق نہیں وُہ بھی اس امر کو ملحوظ رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ مضمون دوست کی فرمائش پر اور اس کی خوشنودی کی خاطر لکھا جا رہا ہے ادھر دوستوں کا عالم یہ کہ:

اُنہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو!

یہ میرا ذاتی تجربہ ہے (ایسا تجربہ جس کی دیگر ناقدین بھی توثیق کر سکتے ہیں) بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ تعریف کے باوجود بھی دوست اس لیے ناخوش رہتا ہے کہ یہ تعریف اس کی توقعات کے مطابق نہ تھی، چنانچہ ہم نے توصیفی مضامین لکھ کر بھی دوست گنوا بیٹھے کہ تنقید کی ہنڈیا میں تعریف کا مصالحہ کم رہ گیا تھا!

میں نہیں جانتا وہ کون کافر تھا جس نے سب سے پہلے کتابوں کی رونمائی کی تقریبات کی طرح ڈالی لیکن جو کوئی بھی تھا وہ قطعاً ہمارے شکریے کا مستحق نہیں، لیکن ٹھہریئے! شاید میں یہ فیصلہ جلدی میں کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ ہر امر کسی فرد سے متعلق رہتا ہے اور ہر وقوعہ اپنے عصر سے مشروط ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا میر تقی میر نے اپنے کلیات کی تقریبِ رونمائی کرائی تھی؟ کیا دیوانِ غالب کو کسی فائیو سٹار ہوٹل میں لانچ کیا گیا تھا؟ اور کیا مولانا شبلی نعمانی نے "سیرۃ النبیؐ" کی تقریبِ افتتاح کے لیے کسی وزیرِ اوقاف کو زحمت دی تھی؟ ان سب کا جواب اس لیے نفی میں نہیں کہ اُس عہد میں پبلسٹی کی یہ صورتیں نہ تھیں بلکہ اس لیے نفی میں ہے کہ وہ لوگ SHOW BIRZ کے عہد میں سانس نہ لے رہے تھے، اس لیے ان کا سب سے بڑا انعام تخلیق ہوتی تھی۔ واضح رہے کہ میر خود کو "مستند" سمجھتے تھے اس لیے انہیں کسی کی سند کی ضرورت نہ تھی۔ غالب نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا کے قایل تھے اس لیے دیوان کی اشاعت پر شیفتہ، حالی اور مجروح جیسے احباب کو مقالات لکھنے کی زحمت نہیں دیتے — ویسے یہ ایک دلچسپ سوال ہے کہ اگر غالب نے دیوان کی تقریب کرائی ہوتی تو صدارت کس سے کراتے؟ میری ذاتی رائے میں شہنشاہِ ہند بہادر شاہ ظفر کے برعکس دہلی کے انگریز حاکم سے صدارت کراتے کہ تقریبِ رونمائی کا پھل اس طرح سے مل سکتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ آج کا زیرک ادیب صدارت کے لیے ہمیشہ کسی وزیر کا متلاشی ہوتا ہے کہ اس بہانہ وزیر صاحب سے تعارف کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے اور دوسرے وزیر صاحب کی ذاتِ بابرکات کی وجہ سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمایندے اور اخبارات کے فوٹو گرافر بھی ضرور آجاتے ہیں۔ ادھر ہمارے اخبارات کا وطیرہ بھی یہی ہے کہ خبر اور تصویر کی اہمیت وزیر یا مہمانِ خصوصی کے سٹیٹس کے حساب سے بنتی ہے لہٰذا کتاب، صاحبِ کتاب یا مقالہ نگاروں کے اسماء اور ادبی مقام کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔

ہم جلد بازی کے دور میں سانس لے رہے ہیں اس لیے ہم انسٹنٹ کافی کے عادی ہیں اور شارٹ کٹ کے ذریعہ سے سفر مختصر کرتے ہیں لیکن کافی کی مانند انسٹنٹ فیم نہیں ملتی اور نہ ہی محنت اور لگن کی بجائے شارٹ کٹ سے شہرت کی بلندیوں کو چھونا ممکن ہے آج ہمیں فیض، ندیم اور اشفاق احمد مشہور اور مقبول نظر آتے ہیں لیکن کون جانے انھوں نے اس مقام کے حصول کے لیے کتنی محنت کی ہوگی!

اُدھر ادیب کے لیے اپنی پہلی کتاب کا چھپنا پہلے بوسے یا پہلے بچّہ کی پیدائش جیسا ہوتا ہے اور مصنف سمجھتا ہے کہ میں نے اس کتاب سے دنیا کو تسخیر کر لیا ہے لیکن وہ یہ اساسی حقیقت فراموش کر دیتا ہے کہ

آج شعر کہنا ایک آزاد اور خود کار قسم کا وقوعہ نہیں ہے اس لیے کہ آج کا شعر کسی خلا میں نہیں تخلیق کیا جاتا اس کے پیچھے کئی سو سال کی شعری روایات ہوتی ہیں اس لیے شعر کے اچھے بُرے یا مقبول و نامقبول ثابت ہونے کا انحصار محض اس کی فنی خصوصیات پر نہیں ہوتا، یہی نہیں بلکہ صرف اچھے خیال سے بھی وُہ اچھا شعر قرار نہیں پاتا۔ در اصل آج کے شعر نے خود کو دو طرح سے منوانا ہے ایک تو کئی سو برس پر محیط شعری تاریخ کے تناظر میں اپنے جنم کا جواز فراہم کرنا ہے اور دوسرے عصری شاعری میں اپنے وجود کا اثبات کرنا ہے —— اس دوسرے امتحان میں کامیابی کے بعد ہی وہ شعر زندہ شعر قرار پائے گا۔ غزل کی تاریخ ہزاروں شعرا پر مشتمل سہی مگر کتنے شاعر زندہ رہ سکے؛ اس طرح آج کے شعرا جو شاعری کر رہے ہیں ان میں سے کتنے وقت کی میزان کا پلڑا جھکانے میں کامیاب ثابت ہوں گے؛ حالت تو یہ ہے کہ شعری مجموعے اوراقِ گل کی طرح آراستہ چھپنے کے ساتھ ہی خزاں گزیدہ پتوں کی مانند وقت کے شجر کی ڈالی سے یُوں جھڑ جاتے ہیں کہ —— لے گئی پون اڑا —— اس لیے تو زیادہ تر کتابیں بڑے تخلیق کاروں کے تخلیقی سفر —— "بلند آج نہایت غبارِ راہ میں ہے" —— کے مقابلہ میں محض گردِ راہ ثابت ہوتی ہیں —— اور اس موقع پر تنقید کے کردار کا آغاز ہوتا ہے ہم اسے مربیانہ تنقید کہیں، تقریبی تنقید کہیں یا تنقیدی اشیرباد۔ یہ ایک ہی وقوعہ ہے اور اس کا نقصان اس امر میں مضمر ہے کہ دوستی، تعلقات یا مفادات کی خاطر یہ ناقص کے نقائص نہیں گنواتی اور خام کی خامیوں کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ اگر یہ نقاد کی کم نگاہی کی وجہ سے ہو تو کوئی حرج نہیں کہ وہ اتنی ژرف نگاہی کا حامل ہی نہ تھا کہ تخلیق کا تحلیلی تجزیہ کر سکتا لیکن ہوتا یہ ہے کہ نقاد جانتے بُوجھتے اپنی تنقیدی بصارت کو MYOPIC بنا لیتا ہے۔ جس کا اعتراف بالعموم تقریبِ رُونمائی کے بعد کچھ ان الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ "یار! کتاب تو بس ایسی ویسی ہی تھی مگر کیا کرتا اپنے دوست کی کتاب جو ٹھہری"!

مربیانہ تنقید کے فروغ میں انفرادی سطح پر دوستانہ تعلقات سے لے کر اجتماعی سطح پر ادبی گروہ بندیوں تک —— کئی طرح کے عوامل کارفرما نظر آتے ہیں چنانچہ اپنے گروپ کی ترقی، قوت اور دہشت میں اضافہ کے لیے جہاں بڑے بڑے منفی حربے اپنائے جاتے ہیں وہاں تنقیدی اشیرباد میں بھی فراخ دلی سے کام لیا جاتا ہے۔ بے معنی نظم میں اسرارِ حیات تلاش کیے جاتے ہیں، جس افسانہ کی ہر چُول ڈھیلی ہو اسے رُوحِ عصر کا استعارہ قرار دیا جاتا ہے، فنی لحاظ سے ناقص ناول صدی کی بہترین تخلیق قرار پاتی ہے اور جمائیاں لانے والے انشائیے میں شگفتنِ گل ہائے ناز کا منظر دیکھا جاتا ہے بس یُوں سمجھ لیجئے کہ انہیں لغو میں الہام نظر آتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس صورتِ حال بھی کوئی ایسی دل خوش کُن نہیں ہے اور یہ ہے مربیانہ کے مقابلہ میں معاندانہ تنقید —— جس میں اگر ایک انتہا پر انفرادی بغض کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری انتہا پر یہ گروہی کینہ کی مظہر ہوتی ہے، اس کا مقصدِ وحید صرف کردار کشی ہے اور بس! اگر مربیانہ تنقید میں خامیاں نہ دیکھنے کے لیے نقاد ایک آنکھ بند کر لیتا ہے تو معاندانہ تنقید میں خُوبیاں نہ دیکھنے کو نقاد دونوں آنکھیں بند کر لیتا ہے اور یوں تنقید

بددیانتی اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ جاتی ہے۔

ہمارا معاشرہ ہر معاملہ میں شارٹ کٹ کا متلاشی رہتا ہے ادھر ادبی شہرت کا شارٹ کٹ تقریبات کے بعد اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں اور ادبی کالموں کی صورت میں تلاش کر لیا گیا ہے بلکہ دیکھا جائے تو ادبی ایڈیشن اور ادبی کالم ——— ادبی تقریبات کی ضمنی پیداوار نظر آتے ہیں ادبی ایڈیشنوں میں رپورٹنگ ہوتی ہے اور تصویریں چھپتی ہیں جبکہ کالم میں تعریف کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں (یا پھر ٹانگ کھینچی جاتی ہے) شاید اس لیے اب ادبی جرائد کے مدیران کے برعکس ادبی ایڈیشنوں کے نگران اور کالم نگار "بادشاہ گر" بن چکے ہیں۔ ادھر کالم کے ذائقہ اور کالم نگار کی آراء کی اہمیت کا انحصار کالم نگار کی ذاتی پسند و ناپسند اور اسلوب کے ساتھ ساتھ اس کی نیت اور شخصیت میں اخلاقی جرأت کے جوہر پر بھی ہوتا ہے صرف اسی ایک بات پر کالم کی اور کالم نگار کی رائے کی اہمیت کا تعین ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے نام سے لکھنے کی جرأت بھی رکھتا ہے یا نہیں ؟

گر یہ نہیں تو بابا باقی کہانیاں ہیں !

صاحب ! یہ ہے ہمارے عہد میں تنقید کا معکوسی سفر ——— ایسا معکوسی سفر جو اسے اِس انتہا تک لے آیا کہ صبح کی تنقید میں شام کو پنساری پُڑیاں باندھتا ہے مگر یہ قابلِ افسوس یا قابلِ مذمت اس لیے نہیں کہ یہ سب کچھ عصری تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اگر جیسی روح ویسے فرشتے والی بات صحیح ہے تو پھر جیسے ادیب ویسے نقاد والی بات کو بھی درست ہی سمجھنا چاہیے۔

ہم دورِ انحطاط میں سانس لے رہے ہیں جس عہد میں بنیادی صداقت کے حامل اداروں کو گھُن لگ چکی ہو، جہاں قدروں کا زوال اجتماعی المیے جنم دے رہا ہو، جہاں حق اور انصاف جیسے الفاظ محض "حرفِ مکرر" کی صورت اختیار کر چکے ہوں اور جس معاشرہ کا ٹریڈ مارک منافقت ہو تو پھر وہاں کے تخلیق کار اگر محنت اور فنی لگن کی بجائے "تنقیدی سرپرستی کے خواہاں ہیں تو یہ مروّج چلن کے عین مطابق ہے، اسی طرح نقاد اگر برا لکھنے والے کو حیاتِ جاوید کی سندیں تقسیم کرتے ہیں تو وہ کیا کریں آخر انہوں نے بھی تو اسی معاشرہ میں اپنے ادیب دوستوں کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہے جب معاشرہ کا ہر سرکردہ قول اور فعل کے تضاد کی عملی تصویر پیش کر رہا ہو تو پھر نقاد کی گفتگو اور تحریر میں بُعد کی شکایت کیوں ؟

اور آخری بات ———

یہ مضمون معروضی تجزیہ ہے، اقبالِ جُرم ہے یا فرضِ کفایہ ؟ اس کا جواب میں آپ پر چھوڑتا ہوں !

میر امن دلّی والے

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

ڈاکٹر جان بارتھوک گلکرسٹ (پ ۱۷۵۹ء ـــ وفات ۹ جنوری ۱۸۴۱ء) کی تصنیفی و تالیفی خدمات کے علاوہ ایک اہم کارنامہ گوشۂ گمنامی میں سسکتے ہوئے میر امن دلّی والے جیسے نابغۂ روزگار ہندوستانی مصنف و مترجم کو منظرِ عام پر لانا ہے۔ جس کا شکریہ نہایت درجہ عاجزی کے ساتھ 'چہار درویش' المعروف 'باغ و بہار' کے دیباچے میں ادا کر دیا گیا ہے، لیکن یہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ ہی ہیں جنھوں نے فورٹ ولیم کالج کے انتخابی مجموعے ("HINDI MANUAL") (مطبوعہ: ۱۸۰۲ء) اور 'باغ و بہار' (مطبوعہ ۱۸۰۲ء) کے اوّلین ایڈیشن کے سرورق پر مصنف/مترجم کے اصل نام کی بجائے صرف 'میر امن' طبع کروا دینے کی غلطی کر کے میر امان علی امن دلّی والے کے جملہ احوال و آثار اور آئندہ تصنیفی کارناموں کو بکھر اندھیروں میں دھکیل دیا[1]۔ اس کی نوعیت اجمالاً یوں ہے:

۱۔ میر امن کے اصل نام کا معاملہ مدت مدید تک کھٹائی میں پڑا رہا۔

۲۔ سنہ پیدائش کا تعین مدت تک دُشوار رہا۔

۳۔ میر امن کی تفصیلی و تالیفی زندگی فورٹ ولیم کالج کلکتہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔

۴۔ سنہ ۱۸۰۶ء کو اُن کا سالِ وفات تصوّر کر لیا گیا۔

۵۔ میر امن کی نامور اولاد کے حوالے سے بھی میر امن کے حالاتِ زندگی کی پڑتال ممکن نہ ہو سکی اور یوں میر امن کے احوال و آثار کو وقت کی دبیز تہ نے کُلی طور پر ڈھانپ دیا۔

میر امن نے اپنے وقت کے دستور کے مطابق اپنا تخلص ہی برتا اور 'چہار درویش' المعروف 'باغ و بہار' اور 'گنجِ خوبی' کے دیباچوں میں اپنا نام 'میر امن دلی والے' درج کیا۔

۱۔ "پہلے اپنا احوال یہ عاصی گنہگار، میر امن دلی والا بیان کرتا ہے۔"

(دیباچہ باغ و بہار سے اقتباس)

۲۔ "خداوندِ نعمت، صاحبِ خلق و مروّت، جان گلکرسٹ صاحب نے کہ زبانِ اُردو کے قدرداں اور فلک زادوں کے فیض رساں ہیں، اس بعید الوطن میر امن دلّی والے کو لطف و عنایت سے فرمایا کہ 'اخلاقِ محسنی' جو فارسی کتاب ہے اس کو اپنی زبان میں ترجمہ کرو۔"

(دیباچہ 'اخلاقِ محسنی' سے اقتباس)

جب کہ بہت پہلے میر امن کے اصل نام کے باب میں مولوی سیّد محمّد (مصنفِ 'اربابِ نثرِ اُردو') اور مولانا حامد حسن

قادری (مصنف "داستانِ تاریخ نثرِ اردو") نے میر امن کا اصل نام میر امان اور تخلص بالترتیب لُطف اور امنؔ بتایا تھا، لیکن ان دونوں کے پاس اس ضمن میں کوئی شہادت نہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ پروفیسر ممتاز حسین نے ان دونوں کی اس تحقیق کو "تاحال مان کر نہیں دیا[۲]۔ اور نہ ہی دیگر محققین نے نام سے متعلق اس انکشاف کو کوئی اہمیت دی۔

'چار درویش' المعروف 'باغ و بہار' اور 'گنجِ خوبی' (ترجمہ : اخلاقِ محسنی) کے بعد کے کارنامے میر امن کو میر امان علی امن دلی والا ثابت کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو 'ستہ شمسیہ'

'تکمیل : ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء مطبوعہ : ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء کے دیباچہ از نواب محمد فخر الدین خان المخاطب بہ شمس الامرا حیدر آباد دکن سے اقتباس :

> "بندہ نیاز مند درگاہ ایزدی کا محمد فخر الدین خاں المخاطب بہ شمس الامرا اس طور پر گذارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہیں بسبب میلان طبیعت کے کہ بہت اس طرف شوق رکھتا تھا، میری سماعت میں آئیں۔ اس جہت سے چند مسائل انکے ازبر تھے اور اگرچہ بعضے علوم فلاسفہ زبان عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں، چنانچہ علم جرثقیل اور علم انظار وغیرہ مگر اس قدر نہیں ہیں کہ جیسا اب اہل فرنگ نے ان کو دلائل اور براہین سے بدرجۂ کمال اثبات کیا ہے بلکہ بعضے علوم اہل فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کا نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنا، چنانچہ علم آب اور ہُوا۔ اور برزنک اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ اس واسطے سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدے کے لیے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصت قلیل میں اس کی معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ میسر ہوئے.... چنانچہ ان دنوں میں بحسب مُدعا چند رسالے مختصر علوم فلاسفہ کے بطور سوال و جواب کے لکھے ہوئے ریوری رنٹ چالس صاحب کے انگریزی زبان میں جو ۱۸۱۸ء میں بیچ شہر لنڈن کے چھاپے گئے تھے۔ بہم پہنچے۔ ان میں سے رسالہ علم جرثقیل۔ علم ہیئت اور علم آب اور علم ہُوا اور علم انظار کہ اس کے آخر میں مقناطیس کا رسالہ بھی شریک تھا اور برزنک کا کہ ہر ایک ان میں سے بدرجۂ اوسط نہ بہت کم نہ بہت زیادہ لکھا ہوا تھا اور ہر چند ترجمہ ان علوم کا ہر ایک زبان میں قلمرو اہل فرنگ میں رواج پایا ہے مگر نظر کرتے فائدے ساکنان بلدہ فرخندہ بنیاد حیدر آباد کے..... میر امان علی دہلوی اور غلام محی الدین حیدر آبادی اور مسٹر جونس اور موسیٰ تندسی کو جو ملازمان سرکار ہیں حکم کرنے میں آیا کہ ان علوم مذکور کو زبان انگریزی سے اُردو زبان میں ہمارے رُوبرو ترجمہ کریں، چنانچہ بفضلِ حق سبحانہ تعالیٰ کے یہ چھ رسالے ترجمہ ہوئے مگر بعضے اسما انگریزی اصطلاح کے جو زبان عربی اور فارسی میں نہ میسر ہوئے، ان کو اس زبان اصلی پر بحال رکھنے میں آیا اور یہ چھ رسالے جو ترجمہ کیے گئے چھ علم پر مشتمل ہیں۔ اس واسطے نام ان کا ستہ شمسیہ رکھا گیا۔ مناسب جان کے علم مقناطیس کو علم انظار کی جلد سے علیحدہ کر کے آخر

میں جلد بندک کے شریک کیا گیا اور مادۂ تاریخ اس رسالے کا گزرانا ہوا۔ حافظ مولوی شمس الدین فیض کا یہ ہے۔
(تالیف نواب شمس الامرا ۱۲۵۳ھ م)

۱۔ اب وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مولوی سید محمد اور مولانا حامد حسن قادری نے میر امن کے اصل نام کے تعین کے سلسلے میں شمس الامرا حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ سے منسلک اسی میر امان علی کے کام کو دیکھنے اور پرکھنے کے بعد میر امن کا نام میر امان علی لکھا ہوگا۔ نیز ان کے پاس تحریری سطح پر کافی داخلی شہادتیں ہوں گی اسی لیے وثوق اور قطعیت کے ساتھ انہوں نے میر امن کا اصل نام میر امان علی لکھا اور کسی قسم کے حوالے کی ضرورت کو محسوس نہ کیا۔

۲۔ زمانی اعتبار سے بھی میر امان علی، میر امن ہی ہو سکتے ہیں۔ نیز امن مکمل نام نہیں تخلص معلوم ہوتا ہے اور یہ تخلص میر امان علی کا ہی موزوں تر ہے۔

۳۔ میر امن فورٹ ولیم کالج میں منشی مترجم تھے۔ اور یہاں بھی مترجم کا ہی حوالہ موجود ہے۔

۴۔ نواب فخر الدین خاں کے مقدمہ میں میر امان علی دہلوی کا نام 'بیاض متین' کے مرتب مشہور شاعر اور ماہر لسانیات غلام محی الدین متین حیدر آبادی، انگریز عالم مسٹر جونس اور فرانسیسی زبان کے ماہر لسانیات موسیو تنڈرس سے بھی پہلے لیا گیا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ حیدر آباد دکن کے ان تین بہت بڑے مترجمین سے پہلے میر امان علی دہلوی کا نام رکھنے میں ان کی فورٹ ولیم کالج والی شہرت کو دخل رہا ہوگا۔

اس ضمن میں دیگر حوالے موقع محل کی مناسبت کے ساتھ آگے آئیں گے۔ مثال کے طور پر یہ سوال خاصا اہم ہے کہ ۴ جون ۱۸۰۶ء میں فورٹ ولیم کالج کونسل نے میر امن کو ان کی اپنی خواہش کے مطابق چار ماہ کی تنخواہ مبلغ ۳۲۰ روپے ادا کر کے کالج سے الگ کر دیا تھا[۳]۔ تو میر امن گئے کہاں؟

اور دوسری اہم بات یہ کہ میر امن کو ان کی خواہش کے مطابق کالج سے الگ کیا گیا۔ علاحدگی کا سبب بڑھاپا یا اُن کی طویل علالت نہیں۔ گمان غالب ہے کہ میر امن نے کالج کے بگڑتے ہوئے حالات کے پیش نظر بروقت حیدر آباد دکن کا رُخ کیا ہو جہاں شمس الامرا نے دارالترجمہ قائم کرنا تھا۔ اگر یہ شہادتیں قابل قبول ہوں تو کہا جا سکتا ہے کہ میر امن دلی والے کا پورا نام میر امان علی امن دلی والا تھا۔

میر امن کے لطف تخلص کرنے سے متعلق ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق پر کوئی اضافہ ممکن نہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:۔

"وہ معمولی شُدبُد کے شاعر تھے۔ اُنھیں خود بھی اپنی اس شاعرانہ حیثیت کا احساس ہے۔ "گنج خوبی" کے دیباچے میں اپنی شاعری کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

نہ شاعر ہوں میں اور نہ شاعر کا بھائی
فقط میں نے کی اپنی طبع آزمائی

جس شخص کی شاعرانہ استعداد کا یہ عالم ہو اُس کا تذکروں میں ذکر معلوم ۔ بعض متاخر کتب میں ان کے دو تخلص بیان یے گئے ہیں ، امن اور لطف ۔ لطف تخلص کا استدلال باغ و بہار کے اس شعر سے کیا گیا ہے :

تو کونین میں لطف پر لطف رکھ
خدایا بہ حقِ رسولِ کبار

لیکن شعر میں کوئی قرینہ نہیں کہ میرامن کا تخلص لطف قرار دیا جائے ۔ مرزا علی لطف مؤلف تذکرۂ گلشنِ ہند شاعر تھے اور لطف تخلص کرتے تھے ۔ گارسیں دتاسی نے ان کے صاحبِ دیوان ہونے کا ذکر بھی کیا ہے ۔ اگرچہ فورٹ ولیم الج کے باقاعدہ ملازم تو نہ تھے لیکن ان کے تفصیلی کام کی اشاعت فورٹ ولیم کالج ہی سے ہوئی ۔ یہ کلکتے ہی میں مقیم تھے ۔ یرامن نے گنج خوبی کے دیباچے میں ان کے دو شعر دیئے ہیں :

"مرہٹے جب عالمگیر بادشاہ کے بعد عالمگیر ہو کر ہندوستان میں چھائے ۔ حضور (انگریز) کی فوج ظفر موج کے سامنے مرہٹے اور کائی سے پھٹ کر تتری بتری ہو گئے ......اور عین مقابلے کے وقت کا یہ قطعہ لطف کا ہے :

پلٹن اور توپیں جب سنمکھ ہوئیں
مرہٹے مصیبت (کذا) کے مارے مر گئے
فیر سنتے ہی فنفرد ہو چلے
چھوٹی جب بندوق کرّے اُڑ گئے

قیاس یہ ہے کہ امن نے باغ و بہار میں بھی اسی لطف کا شعر دیا ہے اور لطف میر امن کا اپنا تخلص نہیں تھا ۔[۵۲] "

"باغ و بہار" کے خاتمہ کتاب میں مرزا لطف علی لطف کے بارہ اشعار شامل ہیں ۔ ان غزلیہ اشعار کا مطلع "باغ و بہار" کے سالِ تصنیف سے متعلق ہے ۔ ملاحظہ ہو :

مرتب ہوا جب یہ باغ و بہار
تھے سنہ بارہ سو سترہ در شمار
کرو سیراب اس کی تم رات دن
کہ ہے نام و تاریخ باغ و بہار
خزاں کا نہیں اس میں آسیب کچھ
ہمیشہ تر و تازہ ہے یہ بہار
مرے خونِ دل سے یہ سیراب ہے اور لختِ جگر کے ہیں سب برگ و بار

مجھے بھول جاویں گے سب بعد مرگ
رہے گا مگر یہ سخن یادگار
اسے جو پڑھے یاد مجھ کو کرے

یہی قاریوں سے مرا ہے قرار
خطا گر کہیں ہو تو رکھیو معاف
کہ پھولوں میں پوشیدہ رہتا ہے خار
ہے انسان مرکب ز سود و خطا

یہ چوکے گا ہر چند ہو ہوشیار
میں اس کے سوا چاہتا کچھ نہیں
یہی ہے دعا میری اے کردگار
تیری یاد میں میں رہوں دم بہ دم
کٹے اس طرح میرا لیل و نہار
نہ پرسش کی سختی ہو مجھ پر کبھی
نہ شب گور کی اور نہ روزِ شمار
تو کونین پر لطفؔ پر لطف رکھ
خدایا بہ حقِ رسولِ کبار

ان اشعار میں مرزا لطف علی لطفؔ نے میرامن کے جذبات کی عکاسی کی ہے اور یہ طریقہ اُس دور میں مروج تھا۔ شمس الامرا حیدر آباد دکن کی بیشتر کتب کا مادۂ تاریخ حافظ میر مولوی شمس الدین محمد فیض کا نکالا ہوا ہے جب کہ کچھ کتب میں اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے اور کچھ میں نہیں۔

باغ و بہار کے خاتمہ کتاب میں مرزا لطف علی لطفؔ کے اشعار کی شمولیت کا ایک سبب یہ بھی رہا ہو گا کہ لطفؔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے بہت قریب تھے اور گلکرسٹ کی ہی فرمائش پر اُنھوں نے علی ابراہیم خاں کے تذکرہ شعرائے ہند "گلزارِ ابراہیم" (سالِ تصنیف ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۴ء) کا فارسی سے اُردو ترجمہ کیا اور "تذکرہ گلشنِ ہند" نام رکھا۔ لطفؔ نے یہ ترجمہ ۱۸۰۱ء میں مکمل کیا تھا[۵۶]

مرزا لطف علی لطفؔ "تذکرہ گلشنِ ہند" کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

"علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارتِ فارسی میں لکھا اور نام گلزارِ ابراہیم رکھا ہے۔ ۱۱۹۸ھ اور ۱۷۸۴ عیسوی میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا، رفتہ رفتہ جب سرحلقۂ بزم

نکتہ دانی رونق افزائے محفلِ معانی ، سخن کی جان اور سخن دانوں کے قدر دان صاحب والامناقب مسٹر گلکرسٹ صاحب کی نظر مبارک سے گزرا ، ازبسکہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا ، ایک مدّت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبانِ ریختہ میں کیا جائے تو خوب ہو اور ہر ایک شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے تو نہایت طبع کو مرغوب ہو ــــــــ [۵]"

میر امن نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ملازمت اختیار کرنے تک کے مختصر حالاتِ زندگی 'باغ و بہار' اور 'گنج خوبی' کے دیباچوں میں بیان کیے ہیں ، ملاحظہ فرمائیے :

> " پہلے اپنا احوال یہ عاصی گنہگار ، میر امن دلّی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جاں فشانی بجا لاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے ، قدردانی جتنی چاہیے فرماتے رہے ۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کر کر مالامال اور نہال کر دیا اور خانہ زاد موروثی اور منصب دار قدیمی ، زبان مبارک سے فرمایا ۔ چنانچہ یہ لقب شاہی دفتر میں داخل ہوا ۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اس گھر کے سبب آباد تھے) یہ نوبت پہنچی ، ظاہر ہے ۔ عیاں را چہ بیاں ۔ تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ درانی نے گھر بار تاراج کیا ۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر وے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلا وطن ہوا ، اور ایسا جہاز (کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا) غارت ہوا ۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا ۔ ڈوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے ۔ کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا ۔ کچھ بنی کچھ بگڑی ۔ آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے ، روزگار نے موافقت نہ کی ۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تنِ تنہا کشتی پر سوار ہو اشرف البلاد کلکتے میں آب و دانے کے زور سے آ پہنچا ۔ چندے بے کاری میں گزری ۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا ۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا ، لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا ۔ تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے ، حضور تک جان گلکرسٹ صاحب بہادر (دام اقبالہ) کے رسائی ہوئی ۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے ، چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا اُٹھا کر ، پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی ، چھوٹے بڑے ، پرورش پا کر دعا اس قدر دان کو کرتے ہیں ۔ خدا قبول کرے ۔"

اِس کے بعد میر امن نے دیباچے میں اُردو زبان کے آغاز کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں ۔ اس کے آخر میں لکھتے ہیں :

> " جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا ، شاہ عالم پورب کی طرف تھے ۔ کوئی "

وارث اور مالک ملک کا نہ تھا، شہر بے سر ہو گیا۔ سچ ہے بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی۔ ایک بارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے کہیں میں کہیں تم ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے۔ جس ملک میں پہنچے وہاں کے امیروں کے ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا۔ .... یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تک پہنچا ہے۔"

'گنج خوبی' کے دیباچے میں اُن نے اپنے بارے میں صرف اِس قدر لکھا ہے:

"خداوند نعمت، صاحب خلق و مروّت، جان گلکرسٹ صاحب نے کہ زبان اُردو کے قدردان اور فلک زدوں کے فیض رساں ہیں۔ اس بعید الوطن میر امن دلّی والے کو لطف و عنایت سے فرمایا کہ اخلاق محسنی جو فارسی کتاب ہے، اس کو اپنی زبان میں ترجمہ کرو تو صاحبان عالی شان کے درس کی خاطر مدرسے میں کام آوے۔ بموجب حکم اُن کے سر آنکھوں سے قبول کیا۔ اس لیے کہ مرہون اُن کے احسان کا ہوں۔ آدمی سر پر سے تنکا اُتارنے کا احسان یاد رکھتا ہے، اُنھوں نے تو روزی سے لگا دیا۔ اور میں نے بھی انھیں کے سبب یہ پیشہ قبول کیا۔ قطعہ:

رہیں شاد آباد گلکرسٹ صاحب
رہیں اُن کے خوش آشنا یار بھائی
دلی مہربانی جو تھی روز اوّل
اسے لُطف سے تا بآخر نبھائی

اور بہ اُمید صِلہ کے، کہ حکم عام حضور کا ہوا ہے، واسطے پرورش اطفال کے۔ اس کثیر العیال نے سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری میں مطابق اٹھارہ سے دو عیسوی کے باغ و بہار کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا۔ از بس کہ جتنی خوبیاں انسان کو چاہئیں اور دُنیا کی نیک نامی اور خوش معاشی کے لیے درکار ہیں، سو سب اس میں بیان ہوئیں۔ اس واسطے اس کا نام بھی گنج خوبی رکھا۔"[۴۵]

میر امن کے سنہ پیدائش سے متعلق ہوم ڈیپارٹمنٹ، پبلک پروسیڈنگز کا امپریل ریکارڈ بابت فورٹ ولیم کالج کلکتہ (نئی دہلی) کچھ رہنمائی نہیں کرتا۔ لیکن اگر میر امن کو میر امان علی دہلوی ملازم سرکار شمس العلماء حیدر آباد دکن مان لیا جاتا ہے تو میر امن کی طبعی عمر سے متعلق بہت سے اُلجھیڑے رفع ہو جاتے ہیں۔ 'ستہ شمسیہ' کا دیباچہ میر امن کو ۱۸۴۰ء تک حیات ثابت کرتا ہے۔

یاد رہے کہ اس سے قبل پروفیسر ممتاز حسین اور ان کی تقلید میں ڈاکٹر ممتاز منگلوری کا قیاس ہے کہ میر امن کی پیدائش بعہد محمد شاہ (وفات: ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء) میں ہوئی اور ۱۸۰۶ء میں وفات پا گئے۔ اس قیاس کی بنیاد 'آب حیات' از محمد حسین آزاد اور میر امن کی خود نوشت مختصر حالات زندگی (دیباچہ جات: 'باغ و بہار' و 'گنج خوبی')[۴۶]

محمد حسین آزاد کا بیان مستند تحقیق سے متعلق اپنی وقعت کھو چکا ہے۔ اب آئیے 'باغ و بہار' اور 'گنج خوبی' کے دیباچہ جات کی طرف۔ بقول میرامن، اُن کا خاندان، نصیر الدین ہمایوں کے عہد سے لے کر شاہ عالم ثانی کے عہدِ حکومت تک منصب دار قدیمی اور خانہ زاد موروثی میں شمار کیا جاتا تھا اور اُن کے خاندان کا یہ لقب مُغل شاہی دفتر میں درج تھا۔ اس خاندانی افتخار کے اظہار کے بعد لکھتے ہیں:۔

"جب ایسے گھر کی کہ سارے گھر اس گھر کے سبب آزاد تھے، یہ نوبت پہنچی، کہ
ظاہر ہے عیاں راچہ بیاں۔

[مغلیہ حکومت کے اِختیار ہوجانے شہنشاہِ ہند عالم گیر ثانی کے قتل (۱۷۵۹ء) اور سورج مل جاٹ کے ۱۷۵۳ء میں دہلی پر حملے[۵۸] کی طرف اِشارہ۔]

تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کیا۔

[سورج مل جاٹ (وفات: ۲۵ دسمبر ۱۷۶۳ء) کا دہلی پر دوسرا کامیاب حملہ[۵۹] ۱۷۶۱ء اور میرامن کی خاندانی جاگیر کی ضبطی کی طرف واضح اشارہ۔ بقول میر محمد تقی میرؔ سورج مل جاٹ نے ۱۲ جون ۱۷۶۱ء میں اکبر آباد پر قبضہ کیا۔ لیکن اس سے کچھ دن پہلے اس کا اکبر آباد کے اکثر محلات پر قبضہ مکمل ہوچکا تھا۔" قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سورج مل جاٹ نے جاگیروں کی ضبطی کا کام اس کے بعد ہی کیا ہوگا۔]

اور احمد شاہ دُرّانی نے گھربار تاراج کیا۔

["ذکرِ میر" میں بھی احمد شاہ کو "ابدالی" نہیں "درّانی" لکھا گیا ہے۔ یہاں ابدالی کے دہلی پر پہلے کامیاب حملے (۱۷۵۷ء) کی طرف اِشارہ ہے۔

میرامن دیباچے کے آخر میں رقم طراز ہیں:

"جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا، شاہ عالم پورب کی طرف تھے (شاہ عالم ۱۴ مئی ۱۷۵۸ء میں دِلّی چھوڑ کر پورب کی طرف نکل گئے تھے) کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ تھا، شہر بے سر ہوگیا سچ ہے بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی ایک بارگی تباہی پڑی۔"

عالم گیر ثانی کے قتل (۱۷۵۹ء) کے بعد شاہ جہان ثانی ۳۰ نومبر ۱۷۵۹ء تا ۱۰ اکتوبر ۱۷۶۰ء تک حکمران رہا، لیکن اس کے بعد شاہ عالم ثانی کی ۱۷۷۲ء میں دِلّی واپسی تک تخت تقریباً بارہ برس تک خالی رہا، اس دوران میں بقول میرامن: "رئیس وہاں کے کہیں میں کہیں، تم کہیں ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے۔"

[اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی کا تجزیہ درست معلوم ہوتا ہے کہ میرامن نے دلّی کے امراء و روٴساء کے ترک وطن کرنے کی بات کی ہے۔ اسے میرامن کی جلاوطنی خیال نہیں کرنا چاہیے۔ میرامن کی تحریر سے داخلی شہادت کو دیکھتے ہوئے ان کی جلاوطنی کا زمانہ جاگیر کی ضبطی کے بعد کا بنتا ہے۔]

ایسی ایسی تباہی کھا کر

[لفظ "ایسی" کے دوبار استعمال کے حوالے سے ابدالی کے پہلے (۱۷۵۷ء) اور دوسرے حملے (۱۷۶۰ء) کی طرف اشارہ۔]

دے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھومی میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلاوطن ہوا اور ایسا جہاز (کہ جس کا ناخدا پادشاہ تھا) غارت ہوا۔

[یہاں جہاز غارت ہونے سے مُراد میرامن کے گھرانے کی بربادی ہے، جو "منصب دارتیلی" اور "خانہ زاد موروثی" شمار کیا جاتا ہے۔ میرامن نے سورج مل جاٹ کے دوسرے حملے (۱۷۶۱ء) اور جاگیر کی ضبطی کا ذکر پہلے کیا اور اس کے دو ایک برس ابدالی کے دہلی پر پہلے (۱۷۵۷ء) اور دوسرے حملے (۱۷۶۰ء) کا ذکر بعد میں کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ میرامن کی دہلی سے جلاوطنی سورج مل جاٹ کے دہلی پر کامیاب حملے (۱۷۶۱ء) کے بعد ہوئی۔ فرض کیا سورج مل جاٹ نے اپنی وفات ۱۱۷۶ھ مطابق (۶۳ - ۱۷۶۲ء) تک دہلی کے جاگیرداروں کو ان کی جاگیروں سے محروم کیا، تو اس کے بعد کا زمانہ میرامن کی دہلی سے جلاوطنی کا بنتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر میرامن ۱۷۶۳ء میں بھی جلاوطن ہوئے تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُس وقت اُن کی عمر تیرہ برس رہی ہوگی۔ یُوں ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ میرامن پیدا ہوئے ہوں گے۔"]

میں بےکسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

[لفظ "بےکسی" اور گھرانے کے غارت ہونے کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ میرامن بہت کم عمری میں دہلی سے جلاوطن ہوئے یعنی ۱۷۶۳ء میں تیرہ برس کی عمر میں دہلی کو چھوڑا تو یہ داخلی شہادت ہمارے اس بیان کو بھی تقویت بخشتی ہے کہ میرامن ستہ شمسیہ (تکمیل ۱۸۳۷ء) کے دیباچے کے مطابق ۱۸۳۷ء تک حیات تھے اور اس دور میں اتنی عمر پانا حیرت کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔ ۱۸۳۷ء میں بھی ان کی عمر ۸۷ برس سے تجاوز نہیں کرتی۔]

ڈوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے۔ کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی، آخر وہاں سے بھی پاؤں اُکھڑے، روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تنِ تنہا کشتی پر سوار ہو اشرف البلاد کلکتے میں آب ودانے

کے زور سے آپہنچا۔

[ڈوبتے کو تنکے کا آسرا کے محاورے اور صیغۂ واحد متکلم پر غور کریں تو صاف پتا چلتا ہے کہ میر امن کم عمری میں دہلی سے تنِ تنہا نکل بھاگے، عظیم آباد میں جوان ہوئے، شادی کی (جسے تنکے کا آسرا قرار دیتے ہیں) ورنہ دہلی سے نکلنے کے بیان میں عیال و اطفال کا ذکر ضرور کرتے۔ یہ داخلی شہادت بھی ہمارے اس بیان کو تقویت بخشتی ہے جس میں ہم نے میر امن کو ۱۸۴۷ء تک حیات ثابت کرنا ہے۔]

چندے بے کاری میں گزری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خان کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا، لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا۔

[وسط ۱۷۹۷ء تا ۴ مئی ۱۸۰۰ء کا زمانہ مراد ہے اور اگر "چندے بے کاری میں گزری" کا خیال کریں تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ۱۷۹۸ء کی ابتدا میں کلکتے آئے۔]

تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گلکرسٹ صاحب بہادر (دام اقبالہ) کے رسائی ہوئی۔

[میر بہادر علی حسینی نارنولی (سیکنڈ منشی فورٹ ولیم کالج) کی معرفت ڈاکٹر جان بارتھوک گلکرسٹ سے اپریل ۱۸۰۱ء میں متعارف ہوئے ہوں گے۔]

بارے طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا اٹھا کر، پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی، چھوٹے بڑے، پرورش پا کر دعا اس قدر دان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔

[پروفیسر ممتاز حسین نے اس اقتباس کے ساتھ اختتام کتاب کے درج ذیل اشعار کو ملا کر پڑھا:

میں اس کے سوا چاہتا نہیں کچھ   یہی ہے دعا میرے لے کردگار
تری یاد میں میں رہوں دم بدم   کٹے اس طرح میرا لیل و نہار
نہ پرسش کی سختی ہو مجھ پر کبھی   نہ شب گور کی اور نہ روزِ شمار

تو کونین میں لطف پر لطف رکھ
خدایا بحقِ رسولِ کبار

بحوالہ دیباچہ "گنجِ خوبی"، میر امن کا کثیر العیال ہونا نیز بحوالہ دیباچہ "باغ و بہار" گھر میں دس چھوٹے بڑے آدمیوں کے پرورش پانے والے بیانات کو ان اشعار کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے پروفیسر ممتاز حسین صاحب نے میر امن کو گور میں پاؤں ڈالے بڈھا کھوسٹ آدمی

> ثابت کردیا[۵۱] جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔
>
> ۱۔ میر امن کے ڈاکٹر گلکرسٹ کو "جواں مرد" اس کے کم سن ہونے کے حوالے سے نہیں بلکہ باہمت ہونے کے حوالے سے کہا ہے۔
>
> ۲۔ گھر میں دس چھوٹے بڑے آدمیوں کا یہ مطلب قطعاً نہیں لیا جا سکتا کہ میر امن محض کثیر العیال تھے اس لیے یقیناً بہت بوڑھے رہے ہوں گے۔ "بڑے" سے مراد میر امن کے والدین بھی ہو سکتے ہیں اور اگر خود میر امن اور اُن کی بیگم کو بھی "بڑوں" میں شمار کریں تو بھی بچوں کی تعداد چھ بنتی ہے۔
>
> عظیم آباد کے قیام کے دوران لُٹی ہوئی دِلّی سے گھر کے بقیہ افراد کا ملنا بعید از قیاس نہیں۔ یوں چھوٹے چھ افراد میں میر امن کے بہن بھائی بھی شمار ہو گئے۔ ۱۸۰۲ء (زباغ و بہار" کے دیباچے کی سنہ تصنیف) تک میر امن کی عمر باون برس کے لگ بھگ رہی ہوگی، اس لیے والدین کا حیات ہونا بعید از قیاس نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ پروفیسر ممتاز حسین صاحب نے ان اشعار کو میر امن کی شاعری قیاس کیا جو درست نہیں۔ یہ اشعار مرزا علی لطف مؤلف "تذکرہ گلشن ہند" کے ہیں۔
>
> اس اقتباس کا سب سے اہم ٹکڑا درج ذیل ہے :
>
> "ایک ٹکڑا اٹھا کر، پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے، پرورش پا کر دعا اس قدر دان کو کرتے ہیں۔"
>
> چارلس ڈوئلے اور کیپٹن ٹامس ولیمز کی کتاب "دی یورپین اِن انڈیا" (مطبوعہ ۱۸۱۳ء لندن) میں فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کے شب و روز کا بیان اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ میر امن فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ہوسٹل میں مقیم تھے، جہاں اہلِ خانہ کو ساتھ رکھنا ممکن نہ تھا۔ اسی طرح "کلکتے" کے بیان میں "چندے بے روزگاری میں گزری" اور محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے باب میں "نباہ اپنا نہ دیکھا" کی بے یقینی کی صورتِ احوال یہ ثابت کرتی ہے کہ میر امن کے بقیہ گھر والے عظیم آباد یا کسی اور علاقے میں قیام پذیر ہوں گے۔

"باغ و بہار" کے دیباچہ کے سرسری مطالعہ سے ہی میر امن کا شیعہ ہونا ثابت ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو :

"جسمِ پاک مصطفیٰ اللہ کا اِک نور ہے اس لیے پرچھائیں اس قد کی نہ تھی مشہور ہے۔

حوصلہ میرا کہاں اتنا جو نعت اس کی کہوں پر سخن گویوں کا یہ بھی قاعدہ دستور ہے اور اس کی آل پر صلوٰۃ و سلام جو ہیں بارہ امام محمد حق اور نعت احمد کو بیان کر انصرام اب ہی آغاز اس

کو کرتا ہوں جو ہے منظور کام پیاہی واسطے اپنے نبیؐ کی آل کے کہ یہ مکرر گفت گو بقول طبع خاص و عام"۔
(باغ و بہار کے دیباچہ سے اقتباس)

۱۷ اگست ۱۸۰۰ء کے سرکاری اشتہار بابت فورٹ ولیم کالج کے مطابق مندرجہ ذیل اشخاص درج ذیل مختلف عہدوں پر مقرر کیے گئے:-

ریورنڈ ڈیوڈ براؤن[۱۱]	پرووسٹ
ریورنڈ کلاڈیس بکھانن	وائس پرووسٹ[۱۲]

یہ قدیم یونانی، لاطینی اور انگریزی کلاسیکی ادب کے پروفیسر تھے۔

لیفٹیننٹ جان بیلی	پروفیسر عربی زبان و شرع محمدیؐ
لیفٹیننٹ کرنل ولیم کرک پیٹرک فرانسس گلیڈون این۔ بی۔ ایڈمانسٹن	پروفیسر فارسی زبان و ادب
ڈاکٹر جان بارتھوک گلکرسٹ	پروفیسر ہندوستانی/اردو زبان و ادب
جان ہیری بارلو	پروفیسر گورنر جنرل کے پاس کیے ہوئے قاعدے قوانین کے مترجم و مرتب۔

۱۳ ستمبر ۱۸۰۰ء کے اشتہار میں کالج کونسل کے مندرجہ ذیل ممبران کے نام شائع کیے گئے:-

۱۔ ریورنڈ ڈیوڈ براؤن (پرووسٹ)
۲۔ ریورنڈ کلاڈیس بکھانن (وائس پرووسٹ)
۳۔ پروفیسر جان ہیری بارلو
۴۔ پروفیسر این۔ بی۔ ایڈمانسٹن
۵۔ پروفیسر لیفٹیننٹ ولیم کرک پیٹرک
۶۔ روتھ مین (سیکرٹری کالج کونسل)

فورٹ ولیم کالج کے دیگر اساتذہ کے نام درج ذیل ہیں:-

پادری ولیم کیری	بنگلہ اور سنسکرت زبان و ادب
جیمز ڈونڈی ایل۔ ایل۔ ڈی	علم الحساب
ڈھیلے سی	جدید زبانیں
لمسڈن	اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی

روتھ مین	شعبہ انتظامیہ / کالج کونسل کے سیکرٹری
ہارنگٹن	علم قانون اور آئین

ایشیاٹک اینول رجسٹر ۱۸۰۱ لندن (۱۸۰۲ء) صفحہ ۳۱ - ۳۲ کے مطابق ۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء تک فورٹ ولیم کالج کا انتظامی اور تدریسی عملہ مندرجہ بالا ناموں تک محدود تھا - ۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء کی میٹنگ میں کالج کونسل نے فارسی، عربی، ہندوستانی / اُردو اور بنگلہ شعبوں میں ایک ایک چیف منشی، ایک ایک سیکنڈ منشی اور طلبہ کی تعداد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ضرورت کے مطابق منشی بھرتی کرنے کا فیصلہ ہوا، لیکن چیف منشی اور سیکنڈ منشی سمیت اُن کی تعداد پچاس سے زیادہ نہ ہو۔ یوں شعبہ فارسی، ہندوستانی / اُردو، بنگلہ اور عربی کے لیے ایک ایک چیف منشی اور ایک ایک سیکنڈ منشی بھرتی کرنے کا فیصلہ ہوا، منشیوں کی تعداد شعبہ فارسی میں ۲۰، ہندوستانی / اُردو میں ۱۲، بنگلہ میں ۶ اور عربی میں چار تجویز کی گئی۔ چیف منشی دو سو روپے ماہوار، سیکنڈ منشی سو روپے ماہوار اور منشی چالیس روپے ماہوار بھرتی کیے جانے تھے۔

۴ مئی ۱۸۰۱ء کی میٹنگ میں ہندوستانی / اُردو زبان و ادب کے مندرجہ ذیل اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا چیف منشی کا عہدہ خالی رکھا گیا۔

میر بہادر علی حسینی نارنولی (سیکنڈ منشی) تاری چرن متر (سیکنڈ منشی) مرتضیٰ خاں (منشی) غلام اکبر (منشی) نصر اللہ (منشی) میر امن (منشی) غلام اشرف (منشی) جلال الدین (منشی) محمد صادق (منشی) رحمت اللہ خاں (منشی) غلام غوث (منشی) کندن لال (منشی) کاشی راج (منشی) میر حیدر بخش حیدری (منشی)

اس شعبے کے سربراہ ڈاکٹر جان بارتھوک گلکرسٹ کا تقرر بطور پروفیسر، ۱۸ اگست ۱۸۰۰ء میں ہوا تھا[۱۴] میر امن کا تقرر بطور منشی جیسا کہ ان کے اپنے بیان (دیباچہ "باغ و بہار") سے معلوم ہے، میر بہادر علی حسینی نارنولی کے توسط سے ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو بمشاہرہ ۴۰ روپے ماہانہ عمل میں آیا۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ملازمت پر باقاعدہ حاضری کے لیے کچھ وقت ضرور دیا گیا ہوگا۔

اتوار کا دن یومِ تعطیل تھا۔ صرف اتوار کو چھوڑ کر چیف اور سیکنڈ منشیوں کو چھٹیوں میں بھی صبح دس بجے سے ایک بجے تک کالج میں حاضر رہنا پڑتا تھا، تاکہ طلبہ جب چاہیں اُن سے مدد لے سکیں۔ ان کی چھٹی صرف پروووسٹ منظور کر سکتا تھا۔ سیکنڈ منشی، چیف منشی کے ماتحت تھے۔

منشیوں سے متعلق چارلس ڈوئلے اور کیپٹن ٹامس ولیمز لکھتے ہیں:

منشی صرف مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں۔ ہندو منشی بھی ہوتے ہیں، لیکن بہت کم۔ ان کا کام نہ تو مستقل ہے اور نہ ہی کسی فرقے یا اس کی کسی ذات تک ہی محدود ہے۔ منشی لوگ اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ ان کے لڑکے پڑھانے کے قابل بن جائیں لیکن اس میدان میں انھیں بہت سے ایسے دولت مند اشخاص سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو اپنے لڑکوں کو اچھی تعلیمی سہولیات فراہم کر سکتے ہیں۔ اس میں خرچ یقیناً زیادہ اُٹھتا ہے لیکن انھیں محنت بہت کم کرنی پڑتی ہے۔

منشیوں کا علم عام طور پر محدود ہوتا ہے۔ قرآن کے لمبے لمبے اقتباسات سنانے اور فارسی کی وہ چند کتابیں جو بھارت میں ملتی ہیں، ان کا معمولی علم ان کے حصے میں آیا ہے۔ زیادہ تر بڑے آدمیوں کی زندگیوں سے متعلق یا حافظ کی غزلوں سے شناسائی کے علاوہ خوشخط ہونا، علاقائی جھگڑوں سے واقفیت اور قلمی مخطوطات کا علم، جن کا متن انگریزی کی نہ پڑھی جا سکنے والی کتب کی طرح مشکل ہوتا ہے اور اس علم کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا — بس یہی کچھ مشرق میں عالم کہلائے جانے کے لیے کافی ہے۔ گہری واقفیت کی طرف وہ نہ صرف دھیان ہی نہیں دیتے بلکہ اس سے نفرت کرتے ہیں۔

منشی ہر روز ناشتے کے بعد سے دوپہر کے کھانے تک پڑھاتا ہے اور کبھی کبھار شام کو بھی۔ اس کی تنخواہ اس کے آقا کے عہدے یا آقا کی ہمت پر منحصر ہے۔ دس روپے سے لے کر چالیس یا پینتالیس روپے ماہانہ تک پاتا ہے۔ وہ سب نوکروں کا افسر سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے نوکر اس کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ بہت سے (بڑے عہدوں سے) متعلق طلبہ اُسے جوتے سمیت اپنے کمرے میں آ جانے دیتے ہیں، جب کہ کوئی دوسرا نوکر جوتا پہنے ہوئے کمرے میں آ جائے تو قابلِ نفرت خیال کیا جاتا ہے اور اُسے سخت سزا دی جاتی ہے۔

سرکاری شعبوں میں جو سیکڑوں منشی کام کرتے ہیں وہ عموماً بہت کم تنخواہ پاتے ہیں اسی لحاظ سے وہ اپنی پوشاک کی طرف سے بے خبر رہتے ہیں۔ وہ نہ تو کوئی عزت دار اشخاص ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی علمیت کا درجہ بلند ہوتا ہے کسی سمجھدار شخص کی باتوں سے واقفیت رکھنا دیسی لوگوں میں خاص طور پر بڑے لوگوں میں القابات کے استعمال سے متعلق حوصلہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ کسی طویل تحریر کا ½ حصہ تو ان کے القابات کی نذر ہو جاتا ہے) اور تیز پڑھنے کے ساتھ ساتھ سرعت کے ساتھ لکھنا ان کی خوبیاں سمجھی جاتی ہیں۔

زبانوں کا مطالعہ کرنے والے دوستوں کے منشی کے پاس ایک لڑکا نوکر رہتا ہے جو گھر آنے جانے کے وقت اس کے لکھنے کا سامان پکڑے رہنے کے ساتھ ساتھ اپنے آقا کے اُوپر چھتری تانے رہتا ہے۔ ان میں سے بہت سے لڑکے اپنے آقاؤں کی محنت اور مہربانی سے ٹوٹی پھوٹی فارسی جان جاتے ہیں اور وقت آنے پر دفتروں میں نوکری حاصل کرنے کے لیے کافی پڑھنا لکھنا سیکھ لیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو بڑے آرام کی اور اُونچی جگہوں پر پہنچ جاتے سُنے گئے ہیں[۱۵]،

قلمی آثار (مطبوعہ کتب)

میر امن نے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران دو کتابیں (فارسی سے آزاد ترجمہ) تیار کیں۔

۱۔ باغ و بہار (قصہ چار درویش "پر ۱۸۰۲ء میں نظرِ ثانی کے حوالے سے تاریخی نام "باغ و بہار" رکھا) سنہ تالیف
۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء،

طبع اول ہندوستانی پریس، کلکتہ ۱۸۰۳ء

۲۔ "گنج خوبی" (ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف "اخلاق محسنی" کا چالیس ابواب میں آزاد ترجمہ)

"اخلاق محسنی" کے ترجمے سے متعلق خود میر امن "گنج خوبی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"لیکن فقط فارسی کے ہو بہو معنی کہنے میں کچھ لطف روزمرہ نہ دیکھا، اس لیے اس کا مطلب لے کر اپنے محاورے میں سارا احوال بیان کیا۔"

عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ "گنج خوبی" فورٹ ولیم کالج سے شائع نہ ہو پائی۔[۱۶] جب کہ عتیق صدیقی نے ثابت کیا ہے کہ "گنج خوبی" کی اشاعت کی تکمیل فورٹ ولیم کالج کی طرف ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء تک ہو چکی تھی۔[۱۷]

اب ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ میرامن کی اس کتاب کا نہ صرف پہلا ایڈیشن بلکہ دوسرا ایڈیشن بھی فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہی طبع ہوا۔ پروسیڈنگز آف دی کالج فورٹ ولیم جلد ایک، امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ، نئی دہلی (بھارت) کے مطابق میرامن کا "اخلاق محسنی" سے ترجمہ ناگری لپی میں "گنج خوبی" کے نام سے جان گلکرسٹ نے پریس کے حوالے کر دیا تھا، جسے ۶۰۰ چوپیجی صفحات پر شائع ہونا تھا اور اس پر لاگت کا اندازہ ۴۰۰۰ روپے بتایا گیا تھا۔[۱۸]

"گنج خوبی" کا تیسرا ایڈیشن ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں مطبع محبوب بمبئی سے شائع ہوا۔

کالج کونسل کی کارروائیوں اور ہندی مینول ("HINDI MANUAL") مطبوعہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ ۱۸۰۲ء کے مطابق "باغ و بہار" کا پہلا نام "چار درویش" ہے اور پہلی بار ہرکارہ پریس کلکتہ سے طبع شدہ "ہندی مینول" کے ۱۰۲ صفحات اسی نام سے شائع ہوئے تھے۔ نظر ثانی (۱۸۰۲ء) کے بعد میرامن نے سالِ تصنیف ۱۸۰۲ء (جسے نظر ثانی کا سال کہنا مناسب ہوگا) کی مناسبت سے "باغ و بہار" کا نام دیا۔

یاد رہے کہ میرامن نے "باغ و بہار" کا اوّلین مسودہ "چار درویش" کے نام سے وسط ۱۸۰۱ء میں تیار کر لیا تھا۔ ۱۲ر جنوری ۱۸۰۲ء کو ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے زیرِ طبع کتابوں کی اشاعت کا تخمینہ کالج کونسل کے سامنے پیش کیا تھا جس کے مطابق (۱۲ر جنوری ۱۸۰۲ء کی تاریخ میں) "چار درویش" کے فارسی رسم الخط میں ۵۸ صفحات ہرکارہ پریس کلکتہ سے چھپ چکے تھے۔

اس رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ "چار درویش" کے چھوٹے چوتھائی کے ۳۲۴ صفحات پر مشتمل پانچ سو نسخوں پر تخمینہ اخراجات ۸۸۰۰ روپے تھا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے توقع ظاہر کی تھی کہ یہ کتاب اگست ۱۸۰۲ء میں شائع ہو جائے گی نیز ۱۲ر جنوری ۱۸۰۲ء کی اس رپورٹ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہرکارہ پریس کلکتہ کو چھ ماہ پہلے پرنٹ آرڈر دیا گیا تھا۔[۱۹] یوں وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ میرامن نے "چار درویش" ترجمہ کرنے کا کام اوائل مئی ۱۸۰۱ء میں شروع کر کے جولائی ۱۸۰۱ء میں اوّلین مسودہ تیار کر لیا تھا۔ انڈیا آفس کے مخطوطات کی فہرست بھی یہی ثابت کرتی ہے کہ "چار درویش" ۱۸۰۱ء میں ترجمہ/تالیف ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی کتابوں سے متعلق تخمینہ رپورٹ کے جواب میں یکم فروری ۱۸۰۲ء میں کالج کونسل کی طرف سے گلکرسٹ کے نام لکھی گئی چٹھی[۲۰] میں مندرجہ ذیل کتب کا حوالہ ملتا ہے:

۱۔ "بتیسی سنگھاسن"	(زیر طبع)	ہرکارہ پریس، کلکتہ	۳۶ مطبوعہ صفحات
۲۔ "شکنتلا ناٹک"	〃	کلکتہ گزٹ پریس	۲۴ مطبوعہ صفحات
۳۔ "اخلاق ہندی"	〃	ٹیلی گراف پریس کلکتہ	چھپائی کا آغاز
۴۔ "چار درویش"	〃	ہرکارہ پریس کلکتہ	۵۸ مطبوعہ صفحات
۵۔ "مثنوی میر حسن"	〃	کلکتہ گزٹ پریس	۳۶ مطبوعہ صفحات
۶۔ "گلستان"	〃	سپرو پریس، کلکتہ	چھپائی کا آغاز
۷۔ "توتا کہانی"	〃	ٹیلی گراف پریس، کلکتہ	چھپائی کا آغاز
۸۔ "ہندوستانی پرنسپلز"	〃	مارننگ پوسٹ پریس کلکتہ	۴۰ مطبوعہ صفحات

حکم دیا گیا تھا کہ محولہ بالا زیر طبع کتب کے جتنے اجزا چھپ چکے ہیں، ان میں سے "مرثیۂ مسکین" کے انتخاب کے نئے طلبہ کے لیے ضروری حصوں کو یکجا کر کے کُل ۵۰۰ صفحات کی صرف ایک کتاب تیار کروالی جائے اور اس کام پر دس ہزار روپے سے زیادہ خرچ نہ اُٹھے۔ واضح رہے کہ اس منظور شدہ رقم میں "مرثیۂ مسکین" کی اشاعت کا خرچ بھی شامل تھا چنانچہ یہ انتخابی مجموعہ ہندی مینول (HINDI MANUAL) کے نام سے ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں میر امن کی "چار درویش" کے ۱۰۲ صفحات شامل تھے۔ "چار درویش" کے ان ۱۰۲ صفحات کی طباعت پر ایک ہزار تین سو سینتیس روپے خرچ ہوئے۔ ۱۹ر فروری ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل کی منظوری کے بعد ۱۲ر اپریل ۱۸۰۲ء کو یہ رقم ہرکارہ پریس کو ادا کر دی گئی۔[۲۱]

یکم فروری ۱۸۰۲ء میں جب زیر طبع کتب کی اشاعت روک دی گئی تو میر امن نے "چار درویش" کے مسودے پر نظر ثانی کرکے بقول میر امن: "چار درویش" کے قصّے کو ہزار جدو کد سے اُردوئے معلّیٰ کی زبان میں "باغ و بہار" بنایا۔"

"باغ و بہار" کے اعداد اور خود میر امن کے بیان کے مطابق اس کا سنہ تالیف ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء ہے۔ اپنی دوسری تالیف "گنج خوبی" کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> "سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری مطابق ۱۸ سو دو عیسوی کے باغ و بہار کو تمام کرکے اس کو لکھنا شروع کیا۔"

یاد رہے کہ نظر ثانی کا کام جون ۱۸۰۲ء میں تمام ہوا۔

"باغ و بہار" فارسی قصّہ "چہار درویش" کا آزاد ترجمہ ہے، لیکن فارسی زبان سے براہ راست نہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حافظ محمود شیرانی کو "چار درویش" کا ایک فارسی نسخہ مصنفہ حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خاں ۱۱۴۶ھ مطابق ۱۷۳۳ء کا ملا تو اُنھوں نے اسے حکیم محمد علی کی تصنیف سمجھ کر "چار درویش" کا مصنفِ اوّل قرار دے دیا۔[۲۲] جب کہ ان کا یہ قیاس درست نہ تھا۔ مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ کے حبیب گنج انتخاب میں فارسی "چار درویش" (۱۱۲۴ھ مطابق ۱۷۱۲ء) کا ایک نسخہ (کل صفحات ۱۲۰) موجود ہے جس سے ثابت ہے کہ محمد علی مصنف نہیں محض راوی تھے۔

میر امن کی "چار درویش" یا "باغ و بہار" کی بنیاد میر حسین عطا خاں تحسین کی نوطرز مرصع ہے[۲۳] اگر میر امن نے اسے امیر خسرو

سے منسوب کیا تو اس میں ان کی جدّتِ طبع یا دروغ گوئی کو دخل نہ تھا، بلکہ اُنھوں نے محض ایک مقبول عام روایت کو نقل کیا۔ اب تک فارسی کے جس قدر نسخے ملے ہیں، ان کا اسلوب امیر خسرو کے اسلوب سے نہیں ملتا، اور نہ ہی تاریخ کی اس بات کا حوالہ دیتی ہے کہ اس نام کا کوئی قصہ امیر خسرو نے تصنیف کیا۔ یہ ایک مقبولِ عام روایت تھی کہ "قصہ چار درویش" امیر خسرو نے اپنے پیر و مُرشد نظام الدین اولیاء کی تیمار داری میں کہا۔ یاد رہے کہ بختیار نامے کے سببِ تالیف میں بھی ایک ایسی ہی حکایت درج ہے۔ قیاس غالب ہے کہ میرامن نے جیسا کہ اپنے بزرگوں سے سُنا ویسا لکھ دیا۔

> ۲۰ راگست ۱۸۰۴ء تک چوتھائی کی صورت میں "باغ و بہار" تقریباً چھپ چکی تھی۔ کالج ریکارڈ کے مطابق یکم اگست ۱۸۰۷ء کو "باغ و بہار" کی ۵۰ جلدیں فی جلد ۲۰ روپے کے حساب سے خرید کر حکومت تے بمبئی کی حکومت کو بھجوائیں۔ ۱۲ رفروری ۱۸۱۳ء کے فیصلے کے مطابق "باغ و بہار" کے نئے ایڈیشن کے لیے کالج کونسل نے مالی امداد دینا منظور کیا۔ اس طرح "باغ و بہار" کے ۱۹ رمارچ ۱۸۱۳ء کی سو جلدوں والے ایڈیشن کے لیے ایک ہزار سات سو سولہ روپے دیئے گئے اور کیپٹن روبک نے "باغ و بہار" کے اس ایڈیشن کی درستگی کے لیے مزید رقم کا مطالبہ کیا۔

کالج کونسل نے ۲ رنومبر ۱۸۰۱ء کو ایک تجویز منظور کی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ: "دیسی زبانوں میں ادبی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی ہمت افزائی کے خیال سے متبحر دیسی لوگوں کو انعامات دیئے جائیں گے۔ کالج کونسل کے نام میرامن کی لکھی ہوئی حسب ذیل عرضی، "باغ و بہار" کی بیشتر اشاعتوں میں شامل کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

میرامن دِلّی والے
بقلم خود
عرض

جو
مدرسے کے مختار کار صاحبوں کے حضور میں دی گئی،

صاحبانِ والا شان، نجیبوں کے قدر دانوں کو خدا سلامت رکھے۔ اس بے وطن نے حکم اشتہار کا سُن کر چار درویش کے قصے کو ہزار جدّ و کد سے اُردوئے معلّیٰ کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔ فضل الٰہی سے سب صاحبوں کے سیر کرنے کے باعث سرسبز ہوا۔ اب اُمیدوار ہوں کہ اس کا پھل مجھے بھی ملے تو میرا غنچۂ دل مانندِ گل کے کھلے۔ بقول حکیم فردوسی کے کہ شاہنامے میں کہا ہے:

بسے رنج بُردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بہ ایں پارسی
سو اُردو کی آراستہ کر زبان
کیا میں نے بنگالا ہندوستان

خداوند آپ قدردان ہیں، حاجت عرض کرنے کی نہیں۔ الٰہی تارا اجبال کا چمکتا رہے۔[۲۴]"

واضح رہے کہ یہ وہ عرضی ہے جو میرامن نے چار درویش پر نظرِ ثانی کا کام ختم کرنے کے بعد ۱۴ رجون ۱۸۰۲ء کو "باغ و بہار" کے مسودے کے ہمراہ ڈاکٹر گلکرسٹ کے ذریعے کالج کونسل کو بھجوائی۔

اس عرضی کے جواب میں ۱۴ رجون ۱۸۰۲ء کے اجلاس میں کالج کونسل نے میرامن کو ۵۰۰ روپے انعام دینا منظور کرتے ہوئے لکھا:

"فاضل دیسی میرامن، جو کالج سے وابستہ ہیں۔ ان کو چار درویش کے ہندوستانی ترجمے کے لیے، جسے ہندوستانی پروفیسر نے آج ہی پیش کیا ہے، پانچ سو روپے بطور انعام دیئے جائیں گے۔[۲۵]"

اس تحریر کی داخلی شہادت سے پتا چلتا ہے کہ میرامن کو یہ انعام "باغ و بہار" کے مسودے پر دیا گیا، نہ کہ مطبوعہ کتاب پر۔ اگر کتاب ڈاکٹر گلکرسٹ مطبوعہ کتاب پیش کرتے تو کتاب کا حوالہ موجود ہوتا۔ نیز یہ کہ اس دور میں "باغ و بہار" کی ضخامت کی کتاب تقریباً ایک سال میں چھپ کر تیار ہوتی تھی۔[۲۶]

میرامن کو "باغ و بہار" کے مسودے پر انعام ملا تو فورٹ ولیم کالج کے دیگر دیسی علما نے بھی ڈاکٹر گلکرسٹ کے توسط سے اپنے مسودات کالج کونسل کو بھجوائے۔ اس کا ثبوت ڈاکٹر گلکرسٹ کی وہ چٹھی ہے جو ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل کے نام لکھی گئی۔[۲۷]

ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے مسودات پر تاری چرن منز، مولوی امانت اللہ، سدل مصر پنڈت، شری لال کوی اور مرزا کاظم علی جواں کے ناموں کی سفارش کی تھی جب کہ میر بہادر علی حسینی کے لیے لکھا تھا کہ اگر انھیں انعام نہ دیا جائے تو کم از کم ان کی تنخواہ ۸۰ روپے ماہوار سے ۱۰۰ روپے ماہانہ کردی جائے۔ دوسرے لفظوں میں ڈاکٹر گلکرسٹ نے ۱۹ راگست ۱۸۰۳ء میں میر بہادر علی حسینی نارنولی کو حیثیت منشی بنانے کی سفارش کی تھی۔[۲۸]

ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی اس چٹھی کے جواب میں کالج کونسل نے لکھا کہ:

"کونسل کا یہ ارادہ کبھی نہیں تھا کہ جو دیسی علما رکالج سے مقررہ تنخواہ پاتے ہیں انھیں بھی انعام دیا جائے یا غیر مکمل یا مذکورہ کتب کے لیے پہلے سے ہی انعام کا اعلان کر دیا جائے۔ کونسل محنتی اور قابل اشخاص کو جنھیں کالج سے اچھی تنخواہ نہ مل رہی ہو، کبھی کبھی خاص مواقع پر انعام دینے کے لیے تیار ہے۔[۲۹]"

اس چٹھی کی آخری سطر میں واضح طور پر میرامن کی حوصلہ افزائی کا حوالہ موجود ہے۔

۱۶ رستمبر ۱۸۰۵ء میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے مستعفی ہونے کے بعد ہندوستانی شعبے کے نئے پروفیسر کیپٹن جیمز موئٹ تھے۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۰۵ء کی کالج کونسل کی میٹنگ میں پروفیسر کیپٹن جیمز موئٹ نے ہندوستانی شعبے کے منشیوں کی جو تفصیل لکھ کر پیش کی تھی اس میں میرامن کو ڈورن (DOR ۱۸۰۷) ظاہر کیا گیا تھا اور ان کی تنخواہ ۸۰ روپے ماہانہ بتائی گئی تھی۔[۳۰] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۳۰ رستمبر ۱۸۰۵ء تک میرامن منشی کے عہدے سے

ترقی پاکر سیکنڈ منشی مقرر ہو گئے تھے۔

رسالہ "ہماری زبان" علی گڑھ میں فورٹ ولیم کالج کونسل کے ریکارڈ کا حوالہ دے کر لکھا گیا ہے کہ:

> "۴؍ جون ۱۸۰۶ء کو فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبہ کے پروفیسر کی شکایت پر کہ میرامن نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کیا ہے۔ کالج کونسل کے سامنے پیش کیے گئے الزامات کو تسلیم کرتے ہوئے پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا انھوں نے عذر پیش کیا۔ ان کا بیان سننے کے بعد کالج کونسل اس نتیجے پر پہنچی کہ میرامن کالج کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے خواہش مند معلوم ہوتے ہیں، طے پایا کہ اس مہینے کی تنخواہ کے علاوہ اور چار مہینوں کی تنخواہ دے کر کالج کی خدمات سے ان کو سبکدوش کیا جائے۔
>
> (فورٹ ولیم کالج کی کارروائیاں جلد دوم ۱۰۶) اس تاریخ کے بعد ان کا نام کالج کونسل کی کارروائیوں میں نہیں ملتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کالج سے نکلنے کے بعد کہاں گئے اور کب تک زندہ رہے؟[۳۱]"

۴؍ جون ۱۸۰۶ء کی میٹنگ میں کالج کونسل نے میرامن کو اُن کی خواہش کے مطابق چار ماہ کی تنخواہ مبلغ ۳۲۰ روپے مع جون ۱۸۰۶ء کی پوری تنخواہ ۸۰ روپے ادا کر کے کالج کی ملازمت سے الگ کر دیا۔[۳۲]

"تذکرہ ہمیشہ بہار" از نصر اللہ خاں خواجگی اور "مواقیت الفوائح" از مولوی مجتبیٰ علی خاں جو فاموی کے دو تذکرے ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء یا ۱۸۰۳ء میں میرامن کی وفات بتاتے ہیں جو درست نہیں۔ یہ بات بھی تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ میرامن محض ۵۶ برس کی عمر میں درس دینے کے قابل نہ رہے تھے۔ فورٹ ولیم کالج سے میرامن اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے مستعفی ہونے کا انداز ملتا جلتا ہے۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی کالج کونسل سے نہ بنی اور میرامن کو نئے صدر شعبہ پروفیسر کیپٹن جیمز موئٹ سے نباہ مشکل نظر آیا۔

میرامن جو "باغ و بہار" کے ترجمے پر نقد انعام پانے والے اوّلین منشی تھے، نیز ان کی کتاب "باغ و بہار" فورٹ ولیم کالج کی بہترین کتاب کا اعزاز حاصل کر چکی تھی۔ اگر اس پر بھی میرامن بطور سیکنڈ منشی ۸۰ روپے ماہانہ پر کام کرتے رہے تو اس میں ان کی اعلیٰ ظرفی اور ایک حد تک مجبوری اور مفلسی کو دخل تھا۔ اب نئے صدر شعبہ نے جب ان کے ساتھ عام منشیوں والا برتاؤ روا رکھا تو اُن کا بددل ہونا یقینی تھا۔ پھر یہ وہ دور ہے جب لکھنؤ اور حیدرآباد دکن کے رؤسا نے نجی رصدگاہیں قائم کرنا شروع کر دی تھیں اور اُن کے دارالتراجم میں اعلیٰ درجے کے مترجمین کی کھپت ممکن تھی۔ پھر اس بات کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ۲۱ مئی ۱۸۰۶ء میں ہیلی بری (برطانیہ) کے مقام پر فورٹ ولیم کالج طرز کے ایک ادارے کے قیام کا فیصلہ ہو چکا تھا اور فورٹ ولیم کالج کا مستقبل تاریک تھا۔

ایسے میں اگر میرامن نے جان بوجھ کر پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا عذر پیش کیا تو بعید از قیاس نہیں۔ خود ڈاکٹر جان گلکرسٹ جیسے نمایاں پروفیسر کو بھی فورٹ ولیم کالج کی ملازمت چھوڑنے کے لیے جسمانی معذوری کا بہانہ بنانا پڑا۔

ملازمت سے مستعفی ہونے سے متعلق میرامن کا فیصلہ بروقت تھا، اس لیے بھی کہ صرف چھ ماہ بعد جنوری ۱۹۰۷ء م
فورٹ ولیم کالج کے اخراجات گھٹانے کا حکومتی فیصلہ سامنے آیا تو کالج کے عملے میں تخفیف کر دی گئی اور منت
منشی جبری طور پر ریٹائر کر دیے گئے۔

۶ رجون ۱۸۰۶ء کے بعد فورٹ ولیم کالج کا ریکارڈ میرامن سے متعلق ہماری راہنمائی نہیں کرتا۔ اب لازم ہے
میرامن اپنی خواہش کے مطابق ملازمت سے علاحدگی کے بعد ریٹائرمنٹ کی زندگی بھی گزار سکتے ہیں اور کسی نئے دارالتا
کا رُخ بھی کر سکتے ہیں۔ "باغ و بہار" اور "گنج خوبی" کے دیباچوں نیز "باغ و بہار" کے مسودے پر انعام کے لیے لکھی گ
درخواست میں وہ کثیر العیال اور ضرورت مند ہی دکھائی دیتے ہیں، اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے دو
راہ اختیار کی ہوگی۔

میرامن سے متعلق ایک حوالہ گارسیں دتاسی کے ہاں ملتا ہے[۳۳]۔ اُنھوں نے مشہور ریختی گو شاعر میر یار علی جان صاحب
کو ریختی کے حوالے سے شاعرہ تصوّر کر کے میرامن کی بیٹی لکھا ہے۔ جس کا ہمارے محققین نے خوب مضحکہ اُڑایا۔ لیکن اتنا
کیا کہ میرامن سے متعلق اس حوالے کو جان صاحب کے حالاتِ زندگی سے جوڑ کر ہی دیکھ لیتے۔ اس لیے کہ جان صاحب
سے متعلق تو تذکرے خاموش نہیں۔

۱۔ عبدالغفور نساخ مؤلف "سخن شعراء" لکھتے ہیں:

"جان صاحب: میر یار علی خلف میرامن لکھنوی شاگرد عاشور علی خاں بہادر، ریختی اپنے طرز پر بہت خوب کہتے تھے[۳۴]"

۲۔ سیّد محمد محسن نقوی الٰہ آبادی مرتب "تاریخِ ریختی مع دیوان جان صاحب" کے مطابق۔

"ان کے والد میرامن تو فرخ آباد کے رہنے والے تھے، لیکن یہ بچپن ہی میں لکھنؤ پہنچ گئے۔ یہیں اُن کی تعلیم تربیت ہوئی[۳۵]"

۳۔ محمد عبداللہ خاں خویشگی مؤلف "فرہنگِ عامرہ" نے اُردو زبان کے اربابِ قلم کی فہرست میں میر یار علی جان صاحب کے والد کا نام میرامن بتایا ہے[۳۶]۔

۴۔ نادم سیتاپوری نے میرامن کو ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء یا ۱۸۱۸ء تک حیات بتایا ہے[۳۷]۔

مقامِ حیرت ہے کہ ہمارے محققین نے میرامن کو ۱۸۰۶ء کے بعد زندہ تصوّر نہیں کیا۔ جب کہ ان کے حیات ہونے
شواہد موجود ہیں۔ مولوی سیّد محمد محسن نقوی الٰہ آبادی مرتب "تاریخ ریختی معہ دیوان جان صاحب" لکھتے ہیں:

جان صاحب کی ولادت فرخ آباد میں غالباً ۱۲۳۴ھ (۱۹ - ۱۸۱۸ء) میں ہوئی تھی۔ نام تو ان کا میر یار علی
گر والدین پیار سے جان صاحب کہتے تھے۔ اسی لیے ریختی کی مناسبت سے اسی عرف کو تخلص قرار دیا۔ ان کے و
میرامن تو فرخ آباد کے رہنے والے تھے لیکن یہ بچپن ہی میں لکھنؤ پہنچ گئے تھے"۔ (صفحہ ۳۹ یا ۴۰ سے اقتباس)

اس تحریر سے میرامن کا ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۸ء میں فرخ آباد سے متعلق ہونا ثابت ہے جب کہ نواب فخرالدین خاں المخاطب بہ شمس الامراء حیدرآباد دکن کی مرتب کردہ کتاب "ستہ شمسیہ" کے دیباچے میں درج ہے کہ ریوی رنٹ چارلس کی طبیعیات سے متعلق کتاب (مطبوعہ ۱۸۱۸ء لندن) حیدرآباد دکن پہنچی تو اسے اُردو میں ترجمہ کروانے کا کام منشیان کو سونپا گیا۔ ستہ شمسیہ جلد ۵ (انظار) صفحات ۱۷۴ کا ایک قلمی نسخہ مرقومہ ۱۸۱۸ء انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ وہی سال بنتا ہے جب جان صاحب کی فرخ آباد (صوبہ جات متحدہ کا ایک ضلع فتح گڑھ کا صدر مقام) میں ولادت ہوئی اور اس کے بعد بچپن میں ہی جان صاحب کو لکھنؤ بھیج دیا گیا۔ قیاس غالب ہے کہ جان صاحب میرامن کے بیٹے تھے۔ میرامن کے اصل نام میرامان علی کی مناسبت بیٹے کا نام میر یار علی (عرف جان صاحب) بھی اس قیاس کو تقویت پہنچاتا ہے۔ پھر جان صاحب کی ولادت ۱۹-۱۸۱۸ء کی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ میرامن فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے مستعفی ہونے کے بعد کچھ عرصہ فرخ آباد میں مقیم رہے اور اس کے بعد بطور مترجم دارالترجمہ شمس الامراء حیدرآباد دکن سے منسلک ہوگئے۔ اُنھوں نے اہل و عیال کو لکھنؤ میں چھوڑا اور خود دارالترجمہ کا کام کرتے رہے۔ بہت ممکن ہے میرامن کے لکھنؤ سے اس تعلق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عبدالغفور نساخ نے "سخن شعراء" (مرقومہ ۱۸۶۴ء) میں میرامن کو میرامن لکھنوی لکھا ہو۔

حیدرآباد دکن میں شمس الامراء کا سنگی چھاپہ خانہ ۱۸۲۰ء میں قائم ہوچکا تھا۔ صاف ظاہر کہ اسی سال اس چھاپہ خانے سے "مدرسۂ فخریہ" کا اولین نصاب شائع ہونا شروع ہوگیا ہوگا اور نصاب ساز کمیٹی نے کم از کم برس بھر پہلے ابتدائی نصاب تیار کرلیا ہوگا۔ میرامن کا فورٹ ولیم کالج سے وابستہ رہنا اس زمانے میں ایک بڑی کوالیفکیشن تھی نیز یہ کہ میرامن کی "باغ و بہار" "ہائی پروفیشنسی" اور "ڈگری آف آنرز" کے امتحانات کی نصابی کتاب تھی۔ "باغ و بہار" کے تراجم غیر ملکی زبانوں خصوصاً ارمنی، لاطینی، پرتگالی اور انگریزی میں یا تو ہوچکے تھے یا ہوا چاہتے تھے۔ ۱۸۳۶ء میں پرتگالی مستشرق پی۔ ایس دی روزاریو نے "باغ و بہار" کو لاطینی رسم الخط میں کلکتہ سے شائع کروایا تھا۔ بعد میں اسی ایڈیشن کو معمولی سی تبدیلی کے ساتھ مونیر ولیمز نے چارلس ٹریویلین کی فرمائش پر دوبارہ طبع کروایا جب کہ ڈنکن فاربس نے لاطینی رسم خط میں لندن سے ۱۸۴۶ء میں "باغ و بہار" کا ایک مستند ایڈیشن شائع کیا۔ ولیم ہنٹر کی "ہندوستانی ڈکشنری" میں لفظوں کے خیال کے سلسلے میں جن ۴۲ کتب سے استفادہ کیا گیا۔ ان میں "باغ و بہار" شامل تھی۔

پروفیسر ڈنکن فاربس ایل ایل ڈی کنگز کالج لندن، ممبر رائل ایشیاٹک سوسائٹی برطانیہ و آئرلینڈ کے مطابق ۱۸۰۳ء میں جونیئر انگریز ملازمین کی نصابی کتاب تجویز کیا تھا۔ ۳۱ مئی ۱۸۴۴ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز نے جنرل آرڈر مجریہ ۹ رجنوری ۱۸۳۷ء کی رُو سے جونیئر ملازمین کے علاوہ تمام ملٹری اور میڈیکل جونیئر آفیسرز کے لیے ہندوستانی (اُردو) میں امتحان پاس کرنا لازمی قرار دیتے ہوئے اُمیدواروں کے نصاب میں "باغ و بہار" اور "بیتال پچیسی" کا ترجمہ اور کتاب خوانی ضروری قرار دیا۔[۴۶]

قرینِ قیاس ہے کہ شمس الامراء کی طرف سے میرامن کو ۱۸۰۶ء میں ہی ملازمت کی یقین دہانی کرائی گئی ہوگی جس کا

نتیجہ میرامن کے استعفا کی صورت میں ظاہر ہوا، اور میرامن کلکتے سے فرخ آباد پہنچے اور اس کے بعد اپنے اہل وعیال کو لکھنؤ میں چھوڑ کر ۱۸۲۰ء سے قبل حیدرآباد دکن چلے آئے اور مدرسہ فخریہ شمس الامرا کی نصاب ساز کمیٹی میں شامل ہو گئے۔ یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا تالیف و ترجمہ کردہ ادب انگریزی سرکار کی وضع کردہ مخصوص تعلیمی پالیسی کے تحت سطحیت کا رجحان پیدا کر رہا تھا۔ نواب فخرالدین خاں شمس الامرا ثانی نے یہ سب دیکھتے ہوئے اپنے علاقے میں داستانوی قصوں کے مقابلے میں سائنٹیفک سوچ کو عام کرنے کی خاطر ۱۸۳۴ء میں "مدرسہ فخریہ" اور سائنسی علوم کی ترویج کے لیے رصدگاہ "جہاں نما" حیدرآباد دکن میں قائم کی۔ مدرسہ فخریہ کے نصاب میں یورپی دانش گاہوں کی نصابی کتب کو شامل کیا اور حیدرآبادی طالب العلموں میں سائنٹفک سوچ کو عام کرنے کی خاطر مغربی علوم و فنون کی نصابی کتب کو مقامی اور فرانسیسی مترجمین سے ترجمہ کروا کر ذاتی سنگی چھاپہ خانے (قیام: ۱۸۲۰ء) سے شائع کیا۔

دارالترجمہ شمس الامرا، حیدرآباد دکن سے میرامن کے منسلک رہنے کی یادگار "ستہ شمسیہ" نامی کتاب ہے۔ اس کتاب میں شمس الامرا ثانی نواب محمد فخرالدین خاں نے ریوری رنٹ چارلس کے، سائنسی رسائل (مطبوعہ ۱۸۱۸ء لندن) کا انگریزی ترجمہ کروا کر ۸"/۵" کی تقطیع پر ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں اپنے سنگی چھاپہ خانے سے طبع کروایا۔ دوسری اور تیسری بار یہ کتاب اسی چھاپہ خانے سے ۱۲۶۶ھ مطابق ۵۰-۱۸۴۹ء میں چھپی۔ اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن ۱۲۷۲ھ مطابق ۵۶-۱۸۵۵ء میں مدراس کے مطبع اسلامیہ میں شائع ہوا۔ پانچواں ایڈیشن ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء دہلی سے شائع ہوا۔ چھٹا اور ساتواں ایڈیشن ۱۳۱۶ھ مطابق ۹۹-۱۸۹۸ء میں منشی منیر احمد کے مطبع سے شائع ہوئے۔ خطِ نسخ میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ سائز ۸×۵ ½ صفحات ۲۸۴، نمبر شمار ۵۴۲ (۳۲ احدید) کے تحت اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد آندھرا پردیش کے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

"ستہ شمسیہ" نامی کتاب میں ریوری رنٹ چارلس کے سات رسائل کا اُردو ترجمہ پیش کیا گیا، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ رسالہ علم جرثقیل (ترجمہ) مطبوعہ: سنگی چھاپہ خانہ شمس الامرا حیدرآباد دکن، ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء۔
۲۔ رسالہ علم ہیئت (ترجمہ) مطبوعہ: سنگی چھاپہ خانہ شمس الامرا حیدرآباد دکن، ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء۔
۳۔ رسالہ علم آب (ترجمہ) مطبوعہ: سنگی چھاپہ خانہ شمس الامرا حیدرآباد دکن (۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء۔)
۴۔ رسالہ علم ہوا (ترجمہ) مطبوعہ: سنگی چھاپہ خانہ شمس الامرا حیدرآباد دکن، ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء۔
۵۔ رسالہ علم مناظر (ترجمہ) مطبوعہ: سنگی چھاپہ خانہ شمس الامرا حیدرآباد دکن، ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء۔
۶۔ رسالہ علم برق (ترجمہ) مطبوعہ: سنگی چھاپہ خانہ شمس الامرا حیدرآباد دکن، ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء۔
۷۔ ریوری رنٹ چارلس کا سوالات و جوابات سے متعلق مکمل رسالے کا ترجمہ اس کے علاوہ ہے، جس کے چھ حصے الگ کر کے علم جرثقیل، علم ہیئت، علم آب، علم ہوا، علم مناظر اور علم برق نامی رسائل کے آخر میں شامل کر دیا گیا۔

یوں ان چھ رسائل میں ۱۸۷۱ صفحات کا انگریزی سے ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

میرامن غلام محی الدین متین حیدرآبادی، مسٹر جولس اور موسیو تندرس کی مشترکہ کاوش، ستہ شمسیہ از ریوری رنٹ چارلس

کے سائنسی رسائل کی تفصیل درج ذیل ہے :

۱۔ رسالہ علم جرثقیل :

"یہ ستہ شمسیہ" سلسلے کی پہلی جلد ہے جو ۸"/۵" کی تقطیع پر ۲۰۷ صفحات کی کتاب ہے۔

صفحہ ایک اور دو سے اقتباس ملاحظہ ہو :۔

" اس میں ہیولا اور اس کے انقسامات بے نہایت اور کشش انجذاب اور کشش ثقل اور مرکز ثقل اور کمیات حرکت اور جرثقیل کی تمام قوتوں اور شاقول کا بیان ہے۔"

طلبہ کے واسطے سرکار شمس الامراء بہادر امیر کبیر کے سنگی چھاپہ خانے میں شہر فرخندہ بنیاد حیدر آباد کے درمیان سنہ ۱۲۵۶ھ میں مطبوع ہوئی۔"

ابتدا میں ۳ صفحات کی فہرست، کتاب کے آخر میں تین صفحات کا غلط نامہ اور ۲۴ صفحات میں علم جرثقیل کے آلوں کی ۳۰ اشکال کو لیتھو میں چھاپ کر شامل کتاب کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں "پوشیدہ نہ رہے" کے عنوان کے تحت ذیل عبارت شامل کتاب ہے :

"حکیم دلوری رنٹ چالس صاحب نے ۱۸۱۸ء میں سات کتابیں علوم ریاضی کی تیار کر کے جو چھپوائی تھیں اُن میں سے چھ کتابیں ترجمہ کر کے ستہ شمسیہ نام رکھا گیا اور باقی ساتویں کتاب تعریفات اور سوالات علوم مذکور میں اس واسطے لکھی تھی کہ علوم مذکور کی تحصیل کے بعد شاگردوں سے ہر ہر علم کے امتحان کے لیے سوال کے جواب اسکاران سے سُننے کہ یاد ہے یا نہیں اور ہم نے اس حکیم کے آئین کو بہتر جان کے ساتویں کتاب کا بھی ترجمہ کیا۔ مگر اس میں سے ہر ہر علم کی تعریفات اور کیفیات اور سوالات علیحدہ کر کے ہر علم کے رسالے میں اسطور شریک کیے کہ آغاز رسالے میں دیباچہ کے بعد تعریفات اور کیفیات اور آخر رسالے میں سوالات اس کے داخل کرنے میں آئے تا اُستاد ہر علم کی تعلیم کے بعد اسی کتاب سے شاگردوں سے سوالات کر کے جوابات پوچھے تا دوسری کتاب سے سوالات کی احتیاج نہ ہو۔ تمت بالخیر۔"

ترجمے سے مثالیں ملاحظہ ہوں :

"عرض خدمت رکھتا ہوں۔"

"آپ نے یہ بات پرسوں کے دن فرمائے تھے۔"

"متوجہ طرف تمہاری تعلیم کے ہوتا ہوں۔"

"سانحہ ایسے ہی اعلیٰ مراتب کے متصف ہے۔"

کتاب میں شامل اکثر الفاظ اور املا کا استعمال اب متروک ہے، مثلاً :

وہ کی بجائے وے
کو کی بجائے تئیں
مٹی کی بجائے ماٹی
کنوئیں کی بجائے کوّے
بحث کی بجائے تکرار
کسی کو کی بجائے کسو کو
بند ہونا کی بجائے موندھنا
ان سے کی بجائے ون سے

اسی طرح عبارت میں شامل اکثر حروف اور الفاظ کا رسم الخط بھی مختلف ہے مثلاً .

ٹ ـــــ ت
ڑ ـــــ ڗ
ٹوٹ ـــــ توٹ
سنئے ـــــ سنے
فٹ ـــــ فوٹ

چند انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

پڈین	PUDDING
چوب شولہ	CORK
اسفنج	SPUNGE
خط راہ	LINE OF DIRECTION
ایئر پمپ	AIR PUMP

(۲) رسالہ علم ہیئت

بستۂ شمسیہ، سلسلے کی دوسری جلد ہے جو ۸"/۵" کی تقطیع پر ۲۴۴ صفحات کی کتاب ہے۔
صفحہ ۲ سے اقتباس ملاحظہ ہو :

”دوسری جلد بستۂ شمسیہ“ کی جو علم ہیئت میں ہے..... طلبہ کی تعلیم کے واسطے سرکار شمس الامراء بہادر امیر کبیر کے سنگی چھاپے خانہ میں شہر فرخندہ بنیاد حیدر آباد کے درمیان ۱۲۵۶ھ میں مطبوع ہوئی۔“

ابتدا میں دیباچہ اور فہرست کے ۱۲ صفحات، آخر میں دو صفحات کا غلط نامہ اور ۴ صفحات پر کتاب کے متن سے متعلق ۲۰ اشکال کو شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ جملہ کتاب ۲۶ گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔

نمونۂ عبارت ملاحظہ ہو :

”پیش از طلوع آفتاب جب مشرق طرف نظر آتا ہے۔ ستارہ صبح گاہی اور جب بعد از غروب آفتاب مغرب طرف دکھلائی دیتا ہے۔ ستارۂ شام گاہی کہلاتا ہے۔ پس جب زہرہ اگلے مقام میں ہوتا ہے۔ بشرطیکہ نقطہ تقاطع پر نہ ہووے ناظر زمین کی نظر سے بالکل محجوب۔“

پہلی گفتگو سے بھی ایک اقتباس دیکھتے چلیے :

”تلمیذ کلاں ۔ قبلہ و کعبہ آج کی شب آسمان اس قدر صاف اور غبار سے پاک ہے کہ کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔“

”تلمیذ خرد ۔ جناب واقعی بھائی نے سچ عرض کیا بسبب کثرت صفائی کے بندہ بھی جس قدر چہار سو نظر کرتا ہے تارے بے حد نظر آتے ہیں، ان کو کس طور شمار کرنا کیونکہ سنتا ہوں اُستادوں نے ان کو شمار کیا ہے، ...... اس مقدمہ مشکل کی راہ دریافت مجھ پر روشن فرمایئے ۔“

”اُستاد ——— ابھی نہیں چند روز توقف کرو .... بالفعل اور ایک امر کی تعلیم تم کو میری مدِ نظر ہے سنو جب ہم شب کو اُوپر کی طرف یعنی منتہائے مد نظری سر پر کا جس کو آسمان کر تعبیر کرتے ہیں.... فقط آنکھ سے دیکھتے ہیں وے نجوم بے حد جو ہم کو نظر آتے ہیں صرف باصرے کا دھوکا ہے ...... بدون استعانت دُوربین کے ہزار سے زیادہ تارے نہیں نظر آتے۔ پس یہاں سے ثابت ہوا کہ ظاہراً ہم کو جتنے تارے نظر آتے ہیں دراصل وے سب تارے نہیں ہیں بلکہ تخلیہ باصرے کا ہے۔“

کتاب میں شامل غلطت ۔ کسو ۔ تئیں لگے ۔ ونکے جیسے متروک الفاظ ہیں۔

۳ ۔ رسالہ علم آب :

یہ ’ستۂ شمسیہ‘ سلسلے کی تیسری جلد ہے جو ″۸/″۵ کی تقطیع پر ۲۱۲ صفحات کی کتاب ہے۔ آخر میں ۴ صفحات کا غلط نامہ اور تین صفحات پر علم آب سے متعلق ۳۶ اشکال کو شامل کتاب کیا گیا ہے۔ کتاب کے کچھ صفحات کے حاشیہ پر ”ستۂ شمسیہ“ سلسلے کی دیگر کتب کے حوالے بھی شاملِ کتاب ہیں ۔

نمونہ عبارت ملاحظہ ہو :-

”کسب کیسا ہی آسان ہو نہیں سمجھنا کہ اس کے عمل میں کچھ خطر نہیں چنانچہ لکھا ہوا دیکھنے میں آیا ہے ۔ حکیم اسپالڈین اور اس کا مددگار دے دونوں اپنے بنائے ہوئے آلے میں بیٹھ کر جہاز شکستہ اور ڈوبے

ہوئے مال کے نکالنے کے واسطے دو بار دریا کے اندر جا کر نکلے اور دفعہ سوم جو ڈوبے ایک ساعت تک رہے جب وقت بہت گزرا اور اُوپر کے مددگاروں نے کچھ اشارہ مراجعت کا نہیں پایا، آدغوطہ زنی کو اوپر کھینچا مر دونوں کی رُوح پرواز ہو گئی تھی۔"

کتاب میں برتے گئے متروک الفاظ درج ذیل ہیں :

ماٹی ——— مٹی
قیمت دار ——— قیمتی
وسکا ——— اس کا
دوڑنے لاگا ——— دوڑنے لگا
جاگہ ——— جگہ

عبارت میں بعض جگہوں پر 'نے' کا استعمال ہی نہیں کیا گیا مثلاً

"اُوپر آپ فرمائے تھے"

اسی طرح لفظ 'کر' کا استعمال ملاحظہ ہو :

' امتحان کر دکھلائیے '   (امتحان کر کے دکھلائیے)

کتاب میں برتی گئی چند انگریزی اصطلاحوں کا اُردو ترجمہ دیکھتے چلیے :

زبردستی کا پمپ - FORCE PUMP
ہیڈرامیٹر - HYDRAMETRE
علم آب - HYDROSTATICS
علم آب کی ترازو - HYDROSTATIC BALANCE
چُوسنے کا پمپ - SUCKING PUMP

۴ - رسالہ علم ہوا :

"یہ 'ستہ شمسیہ' سلسلے کی چوتھی جلد ہے جو ۵"/۸" کی تقطیع پر ۳۳۵ صفحات کی کتاب ہے۔ دیباچہ کے علاوہ آخ
۴ صفحات کا غلط نامہ اور ۵ صفحات پر علم ہوا سے متعلق ۳۴ آلوں کے نقشے شامل کتاب کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی اُ
اور شاگرد کی گفتگو کے انداز میں لکھی گئی ہے۔

۲۳ ویں گفتگو سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :-

"تلمیذ خرد حضرت بیرامیٹر کی معنی بیان کیجیے۔؟

اُستاد : "یہ لفظ یونانی ہے اور اس کی معنی آتش پیما ہے اور یہ ایک آلہ ہے منجملہ چیزوں علی الخصوص معدنیات کے بڑھاؤ کی پیمائش کے واسطے جو بہ سبب گرمی کے ان کو حاصل ہوتا ہے۔ اور چیزیں کتنی بھی تھوڑی پھیلیں اس آلے کی استعانت سے نمیوں شکل کی مانند فقط آنکھ سے نظر آویں گی۔"

کتاب میں بعض مقامات پر حاصل مصدر کی بجائے مصدر کا استعمال کیا گیا ہے مثلاً :

"تعجب ہے کہ گونجنا اکثر سننے میں کیوں نہیں آتا۔"

بعض الفاظ کی جمع دکنی قاعدہ کے مطابق بنائی گئی ہے مثلاً سیخ سے سیخاں اور شاخ سے شاخاں ۔

(۵) رسالہ علم مناظر :

یہ "ستہ شمسیہ" کے سلسلے کی پانچویں جلد ہے جو ۸″ / ۵″ کی تقطیع پر ۲۷۷ صفحات کی کتاب ہے۔ شروع میں دیباچہ اور تعریفات علم مناظر کے علاوہ آخر میں ۸ صفحات کا غلط نامہ اور متن کے متعلق ۴۲ اشکال شامل کتاب ہیں۔ پاری رنٹ چارلس کی اصل کتاب میں علم مقناطیس سے متعلق مختصر رسالہ بھی شامل تھا جسے اس سے الگ کر کے "ستہ شمسیہ" سلسلے کی چھٹی جلد میں داخل کر دیا گیا۔

یہ کتاب بھی سوال و جواب کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ پندرہ[15] ویں گفتگو سے اقتباس ملاحظہ ہو :۔

"تلمیذ خرد۔ حضرت بہتر بندہ ایسا ہی عمل کرے گا لیکن کچھ آپ نے آبرو اور مژگاں کا ذکر نہ کیا، یہ کس کام پر آتی ہیں۔

اُستاد...... ابرو بہت آنکھ کو پناہ دیتی ہے جس وقت کہ بہت روشنی آنکھ پر آتی ہے اور کوئی جسم اگر پیشانی پر سے پھسل کر آنکھ پر گرے آنکھ کو مضرت نہیں پہنچنے دیتی ہے اور مژگاں کام کرتی ہیں آنکھ کے پردے کی مانند کس واسطے کہ جب کوئی شخص سوتا ہے تو وہ سنبھالتے ہیں۔ حادثہ روشنی کو یعنی زیادہ روشنی آنکھ میں جانے نہیں دیتی ہیں...... اور یہ مژگاں ہزاروں صدمات سے آنکھوں کو بچاتے ہیں اور جو گرد کہ ہوا میں بھری ہوئی ہے ان کو آنکھوں میں آنے نہیں دیتے ہیں۔"

چند انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ دیکھئے چلیے :

منہ دیکھنے کا آئینہ	LOOKING GLASS
کلاں بین	MICROSCOPE
منعکس دوربین	REFIECTING TELESCOPE
موازی شعاعیں	CONVERGENT RAYS
انقباضی شعاعیں	

انبساطی شعاعیں	DIVERGENT RAYS
منعکس روشنی	REFIECTED LANTERN
قندیل سحری	MAGIC LANTERN
لنتر یا لانتر	LANTRN

(۶) علم بزفک

"ستہ شمسیہ" سلسلے کی چھٹی جلد ہے جو ۸″ ر ۵″ کی تقطیع پر ۲۰۶ صفحات کی کتاب ہے جس میں علم بزفک (یعنی جھکنے کا علم) اور مقناطیس سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ دیباچے کے علاوہ آخر میں ۳ صفحات پر ۳۱ اشکال اور کتاب کے خاتمے پر متن سے متعلق آلوں کے چھ نقشے شامل کتاب کیے گئے ہیں۔ کتاب میں علم بزفک سے متعلق ۶ مکالمے گیال وی نیزم اور علم مقناطیس کے متعلق چار چار مکالمے شامل کیے گئے ہیں۔

نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:-

تلمیذ کلاں "حضرت آپ نے ابھی ذکر کیا تھا کہ سوئی کو مقناطیس دینے کے بعد وہ جھکتی ہے۔ کیا جھکاؤ اس کا یکساں رہتا ہے یا کچھ کچھ فرق کرتا ہے؟"

اُستاد: یہ قریب الفہم ہے کہ اسی حالت میں ہوگی اسی جائے میں اور رابرٹ صاحب نے کہ قطب نما بنانے والا تھا، نارمے کے ملک میں ۱۵۷۶ء میں دریافت کیا کہ جھکاؤ سوئی کا قریب ۷۲ درجے کے تھا اور اس کی تحقیق بادشاہی مدرسے میں بھی ہوئی اور یہ بات راست نکلی۔"

کتاب کی عبارت میں ڈاکٹر کو "ڈنکٹر" اور تلوار کو "تروار" لکھا گیا ہے۔ باقی وہ تمام خصوصیات اس کتاب میں بھی موجود ہیں، جن کا ذکر دیگر رسائل کے ضمن میں ہوا ہے۔

الوری رنٹ چارلس کے سات رسائل کے علاوہ شمس الامراء کے سنگی چھاپہ خانہ واقع حیدرآباد (دکن) سے طبع ہونے والی دیگر کتب میں دو کتابیں ایسی ہیں جن پر مترجمین کے نام درج نہیں۔

۱ - اصول علم حساب ہندی زبان میں، مطبوعہ: ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء۔

۲ - رسالہ کسورات اعشاریہ، مطبوعہ: ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء

اوّل الذکر کتاب کے دیباچے میں اسے "اہل فرنگ کے دستور پر" لکھی گئی کتاب بتایا گیا ہے، لیکن اس کتاب کا ترجمہ ہونا یوں ثابت ہے کہ کتاب میں سکوں اور اوزان کی شرح برطانوی سکہ اور اوزان کے مطابق دی گئی ہے۔ ورنہ حیدرآبادی سکہ اور حیدرآبادی اوزان استعمال کیے جاتے۔ جب کہ رسالہ کسورات اعشاریہ کو ترجمہ بتایا گیا ہے۔ نیز اس میں "ستہ شمسیہ" والا سوالات و جوابات کا انداز اختیار کیا گیا۔

شمس الامرا کی مطبوعہ کتب سے یہ ثابت ہے کہ ۱۸۴۰ء تک شمس الامرا کی رصدگاہ جہاں نما کے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ میں سیّد شاہ علی[۳۹]، میر شجاعت علی، پنڈت رتن لعل مست، میرامن دہلوی، غلام محی الدین ہمنن حیدرآبادی، ہوسیونندڑس، حافظ مولوی میر شمس الدین، محمد فیض، مسٹر جونس اور کیپٹن جوزہ جیسے شاعر، سائنسدان، انجینئر اور ماہر لسانیات کُل ۱۶ منشی (مترجم) ملازم تھے۔ جان مرقس ۴۷-۱۸۴۶ء کے لگ بھگ مترجم مقرر ہوئے۔ جب کہ ابوعلی، رائے منولال، بشیر علی بن محمد قاسم، مرزا جان قندھاری، میر طفیل علی، مولوی احمد اور سیّد عبدالرحمٰن بہت بعد میں مترجم مقرر ہوئے۔ جب کہ ابوعلی، رائے منولال، بشیر علی بن محمد قاسم، مرزا جان قندھاری، میر طفیل علی، مولوی احمد اور سیّد عبدالرحمٰن بہت بعد میں مترجم مقرر ہوئے۔

محولا بالا دونوں تراجم کے مترجمین کی تلاش کے سلسلے میں ذرا سی کوشش بارآور ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ سیّد شاہ علی (متوطن ادھونی) اور پنڈت رتن لعل مست (ولد بینا لعل) نے رسالہ علم و اعمال کرے کا، (سنہ تالیف ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء طباعت ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء) ترجمہ کیا ہے۔ ان دونوں مترجمین کی زبان بھی سلیس ہے لیکن "ستہ شمسیہ" کی زبان اور ان کی زبان میں واضح فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے رسالہ علم و اعمال کرے کا، سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

> "جب زمین، چاند اور سورج کے درمیان میں حائل ہوتی ہے تو زمین کا سایہ چاند پر گر کر اس کا مانع نور ہوتا ہے، اسی کو جوف قمر کہتے ہیں اور اس سبب سے جوف قمر حالت بدر میں ہونا ضروری ہے۔"
>
> (ترجمہ از سیّد شاہ علی و رتن لعل مست)

اب صرف سیّد شاہ علی کی زبان ملاحظہ ہو:۔

> "اس ذرّہ بے مقدار شاہ علی متوطن ادھونی نے مشہور شرح چغمنی کو کہ جس کی عبارت کی دقت اور معانی کی نزاکت باریک بینان نازک خیال پر ظاہر و باہر ہے۔ زبان ہندی میں بہ عبارت سلیس و صاف ترجمہ کر کے اس مہر منیر (شمس الامرا) کی رائے روشن سے مسائل اصل بیں تقدیم و تاخیر کی اور مسئلہ ضعیف کی قوی سے تبدیل۔"
>
> (ترجمہ شرح چغمنی کے دیباچے سے اقتباس)

اس سے قبل سیّد شاہ علی نے مادری زبان کے ادھونی انگ بیں تعلیم و تدریس کے فوائد بیان کیے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لکھتا ہے:

> "دانایان روزگار اور عاقلان تجربہ کار پر پوشیدہ نہیں کہ جس قوم میں زبان مروج ہے جو فن تحریر و ترقیم پاتا ہے۔ صاحب زبان نہایت آسانی کے ساتھ اس فن کا فائدہ اُٹھاتا ہے بلکہ بہ نسبت دوسری زبان کے مدّت قلیل میں حاصل اور کامل ہوتا ہے۔ کیونکہ جو مدّت وہاں معرفت الفاظ میں جاتی ہے۔ یہاں وہ تحصیل معانی میں کام آتی ہے۔"
>
> (ترجمہ شرح چغمنی کے دیباچے سے اقتباس)

یہاں چغمنی کا ترجمہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء میں کیا گیا۔ اس کا قلمی نسخہ ادارہ ادبیات اردو، خیریت آباد حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے۔

اب صرف پنڈت رتن لعل مست کی زبان ملاحظہ ہو :

"یہ رسالہ ہے موسوم منتخب البصر بیچ علم دورنما کے کہ اسے علم انظار بھی کہتے ہیں اور اس علم کی معلومات سے نقشے اجسام و سطوح کے کھینچے جاتے ہیں ...... اس علم میں اگرچہ ایک کتاب مبسوط فارسی زبان میں موسوم بہ رفیع البصر لکھی ہوئی صاحبزادہ بلند اقبال عالی قدر محمد رفیع الدین خاں المخاطب بہ عمدۃ الدولہ بہادر ... کی ہے ۔"

پنڈت رتن لعل مست کے ترجمہ کردہ 'رسالہ منتخب البصر' کے متن سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

س ۔ "حضرت اگر ہم کو شکل الٹی نظر آتی ہے تو ہم کو سیدھی کیوں نظر آتی ہے ۔"

ج ۔ "ہم لوگوں کو ایک مدّت سے عادت ہو گئی ہے بہ سبب کثرت امتحان کے ذہن تمیز کرتا ہے کہ یہ سیدھی ہے بلکہ اس کے اُوپر ایک بُرہان ساطع یہ ہے جو بچّے شیر خوار ہیں اُن کے سامنے جو شے آتی ہے اس کو بلا شُبہ پکڑ لیتے ہیں اور حس لامسہ کے سبب سے اور لوگوں کے کہنے سے ان کو چند مدت میں تمیز سیدھے اُلٹے کی ہوتی ہے اور اس کی مفصل تکرار اور براہین علم مناظر میں لکھی ہوئی ہے اور یہ علم اسی میں سے وضع ہوا ہے ، اس کو علم انظار کہتے ہیں ...... ۔"

(رسالہ منتخب البصر، سنہ تالیف ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء، سنہ طباعت ، ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء سے اقتباس)

اب سید شاہ علی اور رتن لعل کے ترجموں کی زبان کے مقابلے میں 'اصول علم حساب ہندی زبان میں' اور 'رسالہ کسورات اعشاریہ' سے ایک ایک ٹکڑا دیکھیے :

ا ۔ "مرقوم ہے وہ مثال کہ گزری اس میں معنی بخشتی ہے ۔"

۲ ۔ "اس کسورات عشر کے اعمال مانند کسور مشہور کے ہوتے ہیں ۔"

مندرجہ بالا پہلا ٹکڑا تو ایسا ہے کہ جیسے "باغ و بہار" میں سے اُچک لیا گیا ہو ۔

دوسرا ٹکڑا ٹیکنیکل ہونے کے باوجود اس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ میر امن دہلوی کا ہی ہے ۔ اس لیے کہ اس میں جمع الفاظ کے ساتھ اشارہ قریب 'اِن' کی بجائے 'اُس' لکھا گیا ہے جو 'باغ و بہار' والے منفرد اسلوب کی ایک پہچان ہے ۔ اس کے علاوہ 'اصول علم حساب ہندی' کے ترجمے میں میر امن دہلوی کی لفظیات اپنی صاف پہچان کرواتی ہے مثلاً :

بغیر کی بجائے	بدوں
باوجود کی بجائے	باوصف
اس کے بعد کی بجائے	تس پیچھے
ضرورت کی بجائے	حاجت
غلط کی بجائے	خطا

طریقہ کی بجائے   ڈول

تیسرا مترجم غلام محی الدین مبتین حیدر آبادی ہے جس کی زبان کا دکنی انگ (جس کی مثال 'رسالہ علم ہوا' کے باب میں دی گئی ہے) ان دونوں کتابوں میں ناپید ہے جبکہ حافظ مولوی میر شمس الدین محمد فیض کی زبان مُعرّب ہے اور ہیوٹنڈرلس کی زبان مُفرّس۔ یہ دونوں خصوصیات ان کتابوں میں نہیں پائی جاتیں۔ باقی رہا مسٹر جونس اور کیپٹن جوزف کا معاملہ، تو یہ طے ہے کہ دونوں انگریز منشی مقامی مترجمین کی سہولت کے لیے تھے۔ ان کا کام صرف گنجلک انگریزی عبارت کو صاف کرنا تھا تاکہ اُردو میں ترجمہ کرنا ممکن ہو۔ اب اگر ان دو حضرات میں سے کسی ایک نے میر امن دہلوی کی مدد کی تو کچھ بعید نہیں لیکن ان دو کتابوں کا اسلوبی تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ ان کا ترجمہ میر امن دہلوی نے ہی کیا۔

یوں میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" اور "گنج خوبی" کے علاوہ مطبوعہ کتب میں نو انگریزی سے ترجمہ کردہ کتب کا اضافہ اُس نابغۂ روزگار ہستی سے متعلق تحقیق کے دائرے کو وسیع کرتا ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱؎ میر امن کے قریبی معاصرین میں شمس الامراء کے دار الترجمہ سے منسلک ایک نامور مترجم پنڈت رتن لعل مست ولد چنیا لعل کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ نواب فخر الدین خان نے رسالہ "منتخب البصر" (سال تصنیف ۱۲۵۳ھ مطابق ۳۸-۱۸۳۷ء) کے سرورق پر "رتن لال" نام شائع کیا۔

۲؎ "باغ و بہار" مع مقدمہ و فرہنگ مرتبہ: ممتاز حسین، پروفیسر، مطبوعہ: کراچی: اُردو ٹرسٹ: طبع اول، نومبر ۱۹۵۸ء —پروفیسر صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ کو "باغ و بہار کا تحقیقی مطالعہ" کے عنوان سے اپنی کتاب "نقد حرف" مطبوعہ مکتبہ اسلوب، کراچی طبع اول ۱۹۸۵ء میں بھی شامل کیا ہے۔

۳؎ پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم، امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ نئی دہلی۔

۴؎ دیباچہ: "باغ و بہار ایک تجزیہ"، از ڈاکٹر وحید قریشی مطبوعہ: لاہور۔ سنگ میل پبلی کیشنز، چوک اُردو بازار لاہور، طبع اول ۱۹۶۸ء۔ طبع دوم: نصرت پبلشرز، لکھنؤ (بھارت) ۱۹۸۲ء)

۵؎ بحوالہ "نمونۂ منثورات"، مرتبہ: احسن مارہروی: اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان: طبع ثانی ۱۹۸۲ء، صفحہ ۸۷۔

۶؎ ایضاً صفحہ ۸۷ — واضح رہے کہ بقول احسن مارہروی یہ تذکرہ حیدر آباد دکن کی ایک طغیانی میں بہ گیا تھا، جسے مولوی عبد اللہ خاں حیدر آبادی نے پہلی بار دار الاشاعت پنجاب: رفاہ عام اسٹیم پریس، لاہور سے سنہ ۱۹۰۶ء میں طبع کروایا۔

[۷] بحوالہ: "گل کرسٹ اور اُس کا عہد" از عتیق صدیقی، صفحہ ۲۱۰۔

[۸] بحوالہ: "THE FALL OF THE MUGHAL EMPIRE"، جلد اوّل، صفحہ ۲۷۱؎

[۹] "واقعات دارالحکومت دہلی"، جلد اوّل، صفحہ ۶۶۳؎

[۱۰] بحوالہ: "باغ و بہار" مرتبہ، ممتاز حسین: کراچی: اُردو ٹرسٹ: طبع اوّل نومبر ۱۹۵۸ء؎

[۱۱] مُراد اب مقدّس / تقدّس مآب۔ کیتھولک فرقے میں پادری کی جگہ "ریورنڈ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

[۱۲] یکم جنوری ۱۸۰۵ء سے والس پرووسٹ کا عہدہ ختم کر دیا گیا تھا۔

[۱۳] پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم، ۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء، ہوم ڈیپارٹمنٹ میسلنیس جلد نمبر ا ۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء تا

۴ ستمبر ۱۸۰۵ء صفحہ ا تا ۳ امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ، نئی دہلی (بھارت)

[۱۴] بحوالہ: ایشیاٹک اینول رجسٹر ۱۸۰۱ء لندن (۱۸۰۲ء) صفحہ ۳۱ - ۳۲؎

[۱۵] "دی یورپین ان انڈیا" از چارلس ڈوئلے و کیپٹن ٹامس ولیمز مطبوعہ لندن، ۱۸۱۳ء۔

[۱۶] دیکھیے: "ارباب نثر اُردو"، از سید محمّد۔

[۱۷] دیکھیے: "گل کرسٹ اور اُس کا عہد" از عتیق صدیقی، صفحہ ۱۹۰ — ۱۹۴۔

[۱۸] مزید دیکھیے، کالج کونسل کی رپورٹ بابت ۲۰ ستمبر ۱۸۰۴ء۔

[۱۹] بحوالہ پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم۔

[۲۰] ایضاً

[۲۱] ایضاً

[۲۲] "باغ و بہار" کا تحقیقی مطالعہ"، مشمولہ "مقالات شیرانی۔

[۲۳] تفصیلات کے لیے دیکھیے: "اُردو نثر کی داستانیں"، از ڈاکٹر گیان چند جین: کراچی: انجمن ترقی اُردو

طبع اوّل ۱۹۵۴ء۔

[۲۴] "باغ و بہار"، مرتبہ: ڈنکن فاربس مطبوعہ: لندن: طبع چہارم ۱۸۶۰ء۔

[۲۵] پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم۔

[۲۶] پہلی بار "چار درویش" کے ۸۵ صفحات ہرکارہ پریس کلکتہ سے چھ ماہ میں طبع ہوئے۔ دیکھیے: گلکرسٹ کی چٹھی بنام

کالج کونسل مورخہ ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء۔

[۲۷] پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم۔

[۲۸] بیشتر کتب میں میر بہادر علی حسینی نارنولی کو ۱۸۰۱ء میں ہی حیثیت یا ہیڈ منشی بتایا گیا ہے جو درست نہیں۔

[۲۹] پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم۔

۳۰؎ پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم ۔

۳۱؎ بحوالہ "مقالات گارساں دتاسی" از گارسیں دتاسی (مترجمین: عزیز احمد، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری) نظر ثانی: ڈاکٹر محمد حمید اللہ: کراچی: انجمن ترقی اردو، طبع ثانی: ۱۹۷۷ء ۔

۳۲؎ پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم، جلد دوم ص۱۰۶ ۔

۳۳؎ بحوالہ: "مقالاتِ گارساں دتاسی"۔

۳۴؎ بحوالہ "سخنِ شعرا" از عبدالغفور نساخ (زمانہ تالیف: ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء) مرتبہ: عطا کاکوی: پٹنہ: عظیم الشان بکڈپو سلطان گنج مطبوعہ: طبع اول مئی ۱۹۷۲ء، صفحہ ۴۹؛

۳۵؎ بحوالہ: "تاریخ ریختی معہ دیوان جان صاحب" مرتبہ: سید محمد مبین نقوی الہ آبادی: ناشر: عبدالواسع جعفری، الہ آباد: مطبع انوار احمدی، س۔ن ۔

۳۶؎ بحوالہ: "فرہنگ عامرہ" مولفہ: محمد عبداللہ خویشگی مطبوعہ: کراچی، ٹائمز پریس، طبع چہارم: جون ۱۹۵۷ء صفحہ ۲۲؛

۳۷؎ بحوالہ: "فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی" از نادم سیتاپوری ۔

۳۸؎ بحوالہ: پیش لفظ: "باغ و بہار" مرتبہ: ڈنکن فاربس: لندن طبع چہارم ۱۸۶۰ء پروفیسر ڈنکن فاربس نے "باغ و بہار" مطبوعہ: کلکتہ ۱۸۰۳ء، بنیادی متن "باغ و بہار" ملکیت ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور رسول سروس سے متعلق میر امن کے شاگرد مسٹر رومر کے تیار کردہ متن کو بنیاد بنا کر باغ و بہار، کو لندن سے ۱۸۴۶ء میں طبع کروایا۔ واضح رہے کہ ڈنکن فاربس نے "باغ و بہار" کو چوتھی بار لندن سے ۱۸۶۰ء میں طبع کرواتے وقت رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک مسودہ سے موازنۂ متن کے ساتھ ساتھ خصوصی جائزہ کے بعد اعراب و اوقاف میں بعض تبدیلیاں کرنے کے ساتھ ساتھ کیپٹن ڈبلیو این لیس ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن و پرنسپل کلکتہ یونیورسٹی کے ایما پر "باغ و بہار" کے مخرب الاخلاق حصوں کو حذف کر دیا تھا۔

۳۹؎ مرتب "انوار بدریہ" قلعہ ادھونی حیدرآباد دکن کے رہنے والے تھے۔

۴۰؎ بحوالہ: ۵۵۳ نمبر شمالات ۳۰۶ سائز ۱۸ × ۹ صفحات ۱۹ سطر ۲۰ خطِ نستعلیق۔ قلمی مخطوطہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد آندھرا پردیش کے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

گوشۂ
قدرت اللہ
شہاب

ماں جی

قدرت اللہ شہاب

ماں جی کی پیدائش کا صحیح علم نہ ہو سکا۔

جس زمانے میں لائل پور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا، پنجاب کے ہر قصبے کے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لیے نئی کالونی میں جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ عرف عام میں لائل پور، جھنگ، سرگودھا، وغیرہ کو "بار" کا علاقہ کہا جاتا تھا۔

اُس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہوگی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلہ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ اُن دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہو گئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیئے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے، لیکن سیدھے آدمی تھے، کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لیے کیا قدم اُٹھانا چاہیے۔ انجام کار صبر شکر کر کے بیٹھ گئے اور نہر کی کھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پرچہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے اور نئے آبادکاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی، دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائل پور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی، اس لیے پاپیادہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے اور پوچھ پاچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پاپیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اُٹھانے کا کام کرتے۔ نانی چرخہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں۔ جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقر عید کا تہوار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیئے۔ زندگی میں پہلی بار اتنے پیسے آئے تھے۔ انھوں نے بہت سوچا، لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ دن بھر میں ایک آدھ روٹی نمک مرچ کی چٹنی کے ساتھ میسر آ جائے تو مزید نقدی کس کام آتی ہے؟ یہ فلسفہ ساری عمر ماں جی کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ وفات کے وقت اُن کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن ان کے نزدیک سو روپے، دس روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔

عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑانوالہ سے روانہ ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا۔ اس کے بعد جب کبھی ان کے پاس گیارہ پیسے پورے ہو جاتے وہ فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔ ساری عمر جمعرات کی شام کو وہ اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی۔ لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انھیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی ماں کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لیے جمع کر رکھے تھے۔ چونکہ وہ بھی جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی نہ کوئی زیور۔ اسبابِ دُنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سُوتی کپڑوں کے، ایک جوڑا دیسی جُوتا، ایک جوڑا ربڑ کے چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز۔ ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہننے کے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیبِ تن، دوسرا اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھا رہتا تھا تاکہ استری ہو جائے، تیسرا دھونے کے لیے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آتا تھا تو وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انھیں سوٹ کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لیے انھیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی بنا کر اُنھیں جائے نماز میں لپیٹا۔ جاڑوں میں اُونی فرد اور گرمیوں میں ململ کے دوپٹے کی بکّل ماری اور جہاں کہیے چلنے کو تیار۔ سفرِ آخرت بھی اُنھوں نے اسی سادگی سے اختیار کیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھے۔ نہا دھو کر بال سُکھائے اور چند ہی گھنٹوں میں زندگی کے سب سے آخری اور سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ جس خاموشی سے دنیا میں رہی تھیں اسی خاموشی سے عقبیٰ کو سدھار گئیں۔ غالباً اسی موقعہ کے لیے وہ اکثر یہ دُعا مانگا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ پاؤں چلتے چلاتے اُٹھا لے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے......

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتّے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی دھنیے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے تو کھا لیتی تھیں، لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پہ اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھی کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے کے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں۔ اکثر و بیشتر دوپہر کا۔ شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسّی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ یہ دُعا کرتی تھیں۔ سب کا بھلا، سب کے بعد ہمارا بھی بھلا۔ خاص اپنے یا اپنے بچوں کے لیے اُنھوں نے براہِ راست کبھی کچھ نہیں مانگا۔ پہلے دوسروں کے لیے دُعا مانگتی تھیں اور اس کے بعد مخلوقِ خدا کی حاجت روائی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو اُنھوں نے اپنی زبان سے کبھی "میرے بیٹے" یا "میری بیٹی" کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ اُن کو اللہ کا مال ہی کہا کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کام کر دیتا تو انھیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ اور احسان مندی سے سارا دن اُسے دُعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا رکھ رکھاؤ کچھ تو قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔

جڑانوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خورد سال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لائل پور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں، تو انھیں معلوم نہ تھا کہ انھیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لیے کیا قدم اُٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں کہ اس زمانے میں ان کے ذہن میں کالونی کا تصوّر ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا۔ جو کہیں سرِ راہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہوگا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لائل پور کے علاقہ میں پا پیادہ بھٹکتا رہا لیکن کسی راہ گزر پر انھیں کالونی کا خضر صورت رہنما نہ مل سکا۔ آخر تنگ آکر اُنھوں نے چک نمبر ۳۹۲ میں جو ان دنوں نیا نیا آباد ہو رہا تھا ڈیرے ڈال دیئے۔ لوگ جوق در جوق آکر وہاں آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شاید یہی ایک طریقہ ہوگا۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس پھوس کی جھونپڑی بنائی اور بنجر اراضی کا ایک قطعہ تلاش کر کے کاشت کاری کرنے لگے۔ انہی دنوں محکمہ مال کا عملہ پڑتال کے لیے آیا۔ نانا جی کے پاس الاٹمنٹ کے کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ اُنھیں چک سے نکال دیا گیا۔ اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قُرق کر لیے۔ عملے کے ایک آدمی نے چاندی کی دو بالیاں بھی ماں جی کے کانوں سے اُتروا لیں۔ ایک بالی اُتارنے میں ذرا دیر لگی تو اُس نے زور سے کھینچ لی جس سے ماں جی کے بائیں کان کا زیریں حصّہ بُری طرح سے پھٹ گیا۔

چک نمبر ۳۹۲ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لُو چلتی تھی۔ پانی رکھنے کے لیے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں نظر آتا ماں جی اپنا دوپٹہ بھگو لیتیں تاکہ پیاس لگنے پر اپنے چھوٹے بھائیوں کو چُساتی جائیں۔ اس طرح چلتے چلتے وہ چک نمبر ۵۰ میں پہنچے جہاں ایک جان پہچان کے آباد کار نے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلاتے تھے۔ نانی مویشی چرانے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گائیوں کے لیے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انھیں اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی بیروں پر گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے اُبال کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کچی انبیاں گری ہوئی مل گئیں تو اُن کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے توریے اور گندلے کا ملا جلا ساگ ہاتھ آگیا۔ نانی محنت مزدوری میں مصروف تھی۔ ماں جی نے ساگ چولھے پر چڑھایا۔ جب پک کر تیار ہو گیا، اور ساگ کو اتن لگا کر گھوٹنے کا وقت آیا تو ماں جی سے ڈوئی ایسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پیندا ٹوٹ گیا اور سارا ساگ بہ کر چولھے میں آ پڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانٹ بھی پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولھے کی لکڑیوں پر گرا ہوا ساگ انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

چک نمبر ۵۰ نانا جی کو خُوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آبادکاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر اُن کو ایک مربعہ زمین بھی مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور دو تین سال میں ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی توں توں آبائی وطن کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزارنے کے بعد سارا خاندان ریل

میں بیٹھ کر منیلا کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشہ دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرّے اُن کی آنکھوں میں پڑ گئے، جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوبِ چشم میں مُبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد اُنھوں نے ساری عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھرڈ کلاس زنانہ ڈبے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچّوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستے کے گرد و غبار کا ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اُونچے درجوں میں وہ بہت بیزار ہو جاتیں۔ ایک دو بار جب انھیں مجبوراً ایئر کنڈیشن ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر چُور ہو گئیں اور سارا وقت قید کی صعوبت کی طرح ان پر گراں گزرا۔

منیلا پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان درست کیا۔ عزیز و اقارب کو تحائف دیے۔ دعوتیں ہوئیں اور پھر ماں جی کے لیے بَر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں لائل پور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی اور ان کا شمار خوش قسمت اور باعزّت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لیے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پر رُعب گانٹھنے کے لیے نانی جی انھیں ہر روز نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دُلہنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پُرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں: ”ان دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا تک دوبھر ہو گیا تھا۔ میں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے یہ خیال بخش مربعہ دار کی بیٹی جا رہی ہے۔ دیکھیے کون سا خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔“

”ماں جی، آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟“ ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر اُن سے پوچھا کرتے۔

”توبہ توبہ پُتّر“ ماں جی کانوں کو ہاتھ لگاتیں ”میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اِتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خُدا کی بڑی مہربانی ہوگی۔“

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لیے پیدا ہوئی۔ اس کو خُدا نے یوں پُورا کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبداللہ صاحب سے ہو گئی۔

اِن دنوں سارے علاقے میں عبداللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے، اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اُٹھا تو یہ انکشاف ہُوا کہ ساری آبائی جائیداد رہن پڑی ہے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھونپڑے میں اُٹھ آئے۔ زر اور زمین کا یہ انجام دیکھ کر انھوں نے ایسی جائیداد بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجنوں کے ہاتھ گرو نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹریکولیشن میں اوّل آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اُڑتے اُڑتے یہ خبر سر سیّد کے کانوں میں بھی پڑ گئی جو اُس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بُنیاد رکھ چکے تھے۔ اُنھوں نے اپنا خاص

منشی گاؤں بھیجا اور عبد اللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں پر عبد اللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا اور بی اے کرنے کے بعد اُنیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے لیکچرر ہو گئے۔

سرسید کو اس بات کی دُھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں میں جائیں۔ چنانچہ اُنھوں نے عبد اللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا کہ وہ انگلستان جا کر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبد اللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبد اللہ صاحب کی سعادت مندی آڑے آئی اور اُنھوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سرسیّد کو بے حد غصہ بھی آیا اور دُکھ بھی ہوا۔ اُنھوں نے لاکھ سمجھایا بجھایا، ڈرایا، دھمکایا لیکن عبد اللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفادات پر ترجیح دیتے ہو؟" سرسیّد نے کڑک کر پوچھا۔

"جی ہاں" عبد اللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ ٹکا سا جواب سُن کر سرسیّد آپے سے باہر ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے اُنھوں نے عبد اللہ صاحب کو لاتوں، مکّوں، تھپڑوں اور جُوتوں سے خوب پیٹا اور پھر کالج کی نوکری سے برخواست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا "اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمھارا نام بھی نہ سُن سکوں"۔

عبد اللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے اُتنے سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر اُنھیں سب سے دُور افتادہ اور دُشوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ناک کی سیدھ میں گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

جن دنوں ماں جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی انہی دنوں عبد اللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوگ لکھا ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہو گئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تاکہ عبد اللہ صاحب دلہن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً یا شاید دانستہ عبد اللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

ماں جی کی سہیلیوں نے اُنھیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھاڑ کر اُن سے پانچ پانچ روپے وصول کر لیے۔ عبد اللہ صاحب نے ماں جی کو بھی بہت سے روپے پیش کیے۔ لیکن اُنھوں نے انکار کر دیا۔ جب اصرار بہت بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

"اِتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی؟" عبد اللہ صاحب نے پوچھا۔

"اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلوا دوں گی۔" ماں جی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبد اللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔

اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انھوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی ۔

گلگت میں عبداللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی ۔ خوبصورت بنگلہ ، وسیع باغ ، نوکر چاکر دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ ۔ جب عبداللہ صاحب دورے پر باہر جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو ان کو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی ۔ یوں بھی گلگت کا گورنر ایک خاص سیاسی اور انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا ، لیکن ماں جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرا بھی اثر نہ ہوا کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثر انداز نہ ہوتا تھا ۔ بلکہ ماں جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی ۔

ان دنوں سر مالکم ہیلی حکومتِ برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روسی اور چینی سرحدوں پر پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر مامور تھے ۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں ۔ انھوں نے فراک پہنے ہوتے تھے اور پنڈلیاں کھلی تھیں ۔ یہ بے حجابی ماں جی کو پسند نہ آئی ۔ انھوں نے لیڈی ہیلی سے کہا ۔ "تمھاری عمر جیسے گزرنی تھی ویسے گزر ہی گئی ہے ۔ اب اپنی بیٹی کی عاقبت تو خراب نہ کرو ۔" یہ کہہ کر انھوں نے مس ہیلی کو اپنے پاس رکھ لیا اور چند مہینوں میں اُسے کھانا پکانا ، سینا پرونا ، برتن مانجھنا ، کپڑے دھونا سکھا کر ماں باپ کے پاس بھیج دیا ۔

جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کچنر سرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آئے ۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا ۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکائے ۔ کھانے لذیذ تھے ۔ لارڈ کچنر نے اپنی تقریر میں کہا ۔ "مسٹر گورنر جس خانساماں نے یہ کھانے پکائے ہیں ۔ براہِ مہربانی میری طرف سے آپ اُس کے ہاتھ چوم لیں ۔"

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرحاں و شاداں گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک گوشے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا رہی ہیں ۔

ایک اچھے گورنر کی طرح عبداللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چومے اور کہا ۔ "اگر لارڈ کچنر یہ فرمائش کرتا کہ وہ خود خانساماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں ؟"

"میں" ماں جی تنک کر بولیں ۔ "میں اُس کی مونچھیں پکڑ کر جڑ سے اُکھاڑ دیتی ۔ پھر آپ کیا کرتے ؟"

"میں" عبداللہ صاحب نے ڈرامہ کیا "میں ان مونچھوں کو روئی میں لپیٹ کر وائسرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمھیں ساتھ لے کر کہیں اور بھاگ جاتا ، جیسے سر سید کے ہاں سے بھاگا تھا ۔"

ماں جی پر ان مکالموں کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا تھا ۔ لیکن ایک بار ——— صرف ایک بار ——— ماں جی بھی رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے ۔

گلگت میں ہر قسم کے احکامات "گورنری" کے نام پر جاری ہوتے تھے ۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انھوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا ۔

"بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ !"

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا "بھاگوان یہ تمھارا نام تھوڑا

ہی ہیں گورنری تو در اصل تمھاری سوکن ہے جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔"

مذاق کی چوٹ تھی۔ عبداللہ صاحب نے سمجھا بات آئی گئی ہو گئی لیکن ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کُڑھنے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاپ سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دل کا دُکھ سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آ گئی۔ "ہائے ہائے ہمارے راج میں ایسا ظُلم۔ میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ صاحب کی خبر لیں۔"

جب یہ مقدمہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ تک پہنچا تو اُنھوں نے عبداللہ صاحب کو بُلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا افتاد آن پڑی۔ لیکن جب معاملے کی تہ تک پہنچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضعدار تھے چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیرِ وزارت کے نام سے پُکارا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی جنگِ آزادی تک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سُن کر مہارانی نے ماں جی کو بُلا کر خوشخبری سُنائی کہ مہاراج نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا ہے۔

"اب تم دودھوں نہاؤ۔ پوتوں پھلو" مہارانی نے کہا "کبھی ہمارے لیے بھی دُعا کرنا۔"

مہاراجہ اور مہارانی کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے وہ اکثر ماں جی سے دُعا کی فرمائش کیا کرتے تھے۔

اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے کہ جس کا جواب آسانی سے نہیں سُوجھتا۔

ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دنیا میں کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر صبر و شکر، تسلیم و رضا کی عینک اُتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پردے میں کتنے دُکھ، کتنے غم، کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کیے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصہ بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا بیٹا عین عالمِ شباب میں انگلستان جا کر گزر گیا۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اللہ کا مال تھا۔ اللہ نے لے لیا۔ لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو رویا نہ کرتی ہوں گی؟

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو اُن کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر پچپن سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب بان کی کُھردری چارپائی پر حسبِ معمول گاؤ تکیہ لگا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائینتی پر بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر اُن کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چُوس رہے تھے۔ اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکایک وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے۔ "بھاگاں والی شادی سے پہلے پہلے میں نے تمھیں گیارہ پیسے دیئے تھے۔ کیا اُن کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟"

ماں جی نے نئی نویلی دُلہن کی طرح سر جُھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ اس کے سینے میں بیک وقت بہت سے خیال اُمڈ آئے۔ "ابھی وقت کہاں آیا ہے سرتاج شادی کے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ

نباہ کیا ہے اس پر میں نے تمھارے پاؤں دھو کر پیئے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمھیں پہنائی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے، میرے سرتاج ....

لیکن قضا و قدر کے بھی کھاتے میں وقت آ چکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اُٹھایا تو عبداللہ صاحب گنّے کی کاش منہ میں لیے گاؤ تکیے پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہتیرا بلایا، ہلایا، چمکارا، پکارا، لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے سے لگا لگا کر تلقین کی کہ "بچو۔ رونا مت۔ تمھارے ابّا جس آرام سے رہے تھے اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مت۔ اُن کی رُوح کو تکلیف پہنچے گی۔"

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اپنے ابّا جی کی یاد میں نہ رونا ورنہ اُن کو تکلیف پہنچے گی۔ لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس خاوند کی یاد میں نہ روئی ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک اُنھیں ایک الھڑ دُلہن سمجھا اور جس نے گورنری کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لا کر نہیں بٹھائی ....

جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لیے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں جو قیامت تک اُنھیں عقیدت کے بیابان میں سرگرداں رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے آگے ہمّت نہیں ہوتی۔ لیکن مسجد کا مُلّا پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔

ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے۔ لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ دُرود میں تو پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے لیکن اگر رو دیا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی رُوح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا ....

چمکور صاحب

قدرت اللہ شہاب

ضلع انبالہ میں روپڑ سے کوئی نو میل کے فاصلے پر نہر سرہند کے کنارے چمکور کا قصبہ آباد ہے۔ سکھ اسے چمکور صاحب کہتے ہیں کیونکہ اس گاؤں میں سکھوں کی تاریخ کا تقدس کئی بار بنا اور کئی بار بگڑا۔

چمکور صاحب میں چار گوردوارے اور ایک خانقاہ ہے۔ گوردواروں میں سب سے اونچا درجہ کلغی والے بادشاہ ساتویں گرو کے گوردوارے کا ہے۔ سکھوں کی روایت کے مطابق ایک پٹھان صوبیدار نے گرو کے دو کم سن صاحبزادوں کو اس گوردوارے کی جنوبی دیوار میں زندہ چنوا دیا تھا۔ صاحبزادوں کے نام بابا اجیت سنگھ اور بابا ججھار ہری تھے اور آج کل ان کے نام پر اس گوردوارے کے ساتھ بابا اجیت سنگھ ججھار ہری خالصہ ہائی سکول بھی قائم ہے۔

دوسرے گوردوارے کا نام دمدمہ صاحب ہے۔ یہاں پر کسی گرو صاحب نے طبل بجایا تھا۔ تیسرے گوردوارے کا نام مسواک صاحب ہے۔ اس مقام پر ایک گرو صاحب نے اپنے دندان مبارک پر مسواک فرمائی تھی۔ چوتھا گوردوارہ جھاڑ صاحب کہلاتا ہے۔ یہاں پر ایک گرو صاحب نے جھاڑا پھرا تھا۔

چمکور صاحب کی اکلوتی خانقاہ "بابا صاحبا" ہے۔ بابا صاحبا دراصل بابا شہاب الدین حضرت مجدد الف ثانی کے ہم عصر تھے اور اپنے زمانے کے صاحبِ کرامت بزرگ مانے جاتے تھے۔ زہد و عبادت کے علاوہ بابا شہاب الدین اپنے علاقہ کے قاضی بھی تھے اور کسبِ معاش کے لیے نیل کا کاروبار کرتے تھے۔ بابا صاحب کے صحن میں نیل سے بھرے ہوئے مٹکوں کی قطاریں پڑی رہتی تھیں۔ ایک روز آدھی رات گئے سکھوں کے ساتویں گرو ارجن دیو اچانک بابا صاحب کے احاطے میں آ گئے۔ گرو صاحب عالمِ روپوشی میں جان بچاتے پھر رہے تھے کیونکہ ان کے تعاقب میں سرہند کا حاکم فوج کی ایک بھاری جمعیت لے کر نکلا ہوا تھا۔

گرو صاحب نے کہا "باباجی اگر میں اس جلتی ہوئی بھٹی میں کود جاؤں تو شاید میری روحانیت مجھے آگ کے ضرر سے بچا لے۔ لیکن سرہند کے مغل حاکم سے بچنے کے لیے انسانی وسیلہ درکار ہے۔ اگر تمھارے پاس کوئی وسیلہ ہو تو بتاؤ۔"

بابا صاحب نے جواب دیا "گرو جی مہاراج۔ وسیلہ روحانی ہو یا انسانی خُدا کے حکم کے بغیر میسر نہیں آتا۔ آپ اللہ کا نام لے کر نیل کے اس مٹکے میں بیٹھ جائیں۔ شاید خدا اسی میں بہتری کرے۔"

گرو ارجن دیو گاڑھے نیل سے بھرے ہوئے ایک مٹکے میں بیٹھ گئے۔ بابا صاحب نے مٹکے کا منہ کپڑے کی جالی سے ڈھانپ دیا۔ سرہند کے حاکم نے اپنی فوج کی مدد سے چمکور صاحب کا کونہ کونہ چھان مارا۔ گوردواروں کے گرنتھیوں اور نہنگ اکالیوں کو زمین پر لٹا لٹا کے خوب پٹوایا بھی۔ بہت سے گھروں کی تلاشی لی۔ گنے کے کھیتوں کو کاٹ کاٹ کے رکھ دیا۔ کچھ سپاہی سلام کرنے

کے بہانے بابا شہاب الدین کے ہاں بھی آئے۔ باتوں باتوں میں اُنھوں نے بابا صاحب کے گھر کا جائزہ بھی لیا اور مایوس ہو کر واپس لَوٹ گئے۔ راتوں رات مغل فوج اپنی مہم پر آگے بڑھ گئی۔ صبح سویرے بابا صاحب نے گرو ارجن دیو کو نیل کے مٹکے سے باہر نکالا اور لباس تبدیل کرنے کے لیے اُنھیں نئے کپڑوں کا ایک جوڑا پیش کیا۔

گرو صاحب نے کہا" بابا جی۔ اب میں کبھی سفید کپڑے نہ پہنوں گا۔ آج سے نیلا رنگ میرے پنتھ کا رنگ مقرّر ہوا۔

گرو صاحب بابا شہاب الدین کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔ چند روز بعد چکور کے گوردواروں کے گرنتھی ایک وفد کی صورت میں بابا صاحب کے پاس آئے۔ انھوں نے بڑے ادب و نیاز سے بابا صاحب کی خدمت میں ریشم کی ایک تھیلی پیش کی۔ اس تھیلی میں گرو ارجن دیو کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک فرمان تھا جس میں سارے سکھ پنتھ کو نصیحت کی گئی کہ وہ بابا شہاب الدین کو اپنا محسن مانیں۔ اس احسان کے بدلے چکور کے گوردواروں کی آمدنی میں روپے میں دو پیسے کا حصّہ بھی دائمی طور پہ بابا شہاب الدین اور ان کی اولاد کے حق میں وقف کر دیا گیا تھا۔

بابا صاحب نے اس فرمان کی پُشت پر گورمکھی زبان میں ایک تحریر لکھ دی۔ جس کا مفہوم یہ تھا۔" اگر یہ موقعہ گرو ارجن دیو کے خلاف جہاد کا ہوتا تو سید شہاب الدین خود اپنے ہاتھ سے گرو صاحب کا سر قلم کر دیتا۔ لیکن یہ جنگ حاکم اور محکوم کا سیاسی تنازعہ ہے۔ گرو صاحب کے ساتھ میں نے کوئی احسان نہیں کیا، فقط اپنا اخلاقی فرض ادا کیا ہے۔ اس کی اُجرت میرے لیے حلال نہیں۔ میں اس آمدنی کو اپنی آل اولاد پر ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیتا ہوں۔ البتہ میری خواہش ہے کہ چکور کی حُدود میں سور کا گوشت لانا یا کھانا بند ہو جائے۔ اگر سکھ قوم اس خواہش کو پورا کر دے تو یہ اُس کی عین عنایت ہوگی۔

سکھوں نے برضا و رغبت اس شرط کو قبول کر لیا اور اس روز سے چکور صاحب میں سور کے گوشت کی سختی سے ممانعت ہو گئی۔

چند سال بعد جب بابا صاحب کی وفات ہوئی تو دُور دُور سے ہزاروں ہندو، سکھ اور مسلمان ان کے جنازے میں شرکت کے لیے حاضر ہوئے۔ عقیدت مندوں نے اپنے ہاتھ سے بابا صاحبؒ کا مقبرہ تعمیر کیا۔ مقبرہ ایک سادہ سی چار دیواری پر مشتمل تھا۔ بابا صاحب کی وصیت کے مطابق اس پر چھت نہ ڈالی گئی۔

بابا صاحبؒ کی زندگی ہی میں یہ رسم چل نکلی تھی کہ گاؤں میں آنے والی یا گاؤں سے جانے والی ہر برات ان کی خدمت میں حاضر ہوتی تھی۔ بابا صاحب کچّے چاولوں میں شکر ملا کے ایک ایک مُٹھی براتیوں میں بانٹ دیتے تھے۔ ہندو، سکھ، مسلمان سب اس تبرّک کو دلہا دلہن کے لیے نیک فال سمجھتے تھے۔ بابا شہاب الدین کی وفات کے بعد اس رسم میں اور بھی شدّت آگئی۔ اب ہر برات بابا صاحب کے مزار پر حاضر ہوتی۔ براتی لوگ کچّے چاولوں میں شکّر ملا کے مزار پر پھینکتے اور پھر ان کو اکٹھا کر کے دوبارہ براتیوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ چاولوں کے جو دانے مزار پر پڑے رہ جاتے ان کو چُگنے کے لیے بہت سے کبوتر عام طور پر وہاں جمع رہتے تھے۔ بابا صاحب کے ساتھ کبوتروں کی عقیدت مندی کے متعلق طرح طرح کے قصّے بن گئے اور رفتہ رفتہ کبوتروں کو اتنا تقدّس حاصل ہو گیا کہ چکور صاحب کی حدود میں ان کا شکار حرام شمار ہونے لگا۔

جس مقام پر بابا شہاب الدین کا مزار واقع تھا اس کے پاس ایک وسیع و عریض میدان پھیلا ہوا تھا۔ اس میدان کو ہانڈوانہ

کہتے تھے۔ جھکور کے خوش فہم بڑے بوڑھوں کو اس بات کا یقین تھا کہ کوروں پانڈوں کی مہابھارتی لڑائی اسی میدان میں ہوئی تھی۔ ذرا سا کریدنے پر اس میدان سے طرح طرح کے پرانے سکے اور جنگی ہتھیار مل جاتے تھے۔ یوں بھی تیز بارش کے بعد جگہ جگہ انسانی ڈھانچوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں باہر نکل آتی تھیں۔ اگر ہوا تیز ہو تو ان ہڈیوں کی رگڑ سے جا بجا چراغ سے جل اٹھتے تھے۔ برسات کی اندھیری راتوں میں یہ روشنیاں خاص طور پر مافوق الفطرت سماں باندھ دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ مشہور ہونے لگا کہ روحانی دیئے بھی بابا صاحب کی کرامت سے روشن ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی رات کے وقت پانڈوانہ کے میدان میں بابا صاحب کی یہ کرامت جگمگاتی گاؤں کی بڑی بوڑھیاں سر ڈھانپ کر کوٹھوں پر چڑھ جاتیں اور دامن پھیلا پھیلا کر بابا صاحب سے برکت کی دعائیں مانگنے لگتیں۔

بابا شہاب الدین کی وفات کے بعد ان کے اکلوتے فرزند بھولے میاں نے نیل کا کاروبار سنبھالا۔ بھولے میاں کا اصلی نام قاسم علی تھا۔ وہ محض دیندار تھے۔ دنیاداری سے قطعی بیگانہ تھے۔ سیدھی سادی صبر شکر کی زندگی بسر کرتے تھے، ان کے بعد ان کے بیٹے اور پوتے بھی اسی ڈگر پر ثابت قدم رہے۔ لیکن چوتھی پشت میں جا کر چودھری مہتاب دین نے ایک نیا رنگ پکڑا۔ سب سے پہلے انھوں نے گوردواروں کے گرنتھیوں سے مل کر روپے میں دو پیسے کی آمدنی پر قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ یہاں سے ناکام ہو کر انھوں نے نیل کا ایک پرانا مٹکا لے کر اسے پھولوں سے خوب سجایا۔ گھر کے صحن میں ایک زرکار شامیانہ تان کر اس کے نیچے ایک خوبصورت تخت بچھایا۔ اس تخت پر ریشمی تکیوں اور گدوں کے درمیان اس مٹکے کو جا کے رکھ دیا۔ دو خوش پوش ملازم مورچھل پنکھے اٹھائے ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ اور بڑے ادب سے مٹکے پر آہستہ آہستہ پنکھا ہلاتے رہتے تھے۔ چودھری مہتاب دین نے چار دانگ عالم میں یہ چرچا کر دیا کہ یہی وہ مقدس مٹکا ہے جس میں بابا شہاب الدین نے گرو ارجن دیو کو چھپا کے رکھا تھا۔ پہلے اکا دکا سکھ مٹکے کی زیارت کے لیے آئے پھر عقیدت منڈلیاں چڑھاوے کے پھول حلوہ مٹھائیاں اور پھل لا کر درشن کرنے لگیں۔ چند مہینوں کے بعد جب سنگھ سبھا کے موقع پر جھکور میں سکھوں کا سالانہ اجتماع ہوا تو ہزاروں زائرین نے مٹکے کو تعظیم دی۔ چودھری مہتاب دین نے تعظیم دینے کا عملی طریقہ یہ رائج کر ڈالا تھا کہ عقیدت مند پہلے ہاتھ جوڑ کر مٹکے کو نمسکار کرتے تھے۔ پھر گھٹنوں کے بل جھک کر اسے بصد ادب احترام چھوتے تھے اور آخر میں چاندی کے روپیوں یا سونے کی مہروں کا نذرانہ مٹکے میں ڈال دیتے تھے۔ پہلی سنگھ سبھا پر دو ہزار روپے جمع ہوئے۔ دوسری بار پانچ ہزار۔ اسی طرح بڑھتے بڑھتے آخر ایسا وقت بھی آیا کہ سنگھ سبھا کے روز مٹکا بار بار بھرتا تھا اور دن بھر کی آمدنی بیس بیس ہزار تک جا پہنچتی تھی۔

پانچ سات برس میں چودھری مہتاب دین ایک معمولی نیل فروش سے ترقی کر کے لکھ پتی رئیس بن گئے۔ جھکور کے ارد گرد انھوں نے سینکڑوں ایکڑ اراضی خرید لی اور بابا شہاب الدین کے کچے مکان کو مسمار کر کے ایک عالی شان حویلی تعمیر کر ڈالی۔ جس کے چوبارے کی چھت بلندی میں گوردوارہ دمدمہ صاحب کے کلس کا مقابلہ کرتی تھی۔ گرنتھیوں کو یہ گستاخی ناگوار گزری۔ یوں بھی کچھ عرصہ سے جملہ گرنتھی چودھری مہتاب دین سے بیزار ہو رہے تھے۔ مٹکے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے گوردواروں کی آمدنی پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا اور چودھری مہتاب دین کی روز افزوں امارت میں گرنتھیوں کو اپنے حقوق کا خون نظر آ رہا تھا۔ ادھر سکھوں میں صلاح مشورے شروع ہوئے کہ چودھری مہتاب دین کے چوبارے کی بلندی گوردوارہ دمدمہ صاحب کے کلس سے بہر حال کمتر ہونی چاہیے۔ ادھر چودھری صاحب نے اس سازش کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے اپنے چوبارے پر سکھ پنتھ کے بے شمار جھنڈے

گاڑ دیئے۔ اندر وہی زرکار شامیانہ تان کر اُس کے نیچے تخت پوش بچھایا اور تخت پوش پر ریشمی گدّوں اور گدیلوں کے درمیان نیل کا خالی مٹکا جما کے رکھ دیا۔ اب یہ کمرہ "چوبارہ مٹکا صاحب" کہلانے لگا اور سنگتوں میں دُور دُور تک شہرت ہو گئی کہ واہ بھئی وا چودھری صاحب مہتاب دین نے بھی کمال کر دیا۔ اپنے خرچ پر مٹکا صاحب کے لیے ایسا بلند و بالا چوبارہ بنایا ہے کہ چمکور کے گوردواروں کو مات کر دیا۔

ہر سنگھ سبھا کے بعد چودھری مہتاب دین سونے چاندی کے سکّوں کو گلا کر سلاخوں میں ڈھال لیتے تھے اور ان سلاخوں کو تانبے کی گاگروں میں بھر کر اپنی حویلی کی اندرونی دیواروں میں خفیہ طور پر گاڑ دیتے تھے۔ اس خزانے کی حفاظت کے لیے چودھری صاحب نے ایک نرالی ترکیب نکالی۔ انھوں نے کوئی درجن بھر قاری اور حافظ جمع کر کے ملازم رکھ لیے۔ اندر کے کمرے میں ہر قاری باری باری سے دو دو گھنٹے بابا شہاب الدین کے لیے قرآن خوانی کرتا تھا۔ ایک دو نوکران کی خدمت پر ہمہ وقت مامور رہتے تھے۔ چنانچہ اندرونی کمروں میں چوبیس گھنٹے چراغ جلتا تھا اور قرآن خوانی ہوتی تھی۔ ایک پنتھ دو کاج۔ بابا شہاب الدین کی رُوح کو ایصالِ ثواب بھی ہوتا رہتا تھا اور چودھری مہتاب دین کے گڑے ہوئے خزانے کی حفاظت بھی بعنوان شائستہ ہوتی رہتی تھی۔ دن رات قرآن خوانی کی خبر پھیلی تو لوگوں نے فرطِ مسرت و حیرت سے اپنی اُنگلیاں کاٹ لیں۔ واہ بھئی وا۔ چودھری مہتاب دین کی کیا بات ہے۔ بابا صاحب کی رُوح پاک کے لیے دن رات چراغ جلاتا اور قرآن شریف پڑھواتا ہے۔ چودھری صاحب نے بھی اپنی سعادت مندی کا مزید ثبوت دینے کے لیے بابا شہاب الدین کے مزار کی مرمّت پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ قبر کا تعویذ بیش بہا سنگِ مرمر کا بنایا اور فرش اور دیواروں پر بے شمار چھوٹے چھوٹے خوشنما شیشے چڑھوا دیئے۔ اب مزار پر ایک چراغ جلتا تھا تو فرش اور دیواروں پر اس کے سینکڑوں عکس جگمگا اُٹھتے تھے۔ عقیدت مند سرشار ہو کر جھومتے تھے اور چودھری مہتاب دین کی امارت اور سخاوت کے گُن گاتے تھے۔

دین کی طرف سے بے نیاز ہو کر اب چودھری مہتاب دین نے اپنی دولت کا رُخ دنیا کی طرف بھی موڑنا شروع کیا۔ حویلی کے بڑے احاطے میں وہ صبح و شام دربار لگا کر بیٹھنے لگے۔ سُرخ بانات پر سنہری گوٹے کا شامیانہ لگتا تھا۔ نقرئی پایوں والی زرکار مسند پر چودھری صاحب خود بیٹھتے تھے۔ پیچھے آٹھ دس چوبدار شمشیر و عصا لیے مستعد کھڑے رہتے تھے۔ دائیں بائیں خوش پوشاک خادم دست بستہ حاضر رہتے تھے۔ سامنے درباریوں کی نشستیں تھیں۔ درباریوں میں قل اعوذیئے ملّاؤں، شراد کھانے والے پنڈتوں اور بھنگ کے رسیا نہنگ اکالیوں کی اکثریت تھی۔ ان لوگوں کو اپنے دربار کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لیے مہتاب دین طرح طرح کے پاپڑ بیلتے تھے۔ مولویوں کے لیے دو وقت پلاؤ گوشت اور مُرغ پکتے تھے۔ پنڈتوں کے لیے پوری کچوری، حلوے اور کھیر کا دَور چلتا تھا۔ نہنگ اکالیوں کے لیے بڑے بڑے کونڈوں میں بھنگ بھگوئی جاتی تھی اور بالٹیاں بھر بھر کے تقسیم ہوتی تھی۔ یوں بھی گرد و نواح کے اُٹھائی گیرے، رسّہ گیر اور نامی گرامی چور اچکے وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہتے تھے اور چودھری مہتاب دین کے ساتھ ذاتی رابطہ قائم رکھتے تھے۔ اپنی نوابی کا مکمل ٹھاٹھ جمانے کے لیے چودھری صاحب نے چھ چھ فٹ کے پچاس تنومند گھوڑ سواروں کا دستہ بھرتی کیا اور اپنی سواری کے لیے ایک بوڑھا سا ہاتھی بھی کہیں سے خرید لیا۔ اس ہاتھی پر چاندی کا ہودہ لگا کے وہ چمکور کے گلی کوچوں میں ہوا خوری کے لیے نکلا کرتے تھے۔ مضافات میں اپنی زمینداری کا دورہ کرنے کے لیے وہ اور ان کا عملہ رتھوں پر سوار ہوتا تھا۔ ان رتھوں کے لیے

انھوں نے ہریانے کے جاٹی وچوبند بیلوں کی خوبصورت جوڑیاں پال رکھی تھیں۔ جب بیل رتھوں میں جُتتے تھے تو ان پر زربفت کے جھول ڈالے جاتے تھے۔ گلے میں چاندی کی ننھی ننھی گھنٹیاں لٹکتی تھیں اور سینگوں پر سونے کے خول چڑھائے جاتے تھے۔ اپنے بیلوں سے چودھری مہتاب دین کو خاص الفت تھی۔ ہر صبح وہ ان کا چارہ اپنے سامنے ڈلواتے تھے۔ دن میں کئی بار اُن پر پھریرا ہوتا تھا اور ہر جمعرات کو خالص گھی اور شکر میں مکئی کی روٹی کی چُوری کُوٹ کر انھیں کھلائی جاتی تھی۔ رتھ کھینچنے کے بعد بیلوں کو پانی میں گلاب کا عرق ملا کر پلایا جاتا تھا۔

جُوں جُوں دولت کی ریل پیل بڑھتی گئی، چودھری مہتاب دین کی دلچسپیاں بھی گھوڑوں، بیلوں اور ہاتھیوں کی دُنیا سے نکل کر اپنی جولانیوں کے لیے نئے نئے میدان مارنے لگیں۔ طبیعت میں اقتدار کی ہوس اور دماغ پر امارت کا بھوت سوار تھا۔ ان کی سب سے عزیز ترین خواہش یہ تھی کہ چار دانگ عالم میں ان کے نام کا ڈنکا بجے۔ جس طرف سے وہ گزر جائیں لوگ اُنگلیاں اُٹھا اُٹھا کر کہیں "یہ چودھری مہتاب دین کی سواری جا رہی ہے" "چوبارہ ٹکا صاحب" کے مالک۔ راجوں کے یارِ غار۔ مہاراجوں کی ناک کے بال چودھری مہتاب دین جن کے جاہ و جلال اور تزک و احتشام کے سامنے سارے ماجھے میں کسی اور کا چراغ نہیں جل سکتا۔ لیلائے آرزو کے اس جنون میں چودھری صاحب نے سب سے پہلے روپڑ کے راجہ بھوپ سنگھ کو بڑی خوشامد سے چکور صاحب تشریف لانے کی دعوت دی۔ بھوپ سنگھ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے روپڑ کا حاکم مقرر کر کے بھیجا تھا۔ دریائے ستلج کے کنارے یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا جس کی اہمیت ابتدا میں صرف اتنی تھی کہ یہاں سے جنید کیتھل اور نابھہ کے راجواڑوں پر نظرِ احتساب رکھنا آسان تھا۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کا دام ق پھیلتا پھیلتا دریائے ستلج تک پہنچ گیا۔ سکھوں کی سلطنت ستلج کے دائیں کنارے تک محدود ہو کے رہ گئی۔ اس موقع پر انگریزوں اور کے درمیان ایک سرحدی شہر کی حیثیت سے روپڑ کو بڑا اہم مقام حاصل ہو گیا۔ راجہ بھوپ سنگھ نے اس صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ انگریزوں کے خلاف رنجیت سنگھ کے ساتھ اور رنجیت سنگھ کے خلاف انگریزوں کے ساتھ ساز باز کا کچھ ایسا جال بُنا وہ دونوں بھوپ سنگھ کو اپنا جگری دوست ماننے لگے اور سازشوں کے اس اُلجھاؤ میں بھوپ سنگھ رفتہ رفتہ روپڑ کا خود مختار حکمران ہو گیا۔ لاہور کا دربار اور انگریزوں کے ایجنٹ راجہ بھوپ سنگھ کو مُنہ مانگی رقمیں بھیجتے رہتے تھے جنھیں وہ شراب، کباب اور ع پر بے دریغ خرچ کر ڈالتا تھا۔ اگر کبھی یہ رقمیں وصول ہونے میں تاخیر ہو جاتی تو بھوپ سنگھ کے سپاہی روپڑ کے گرد و نواح نکل جاتے تھے اور دن دہاڑے ڈاکے ڈال کے سونا چاندی اور غلّے کے علاوہ گائے، بھینسوں، گھوڑوں اور جوان عورتوں کو بھی لاٹھی سے ہانک لاتے تھے۔ راجہ بھوپ سنگھ عرصہ سے چودھری مہتاب دین کی دن دُگنی اور رات چوگنی امارت کے چرچے سن تھا۔ اُسے وہ طلسمی ٹکا بھی دیکھنے کا شوق تھا جو سال میں کئی بار دولت کے انبار اُگلتا ہے۔ اس کے علاوہ چکور صاحب کے مقدس گوردواروں کی زیارت بھی ایک بہانہ تھی، چنانچہ جب بھوپ کو چودھری مہتاب دین کا دعوت نامہ ملا تو اس نے بسر و چشم قبول کر خبر سُن کر چودھری صاحب کا سر وفورِ مسرت سے چکرانے لگا اور انھوں نے فوراً بابا شہاب الدین کے مزار پر حاضر ہو کر دو شکرانہ ادا کیے۔

راجہ بھوپ سنگھ کی خاطر تواضع اور استقبال کے لیے چودھری مہتاب دین نے جس پیمانے پر انتظامات شروع کیے وہ اپنی

آپ تھے۔ سارے گاؤں کے درو دیوار پر چودھری صاحب نے اپنی جیب سے سفیدی پھروائی۔ گلی کوچوں میں حلوان بچھوایا۔ بچوں کو نیلے اور سبز ریشم کی وردیاں سلوا کے دیں۔ وہ رنگ برنگی جھنڈیاں لے کر صبح شام جلوس نکالتے تھے اور نعرے لگانے کی مشق کرتے تھے۔ ہر مشق کے بعد انھیں دودھ جلیبی اور موتی چور کے لڈّو بانٹے جاتے تھے۔ پانڈو دانہ کے میدان میں راجہ بھوپ سنگھ کے سواروں اور سپاہیوں کے لیے خیموں اور شامیانوں کی قطاریں ایستادہ ہو گئیں جن میں سینکڑوں مشعلوں، شمعوں اور فانوسوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گرد بٹھانے کے لیے بہشتیوں سقے صبح شام چاروں طرف چھڑکاؤ کرتے تھے۔ چھڑکاؤ کے پانی میں عرق گلاب کی بوتلیں بڑی فیاضی سے ملائی جاتی تھیں۔

چودھری مہتاب دین کی حویلی مردانے میں راجہ بھوپ سنگھ کی رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مہمان خانے کی دیواروں پر ابرق ڈال کر سفیدی کی گئی تھی۔ دروازوں پر سونے اور کمخواب کے پردے ہر طرف لٹکے ہوئے تھے اور فضا کو ہر لحظہ معطّر رکھنے کے لیے کئی ملازم عطر کی پچکاریاں اُٹھائے مستعد کھڑے رہتے تھے۔

راجہ بھوپ سنگھ کو چمکور صاحب میں صرف ایک دن اور ایک رات قیام کرنا تھا۔ ان کی آمد سے ایک ہفتہ قبل راجہ صاحب کے ڈیوٹی افسر صاحب انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے تشریف لائے۔ اُنھوں نے تقریباً ہر چیز میں کچھ نہ کچھ مین میخ نکالی اور راجہ صاحب کے قیام کو آرام دہ بنانے کے لیے چودھری مہتاب دین کو بہت سے مفید مشوروں سے نوازا۔ ایک مشورہ یہ تھا کہ راجہ بھوپ سنگھ کے لیے اعلیٰ درجے کی شراب کثیر مقدار میں موجود ہو۔ شراب کے ساتھ کباب بھی لازمی ہیں، لیکن حلال گوشت نہ ہو، خالص جھٹکا ہو۔ شراب اور کباب کے بعد راجہ صاحب صرف سؤر کا گوشت نوش فرماتے ہیں۔ سؤر جوان اور فربہ ہوں اور کھانے کے بعد اگر اعلیٰ درجے کے ناچ اور گانے کی محفل برپا ہو تو چودھری صاحب کے ذوقِ میزبانی پر راجہ صاحب کی خوشنودی کی مہر ثبت ہونا امرِ یقینی ہے۔

یہ ہدایات سن کر چودھری مہتاب دین ایک لحظے کے لیے سکتے میں آ گئے۔ ان کی رگوں میں بابا شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ کے خون کا جو حصہ تھا اُس نے دم بھر کے لیے بُری طرح جوش مارا لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ سونے چاندی سے بھری ہوئی گاگروں کا خوش آئند تصور، خون کے جوش پر غالب آ گیا اور جاہ و جلال کی شہرت نے موروثی توہمات کے تانے بانے ادھیڑ کر پھینک دیئے۔ چودھری صاحب نے اپنا خاص رتھ دو خوش سلیقہ مصاحبوں کے ساتھ انبالہ کی طرف بھگایا تاکہ وہ سہارن پور کی یکتائے روزگار موسیقار زہرہ جان اور جگادھری کی مشہورِ عالم رقاصہ ترنجن بائی کو جس قیمت پر ہو سکے اپنے ساتھ لائیں۔ دونوں کے ساتھ تین تین ہزار روپیہ نقد، ایک ایک جڑاؤ گلوبند اور دو دو شاہانہ جوڑوں پر معاملہ طے ہوا، اور پانڈو دانہ کے میدان میں ان کے طائفوں کے لیے کئی ایک اور خیمے بھی نصب ہو گئے۔

شراب کے لیے چودھری صاحب نے اپنے گماشتے لدھیانہ روانہ کیے۔ وہاں پر انگریزوں کا پولیٹکل ایجنٹ کرنل وڈ تھا۔ وہ سیاسی ریشہ دوانیوں کے علاوہ درپردہ انگریزی شراب کا بیوپار بھی کیا کرتا تھا۔ چودھری مہتاب دین کے آدمی اس سے پانچ ہزار روپے کے عوض اعلیٰ درجہ کی ولائتی شراب کی تین چار پیٹیاں خرید لائے۔

فربہ اور جوان سؤر فراہم کرنے کے لیے چودھری صاحب کو البتہ قدرے دقّت کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے وہ چاروں

گوردواروں کے گرنتھیوں کے پاس گئے کہ وہ اپنی وساطت سے منہ مانگے داموں پر چند ایک اچھے سؤر منگوا دیں، لیکن سکھ گرنتھیوں اور پاٹھیوں نے واہگرو واہگرو کر کے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ ہم بابا شہاب الدین کے ساتھ اپنے عہد نامہ کو توڑنے کے روادار نہیں ہیں۔ ہر چند چودھری مہتاب دین نے انھیں یقین دلایا کہ عہد نامہ کی شکست و ریخت کا بوجھ خود ان کی اپنی گردن پر ہوگا۔ لیکن گوردوارہ دمدمہ صاحب کے بوڑھے گرنتھی گیانی کھڑک سنگھ نے انھیں سختی سے ڈانٹ دیا۔ چودھری مہتاب دین، تم اپنے آپ کو کس کھیت کی مولی سمجھتے ہو۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ کسی کو تمھارا نام بھی یاد نہ رہے گا، لیکن بابا شہاب الدین کا دربار اور سکھ دھرم تو ہمیشہ زندہ رہیں گے ان کے معاہدہ کو ہاتھ لگانے والے ہم تم کون۔

چودھری صاحب کا بس چلتا تو وہ وہیں کھڑے کھڑے گیانی کھڑک سنگھ کا منہ نوچ لیتے، لیکن راجہ بھوپ سنگھ کی آمد کے موقع پر سکھوں سے لڑائی جھگڑا مول لینا قرین مصلحت نہ تھا۔ چنانچہ چودھری مہتاب دین خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے اور دل ہی دل میں کڑھتے اور جھلا سکھ پنتھ کو گالیاں دیتے واپس لوٹ آئے۔ گھر پہنچ کر انھوں نے کوئی درجن بھر چماروں کو جمع کیا اور انھیں توڑے دار بندوقوں اور تیز دھار بلموں سے مسلح کر کے بیلے کے جنگلوں میں بھیج دیا کہ وہ تنومند اور جوان سال سؤروں کا شکار کر لائیں۔

خدا خدا کر کے آخر وہ روز سعید بھی آ پہنچا، جس کے انتظار میں چودھری مہتاب بیقراری سے گھڑیاں گن رہے تھے۔ راجہ بھوپ سنگھ اپنے جنگی رتھ پر سوار چکور صاحب تشریف لائے۔ ان کے جلو میں ہاتھیوں، گھوڑوں، شکاری کتوں اور فوجی سپاہیوں کا لاؤ لشکر تھا جب یہ جلوس چکور صاحب کی حدود میں داخل ہوا، چودھری صاحب کے بیسیوں ملازم پھولوں کے ٹوکرے اٹھائے دو رویہ کھ ہوئے۔ جہاں جہاں سے قافلہ گزرتا تھا۔ یہ لوگ گلاب، چنبیلی اور گیندے کے پھول رتھ کے راستے میں بچھاتے جاتے تھے۔ چھوٹے بچے رنگ برنگی جھنڈیاں لہراتے تھے اور گلی گلی میں باوردی بینڈ سکھوں کے مشہور ترانے بجا بجا کر سلامی دیتے تھے۔

راجہ بھوپ سنگھ نے پہلے چاروں گوردواروں کی زیارت کی۔ پھر وہ بابا صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے اور اس کے بعد انھ نے چوبارہ مٹکا صاحب جا کر اس طلسماتی مٹکے کو تعظیم دی، جس کے بطن سے سونا چاندی بڑی افراط سے پیدا ہوتا تھا۔ راجہ بھوپ سنگھ نے نیلے زربفت کا سرپوش اٹھا کر مٹکے کے اندر للچائی ہوئی نظروں سے اندر جھانکا جو آج خاص طور پر سونے چاندی کے سکوں ا زیورات سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ چودھری مہتاب دین نے لپک کر مٹکا انڈیل دیا اور راجہ بھوپ سنگھ کے قدموں میں یہ زرکا لگا کر بڑی لجاجت سے عرض کیا۔ "حضور، فقیر کا یہ حقیر نذرانہ قبول ہو۔"

راجہ بھوپ سنگھ کے خاص مصاحبوں نے یہ سارا انبار سمیٹ کر بڑے بڑے رومالوں میں باندھ لیا۔ راجہ صاحب نے ا خوشنودی کے لیے مٹکا صاحب کو دوبارہ تعظیم دی۔

انگریزی شراب کی بوتلیں راجہ بھوپ سنگھ کو خاص طور پر پسند آئیں۔ سرِ شام پانڈوانہ کے میدان میں بڑے بڑے سؤروں کی اترنے لگیں اور رات گئے جب زہرہ جان اور ترنجن بائی کے طائفے اپنا اپنا ساز و سامان سجا کر محفل میں جم گئے تو یکایک چکور کے مسلمان اور سکھ بڑے بوڑھے اپنے گھروں کی کنڈیاں چڑھا کر اندر دبک کر بیٹھ گئے۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں آج پہلی مرتبہ چکور کی سرزمین پر سؤر کا گوشت کاٹا گیا تھا۔ آج تک اس قصبہ کی فضا زہرہ جان کے طبلے کی تھاپ اور ترنجن بائی کے گھنگھروؤں کی جھن

سے نا آشنا تھی۔ رات کے بڑھتے ہوئے سناٹے میں جب ان سازوں کی آواز فضا میں دُور دُور تک لہراتی تھی، گاؤں والوں کے دل دھک دھک کرنے لگتے تھے۔ خوش عقیدہ عورتیں جو ہر جمعرات کو بابا صاحب کے مزار پر دیا جلانے جاتی تھیں، سہم سہم کر کوٹھوں کی منڈیر سے لگی بیٹھی تھیں۔ طوفان زدہ اندھیری راتوں میں وہ انھیں کوٹھوں پر چڑھ چڑھ کر ان مقدس چراغوں سے اپنی مُرادیں مانگا کرتی تھیں جو بابا صاحب کے فیض سے پانڈوانہ کے میدان روشن ہُوا کرتے تھے آج اسی میدان میں رنگ و نُور کا ایک سیلاب سا آیا ہُوا تھا۔ قندیلوں اور شمعوں کی ضیا، تا حدِ نظر جگمگا رہی تھی لیکن شراب میں بدمست فوجیوں کی ہر ہنکار کے ساتھ گاؤں والوں کے دل لرزنے لگتے تھے جیسے کوئی زبردستی ان کی باہنیں پکڑ کر کھینچ رہا ہو۔ بے زبان کنواریاں جو سپنوں کی بارات لے کر بابا صاحب کے مزار پر کچے چاول اور شکر کی مٹھائیاں بھر بھر کے نچھاور کیا کرتی تھیں، یُوں حیران پریشان تھیں، جیسے بھرے ہوئے چوراہے پر اُن کا سُہاگ لُٹ رہا ہو۔ سارا گاؤں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح انجانی فضاؤں میں ڈگمگا رہا تھا۔ روایات کی ڈور کٹ گئی تھی، ثبات کا پیچ کٹ گیا تھا، سکون ی دولت لُٹ گئی تھی حقیقت کی روشنی تاریخ کے بے نُور سانچوں میں ڈھل ڈھل کر مستقبل کے لیے ایک بے حِس، بے جان اور بے رنگ بت کا رُوپ دھار رہی تھی۔ صدیوں کے سکوت کو فقط ایک رات کے شور نے نگل لیا تھا۔ ایک پھیکا سا انقلاب، ایک بدمزہ سا تغیر یاروں طرف بدرو کے کنارے پانی کی طرح اُبل رہا تھا۔ شاید یہ وہ لمحہ تھا جب وقت کا سویا ہُوا بادشاہ بیداری کی کروٹ لیتا ہے یا بب وقت کا جاگتا ہُوا پاسبان اُونگھنے لگتا ہے یا جب وقت کا نہیں، وقت کی مصلحت کا بے دام غلام ارضی شطرنج پر سماوی انسہ پھینکنے کی کوشش یا بہانہ کرتا ہے۔ جیسا تیسا تھا آخر بیت گیا — بیت جانا چاہیے۔

دوسری صبح نُور کے تڑکے جب راجہ بھوپ سنگھ اور اُس کا لاؤ لشکر رخصت ہو کر چلا گیا تو چمکور صاحب کی صورت کچھ یُوں ل آئی، جیسے ہزاروں گھوڑوں نے کسی خوبصورت قبرستان کو پاؤں تلے رَوند ڈالا ہو۔ تھکے ہارے کارندے اور خادم جہاں جگہ ملی ر کر سو گئے۔ اندر حویلی میں چودھری مہتاب دین بھی ایک تخت پوش پر لیٹے کروٹیں بدل رہے تھے۔ ایک دو خاص مصاحب ان کا سَر اور ؤں دبا رہے تھے۔ کئی روز کے لیے رَت جگے نے اُنھیں چُور کر دیا تھا۔ یُوں بھی کل رات سے وہ کچھ زیادہ ہی کسل مند تھے۔ رقص و نغمہ کی محفل میں جہ بھوپ سنگھ نے انھیں کئی بار شراب پینے کی دعوت دی تھی، لیکن چودھری صاحب ہر بار خوش سلیقہ حیلوں بہانوں سے ٹالتے ئے۔ انجامِ کار جب راجہ صاحب خود لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھے اور شراب کا جام بہ نفسِ نفیس اُن کے ہونٹوں سے لگا کر کھڑے ہو گئے تو دھری مہتاب دین کی مروّت انکار کی تاب نہ لا سکی۔ دوسرا جام اُنھوں نے زہرہ جان کے ہاتھ سے پیا۔ تیسرا ترنجن بائی سے۔ اوّلین دہ گساری کے اس دور نے چودھری مہتاب دین کے دل و دماغ میں ایسے ایسے رنگین قمقمے روشن کر دیئے جن کی تجلیوں سے وہ آج تک شناس نہ ہوئے تھے۔ حویلی کے در و دیوار ایک خوبصورت غبار میں ڈوب گئے۔ زہرہ جان کے گلے سے آواز کی جگہ مہتابیاں سی چھوٹنے یں۔ ترنجن بائی کے تھرکتے ہوئے تن بدن میں سونے اور چاندی کے تار لہرانے لگے۔ رنگ و نُور کے اس سیلاب میں چودھری مہتاب دین بارے کی طرح اُڑ رہے تھے لیکن جب صبح ہوئی تو ٹوٹتا ہُوا خمار چودھری صاحب کے رگ و پے میں ٹیسیں مارنے لگا۔ وہ اپنے تخت پوش اوندھے پڑے ہولے ہولے کراہ رہے تھے۔ اس عالم میں سردار نونہال سنگھ نے انھیں ایک مژدہ جانفزا سُنایا۔ سردار نونہال سنگھ چوبارہ کا صاحب کی سیوا پر مامور تھے اور اس رُوحانی کاروبار میں چودھری مہتاب دین کے دستِ راست تھے۔

سردار نونہال سنگھ نے چودھری صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا "چودھری اُٹھو۔ اس طرح حاملہ عورت کی طرح پڑے پڑے کب تک کراہتے رہو گے۔"

چودھری صاحب اپنا دُکھتا ہُوا بدن سنبھال کر تخت پوش پر اکڑوں بیٹھ گئے۔

"چودھری لوہا لوہے کو کاٹتا ہے" سردار نونہال سنگھ نے کہا "شراب کا کسل بھی شراب ہی سے جائے گا۔"

سردار نونہال سنگھ کے اصرار پر چودھری مہتاب دین نے شراب کے ایک دو گھونٹ پیئے تو ان کے کسیلے مُنہ کا ذائقہ بدل گیا۔ زبان پر تراوت آ گئی۔ گلا کُھل گیا اور جسم کے دُکھتے ہوئے جوڑوں میں از سرِ نو نشاط عَود کر آیا۔ زندگی کے کیف کا یہ تیر بہدف نُسخہ چودھری صاحب کو بیحد پسند آیا۔ انگریزی شراب کی بچی کھچی بوتلیں جو لوکر اچھرکر باہر پھینکوائی جا رہی تھیں، اُنھوں نے واپس منگوا لیں اور اپنے دیوان خانے کی الماری میں کو کر احتیاط سے تالا لگا دیا۔

شام کے وقت جب چودھری مہتاب دین ہاتھی پر بیٹھ کر حسبِ معمُول ہُوا خوری کے لیے نکلے تو اُنھیں اپنے گاؤں کا ماحول کچھ پرایا پرایا سا لگا، چھوٹے چھوٹے بچے جو کلکاریاں مار مار کر ہاتھی کی سُونڈ سے لٹک جاتے تھے اور ہاتھی انھیں اُٹھا اُٹھا کر چودھری مہتاب دین کی گود میں ڈال دیتا تھا آج کہیں نظر نہ آئے۔ وہ نوخیز اور شریر لڑکیاں بھی غائب تھیں جو چودھری کا راستہ روک کر چاندی کے کنگنوں اور سونے کی بالیوں کی فرمائشیں کیا کرتی تھیں۔ آج کسی نے سرِ راہ اس کے ساتھ ہلکا پھلکا مذاق نہ کیا۔ وہ سارا گاؤں گھوم آیا لیکن کسی کوٹھے کی چھت سے دُعاؤں کی آواز نہ آئی کہ "او بابا صاحب کے خوش بخت وارث۔ خُدا تجھے سدا ہی سکھی رکھے۔" اس بے کیف سیر کے بعد جب چودھری صاحب گھر آئے تو محجوب اور شرمندہ سے تھے۔ لیکن سردار نونہال سنگھ نے شراب کی بوتل کھول کر اُن کے سامنے رکھ دی۔ دو تین پیگ پی کر چودھری صاحب پھر چہک اُٹھے۔ چکور کی سنسان گلیاں جادُو کے زور سے پھر آباد ہو گئیں۔ خاموش کوٹھوں پر خُوبصورت پریوں کے جُھرمٹ ناچنے لگے۔ آسمان پر قوسِ قزح چھا گئی……

راجہ بھوپ سنگھ نے خوش ہو کر چودھری مہتاب دین کو اپنے ہاتھ سے دو خط لکھ کر دیئے تھے۔ ایک پروانہ لارڈ ولیم بنٹنگ کی طرف تھا جو کلکتہ میں ملکہ معظمہ کے نام پر ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل تھے۔ اس خط میں راجہ بھوپ سنگھ نے چودھری مہتاب دین کو "فرزند دلپذیر حکومتِ انگلشیہ وفاشعار قیصر یہ ہند اور شیرِ سلطنت و معاون دولتِ برطانیہ" کے خطابات سے نوازا تھا اور لارڈ ولیم بنٹنگ کی خدمت میں بڑے وثوق سے یہ تصدیق کی تھی کہ بھوپ سنگھ کے بعد ستلج کے اس پار انگریزوں کا سب سے بڑا بہی خواہ چودھری مہتاب دین ہی ہے۔

راجہ بھوپ سنگھ کی دوسری سند مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام تھی۔ اس میں چودھری مہتاب دین کو سکھ پنتھ کی آنکھ کا تارا اور خالصہ حکومت کا راج دلارا ثابت کر کے یہ سرٹیفکیٹ دیا کہ ستلج کے اس پار راجہ بھوپ سنگھ لاہور دربار کی تلوار اور چودھری مہتاب مہاراجہ اہیراج کی ڈھال ہے۔ سرکاری اکال پورکھ نے ان دو وفادار سپوتوں کو پیدا کر کے خالصہ دربار کو ستلج پار کی سرحد سے بالکل بے فکر کر دیا ہے۔ راجہ بھوپ سنگھ واہگرو جی کا خالصہ اور چودھری مہتاب دین واہگرو جی کی فتح ہے۔

چودھری صاحب نے ان نایاب پروانوں کے لیے ریشم اور کمخواب کی تہ در تہ تھیلیاں سلوائیں۔ دن میں کئی بار وہ ان تھیلیوں

کر ہاتھوں لے کر اعلیٰ نسل کے بٹیروں کی طرح سہلاتے تھے۔ کبھی مٹھیاتے تھے۔ مٹھیانا ایک ایسی صفت ہے جس کو سمجھنے اور پانے کے لیے یا تو بٹیر بننا چاہیے یا بٹیر باز۔ باز اگرچہ پرندہ ہے لیکن بازی چرندہ ہے۔ درندہ ہے ـــــ سب کچھ وہ ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔ رات کے وقت چسکی لگا کر وہ ان تھیلیوں کو بڑے اہتمام سے کھولتے اور دونوں خطوں کو انتہائی ادب و احترام کے ساتھ سر آنکھوں سے لگاتے اور جھوم جھوم کر بار بار پڑھتے۔ بادامی کاغذ کے یہ پُرزے چودھری صاحب کے ذہن میں جل پریوں کی طرح ناچتے اور ان کا ایک ایک حرف الہامی پھوار کی طرح ان کی رُوح کے نئے ریگزاروں میں رنگ برنگ ترشح کرتا۔ لاہور اور کلکتہ کے شاہی درباروں کا تصور اُن کے دل و دماغ میں پھلجھڑیاں سی پھوڑتا اور خیالوں کے اس گل و گلزار میں چکور کی بستی بڑی ذلیل اور بے معنی نظر آتی۔ یہاں کے لوگ طوطا چشم تھے، جو چودھری مہتاب دین سے کنی کترا کر گزر جاتے تھے۔ اُنھوں نے کسی کو قتل نہ کیا تھا، کسی کے ہاں ڈاکہ نہ ڈالا تھا، کسی عورت کی آبرو نہ لُوٹی تھی۔ اس کے برعکس اُنھوں نے تو اس گاؤں کا سر بلند کر دیا تھا۔ چودھری مہتاب دین کے طفیل آج دُور دُور تک چکور کا ڈنکا بجتا تھا، لیکن یہاں کے کمینے لوگ اپنی عظمت کے اس احساس سے بے بہرہ تھے۔ دن بدن مغائرت کی ایک ٹھوس دیوار چودھری صاحب کے گرداگرد اُٹھتی چلی گئی اور رفتہ رفتہ وہ ایک کوڑھی کی طرح سے کٹ کر الگ تھلگ پڑے رہ گئے۔ صبح کی سیر بند ہو گئی۔ شام کو ہاتھی کی سواری بھی موقوف ہو گئی۔ دن بھر وہ اپنی حویلی میں بند رہتے تھے تاکہ گاؤں والوں سے مٹھ بھیڑ نہ ہو جو دیکھتے ہی منہ دوسری طرف پھیر لیتے تھے۔ ماحول کی اس پاگل کر دینے والی بیگانگی سے گھبرا کر چودھری مہتاب دین نے رختِ سفر باندھا اور ایک ہاتھی تین رتھ پچاس باوردی سوار اور سو پیادوں کی جمعیت لے کر اُنھوں نے کلکتہ کا رُخ کیا۔

جب چودھری مہتاب دین کی سواری روانہ ہوئی تو گویا طاعون کا چوہا گاؤں سے باہر نکل گیا۔ لوگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو مُبارک باد دی۔ بچوں نے از سرِ نو حویلی کے وسیع میدان میں گلی ڈنڈا کھیلنا شروع کر دیا اور جوان لڑکیوں نے حسبِ معمول کوٹھوں پر بیٹھ کر بابا صاحب کے دوہے گانا شروع کر دیے۔ بابا شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے وطن کی دوشیزاؤں سے خاص اُنس تھا۔ جو لڑکی عقیدت مندی سے بابا صاحب کے دوہے گاتی تھی اس کا دامنِ مراد پھولوں سے گلنار ہو جاتا تھا۔ چنانچہ چکور صاحب کی مائیں بڑی توجہ سے اپنی بیٹیوں کو بابا صاحب کے دوہے حفظ کرایا کرتی تھیں۔ یہ دوہے بابا شہاب الدین نے عشقِ الٰہی کی یاد میں جل جل کر تصنیف کیے تھے اور ان کا ایک ایک لفظ دہکتے انگاروں کی مانند تپاں تھا۔ لیکن جب یہ دوہے شرمیلی کنواریوں کے ہونٹوں پر لرزتے تھے تو یہی انگارے ارمانوں کی سُبک چاندنی اور سپنوں کے سُہانے آبشار بن جاتے تھے۔ معرفت کے راز جب حقیقت کے سانچے میں ڈھلتے تھے تو بابا شہاب الدین کے دوہوں میں نوخیز کنواریوں کے آرزو انگیز سپنے نئی دُلہنوں کے متلاطم ولولے اور منتظر سہاگنوں کی آس عجب انداز سے جھلکتی تھی۔

او میرے یار میں نے ابھی تک تیرے باغ میں قدم نہیں رکھا
مجھے کیا معلوم تیرے پھول پیلے ہیں یا سُرخ ہیں یا سفید ہیں
جو تیرا رنگ ہے وہی میرا رنگ ہے۔
اپنے باغ کا دریچہ ذرا سا تو کھول

اگر میرا قدم جلے تو میں اپنے پاؤں کاٹ ڈالوں
میں تو اپنے یار کے باغ میں آنکھوں کے بل جاؤں گی۔

او میرے یار تیرے دامن کو میں نے کبھی نہیں چھوا
تیرا دامن بادلوں سے پرے ستاروں سے اُونچا ہے
میں بچاری تو کبھی تیرے خیال کے دامن کو بھی نہیں چھو سکی
تیرا خیال تجھ سے بھی زیادہ تابناک ہے
کیونکہ میں اس کو خود اپنے ہاتھوں سے سجاتی ہوں

میرے یار رات کی خلوت میں مَیں نے تجھ کو لمحہ بھر کے لیے آخر پا ہی لیا
اب میری سہیلیاں مجھے طعنہ دیتی ہیں کہ یہ محض خواب تھا۔
چلو خواب ہی سہی او میرے یار
ایسے خواب پر ہزاروں بیداریاں قُربان
اے حقیقت — رات کی تنہائی میں ایک بار پھر بے حقیقت بن کر آ جا
میں تو اسی انتظار میں پڑی سوتی ہُوں۔

او میرے یار میں بھی تو تیرے بہت کام آتی ہوں
دیکھ میں نے تیرے رُخ پر اپنے تصوّر کا حجاب ڈال رکھا ہے
اگر میں اپنے تصوّر کی آنکھ ذرا سی بند کر لوں
تو ساری دنیا تجھے بے نقاب دیکھ لے گی۔

او میرے یار تُو ابد ہے تُو ازل ہے۔
تُو احد ہے تُو صمد ہے
شکر کر کہ تُو میری گلی کا البیلا جوان نہیں
ورنہ میں تجھے ستاتی، خوب ترساتی
لیکن یہ ستانا اور ترسانا جھوٹ موٹ کا ہوتا

یہ تو محض تیری آزمائش ہوتی
ورنہ سچ تو یہ ہے کہ میں سارا سارا دن اپنے دروازے کی اوٹ سے تجھے جھانکا کرتی ۔

او میرے یار تُو عزیز ہے تُو حفیظ ہے
تُو حکیم ہے تُو حلیم ہے
شکر کر کہ تُو میرے سینے کا ارمان نہیں
ورنہ اگر میرا سینہ پھٹ جاتا پھر بھی تُو نکل نہ سکتا

او میرے یار تُو وہاب ہے تُو ستار ہے
تُو توّاب ہے تُو غفّار ہے
شکر کر تُو ہمارے کھیت کا راکھا نہیں
ورنہ ہر روز میں تجھے چوری چوری ملنے آیا کرتی
تُو رکھوالی کر ہی نہ سکتا ۔
سارے کھیت کو چڑیاں چُگ جاتیں

او میرے یار تُو معبود ہے تُو مقصود ہے
تُو موجود ہے تُو مستور ہے
تُو سب کچھ ہے
لیکن شکر کر تُو میں نہیں
ورنہ نہ جانے تیرا کیا حال ہوتا

(ناول کا ایک باب)

قدرت اللہ شہاب

اللہ کا 007

ممتاز مفتی

قدرت اللہ شہاب اور میں نے زندگی کے ۲۸ سال اکٹھے گزارے اس کے باوجود ہم دوست نہیں تھے قدرت ایک باکردار فرد تھا۔ اس کے قول اور فعل میں ربط تھا۔ میں اس ربط سے محروم تھا قدرت اور میں ساتھی بھی نہیں تھے۔ چونکہ ہمارے مشاغل مختلف بلکہ متضاد تھے۔ ہمارا تعلق عجیب تعلق تھا۔ دونوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی وہ پاکیزہ تھا میں چکٹ میلا۔ وہ ٹھنڈا تھا میں سلگتا جلتا۔ وہ گونگا تھا میں باتونی۔ وہ کردکھانے کا رسیا تھا۔ میں منہ زبانی۔ اس کا مسلک ایک تھا۔ ایک راستہ تھا۔ ایک منزل تھی میں آوارہ تھا۔

میری دانست میں افراد کے درمیان کوئی تعلق پیدا نہیں ہو سکتا، جب تک دونوں میں قطعی برابری کا احساس نہ ہو۔ بڑا چھوٹا نہ ہو ہم دونوں میں کسی لحاظ سے برابری نہ تھی رتبے کے لحاظ سے وہ بڑا تھا انسانیت کے لحاظ سے بہت بڑا تھا میں بہت چھوٹا تھا میرے اور قدرت کے درمیان احترام کی ایک دیوار حائل تھی۔ احترام کو میں تعلق کی نفی سمجھتا ہوں چونکہ احترام قریب آنے نہیں دیتا۔

میرے مشاغل ممنوعات پر مبنی تھے وہ صراط مستقیم تھا اس لئے وہ میرے مشاغل نہیں اپنا سکتا تھا وہ راستہ جس پر قدرت گامزن تھا بہت کٹھن تھا مجھ سے آرام طلب کے بس کی بات نہ تھی۔ اس راستے پر چلنے میں ٹوٹ لازم تھی۔

آپ قدرت کی ۱۹۶۰ء کی تصویر دیکھیں پھر ۱۹۸۶ء کی تصویر ملاحظہ کریں ان دونوں میں صرف عمر رسیدگی کا فرق نہیں ہے ۱۹۶۰ میں وہ ایک ثابت اور قائم فرد تھا ۱۹۸۶ء میں ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا۔ یہ ٹوٹ ناکامی کی نہیں تھی بلکہ آزمائش میں ثابت قدمی کی ٹوٹ تھی اس کے بند بند میں منزل کی بھیک تھی۔ میں سوکھا کاٹھ تھا ۲۸ سال دریا بہتا رہا۔ اور میں کنارے پر سوکھا بیٹھا رہا۔ ۲۸ سال رواداری، خدمت اور عبادت کی دیگ پکتی رہی میں اس دیگ میں سے کوکڑو کی طرح اچھل کے باہر نکل آیا۔

مشفق خواجہ نے اپنے ایک مضمون میں کیا پتے کی بات کی ہے لکھتے ہیں: "قدرت اللہ شہاب مرحوم میں بے شمار خوبیاں تھیں عیب صرف دو تھے اشفاق احمد اور ممتاز مفتی۔"

مشفق خواجہ کی بات بالکل درست ہے سوال یہ ہے کہ قدرت نے یہ عیب کیوں پالے۔ اشفاق احمد کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ممتاز مفتی کو پالنے کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔

ایک یہ کہ قدرت ذات کا دھوبی تھا۔ راہ چلتے چلتے اسے ایک چکٹ میلا کپڑا نظر آیا اس نے اُسے اٹھا لیا۔ اور پھر زندگی بھر اُٹھا لینے کی لاج پالتا رہا۔ ۲۸ سال صابن اور میل کے درمیان جنگ جاری رہی آخر صابن جھاگ جھاگ ہو کر بہہ گیا۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہر بزرگ کے ساتھ آزمائش کا ایک کانٹا لگا ہوتا ہے ممتاز مفتی وہ کانٹا تھا۔

بنیادی طور پر قدرت اللہ اشفاق احمد کا دوست تھا۔

جب اشفاق احمد روم میں پروفیسری کے عہدے پر فائز تھا ان دنوں قدرت سرکاری دورے پر روم گیا۔ وہاں اتفاقاً اشفاق احمد سے ملاقات ہو گئی اشفاق نے کہا یہ کیا ہوٹل بازی میں پھنسا ہوا ہے تو چل میں تجھے گھر لے جاؤں۔ میں گوجروں کے محلے میں رہتا ہوں وہاں دودھ ڈبل روٹی کھائیں گے اور کتر کتر باتیں کریں گے ان دنوں قدرت ایڈونچر کا رسیا تھا اور باتیں سننے کا تو وہ ہمیشہ ہی شوقین رہا یوں قدرت اللہ اشفاق کی رنگین باتوں کے جال میں پھنس گیا۔

اس زمانے میں میں راولپنڈی کے ایک انفرمیشن ڈائیرکٹوریٹ میں ملازم تھا۔ بڑے صاحب سے شدید اَن بَن تھی۔ انہوں نے مجھ پر دو کیس کر رکھے تھے ایک فراڈ کا دوسرا سیکورٹی کا۔ انکوائری ہو رہی تھی اشفاق کہنے لگا یار میرا ایک دوست ہے جو بڑے عہدے پر فائز ہے اسے کہوں کہ تیری سفارش کرے میں نے کہا کرا دے سفارش نو انجکشن۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ایک روز وزارت کے سیکرٹری اظفر نے مجھے طلب کر لیا۔

اظفر نے پوچھا کیا آپ قدرت اللہ شہاب کو جانتے ہیں!

میں نے کہا جی نام سنا ہے۔

انہوں نے کہا کبھی ان سے ملاقات بھی ہوئی ہے کیا؟

میں نے کہا جی کبھی نہیں۔

اظفر نے میز کی دراز سے ایک خط نکالا بولا مفتی صاحب قدرت اللہ شہاب کا یہ خط مجھے آج ہی موصول ہوا ہے اس خط میں انہوں نے لکھا ہے کہ ممتاز مفتی میرے عزیز دوست ہیں ان کا خیال رکھئے اور مدد کیجئے آپ کہتے ہیں آپ قدرت اللہ شہاب کو جانتے ہی نہیں۔

میں نے کہا جناب یہ آپ ان سے پوچھئے کہ وہ مجھے دوست کیوں سمجھتے ہیں، میں نے تو آپ سے سچی بات کہہ دی ہے۔

بڑے عہدے کے باوجود اظفر ایک شریف النفس اور دیانت دار آدمی تھا وہ یہ بات سن کر سٹپٹا گیا۔ گمان غالب ہے کہ اظفر نے قدرت کو فون پر سنائی ہوں گی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد اشفاق نے مجھے خط لکھا کہ قدرت اللہ شہاب پنڈی آ رہے ہیں ان سے ملو۔ انہوں نے تمہاری سفارش بھی کی تھی، میں نے جواب میں لکھا کہ اگر اس نے سفارش کی تھی تو تیرے کہنے پر کی تھی مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے اس کا نہیں دوسرے یہ کہ اس سفارش کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا پھر شکریہ کیسا تیسرے یہ کہ میں کسی بڑے آدمی سے میل جول رکھنا نہیں چاہتا اشفاق نے یہ خط قدرت کو بھیج دیا۔ قدرت ان دنوں کراچی میں مقیم تھا۔

اس کے بعد انکوائری افسر کی سفارش پر میرا تبادلہ کراچی ہو گیا۔

اشفاق کراچی آیا تو وہ مجھے زبردستی قدرت کے گھر لے گیا جب اشفاق لاہور واپس جانے لگا تو اس نے مجھے بہت سمجھایا کہنے لگا شہاب سے ملتے رہنا وہ بڑا اچھا آدمی ہے میں نے کہا یار دنیا میں بیسیوں اچھے آدمی ہیں، اب میں کس کس سے ملتا رہوں کیوں مجھے خوار کرتا ہے۔

پھر ایک دن دفتر میں قدرت کا فون آ گیا کہنے لگا مفتی صاحب مجھے چند کتابیں خریدنی ہیں اگر آپ کو فرصت ہو تو براہِ کرم میرے ساتھ چلئے میری مدد کیجئے۔ آپ دفتر سے باہر دروازے پر کھڑے ہو جائیں، میں ابھی پہنچتا ہوں۔

اس کے بعد ہر چند دنوں کے بعد قدرت کا فون آجاتا ۔ فلاں کام ہے اگر آپ کو فرصت ہو تو میرے ساتھ چلئے یوں قدرت اور میں ملنے لگے ۔ ان دنوں ابنِ انشا، احمد بشیر اور میں ہم تینوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے حفیظ جالندھری دفتر کا سربراہ تھا ۔

انہی دنوں میری پے فکسیشن کا مسئلہ کھڑا ہو گیا ۔ ۱۹۵۱ء میں فیڈرل پبلک سروس کمشن نے مجھے ایک آسامی پر فائز کیا تھا مگر میری پے فکسیشن نہیں ہوئی تھی ۔

قدرت نے اس مسئلے میں دلچسپی لینا شروع کر دی ۔ حالات کو جاننے کے لیے وہ اکثر مجھے اپنے دفتر میں بلا لیتا تھا ۔

میری پے فکسیشن کے لیے اس نے جگہ جگہ میری سفارشیں کیں قدرت سفارش کرنے کے فن سے قطعی طور پر نا واقف تھا ۔ پھر یہ بھی تھا کہ جب وہ سفارش کر رہا ہوتا تو صاف نظر آتا کہ وہ اذیت سے گزر رہا ہے زبان لڑکھڑاتی، آواز مدھم پڑ جاتی پسینہ چھوٹ جاتا اس کے باوجود وہ میرے کہے بغیر میری سفارشیں کرتا رہا ۔ اگرچہ مجھے اس بات پر غصہ آتا تھا کہ وہ اپنے سے چھوٹے افسروں کی کیوں منتیں کرتا ہے لیکن میرے دل میں شکرگزاری کے جذبات بیدار ہو گئے اور میں سوچنے لگا کہ یہ کیسا آدمی ہے افسر ایسے تو نہیں ہوتے ۔

انہی دنوں پاکستان کا دارالخلافہ پنڈی منتقل ہو گیا ۔ قدرت اللہ پنڈی چلا گیا اور میں کراچی میں اکیلا رہ گیا ۔

پھر ایک دن اطلاعات کے وزیر ہمارے دفتر میں آ گئے انہوں نے مجھے حکم دیا کہ فوراً راولپنڈی جاؤ اور پریذیڈنٹ ہاؤس میں رپورٹ کرو ۔ پریذیڈنٹ ہاؤس میں گیا تو قدرت اللہ شہاب نے حکم دیا کہ اپنی جائننگ رپورٹ دے دیجئے آج سے آپ ہمارے او۔ ایس۔ ڈی ہیں یوں میں قدرت اللہ شہاب کا ماتحت بن گیا اور مجھے اُسے قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا ۔

مجھ سے قدرت کا برتاؤ عجیب تھا ۔ ہر بات پر وہ مجھ سے کہتا اگر آپ کو فرصت ہو تو ۔ اگر آپ پسند کریں تو ۔ ۔ ۔ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو اس کا برتاؤ مجھ سے ایسا تھا کہ ایسے لگتا جیسے میں نہیں بلکہ وہ میرا ماتحت ہو، صرف مجھ سے ہی نہیں، دفتر کے چھوٹے سٹاف سے اس کا برتاؤ ایسا ہی تھا ۔ لوگ باری باری اس کے پاس ذاتی مسائل لے کر آتے اور وہ آرٹ آف دی وے جا کر ان کی مدد کرتا ایک روز قدرت مجھے ایک کمرے میں لے گیا ۔ کہنے لگا مفتی صاحب آپ کی تنخواہ کے کاغذات بڑی دیر کے بعد کراچی سے پنڈی آئیں گے پھر آپ کی تنخواہ پر نظرِ ثانی ہو گی ۔ پانچ چھ ماہ تنخواہ نہیں ملے گی ۔ قدرت نے لوہے کی ایک الماری کھولی اس میں نوٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے کہنے لگا جب بھی آپ کو ضرورت پڑے حسبِ ضرورت اس الماری سے روپیہ نکال لیجیے اور نیت یہ کیجیے کہ جب بھی تنخواہ ملے گی روپیہ ادا کر دوں گا ۔ یہیں رکھ دوں گا اس پر مجھے بڑا غصہ آیا کہ یہ کیسا افسر ہے جو سرکاری خزانہ یوں لٹا رہا ہے میں چاہے جتنا اُٹھا لوں واپس رکھوں نہ رکھوں ۔

ابتدائی ایام میں مجھے قدرت اللہ کے متعلق چار ایک باتوں کا پتا چلا پہلی بات یہ تھی کہ وہ دفتری انگریزی نہیں بلکہ ادبی انگریزی لکھتا تھا ۔ دفتر میں اس کے لکھے ہوئے نوٹس کا بڑا چرچا تھا لوگ بڑے اشتیاق سے اس کے نوٹس پڑھا کرتے تھے جو بڑے مختصر اور جامع ہوتے تھے ۔ اپنے نوٹس میں اسے اَن کہی بات سمجھانے میں بڑا ملکہ حاصل تھا ۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ بات سمجھنے میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی ۔ آپ ابھی تمہید باندھ رہے ہوتے کہ وہ بات کا لبِ لباب سمجھ جاتا تھا ۔

میرے لیے حیرت کی بات تھی کہ جتنی دیر میں ایک ٹائپ شدہ صفحہ پڑھتا تھا وہ چار صفحے پڑھ لیتا تھا۔ ایک دن میں نے اُسے پوچھا کیا آپ پورا صفحہ پڑھتے ہیں یا عبارت کو نگاہ سے ٹٹول لیتے ہیں اُس نے جواب دیا پورا صفحہ پڑھتا ہوں میں نے جلدی پڑھنے کی مشق کی ہوئی ہے۔

تیسری بات یہ تھی کہ اسے دفتری سازشوں کو نظر انداز کرنے کا انوکھا گُر آتا تھا۔ صدر کے دفتر میں دو یونٹ تھے۔ دوسرے یونٹ کا سربراہ قدرت اللہ کا مخالف تھا وہ قدرت اللہ کے ہر کام میں رکاوٹ ڈالتا تھا۔ اور اس کی ہر تجویز کی کاٹ کرتا تھا۔ اس کی مخالفت ڈھکی چھپی نہیں رہی بلکہ علانیہ ہوتی تھی قدرت اللہ اس کی مخالفت کو ہر طرح "اگنور" کرتا تھا۔

قدرت اللہ کے یونٹ کے افسر شکایت کرتے تو وہ بڑی چالاکی سے بات ٹال دیتا یہ رویہ دفتری روش سے ہٹ کر تھا قدرت اللہ کا سٹاف اس بات پر ناخوش تھا مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیسا افسر ہے جو دفتری سیاست میں التزاماً دلچسپی نہیں لیتا ایک روز دفتر میں کراچی کا ایک سیٹھ آ گیا۔ قدرت نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ میرے دوست ممتاز مفتی ہیں سیٹھ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا دیکھو مفتی ہم تمہیں مشورہ دیتا ہے کہ اس شخص کو اُس نے شہاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہرگز دوست نہ بنانا۔ یہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ اسے دوست بنایا جائے میں حیرانی سے قدرت کی طرف دیکھ رہا تھا وہ چپ چاپ بیٹھا تھا ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

سیٹھ بولا۔ دیکھو مفتی ہم نے اس سے اچھا تعلق بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے ہماری پلس میں رپورٹ کر دی

قدرت چپ چاپ بیٹھا رہا۔

سیٹھ بولا۔ ہمارا ایک دستور ہے کہ ہم افسروں کو عیدی بھیجتے ہیں ان سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ کوئی کام کرنے کو نہیں بولتے نہ جائز، نہ ناجائز۔ صرف عیدی بھیجتے ہیں۔ جب یہ نیا نیا کراچی آیا تو ہم نے دوسرے افسروں کے ساتھ اسے بھی عیدی بھیجی۔

شہاب نے کہا مفتی صاحب عید کا چاند دیکھنے کے بعد میں سیر کرنے کے لیے باہر چلا گیا واپس گھر پہنچا تو دیکھا کہ ایک بڑا کمرا مٹھائی کے ٹوکروں سے بھرا ہوا ہے اور دوسرے کمرے میں کپڑے کے تھانوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔

سیٹھ بولا۔ اس نے ہمیں فون کیا۔ بولا سیٹھ اپنی عیدی ایک گھنٹے کے اندر اندر یہاں سے اٹھوا لیں ورنہ میں پولیس کو اطلاع کر دوں گا ہم نے اسے بہت سمجھایا کہ یہ رشوت نہیں ہے ہم تم سے کوئی کام نہیں کروائیں گے۔ ہماری عیدی واپس نہ کرو۔ لیکن یہ شخص نہ مانا۔

شہاب مسکرا رہا تھا۔

سیٹھ بولا، بھئی اس کی مسکراہٹ کو نہ دیکھو۔ ہمارا مشورہ ہے کہ اس شخص پر کبھی بھروسا نہ کرنا۔

صدر ایوب کے ساتھ شہاب کا رویہ عجیب تھا۔ چپڑاسی نے آ کر قدرت سے کہا لاٹ صاحب نے سلام دیا ہے۔ صدر گھر کے چپڑاسی صدر کو لاٹ صاحب کہا کرتے تھے۔ برطانوی راج کی یہ روایت ابھی تک چل رہی تھی شہاب اچھا کہہ کر پھر سے کام میں مصروف ہو جاتا۔

پانچ منٹ کے بعد چپڑاسی پھر آتا۔ لاٹ صاحب نے سلام دیا ہے۔ اچھا کہہ کر قدرت پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔

میں نے علیحدگی میں چپڑاسی سے پوچھا وہ ہمیں معلوم ہے کہ لاٹ صاحب کے تیسرے بلاوے پر صاحب حاضری دیتا ہے۔

پہلے دوسرے پر نہیں اس لیے ہم باہر سٹول پر بیٹھ جاتے ہیں پانچ منٹ کے بعد بلاوے کو از خود دہرا دیتے ہیں ۔

ایک روز میں نے قدرت سے پوچھا کہ آپ صدر کے تیسرے بلاوے پر کیوں جاتے ہیں پہلے پر کیوں نہیں جاتے قدرت بولا میں التزاماً ایسا کرتا ہوں تاکہ صدر صاحب کو یہ احساس ہو کہ ان کے بلاوے کے علاوہ اور ضروری کام بھی ہو سکتے ہیں ۔

قدرت اللہ شہاب صدر ایوب کو بات بات پر بڑے مؤدبانہ انداز میں ٹوکنے کا عادی تھا یہاں تک کہ صدر صاحب اکثر کہا کرتے SHOHAB MUST YOU THROW A BRICK ON MY HEAD EVERY TIME I SPEAKE (جب بھی میں بات کرتا ہوں آپ میرے سر پر پتھر دے مارتے ہیں) مثلاً کابینہ میں پھانسی کی مرسی پٹیشن کی بات ہو رہی تھی۔ صدر نے کہا یعنی رحم کی آخری اپیل میرے پاس ہوگی ۔ قدرت بولا جناب آخری اپیل آپ کے پاس نہیں اللہ تعالیٰ کے پاس ہوگی، صدر بولے وہ تو ظاہر ہے اسے کہنے کی کیا ضرورت ہے ۔ شہاب نے کہا جناب اسے کہنے کی اشد ضرورت ہے بار بار کہنے کی ضرورت ہے ۔ بآواز بلند کہنے کی ضرورت ہے ورنہ انسان یہ اہم ترین حقیقت بھول جاتا ہے ۔

قدرت کے کردار کو دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا یہ کیسا افسر ہے یہ کیسا انسان ہے اس سے پہلے نہ میں نے ایسا افسر دیکھا تھا نہ انسان ۔

قدرت کے نام روز خط موصول ہوتے تھے۔ زیادہ تر خط تعریفوں سے بھرے ہوتے تھے انھیں پڑھتے ہوئے قدرت بہت جھینپتا تھا اور پڑھ کر فوراً پھاڑ دیتا تھا کبھی کبھی سخت تنقیدی خط بھی موصول ہوتا ۔ اسے وہ بار بار پڑھتا ۔ پھر مجھے پڑھنے کو دیتا۔ مجھ سے کہتا اس کی باتوں میں وزن ہے معقول اعتراضات ہیں نا ۔ پھر وہ ضروری کام چھوڑ کر اس خط کا جواب لکھنے بیٹھ جاتا ۔

ایسے خطوں کے جواب میں وہ سراپا منت بن جاتا ۔ پھر مجھے دکھاتا ۔ کہتا دیکھئے تو یقین دہانی بنی ہے یا نہیں ۔

قدرت کی منت سے خدا محفوظ رکھے ۔ اس کی منت بڑی خوفناک ہوتی تھی ۔ وہ ہونٹوں سے منت نہیں کیا کرتا تھا اس کا تمام تر وجود منت بن جاتا ۔ منت کرتے وقت وہ یوں پھوٹ جاتا جیسے کچا انڈا چور چور ہو کر بہ جاتا ہے ۔

میں نے قدرت کی شخصیت پر چھ سات مضامین لکھے ہوں گے ۔ اشاعت کی اجازت لینے کی غرض سے اُسے سنائے ۔ سُن کر وہ بہت خوش ہوا چٹکیاں بجانے لگا ۔ بولا ۔ سن کر میری انا کو بہت تسکین ملی ہے ۔ خوب ہے بہت خوب ۔

پھر دفعتاً انڈا پھوٹ کر بہ نکلا مفتی صاحب اس کی اشاعت نہ کیجئے ۔

وہ ساتوں مضامین آج تک میرے پاس پڑے ہیں یہ مضمون لکھتے ہوئے بھی میں ڈرتا ہوں کہ میری نگاہ سامنے لٹکی ہوئی شہاب کی تصو پر نہ پڑ جائے اور تصویر انڈے کی طرح پھوٹ کر بہ نہ نکلے ۔

پہلے چار ایک مہینے تو میں شہاب کے کردار پر حیرت میں ڈوبا رہا ۔ اس کے کردار میں بلا کا عجز تھا ۔ پھر اس کی شخصیت کا ایک اور پہلو میرے سامنے ابھرا، ایک مزید حیران کن پہلو ۔ اس قدر حیران کن کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شہاب کون ہے ضرور وہ کوئی ہے ۔ کوئی پراسرا ہستی ۔ یا تو کسی خفیہ عالمی تنظیم کا ۔۔ ہے ۔ یا کوئی شعبدہ باز ہے اور یا کوئی پہنچا ہوا بزرگ ۔

اس زمانے میں مجھے بزرگوں کے متعلق کوئی تجربہ نہ تھا ۔

بنیادی طور پر میں برٹرینڈ رسل۔ ہالڈین۔ ہکسلے۔ فرائڈ اور ایڈلر کا پروردہ تھا نہ میں خدا کو مانتا تھا نہ اسلام کو۔ جب پاکستان کے قیام کی بات چلی تو میں پاکستان کے حق میں نہ تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد مجھے شدت سے احساس ہوا کہ اگرچہ میں برائے نام مسلمان ہوں، پھر بھی پاکستان میری واحد جائے پناہ ہے۔

البتہ ۱۹۵۵ء میں میری زندگی میں ایک غیر معمولی واقعہ رونما ہوا تھا۔ مری کے ایک بزرگ بھائی جان خواجہ جان محمد نے مجھ پر رقت طاری کر دی تھی۔ دس دن میں بلا وجہ پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا تھا اس پہ میری عقلیہ بنیادیں بری طرح سے ہل گئی تھیں اور مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ ایسی پُراسرار طاقتیں بھی وجود رکھتی ہیں، جو دوسرے کا رُخ بدلنے پر حادی ہوتی ہیں۔

۱۹۵۷ء میں جب میں تبادلے کی وجہ سے کراچی گیا تھا تو اس وقت میرا دل بھائی جان اور اُن کے مرشد بابا اللہ بخش مرحوم کی عقیدت سے بھرا ہوا تھا۔

بھائی جان رسمی قسم کے بزرگ نہ تھے وہ بزرگ نظر ہی نہیں آتے تھے۔

اونچے لمبے مستعد عام شکل وصورت اور طور اطوار انہوں نے کبھی محفل نہ لگائی تھی۔ چند ایک لوگ انھیں ملتے تھے۔ پنڈی کے معروف صاحب طرز ادیب عزیز ملک مشہور شاعر یوسف ظفر آغا حنیف راجہ شفیع جانے پہچانے کشمیری لیڈر غلام دین دانی اور میں بھائی جان سے ہم کوئی مسئلہ پوچھتے تو وہ مسکرا کر کہتے بھئی میں عالم نہیں ہوں، میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ سرکار قبلہ نے دو لفظ بتلائے تھے ان کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا

بھائی جان اعلیٰ کردار کے مالک تھے جھوٹ نہیں بولتے تھے وعدہ ایفا کرتے تھے۔ بڑے بن کر بات نہیں کرتے تھے۔ ان کا مسلک خدمت تھا وہ ہر وقت ہمہ تن ہماری خدمت میں لگے رہتے تھے وہ ہماری توجہ خود پہ مرکوز ہونے نہ دیتے تھے بلکہ اپنے سرکار قبلہ کی طرف موڑ دیتے تھے جب میرا تبادلہ کراچی ہوا تھا، تو بھائی جان نے کہا تھا مفتی جی گھبرائیے نہیں بہت جلد آپ کو واپس بلالیں گے۔

دو سال کراچی میں قیام کرنے کے بعد مجھے اپنے دوست راجہ شفیع کا خط ملا لکھا تھا بھائی جان بار بار کہہ رہے ہیں کہ مفتی کو جس کام کے لئے کراچی بھیجا تھا وہ تو ہو گیا اب مفتی وہاں کیوں بیٹھا ہے۔ راجہ شفیع کا خط پڑھ کر مجھے بے حد غصہ آیا کیا میں کراچی میں کسی کام کے لیے بھیجا گیا ہوں اور مجھے شعور ہی نہیں کہ وہ کیا کام ہے۔ کتنی بیہودہ بات ہے۔

بہر صورت بزرگوں کے متعلق مجھے کوئی تجربہ نہ تھا۔

پھر دو چار واقعات ایسے ہوئے کہ میں بُری طرح سے کنفیوز ہو گیا۔

ایک روز جب شہاب دورے پہ گیا ہوا تھا تو ایک عمر رسیدہ معزز آدمی جھنگ سے آ گیا۔ میں نے کہا جناب شہاب صاحب تو گئے ہوئے ہیں اگر کوئی پیغام ہے تو مجھے دے دیجئے اس نے کہا جناب پیغام تو کوئی نہیں، مجھے دو مربع واپس کرنے ہیں۔ مربعے واپس کرنے ہیں، میں نے حیرت سے پوچھا۔ جی۔ وہ بولا دو مربعے اراضی۔ تفصیلات بیان کرنے میں پہلے وہ ہچکچاتا رہا۔ آخر اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔

کہنے لگا جناب جھنگ کے ایک گاؤں میں میں پرائمری سکول میں پڑھاتا تھا مشکل سے گزارہ ہوتا تھا۔ میری تین بیٹیاں تھیں، وہ سب یک دم جوان ہو گئیں تو میں گھبرا گیا۔ یا اللہ میں ان کے لیے جہیز کہاں سے لاؤں گا میں نے ہر نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آہ وزاری کرنا شروع کر دی تہجد میں رو رو کر عرض حال کرتا رہا۔ پھر ایک دن رات کو خواب میں حضور تشریف لائے فرمایا کہ

کھلی کچہری میں جاؤ اور عرضِ حال کرو۔

اس زمانے میں قدرت اللہ شہاب جھنگ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ عوام کی مشکلات دُور کرنے کے لئے وہ ہفتے میں ایک بار کھلی کچہری لگاتے تھے جس میں ہر کوئی بلا روک ٹوک جا سکتا تھا اور وہ وہیں حکم جاری کر دیا کرتے تھے۔

جھنگ کے اسکول ماسٹر نے کہا کہ خواب میں حضورِ اعلیٰ کا اشارہ پا کر بھی مجھے کھلی کچہری میں جانے کی ہمت نہ پڑی، سوچا کہ وہاں جا کر کیا کہوں گا پھر خواب میں دوبارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی تو میں خوفزدہ ہو کر شہاب صاحب سے جا ملا۔ شہاب صاحب نے میری بات یوں سنی جیسے وہ پہلے سے ہی میری مشکل سے واقف ہوں۔ اُنہوں نے تحقیق کئے بغیر دو مربعے زمین میرے نام الاٹ کر دیے اب میں تمام بیٹیوں کی شادیوں کے فرائض ادا کر چکا ہوں وہ مربعے لوٹانے آیا ہوں۔

پھر ایک اور واقعہ ہوا۔ ایک بڑی پاکیزہ خاتون شہاب کی بیگم ڈاکٹر عفت شہاب کے پاس آئی کہنے لگی میں اعتکاف کرنا چاہتی ہوں کل رات تہجد کے دوران میں مجھے آپ کا گھر دکھایا گیا اور مجھ سے کہا گیا کہ اس گھر میں اعتکاف کرو جب شہاب کو پتا چلا تو وہ قطعی طور پر حیران نہ ہوا ایسے لگا جیسے وہ پہلے سے ہی جانتا ہو کہ فلاں عورت اس گھر میں اعتکاف کرنے آئے گی اس بات پر میں سٹپٹا کر رہ گیا بار بار مجھے خیال آتا کہ یہ کیا بھید ہے کسی کو کہا جاتا ہے کہ کھلی کچہری میں قدرت اللہ سے عرضِ حال کرو کسی کو قدرت اللہ کا مکان بتایا جاتا کہ وہاں جا کر اعتکاف کرو۔ قدرت اللہ کون ہے۔

چار ایک دن میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا پھر قدرت اللہ کی بیگم ڈاکٹر عفت سے جا ملا۔

میں نے عفت سے کہا۔ مجھے بتاؤ کہ شہاب کون ہے۔

وہ ہنس کر بولی میں تو خود حیرت کے عالم میں ہوں اس گھر میں آ کر میری تو سدھ بدھ ماری گئی ہے وہ سامنا کمرا دیکھتے ہو بولی شہاب کے کہنے پر ہم نے یہ کمرا مقفل کر دیا ہے پتا ہے کیوں آٹھ دن سے اس کمرے سے تازہ گلابوں کی خوشبو آ رہی ہے خوشبو کے اتنے لپٹے آ رہے ہیں کہ۔

میں نے کہا مجھے سنگھاؤ۔ بولی شہاب نے منع کر رکھا ہے میں نے کہا چلو میرے لئے جھوٹ بول دینا۔ بڑی منتوں کے وہ اس شرط پر رضامند ہوئی کہ میں کمرے کے اندر داخل ہوئے بغیر دروازے میں تھوڑی سی درز بنا کر سونگھ لوں خوشبو کا ایسا لپٹہ کہ میں ڈر گیا۔

میں نے پہلے بھی کچھ باتیں بھائی جان کو بتائی تھیں جنہیں سن کر وہ چپ ہو گئے تھے بھائی جان کی شہاب سے کبھی ملاقات نہ تھی۔ لیکن اُنہوں نے قدرت کا نام ستارہ رکھا ہوا تھا وہ کہا کرتے تھے چاند گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، ستارہ قائم رہتا ہے۔

ان تازہ واقعات پر میں سٹپٹا گیا۔ میں نے سوچا کہ بھائی جان سے جا کر پوچھوں کہ یہ قدرت کون ہے اور یہ پُراسرار واقعات کیوں ہو رہے ہیں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ لاہور سے اشفاق احمد آ گیا۔ کہنے لگا مجھے بھائی جان سے ملا دو۔ ہم بھائی کے گھر گئے بھائی جان اشفاق احمد سے مل کر بہت خوش ہوئے پھر قدرت اللہ کی بات چل نکلی۔ باتوں کے دوران اشفاق احمد نے سبتاً سے قدرت کو گالی دے دی اس پر بھائی جان اٹھ کر کھڑے ہو گئے ان کا منہ غصے سے لال ہو رہا تھا بولے مفتی صاحب آپ اپنے دوس

کو منع کر دیں کہ وہ ہمارے سامنے اُن کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال نہ کریں ہم برداشت نہیں کر سکتے۔

بھائی جان کی بات سن کر میں تو حیران رہ گیا۔ بھائی جان نے تو ہمیں کسی بات سے کبھی نہ ٹوکا تھا انھیں تو کبھی غصہ نہ آیا تھا اور پھر قدرت اللہ کی اتنی طرف داری ابھی تو وہ قدرت سے ملے ہی نہ تھے۔

بھائی جان کے دل میں ستارہ کی اتنی عزت؟ ضرور کوئی بات ہے۔

میں نے قدرت کو بھائی جان اور اشفاق احمد کی ملاقات کی بات بتائی تو قدرت بہت محظوظ ہوا۔ میں نے کہا بھائی جان تو آپ سے ملے ہی نہیں پھر انھیں آپ سے اتنا لگاؤ کیوں ہے قدرت ہنسا، کہنے لگا شاید انہوں نے میرے متعلق کوئی خوش فہمی پال رکھی ہو۔ میں نے کہا آپ ان سے ملتے کیوں نہیں۔

قدرت نے کہا اچھا اتوار کو جائیں گے۔ میں نے کہا آپ کیسے جائیں گے آپ کو تو راستہ نہیں معلوم فیصلہ یہ ہوا کہ اتوار کو صبح دس بجے۔ مریڑ چوک کے دو نالی پل پر میں قدرت کا انتظار کروں اور وہاں سے اسے ساتھ سرکار قبلہ کے مزار پر لے جاؤں بھائی جان اور راجہ شفیع کو میں نے مطلع کر دیا کہ اتوار کو قدرت اللہ مزار پر آئیں گے۔ اتوار کو دس بجے میں دو نالی پل پر جا کھڑا ہوا گیارہ بج گئے بارہ بج گئے قدرت نہ آیا۔ مایوس ہو کر میں پیدل مزار پر پہنچا۔ وہاں بھائی جان نے بتایا کہ ستارہ آئے تھے ابھی ابھی گئے ہیں، میں اس پر حیران ہوا قدرت کو تو راستے کا علم نہ تھا پھر وہ از خود وہاں کیسے پہنچ گیا۔

اس روز بھائی جان خلاف معمول بڑے مضمحل تھے۔ کہنے لگے ستارہ کی آمد پر سرکار قبلہ خود آئے تھے ان کے ساتھ پانچ ولی اللہ بھی تھے انہوں نے ستارہ کی دستار بندی کی۔ بھائی جان تو کبھی اس قدر جذباتی نہ ہوئے تھے انہوں نے کبھی ایسی بات نہ کی تھی کیا بابا نے واقعی قدرت کی دستار بندی کی کیوں قدرت اللہ کون ہے۔ ضرور قدرت اللہ کوئی ہے لیکن کون۔

پہلی مرتبہ میرے دل میں بڑی سنجیدگی سے یہ سوال پیدا ہوا کہ قدرت اللہ کون ہے بھائی جان جھوٹ نہیں بول سکتے اور بھائی جان کے نزدیک سرکار قبلہ سے بڑھ کر کوئی ہستی نہ تھی۔ سرکار قبلہ نے قدرت کی دستار بندی کی۔ کیوں۔ قدرت اللہ کون ہے۔ کئی ایک دن راجہ شفیع اور میں دونوں حیرت میں ڈوبے رہے۔

انہی دنوں قدرت نے مجھے بلایا۔ کہنے لگا سیکورٹی سے ابھی ابھی فون آیا ہے کوئی دیہاتی باہر دروازے پر کھڑا ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے آپ اس سے جا کر ملیں اگر وہ کوئی پیغام دینا چاہتا ہے تو اس کی بات سن لیں اگر وہ مجھ سے ملنے پر مصر ہو تو مجھے فون کریں میں گیٹ پر آ جاؤں گا۔

دروازے کے باہر ایک دیہاتی کھڑا تھا۔ میں نے اس سے بات کی وہ کہنے لگا نہ جی مجھے ملنا ونا نہیں۔ میں تو گاؤں سے آ رہا تھا تو ادھر اس بنگلے کے پیچھے مجھے ایک سانڈھنی سوار ملا کہنے لگا، یہ جو سامنے مکان ہے وہاں چلے جاؤ اور جا کر کہو کہ مجھے شہاب سے سے ملنا ہے شہاب سے ملو اور اسے ہمارا پیغام دے دو۔

میں نے کہا جی کیا پیغام ہے۔

دیہاتی بولا سانڈھنی سوار نے کہا ہے کہ جو کاغذ تم لکھ کر پھاڑ چکے ہو وہ ٹھیک تھا جو اب لکھ رہے ہو وہ غلط ہے۔

میں نے آکر قدرت کو وہ پیغام سنایا اس کا رنگ فق ہو گیا، اس نے لپک کر ویسٹ پیپر ٹوکری اٹھائی اور کاغذ کے پھٹے ہوئے ٹکڑے اٹھا کر جوڑنے لگا اس پر میں حیرت میں ڈوب گیا ضرور قدرت کو ہدایات موصول ہوتی ہیں۔ کون ہدایات دیتا ہے۔ وہ سانڈنی سوار کون تھا قدرت اس قدر سنجیدگی سے اس پیغام پر کیوں عمل کر رہا ہے۔ کیوں میرا حرام مغز ہل گیا۔ یا اللہ یہ کیا بھید ہے۔

میں ڈاکٹر عفت سے جا کر ملا۔

ڈاکٹر عفت شہاب سے مل کر میں نے کہا ڈاکٹر قدرت سے میری ایک سفارش کرو گی کیا اس نے پوچھا میں نے کہا میرا تبادلہ کرا دو، وہ گھبرا گئی، بولی یہاں کوئی تکلیف ہے کیا میں نے کہا اگر میں تمہارے میاں کے پاس رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میں نے اسے سانڈنی سوار کی بات سنائی ڈاکٹر ہنسی بولی میرا بھی یہی حال ہے پتا ہے پچھلی اتوار کو کیا ہوا۔ شہاب اور میں باغیچے میں بیٹھے تھے چار ساڑھے چار کا وقت تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک سفید کبوتر اڑتا ہوا آ رہا ہے۔ ہم دونوں اسے دیکھتے رہے۔ قریب آ کر اس نے لوٹنی پوٹنی کھائی اور ہمارے پاؤں کے قریب آ گرا۔ میں نے اٹھ کر اسے پکڑنا چاہا تو کیا دیکھتی ہوں کہ میرے ہاتھ میں کبوتر نہیں بلکہ ایک سفید کاغذ ہے جس کے ایک طرف کچھ لکھا ہوا ہے، پڑھنے لگی تو شہاب نے میرے ہاتھ سے کاغذ چھین کر جیب میں ڈال لیا۔

ضرور اس پر ہدایات لکھی ہوں گی، میں نے کہا۔

پتا نہیں وہ ہنسی۔

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ڈاکٹر میرا کیا بنے گا۔

اگرچہ بھائی جان نے مجھ پر رقت طاری کر کے میرا ریشنل سلف متزلزل کر دیا تھا۔ پھر بھی بنیادی طور پر میں ایک عقلیہ آدمی تھا۔ بابا اللہ بخش کی محیر العقول باتیں سن کر میں حیران ہوا کرتا تھا لیکن وہ باتیں سنی سنائی کی حیثیت رکھتی تھیں، میرے دل سے ایک آواز اٹھا کرتی تھی کہ یہ باتیں جذباتی باتیں ہیں۔ مریدوں کی عقیدت مندی بڑی شعبدہ باز ہوتی ہے جو معجزاتی سراب پیدا کرتی ہے۔ میرے دل میں شک و شبہات کے چیونٹے رینگتے رہتے تھے، بابا کے ڈر سے میں لاحول پڑھتا رہتا تھا لیکن ساتھ ہی شک و شبہات کا دھواں اٹھتا رہتا۔

قدرت کے پاس رہ کر جو جو مشاہدات دیکھنے میں آ رہے تھے وہ منہ زبانی باتیں نہیں بلکہ بیتی باتیں تھیں ان مشاہدات کی وجہ سے میرے ریشنل سلف پر بری طرح سے ضرب پڑی تھی اور ان باتوں کی وضاحت کرنے والا کوئی نہ تھا جس راستے پر میں زندگی بھر چلتا آیا تھا وہ معدوم ہو چکا تھا۔ سامنے کوئی نیا راستہ تشکیل نہیں ہو رہا تھا۔ میں گھبرا گیا۔

پھر میں بھائی جان سے جا ملا۔ میں نے بھائی جان سے کہا ازراہ کرم شارہ سے کہہ کر مجھے یہاں سے تبدیل کروا دیجیے بھائی جان نے حیرت سے میری طرف دیکھا بولے کیوں کیا ہوا۔ میں نے بھائی جان سے کہا ہوا تو کچھ نہیں لیکن کیا نہیں ہوا، جو جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اسے دیکھ کر میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میری عقل کا جنازہ نکل چکا ہے، کیسے نہ نکلے بھائی جان یہاں کبوتر اڑتے ہوئے آتے ہیں اور پھر بذات خود نامے بن جاتے ہیں۔ عورتوں کو اشارہ ہوتا ہے کہ اس گھر میں اعتکاف کرو، حاجت مندوں کو حکم ہوتا ہے کہ کھلی کچہری میں حاضری دو، سانڈنی سوار ہدایات بھیجتے ہیں کہ فلاں کاغذ غلط ہے۔ بھائی جان یہاں رہ کر میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔

چند ساعت کے لیے بھائی جان گردن جھکائے خاموش بیٹھے رہے، پھر سر اُٹھا کر بڑی سنجیدگی سے بولے مفتی صاحب آپ اتنے ناشکر گزار انسان ہیں۔ اللہ نے آپ کو اتنے بڑے اعزاز سے نوازا ہے، پہلے آپ کو کراچی بھیجا گیا اس لئے کہ آپ ستارہ سے رابطہ پیدا کریں آپ کو اس کام میں آسانیاں مہیا کی گئیں، اب انہوں نے آپ کو پرسنل اسسٹنٹ کا مرتبہ دے رکھا ہے آپ کی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے آپ ان باتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو ایک دن پاکستان کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھی جائیں گی - ایک دن آئے گا جب آپ کو سب پتا چل جائے گا۔ لیکن اگر آپ کا رویہ ایسا ہی رہا تو دودھ سے مکھی کو نکال دیا جائے گا اللہ کے کاموں میں منفی رویے کی کوئی گنجائش نہیں۔

بھائی جان نے اس روز مجھے اتنی جھاڑ پلائی کہ میری ہڈیاں چٹخ گئیں میں ادھ مرا ہو کر دفتر میں جا بیٹھا میرے دل میں شکر گزاری کا جذبہ تو پیدا نہ ہو سکا البتہ چپ چاپ ٹربٹر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہ کرنے کی صلاحیت ضرور پیدا ہو گئی، پھر میں نے سالہا سال دیکھا۔ اتنا کچھ دیکھا کہ میری آنکھیں پتھرا گئیں۔

میں نے دیکھا کہ قدرت اللہ کی خاطر بھائی جان اپنے اصولوں کی قربانی دے رہے تھے حالانکہ وہ اصولوں پر بڑے پابند تھے مثلاً وہ عورتوں سے نہیں ملتے تھے اُنہوں نے میری والدہ سے ملنے سے انکار کر دیا تھا لیکن ڈاکٹر عفت کو انہوں نے بیٹی بنا لیا۔

بھائی جان تعویذ نہیں لکھتے تھے، لیکن یہ جان کر کہ عفت کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ ہو بھی تو ولادت سے پہلے ہی بچہ ضائع ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ قدرت اللہ کے گھر بچہ ہو ہی نہیں سکتا چونکہ میاں بیوی کے خون میں نامناسبت ہے بھائی جان نے از خود عفت کو کالی مرچیں دم کر کے دینے کی پیش کش کی اور دیر تک اسے کالی مرچیں دم کر کے دیتے رہے۔

میں نے دیکھا کہ ان جانے لوگ قدرت کے لیے دعا گو تھے۔

اس بارے میں پہلا خط جنوبی ہند سے موصول ہوا۔ لکھا تھا۔ اٹھارہ سال سے میں اپاہج ہوں۔ عبادت کے سوا میرا کوئی شغل نہیں۔ چند سال سے میں ہر نماز کے بعد دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو فرزند عطا کرے حالانکہ میں آپ کو قطعی طور پر نہیں جانتا۔ پھر بھی میرے دل سے آپ کے لیے دعا نکلتی ہے۔

قدرت کے بیٹے کی پیدائش سے ایک سال پہلے خوشاب کے ایک ایڈوکیٹ عبدالغفور کا خط موصول ہوا لکھا تھا میں آپ کو نہیں جانتا لیکن میں نے سنا ہے کہ آپ اچھے آدمی ہیں' میں نے کبھی تہجد قضا نہیں کی۔ پچھلے چند ایک سال سے ہر تہجد میں دعا کرتا رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اولاد سے نوازے۔ کل رات تہجد کے دوران میں میری گود میں ایک بچہ ڈال دیا گیا اور کہا گیا کہ آپ کو اطلاع کر دوں کہ آپ کے ہاں بچہ ہو گا۔

عین ایک سال بعد شہاب کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔

پھر ایک اور واقعہ ہوا۔

قدرت اللہ کے پاس ایک اور صاحب تشریف لائے انھیں مسجد نبوی کے چابی بردار نے بھیجا تھا مسجد نبوی کا چابی بردار ہونا، بہت بڑا اعزاز ہے وہ جہلم کے رہنے والے تھے مسجد نبوی میں حاضری دینے کے لیے گئے تھے وہیں کے ہو رہے پھر بتدریج چابی بردار کا اعزاز حاصل

ہو گیا۔

انہوں نے پیغام بھیجا کہ کئی ایک سال پہلے ہم نے خواب میں دیکھا کہ مسجد نبوی سے ایک پودا پھوٹا اور دور جا کر اس پر دو پتیاں نکلیں

ہم نے پھر خواب دیکھا۔ دیکھا کہ وہ پودا سوکھ گیا ہے پتیاں جھڑ گئیں۔

اب پھر ہم نے خواب دیکھا ہے کہ وہ سوکھا ہوا پودا پھر سے ہرا ہو رہا ہے۔

ہماری جانب سے سربراہ مملکت کو پیغام دے دو کہ بھیڑوں کا رکھوالا خود چھاؤں میں نہیں بیٹھتا۔

اس پیغام سے میں بے حد متاثر ہوا۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ پودا مملکت پاکستان ہو۔

قدرت کی زندگی میں صرف مثبت طاقتیں ہی کام نہیں کر رہی تھیں۔ منفی طاقتوں کی بھی بھر مار تھی۔ ان کا مقصد قدرت کا راستہ کاٹنا تھا۔ اس کے مشن کی تکمیل میں روڑے اٹکانا تھا۔

پرانے زمانے میں رشی منی اور یوگی دھیان لگا کر بیٹھ جاتے تھے تو ان کے حریف ان کا دھیان توڑنے کے لیے حسین و جمیل لڑکیاں بھیجتے تھے۔ لڑکی یوگی کے گرد رقص کرنے لگتی۔

پتا نہیں وہ کون تھا جو قدرت کا دھیان توڑنے پر مصر تھا۔

یانکی حسین کلچرڈ طرحدار عورتیں اس پر یورش کئے رکھتی تھیں۔ قدرت انھیں چمگادڑیں کہا کرتا تھا میں اسے کہا کرتا تھا کہ تو ان چمگادڑوں کو کیوں لفٹ دیتا ہے ان سے جان کیوں نہیں چھڑاتا جواب میں وہ کہتا مجھے اچھی لگتی ہیں۔

جب بھی کوئی چمگادڑ آتی تو وہ قدرت کا دھیان توڑ کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتی۔ قدرت اس کی توجہ کو اپنی طرف سے ہٹا کر مدینے شریف کی طرف منعطف کرنے کی کوشش کرتا۔ دونوں طاقتوں کا تصادم ہوتا گھمسان کا رن پڑتا بالآخر قدرت کامیاب ہو جاتا دو جائے نماز، پہلو بہ پہلو بچھ جاتے دونوں سربسجود ہو جاتے۔ اس روز قدرت اس قدر خوش ہوتا پھولے نہ سماتا جیسے پتا نہیں کیا پا لیا ہو۔

ایک بار ایسا بھی ہوا کہ قدرت بری طرح سے ناکام ہوا اور میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھا۔

وہ ایک نہایت جاذب نظر خاتون تھی۔ بات کرتی تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ ہنستی تو فضا نشہ آلود ہو جاتی تھی۔ اس کی رہائش گاہ پر جوان افسروں کی کاروں کی قطار لگی رہتی تھی۔ وہ آئی تو سب نے اسے اپنا لیا بھائی جان نے اسے ہمشیرہ بنا لیا۔

کہنے لگے یہ خاتون کام کرے گی دنیائے اسلام میں نام ہوگا۔

راجہ شفیع اور میرا بُرا حال تھا ہم جذبات سے پچ پچ کر رہے تھے۔ مقام احترام نہ ہوتا تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔

قدرت نے جائے نماز بھی بچھا دیئے سجدہ ریزی بھی ہو گئی لیکن اُس نے سجدے میں بھی سامنے قدرت کو بٹھائے رکھا اس خاتون کا جسمانی مطالبہ عفریت بن گیا۔ قدرت اپنے تحفظ کے لیے اُٹھ بھاگا۔ روپوش ہو گیا، خاتون ناکامی کو برداشت نہ کر سکی خودکشی پر تل گئی، بچ تو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پھول معدوم ہو گیا نیچے سے ڈنٹھل نکل آیا۔

قدرت کو محبت کا عارضہ بھی ہوا تھا جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں آخری سال میں تھا چندراوتی ایمن آباد کے دیوانوں کی نوکرانی کی بیٹی تھی۔ وہ ٹی بی کی آخری سٹیج میں تھی قدرت سائیکل پہ ۴۰ میل کا سفر کر کے روز حاضری دیتا۔ سارا دن چندراوتی کے کپڑے تالاب پر دھوتا

اسے دوائیاں پلاتا اور شام کو واپس لاہور پہنچتا۔

قدرت عجب پسوی تھا۔ وہ ادھر سے حدت مستعار لیتا تھا اور اُدھر لگا دیتا تھا وہ آگ کا اتنا بھانبھڑ لگا لیتا تھا کہ حدت جلانے کی قوت کھو کر نور بن جاتی۔ بھیا رب دا کی پُنّاں، ایدھروں پٹنا اُودھر لوناں۔

صرف قدرت کی بات نہیں۔ اللہ کے پراسرار بندے اپنا اپنا طرزِ عمل وضع کرتے ہیں، کوئی آگ سے دامن بچاتا ہے۔ کوئی آگ سے کھیلتا ہے کوئی آگ کو پانی بنا کر پی جاتا ہے۔

میں نے ایک بزرگ دیکھے جو ہر تین ماہ کے بعد ہیرا منڈی جاتے خوبرو طوائف کو بک کرتے۔ برہنہ ہو کر اس کی گود میں بیٹھ جاتے اور دھیان لگاتے جب جسم کا پھنیر پھن پھیلا پھیلا کر اور ٹھوکریں مار مار کر تھک ہار جاتا اور سر زمین پہ رکھ دیتا تو وہ اُٹھ کر کپڑے پہن لیتے اور طوائف کے سر پہ شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر سیڑھیاں اتر آتے۔

بھائی جان خواجہ جان محمد کے مرشد اللہ بخش کا بھی یہی وطیرہ تھا۔

قدرت اللہ کے بیشتر کوائف نارمل سے ہٹ کر تھے اس کا نارمل ٹمپریچر ڈیڑھ درجہ اونچا تھا۔ نبض زیادہ تیز تھی۔ بلڈ پریشر سو سے نیچے نہیں گرتا تھا اس میں تکلیف سہنے کی طاقت عام آدمی سے بہت زیادہ تھی۔

قدرت اللہ میں وقت کے متعلق آبسشن تھی کہیں جانا ہوتا تو وہ گھنٹوں پہلے تیار ہو کر بیٹھ جاتا اور اگر وقت پر نہ پہنچ سکتا تو سخت ذہنی اذیت کا شکار ہو جاتا۔

اسے جوانی سے ہی دل کا عارضہ تھا اس کا دل اچھلتا رہتا ہارٹ بیٹ مس ہو جاتی ساری عمر وہ دل کی دوائیاں کھاتا رہا زندگی بھر بیسیوں ہارٹ اٹیک ہوئے میں اسے کہا کرتا تھا۔ دوائیاں کھانے کا کیا فائدہ ہے جب تمہارے مشاغل ہی ایسے ہیں کہ دل کو انڈے کی طرح پھینٹتے رہتے ہیں پھر دوائیاں کھانے کا مطلب۔

قدرت اللہ کو بلندیوں کا خوف تھا اور یہ خوف اتنا شدید تھا کہ جب وہ ہوائی جہاز کے زینے کی آخری سیڑھی پہ پہنچتا تو ایک قیامت ٹوٹ جاتی۔ اسلام آباد میں جب وہ نئے گھر میں منتقل ہوا تو اس لیے جان بوجھ کر اوپری منزل کا کمرہ اپنے لیے چنا میں نے اسے کہا، کیوں خود پہ ظلم کر رہے ہو۔ بولا۔ یہ خود اسی لائق ہے کہ اس پر ظلم کیا جائے اسے آرام پسند بنا دوں تو یہ عفریت بن جائے گا صرف قدرت ہی نہیں اس کے گھر کے دوسرے افراد بھی عجیب تھے۔

اس کے والد عبداللہ صاحب نے علی گڑھ میں ایم اے انگلش میں امتیازی پوزیشن حاصل کی سر سید نے انھیں آئی سی ایس کے لیے ولایت بھیجنے کا فیصلہ کر لیا عبداللہ صاحب نے ولایت جانے سے انکار کر دیا چونکہ اس کی والدہ نے اجازت نہ دی۔ اس پر سر سید اس قدر سیخ پا ہوئے کہ عبداللہ صاحب خوفزدہ ہو گئے اور علی گڑھ سے روپوش ہو گئے۔ گلگت پہنچ کر خود کو میٹریکولیٹ ظاہر کر کے گورنر گلگت کے دفتر میں کلرک بن گئے۔ گورنر انگریز تھا وہ بھانپ گیا کہ لڑکا بہت پڑھا لکھا ہے اس نے کھوج لگایا اور جب ریٹائر ہونے لگا تو عبداللہ صاحب کو گلگت کا گورنر بنا دیا گیا، قدرت وہیں گلگت گورنر ہاؤس میں پیدا ہوا۔

قدرت کی والدہ بڑی عابدہ خاتون تھی۔ بیٹا آئی سی ایس تھا صدر مملکت کا سیکرٹری تھا لیکن والدہ کا سامان ایک گٹھڑی پر مشتمل

تھا جس میں دو موٹے جوڑے تھے۔ وہ روزانہ اپنے ہاتھوں سے ایک جوڑہ دھوتی تھیں اور اگلے روز اسے پہن لیتی تھی۔ جب والدہ فوت ہوئیں تو قدرت اکیلے میں دہاڑیں مار مار کر رویا۔

قدرت کی بیگم ڈاکٹر عفت ایم بی بی ایس تھیں وہ دن میں دو بار پریذیڈنٹ ہاؤس کا راؤنڈ کرتی تھیں۔ ہر مریض کے پاس بیٹھ کر اس کا حال سنتیں مفت دوا دیتیں اور اگر خصوصی غذا کی ضرورت ہوتی تو ساتھ رقم پیش کرتیں فارغ وقت میں وہ دوا ساز کمپنیوں سے غریب مریضوں کے لئے ادویات اکٹھی کرتیں۔ انہوں نے ایک سوسائٹی بنا رکھی تھی جو غریب مریضوں کے لیے ادویات کا ایک ڈپو چلا رہی تھی، ڈاکٹر عفت انگریزی دوا کے علاوہ طب ہومیوپیتھک اور لوک دوائیاں بھی استعمال کرایا کرتی تھیں۔ جب وہ ہالینڈ میں تھیں، تو تربھلا یہاں سے منگوایا کرتیں۔ پانچ روپے کے تربھلے پر ۳۵ روپے محصول ڈاک لگتا تھا۔

اپنے چھوٹے بھائی حبیب کے بارے میں قدرت کہا کرتا تھا کہ ہم دونوں بھائیوں کے متعلق خدا نے ایک ارینجمنٹ قائم کر رکھا ہے تکلیفیں حبیب کی طرف منتقل کر دی جاتی ہیں اور خوشیاں میری جانب اور اگر کوئی تکلیف میری جانب آئے تو حبیب کو اس کا پتا چل جاتا ہے اور اسے اس قدر اذیت ہوتی ہے جو میری تکلیف سے کہیں زیادہ اذیت دہ ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ رمضان شریف میں ۲۷ ویں رات کو میں نے قدرت سے کہا کہ تم عبادت کرو تو مجھے بھی پاس بٹھا لینا میں بھی دیکھوں عبادت کیسے کی جاتی ہے۔

ساری رات وہ کھڑا نفل پڑھتا رہا اور میں ایک کونے میں بیٹھا اسے دیکھتا رہا صبح سویرے وہ گر پڑا، اسے دل کا دورہ پڑ چکا تھا میں نے ڈاکٹر کو فون کیا ڈاکٹر کے ساتھ ہی کراچی سے حبیب اور لاہور سے عفت آ گئیں، عفت نے کہا، میں نے محسوس کر لیا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے، اس لیے صبح سویرے میں ایئرپورٹ آ بیٹھی، حبیب نے کہا شام ہی سے مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی اور ہر لمحہ شدت اختیار کرتی گئی حتیٰ کہ ناقابل برداشت ہو گئی اور میں نائٹ کوچ میں جا بیٹھا۔

قدرت اللہ کو ہدایات کے ساتھ ساتھ وارننگز بھی موصول ہوتی رہتی تھیں وارننگ دینے والے بزرگ کہا کرتے تھے، حیرت ہے کہ تمہیں خبردار کیا جا رہا ہے ورنہ اصولی طور پر ہمارے ہاں وارننگز نہیں ہوتیں۔ بلکہ نام کاٹ دیا جاتا ہے۔

قدرت کو وارننگ دینے کے لیے بزرگوں کو جیل میں بند ہونا پڑتا تھا۔ ہسپتال میں داخل ہونا پڑتا ہے۔

وارننگ دینے والے ایک بزرگ مجھے کبھی نہیں بھول سکتے کالے پیلے۔ دبلے پتلے وہ اس قدر تلخ کلام تھے کہ میں نے ان کا نام مرچ رکھ دیا تھا۔ وہ انگریزی بولتے تھے۔ آتے ہی کہنے لگے "FLAY YOU ALIVE PUT BRAN ON YOU AND PUT YOU IN THE SUN" ۔ تمہاری کھال کھینچ کر نمک مرچ مل کر تمھیں دھوپ میں رکھ دیا جائے۔

قدرت نے پوچھا آپ کے کریڈنشل کیا ہیں۔ بولے ہم حیدر آباد دکن میں آئی جی پولیس تھے حکم نامہ آ گیا ہم نے استعفا دیا اور باہر نکل آئے۔

ان بزرگ کا سامان ایک لنگوٹ ایک جوڑا کپڑے، ایک جائے نماز ایک تسبیح اور ایک لوٹا تھا۔

پھر منفی طاقتوں کو شعور ہو گیا کہ قدرت کو بے اثر کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ قدرت کو صدر ایوب سے الگ کر دیا جائے‘

تاکہ صدر مثبت اثرات سے محروم ہو جائے۔ امریکہ بہادر قدرت سے ناخوش تھا چونکہ صدر اس کے ڈھب پہ نہیں آتا تھا انہوں نے دباؤ ڈال کر قدرت کو سیکرٹری اطلاعات کے عہدے پہ فائز کرا دیا۔ اور الطاف گوہر کو صدر کا سیکرٹری بنا دیا۔ الطاف گوہر جانا پہچانا زیرک انشو تھا۔ مگر اس میں کیریر بنانے کا بے پناہ جذبہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جی حضوریہ بن گیا۔

کچھ دیر کے بعد امریکہ نے محسوس کیا کہ صدر اور قدرت کے درمیان مزید فاصلہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے لہٰذا قدرت کو ہالینڈ کا سفیر بنا کر بھیج دیا گیا۔

ہالینڈ سے قدرت نے مجھے خط لکھا کہ یہاں سکون ہی سکون ہے آٹھ آٹھ دن کوئی بات کرنے والا نہیں ملتا یہاں میں وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جسے کرنے کا مجھے کبھی موقع نہ ملا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ عبادت میں ڈوبا ہوا ہے۔

پھر پاکستان کے ایک سربراہ جرنیل نے قدرت کو ملک بدر کر دیا۔

پیرس اور لندن میں قدرت اس کی بیوی اور بیٹے نے دو برس فاقے کئے یونیسکو کا ڈائرکٹر ہونے کی وجہ سے پیرس میں ہر ماہ اسے میٹنگ میں حاضری دینی پڑتی تھی اس حاضری کا ٹی اے ڈی اے اس کی واحد آمدنی کا ذریعہ تھا جو گزارے کے لیے بہت قلیل تھا قدرت کو گرفتار کرنے کے لیے پاکستان سے فوجی افسر بھیجے جاتے تھے قدرت، عفت اور ان کے بیٹے کو چھپ چھپ کر زندگی گزارنی پڑ رہی تھی۔ پھر اس کے بیٹے کو اغوا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ یہ زمانہ انہوں نے بڑی عزیت اور خوف و ہراس میں گزارا۔

پھر عربوں نے اسے اسرائیل بھیج دیا۔ جب اسرائیل کو پتا چلا کہ وہ اسرائیلی ہتھکنڈوں کے بھید لے گیا ہے تو انہوں نے قدرت پہ جادو کر دیا اسرائیلی جادو کے تحت وہ ایک زندہ لاش کی طرح پڑا رہا۔ اس کے اعضا شل ہو گئے۔ حرکت کی قوت سلب ہو گئی۔ ان دنوں قدرت سے اس قدر بدبو آتی تھی کہ لوگ قریب آتے تو ناک پہ رومال رکھ لیتے۔ قدرت نے ایک خط میں مجھے لکھا کہ دو سال جادوگر ہتھوڑوں سے مجھے توڑتے رہے اب اللہ کا فضل ہو گیا ہے چھ مہینے سے وہ مجھے پھر سے جوڑ رہے ہیں لیکن مفتی صاحب جوڑے جانے میں بھی اتنی ہی اذیت ہے جتنی توڑے جانے میں۔

جڑ کر بھی قدرت کئی ایک جگہوں سے ٹوٹا رہا اس کی بائیں ٹانگ مردہ تھی لندن کے ایک ڈاکٹر نے جب قدرت کا معائنہ کیا تو حیرت سے بولا۔ آپ یہاں کیسے آئے ہیں، قدرت نے کہا جناب گاڑی میں آیا ہوں ڈاکٹر بولا گاڑی سے یہاں تک کیسے آئے ہیں قدرت نے کہا جناب چل کر آیا ہوں ڈاکٹر نے سر پیٹ لیا بولا یہ نہیں ہو سکتا کیسے ہو سکتا ہے تمہاری بائیں ٹانگ میں دوران خون نہیں ہو رہا یہ ٹانگ مردہ ہے۔ قدرت اس مردہ ٹانگ کو زندگی بھر گھسیٹتا رہا۔ ہر قدم ایک اذیت تھا۔

میو ہسپتال کے ڈاکٹر آج بھی حیرت میں گم ہیں، میو ہسپتال میں بانو قدسیہ زندگی کے آخری سانس لے رہی تھی کمرے پہ موت کی فضا چھائی ہوئی تھی ڈاکٹر مایوس ہو چکے تھے پھر ایک بڈھا سوٹی ٹیکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا اور ایک طرف کونے میں کرسی پہ بیٹھ گیا کسی نے اس بڈھے کی طرف توجہ نہ کی لیکن کچھ دیر بعد کمرے کی فضا بدلنے لگی بانو کی کیفیت میں تبدیلی پیدا ہونے لگی ڈاکٹر حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے وہ بار بار بانو کی طرف دیکھتے پھر بڈھے کی طرف دیکھتے۔ نحیف و نزار بڈھا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ چند گھنٹوں بعد بانو اٹھ بیٹھی میں ٹھیک ہوں مجھے گھر جانے دو۔

قدرت اللہ شہاب کی شخصیت کا بنیادی پہلو عجز تھا طبعاً وہ ایک ملامتیہ تھا اپنے سٹاف کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو بڑی فراخدلی سے اپنا لیا کرتا تھا۔ اور حکام بالا کی جھاڑ جھپاڑ کے لئے خود کو پیش کر دیا کرتا تھا ایک دن میں نے قدرت سے کہا یہ نمازیں وظائف اور عبادت میرے بس کی بات نہیں مجھے کوئی آسان راستہ بتا دیجئے لگا کسی شخص کو اپنے سے کم تر نہ سمجھو

چار ایک دن کے بعد میں اسے ملا، میں نے کہا میں تو سمجھا یہ آسان کام ہے لیکن یہ تو بڑا مشکل کام نکلا۔ مجھ سے نہیں ہوتا کہنے لگا ہاں مشکل کام ہے، مجھ سے بھی نہیں ہوتا لیکن میں مسلسل کوشش کئے جاتا ہوں

جب میں نیا نیا اس سے ملا تو مجھے نجوم، پیش گوئیوں اور ای ایس پی کا بہت شوق تھا۔ قدرت نے ایک دن سنجیدگی سے مجھے کہا یہ بے کار شوق ہے کیوں میں نے پوچھا۔ بولا کل کے بارے میں کوئی یقین سے بات نہیں کر سکتا کل کی بات اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا میں نے کہا بزرگوں کو کشف جو ہوتا ہے قدرت بولا کشف بزرگوں کے راہ کی ایک رکاوٹ ہے ایک آزمائش ہے۔ وہ بزرگ جو کشف کے سراب میں پڑ جاتے ہیں اپنا راستہ کھوٹا کر لیتے ہیں مفتی صاحب اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا ایک بات پلے باندھ لیجئے کہ :-

FINALITY RESTS WITH GOD

کہ آخری حکم باری تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ یہ اصول اس کی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی تھا۔

کوئی کام ہو مشکل ہو یا مسئلہ ہو۔ اسے حل کرنے کے لئے قدرت صرف دو بار کوشش کیا کرتا تھا۔ اگر تیسری کوشش پر کامیابی کے امکانات واضح ہی ہوتے تو بھی وہ تیسری دفعہ کوشش نہیں کرتا تھا کہتا تھا۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کچھ اور مقصود ہو اللہ کو بھی تو موقع دینا چاہیے۔

اگر قدرت کی کوششوں کے خلاف نتیجہ نکلتا تو وہ بڑی خوش دلی سے اسے قبول کر لیتا شکوہ یا شکایت کرنا اس کے نزدیک ناشکری کے مترادف تھا۔

وہ کرامات کے حق میں نہ تھا اور مافوق الفطرت واقعات کو قطعاً اہمیت نہ دیتا تھا ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ہیں اور حضورؐ کا مسلک بندہ بن کر جینا تھا انہوں نے کبھی مافوق الفطرت کا سہارا نہیں لیا تھا۔

جب میں نے چند ایک سال قدرت کے ساتھ رہ کر دیکھا کہ اسے پُراسرار طور پر ہدایات موصول ہوتی رہتی ہیں اور اس کی زندگی مافوق الفطرت واقعات سے بھری ہوئی ہے تو ایک دن میں نے کہا آپ تو مافوق الفطرت کے حق میں نہیں تھے پھر آپ کی زندگی میں مافوق الفطرت واقعات کیوں ہو رہے ہیں۔

ایک ساعت کے لئے وہ چپ رہا پھر بولا۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میری زندگی میں مافوق الفطرت واقعات ہوتے ہیں، تو یقین کیجئے وہ میری جانب سے نہیں ہوتے میں تو ایک عام سا بندہ ہوں اگر مجھے مافوق الفطرت قوتیں پیش کی جائیں تو میں انھیں قبول نہیں کروں گا یہ میرے مسلک کے خلاف ہوگا۔

پھر یہ واقعات کیوں ہو رہے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

اس نے کہا اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے ہدایات ملتی ہیں، احکامات ملتے ہیں کیوں ملتے ہیں یہ وہ جانیں جو ہدایات دیتے ہیں

[illegible]

میں نے ایک بار قدرت سے پوچھا کہ افضل ترین عبادت کون سی ہے قدرت نے کہا حضورؐ کی سوانح اپنے سرہانے رکھ لو۔ روز ایک واقعہ پڑھو اور پھر سارا دن سوچتے رہو کہ اس واقعہ پر حضورؐ کے جذبات کیا ہوں گے حضور نے کیا سوچا ہوگا۔

قدرت اللہ کا مسلک محمدؐ پنا (MOHAMMAD HOOD) محمدؐ جیوا (IDENTIFICATION WITH MOHAMMAD)

قدرت ایک بڑا عاجز بندہ تھا میرا اندازہ ہے کہ وہ محمدؐ کا عاجز ترین غلام تھا۔ قدرت ایک کمشنڈ افسر تھا۔ وہ ایک کام کے لیے بھیجا گیا تھا جس طرح گورنر کی آمد سے پہلے ایک کارکن بھیجا جاتا ہے کہ جاؤ جا کر چھڑکاؤ کراؤ دریاں بچھاؤ، ڈائس بنواؤ کرسیاں لگواؤ۔ اسی طرح پاکستان میں ایک عظیم اسلامی ہستی کی آمد سے پہلے قدرت کو بھیجا گیا تھا کہ جا کر چھڑکاؤ کراؤ دریاں بچھاؤ۔ آنے والی ہستی اس قدر اہم ہے کہ اس کے لیے چھڑکاؤ کرنا بھی بہت بڑا اعزاز ہے۔

صاحبو قدرت اللہ شہاب کی الف لیلوی بیتی ایک بڑی لمبی داستان ہے جو سمٹ کر ایک مضمون میں نہیں سما سکتی۔ یہ موضوع تو ایک کتاب کا موضوع ہے۔

صاحبو میں اتنا بڑا قلم کار نہیں ہوں کہ قدرت کے عظیم کردار اور مشن کو بیان کر سکوں پھر یہ بھی ہے کہ قدرت اللہ ایک گپت بزرگ تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بھید کھلے۔

قدرت کے ساتھ رہ کر مجھ پر ایک بہت بڑا انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ بات کہہ دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ ضروری نہیں کہ بات کہہ دی جائے اور کھل جائے قدرت ول (WILL) کر دیا کرتا کہ بات نہ کھلے اور وہ نہیں کھلتی تھی۔

پتا نہیں قدرت نے کیا منتر پڑھ رکھا تھا کہ اس کے گھر والے سب کچھ دیکھتے تھے لیکن انھیں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ گھر پر پردہ ہی پڑا رہا۔

جب بھی میں نے دانشوروں سے بات کی تو انھوں نے ہنسی میں اڑا دی۔ روزنامہ مشرق کے ادبی کالم نے تو کوئی ایک سال مہم چلائے رکھی۔ سلسلہ شہابیہ کے چار درویش۔ انھوں نے میرا مذاق اڑایا مفتی کو مرشد کہاں ملا پریذیڈنٹ ہاؤس میں۔

میرے قریبی دوست سمجھتے رہے کہ قدرت سے تعلق قائم کرنے میں میرا بنیادی مقصد دنیاوی مفادات کا حصول تھا۔ بیشک قدرت کی وجہ سے میں نے بہت سارے دنیاوی مفادات حاصل کئے لیکن میرا مقصد حاصل کرنا نہ تھا۔

سات سال میں بانو اور اشفاق سے منتیں کرتا رہا کہ اللہ کے واسطے ذرا گہری نظر سے دیکھیں یہ شخص جسے تم صرف اچھا آدمی سمجھ رہے ہو، وہ تو بہت کچھ ہے۔ وہ میری باتیں سن کر بہت متاثر ہوتے تھے بھیگ جاتے تھے لیکن پھر پر جھاڑ کر آرام سے سوکھے بیٹھ جاتے۔ سات سال کے بعد بانو نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور وہ ہکی بکی رہ گئی، بانو ایک پاکیزہ خاتون ہے اس میں دیکھنے سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت مجھ سے کہیں زیادہ ہے لیکن اشفاق احمد دیکھ کر بھی نہ دیکھ سکا سمجھ کر بھی نہ سمجھ سکا وہ اپنی ذات کے حصار سے باہر نہ نکل سکا۔

قدرت اللہ شہاب نے شہاب نامے کے پیش لفظ اقبال جرم میں میری کہہ دینے کی عادت کے خلاف اپنا تحفظ کر لیا ہے۔ لکھتا ہے :

” خاص طور پر ممتاز مفتی انتہائی ذکی الحس، ضدی، بے باک اور شدت اور جدت پسند تخلیق کار ہیں۔ کسی وجہ سے میری کوئی حرکت انھیں پسند آ گئی اور انھوں نے بیٹھے بٹھائے ایسی عقیدت کا روگ پال لیا کہ میرے چہرے پر مشک کافور سے مہکتی ہوئی حنائی داڑھی چسپاں کر کے میرے سر پر دستارِ فضیلت باندھی اور سبز پوشوں کا پراسرار جامہ پہنا کر اپنی سدا بہار تحریروں کے دوش مجھے ایسی مسند پر لا بٹھایا جس کا میں اہل تھا نہ خواہش مند۔ اس عمل سے تو کوئی فائدہ نہ پہنچا البتہ میرے لیے وہ ایک طرح کے مرشد کا کام دے گئے۔ ان کی وجہ سے میں صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہنے پر اور بھی زیادہ مستعد ہو گیا تاکہ ممتاز مفتی کی عقیدت کے آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے۔ بظاہر میرا نفس تو بہت پھولا۔ لیکن اندر ہی اندر عرقِ ندامت میں غوطے کھاتا رہا کیونکہ من آنم کہ من دانم۔

بے شک شہاب جیسے بزرگ کو جس کا مسلک پردۂ عجز اور رواداری تھا یہی کہنا سجتا تھا اس نے الٹا پیتل پر ملمع کر دیا، لیکن سیانے کہتے ہیں۔ بات چھپائے نہیں چھپتی۔

دیکھا احسانِ ضبط لازم ہے، تشنۂ انکشاف ہے ہر راز

شہاب نامے کے آخری باب میں چھوٹا منہ بڑی بات میں پتا نہیں کیسے قدرت اللہ شہاب کے قلم سے بات نکل گئی، اس نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ اسے پراسرار ذرائع سے ہدایات موصول ہوا کرتی تھیں۔ قدرت اللہ نے بڑی وضاحت اور تفصیل سے اس بات کا ذکر کیا ہے اگرچہ قدرت نے اس نوے سالہ بزرگ کا نام ظاہر نہیں کیا جو اسے ہدایات بھیجا کرتے تھے۔ تاہم قدرت نے اس پُراسرار خضرِ راہ کے وجود کو تسلیم کر کے قدرت اللہ شہاب کے متعلق ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری کو حقیقت نگاری کا مرتبہ عطا کر دیا ہے۔ قدرت کے اس طویل بیان سے ایک چھوٹا سا اقتباس پیشِ خدمت ہے۔

اس کے بعد کم و بیش پچیس برس تک ہمارے درمیان اس عجیب خط و کتابت کا سلسلہ قریباً قریباً ہر روز جاری رہا بعض اوقات ہمارے درمیان کی آمد و رفت دن اور رات میں دو دو، تین تین یا چار چار بار تک پہنچ جاتی تھی جیب ہمارا پوسٹ آفس تھا ہمارا لیٹر بکس کبھی الماری ہوتی تھی کبھی اپنی جیب کبھی کوئی کتاب یا کاپی یا کبھی یونہی سرِ راہ چلتے پھرتے نائنٹی کے تحریر کردہ خطوط ہوا کے دوش پر سوار پھول کی پتیوں کی طرح سر پر آ گتے تھے۔

ایک روز میں نے اپنے رہنما سے دریافت کیا آپ کون ہیں کہاں ہیں کیا کرتے ہیں اور روحانیت کے کس مقام پر فائز ہیں جواب ملا، پہلے تین سوال فضول ہیں ان کا جواب تمہیں کبھی نہیں ملے گا باقی رہی روحانیت کے مقام کی بات۔ اس سڑک پر سب راہی ہیں کوئی آگے کوئی پیچھے کوئی صرف ایک بشر کو ملی ہے اس بشر کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔

(بشکریہ انجمن ترقی اردو کراچی)

پیر و مرشد

احمد بشیر

شہاب نامہ مجھے پسند نہیں آیا اگرچہ رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔

میں کتاب کی گرفت کی بات نہیں کرتا۔ یہی اس کی خرابی ہے کہ آدمی شروع کرے تو پھر چھوڑ نہیں سکتا۔ میں شہاب کی بات کرتا ہوں اس نے کتاب نہیں لکھی۔ بیان صفائی مرتب کیا مگر ملزم مجھے باعزت بری ہوتا نظر نہیں آتا۔

انتقال سے کچھ پہلے وہ میرے گھر آیا تھا۔ دوپہر کے وقت جب آہستہ آہستہ چلنے والی گلی میں لُو پھیل رہی تھی۔ اسے گرمی بہت لگتی تھی۔ میں نے کہا: "ٹھہریے، پہلے میں آپ کو ٹھنڈا پانی پلوا لوں۔"

"مجھے پیاس نہیں"۔ اس نے بیزاری سے جواب دیا

شہاب پانی بار بار پیتا تھا اس لیے مجھے اس کی بات کچھ عجیب لگی۔ اس نے کہا: "میری طبیعت پر بڑا بوجھ ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔"

"جی ہاں! گرمی نے سب کی مت مار دی ہے۔ ویسے آپ کی صحت تو ٹھیک ہے نا؟"

"صحت ٹھیک ہے، بوجھ دل پر ہے۔ اسی لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے کچھ آپ سے کہنا ہے۔"

شہاب بالعموم ذاتی احساسات کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ مجھے اس کی شکست کی جھنکار سن کر کسی قدر خفت ہوئی اس قسم کے کچھ واقعات اس سے پہلے بھی ہوئے تھے۔ جب اس نے دوستی کی دہلیز پر کھڑے کھڑے میرے سامنے اپنے کچھ راز اگل دئے حالانکہ اس کے بڑے بڑے امانت دار دوست منتظر رہتے کہ وہ کوئی ذاتی بات کرے۔ وہ ان سے ذاتی باتیں کرتا تھا مگر اوپر کی سطح پر۔ اپنی طاقت یا اپنی کمزوری کا اعتراف کسی کے سامنے کم ہی کرتا تھا۔ میری بات اَور تھی۔ میں اس کے مقام سے واقف نہیں تھا اور اسے محض ایک شریف آدمی سمجھتا تھا جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، جس کی رائے کو نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے اور جس سے ہر قسم کی بات کی جا سکتی ہے۔ اس لیے بعض مشکل لمحات میں اس نے مجھ سے سہارا مانگا۔ وہ چاہتا تھا کہ مجھے ایک عام انسان سمجھا جائے اور مجھ سے بات کر کے اس کی یہ آرزو پوری ہو جاتی تھی۔ میں نے اپنی خفت کو ظاہر نہ کیا، سمجھ گیا کہ وہ دل کا کوئی گھاؤ دکھانے آیا ہے۔ میں نے کسی حیرت کا اظہار کرنے کی بجائے سرسری طور پر کہا: بوجھ تو سب کے جی پر ہے۔

یہی بات مجھے بے چین کیے دیتی ہے سب کچھ چکنا چور ہو گیا۔ میں سخت ندامت میں مبتلا ہوں۔ جینا دوبھر ہو رہا ہے۔

مگر آپ کا کیا قصور، کس بات کی ندامت آپ کو جینے نہیں دیتی!

میں نے اُسے تسلّی دینے اور اس کا احساسِ گناہ گھٹانے کی کوشش کی مگر شرمندگی کے جس جذبے میں وہ جکڑا ہُوا تھا اس میں میری آواز اُس تک نہ پہنچ سکی۔ وہ میرے بے تاثیر لفظوں سے محفوظ ہو کر منمنایا۔ قوم ذلت کی جس انتہا کو پہنچ چکی ہے اس کی کچھ ذمہ داری ذاتی طور پر مجھ پر بھی آتی ہے۔ میں نے ایوّب خاں کی خدمت اپنی سرکاری ڈیوٹی سے بہت آگے بڑھ کر انجام دی۔ میں نے اسے اس کی پسند کے مشورے دئے اور اس کے بعض فیصلوں میں شریک رہا جن کی بدولت ڈکٹیٹر شپ جڑ پکڑ گئی اور قوم کا ہر فرد ذلیل و خوار ہُوا۔ اخلاق تبدیل ہو گئے۔ اقدار بگڑ گئیں۔ معاشرہ نفسا نفسی کا شکار ہو گیا اور آگے بھی ذلّت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اس رذالت میں میرا جو حصّہ ہے میں اس کی وجہ سے سخت ندامت میں مبتلا ہُوں مگر اب کچھ ہو نہیں سکتا۔

اس نے اپنا کلیجہ ایک ہی سانس میں الٹ دیا حالانکہ وہ سیدھی سادی بات بھی رک رک کر ٹکڑوں میں بیان کرنے کا عادی تھا۔ ایسا پچکا ہُوا میں نے پہلے اُسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ عام لوگوں سے محبت کرتا تھا مگر یہ احساس مجھے پہلے نہ ہُوا کہ عوام کی عزتِ نفس کے ذبیحے پر اُسے چُھری سے کوئی شکایت ہے!

یحییٰ خاں کے مارشل لا کے خلاف اُس نے کُھلا مورچہ لگایا تھا۔ ضیاء الحق کے مارشل لا کو اس نے ناپسند کیا۔ اس نے بتایا کہ میں اسی دنیا کے مسائل سے لتھڑا ہُوا ہُوں اور کسی روحانی رفعت کی آرزو نہیں رکھتا۔ یہ معاملہ میری اور میرے جیسے کیڑے مکوڑوں سے تعلق رکھتا تھا جو شرفِ انسانی کھو بیٹھے ہیں۔ اس نے یہ بات مجھ حقیر ہی سے کرنا پسند کی۔

پھر میں بھی بڑا بن بیٹھا جیسا کہ چھوٹے لوگوں کا طریقہ ہے۔

پس مائی چائلڈ! ایک رومن کیتھولک پادری کے انداز میں مَیں نے سوچا خداوند خدا نے ہم سب کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ اب ہماری نجات کے لیے اعترافِ گناہ ہی کافی ہے۔ یہ بات اُسے میں نے ذرا مختلف لفظوں میں کہی۔ میں نے کہا آپ کو اگر ندامت کا احساس ہے تو قوم کے سامنے کھل کر اعترافِ گناہ کریں اور معافی مانگیں۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ شہاب نامہ کا دیباچہ بھی لکھ چکا ہے۔

روہانسا ہو کر وُہ بولا، اعترافِ گناہ اور اقبالِ جُرم میں مَیں نے پوری پُستک لکھ ڈالی اور اس کا نام شہاب نامہ بھی اسی لیے رکھا کہ یہ میرا ہی کچاّ چٹھا ہے مگر کتاب لکھ کر بھی مجھے سکونِ قلب میسر نہیں آیا۔ خجالت کا بوجھ میری رُوح کو کچل رہا ہے۔ اچھا اب اجازت!

وُہ فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہُوا کیا وُہ مجھے کوئی پیغام دینے آیا تھا؟ نہیں وہ تو اپنا بوجھ ہلکا کرنے آیا تھا اور اس نے اس شدید گرمی میں پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پیا۔ گاڑی تک چھوڑتے ہُوئے میں نے اس سے کہا آپ کا وزن اچانک گھٹ گیا ہے یہ بات اچھی نہیں اس عمر میں!

مجھے جسمانی طور پر کوئی ضعف نہیں پہنچا۔ کچھ عرصہ قبل میں نیند سے آزاد ہو گیا تھا اب طعام سے بھی فارغ ہوں۔ اس سے میرے روز مرّہ کے مسائل کم ہو گئے ہیں اور میں بڑے آرام سے ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ شہاب نامہ اُسے بھی پسند نہیں آئی تھی کم سے کم اس کا وہ حصّہ جس میں اس نے ایوب خاں کی دبے دبے تعریف کی اور پھر اپنی بعض ناقابلِ قبول حرکتوں کی وضاحت سے صفحے کالے کیے۔ شہاب نامہ پڑھنے والے کو عالمِ تحیّر میں لے جاتی ہے اور اگر وُہ عذر خواہی نہ کرتا تو بھی یہ ایک منفرد کتاب ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے جب لکھنے کا قصد کیا تھا تو وُہ صرف اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا تھا۔ باقی واردات اپنے زور پر اس میں در آئی۔ اگر اس نے اقبالِ جُرم کسی سچّے مجرم کے خلوص سے کیا ہوتا تو وہ آسُودہ ہو جاتا اور اس کے قاری کی ملاقات ایک ایسے کردار سے ہو جاتی جو رُوح اور جسم کی سیخ پر جلتے ہوئے پہلو بدل رہا ہے۔ مگر اس کے پھُسپھُسے بیان سے جس کی تصویر اُبھرتی ہے وُہ صبح کو صعفِ نعال ہے تو شام کو خسروِ شام۔ فقیر اور آئی سی ایس کا دو آتشہ حلق سے اترتا ہے تو چھالے پڑ جاتے ہیں۔

شہاب نامہ ایک سچی کتاب ہے مگر شہاب نے اس میں سارا سچ نہیں بول دیا جیسے روسو نے بول دیا تھا یا جس طرح ممتاز مفتی نے علی پور کا ایلی میں بول دیا ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ سچ کی کوئی معروف شکل نہیں۔ سچ ایک ہاتھی ہے جسے صرف اندھے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اسی لیے کہ ہر شخص کا سچ الگ الگ اور ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ اس کی کلیت کسی کے ہاتھ نہیں آتی اس کے مکمل جغرافیے کا بھی کسی کو علم نہیں۔ سچ ایک ذاتی تجربہ ہے ایک خفیہ معاہدہ ہے ایک چلبلا معشوق ہے جو چاہنے والوں کو اپنے روپ کے چھل بل سے رجھاتا ہے مگر سارے بھاؤ کسی کو نہیں بتاتا۔ شہاب پر جو کچھ بیتا' بیان کیا۔ ایک خاص زاویے سے بیان کیا۔ وہ زاویہ سچا ہے۔ مگر جو اس سے نظر ملا کر نہ دیکھے کیا اس کی نظر بھی سچی ہو سکتی ہے؟

شہاب ایک مجموعۂ اضداد شخص تھا بیک وقت کمزور اور طاقتور۔ ذرا خیال کرو کہ شہاب جیسا معمولی قد و قامت کا ایک شخص جس پر راہ چلتے کوئی شخص دوسری نظر ڈالنی ضروری نہ سمجھے بچپن میں ایک مہندر بیٹے کو چڑانے کے خیال سے زور زور سے درود شریف کی تلاوت کرتا ہے اور اسی مستی میں روزانہ بائیس میل کا پیدل سفر کر لیتا ہے بڑا ہوتا ہے تو ایمن آباد کی چندراوتی کے عشق میں گرفتار رہتا ہے کہ روزانہ بائیسکل پر ستّر میل آتا جاتا ہے مگر لڑکی کو ہاتھ نہیں لگاتا کیا اس سے بڑی بہادری کہیں ممکن ہے؟

وہ مزارات سے نذر نیاز کے پیسوں کا ایک مقررہ حصّہ نہایت ایمان داری کے ساتھ اٹھا لیتا ہے۔ صاحبِ مزار سے اس کے تعلق کی بنیاد یہی ہے۔ ایک دن جب وہ نہیں اٹھاتا تو اس کی کائنات کی حرکت رک جاتی ہے اور نادم ہو کر وہ اپنے سر پر جوتے مارتا ہے اور پھر سے پیسے اٹھانا شروع کر دیتا ہے۔ کیا یہ پیاری بات نہیں ہے؟

یہ وہی شخص ہے جو بچپن میں پلیگ کے مُردہ چُوہے دم سے پکڑ کر دوسروں کو ڈراتا ہے مگر خود نہیں ڈرتا حالانکہ پلیگ کی دہشت اس زمانے میں بے حد و حساب تھی اور بڑی بڑی دلربا صادقہ بیگمیں دیکھتے ہی دیکھتے نوخیز شہاب کے دئے ہوئے لہریا دوپٹے اوڑھنے کی بجائے چُپ چاپ لحد میں اترجایا کرتی تھیں۔

پھر جب وُہ آئی سی ایس کی تربیت پاکر قحط زدہ بنگال کے قصبے تملوک میں رضاکارانہ طور پر ایس ڈی او مقرر ہوتا ہے تو بھُوک سے سسک سسک کر مرنے والوں میں چاول کے سرکاری گودام لٹوا دیتا ہے جو سرکار نے جاپانیوں کے حملے کے خیال سے ذخیرہ کیے تھے۔ اس پر اس کو کولھو میں پلوایا جا سکتا کہ جاپانیوں کا ایجنٹ ہے یا کانگریس کی ہندوستان چھوڑ دو تحریک کا تخریب کار۔ مگر جب اُس نے خلقِ خدا کو بے موت مرتے دیکھا تو اس نے نتیجے سے بے پروا ہو کر بوریاں خالی کرا دیں۔ انسان دوستی کی اس سے بڑھ کر اور مثال کیا ہو گی!

کٹک میں ایک آسیب زدہ بنگلے میں وہ مہینوں ایک حسرت زدہ مقتول ہندو لڑکی کی نرم و لطیف رُوح اور اس کے بے وفا عاشق قاتل کے بھوت سے جسمانی طور پر راتوں کو دھینگا مشتی کرتا رہا جو نہیں چاہتا تھا کہ شہاب لڑکی کی خواہش کے مطابق اس کے قتل کی اطلاع الٰہ آباد میں اس کی ماں کو پہنچا دے جو اس کی منتظر تھی۔ وہ اس بھوت بنگلے میں ڈرتا بھی تھا مگر وہ کسی خاص وجہ کے بغیر اس قسم کے کٹھن امتحانوں سے گزرتا رہا۔ بسا اوقات بھُوت ایک طرف سے دروازے کو دھکیل رہا ہے اور شہاب دوسری طرف سے، جب کہ لڑکی کی لاش خوشبوُؤں میں لسبی ہُوئی یا زمین پر پڑی ہے یا ہلکے دُودھیا رنگ کے گول دائرے کی شکل میں کمرے میں کھڑی تماشا دیکھ رہی ہے۔ ایسے شخص کو آپ احمق نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے۔

یہ واقعہ شہاب نے زبانی بھی مجھے سنایا تھا اور اسی قسم کے ایک دو اور واقعے بھی میں نے اس سے سنے اس کی ملاقات لندن میں چندراوتی کے ہیولے سے بھی ہُوئی جس نے اسے جسمانی طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیا کیونکہ اس کے پاس کرایہ نہیں تھا۔ چندراوتی نے اُسے بتا دیا کہ تمہاری بیوی عفت کی روانگی قریب ہے اس واقعے کا نجانے اس نے شہاب نامہ میں ذکر کیوں نہیں کیا۔ اگر وُہ سچّا آدمی نہ ہوتا تو میں اس کی ہنسی اڑاتا۔ مگر میں سوچنے پر مجبور ہُوا کہ کیا مادی اجسام غیر مادی قوتوں سے متحرک ہو سکتے ہیں۔ اس حقیقت کا سامنا کرنا بڑے دل گُردے کی بات ہے۔ مگر شہاب جھُوٹ نہیں بولتا تھا۔

شہاب ان افسروں میں سے تھا جنھوں نے برطانوی استعمار کی بنیاد رکھی تھی مگر اس کے اور ہی لچھن تھے اڑیسہ کے چیف منسٹر ہری کشن مہتاب کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے اُس کے ہاتھ کانگریس کا ایک انتہائی خفیہ سرکلر لگا جس پر نمبر لگے ہوئے تھے۔ اس میں کانگریسی حکومتوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ چونکہ تقسیمِ ہند کا فیصلہ ہو چکا ہے اس لیے مسلمان افسروں کو کلیدی عُہدوں سے ہٹا دیا جائے۔ تھانوں کا چارج بھی ہندوُوں کو دیا جائے اور پولیس کی مسلمان نفری کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ شہاب کو جھٹکا لگا، اس کی سرکاری تربیت اس کا راستہ روک

نہ سکی اور اس نے دہلی جاکر یہ دستاویز قائدِاعظم کو دے دی۔ انھوں نے اسے ڈانٹا کہ تم نے اپنے فرائض میں غفلت برتی ہے تمھیں سرکاری راز افشا نہ کرنا چاہیے تھا مگر انھوں نے دستاویز رکھ لی اور پھر کانگریس حکومت کی منافقت کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس موقعے پر شہاب نہ تو ہری کشن مہتاب سے ڈرا اور نہ اس نے قائداعظم کی خفگی کا خیال کیا جو پہلے سے اسے جانتے نہ تھے۔

اس میں ہری کشن مہتاب کی بھی بڑائی ہے جس پر سردار پٹیل نے لعن طعن کی مگر اس نے شہاب سے شکوہ نہ کیا بلکہ پاکستان بن جانے پر اس نے کہا اگر سارے مسلمان افسر پاکستان چلے گئے تو ہندوستان میں مسلمان عوام کی حفاظت کون کرے گا۔

شہاب نے سی ایس پی افسروں کی بھری مجلس میں یحییٰ خاں کے مارشل لا پر نکتہ چینی کی جہاں بڑی بڑی سینیئر سی ایس پی زبانیں خوشامد کی مٹھاس سے چپک رہی تھیں۔ پھر اس نے نوکری سے استعفا دے دیا حالانکہ اس کے پاس کوئی سامانِ زلیست نہ تھا۔ وہ کوئی سیاسی آدمی بھی نہ تھا مگر وہ یحییٰ خاں کو جانتا تھا اور مارشل لا کی خون آشامی سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس کی والیسی ملک کی خانہ بربادی کا باعث ہو گی اور اگرچہ خود اس نے اس قوم شکن نظام کی کھائی میں اپنا پسینہ بھی ڈالا تھا، پاکستان سے اسے بہرحال محبت تھی اور عوام بھی اسے عزیز تھے کہ وہ بے گناہ تو صرف بوجھ ڈھوتے ہیں۔ کسی سی ایس پی افسر کا جو کہ اصلاً آئی سی ایس ہو اپنے عہدے کے بھرپور جلال کے باوجود کسی اصولی مسئلے پر جھگڑا کر کے نوکری چھوڑ دینا اور جلاوطن ہو جانا غیر معمولی بات ہے۔

شہاب نے یہ غیر معمولی بات زندگی میں چار مرتبہ کی۔ بہار میں اس نے اپنے انگریز افسروں کو جو کانگریسیوں کا ایک گاؤں جلانے کے لیے پٹرول کا ٹینکر ساتھ لائے تھے قید کر لیا اور یہ بات بھی ہم میں سے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے۔

لندن میں جلاوطنی کے زمانے میں اس نے ایک ایرانی پاسپورٹ پر خفیہ طور پر اسرائیل کا دورہ کیا اور وہاں سے یونیسکو میں پیش کرنے کے لیے وہ کتابیں لے آیا جو اسرائیلی مقبوضہ فلسطین کے مسلمان بچوں کو پڑھاتے تھے اور جن میں اسلام اور اسلامی نظریات کی ریڑھ ماری گئی تھی۔ اس قسم کے کارنامے باقاعدہ تربیت یافتہ جاسوس بھی مشکل سے کرتے ہیں مگر یہ کام معمولی قد و قامت کے ایک گول مٹول سی ایس پی افسر نے کیا جس سے اس بات کی توقع بھی نہیں کی جاتی کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھے۔ اس قسم کی مہمات اس نے بہت سر کیں جن کے تذکرے سے کتاب بھری پڑی ہے۔ مگر شہاب کی سب سے بڑی بہادری یہ ہے کہ اس نے پاکستان میں ایک پائی کی لوٹ مار بھی نہیں کی حالانکہ جتنے موقعے اسے ملے اور کسی کو ملے ہوتے تو صنم بھی کہتا ہری ہری!

ایسا جری شخص میاں افتخار الدین کے پاکستان ٹائمز اور امروز وغیرہ پر قبضے کے بعد اپنے عمل کے بارے میں ایسی پھسپھسی بات کرے جیسی کہ اس نے کی تو اس پر سے اعتبار اُٹھ جاتا ہے اور جو لوگ کسی بھی طور اسے معاف کرنے پر تیار نہیں وُہ سچّے ہیں۔

شہاب لکھتا ہے پاکستان ٹائمز کا اگلا شمارہ پریس میں جانے کے لیے تیار ہُوا تو ایک ایڈیٹوریل کسی نے نہ لکھا تھا۔ جنرل شیخ اور بریگیڈیئر الیف، آر خان ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے کہ آج کا ایڈیٹوریل لکھ دُوں۔ مجھے اس میں کلام تھا کہ مجھے صحافت کا عملی تجربہ نہیں ہے، نہ اداریہ سپردِ قلم کرنے کا۔ اس کے علاوہ مجھے تو ابھی تک یہ علم بھی نہ تھا کہ اس اخبار کو حکومت کے قبضے میں لینے کے کیا کیا محرکات تھے۔ اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ وہ کیا الزامات تھے جن کی پاداش میں سرکار نے اتنا شدید اور غیر معمولی قدم اٹھایا ہے۔ اس لاعلمی کی وجہ سے میں کوئی پُر معنی اور معقول اداریہ لکھنے سے قاصر تھا لیکن بریگیڈیئر الیف آر خان بھی انتہائی ضدی اور اڑیل ذات شریف تھے۔ وہ اپنے اصرار پر اڑے رہے اور آخر مجبور ہو کر میں نے جنرل شیخ کے بتائے ہُوئے خطوط پر وہیں کھڑے کھڑے بے دلی سے ایک مختصر سا اداریہ گھسیٹ دیا جو نیو لیف (NEW LEAF) کے عنوان سے پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا۔ یہ تحریر کسی صورت بھی میرے لیے باعثِ فخر و مباہات نہیں بلکہ دراصل یہ نامعقولیت اور کج فہمی کے اس پھندے کی عکاسی کرتی ہے جو ایک سرکاری ملازم کو بسا اوقات اپنی مجبوریوں کے دباؤ میں آ کر خواہی نخواہی اپنے گلے میں ڈالنا پڑتا ہے۔

شہاب یہاں جتنا بودا اور فضول آدمی نظر آتا ہے اس کی کہیں مثال نہ ملے گی۔ بھلے آدمی اگر تم مان لیتے کہ پروگریسو پیپرز کے تم دل سے خلاف بھی تھے کیونکہ وہ سوشلزم کا دم بھرتے تھے اور بین الاقوامی امور میں کمیونسٹ ممالک خاص طور پر سوویٹ یُونین کی حمایت کرتے تھے جو نظریاتی طور پر تمہیں ناگوار گزرتی تھی کیونکہ جیسا کہ پرانے نوآبادیاتی مغربی نظام کے حامی کہتے چلے آئے ہیں۔ کمیونزم کا خدا اور مذہب کی دشمنی کے سوا اور کوئی کام نہیں اور تم بھی یہی سمجھتے تھے۔ سرمایہ داری پر حملہ کرتا ہے تو دراصل وُہ الحاد پھیلاتا ہے۔ اور تم نے جو کچھ جنرل شیخ کے بتائے ہُوئے خطوط پر جو اداریہ لکھ دیا اس میں تمہاری اپنی آگاہی بھی شامل تھی اگر تم یہ سب کچھ مان جاتے تو تمہارا کچھ بھی نہ بگڑتا جب تم آخری مرتبہ میرے گھر آئے تو محض مجھے ملنے کے لیے نہیں آئے تھے، تمہارے ضمیر کا فرنگی کوڑے مارتا ہُوا تمہیں پکڑ کر لایا تھا کیونکہ تم نے اقبالِ جُرم بھی کھُلے دل سے نہ کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ دمِ آخر تمہارے دل میں کون کون سے کانٹے چُبھے رہ گئے مگر یقیناً ایک کانٹا پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کا بھی تھا۔

میں اس قابل نہیں کہ کسی کے لیے دُعا کر سکوں، مگر میں دُعا کرتا ہُوں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری روح کو سکون عطا کرے کیونکہ تم بنیادی طور پر ایک انکسار پسند تنہا اور نیک شخص تھے اور تم نے بے شمار لوگوں کو جن میں بعض نااہل

اور بے ایمان بھی تھے کسی ذاتی لالچ کے بغیر فائدہ پہنچایا۔ ایسا کوئی جرم نہیں جو کسی سی ایس پی نے نہ کیا ہو اور تم اپنے عجز و انکسار کے باوجود سی ایس پی بھی ضرور تھے۔ تم جب اس کیچڑ میں پوری طرح لتھڑ گئے تو پھر اسے پسند بھی کرنے لگے کیونکہ جیسے کہ تم نے شہاب نامہ میں لکھا ہے حسبِ ضرورت دنیا کو بھی ہاتھ میں رکھنا چاہیے اگرچہ متعین نہیں کیا کہ حسبِ ضرورت کی حد کہاں تک ہے!

شہاب نے ایوانِ صدر میں معززین کی قلابازیاں بھی دیکھیں۔ ٹیڑھے انگنوں میں سیدھے اور سیدھے انگنوں میں ٹیڑھے ناچ بھی دیکھے اور جاہ و جلال کے چہرے پہ زردی اور بدن پر لرزہ بھی دیکھا وہ کبھی بر سرِ بام آ کر مرغِ بسمل کے تڑپنے کا بھی مظاہرہ کرتا تھا مگر تماشائی کا چولا اس نے سوچ سمجھ کر پہن رکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ اسے اتار کر پھینک دیتا تھا، ایک نوکری ہزار افسانے!

مگر میں تو شہاب نامہ پر مضمون لکھنے چلا تھا یہ قدرت اللہ شہاب بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑا۔

قدرت اللہ شہاب بیچ میں کہیں نہ کہیں سے آ ہی ٹپکتا ہے اور بعض ایسے لوگ بھی اسے گالیاں دیتے ہیں جنھوں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔

جس طرح بعض لوگ ایسے بھی اس کے ثنا خواں ہیں جو اس سے کبھی نہیں ملے۔ وہ ایک خاموش آدمی تھا اور اپنی خاموشی سے اُس نے میرے پھٹے جوتے جیسے منہ پر بھی چپ کا ڈھاٹا باندھ دیا۔ یہ بات نہیں کہ میں اس کے آگے بولتا نہ تھا مگر اس نے میرے دل میں اپنی عظمت کا شک ڈال دیا تھا اور مجھے اس سے جھگڑا کرتے وقت اچانک اس بات پر شرمندگی ہونے لگتی تھی کہ وہ تو میری ہاں میں ہاں ملا رہا ہے میں کس پر خفا ہو رہا ہوں۔

شہاب دنیا داری کے بھید خوب جانتا تھا اور جب ضروری سمجھتا تھا تو جھوٹ بھی بول دیتا تھا۔ اس کے جھوٹ یا تو دفتری کاموں سے متعلق ہوتے تھے یا کسی کی دل جوئی کی خاطر کسی کو دھوکا دینے یا کوئی فائدہ اٹھانے کے لیے اُس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ جھوٹ بول کر وہ کسی فضول ذمہ داری سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایسے سرکاری کاغذ بھی چھپا لیتا تھا جن سے افسروں کو ظلم کرنے کا جواز ملے۔ ایسے موقعوں پر وہ ایسے گول مول نوٹ لکھتا تھا جن کے دو دو تین تین معنی ہوں۔ وہ اپنی تکمیل ذات کے راز بھی نہایت دیدہ دلیری سے چھپاتا تھا۔ مبہم گوئی کا وہ گاماں پہلوان تھا مگر صاف گوئی میں بھی اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی صاف گوئی بعض منتخب لوگوں کے لیے ہوتی تھی۔ بعض اوقات ایوب خاں اس کا نشانہ بنا۔ کبھی کبھار بھٹو نے بھی کڑوی کسیلی سنی۔ یحییٰ خاں کا ذکر میں کر ہی چکا ہوں۔ ان کے علاوہ کئی وزیر، سفیر اور امریکی ڈپلومیٹ اس کی زبان سے زخمی ہوئے۔ مگر چھوٹے موٹے لوگوں کی تلخ ترش پر اُسے غصہ نہیں آتا تھا۔ ان کے حضور میں عاجزی سے ہکلاتے دیکھ کر یہ قیاس کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ آئی سی ایس کے زمانے میں اس نے ایک انگریز افسر سے چانٹا کھا کر چانٹا جڑ دیا تھا اور سی ایس پی کے زمانے میں مری کے مقام پر اُس نے صدر ایوب

نواب کالا باغ اور منعم خان کی موجودگی میں ایک وزیرِ خزانہ کا گال سجا رکھا تھا جو کھلم کھلا پاکستان کو امریکہ کا پائیدان بنانا چاہتا تھا۔

جب امریکی افسروں نے اسے ایوانِ صدر سے نکلوا دیا تو وہ اپنا گال سہلاتا ہوا ہالینڈ چلا گیا۔ شہاب کے اندر کا آئی سی ایس جانتا تھا کہ میرے چانٹے کی انتہا کیا ہے۔

جب ممتاز مفتی نے مجھ پر اس کی روحانی عظمت کا بہت رُعب ڈال کر اُسے قضا و قدر میں دخیل بنایا تو میں نے سوچا کہ میں شہاب سے بھی پُوچھ لوں۔ ممتاز مفتی میں لاکھ خرابیاں ہوں گی مگر وہ ایک سچا آدمی ہے اور ان سے کبھی جھُوٹ نہیں بولتا جن سے وہ اخلاص رکھتا ہے یا جو سچے کی کڑواہٹ برداشت کر سکیں۔ میں اُسے ایک نامعقول اور توہم پرست آدمی سمجھتا ہُوں جس کا مٹکا احساس کی دولت سے لبالب بھرا ہے، بیان کی ندرت بھی رکھتا ہے مگر عقل اور معقولیت کو جسے شہاب شرطِ ایمان قرار دیتا ہے اپنے محلے میں گھسنے نہیں دیتا۔ وہ اپنی جہالت پر خوش بھی بہت ہے۔ اسے کوئی شخص عقلمند کہہ دے تو اسے بے نقط سناتا ہے۔ میں نے چونکہ یہ غلطی کبھی نہیں کی اس لیے میری اس کی بہت اچھی گزری۔

اس نے جب شہاب کی روحانی عظمت کا مصلاّ بچھا ہی دیا تو پوچھا "شہاب صاحب! ممتاز مفتی کہتا ہے کہ آپ کوئی بہت پہنچے ہُوئے ولی ہیں آپ میرے سامنے بھی اعتراف کر لیں تو اچھا ہے"۔

"مگر آپ کا کیا خیال ہے؟" شہاب نے سادگی سے پوچھا "آپ بھی مجھے جانتے ہیں، آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا: "میرے خیال میں آپ بہت نیک آدمی ہیں۔ مذہب پر آپ کا اعتقاد پختہ ہے۔ آپ بہت چالاک بہت منجھے ہوئے بیوروکریٹ ہیں اور درجہ دوم کے ادیب ہیں شاید اس سے زیادہ ہوں میں نے صرف آپ کی یا خدا پڑھی ہے یا کچھ افسانے۔ سوشلسٹوں کو آپ شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں"۔

"آپ ہی درست سمجھے۔ میں دراصل ایسا ہی ہُوں جیسا آپ نے بتایا۔ مگر یہ ممتاز مفتی مجھے جینے نہیں دیتا۔ وہ میرے چہرے پر ڈاڑھی لگا کر سر پہ سبز عمامہ رکھ دیتا ہے۔ اب اس خیال سے کہ اس کی توقعات پر پُورا اتر سکوں، میں جو تھوڑی بہت عبادت کر سکتا ہُوں کر لیتا ہُوں۔ پیر اور ولی تو وہ ہے جو لاٹھی لے کر مجھے صراطِ مستقیم پر قائم رکھتا ہے ورنہ میں ایک دُنیا دار آدمی ہُوں۔ کچھ اچھی باتیں اگر آپ کے خیال میں مجھ میں ہیں تو کچھ اچھی باتیں آپ میں بھی ہیں اور آپ بھی ولی ہیں۔ خوبیوں کی کچھ نہ کچھ ولایت سے کوئی بھی محروم نہیں"۔

شہاب نے بات سادگی سے کہی ہوگی مگر جس پرکاری سے اس نے مجھے جواب دیا اُس سے ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ وہ کسی راز کا امین ہے۔ مگر میں نے اس خیال کو وہیں چھوڑ دیا۔ ممتاز مفتی شہاب

کی عظمت کے افسانے سنا سنا کر دیوانہ ہُوا جاتا تھا۔ میں علّت اور معلول کی منطق میں پھنسا بیٹھا تھا اور اس کی بات سُن کر بھی اپنے سر پر قلندری کا استرا پھروانے پر تیار نہ تھا۔ میری بدنصیبی پر اسے سخت غصہ آتا تھا مجھ پر خاص کیونکہ اسے میرا بڑا خیال ہے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں ان برکات سے محروم ہو جاؤں جو شہاب کے قرب کی وجہ سے میرے آس پاس بکھری پڑی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اسے مرشد مان کر اور اس کی پیروی کر کے دنیا میں مجھے جو تکیہ میسر آ سکتا ہے میں اس کے بغیر بھٹکتا ہُوا مر جاؤں۔ وہ میری جہالت پر بہت کڑھتا۔ اس نے اپنا جی بہت جلایا۔ مگر میں اس کے ہاتھ نہ آیا اور یہ اس کے دکھوں میں ایک دکھ ہے۔

شہاب کا طریقہ دوسرا تھا اس نے کبھی کسی کو سیدھا راستہ نہیں دکھایا۔ کسی نے پوچھا تو اس کی رہنمائی کر دی کہ آپ فلاں دُعا پڑھیں فلاں وظیفہ کریں۔ جب کچھ بتاتا تھا تو ایک عام مولوی یا پیر لگتا تھا جس کی نگاہ یا جس کے کلام میں بجلی کا کوئی کَوندا نہیں لپکتا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے میرا افسر بھی رہا۔ اس لیے اس کے بعض رویوں کا میں ذاتی طور پر شاہد ہوں۔

مجھے اس کے شروع کے روز و شب کا علم نہیں مگر جب میں نے اُسے قریب سے دیکھا تو وہ سرکاری نوکری کا تت نکال کر مزے میں بیٹھا تھا۔ وہ مجھے کہتا کام کرنے کا کوئی فائدہ نہیں فقط فائل بھرنی چاہیے۔ میں نے کام کرنے کی بہت کوشش کی مگر کچھ نہ کر سکا اور اس پر مجھے ذاتی طور پر تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ یُوں بھی کرنے کے کام سال بھر میں دس سے زیادہ نہیں ہوتے اور میں سال میں دس کام بھی کرتا ہوں۔ باقی روٹین ہے۔ اس میں غلط اور صحیح سے کچھ فرق نہیں پڑتا اور چھوٹے قصائی، سیکشن افسر اور ڈپٹی سیکریٹری خوش ہو جاتے ہیں کہ صاحب ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم جو چاہیں اس سے کروا لیں۔ اس طرح وہ زیادہ فرمانبردار ہو جاتے ہیں۔ یہ میرا طریقہ ہے مگر تم چونکہ نہایت کچی نوکری پر ہو اور بہت تیر مارو گے تو دو چار سال نکال کر پنشن کے بغیر ریٹائر ہو جاؤ گے۔ تمہیں کام بالکل نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ سیکرٹریٹ میں تمہارے دشمن پیدا ہو جائیں گے اور تمہارا پتہ بہت جلد کٹ جائے گا۔

وہ مجھے کہتا تھا کہ اصول اور فلسفہ اپنی جگہ درست ہے مگر عملی حقیقت یہ ہے کہ ریاست اور حکومت میں کوئی فرق نہیں اور بیوروکریسی ریاست صرف اپنے آپ کو سمجھتی ہے تم حکومت کے خلاف زبان بند رکھا کرو تاکہ تم پر ریاست سے غداری کا الزام نہ لگے۔ شکر کرو کہ ہماری ریاست ابھی پُوری طرح فاشسٹ نہیں ہوئی ورنہ تم اب تک کئی مرتبہ پھانسی پر لٹکا دئے گئے ہوتے۔ وہ مجھ سے ایسی عجیب عجیب باتیں کہتا تھا جو تھوڑے عرصے کی نوکری کے تجربے کی روشنی میں بھی مجھے صحیح لگنے لگیں۔ مگر میں نے اس کی کوئی بات نہ مانی اور اس کی پیش گوئی کے مطابق سیکرٹریٹ میں پراگندہ خیالی پھیلا کر اور اپنا پتہ جلدی کٹوا کر گھر آ گیا۔ اس پر بھی شہاب کو کوئی خاص قلق نہ ہُوا میرے آخری وقت میں وُہ حکومت سے الگ ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود اس نے میرے بچاؤ کی کوشش کی۔ اس عظیم سول سروس کی روایت ہے کہ اگر کوئی ریٹائرڈ سی ایس پی افسر

کسی حاضر نوکری سی ایس پی افسر سے کوئی درخواست کرے تو اسے حکم سمجھا جاتا ہے مگر شہاب نے میرے سلسلے میں جو ڈی او لکھا حاضر نوکری سیکرٹری نے اسے نظر انداز کر دیا اس پر شہاب کو جو صدمہ ہوا ہوگا اس کا اس نے مجھ سے کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ مجھے تمہاری بیروزگاری پر تشویش ہے۔ اس نے میرے لیے قضا و قدر پر بھی کوئی ہاتھ نہ ڈالا حالانکہ وہ مجھے عزیز جانتا تھا۔

شہاب بالعموم مصیبت زدہ لوگوں کی زندگیوں میں مداخلت کرنے سے اجتناب کرتا تھا کیونکہ پھر اس پر ان کی امداد کرنے کی ذمہ داری آن پڑتی تھی۔ ایک اس کا یہ فلسفہ بھی تھا کہ مصیبت زدہ آدمی تقدیر کے کسی امتحان میں سے گزر رہا ہے۔ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے مگر وہ اپنے قریبی دوستوں کی امداد سو قانون توڑ کر بھی کرتا تھا اس سلسلے میں جائز ناجائز کی پروا بالکل نہ کرتا تھا اس کے خیال میں نوکری اور روزگار میں جائز اور ناجائز کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اس کو اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ کون حکومت کو کتنا لوٹ رہا ہے! حکومت اس کے خیال میں خوا لٹیری تھی جس نے ریاست بھی لوٹ کر گھر میں ڈال لی تھی۔ اس لیے اگر اس کا کوئی دوست لوٹ لیتا بشرطیک حسب حیثیت لوٹتا تو وہ بُرا نہیں مانتا تھا اور جو نہیں لوٹتا تھا اس کے بارے میں بھی نہیں کہتا تھا کہ دیکھو بیچار کتنا ایمان دار آدمی ہے!

ایک مرتبہ اس نے میری تبدیلی ایک ایسے عہدے پر کرنی چاہی جہاں لُوٹ مار بہت تھی میں نے انکار کر دیا تو اس نے پوچھا: آخر وہاں آپ کو ایسی کون سی تکلیف ہے؟

میں نے کہا اگر یہاں میں دس لاکھ روپے رشوت لُوں گا تو بدنام بھی ہو جاؤں گا اور کامیاب بھی ہو جاؤں گا اور اگر میں دس لاکھ روپے کی رشوت نہیں لوں گا تو بدنام بھی ہو جاؤں گا اور کامیاب بھی نہیں ہو سکوں گا اس لیے ———"

"تو پھر آپ رشوت لے لیں اور کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں"۔ اس نے کہا

"جی نہیں، میں رشوت نہیں لے سکتا، مجھے لاکھوں کی حسرت بھی نہیں۔ دو ڈھائی ہزار ماہوار میرے لیے کافی ہیں"۔

"اچھا تو پھر جانے دیں"۔

یہ بات بھی اس نے اسی لاپروائی سے کہی جس لاپروائی سے اس نے کہا تھا کہ رشوت لے لو اور کا کرو۔ رشوت لینے والوں پر اسے ایک اعتراض ہوتا تھا کہ رشوت لیتے ہیں تو کام مکمل نہیں کرتے۔

مجھ سے شہاب کی بات چیت عملی زندگی کی سطح پر ہوتی تھی اس نے مجھے کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ م کسی معاملے میں اس سے یا اس کے کسی دوست سے کسی بھی طرح کم ہوں حالانکہ میں بہتوں سے کم ہوں اور ب

بات میں رسمًا نہیں کہتا۔

اس کی مجلس کے جن مستوں پر انگلیاں اُٹھتی ہیں ان میں ابن انشا جیسے بے خبر، جمیل الدین عالی جیسے خبردار، اشفاق احمد جیسے بقا بالعشق اور ممتاز مفتی جیسے فنا فی العشق لوگ شامل ہیں باوجود اس کے ان میں سے کوئی بھی طرح مصرع کی غزل نہیں اور ان میں وہ سفید پروں والی بچھیری بانو قدسیہ بھی پُتکل مارے بیٹھی ہے۔ وہ اڑتی ہے مگر اشفاق احمد کے بادلوں کے شامیانے کے اندر اندر اور انسان لباس طعام ترک کر کے یہیں تک جا سکتا ہے اس سے اُوپر نکلنے کے لیے عقیدوں اور عصبیتوں پر قینچ کرنے پڑتے ہیں۔

بانو قدسیہ کو اس قدر ہنر، احساس اور قوتِ اظہار ملی ہے کہ اگر وہ اس سے آگاہی پھیلانے کا کام لیتی تو راستوں میں چراغ جلنے لگتے۔ اگر وہ بے خبر ہوتی تو گلہ نہ ہوتا مگر وہ بارہ سروں کے بھراؤ کے بھیروی ہو کر تین سُر نہیں لگاتی۔ سات سُروں کی ڈنڈی مار کر بھی سمپورن ہے۔ وہ انسان کو اشرف المخلوقات سمجھتی ہے مگر اس کی فطرت کو گدھ کی فطرت سے قیاس کرتی ہے جو غلاظت کھاتا ہے تو کہتی ہے دیکھو بیچارہ اپنی فطرت سے کتنا مجبور ہے مگر کیا وہ اتنی کودن ہے کہ وہ انسان اور گدھ کے فرق کو نہیں جانتی؟ نہیں نہیں وہ بے ایمانی کرتی ہے تاکہ اس کا جاگیردار اس سے خوش رہے جس کا جی اپنے بچپن میں جا اٹکا ہے جہاں اپنی دادی کی گود میں بیٹھ کر مکھن کا پیڑا کھایا کرتا تھا اور کمیوں کے بیٹے اس کی بھینسیں چرایا کرتے تھے۔

بانو قدسیہ عورت سے نفرت کرتی ہے۔ کہتی ہے کہ یہ ایک بے وفا جنس ہے۔ مرد سے پیار نہیں کرتی بلکہ اس کی نظر اس کی ڈاب میں ہمکتے ہوئے بچّے پر ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہوگا مگر وہ عورت کو اس کی فطرت کی رعایت بھی نہیں دیتی۔ وہ خود جنم سے ستی ماتا ہے اور مرن تک چتا پر بیٹھتی ہے۔ یہ ہندو عورت کا تصوّر ہے۔ عیسائی عورت کا تصوّر ایک گنہ گار کا ہے۔ مسلمان عورت کا تصوّر ایک کنیز کا ہے اور وہ ان تینوں تصوّرات کے سہاگ پُڑے سے جوڑا سجا کر اپنی نفی کرتی ہے کیونکہ اس کا سب سے بڑا تضاد اس کا اپنا وجود ہے، وہ عورت سے نفرت کرتی ہے کیونکہ وہ اس کی ہم جنس ہے مگر وہ اتنی غیر منطقی اور بے رحم نہیں کہ خواہ مخواہ اپنی کمزور، مظلوم اور بوجھ ڈھونے والی بہن سے بَیر رکھے۔ اس کی کچھ مجبوریاں اور معذرتیں ہیں جنھوں نے اس کے ایمان کو دبایا ہُوا ہے اور اس دباؤ ہی میں اُس نے اپنی ذات کو کھویا بھی اور پایا بھی۔

ابن انشا ایک سیدھا سادہ رومانٹک آدمی تھا جو لذّاتِ زندگی کے لیے اپنا خُون پی اور پلوا سکتا تھا۔ وہ ایک دُنیادار شخص تھا اور اس بات کو مانتا بھی تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں اپنی ذات سے بالا ہو کر سوچنے کی صلاحیت نہیں تھی یا مرگِ مفاجات پر اسے حاکم پر غصّہ نہیں آتا تھا یا وہ اسے اللہ کی رضا سمجھتا تھا۔ وہ ایک بے ریا شخص تھا۔ وہ غم خور بھی تھا۔ لطیفہ گو بھی تھا۔ حسن پرست بھی تھا اور اسے کسی ایسی روحانی بلندی کی آرزو بھی نہ تھی جس کا مقصد اپنی ذات گرامی کے لیے اس حیات مستعار میں یا حیات بعد از ممات کی ابدیت کے لیے جنت الفردوس

حور و قصور، شرابِ طہور، سدرۃ المنتہا، شاخ طوبیٰ یا آسمان کے کسی گوشے کا استحقاق حاصل کرنا ہو۔ وہ تو اس زندگی میں بھی سکونِ قلب کا طلبگار نہیں تھا اور برچھیوں بلموں سے اپنے دل کو چھیلتا رہتا تھا۔ اسے اس بات پر بڑی ہنسی آتی تھی کہ اگر کوئی کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو کسی دوسرے مصیبت زدہ شخص کی دامے درمے امداد کر کے اللہ میاں کو راضی کرنے کی بجائے نفل پڑھنے میں رات بتا دے اور یہ بات وہ شہاب سے بھی کہتا تھا۔ خود ایک مرتبہ اپنے بچے کی بیماری کے دکھ میں ایک بھکارن کو جس کی گود میں ایک نحیف بچہ تھا اچانک دو ہزار روپے دے دیئے اور یہی اس کی روحانیت تھی۔

انشا اپنی تمام تر روحانیت کے ساتھ ساتھ ایک پریکٹیکل شخص تھا۔ جو تھوڑی بہت جائداد اس نے پیدا کی اخلاقی اور ملکی قوانین کے مطابق بنائی اور اس پر اس نے کبھی معذرت خواہانہ رویّہ اختیار نہیں کیا۔ مگر اسے عوام الناس کا غم بھی ستاتا تھا۔ اسے پرانے نظام سے بھی نفرت تھی۔ وہ باغیوں سے محبت کرتا تھا۔ وہ ایک باشعور مڈل کلاسیا تھا۔ شہاب اسے بہت چاہتا تھا۔

شہاب جمیل الدین عالی کو بھی بہت چاہتا تھا مگر وہ ایک مراعات یافتہ مڈل کلاسیا ہے۔ انسان بھرے پیٹ کی ضرورت میں جس قسم کے غم پال سکتا ہے عالی نے وہ سارے غم پال رکھے ہیں۔ اس کے مزاج میں اور اس کے کلام میں آہا اودل کا لٹکا بھی ہے اور یوپی کے رئیس زادوں کی رضا بھی، جو تونگری اور خود پرستی کی دین ہوتی ہے۔ پاکستان سے اس کو اس لیے بھی عشق ہے کہ یہیں آکر اس نے اپنے آپ کو دریافت کیا۔ چھپ تو وہ ہندوستان میں بھی نہ سکتا کیونکہ منہ زور آدمی ہے مگر کمان اس کی اس طرح نہ چڑھ سکتی۔ اس کا اپن تحفظ ہو چکا مگر وہ جانتا ہے کہ وہ اقدار جن کو لے کر وہ گھر سے نکلا تھا خطرے میں ہیں۔ وہ سیانا بہت ہے اس لیے بُرا کسی کو نہیں کہتا، مگر نصیحت ہر ایک کو کرتا ہے۔ اس طرح بھی بعض لوگ بزرگ بن جاتے ہیں۔ وہ چاہ کہ معاشرے میں عدل کا دَور دورہ ہو جائے، لوگ سچّے پاکستانی بن جائیں اور کچھ تبدیلی بھی نہ ہو۔ اس کو ایوب خا کی کوتاہیوں پر بڑا غصہ آتا تھا اور وہ کہتا تھا کہ وہ اگر ہماری بات مانتا رہتا تو ہم اسے نہرو سے بڑا آدمی بنا چھوڑتے۔ وہ پاکستان کے زوال پر دل سے روتا ہے مگر اس کو بالکل یاد نہیں کہ اس کا عروج اس وقت شروع ہوا تھا جب ایوانِ صدر میں اس کے سانسوں کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔ وہ ایک پرشکوہ خرد مار باشعور مڈل کلاسیا ہے جو جانتا ہے کہ مراعات یافتہ طبقہ تاریخ کے بہاؤ میں ہے اور اگر محروموں اور مظلوم کو زندگی کے اسباب اور کم سے کم عزتِ نفس نہ ملی تو دریا چٹانیں توڑ کر اور پہاڑ کاٹ کر نکل جائیں گے پھر نہ رہے گا جمیل الدین عالی اور نہ بجے گی بانسری۔ شہاب جن کے نغمے بڑے شوق سے سنتا تھا۔

اشفاق احمد یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ وہ تاریخ کے جبر سے ناآشنا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ ساری شورش چند شورش پسند سوشلسٹوں کی پھیلائی ہوئی ہے جو خواہ مخواہ زمینداروں کے دشمن ہی

غیر ملکی سرمایہ داری کے خلاف ہیں، مُلّا کے مذہب کو نہیں مانتے اور اسلام اور اتحاد کے نام پر حکومت کرنے والے طبقوں کے رقیب ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ اگر پاکستان ان چند شر پسند سوشلسٹوں کے وجود سے پاک ہو جائے تو ملک طبقاتی انتشار اور تضادات سے پاک ہو جائے اور ان کو کوئی صدمہ نہ پہنچے جن کو کبھی صدمہ نہیں پہنچا۔ وہ دردمندی سے سمجھاتا ہے کہ لوگو! تم کتنے ناشکرے ہو۔ پاکستان نے تمہیں کیا کچھ نہیں دیا۔ یہ جنگل، پہاڑ کس قدر خوشنما ہیں۔ ان کے سینوں میں کتنے دفینے ہیں! افسوس، تم نے مشرقی پاکستان کھو دیا۔ مشرقی پاکستان کے اناناس کس قدر شیریں ہوتے تھے! نظام کو تبدیل کرنے کے چکر میں پڑنے کی بجائے اب ہمیں چاہیے کہ ہم حقِ ہمسائگی ادا کریں اور انفرادی طور بر جس کی حاجت روائی کر سکیں، دریغ نہ کریں۔ یہ نظام تبدیل کرنے والے سنگدل ہیں، نظریۂ پاکستان کے دشمن ہیں، روسی اور بھارتی ایجنٹ ہیں۔ ان عوام عوام پکارنے والوں پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ عورتوں کا بھی مغزیچی کرنا چاہیے جو حقوق مانگنا سیکھ گئی ہیں۔ اب کوئی کس کس کو حقوق دے!

اشفاق احمد ایک ہُنر مند مڈل کلاسیا ہے جو ادب اور تخلیقی عمل سے صرف اپنے خیالات کے پرچار کا کام لیتا ہے اور پروپیگنڈے کی خاطر اس نے ادب تک کو ترک کر دیا جس کی صلاحیت اس میں بے پایاں تھی۔ اب چونکہ س کی جھولی موتیوں سے بھری ہے اس لیے اس کے پڑھنے اور دیکھنے والے ایسے بھی ہیں جن کو بعد میں غصے سے نپ چڑھ جاتا ہے۔

اشفاق احمد عمدہ خیالات کا ایک بہت بڑا بورا ہے۔ زندگی کو اس نے گلے لگا کر رکھا مگر وہ ان جہانوں کے راستے بھی پُوچھتا ہے جو ستاروں سے آگے ہیں۔ تلاش اس کا عہد ہے۔ اُس کے چاہنے والے بہت ہیں مگر ہ یا تو خوشحال لوگ ہیں جنھیں نصیحت کرنے اور نصیحت سننے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا یا ڈرے ہوئے ناکام لوگ جنھیں مایوسی کی انتہا پر پہنچ کر یا شکست قبول کرنے کے بعد وعدے اچھے لگتے ہیں۔ اشفاق احمد کو بطور فنکار نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرا کوئی ایسا ہے بھی نہیں جو اتنے تسلسل اور یقین کے ساتھ حقیقتِ منتظر کی نفی لرتا ہو۔ وہ کسی ایک مظلوم پر رحم کھا سکتا ہے مگر کشکول سازی کی صنعت بند کروانے کے لیے کچھ کرنے پر یار نہیں۔ ظالم کے خلاف کوئی ثبوت ابھی تک اس کو ملا نہیں۔ طبقوں کے ذکر سے اس کا جی مالش کرنے لگتا ہے س کے نزدیک فرد ہی مرکزِ کائنات ہے۔ اجتماع کو وہ سالم اکائی نہیں سمجھتا اس نے ذاتی طور پر بھرپور زندگی بسر کی س میں زیادہ وقت اس نے جاگ کر اور دیواروں پر تصویریں لٹکا کر گزارا۔ وہ ایک مشفقی قیدی ہے۔

شہاب کے دوستوں میں سب سے بے لوث، سب سے زیادہ عقیدہ پرست، سب سے زیادہ لص، سب سے زیادہ جذباتی اور سب سے بڑا ابلہ ممتاز مفتی ہے۔ اس نے شہاب سے محبت ہی نہیں ی اُسے پُوجا بھی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بھی فائدہ نہیں اٹھایا مگر اس کو اپنے کردہ گناہوں کی جب ھی سزا ملی اس نے فرض کیا کہ میں نے تو کوئی حماقت نہیں کی تھی۔ یہ شہاب ہے جس نے تربیتِ نفس کے

کسی پھیر میں مجھے امتحان میں ڈال رکھا ہے اور بعض اوقات اس نے شہاب سے اس کا گلا بھی کیا۔

وہ ایک بے شعور شخص ہے۔ جوانی میں وہ برٹرینڈ رسل کا مرید رہا اور اب بھی اس کی عظمت سے انکار نہیں کرتا۔ مگر وہ سمجھتا ہے کہ زندگی ظالم اور مظلوم، اونچے اور نیچے اور اچھے اور بُرے کے معاہدے کا نام ہے۔ دنیا ازل سے اسی طرح چلی آتی ہے اور ابد تک اس کا ڈھنگ تبدیل نہ ہوگا اس لیے اس کو امنگ میں عمر ضائع نہ کرنی چاہیے۔ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ انسان فعل مختار نہیں۔ وہ طرح طرح کے دھاگوں سے لٹکا ہوا ایک پپٹ ہے جسے نچانے والے چھپ کر بیٹھے ہیں، کچھ ایک مزار میں کچھ دوسرے مزار میں جن کی اپنی اپنی ولایات اور اپنی اپنی بادشاہتیں ہیں۔ یہ ان کا کام ہے کہ جس کو چاہیں اس کی اللہ کے حضور میں فائل پیش کر دیں یا رسول اکرمؐ کی بارگاہ میں شفاعت کی سفارش کر دیں۔ اب جس پر ان کی نگاہ نہیں پڑی وہ پیاسا بھٹکتا پھرے چاہے وہ اپنے طور پر رحم کا کیسا ہی حقدار کیوں نہ ہو۔ اس لیے وہ اس کوشش میں رہا کہ جو اس کے پیارے ہیں وہ ہمیشہ بزرگوں کی نظروں میں رہیں۔ وہ ایک بے مثل ادیب ہے جو نئی تھیمیں، نئے نظریئے اور نئی نگاہیں لے کر آیا۔ قا نے اُسے آنکھوں پر بٹھایا مگر وہ اس کے لیے کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ پڑی ہوئی چیزوں کو چھیڑنا ادیب کا کام نہیں۔ ادیب کی حیثیت سے وہ کوئی سماجی ذمہ داری قبول نہیں کرتا اور اس معاملے میں اتنا اڑیل ہے کہ شہاب کی بات بھی نہیں مانتا۔ وہ نہیں جانتا کہ ادیب لفظوں کا سوداگر ہوتا ہے اور لفظ اگر سوشل کنٹریکٹ نہیں ہو تو کُتے بلّے کی آواز ہوتے ہیں۔ سماجی ذمہ داری لفظوں کی سرشت میں نہیں ہوتی تو پیدا ہی نہ ہوتے اور حیوانو کو اسی لیے لفظ نہیں آوازیں ملی ہیں۔

وہ اپنے مسلک میں شہاب کو جو مقام دیتا ہے خود شہاب نے کبھی اشارے سے بھی اس کی تصدیق نہیں کی مگر ممتاز مفتی نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی گپت گورو اپنے بھید نہیں بتاتا۔ اس کا مقام اس سے نہیں کوئی مجھ سے پُوچھے۔ شہاب کے بارہ حواریوں میں یہی تھے جن کو میں کسی حد تک جان سکا۔ یہی اس کے لُوقا، یوحنا، پطرس اور متی ہیں اور جو حدیث وہ بیان کریں گے وہی انجیل ہوگی۔ مجھ جیسے جال پھیرے کے ہا تو کچھ بھی نہیں آیا۔

مگر مرشد اور مرید سب کے سب مڈل کلاسئے ہیں۔ اپنی نیک دلی، روحانیت اور عجز و انکسار کے باوجود ان میں سے کسی نے اپنے طبقے سے بغاوت نہیں کی۔ خالق اور مخلوق کو سب نے ہمیشہ الگ الگ رکھا اور ایک کو دوسرے کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ وہ سب کا بھلا چاہتے ہیں مگر سب کے بھلے کے لیے خود کچھ کرنے پر تیار نہیں۔

مڈل کلاسیے سے مراد ایک خاص قسم کی نفسیات ہے۔ اس نفسیات کے مالک دینی اور دُنیوی امور میں اپنی ذات کے لیے ادنیٰ سے اعلیٰ کے سفر پہ یقین رکھتے ہیں۔ مگر جن امور میں سے ان کا ذاتی نفع خارج ہو

فقر ہی کا میدان کیوں نہ ہو ان سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ مجھے اہلِ سلوک سے یہی گلہ رہا۔ خدا کی خلقت میں سے جو ذاتی طور پر ان کے پاس پہنچ گیا اس کی امداد اگر وہ خوش ہو گئے تو انھوں نے حسبِ توفیق کر دی۔ مگر ایسے معاشرتی نظام کو جس کی بنیاد ظلم پر ہو تبدیل کرنے میں وہ یقین نہیں رکھتے۔ یہی نہیں جو لوگ تبدیلی کی بات کرتے ہیں وہ ان پر شبہ کرتے ہیں یا انھیں حقیر جانتے ہیں یا قابلِ رحم سمجھتے ہیں یا گردن زدنی قرار دیتے ہیں کہ ہو نہ ہو وہ سیدھے سیدھے اللہ کے دشمن ہیں، ملک اور قوم کے دشمن ہیں اور ایسوں کو فنا ہو جانا چاہیے۔

شہاب ایک جمالی آدمی تھا۔ اس نے اپنے اظہار پر قابو پا لیا تھا مگر اس کے حلقہ نشینوں کا رویہ یہی ہے وہ دنیاوی لحاظ سے بڑے چھوٹے میں فرق کرتے ہیں۔

ممتاز مفتی ان میں ایک چھوٹا آدمی ہے وہ یقین کرنے والوں میں سے ہے۔ وہ روپے پیسے یا جاہ و حشمت سے داغا نہیں گیا اور جذبوں کے زندان میں اس کے لیے عمر قید لکھی ہے مگر ہے وہ بھی مڈل کلاسیا کیونکہ وہ بھی صرف اپنی نجات چاہتا ہے یا اپنے پیاروں کی۔ اس کی شدتِ احساس مجھ جیسے سگِ دنیا کو بھی ڈرا دیتی ہے۔ اس کو خشمگیں دیکھ کر مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے جذبے کی سچائی کوڑا ہاتھ میں لیے بغیر باہر نہیں نکلتی مگر وہ حقیقت پر یقین نہیں رکھتا غائب کو مانتا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ حضرت یحییٰ علیہ السلام یاد آئے جو لاٹھی ہاتھ میں لے کر گلی گلی بشارت دیتے پھرتے تھے ممتاز مفتی بھی ایک ہاتھ میں بشارت کی لاٹھی اور دُوسرے ہاتھ میں اپنا کٹا ہُوا سر لیے گلی گلی ہانکا کرتا ہے اسے اس بات پر غصہ آتا ہے کہ جب میں لوگوں کو ہلاکت اور اندھیرے سے خبردار کرتا ہُوں تو وہ سیدھی راہ پر کیوں نہیں چلتے۔ سیدھی راہ میں عبادت کی حدود شامل ہیں مگر وہ شریعت کی پابندی نہیں کر سکتا اور اسی پر اس کی لُٹیا ڈوبی۔ شہاب شریعت کی پابندی کو تمام دیگر رفعتوں کی بنیاد مانتا تھا اور شریعت سے اس کی مراد نماز روزے اور اللہ اور رسول کی طرف سے بندے پر انفرادی طور پر عاید فرائض کی بجا آوری ہوتی تھی۔ آگے کی مسافت کوئی طے کرا دے تو کرائے مگر آگے کا ویزا شریعت کی پابندی ہی سے ملتا ہے۔ اس کی توفیق ممتاز مفتی کو نہ ہُوئی۔ وہ عقیدے کا گھٹنا تہ کر کے بیٹھا رہا۔ اور اگرچہ میں اُس کا بہت دُور سے ساتھی چلا آتا ہُوں۔ روحانیت کے موڑ پر ہم الگ ہو گئے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہیں پہنچا بھی یا نہیں۔ ممکن ہے اس کے کندھوں پر بھی فریدالدین عطار کی منطق الطیر کے مسافروں کی طرح جو سیمرغ کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے اچانک چاندی کے پَر نکل آئے ہوں۔ تلاش کا حاصل خود تلاش بھی ہوتا ہے اور یہ بات سیانوں نے کتابوں میں لکھی ہے۔

میرے خیال میں شہاب کے حواریوں میں سچا درویش ممتاز مفتی ہی ہے۔ حماقت اس میں کُوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ دنیا اس نے کمائی نہیں اور یقینِ محکم سے وہ مالا مال ہے۔ وہ لوگوں کی خدمت کرتا ہے۔ اپنے آپ کو حقیر جانتا ہے۔ جنت اور دوزخ کی بھی اسے کچھ خبر نہیں۔ وہ حور و قصور کا طلبگار بھی نہیں مگر وہ کسی

ایسے کیف کی تلاش میں ہے جس کو وہ صحیح طور پر جانتا بھی نہیں اب چونکہ وہ سو فیصد سچا اور بے لوث آدمی ہے ا سمجھتا تھا کہ اگر شہاب کے بعد میں زندہ رہا تو شہاب مجھے وہ سب کچھ ایک نظر سے عطا کر دے گا جو خود اس اتنی محنت سے حاصل کیا کیونکہ میں ہی اس کے مسلک اور مقام کا رازدار ہوتا۔ مگر شہاب جب اچانک بھری مجلس ابھرا تو اسے بڑا دھچکا لگا۔ اُسے دھچکا لگا کہ وہ نظر تو اس نے مجھ پر ڈالی ہی نہیں جس سے مجھ پر سات زمینوں اور آسمانوں کے بھید کھل جانے۔ پھر اُسے شک ہُوا کہ ہو نہ ہو وہ جو انتقال سے پہلے اچانک لاہور گیا اور تین چار ر وہیں گزار کر آیا تھا تو لازماً اپنا سب کچھ اشفاق احمد پر لٹا کر آیا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ملتان کی باد

شہاب نے صدیق راعی کو دے دی تھی اور باقی جو کچھ بچا وہ اشفاق احمد لے گیا یہ سب کچھ حساب ہیں۔

اشفاق احمد نے کہا ؛ مجھے تو کچھ بھی نہیں ملا مگر جب اس نے اچانک ڈاڑھی رکھ لی اور پھر نمازوں اور و میں شدت کرنے لگا تو ممتاز مفتی کا شک یقین میں بدل گیا مگر یہ دوستوں کا داخلی معاملہ ہے۔ ہم باہر کے لوگ اس میں دخل نہیں دے سکتے۔ اگر اشفاق احمد کو کچھ ملا ہے تو آگے چل کر اس کے اعمال صالحہ اس کی شہادت د اور اس کے آنے والے ڈرامے اس کے سینے کا روحانی ابال باہر انڈیل دیں گے۔

ڈراموں کی بات میں نے جان بُوجھ کر کی۔ اس کے ڈراموں کا آخری سلسلہ جب چلا تو شہاب لندن میں تھ لوٹ کر آیا اور اس نے ان کے بارے میری رائے پُوچھی تو میں نے اشفاق احمد کی غیبت میں اس کو اس کے خ کو اور اس کے مقاصد کو بے نقط سنائیں کیونکہ ڈراموں کی روشنی میں میں نے اسے دشمن ایمان و آگہی دشمن خلقت ذاتی طور پر متکبر اور جاگیردارانہ سرمایہ دارانہ نظام کا علمبردار پایا تھا۔ شہاب نے میری تنقید کرید کرید کر سُنی اور میں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی حالانکہ خوب جانتا تھا کہ شہاب کو اشفاق احمد کتنا عزیز ہے! اسے پتا تھا کہ میں بات کر میں احتیاط نہیں کرتا شاید اسے میری یہی کمزوری پسند تھی۔ اسے پتا تھا کہ ظلم پر میرا دل کڑھتا ہے مگر اپنے لئے کچھ نہیں مانگتا۔ اس کے قریب کے لوگوں میں مجھ جیسا معمولی اور بے حیثیت دوسرا کوئی نہ تھا۔ شہاب کو سب معلوم تھا وہ مارشل لا کے بارے میں بھی میری تنقید شوق سے سنتا تھا۔ اس کے حلقے کے عام اور خاص لوگ کے خلیفے اور مرید اس کے فقیر اور صوفی کبھی مارشل لا کی لائی ہوئی پریشانیوں پر دُکھی نہ ہوئے۔ اسلام کے با میں خاص طور پر اسلام کے سماجی نظام کے بارے میں ان کے تصورات کبھی نکھر نہ سکے۔ اسلام سے ان کی مراد پرانے اقتصادی اور تہذیبی نظام میں اللہ کا ورد۔ شہاب کو تو آخری وقت میں مارشل لا کی خدمت گزا پر ندامت ہُوئی اور وہ میرے پاس حساب دینے اور گناہ کا اعتراف کرنے آیا تھا مگر اس کے خاص مرید آ تک نہ سمجھے اور وہ ان سب لوگوں کو جو اپنی کسی غرض کے حوالے سے بالا ہو کر تبدیلی کے علمبردار ہیں تاکہ خلقِ خدا اجتماعی طور پر سکھ ملے وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ خلقِ خدا کا معاملہ خدا پر نہیں چھوڑ دیتے بلکہ خود

شہاب جب آخری مرتبہ میرے پاس آیا تھا تو وہ مجھ سے رخصت ہونے بھی آیا تھا مجھے اس وقت تک یہ احساس نہ تھا کہ یہ میری اس کے ساتھ آخری ملاقات ہے۔ رخصتی کے بارے میں بھی بات اس نے فقط مجھ ہی سے کی تھی۔

یہ غالباً ۱۹۷۵ء کا زمانہ تھا۔ وہ مرکزی حکومت کی وزارتِ تعلیم کا سیکرٹری اور میرا افسر تھا۔ اسے پتا تھا کہ میں کسی صورت بھی دس بجے سے پہلے دفتر نہیں آ سکتا۔ ایک روز صبح نو ہی بجے اس کا فون آ گیا۔ لائن پر وہ خود ہی تھا۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا آپ فوراً دفتر پہنچیں۔ شیو نہیں کیا تو نہ کریں، ناشتے کا انتظام بھی یہیں ہو جائے گا۔

میں گھبرا گیا۔ شہاب ایسی مضطربات کبھی نہ کرتا تھا۔ "آج کون سی قیامت ٹوٹ پڑی"؟ میں نے پوچھا اس کی زبان میں لکنت تھی

آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟

بولا: ہاں بالکل ٹھیک ہے۔

مجھے یقین نہ آیا، الفاظ اس کے منہ سے نہ نکلتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ دل کے دورے میں مبتلا ہے اور اس نے مجھے فوراً طلب کیا ہے شاید مجھے اسے ہسپتال لے کر جانا ہوگا۔ میں نے ایک دفعہ پھر کہا: مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی، آپ سچ بتا دیں!

سچ میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے، آپ دفتر پہنچ جائیں وقت ضائع نہ کریں۔

وہ کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری سے کہا نہ مجھ سے کوئی ٹیلی فون ملایا جائے اور نہ کوئی ملاقاتی اندر آئے۔ سمجھ گئے؟

زبان اس کی لڑکھڑا رہی تھی جیسے اس نے شراب پی رکھی ہو۔

یا اللہ! خیر۔ میں نے سوچا اور اس کے سامنے ہمہ تن گوش بیٹھ گیا۔ چھوٹتے ہی اس نے کہا، آج میں بے حد خوش ہوں۔ آپ کو بلایا ہے کیونکہ اتنی خوشی مجھ اکیلے سے سنبھالی نہیں جاتی۔ اس میں آپ کو شریک کرنا ضروری تھا۔

شہاب اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا کرتا تھا۔ اب چاہے یہ اس کی آئی سی ایس ٹریننگ کی دین تھی چاہے اپنی طبیعت پر اس کی گرفت۔ وہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی پتا نہیں لگنے دیتا تھا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں اس قسم کی بات اس نے کبھی اپنے حلقہ خاص میں بھی نہ کی ہوگی۔ مجھے اس نے اس قابل کیوں سمجھا اور اسے ایسی کون سی نعمت اچانک مل گئی کہ راہگیروں میں اشرفیاں بانٹنے پر مجبور رہے۔ میں نے پوچھا کہ آخر آپ کس بات پر اتنے خوش ہیں

اس نے کہا: "مجھے پتا لگ گیا ہے کہ مجھے مرنا کب ہے"! اس کی آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی تھی۔

"تو کب مرنا ہے"؟ میں نے لاپروائی سے پوچھا

یہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ مجھے پتا لگ گیا ہے۔ مگر آپ کو اجازت نہیں کہ کسی اور سے اس واقعے کا ذکر بھی کریں۔

مگر ابھی کچھ مہلت تو ہے؟

ہاں، ابھی مہلت ہے اتنا اور بتا دوں کہ میری موت ممتاز مفتی سے پہلے آئے گی اور یہ بات بھی ممتاز مفتی تک نہ پہنچے۔

نہیں پہنچے گی جی!

پہلے مجھے خیال آیا کہ میں اس پر جرح کر کے اس کے وجدان کے بخیے ادھیڑ دوں۔ مجھے پتا تھا کہ وہ میری منطق کے آگے ٹھہر نہیں سکے گا۔ مگر مجھے اس پر ترس آ گیا۔ وہ ایک بچے کی طرح لکڑی کے گھوڑے پر سوار دوڑ لگا رہا تھا۔ وہ واقعی بہت خوش تھا۔

پھر وہ واہی تباہی بکنے لگا جیسے اس نے ایک بوتل دیسی شراب کی پی ہو۔ لگتا تھا ابھی اُٹھ کر کمرے میں بھنگڑا ڈالنے اور بولیاں گانے لگے گا۔ میں چوکنا ہو گیا اور ایسی کوئی بات نہ کی جس سے اس کی طبیعت کے بہاؤ میں رکاوٹ آئے۔

جوانی میں میں نے بیساکھی کے میلے کے لیے گوجرانوالا کے ریلوے اسٹیشن پر ایک بزرگ سکھ کو گاڑی سے اترتے دیکھا تھا اس کے کیس، داڑھی اور بھنویں سفید تھیں۔ اس نے پان کھایا ہُوا تھا، شراب پی ہوئی تھی۔ تیرہ سال کا بچہ بھی اس کی انگلی پکڑ کر ساتھ ہی اترا تھا اُس نے بھی پان کھایا ہوا تھا اس نے بھی شراب پی ہوئی تھی اور اس کی پگڑی بھی گردن میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ بچہ اس کا پوتا تھا۔ اسٹیشن پر اترتے ہی بزرگ سکھ نے پوتے کا ہاتھ پکڑ کر ناچنا اور لہک لہک کر گانا شروع کر دیا اوئے اوتھے عملاں دے ہون گے نبیڑے کسے نہ تیری ذات پُچھنی!

اسی قسم کی کیفیت میں نے ایک زمانے میں جالندھر کے ایک دیہاتی میلے میں بھی دیکھی تھی ایک بوڑھے سکھ نے خود بھی شراب پی رکھی تھی اور ایک بوتل اپنے اونٹ کے پیٹ میں بھی ڈال رکھی تھی۔ سکھ نے پان کھایا ہوا تھا اس کے ہونٹ سُرخ تھے جس وقت میں نے اُسے دیکھا وہ لگے ہوئے پانوں کا ایک بوجھ الائچی سپاری اور خوشبو سمیت اونٹ کے منہ میں ڈال رہا تھا تاکہ اس کے ہونٹ بھی سُرخ ہو جائیں۔ قدرت اللہ شہاب کی مستی، پان کھائے اور شراب پیئے ہوئے اونٹ کی مستی تھی جس کے گھٹنوں پر گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔ میں کم و بیش دو گھنٹے بیٹھا اسے لقمے دیتا رہا جیسے قوال اہلِ حال کو لے کا لقمہ دیتا ہے حتیٰ کہ اس کی ہنڈیا ابل ابل کر کسی قدر ٹھنڈی ہو گئی اور وہ اشیا کی ماہیت کو پھر سے پہچاننے لگا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس نے اس عالم میں اور کیا کیا کہا۔ مگر اس کی بات چیت بے ربط تھی اور اس میں مزید کوئی انکشاف نہیں تھا۔ ہاں کچھ گالیاں اس نے اس کیفیت میں ضرور دیں۔

ایک بات مجھے یاد آئی جو میں نے اس سے اس واردات کے دوران پُوچھی تھی۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کو اپنی موت کی خبر مل چکی ہے اور آپ اس پہ خوشی سے جامے میں نہیں سماتے تو اس راز میں شریک کرنے کے لیے میں ہی کیوں منتخب ہوا۔ میں آپ کے ڈھب کا آدمی نہیں۔ آپ کے حلقہ خاص میں بھی شریک نہیں۔ خدا سے میرا

رشتہ ایک دُور کے دوست کا ہے۔ پھر آپ نے راہِ سلوک کے ساتھیوں کو چھوڑ کر مجھ ہی سے ایسی نازک بات کیوں کی؟

وہ بولا: خدا سے صحیح رشتہ یہی ہے کہ آدمی اس کو دوست سمجھے۔ رہی یہ بات کہ میں نے اپنے رازداروں کو چھوڑ کر ایسی نازک بات آپ سے کیوں کہی، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات میں آپ ہی سے کر سکتا تھا اور ایک طرح آپ بھی میرے رازدار ہیں۔ ان میں بہت سی خوبیاں ہیں مگر سبھی خوبیاں ان میں نہیں ہیں۔ بعض خوبیاں آپ کو ان سے ممتاز کرتی ہیں اس لیے میں نے ان کو تکلیف نہیں دی۔ میں سمجھتا ہُوں کہ بعض مقامات پر میں آپ جیسا ہُوں یا آپ میرے جیسے ہیں۔ یعنی ہم دونوں میں ایک دوسرے کا کچھ عکس بھی ہے۔

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں تو ایک گندا اور مَیلا آدمی ہُوں۔ کہاں راجا بھوج، کہاں گنگو تیلی!

یہ بات نہیں میں آپ کو خوش نہیں کر رہا۔ بعض مقامات پر ہم ایک جیسے ہیں اور یہاں ہم برابری کی سطح پر بات کر سکتے ہیں۔ مثلاً آپ بھی کسی وحشیانہ طاقت کے سامنے نہیں جھکتے اور اپنے سچ کی خاطر بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ میں بھی وحشیانہ طاقت کے سامنے نہیں جھکتا اور اپنے سچ کی خاطر بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتا ہوں۔ آپ نے بھی اپنی ذات کے لیے دنیا میں کچھ نہیں مانگا۔ آپ بھی منہ پھٹ اور بے ریا ہیں، میں بھی منہ پھٹ اور بے ریا ہوں۔ مگر یہاں آپ کو مجھ پر کسی قدر فضیلت حاصل ہے۔ میں آپ کی طرح ہر وقت، ہر مقام پر اور ہر مسئلے پر ہر غلط شخص کو نالی کا پانی نہیں پلوا دیتا اگر وُہ جھوٹا، مکّار اور مغرور ہو۔ بعض اوقات میں طرح دے جاتا ہوں۔ مگر جب حریف کو طاقت کا زعم ہو یا اس کے سامنے چُپ رہنے سے کسی بڑے دھوکے کا اندیشہ ہو تو پھر میں زبان، قلم اور تلوار میں تمیز نہیں کرتا۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے مگر پھر میرا لہجہ آپ ہی کا لہجہ ہوتا ہے اگرچہ جیسی گاڑھی گالیاں کھڑے کھڑے آپ دے سکتے ہیں ان کی مجھے حسرت ہی رہی۔ میں نے اپنی موت کی خبر آپ کو اپنے جیسا جان کر بتائی، میرا کوئی دُوسرا دوست اس کا اہل نہ تھا۔

شہاب نے اس ایک واقعے کے سوا مجھ سے کبھی کسی ذاتی واردات کا ذکر نہیں کیا اور اس ایک واردات کے باوجود جس کا میں شاہد ہوا میں نے اس میں شاہد و مشہود کا کوئی جلوہ نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ میرا ریسیور بند ہو یا انٹینا الٹا لگا ہو۔ مگر میں نے اسے ایک نیک دل عبادت گزار، دلیر، منکسر المزاج اور خاموش آدمی پایا جو طبعاً غریبِ شہر تھا اور جہاں گھنی چھاؤں دیکھتا تھا دم لینے کو بیٹھ جاتا تھا اب وہ گھنی چھاؤں کسی پرانے مزار کے حجرے میں ملے یا کسی مسجد کے خشمگیں گنبد کے اندر۔

خانقاہ نشینی بھی شہاب کی روح کو قوت بخشتی تھی اور ایک مدّت تک کم سے کم جوانی کے زمانے تک غلام محمد، سکندر مرزا اور ایوّب خاں کی سیکرٹریٹ بھی اس کے لیے حدیثِ دل رہی۔ لوگ اسے بُرا کہتے تھے تو وہ مزا لیتا تھا مگر آخر میں جب اس نے حساب لگایا تو اپنی گٹھڑی اُسے ذرا بھاری لگی پھر اس نے کوشش کی

کہ اس میں سے کچھ بوجھ کم ہو جائے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اقبالِ جُرم کی ہدایت اسے اس کے گپت گورو نائنٹی بابے نے دی ہو۔ وہ نوّے سال کا ایک بزرگ تھا جو اپنے آپ کو جوان فقیر کہتا تھا اس لیے اسے بابا نہ کہنا چاہیے۔ وہ مسلک اویسیہ کا ایک بزرگ تھا جو بظاہر حجروں میں مقیم تھا مگر اس نے شہاب کا ہاتھ پکڑ کر اسے افلاک کی سیر کرادی۔ وہ اپنے سالک سے کبھی نہیں ملا اور ان میں جو گزری وہ ایک ناقابلِ یقین داستان ہے۔ شہاب نامہ کا یہ حصہ اس قابل ہے کہ آدمی یہاں سے اُٹھ کر گیان کے نگروں میں جا بسے۔ وہ ہم میں نہیں ہے اس لیے کہا نہیں جا سکتا کہ اب وُہ خود بھی راہِ طلب میں کسی کی دستگیری پہ آمادہ ہوگا یا نہیں مگر سفر شرط ہے۔

شہاب کی یہ واردات غیر معمولی تھی ایسی باتیں میں نے پرانے تذکروں میں بہت پڑھی ہیں یا ضعیف الاعتقاد لوگوں سے سنی ہیں جو زندگی میں سعی کے باوجود ناکام رہے یا جن کو محنت کے بغیر بہت کچھ مل گیا اور پھر انھوں نے عالمِ تحیّر میں زندگی گزار دی۔ بعض آئی سی ایس ایّوب خاں کے زمانے سے قوالیاں تو سنتے چلے آرہے ہیں انھیں بھی چونکہ محنت کے بغیر بہت کچھ مل گیا تھا اس لیے وہ بھی عالمِ تحیّر میں اسباب کے اسباب تلاش کرتے اور تصوف سے رومان لڑاتے رہے مگر جو کچھ شہاب پر گزری اس پر یقین کرنا مشکل ہے۔ میں اگر اسے ذاتی طور سے نہ جانتا ہوتا تو اس کی اور اس کے ہوتے سوتوں کی خوب ہنسی اڑاتا جس واردات سے وہ گزرا وہ عالمِ امکان اور عمل اور ردِّ عمل کی منطق سے خارج ہے۔ مگر شہاب نے اس معاملے میں جھُوٹ نہیں بولا۔ اشفاق احمد کے دل میں ایک خواہش ہے کہ میرے بعد میرا مزار بنے اور اس پہ عرس اور قوالی کے میلے لگیں۔ شہاب کو تو اس کی آرزو بھی نہ تھی۔

اسلام آباد کے جس قبرستان میں وُہ دفن ہُوا اس کے دو سیکٹر ہیں، ایک سیکٹر میں عوام الناس یعنی ڈپٹی سیکریٹری کے عہدے سے کم کے لوگ دفن ہوتے ہیں اور میری معلومات کے مطابق اس پہ سیکشن آفیسر اتنے ناراض ہیں کہ وہ تو مرنا ہی نہیں چاہتے کہ پھر ہمیں کلرکوں اور چپراسیوں کا سٹیٹس قبول کرنا پڑے گا۔ دوسرا سیکٹر ڈپٹی سیکریٹری اور اس سے اوپر کے افسروں کا ہے جس کا نام بھی وی آئی پی سیکشن ہے۔ ظالموں نے شہاب کو اس سیکٹر میں دفن کر دیا حالانکہ اس میں وی آئی پی والی کوئی بات نہ تھی وہ پیدل چلتا تھا۔ ہنڈوں والے کھانے کھاتا تھا اد چپراسیوں کلرکوں کے احکام بجا لاتا تھا اب وہ وی آئی پی سیکٹر میں دفن ہُوا ہے جہاں اس کا مزار بھی نہیں بن سکتا کیونکہ قبروں کے پلاٹ بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس کے آس پاس جو لوگ دفن ہیں سب کے سب وی آئی پی ہیں، اور بعض کے کتبوں پہ تو یہ بھی لکھا ہے کہ مرنے والے نے نیویارک یا ٹوکیو یا جنیوا میں موت قبول کی۔ اس سٹیٹس کے لوگ مر کر بھی یہ گوارا کیسے کر سکتے ہیں کہ ایک وی آئی پی جو پاکستان ہی میں مرا ہو ان کے پہلو میں پڑا صاحبِ مرقد و علم کہلائے اس کا عرس منایا جائے، اس پر چڑھاوے چڑھیں اور حال کھیلے جائیں۔

قبرستان کے وی آئی پی سیکٹر میں جس میں شہاب دفن ہُوا دل بھی تنگ ہیں اور زمین بھی۔ شہاب سے

پوچھا گیا ہوتا تو وہ کبھی اس سیکٹر میں دفن نہ ہوتا بلکہ عوام الناس کے سیکٹر میں جاتا کیونکہ اس کے آشنا وہاں بھی بہت ہیں. مگر شہاب سے کسی نے پُوچھا ہی نہیں۔ یہ اتنی معمولی بات تھی کہ وہ جو اپنی روانگی کے وقت سے واقف تھا اس کا ذکر کرنا بھول گیا مگر مٹی تو مٹی ہے جہاں بھی لگ جائے۔

مرنے سے ڈھائی گھڑی پہلے اس نے شہاب نامہ کے ٹائیٹل کی منظوری دی تھی اس کے سارے کام اب ختم ہو چکے تھے۔ اس کا بیٹا ثاقب اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو چکا تھا اس کی پیاری مرحومہ بیوی اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھی اور اس سے کچھ پرے ہٹ کر چندراوتی کھڑی اپنے دوپٹے سے اس کی بائیسکل جھاڑ رہی تھی۔ کتاب کا ٹائیٹل منظور کرنے کے بعد وہ پچھاڑ کھا کر گرا۔ پھر ثاقب اور عکسی مفتی جس کو ہسپتال لے کر گئے وہ مٹی کا ایک تودہ تھا۔ اس کا جنازہ بوجھل نہیں تھا کیونکہ وہ ہلکے سفر کا عادی تھا۔

مگر وہ گپت گورو کون تھا جس نے اس کی زندگی بدل ڈالی اور زمین سے اٹھا کر اسے زمان و مکان سے آگے کی سیریں کرا دیں اور زمین سے اس کا رشتہ بھی نہ ٹوٹنے دیا۔

ممتاز مفتی کا خیال ہے کہ وہ خواجہ بختیار کاکی تھے مگر ممتاز مفتی علم و خبر کے معاملے میں کولن ہے۔ بختیار کاکیؒ صوفیائے چشت سے تعلق رکھتے تھے جب کہ گپت گورو سیدھا سیدھا اویسی تھا جسے رسولِ اکرمؐ نے بی بی فاطمہؓ کی سفارش پر شہاب کی دستگیری کے لیے خود مقرر فرمایا کہ چلو اس کو راستہ دکھا دو اور بی بی فاطمہؓ نے شہاب کی ایک جرمن بھابی کو یہ بات خواب میں بتا دی تھی وہ عفیفہ بھی جب سے رات دن ہُو حق میں کاٹ رہی ہے۔

پیر اور مرید کا رابطہ انگریزی زبان میں خطوں کے ذریعے ہوتا تھا جو کبھی کتابوں کی الماری میں سے نکل آتے تھے کبھی چھت میں سے ٹپک پڑتے تھے مگر شہاب کو ان میں سے کسی کاغذ کے محفوظ کرنے کی اجازت نہ ملی۔ اب اس داستان سرائی پر کیا کہئے۔ ہے اِس میں کوئی ماننے والی بات ؟

نائنٹی سے اس کا تعلق پچیس برس سے زیادہ رہا اور جب اُس نے مجھے اپنے دفتر میں اچانک بلا کر بتایا تھا کہ میری موت کی رسید مل گئی ہے تو غالباً اُسے نائنٹی کا کوئی رقعہ ملا تھا جس نے اُونٹ کے منہ میں الائچی سپاری اور خوشبودار پان ڈال کر اس کے ہونٹ لال کر دیے تھے اور وہ فروغِ مے میں بے خودی کے گھنگھرو باندھ کر ناچنے لگ گیا تھا اونٹوں کو میں نے ایوب خاں کے میلہ مویشیاں میں پہلے بھی ناچتے دیکھا مگر اس اونٹ کی بات ہی کچھ اور تھی اور جو لوگ مجھے جانتے ہیں انھیں پتا ہے کہ جھوٹ میں بھی نہیں بولتا۔

میں جدلیاتی مادیت کا قائل ہوں اور اس پر یقین محکم رکھتا ہُوں۔ زندگی کی مادی حرکت و ترقی کے بارے میں بھی مجھے آگاہی ہے۔ میں نہیں مانتا کہ رُوح اگر ہے تو امام غزالیؒ کے بقول مادے کی مقطر شدہ حالت سے سوا کچھ اور ہے۔ انسان میں چونکہ ایجاد و تعمیر کی خلاقی ودیعت ہے جس کا زیادہ تر حصہ وہ بروئے کار نہیں لاتا تو پھر روح ان تخلیقی قوتوں کا نام ہوگا جو بروئے کار نہ آ سکیں اور پھر انرجی کی شکل میں فنا کے بعد کائنات میں آوارہ ہوں کہ

کچھ تخلیق کریں یا کروائیں، اچھی یا بُری یہ ان کی انفرادی فطرت پر موقوف ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ میں کچھ سٹھیا گیا ہُوں مجھے اپنے یقین پر اتنا یقین نہیں رہا۔ بعض جوابات بے شک موجودہ سائنس اور منطق کے پاس نہیں مگر اس کا یہ مطل بھی نہیں کہ قبروں اور مزاروں پر بیٹھا ہُوا ہر بھبھوتی یا حلوہ کھانے والا یا سفید چادر اوڑھ کر نذر وصول کرنے والا ہ حق آگاہ ہو جب یہ بھی طے نہیں کہ حق کیا ہے اور یہ بات شہاب نے بھی کھول کر نہیں سمجھائی۔

شہاب نے جو کچھ بتا دیا ہے اس پر بھی اس کے حلقے کے خاص لوگ خوش نہیں کیونکہ اہلِ حق اپنے راز فا نہیں کرتے۔ انھیں اپنے مریدانِ باصفا کے سینوں میں منتقل کرتے ہیں یا مخطوطوں میں اشارے کر کے منہ پھیر شہاب نے یہ رسم توڑ دی اور بہت کچھ کھول کر بتا دیا۔ راستے کے کچھ بھید بھی ظاہر کر دیے کہ جس میں ہمت ہو آگے منزل اسے ملے گی جو اپنی اہلیت ثابت کرے گا اور قسمت کا دھنی بھی ہو گا کیونکہ سب کچھ محض مشقت سے حا نہیں ہوتا۔ اس نے اگر اشفاق احمد کو کچھ دیا ہے اور ممتاز مفتی کو کچھ نہیں دیا تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اشفاق ا ممتاز مفتی کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ جفاکش ہے وہ جس چیز کو حاصل کرنے کا فیصلہ کر لے اس کے لیے اسے ایک ٹانگ پر کھڑا ہونا پڑے تو وہ کھڑا رہے گا۔ ممتاز مفتی سے تو اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ پنج وقتہ نماز ہی پڑ شہاب کے معیاروں کے مطابق اہلِ خیر کی رسائی کے لیے نماز آئیڈنٹی کارڈ کی حیثیت رکھتی ہے تو پھر ممتاز روتا اس کی شکل ہی ایسی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وُہ اشفاق احمد سے زیادہ نمدار ہے مگر جب زمین میں ہل نہ چلے تو نمی کسی کام کی نہیں۔

بعض امور میں وُہ اشفاق احمد سے افضل ہے کیونکہ اس کا یقین اس کے حاصل سے تعلق نہیں رکھتا۔ بع امور میں وہ اشفاق احمد سے کم تر ہے کیونکہ وہ رسوم و قیود کی جسمانی اور ظاہری صعوبتیں نہیں اٹھا سکتا وہ شہاب بہت پیارا تھا مگر وہ اس کے کام کی چیز نہیں تھا کیونکہ وہ عقیدہ پرست ہے اندھا ہے۔ شہاب کی ہدایت برعکس وہ قرآن شریف پر عقلِ سلیم کی روشنی میں غور نہیں کرتا۔ دین کو مجازی اور استعاری اشارات کا مجموعہ سمجھتا اور جو بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی اس پر اور بھی زیادہ پختہ ایمان رکھتا ہے۔ وہ عقل اور عقلی آدمیوں کا ٹھٹھا اڑ کر لوجی یہ بھی عقل والے ہیں انھیں بھی کچھ معلوم ہے! وہ انھیں قتل کر سکتا تو اچھا ہوتا مگر وُہ ان پر رحم کھاتا ہے ان پر تحقیر کی ایسی نظر ڈالتا ہے کہ بیچارے ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ ایسا مجہول آدمی اپنی نیک دلی اور صفائی کی بدو حق کوش ہو سکتا ہے مگر اس کی اڑان محدود ہو گی الّا اس کے کہ کوئی گپت گورو انگلی سے پکڑ کر اسے بھی لے شہاب سے اس نے کچھ ایسی ہی آس لگا رکھی تھی۔

جس روز شہاب نے رخصت لی میں ممتاز مفتی کے پاس تھا۔ ایک رات میں نے اس کے ساتھ خوف عالم میں گزاری کہ اس کے جلال کا نشانہ کہیں میں غافل نہ بن جاؤں اب یہ چند سطریں لکھتے ہُوئے بھی میں ڈر ر شہاب کو زندگی میں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوئی۔ اُس نے مجھے کبھی راندۂ درگاہ، گمراہ، سیاہ بخت اور جہنم

جہنمی نہ سمجھا حالانکہ اسے پتا تھا کہ میں کائنات کو ایک خودکار کارخانہ سمجھتا ہُوں جس کا ایندھن مادّے کی داخلی جلالیت ہے کیونکہ یہی اس کا گارا چُونا ہے۔ اس سطح پر اس حقیقت سے کوئی بڑے سے بڑا اہلِ خبر بھی انکار نہیں کر سکتا کہ مادہ خود بھی خلاق ہے۔ یہ تسلیم کرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں کہ یہ خلاقی بھی کسی انتہائی قوت کا عطیہ ہے۔ اس قسم کی باتیں میں شہاب سے کرتا تھا تو وہ بڑی توجہ سے سُنتا تھا۔ ہر بات کا جواب میرے پاس بھی نہیں تھا اور ہر بات کا جواب اس کے پاس بھی نہ تھا۔ شہاب نامہ میں اس نے جو بھید بتائے ہیں وہ ہم عامیوں کے کسی کام کے نہیں۔ ہم عامی جو خلقتِ خدا کو دکھوں کے منجدھار میں چھوڑ کر اپنے لیے کنارہ ڈھونڈنے کے لیے تیار رہیں۔

میں نے غلط کہا کہ کتاب مجھے پسند نہیں آئی۔ یہ میں نے جل کر کہا تھا کیونکہ یہ ایک کتاب مجھ پر حاوی ہو گئی تھی حالانکہ میں نے اس سے پہلے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔

قدرت اللہ شہاب

پروین عاطف

غلام محمد، سکندر مرزا، جنرل محمد ایوب کے ادوار میں، جب قدرت اللہ شہاب کو ابوالفضل فیضی کا درجہ حاصل ہوا، میں وقت کے شجر کی اس ڈال پہ تھی، جہاں نغموں اور رنگوں میں بھیگا انسان، اپنے وجود کے تحیر میں گم، تمام خارجی حقائق سے بے خبر ہوتا ہے۔

مفتی جی کی دوستی کے ستارے میرے اردگرد، جھڑنے شروع ہو گئے تھے، لیکن جھولی لبالب نہیں بھری تھی دوسروں سے ان کی عقیدتوں اور ان کی محبتوں کی شدت نے ابھی مجھے اپنی لپیٹ میں نہیں لیا تھا۔ بانو قدسیہ کے مٹے مٹے ظاہر میں لشکتی اس کے اندر کی بجلیاں مجھے ٹین ایج تحیر میں گم رکھتی تھیں۔ اشفاق احمد میرے ساتھ سدا کے پیٹرونائزنگ تھے۔ خدا اور رسول کا تصور بچپن ہی سے کسی جابر ایس پی اور تھانیدار سے ملتا جلتا تھا۔ اس لیے، ان کے حلقہ بگوشوں کی قربت کی دھیمی سی خواہش بھی سر نہیں اٹھاتی تھی اس لیے شہاب صاحب سیاسی، ادبی یا مذہبی ہواؤں کا رُخ رکھتے تھے یا نہیں، یہ جاننا میرے بس میں نہ تھا۔

یُوں روایتاً بھی ان دنوں پتا نہیں کیوں اکثر گھروں میں سنجیدہ سیاسی و معاشی معاملات کو نوجوانوں بالخصوص نوجوان لڑکیوں سے کوک شاستر یا کاما سوترا کی طرز پر مخفی رکھا جاتا تھا۔

دراصل دو سو برس کے جبر اور غلامی نے ہمارے اندر ہر گدھے گھوڑے کی لاٹھی پر لبیک کہنے کا ایک مستقل وائرس اس طرح پھیلا دیا تھا کہ آج بھی ہم اس وائرس کے انڈے فخر سے ہتھیلیوں پر سجائے پھرتے ہیں اور ہماری اجتماعی نفسیات، ایک آزاد ملک کے وقار اور احترام کے تصور سے بدرجۂ اتم خالی ہے۔

سکندر مرزا ایوب کے زمانے میں تو میری بے بصیرت آنکھیں چوک میں رکھی جمہوریت کی برہنہ لاش کو دیکھ تک نہیں سکتی تھیں۔ قدرت اللہ شہاب جیسی ہمہ جہت مقبول عام و خاص شخصیت کی قربت کیسے حاصل کرتی۔

وُہ تو اچھا ہُوا، اچانک میں کٹھالی میں گئی، میز پر رکھا میری ذات کا اندھا بہرا بُت گر کر چُورہ ہُوا اور میں کرکر کرتی ریت مُٹھیوں میں دبوچے، ہراساں ممتاز مفتی اور بانو قدسیہ کی طرف بھاگی۔ یہ دیکھیے میرا انوکھا لاڈلا وجود اسے میں کسی قسم کی زک پہنچتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں نے تو کائنات، ازل ابد، آج کل سب کچھ کا منبع اپنی ذات کو بنا رکھا تھا۔ یہ سنیے سراسر دھاندلی ہے۔ آپ لوگوں کی شفقتوں پر بڑا مان ہے مجھے..... دیکھیے....

پر وہاں تو سماں ہی بدلا ہُوا تھا۔ آشرم کے دروازے بھڑے تھے۔ ایک پُراسرار سناٹا چھایا تھا چاروں

طرف، میں نے دراڑیں سے جھانکا، کستوری اور لوبان کے کاسنی دُھوئیں میں بانو، اشفاق اور ممتاز مفتی، پنڈے بھبھوت ملے، اپنے اپنے وجودوں کی گٹھڑیاں سروں پر دھرے، گردوپیش سے بے خبر، ہرے راما ہرے کرشنا، یفوریا (EUPHOREA) میں گم، قدرت اللہ کے نام کی مالا جپ رہے تھے یا مالکِ حقیقی ایسی جھم جھم کرنے والی شا کُرسی پہ براجمان ایسے مانے ہوئے، مستند بیوروکریٹ کے وجود میں تیری کون سی تجلیاں سرایت کر گئیں کہ میر یہ تینوں مہربان پچھلا سب کچھ مٹا کر نیا اُسارنے کے کشٹ میں مبتلا ہیں۔

یہ بات تو قابلِ فہم تھی کہ قدرت اللہ شہاب، اپنی ادبی پذیرائی کی خاطر ممتاز مفتی، ابنِ انشا جیسے بوریا نشی کو ایوانِ صدارت میں بُلا کر برابری کی سطح پر بٹھاتے، یا کوئی ذریعہ معاش تلاش کرنے میں اُن کے ممد ثابت ہو۔ لیکن یہ بات میرے ذہن کا کوئی کُند گوشہ بھی قبول کرنے پر تیار نہیں تھا کہ صدارتِ عظمیٰ کا ہاتھ تھامے معرفت کے سمندروں کے ایسے مشاق تیراک ہوں گے جن کے قرب سے کسی کی پیشانی پر تیسری آنکھ کھلنے لگے۔ یہ محلوں کے طلسم ہوشربا میں طاقت کے مشکی گھوڑے پر سوار کوئی مجاز سے حقیقت کی طرف آئے ایک سیکولر ذ کے لیے ناقابلِ قبول وقوعہ تھا۔

بانو قدسیہ تو پتا نہیں کس مصلحت کی بنا پر، شاید اس لیے کہ تپسیا کا بھید نہ کھلے، بھگتی کی منزل لیے نہ کھوٹی ہوں۔ ہر قسم کے احساس کی آتشِ سیال پر تنبو تانے رہتی ہیں۔ بیس برس کی قربت کے باوجود ان نفسیاتی یا داخلی وجود میرے لیے ایک زیرِ زمین احرامِ مصر کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن مفتی جی، جنہیں منظر در منظر، زندگ تمام چھوٹی بڑی جزئیات سمیت مادر زاد ننگے ہو کر جینے کا چسکا تھا۔

چوک میں کھڑے ہو کر مذہب کے بخیے ادھیڑنے والا، موجودات کی لگن میں مست، عقلیت کا پجاری ایسے مٹے مٹے رنگوں کے گلیمرلیس (GLAMOURLESS) بیوروکریٹ ادیب کے ہاتھوں گیلی پورسلین ڈھیر کیسے بن گیا۔ اب اس نرم ڈھیلی پورسلین کا وہ گھگھو گھوڑا بناتے یا کچھ اور۔

ممتاز مفتی کا بطور دوست، بطور ایک جینئس (GENIUS) ادیب، ایک مستند، فعال، ہمہ گیر وجود بر سو میرے دل پر نقش تھا، اچانک ان کو ایسی نفی کی منزل پر دیکھا تو یمین و یسار کی یاسیت دوچند ہو گئی۔ لیکن ان کی ذا کے تمام پیش منظر پس منظر سمٹ کر شہاب صاحب کے اسرار میں گم ہو چکے تھے۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر وہ ٹرانس میں آ اور اپنی عقیدت کی مالا جپتے، شہاب صاحب کے پیچھے پیچھے حج کو روانہ ہو گئے۔ ابھی یار لوگ اس انوکھے حادثے حلق سے نیچے اتارنے کی جدوجہد میں تھے کہ مفتی جی بڑے طمطراق سے حاجی بن کر واپس آئے اور 'لبیک' کا ایک سٹنگ میزائل چھوڑا کہ تمام ریشنل (RATIONAL) کی دھجیاں اڑا دیں۔

عقلیت پسندوں نے شور مچایا۔ کوئی بُت پُوجے بنا مفتی کی اپنی شخصیت کی ٹھیکریاں بکھرنے لگتی ہیں۔ بند چسکا پُورا نہیں ہوتا۔ زندگی بھر عورت کے سامنے دوزانو بیٹھا رہا۔ اب عمر کے بھُوسلے سرمئی علاقے میں عورت

لے کر بس چھٹے، جہانِ دیگر کی باتیں ہوئیں تو شہاب صاحب کی آرتی اتارنا شروع کر دی یا وحشت مذہبی بولے صراطِ مستقیم لنکر کنکر چُن کر چلنا، ہڈیوں کا گُودا تک جلانے کا کام ہے۔ محبوبِ حقیقی تک شرع کے سوا کوئی راستہ نہیں جاتا۔ وسروں کی بیساکھی پر اپنی گٹھڑی لٹکا کر بار اترنے کی کوشش، سہل انگاری ہے۔ مفتی گردن زدنی ہے۔ میں بارہ من ل دھوبن کی طرح شیشے سے آنکھ لگا کر دیکھتی رہی۔

میرا کے پربھو گردھر ناگر۔

یا تو بھی کسی پوشیدہ آواز کی ڈور سے بندھی ماتھے پر تلک لگائے گیروا لباس پہنے ناچتی چلی جا رہی تھی۔ ھی تھی تا تھی۔ چہرے پہ نئی بیاہیوں کی لالی سجائے نفسا نفسی کے عالم میں۔

”آسودگی چاہتی ہے تو تو بھی قدرت اللہ شہاب کی چھاؤں بیٹھ۔ اس کا دامن تھام۔“ مفتی جی نے مجھے ہراساں دیکھ کر کہا

”میری جنتِ گم گشتہ وہ چہرے ہیں مفتی جی! جن کو چھو کر، جن سے بات کر کے، جن کے انتظار میں دیے جلا کر بیٹھنے سے میری ذات کے گلزار سیراب ہوتے ہیں۔ مرشدوں کے لاتعلق چہروں میں خالق کی شبیہ ڈھونڈنا، انہیں چُھو کر مالکِ حقیقی کو چُھو لینے کی لذت میں سرشار ہونا میری بساط سے باہر ہے۔

پھر اچانک ہمارا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا اور مفتی جی سے قربت شب و روز رہنے لگی۔

وہاں بھی مفتی جی کے اردگرد ان کے گھر کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ ہرے بھرے درختوں، کیاریوں میں کِھلے پھولوں، کھڑکیوں دریچوں سے گزرتے ہوا کے جھونکوں میں رچا قدرت اللہ شہاب کا وجود دیکھ کر چڑسی ہونے لگی۔

’اگر وہ شہ رگ سے قریب ہے مفتی جی! تو پھر یہ دوئی کا حجاب آپ از خود اٹھانے کی قوت کیوں نہیں پیدا کرتے؟ کیا وہاں بھی آقا اور بندہ کے درمیان وفاق جیسا لال فیتہ حائل ہے؛ جو آپ شہاب صاحب کی سفارش کے ایسے محتاج ہیں؛

یہ شہاب صاحب بھی یقیناً کوئی نرگسیت مارے انا پرست ہوں گے جنہیں شاہی ایوانوں سے نکل آنے کے بعد بھی واہ وا کی لت لگی ہوئی ہے۔

پھر وہاں اسلام آباد میں افسروں کی ایک بند دروازہ ادبی تحریک سلسلہ میں شہاب صاحب سے باقاعدہ ملاقات کے مواقع میسر آنے لگے۔

ان جھم جھم کرتی، معطر شاموں میں بھوسلا، بے رنگ سا کوٹ اور پرانے جاگر پہن کر جب وہ ایک شانت سی دبی دبی مسکراہٹ چہرے پر سجائے آہستہ روی سے بات کرتے کونے میں بیٹھ جاتے، تو مجھے تھوڑا سا دھچکا لگتا۔

[illegible] ذوالجناح کی طرح سجی ہوئی فولاد

میں جکڑی گردنوں والی برکتیں بکھیرتی وفاقی سیکریٹریوں کی سواریوں کے درمیان ایسی مٹیالی، بلا تردد شخصیت چہ معنی دارد!

اللہ مفتی جی، یہ تو ٹیکسلا کی جولیاں یونیورسٹی کے کوئی بدمست پروفیسر یا تبت کی بھید بھری پہاڑیوں سے اترے کوئی دلائی لامے لگتے ہیں۔

ان کے چہرے پر تو سبز عماموں والے نام نہاد بزرگوں اور اللہ والوں کی رعونت، خشونت اور کڑک کا بھی شائبہ تک نہیں۔ ان کے چہرے پہ چھایا معصوم بچوں والا تحیّر اور نارنجی روشنی دیکھ کر تو ایک ممتا بھرے PATHOS کے سوا کوئی دوسرا جذبہ نہیں ابھرتا آپ جو اس یقین میں ڈکو ڈولے کھاتے پھرتے ہیں کہ شہاب صاحب جب چاہیں آگ میں گلزار کھلا دیں، تو مان لیں کہ یہ صرف آپ کی اپنی ذات کا کتھارسس ہے۔

ہاں یہ سچ ہے کہ مفتی جی نے مجھ پر کسی خاص سمت کا وژن کھولنے کی شرط نہیں بدھی تھی، بس جیسے کہ وہ دوستوں کے بارے میں دیالو ہیں۔ ان کا جی چاہتا تھا ہم اپنے چھوٹے چھوٹے دکھوں روزمرہ کی غلاظتوں کے دشتِ کرب و بلا سے نکل کر اسی مدار کے اسرار میں گم ہو جائیں، جہاں وہ خود ہیں۔

پھر ایک روز میری کج بحثی سے تنگ آ کر بولے: "تم ابن آباد ہے۔ میری بیوی سمیت، اپنی انا کے نوکیلے کیکروں پہ چڑھے رہتے ہو۔ خدا اور رسول کے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتے حالانکہ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ روحانی لوگوں کا بھی ایک انتظامی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ وہاں بھی کمشنر ہوتے ہیں، ڈی سی ہوتے ہیں، رابطہ افسر ہوتے ہیں، مسندوں پہ بیٹھنے والے ہوتے ہیں۔ دہلیز پہ لٹکنے والے ہوتے ہیں۔

اور تم خود، جب تمہارے داخل، تمہارے خارج میں سے تمہارا کوئی عالم کسی کڑے امتحان میں ڈلتا ہے تو تم کسی عارف، کسی مددگار کے لیے ایسی چیخ و پکار ڈالتے ہو کہ خدا کی پناہ۔ اور اب جب میں ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہوں کہ قدرت جیسا بھر بھر لٹانے والا، صاحبِ علم و عمل ہمارے درمیان موجود ہے تو تمہارے دل میں وسوسوں کی سلاخیں کھبی ہیں۔

مفتی جی کے وجود سے ٹپکتی شریفے جیسی سچ اور خلوص کی منہ توڑ مٹھاس نے مجھے شہاب صاحب کی چوکھٹ پر جانے کے لیے مجبور تو کر دیا۔ لیکن شک کی مکڑی نے اپنا جالا اور تیزی سے بُننا شروع کر دیا۔

وہ مجھے راستہ بھر سکھاتے رہے ابھرتے بچے کی مشفق ماں کی طرح ــــ جھجکنا نہیں، دل کی بات کھل کر کرنا، کیلی اندر جانا، مجھے ساتھ گھسیٹنے کی ضرورت نہیں۔ اب قدرت اس مقام پر ہے۔ اس کی بات رد نہیں ہوتی۔ چاہتا ہوں تم بھی سُکھی ہو جاؤ۔ بجز میں بھیگی بی بی بیٹیوں کی طرح دبے پاؤں شہاب صاحب کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ کر میں نے اپنے بوسیدہ بدبودار گھاؤ ننگے کرنے شروع کر دیے۔ پیٹ کے اندر خوف اور تجسّس کا ملا جلا کھچاؤ، ایک درد کی سی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔

شہاب صاحب کے چہرے پر یوگیوں کی سی مسکراہٹ تھی۔ میری کمر میں جو بھالا کھبا ہے اس سے خون کی

دھاریاں بہتی ہیں شہاب صاحب مجھے اپنے لیے شفا مانگنے کا چلن نہیں آتا۔"

"اپیل تو صرف اوپر والے کورٹ میں دائر کی جا سکتی ہے۔ یہاں تو بات کرنا ہی بے سُود ہے۔" وہ دھیرج سے بولے "تقسیم کے وقت مہاجر کیمپ میں اپنے خانماں برباد کزن اور اس کی لُٹی پٹی حرماں نصیب بیوی کو دیکھ کر آپ کے حساس دل میں آگ کے الاؤ دہکنے لگے تھے۔ اور انسانی وحشت و بربریت کے متعلق آپ نے صبح کی سپیدی نمودار ہونے سے پہلے "یا خدا" کی صورت میں انسانیت کو جھنجھوڑ کے رکھ دینے والا لازوال ادب پارہ تخلیق کر ڈالا تھا لیکن غلام محمد، سکندر مرزا، جنرل ایوب کی آمریت اور مفاد پرستی نے جمہوریت کو جڑ سے اکھاڑ کر پاکستان کی نیوں میں ڈائنامائٹ کی تاروں کے جال بچھانے اور آپ کی کھلی چاک چوبند آنکھیں دیکھتی رہیں۔ لوگ کہتے ہیں گلڈ کی صورت میں آپ نے ایوب شاہی مارشل لا کی تقویت کے لیے اکادمی ادبیات بنانے کی روایت ڈالی اور آپ کے رویے نوکری کے دوران بہت حد تک وہی رہے جو انگریزی حکومت کی روایات پر چلنے والی باقی نوکر شاہی کے رہے۔ سدھارتا کی طرح کن حادثاتِ زمانہ کے تحت آپ کے اندر یہ جہانِ دیگر دھڑکنے لگا۔ میرے ذہن میں سوالات کے سیکڑوں سرکنڈوں نے سر اٹھایا۔

"آپ یہ دو لفظ پڑھ کر خلوصِ دل سے دُعا کریں، قبولیت کی گھڑی ضرور آئے گی۔ مانگتے رہنا ضروری ہے کس لمحے فریکوئنسی قایم ہوتی ہے، کوئی نہیں جانتا۔" انھوں نے قرآن پاک کے دو لفظ کاغذ پر لکھ کر پکڑاتے ہوئے حلیمی سے کہا

"میرے اندر کی جدید عورت چلاّئی۔ میں فہم و ادراک کی خیرہ کر دینے والی روشنیوں سے باہر کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ آپ کے دیئے ہوئے یہ دو معصوم لفظ میرے درد کا مداوا کیسے ہو سکتے ہیں!"

"میں مطمئن ہوں، جتنی توجہ تمھیں دی گئی دوسروں کو کم کم ملتی ہے۔ بارود کے فلیتے کی طرح تڑ تڑ نہیں ہوا کرتی روحانیت میں... جو کہا گیا وہ کر۔" مفتی جی نے قرآنی حروف کو دیکھتے ہوئے کہا

پھر میں نے وہاں ممتاز مفتی کی دہلیز پر ٹھٹھ کے ٹھٹھ دیکھے۔ گمشدہ، زخمی بکریوں، پھٹی ہوئی جھولیاں، نئی نکور جھولیاں، خالی جھولیاں، بھری ہوئی جھولیاں۔ اور ممتاز مفتی ایک داس کی لگن سے، کسی کے منہ میں ہومیوپیتھی کی پڑیا ٹھونستے ہوئے، شہاب صاحب سے لوگوں کی ملاقاتوں کے اوقات لیتے ہوئے، کسی کی اشک شوئی کے لیے اپنا کندھا آگے بڑھاتے ہوئے

کت کُڑے نی کت کُڑے!

یہ جو آپ صبح و شام ڈھول پیٹتے ہیں میں شہاب صاحب کا "ایرینڈ بوائے" ہوں "ٹیلیفون ایکسچینج" ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اس میں بھی کچھ گڑبڑ ہے۔ مجھے تو آپ بھی کوئی ملامتی سے فقیر نظر آنے لگے ہیں۔ حاجتمندوں کے آگے گھٹنے ٹیکنا۔ میلے کچیلے کو گلے لگانا۔ وجودِ حقیقی میں انجذاب کا ایک ارفع راستہ — نہیں تو اور

کیا ہے۔"

شہاب والے کشٹ تو میں کئی زندگیوں میں بھی نہیں کاٹ سکتا۔ پگلی میرا تو کڑا رشتہ صرف اس کی مخلوق سے ہے، زمین پر رہنے والوں سے۔ ولی ابدال بننا میرے بس میں نہیں" مفتی نے مسکراتے ہوئے کہا

ایک روز شہاب صاحب کے گھر کے مسجد نما ماحول میں، ان کی جدیدیت کا پیکر، ہنس مکھ، ذہین بھتیجی سے ملاقات ہوئی۔ دو چار منٹ میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی حیثیت قدرت اللہ شہاب کی برفانی جھیل جیسی خاموش زندگی میں وہ ایک گلابی کنول کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

"گڈی، آپ تو شام و سحر شہاب صاحب کی قربت میں رہتی ہیں۔ خلوت اور جلوت کا مشاہدہ کرتی ہیں۔ کیسا محسوس ہوتا ہے آپ کو؟" میں نے اخبار نویسوں کے مخصوص لہجے میں پوچھا

"عام طور پر میں ان سے دوستوں جیسی لبرٹیز (LIBERTIES) لے لیتی ہوں۔ وہ ہنستے رہتے ہیں میں ان کے ذاتی معاملات میں متجسس نہیں ہوتی۔ بس کبھی کبھی ان کے کمرے کے سامنے سے گزرنا عذاب ہو جاتا ہے۔ ایک بار تو میں ان سے لڑ ہی پڑی تھی۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے کانپتی نحیف آواز میں پوچھا

عجیب، ان چھوٹی بے دست و پا کر دینے والی خوشبو کے بھبکے آنے لگتے ہیں ان کے کمرے سے اچانک۔ سارا گھر بھیگ جاتا ہے۔ میں تو خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ ایک روز میں ناراض ہو گئی یہ پتا نہیں کون سے SCENT کی بارش ہونے لگتی ہے گھر بھر میں۔ ہمیں ڈر لگتا ہے۔"

"کسی نیک رُوح کی آمد ہو گی، گھبرایا نہ کرو۔" وہ شرارت سے بولے

میں نے ممتاز مفتی سے کہا: "مفتی جی! اتنی باتیں سُنیں، سمجھنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن روحانیت کا چھوٹا سا جرثومہ بھی اندر گھر نہیں بنا سکا۔ آپ کا رُخ مُڑتے ہی رسل، ڈیکارٹ، کرک گارڈ آوازے کسنے لگتے ہیں۔ شہادت، عمل، ردِ عمل، تفتیش کے پاٹوں میں پسنے لگتی ہُوں میں۔"

ایک روز مفتی جی نے شہاب صاحب کا لندن سے آیا ہُوا ایک پُرانا خط دکھایا "اسے پڑھ کر اور صدقِ دل سے بتا، کوئی دوسرا ایسا دیکھا جو محض ایک یقین کی قندیل ہاتھ میں لیے، جان ہتھیلی پہ رکھ کر اندھے تاریک کنویں میں اتر جائے۔ ایسے کڑے امتحانوں کے لیے محض جذبۂ حب الوطنی کافی نہیں ہوتا۔ وجود کے اندر کچھ اور سوتے پھُوٹ رہے ہوتے ہیں۔

(میں نے شہاب صاحب کے متن کو معذرت کے ساتھ اپنے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے)

جب دشمنوں کے جُھوٹ کے پول کھلے تو انہوں نے انتقاماً کالے علم کے ذریعے میرے بدن کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ میں زندوں میں ہُوں یا مُردوں میں ـــ یہود کی صدیوں پُرانی شیطانی

قوت بدستور فعال ہے۔ بستر پہ پڑا پڑا ابھی آہنی شکنجوں میں جکڑا رہتا ہوں ٹائم اور سپیس سے پرے حواس گم کر دینے والا یہ دوزخ پتا نہیں کب تک بھڑکتا رہے گا۔ کچھ روز پہلے ایک ضروری میٹنگ کے لیے ہمت کر کے گھر سے نکلا تو ایک ویگن قریب آ کر کھڑی ہوئی "چلئے ہم آپ کو آپ کی منزل پہ پہنچا دیں ہم بھی اسی طرف جا رہے ہیں۔" ایک سوٹڈ بوٹڈ آدمی نے باہر نکل کر بڑے اخلاق سے کہا، اور اس تذبذب اور بے یقینی کے لمحے کے بعد، مجھ پر اغوا اور تشدد کی جو غیر انسانی واردات گزری، آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے، وغیرہ وغیرہ۔

یہ تو ہم سب بھی جانتے تھے کہ یونیسکو میں پاکستان کی نمائندگی کرتے کرتے یہودیوں کے جھوٹ اور جعلسازی سے تنگ آ کر شہاب صاحب نے گوریلا تربیت حاصل کی اور فلسطینی بچوں پر ڈھائے ہوئے یہودیوں کے مظالم کی ایک سچی تحقیقی رپورٹ حاصل کرنے ایرانی ٹورسٹ کا بھیس بدل کر اسرائیل جا پہنچے۔ کسی خطرناک زہر کی گولیاں جیب میں رکھے بھوکے پیاسے شب و روز جاگتے، لومڑی کی سی ہوشیاری کے ساتھ۔ یہودیوں کو جُل دے کر ایسی تحقیقی رپورٹ جمع کی کہ یونیسکو کی یہودی لابی بغلیں جھانکتی رہ گئی۔

مسجدِ اقصیٰ میں چھپ کر رات گزارنے کے موقع پر لکھتے ہیں "قبلہ اوّل کی چار دیواری کے اندر جب میں اکیلا رہ گیا تو تاریخ اور تقدس کے ایک مہیب سنّاٹے نے مجھے سر سے پاؤں تک غڑاپ سے نگل لیا، مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی پاکیزہ شیش محل میں ایک کُتّا غلطی سے بند ہو گیا ہے۔ لرزے کے بخار کی طرح میرے تن بدن پہ کپکپی طاری ہو گئی اور دانت بے اختیار کٹ کٹ بجنے لگے۔ مرگی کے مریض کی مانند تشنّج میں گرفتار ہو کر لڑھکتا ہُوا میں ایک ایسی ٹائم ٹنل (TIME TUNNEL) میں جا گرا جہاں پر نسل انسانی کی ہزاروں سال کی خوابیدہ تاریخ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔"

ممتاز مفتی کا خط پڑھنے سے پہلے اس بات کا مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ شہاب صاحب کا سارا مشن کامیابی سے مکمل ہو جانے کے بعد یہودیوں کی مسلمانوں کے خلاف صدیوں پرانی کینہ پروری اور خباثت خوفناک انتقام کی صورت شہاب صاحب کے گھر کی دہلیز تک جا پہنچے گی۔

وہ مفتی صاحب کے خط میں شاید اسی طرح کچھ لکھتے ہیں، "یونیسکو کی میٹنگ پہ جانے کے لیے گھر سے باہر نکل کر کسی ٹیکسی یا ویگن کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک ویگن نما ڈبّہ میرے قریب آ کر کھڑا ہوا، اور سوٹڈ بوٹڈ گورے نے بڑے مہذّب انداز میں پُوچھا: آپ یونیسکو کی میٹنگ پر تو نہیں جا رہے، ہم بھی ادھر ہی جا رہے ہیں، چلئے ہمارے ساتھ۔ ادھر مغرب میں کسی سے لفٹ لینا کوئی اچنبھے کی بات نہیں، میں شکریہ کر کے سوار ہُوا پھر اس کے بعد وقت اور سپیس سے الگ کسی ڈائمنشن میں، جس تشدّد اور اذیت سے مجھے گزرنا پڑا اس کے بیان کے لیے الفاظ ناپید ہیں۔ پتا نہیں کتنی مدّت کے بعد آنکھ کھلی تو اپنے گھر کے قریب اسی جگہ گرا ہوا پایا گیا جہاں سے ان یہودیوں نے اٹھایا تھا۔ عفت تلاش میں دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

گھر چلے آنے کے بعد بھی بہت دن تک یہودیوں کے فاسد جادوئی عمل نے مجھے اس مقام پہ لٹکائے رکھا، جہاں انسان زندگی اور موت کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا۔ پھر بھی الحمد للہ میں مطمئن ہوں۔"

اور یہ بات میں شہاب صاحب کی زندگی میں انہیں کھل کر بتانے کی جرأت پتا نہیں کیوں نہ کر سکی کہ ان کی اس عظیم قربانی پر میرا پاکستانی دل رہتی دنیا تک ان کا اور ان کی اولادوں کا ممنون رہے گا۔

اور جہاں تک قدرت اللہ شہاب کی تازہ ترین اور بد قسمتی سے آخری کتاب، شہاب نامہ کا تعلق ہے۔ اس منجھی ہوئی شگفتہ رسیلی نثر کا مقام ادبِ عالیہ کی چنیدہ مسند پر ہوگا۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

"آئینہ خانہ ہے دلیر" کے مترادف زندگی کے چھوٹے چھوٹے دلچسپ واقعات کے رنگین شیشوں سے مزین یہ کتاب شروع سے آخر تک رنگ میں بھگوتی ہے کہانی در کہانی، عکس در عکس، نرمی اور محبت سے ہاتھ پکڑ کر بٹھاتی ہے اور پھر آخری سطر تک ہلنے نہیں دیتی۔

علاوہ ازیں جس بات نے مجھے چونکایا وہ شہاب صاحب کے ہمہ گیر سیاسی اور تاریخی تجزیے ہیں۔

یہ ہماری بدبختی کہ قائدِ اعظم کے بعد، جب بھی در وا ہوا۔ گھر پہ خرکاروں اور لٹیروں کا قبضہ ہوا، جنھوں نے طاقت کے منہ زور گھوڑے پر سوار ہوتے ہی نوزائیدہ پاکستان کو اغوا شدہ بچے کی طرح ہاتھ پاؤں توڑ کر ٹُنڈ منڈ کر کے ریڑھی میں ڈالا اور کشکول ہاتھ میں دے کر در در بھیک مانگنے جوگا کر دیا اور اپنی سیاہ کاریوں اور چیرہ دستیوں پہ پردہ ڈالنے کے لیے آنے والی بے گناہ نسلوں کے لیے دھوئیں اور دھند میں لپٹے جھوٹ کے پلندے باقی چھوڑ دیے۔

یہی وجہ ہے کہ ان بند دروازوں کی گھٹی فضا میں، کرنی جی دار اگر سچ کے چار جگنو مٹھی میں بند کر کے لاتے تو محب الوطن چاک گریباں اُس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب جس مصفا مٹی سے بنے تھے۔ روشنی کے کچھ دریچے وا کرنا ان پہ بہر طور واجب تھا۔

دراصل "شہاب نامہ" کتاب نہیں زندگی کی داخلی اور خارجی کیفیات کی اونچی نیچی سنگلاخ پہاڑیوں کے درمیان ایک طویل سفر ہے۔ کہیں اچانک بپھرے جھاگ اڑاتے پُرشور سمندر، اپنی تھکن اور ناممکن وسعتوں سمیت چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ پل بھر میں قاری آتش فشاں کے دہانے پہ معلق ہوتا ہے تو دوسرے ثانیے، رنگوں کی پھوار میں ڈوبے نارنجی، کاسنی، عنابی گلستاں اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ زندہ، دھڑکتی، جلتی، بھڑکتی حقیقتوں کے ہجوم میں بھاگ بھاگ کر میرا تو سانس پھول گیا ہے زندگی کرنے کی وہ تمام تشبیہیں جو میرے فہم نے اپنے اردگرد اتنے برسوں میں کھڑی کی تھیں، جھٹکے سے چکنا چور ہو گئیں "نائنٹی" کے طویل، سبز، نیچرل، پُراسرار تجربے سے، شہاب صاحب نے میرے اتنے سارے برسوں کو زیرو پوائنٹ پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ ہمارے عالم کے ساتھ اور کون کون سے عالم گڈمڈ ہیں؟ مفتی جی کے تمام مشاہدات

بھی مجھے پلوسی نیشن اور فینٹی پر مبنی نظر آیا کرتے تھے لیکن قدرت اللہ شہاب نے جاتے جاتے جو آگ بھڑکائی ہے پتا نہیں وہ اصل کی طرف کوئی سمت کھولتی ہے یا نہیں! مری کی شاداب و سرسبز پہاڑیوں میں جاڑے کی گلابی چائے کی طرح جب میں نے شہاب نامہ گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارا تو میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہ کتاب دوستوں کے درمیان ایک داستانِ کشمکش و گریز بن جائے گی اور رفقا، ادب عالیہ سے الگ، اسے سیاست اور تاریخ کی کسوٹی پر رگڑنا شروع کر دیں گے۔ بالخصوص اس وقت جب قدرت اللہ شہاب ہمارے درمیان موجود نہیں۔

نقوش کے خاص نمبر

جو بڑی تھوڑی تعداد میں دستیاب ہیں

(۱) رسولؐ نمبر	(۱۲ جلدیں)	فی جـ۔	۱۲۵ روپے
(۲) بیاضِ غالب (بخطِ غالب)		فی جلد	۱۰۰ روپے
(۳) غالب نمبر ۳		فی جلد	۵۰ روپے
(۴) افسانہ نمبر	(دو جلدیں)	فی جلد	۷۵ روپے
(۵) ادبی معرکے نمبر	(دو جلدیں)	فی جلد	۷۵ روپے
(۶) خطوط نمبر	(تین جلدیں)	فی جلد	۵۰ روپے
(۷) آپ بیتی نمبر	(جلد دوم)	فی جلد	۱۰۰ روپے
(۸) میر نمبر ۱		فی جلد	۱۰۰ روپے
(۹) میر نمبر ۳		فی جلد	۹۰ روپے
(۱۰) اقبال نمبر ۲		فی جلد	۵۰ روپے
(۱۱) انیس نمبر		فی جلد	۱۰۰ روپے
(۱۲) منٹو نمبر		فی جلد	۵۰ روپے
(۱۳) عصری ادب نمبر		فی جلد	۶۰ روپے
(۱۴) سالنامہ ۱۹۷۷ء		فی جلد	۵۰ روپے
(۱۵) سالنامہ ۱۹۷۹ء		فی جلد	۵۰ روپے

نقوش کے عام شمارے

(۱۶) شمارہ نمبر ۵	فی جلد ۲۰ روپے	(۱۷) شمارہ نمبر ۶	فی جلد ۲۰ روپے
(۱۸) شمارہ نمبر ۱۱	فی جلد ۲۰ روپے	(۱۹) شمارہ نمبر ۱۳	فی جلد ۲۵ روپے
(۲۰) شمارہ نمبر ۱۴	فی جلد ۲۰ روپے	(۲۱) شمارہ نمبر ۳۷	فی جلد ۳۰ روپے
(۲۲) شمارہ نمبر ۱۱۴	فی جلد ۲۵ روپے	(۲۳) شمارہ نمبر ۱۱۵	فی جلد ۲۵ روپے

رسالہ ’نقوش‘ بکیر اسٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

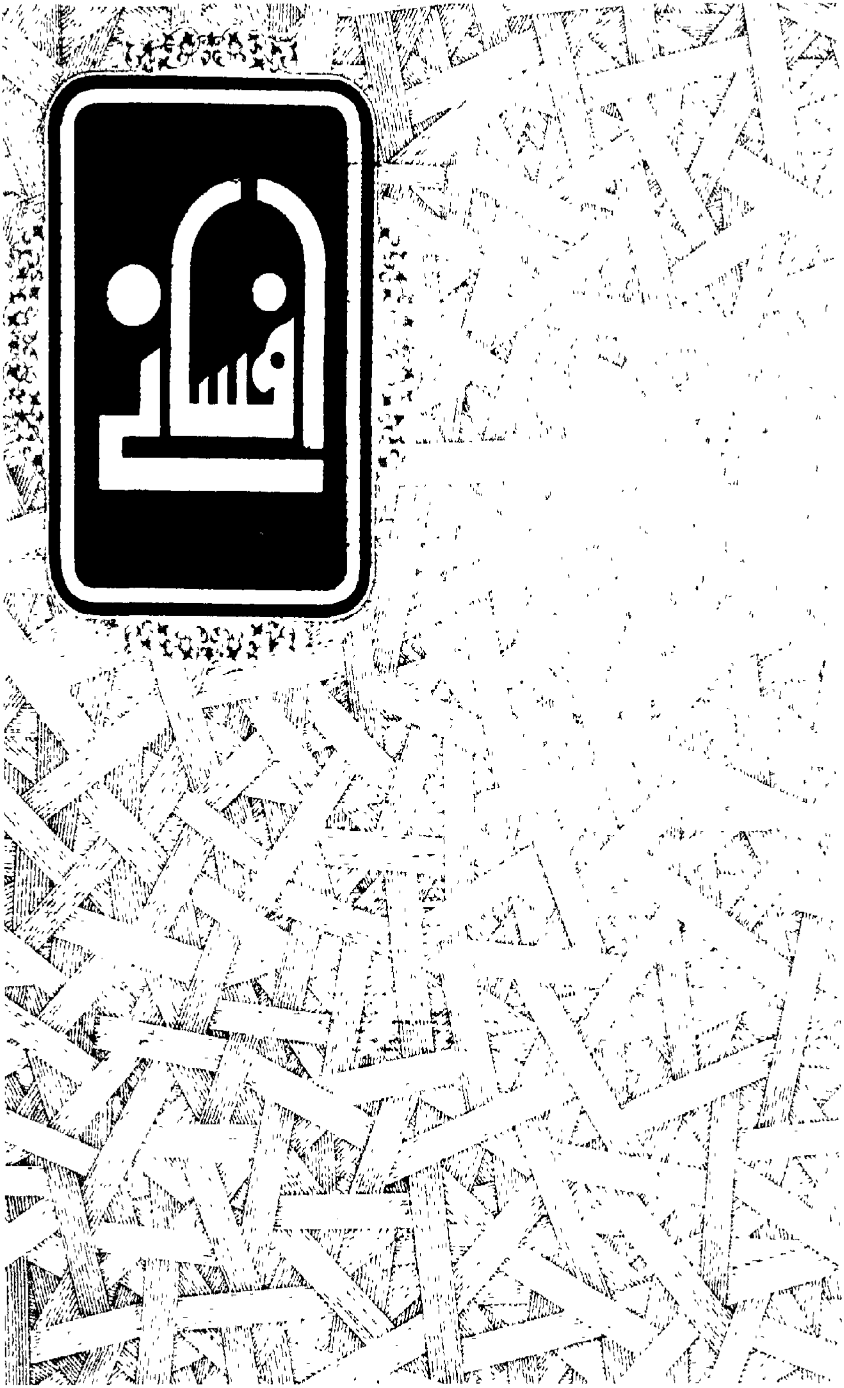

فقیرا فقیری دُور ہے

اعجاز حسین بٹالوی

میرا خیال تھا کہ اُس کا انتقال ٹی بی سے ہوگا مگر اس نے تو اپنی موت کا انتظار ہی نہ کیا اور سڑک کے حادثے کی نذر ہوگیا۔ یوں تو اس سے ملاقات بھی حادثہ ہی تھی مگر ملاقات سے موت تک آتے آتے شناسائی کی کئی منزلیں طے ہوگئی تھیں۔ یاد کرتا ہُوں تو نقش دُھندلے دُھندلے سے نظر آتے ہیں مگر اوّل ملاقات کے نقش بالکل واضح ہیں۔

میں پیرس سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر پاکستان آیا تھا اور کیا زمانہ تھا کہ مجھے پڑھے لکھے پاکستانی بھی جاہل معلوم ہوتے تھے۔ میں علم کی بوجھل گٹھڑی سر پر اٹھائے اٹھائے پھرتا تھا۔ کبھی علم کا غازہ منہ پر جاتا اور کبھی اپنے علم کو تیز خنجر کی طرح استعمال کر کے حریفِ بذلہ کو تہِ تیغ کر ڈالتا۔ یہی زمانہ تھا جب میری اس سے ملاقات ہُوئی۔

سردیاں گزر چکی تھیں، کھلتے موسم کا آغاز تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں غسل خانے میں قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا سیٹی بجا رہا تھا اور اِس انتظار میں تھا کہ گیزر میں پانی گرم ہو جائے تو نہاؤں۔ کھڑکی سے باہر نظر پڑی تو دیکھا کہ نہایت پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک فقیر صحن میں آم کے پیڑ کے نیچے اکڑوں بیٹھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں تازہ گُندھے ہُوئے آٹے کا بڑا سا پیڑا تھا جس پر وُہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پھُونکتا جا رہا تھا۔ پھر اُس نے وُہ پیڑا ملازم کے حوالے کر دیا اور بولا :

”لو، بھینس کو کھلا دو، مولا برکت دے گا۔“

اب وہ اُٹھ کر باہر جانے لگا۔ اُس کے پاؤں میں گھنگرُو بندھے ہُوئے تھے۔ جب وُہ میرے دروازے کے سامنے سے گزرا تو میں نے آواز دی :

”ٹھہرو، اِدھر آؤ ذرا!“ مجھے یاد ہے میری آواز میں رعونت بھی تھی اور غصّہ بھی۔

”یہ تم کیا کر رہے تھے؟“

”آٹے کے پیڑے پر دم پڑھ رہا تھا۔“

”کیوں؟“

”مائی ہوراں نے کہا تھا کہ بھینس دُودھ نہیں دیتی۔ میں نے کہا لاؤ آٹے پر دم پڑھ کر اسے کھلا دیں۔“

”اچھا تو تمھارے دم پڑھنے سے بھینس دُودھ دینے لگے گی!“

”اللہ کی مرضی ہوگی تو دودھ دے گی اُس کی مرضی نہ ہوگی تو نہیں دے گی۔“ اس کا فقرہ گویا فل سٹاپ تھا

ی بات ختم۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمبا میلا کچیلا مٹّی رنگا کُرتا، ٹخنوں سے ذرا نیچے تک، جس پر جگہ جگہ ِ ںٹے دھاگے سے رنگا رنگ پیوند لگے ہُوئے تھے۔ ٹانگیں برہنہ، پاؤں جُوتے کے بغیر، سر کے بال ایسے یسے گاؤں کے کچّے راستے کے ساتھ اُگی ہُوئی جھاڑیاں، جن پر گرد کی تہیں جم جاتی ہیں۔ داڑھی بڑھی ہُوئی، ںکھوں میں گیر، دانت گندے، اکثر گر چکے تھے، باقی یُونہی اٹکے ہُوئے معلوم ہوتے تھے، کسی وقت بھی جائیں گے۔

میں نے پُوچھا: "اور تم اپنے دانت کیوں صاف نہیں کرتے؟"

ہ خاموش رہا اور میری طرف یُوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کیسا فضول سوال کیا ہے تم نے!

اس کے کپڑوں سے بہت بدبُو آ رہی تھی، میں نے پُوچھا:

"تم نہائے کب تھے؟"

س نے سوچ کر کہا:

"یہی شور شرابے سے دو تین سال پہلے۔"

مجھے یاد ہے اس نے "شور شرابے" نہیں "رَولے گَولے" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ رَولے گولے سے وتین سال پہلے۔

"رَولا گَولا کیا؟" میں نے پُوچھا

وُہ بولا: "یہی جب کھتری یہاں سے اُدھر گئے تھے اور مسلمان اِدھر آئے تھے۔"

ں نے حساب لگایا تو اس کے آخری غسل کا سال کوئی ۵۴۹۱ء کے لگ بھگ نکلتا تھا۔

"تم کرتے کیا ہو؟"

"بُوٹی پیتا ہُوں"۔

"بُوٹی کیا؟"

س سوال پر اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"بھنگ بُوٹی۔"

"اور رہتے کہاں ہو؟"

"یہ مڑھیاں ہیں نا، جہاں رَولے گَولے سے پہلے ہندو مُردے جلاتے تھے وہاں رہتا ہُوں۔ اب ڑھیاں خالی پڑی ہیں۔"

"کیوں اب مُردے نہیں جلتے وہاں؟"

"نہیں، پچھلے سال ایک مُردہ جلا تھا وہاں۔ مگر اُنھوں نے پُوری لکڑیاں بھی نہیں ڈالیں۔ مردہ آدھا جلا آدھا نہیں جلا۔ وُہ تو چلے گئے مگر دو دن بعد جب کُتّے جمع ہونے لگے تو میں نے کتوروں کو بھگایا اور لکڑیاں جمع کر کے لاش جلا دی۔"

اس آواز میں نہ افسوس تھا، نہ حیرت نہ غصّہ، نہ میری رعونت سے نفرت، نہ کوئی گِلہ نہ شکایت، نہ ڈر نہ خواہش۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور یک لخت مجھے ایک خیال آ گیا۔ میں نے اُسے کمرے میں بُلا کر قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا، اور خود اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ حیرت سے آئینے میں تکتا چلا گیا اور تکتا چلا گیا، خاموش تھا اور آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے چہرے کی طرف دیکھتے ہُوئے آہستہ سے کہا:

"ساڈے تو کسی کام کا ہے نہیں، جس کا ہے اس کے کام کا ہو تو خبر نہیں۔" پھر اس نے آئینے سے نظریں پھیر لیں۔

یہ فقرہ سُن کر میں ٹھٹک گیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پہلی دفعہ اس کی ذات میں دلچسپی لیتے ہوئے اس سے پُوچھا:

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"نام صرف اس کا ہے، میرا نام کیا ہوگا!"

"پھر بھی تمہیں لوگ کس نام سے پکارتے ہیں؟"

"اڑنگے شاہ۔"

"اڑنگے شاہ!" میں نے میز سے اٹھا کر مٹھی بھر سکّے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے "یہ تم لے لو۔"

اس نے مٹھی کھول کر سکّوں کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر مٹھی بند کر کے میری طرف بڑھا دی۔

"یہ تم رکھ لو۔"

"تم کیوں نہیں لیتے؟"

"سائیں! اتنی دولت مَیں کہاں رکھوں گا!"

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا کہ کہیں بیوقوف نہ بنا رہا ہو مگر اس کا چہرہ تو دیوار تھا، آئینہ تھا۔

پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: "اچھا، لاؤ ایک چونّی دے دو، تم بادشاہ آدمی ہو ناراض ہو جاؤ گے۔"

"مگر اس چونّی کا کیا کرو گے؟"

"تمہاری طرف سے بُوٹی میں الائچی گھوٹ لُوں گا۔"

اور یوں اڑنگے شاہ سے دوستی کی ابتدا ہوئی، ایسی دوستی جس پر پچیس سال سے زیادہ کا زمانہ گزرا۔ ہماری بستی کے ویران مرگھٹ میں رہتا، جہاں اس کی ایک کوٹھڑی تھی اور اس کے قریب ہی ایک قبر تھی۔ اکثر کوٹھ میں رہتا لیکن قبر میں اُتر جاتا اور وہیں پڑا رہتا۔ کسی نے اس کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔ دنیا کی کسی چیز کے لیے ا نے کبھی دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ کھانا مل جائے تو کھا لیتا۔ نہ ملے تو کئی دن بغیر کھائے گزار دیتا مگر بوٹی بغیر ایک دن گزارنا اسے موت معلوم ہوتا۔ مگر موت سے اسے کوئی ڈر نہ آتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ زندگی میں کئی د مرچکا تھا۔ شروع شروع کی ہر ملاقات پر میں طرح طرح کے تجربے اس پر کرتا۔

”اڑنگے شاہ! ایک بات بتاؤ، تمہیں کبھی کسی چیز سے ڈر بھی لگتا ہے؟“

”نہیں سائیں! ڈر کس بات کا، ڈر صرف اس کا۔“ پھر وہ قدرے خاموش ہوگیا اور بولا: ”ہاں مگر ا بات ہے سائیں! رات کو جب میں بُوٹی پی کر اکیلا آرام سے آسمان کے نیچے بیٹھا ہوتا ہوں تو کبھی کبھی مجھے ی معلوم ہوتا ہے جیسے دھرتی ماں مجھے دھتکار رہی ہے اور کہتی ہے، 'اُٹھ بدبختا، اٹھا لے اپنا بوجھ یہاں سے بس سائیں بادشاہ! اس وقت مجھے ڈر لگتا ہے۔ پھر میں بڑا روتا ہوں اور کہتا ہوں ماتا! تو تو مجھے دھتکا نہ میں تجھے چھوڑ کر کہاں جاؤں۔“

یہ سُن کر میرے ذہن کا بے ہودہ کمپیوٹر چل پڑا۔ دھرتی ماں، ماتا، ماتا، ماں بالکل ٹھیک ہے۔ میں سوچا پکڑ لیا چور۔ ایک دم سگمنڈ فرائیڈ نے میرے دماغ پر قبضہ جما لیا اور میں نے سوچا بے چارے اڑنگے شا کو تو ”مدر کمپلیکس“ ہے۔ یہ بے چارہ تو ”ایڈی پس“ کا شکار ہے

”اڑنگے شاہ! تمہاری ماں کہاں ہے؟“

”اللہ جانے سائیں! پتا نہیں کہاں ہوگی، بچپن میں اُسے دیکھا تھا، شاید اب تک گزر گئی ہوگی۔“

”مگر اڑنگے شاہ! تم اس سے ملنے کیوں نہیں جاتے؟“

”کہاں ملنے جاؤں بادشاہ، جب دنیا ہی چھوڑ دی تو پھر ناتے رشتے کہاں رہے۔ باپ تو بچپن میں گزر گیا تھا۔ ہماری ماں نے ایک اور جنے کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ میں ماسی کے پاس چلا گیا۔ میں اکیلا بیٹھا رہتا تھا۔ پھر گاؤں کا ایک لڑکا ساتھی بن گیا۔ اس کے ساتھ مل کر بُوٹی کے پتے توڑتے ماسی جاتی تو توے پہ ذرا سا بھونتے اور گڑ میں ملا کر کھا لیتے۔ سارا دن آنند رہتے۔ ماسی نے یہ دیکھا تو س بگے کے پاس نوکر کروا دیا۔

”اچھا تو اڑنگے شاہ! تم نے کبھی باقاعدہ نوکری بھی کی ہے؟“

”نوکری تو صرف مرشد کی کی ہے سائیں! سردار بگا تو سید نہیں تھا۔ میں تو ماسی کے کہنے پر ا ڈیرے پر جا بیٹھا تھا۔ اُس وقت میں واہ وا گبھرو تھا اور سردار بگا پنڈ کا مالک تھا۔ اس کے پاس بھری

بندوق پڑی ہوتی تھی۔ گھوڑا زین ڈالے ہر وقت تیار کھڑا رہتا تھا۔ سفید دوتہی والا پلنگ بچھا ہوتا تھا۔ ہماں شماں تو اس کے سامنے زمین پہ بیٹھتے تھے اور میں اس کا اوپر کا کام کرتا تھا۔"

میں نے اس اڑنگے شاہ کی طرف دیکھا جو اِس وقت میرے سامنے بیٹھا تھا۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچا، مسلسل فاقے سے نڈھال وجود، آرام اور آسائش سے محروم جسم، قد کاٹھ تو اب بھی اچھا تھا مگر سالہا سال تک نشے کی زیادتی اور خوراک کی کمی سے وجود ڈھے گیا تھا۔ میں نے سوچا کیا واقعی یہ شخص کبھی جوان ہُوا ہوگا۔ کیا اس نے بھی گاؤں کی کسی لڑکی کی طرف محبت یا ہوس کی نظر سے دیکھا ہوگا۔ کیا اس کی طبیعت کبھی دنیا داری کے معاملات پر مچلی ہوگی۔

"اڑنگے شاہ! تم سردار بگے کا کیا کام کرتے تھے؟"

"بس یہی گھوڑی باندھ دی، کاٹھی ڈال دی۔ آئے گئے کے لیے حُقّے پر آگ دھر دی۔ شکار پر گئے تو اس کے ساتھ ساتھ۔ شکار اٹھا کر لا دیا یا جب اس نے کہا اس کی بندوق پکڑ لی مگر بادشاہ، اچھا آدمی نہیں تھا سردار بگا!"

"خرابی کیا تھی؟"

"خرابی یہ تھی کہ جو چیز اسے پسند آجاتی وُہ اسے چُرا لیتا یا چھین لیتا۔ کسی کا ڈنگر کُھلوا لیتا، کسی کی عورت اٹھا لیتا۔ تین بیویاں تو گھر میں تھیں مگر یار بھی کمی نہ کرتا تھا۔ ایک دن ایک گاؤں سے گزر رہا تھا کہ ایک مٹیار کو دیکھا جو اپنا چھوٹا سا بال اٹھائے جا رہی تھی، سردار بگے نے بال کو تو وہیں پھینکا اور عورت کو گھوڑی پر ڈال کر ڈیرے پر لے آیا۔ شام کو اس جنی کا گھر والا اس بال کو اٹھا کر سردار کے پاس آیا کہ یا تو میری عورت واپس کر دو یا یہ بال بھی رکھ لو۔ سردار بگے نے اس جنے کو تو ایک دوہتڑ مارا، بچہ اٹھا کر میرے حوالے کیا اور خود اس جنی کو لے کر کوٹھڑی میں چلا گیا۔ سائیں بادشاہ! وُہ بال بیچارہ ساری رات روتا رہا، نہ دودھ پیتا تھا نہ سوتا تھا، میں بھی ساری رات اس کے ساتھ روتا ہی رہا۔ صبح کو میں نے بگے سے کہا: "یہ کام اچھا نہیں کیا تم نے، اس آدمی کی بد دعائیں اور بچے کی ہائیں تم کو لگیں گی، واپس کر دو دونوں کو۔" میری بات سُن کر سردار بگے کو ایسا غصہ چڑھا کہ وُہ اٹھ کر مجھے ہُورا مُکی کرنے لگا اور حد یہ کہ گالی بھی دے دی۔ بس سائیں! پھر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا: "سردار ترے گھر کا پانی بھی مجھ پہ حرام اور باہر آ کر کُرتا گلے سے اتارا اور جھولی کو آگ لگا دی۔"

"جھولی کو کیوں آگ لگا دی؟"

"سائیں! جھولی کی تو ساری خرابی ہوتی ہے نہ جھولی ہوگی نہ کسی کے سامنے پھیلے گی۔ سردار بگے کے ڈیرے سے نکل کر میں نے کہا: بندیا! اب کسی دنیا دار کی نوکری نہ کرنا۔ سوچا کہ کسی بزرگ کی خدمت کروں گا یا کسی فقیر کا غلام ہو جاؤں گا۔ جھولی کو تو آگ لگا دی تھی صرف لنگوٹی میں اس کے گھر سے نکلا۔ پنڈے پر راکھ مل لی

اور لوئی اٹھا کر چل پڑا۔

یہ سب کچھ میرے سوالوں کا جواب اور اڑنگے شاہ کی ذات تک پہنچنے کا راستہ تھا۔ اس پر میرے سوال اور تجربے تو عمر بھر جاری رہے۔ دُنیادار اور درویش کی یہ دوستی ایسی پختہ تھی جیسے رند اور زاہد کی یاری ہو جائے تو پختہ ہوتی ہے۔ شاید ایک کو دوسرے میں اپنی تصویر نظر آتی ہے۔ اڑنگے شاہ نے اِس دوستی سے کیا پایا، مجھے معلوم نہیں لیکن مَیں نے تو اِس دوستی سے زندگی کی ایسی ایسی سطحیں دریافت کیں جن سے شناسائی تو کہاں حاصل ہوتی شاید میری نظر بھی وہاں نہ پڑتی۔

اڑنگے شاہ سردار بگے کے ڈیرے سے دامن جھاڑ کر یوں نکلا جیسے رانجھا تخت ہزارے سے رخصت ہُوا ہوگا۔

"پھر کیا ہُوا اڑنگے شاہ؟"

"ہونا کیا تھا سائیں! نہ کوئی سنگی نہ ساتھی۔ نہ کوئی رستا سامنے تھا۔ نہ کوئی تھاں ٹھکانا۔ نہ یار نہ بیلی۔ الفی پہنی اور چل کھڑا ہوا۔"

"مگر کدھر کو چل پڑے!"

"کدھر جانا تھا بادشاہ! مرشد کی تلاش میں جدھر پاؤں چلتے رہے اُسی طرف چلتا رہا۔ ماجھے کا علاقہ تھا دیکھا کہ شیر جاوّلی مشایخ کے دربار کی ڈاچیاں جا رہی تھیں، میں بھی ان کے ساتھ چل پڑا۔ شام ہوگئی تو میں ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں لوگ ایک نیا چک اُسار رہے تھے۔ کوئی کوٹھا لیپ رہا تھا۔ کوئی ڈنگروں کے پاس منجی ڈال کر بیٹھا تھا۔ ابھی تھمی پورنی تھی لوگ چک باندھنے لگے تھے اور گُڑ بانٹ رہے تھے۔ مجھے دُور سے آتا دیکھ کر سب خوش ہوگئے کہ چلو اچھا ہُوا فقیر آ گیا بھانویں مٹی کا ہووے فقیر تو سید کا نشان ہوتا ہے۔ رات کو چک والوں نے منجی بستر ابھی دیا۔ لُوٹی بھی پلائی اور ٹک بھر بھر کر تمباکو بھی دیا۔

دُوسرے دن چک والوں نے مجھے کہا کہ گاؤں کے فقیر بن جاؤ، یہیں رہو۔ گاؤں کے باہر جو رُکھ کھڑا ہے وہاں سچّی سرکار کا دربار بنا لو، جھاڑو دو، پانی بھرو اور دُھواں کرلو۔" مگر سائیں! میں تو بے مرشدا تھا۔ یہ کام کیسے کرتا۔ جب دل نہ مانا تو میں چل پڑا۔ بس اس وقت سے لے کر اب تک چلتا ہی جا رہا ہُوں۔"

"مگر اڑنگے شاہ! کوئی مرشد ملا کہ نہیں؟"

"مرشد ملا، سائیں بادشاہ! مگر مشکل سے ملا۔ گاؤں والوں نے کہا کہ اب جانا ہے تو بابا شاہ قلندر کے تکیے پر چلے جاؤ، وہاں سائیں کرم شاہ قلندر بیٹھا ہے، بڑا جلالی فقیر ہے، گالیاں بھی دے گا، مارے گا بھی اور چاہے گا تو لنگوٹی بھی لیراں لیراں کر دے گا۔ میں ڈر گیا سائیں! اُدھر گیا ہی نہیں۔"

"تو پھر مرشد کیسے ملا؟"

"مرشد الٰہ نے ملا دیا۔ میں چلتے چلاتے سائیں گھگھری شاہ کے دربار میں پہنچ گیا اور اُسی دربار کا خادم ہوگیا۔ بڑے مرشد تھے سرکار، گھگھری پہنتے تھے اور آئے گئے سے چاہے وُہ عورت ہو کہ مرد، ایک ہی بات پُوچھتے بتاؤ میں جنی ہُوں کہ جنا؟ دربار کی جگہ صاف سُتھری تھی، مگر کنواں بند تھا، صرف ڈال کھڑی تھی۔ حکم ہُوا کہ جھاڑو دو، چکی پیسو، تنور تاؤ، پانی بھرو، کھُوہ گیڑو اور آئے گئے کی خدمت کرو۔ میں سات سال تک اس دربار کا خادم رہا اور اگر مرشد پردہ نہ کر جاتے تو آج بھی ان کی خدمت میں وہیں ہوتا۔"

"مرشد نے پردہ کیسے کیا؟" میں نے دریافت کیا

"سائیں! ایک رات مجھے خواب آیا کہ کہیں آسمانوں پر ایک بڑا عالی شان روضہ ہے، چاندی کے دروازے، سونے کے کیل لگے ہُوئے، چاندی کی دہلیزیں اور چاروں طرف غوثی، قطبی، اولیائی سب کسی کا انتظار کر رہے ہیں صبح اُٹھ کر میں نے مرشد کو اپنا خواب سنایا۔ مرشد بولے، ہمیں معلوم ہے۔ اور خاموش ہوگئے۔ گھگھری شاہ سچا پیر تھا۔ اُسی روز بیٹھے بیٹھے میرے سامنے آہستہ آہستہ زمین میں گم ہوگیا۔ جاتے جاتے آواز آئی، اڑنگے شاہ! ہماری ڈھیری یہیں بنا دینا اور اس کے بعد تم یہاں سے چلے جانا۔ میں رونے لگا۔ گاؤں کے لوگ اکٹھے ہوگئے۔ زمیندار کا مال مرجاتا تھا اس نے کہا، سائیں گھگھری شاہ کی ڈھیری وُہ بنائے گا۔ زمیندار نے ڈھیری بنا دی تو کھیتی بھی ٹھیک ہوگئی اور مال بھی بچ گیا۔ میں نے مرشد کا حکم مانا اور ڈھیری کو سلام کر کے چل پڑا۔

یہاں پہنچ کر اڑنگے شاہ کا حافظہ گڑبڑا جاتا تھا۔ ایک تو اسے یہی یاد نہیں تھا کہ گھگھری شاہ کی ڈھیری سے چلے اسے کتنے سال ہوگئے تھے اور یہ بھی یاد نہ تھا کہ سارا زمانہ کہاں کہاں گزرا۔ ٹوٹی ٹوٹی تصویریں ذہن میں آتی تھیں۔ اِس سارے زمانے کو وہ سفر کہتا تھا۔ مختلف درگاہیں، مزار، دربار، مگر سلسلہ وار نہیں۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ لگتا یُوں تھا کہ مرشد کی ڈھیری سے رخصت ہونے کے بعد اس کے غم اور بُوٹی کے استعمال دونوں میں اضافہ ہُوا تھا "سائیں! ایک دفعہ ایک درویش اور میں ایک ایسے علاقے سے گزرے جہاں چاروں طرف بُوٹی ہی بُوٹی اگی ہُوئی تھی۔ ہم نے سوچا ایک دو دن رک جاتے ہیں مگر بُوٹی نے پاؤں پکڑ لیے۔ کئی دفعہ یُوں ہوتا کہ گھوٹنے کی بھی ہمت نہ ہوتی۔ ہم پڑے پڑے ہاتھ بڑھا کر بُوٹی اتارتے اور پتوں کو دونوں ہاتھوں کی تلیوں میں مل کر کھا لیتے اوپر سے پانی پی کر پڑے رہتے۔ گاؤں والے کھانے پینے کی کوئی چیز رکھ جاتے تو کھا لیتے ورنہ کھانے کی ہوش کہاں تھی! کچھ معلوم نہیں بادشاہ! اس درخت کے نیچے کتنا وقت گزر گیا!"

اڑنگے شاہ کا یہ سفرنامہ بالآخر مرگھٹ پر ختم ہُوا جہاں اس نے قیام کیا اور جہاں اس کی کوٹھڑی اور قبر ایک دوسرے سے چند قدم کے فاصلے پر آباد ہوگئیں۔ یُوں تو وہ اب بھی سفر میں رہتا تھا۔ دُور دُور کے میلے اور عرس اسے کھینچ بلاتے مگر کچھ عرصے بعد اس کی قبر اور کٹیا اسے واپس لے آتیں۔ اتوار کی چھٹی اور ہم دونوں کی ملاقات لازم و ملزوم ہوگئے تھے بلکہ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ اسے اتوار کا دن یاد کیسے رہتا ہوگا۔ وہ دور دراز کے

کسی عرس سے واپس آیا تھا اور مجھے دھمال کے قصے سُنا رہا تھا۔ میں نے ایک دم پُوچھ لیا "اڑنگے شاہ! تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔" اس غیر متوقع سوال پر وہ ٹھٹک گیا اور بولا:

"شادی تو گھر والوں کی ہوتی ہے سائیں! اور فقیر کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔"

پھر سوچ میں پڑ گیا، یُوں جیسے وہ اپنے جواب سے مطمئن نہ ہو۔ میں نے پوچھا:

"کیا سوچ رہے ہو؟"

بولا: "بادشاہ! اب تو میں دُور دُور کے میلوں اور عرسوں پر چلا جاتا ہُوں، نہ بس والا پیسے مانگتا ہے نہ ریل والا ٹکٹ مانگتا ہے۔ اگر زنانہ ساتھ ہو گیا تو اس کا ٹکٹ کہاں سے بھروں گا!"

اڑنگے شاہ مجھے جنوں اور پریوں کے عجیب و غریب قصے سناتا، اس کا نظام اعتقادات ایک ایسے شیش محل کی طرح تھا کہ اس میں گھس جاؤ تو باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ ایک روز ملنے آیا تو بہت تھکا ہُوا تھا۔ میں نے پُوچھا "کیا ہوا؟" بولا: "گئو ماتا گزر گئی تھی اس کو دفن کرنے میں لگا رہا۔" میں اس کی اِس نئی مصیبت سے واقف تھا۔ ہُوا یُوں کہ ایک بوڑھی مریل سی گائے کا مالک اسے بُوچڑ خانے لے جا رہا تھا کہ راستے میں اڑنگے شاہ سے ملاقات ہو گئی۔ اڑنگے شاہ نے ایسی باتیں کیں کہ مالک کا دل پسیج گیا۔ اس نے گائے اڑنگے شاہ کے حوالے کر کے خود گاؤں کی راہ لی۔ دُودھ تو وہ دیتی نہیں تھی البتہ اڑنگے شاہ کی زندگی حرام ہو گئی۔ وُہ دور دُور سے چارہ مانگ کر لاتا اور گائے کی سیوا کرتا۔ پھر گئو مر گئی اڑنگے شاہ نے درویشوں کے ساتھ مل کر دو دن کی مسلسل محنت کے بعد گڑھا کھود کر گائے کو دفن کیا اور ڈھیری پر چادر ڈال کے پاس کالے کپڑے کا نشان کھڑا کر دیا۔ میں نے پوچھا:

"اڑنگے شاہ! یہ کیوں؟"

بولا: "سائیں! ہماری دھرتی اُسی کے سینگوں پر تو کھڑی ہے۔ ہم اس کی سیوا نہ کریں گے تو کون کرے گا!"

باتیں کرتے کرتے بجلی کا پنکھا بند ہو گیا۔ میں نے کہا:

"اڑنگے شاہ! یہ بجلی کہاں سے آتی ہے؟"

اس نے میری طرف یُوں دیکھا جیسے یہ جاننا چاہتا ہے کہ میں اس کے جواب کا اہل بھی ہُوں یا نہیں۔ پھر اس نے رازداری کے لہجے میں آہستہ سے کہا:

"سائیں! بجلی ایک جن ہے۔"

"جن تو ہے مگر کہاں ہے؟"

"سلیمان بادشاہ کے کنوئیں میں!"

"وہاں کیسے؟"

"سلیمان بادشاہ کا ایک بہت بڑا کنواں ہوتا تھا۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ سورج سوا نیزے پر آ گیا اور عین اس کنویں کے اوپر اس کا لشکارا پڑا۔ بس پھر کیا تھا سلیمان بادشاہ نے اپنے جنات کی مدد سے کنویں پہ پتھر رکھ کر اسے قید کر لیا۔ اب یہ مستری لوگ لمبی لمبی تاریں لے جا کر اس کنویں میں ڈال دیتے ہیں۔ سائیں! یہ بجلی سلیمان بادشاہ کا جن ہے۔"

اڑنگے شاہ سے دوستی کے دن یونہی گزر رہے تھے کہ ایک دن میں نے اتفاق سے ایک عجیب و غریب نظارہ دیکھ لیا۔ آگے آگے تین چار ڈھول تھے جو پوری گرما گرمی کے ساتھ بج رہے تھے۔ ان کے پیچھے نوجوانوں کی ایک ٹولی تھی۔ یہ لوگ فرطِ مسرت کے عالم میں دھمال ڈال رہے تھے۔ ان کے جسم پسینے میں شرابور اور چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ اس گروہ کے پیچھے ایک سفید گھوڑا تھا جس پر اڑنگے شاہ بیٹھا تھا۔ گھوڑے کے اردگرد لوگوں کا ایک گروہ تھا جو ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ اڑنگے شاہ نے سبز رنگ کا صاف ستھرا لباس پہن رکھا تھا۔ سر گھٹا ہوا تھا۔ حجام نے سر پر بالوں کی ایک لمبی سی لٹ چھوڑ دی تھی جسے پنجابی میں بودی کہتے ہیں اڑنگے شاہ کے بازوؤں میں ایک نوعمر بچہ تھا اسے بھی سبز کُرتا پہنا دیا گیا تھا۔

میں نے موٹر سڑک کے ایک طرف روک لی اور اِس جلوس کو دیکھنے لگا۔ میں نے گاڑی بند کی اور جلوس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ مجمع اڑنگے شاہ کی کوٹھری اور قبر تک پہنچا جسے روشنیوں نے منور کیا ہوا تھا اور نائی چولھوں پر دیگیں پکانے میں مصروف تھے۔ میں نے دور سے یہ نظارہ دیکھا اور بغیر اڑنگے شاہ کے سامنے آئے واپس ہوا۔ سوچتا رہا مگر اِس سارے ہنگامے کا مطلب میری سمجھ میں بالکل نہ آسکا۔

دو روز بعد اڑنگے شاہ ملنے آیا تو معلوم ہوا کہ یہ سب جلسہ جلوس دراصل چودھری مکھن اور اس کے گاؤں والوں کا اظہارِ تشکر تھا۔ ہوا یوں کہ آج سے دو برس پہلے مضافات کے ایک گاؤں سے اڑنگے شاہ کا گزر ہوا۔ گاؤں کے کتے ایک اجنبی فقیر کو دیکھ کر بھونکنے لگے۔ اڑنگے شاہ اپنے راستوں پر چلتا رہا اور کتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ خطرے کا یہ منظر دیکھ کر چودھری مکھن کو اڑنگے شاہ کی مدد کو آنا پڑا۔ اس نے کتوں کو بھگا دیا تو اڑنگے شاہ کی زبان سے اس کے لیے دعا نکلی "جا بھلے لوک! خدا تمہیں پُتر دے گا"۔ مکھن نے عقیدت سے اڑنگے شاہ کے پاؤں پکڑ لیے کہ اب فقیر کے بابرکت پاؤں اس کے گھر سے ہو کر جائیں۔ چودھری مکھن کی درجنوں بھینسیں تھیں جن کا دودھ ہر روز ریڑھوں پر شہر جاتا تھا۔ بیٹے کی امید میں خدا نے ایک کے بعد ایک، سات بیٹیاں دے دی تھیں اور ہر بیٹی کی ولادت کے بعد بیٹے کی خواہش شدید تر ہوتی چلی گئی تھی۔

اڑنگے شاہ نے چودھری مکھن کی حویلی کا رُخ کیا۔ اس کے پاؤں جوتے سے بے نیاز تھے مگر ٹخنوں سے اوپر گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔ اِس بکھرتی ہوئی موسیقی کے ساتھ وہ گلی سے گزرا تو گلی کی عورتیں کام کاج چھوڑ کر اس کے پیچھے چلنے لگیں۔ اڑنگے شاہ نے مکھن کے صحن میں جا کر دھمال ڈالی اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر اس گھر کے

وارث کے لیے دُعا مانگی اور رخصت ہُوا رَستے جوگی اور چلتے فقیر کا کیا ٹھکانا۔ اڑنگے شاہ گاؤں سے رخصت ہو کر خدا جانے کس طرف نکل گیا۔

دو تین برس بعد جب پھر اڑنگے شاہ کا گزر اس گاؤں سے ہُوا تو فرطِ عقیدت سے سارے گاؤں نے اسے گھیر لیا کہ اِس دوران میں مکھن کے گھر کا چراغ روشن ہو چکا تھا اور گاؤں والے تو گویا انتظار کر رہے تھے کہ کب فقیر کا گزر ادھر سے ہو اور وہ قبولِ دُعا کا جشن منائیں۔

اڑنگے شاہ ہمیشہ زمین پر بیٹھتا تھا مگر اب اسے پلنگ پر بٹھا کر سارا گاؤں اس کے اردگرد زمین پر بیٹھ گیا۔ ایک ایک کر کے عورتیں، مرد اور بچے اس کے سامنے آتے، سلام کرتے اور دُعا لے کر بیٹھ جاتے۔ چودھری مکھن نے حکم دیا کہ اڑنگے شاہ کے لیے نیا لباس تیار کیا جائے۔ حجام بلا کر اس کا سر گھٹایا گیا البتہ اڑنگے شاہ کے اصرار پر ایک لمبی فقیرانہ لٹ سر پر چھوڑ دی گئی۔ پھر فیصلہ ہُوا کہ اسے پہلے دودھ سے اور پھر پانی سے غسل دیا جائے گا۔ ابھی تک تو اڑنگے شاہ گاؤں والوں کی بات مانتا رہا لیکن غسل والی بات پر آ کر اس نے انکار کر دیا۔ سمجھوتہ یہ ہُوا کہ صرف دائیں گھٹنے کو غسل دے دیا جائے۔ جب یہ جشن ہو چکا تو چودھری مکھن اور اس کے ساتھی اڑنگے شاہ کو سفید گھوڑے پر بٹھا کر ڈھول کی تھاپ اور بھنگڑے کی چاپ کے ساتھ اس کے ڈیرے تک چھوڑنے آئے۔

میں نے یہ واقعہ بہت دلچسپی سے سُنا۔ اڑنگے شاہ کی شکل، حلیہ اور لباس تبدیل ہو چکے تھے۔ مگر اس وقت تو مجھے خیال ہی نہ آیا کہ یہ واقعہ اڑنگے شاہ کی زندگی کو اس حد تک تبدیل کر دے گا۔ اس کے اثرات آہستہ آہستہ نمودار ہُوئے۔ چودھری مکھن کو یہ گوارا نہ تھا کہ اڑنگے شاہ بغیر منجی بستر کے رہے۔ اڑنگے شاہ نے پلنگ لینے سے انکار کر دیا کہ پلنگ پر سونے سے فقیری جاتی رہتی ہے مگر چودھری مکھن دوتہی اور کھیس ڈیرے پر چھوڑ گیا۔ اڑنگے شاہ قبر میں اتر کر لیٹنے لگتا تو مکھن نیچے کھیس بچھا دیتا۔ اڑنگے شاہ کھیس اٹھا کر باہر پھینک دیتا۔

شام کو مکھن گھر کا پکا ہُوا کھانا لے کر اڑنگے شاہ کے ڈیرے پر پہنچ جاتا۔ بُوٹی خود اپنے ہاتھ سے گھوٹتا۔ کبھی کبھی بھنگ کے ساتھ بادام بھی گھوٹ دیتا۔ دُھواں کرتا، چلمیں بھرتا اور دُور دور کے علاقوں سے فقیروں اور درویشوں کو پکڑ پکڑ کر اڑنگے شاہ کے ڈیرے پر لاتا کہ آؤ ایک سچے فقیر کی زیارت کرو۔ اڑنگے شاہ بیچارہ مجبوری کے ہاتھوں صدرِ محفل بنا خاموش بیٹھا رہتا اور مکھن کی طرف دیکھ کر کہتا "بھلے لوک! فقیروں کی خدمت کرو۔ کر سیوا، کھا میوہ"۔ مکھن پیالے بھر بھر کر ان کو تھماتا رہتا۔ اڑنگے شاہ کی جان پر ایک عذاب تھوڑے سے تھا۔ مکھن کے گاؤں میں کوئی مصیبت پڑتی، کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا تو اس کا بوجھ اڑنگے شاہ پر پڑتا۔ اب کے بارش بالکل نہیں ہُوئی، فصلیں خراب ہو رہی ہیں۔ کسی کو تھانے والے پکڑ کر لے گئے ہیں۔ کسی کی بیٹی خاوند کے گھر میں آباد نہیں ہو رہی۔ کسی کا بیٹا لاپتا ہو گیا ہے۔ کوئی بیمار پڑا ہُوا ہے اور بے اولاد عورتوں کا تو ایسا تانتا بندھا رہتا تھا کہ ختم ہونے میں نہ آتا۔ اڑنگے شاہ بیچارہ دعائیں کرتے کرتے تھک جاتا۔

لیکن آخر میں جو مصیبت آئی اس کا تو اندازہ بھی کسی کو نہ تھا۔ علاقے میں گل گھوٹو کی بیماری پڑی اور پہلے ہی حملے میں چودھری مکھن کی چار بھینسیں یُوں زمین پر گریں جیسے شکاری کے ایک کارتوس سے چار مرغابیاں زمین پر آ رہی ہیں۔ مکھن دوڑا ہُوا اڑنگے شاہ کے پاس آیا "دعا کرو شاہ جی! میرے لیے دُعا کرو، مال پر مصیبت آ گئی ہے۔"

اگلے روز دو اور ڈنگر مر گئے۔ اڑنگے شاہ نے گھبرا کر اپنے دُھونیں سے راکھ کی چُٹکی اٹھائی۔ آسمان کی طرف منہ کر کے دعا مانگی اور راکھ چودھری مکھن کو دے دی "جاؤ اللہ کا نام لے کر ڈنگر کو دے دو۔" وہ بھینس بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔

دودھ لے کر جانے والے ریڑھے بیکار کھڑے تھے اور چودھری مکھن دیکھتے ہی دیکھتے امیر سے فقیر اور چودھری سے نمانا ہو گیا تھا۔ وہ کٹی پتنگ کی طرح گاؤں کی گلیوں میں پھرتا۔ گھر میں خاک اُڑنے لگی تو وہ اڑنگے شاہ کی چوکھٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اڑنگے شاہ کی طرف دیکھتا اور التجا آمیز لہجے میں کہتا:

"سائیں جی! میرے لیے دُعا کرو۔"

یہ فقرہ اڑنگے شاہ کے سینے پر تیر کی طرح لگتا اور وہ اس تیر سے بچنے کے لیے مکھن سے نظریں چرانے لگا۔

اڑنگے شاہ روز بروز اداس ہوتا جا رہا تھا اس کے ڈیرے پر درویشوں کا جمگھٹ ختم ہو گیا۔ کھانا پینا تو ایک طرف بُوٹی کی کمی بھی محسوس ہونے لگی مگر چودھری مکھن کی عقیدت اور خدمت گزاری میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک روز اڑنگے شاہ مجھ سے ملنے آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"سائیں بادشاہ!" اس نے درد بھری آواز میں مجھ سے کہا "بھلے لوک کا کچھ کرو۔"

وہ احباب کو ان کے دنیاوی ناموں سے نہ پکارتا تھا۔ خود اڑنگے شاہ تھا، میں سائیں بادشاہ تھا اور چودھری مکھن بھلا لوک تھا۔

میں نے پُوچھا:

"تم ہی بتاؤ اڑنگے شاہ! اب بھلے لوک کا کیا کریں!"

اڑنگے شاہ رو پڑا "سائیں! وہ لاکھوں کا تھا اب راکھ ہو گیا ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں۔ اس کے گھر میں جوان بیٹیاں بیٹھی ہیں، شادیاں کیسے ہوں، گھر میں تو کھانے کو کچھ نہیں رہا۔ بودی شاہ تو اب مدرسے بھی نہیں جاتا۔"

"بودی شاہ کون؟" میں نے پُوچھا

"مکھن کا بیٹا، سائیں! میرے کہنے پر اس کا نام بودی شاہ رکھا گیا تھا۔ کھانے کو روٹی نہیں، مدرسے کا خرچہ کون اٹھاتے گا۔"

کچھ دنوں بعد مکھن مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے کہا: ”چودھری مکھن! ڈھور ڈنگر تو گیا اب کچھ اور کام شروع کرنا چاہیے۔ جب تک میں تمہارے لیے کسی کام کا بندوبست کروں تم دہاڑی کرلو، گھر کا خرچ تو چلتا رہے۔“

مکھن نے کہا: ”بادشاہ! میرے اُوپر ایک مہربانی کردو، صرف ایک مہربانی!“

”میں تمہاری ہر خدمت کرنے کو تیار ہُوں مکھن! تم حکم تو دو۔“

”تو پھر اڑنگے شاہ سے کہو میرے حق میں دُعا کردے۔ اس کے پاس سب کچھ ہے، سب کچھ ہے مگر وہ میرے لیے دعا نہیں کرتا۔“

”کیا باتیں کرتے ہو، میں نے تو اس کو گڑگڑا کر تمہارے لیے دعائیں کرتے دیکھا ہے۔“

’نہیں بادشاہ! وہ دل سے دُعا نہیں کرتا، ایک دفعہ دل سے دعا کردے تو رحمت کے دروازے کھُل جائیں۔‘

”چودھری مکھن! کیا واقعی تمہیں اس بات کا یقین ہے؟“

”یقین کیسا، سائیں بادشاہ! میرا تو ایمان ہے اس نے تو کئی جن قابو کر رکھے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے جنوں کو اس کے پاس آتے جاتے۔“

”کیا باتیں کرتے ہو مکھن! بے چارے اڑنگے شاہ کے پاس کہاں سے آئے جن؟“

”نہ سائیں! اِس خیال میں نہ رہنا، اس کا نام اڑنگے شاہ تو پڑا ہی اس لیے تھا۔“

”کس لیے؟ کس لیے پڑا تھا یہ نام؟“

”وُہ بڑے سے بڑے جن کو اڑنگا دے کر اپنے قابو میں کرلیتا ہے۔“

”دیکھو سائیں بادشاہ! تمہاری بات اڑنگے شاہ کبھی نہیں ٹال سکتا۔ خدا کے لیے اس سے کہو کہ میرے لیے دعا کرے۔“

میں نے صورتِ حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مکھن سے کہا، چلو ابھی چلتے ہیں اس کے ڈیرے پر۔

ہم تینوں ایک مثلث تھے، اڑنگے شاہ، بھلا لوک اور سائیں بادشاہ۔ میں اِس مثلث کا کمزور ترین زاویہ تھا کہ اڑنگے شاہ کی بےبسی اور بھلے لوک کا ایمان دونوں مجھ پر عیاں تھے اور صورتِ حال کی مجبوری میرا مقدر تھی۔ میں اور مکھن اڑنگے شاہ کے ڈیرے پر پہنچے۔ چاند کی ابتدائی تاریخ تھی۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ ڈیرہ ویران پڑا تھا۔ کوٹھری میں ایک ٹمٹماتا ہُوا دیا جل رہا تھا مگر کوٹھری خالی تھی۔ اندھیرے میں مَیں نے سنا کہ قبر میں سے بلک بلک کر رونے کی آواز آرہی تھی۔ قبر کے اندھیرے میں اڑنگے شاہ سجدے میں پڑا ہُوا تھا اور بچّوں کی طرح بلبلا بلبلا کر رو رہا تھا۔ ہم کچھ عرصہ کھڑے یہ دل چھیدنے والا گریہ سُنتے رہے پیشتر اس کے کہ ہم پر رِقّت طاری ہو جاتی، میں نے اسے آواز دی وہ باہر آگیا۔

"کیا کر رہے تھے اڑنگے شاہ؟"

"بھلے لوک کے لیے دُعا مانگ رہا تھا سائیں!"

میں نے مکھن کی طرف دیکھا۔ مکھن نے آنکھ چُرا کر نظریں جُھکا لیں۔

یہ حالات تھے کہ مجھے پیرس کی سار بون یونیورسٹی سے بلاوا آگیا۔ وہاں دو سال کے لیے جنوبی ایشیا کے ثقافتی ورثے پر کام کرنے اور پڑھانے کے لیے ایک آسامی خالی تھی۔ خط ملا کہ تمہاری عرضی منظور ہو گئی ہے مہینے بھر میں پہنچ جاؤ۔ میں عارضی طور پر کام کاج سمیٹ کر بھاگا۔ بیوی نے کہا وہ بچّوں کی تعلیم کی وجہ سے یہیں رہے گی چھٹیوں میں سب لوگ پیرس آجائیں گے۔

میں پیرس چلا گیا۔ پیرس پہنچ کر پاکستان یادوں کے قریب اور نظروں سے بہت دُور ہو گیا۔ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ بیوی سے ٹیلیفون پر بات ہو جاتی سب کی خیریت معلوم کر لیتا۔

اس روز ٹیلی فون کی لائین ایسی صاف تھی جیسے ٹیلی کوم پر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بات ہو رہی ہو۔ بیوی نے کہا:

"اور ہاں سُنو تمہارے دوست کا انتقال ہو گیا۔"

میرا دل بیٹھ گیا۔ جلدی سے میں نے کہا: "نام تو لو، کس دوست کا؟"

"اڑنگے شاہ کا۔"

"انّا للہ، مگر کیسے، ٹی بی سے؟"

"نہیں، ویگن کے حادثے میں۔ وہ نہر کے کنارے سے بُوٹی جمع کر کے لا رہا تھا۔ قریب سے ایک ویگن گزری جس کا دروازہ کُھلا ہُوا تھا۔ دروازہ اس کے سر پہ لگا۔ وہیں گرا اور ختم ہو گیا ہے۔"

"یہ کب ہُوا؟"

"پچھلے ہفتے، اور ہاں سُنو، مکھن تم سے ملنے آیا تھا اور کہتا تھا کہ پولیس والا اسے مجبور کر رہا ہے کہ وہ جھُوٹی گواہی دے ویگن والے کے حق میں اور یہ کہے کہ اڑنگے شاہ ویگن میں بیٹھنے لگا تھا کہ گر کر مر گیا۔"

"کیا مکھن وہاں موجود تھا؟"

"نہیں، بالکل نہیں، حادثے کے وقت اڑنگے شاہ اکیلا تھا۔"

"تو مکھن کو میری طرف سے کہنا جھُوٹی گواہی نہ دے اڑنگے شاہ کی رُوح کو تکلیف ہو گی۔"

پیرس میں ہر طرف برف پڑی ہُوئی تھی۔ درختوں پر ایک پتّہ نہ تھا۔ کھڑکی سے دور تک سوائے برف کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میں اکیلا اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ شام کی تنہائی پہلے ہی تکلیف دہ تھی۔ اب تو اُداسی دل تک اُتر گئی۔ میرا خیال تھا اس کی موت ٹی بی سے ہو گی مگر اڑنگے شاہ نے تو اپنی موت ک

انتظار ہی نہ کیا اور حادثے کی نذر ہو گیا۔

میں دو برس بعد پیرس سے واپس آیا پہلی شام اڑنگے شاہ کے ڈیرے پر گیا۔ وہ اپنی قبر میں دفن ہو چکا تھا۔ جمعرات کی شام تھی۔ کچھ عورتیں دیے جلا جلا کر قبر کے چاروں طرف رکھ رہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی اور نیاز کے چاول بچوں میں تقسیم کر رہی تھی برسوں کے بعد خدا نے اسے پوتے کی شکل دکھائی تھی۔

پرلی طرف کچھ درویش دائرہ کیے بیٹھے تھے اور بوٹی گھوٹ رہے تھے۔ ان میں سے ایک جذبے میں آ کر اٹھا اور حق حق کرتا ہوا قبر کے چاروں طرف دھمال ڈالنے لگا۔ قبر کی پائنتی ایک آدمی کالی پگڑی باندھے دوزانو بیٹھا تھا۔ میں نے پہچان لیا۔ مکھن تھا۔ وہ اٹھ کر میرے گلے لگ گیا اور رونے لگا۔ میں نے کہا، "مکھن! تم تو ایک دم بوڑھے ہو گئے یار!"

"بزرگ کی جدائی مار گئی سائیں! ایک دن مجھ سے کہا بھلے لوک! اب ہمارا وقت ختم ہونے والا ہے اور اگلے ہی روز پردہ کر لیا۔"

"مگر تمہارے حالات اب کیسے ہیں، گھر والوں کا کیا حال ہے؟"

"وہی ہوا سائیں! جو میں کہتا تھا۔ فقیر مرتے مرتے دعا دے گیا مگر مجھے نہیں، بودی شاہ کو۔ بودی شاہ پر اللہ کا فضل ہو گیا اب اس کا اپنا ڈیری فارم ہے اور اس کی بھینسوں کا دودھ ریڑھے پر نہیں پک اپ پر شہر جاتا ہے۔ لڑکیوں کی شادی کر دی ہے۔ باغ بہار ہو گئی سائیں، باغ بہار ہو گئی۔ سب فقیر کی کرامات ہے۔"

"اور مکھن! تم خود کیا کرتے ہو؟"

"میں تو یہیں ڈھیری کے پاؤں میں بیٹھا ہوں۔ کوٹھری میں رہتا ہوں۔ ڈیرے کی صفائی کرتا ہوں دُھواں کر دیا ہے۔ آئے گئے درویشوں کی سیوا کرتا ہوں، روٹی پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔ مزار کی خدمت کرتا ہوں۔"

"گھر نہیں جاتے مکھن؟"

"کیسے جاؤں سائیں! مرشد نے پردہ کرنے سے پہلے جانے کا حکم جو نہیں دیا تھا۔ فقیر کی قبر زندہ ہے سائیں، اسے چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں۔ اب تو حیاتی اسی ڈھیری کے قدموں میں گزرے گی۔"

پھر مکھن نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، "سائیں بادشاہ! بیٹھ جاؤ، تھوڑا سا تبرک تو چکھ لو۔" اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں اڑنگے شاہ کے مزار پر سائیں مکھن شاہ کے سامنے کھڑا ہوں۔

خدوخال

آغا بابر

انگنائی نہ آنگن ۔ بڑا صحن کہئے یا صحنِ فراخ ۔ بھٹّے میں خوب پکی ہوئی چھوٹی چھوٹی بادام رنگ کی نانک ش اینٹوں سے بنا ہُوا دُھلا دُھلایا صاف سُتھرا چوڑا پھیلا ہُوا فرش صاف کرتے وقت یا پانی سے سونتتے بھنگن ک ضرور دُکھنے لگتی ہوگی مگر وُہ تو صرف ایک روپیہ مہینہ اور روز کی روٹی لیتی تھی ۔

جب اِس صحن میں سُورج کا اُجالا پھیلنے لگتا تو بادام رنگ اینٹوں کا رنگ ایک دم گیروا دکھائی دیتا اور ا ایک اپنی قسم کی چمک آجاتی ۔ اُس صحن کے چاروں طرف دالان اور کوٹھڑیاں تھیں جن کے روشندان باہر کو کھلتے ۔ دو کوٹھڑیوں میں اندھیرا رہتا کہ روشندانوں کے آگے باہر کے رُخ مکان کھڑے ہو گئے تھے ۔ مگر یہ کوٹھڑیاں گر کی دوپہریوں میں بڑی ٹھنڈی رہتیں اور رمضان کے مہینے میں برف خانہ کا مزا دیتیں ۔

اِس حویلی میں افطاری کا اہتمام کس سلیقے سے ہوتا ۔ فالسے کا شربت ۔ لیموں کی تازہ سکنجبین جس کی بوتل گھر میں بنالیتیں ۔ پیتے وقت گاچنی کی صراحیوں اور کورے گھڑوں کا ٹھنڈا پانی ڈالا جاتا ۔ میٹھے کا نرم گداز حلوہ ۔ کی چکور ٹکڑیاں ، مونٹھ کی نمکین دال ۔ کڑاہی میں سے گرم گرم پھلکیاں نکلتیں ۔ دہی میں کابل کا خوشبودار زیرہ کا رُخ صحن میں سے گزرتے باورچی خانہ کی طرف کا اگر ہو جائے بھننے بھگارنے اور تلنے کی خوشبوؤں سے سار روزہ دار کی دُور ہو جائے ۔

صحن کے جنوب کی سمت سامنے کے رُخ جو برآمدہ تھا اُس میں ہمیشہ سے ایک تخت اور آبنوس کی آرام کرسیاں بچھی دکھائی دیتی تھیں ۔ تخت پر اُس کے برابر کا شیرازی غالیچہ بچھا ہُوا اور اس پر بڑا پاندان رکھا دیتا ۔ اِس برآمدے کے پیچھے کے بڑے دالان کے دونوں کواڑوں پر پیتل کے نقش و نگار بنے تھے ۔ پچھ طرف کو ایک ایک کوٹھڑی تھی ۔ دالان میں جو چھپر کھٹ تھی اُس کے چاندی کے بنے ہُوئے موٹے موٹے پا برآمدے کے رُخ ایک اور جہازی پلنگ بچھا رہتا جس کے فیل پائے بھی چاندی کے تھے ۔ اِس حویلی میں دا کے لیے تین قدمچوں کے ایک چبوترے پر سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا ۔ چبوترے سے ہو کر گزرتے تو دائیں ہاتھ کنو ڈول لٹکتا دکھائی دیتا ۔ یہ کنواں اِس حویلی سے منسلک تھا ۔ جب یہ حویلی تعمیر ہُوئی تھی تو اِس کنویں سے بھر بھر کر سقہ حویلی والوں کو پانی مہیا کرتا تھا ۔

حویلی میں داخل ہوتے ہی لمبے چوڑے صحن کی گرانبار وسعت نووارد کی آنکھوں میں کشادگی پیدا

اور ملازم اُسے سیدھے ہاتھ کے رُخ بیٹھک میں جا بٹھاتا جو مردانہ تھا۔ اِس مردانہ بیٹھک کی دیواریں چُونا گچ تھیں اور چھت پر کاشی کاری کے علاوہ چھوٹے چھوٹے آئینوں کے ٹکڑوں کی خوشنما جڑت کی گئی تھی۔ چُوڑی دار پائجامے والی ملازمہ اپنے کندھے دوپٹّے سے ڈھک کر ہاتھ میں خاصدان لیے داخل ہوتی آداب کہہ کر گلوریاں مہمان کے سامنے رکھ دیتی۔ وُہ ملازم جو مہمان کو بیٹھک میں بٹھا کر چلا گیا تھا پیچوان لیے داخل ہوتا اور مہمان کے قریب رکھ دیتا۔

یہ حویلی ۱۸۹۰ء میں میاں عطا محی الدین کے والد غلام محی الدین نے تعمیر کرائی تھی۔ میاں عطا محی الدین کے بھائی گلباغ محی الدین ۱۹۲۱ میں فوت ہو گئے۔ ان کا بیٹا شوق محی الدین رہا جس نے واللہ اعلم کس محمل نگیں کی تلاش میں شوقِ صحرا نوردی کو اپنا مقدّر بنایا کہ کبھی دل کی بات لب پر نہ لایا۔ شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا۔

اِس حویلی میں رہنے والے کتنے میٹھے لوگ تھے۔ قصّہ دل کوئی کہنے کی چیز نہیں ہوتی اور دردِ دل چُھپانا اچّھا۔ دل میں لاکھ کانٹا چُبھتا زبان سے مٹھاس نہ جاتی۔ نگاہ اُٹھتی گھائل ہوتے۔ نگاہ زیادہ جھک جاتی۔ محبّت کا طوفان جس حیرت سے اُٹھتا یہ اُسی حیرت سے پی جاتے۔ یہ لوگ کتنے حوصلے والے تھے۔ نہ غزل کہتے نہ سراپا لکھتے نہ قصیدہ۔ حُسنِ کلام کی دستاویز بند پڑی رہتی۔ کبھی کُھل نہ پاتی۔ مِنے ٹکے اور مقررہ اصولوں کی خلاف ورزی کرنے کو کبھی جی نہ چاہتا کہ زندگی کا چمن اِنھیں کی بدولت سرسبز تھا۔

ایک طرف سے لمبے لمبے بانسوں کے سہارے دُوسری طرف سے محرابوں کے کولوں کے ساتھ رسّے کے ساتھ بندھا ہُوا حویلی کے فراخ کشادہ صحن پر شامیانہ نصب ہے جس کے نیچے نپے تُلے قدموں والیاں زندگی کی ہمہمی لیے اِدھر سے اُدھر پھر رہی ہیں۔ ہوا میں موتیا کی مہک ہے۔ شادی کی اِس گہما گہمی سے ساری فضا منوّر ہو رہی ہے۔ گیرُوے رنگ کی اینٹوں والا فرش حُسنِ سماعت کے لیے اپنے اوپر اونچی ایڑیوں کی گُرگابیوں سے پیدا ہونے والی آواز کو باہر کی طرف پھینک رہا ہے۔ لڑکیوں کے کٹ پھٹ چلنے کی یہ آوازیں کانوں کو بڑی اچھی لگ رہی ہیں۔ نوکرانیاں اِدھر سے اُدھر پھر رہی ہیں۔ مہریاں اُن کا راستہ کاٹ کر دوسری طرف کو جا رہی ہیں۔ کنیز فاطمہ دالان کے آگے ہلکے رنگ کی بنارسی ساڑی پہنے کھڑی کہہ رہی ہیں: "آپا شہر بانو کو بلاؤ، جب تک وہ آ کر بوٹیوں کو منظور نہیں کریں گی دیگوں میں نہیں ڈالی جائیں گی۔"

شہر بانو کنیز فاطمہ کی نند ہے۔ کنیز فاطمہ کے لہجہ میں جتنی مٹھاس ہے آواز میں اتنا ہی دبدبہ ہے۔ اُس وقت کے فیشن کے مطابق اُس نے اپنے بال پیچھے کو کھینچ کر بنا رکھے ہیں۔ ہاتھ میں سونے کی چُوڑیاں چھم چھم کر رہی ہیں۔ بلاؤز پر پھول اور پتّے بنے ہیں۔ حویلی میں گانے والی میراسنوں کا طائفہ دعائیں دیتا داخل ہُوا ہے اور کنیز فاطمہ کو سَو سَو سلام آداب کرتا دیوار کے ساتھ جا کھڑا ہُوا ہے اور اُس کی شوکت اور شخصیت سے مسحور ہو کر اُس کے احکامات اور ہدایات کو سُننے لگا ہے۔

شہر بانو یوتھ کا سُوٹ پہنے گوٹ کا دوپٹّہ لیے کمرے سے باہر نکلی ہے اور بوٹیوں سے بھری سینیوں کے

بس جو نوکر فرش پر رکھ چکے ہیں کھڑی ہوگئی ہے۔ سب لوگ اُس کی طرف متوجہ منظوری کا فیصلہ سُننے کے منتظر ہیں۔

وُہ چند بوٹیوں کو دیکھ کر کہہ رہی ہے: ”قصائی سے کہو گوشت کی بوٹیاں چھوٹی ہیں۔ یہ بوٹیاں دیگوں میں نہیں بڑیں گی۔ عامیوں کے لیے ٹھیک ہیں۔ کہو بڑی بوٹی بنائے اور دکھانے کو بھیجے۔ بوٹی نہ چھوٹی بنے نہ پارچہ۔“

شہر بانو کی دلآویز شخصیت میں کتنا کرّوفر ہے۔

حویلی کی باوقار عورتوں کو قدرت نے تدبّر اور تمکنت کی نعمتوں سے کس قدر نواز رکھا تھا۔

حویلی کے مکینوں پر دولت عاشق تھی۔ غلام محبوب سبحانی بچپنے میں غلیل لیے چڑیوں کے پیچھے پھرتے رہے۔ جوان ہوئے تو ہاتھی پر بیٹھ کر پُوربیوں کا ہانکا ساتھ لے کر شکار کو نکلتے۔ میاں عطامحی الدین کا بیٹا نوابزادوں کے برابر رہا۔ چھ فٹ کا قد کسرتی گٹھیلا بدن ستواں ناک کے نیچے چھوٹی چھوٹی بھوری بھوری نوکدار مونچھیں کھلتا ہوا سُرخ گندمی رنگ جو لباس پہنتا زیب دیتا۔ برجس پہنتے تو کسی ریاست کے خوبصورت راجواڑے دکھائی دیتے۔ چہرے کے سنورے خدوخال میں آنکھوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ کھنچی کھنچی آنکھوں کے بھاری بھاری پپوٹوں میں شرارت اور مردانہ حُسن لڑتا جھگڑتا دکھائی دیتا۔ جب سنجیدہ باتیں کرنے لگتے تو شرارت غائب ہوجاتی۔ آواز میں گمبھیرتا آجاتی اور مردانہ حُسن ساری فضا کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔ داناپور میرٹھ لکھنؤ فیض آباد مراد آباد جھانسی کی چھاؤنیوں میں جوان ہُوئے ہزاروں لاکھوں کی رقم جیب میں لیے سفر کرتے رہے۔ جتنا دھن اُجڑتا اُس سے دگنا خدا دیتا۔ ایک دفعہ جھانسی اور نینی تال میں خدا نے اتنے نوٹ بھیج دئے کہ بیوی جی اور کنیز فاطمہ سوچ میں پڑگئیں کہ کہاں رکھے جائیں۔ غالیچوں کے نیچے بچھا کر رات کاٹی گئی۔

جہاں گوراپلٹن جاتی بابو عطامحی الدین اپنی پلٹن کے ساتھ جاتے۔ نام کی نوکری سٹورکیپری کی تھی مگر ایڈجوٹنٹ بہادر کو جو بھی مشکل پڑتی بابوجی اُس کو حل کرنے کے لیے کافی تھے۔ ہاتھیوں کو کام کا بھُوسہ اور کچے کماد کے ٹانڈے نہیں مل رہے تو بندوبست کے لیے عطامحی الدین سے کہا جاتا۔ ٹھیکیداروں سے بات چیت کرنی ہوتی تو بابو عطامحی الدین کو بلایا جاتا یہاں تک کہ خچر کے پیر کو موچ آجاتی تو بابُوجی کی رائے لی جاتی۔ ڈبل روٹی کا فلےور کیسا ہے۔ بابوجی سے پُوچھا جاتا۔ انگریز ایڈجوٹنٹ اور انگریز کوارٹر ماسٹر ہر مشکل کے حل کے لیے اُن کی طرف رجوع کرتے۔ یہ اعتماد کی بات ہوتی ہے۔ وُہ انگریز فوجی افسروں کے دل میں جگہ بنانے کا گُر خوب جانتے تھے۔ اُن پر شاگرد پیشہ لوگ الگ جان چھڑکتے۔ وہ شخص جو انگریز فوج کی مشکلوں کو رفع کر دیتا تھا اس کے لیے شاگرد پیشہ لوگوں کے جھگڑوں کا چُکانا کیا مشکل تھا۔ اِن شاگرد پیشہ لوگوں کے ہزار بکھیڑے تھے۔ مگر بابو عطامحی الدین اِس خُوبی سے فیصلہ کرتے کہ اپنی اپنی جگہ دونوں فریق مطمئن اور خوش ہو جاتے۔ رجمنٹل کوتوال اکثر اوقات مشورہ کرنے کو اُن کے پاس آتا۔

اُن کی پلٹن جب بھی میرٹھ چھاؤنی میں پڑاؤ کرتی تو مہاجن خوشحال چند ہاتھ جوڑ کر کہتا: ”بابُوجی! آپ کی

دَیا سے پرماتما نے سب کچھ دے رکھا ہے پر ہاتھی کی آرزو ہے ایک ہاتھی دلوا دیں جو دام کہیں حاضر کردوں۔ شہر میں ہاتھی پر سوار نکلوں تو ہوا بندھ جائے۔"

"کریں گے بندوبست۔"

"رام جانے کب کریں گے!"

ہاتھی دریا سے واپس آئے۔ ایک کم ہو گیا۔ بابو جی نے ایڈجوٹنٹ سے کہا: "صاحب بہادر! بُرا ہُوا۔ دریا چڑھا ہُوا تھا۔ نہاتے نہاتے ایک ہاتھی بہ گیا۔ بہت تلاش کیا۔ پیچھے آدمی بھیجے۔ نہیں ملا۔ ایک رائٹ آف کرنا پڑے گا۔"

ایڈجوٹنٹ سے ایک ہاتھی رائٹ آف کرا لیا۔

تیسرے روز پلٹن نے کُوچ کیا۔ تیسرے مہینے لالہ خوشحال چند اپنی دُکان پر ہاتھی پر بیٹھ کر آیا۔ سب دوست احباب اشیرباد دینے کو آئے اور لڈو بھرے ڈونے لے کر گئے۔

کئی لوگوں کا روزگار پلٹن میں بابو جی کی وجہ سے لگا ہُوا تھا۔ بڑے بڑے لوگوں پر اُن کے احسانات تھے کئی لوگ یہ کہتے کہ گورے کالے میں اُن کی اِس قدر عزّت انگریزوں اور دیسیوں میں اُن کا یہ مقام اُن کے نام محی الدین کی برکت سے تھا۔ اُن پر اللہ کا سایہ تھا۔ اللہ کی عطا تھی۔ تین چار سال بعد جب وطن آتے تو اس سخی کے ہاتھوں حاجتمندوں کی ضرورتیں پُوری ہوتیں۔ دادا کی بنائی ہُوئی مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے۔ ایک ایک کا حال احوال پُوچھتے۔ پھر ایک دن دیگیں چڑھتیں۔ غریبوں میں بٹتیں۔ عطا محی الدین بستی کی آبرو تھے۔

حویلی میں بگھی کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ تھی۔ گلی میں دو کچّے مکان تھے خرید کر ایک کو گرایا۔ پختہ اینٹ کا بگھی خانہ بنوایا۔ ساتھ اُس کے دو کمرے کھڑے کر دئے جہاں چھوٹا سا پُوربیا ڈیڑھ پسلی کا سائیس رسیاون رسوئی میں بھوجن تیار کرتا دکھائی دیتا۔ کبھی بگھی کو صاف کرتا چمکاتا نظر آتا۔ کبھی پہیوں کو دھوتا گھوڑے کی مالش کرتا سانی بناتا چلم پیتا۔ کبھی بیکار بیٹھا دکھائی نہ دیتا۔ جب میاں جی گھوڑے کی راسیں ہاتھ میں پکڑ لیتے تو بالشت بھر کا پوربیا اُچک کر اپنی جگہ پر بگھی کے پیچھے جا بیٹھتا۔ ٹاپیں مارتا گھوڑا گلی سے باہر نکل جاتا۔ اِس آن بان سے حویلی کا مالک اپنی شہری جائداد دیکھنے نکلتا۔

اُنھوں نے بیٹوں کے نام محی الدین اور بیٹیوں کے فاطمہ کے متبرک نام سے رکھے۔ کنیز فاطمہ، عزیز فاطمہ، بنت الفاطمہ اور حبیب فاطمہ۔ بیٹوں کے ناموں میں شکرانۂ ایزدی کی جھلک یعنی غلام محبوب سبحانی، محمد عبداللہ مہر محی الدّین اور عبدالحق محی الدین۔ اُن کی بیوی بھی دینے والے نے ایسی قانع بے نفس بے زبان دی کہ صالح بیبیوں میں ایسی مثال کم ہوتی ہوگی۔ کسی کی غیبت نہ کسی کی بدگوئی۔ داد و دہش میں کتنا دے نکلتیں کہ جتنا بھی

کوئی کہہ لے۔

جب بڑی بیٹی کنیز فاطمہ کی شادی کا سوال اُٹھا تو اپنی فرزندی میں عطا محی الدین نے اپنے چچا کے بیٹے ڈاکٹر فرزند علی کو قبول کیا۔ کنیز فاطمہ کے حُسنِ سلیقہ سے سسرال اتنا متاثر ہُوا کہ اُس نے فرزند علی کے چھوٹے بھائی نور نبی کے لیے عزیز فاطمہ کا رشتہ مانگ لیا۔ دونوں بیٹیاں دونوں بھائیوں سے بیاہ دی گئیں۔

کارخانۂ قدرت بھی عجب چیز ہے۔ نور نبی کی بیوی عزیز فاطمہ پانچ بچّوں کو چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ان پانچ بچّوں زبیدہ، یعقوب نبی نور، مسعود نبی نور، انیس فاطمہ اور آصف نبی نور کی پرورش تعلیم اور نگرانی کنیز فاطمہ کے ہاتھوں جو خود بے اولاد تھیں ایسی عمدہ ہُوئی کہ اصلی مائیں بھی نہ کر پائیں۔ اِن بہن بھائیوں میں زبیدہ سب سے بڑی تھی۔ یعقوب نبی نور ہمارا ساتھی تھا۔ طبیعت باغ مزاج بہار۔ موتی آنکھوں میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے۔ ایسا پھُول معلوم ہوتا جو شبنم کے ساتھ آسمان سے اترا ہو۔ گیلی آنکھوں میں نمی رچی ہُوئی اور پپوٹوں کی اوٹ میں ایسی شرارت چھپی ہوتی جس کا سراغ نہ مل پاتا۔ اِس کا بھی سراغ نہ مل پایا کہ اتنی جلدی وہ اِس جہاں کو چھوڑ کر اگلے جہان کیوں چلا گیا۔ اُس کی خالہ آپا بوّا یعنی بنت الفاطمہ کا بیٹا ضمیر بھی میرا ساتھی تھا بھائی عاشق کی شادی کی تقریب پر ہم تینوں نے چھپ چھپ کر سگرٹ پیئے۔ یعقوب اور ضمیر اپنے وقتوں کے چین سمو کر ہُوئے اور میں عمر بھر کا نون سمو کر۔ ایسا کیوں اور کیونکر ہوتا ہے اور یہ بریک کیوں لگتی ہے۔ آپ لگتی ہے یا قدرت لگاتی ہے۔ بس لگتی ہے۔

ضمیر احمد کے والد بھائی مجید کو جوانی میں تپ دق لگ گئی۔ اُن دنوں اِس مُوذی مرض کا علاج کہاں تھا! وہ عالمِ شباب میں سلمیٰ شمیم اور ضمیر تین بچّوں کو تنہا چھوڑ ملکِ عدم کو سدھار سے۔ آپا بوّا بیوہ ہو کر باپ کے گھر آ بیٹھی۔

میں کوئی پرائمری کلاس میں ہُوں گا۔ بھائی مجید ہماری بیٹھک کی الماری کھولے کتابیں دیکھ رہے تھے اور میں انھیں ایک موٹی سی کتاب میں سے ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کی تصویریں دکھا رہا تھا۔ وہ میری باتیں بھی سُنتے تصویریں بھی دیکھتے اور سرسری نگاہ سے دُوسری کتابیں بھی دیکھتے جاتے تھے۔ صرف یہی ایک لمحۂ گریزاں اُن کی یاد کا ذہن کے کسی کونے میں محفوظ رہ گیا ہے۔

عام دستور یہی ہے کہ گھر کا کوئی فرد اگر سرکار دربار کے ہاں کسی منصب پر جا لگے تو سبھوں کے لیے ایک طرح سے روزگار کا در کُھل جاتا ہے۔ میاں عطا محی الدین اپنوں کے لیے پیکرِ شفقت و کرم بنے رہے۔ بلا بلا کر ملازمتیں دلوائیں۔ چُونکہ فوجی افسروں کے دل میں اُن کا خاص احترام تھا اس لیے گورا پلٹن میں سٹور کیپر کرا دینا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ انگریز کے راج میں اسّی فیصد مسلمان پولیس کے محکمے میں ہوتے تھے۔ اِس محکمہ میں ہندو نہ چمکتا۔ مسلمان خوب خوب رُعب دکھاتا۔ پولیس کا ساحاکمانہ عہدہ مل جائے تو پُوچھنا ہی کیا۔ اُن کے پھوپھی کے بیٹے

مرید غوث کو سٹورکیپری پسند نہ آئی۔ میاں عطامحی الدین نے انھیں لکھنؤ میں بلا کر اودھ کی پولیس میں ملازمت دلو اپنے دامادوں کا چھوٹا بھائی سردار علی تلاشِ روزگار میں اُن کے پاس پہنچا۔ چند ہفتوں میں کمسریٹ میں سٹو کرادیا۔ جھانسی کی چھاؤنی میں کھپریل کے چھجے دار بنگلے میں رہتے تھے کہ پنجاب کے ایک گاؤں سے نور احمد ملاز کی تلاش میں وہاں آپہنچا۔

عطامحی الدین نے اپنی اہلیہ سے پُوچھا، "لڑکا بُرا نہیں ہے۔ ہماری دُور پار کی رشتہ داری بھی نکلتی صاحب سے میں نے وعدہ لے لیا ہے۔ چند دنوں میں سٹورکیپر ہو جائے گا۔ ہمارے پاس تمھاری بڑی کرامت بی بی بیوگی کے دن گزار رہی ہے کیوں نہ نور احمد کا اُس سے نکاح پڑھوا دیا جائے۔ ہم نے نوکری دلوادی ہم زلف بھی بنا لیا۔ ساری عمر ہمارا احسان مند رہے گا۔"

بیوی جی نے پردے سے دیکھا۔ گورا چٹا نور احمد تہمد باندھے بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ انھوں نے صاد نور احمد کا کرامت بی بی سے نکاح ہو گیا۔ میاں عطامحی الدین اور نور احمد ہم زلف ہو گئے۔

بھائی مجید کرامت بی بی کے پہلے خاوند کی اولاد تھے۔ انھوں نے میٹرک پاس کیا تو عطامحی الدین نے بھی فوج میں سٹورکیپر کرا دیا اور پھر اپنی بیٹی بنت الفاطمہ سے شادی کر دی۔ بنت الفاطمہ کو گھر میں سب آپا بوّا اِس شادی سے دو بیٹیاں سلمیٰ اور شمیمہ اور بیٹا ہمارا دوست ضمیر احمد تولد ہوئے آپ نے جانے زندگی میں صاحبِ جمال عورتیں دیکھی ہوں میں نے صرف آپا بوّا دیکھیں۔ اللہ اللہ کیا حُسن و جمال کا پیکر تھیں۔

قدرت کی عجوبہ کاری اور رضائے ایزدی سیانوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ منشائے خداوندی دیکھیے ک صاحبِ جمال خاتون خاوند کی جواناں مرگ کے بعد تین بچوں کو لے کر باپ کے گھر آ بیٹھیں۔ ہمارا دوست ضم ننھیال کے گھر سکول کے درجے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ بمبئی میں جا کر سمندری جہاز پر ملازم ہو گیا۔ پھیپھڑے یہ سخ برداشت نہ کر پائے۔ چند ہی سال میں تپ دق نے ایسا پکڑا کہ اِس جوانِ رعنا کی جان لے کر چھوڑا۔ ضمیر پھیکا پھیکا گندمی رنگ سیدھی ناک سگرٹ پینے کے سبب جلے جلے ہونٹ شراروں کی طرح سُرخ آنکھیں او میں کبھی کبھی شفقتِ پدری کے لیے چھپا چھپا آزارِ جستجو میری یادداشت کے پٹارے میں ابھی تک جھلملا رہا ہے

دوستوں کی ہزاروں باتیں کبوتروں کی طرح گھنٹوں کی غٹرغوں مگر یہ کمال کہ اِن یاروں نے میری رسوا سُن کر بھی کبھی یہ تک نہ پُوچھا کہ اے دوست تو بے شرر و شعلہ کیسے جل اُٹھا اور یہ سوزِ دروں ہمیں کیوں ارزاں نہ تقدیر نے محبت کے اُس جذبِ دروں سے انھیں سرشار و شناسا نہ کیا جو بعض اوقات شورِ حیات پر بھی غا آجاتا ہے۔ ہر رُخ کزن چاروں اوٹ بنتِ عم مگر اُس دھاگے کا سرا اِن جواں سالوں کے ہاتھ نہ آیا جو دلو گنڈھاوٹ کے ساتھ پروتا چلا جاتا ہے اور اُس راہِ آگہی و آشنائی کے مسافر محبت کی مالا جپنے لگتے ہیں۔ فہ ذرّہ ذرّہ منوّر ہو اور نور حاصل نہ کیا جائے شاید یہ اُن کی سرشت اور فہم میں نہ تھا۔

میری شادی پر ولیمہ کے روز بمبئی سے مبارکباد کا تار آیا۔ ضمیر کا تھا۔ یہ ثبت مہر تھی کہ ہم محبت کی طاقت پر ایمان لے آئے۔ برسوں یہ تار میرے کاغذوں میں محفوظ پڑا رہا۔ ایک روز آپا بوا مجھ سے ضمیر مرحوم کی باتیں کر رہی تھیں کہ میں نے یہ تار انہیں لاکر دے دیا کہ شاید ماں کے دل کو کوئی قرار آجائے۔

سکول میں ہم نے ایک کہانی پڑھی تھی کہ سبکتگین بادشاہ ایک روز شکار کھیلنے گیا مگر جنگل خالی ملا۔ ناکام واپس جا رہا تھا کہ کلیلیں بھرتا ہُوا ہرن کا بچہ سامنے سے گزرا۔ سبکتگین نے تیر چلا کر اُسے شکار کیا۔ کچھ فاصلہ تک ہرن کی ماں چھپ چھپ کر بادشاہ کے پیچھے پیچھے چلتی رہی پھر جنگل میں غائب ہوگئی۔ کچھ عرصہ بعد بادشاہ پھر شکار کے لیے نکلا۔ ایک ہرنی کو شکار کیا۔ جب اُس کا پیٹ چاک کیا گیا تو وزیر نے کہا: ”بادشاہ سلامت! یہ ہرنی اُسی بچّے کی ماں ہے جس کو ایک مرتبہ آپ نے شکار کیا تھا۔“

بادشاہ بولا: ”یہ کیونکر؟“

وزیر نے کہا:

”یہ دیکھئے ہرنی کے دل پر داغ ہے۔ یہ داغ مرنے والے بچّے کے صدمے کا ہے۔“

آپا بوا کے دل پر بھی کلیلیں بھرنے والے بیٹے کا داغ ہوگا جو وُہ عمر بھر کسی کو نہ دکھا پائیں۔

۲

کرنل کرپ نور احمد کو سٹور کیپری کی ٹریننگ کے لیے چکراتہ چھاؤنی بھیجتے وقت بابو عطا محی الدّین سے کہنے لگا: ”ہم آپ کے رشتہ دار لوگوں کو اس لیے سٹور کیپری دیتا ہے کہ ہماری پلٹن پر آپ کے بہت احسانات ہیں مگر اب ہم آپ کے کسی بیٹے کو سٹور کیپری دینا چاہتا ہے کہ آپ کو فائدہ ہو۔“

غلام محبوب سبحانی سے چھوٹے محمد عبداللہ تھے جنہیں کرنل کرپ نے سٹور کیپری دینے میں قطعاً تامل نہ کیا بلکہ وُہ تو اپنی پلٹن کی ٹکڑی کے ساتھ درّہ خیبر کے قریب انھیں رزمک چھاؤنی لے گیا اور جاتے ہی بلا کر حکم دیا کہ تم نے ہر روز لفافہ میں پچاس روپے کا نوٹ بند کر کے ڈاک کے ذریعے اپنے باپ عطا محی الدّین کو بھیجنا ہے جس میں ناغہ نہیں ہوگا۔

ایک روز کسی جگہ ملاقات ہوگئی، پُوچھا: ”نوٹ ہر روز بھیج رہے ہو کہ نہیں۔“

اُنھوں نے کہا: ”بھیج رہا ہُوں۔“

اُس وقت کے پچاس روپے آج کل کے پانچ ہزار روپے کے برابر تھے۔ سات روپے سپاہی کی تنخواہ ہوتی تھی۔ اندازہ لگائیے سٹور کیپر کتنا کماتا ہوگا۔ سبزی گوشت ڈبل روٹی مکھن پھل میوہ مفت آتا۔ ایک طرح سے تھانیداری تھی۔ اپنے کنبے میں یہ لوگ اتنے جُڑے بندھے تھے کہ پُوربیوں کی طرح گھر پھر شادیاں کنبے کے اندر ہی کرتے،

برکی ہمت نہ پڑتی۔ خلیرے، ممیرے، پھپھیرے، چچیرے کے چکروں میں ہی رہتے۔ عطا محی الدین کے کانوں میں کسی نے لی کہ تمہارے ہم زلف نور احمد کے بیٹے عزیز احمد کی شادی غلام اکبر خاں کی بیٹی سے ہو رہی ہے۔ برات کے ساتھ بھی تو بٹالہ جا رہے ہو۔ عطا محی الدین بولے:

جہاں میری رشتہ داری کپور تھلے والوں سے بنتی ہے وہاں غلام اکبر خاں سے بھی ہے۔

وہ غلام محبوب سبحانی کی شادی میں شریک ہوا دیوان علی کے بیٹے کی شادی پر آیا۔ دونوں میں دُوری فاصلوں ہے دلوں کی نہیں۔ چنانچہ میری بڑی بہن امیر بانو عطا محی الدین کے بیٹے محمد عبداللہ سے بیاہی گئیں۔ بس خواب طرح دھندلا دھندلا۔ اتنا یاد ہے برات کے آگے آتش بازی چل رہی تھی۔ باریک کاغذ کے بڑے بڑے فانوس ڑے گئے تھے جن کے اندر مُنّا سا دیا جل رہا تھا اور وہ ایک دوسرے کے پیچھے بلندیوں میں اڑتے اڑتے تارے تے چلے گئے۔ برات رات کو چھتوں پر سوئی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ مٹی کی صراحیوں میں پانی رکھا گیا سفید اُجلے اُجلے تر بچھے جو صبح کو تہہ کیے گئے۔

اُن دنوں عبداللہ صاحب کی پلٹن نارتھمبرلینڈ فزیلیرز دارجیلنگ چھاؤنی میں مقیم تھی جہاں وہ کم سرئیٹ میں لور کیپر تھے۔ دارجلنگ کی چھاؤنی کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے۔ وہ وقت برطانوی دورِ جلال کا شباب تھا۔ ریز کی فوج برِ عظیم کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اِس علاقہ کے پہاڑی لوگ گورکھے کے نام سے مشہور ہیں سپانیہ کے وسیع و عریض دامنِ کوہ میں یہ نسل آباد ہے جو اپنی جنگجوئی اور بہادری کی وجہ سے برٹش انڈین آرمی میں ی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی۔ چری چری آنکھوں والے گندمی رنگ کے ناٹے قد کے پہاڑی لوگ چپٹی ناک گالوں کی ہڈیاں نمایاں چوڑے گھیر کا ہیٹ لگاتے جس کا نام گورکھا ہیٹ تھا۔ کمر پہ سکھوں کی کرپان کی طرح خنجر ھتے جسے اپنی زبان میں پوکھری کہتے۔ حکومتِ برطانیہ اب تک حکومتِ ہند کی اجازت سے پانچ سو گورکھوں کا ـ فوجی دستہ دکھاوے کے طور پر برطانوی فوج کے ساتھ منسلک رکھتی ہے۔ دارجیلنگ کے علاقہ کی خاص اوار وہاں کی چائے ہے جس کا ایک خاص ذائقہ اور فلیور ہے۔ چنانچہ دارجیلنگ ٹی دنیا بھر میں مشہور ہے۔

میاں عطا محی الدین کی تہجد گزاری، تقویٰ، پابندیِ صوم و صلوٰۃ سب بیٹوں میں سے زیادہ محمد عبداللہ کے ر میں نمو پذیر ہوئی۔ جوانی کی راتیں بھی ورد و وظائف میں گزریں۔ علاّمہ اقبال کی طرح حُقّے کا ساتھ بچپن سے رہا۔ رٹ کم پیا حُقّہ زیادہ اور بڑے التزام کے ساتھ پیا۔

ہر چند میرے والد کے سامنے حُقّے کو ہاتھ نہ لگایا مگر وہ جانتے تھے کہ داماد کو حُقّے کا شوق اُن سے کم ھا۔ فیض آباد سے اُنہوں نے کٹھل بھیجا والد صاحب نے جواب میں لکھا "ہمارا منہ تم نے کٹھل سے میٹھا کرایا۔ ارا منہ کڑوا کرنے کے لیے ایک بوری تمباکو کی بھیج رہا ہوں۔"

حُقّے کے سلسلہ میں ایک واقعہ اور بھی ذکر کے قابل ہے۔ اپنی ٹریننگ کے دوران محمد عبداللہ کو چکراتہ چھاؤنی

جانا پڑا جہاں وُہ اپنے خالو نور احمد کے ہاں مقیم ہوئے جن کا مکان ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ چونکہ رات کو سونے سے پہلے عبداللہ صاحب کو حقہ گُڑگُڑانا تھا اس لیے انھوں نے اپنے قیام کے لیے مکان کا ایک الگ تھلگ کمرہ منتخب کیا جس میں کوئی نہیں رہتا تھا۔ بابو نور احمد نے کمرہ تبدیل کرنے پر اصرار کیا مگر وہ رضامند نہ ہوئے۔ رات کو آنکھ کھل گئی ٹین کی چھت پر پتھر گر رہے تھے۔ اُنھوں نے سمجھا پہاڑی علاقہ ہے پہاڑی سے پتھر لڑھک لڑھک کر چھت پر گر رہے ہیں۔ سو گئے۔ پھر آنکھ کھل گئی۔ کئی دفعہ سوئے کئی دفعہ جاگے۔ نیند کچھ ٹھیک سے نہ آئی۔ صبح خالو نے پُوچھا: "رات نیند ٹھیک آئی۔"

"جی خوب سویا۔"

اگلی رات آنکھ کُھلی تو انسان کی شکل وصُورت میں ایک لمبا سایہ چارپائی کے ساتھ لگا کھڑا تھا اور چارپائی ہل رہی تھی کچھ ڈرے۔ کچھ سہمے۔ پسینہ آ گیا۔ ساتھ اپنی عبادت گزاری پر بھروسا۔ وہ سایہ اُن کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور گلا دبانے لگا۔ انہوں نے آیت پر آیت پڑھنی شروع کر دی جُوں جُوں پڑھتے جاتے اُس کی گرفت ڈھیلی پڑتی جاتی۔

صبح اُن کی خالہ نے جنہیں بھابوجی کہا جاتا تھا پُوچھا: "عبداللہ! تم اِس کمرے میں سو جایا کرو اُس الگ تھلگ کمرے میں نہ سویا کرو۔"

"بھابوجی صبح صبح نماز کے لیے اُٹھتا ہُوں۔ رات کو عشا کی نماز پڑھتا ہُوں پھر تسبیح کرتا ہُوں۔ وُہ کمرہ اچھا ہے الگ تھلگ سا۔"

"مگر ہم نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ ہم سے جو لوگ پہلے رہتے تھے اُنھوں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ اُوپر تلے اُن کی دو بھینسیں وہاں مُردہ پائی گئیں۔ کہتے ہیں کمرہ اچھا نہیں۔ بابوجی نے بھی مجھے یہی کہا تھا کہ تم کوئی اور کمرہ لے لو۔"

دل نے کہا عبادت کے سامنے سب شیطانی طاقتیں کمزور ہیں۔ اِسی میں بیٹھا رہ "یہی ٹھیک ہے بھابو جی!" بھابوجی چوکی پر پھسکڑا مارے چُولھے پر سے چائے کی کیتلی اتارتے ہُوئے بولیں: "تمھاری مرضی۔"

اگلے روز میاں عطا محی الدین کے نوعمر صاحبزادے نے عشا کی نماز کے بعد کچھ دیر حقہ گڑگڑایا پھر تھوڑی سی نیند لے کر آدھی رات کو اُٹھ بیٹھے اور تسبیحاں پڑھنے لگے۔ تھک گئے تو بستر پر جا لیٹے مگر نیند نہ آئی۔ لالٹین کی بتی بھڑ بھڑ کر کے بجھ گئی جیسے تیل ختم ہو گیا ہو۔ ایک کونے میں سے لمبا سا سایہ اُبھرا جس کا قد چھت تک جاتا تھا وہ آہستہ آہستہ چارپائی کی طرف آیا۔ لمحہ بھر کھڑا رہا پھر کونے کی طرف جا کر تحلیل ہو گیا۔ نوجوان نوعمر صاحبزادے بستر پر سے اُٹھے۔ لالٹین جلائی جو تیل سے بھری ہُوئی تھی۔ خوف کا پسینہ پونچھ کر مصلّے پر جا بیٹھے۔ آیتیں پڑھتے جاتے اور اُس کونے کی طرف پھونکتے جاتے کہ دن نکل آیا۔ مہینہ بھر رہے پھر کچھ دکھائی نہ دیا۔

چہرے پر سبزہ آیا مسیں بھیگیں۔ مونچھ ڈاڑھی نمودار ہُوئی۔ قینچی تک نہ چھوائی اور جب حجام سے پہلی مرتبہ اصلاح کرائی تو ڈاڑھی کچھ ہلکی ہلکی کچھ ہلکی ہلکی مونچھیں چہرے پر خُوب سجیں۔ پُرشباب چہرہ پاکیزگی سے ڈھل گیا۔ پھر

آنکھوں کے پپوٹوں میں شرارت کا خاص اسٹائل جھلملانے لگا۔ تبدیلی لب و لہجہ میں آئی۔ اب پر آسودہ تبسم نے جگہ پائی اور لہجہ میں شباب کی بشاشت در آئی۔ محمد عبداللہ نے شرافت اور انسانیت کی اونچی اقدار کی پاسبانی اپنے پرکھوں سے پائی تھی۔ ساری عمر ان اقدار کے وارث رہے۔

پندرہ برس کی آپا امیر سسرال پہنچیں جو میکے سے بالکل مختلف یکسر جدا سرتاپا الگ۔ تھوڑی دیر بعد دارجلینگ کی تیاری شروع ہوئی۔ بڑی نند کنیز فاطمہ جنھیں بڑی آپا کہا جاتا تھا زیور کا صندوقچہ کھول کر بولیں: ”وہاں تمھیں کہاں پہننا ہوگا زیور اتنا، چند چیزیں لے جاؤ امیر بانو۔ بڑا ہار ایک چھوٹا۔ کنگن کی جوڑی۔ آٹھ چوڑیاں۔ دو کڑے۔ دو کان پھول۔ چار بندے۔ چھ انگوٹھیاں۔ گلے کے لیے چندن ہار بھی لے لو۔“ یہ اُس زیور میں سے جو دلہن کو جہیز اور بری میں ملا تھا بقول بڑی آپا چند چیزیں تھیں جو وہ چھوٹی بھاوج کو دے رہی تھیں جو شادی کے بعد میاں کے ساتھ دارجلینگ جا رہی تھی۔

زنانہ انٹر کلاس میں دلہن اور ساتھ کے مردانہ انٹر کلاس میں عبداللہ صاحب سفر کر رہے تھے۔ جب کوئی بڑا اسٹیشن آتا تو جا کر حال پوچھ آتے یا کوئی کھانے کی چیز دے آتے۔ ہوڑہ کا اسٹیشن آیا۔ قریب سے کوئی حجام گزرا ”باربر صاحب باربر!“

انھوں نے بلا لیا۔ ایک طرف جا کر ڈاڑھی مونچھ صاف کرا دی۔ شیشہ دیکھا تو چہرہ اور اچھا لگا۔ زنانہ ڈبے کے قریب آ کر دلہن کو گھورنے لگے جو برقع میں سے دیکھ رہی ہے اور گھبرائے جا رہی ہے اور سوچ رہی ہے کہ میاں کدھر چلے گئے۔ ابھی یہاں تھے آ جائیں تو اچھا ہے۔ اِس بدمعاش سے نجات ملے۔ جب گاڑی چلنے کا وقت آیا تو کھڑکی کے پاس آ کر شرارت کے اپنے اسٹائل سے بولے:

”امیر یہ میں ہوں۔“

ہوڑہ اسٹیشن کے بافیشن پہنچے ہوئے حجام نے سیدھے اُسترے سے ایسی شیو بنائی کہ اپنی پلٹن کی آفیسر شاپ سے جاتے ہی ویسا استرا خریدا اور عمر بھر وکٹوریئن اسٹائل کے خطرناک استرے سے شیو بناتے رہے سیفٹی ریزر کو ہاتھ نہیں لگایا۔ دھار میں کمی آئی تو چمڑے کے اُس سٹریپ پر شڑاپ شڑاپ تیز کر لیا جو GREAT BRITAIN کی کسی فیکٹری کا ساختہ تھا۔

میری بڑی بہن آپا وزیر کے شوہر ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے انگلستان گئے ہوئے تھے۔ محمد عبداللہ چھوٹے بہنوئی رخصت پر فیض آباد سے آئے ہوئے تھے۔ میری آٹھ اور چھوٹے بھائی الطاف کی عمر چھ برس کی ہوگی کہ چڑیا کی زبانی سنا دونوں کے ختنے ہو رہے ہیں اور حسن نائی کا ہاتھ ہلکا ہے اُسے بلایا جا رہا ہے۔ دونوں کو سہ پہر کے وقت برفی کی ایک ایک ڈلی کھلا دی گئی۔ گھر میں فضا کچھ ایسی تھی جو پہلے نہ دیکھی تھی۔ چڑیا کی زبانی یہ تک معلوم ہو گیا کوئی نشہ آور چیز برفی کی ڈلی میں تھی جس سے درد محسوس نہ ہو پائے گا۔ نظام دین نائی دھاگے والی عینک

لگائے بغل میں بستہ لپیٹے آن نازل ہوا۔ ہماری ٹانگیں عبداللہ صاحب نے زبردست گرفت سے پکڑیں۔ نائی نے کٹ تھروٹ قسم کا استرہ جو چاقو کی طرح بند تھا کھولا۔ دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر چپٹ اور پٹ کیا۔ کوئی انگلی کے اشارے سے بولا: "وہ چڑیا" ہم نے فضا میں دیکھا ہی تھا کہ ہماری فاختہ اڑ گئی۔

ترکی میں ختنہ کرانے والے بچّے کا ٹانگیں پکڑنے والے کے ساتھ ایک خاص دلی تعلق ہو جاتا ہے۔ وہاں بچّے کی ٹانگیں عام طور پر باپ کا کوئی دوست پکڑتا ہے جو ختنہ کے بعد بچّے کا گاڈ فادر کہلاتا ہے۔ جب بھی باپ کے خلاف بچّے کو کوئی شکایت ہو تو وہ اپنی شکایت اس گاڈ فادر (GOD FATHER) سے بیان کرتا ہے جو سمجھوتہ کی صُورت نکالتا ہے۔ اِس رسم کے ناتے سے اُس شخص کو گھر میں بڑی اہمیت اور استحقاق حاصل ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ لڑکے کی شادی پر جوڑا بنا کر لاتا ہے۔

۳

میرا جانا لستی والوں کے ہاں لڑکپن میں ہُوا تھا۔ صبح صبح چوکی پہ بیٹھا منہ ہاتھ دھو رہا تھا کہ کوئی صاحب میری طرف دیکھتے ہوئے گزرے۔ میں نے سلام کیا۔ بولے:

"بھئی! یہ برخوردار کون ہے؟ میں نے پہچانا نہیں۔"

کوئی بولا:

"بابر ہے چچا جان۔ بھابی امیر کا بھائی۔"

"اچھا امیر بانو کا بھائی ہے۔"

بعد میں مجھے معلوم ہوا آپ ڈاکٹر دیوان علی تھے جن کی بیٹی شریفی کی شادی اُن کے چھوٹے بھائی سردار علی کے بیٹے محمد انور[1] سے ہو رہی تھی۔ محمد انور ایف سی کالج لاہور میں میرے بڑے بھائی خادم حسین کا کلاس فیلو تھا۔ موٹی موٹی آنکھوں میں لال لال ڈورے، بھرے بھرے گال، گورا چٹّا رنگ، لہجہ میں طرّاری اور اضطراب ایسا اور اِس قدر کہ اُس کے ساتھ لپٹے ہُوئے لفظ تیزی کے ساتھ دہن سے نکلتے ہوئے ادا ہوتے۔

ڈاکٹر دیوان علی فرزند علی سردار علی اور نور نبی کے مکان ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جُڑے بندھے تھے کہ ایک میں گھسو تو چوتھے میں جا نکلو۔ چار پانچ بھائیوں میں ایک آدھ شوقین مزاج بھی ہونا چاہیے۔ پانچویں بھائی غلام دستگیر جن کا مکان شہر میں تھا چوٹی کے وکیل، مزاج کے شوقین اور صاحبِ اثر و رسوخ تھے۔ تپِ محرقہ سے ایک آنکھ خراب ہو گئی تھی۔ رنگدار چشمہ لگاتے۔ دیکھنے میں بڑے خاموش دکھائی دیتے مگر عدالت میں اس

---

[1] سابق ڈی پی آر محکمہ اطلاعات پنجاب

طرح گرجتے اور دُور دُور کی کوڑی لاتے کہ مخالفین دیکھتے رہ جاتے۔ دشمنوں کے نرغہ میں سے ننگی تلوار کی طرح نکل جاتے۔ شہر کے لفنگے بدمعاش دس نمبریئے سلام کیے بغیر سامنے سے نہ گزرتے۔ ڈوم مراثی دعائیں دیتے۔ طوائفیں جھک کر آداب بجالاتیں۔ اپنے بھتیجے اور بھتیجی کی شادی پر انہوں نے اپنی چہیتی طوائف نذیر کو مجرے کے لیے بلا رکھا تھا۔

دیوان خانہ کے سامنے کھلے میں چاندنیاں بچھ رہی تھیں۔ تہ کیے لپیٹے قالینوں کو کھولا جا رہا تھا۔ ملازم دالان میں سے اٹھا اٹھا کر گاؤ تکیے باہر لا رہے تھے۔ فرش کے گرد اگرد کرسیوں کی قطاریں لگائی جا رہی تھیں۔ ڈوریوں اور رسوں سے شامیانے والے زرتار شامیانہ تان کر نیچے سے سرخ الوان سے ڈھکے بانسوں کا سہارا دے رہے تھے۔ ہم عمر لڑکے نیاز قطب ضیائی الدین ضمیر فیاض یعقوب اور میں چاندنی پر صحرا کے غزالوں کی طرح ٹاپیں مار رہے تھے قلابازیاں کھا رہے تھے اور گاؤ تکیوں کو مسل رہے تھے۔

منتظمین میں سے ایک شخص ممتاز نظر آتا رہا۔ پھرتی کے اس کو پَر لگے تھے۔ سیماب بھرا تھا کہ چھلاوہ تھا۔ ابھی یہاں ابھی وہاں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹیں اور بانکی سی مونچھیں۔ لہجہ میں اپنائیت اور کالی سیاہ بھور آنکھوں میں سمندر۔ یہ تیکھا نوجوان میاں عطا محی الدین کے سالے کا بیٹا اور محمد عبداللہ کا ممیرا بھائی نواب زادہ عبدالصمد خاں تھا۔

اندر سے بلاوا آیا۔ ہم کپڑے بدل مردانے میں آئے تو دیوان خانہ جھاڑ فانوس سے سج چکا تھا۔ کرسیاں مہمانوں سے بھر چکی تھیں۔ میاں عطا محی الدین اپنے دو بیٹوں غلام محبوب سبحانی اور محمد عبداللہ کی معیّت میں سفید عمامہ اور سفید انگرکھا پہنے چاندی کی مٹھ والا عصا ہاتھ میں لیے دیوان خانہ میں تشریف لائے ان کی چھدری چھدری لمبی سفید داڑھی تھی اور چہرہ پر عبادت گزاری کا نُور۔ مہمانوں نے اُٹھ کر مصافحہ کیا۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر تشریف لے گئے۔

پہلے اندھیرے میں ایک سایہ جھلملایا پھر روشنی میں آیا جس کے آتے ہی ہم لڑکوں کو زندگی کا ایک اچانک پن محسوس ہُوا۔ اپنے لٹکتے دوپٹے کو اُس نے کندھے پر ڈال کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے اور محفل میں آکر آداب کیا۔ پیچھے پیچھے آنے والے سازندوں کی ٹولی نے جھک کر غلام دستگیر اور اُن کے بھائیوں کو سلام کیا۔ ہم نے پہلی بار طوائف کو دیکھا کہ اُس نے کس طرح آتے ہی اپنی جلوہ نمائی سے محفل کو جاندار بنا دیا۔ یہ کیسے معلوم نہ تھا کہ یہ طوائف چچا دستگیر کی ہے۔ اس نے ایک چھچلتی نگاہ سے محفل کا جائزہ لیا۔ پینترہ جما کر بڑے رچاؤ کے ساتھ سب سے پہلے انور کا سہرہ گایا پھر دو چار غزلیں گا کر گھنگھرو باندھے اور ہر شعر کو اندازِ دلبری کے ساتھ گانے لگی۔

چقوں کے پیچھے بیٹھی مستورات بھی گانا سُنتی رہیں اور دو ایک پان کی گلوریاں خاصدانوں میں قاعدے کے ساتھ محفل تک ملازموں کے ہاتھ پہنچاتی رہیں۔ ایسے موقعوں پر طوائف کہاں سے آبراجتی ہے۔ اُس کو کیوں بلایا جاتا ہے۔ ہماری تہذیب کے ساتھ اُس کا وجود گندھا بندھا کیوں رہا۔

وہ ہمیں زندگی کا احساس دلاتی ہے۔ وہ یہ احساس دلاتی ہے کہ ہم زندہ ہیں اور زندگی کی خوشیاں ہمارے لیے ہیں۔ کسی خوب صورت جسم کو دیکھ کر زندگی کا اعتبار بڑھتا ہے۔

اِس شادی کی تقریب پر لڑکیاں جھما جھم کوندتی رہیں اور بشاشت سے ہنستی رہیں مگر نیاز قطب فیاض یعقوب اور ضمیر نے قطعاً نوٹس نہ لیا اور دلوں کو اور ہی قسم کی شرارتوں سے بہلایا۔ بڑوں سے چھپ چھپ کر سگرٹ پیتے رہے چرائی ہوئی الائچیاں سگریٹ پینے کے بعد چاب لیتے کہ بڑا کام کیا ہے۔ رکابی فرنی کی اڑا لاتے اور رل مل کر انگلیوں سے چاٹ جاتے۔ بیہودہ قوم لڑکیوں کی پلٹن ہمارے پاس سے گزر جاتی گویا ہم کہیں ہیں ہی نہیں اور ہماری کوئی شناخت نہیں۔ اور ہم تھے بھی کہیں نہیں اور نہ ہماری شناخت تھی۔ جاڑے کی چاندنی کو وُہ دیکھے جو گھر سے باہر نکلے۔ اور پھر چاندنی بھی اُس وقت چٹکتی ہے جب اُس کی طرف دیکھا جائے۔ ہم سب اندر کے خول میں بند تھے۔ مگر یہ کیسا خول تھا کیسی سائیکی تھی۔ ہم عمروں کا کیسا ذہنی اور نفسیاتی پس منظر تھا۔ ہم گھر سے باہر بہت ہوتے۔ ہندو لڑکیوں کو چھیڑتے انھیں ٹاپ ٹاپ کر کپڑے دھوتے اور نہاتے دیکھتے۔

کانچ کی گولیاں کھیلتے۔ زمین کی مٹی کو کھُرچ کر سوراخ بناتے۔ اُس پر گولیاں پھینکتے۔ انگشتِ شہادت پر کانچ کی گولی کو رکھ کر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے خوب دباتے اور مخالف کی گولی کا یُوں نشانہ بناتے جیسے پیدائشی نشانہ باز تھے۔ غلام دستگیر کے مکان سے باہر ہم کھلے میں کھیل رہے تھے۔ یعقوب کی گولی کا نشانہ باندھ کر ضمیر بڑے بھولپن سے کہہ رہا تھا، پل گولی دو گاڑھا، نیچے ووہٹی اُپر لاڑا۔ یعقوب کے والد چچا نور نبی ہمارے پاس سے مسکرا کر گزر گئے۔ جن آنکھوں میں ہمیشہ سہانا سا رُعب اور ملائم سا دبدبہ جھلکتا تھا اُن کی یہ زیرِ لب مسکراہٹ اور چمک میری سمجھ میں نہ آئی۔ کیا کیا ہم لڑکپن کے انجانے میں بکا کرتے تھے۔ اِس کا کیا علم ہمیں کہ جو کھیل کے بول ہیں اُس میں اک گُونہ لچریت اور فحاشی ہے۔

اے میری گولی پل دوسری پر اس طرح کہ دونوں کو گاڑھ دے یُوں جیسے دولہا دُلھن کو گاڑھ دیوے۔ بوجیے حضرت یہ بول ہماری لوک تہذیب میں کیونکر گھُس آئے۔ ایک نہیں ایسے کئی بول ہماری FOLKLORE میں ملتے ہیں۔ عرب تہذیب میں زیادہ ہماری تہذیب میں کم مگر اس طرح کے بول ریزہ ریزہ ضرور بکھرے پڑے ہیں جو تہذیبی لحاظ سے مرد کی جنسی فعالیت بحال رکھنے کے لیے محرک کا کام کرتے ہیں۔

۴

اہلِ پنجاب میں کمال کی صلاحیت دیکھی فارسی بولے تو ایرانی۔ عربی بولے تو مصری۔ یہ لوگ زندگی کو اپنانے کی کمال صلاحیت رکھتے ہیں۔ پنجاب کے دریا ستلج بیاس کے درمیانی علاقہ دو آب کے یہ لوگ یوپی میں جا کر ایسے مدغم ہوئے اور یوپی آگئے کہ روز مرہ زبان لباس زیور نشست و برخاست سارے اطوار وہیں کے ہو رہے ریشم کی انگشتیا نگندے پڑی ہُوئی دولائیاں جن میں دھنکی ہوئی دو چھٹانک رُوئی کی ہوائیاں ہوں اِنھیں کے ہاں دیکھیں۔ مرید غوث کی اہلیہ بوا پیاری بالکل یوپی کی بوا پیاری معلوم ہوتی تھیں۔ ڈوریئے کا کُرتہ، چھینٹ کا

تنگ پاجامہ چھوٹا قد کلّے میں پان کی گلوری ہاتھ میں چھالیہ کا بٹوہ۔ اردو ہر طرف ایسی مصفّا بولی جا رہی تھی کہ یہ جالندھر نہیں آگرہ ہے۔ دہلی ہے۔ لکھنؤ ہے نجیب آباد ہے۔ گورکھپور ہے۔ بوا پیاری کی ایک بیٹی کلثوم فاطمہ غلام محبوب سبحانی کی بیوی ہوئیں۔ دوسری بیٹی عبدالقادر سے بیاہی گئی جو بعد میں پاکستان سٹیٹ بنک کے گورنر متعین ہوئے جن کے بیٹے لفٹنٹ جنرل سعید قادر کابینہ میں وزیر رہے۔

عورتیں اِس گھرانے کی خالی کہاں بیٹھتی تھیں۔ بیٹھتیں تو ہاتھ میں سرائتہ کٹ کٹ چھالیہ کاٹتا۔ پاندان سفری ہو یا فرشی جب کھلتا مُنّے سے پتّے پر قدرے چُونا کتھّا لگتا۔ چھالیہ کے دو دانے رکھے جاتے۔ گلوری بنتی۔ پیسہ دھیلا اور چابیوں کا گُچھّا رکھنے کے لیے گھر میں پاندان کی تھالی سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی۔ دن بھر اِس پنجابی گھرانے میں پان یوں چبایا جاتا کہ دہلی والوں کا گھرانہ ہو۔

انگریز سرکار کی ملازمت کا حاکمانہ رعب اور داب اپنی جگہ اہم اور نہایت اہم مگر ریاست کی نوکری کا بھی اپنا چسکا۔ جس کو جو لگ جائے۔ دونوں بھائی ریاستوں میں ملازم رہے۔ ڈاکٹر دیوان علی نواب بہاولپور کے ذاتی معالج اور ڈاکٹر فرزند علی نواب خیرپور کے ذاتی معالج اور وزیر رہے پھر خیرپور سے امیر افغانستان کے ذاتی معالج ہو کر کابل چلے گئے۔ جہاں شاہی خاندان کے افراد سے قریبی مراسم پیدا ہو گئے۔ دیوان علی کلین شیو رہتے مگر ڈاکٹر فرزند علی کے کھلتے ہوئے گندمی رنگ پر خشخشی ڈاڑھی خوب سجتی۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے وقت کے پانچ نوجوان انگلستان روانہ ہوئے۔ بستی کے گھرانے سے ڈاکٹر دیوان علی کے بیٹے غلام جیلانی، بابو عطا محی الدین کے فرزند مہر محی الدین، جھانسی سے بابو نور احمد کے بیٹے عزیز احمد، بٹالہ سے بابو مختار احمد بار ایٹ لا کے فرزند خورشید احمد اور بابو دین محمد کے فرزند عبدالرزاق۔ یہ لڑکے ایک ہی سمندری جہاز میں بمبئی سے روانہ ہوئے۔ اپنی اپنی درس گاہوں کی جانب رخصت ہونے سے پہلے لندن کے اعلیٰ سلے ہوئے کپڑے پہن کر ایک یادگار فوٹو کھنچوائی جو ہر ایک نے اپنے اپنے والدین کو بھیجی۔

عزیز احمد میرے بہنوئی تھے۔ انھوں نے تصویر اپنے والد کو بھیجی۔ جنھوں نے دیکھنے کے لیے میرے والد کو ارسال کی۔ میں چھوٹا سا تھا مگر ابھی تک ذہن میں اُس خُوب رُو گروپ کی جھلک اپنی تمام حسن و رعنائی کے ساتھ محفوظ ہے۔ نوجوان کس قرینے سے بیٹھے ہیں۔ خوشبو کی ایک فضا اُس تصویر کے خد و خال پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ تصویر ننھی پھولوں کا گلدستہ تھا۔ جی چاہتا اِن پھولوں کی طرف دیکھتے چلے جائیں جیسے بہار کا رواں دواں قافلہ لمحہ بھر کو ہمارے سامنے رُک گیا ہو۔ اِن راج دلاروں کی جوانی کے سنورے سنورے نقوش مستانی آنکھیں چہروں پر شباب کی شگفتگی لبوں پر ملائم تبسّم جو دیکھتا گھر میں وہی کہتا۔ سب خوب صورت اور رعنا مگر خورشید احمد کے حسن کی تاب نہیں لائی جاتی۔ سب پر چھایا ہوا ہے۔ ہر ایک کے چہرے پر تابشِ شباب، آنکھوں میں زندگی کو جاننے کی چمک۔ اچھّے مستقبل کی آرزو اور شوق کی رفعت مگر خورشید احمد کا حسن حُسنِ یوسف تھا۔ یہ تصویر نہ تھی ایک مطلّا ورق تھا۔ مگر اے زمین لعین! آج ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں

ناموں کے ساتھ اگلے وقتوں میں سابقہ کے طور پر بابو کا لفظ استعمال کیا جایا کرتا تھا جو انگریزوں کی اختراع تھی۔ یہ لفظ جو عزّت و تکریم کا نشان تھا انگریزوں کا عطا کردہ ہونے کے سبب بڑا قابلِ عزّت سمجھا جاتا تھا ہندوستان کو بہت پسند آیا بہت قبولا گیا اتنا کہ یہ لفظ ہماری تہذیب اور کلچر کا حصّہ بن گیا۔ کئی مسلم گھرانے باپ کو ابّا جی کہنے کی بجائے بابو جی کہنے لگے۔ ہندو گھرانوں میں پتا جی کی بجائے بابو جی کہا گیا۔ یہ لفظ پنجاب کی بعض حدود میں باؤ جی بن گیا ابھی تک سرکاری دفتروں میں چھوٹے درجے کے کلرکوں کے لیے یہ لفظ خطاباً استعمال ہوتا ہے۔ انگریز کے وقتوں میں دیسی گماشتوں اور اہلکاروں کو فوج کے دفتروں میں بھی بابو کے لقب سے بلایا جاتا تھا۔ چنانچہ حاجی عطا محی الدین اور نور احمد کو بابو عطا محی الدین اور بابو نور احمد کہا گیا۔ مختار احمد جو میری اہلیہ کے نانا تھے اور ان کے بڑے بھائی محمد عمر ہر چند کہ یہ دونوں بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے بیرسٹر ایٹ لا تھے مگر دونوں کو بٹالہ اور امرتسر میں عزّت و تکریم کے طور پر بابو مختار احمد اور بابو محمد عمر کہا جاتا تھا۔ اُن کے ایک عزیز جلال الدین جو لاہور میں سیکرٹریٹ کے دفتر میں ملازم تھے عمر بھر انھیں باؤ جلال الدّین کہا گیا۔ سول سیکرٹریٹ کو لاٹ صاحب کا دفتر کہا جاتا تھا کیونکہ لوگ باگ گورنر نہ کہہ سکتے تھے اس لیے گورنر کو عام زبان میں لاٹ صاحب کہتے تھے میں اپنی راہ سے اُتر کر الگ پگڈنڈی پر جا چڑھا ہ جسے جملہ معترضہ کی پگڈنڈی کہتے ہیں۔ جب یہ چھوٹی سی پگڈنڈی راستہ کاٹتی ہے تو چلنا اس پر بھی ضروری ہو جاتا ہے کیونک اس پر سے بھی کبھی کچھ یافت ہو جاتی ہے۔ اِس پگڈنڈی پر سے بابو مختار احمد مل گئے جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک خوبصورت بیوی کے شوہر اور تین اولادوں کے باپ ہوتے ہوئے بابو نور احمد کی بیٹی محبوب کو بیاہنے جاتے ہ بابو مختار احمد کی بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی ہے جو ایک بچّی کی ماں بھی ہے۔ مختار احمد کے بیٹے خورشید احمد کی عمر گیا برس کی ہے اُس کے نئے کپڑے سلتے ہیں کیونکہ وہ اپنے باپ کی برات کے ساتھ اپنی سوتیلی ماں کو بیاہنے جا

کیسے نڈر اور عاشق صفت تھے ہمارے بزرگ !

جب اِس پگڈنڈی نے راستہ کاٹا ذکر جالندھر کے اُس گھرانے کا ہو رہا تھا جس کے لکھنؤ اور دہلی والوں اطوار تھے جہاں جہازی پاندان تخت پر موجود رہتا جس میں چھالیہ موجود ہوتے ہوئے بھی کنیز فاطمہ سراَتہ سے دو د کاٹ کر گلوری میں رکھتیں۔ پاندان سے اپنائیت رکھنے والوں کا یہ بھی ایک اسٹائل ہوتا ہے۔

کنیز فاطمہ کا بولنے کا اپنا اسٹائل تھا۔ اُن کی گفتگو سے شیرینی اور فصاحت خاص تھی۔ جب وہ بات کرتیں تو فضا خوشگوار گداز گداز محسوس ہونے لگتی۔ سننے والے کے کان میں زبان کی سلاست اور روانی رس گھولت یہ پہلا احساس تھا مجھے جو بچپن کی عمر میں ہوا کہ صحیح بولے گئے لفظ میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ اور پھر یہ احسا تھیئٹر سے مزید راسخ ہوتا چلا گیا۔

بابو عطا محی الدین کی اولاد میں کنیز فاطمہ سب سے بڑی تھیں۔ عقل و دانش اور تدبر سے جو انھیں مقدر ہوا ت وہ گھر اور گھر سے باہر ایک پرکشش اور محکم شخصیت بنتی چلی گئی تھیں۔ اُن کے چار دیور دیوان علی سردار علی نورنبی ا

غلام دستگیر سب اُن سے دبتے تھے۔ بھابی کے سامنے کسی کو سرتابی کی مجال نہ تھی۔ اُن کے مشورہ اور دانست کا یہ اثر تھا کہ اُن کے بہنوئی نور نبی نے اپنی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہ کی۔ شوکت اور شخصیت والی اس خاتون کے اطوار اور لہجہ میں ویسا ہی حاکمانہ وقار تھا داستان گو داستانوں میں جس کا ذکر کرتے آئے ہیں۔ مگر آپا بوّا کے لہجہ میں یہ حاکمانہ وقار نہ تھا۔ لہجہ اُن کا اور شخصیت اُن کی مٹھاس سے معمور تھی آپا بوّا بولتی تو منہ سے پھول جھڑتے جیسے ساون میں مہین مہین بوندیوں کی ٹھنڈی پھوہار برس رہی ہو۔ زندگی کا یہ کتنا بڑا احزنیہ ہوتا ہے کہ خاوند کے اُٹھ جانے کے بعد عورت کی شخصیت میں گرِہیں پڑ جاتے ہیں۔ زندگی کی تمام سرخوشی کافور ہو جاتی ہے۔

بابو عطا محی الدین کے ہمزلف نور احمد بٹالہ کے قریبی گاؤں فتوپور کے رہنے والے تھے۔ دستور کے مطابق جنہوں نے اپنے بڑے بیٹے رشید احمد کی شادی گاؤں میں اپنے عزیزوں کی لڑکی فاطمہ سے کر دی تھی جس سے ریاض احمد تولد ہوا۔ مگر رشید احمد نے بے چین اور غیر مطمئن خاوندوں کی طرح جو ہر دور میں موجود رہے ہیں فاطمہ کو اپنے گھر آباد نہ کیا اور فاطمہ نے غیر آباد بیویوں کی طرح جو ہر دَور میں موجود رہی ہیں گاؤں ہی میں اپنے والدین کے پاس رہائش رکھی جہاں ریاض احمد پلتا رہا۔

اِدھر ایک بہن کا بیٹا رشید احمد بے آباد۔ اُدھر دوسری بہن کی بیٹی آپا بوّا بیوہ۔ دونوں کا نکاح ہو گیا۔ شمیم اور ضمیر ننھال میں رہے۔ بڑی بیٹی سلمیٰ کو بے اولاد خالہ امیر بی بی متبنّیٰ کر کے اپنے ہاں لے گئی۔ آپا بوّا کے چلے جانے پر گھر کا انتظام چھوٹی بہن حبیب فاطمہ کے ہاتھ میں چلا گیا۔ مگر ہدایات دستور کے مطابق کنیز فاطمہ ہی کی طرف سے جاری ہوتیں۔ اپنے ماں باپ کے گھر کے اُن کے صبح و شام کے دو پھیرے بندھے تھے۔ اس طرح سب سے چھوٹی بہن حبیب فاطمہ نے حُسنِ خانہ کاری بڑی بہن سے سیکھ لیا۔

تین گھروں کی گاڑی عقل و دانش رکھنے والی اِس خاتون کے دم سے چل رہی تھی۔ اپنے گھر کی دیکھ بھال خاوند کے آرام و آسائش کا خیال اپنے سے چھوٹی مرحومہ بہن کی اولاد کی تعلیم و پرورش۔ پھر اپنے ماں باپ کے گھر کا انتظام و انصرام۔ حیرت ہوتی کنیز فاطمہ کے کندھے کبھی بوجھ محسوس نہ کرتے۔

اُن کی خود اعتمادی تھی جس نے گھر اور باہر انھیں ایک محکم اور پُرکشش شخصیت بنا دیا تھا۔ بیکار اور بے معنی رسمیں اُن کی مضبوط اور محکم شخصیت کے سامنے نہ ٹھہر سکیں۔ آدمی کے مرنے پر پہلی چار جمعراتوں کو کھانا پکتا تھا جو ہر عزیز کے گھر خوان بھر بھر کر بھجوایا جاتا۔ چالیس دن تک صفِ ماتم بچھی رہتی۔ عورت ایک آتی ایک جاتی۔ بیکار گفتگوؤں کی جگالی ہوتی۔ کیسا احمقانہ رواج ہے اور ہم اِن رواجوں میں کس طرح جکڑے گئے ہیں۔ دماغ نے سوچا۔ ارادے کی آنچ جلی۔ سوچ نے ایندھن فراہم کیا۔ کنیز فاطمہ کے باپ کے چچا برخوردار خاں جنہیں گھر میں بابا برخوردار کہا جاتا تھا۔ جب ۱۹۲۴ میں بے اولاد فوت ہوئے تو کنیز فاطمہ نے اعتماد سے کہا:

"جمعرات کو عزیزوں کے گھر کھانا نہیں جائے گا۔"

چھوٹے بڑوں نے تعجب سے اُس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی: "یہ فضول رسم آج سے ختم سمجھو۔"

قُل ختم ہونے پر مستورات کے گوش گزار کرنے کو کنیز فاطمہ نے میری بہن سے کہا: "امیر بانو! قُل کی رسم ختم ہو چکی۔ اب قُلوں کے بعد صف نہیں بچھے گی۔ بیبیوں سے کہو آ کر چارپائیوں پر بیٹھ جائیں۔"

بہت کھُسر پھُسر ہوئی۔ چہ میگوئیاں ہوئیں۔

"برخوردار لاولد مرا تھا اس لیے کنیز فاطمہ نے ایسا کیا۔ اس کا کوئی اپنا ہوتا تو دیکھتے ہم کیسے صف اٹھوا دیتیں۔"

رسموں سے چھٹکارا دلوانے کی کنیز فاطمہ کی دوسری کوشش اپنی ساس کے انتقال پر ہوئی۔ گھر میں موت ہو جائے تو اس کے بعد آنے والی عید نہیں منائی جاتی۔ اُن دنوں یہ باریک باریک مہین بنی بنائی سویّاں بازار میں نہ بکتی تھیں گھروں میں آٹا میدہ گوندھا جاتا سویّاں بنانے والی مشین میں مختلف سوراخوں والی چھلنی لگتی۔ ہتھی گھما کر آٹے کے پیڑے پر دباؤ ڈالا جاتا۔ سویّوں کے لچھے چھلنی میں سے نکلنے لگتے۔ خاص انداز سے ہاتھ کی ہلکی عورت جھٹکا دے کر توڑتی سف چادر پر رکھے سرکنڈوں پر سوکھنے کو ڈال دیتی۔ یُوں عید کی پُرمسرت آمد پر زنانخانہ ایک اکسائٹمنٹ اور مصروفی سے بھر جاتا۔

کنیز فاطمہ کی ساس کا انتقال ہُوا تو دُوسرے مہینے عید پڑتی تھی۔ کنیز فاطمہ نے کہا: "مرنا جینا خدا کے ہا میں ہے۔ عید کی خوشی خدا کا فرض پُورا کرنے کی خوشی ہے سویاں بٹ جائیں گی۔"

میدہ سُوجی منگایا گیا۔ کسی نے کہا ساس مری ہے۔ ماں مرے گی تو دیکھیں گے۔

چھ مہینے بعد کنیز فاطمہ کی والدہ بیوی جی کا انتقال ہوا۔

عید آئی تو گھر بار نے کنیز فاطمہ کی طرف دیکھا۔ کنیز فاطمہ نے میدہ سُوجی لینے کو نوکر بازار بھیجا۔ کوٹھڑی سے مٹ نکلی۔ سویاں بٹی گئیں۔ شاگرد پیشہ لوگ عید کا سلام کرنے کو آئے۔ سویّاں لے کر گئے۔ نوکروں کو عید کے پ دئے گئے۔

لڑکے کی شادی کے موقع پر برات سے دو روز پہلے بجرے کی رسم ہوتی تھی۔ دس دس پندرہ پندرہ د پکتیں۔ طباخ میں الگ الگ زردہ اور پلاؤ بھرا جاتا جو رشتہ داروں میں فی کس فی طباخ جاتا۔ مہندی کی را گھروں میں فی کس دس دس نان اور آلو گوشت بھیجا جاتا۔ مہندی کی رات جو آتا پلاؤ زردہ کھا کر جاتا۔ یہ دونوں کنیز فاطمہ نے ہٹا کر ولیمہ کر دیا۔ لوگ کہتے رہے ہم نے اتنا کھلایا اب ہمیں یُوں ٹرخایا جا رہا ہے۔ اُنھوں نے بات پہ کان نہ دھرا۔

جس رات دلہن اور دُولہا کے ہاتھ پہ مہندی لگائی جاتی مراسنیں ساری رات گاتیں۔ دُولہا کی ماں

سے پہلی بیل پاؤنڈ کی دی جاتی ۔ پاؤنڈ اشرفی کہلاتا تھا۔ اگر پاؤنڈ کی بیل نہ ہوتی تو زیور کی بیل دی جاتی تھی۔ کنیز فاطمہ کہتی : یہ گانے والیوں کو اُن کا حق ملتا ہے جو خوشی کی تقریب کو زیادہ پُر رونق، زیادہ پُر مسرت بنا دیتی ہیں۔ سخی دان کرتا ہے غریب کا پیٹ بھرتا ہے ۔پھر یہ ایک طرح سے دولہا دلہن کا سر صدقہ ہے۔ دافع بلا ہے۔ جنہیں یہ ڈوم مراثی لوگ اتنی ساری دعائیں دیتے ہیں۔ انسان کا دعائیں بھی بہت بڑا اثاثہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ خوشی کے موقعوں کا انتظار کرتے ہیں۔ ان حاجتمندوں کی ایسے موقعوں پر پرورش ہوتی ہے۔ وہ ایک حدیث کا حوالہ دیتیں کہ "رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ایک شادی پر گئے۔ اُنھوں نے پُوچھا وُہ دف بجانے والا کہاں ہے اُسے بلاؤ کچھ گانا گائے۔ اُس کے آنے سے رونق ہو جاتی ہے۔

کنیز فاطمہ اپنے میاں کے ہمراہ میری شادی پر بٹالہ آئیں اور آنے سے چار روز پہلے مراسنوں کو بھجوایا جنھوں نے طبلے اور ہارمونیم پر اردو پنجابی کے علاوہ مولینا گرامی اور حافظ کا فارسی کلام بھی گایا۔ اباجی ذاتی طور پر گرامی سے واقف تھے۔ گرامی کی اِس غزل پر اُنھوں نے بہت داد دی ؎

آمادہ بہ قتلِ من آں شوخ ستمگارے
ایں طرفہ تماشا بیں ناکردہ گنہگارے

(وہ شوخ ستمگر میرے قتل پر آمادہ ہو گیا یہ کیسا تماشا ہے اور طرفہ تماشا یہ کہ ناکردہ گنہگار کے قتل پر۔ اُس شوخ کی ستمگری کی یہ حد ہے)

چشم است سیہ مستے دل ہست سیہ کارے
دردے بہ جگر دارد بیمار ز بیمارے

(آنکھ اُس کی سیہ مست اور دل سیاہ کار ہے جو چشمِ بیمار چشمِ سیاہ دیکھتا ہے بیمار ہو جاتا ہے، یہ ایسا درد ہے جو ایک بیمار سے دُوسرے کو لگ جاتا ہے)

از عشق بگو با من با شیخ چہ می گوئی
ہر کارے و ہر مردے ہر مردے و ہر کارے

(قدرت نے مختلف کاموں کے لیے مختلف لوگ چُنے ہیں۔ عشق کے لیے ہمیں چُنا ہے اس لیے عشق و عاشقی کی بات ہم سے کر زاہد و شیخ سے نہ کر۔ اُس کی سمجھ میں خاک نہیں آئے گا)

آہم بہ سرِ راہے ما ہم بہ سرِ بامے
دیوار بہ امیدے امید بہ دیوارے

(میرا محبوب چاند کی طرح حسین و جمیل ہے جو سرِ بام دکھائی دے رہا ہے۔ میں اپنی راہ چلتا ہُوں اور اُس کے لیے آہیں بھرتا ہُوں۔ اُمید کی دیوار کھڑی ہے اور دیوار کو بھی امید ہے

کہ کبھی تو یہ محبوب جو سرِ بام ہے نیچے اُترے گا یا عاشق دیوار پہ سے اُس تک پہنچے گا)

ہاں جرمِ گرامی نیست جز کاہلی و پیری
دیرینہ غلامے را مفروش بہ بازارے

(گرامی کی پیری اور کاہلی اُس کا جُرم نہیں ہے۔ اِسے گرامی کا جرم نہ گردان۔ اُس کے دل میں
تیری محبت ابھی تک ویسی ہے اس لیے اپنے اِس دیرینہ غلام کو بازار میں فروخت نہ کر)

اباجی نے ساری غزل کا لُطف اٹھایا اور واہ وا کیا۔ مگر جب مقطع انھوں نے دوبارہ گنوایا اور داد دی تو ساختہ پرداختہ مؤدبانہ طریقے سے گوماں میراسن نے آداب کیا۔ اگلے روز ناشتہ پر کنیز فاطمہ اباجی سے کہنے لگیں: "چچا جان! بابر کے ہاں لڑکی پیدا ہو تو نام منزّہ رکھا جائے لڑکا ہو تو ہمایوں۔"

یہ سُن کر میں شرما گیا۔

لڑکی ہوئی، نام منزّہ رکھا۔

۵

جدّی حویلی سے باہر چوگان میں فرش پر دری بچھی۔ دری پر جاجم جاجم پر گوٹے کناری کے جوڑے سجے۔ کچھ دیوار پر لٹکے جن پر مقیش کے ستارے اور گوکھرو ٹم ٹم جھلمل کرتے بڑے اچھے لگتے۔

والد مرحوم نے آپا وزیر کے جہیز میں دُودھ دینے والی بھینس بھی دی جو جہیز کے قریب بندھی تھی۔ سجاوٹ کے لیے اُس کی پیٹھ پر پھولدار پھلکاری پڑی تھی۔ گردن ملنے پر گلے میں گھنٹی ٹن ٹن بجتی۔

مِس بزرگ کا انتظار تھا۔ لفظ مس بزرگ کانوں کو عجب سا لگتا۔ برف جیسے سفید بالوں کا جُوڑہ، اوپر ہیٹ، سفید لمبا سایہ۔ یہ بوڑھی انگریز عورت عیسائی تبلیغی مشن کی سربراہ تھی جو اپنی بزرگی اور پاکیزہ صُورت کی وجہ سے بٹالہ میں مس بزرگ کے نام سے مشہور تھی۔ جب ہم لوگ وطن آتے تو مِس بزرگ ہماری والدہ سے ملنے آتی۔ ٹوٹی پھوٹی اردو بولتی۔ دو غیر اہم بچے الطاف میرا چھوٹا بھائی اور میں دبک کر ایک کونے میں اِس نُور کے بُت کو اہمیت سے دیکھتے۔

مس بزرگ نے جہیز دیکھ کر کچھ اباجی سے کہا۔ وہ خوشی سے مسکرائے۔

چوگان میں جہاں جہیز بچھا تھا اُس کے سامنے مضبوط اینٹ کی ایک چُونے گچ حویلی موجود تھی۔ اُس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ اِس نادان بے سمجھ بچے کا دل اِس حویلی سے ایک دن ایسا اٹکے گا کہ اس کو صدہا بہاروں کی خوشبوئیں یہیں پنہاں ملیں گی۔

اُن دنوں برات کو بھی سجایا جاتا۔ آگے آگے سبز کاغذ سے بنے قدِ آدم سرو ہوتے۔ جن کو سروِ رواں کہا جاتا۔ ملازموں نے ان کو یوں سیدھا اٹھایا ہوتا جیسے سرو کا بوٹا بھی چمنستان سے نکل کر برات کے ساتھ

ہو لیا ہے۔ بری کے جوڑے ڈُوم ڈومنیوں نے سر پر اٹھائے ہوتے جو چنگیروں اور تھالوں میں سجے ہوتے۔ اِس طرح سے بُری اور جہیز کی نمائش ہوتی۔ آگے آگے باجا ہوتا پیچھے دُولھا سہرا باندھے گھوڑی پر سوار۔ دُولھا کو سہرے کے پیچھے منہ کو رومال سے ڈھک کر رکھنے کی تاکید کی جاتی۔ اِس میں بھی کئی بھید تھے۔ رنگ کا سیاہ ہو تو معلوم نہ ہو پائے۔ منہ چوڑا، دانت بدنما ہوں تو دیکھنے والے کی نگاہ نہ پہنچے۔ صورت کا اچھا ہو تو نظر نہ لگے۔

دُولھا کے پیچھے پیچھے دو آدمیوں نے کاغذ کا تخت اٹھایا ہوتا۔ یہ تختِ رواں کہلاتا۔ یعنی دُولھا اپنا تخت ساتھ لے کر آیا ہے تخت از بس بانس کی قمچیوں سے بنا ہوتا مگر ہنرمندی کا ایک نمونہ ہوتا۔ جب برات لڑکی والوں کے ہاں پہنچتی تو لڑکی والوں کی طرف کے کچھ لڑکے بالے لُوٹ مچاتے۔ برات والوں کے ہاتھوں سے سرد اور تختِ رواں لے دوڑتے۔

ہماری آپا کی برات اِسی دھوم سے آئی۔

تخت اور سرد رواں کی کھینچا تانی کی تصویر میرے ذہن کی جھالر پر ابھی تک ٹمٹما رہی ہے۔

آپا کا دُولھا عزیز احمد شادی سے بیس روز بعد ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کو پانچ سال کے لیے انگلستان روانہ ہو گیا پانچ سال کا دورانِ وقت وقت نہ تھا۔ ایک طویل مدت تھی۔ ایک عرصۂ بعید تھا۔ صرف بیس دن کی دلہن کے لیے جدائی کا نہ بیتنے والا ایک زمانہ تھا جس کو کوئی اداس برہن کس طرح بتا سکے گی! اتنی ہمت کہاں سے آئے گی! اتنا حوصلہ کس کا ہو گا! سسرال جاتی تو اِس طرح آبدیدہ ہو کر جاتی کہ ہم سب غمگین ہو جاتے۔ اُس کا خُسر بابو نور احمد اباجی کا خلیرا بھائی تھا اور اس کی ساس کرامت بی بی بابو عطا محی الدین کی سالی۔ سب اُسے گھر میں بھابوجی کہتے۔ رشید، عزیز، ادریس اور مظہر چار بیٹے تھے اور اس کی بیٹی محجوب مختار احمد سے بیاہی گئی جو بیوی بچوں والا تھا۔ مختار احمد اباجی کا ہم عمر تھا۔ اس ناتے سے ہم اُسے بھائی مختار احمد کہتے۔

ایک روز مختار احمد جالندھر اپنے سسرال گیا تو میری بہن انگنائی میں بیٹھی جھوٹے برتن مانج رہی تھی اُس نے اپنی ساس سے کہا:

”بھابوجی! وزیر بیگم سے برتن نہ منجوایا کرو۔“

”دِہ تاں، کیوں؟“

وہ بولا:

”یہ غلام اکبر کی بڑی لاڈوالی بیٹی ہے۔“

”ہُوؤ۔“

”ہُوؤ“ دوآبہ کی بولی کا روزمرہ تھا، جس کا مطلب ہوتا ”پھر کیا ہوا، کوئی بات نہیں، SO WHAT“۔

اور "دِہ تاں" کا لفظ جملے کو مضبوط بنانے کے لیے یا دو جملوں میں پیوند لگانے کو بولا جاتا۔

پہلی شادی نواب احمد کی گاؤں میں ہوئی، دوسری بھابوجی سے۔ پہلی کا کیا دوسری کا تو فرمانبردار رہا۔ پھر داماد مختار احمد، محبوب فاطمہ کو محبوب جی محبوب جی کہتا پھرا۔

معلوم نہیں ہوتا مگر کچھ یوں ہے دوسری کا دولہا جو غلام بن کر رہتا ہے پہلی بیوی کا تو صرف خاوند، مگر دوسری کا کچھ عاشق بھی۔ ہماری فکشن کا یہ بڑا دلچسپ موضوع ہے۔ اِس کی تصویر خواہ تجریدی بنے خواہ روائتی، یہاں وہاں اِس میں رنگ مزے کے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

ماں باپ کی طرف سے شادیاں صغرسنی میں کر دی جاتیں۔ باہر کی آب و ہوا سے مرد کا ذہنی افق کشادہ ہوتا چولھے چوکے کی مجذوب ذات عورت بچوں کے گوہ موت میں لتھڑی رہتی۔ یہ سارا عمل میکینکل بنا رہتا۔ مرد کی گھبراہٹ باہر کی طرف دوڑتی۔ چوکڑیاں بھرنے والا ہرن اُفق کی راہوں پر نکل بھاگتا۔ جہاں کہیں دلبری کا سایہ ملتا بیٹھ جاتا۔ کوئی پری جس کنج میں ہوتی کوئی چڑیل جس ویرانے میں ملتی اُس کی زلفوں کا اسیر ہو جاتا۔

اسیر ہونے کی میٹھی میٹھی باتیں رسیلا رسیلا عمل جو بند دیوان خانے میں ہوتا اُس کی خبر زنان خانے میں نہ پہنچ پاتی۔ داشتہ ہے اور اُس کے بطن سے اولاد بھی۔ مگر اس راز کی خبر بیوی کو نہ ہو پاتی تھی۔ میاں کے مرنے پر بھید کھلتا ایک اور بھی تھی جس سے میاں کے نطفے نے اتنے پیدا کیے۔ مگر اس وقت کلیلیں بھرنے والا ہرن تمام جھگڑوں سے بری الذمہ حوروں کے درمیان جنت میں بیٹھا شرابِ طہورا پی رہا ہوتا۔

ماؤں، بیٹیوں اور بہنوں کو باہر والی عورت سے محفوظ رکھنے کے لیے ایوب خاں کے عہدِ جلالت میں عائلی قانون نافذ کیا گیا جس میں بات اتنی سی تھی کہ دوسری شادی سے پہلے پہلی سے اتنا لکھوا لو اجازت دی۔ اِس کو اسلامی مسئلہ بنا لیا گیا۔ بعضوں نے اِسے دخل در معقولاتِ نفس سمجھا۔ پاؤں سے آگ لگی سر سے نکل گئی۔ چار بیویوں کا مسئلہ بنانے والے آزاد پنچھی نے سمجھا اُسے چڑیا گھر میں بند کیا جا رہا ہے۔ تعجب ہے انگریز کے دورِ حکومت میں ہندوستان میں ہندوؤں کی مذہبی رسم ستی کے خلاف قانون نافذ کیا گیا تو کوئی مخالفت نہ ہوئی۔ عورتوں کی جان بچ گئی۔ ورنہ ہندو عورت اپنے مُردہ خاوند کے ساتھ چتا پر زندہ جل جاتی تھی۔ ستی کی یہ رسم ہندو دھرم کا ایک اہم جزو تھا۔ جلنے والی کا تمام گہنا گٹا، کپڑا لتا برہمن کو ملتا تھا۔ ہر ستی پر پنڈت کے وارے نیارے ہو جاتے تھے۔ تاریخ میں کہیں درج نہیں کہ انگریزوں کے خلاف جلسہ جلوس نکلا ہو۔

اگلے وقتوں میں ایک شخصیت ہوتی کہ لوگ باگ ہر قسم کا مشورہ لینے کو اس کی طرف رجوع کرتے۔ وہ جھگڑا فسد بھی نپٹاتا۔ شادی بیاہ کی صلاح بھی دیتا۔ منشی رکن دین بھی ایک ایسا ہی بزرگ تھا۔ ضرورت مندوں کا گہنا پاتا دبا کر رکھ لیتا۔ سود پر قرض بھی دے دیتا۔ اُس نے اپنے بیٹے محمد عمر کو بیرسٹری کے لیے انگلستان بھیج دیا۔ واپس آ کر امرت سر میں وکالت شروع کی جو خوب چمکی۔ یہ مشکل کہ مسلمانوں کے ذہین لڑکے مالی کمزوری کی وجہ سے ۱۶۱

تعلیم سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے تھے۔ اُس وقت کا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ محمد عمر نے امرتسر میں مسلم ایجوکیشن کانفرنس کی بنیاد ڈال کر اس مسئلہ کو حل کر دیا۔ جن قابلِ ذکر نوجوانوں کو اس کانفرنس نے اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفے مہیا کیے اُن میں جسٹس منیر احمد اور کرنل سلامت اللہ کے نام سرِ فہرست نظر آتے ہیں۔

اُس وقت ایک عجیب اندھیر تھا کہ تعلیم کے اُجالے کا دامن شام کے بجھے ہُوئے اندھیرے کے ساتھ باندھ دیتے یہ سارا عمل بڑوں کے ہاتھوں سرزد ہوتا تھا۔ مرد کتنا بھی تعلیم یافتہ ہوتا دم نہ مار سکتا۔ اُس کے بعد جو ہو سو ہو۔ شادی بہرحال بخیر و خوبی انجام پائی۔ شادی بخیر و خوبی انجام پائی کا جملہ جو آج تک پڑھنے میں آتا ہے اور لکھا جاتا ہے انھیں وقتوں کی یاد ہے جب مرد کی خیر سے گزرتی نہ عورت کی خُوبی سے۔ بڑوں کے ہاتھوں یہ مصنوعی مصنوعی اوڑھی ہُوئی اوڑھنیاں اپنے اوپر نامانوس سی رہتیں۔ محبّت کی صداقت سے یہ ناآشنا لوگ بس زندگی کی سطح پر زندہ رہتے۔ ایک طرف داشتہ دُوسری طرف بیوی دونوں مصنوعی بیویاں بنی رہتیں۔ یہ تمام پروسس خود کارانہ سادہ دلانہ سا بنا رہتا۔ اِس قدر سادہ دلانہ کہ بار ایٹ لا جامہ زیب خوش پوش خوش شکل محمد عمر تاریک راہوں میں مارا گیا۔ اُس کی شادی منشی رکن دین نے ایسی عورت سے کی کہ میرے نامۂ سیاہ سے زیادہ اُس کے چہرے کا رنگ سیاہ تھا۔ دو لڑکیاں لطیفہ اور سکینہ پیدا ہُوئیں جو ساری باپ پر گئیں۔ ایک آفتاب، دُوسری مہتاب۔ زندگی میں روشنی پیدا کرنے کے لیے اُس نے چاند نام کی داشتہ رکھ لی جو ہفتے میں ایک مرتبہ دیوان خانے میں رونق افروز ہوتی۔

اب شاید رکن دین نے کچھ سوچا کہ دوسرے بیٹے مختار احمد کے لیے صورت شکل کی لڑکی ڈھونڈی گئی۔ اِس کا ارادہ زمینداری مختار احمد کے سپرد کر دینے کا تھا مگر قدرت کو جو منظور ہو۔ مختار احمد تین بچّوں کا باپ تھا کہ اُس کا ماموں برکت علی سندھ سے اپنی نو بیاہتا بیوی لے کر بٹالہ آیا۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے جگ کے صلاح کار رکن دین کو معلوم ہُوا تو وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ مختار احمد کو بیرسٹری کے لیے لندن بھیج دیا گیا۔

برہن سندھ میں اُس کی جُدائی میں گُھل گُھل کر مر گئی۔ برکت علی کا دل ایسا ٹوٹا کہ اُس نے پھر ساری عمر شادی نہ کی۔ گھروں میں کیسے کیسے فسانے ہیں! کیسی کیسی داستانیں ہیں۔ ہجر و وصال کی کیسی کیسی گھڑیاں جامِ بلوریں میں ذرّہ ذرّہ ہو کر گرتی رہتی ہیں۔

مختار احمد بیرسٹر ایٹ لا جب اپنی خوش شکل بیوی سے پُوچھتا آج کون سا دن ہے تو زہرہ انگلیوں پر گننے لگتی اور کہتی: ہفتے کے بعد اتوار، اُس کے پیچھے پیر، پھر ہوا منگل، منگل کے بعد بُدھ، بدھ بعد جمعرات۔ اتنے میں مختار احمد ڈیوڑھی سے باہر نکل چکا ہوتا اور جب زہرہ اپنے خوب صورت دہن سے کہتی: آج جمعہ کا دن ہے تو میاں فٹن میں بیٹھ کر جا بھی چکا ہوتا۔

بٹالہ سے لاہور کی طرف بیس میل دُور امرتسر اور پٹھانکوٹ کے رُخ بائیس میل پر گورداسپور۔ امرتسر میں

محمد عمر، گورداسپور میں مختار احمد۔ محمد عمر کی طرح مولوی غلام محمد اختر بھی امرتسر کے اکابرین میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ اُس کی داشتہ کا نام وارو تھا جس سے بعد میں نکاح پڑھوا لیا گیا تھا۔

مختار احمد نے ایک روز وارو سے کہا: "میری بیوی زہرہ میرے مقابلے میں ذہنی طور پر کم تر ہے۔ اُس سے اولاد تو ہوگئی ہے مگر دل نہیں مل رہا۔ تم میرے لیے کوئی رشتہ دیکھو۔ تمہارا اتنے لوگوں سے ملنا جلنا ہے۔"

وارو بولی: "میرے ذہن میں بابو نور احمد کی بیٹی محبوب فاطمہ آرہی ہے۔ بابو نور احمد مولوی صاحب کا ملنے والا ہے۔ یہ لوگ ساری عمر آگرہ لکھنؤ کانپور میرٹھ کی طرف رہے ہیں۔ اردو بولتے ہیں۔ پان کھاتے ہیں سارا رہن سہن اُدھر کا ہے۔ بیٹی اُن کی محبوب فاطمہ بری نہیں۔"

مختار احمد جیسا رشتہ نور احمد کے خواب و خیال میں نہ آیا ہوگا۔ بیٹی کی عمر بیت رہی تھی۔ یہ الگ بات کہ مختار ا
اُس وقت ایک نواسی کا نانا تھا۔

مختار احمد زہرہ کے مقابلے میں ایک فیشن ایبل بیوی بیاہ لایا۔ آگے آگے وہ ہوتی پیچھے پیچھے پاندان۔ سرائتہ سے کٹ کٹ چھالیہ کاٹتی۔ ہونٹوں پر لاکھا جما رہتا۔ پان کی کترن چباتی اردو بولتی۔ نئی بیوی کے آ
سے گھر کی فضا ڈھل کر نئی ہوگئی۔

گورداسپور والی کوٹھی میں مختار احمد کے پاس محبوب اور بٹالہ کی جدی حویلی میں اپنی اولاد کے پاس زہر
محبوب سے جب کوئی اولاد نہ ہوئی تو اس کا جلاپا سوکن کی اولاد سے بڑھنے لگا۔ ماں باپ کے گھر جالندھر جاتی۔ ٹو
سے ٹونے ٹوٹکے کی پوچھ گچھ کرتی۔ میرا دل تپتا ہے تو سوکن کا بھی تپے۔ مختار احمد اُس کا دشمن ہو میرا غلام بنا
ہو تو میرا اور کسی کا نہیں۔ پیروں فقیروں سے یہی کہتی پھرتی۔ جتنے تعویذ مختار احمد کو پلاتی وہ اُتنا ہی اپنی اولاد
ملنے جاتا۔ جتنے سوکن کے خلاف ٹونے ٹوٹکے کرتی اتنا ہی زہرہ کا ذکر اذکار رہتا۔

ایک مجذوب جو ملا تو اُس کے پاس چلاتی روئی کہ بہت تعویذ دبائے بہت لٹکائے بہت پلائے
دراز قد لمبے چوڑے مختار احمد پر کوئی اثر نہیں۔ سب اُلٹے پڑتے رہے۔ زمینوں میں فصل زیادہ اُگی۔ جائداد اور خر
وکالت اور چمکی۔ اُسے کوئی بپتا پڑے۔ اُس کے بچوں پر کوئی مصیبت نازل ہو، کوئی قیامت آئے۔ کوئی طو
اُٹھے، کہرام مچے۔

کہتے ہیں کوئی عورت شاہ مقیم کی قبر پر عجیب اُوت پٹانگ منت لے کر گئی جو پوری ہوئی۔ یہ گورکھ دھند
عجیب ہے۔ ساہیوال کے قریب ایک گاؤں شاہ مقیم ہے جہاں کوئی بزرگ دفن ہیں جن کا نام شاہ مقیم تھا۔
سال پہلے کا واقعہ ہے ایک جاٹ عورت نے جا کر کہا اگر اس کا خاوند مر جائے تو ایک بکرے کی نیاز نذر
محلے کی کچھ پڑوسنیں بھی مریں۔ جو رہ جائیں اُن کو زور کا بخار چڑھے۔ فقیر کی جھگی جہاں دیا جلتا رہتا ہے جل کر
ہو جائے۔ فقیر کا کتا جو میرے محبوب کو بھونکتا ہے مر جائے۔ گلی ایسی ویران ہو جائے کہ میرا یار کھلے ب

پھر سکے۔ پنجابی شاعر نے جاٹ عورت کی دُعا کو اپنی نظم میں یُوں باندھا: ؎

جُرے شاہ مقیم دے اِک جٹی عرض کرے — بکرا دیواں پیر دا جے گھر دا سائیں مرے
پنج ست مرن گوانڈھناں باقیاں نوں تاپ چڑھے — کُتّی مرے فقیر دی جہیڑی چَوں چَوں نت کرے
تے جُھگّی سڑے فقیر دی جتھے راتیں دیوا بلے — سُنجیاں ہوون گلیاں وچ مرزا یار پھرے

کہتے ہیں جاٹ عورت کی یہ ساری مرادیں پُوری ہوئیں۔

محبوب نے بھی مجذوب سے واد فریاد کر کے سخت ٹوٹکا دینے کو کہا۔ ٹونے تعویذ کر چکی تھی اب ٹوٹکے کی ضرورت تھی۔ جالندھر میں مسلمان شبرات کے تہوار پر آتشبازی بہت پھُونکتے تھے۔ آگ کا تماشا بھی بڑا دلچسپ تماشا ہوتا ہے۔ جکڑے بندھے منضبط بارود کا آتشبازی کی شکل میں پھٹنا آگ کا اُچھلنا کودنا ناچنا شبرات پر بڑا مزہ دیتا، خون میں گرمی پیدا کرتا۔ پٹاخے کئی قسم کے۔ پوپٹ پٹاخہ۔ زمینی پٹاخہ، سنی پٹاخہ، پھلجھڑی پٹاخہ، لڑی پٹاخہ، بھلی مڑھ پٹاخہ۔ گھُن گھیر، ریٹھہ، ہوائیاں، جلیبی، چٹین، انار، چھچھوندر، پھلجھڑی، مہتابی، شششوند ریکلا۔ یہ نام سُن کر ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگتی مگر جالندھر میں آتش بازی کی ایک خاص چیز بنتی تھی جس کو چلانے والا مضبوط بازو کا آدمی ہوتا۔ اِس آتش بازی کو ٹوٹکا کہتے۔ آتشباز بھینسے کی انتڑی تی خاص جھلی کے اندر بڑی مہارت سے خاص بارود بھرتا۔ چلانے والا دائیں ہاتھ کی مضبوط گرفت میں ٹوٹکا پکڑتا۔ بازو کو یُوں اکڑاتا کہ زمین کے متوازی ہوتا۔ دوسرا آدمی آگ دکھاتا، ٹوٹکا پھڑپھڑ جلتا شوں شوں کرتا دُور دور تک چنگاریاں پھینکتا۔ زد میں آتا تو جاندار کی طرح چلاتا چیختا۔ سارا بازو اُس وقت آدمی کا کانپتا۔ اگر ہاتھ سے نکل گیا تو سامنے والوں کی خیر نہ ہوا مجمع کو چیرتا زخمی کرتا چلاتا آگ لگاتا جھلستا جلاتا نکل جاتا جالندھر میں ٹوٹکا چلانے والوں کی خاص ٹولیاں ہوتی تھیں جو آمنے سامنے کھڑی ہو کر مظاہرہ کرتیں اور دونوں طرف دیکھنے والوں کا ٹھٹھ لگ جاتا۔

محبوب نے ہاتھ جوڑ کر فقیر سے کچھ ایسا ٹوٹکا دینے کی منت کی جو زخمی کرتا آگ لگاتا نکل جائے۔

کیا ناک نقشہ پایا تھا مختار احمد کے بیٹے خورشید احمد نے۔ کیا حُسن تھا اُس پر۔ کیا خط و خال تھے اس کے کیا چلبلاہٹ اور ہنسی ٹھٹھول کا لہجہ تھا اُس کا۔ محبوب کو ایک نظر نہ بھاتا۔

سب سے بڑی بیٹی خورشید بیگم کچھ ماں کی طرح کھلتا ہوا رنگ کچھ باپ کی طرح باوقار نقشہ، نکلتا ہُوا قد، بھرا بھرا بدن، عربی اردو سے مزیّن، متقدمین کے اشعار ازبر۔ محبوب کو مزید جلن ہوتی۔ خورشید بیگم کا شوہر محمد حسین سُرخ و سفید بھرے بھرے رخسار گورا چٹا سفید پتلون پہن کر کرکٹ کھیلنے کو نکلتا تو لوگ دیکھتے رہ جاتے۔ یہ کون ہے۔ کس کا داماد ہے۔ کس کا بیٹا ہے۔ محبوب کی آنکھوں کا کانٹا تھا۔ خورشید بیگم سے چھوٹی حبیب پتلی دبلی سی نوخیز خوب صورت سی لڑکی جس کی آنکھوں کی پتلیوں میں باپ کی سی ذہانت، تدبر اور دانش سر پر اوڑھنی لے کر مغلانی سے قرآن مجید کا سبق لیتی تو محبوب کا جھوم جھوم کر پڑھنے والی کی اوڑھنی کو آگ لگا دینے کا

جی چاہتا۔

یہ رسا بسا جما جمایا گھر بستے کھیلتے چہرے اسے قطعاً اچھے نہ لگتے۔ محبوب نے کس کس دہلیز کے نیچے آ دفن کیے۔ کن کن درختوں کی ٹہنیوں سے باندھے۔ کیا کیا دہکتی آگ پر چھڑکا کہ سب کچھ اُس کی کوکھ کی طر بنجر اور شور آلود ہو جاتے۔

مختار احمد کا داماد محمد حسین کسان ریلوے اسٹیشن پر اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر تھا اور جسٹس انوارا کے والد اسٹیشن ماسٹر جو ذرا غصے والی طبیعت رکھتے تھے۔ اسٹیشن کے چھوٹے درجے کے ملازمین اُن سے تنگ تھے۔ فتح دین جو گاڑی کا کانٹا بدلتا تھا خود بڑا غصیلا تھا۔ ایک دن اُس کے دل میں خیال آیا کہ اسٹیشن ما کیوں نہ کانٹا بدل دیا جائے۔ وہ محمد حسین کا بستر بچھاتا بوٹ پالش کرتا، کھانا پکاتا، صراحی میں ٹھنڈا پانی بھ سارے کام فتح دین کرتا۔ سارا دن حسین صاحب حسین صاحب کرتا پھرتا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ شام کو جب ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی تو ریت ٹھنڈی ہو گئی۔ فتح دین نے محمد حسین کا اندر سے باہر نکال کر اپنی مقررہ جگہ پر بچھا دی۔ بستر لگایا اور جا کر اپنی کوٹھڑی کے آگے سو گیا۔ رات کو کیا ہو اسٹیشن ماسٹر سے باتیں کرتے کرتے محمد حسین اپنی کمر سیدھی کرنے کو اُن کے بستر پر جو لیٹا تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ نیند آ گئی۔ غٹ سے وہیں سو گیا۔

اسٹیشن ماسٹر بولا: "سویا رہ، سویا رہ، میں تیرے بستر پر سو جاتا ہوں۔"

وُہ جا کر محمد حسین کے بستر پر سو گیا۔

ستارے چُپ چاپ سنسان رات کی خاموشی میں ٹمٹمانے لگے۔ محمد حسین نے اپنے اوپر چادر لے لی جھاڑیوں میں بولنے والا جھینگر بولتے بولتے ایک دم چُپ ہو گیا۔ تھور کے ناگ بوٹوں کا پھن ڈھیلا پڑ گیا۔ اُس سخت کانٹے جنگل کی نرم ٹھنڈی ہوا سے خنک ہو گئے۔ فتح دین نے چھُری اٹھائی اور گہری نیند سوئے ہو اسٹیشن ماسٹر پر برسا دی۔

کہرام مچ گیا۔ جاگ ہو گئی۔ اسٹیشن ماسٹر اُٹھ کر اپنے بستر کی طرف بھاگا۔ اُس کے بستر پر محمد حسین لہ پڑا تھا۔ اُس کا سینہ گردن اور چہرہ زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ اسٹیشن کا عملہ سینہ پیٹ رہا تھا۔ حسین قتل ہو

یہ کیا ہُوا، کس نے کیوں کیا، قتل کرنے والا کس طرف سے آیا۔

پَو پھٹی کہ پولیس آن پہنچی۔

دَس بجے والی ٹرین آئی جس کے نیچے آ کر کانٹے والے فتح دین نے جس کے ناہنجار ہاتھوں بے گناہ، بے تقصیر، نیک دل مالک کو قتل کر دیا تھا خودکشی کر لی۔

یہ بساط کس طرح بچھی۔ یہ مُہرے کس طرح تبدیل ہُوتے۔ کس طرف سے پُراسرار طاقت در آئی۔۔

بے خطا کسی کی موت کیوں مارا گیا۔ کون یہ کانٹا بدلتا ہے۔

محمد حسین کی نعش جب بٹالہ آئی تو گھر والوں پر قیامت ٹوٹ گئی۔ اتنا وقت گزر جانے پر بھی خون ابھی تک ٹپ ٹپ نیچے گر رہا تھا۔

مختار احمد کی بائیس برس کی جوان بیٹی خورشید بیگم اپنے چار بچّوں کو گود میں لیے خاوند کی نعش کو بِٹر بِٹر تکے جا رہی تھی۔ زہرہ پچھاڑیں کھا کر گر رہی تھی۔ غم سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ مرنے والے کی سات برس کی بڑی بیٹی سہمی ہوئی چُپ چاپ کواڑ کے ساتھ لگی اپنے مُردہ باپ کی میّت کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ مرنے والے کا چھوٹا بھائی اسلم حیات جس کی آنکھیں سوج گئی تھیں مُردہ بھائی کی چارپائی کا پایہ پکڑے عاجزی اور بے بسی سے ہائے ہائے کر رہا تھا، باپ دھاڑیں مار مار کر حسین حسین پکارے جا رہا تھا۔ میدان لوگوں سے بھرا تھا جو زار زار روئے جا رہے تھے۔

محبوب لوگوں کی یہ آہ و بکا دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے لرز گئی۔

اِس سانحہ کے بعد جب وُہ جالندھر گئی تو آپا وزیرہ کو اعتماد میں لے کر بولی: "آج شام میرے ساتھ چلنا، مجھے اکیلے جاتے ڈر لگتا ہے۔"

چند انڈے ابال کر اُس نے کُلفی میں ڈالے۔ میری بہن کو ساتھ لیے فقیر کی طرف چل دی جو بوریا بچھائے بیٹھا تھا۔ وُہ دیکھ کر دُور سے ہی چلّانے لگا:

"بوبو آئی، اندا لائی۔ بوبو آئی اندا لائی۔"

محبوب اُس کے گھٹنے پکڑ کر بولی:

"میں تو نہیں چاہتی تھی کہ حسین کو کچُھ ہو، میں تو خورشید احمد کا چاہتی تھی۔"

وُہ بولا،

"آگ لگ گئی۔ جل گئے۔ طوفان اُٹھا۔ ڈوب گئے۔ حلوہ انڈوں کا لائی ہو؟"

"نہیں اُبلے ہُوئے لائی ہُوں۔"

محبوب نے کُلفی کھول کر اُس کے آگے رکھ دی۔ وہاں اُبلے انڈوں کی بجائے انڈوں کا حلوہ تھا۔ میری بہن خوف سے لرز گئی۔

کوئی بغل والی کہتا کوئی کچھرالی، مگر کوئی ایک نکلتی۔ ہر مہینے بغل میں پھوڑا سا بنتا جو پکتا نہ بہتا اندر تحلیل ہو جاتا۔ باچھیں پکیں، پھر پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ ٹخنے ٹکراتے۔ سمجھ میں نہ آتا۔ زندگی اچانک پن محسوس کرنے لگی تھی۔

ہمارے گھر میں ایک خوبصورت بیوہ کا آنا جانا ہو گیا جس پر مجھ سے بڑے دونوں بھائی ایک دم سے

عاشق ہو گئے۔ ایک دن آموں کے ٹوکرے لیے گھر کے سارے لوگ پک نک منانے علی وال چل دیے۔ چشمے کا شفاف پانی چھوٹے چھوٹے کنکروں اور سنگریزوں پر بہے جا رہا تھا۔ شاہ بیگم نے اپنے گورے گورے پاؤں پانی میں رکھ دیے۔

بہت دنوں بھابیوں کی زبان سے یہی سُنا گیا ”شاہ بیگم کے پاؤں کتنے خوب صورت تھے !“

بچہ کامن فیٹ فیٹش ہوگیا۔

یہ چھوٹے چھوٹے واقعات اگر رونما ایسے خطرناک وقت میں ہوں جب بچے کا شعور اُس عمر میں داخل ہو رہا ہو جب باتیں سُوجھنے لگتی ہیں۔ خیال جاگتا ہے۔ دل جھوٹ بولنے کو چاہتا ہے تو وُہ جو پوتڑوں کا گندہ ہو اُس کے خیالات کی پراگندگی کا کیا ٹھکانا ہوگا !

ماموں محمد دین بھی پوتڑوں کا گندہ، بچپن کا رنڈی باز، اُڑتی چڑیا پہچانتا تھا۔ والدہ سے ایک روز پوچھنے لگا ”بہن! مجھے یہ بتا شاہ بیگم ہمارے گھر کیسے آنے لگی ؟“

والدہ نے جواب دیا : ”میراثن آئی تھی کہ شاہ بیگم آپ کے ہاں آنا چاہتی ہے، میں نے کہا سو دفعہ۔ وزیر کا دل بہلے گا اکیلی ہوتی ہے۔“

٦

ہمارے گھر میں ماما محمد دین اور بھائی ذوالقرنین دونوں بے اولاد تھے۔ اِس خیال سے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ دونوں کی بیویاں بے کل ہونے لگیں کہ کہیں انہیں کے محلہ کی لڑکی اُن پر سوکن بن کر نہ آجائے۔ بھابی نے تو نارووال جاتے ہی یہاں سے قرآن پر ہاتھ دھرا کر کہلوایا کہ وُہ دوسری شادی نہیں کریں گے اور اِس وعدے کو پکا رکھنے کے لیے بھابی تعویذ تاگے پر ایمان لے آئی۔ مامی نے یوں اطمینان کیا کہ اتنے بڑے صنعت کار کی بیوہ پولیس کے حوالدار کے ساتھ شادی کرنے سے تو رہی۔ مگر ہمارا ماموں خوب صورت بڑا تھا۔

میری بہن نے خاوند کی جُدائی کا عرصہ سسرال کی سختیاں اٹھا اٹھا کر گزارا۔ میکے آتی تو جب بھوپو والا ہز ماسٹرز وائس گراموفون فراق اور جُدائی کا گانا گاتا تو اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آتیں۔ بالی اور ڈاراں جو ہماری دُور کی رشتہ دار تھیں بڑی اُداسی سے ہماری آپا کی طرف دیکھنے لگتیں۔ یاد کی بھُول بھلیّوں میں آپا کا یہ نقشہ میرے ذہن میں ابھی تک محفوظ پڑا ہے۔

اب سات سال کے بعد عزیز احمد ڈاکٹری کی ڈگری لے کر انگلستان سے واپس آ رہا تھا۔ بیٹے کے استقبال کے لیے نور احمد نے اپنے عزیزوں کو جالندھر بلوایا۔ مختار احمد کا بڑا انتظار تھا۔ بھابو جی شکل کی واجبی سانولا رنگ چھوٹا قد فربہ بدن تخت پر بیٹھی احکامات دیتی۔ محبوب آپا بُوا اور آپا وزیرہ دن بھر کام میں مصروف دکھائی دیتیں۔ اِس مکان کے ساتھ ایک اور مکان یوں جُڑا ہوا تھا کہ اُس مکان کا دروازہ بالکل اس مکان کے بیچ بیں

کھلتا تھا۔ اُس ساتھ والے مکان میں بھابو جی کی بہن امیر بی بی رہتی تھی جس کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ اُس نے آپا بُوا کی بیٹی سلمیٰ کو متبنیٰ کر رکھا تھا۔ خالہ امیر بی بی کو بس دہلیز اُلانگھ کر صبح صبح ادھر آ جانا پڑتا۔ سو کاموں میں ہاتھ بٹاتی۔

کمروں میں دریاں بچھائی جا رہی تھیں۔ پلنگوں پر بستر بچھ رہے تھے۔ کھانا پکانے کے لیے ضروری چیزیں کوٹھڑی میں سے نکال کر محبوب دیتی جس کے چھلّے میں بہت ساری چابیاں لٹکتی نظر آتیں۔

میرے بڑے بھائی کا سالہ خورشید جو میرا ہم عمر تھا اپنی ماں کے ساتھ جالندھر پہنچ گیا۔ ہمارا زیادہ وقت اُوپر والے کمرے میں گزرتا۔ کون آیا، کون گیا، شاہ نشین پر بیٹھ کر نیچے دیکھتے رہتے اور ہماری نگاہ میں صحن کی ساری سرگرمیاں رہتیں۔ ہم دیکھتے ساتھ والے مکان سے سلمیٰ اور خاتون آتی جاتی رہتیں ذرا دیر کو جاتیں تو پل بھر کے بعد بلا لیا جاتا۔

سلمیٰ کا چھوٹا بھائی ضمیر میرا ہجولی تھا۔ کب بستی سے آتا ہے۔ ہم اُس کا انتظار کرتے۔ آتا تو تھوڑی دیر ٹھہرتا۔ اُس کا رنگ جتنا گندمی تھا اتنا ہی اُس کی بہن سلمیٰ کا صاف۔ آپا بُوا کی طرح روشنیوں کی جھلملاہٹ دکھائی دیتی تھی۔ ایک روز میں ضمیر اور خورشید باتیں کر رہے تھے کہ سلمیٰ اور خاتون نوکر سے دری کی گٹھڑی اٹھوائے کمرے میں داخل ہوئیں۔ نوکر نے جھاڑو دیا۔ ہم سب نے مل کر دری بچھائی پھر سلوٹیں درست کرنے لگے۔ نوکر جھاڑن سے دیوار گیر الماری صاف کرنے لگا۔

میرے پاؤں پر سلمیٰ کی نگاہ پڑی تو ضمیر سے کہنے لگی: "دیکھنا ضمیر بابر کی انگلی۔ جس کی انگلی اس طرح ہو کہتے ہیں وہ محبت میں ناکام رہتا ہے۔"

اُس نے یہ بات کہیں سے تو سنی ہو گی۔ پلک جھپکنے تک کو کچھ ہوا۔ ایک ہُوک سی دل میں اُٹھی۔ مگر یہ چھوٹی سی بوند آٹھویں جماعت کے لڑکے کے کھیت کی مٹی میں کہیں جذب ہو گئی۔

دوپہر کی گاڑی سے مختار احمد بھی پہنچ گیا۔ کھانے کے لیے نیچے پہنچنے کا بلاوا آیا۔ کھانا کھا کر اُوپر آئے تو معلوم ہوا عزیز احمد کے لیے الگ کمرے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ ریلوے اسٹیشن گئے کچھ گھر پر رہے۔

عزیز احمد گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے داخل ہوا۔ وہی بھنچے بھنچے ہونٹ جن میں کچھ مسکراہٹ کچھ شرارت کچھ اکڑ کچھ اکڑفوں۔

قریبی رشتہ دار مستورات اُس کے گلے مل رہی تھیں۔ بزرگ عورتیں اُس کی پیشانی چومتیں مگر وہ بزرگ و خورد میں تمیز کیے بنا کسی کا گال کسی کی پیشانی چوم رہا تھا۔ اپنے منہ پر بوسہ چپکتا محسوس کر کے عورتوں اور لڑکیوں کے چہرے شرم سے گلنار ہو رہے تھے۔

آپا وزیر بیس روز کی دُلھن ایک پلنگ پر عروسی کا جوڑا پہنے گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ عورتیں پلنگ کے گرد

تھیں۔ خاوند کو سات برس سے بچھڑی دُلھن کے پاس لا کر بٹھایا گیا۔ میراثنوں نے سہاگ کے گیت گانے روع کئے۔ عزیز احمد نے آپا کی مٹھی کھولی جس میں مصری کی ڈلی تھی جو اُس نے منہ میں رکھ لی۔ پھر آپا کے ونگھٹ کے نیچے آئینہ رکھا گیا جس میں ایک دوسرے نے ایک دوسرے کا چہرہ سات برس کے بعد دیکھا۔ س رسم میں کتنی مٹھاس اور ٹھنڈک تھی۔ ہمارے پرکھوں نے کتنی اکسائٹمنٹ اُس میں چھپا دی تھی۔

مشاہدے میں آنے والی یہ میٹھی میٹھی رونق اور دل کو اچھی لگنے والی یہ فضا میرے ساتھ بٹالہ نہ آئی، ان بھی وہیں رہ گئی۔ اب عزیز احمد کے بٹالہ آنے کا انتظار تھا۔

وُہ بٹالہ آیا تو ابا جی نے ضیافت کا انتظام کیا۔ چھت پر چاندنی بچھی۔ گاؤ تکیے لگے۔ شاہ نشین پر دو بتی کے ہانڈے والے ولایتی لیمپوں کی جھلملاتی روشنی بہت اچھی لگی۔ ہاتھوں میں فرشی پنکھا لیے ملازم پنکھا جھلاکئے۔ چلمچی میں آفتابہ سے ہاتھ دُھلے۔ دستر خوان بچھا۔

عزیز احمد کا بہنوئی مختار احمد آیا۔ پہلی دفعہ ڈاکٹر شریف کا نام سُنا جنہیں میں اُوپر کی چھت تک چھوڑ کر آیا۔ مقطع داڑھی مقطع چہرہ جس پر مجھے زندگی کی سنجیدگی اور زندگی کے گزران کی متانت کے سوا کچھ محسوس نہ ہُوا۔ مختار احمد کے خال و خد بڑے واضح تھے۔ داڑھی کے بغیر نیچے کو گری ہوئیں لمبی لمبی مونچھیں جن کے سائے میں اُوپر تلے کے ہونٹوں میں ایسی متبسم ظرافت کہ حرفِ سادہ کو لطفِ کلام دینے کی چغلی کھائے۔ چہرہ زمانہ شناسی کے تجربے سے ڈھلا ہوا۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ دراز قد۔ ہاتھ میں چاندی کے مُٹھے والی چھڑی۔

ایک اور صاحب منشی غلام قادر آئے جن کا تخلص مِتی تھا۔ خشخشی داڑھی۔ سر پر صافہ۔ ململ کا کُرتہ اور واسکٹ۔ چہرے پر ڈھیروں منشیانہ پن۔ نہایت متین اور سنجیدہ بزرگ دکھائی دئے۔ والد صاحب کی زبانی یہ کئی مرتبہ سُن رکھا تھا کہ ہے تو منشی غلام قادر وثیقہ نویس مگر اپنی علم دوستی اور قابلیت کی بنا پر ہر طبقہ میں اُس کی عزت ہے۔ سب جج ہندو ہوا یا تحصیلدار۔ یہ ناممکن کہ کچہری کے اِس عرضی نویس کو دعوت پر نہ بلایا جائے بلکہ اُن لوگوں کو اُس کا انتظار رہتا۔ غلام قادر کو موسیقی اور شعر کا بھی ذوق ہے اور پھر تھوڑی سی پی لینے کے بعد اُس کی گفتگو میں لطائف و ظرائف کے ستارے چمکنے لگتے ہیں۔

اسٹیشن ماسٹر شہر کا سرکاری ڈاکٹر تھانیدار پوسٹ ماسٹر۔ اِن چار افراد کو ابا جی کسی ضیافت پر فراموش نہ کرتے۔ اس دعوت پر بھی یہ چاروں آئے۔

دعوت کے لیے ذوالقرنین خان نارووال سے ایک سو بٹیر، پچیس مُرغیاں اور پچیس تیتر لائے۔ ذوالقرنین خان ہمارے سب سے بڑے بھائی نارووال میں تھانیدار تھے۔

ایک دن ابا جی نے کسی سے پُوچھا، "جیسے ہوشیار پور والے غلام قادر کا تخلص گرامی تھا۔ اِسی طرح منشی غلام قادر کا تخلص مِتی ہے۔"

ابا جی بولے: "تخلص نہیں۔ نام کا حصّہ ہے۔ ہُوا یُوں کہ شوق محمد کے بیٹے غلام محمد نے کابل جاکر گھوڑوں کے کاروبار میں بہت دولت کمائی۔ کسی نے دولت کی تعریف کی۔ اُس نے کسرِ نفسی سے کہا: ما ایں قدر دولت ندارم۔ ما مانندِ متی ہستم۔ یعنی میں مٹّی کے برابر ہُوں۔ اور کہانی یُوں بھی ہے کہ گھوڑے بیچنے کے سلسلہ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں رسائی ہُوئی۔ مہاراج کو اُس کی باتیں اچھی لگیں۔ جب بھی مہاراج کو گھوڑوں کے متعلق کوئی مشورہ لینا ہوتا تو کہتا اُس مَت والے گلام محمد کو بلاؤ۔"

"گلام محمد کیوں؟"

"سِکھ غین نہیں بول سکتا۔ غین کی بجائے گاف بولتا ہے۔"

ابا جی کی ظرافت کی رگ پھڑکی تو حقّہ کی نَے مُنہ سے ہٹا کر کہنے لگے: "میرا نام اب فقیر احمد ہے مگر سب فقیرا قینچی کہتے ہیں۔ تو میں بتاتا نہیں مگر کبھی تو پُرکھوں نے قینچی چلائی ہوگی۔ تیری نسل اگر اپنے نام کے ساتھ قینچی لکھنا شروع کر دے تو تم کیا بگاڑ لو گے۔ کوئی محمد بشارت قینچی کوئی برکت اللہ قینچی کوئی ریاض علی قینچی۔ بس متی کا لفظ چل پڑا۔"

ابا جی نے حُقّے کا کش لیا اور بولے: "غلام محمد کے آگے چار بیٹے ہُوئے۔ فیروز خاں، مراد علی، گورے خاں، نور محمد۔ یہ باپ کی وجہ سے متی کہلائے۔"

"مختار احمد کس بیٹے کی اولاد؟"

"بھئی مراد علی کا پوتا۔ مگر میری بات یاد رکھنا غلام قادر اور مختار احمد کے بعد مت کا اللہ ہی حافظ ہے۔"

اِن لوگوں کی شادیاں بھی بستی والوں ہی کی طرح گھر گھر آپس میں ہو جاتیں۔ اِن کے مکان بھی انجیر کی طرح ایک دُوسرے سے جُڑے ہوئے تھے۔ مگر غلام محمد کے بیٹے مراد علی نے پکّی اینٹ کی تین منزلہ حویلی بڑے دروازے میں جا بنوائی اور وہیں جا بسا۔ اپنے مکان کے سامنے چُونے گچ مسجد تعمیر کرائی۔

بچپن میں ہم جب اس مسجد کے غسل خانہ میں نہانے کو جاتے دروازے پر نصب شدہ کتبہ پڑھتے صرف ایک مصرع سمجھ میں آتا: بنا کرد ایں مسجدِ مراد علی۔

میرا بہنوئی عزیز احمد جو مختار احمد کا سالا ہُوا۔ جب دوبارہ بٹالہ آیا تو گھر میں بڑی چہل پہل رہی۔ پچھلے دالان میں جہاں چینی کے برتنوں سے بھری الماریاں لش لش کرتیں فرشی محفل میں بیٹھ کر چلغوزے کھائے جاتے اور گپ لڑائی جاتی۔ کچھ عرصہ بعد عزیز احمد کو برٹش انڈین آرمی میں کمشن مل گیا۔ ٹریننگ کے بعد فیروز پور چھاؤنی میں جب اُس کی تبدیلی ہُوئی تو آپا وزیر وہاں چلی گئی۔

کمال یہ ہے کہ سب طرفیں زندگی کی ہر لمحہ صیقل ہوتی رہتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ خیالات نشو و نما پاتے ہیں۔ لطیف جذبات کی شاخوں پر کونپلیں پھُوٹنے لگتی ہیں۔ ایک نظم خوشی محمد ناظر کی "جوگی" میرے نصاب

میں ہوتی تھی زبانی یاد ہو گئی۔ بھائی عاشق کے سالے خورشید کو جسے اُس کے والدین پیار سے خوشی کہتے تھے جب میں یہ نظم زبانی سناتا تو وہ میرا منہ دیکھنے لگتا۔ میں اور وہ جب چھت پر کیکڑی کاٹا کھیلتے تو کتنی مسرت ہوتی۔ پھر میں اور وُہ بیٹھک میں میکونو (MACCANO) لے کر بیٹھ جاتے۔ پیچ اور کمانیوں کو جوڑ جوڑ کر چھکڑا بناتے۔ کرین اور پُل بناتے۔ جنگلے والے چھجے میں آ بیٹھتے اور نیچے بازار میں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھتے رہتے۔ میں نے ایک چھوٹی سی لڑکی کو کئی بار دیکھا تھا۔ اُسے جب بھی دیکھتا معلوم ہوتا اُسے میرے ہی پیچ اور کمانیوں سے بنایا گیا ہے۔ مجھے اُس میں اپنی پہچان دکھائی دیتی۔ میری رُوح جیسے اُس کے وجود میں ہو اور اُس کی رُوح میرے وجود میں۔

وُہ لڑکی بازار میں عطّار کی دکان کی طرف جا رہی تھی۔ ایک جذبِ بے نام سے میں اُس کی طرف دیکھا کیا۔ وہ کیسا لمحہ تھا جذبِ دروں کی بے ساختگی کا کہ انا الحق کہنے کو جی چاہا۔

"میں اِس لڑکی سے شادی کروں گا۔"

خوشی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ہم دونوں بہت چھوٹے تھے۔ بات بہت بڑی تھی۔

گولڈن گیٹ کی بلیاں

احمد سعید

سان جوزے میں جون کا مہینہ تھا لیکن وہاں سال بھر مُتبسّمہ بہار کا موسم رہنے کے باوجود نووارد پاکستانی کمال کو سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی ایک اور وجہ اُس کی بیماری تھی۔

ہفتے کا دن تھا۔ اتوار ملا کر اس کے دوست حامد کو دو روز کی دفتری چھٹی تھی۔ دوپہر کا ایک بجا تھا جب کمال اُس ک گاڑی کی طرف بڑھا جس میں حامد اسے اُس کے میزبان بیٹے کے اپارٹمنٹ سے لینے آیا تھا، جہاں کمال اور اُس کی بیگم مقیم تھے پہلے سے کار ڈرائیو کرنے کے لیے اس میں بیٹھے حامد نے کمال کے ہاتھ سے کیمرہ لے کر ونڈ سکرین کے پاس رکھا اور دروازہ کھولا کما جب اُسے بند کر کے بیلٹ لگا کر بیٹھ گیا تو حامد بولا "چلو یار گولڈن گیٹ برج، ایک بار پھر۔ بقول تمہارے ساؤتھ پیسفک کی دلہن!"

"گاڑی چلاؤ۔ باتیں تو راستے میں ہوتی رہیں گی گائیڈ ——"

"YES JOHNNY —— بلیاں پکڑنے جلدی جو پہنچنا ہے۔" حامد نے معنی خیز انداز میں مُسکرا کر کہا۔ وہ گاڑی چلا کر چوک میں پہنچا اور وہاں سے اُسے سان فرانسسکو کی طرف موڑ دیا۔

"ہاں، تو کہاں تک پہنچے۔؟"

"کچھ افسانہ، کچھ کہانی بن رہی ہے مُشاہدہ کی پیداوار، سچائی پر مبنی۔"

"یہ تمہارا کام ہے۔ تو لگے ہاتھ ایک اور بات نوٹ کر لو کہ اب تک گولڈن گیٹ برج سے چھلانگ لگا کر، اخبار کے مطابق، آٹھ نو سو لوگوں نے کُود کر خودکشی کر لی ہے یا اس کی کوشش کی ہے۔"

"خودکشی۔ جنّت کی تلاش کرتے کرتے جہنّم میں —— پہنچنے کے لیے —— یا وہیں کہیں اسّی نوّے برس پہلے کئی من چاندی لدے ڈوبے جہاز کا خزانہ تلاش کرنے —— ؟ —— گ —— ل —— ڈ —— ن گیٹ، سنہری برج کا دروازہ کدھر کُھلتا ہے۔؟"

"کیا بہک بہک کرنے لگے۔ یار اگلے مہینے تمہارا آپریشن ہے۔ کہیں اس خیال سے تو نہیں سُوجھا؟"

"واہ وا: کمپیوٹر یار بِن جانے، بِن سوچے کتنی پتے کی بات کر گیا!"

"لیکن تُم تو سیریس ہو گئے۔"

"نان سیریس بھی نہیں۔ آپریشن ایک نہیں، دو۔ پیٹ ملے کے لیے دل کا بائی پاس کروانا جو مُقدّم ٹھہرا۔ آدمی کے ظرف

ہر، بلکہ اندر بھی کیسی کیسی بلائیں پیدا ہو جاتی ہیں —— جن کا پتہ ——"

"پھر کہو گے میں فقط کمپیوٹر ہوں۔ ترا کمپیوٹر انجینئر۔ لیکن دیکھو، تمہارا سسٹم بھی تو ایک مشین ہے۔ اس کا ایک نہ ایک پرزہ تو کبھی خراب ہوتا ہے جس کی REPAIR بھی ہوتی ہے اور اگر ہو سکے تو ری پلیسمنٹ بھی —— ورنہ۔ ——"

" THE END "

"وہ۔ وہ کس کا نہیں مائی ڈیئر —— تمہارے شاعر نے وہ کیا کہا ہے، ع اسے رد کر گزار دے یا ہنس کر گزار دے —— اللہ پر بھروسہ رکھو، آپریشن کراؤ —— اور اس سے پہلے مصروف رہنے کے لیے بلیاں پکڑو —— پروفیشنل جرنلزم کے علاوہ تمہاری —— ہسٹوری رائٹنگ —— فسانہ نویسی کا پرانا شوق...... "

اس دوران کمال گرد و پیش کے مناظر دیکھتا جاتا تھا، کبھی ٹیلی فوٹو لینز میں سے، کبھی اس کے بغیر —— دائیں طرف تقریباً گنجی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا جن پر کہیں کہیں نظر آتے درختوں کے جھنڈ برہمنوں کے سر پر لودیاں سی دکھائی دیتے تھے اور سنہری رنگ کی مخملی، مسدور پہاڑیاں عجیب لمس آمیز اور سنسنی خیز، دلکش مناظر پیش کرتی تھیں۔

"ہاں۔ افسانہ، یا کہانی، تم نے یہی کہا تھا نا؟ —— ہر فضا سے طرح طرح کی کہانی جنم لیتی ہے۔ ورنہ ایک PLANET سے دوسرے پر ایک کم مایہ ادیب، پھر مریض کا آپریشن کروانا بے مزہ ہو کر رہ جاتے۔ اسے ٹل یا خوش نصیبی کہہ لو ——"

"ٹل ڈل نہیں —— تمہارے انجینئر بیٹے نے بلایا ہے ——"

"اتنا بڑا احسان...... اتنا کہ......"

"شٹ اپ۔ اس پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ شاہد (کمال کا بیٹا) تمہارے بارے میں کتنا فکرمند ہے۔" یہ کہتے ہوئے حامد نے اپنا دایاں ہاتھ ہینڈل سے اٹھا کر (ہینڈل بائیں طرف ہونے کے باعث) کمال کے منہ پر رکھ کر کھینچ لیا۔ "اپنی انرجی یونہی ضائع نہ کرو۔ آج تمہیں سان فرانسسکو لے جانے کا مقصد، مشن "اس" کا پتہ کرنا ہے۔ —— سڑک والی کا!"

"کہانی کا بہت اہم کریکٹر ہوگا میرے خیال میں۔"

"کیا کہا تھا لیزر بیم (LASER BEAM) آنکھوں والی۔ پچھلے ہفتے تو بھابی اور شاہد کی وجہ سے اس کا تعاقب کرنا ممکن نہ تھا لیکن دیکھیں آج کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں۔"

"تمہارے وسیع روابط ——"

"ہاں۔ سان فرانسسکو جیسی جگہ میں ضرور کام آئیں گے۔"

اب گاڑی ایک وادی سے دوسری میں داخل ہو رہی تھی۔ پہاڑیاں پہاڑ بن کر ابھر رہی تھیں۔ ان کی ڈھلانوں پر نکڑ نما گھر، پرانی اور نئی آبادیاں پھیلتی اور مرتکز نظر آ رہی تھیں جب کہ میدانی علاقوں میں ٹاؤن، ٹاؤن شپ یا قصبے، شہر یا میٹروپولس، کسی نہ کسی "امیریکن ڈریم (AMERICAN DREAM)" کا اعلان بردار ہورڈنگ دکھائی دیتا جو بنیادی

گھر اور کار پر مشتمل تھا۔ پھر اشتہاری کاؤبوائے کی پسند، گاہک راغب کرنے کی کسی بکاؤ چیز کی پبلسٹی، کتّوں کی دیکھ بھال اور مناسب غذا کے اشتہارات اور ـــــــ ڈالر کی فصل اُگانے کی چھوٹی بڑی سکیموں کے راستے میں لگے بورڈ مسافر کو متوجہ کرتے جتنی کہ تقریباً ایک گھنٹہ کی مسافت کے بعد سان فرانسسکو کے مضافات میں داخل ہوتے ہی دُور سے سامنے دکھائی دیتی ایک وسیع و عریض چٹان پر جلی حروف میں یہ نام لکھا تھا جیسے کسی جِن نے کھجور یا ریڈ ووڈ کے درخت کا بُرش بنا کر اس سے گھسیٹ مار دیا ہو۔ مضافات کی ایک طرف سان فرانسسکو پر بنا پُرانا آٹھ میل لمبا پُل پہاڑی سلسلے کی جانب اور اُس کے برابر تقریباً ایک میل دُور گولڈن گیٹ برج دکھائی دیتا تھا .... اس وقت پہاڑوں کے پیچھے سے سُرمئی بادل جھانکنے لگے اور فضا میں خنکی پیدا ہوگئی، کمال کو سردی محسوس ہوئی، اُس نے کیمرہ گولڈن گیٹ پر زوم کیا، جس میں سے پیلے بِلّی، پھر ایک لڑکی کی آنکھیں چیتے کی طرح گھورتی دکھائی دیں۔ ـــــ ایک میل لمبا، بے ستون، لوہے، سٹیل اور سیمنٹ کا بنا سُرخی مائل سُنہری رنگ کا پُل مگرمچھ کی طرح منہ کھولے خلیج پر واقع ہے، جس کے ایک طرف خلیج کا عقب، آگے کھلا سمندر خلا میں ختم دکھائی دیتا ہے ــــــ کمال کو پہلی مرتبہ اس کی ساکت سطح دیکھ کر ایک لحظہ وحشت محسوس ہوئی تھی، جب وہ اپنی بیوی، بیٹے اور گائیڈ دوست حامد کے ہمراہ پُل کے آخر میں واقع ایک چڑھائی کے کنارے کھڑا تھا .... حامد ان کا ایک گروپ اور ایک آدھ انفرادی فوٹو ہی لے پایا تھا، جب کمال کے نیچے سے یک دم ایک بِلّی کی آواز آئی تھی جو کمال کے پاؤں کے قریب اُوپر کو تک رہی تھی ـــ سبز، پُراسرار آنکھوں والی، چیتے کی طرح ٹکٹکی باندھے، خاکی اور سیاہ رنگ کی حامل بِلّی کو دیکھ کر وہ سب حیران اور خوش ہوئے تھے .... مسز کمال نے اُس کے سامنے ایک دو بسکٹ پھینکے تھے، لیکن شاید امریکن بِلّی ہونے ہوتے اُس نے اُنھیں مسترد کر دیا تھا۔ ـــــــ جب کمال نے جھک کر اُسے پکڑنا چاہا تھا، یہ جھپاک سے جھاڑیوں کی طرف جاتی ہوئی ساحلی چٹان کی پگڈنڈی میں غائب ہوگئی تھی ـــــــ وہ بِلّی آسامی تھی نہ ایرانی ـــــ جانے کس نسل کی تھی!

اس وقت خلیج کا پٹرول ہیلی کاپٹر اُوپر سے گزرنے کی وجہ سے کمال کی توجہ منقطع ہوگئی تھی اور اُسے معاً گھاٹی پار، پُل کے قریب لگی دُوربین میں سے خلیج کا نظارہ کرنا یاد آیا...... بندرو کشتی گاہ (MARINA) پر کھڑے جہاز، موٹر لانچیں، لوبٹ ریسٹورنٹ اور ہوٹل، بادبانی کشتیاں اور طرح طرح کی ٹیوبیں، جنھیں تیراک اُٹھائے ہوتے تھے، ہَوا کے زور سے پانی میں چل رہی تھیں، بھاگ رہی تھیں، کشتی گاہ سے ہٹ کر، ایک جزیرے پر ALCUTZ عمر بھر قید کے مجرموں کی سابق جیل واقع ہے ــــــ وہ GOLD FISH نامی دو منزلہ ٹورسٹ جہاز کے عرشے پر بیٹھے اس متروکہ گرتی ہوئی عمارت کے قریب سے گذرے تھے جس میں سے کسی مرد اور عورت نے جہاز کو ہاتھ ہلائے تھے، اس جیل کے ایک کونے کے ارد گرد اب بھی پُرانی خاردار تار اور داخلے پر عاید کردہ سخت سرکاری پابندی کی خلاف ورزی کرنے والے کو سزا دینے کے بارے میں نصب کردہ بورڈ دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ خوفناک جیل جس کے ۱۹۶۰ء میں بند ہو جانے تک صرف پانچ قیدی اگر سے فرار ہو سکنے تھے لیکن جلنے والا کا کھانا تھا ـــ تو خلیج کا [illegible] تاہم

وہ جیسے سان فرانسسکو کی تاریخ اور معاشرتی روایت کا حصہ بن گئے تھے ——— کمال کو اس جیل کا ایک منظر PIER MARKET کے ایک برآمدے کے نکڑ پر واقع "منٹ سٹوڈیو" میں نظر آیا۔ ایسا سٹوڈیو جو لاہور اور چھوٹے شہروں میں، بالخصوص پایا جاتا ہے اور جس میں کسی بامنظر لٹکتے پردے کے سامنے سٹول پر بیٹھ کر کوئی گاہک اپنی فوٹو اُتروا سکتا ہے۔ مذکورہ نکڑ کی دیوار پر بھی اسی طرح ایک پردہ لٹک رہا تھا۔ اس پر جیل خانے کی تصویر بنی ہوئی تھی جس کے آگے گتے کے ایک خاصے بڑے کٹ آؤٹ پر ایک ملبوس قیدی کھڑا دکھائی دیا۔ اس کے سینے پر اس کا نمبر لکھا تھا۔ اس کا کوئی خیالی ملاقا اس کے پاس کھڑا ہو کر چند ڈالروں میں اپنی فوٹو اتروا سکتا تھا...... قیدی جیسے باہر، بیرونی آزاد فضا کی طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہا ہو ——— پنجرے میں بند جیسے کسی جانور کی آنکھوں سے! ———

رنگا رنگ کے نیم عریاں اور ملبوس، جوان اور بوڑھے، مرد، عورتیں چلتے چلتے رُک کر شہوانی جوش میں آ کر ایک طرف کھڑے ہو کر بوس و کنار کرنے میں مصروف جوڑوں کے پاس سے گذرتے ——— سیاحوں کے تحفے تحائف SCANDAL SHOES نامی دکان سے عورتوں کے جُوتے خریدتے، اطالوی نان PIZZA اور بحری غذا، SEA FOOD جیسی چیزیں کھاتے، پینے والے شراب پیتے، فوٹو اُتارتے اور اُتر واتے ———

سیاحوں کو پیچھے چھوڑ کر کمال اور اُس کا ساتھی واپسی کے لیے کار میں جا بیٹھے تھے اور فضا میں سڑک کے کنارے بیٹھ ایک نوجوان حبشی فقیر کی خیرات کے لیے مسلسل نقارہ بجانے کی آواز سُنائی دے رہی تھی ——— حامد کو معاً یاد آیا کہ پچھلے ہفت اُسے منبرم کشتی گاہ کے قریب سے گزرتی سڑک پر رُکنا پڑا تھا جب چُل بُری سی ایک لڑکی ایک گھاٹی سے اُتر کر سڑک پار کرنے گ تھی ——— کمال جو اس وقت بھی حامد کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا نے لڑکی کو پہلے دیکھ کر رُکنے کا اشارہ کیا تھا۔ رنگ کی بکنی (BIKINI) پہنے مجسمہ صورت، عجب حیرت انگیز گیہواں رنگ کی لڑکی نے بڑی بے نیازی سے سڑ قدم رکھا تھا اور خراماں خراماں چلتے اُسے راستہ دینے والی حامد کی کار کی سواریوں کو، بقول کمال (LASER BEAM) "لیزر بھری" نظروں سے دیکھ کر مسکرا کر آگے نکل گئی تھی۔ اسے دیکھ کر مسز کمال نے نفرت آمیز ناپسندیدگی سے بے قابو ہو کر "بے شرم!" کہا تھا اور اس کے جواب میں کمال یہ برجستہ جواب دیا تھا "میڈیم مختلف تہذیبوں میں ایک بنیادی فرق ہے"۔ اس دوران کمال نے لڑکی کو پیچھے مڑ کر آگے چلتی گاڑی کی طرف معنی خیز اندا ہاتھ ہلا کر جاتے دیکھا..... جیسے وہ سان فرانسسکو اور گولڈن گیٹ کی دلہن ہو..... وہ چُل بُری ایک پُل سے دوسرے پُل کی طرف ——— (سان فرانس (BAY) اور گولڈن گیٹ برج) ——— سرکس کی کھلاڑی لڑکی کی مانند ایک پینگ سے دوسری کی جانب جھول کر جاتی ہوئی دکھائی دی ——— کمال کا بے قابو ہو گیا تھا، اس لیے اُس نے قدرے غصّے سے سر جھٹکا اور لڑکی کے بارے میں نارمل انداز میں سوچا تو وہ اُسے ا زیر تکمیل افسانے کا اختتامی کردار محسوس ہوئی ——— سبز آنکھوں والی اور نا اُمید، بے نور سی نظروں والی بلّی مربوط ایک معمہ جس کے حل میں حامد، اس علاقے سے اچھی طرح واقف شخص، مدد دے سکتا تھا۔ ——— کیا وہ لڑ کوئی ایکٹریس تو نہیں تھی؟ ——— حامد سے بعد ازاں اس بارے میں تخلیے میں استفسار کرنے پر اُسے اس سوال کا حوصلہ افزا جواب ملا تھا کہ مارکیٹ میں واقع "ہالی ووڈ سٹوڈیو" نامی دکان سے یہ عقدہ وا کیا جائے ——— اگلے ہفتے، دفتری چھٹی کے دن!

لہٰذا کمال اور حامد اب اکیلے دوبارہ سان فرانسسکو پہنچے اور اُنھوں نے مذکورہ دکان کا رُخ کیا ـــــ "ہالی ووڈ سٹوڈیو!" جہاں اس طلسمی دنیا کے ہر یادگار دور کے منتخب فوٹو، اشتہارات، ستاروں کی زندگی کے مطبوعہ حالات اور MASKS وغیرہ تک دیکھے اور خریدے جا سکتے تھے...... چارلی چپلن، روڈالف، للین گش، جان گلبرٹ، مے ویسٹ اور کلارک گیبل ـــــ مسخروں" کے فوٹو، ہیروز اور ہیروئنوں کے فوٹو، ولنوں اور اسسٹنٹ ایکٹروں کے فوٹو ـــــ پروڈیوسروں اور فلموں کے فوٹو ـــــ دکان کا مالک حامد کا آشنا تھا۔ چنانچہ وہ کمال کو ادھر لے گیا۔ اندرون مارکیٹ کے آخر میں نصب کردہ گھوڑ چکر "میری گو راؤنڈ" (MERRY-GO-ROUND) کے قریب واقع وہ دکان تقریباً ہر سیاح اور غیر سیاح کے لیے بھی سنسنی خیز تجسس و کشش کا ایک مخصوص مرکز ہونے کے باعث خاصی پُر رونق رہتی ـــــ

حامد نے اس میں داخل ہو کر کاؤنٹر پر کھڑے اس کے مالک سے باہمی ہیلو کرنے کے بعد کمال کا تعارف کرایا۔ اس کے معتبر اور سیاح ہونے کے پیش نظر دکان کا مالک انھیں عقب میں واقع اپنے دفتر میں لے گیا اور ان کی کافی سے خاطر تواضع کی۔ اس کے بعد حامد اور کمال، بالخصوص مؤخر الذکر نے گھاٹی سے اترنے والی لڑکی کے متعلق تفتیش شروع کی ـــــ وہ لڑکی جو بظاہر ایکٹریس تھی ـــــ

"ایکٹریس! ـــــ گھاٹی!!" مالک دکان نے لڑکی کے بارے میں فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں آنکھیں جھپک کر قدرے اثبات میں سر ہلا کر میز کا ایک دراز کھول کر اس میں سے ایک البم میں لگے دو تین فوٹو ملاقاتیوں کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ـــــ یہ تو نہیں کیا؟"

"بالکل۔ بالکل۔ وہی ہے۔ ہے نا حامد؟"

"ہاں ہاں!"

"...لیزا ـــــ نہیں یہ ایکٹریس نہیں ـــــ آفرز ہوئی ہیں لیکن اُس نے ہر بار انکار کر دیا ہے۔"

"انکار کیوں؟"

"وہ BAY اور BRIDGE اور باپ کو ـــــ چھوڑنے کو تیار نہیں ـــــ"

"کیوں؟ باپ کیا کرتا ہے؟"

"لوگ اسے اس کی فطرت اور باپ کے باعث......" مالک دوکاندار نے رازدارانہ اور قدرے پُرخوف لہجے میں آگے جھک کر کہا۔

"یار، تم گھبراؤ نہیں۔ تمھارا راز راز ہی رکھیں گے۔" حامد نے جواب دیا۔

"ہاں جناب ـــــ اپنا فقرہ مکمل کیجیے۔" اس کی فطرت اور باپ؟"

"یہاں اُسے یہ W ـــــ "WILD CAT" کہتے ہیں۔ جو اُس کے پیچھے لگا ـــــ وہ اکثر لگا ہے ـــــ وہاں ـــــ باپ کسی زمانے میں PIER پر کام کرتا تھا۔ اب ہاؤس بوٹ (HOUSEBOAT) رکھتا ہے اور وہاں ـــــ

نائٹ کلب ——— "مطلوبہ معلومات یہاں ختم کرتے ہوئے مالک دکان گھڑی میں مسلسل وقت دیکھ کر یک لخت اُٹھ بیٹھا ———

"مل کہاں سکتے ہیں؟" حامد نے پوچھا۔

"MERRY-GO-ROUND پر ابھی باہر دیکھ لو۔ آنے کا وقت ہو چلا ہے ——— ورنہ تمھاری قسمت ——"

کمال کے لیے یہ کلیدی انکشافات تھے۔ اور "ورنہ تمھاری قسمت" بھی ——— یہ یاد کر کے اس میں خفتہ جاسوس بیدار ہو گیا اور وہ حامد کو فوراً کہنی سے پکڑ کر دکان سے باہر نکلا۔

.... گھوڑ چکر کے قریب ہی اُسے "لیزر جیسی" آنکھوں والی لڑکی گاڑھے نیلے رنگ کی بکنی (BIKINI) پہنے ایک نوجوان کو، جو لجاجت آمیز لہجے میں اُس کی ٹھوڑی دائیں ہاتھ سے چھو کر کچھ کہہ رہا تھا، ایک دم اُسے غصے سے پیچھے دھکیلتے دیکھا۔ جب موصوف اس کی طرف مجنونانہ انداز میں دیکھ کر اُس کا ہاتھ پکڑنے لگا تو لڑکی نے اُس کے مُنہ پر تھوک دیا۔ اس پر اُس کا عاشق نما لگتا مخاطب زور سے چیخیں مارتا وہاں سے بھاگ نکلا اور لڑکی "رُکتے" ہوئے تفریحی چکر کے ایک گھوڑے پر بیٹھ گئی جس پر یہ فوراً، جیسے اُس کے ڈر کے مارے، چل پڑا : ——— اُس کے مالک نے اُسے دیکھ لیا تھا!
کمال نے یہ تمام منظر قدرے مخدوش لیکن پُرلطف اور تجسّس انگیز پایا جب کہ حامد اس دوران میں کمال کی محویت کو طفلانہ سمجھتے ہوئے پائپ سُلگا کر اُس کے لیے لمبے کش لگانے لگا ——— اور وائلڈ کیٹ (WILD CAT) گھوڑے پر بیٹھی قہقہہ لگاتی، اسے خیالی چابک مارتی دوڑانے بھگاتے جا رہی تھی ——— کمال اس دوران اس کا نظارہ کرتے ہوئے سوچنے لگا "یہ کیا چیز ہے۔ اس سے کیسے بات کی جائے؟ ——— کیا ردِ عمل ہوگا۔ کافی دلچسپ، ڈرامائی نوعیت کا کیریکٹر ہے ——— اس علاقے سان فرانسسکو کی جان ——— جان نہیں سپرٹ ——— نہیں دیوی کہنا بہتر ہے۔ ——— ادھر ہی اُس نے دیکھا، شاید پہچانا........" عین اس وقت ہی لڑکی نے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور یوں محسوس ہُوا جیسے وہ "ابھی آئی" کا اشارہ کر کے گئی ہے۔

"نہ۔ نہ۔ یہ کہیں میری خوش فہمی تو نہیں؟" کمال نے خود سے پوچھا ——— لڑکی کے ہاتھ ہلانے کے جواب میں نہ صرف کمال بلکہ حامد نے بھی ہاتھ ہلایا ——— پانچویں چکر پر وہ رُک گئی ——— کمال کی جانب دیکھتے ہوئے گھوڑے سے اُتری اور جونہی سیدھی کھڑی ہوئی نیم سنجیدہ ہونے لگی ——— حامد کمال کا تعارف کروانے کے لیے اپنی مخصوص خود اعتمادی سے آگے بڑھ کر اس سے مخاطب ہوا، جب کہ کمال نے اُسے شائستگی سے سلام کرتے ہوئے اپنا کیمرہ اُس کی طرف اُٹھایا تا کہ اُس کا فوٹو اُتار سکے۔ وہ اس کا ایک فوٹو گھوڑے پر بیٹھے، پہلے کی طرح قہقہہ لگاتے اور والہانہ انداز میں ہوا میں ہاتھ لہراتے ایکشن میں لینا چاہتا تھا۔ اس نے اس سے ملاقات کی یوں ابتدا کرنے کا سوچا ہی تھا، جب وہ دونوں اُس کے عجب ردِ عمل پر چونک پڑے : کمال نے جب کیمرہ اُس پر فوکس کر لیا تو اُس نے ہاتھ معاً کمال کی طرف بڑھایا اور ہتھیلی کھولتے ہوئے کہا، "سو ڈالر!" کمال نے کھسیانا ہو کر کیمرہ نیچے کرتے ہوئے پہلے حامد، پھر اُس کی طرف بغور دیکھا اور مُسکرایا ———

لڑکی نے وِگ پہن رکھی تھی اور خاصا گاڑھا میک اَپ کیا ہوا تھا۔ قدرے ناٹے سے قد اور خاصے گدرائے جسم کی حامل

ہونے ہوتے اس پر دور سے فقط اُنیس بیس برس [حالانکہ اس کی عمر تقریباً تیس برس تھی] کی ہونے کا بھی گمان ہو جاتا۔ جیسے کمال کو گزشتہ ہفتے ہوا تھا۔

وہ ہتھیلی پھیلائے خاصہ مسکرائی لیکن کمال، نہ ہی حامد، کا مثبت جواب پاکر وہ غصّے سے بھڑکتے ہوئے انھیں راستے سے پرے ہٹا کر تیزی سے آگے نکل گئی ——— "دس ڈالر کم دینے ہوں تو فوٹو کے لیے ایک گھنٹے بعد ——— (گھڑی دیکھ کر) چار بجے۔ گیٹ پر ملنا ——— گولڈن گیٹ پر! ———" اس کے جواب میں کمال نے جانے کیوں پھرتی سے اُس کی پشت کے ایک دو سنیپ شاٹس لیے اور کیمرے کا لینز ڈھانپ کر اسے کندھے سے لٹکاتے ہوئے عجب اطمینان سے حامد کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ لیکن حامد نے جاتے جاتے رُک کر کمال کو کندھے پر شاباش دیتے ہوئے پوچھا: ———

"کیا خیال ہے۔ کیا اب برج پر جا کر مجرم کا کلوز اَپ نہ لیا جائے؟ اُس کے مقررہ وقت تک آدھ پون گھنٹہ کہیں کافی پیتے ہیں، کیوں؟"

"کیوں نہیں۔ راستے میں کھڑے کھڑے تمھیں کافی بھی پلاؤں گا، برگر بھی کھلاؤں گا۔ کمال نے خوش ہو کر جواب دیا۔ اور حامد کو ساتھ لے کر کافی سٹال کی طرف مڑ گیا ——— جب حامد نے اُس سے چلتے چلتے پوچھا کہ آیا وہ تازہ دم ہونے کے بعد گیٹ پر جانا چاہتا ہے تو کمال نے حتمی طور پر جواب دیا: "تمھارا تردد اور میرا تجسس تقریباً ختم!"

"یعنی اب اس کا تعاقب نہیں کرنا اور تمھاری کہانی والی کا ای، این، ڈی (END) ہو گیا!"

"فقط آخری ٹچ۔ لکھتے لکھتے اور بقول غالبؔ ؎ آتے ہیں غیب سے مضامیں خیال میں" کہتے ہوئے کمال نے کافی کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے برگر کا باقی ماندہ ٹکڑا منہ میں ڈال کر حامد کے ہمراہ گاڑی کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

اگلے روز صبح اس کہانی کا آخری ٹچ اخبار میں چھپی۔ اس سنسنی خیز خبر نے فراہم کر دیا کہ گزشتہ رات ایک نوجوان نے گولڈن گیٹ سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔ پولیس کی ابتدائی معلومات کے مطابق یہ ناکام محبت کا نتیجہ تھی، کیونکہ لڑکے کو چار پانچ مرتبہ ایک لڑکی، جو مقامی بتائی جاتی تھی، کے ساتھ برج اور اس کے قریب ایک گھاٹی پر گھومتے پھرتے دیکھا گیا تھا۔ لڑکا کسی غیر ملکی ڈانس ٹروپے میں کام کرتا رہا تھا۔

.... دوپہر کو نہ صرف کمال بلکہ حامد کو بھی یقین کی حد تک شک تھا کہ مذکورہ لڑکا اور لڑکی کون تھے۔ ایک WILD CAT دوسرا اس کا عاشق جس کے منہ پر اُس نے گزشتہ دوپہر کمال اور حامد کے سامنے تھوکا تھا۔

ہالی وڈ سٹور کے مالک نے مقامی ریڈیو پر نشر شدہ مزید خبر کی بنا پر اس کی تصدیق کر دی۔ علاوہ ازیں WILD CAT اور اسے بھی شامل تفتیش کر لیا گیا تھا۔

"کمال۔ یار تم نے تو صرف کمال ہی نہیں، بہت کمال کر دیا۔ تمھاری وہی لیزبیئن لڑکی اور وہ لڑکا ——— آخری ٹچ!"

"اِس کہانی کا آخری ٹچ"، کمال نے فون بند کرتے ہوئے عجب اطمینان کا سانس لیا۔ (۱۵ر اگست ۱۹۸۷ء سان جوزے کیلیفورنیا)

ہسٹری شیٹرز

احمد شریف

ایک روز وقار کا ٹیلی فون آیا، کہنے لگا:

"ڈنر کا دعوت نامہ بھیج رہا ہوں، ضرور آنا۔"

میں نے پوچھا:

"کیسا ڈنر؟"

کہنے لگا:

"تیرے چہیتے آتے ہوئے ہیں، چینی۔ ان کی دعوت ہے۔"

ان دنوں چین سے لکھنے والوں کا ایک وفد پاکستان کے دورے پر آیا ہُوا تھا۔ میں نے ہامی بھرلی۔

اسی شام ایک آدمی دعوت نامہ لے کر آیا تو پتا چلا کہ ڈنر کی نوعیت سراسر سرکاری تھی۔ میرا خیال تھا عام سی دعوت ہوگی جہاں دونوں ملکوں کے لکھنے والے بیٹھ کر اپنے دُکھ سُکھ بانٹ لیں گے۔ ڈنر کا انتظام فارن آفس کی بلڈنگ شہرزاد میں کیا گیا تھا۔ وہاں سے رات گئے واپسی پر سواری کا ملنا دشوار تھا۔ پہلے تو جی میں آئی معذرت کر کے جان چھُڑا لوں۔ پھر چینیوں سے مل بیٹھنے کا شوق غالب آ گیا اور میں چپ ہو رہا۔

ڈنر کا سارا دن تیاری کرتے گزر گیا۔ میں نے وقت سے پہلے پریس بند کر کے کاریگروں کو چھُٹی دے دی اور دفتر میں آ بیٹھا۔

شام ہُوئی تو بادل گھِر کر آ گئے۔ بادلوں کے ساتھ ساتھ کرسٹی آوارد ہُوئی۔ میں دل ہی دل میں خوش ہُوا کہ ڈنر میں نہ جانے کے اسباب خود بخود پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ کرسٹی نے دروازے میں رک کر میری سج دھج دیکھی اور چوکھٹ سے لگ کر پوچھنے لگی:

"کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے کہا:

"اسلام آباد"

پُوچھنے لگی:

"کیوں؟"

میں نے کہا :

"ڈنر کھانے ۔"

وُہ جلدی سے میری طرف بڑھی اور آدھی پونی مجھ پر ڈھیر ہوتے ہوئے اٹھلائی :

"میں بھی جاؤں گی۔"

میں نے حیرت سے کہا :

"تم !"

اس نے بغور میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی :

"تمہاری بیوی کو باہر سے واپس کر دیں گے ؟"

میں خاموش رہا۔ اس نے پرس سنبھالا اور جھک کر اُٹھتے ہوئے بولی :

"چلو ۔"

میں اس کے ساتھ ہولیا ۔ بازار میں آئے تو میں نے گرد و پیش سے نظریں چرالیں ۔ وجہ یہ تھی کہ کرسٹی کی ہمراہی میں لوگ کرسٹی کی بجائے اس کے ساتھ جانے والے کو زیادہ معنی خیز نظروں سے گھورا کرتے تھے ۔ راستے میں آکر اس نے پُوچھا :

"جائیں گے کیسے ؟"

میں نے کہا :

"ویگن سے ۔"

اس نے سر ہلایا اور کہنے لگی :

"ٹھیک ہے آب پارے سے آگے سیر کرتے چلیں گے ۔"

ویگن میں سوار ہوتے وقت وہ آگے ہی آگے لپک کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے اسے اور اس نے ڈرائیور کو بھرپور نظروں سے تولا۔ پھر وہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی ۔ میں ابھی نئی صورت حال کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ سنٹرل ہسپتال کے پاس آکر اس نے ویگن رکوائی اور اترتے ہوئے بولی :

"میری سہیلی بیمار ہے اسے تسلّی دے آؤں ۔" پھر پُوچھنے لگی : "تم کب واپس آؤ گے ؟"

میں نے کہا ،

"نو ساڑھے نو بج جائیں گے ۔"

کہنے لگی :

"میں گیٹ پہ انتظار کروں گی ۔"

میں نے یُوں ہی پُوچھا :

"کب تک؟"

وہ مُسکرا کر بولی :

"صبح تک۔"

اور پرس جھلاتی ہسپتال کی طرف چلی گئی۔

سارا راستہ بادل گرج گرج کر ہلکان ہوتے رہے۔ بجلی چمکتی تو آنکھیں خیرہ سی ہو جاتیں۔ بارش سگنل پ
رُکے نوجوان سکوٹر سوار کی طرح پر تولے کھڑی تھی۔

آب پارہ پہنچے تو بارش چھما چھم برسنے لگی۔ میں نے دُور ہی سے ٹیکسی والے کو آواز دی :

"شہزاد!"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ چلنے لگے تو میری نظر ایک غیر ملکی پر پڑی۔ وہ سٹینڈ پر ہونقوں کی طرح کھڑا
بھیگ رہا تھا۔ میں نے پُوچھا :

"کہاں جاؤ گے؟"

کہنے لگا :

"برٹش ایمبیسی۔"

میں نے اس کے لیے جگہ بناتے ہُوئے کہا :

"چلے آؤ۔"

وُہ لپک کر میرے برابر آ بیٹھا۔ میرا خیال تھا وہ میرا شکریہ ادا کرے گا۔ میں اپنی فراخدلی کا مظاہ
کروں گا اور بات اس کے حسب نسب تک جا پہنچے گی۔ لیکن وہ گم صم بیٹھا ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہا۔ و
سچ مچ روایتی انگریز تھا اسے اپنی جگہ کچھ جتانے کی فکر تھی۔ میں اپنی جگہ کچھ بچانے اور کچھ سمجھانے کی خاطر چپ بیٹھا ر
راستے میں آکر اچانک اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ میری طرف بڑھایا اور کہنے لگا :

"میرا نام فریڈی ہے ——— مائیکل فریڈی۔"

میں نے اپنا مختصر سا تعارف کرایا اور اپنی جگہ دبک کر بیٹھ گیا۔

بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔

شہزاد پہنچے تو میں نے برٹش ایمبیسی تک کا کرایہ ادا کر کے ٹیکسی والے سے کہا :

"اسے برٹش ایمبیسی چھوڑ دینا۔"

فریڈی نے مجھے روکا اور کہنے لگا :

"اپنا کرایہ ادا کر دو، آگے میں دے دُوں گا۔"

میں نے چلتے چلتے اسے اپنا پتا بتایا اور کہا :

"اپنا کرایہ میرے نام منی آرڈر کر دینا۔"

وہ اپنی جگہ کسمسا کر رہ گیا۔ اسی اثنا میں ٹیکسی روانہ ہو گئی۔

کئی روز بعد کا ذکر ہے۔

ایک رات میں کلب پہنچا تو کرسٹی مجھے دیکھ کر لپکتی ہُوئی میری طرف آئی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے بولی :

"تو اسے قابو میں رکھ، میں ایک اور کو تسلّی دے آؤں۔"

کرسٹی سب کو تسلّیاں دیتی صدر کی سڑکوں پر گھُوم پھر کر جوان ہُوئی تھی۔ اس کا انداز ہر ایک سے ایسا ہی تھا جیسے وہ اس کا بزنس پارٹنر ہو۔ میں نے پُوچھا :

"دوسرا کون ہے؟"

کہنے لگی :

"ہے ایک گرینڈ پا۔ شام سے سامنے ہوٹل میں کروٹیں بدل رہا ہوگا۔"

وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے اس کے ساتھی کی طرف دیکھا وہ فریڈی تھا اور اپنی جگہ بیٹھا پہلو بدل رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس پر بڑھاپا ٹوٹ کر طاری ہو گیا تھا۔ گالوں کا گوشت لٹکا ہوا تھا۔ آنکھیں گھنی بھنوؤں کے نیچے مُندی جا رہی تھیں۔ میں نے اسے مخاطب کیا :

"ہیلو۔"

اس نے میری طرف دیکھ کر کہا :

"ہیلو!"

اور مجھے پہچان لیا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے پُوچھا :

"منی آرڈر مل گیا تھا؟"

مجھے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ اس نے شہرزاد سے برٹش ایمبیسی تک کا کرایہ مجھے منی آرڈر کیا ہوگا۔ مجھے کوئی منی آرڈر نہیں ملا تھا — میں نے یونہی کہہ دیا :

"مل گیا تھا۔"

اس نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے دُور ہوتی کرسٹی کی طرف دیکھا اور کہنے لگا :

"میں نے بھیجا ہی نہیں تھا۔"

اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ کرسٹی اپنے آس پاس قیامت سی جگاتی باہر نکل گئی۔ میں نے فریڈی کا ہاتھ تھپتھپا کر کہا

"ٹیکسی والے نے بھیجا ہو گا۔"

ہم دونوں ہنس پڑے۔ اجنبیت کا حائل پردہ ہٹتا جا رہا تھا۔ فریڈی بولا :

"تمہاری عورتیں بہت اچھی ہیں۔"

میں ہنسا اور ہنس کر کہا :

"ہماری کہاں، تمہاری ہیں، جن کو تم جاتے ہوئے ہمارے لیے چھوڑ گئے تھے۔"

میں اس سے کیا کہتا۔ اپنی سی جستجو کے باوجود ہم آج تک اپنی عورتوں کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ میں نے پوچھا :

"سیر کے لیے آئے ہو ؟"

کہنے لگا :

"ہاں سیر ہی سمجھو۔ میں استعفا دے کر آیا ہوں۔"

میں نے اس کے قریب ہو کر دلچسپی ظاہر کی :

"اچھا !"

وہ بولا :

"میں اپنی کاونٹی کا جج تھا۔ میرا بھتیجا بڑا حرامی ہے۔ ایک روز ریپ کے کیس میں پڑ گیا تھا۔ اسے میری عدالت میں لایا جانا تھا۔ میں نے چپکے سے استعفا دے دیا۔"

اس کے بھتیجے کے حرامی ہونے اور اس کے استعفا دینے کی بات میری سمجھ میں آ گئی لیکن یہ راز نہ کھلا کہ وہ یہاں کیا کر رہا تھا۔ میں نے داستان جاری رکھنے اور بات آگے بڑھانے کی خاطر ہنکارا بھرا :

"پھر ؟"

وہ بولا :

"میری جگہ ایک اور جج کا تقرر ہو گیا۔ میں نے سوچا میرے اثر و رسوخ کی وجہ سے نئے جج کو میرے بھتیجے کا کیس نمٹانے میں دشواری ہو گی — میں جہاز میں بیٹھا اور وقت گزارنے یہاں چلا آیا۔"

میں نے حیرت و استعجاب سے اس کی طرف دیکھا۔ فریڈی پتا نہیں کیسا جج تھا !

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہماری عدالت میں ایک تاریخی مقدمہ سُنا جا رہا تھا۔

بے یقینی کا عذاب

غلام الثقلین نقوی

وہ چھوٹی سی بستی ایک وادی میں واقع تھی اس کی مٹی بہت زرخیز تھی ذرا نم ہوتی تو اس سے دودھ اور شہد کی نہریں بہ نکلتیں اس کی ندیاں قریب کی ایک سرسبز پہاڑی سے آتی تھیں۔ جگہ جگہ پھوٹتے ہوئے صاف شفاف چشمے ان ندیوں کو کبھی محروم آب نہ ہونے دیتے اس پہاڑی پر جھاڑیوں کے جھنڈ تھے کہ جن میں شہد کی مکھیاں بے شمار چھتے ڈالتیں اور خودرو پودے تھے کہ جن کے پھولوں سے وہ رس، چوستیں۔ لگتا جیسے یہ پھول نہ ہوں بلکہ ننھی ننھی کٹوریاں ہوں کہ جن میں شہد بھرا ہو، ان لوگوں کی گائیں اتنا دودھ دیتیں کہ گھر کے سارے برتن دودھ سے بھر جاتے اور دھار نہ ٹوٹتی۔

جن لوگوں نے اس بستی کو آباد کیا تھا، وہ اللہ کے بہت شکرگزار بندے تھے ٹھنڈا پانی پیتے تو ایک ایک گھونٹ سو سو بار اللہ کا شکر ادا کرتے۔ دودھ اور شہد کے ساتھ ساتھ گیہوں کی نرم نرم سفید روٹی کھاتے تو ان کی شکرگزاری کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔ انہوں نے اپنی ضروریات کو بہت محدود رکھا تھا نہ پتھروں سے اونچے اونچے بے مصرف محل بناتے نہ ریشم و کمخواب کے لباس پہنتے۔

ان کی اگلی نسل نے کچھ اسراف و تبذیر سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ دودھ، شہد اور گیہوں پر قناعت نہ کرتے اور دوسری بستیوں سے کچھ ایسی چیزیں بھی خریدنے لگے کہ جن کے بغیر بھی ان کے آباؤ اجداد بڑی آسائش کی زندگی گزار گئے تھے اور جن سے عیش و عشرت کی راہیں کھلنے لگی تھیں۔ چنانچہ ان کے مکانوں میں وسعت پیدا ہوئی، فرش پکے ہوئے اور پکے فرشوں پر قالین بچھنے لگے جن مکانوں میں کبھی گھی اور تیل کے دیے جلتے تھے، وہاں اب قندیلیں اور جھاڑ روشن ہونے لگے۔

اور ان کی اگلی نسل میں سامانِ تعیش کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے مسابقت شروع ہو گئی اور وہ اپنے مکانوں کی وسعت، اپنے خوبصورت ساز و سامان اور در و دیوار کی آئینہ بندی پر فخر و مباہات میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ ان میں جو بڑے تھے، انہوں نے چھوٹوں کا حق مارنا شروع کر دیا جو تاجر تھے، وہ نفع اندوزی کا شکار ہو گئے اور جو حاکم تھے وہ رشوت لینے لگے۔

اس نسل کا ایک آدمی کہ جس کی عبادت و زہد کا چرچا تھا جو سال کے تین مہینے سرسبز پہاڑی کے ایک غار میں مصروفِ صوم و صلوٰۃ رہ کر گزارا کرتا تھا اور باقی نو مہینے اپنی بستی کی مجلسی اور مذہبی زندگی میں جوش و خروش سے حصّہ لے کر بسر کرتا تھا اور ایک خوشحال گھرانے کا سربراہ ہونے کی وجہ سے جسے بستی میں عزت و احترام کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا تھا، اس صورتِ حال پر بہت کڑھتا تھا لیکن خاموش رہتا تھا کہ ابھی اسے اپنے اندر سے اظہار کا اذن نہیں ملا تھا۔

تب ایک دن جب وہ منبر پر بیٹھا، اچانک اس کی زبان رواں ہو گئی اس نے بستی کے اپنی اصل سے انحرافی رویے کے خلاف فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے اس کے لفظوں میں آگ تھی کہ پتھر دل بھی پگھل گئے لیکن وہ لوگ جو اس انحراف کے ذمہ دار،

تھے، اس سے ناراض ہو گئے اور بازاروں میں اور چوراہوں پر اُسے برا بھلا کہنے لگے۔

وہ غار میں چلا گیا کہ غور و فکر اور مراقبے سے اپنے عزم کو راسخ بنائے اور اس کی عدم موجودگی میں بستی کے سب سے بڑے آد
نے ایک دوسری بستی سے کہ جس کی عورتیں اپنے حسن و رعنائی میں مشہور تھیں، ایک عورت سے شادی کی اور اس نے مطالبہ کیا کہ گھر میں اس
لئے عبادت گاہ بنائی جائے کہ جہاں وہ اپنی بستی کے دیوتاؤں اور دیویوں کے بت سجائے، ان میں کچھ بت عریاں تھے اور بُت گروں نے دیو
دیوتاؤں کی محبت کو اس طرح کا جسمانی ملاپ دیا تھا کہ بستی کے نوجوان اُن پر فریفتہ ہو گئے۔

تب گھر گھر میں بت بننے لگے اور انہیں تہذیب و تمدن کا لازمہ قرار دے دیا گیا۔

اور جب وہ شخص غار سے لوٹا تو اس نے دیکھا کہ اس کے گھر کے سب سے کشادہ کمرے کے آرائشی آتش دان کی کارنس پر د
بُت رکھے ہوئے ہیں، وہ پہلے حیران ہوا پھر اس کا غضب آتش فشاں کی طرح پھٹا۔ اس نے ہتھوڑا اُٹھایا اور بتوں کو پاش پاش کر دیا
پر غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو ٹکڑوں کو پاؤں تلے مسلنے لگا۔

اس کے پہلوٹھی کے بیٹے نے پوچھا "بابا! تم نے ایسا کیوں کیا"؟

"میں اپنے گھر کو بُت کدہ نہیں بننے دوں گا۔" اس نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"بستی کا کون سا گھر ہے جس میں یہ بتکدہ موجود نہیں؟" اُس کے بیٹے نے کہا اور اُس کے لہجے میں سرد مہری کی برف تھی۔

اُس کے غصے کی آگ اچانک بجھ گئی جیسے اس پر برفیلا پانی پڑ گیا ہو۔

"تب میں ایسے گھر میں نہیں رہ سکتا۔" اُس نے مایوسی کے لہجے میں کہا اور دراز گوش پر پھر سے پالان کسنے لگا۔

اس نے ایک ایک بیٹے کے چہرے کو پڑھا، کسی چہرے پر اُسے وہ تحریر نظر نہ آئی جو دامن پکڑ لیتی ہے اس کی بیوی نے آنکھیں
چُرا لیں۔ صرف اُس کی بیٹی نے جو ابھی ناکتخدا تھی اور جس سے اُسے بہت محبت تھی، آنکھ میں آنسو بھر کر اس کا دامن پکڑنے کی کوشش ک
نے دل پر جبر کر کے دامن چھڑا لیا۔

اِس لڑکی نے اُس کے خالی توشہ دان کو کھانے سے بھر دیا۔

اُس نے سرسبز پہاڑی کے غار میں پناہ لے لی۔

اُسے بستی چھوڑنے کا افسوس ضرور تھا لیکن ابھی وہ بستی والوں سے مایوس نہیں ہوا تھا کہ اس کے دِل میں امید کی روشنی برقرار
اور اُمید محبت کو زندہ رکھتی ہے۔

اسے اُن پر غصہ تھا کہ جو باشعور ہو کر بھی شعور کھو چکے تھے لیکن اُن سے پیار تھا جو ابھی شعور کی منزل پر پہنچے تھے اس زمرے
اُس کی بیٹی بھی داخل تھی اور انہیں وہ ہر صورت میں اللہ کے غضب سے بچانا چاہتا تھا کیونکہ ان میں اصلاح کی قابلیت موجود تھی۔ چنانچہ وہ
کے لئے خدائے لایزال سے استغفار کرتا رہا، اُس نے سخت مجاہدہ بھی کیا اور مجاہدے کا مقصد یہ تھا کہ اس کے اندر ایمان کی وہ قوت
ہو جو شر سے ٹکرا کر اُسے پاش پاش کر دیتی ہے۔

"جب بھی میں نے محسوس کیا کہ یہ قوت میری روح میں جنم لے چکی ہے، میں بستی میں واپس چلا جاؤں گا۔"

پھر ایک دن اُسے اپنے اندر سے آواز آئی کہ اے شخص! تیرا مجاہدہ مکمل ہوگیا ہے وہ غار سے نکلا۔ اس کا دراز گوش غار کے دہانے کے قریب سبزہ چر رہا تھا۔ اس نے اُس کی پیٹھ پر پالان کسا اور خوش خوش اس پگڈنڈی پر ہولیا جو پہاڑ سے اتر کر وادی میں داخل ہوجاتی تھی۔

جب وہ بستی کے قریب پہنچا تو وہ سوچنے لگا کہ میں کہیں رستہ تو نہیں بھول گیا۔ یہ کون سی بستی ہے، جہاں میں آ پہنچا ہوں۔ یہ تو شہرِ خموشاں ہے کہ جس کی گلیاں جانداروں سے خالی ہیں اور درختوں پر کوئی پرندہ موجود نہیں۔ پوری بستی اپنی چھتوں پر ڈھے کر گری پڑی ہے اور ہر گھر کی دہلیز پر کسی لاش کا ڈھانچا پڑا ہے۔

تب ایک خیال بجلی کا کوندا بن کر لپکا۔

وہ بستی جس کے لیے اس نے غار میں مسلسل استغفار کیا تھا، وہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو کر تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ یہ اس کی اپنی ہی بستی تھی جس کے ایک گھر میں اس کے بیوی بچے رہتے تھے اس کی بیوی کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے مجسّم ہوا۔ اس کے بیٹے صحن میں چلنے پھرنے لگے اور وہ بیٹی جو اُسے بہت عزیز تھی اور جس نے آنکھ میں آنسو بن کر اس کا دامن کھینچا تھا، بلبل کی طرح چہکنے لگی، تو اس کا سینہ غم و اندوہ سے بھر گیا۔

"تم لوگ کہاں گئے؟" اس نے چلا کر کہا۔

اس کی آواز بستی کے کھنڈروں میں گونج گونج کر شہرِ خموشاں میں غرق ہوگئی تو اس کا سینہ پتھر کا اور اس کا دل سیسے کا بن گیا وہ آنسو جو اُس کے حلق سے گزر کر اس کی آنکھ تک پہنچا تھا ٹپک نہ سکا اور وہیں پتھرا کر رہ گیا۔

اُس نے اللہ سے کوئی شکایت نہ کی۔

البتہ اُس کے دل میں ایمان کا نور بجھ گیا اور آنکھوں میں بے یقینی کا اندھیرا چھا گیا۔

اس نے سوچا "یہ بستی جسے بابل و نینوا کے ایک قاہر و جابر بندے بخت نصر نے تباہ و برباد کیا ہے، اب اللہ بھی چاہے تو ایسی ویرانی کے بعد اسے آباد نہیں کر سکتا۔"

وہ دراز گوش پر سوار ہو کر غار میں لوٹ آیا۔

اُس نے پتھر کے تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ اُسے نیند آ گئی۔

جب وہ جاگا تو اس نے اپنے آپ سے پوچھا "میں ایک پورا دن سویا یا اُس سے کم؟"

وہ آنکھیں ملتا ہوا غار سے باہر نکلا۔

غار کے دہانے پر اس نے اپنے دراز گوش کا ڈھانچا دیکھا کہ جس پر گوشت پوست نام کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے ہڈی کو ہاتھ لگایا تو وہ خاک بن کر بکھر گئی۔

تب غیب سے آواز آئی "اے شخص! اپنے دراز گوش کو پکارو"۔ اس نے دراز گوش کو آواز دی تو ہڈیوں کے ڈھانچے پر گوشت پوست چڑھنے لگا۔ چشم زدن میں دراز گوش اس کے پہلو میں کھڑا تھا اور اس پر پالان بھی کسا تھا۔ وہ اُس پر سوار ہو گیا۔

جونہی پگڈنڈی بل کھا کر وادی میں اتری، اسے یوں لگا جیسے کوئی جادو کا شہر اچانک وجود میں آگیا ہو ایک بہت ہی آباد شہر کر کی عمارتیں آسمان کی خبر لا رہی تھیں، پگڈنڈی اچانک ایک وسیع و عریض شاہراہ میں گم ہو گئی جو اس شہر کی طرف جاتی تھی۔ اس پر عجیب و غریب سواریاں طوفانی ہوا سے بھی زیادہ تندی و تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی تھیں کہ اس کا دراز گوش مسلسل کانپ رہا تھا اور یہ کپکپاہٹ اس کی ریڑھ کی ہڈی کے مغز کو بھی مرتعش کر رہی تھی اور ایک عجیب سا خوف اس کی رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔

سڑک کے کنارے اسے پہلا آدمی جو نظر آیا، اسے روک کر اس نے پوچھا "بتا سکتے ہو کہ اس بستی کا نام کیا ہے؟"

اُس کُسے کُسے چہرے والے نے اُسے یوں دیکھا جیسے وہ اس کی زبان نہ جانتا ہو وہ سڑک کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ کسی آدمی اُس کے سوال کا جواب نہ دیا۔

"یہ عجیب شہر ہے جو مسافروں کی میزبانی تو کیا، راہنمائی بھی نہیں کرتا۔" دراز گوش تھک کر ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔

وہ اس کی پیٹھ سے اتر کر اس کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا

تب بھوک پیاس اور تھکن سے نڈھال ہو کر وہ فرشِ زمین پر بیٹھ گیا اور پاس سے گزرنے والے کسی انسان نے اس کی دلداری

اس نے ہر گزرنے والے چہرے کو غور سے دیکھا۔

اُسے ہر چہرہ ایک جزیرہ نظر آیا کہ جس میں کسی اور کو در آنے کی اجازت نہیں تھی۔ کسی آنکھ میں اُسے کسی دوسرے چہرے کا عک دکھائی نہ دیا جیسے وہ اپنی دنیا آپ ہو۔ بے گانگی، عزیمت، شک اور گمان کی بنجر دنیا۔

اعتماد اور یقین سے خالی تنہا تنہا چہرہ، اپنے ہی کرب کا شکار بے یقینی کے سلگتے ہوئے آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا تھا کسی کسی چہرے کے ہونٹ پر ہنسی کی لکیر بھی دکھی لیکن جب وہ ہونٹ سے آنکھ میں اترتی تو کرب و اذیت کی تحریر بن جاتی۔

ہر چہرہ بجھا ہوا تھا ہر آنکھ بے نور تھی۔

کیونکہ وہ جو نور کا سرچشمہ ہوتا ہے اور جسے دل کہتے ہیں، اب یقین اور ایمان کی روشنی پیدا نہیں کر رہا تھا۔

اس نے ایک ایک آنکھ میں جھانک کر دیکھا ہر آنکھ میں اُسے خوف کا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا نظر آیا۔

اس نے مقدس کتابوں میں پڑھا تھا کہ قیامت کے روز ایسا ہی خوف ہر آنکھ میں ہوگا اور اُس وقت کوئی کسی کا یگانہ نہیں ہوگا کوئی نفسا نفسی کا شکار ہوگا۔

اس بستی پر یقیناً عذاب نازل ہونے والا ہے۔

وہی عذاب جو اس بستی پر آیا تھا جس کے کھنڈروں پر یہ بستی آباد ہوئی ہے۔

اس کے اپنے دل میں بھی خوف کا آتش فشاں سلگنے لگا تو وہ اچک کر دراز گوش کی پیٹھ پر بیٹھا اور اس کا منہ غار کی طرف کر کے اُسے مہمیز لگائی دراز گوش بگٹٹ دوڑنے لگا کہ جانور کا اپنا خوف بھی اسے ایڑھی لگا رہا تھا۔

اس نے دیکھا کہ وہ پگڈنڈی جو پہاڑی پر چڑھ کر بل کھاتی ہوئی اس کے غار کی طرف جاتی تھی، اچانک غائب ہو گئی ہے۔

تب غیب سے ایک آواز آئی :۔

اے شخص! تو میرے عذاب پر اتنا غضب ناک ہوا کہ تیرا آنسو تیری آنکھ میں آ کر پتھر بن گیا' میری بے نیازی کو اس سے کچھ گلہ نہ ہوا لیکن جب تو نے بے یقینی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب اللہ چاہے بھی تو اس اُجڑی بستی کو آباد نہیں کر سکتا' میں نے تجھے موت دی اور پھر زندہ کیا تو نے اجڑی ہوئی بستی کے کھنڈروں پر نئی بستی آباد دیکھی.... اور اب تیری بے یقینی کی سزا یہ ہے کہ تو اس بستی میں اکیلا رہے گا۔"

جونہی آواز خاموشی کے سمندر میں ڈوبی' اس کا دراز گوشت زمین پر گرا اور گرتے ہی راکھ ہو گیا۔

اس نے پہاڑی کی چوٹی کو حسرت کی نگاہ سے دیکھا جہاں وہ غار تھا جس میں انسانوں سے بھاگ کر اسے عافیت ملا کرتی تھی لیکن اس تک جانے والی پگڈنڈی گم ہو چکی تھی۔

اس نے مُڑ کر خوف کی نظروں سے شہر کی طرف دیکھا کہ جس کی بلند و بالا عمارتیں آسمان کی خبر لا رہی تھیں اور جہاں رات کو بھی ن کا سماں ہوتا تھا لیکن وہاں ہر آدمی "تنہا" تھا اور اُسے بے یقینی کے عذاب میں مبتلا کر دیا گیا تھا۔

اور اب قیامت تک وہ اُن کے عذاب میں شریک بھی تھا اور تنہا بھی۔ اس نے آسمان کی طرف ایک نظر دیکھا۔

اور سر جھکا کر کہا۔ "مجھے تیرا یہ عذاب دل و جان سے قبول ہے"۔

پہاڑوں کی کہانیاں

جوگندر پال

(۱)

میں اپنی محبوبہ کو بھگا کر پہاڑوں میں لے آیا تھا اور یہاں ہمارے سارے راستے میں موڑ ہی موڑ تھے۔ اِن موڑوں پر راستہ کبھی جھک جاتا تو ہم خوشی سے لپک کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے لیکن تھوڑے فاصلے پر ہی وُہ اپنی پیٹھ پھر سیدھی کر لیتا اور ہم نیچے سرک کر پھر اپنے پیروں پر لڑکھڑانے لگتے۔ آخر اوپر اٹھتے ہوئے ایک اور موڑ پر ہماری سانس پھُولنے لگی اور ہم وہیں بیٹھ گئے اور تھکن سے ہمیں ہوش کا نہ رہا کہ ہمارا راستہ ہمیں وہیں چھوڑ کر اپنی دُھن میں بدستور مُڑ گیا ہے۔

"تھک گئے ہو؟" ایک پہاڑی بوڑھا نہ جانے کہاں سے وارد ہو گیا۔

"ہاں بابا! اتنے موڑ ہیں کہ دم ٹوٹ گیا ہے۔"

بوڑھا مسکرانے لگا "پہاڑوں میں یہی تو ہوتا ہے۔ ہنستے کھیلتے مڑتے جاؤ گے تو کسی موڑ پر ایک دم گھر سامنے جا کھڑے ہو گے ——"

(۲)

"پراچین کال میں رِشی مُنی اپنا وقت آتے ہی پربتوں کی اور کیوں ہو لیتے تھے؟"

"اِس لیے کہ پربت آگے بڑھ کے جھٹ اُنھیں اپنی اوٹ میں لے لیتے تھے۔"

(۳)

جب ہم اپنی پہاڑی مہم پر روانہ ہُوئے تو ہمارے ساتھ ڈھیروں سامان تھا۔ ایک خاص اونچائی تک ہم اپنا سارا سامان لے آئے مگر یہاں سے اوپر جانے کے لیے ہمیں نصف سامان یہیں چھوڑنا پڑا۔ آگے جاکے اپنا یہ نصف سامان اٹھانا بھی دُوبھر ہو گیا اور ہم نے اِس میں ایک چوتھائی اور کم کر دیا۔ مزید آگے ہمیں اپنا بقیہ سامان چھوڑ دینا پڑا اور اِس طرح سبک ہو کر ہم اپنی مہم کی تکمیل میں جٹ گئے۔ ہمیں محسوس ہونے لگا گویا ہم میں سے ہر ایک ابھی تک بڑے بھاری سامان

لدا ہوا ہے۔

ہمارے لیڈر نے ہمیں پکار کر مسکراتے ہوئے مانو اپنے آپ کو بھی بتایا" اگر ہم اپنا سفر جاری رکھنا چاہتے ہیں تو یہاں سے اِس بوجھ سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔"

"کون سا بوجھ؟" ہم نے حیرت سے پُوچھا

"اپنے وجود کا، اور کون سا؟" لیڈر کی مُسکان گاڑھی ہونے لگی" بولو!"

(۴)

پہاڑوں میں ایک پگڈنڈی پر سے اترتے ہُوئے وُہ رک گیا اور سر جھکا کر دیکھنے لگا کہ اوپر کے مانند نیچے بھی پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور وہ اتر اتر کر در اصل چوٹیوں پر پہنچ رہا ہے۔

(۵)

میں اور وہ یہاں اِس پہاڑ پر بیٹھے تھے اور ہماری آنکھوں میں ایک وسیع وادی بسی ہُوئی تھی جس کے سینے پر چار سُو سبزہ ہی سبزہ بچھا تھا۔

"آؤ رینو!" میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا" ہمارے ماں باپ نہیں مانتے تو کیا ہوا! آؤ ہم شادی کے بغیر ہی ایک دُوسرے کو اپنا لیں۔"

"نہیں، رام!" وہ کہنے لگی" پگڈنڈی کے بغیر وادی میں اترنا نہیں ہو پاتا۔"

(۶)

اُس پہاڑن کا گھر اپنے پہاڑ کی وسطی ڈھلان پر واقع تھا۔

مَیں نے ایک دن اُس سے پُوچھا" تمہاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟"

پہلے تو وہ میری نظر بچا کر اپنے ذہن میں گھس گئی اور پھر میں ابھی اُس کا پیچھا کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ وُہ اچانک سج دھج کر اپنے دل و دماغ سے بر آمد ہوئی اور بولی" میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے میرے گھر کے آگے ایک چھوٹا سا چپٹا آنگن ہو۔"

بس؟

ہاں، بس یہی۔ گھر کی چوکھٹ پر کھڑے مجھے کھٹکا سا لگا رہتا ہے کہ انجانے میں کبھی میرا پاؤں نہ پھسل جائے۔

(۷)

وہ چوٹی دیکھ رہے ہو؟ —— وہ —— اُس چوٹی کے اُوپر وہ! —— اُسے بُڈھوں کی چوٹی کہتے ہیں —— ہاں، اُس چوٹی پر بڈھوں کا ایک پُورا شہر آباد تھا —— ہاں، بتاتا ہوں —— تھا یُوں، کہ دراصل وہاں ایک ہی بڈھا تھا اور وہ اپنے آپ سے اِس طرح مِل جُل کر رہتا تھا گویا وہ کئی ہزار ہو۔

بڑی عجیب بات ہے!

یہ تو ہُوئی، اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ اُن میں سے ہر ایک بُڈھے کو بھی ہزاروں میں گِنا جا سکتا تھا۔

مگر یہ ہزاروں لاکھوں بُڈھے اتنی چھوٹی سی چوٹی پر رہ کیونکر پاتے تھے؟

یہی تو معجزہ ہے! مِل جُل کر رہیں تو جتنے بھی ہوں، کیا مجال، ایک سے زیادہ لگیں۔

(۸)

نہیں، اِس پہاڑ پر سبزہ نہیں اُگتا —— کیوں؟ —— اِس لیے کہ اِسے نیند نہیں آتی —— کیوں نہیں آتی؟ —— ارے بابا! جس مُورکھ نے پیٹ میں اتنے قیمتی پتھّر جمع کر رکھے ہوں اُسے بے فکری کی نیند کیسے آئے گی؟ —— ذرا سا سو کر بُھربُھرا ہو تو سینے پر سبزہ آئے۔

(۹)

اُدھر دیکھو، وہ پہاڑ اپنے اِس خیال پر پانی پانی ہو رہا ہے کہ وُہ چلنے پھرنے سے قاصر ہے، ورنہ اپنی گود میں بسے ہُوئے لوگوں کے دُکھ کا مداوا کرتا —— دیکھو، سوچ سوچ کر اُس کی چوٹی پر برف پگھلنے لگی ہے اور نشیب پر جابجا کئی جھرنے بہ نکلے ہیں —— ہاں، بھائی! پہاڑ اگر شرمندہ بھی ہوتے رہیں تو دھرتی سیراب ہو جاتی ہے۔

(۱۰)

مَیں جب بھی اِس طرف سے گزرا، اُس بُوڑھے کو ہمیشہ ویسے ہی چُپ چاپ بڑے چین سے اِس پہاڑ پہ بیٹھے پایا۔ مجھے الجھن سی ہونے لگتی کہ وُہ کیونکر اتنے چین سے مہینوں سالوں سے عین اُسی مقام پر جم کے بیٹھا ہوتا ہے، اور پھر ایک دن اُسے وہاں نہ پا کر مجھے لگا جیسے کوئی بڑی انوکھی بات ہو گئی ہے۔ میں تعجب سے آس پاس دیکھنے لگا۔ وہ مجھے نظر تو کہیں نہ آیا مگر وہ سارا مقام جُوں کا تُوں اس کی موجودگی سے بسا بسا معلوم ہو رہا تھا —— ارے ہاں! —— اور کیا؟ —— وہ بُوڑھا یہ پہاڑ ہی تو تھا! ——

(۱۱)

"پہاڑوں کی گھور خاموشی میں محسوس ہوتا ہے جیسے دور ——— بہت دور سے کوئی آواز سنائی دے رہی ہو۔"

"ہاں، اور اِس پر کان دھرے ہم اپنا آپ بالکل بھولے ہوتے ہیں۔"

"ہاں، ابد کی آواز اُس وقت تک سنائی نہیں دیتی جب تک ہم مٹی نہ ہو جائیں۔"

(۱۲)

سارا قصہ تو کئی بار سُنا چکا ہوں۔ بات بس اتنی سی ہے کہ میں نے اُس پہاڑ کی چوٹی سے گِر کر خودکشی کرنا چاہی، مگر اُسی دم پہاڑ نے اچھل کر میرے پیر پکڑ لیے ——— نہیں، میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا ——— میں نے پُورا زور لگا کر اپنے پیروں کو چھڑانے کا جتن کیا اور ناکام ہونے پر ڈھیلا پڑ کر جب اُس سے وعدہ کیا کہ خودکشی نہیں کروں گا تو وہ میرے پیر چھوڑنے پر آمادہ ہوا۔

(۱۳)

وہ سامنے والا سب سے اونچا پربت دیکھ رہے ہو؟ بڑا سہج پربت ہے۔ صدیوں سے اِسی طرح خاموش کھڑا ہے ——— نہیں، میں نے اِسے کبھی غصّے کی حالت میں نہیں دیکھا ——— ہاں، کبھی نہ کبھی تو ہر کسی کو غصہ آتا ہے۔ آج سے صدیوں پہلے ایک بار یہ پربت بھی غصّے میں آگیا تھا ——— ہاں، اتنے غصّے میں، کہ پھٹ گیا تھا اور ——— اِتہاس میں لکھا ہے ——— جب یہ پھٹا تھا تو اس کے سینے سے رنگا رنگ ہیرے، جواہر پھوٹ پڑے تھے ——— نہیں، روز روز پھٹنے سے ہیرے جواہر تھوڑا ہی پھُوٹتے ہیں ——— ہیرے جواہر تو کہیں صدیوں کی سہجتا سے ہی بننے میں آتے ہیں۔

(۱۴)

رات کو مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، اِس لیے میں کمرے سے نکل کر گیسٹ ہاؤس کے باغ میں چلا آیا اور یہاں ذرے ذرے کو پُورے چاند کی روشنی سے بھرا پا کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

باغ کے کنارے ہی ایک بندر بیٹھا تھا، وہ مجھے دیکھ کر بولا "آؤ، باہر آکے دیکھو، پہاڑ کے سینے کا کواڑ چوپٹ کھلا ہے۔" مجھے اپنی طرف بڑھتے پا کر وہ میرے آگے آگے ہو لیا "جلدی آؤ، نہیں تو کواڑ بند ہو جائے گا" اور اگر ہمارے اندر داخل ہوتے ہی بند ہو گیا تو ———؟ ——— مگر میں سر جھٹک کر اپنے آپ کو بتانے لگا

—— تو کیا؟ اپنے بندر ساتھی کی رفاقت میں وہیں بس جاؤں گا۔

(۱۵)

اِس جگہ جہاں بڑے پہاڑوں کے بیچ چھوٹے چھوٹے پہاڑ دِکھتے ہیں، پہلے یہاں ایک چھوٹی سی وادی تھی۔ اِس وادی میں کوئی منہ کھولتا تو اُس کی آواز کسی پنچھی کی طرح اڑتے ہُوئے وادی کے ہر باسی کے آنگن میں چہچہانے لگتی اور یُوں سارے گھروں میں بھانت بھانت کے پنچھی چہچہا چہچہا کر سبھوں کو ایک ہی کنبے میں پروئے رکھتے۔

پھر کیا ہوا کہ سبھوں کو ایک دوسرے پر شک گزرنے لگا اور ہر ایک نے خاموشی سادھ لی، اور جُوں جوں ان کی خاموشی گہری ہوتی چلی گئی تُوں تُوں اُن کے جسم بھُرتے چلے گئے اور وادی کی چھاتی سے بھی مٹّی ہی مٹّی پھُوٹنے لگی اور ہوتے ہوتے اِن پہاڑوں میں یہ پہاڑ بھی کھڑے ہو گئے۔

(۱۶)

میرے ہاتھ پَیر کیسے ٹوٹے؟ —— نہیں، پہلے میرا کوئی گھر نہیں تھا —— نہیں، ہمیشہ سے یہیں اِسی پہاڑ پر بود و باش ہے، پر جوانی میں کوئی گھر بار نہ تھا —— نہیں مجھے اپنے ماں باپ کا کوئی اتا پتا نہیں۔ ہاں، نہ معلوم وہ کون تھے —— پر تم تو یہ جاننا چاہتے ہو، میرے ہاتھ پَیر کیسے ٹوٹے؟ —— میری جوانی کے دِنوں کی بات ہے کہ ایک بار اِسی پہاڑ پہ مجھے سوچ آئی کہ اب اپنے لیے ایک چار دیواری کھڑی کر لوں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرا پاؤں پھسل گیا اور میں سیکڑوں فٹ نیچے جا گرا، پھر گھنٹوں بعد بے ہوشی سے میری جو آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ پہاڑ ایک چوپائے کا رُوپ دھار کر میرے اوپر سر جھکائے کھڑا ہے —— کیا؟ —— مجھے کیسے معلوم ہوا، وہ پہاڑ ہی چوپائے کا روپ دھارے ہوئے تھا؟ —— ارے بھئی! پہاڑ پر ہر سالم جاندار پہاڑ ہی ہوتا ہے —— ہاں، اپنے ہاتھ پَیر ٹوٹنے سے پہلے مَیں بھی پہاڑ ہی تھا —— ہاں تو مَیں کیا بتا رہا تھا؟ —— وہ چوپایہ —— میرا مطلب ہے، پہاڑ میرے ٹوٹے پھُوٹے وجود پہ سر جھکائے کھڑا تھا اور میرے کانوں میں بڑبڑا رہا تھا، جاؤ، اب اپنے لیے چار دیواری کھڑی کر لو۔

(۱۷)

آپ تعجب کریں گے مگر یہ واقعہ ہے۔

دشوار گزار پہاڑی راستوں پر چڑھتے ہُوئے مَیں گویا بدستور میدانوں میں اپنے سگے سمبندھیوں سے نباہ کر رہا ہوتا ہُوں اور مشق نہ ہونے کے باوجود ہنستے کھیلتے چوٹیوں پر آ پہنچتا ہُوں۔

میری محبوبہ وجود کی ذرا بھاری ہے۔ اُوپر چڑھتے ہُوئے جھٹ ہی اُس کا دم پھُول جاتا ہے اور وہ جہاں کی تہاں پاؤں پسار کر بیٹھ جاتی ہے۔ اِس دوران جب میں آناً فاناً کئی ہزار فٹ کی اونچائی طے کرکے اُس کے دل کو آچھوتا ہُوں تو وہ اتنی دُور اپنی محفوظ پست ہموار ی پہ بیٹھی سہم کر ہڑبڑا اُٹھتی ہے۔

اپنے اِسی خوف کے باعث اُس نے مجھے ابھی تک قبول نہیں کیا۔

(۱۸)

جب اُسے اپنی روانگی کے سگنل ملنے لگے تو آخر ایک دن اُس کے قدم آپ ہی آپ میدانوں سے پہاڑوں کی طرف اُٹھنے لگے۔

ہم نے اُسے بہت آوازیں دیں مگر وہ اپنی دُھن میں آگے بڑھتا چلا گیا اور ہم بھی اُسے پیہم آوازیں دیتے ہُوئے اُس کے پیچھے پیچھے پہاڑوں کے بیچوں بیچ آن پہنچے۔

ایک نہایت سنسان مقام پر پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ آگے کے سارے راستے مسدود ہیں۔ ہم خوش ہو کر رُک گئے کہ اب وہ پلٹ آئے گا، مگر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایسے اوجھل ہُوا' جیسے اپنا آپ ہونے کی بجائے ہمارا کوئی خیال ہو' اور ہم اپنا سا منہ لے کر واپس ہو لیے۔

(۱۹)

ایک گھنے پہاڑی جنگل میں سے گزرتے ہُوئے مَیں اچانک اپنے آگے آگے ایک نہایت مُسن آدمی کو پا کر ٹھٹک گیا ـــــ ابھی ابھی تو یہاں کوئی بھی نہ تھا! ـــــ میرے تجسس کا یہ حال تھا کہ میں اپنی راہ بھُول کر اُس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ بہت دیر چلتا رہا اور آخر ایک چھوٹے سے تنہا، نئے مکان میں گھُس گیا اور میری طرف مُڑ کر دروازہ بھیڑنے لگا، حالانکہ مَیں اُس کے عین سامنے کھڑا تھا، پھر بھی ـــــ مجھے لگا ـــــ مَیں اُسے دکھائی نہ دیا۔

میں وہاں سے پلٹ تو آیا مگر اُس شخص کے چہرے کی ٹیڑھی میڑھی جھُریوں میں کھویا رہا۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر مَیں نے سرائے کے رکھوالے سے اُس کے بارے میں پُوچھنا چاہا۔

وہ ہنس کر بتانے لگا "وہ بوڑھا آدمی ہمارا پردادا ہوگا جناب! پردادا کوئی دو ماہ پہلے گزر گیا تھا۔"

"گزر گیا تھا؟"

"ہاں، جناب! اُسے مرے دو ماہ ہو گئے ہیں۔ مرنے سے چند ہی روز پہلے وہ اپنے نئے مکان میں

منتقل ہُوا تھا اور آخری سانس لیتے ہُوئے بڑا خوش تھا کہ چلو، عمر بھر اپنا مکان نصیب نہ ہُوا تو کیا؟ اب تو بن گیا ہے۔ مر کے اب چین سے اِس میں رہوں گا۔"

(۲۰)

گُمشدوں کے موضوع پر اپنی تحقیق کے سلسلے میں مَیں پہاڑوں میں بھی آنکلا اور اِس نتیجے پر پہنچا کہ پہاڑیوں کو یہ مسئلہ درپیش نہیں۔

"اِس کا کیا سبب ہے؟" میں نے ایک مقامی معتبر سے استفسار کیا

"سبب کیا ہونا ہے؟" اُس نے مجھے بتایا "یہاں پہاڑی زندگی میں ایک ہی راستہ تو ہے، اوپر نیچے کا راستہ۔ کوئی لاکھ گم ہونے کی کوشش کرے، جائے گا کہاں؟ یہاں نہیں تو اوپر، اور وہاں بھی نہیں، تو اُس سے بھی اوپر آسمان میں۔"

(۲۱)

مَیں ایک بُوڑھے کا مہمان تھا جو ایک خاموش پہاڑ پر تن تنہا رہ رہا تھا۔

"یہاں زندگی کتنی ٹھہری ہے!" ایک دن مَیں نے اُس سے کہا

"قیام ہمارے پہاڑوں کا درس ہے بیٹے!" اُس نے جواب دیا "پہاڑ ہمیشہ ہماری جڑوں کو تھامے ہوتے ہیں تاکہ ہم گرنے بھٹکنے سے بچے رہیں۔"

"کیا تم درخت ہو، یا انسان، بابا؟"

میرے سوال کے جواب میں آس پاس کے سارے درخت قہقہا اُٹھے اور — اور آپ شاید یقین کریں گے کہ اُس ایک لمحے بُوڑھے بابا کو اُس کے طبعزاد رُوپ میں دیکھ کر مَیں چونک پڑا۔

(۲۲)

"ابّا! مجھے اپنے کندھوں پر بٹھالو۔"

"کیوں، بیٹا؟"

"میں اونچا بیٹھنا چاہتا ہُوں۔"

"پہاڑی بچے ہو بیٹا! باپ کے کندھوں کی بجائے ہمیشہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر نظر رکھو۔"

(۲۳)

وہ بڑے مزے سے پہاڑ کی اِس بلندی پر آ پہنچا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جب تک آدمی پہاڑ پر چڑھنا شروع نہیں کرتا، اُس وقت تک وُہ خواہ مخواہ پریشان ہوتا رہتا ہے۔ پہاڑ تو آپ ہی آپ راستہ دیتا چلا جاتا ہے۔ مگر اِس بلندی پر پہاڑ اچانک مُنہ موڑ کر اُس کے سامنے سیدھا کھڑا ہو گیا اور اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب آگے کیونکر جائے۔

"تمہیں تو ابھی بہت اُوپر جانا ہے۔" پہاڑ نے اُسے مخاطب کیا "آتے جاؤ۔"

"کیسے آؤں؟"

"کیوں، اتنا بھی نہیں جانتے؟" پہاڑ ہنسنے لگا "ٹانگیں بھول کر اب آنکھوں سے چلنا شروع کر دو۔" وُہ ویسے ہی کھڑے کھڑے ہنستا چلا گیا "میری چوٹی پر پہنچ کر تمہاری آنکھیں بھی ٹانگوں کے مانند بیکار ہو جائیں گی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ وہاں سے تم صرف اپنے گمان سے ہی چل پاؤ گے۔"

"اور جہاں سے گمان بھی کام نہ کر پائے گا؟"

"وہاں سے آگے جانے کے لیے تمہیں اپنا گمان بھی وہیں چھوڑ دینا ہو گا۔"

"مگر اپنے گمان کے بغیر مجھے اپنے آپ کا پتا کیسے چلتا رہے گا؟"

"تمہارا اپنا آپ ہی نہ ہو گا تو تمہیں اپنے اَتے پتے سے کیا غرض؟"

(۲۴)

مَیں اِس خیال سے اُس کے ساتھ ہو لیا کہ چپکے سے اُسے پہاڑ کی چوٹی سے گرا کر واپس وادی کی طرف ہو لُوں گا، شاید وُہ بھی اسی خیال سے میرے ساتھ ہو لیا تھا۔

ہم دونوں ایک دُوسرے کے جانی دشمن تھے اور اپنی پیار بھری مسکراہٹوں سے ایک دوسرے کو جُل دیتے ہوئے تیز تیز اوپر چڑھتے جا رہے تھے اور ابھی چوٹی پر پہنچ نہ پائے تھے کہ ایک باریک سی پگڈنڈی پر اچانک بادوباراں کے طوفان میں گھر گئے۔

طوفان بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہمیں آگے کا راستہ سُجھائی دے رہا تھا، نہ پیچھے کا۔ ہمارے پاؤں اُکھڑ رہے تھے اور ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا تھا کہ گر نہ جائیں۔

اِسی دوران ہوا کے ایک نہایت تُند جھکڑ نے ہم دونوں کو پہلو کے ایک شگاف میں دے مارا، جہاں

ہم بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئے، مانو ایک کی جان دوسرے میں دھڑک رہی ہو۔

(۲۵)

ہم بھاری اُونی پہنے ہُوئے تھے، اِس کے باوجود سردی سے ہمارا بُرا حال تھا۔

یخ بستہ ویران سڑک کے نیچے ایک کچّے راستے پر آبادی کے آثار پا کر منصور نے تجویز کیا "چلو، نیچے اُتر کر کہیں سے گرم گرم چائے پیتے ہیں۔"

یہاں نیچے کچّے راستے کے دونوں کناروں پر ایک ایک کوٹھڑی کے بیسیوں گھر بسے ہُوئے تھے۔ اِدھر اُدھر بھٹکنے پر ہمیں چائے کی کوئی دُکان نظر نہ آئی تو ایک پہاڑیے کی دعوت پر ہم اُس کے دروازے پر آ جمع ہوئے۔

پہاڑیے کے تین چار بچّے اُس کی کوٹھڑی کے کچّے فرش پہ اِس طرح کھیل رہے تھے جیسے کسی کھلی وادی میں۔ اُس کی ماں اور بیوی سُرعت سے ہمارے لیے چائے تیار کرنے میں جُٹ گئیں اور وُہ آپ ہمارے سامنے چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔

"تم اتنے لوگ ہو اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں کیسے گزر کرتے ہو؟" ہم میں سے کسی نے اُس سے پُوچھ لیا۔

"ابھی تو دو کم ہو گئے ہیں بابو، مگر اُس وقت بھی ایسی ہی کُھلی لگتی تھی۔ میرے بابا اُوپر جا بسے ہیں اور بہن کی شادی ہو گئی ہے۔"

"رات کو سب لوگ سوتے کہاں ہو؟"

"یہیں، اور کہاں!" اپنی بات کو اچھی طرح سمجھانے کے لیے وُہ کھڑا ہو گیا "رات کو ہم دروازہ بند کر لیتے ہیں تو ہماری سانسوں سے کوٹھڑی خُوب گرم ہو جاتی ہے اور ہم ایک دوسرے سے لپٹ کر فوراً سو جاتے ہیں ـــــ بس!" وہ ہنسنے لگا "اللہ بڑا مہربان ہے بابو ـــــ لیجئے، چائے آ گئی ہے!"

چائے کی پھولدار پیالیوں سے دُھواں اُٹھتے دیکھ کر ہم سبھوں نے بھکاریوں کے مانند اُس طرف ہاتھ بڑھا دیے۔

جزیرے

رام لعل

اِدھر کچھ دنوں سے باوا جی کو یُوں محسوس ہونے لگا ہے، جیسے کوئی اُسے پکار رہا ہو۔ بار بار دروازے تک آتا ہو اور لوٹ جاتا ہو۔ گھر کے لوگ اُس کے لیے دروازہ کھولتے ہیں نہ اُسے اُن کے پاس لے کر آتے ہیں۔ باوا جی خود ہلنے ڈلنے سے بالکل معذور ہو چکے ہیں۔ ورنہ اُن کا جی تو چاہتا ہے کہ ذرا سی بھی آہٹ ہونے پر وُہ لپک کر دروازے پر پہنچ جائیں اور آنے والے کا پہلے کی طرح دونوں باہیں پھیلا کر سواگت کریں۔ کچھ عرصہ سے اُنہوں نے بالکل چُپ سادھ رکھی ہے۔ اُن کے چہرے پر چھائی ہوئی خاموشی میں رشیوں مُنیوں جیسی متانت یا شانتی نہیں ہے جو اُن کی برسوں کی اُپاسنا کا پھل ہوتی ہے بلکہ اُس میں ایک بے چینی ہی ہوتی ہے۔ وُہ منہ سے ذرا سی بھی آواز نہیں نکالتے۔ اِدھر اُدھر ایک بے بسی سے تاکتے رہتے ہیں جس میں کبھی کبھی حیرانی بھی جھلک اُٹھتی ہے۔

اُن کے پلنگ کے ساتھ لگی ہُوئی چھوٹی سی میز پر ایک چابی والی گھنٹی رکھ دی گئی ہے کہ اُنہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہاتھ بڑھا کر کسی کو بلا لیں۔ اکثر وہ گھنٹی نہیں بجاتے۔ اپنے آپ ہی کوئی نہ کوئی اندر آجاتا ہے اور اُن سے اُن کی ضروریات کے بارے میں پُوچھ جاتا ہے۔ بلکہ پُوچھنے کے بجائے خود ہی سمجھ جاتا ہے کہ اِس وقت باوا جی کو کیا چاہیے۔ کھانا، پانی یا کوئی اور شَے۔ کموڈ تک ان کے پلنگ کے پاس رکھ دیا گیا ہے۔ اب اُنھیں چلّا چلّا کر کسی کو مدد کے لیے نہیں پکارنا پڑتا ہے۔

باوا پردھان سنگھ کے دومنزلہ مکان میں اُن کی پتنی کے علاوہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی اور اس کا پتی اور ان کے تین بچے رہتے ہیں۔ اپنے خاندان کے سب سے بڑے بزرگ کو وُہ سب یہ تلقین کرنا کبھی نہیں بُھولتے۔ "دار جی! ہر سمے پڑے نہ رہا کریں۔ تھوڑا بہت چل پھر بھی لیا کریں، چھڑی کے سہارے یا پلنگ کی ٹیک یا کرسی کو ہی پکڑ کے آس پاس گھُوم لیا کریں۔"

کوئی نہ کوئی باوا جی کو زبردستی اٹھا کر کھڑا کر دیتا ہے اور حکم دیتا ہے "چلیے اب۔ حرکت کرتے رہنے سے ہی جوڑ کھُلتے ہیں نہیں تو یہ آپس میں پکے جُڑ جائیں گے دار جی۔ قدرت کا قانون یہی ہے کہ انسان چلتا پھرتا رہے۔ اپنے شریر کی رگ رگ میں خون کو دوڑتا ہُوا رکھے۔ سمجھے!"

باوا پردھان سنگھ کبھی لانگ ٹینس کے ایک بہترین کھلاڑی تھے۔ اُن کے رُوئیں رُوئیں میں جیسے پارہ بھرا رہتا تھا جو انھیں پل بھر کے لیے بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ جن لوگوں نے اُنھیں ٹینس کورٹ پر اچھل اچھل کر

کھیلتے ہوئے دیکھا تھا وہ ان کی جسمانی چستی کی اب بھی گواہی دیتے ہیں۔ اُن کے اسی کمرے کی دیواروں پر کئی پرانے، گرد آلود ریکٹ اب بھی ٹنگے ہوئے ہیں اور زردی آلود انگریزی اخبارات کے فریم شدہ تراشے بھی۔ دُھندلے شیشوں کے پیچھے وہ کئی فوٹوؤں میں مہاراجہ پٹیالہ اور کپورتھلہ کے شہزادوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کے ساتھ وہ دلّی، بھوپال اور کلکتہ کے مقابلوں میں شریک ہوتے رہے تھے۔ انعام میں حاصل کی ہوئی تین زنگ آلود ٹرافیاں بھی ابھی تک اُس شوکیس میں موجود ہیں جس کے شیشے اب ٹوٹ چکے ہیں اور ٹرافیوں کے دائیں بائیں ان کی جمع کی ہوئی کئی دیمک خوردہ کتابیں بھری پڑی ہیں۔ تاریخ فتوحات مہاراجہ رنجیت سنگھ، پنجاب کی سرکردہ شخصیات، ہسٹری آف دی ورلڈ (پانچ حصے) ہندوستان غدر پارٹی از سوہن سنگھ جوش THE GREAT DIVIDE، خوشونت سنگھ کی تالیف سکھ ہسٹری (دو حصے) وغیرہ۔ باواجی اپنی آنکھوں پر لٹکتے ہوئے سفید ابروؤں کے گچھوں اور بھاری پپوٹوں کے غلاف اٹھا کر ان کی طرف دیکھتے ہیں تو اُن کی دُھندلی آنکھوں میں ذرا دیر کے لیے چمک پیدا ہوجاتی ہے۔ پھر یہ سوچ کر انھیں افسوس ہونے لگتا ہے کہ اُن کی کھیل کود کی صلاحیتوں کا عشرِ عشیر تک اُن کی اولاد کو منتقل نہیں ہوسکا۔ اُن کی اولاد میں کسی نے عشق کیا اور اسکینڈل کھڑے کرلیے، نشیلی دواؤں کی لت ڈال لی اور حوالات کی سیر کی، تجارت اور سمندر پار کی ملازمت اور جدید کھیتی باڑی میں اتنی زیادہ دلچسپی دکھا کر اپنے ماں باپ تک کو بھلا دیا۔ ہاں، اُنھوں نے یہ ضرور کیا کہ وہ اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے رنگین فوٹو ضرور بھجواتے رہے جن میں سے کچھ فوٹو چمکتے ہوئے نکل پلیٹڈ فریموں میں محفوظ پڑے ہیں۔

مہربان سنگھ دہلی میں موٹر پارٹس کا دھندہ کرتا ہے۔

سردول سنگھ کناڈا میں بجلی مکینک ہے۔ اُس نے ایک فرانسیسی نژاد کینیڈین عورت سے شادی کرنے کے لیے اپنے کیسوں اور داڑھی مونچھوں کو خیرباد کہہ دیا۔

بلبیر سنگھ عرف بِلی چنڈی گڑھ کے نواح میں کھیتی باڑی کرتا ہے۔

یمی چھ سال تک ممبئی کے فلمی نگارخانوں میں وائلن بجاتے رہنے کے ساتھ ساتھ گانجہ چرس بھی پیتا رہا۔ اُس کی کامیابی کی صرف ایک نشانی ہیما مالنی کے ساتھ کھچوائی ہوئی فوٹو ہے۔ اب وہ گھر واپس آچکا ہے لیکن کوئی کام کاج نہیں کرتا ہے۔ باواجی نے بہت کوشش کی کہ وہ بڑے گوردوارے کے راگی جتھے میں ہی شامل ہو جا لیکن وہاں بھی وہ نہیں ٹک سکا۔

باوا پردھان سنگھ نے ملٹری سے ریٹائر ہوجانے اور ادھیڑ عمر کی منزل میں قدم رکھتے ہی خود کو روٹر کلب اور بڑے گوردوارے کی پربندھک کمیٹی کے علاوہ کئی سماجی و تعلیمی اداروں کے ساتھ وابستہ کرلیا تھ اُنھوں نے ہر ادارے کی خدمت ایک حیرت ناک لگن کے ساتھ کی ہے۔ جیسے یہ بھی ان کے لیے کھیل کود کے میدان ہوں۔ انھیں یہاں بھی اپنی خداداد صلاحیتوں کا کمال دکھانے کی کھلی چھوٹ مل گئی ہو۔ لیکن جیسے اچانک

کوئی بھاگتا دوڑتا ہوا ٹرک کسی بڑی اندرونی خرابی کی وجہ سے سڑک کے عین بیچ میں رک جاتا ہے۔ اُس کے بعد ہزار کوشش کے باوجود حرکت میں نہیں آتا۔ ناچار اُسے دھکیل کر سڑک کے کنارے کر دیا جاتا ہے جہاں وُہ بے مُدت کھڑا رہ جاتا ہے۔ بارش، دُھوپ اور تیز ہوائیں اس کی اصلی شاہانہ رنگت اڑا لے جاتی ہیں اور اس کے کل پرزوں کو زنگ چاٹنا شروع کر دیتا ہے اور اس کے بھاری ٹائر ٹیوب بھی گلنے سڑنے لگتے ہیں۔ باواجی کا سارا وجود اُسی ٹرک جیسا ہو گیا ہے۔

اچانک دروازے پر پڑا ہُوا پردہ ہلتا ہے اور ان کی بیٹی کلونت اندر آتی ہے۔ چونکہ وہ کچھ اونچا سُننے لگے ہیں اس لیے وہ ان کے پلنگ کے پاس آکر زور زور سے بتاتی ہے "چنڈی گڑھ سے فون آیا ہے۔ ببلی نے کہا ہے اُسے فلائیٹ مل گئی تو کل شام تک ضرور آ جائے گا۔ اُسے آپ کی صحت کے بارے میں بڑی چنتا لگی ہوئی ہے۔ لیکن وہ پریشان بھی بہت ہے۔ کہتا ہے، کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور نہیں ملتے۔ بہاری لیبر نے اب اِدھر آنا چھوڑ دیا ہے۔"

باواجی لیٹے لیٹے اپنی بیٹی کی طرف خاموش نظروں سے تاکتے رہتے ہیں جس کے سر پر ترشے اور سٹ کرائے ہوئے اور مہندی سے سُرخ کیے ہوئے خوب صورت گھنے بالوں کا ایک جنگل سا ہے۔ وہ یونیورسٹی میں انتھروپولوجی کی ریڈر ہے۔ جس زمانے میں وہ ریسرچ کر رہی تھی اُس نے اپنے برہمن گائیڈ کے ساتھ 'لَو میرج' کر لی تھی۔ اُن کے خاندان میں یہ پہلی بغاوت تھی جسے وہ روک نہیں سکے تھے۔

وُہ جاتے جاتے یہ خبر بھی سُنا جاتی ہے "پپّی کو پولس نے پھر بُلایا ہے پُوچھ گچھ کے لیے۔ پر اُس کا تو اسپتال میں علاج چل رہا ہے۔ پولس والے کہتے ہیں، اس نے ہاسپیٹل کے بیڈ سے کسی کے ہاتھ ایک پڑیا بیچی ہے۔ اُس کی ضمانت کا پہلے سے انتظام رکھنا ہوگا۔"

اُس کے جانے کے بعد اُن کا چھ برس کا نواسہ اپنی تین پہیوں والی سائیکل دوڑاتا ہُوا اُسی کمرے میں آ جاتا ہے اور فرنیچر کے آس پاس چکّر لگانے لگتا ہے۔ پہیوں کی کرخت 'چیں چیں' ہر طرف گونج اُٹھتی ہے۔ وُہ اسے ہاتھوں سے بار بار نکل جانے کا اشارا کرتے ہیں لیکن بچّہ اُن کی ایک نہیں سُنتا۔ چکر لگاتے لگاتے اپنی سائیکل کبھی پلنگ کے ساتھ ٹکرا دیتا ہے، کبھی میز کرسی کے ساتھ۔ باواجی بالکل زچ ہو کر اپنا ہاتھ گھنٹی پر رکھ دیتے ہیں۔ گھنٹی زور زور سے بجنے لگتی ہے تو بچہ خوش ہو کر گھنٹی اٹھا لیتا ہے اور اسے اپنی سائیکل پہ لٹکے بجانے لگتا ہے۔

باوا پردھان سنگھ کے اندر اچانک بے شمار آوازیں بھر جاتی ہیں۔
پپّی کو پولس نے پھر بلایا ہے۔
اُس کی ضمانت کا پہلے سے انتظام رکھنا ہوگا۔

بلی بار بار فون کرتا ہے لیکن وہ یہاں آتا نہیں ہے کبھی !
گھنٹی مسلسل بج رہی ہے۔
بچہ بار بار اس میں چابی بھر رہا ہے۔
سائیکل اور تیز تیز دوڑ رہی ہے
اور بار بار پلنگ اور کرسیوں کے ساتھ ٹکرا رہی ہے۔
ٹھک ٹھک، ٹھک ٹھک !!

وہ اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے چلا اُٹھتے ہیں "کوئی ہے ؟ اِسے روکو، نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

اُن کی بوڑھی بیوی اپنے اونچے بھاری بدن کا بوجھ اٹھائے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اندر داخل ہوتی ہے نانی کو دیکھتے ہی بچہ باہر کھسک جاتا ہے۔ جاتے جاتے گھنٹی پھینک جاتا ہے۔ بڑھیا فرش پر جھک کر گھنٹی کو اٹھاتی ہے اور اس میں مزید چابی بھر کر میز پر رکھ دیتی ہے اور کرسی پر بیٹھ کر بے ترتیب پڑے ہوئے اخبار اور میگزین اکٹھے کرنے لگتی ہے جن میں سے کئی ایک کے ریپرز کو باواجی نے کھولا تک نہیں ہے۔ اپنے شوہر کی طرف وہ ایک عجیب سے ترس کے ساتھ دیکھنے لگتی ہے۔ باواجی کے منتشر حواس پھر سے مجتمع ہونے لگتے ہیں۔ وہ بھی اپنی برسوں کی ساتھی کی جانب ایک ٹک دیکھنے لگتے ہیں۔ دونوں نے پچھلے کئی برسوں میں ایک دوسرے کی طرف ایسی ہی نظروں سے بارہا دیکھا ہے اور اپنے اپنے طور پر بہت کچھ سوچا ہے بالکل اس طرح جس طرح دو بوڑھے پتی پتنی کو سوچنا چاہیے دونوں کی آنکھوں سے پہلی سی شوخی اور جذبات کی شدت بہت عرصہ سے عنقا ہو چکی ہے۔ باواجی کرسی کے اندر اپنی بیوی کے لبالب بھرے ہوئے بوڑھے شریر میں سے کوشش کرنے پر بھی ایک چڑھی کمان کے تیر جیسا بدن نہیں تلاش کر پاتے جو کبھی لہراتا ہوا اُن کی گود میں بے اختیار آ گرتا تھا۔ وہ اُس کی طرف اس طرح مُندی مُندی آنکھوں سے دیکھتے ہیں جیسے کوئی چمکتی ہوئی ننھی منی سوئی گھاس پھوس کے اونچے ڈھیر میں گم ہو چکی ہو۔

بڑھیا اُن سے اُن کے اچانک پریشان ہو کر چلا اُٹھنے کا سبب نہیں پوچھتی۔ وہ ہاتھ میں اٹھائے ہوئے اخباروں کو میز کے نچلے حصے میں رکھتی ہوئی کہتی ہے "سردار جی ! پمّی کی ضمانت کے لیے جگت سنگھ کو فون کر کے بلا لوں ؟ اور تو کوئی نظر نہیں آتا جو اتنی ہمدردی دکھائے۔"

باواجی جانتے ہیں، ان کی بیوی نے انڈیا ٹریکٹرز والے جگت سنگھ کا لڑکا کا نام کیوں لیا ہے ؟ آزادی کے بعد وسطی ہند کے اس شہر میں آکر بسنے والا وہ پنڈی کا پہلا ریفیوجی تھا جسے انھوں نے دوبارہ بسنے میں پوری پوری مدد دی تھی۔ پچھلے چالیس برسوں میں اُس کے خاندان کے ساتھ اُن کے سمبندھ بہت گہرے ہو گئے تھے بُری طرح سے اُجڑ پُجڑ کر آنے کے بعد جگت سنگھ نہ صرف پھر سے اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو گیا تھا بلکہ اس کا خاندا

بھی پھیلتا چلا گیا تھا۔ اس کے بچّے، اس کے بھائی اور بھائیوں کے بچّے۔ ٹریکٹروں کے علاوہ انہوں نے گیس، کوئلہ اور ٹرکوں کا بھی کاروبار پھیلایا تھا۔ باواجی کے ہی مشورے سے جگت سنگھ کانگریس میں شامل ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ پارٹی کے ضلع پردھان کے عہدے سے آگے کبھی نہ بڑھ سکا اور میونسپل کارپوریشن کی رکنیت کے لیے بھی ایک ہی بار انتخاب لڑا تھا جس میں وہ جن سنگھ کے امیدوار سے ہار گیا تھا۔ باواجی نے اسے بہت معمولی سود پر ستر اسّی ہزار کا جو قرض دیا تھا وہ اس نے ابھی تک واپس نہیں کیا ہے۔ گزشتہ کچھ برس کے سیاسی حالات نے جگت سنگھ کا سارا کاروبار چوپٹ کر دیا ہے۔ مسز اندرا گاندھی کے قتل کے بعد اس شہر میں جو فساد ہوا تھا اس میں اس کی دکان کو بھی آگ لگا دی گئی تھی اگرچہ دکان پھر سے بنائی گئی ہے لیکن وہاں سامان خریدنے بہت کم لوگ آتے ہیں۔ پوری مارکیٹ میں وہ یکّہ و تنہا رہ گیا ہے جیسے کسی جزیرے پر جانے والی کشتیوں نے اچانک اپنے راستے بدل لیے ہوں۔ لیکن وہ باواجی کی خدمت میں اکثر حاضر ہو کر اپنا یہ وعدہ دیتا ہے کہ حالات کے معمول پر آتے ہی وہ ان کی پائی پائی واپس کر دے گا۔ جگت سنگھ ان کے اس احسان کا بھی اعتراف کرتا رہتا ہے کہ انہوں نے اس کا ضمانتی بن کر بنک سے ایک بڑا قرضہ بھی دلانے میں مدد دی تھی۔

باواجی کی بیوی نے کہا: "بنک والوں نے ایک کاغذ پھر بھجوایا ہے۔ ہمارے بیٹے آپ جی سے اس لئے ناراض ہیں کہ آپ نے جگت سنگھ کی ضمانت کے لیے اپنی لاکھوں کی جائیداد استعمال کی۔ اگر وہ بنک کا قرضہ واپس نہ کر سکا تو بنک والے تو ہماری ہی جائیداد نیلام کرا دیں گے ناں!"

یہ سن کر باوا پردھان سنگھ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ دیر تک پڑے پڑے وچارتا رہتا ہے۔ پھر اسی طرح آنکھیں بند کئے کئے ہونٹوں کے اندر ہی اندر بدبداتا ہے: "ٹھیک ہے۔ جگت سنگھ سے کہنا، میرے بیٹے کی ایک ضمانت اور کرا دے، اس کا بڑا احسان مانوں گا۔"

زندگی کی بند گلی

سائرہ ہاشمی

خزاں کے موسم کی ابتدائی ہوائیں گلبرگ کے مین بولیوارڈ کی کشادہ سُرمئی سڑکوں پر بوگن بیلا کے جھاڑوں میں گھوم رہی ہیں۔ بڑی بڑی گاڑیاں تیزی سے پھولوں اور رنگوں کا ادراک کیے بغیر میرے پاس سے گزر رہی ہیں۔ بوگن بیلا کی رنگین پتیوں نے گھاس کے قطعوں کو بڑا جاذبِ نظ اور جاندار بنا دیا ہے، لیکن گھاس اور پھولوں کی مِلی جُلی خوشبوؤں میں مجھے ایک اور خوشبو کی موجودگی کا احساس ہو رہا ہے۔ خوشبو جو میری یادو کے ویرانے سے ہولے ہولے میرے حواسوں پر چھا رہی ہے۔ کریوَن سگریٹ کی خوشبو!

زندگی کے سفر کے کئی پڑاؤ ہیں، مصنوعات کی ترقی کی کئی منزلیں ہیں۔ دولت کی لے پہ رقص کرتے لوگوں کی تال بدل چکی ہے۔ پھیلاؤ کے دائرے چکّر در چکّر سوچوں کے پاتال میں معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور مَیں جو تمام عمر دلوں سے دلوں کی طرف محوِ سفر رہتا ہوں یادوں کے ایک لمحہ میں ساکت ہو گیا ہوں۔ یاد جو کریوَن کے دو سگرٹوں سے بندھی آج تک میری یادوں کی دیوار پہ آویزاں ہے۔ گرد آلود بوسیدہ، لیکن پھر بھی موجود۔ میں برسوں اس کی موجودگی سے غافل بہت سی دوسری خوشبوؤں کے تعاقب میں نہ جانے کہاں کہاں گھومتا رہا ہوں۔ میری زندگی الف لیلوی داستانوں کی طرح تہ در تہ، پرت در پرت ایک بڑا انبار ہے۔ اس انبار سے چہروں کو شناخت کر اور انہیں کوئی نام دینا بہت ہی مشکل ہے۔ لیکن یہ خوشبو۔

کائی زدہ یادوں کے اس چھوٹے سے تالاب کے کنارے میرے قدم رُک گئے ہیں۔ میں اُن سے کسی سفید یا زرد کنول کے پھول کی کھوج نہیں کروں گا۔ یہاں صرف کائی ہی اُگتی ہے۔ کائی جو چھونے پر ہاتھوں سے چپک جاتی ہے۔ جس سے سارے جسم میں جھنجھناہ سی پیدا ہوتی ہے۔ گُل جاناں بھی ایسی ہی جھنجھناہٹ ہے۔

کئی مہینوں بعد جب میں میڈم کے کوٹھی خانے میں ملنے کے لیے گیا، تو چند لوگ ایک جنازے کے گرد لاتعلقی سے کھڑے ا کے اُٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر چہرے سے سُفید کپڑا اُٹھایا، تو وہ گُل جاناں تھی۔

گُل جاناں جو زندگی کے جنگل میں محرومیوں اور ناکام خواہشوں کے خار زار سے گزرتی آخر کار آخری پڑاؤ تک پہنچ ہی گئی تھی، مَیں رو سکتا ہوں۔ کیا میری آنکھوں میں اس کے جلنے پر دو سُچے آنسو ٹپک سکتے ہیں... میری آنکھیں خشک تھیں... لیکن یاد کی چبھن مجھے بے چین کر رہی تھی۔ گُل جاناں اور کریوَن کے دو سگریٹ۔

گُل جاناں اور برسوں پر مُحیط ایک بے ضرر کہانی۔

مَیں کاغذ کو میز پر رکھے اس کی کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں.... کردار... واقعات... سچ لکھنا کتنا مشکل ہے۔ وا

کے آئینہ میں مجھے اپنا عکس بار بار نظر آ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس سے نظریں نہ ملاؤں، لیکن وہ عکس میری نظروں میں در آئنہ گھسا چلا آ رہا ہے اور میں اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

گل جاناں نہیں رہی اور میں اس کو الفاظ کا جادو جگا کر منا نہیں سکتا۔ شاید میں ہار گیا ہوں۔ یہ فیصلہ ہمیشہ کی طرح تصفیہ طلب ہے۔

ایک لمبے عرصہ بعد میں اُسے میڈم کے کوٹھی خانے میں ملا تھا۔ میں اور رحمان زندگی کی لذّتوں کی تلاش میں ہمیشہ کی طرح سرگرداں جب اس کمرے میں داخل ہوئے، تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ اس کے لب موہوم مسکراہٹ سے پھیلے اور پھر سکڑ گئے۔

تو مسٹر ظہیر یہ آپ ہیں۔۔۔ اس کا انگریزی لہجہ بہترین تھا۔ اور میں تو اس کی زندگی کے بدلتے رُوپ کا خود گواہ تھا۔۔ رُوپیہ جادو کی چھڑی کی طرح اُسے کسی بھی رنگ میں رَنگ سکتا تھا۔

گل جاناں شعلہ جوالا نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس کی خوبصورت آنکھوں کے کناروں پہ زندگی کی برتی ہوئی سختیاں باریک لائنوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ اس کا جسم بھرپور تاثر دے رہا تھا۔ وہ پہلے والی گل جاناں نہیں تھی۔ وقت نے اسے تراشنے میں خاصی کاریگری دکھائی تھی۔

کچھ دیر پہلے میں اور رحمان فر فر انگریزی بولتی مالکہ سے بھاؤ طے کرنے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ میں نے کہا میڈم خوبصورتیوں پر ہمارا بھی حق ہے۔ ہم امیر نہیں ہیں۔ ہمیں مسٹر زاہد شفیق نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔

وہ زور سے ہنسی۔ بولی۔ ” دیکھیے۔ میں سبزی نہیں بیچتی۔ میں تو بس کمیشن لیتی ہوں۔ سوسائٹی میں میرا ایک مقام ہے۔ میری کوٹھی کے ریٹ مقرّر ہیں “۔۔۔ وہ بڑے خوبصورت دھوئیں کے دائرے بناتی ہوئی ہمیں بتا رہی تھی۔ وہاں بیٹھے مجھے اپنا آپ بڑا حقیر لگ رہا تھا۔ وہ مہذّب سوسائٹی کی عزت دار عورت تھی، کیونکہ دولت بہت سے عیُوب کی پردہ پوش ہے۔

رحمان دوسرے شہر سے آیا تھا۔ اس کی بیوی چھوٹے سے قد کی خوبصورت عورت تھی جس نے چار بیٹوں کو جنم دیا تھا۔ اُسے اپنے شہر سے عشق تھا۔ لیکن ہم مَرد۔۔۔ ہماری بھوک کے کتنے انداز ہوتے ہیں۔ رحمان جب بھی لاہور آتا مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جاتا۔

ہمارا سودا چک گیا۔ اور اس کمرے میں گل جاناں تھی۔

میں نے کہا گل جاناں یہ تم ہو۔ میں نے ایکٹنگ کرتے ہوئے آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملا۔ مجھے ہر قسم کی عورت کو پھانسنے کے گُر آتے ہیں۔

وہ زور سے ہنسی۔۔ ” مسٹر ظہیر آپ۔ آہ مجھے امید نہیں تھی کہ میں دوبارہ کبھی آپ سے مِل سکوں گی۔ “

میں حیران ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ میں جو ازلی تماش بین تھا۔ لیکن وہ فطری طوائف نہیں تھی۔۔ اسے تو باتیں کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ شاید وقت نے اُسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اس کا کمرہ سجا ہوا تھا۔

ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اور برسوں کے لمحے سائیں سائیں کرتے میرے ذہن کی سکرین پہ گردش کر رہے تھے۔

اس کی آنکھوں میں لرزاں تھے۔ کیا میں آنکھیں جھکاؤں۔ کیا مجھے شرمندہ ہونا چاہیے۔ لیکن میں خاموش رہا۔

"مسٹر ظہیر وہ میری سچائی تھی۔ اور یہ میری ضرورت۔ انسان کب تک سچائیوں کا تعاقب جاری رکھے۔ اس نے سگریٹ کا دھواں مرغولوں کی صورت میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں سپاٹ پن تھا۔

میں کیا کہتا۔ جذباتی تعلق کی ڈور کو واقعات کے ڈھیر سے ڈھونڈ کر پھر سے باندھنے کے لیے وقت چاہیے تھا۔ اور میرے پاس وقت نہیں تھا۔

میں اکثر آپ کو یاد کیا کرتی تھی۔ اس وقت جب دوسروں کے بے جان الفاظ مجھے بور کرتے تھے۔ اس وقت جب میں جھوٹ پر یقین کرتے ہوئے تلخیوں سے چھٹکارا پانے کی خواہش کرتی تھی۔ اس وقت جب میرے اندر کی مری ہوئی عورت کلبلا کر زندہ ہونا چاہتی، اور اس وقت بھی جب میں خوبصورت جھوٹ سُننے کے لیے تڑپ اُٹھتی تھی۔ اور شاید اس وقت بھی جب ایک چھوٹا سا گھر اور اس میں رہتا ایک بچہ میرے تصورات میں مجھے اپنی طرف بُلاتا۔

"لیکن گُل جاناں ان ساری سوچوں کا محور میں کیونکر تھا۔ میں جانتے ہوئے بھی انجان بن رہا تھا۔

مسٹر ظہیر وقت گزر گیا — میرے جسم پر سے بھی۔ آپ کی یادوں پر سے بھی — لیکن میں وہیں کھڑی ہوں۔" اور آپ آگے بڑھ چکے ہیں۔ میری آواز آپ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس نے دھواں پھر میری طرف پھینکتے ہوئے کہا:

اسے بولنا اور اظہار کرنا آ گیا تھا — گولڈ فلیک کا دھواں میرے نتھنوں میں گھس رہا تھا۔ خوشبو کا ان دیکھا ہاتھ میرے دل کو سہلا رہا تھا، لیکن یہ دھواں تو کریون سگریٹ کا تھا۔

میں نے کہا گُل جاناں تم آج سے پندرہ برس پہلے میرے لیے دو کریون کے سگریٹ چھوڑ کر غائب ہو گئی تھیں۔

"ہاں — مجھے یاد ہے میں ان دو سگریٹوں کے لیے بہت سے دن تمہارے انتظار میں رہی۔ میں ان کو اپنی محبت کی نشانی کے طور پر دینا چاہتی تھی۔ لیکن پھر میرا باپ مجھے گاؤں واپس لے گیا۔ میں رُکنا چاہتی تھی، لیکن تب تک مجھے بولنے کا حق نہیں تھ

"اور آج"۔ میں نے پوچھا۔

"اور آج کسی کو بولنے کا حق نہیں۔ میں اپنی مالک خود ہوں۔ جو پسند نہیں ہوتا۔ وہ میری دہلیز کے اندر نہیں آ سکتا۔ اد جو پسند ہو"۔ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ بند کمرے میں اس کا قہقہہ گونجنے لگا۔ جیسے آواز پا کی دھمک ہو۔ جیسے وہ قہقہ کسی ڈبے میں بند دکھوں سکھوں کی کہانی کہہ رہا ہو۔ ملفوف آواز تہ در تہ جذبوں کا اظہار کیے بغیر ڈوبتی جا رہی ہو۔

اس کی اور میری ملاقات کا محدود وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بستر پر سفید چادر بچھی تھی اور سُرخ رضائی زیادہ زندہ لگ رہی تھی۔ لیکن میں نہ جانے یادوں کی ڈور کو کیوں لپیٹنے لگا۔ میں اس کی ابتدا تک پہنچنا چاہتا تھا۔ حالانکہ کوئی بھی یاد کچھ بدل نہیں سکتی تھی۔

اُن دنوں میں ایک اخبار میں رپورٹر بن کر کوئٹہ کے شہر میں رہتا تھا۔ غیر مانوس زبان اور پھر اپنوں سے دُور ج

مجھے بڑا اُداس اور مضمحل بنا ڈالا تھا۔ میں جو مردانہ فتوحات کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اپنے آپ کو اجنبی ماحول اور غیر مانوس زبان میں گھرا دیکھ کر اپنے ہی اندر محدود ہو گیا تھا میرے لئے زندگی ایک خلا میں ڈھل گئی تھی جس میں میرے پاؤں تلے کوئی زمین محسوس نہیں ہو رہی تھی راتوں کی طویل تنہائی اور پہاڑوں پر پڑی سفید برف دل کی ویرانی میں اضافہ کر دیتی' اگر ماجد خاں میرے دفتر میں نہ ہوتا تو شاید میں نوکری چھوڑ کر واپس لاہور آ جاتا۔ لیکن ماجد کی رفاقت میں ماحول کچھ کچھ بدل گیا تھا کوئی تو تھا جو میری بات سن لیتا تھا۔

اس روز میں اور ماجد راستہ بدل کر اخبار کے دفتر جا رہے تھے کہ اچانک راستہ ایک بند گلی پر رک گیا تھا۔ مین شاہراہ کے دونوں طرف گلیوں میں نیم وا۔ نیم تاریک۔ پختہ گھروں کی قطاریں تھیں ساری بستی ویران اور خاموش تھی۔ لیکن نیم وا دروازوں کی اوٹ سے چہرے جھانک رہے تھے۔ آنکھیں ہمارا تعاقب کر رہی تھیں۔ مجھے عجیب خوف کا احساس ہو رہا تھا ہم دونوں واپس جانے کے لئے مڑے.... وہ آخری دروازے کے پٹ سے لگی ہنس رہی تھی — روشن چہرے پر معصومیت اور بھول پن تھا۔ گھیر دار لباس اس کے جسم کو ڈھانپے ہوئے تھا — وہ پشتو میں کچھ کہہ رہی تھی۔

ماجد خاں نے کچھ جواب دیا اور ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے اس بند گلی سے نکل آئے — لیکن وہ چہرہ میری یاد میں کھد سا گیا تھا۔ ماجد خاں نے بتایا کہ وہ ہمارا مذاق اُڑا رہی تھی اس کے چہرے کی یاد میرے دل میں ہولے ہولے ہلکورے رہی تھی۔ کوئٹہ ایکدم آباد سا لگنے لگا تھا.... جیسے میرے دل کے ویرانے میں پھول اُگ آئے ہوں میں جانتا ہوں مرد کی ہر مایوسی کا علاج عورت کا وجود ہے لیکن کوئٹہ میں عورت کا وجود دیواروں کے اندر بند تھا اس کی آوازوں کا جلترنگ اور وجود کی رنگینی کے نہ ہونے سے بازار سنسان تھے لیکن اب ان میں ایک ہنسی کی آواز آباد ہو گئی تھی یا میرے ناپختہ ذہن نے ایک بت تراش لیا تھا جو میری پوجا کے لئے کافی تھا — میرے تصورات نے اُسے خود ہی جنم دے ڈالا تھا۔

اخباری خبریں لکھتے مردانہ آوازوں میں گھرے مجھے وہ آواز سنائی دیتی۔ پٹ سے لگا ہیولہ بڑھ کر میرے جسم سے لگ جاتا خوشبو کا انوکھا احساس حواسوں پر چھا جاتا۔ میں شاید شعور اور خواہش کے ایک خاص نقطہ پر آن رکا تھا جہاں انسانی جسم دوسرے جسم کو پکارنے لگتا ہے جہاں محبت کرنے اور کئے جانے کی خواہش ایک عورت کے تصوراتی ہیولے میں ڈھل جاتی ہے۔ یا وہ صرف جسمانی آگہی کا عذاب تھا جو مجھ پر وارد ہونے والا تھا۔

میں اور ماجد خاں اب ہر روز اس گلی کے آخری کونے تک جاتے۔ اور پھر پلٹ آتے۔ ان نیم وا دروازوں کے اندر ایک دنیا آباد تھی۔ خوبصورت بدصورت۔ فربہ بھدے۔ خوبصورت' دلکش جسموں اور چہروں کی دنیا۔ جسم جو بیچے اور خریدے جاتے تھے میرے لئے یہ دنیا ایکدم نئی اور انوکھی تھی۔ لیکن ہم دونوں محض تماشبین تھے۔ ہمیں خریدنے کا شعور نہیں تھا... میں تو صرف اُس ایک چہرے کی جھلک دیکھنے کے لئے آتا تھا وہ چہرہ جو کبھی بھرپور انداز سے دوبارہ ہنستے ہوئے نہ ملا — اب اس دروازے کے باہر ایک بوڑھی عورت بیٹھی نظر آتی اور وہ دروازے کے اس پار نیم تاریک روشنی میں کھڑی بڑی ماورائی لگتی — میں عورت کے اس روپ کو پہلی بار دیکھ رہا تھا میں نے تو صرف سن رکھا تھا۔

بوڑھی عورت منتظر نظروں سے ہمیں دیکھتی — دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھول دیتی اور خاموش بیٹھ جاتی۔ لیکن ہم تیز تیز

قدموں سے چلتے واپس آجاتے۔

اس روز چھٹی تھی، لیکن میں اور ماجد ایک دوسرے کو کچھ کہے بغیر اس بند گلی کی نکڑ تک آئے اور مُڑنے ہی والے تھے کہ وہ بوڑھی عورت اُٹھ کر ہمارے سامنے کھڑی ہوگئی۔ بولی۔

تُم روز واپس کیوں جاتے۔ دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔ بڑا خوبصورت ہے۔ گل جاناں اور روشانہ۔ اندر آؤ۔ اور وہ ہم دونوں کے ہاتھ پکڑ کر زبردستی کھینچنے لگی۔ میرا خون رگوں میں دھکنے لگا۔ میرے اندر کا خوبصورت تصوراتی ہیولہ۔ اس میں خریدنے کا تو کوئی جذبہ نہیں تھا۔ محبت تو کی جاتی ہے خریدی تو نہیں جاتی ... اور پھر ہماری تنخواہوں کے محدود روپئے۔ جن سے آدھے مجھے گھر بھیجنے پڑتے تھے اور باقی کے زندگی کی ضروریات کے لئے ناکافی تھے۔

اس نے ہمیں اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے بھیڑ دیا اس کی آنکھوں کی ضرورت نے مجھے باندھ دیا تھا چند روپے اور ایک جسم میرا وجود سنسنا رہا تھا۔ وہ دونوں پیڑھیوں پر خاموش بیٹھی تھیں۔ اُن کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ماجد اور میں خاموش کھڑے تھے ان کے چہرے نیم روشن تھے۔ کچھ لمحے بعد ایک خاموشی سے اٹھی اور ماجد کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی وہاں ایک ہی کمرہ تھا جس میں چارپائی پر گندہ سا بستر بچھا تھا اور تاک میں سرسوں کے تیل کا دیا جل رہا تھا۔

دوسری خاموش بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اوپر اُٹھا کر مجھے دیکھا۔۔۔ میرا نام گل جاناں ہے... تمہیں انتظار کرنا پڑے گا

"بیٹھو۔" اس نے خالی پیڑھی کی طرف اشارہ کیا اس کی آنکھوں میں گہری اُداسی تیر رہی تھی۔ قدرتی سرخ ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ جیسے وہ کسی ناگوار جذبے کو مشکل سے دبا رہی ہو اس کے لباس میں ٹکے گول گول آئینے کبھی کبھار جھلملانے لگتے

تم روز آتا۔ واپس چلا جاتا.... تمہارا نام کیا"۔ شاید اُس نے مجھے اُردو ملی پشتو زبان میں یہی پوچھا ہوگا۔ میں مسکرانا چاہتا تھا لیکن میری کئی دنوں کی تصوراتی محبت میرے سینے پر بوجھ کی مانند اتر آئی تھی۔ اور میں اُسے خریدنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید چھونے پر اُس کے انگ میری پوروں پر نہ اترے تو مجھے مایوس ہونا پڑے۔ اور میں مایوس ہونا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ میں تو اس رنگ میں رنگ جانا چاہتا تھا اور وہ بے حد معمولی قیمت میں مجھے ملنے والی تھی آنسو میری آنکھوں میں بھر گئے۔ میں جذباتی ہو رہا تھا۔

گل جاناں۔ تمہارا نام بڑا خوبصورت ہے۔ تم بھی خوبصورت ہو لیکن میں اب جاؤں گا... پھر آؤں گا... میں نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ اس کے سفید خوبصورت ہاتھ شاید لرز رہے تھے دیکھو میرا جسم خوبصورت ہے اس نے سر سے چادر اتار دیا۔

اس کا جسم ابھی بھی اس کے گھیردار لباس میں چھپا ہوا تھا۔ اور آنکھوں میں خوف تھا۔ میرا باپ ناراض ہوگا وہ روز مجھے مارتا ہے... "مت جاؤ"۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے اس کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ دیا اور باہر نکل آیا۔ بوڑھی عورت میرے پیچھے آنے لگی تو اندر سے گل جاناں کی آواز آئی۔ اور وہ واپس چلی گئی۔

ماجد کے کہنے کے باوجود میں کئی دن اس گلی سے نہ گذرا مجھے اس کی آنسوؤں بھری آنکھیں یاد آتیں اور میرا

کو دیر تک جاگتا اس کے تصور کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالتا، ہنساتا۔ سنوارتا اور پھر دس روپوں کا نوٹ چھن سے اس بت پر رکھ کر اسے چکنا چور کر دیتا۔ جس کی کرچیں میرے دل میں چبھ جاتیں۔

نہیں میں ایک ٹکے ٹکے پر بکنے والی ٹکیائی سے محبت نہیں کر سکتا میں بار بار اس جملے کو دہراتا لیکن وہ میرے لئے ابھی بھی ایک مجبوری تھی جس کی ہنسی کی ڈور مجھے باندھے ہوئے تھی..... میں نے ماجد سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ میں اس کے تجربے کی عریانی سے اپنی سوچ کو داغدار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ مجھے زبردستی پکڑ کر اس بند گلی کی نکڑ تک لے گیا۔ بوڑھی عورت کے چہرے پر غربت اور جھریوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھوک تھی جو اس کے جسم کے لاغر پن سے جھانک رہی تھی۔

گل جاناں خاموشی سے اٹھی۔ اس کے ساکت چہرے پر ہنسی نہیں تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ گردش کے ایک لمحہ میں مقید کر دی گئی ہو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

میں اس کوٹھری کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا اور اگلا لمحہ اسے مجھ سے نہ جانے جدا کرنے والا تھا یا باندھنے والا۔

مجھے یکایک احساس ہوا کہ اس بازار میں سُر اور آواز کی تال کہیں سے بھی ابھر نہیں رہی تھی وہاں وہ بڑی ڈیرہ دارنیاں نہیں تھیں جو آواز کی مملکت پر حکومت کرتی تھیں۔ یہ تو جسم کا متعفن جوہڑ تھا جس میں صرف کائی اگی ہے اور بساند کے بھبکے اٹھتے ہیں۔ مسرتوں کی دلدل میں پھنسی روحیں۔ جو چیخنا بھی نہیں جانتی تھیں۔

گل جاناں کی خاموش آنکھیں مجھے گھیر رہی تھیں، شائد میری محبت کا انجام بھی جسم کی دلدل کو جانے والی راہ کی طرف ہی مجھے دھکیل رہا ہو۔ شاید میں جو مردانگی کے دروازے پر کھڑا اپنا آپ منوانا چاہتا تھا۔ صرف اسی راہ پر چل کر اپنے ہونے کا ادراک کرنا چاہتا تھا۔ میرا ذہن گڈمڈ سوچوں سے الجھا ہوا تھا۔ میں ایک بار پھر اس کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ پکڑا کر بھاگ آیا تھا عورت کا جسم جو بیچا جا سکتا تھا۔ خریدا جا سکتا تھا۔ گل جاناں کا جسم بھی نہ جانے کتنی بار خریدا جاتا ہو۔ نہ جانے کتنے ہاتھ اسے چھوتے ہوں گے۔ اس سوچ نے میرے اندر ہلچل مچا دی۔ میں غصے اور حسد سے دھکنے لگا میرے اندر پیدا جذبہ تو بڑا لطیف اور غیر مرئی تھا۔ ایسا جذبہ جہاں میں گل جاناں کو چھونا بھی نہیں چاہتا تھا میں محبت کے لافانی تقدس کی کھوج میں تھا لیکن قسمت مجھے اس دلدل کی طرف دھکیل رہی تھی میں گل جاناں کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن مجبور تھا مجھے یاد ہی نہ رہتا کہ وہ شریف عورت نہیں تھی۔ وہ تو برتی اور جھنجوڑی ہوئی ہڈی تھی۔ سارا جادو گل جاناں کی آنکھوں میں تھا جو معصوم اور بے بس لگتیں۔ دوسردل میں سمٹ آنے کی خواہش سے بندھی گل جاناں کی کوٹھری کا دروازہ مجھ سے فاصلے پر چلا جاتا۔ میرے وجود پر بند ہو جاتا۔

یہ آنکھ مچولی میرے اندر ہلچل مچا رہی تھی آہستہ آہستہ مجھے خاکستر کر رہی تھی۔ اب میں اور ماجد الگ الگ اس بند گلی کے موڑ تک جاتے میرا راز میرے اندر بند تھا اور میں اس کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔

اس روز ماجد خاں نے آکر کہا تھا۔ ظہیر گل جاناں تو بڑی ہی خوبصورت اور معصوم ہے۔ تم اس کے پاس کیوں نہیں جاتے یار آجکل بازار تماش بینوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور اس کی کوٹھری کا دروازہ اکثر بند ہوتا ہے لیکن وہ تمہیں یاد کر رہی تھی۔

تمہاری شکایت کر رہی تھی ــ میں آج اس کے پاس گیا تھا۔

میں نے اس سے کچھ بھی نہ کہا ۔ اسی شام میں نے اپنا سامان ایک اور کمرے میں منتقل کر دیا۔ ماجد خاں میرا دوست تھا لیکن اس نے میرے جذبات پر طمانچہ مارا تھا اس نے میرا لحاظ نہیں کیا تھا۔ اس رات میں گل جاناں کے پاس گیا۔

دس روپے دیتے ہوئے میں نے اپنی تصوراتی محبوبہ کو مار ڈالا جیسے اپنے ساتھ کی گئی ساری زیادتیوں کا حساب چکا رہا ہوں جیسے ماجد خاں کے چہرے پر تھوک رہا ہوں۔ گل جاناں حیرانی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ خوشی تھی۔ اپنے آپ کو بیچ دینے والی کیفیت تھی۔

"ظہیر خاناں... تم بہت اچھا ہو... تم ہمیں بہت اچھا لگتا ہو۔" وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

اس روز پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی بہت خوبصورت باتیں کر سکتا ہوں۔ اُسے غلط فہمی میں مبتلا کر سکتا ہوں اور میں نے اپنے دل کو اس ساری واردات سے الگ کر کے گل جاناں کو وہ ساری خوبصورت باتیں کہہ دیں میں نے اپنی تصوراتی محبوبہ کو الفاظ کی بھینٹ چڑھا دیا۔

میں اپنے اندر سے اداس اور خالی تھا لیکن گل جاناں کے چہرے کی ہنسی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔

تب ہی تو کچھ دنوں بعد اُس نے کہا تھا۔

"ظہیر خاناں مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤ ــ اپنی بیوی بنا لو۔ میرا باپ بڑا ظالم ہے۔ وہ مجھے ساری عمر بیچتا رہے گا۔" محبت کی وجہ سے مجھے ظہیر خاناں کہتی تھی اور میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا لیکن اب شاید میں اس سے اتنی شدید محبت نہیں کرتا تھ وہ میری محبوبہ نہیں رہی تھی وہ تو محض ایک جسم تھی جس کو میں خریدتا تھا اور اس سے وعدہ نبھانا ضروری نہیں تھا۔

اس رات میں سوچتا رہا..... اپنے آپ کو جانچتا رہا..... چند دنوں میں ہی میں اناڑی سے کھلاڑی بن چکا تھا ــ شا پہلے تصورات بھی ان ساری رومانوی داستانوں کا اثر تھا جو الف لیلوی قصوں کہانیوں نے میرے اندر پیدا کر دئیے تھے۔ میں خود دھ کھا رہا تھا... لیکن اب اسے دھوکا دے رہا تھا۔

گل جاناں نے مجھے اپنے دو جوڑے اور چاندی کے کڑے دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ "ظہیر خاناں تمہارے گھر میں جب یہ پہن کر پھروں گ تو بہت خوبصورت لگوں گی اپنی آنکھوں میں کجرا لگاؤں گی تو میری آنکھیں زیادہ خوبصورت لگیں گی۔ میرے گاہک میری آنکھو کی بڑی تعریف کرتے ہیں... خوبصورت ہیں نا میری آنکھیں۔" اور وہ آنکھیں کھول کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔

لیکن میں اسے اپنی دلہن نہیں بنا سکتا تھا۔ اس کے جسم سے مجھے یکایک بساند آنے لگی تھی اس کی خوبصورت آنکھیں میرے پرے ہٹنے پر سکڑ گئیں۔ ظہیر خاناں مجھے ساتھ لے جاؤ۔ وہ رونے لگی۔ میں باتوں سے اُسے بہلاتا رہا۔ اُس کے آنسو پونچھتا رہا اور اپنی کوشش پر خوش ہوتا رہا ــ ہم دونوں کے اندر سچ نہیں تھا۔ یا شاید صرف مجھے سچ کی ضرورت نہیں تھی۔

اس کے بعد میں کتنے ہی دن اس کے گھر نہ گیا میری محبوبہ کا تصوراتی ہیولہ ہولے ہولے میری طرف بڑھتا اور پھیلتا، لیکن اس کا چہرہ نہیں تھا۔

کوئٹہ شہر گھروں کو پلٹتے جوان مردوں سے بھر گیا۔ اکثر اداس اور خاموش رہنے والی سڑکیں آوازوں اور قدموں کی دھمک سے گونجنے لگیں بازار خریداروں اور دکانیں ضروریات زندگی سے بھر گئیں تماش بینوں کی ٹولیاں بند گلی کی نکڑ تک بھر جاتیں اور گل جاناں کی کوٹھری کا دروازہ اکثر بند رہنے لگا۔ میں وہاں تک جاتا۔ رکتا۔ میرے لب خواہش سے اکڑ جاتے میں نہ جانے سارے تماش بینوں کو اپنا رقیب کیوں تصور کرنے لگا تھا میری ذات کا قلعہ اُن دنوں بار بار ٹوٹ کر بکھر جاتا۔ حالانکہ وہ میرے لئے نہیں تھی شاید میں اپنے آپ کو نظر انداز کئے جانا برداشت نہیں کر رہا تھا وہ مجھ سے محبت کرتی تھی لیکن برہن بن کر میرا انتظار نہیں کر رہی تھی مجھے اپنی شکست منظور نہیں تھی۔

عید کے بعد گلیاں پھر خاموش ہو گئیں۔ دکان دار اونگھنے لگے اور میں کوشش کے باوجود اپنے قدموں کو وہاں جانے سے نہ روک سکا۔ میرے ہاتھ جیب میں روپوں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے میں نے شام کا انتظار بھی نہ کیا۔

ہمیشہ کی طرح دروازہ نیم وا تھا۔ بوڑھی عورت آنکھیں موندے نسوار کے سرور میں پیڑھی پر بیٹھی چوکھٹ سے سر کو لگائے نیم خوابیدہ تھی کوٹھری کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور دیا بجھا ہوا تھا۔

میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی مجھے لگا جیسے اس کے اندر کی ویرانی اس کی آنکھوں کی دہلیز کو پار کر کے اُس کے چہرے پر آن بیٹھی ہو۔ وہ خالی نسوار کی ڈبیہ کو تھامے بازار کو جاتے موڑ کو گھور رہی تھی۔

میں اس کے سامنے خاموش کھڑا ہو گیا۔

" تم اس کے لئے آیا۔ لیکن وہ چلا گیا وہ عید کے لئے آیا تھا۔ شاید اگلی عید کو پھر آئے۔ میں جانتا تم اسے اچھا سمجھتا تم بھی اُسے اچھا لگتا۔ پر مجبوری۔ وہ پشتوں کی ٹکیائی نہیں ہے.... مجبور.... ضروریات زندگی بڑا ظالم۔ اور پھر وہ عورت تھا۔ عورت کا جسم بڑا ظالم ہوتا سب اُسے لالچ سے دیکھتا۔ تھوڑے سے پیسہ کے بدلے میرے باپ نے مجھے بیچا۔ گل جاناں... اور یہ روشانہ۔ اُس کے باپ نے بری نظر ڈالا۔ اُسے یہاں لے آیا۔

ہم سب بہت بیچارہ عورت.... نہ جانا ابھی کتنا اور عورت بکنے کے لئے جنم لے گا۔

اور وہ سر کو جھکا کر زور زور سے رونے لگی اس کی آنکھیں گہرے آنسوؤں سے اُمنڈ رہی تھیں وہ تلخ یادوں کے برف زار میں یخ بستہ تنہا بیٹھی تھی۔ میں نے جیب سے نوٹوں کو نکال کر اس کی جیب میں ڈال دیئے اور بند گلی کی دیوار سے ٹیک لگا کر وہاں چپ چاپ کھڑا ہو گیا گلی سنسان تھی کبھی کبھار کوئی دروازہ کھلتا اور پھر بند ہو جاتا مجھے لگا جیسے میرے اندر بھی کوئی دروازہ بند ہو گیا ہو کبھی نہ کھلنے کے لئے میرے وجود میں ساری آوازوں کا سلسلہ گہری خاموشی میں ڈوب گیا.... اپنی ذات کی ساری دنیائیں ریت کے ڈھیر میں ڈھل گئیں۔

" دیکھو ظہیر خاناں.... وہ جاتے ہوئے بڑا غمگین لگتا تھا۔ شاید وہ تمہارا منتظر تھا.... اور وہ جاتے جاتے یہ دو ۲ سگریٹ تمہارے لئے دے گیا ہے۔ کہتا تھا۔ اُسے ضرور دینا اسے کہنا مجھے یاد رکھے۔ میں بھی اُسے ہمیشہ یاد رکھوں گی..... وہ نوٹوں کو گنتے ہوئے مسکرا رہی تھی.... انہیں پیار سے سہلا رہی تھی اس نے نوٹوں کو ایسے ہاتھ میں تھام رکھا تھا جیسے وہ کانچ کے بوں اور ٹوٹ جائیں گے

وہ گل جاناں کے پسندیدہ سگریٹ تھے جنہیں پیتے ہوئے وہ بڑی مسرور دکھائی دیتی تھی۔ مجھے لگا جیسے میری ہتھیلی کرب اور اذیت سے اینٹھ گئی ہو۔۔۔ میں گل جاناں کو یوں اپنے دل کے اس قدر قریب نہیں سمجھتا تھا۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا۔ لیکن آنسو کہیں میرے اندر ہی اندر گرنے لگے۔

ظہیر خاناں رونا نہیں۔۔۔۔ دیکھو گھر کی ویرانی دیکھو۔۔ وہ دن تھا بدلتی تھا اب کوئی اور باپ۔ کوئی بھائی۔ کوئی شوہر کسی بیٹی بہن یا بیوی کو بیچنے کے لئے لائے گا۔ مجھے کرایہ دے گا۔ چوکیداری کا لے گا۔ گاہک کو لانے کا لے گا۔۔۔۔ اس طرح میری روزی لگے گا۔۔۔ میرا خالی پیٹ بھرے گا۔

اس نے آنکھیں ایک بار پھر بند کر لیں اور پشتو لوک گیت کا ٹپہ گانے لگی۔۔۔۔ مجھے الفاظ کے مطلب نہیں آتے تھے شاید اس میں جانے والے محبوب کے فراق کا ذکر ہوگا اُس کے حسن کا بیان ہوگا یا وہ اپنی گزری جوانی کا نوحہ کہہ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے، اُس میں صرف اس کے پیٹ کی بھوک کا ذکر ہو۔

میں نے دونوں سگریٹوں کو وہیں پھینک دینا چاہا۔ لیکن گل جاناں کی دُوری نے میرے اندر محرومی کا دکھ بھر دیا تھا۔ میں نے مُٹھی کو زور سے بند کر لیا جیسے گل جاناں میرے قبضہ میں آگئی ہو اوپر آسمان پر سیاہی میں تارے چمک رہے تھے۔ بازار ویران ہو چکا تھا

میں نے کہا کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ کہاں سے آئی تھی۔۔۔ کدھر چلی گئی"

وہ خاموشی سے مجھے گھورنے لگی پھر بولی۔

دیکھو ظہیر خاناں۔ طوائف اور سگریٹ دونوں ایک جیسا ہوتا۔ سگریٹ کو پی کر بھی کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اور طوائف کے پاس آ کر بھی کچھ حاصل نہ ہوتا جاؤ اپنے آپ کو آزاد کرو۔ اس کی یاد کی زنجیر سے خود کو مت باندھو۔ اس بازار سے بھاگ جاؤ۔۔۔ اس گندگی سے بھاگ جاؤ۔۔۔ نہیں تو میرے مانند بوڑھا اور بیکار ہو جائے گا بھاگ جاؤ۔۔۔۔ بھاگ جاؤ۔۔۔ بھاگ جاؤ۔۔۔ بھاگ جاؤ۔

اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں۔۔۔ اُس کے لبوں پر کسی ادھورے گیت کے بول تھے۔ اس نے اُٹھ کر دروازے کی چوکھٹ کو پکڑ لیا۔

"ظہیر خاناں ہم ڈھونڈنے کے قابل نہیں ہوتا۔" اور اس نے دروازہ بند کر لیا۔ سگریٹ کی خوشبو میرے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ میرے دماغ میں گھس رہی تھی۔ میری آنکھوں کی نمی میں ڈھل رہی تھی۔

آنے والے دن ایک کربناک تنہائی میں ڈھل گئے بیتا اور برتا ہوا ایک ایک لمحہ مجھے بلانے لگتا۔ لمحے جو میری ہتھیلی سے گر کر گم ہو گئے۔ گل جاناں۔ گل جاناں کا روشن چہرہ۔۔۔ اس کے روشن اور چمکیلے جسم کا۔ فانوس میری یاد کے اندھیروں میں چمکنے لگتا اب میرا دل کوئٹہ سے اچاٹ ہو گیا تھا کوئٹہ بے گیاہ پتھریلی چٹانوں میں ڈھل گیا تھا۔ ایسا ہو گا۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔ انسانی دل کی تخلیق کن عناصر سے ہوئی ہو گی۔ مجھے معلوم نہیں۔ میرے اندر تو بہت سا جھوٹ بھرا ہوا ہے جسے میں الفاظ کے پیمانوں میں پیاس سے خشک لبوں کے اندر انڈیلتا رہتا ہوں۔۔۔۔ میں اب ایک شاطر کھلاڑی ہوں میں نے واقعات اور حالات کو ہمیشہ اپنے حق میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی انا کو خود پسندی کی دھند میں لپٹا دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے لیکن

کوئٹہ شہر گھروں کو لوٹتے جوان مردوں سے بھر گیا۔ اکثر اداس اور خاموش رہنے والی سڑکیں آوازوں اور قدموں کی دھمک سے گونجنے لگیں بازار خریداروں اور دکانیں ضروریات زندگی سے بھر گئیں تماش بینوں کی ٹولیاں بند گلی کی نکڑ تک بھر جاتیں اور گل جاناں کی کوٹھری کا دروازہ اکثر بند رہنے لگا۔ میں وہاں تک جاتا۔ رکتا۔ میرے لب خواہش سے اکڑ جاتے میں نہ جانے سارے تماش بینوں کو اپنا رقیب کیوں تصور کرنے لگا تھا میری ذات کا قلعہ اُن دنوں بار بار ٹوٹ کر بکھر جاتا۔ حالانکہ وہ میرے لئے نہیں تھی شاید میں اپنے آپ کو نظر انداز کئے جانا برداشت نہیں کر رہا تھا وہ مجھ سے محبت کرتی تھی لیکن برہن بن کر میرا انتظار نہیں کر رہی تھی مجھے اپنی شکست منظور نہیں تھی۔

عید کے بعد گلیاں پھر خاموش ہو گئیں۔ دکان دار اونگھنے لگے اور میں کوشش کے باوجود اپنے قدموں کو وہاں جانے سے نہ روک سکا۔ میرے ہاتھ جیب میں روپوں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے میں نے شام کا انتظار بھی نہ کیا۔

ہمیشہ کی طرح دروازہ نیم وا تھا۔ بوڑھی عورت آنکھیں موندے نسوار کے سرور میں پیڑھی پر بیٹھی چوکھٹ سے سر کو لگائے نیم خوابیدہ تھی کوٹھری کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور دیا بجھا ہوا تھا۔

میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی مجھے لگا جیسے اس کے اندر کی ویرانی اس کی آنکھوں کی دہلیز کو پار کر کے اُس کے چہرے پر آن بیٹھی ہو۔ وہ خالی نسوار کی ڈبیہ کو تھامے بازار کو جاتے موڑ کو گھور رہی تھی۔

میں اس کے سامنے خاموش کھڑا ہو گیا۔

"تم اس کے لئے آیا۔ لیکن وہ چلا گیا وہ عید کے لئے آیا تھا۔ شاید اگلی عید کو پھر آئے۔ میں جانتا تم اسے اچھا سمجھتا تم بھی اُسے اچھا لگتا۔ پر مجبوری۔ وہ پشتوں کی ٹکیائی نہیں ہے..... مجبور... ضروریات زندگی بڑا ظالم۔ اور پھر وہ عورت تھا۔ عورت کا جسم بڑا ظالم ہوتا سب اُسے لالچ سے دیکھتا۔ تھوڑے سے پیسہ کے بدلے میرے باپ نے مجھے بیچا۔ گل جاناں... اور یہ روشانہ۔ اُس کے باپ نے بری نظر ڈالا۔ اُسے یہاں لے آیا۔

ہم سب بہت بیچارہ عورت..... نہ جانا ابھی کتنا اور عورت بکنے کے لئے جنم لے گا۔

اور وہ سر کو جھکا کر زور زور سے رونے لگی اس کی آنکھیں گہرے آنسوؤں سے اُمنڈ رہی تھیں وہ تلخ یادوں کے برف زار میں تخ بستہ تنہا بیٹھی تھی۔ میں نے جیب سے نوٹوں کو نکال کر اس کی جیب میں ڈال دیئے اور بند گلی کی دیوار سے ٹیک لگا کر وہاں چپ چاپ کھڑا ہو گیا گلی سنسان تھی کبھی کبھار کوئی دروازہ کھلتا اور پھر بند ہو جاتا مجھے لگا جیسے میرے اندر بھی کوئی دروازہ بند ہو گیا ہو کبھی نہ کھلنے کے لئے میرے وجود میں ساری آوازوں کا سلسلہ گہری خاموشی میں ڈوب گیا..... اپنی ذات کی ساری دنیائیں ریت کے ڈھیر میں ڈھل گئیں۔

"دیکھو ظہیر خاناں..... وہ جاتے ہوئے بڑا غمگین لگتا تھا۔ شاید وہ تمہارا منتظر تھا..... اور وہ جاتے جاتے یہ دو ۲ سگریٹ تمہارے لئے دے گیا ہے۔ کہتا تھا۔ اُسے ضرور دینا اسے کہنا مجھے یاد رکھے۔ میں بھی اُسے ہمیشہ یاد رکھوں گی..... وہ نوٹوں کو گنتے ہوئے مسکرا رہی تھی..... انہیں پیار سے سہلا رہی تھی اس نے نوٹوں کو ایسے ہاتھ میں تھام رکھا تھا جیسے وہ کانچ کے

وہ گل جاناں کے پسندیدہ سگریٹ تھے جنہیں پیتے ہوئے وہ بڑی مسرور دکھائی دیتی تھی۔ مجھے لگا جیسے میری ہتھیلی کرب اور اذیت سے اینٹھ گئی ہو — میں گل جاناں کو یوں اپنے دل کے اس قدر قریب نہیں سمجھتا تھا۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا۔ لیکن آنسو کہیں میرے اندر ہی اندر گرنے لگے۔

ظہیر خاناں رونا نہیں ..... دیکھو گھر کی ویرانی دیکھو.. وہ دونوں تھا بدلتی تھا اب کوئی اور باپ۔ کوئی بھائی۔ کوئی شوہر کسی بیٹی بہن یا بیوی کو بیچنے کے لئے لائے گا۔ مجھے کرایہ دے گا۔ چوکیداری کا لے گا۔ گاہک کو لانے کا لے گا..... اس طرح میری روزی لگے گا ... میرا خالی پیٹ بھرے گا۔

اس نے آنکھیں ایک بار پھر بند کرلیں اور پشتو لوک گیت کا پٹہ گانے لگی.... مجھے الفاظ کے مطلب نہیں آتے تھے شاید اس میں جانے والے محبوب کے فراق کا ذکر ہوگا اُس کے حسن کا بیان ہوگا یا وہ اپنی گزری جوانی کا نوحہ کہہ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے، اُس میں صرف اس کے پیٹ کی بھوک کا ذکر ہو۔

میں نے دونوں سگریٹوں کو وہیں پھینک دینا چاہا۔ لیکن گل جاناں کی دوری نے میرے اندر محرومی کا دکھ بھر دیا تھا۔ میں نے مُٹھی کو زور سے بند کرلیا جیسے گل جاناں میرے قبضہ میں آگئی ہو اوپر آسمان پہ سیاہی میں تارے چمک رہے تھے۔ بازار ویران ہوچکا تھا

میں نے کہا کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ کہاں سے آئی تھی... کدھر چلی گئی۔"

وہ خاموشی سے مجھے گھورنے لگی پھر بولی۔

دیکھو ظہیر خاناں۔ طوائف اور سگریٹ دونوں ایک جیسا ہوتا۔ سگریٹ کو پی کر بھی کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اور طوائف کے پاس آ کر بھی کچھ حاصل نہ ہوتا جاؤ اپنے آپ کو آزاد کرو۔ اس کی یاد کی زنجیر سے خود کو مت باندھو۔ اس بازار سے بھاگ جاؤ... اس گندگی سے بھاگ جاؤ... نہیں تو میرے مانند بوڑھا اور بیکار ہوجائے گا بھاگ جاؤ.... بھاگ جاؤ ..... بھاگ جاؤ... بھاگ جاؤ۔

اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں... اُس کے لبوں پہ کسی ادھورے گیت کے بول تھے۔ اس نے اُٹھ کر دروازے کی چوکھٹ کو پکڑ لیا۔

"ظہیر خاناں ہم ڈھونڈنے کے قابل نہیں ہوتا" اور اس نے دروازہ بند کرلیا۔ سگریٹ کی خوشبو میرے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ میرے دماغ میں گھس رہی تھی۔ میری آنکھوں کی نمی میں ڈھل رہی تھی۔

آنے والے دن ایک کربناک تنہائی میں ڈھل گئے بیتا اور برتا ہوا ایک ایک لمحہ مجھے یاد آنے لگتا۔ لمحے جو میری ہتھیلی سے گر کر گم ہوگئے۔ گل جاناں۔ گل جاناں کا روشن چہرہ ... اس کے روشن اور چمکیلے جسم کا۔ فانوس میری یاد کے اندھیروں میں چمکنے لگتا اب میرا دل گوشہ سے اجاڑ ہوگیا تھا گوشۂ بے گیاہ پتھریلی چٹانوں میں ڈھل گیا تھا۔ ایسا ہوگا۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔ انسانی دل کی تخلیق کن عناصر سے ہوئی ہوگی۔ مجھے معلوم نہیں۔ میرے اندر تو بہت سا جھوٹ بھرا ہوا ہے جسے میں الفاظ کے پیمانوں میں پیاس سے خشک لبوں کے اندر انڈیلتا رہتا ہوں..... میں اب ایک شاطر کھلاڑی ہوں میں نے واقعات اور حالات کو ہمیشہ اپنے حق میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی انا کو خود پسندی کی دھند میں لپٹا دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے لیکن

وہ سچائی کا ایسا لمحہ تھا۔ جو میرے دل کی دیوار توڑ کر داخل ہونا چاہتا تھا۔ ایک چہرہ زندہ ہو کر میری سوچ میں سمٹا ہوا تھا.... میں روز اس گلی تک جاتا بوڑھی عورت ہمیشہ کی طرح خلاء میں گھور رہی ہوتی وہ کہتی۔ دیکھو ظہیر خاناں میری زندگی اس چند گز زمین سے بندھی ہوئی ہے۔ لیکن اس بند گلی کو دیکھو۔ راستہ یہاں آکر رک جاتا کہیں نہیں جاتا۔ اسی طرح یہاں آیا عورت بھی اپنے اندر بند ہو جاتا۔ وہ کھلے بھی تو کس کے لئے۔ سب کچھ اس کے اندر دم توڑ دیتا۔ یہاں کچھ نہیں رہتا۔

اس نے اپنے دل کی طرف اشارہ کیا اس کی آنکھوں میں دکھ بھری کہانی بھری ہوئی تھی شائد اسے معلوم نہیں تھا کہ یہاں تو رنگ ہی رنگ بھرے ہوئے ہیں۔ دوسروں کے جذبوں کے ساتھ راس رچائی جا سکتی ہے۔ جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔

آج میں دل ہی دل میں مسکرا سکتا ہوں۔ میں ردّی خریدنے والے کی طرح رد کی ہوئی عورتوں کا سودا الفاظ کے سکوں سے کرتا ہوں کھنکھناتے سکّے جن پر جاہت کی چمکیلی ملمع چڑھی ہوئی ہوتی ہے نفع و نقصان کا حساب تب ہوتا ہے جب ہاتھ میں سوائے دھول کے کچھ باقی نہیں بچتا۔ تب تک بہت کچھ حاصل ہو چکا ہوتا ہے لیکن اُن دنوں میں زندگی کے ابتدائی سبق ہی سیکھ رہا تھا۔ میں نے کوئٹہ کی نوکری چھوڑ دی اور لاہور کے اخبار میں کام کرنے لگا۔

وہ لاہور کا سب سے بڑا ثقافتی میلہ تھا، میلے کا میدان اجنبی چہروں، قدآور گھوڑوں.... بیلوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں اور خیموں کی تنی طنابوں سے بھر گیا۔ مختلف اضلاع کے طائفے رنگین ریشمی لباسوں میں لوک رقص کی تیاریاں کرتے ڈھول مجیرے فضا کو شور سے بھر دیتے زمینداروں کے کارندے انعام کے لئے گھوڑوں کے مشکی جسموں کو تیل سے چمکاتے اور ہمیشہ کی طرح باہر کی طوائفوں نے مختلف علاقوں میں ڈیرے ڈال دئے۔ زندگی اپنی ساری خوبصورتیوں اور بدصورتیوں کے ساتھ لاہور کی صبحوں شاموں میں گھلی رہتی اور میں کیمرہ گلے میں ڈالے اپنے اخبار کے لئے خبروں اور تصویروں کے تعاقب میں شہر کی خاک چھانتا رہتا۔

تب میں نے اسے ایک تنگ گلی کے چھوٹے سے گھر کی چوکھٹ پر کھڑے دیکھا۔ وہ گل جاناں ہی تھی مجھے لگا جیسے کریون سگریٹ کی خوشبو اچانک میرے چاروں طرف اُڑنے لگی ہو۔ گذرے برسوں کا بوجھ اس کے چہرے پر تھا۔ جیسے وہ مسلسل کسی انتظار کے کرب سے گذرتی رہی ہو۔ وہ میرا انتظار نہیں تھا اس کے دل کی دہلیز تک نہ جانے کتنے لوگ آکر دستک دیتے رہے تھے اس پر نہ جانے کتنے قدموں کے نشانات تھے وہ ہمیشہ کی طرح دبی دبی مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں لمبی مسافت کی تھکاوٹ تھی۔ اس نے رنگین شلوار قمیص پہن رکھی تھی وہ یقیناً آج بھی میلے کی رونق بڑھانے کے لئے لائی گئی تھی۔

میں اس کے سامنے خاموش کھڑا ہو گیا۔ جذبوں کے اظہار کے لئے خاموشی سب سے بڑی زبان ہے۔

”اندر آؤ۔ میرا شوہر اندر ہے“۔۔ اس کی آواز میں جذبوں یا تعلق کی خوشی نہیں تھی۔

ہم دونوں کپڑے کا بوسیدہ پردہ ہٹا کر اندر چلے گئے چھوٹے سے گھر میں برآمدے کے پیچھے دو کمرے تھے جو بجلی سے روشن تھے.... اجلے بستروں پر خوبصورت پلنگ پوش تھے اور دیواریں نئی نئی سفیدی کروائی گئی تھیں دو اور جوان لڑکیاں اپنے گھیردار لباس میں سہمی ہوئی برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھیں... سخت چہرے اور سیاہ لمبی مونچھوں والا دراز قد مرد میرے اندر جانے پر اُٹھ کھڑا ہوا

"گل جاناں کرسی لاؤ۔ بیٹھو صاب، بیٹھو۔" وہ جلدی سے بولا میں کریون سگریٹ کی خوشبو کو آہستہ آہستہ یاد کی تہہ سے اُبھرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر وہ خوشبو آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگی، مرد اور مرد کا دل۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا وہ مرد بغیر کچھ کہے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر میرے کندھے سے لگ کر رونے لگی تعلق کی باریک ڈور شاید ابھی تک موجود تھی۔

میں نے کہا: "گل جاناں ملنے میں بڑی دیر کر دی۔" میں جانتا تھا، مجھے وہ بہت کم یاد آتی تھی۔ لیکن میں اس کے آنسوؤں کی قیمت ڈالنا چاہتا تھا، اُسے خوش کرنا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں سیندھ لگا کر دوبارہ داخل ہونا چاہتا تھا وہ زندگی کے جبر سے گھری ہوئی عورت تھی اور یہ جذبہ اس کی نظروں میں لکھا ہوا تھا اس کا شوہر باہر سے چائے کا ٹرے پکڑے اندر آیا... میں نے چند روپے ٹرے میں رکھے چائے پی اور اُٹھ کھڑا ہوا..... اس کا شوہر پھر چلا گیا۔

"ظہیر باؤ" میں اکثر آپ کو یاد کیا کرتی تھی۔ میں نے آپ کا انتظار کیا تھا... اگر آپ آ جاتے تو شاید آج میں یہاں نہ ہوتی شاید میرا کوئی اپنا گھر ہوتا.... اپنے بچے ہوتے..... میرا شوہر مجھے بیچتا ہے مارتا ہے اور سارے روپے چھین لیتا ہے شاید تب ایسا نہ ہوتا۔ وہ پھر رو رہی تھی۔ جیسے بیتے دُکھ کی لہر بار بار اُس کے دل سے ٹکرا رہی ہو..... وہ ڈوب رہی ہو.... میں اس کے آنسو پونچھنا چاہتا تھا میں آگے بڑھ کر رک گیا.... میں اس کے شوہر کی موجودگی سے خوفزدہ ہو رہا تھا۔ میں نے کہا گل جاناں، میں پھر آؤں گا

وہ زور سے ہنسی۔ ظہیر باؤ میرے شوہر سے ڈر رہے ہو... میں کوئی شریف زادی تو نہیں ہوں میرا شوہر گاہک کو دیکھ کر ناراض نہیں ہوتا اس نے مجھے مہنگے داموں خریدا تھا اور وہ ساری رقم سود کے ساتھ بار بار وصول کرے گا.... اس نے ڈبیہ سے سگریٹ کو نکالا اور پینے لگی۔

"کون سا برانڈ ہے گل جاناں"... میں نے پوچھا۔

"ظہیر باؤ کریون نہیں.... اب کریون نہیں ملتا..... وہ سگریٹ تو میرے ایک یار نے دئے تھے.... لیکن اب میں خود خریدتی ہوں"..... مانگے کے مختلف برانڈ کے سگریٹ پینے سے مزہ نہیں آتا" اس نے آنکھوں کو پلو سے خشک کیا اور تیز تیز کش کھینچنے لگی۔ وہ اب بھی بائیس چوبیس برس سے زیادہ عمر کی نہیں تھی.... اس کے جسم کے خطوط بھر کر خوبصورت ہو گئے تھے اس میں کچے پن کی بے ترتیبی نہیں تھی وہ اگر خوبصورت لباس پہنتی تو خوبصورت ترین عورت لگتی..... میں نے کیمرے سے اُس کی ایک تصویر بنائی اور باہر نکل آیا.... میں نہیں جانتا یہ تعلق کی پہلے والی ڈور تھی یا میں جو زندگی کے ہر لمحہ سے لطف لینا سیکھ گیا تھا۔ اسے بھی ایسا ہی لمحہ سمجھ رہا تھا اس کے جسم کے دلکش خطوط بار بار میری نظروں میں گھوم رہے تھے اسے باتیں کرنا آ گیا تھا وہ اُردو بھی اچھی طرح بول سکتی تھی اسے سگریٹ کے ادھورے دائرے بنانے بھی آ گئے تھے۔ اور اس کے لبوں کی بناوٹی مسکراہٹ بڑی کاروباری ہو گئی تھی۔

میں جو ٹوٹے دلوں اور رگیدے گئے جذبات کی ردی کو گوندھ کر محبوباؤں کو تخلیق کرنے کا فن سیکھ گیا تھا۔ ایک اور محبوبہ کو تخلیق کرنا چاہتا تھا۔

میرے دوست کہتے ہیں کہ میں پھینکے ہوئے کنکوے اور پھٹی پتنگیں اکٹھی کرتا رہتا ہوں خود کو جو بڑا لیڈی کلر اور ہیرو سمجھتا ہوں محض ایک خوشامد پسند عاشق ہوں میں ان کا الزام سن کر بُرا نہیں مانتا۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ ان پتنگوں کو مرمت کر کے جب میں فضاؤں میں بلند کرتا ہوں تو ان کا کوئی دعوے دار نہیں ہوتا وہ صرف اور صرف میری ملکیت ہوتی ہیں۔ اور گل جاناں بھی اپنوں کے ہاتھوں پامال کی جا رہی تھی۔ اُس کے گاہک محبتوں کے اظہار کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ وہ اُسے گوشت کا ایک ٹکڑا سمجھتے ہیں میری باتیں اس کے اندر محبت کرنے والی عورت کو جگا رہی تھیں اور وہ بت کی طرح سیدھا بت تراش کی آنکھوں کے علاوہ کہیں اور نہیں دیکھ سکتی اور میں اس کا بت تراش تھا۔

اس کے اندر کی عورت کو جگانے اور پھر اسے اپنی گرفت میں لینے کی شدید خواہش میں میرا سکوٹر بار بار اس کے گھر کے سامنے رک جاتا۔ شہر کے سارے راستے اس کی دہلیز پہ رُک جاتے وہ گلی بند نہیں تھی لیکن میرے لئے وہ اب بھی بند گلی ہی تھی۔ میں نے اسے الفاظ کے فانوس میں قید کر لیا تھا میں جو عورتوں کو کم ہی نظر آتا تھا الفاظ کا نشہ پی کر سوائے میرے کہیں اور نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ میں یہ بات دعوےٰ سے کہہ سکتا ہوں آئینہ میرے تصورات کا ساتھ نہیں دیتا۔ اور میں اُسے بار بار جھٹلا دیتا ہوں میں خوبصورت مرد نہیں ہوں لیکن پھر بھی لڑکیاں محبت بھرے خطوط لکھتی ہیں جنہیں پڑھ کر میرے اندر نیا اعتماد پیدا ہوتا ہے اور میں آئینے کے سامنے کھڑے مرد کا مذاق اُڑانے لگتا ہوں۔

”دیکھا.... یہ میں ہوں.... اور تم.... تم کبھی مجھے مات نہیں دے سکتا۔ میں مسکراتا ہوں۔ اور آئینہ والا آدمی غائب ہو جاتا ہے۔ میرے پاس سوائے الفاظ کے خزانے کے اور کوئی خزانہ نہیں۔ اور میں اپنے الفاظ کو بڑی محنت سے تراشتا۔ سنوارتا اور سجاتا ہوں۔ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا میں اکثر اپنی محبوباؤں کو مکھی بنا کر خود پسندی کی دیوار سے چپکا دیتا ہوں... اور میری انا کا دیو اسے ہڑپ کر جاتا ہے۔

گل جاناں بھی ایسی ہی مکھی تھی۔ لیکن اس کے شوہر کا جابر چہرہ بار بار میری راہ روک لیتا۔

اس روز میں بازار سے دو خوبصورت کرتے لے کر اس کے پاس گیا اُسے بخار تھا۔ مارچ کی سردیاں سورج کی چادر اوڑھے سڑکوں پہ اونگھ رہی تھیں وہ گھر میں اکیلی تھی۔ شاید اس کا شوہر دوسری لڑکیوں کو کسی میلے میں لے کر گیا ہوا تھا۔

وہ نڈھال لیٹی ہوئی تھی۔ کہنے لگی ”ظہیر بابو.... آؤ۔ کہیں بھاگ جائیں.... میں اچھی عورت ہوں... میرا دل تمہاری بیوی کہلانے کو چاہتا ہے.... میرا شوہر کہیں گیا ہوا ہے.... وہ ہمیں ڈھونڈ نہیں سکے گا... مجھے تم سے محبت ہے تم بھی تو یہی کہتے ہو“

اس نے اُٹھ کر میرے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ اس کے ہاتھ دہک رہے تھے۔ بخار سے اس کا خوبصورت چہرہ گہرا گلابی ہو رہا تھا.... وہ اونچی آواز میں رو رہی تھی۔

میرے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ میں ہمیشہ کی طرح اُسے کہیں بھی لے کر نہیں جا سکتا تھا۔

میں نے کہا ”گل جاناں بخار اتر جائے گا تو سوچیں گے۔

ابھی آرام کرو۔"

"شاید آج آرام کے بعد تم آؤ ہی نہیں میرے پاس صرف آج ہی کا وقت ہے۔ میں تمہیں دوبارہ کھونا نہیں چاہتی۔"... اس کے بازو میرے گرد لپٹ گئے.... "آؤ چلیں.... آؤ چلیں..... آؤ چلیں"... شاید بخار کی تیزی میں وہ ہذیان بک رہی تھی.. "تم ہی نے تو مجھے عورت ہونے کا احساس دلایا ہے.... آؤ چلیں"... اس کے شوہر نے اندر آکر اُسے مجھ سے جدا کیا... اس کے چہرے پر غصہ ہی غصہ تھا.... لیکن گل جاناں کی آواز میں سچائی ہی سچائی تھی۔

"باؤ جی، آج آپ چلے جائیں جب وہ تندرست ہوگی تو پھر آجائیے گا"... میں نے اس کے ہاتھ میں کچھ روپے تھماتے ہوئے خدا حافظ کہا اور باہر چلا گیا۔

میں بہت دن اس کے پاس نہ گیا میلے کی بساط اُٹھ چکی تھی میرے روپے ختم ہو چکے تھے۔ اور مجھے بہت سے ادھو کام نپٹانے تھے۔

بہت دنوں بعد جب میں اس کے گھر گیا تو وہاں گل جاناں نہیں تھی۔ دونوں لڑکیاں بنی سنوری برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ ہوئی تھیں۔

"ظہیر باؤ آپ بڑی دیر کر کے آئے۔ باجی تو اب یہاں نہیں ہوتی۔ اس کے شوہر نے اسے ایک بڑی نائکہ کے پاس با مہنگے داموں بیچ دیا ہے۔"

مجھے لگا جیسے میرے ہاتھ سے کوئی مہنگی چیز چھن سے گر کر ٹوٹ گئی ہو۔

"کیوں" میں مشکل سے پوچھ پایا۔

"وہ بخار میں بار بار آپ کا نام لیتی تھی۔ اُٹھ اُٹھ کر آپ کو پکارتی ہوئی باہر بھاگتی تھی اس کا شوہر اسے مارتا۔ گالیا تھا۔ اسے ڈر تھا وہ آپ کے ساتھ بھاگ نہ جائے۔"

میرے دل کی دھڑکن آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی، میں اس کی سچائی کا حقدار نہیں تھا۔ لیکن میری انا کا غبارہ پھول بڑا ہو گیا تھا۔ میں بہت بلند اُڑنے لگا۔ ایک عورت ایسی تھی جو میرے لئے گالیاں کھاتی اور مار سہتی رہی، ایک طوائف جس اندر کی عورت پر میرا قبضہ تھا.... میں دل ہی دل میں مسکرایا۔

"ظہیر باؤ پنجتن پاک کی قسم۔ میں سچ کہتی ہوں اس نے بکنے سے پہلے آپ کا لایا ہوا کُرتا پہنا تھا۔ وہ کہتی تھی وہ عمر اپنے تن سے نہیں اتارے گی.... وہ اسے اپنا کفن بنائے گی.... ظہیر باؤ۔ کسبی تو پیار کرنا جانتی ہی نہیں وہ کبھی کا اظہار نہیں کرتی۔ آپ تو بڑے نصیبوں والے ہیں۔ وہ آپ کا نام لیتے لیتے موٹر میں بیٹھی تھی.... اُسے اس کرتے سے ہاتھوں کی خوشبو آرہی تھی۔ آپ چلی جائیں نہیں تو وہ آکر آپ سے لڑے گا وہ دونوں بھی خوفزدہ لگ رہی تھیں۔ گل ایک بار پھر مجھے وقتی انتظار اور کرب میں مبتلا کر گئی تھی۔ میں جانتا تھا اس کی یاد محض وقتی دکھ دے گی اور پھر یادوں کی چھاؤں میں چھپ جائے گی۔ میں نے اپنی ذات کے افق پر بہت ساری محبتوں کی دھنک سجا رکھ

کسی بھی واردات میں میری پوری رات شامل نہیں ہوتی تھی۔ میں نے گل جاناں کا پتا معلوم کرنا چاہا تو وہ زور سے ہنس دی۔ ظہیر باؤ۔ بکاؤ مال کا کیا ٹھکانہ۔ نہ جانے آگے کتنے ہاتھوں میں بکے گی کون سے کوٹھے پہ بسیرا کرے گی۔ سارا شہر ہی بکاؤ لگتا ہے سارا شہر ہی خریدار لگتا ہے آج یہاں کل کوئی اور شہر۔ گل جاناں بھی ہمارے جیسی ہی بدنصیب ہے۔

گندگی کے ڈھیر۔ آوارہ کتے۔ خوبصورت چہروں والی لڑکیاں جو کاغذ کے ڈھیروں سے بے کار چیزیں اکٹھی کر رہی تھیں اور مٹھائی کے تھالوں پر بھنبھناتی مکھیاں۔ دربار پہ آس کی جھولی پھیلائے ضرورت مند زائرین۔ عورت کا دل۔ عورت کا جسم جو بکاؤ مال ہے واپس آتے ہوئے میں نے پوری دیانت داری سے اس کی کمی محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن میری یادوں کے ڈھیر میں وہ صرف ایک چہرہ تھی.... صرف ایک چہرہ۔

میں جانتا ہوں اس کا چہرہ میرے دل کے کینوس پر بار بار آنکھ مچولی کھیلے گا۔ اپنی فتوحات کی داستان لکھتے ہوئے میں اس کے ذکر پر مسکرایا کروں گا میرا دل نہ جانے کیوں مسافرت میں تھا میرے دل کا کنواں کسی بھی وجود سے بھر نہ پاتا۔

شاید میرے اندر شکل اور دولت سے محرومی نے انتقام بھر رکھا تھا اور میں دلوں کو تہس نہس کر کے محرومی کے جذبے کو تسکین دینا چاہتا تھا اب پہ پوری دسترس چاہتا تھا جب وہ میرے ہاتھوں میں تڑپتے ہیں تو مجھے غیر شعوری طور پہ بے حد تسکین ملتی ہے ایسی ہی تسکین جیسی میری سوتیلی ماں کو میرے وجود کو داغدار کر کے ملتی تھی۔ ایسی تسکین جو میرا سگا باپ میری ہر بات کا مذاق اڑا کر حاصل کیا کرتا تھا میں عورت کے اندر آگ دہکاتا ہوں۔ اسے اونچے ستون پہ ایستادہ کرتا ہوں اور پھر اس ستون کو ہلانے لگتا ہوں۔ وہ عورت مدد کے لئے میری طرف بڑھتی ہے اور میرے جسم کی بھی اسیر ہو جاتی ہے اسے میرا چہرہ نظر نہیں آتا وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتی ہی کب ہے وہ تو میرے الفاظ کے تعاقب میں چلنے لگتی ہے چلتی ہی جاتی ہے۔ خواب دیکھتے ہوئے .... اور میں ان کی آنکھوں میں بسے خوابوں کی تعبیر بن جاتا ہوں ...... کبھی جاگنے پر میں انہیں جاگنے ہی کب دیتا ہوں.... الفاظ کے نشے کی عادی ان کی ویران اور دھتکاری روحیں میرا تعاقب کرنے لگتی ہیں۔۔ یہاں تک کہ وہ پوری طرح جاگ نہ جائیں یا میں راستہ نہ بدل لوں۔ شہر تو گنجان ہے اور کسی کو ڈھونڈنا آسان نہیں ہوتا۔ اور خواب محض سراب ہی ہیں

گلبرگ کے نئے کوٹھی خانوں میں میڈم شائستہ کا کوٹھی خانہ سب سے زیادہ مشہور اور مہنگا تھا' خوبصورتیوں کے نئے طریقوں نے چہروں کو خدوخال سمیت بدل کر رکھ دیا ہے رنگوں کے پیچھے سے کسی کو پہچاننا آسان نہیں۔ اور گل رخ اس کوٹھی خانے کی سب سے مہنگی کال گرل تھی جو بہترین لباس میں گاڑی کو فراٹے سے بھگاتی تو جوان سیٹیاں بجانے لگتے.... اور میڈم کا فون بہت ہی مصروف ہو جاتا۔ یہ سارا کاروبار زیرزمین تھا بظاہر وہ میڈم شائستہ کی بڑی بیٹی تھی.... امیرزادی۔ بگڑی ہوئی فیشن ایبل سودا خفیہ طے ہوتا... مڈل مین روپیہ وصول کرتا اور پھر کسی ہوٹل کے خوبصورت کمرے میں وقت کو رنگین کیا جاتا۔ مہنگی چیزیں ہمیشہ پرکشش ہوتی ہیں... لیکن میں آج بھی اپنی جیب میں پڑے روپوں سے غافل نہیں ہو سکتا تھا..... میں جس زندگی کے پیچھے دوڑتا رہا تھا وہ میری دسترس سے ہمیشہ دور رہتی ... میرے پاس اپنا گھر۔ اپنی گاڑی اور اپنی بیوی نہ تھی لیکن گل جاناں پھر بھی میرے لئے آنکھوں میں خواب سجا لیتی شاید عورت کا دل پرانے خوابوں سے رشتہ منقطع نہیں کرنا چاہتا [illegible]

وجۂ افتخار سمجھتی تھی اپنی کشش کے لئے ایک کسوٹی۔ یا اسے اب بھی مجھ سے ان باتوں کی توقع تھی جو اسے دنیا کی انتہائی خوبصورت عورت بنا دیتیں اُس کے ذہن سے طوائف ہونے کی گندگی دھو کر باعصمت ہونے کی پاکیزگی دے دیتیں۔ میں اب باتوں کے فن میں اور بھی ماہر ہو چکا تھا ایسا عاشق جو سرتاپا اس کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا جو اس سے بے لوث محبت کرتا تھا.... میں جانتا تھا میری گانٹھ میں الفاظ کے سکوں کے سوائے تھا بھی کیا۔ اور مجھے قیمت تو بہر حال چکانی تھی۔

وہ کہتی مسٹر ظہیر تم نے میرے خواب چھین لئے ... اور اب میرے خواب زیادہ مہنگے ہو گئے ہیں.... لیکن پھر بھی کہیں نا کہیں اس خواب کے گھر میں تمہاری شبیہ موجود ہوتی ہے تمہاری باتیں میرے کانوں میں گونجنے لگتی ہیں میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں... مسکرانے لگتی ہوں، میرا ساتھی اکثر اس ہنسی کی وجہ پوچھتا ہے تو میں تمہارا ذکر کرتی ہوں تمہاری باتوں کی خوبصورتی کا تذکرہ اسے چوکنا کر دیتا ہے وہ بھی مجھے وقتی طور پر باتیں کر کے بہلانا چاہتا ہے لیکن اس کی باتیں میرے دل میں نہیں اترتیں... تب میرا دل ویران ہو جاتا ہے۔

میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میرے پاس رقابت کی گنجائش نہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ میں اس کے دل کے ایک کونے میں ہمیشہ موجود رہوں گا۔ میرے پاس اس سے زیادہ کی طاقت نہیں۔

مرد اور طوائف کی زندگی میں ہزاروں بار کی دہرائی کہانی ہمیشہ دہرائی جاتی رہے گی اس کے دل اور وجود کا ایک کونہ ہمیشہ شوہر اور گھر کی آس میں دھڑکتا رہے گا کسی آہٹ کا منتظر رہے گا۔

وہ شاید اسی امید میں میری بھی آنکھوں میں جھانکتی ہے اور میں اس خواہش کو وجود میں ڈھالنے کے لئے سراپا خالق بن جاتا ہوں رات کے پچھلے پہر جب کبھی کبھار اس کا فون آتا تو وہ کہتی ظہیر خاناں تم بہت یاد آ رہے ہو.... میں تھک گئی ہوں... گاڑی چلاتے جسم جلاتے میرا پڑاؤ کہاں ہو گا... کون مجھے سہارا دے گا"۔ میں ہنس کر کہتا۔ عزیز از جان خاتون .... میں جو ہوں ... وہ ہنس پڑتی ... ظہیر خاناں اگر یہ آج سے برسوں پہلے والی گل جاناں ہوتی تو اور بات تھی۔ لیکن اب ...

اس وقت مجھے معلوم ہوتا کہ وہ عورت پن کے خارزار میں ابھی کوئی راستہ ڈھونڈ رہی ہے لیکن راستے کس کو ملتے ہیں اور میں باتوں کے رنگوں سے اسے بہلا لیتا... وہ ہنستی، مسکراتی اور پھر دن کی ملگجی روشنی میرے کرایہ کے چھوٹے سے گھر پر طلوع ہوتی، جس میں، میں نے بڑی تگ و دو کے بعد فون لگوایا تھا۔ آخر حسینوں سے ملاقات کا اس سے بہتر ذریعہ بھی تو کوئی نہیں

میں کہتا گل جاناں "تمہارے گیٹ کے کتے اور چوکیدار بڑے خونخوار ہیں" اس کی ہنسی تاروں میں ارتعاش بن جاتی۔ ہم باتوں میں مصروف رہتے .... گذری محبتیں... بے وقوف گاہکوں کے قصے راستوں کی ٹھوکریں۔ مردوں کا دھوکا آنے والے دنوں کا انتظار۔ گذرے دنوں کی طوالت۔ وہ باتیں کرتی رہتی اور میں بڑا اچھا سامع تھا۔

پھر ایک دن میں نے اس کے بڑے بڑے پوسٹر شہر کی دیواروں سے چسپاں دیکھے ... وہ ایک بدنام فلم ساز ادارے کے بڑے عیاش پروڈیوسر کی فلم میں ہیروئن آ رہی تھی اب اس کے فون بھی نہ آتے وہ مصروف تھی اور میں اخبار کے فلمی صفحے کے لئے اس کی تصویریں لینے کے لئے سٹوڈیوز کے چکر لگاتا۔ اس کی رنگین تصویریں کھینچتا .... وہ مجھ سے بہت کم بات کرتی ... سارا وقت سٹوڈیوز کے اندر فلم کے سیٹ پر رہتی لیکن کبھی کبھار جب ہماری آنکھیں ملتیں تو وہ بڑی اپنا سینہ

ے مسکرا دیتی تب مجھے برسوں پہلے والی گل جاناں بند گلی کے آخری دروازے کی چوکھٹ سے لگی یاد آنے لگتی لیکن اب وہ گل رخ تھی۔ پری چہرہ گل رُخ .... اور میں دوستوں کو بتاتا کہ نئی فلم ایکٹرس کبھی میری دوست تھی تو وہ یقین نہ کرتے۔

لیکن وہ فلم بری طرح فلاپ ہو گئی۔ میری مدد رائیگاں گئی۔ میری اخبار کی بڑی بڑی رنگین تصویریں اس کو ایکٹرس نہ بنا سکیں اور پھر میں نے سنا کہ وہ اس پروڈیوسر کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی ہم مشرقیوں کے خوابوں کی سرزمین۔ آسائشوں کا جزیرہ۔ محرومیوں کا مداوا میڈم شائستہ نے یقیناً اسے بڑے مہنگے داموں بیچا ہو گا اس نے مجھے جانے کی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔

میرے اندر کوئی جذبہ بری طرح مجروح ہو گیا کیا میں اسے دھوکا دیتا رہا تھا یا وہ مجھے دھوکا دیتی رہی تھی۔ شائد وہ پروڈیوسر جھوٹ بولنے میں مجھ سے زیادہ مشاق تھا۔ مجھے اپنی کم مائیگی کا شدید احساس ہوا۔ گل جاناں تو بڑی عملی عورت نکلی خواب تو میں بنتا رہا تھا میں ہمیشہ اپنے آپ کو ایسا ہیرو تصور کرتا رہا تھا جس کے گرد ہیروئن چکر کاٹتی اور گانے گاتی ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے میں نے ہمیشہ آنکھیں بند رکھیں، اپنی محرومیوں کو اپنے آپ سے چھپایا... میری خود پسندی کا تانا بانا بکھر کر رہ گیا کیا میں اس سے محبت کرتا تھا۔ میں تو ہمیشہ دوسری کی ذات کے بند قلعوں کو مسمار کرتا جھکاتا آیا تھا اور مجھے اپنی خوبی پر ناز تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ ایک عام گھریلو عورت نہیں جو اپنے ٹوٹے دل مجروح انا اور آنے والے تنہا دنوں کے خوف میں مبتلا آنسوؤں میں ڈوبی جب زندگی کی شاہراہ پر نکلتی ہے تو میں کہیں نہ کہیں اسے ضرور ڈھونڈ لیتا ہوں۔ اور پھر اپنے کمرے کی تنہائی میں بیٹھے الفاظ کے رنگوں سے اس کے گرد نیا کو یا بننے لگتا ہوں وہ جو دل کے خلا میں بغیر سمت کے رواں دواں ہوتی ہیں میرے دل اور میرے کمرے کو اپنا وقتی پڑاؤ بنا لیتی ہیں راتیں سیاہ اور لمبی ہوتی ہیں لیکن میری باتیں اُن کی آنکھوں میں ہنسی اور دلوں میں امید جگا دیتی ہیں

لیکن گل جاناں اور اُن میں بنیادی فرق تھا عورت کو زندگی برتتی ہے اور طوائف زندگی کو۔

میں دوستوں کی باتوں کی پروا نہیں کرتا کہ میں ہمیشہ کٹی پتنگیں اور رد کئے ہوئے کنکوے اکٹھے کرتا ہوں۔

میں جانتا ہوں کسی نہ کسی روز گل جاناں کو بھی برت کر پھینک دیا جائے گا تب اسے میری ضرورت ہو گی... اور میں کسی کو بھی مایوس نہیں کرتا میرے خوبصورت جھوٹ مرہم بن کر اُن کی مجروح انا کا مداوا کرتے ہیں۔ . . اور میں اپنی زندگی کی محرومیوں کو بھول جاتا ہوں۔

اور انہی محرومیوں کی کسک نے مجھے شاعر کے طور پر مشہور کر دیا تھا خوبصورت محبوباؤں کی ادائیں۔ اُن کے سراپے الگ بن کر میری شاعری کو مشہور کر رہے تھے عورت سے محبت کے بغیر شاعری میں رنگ نہیں بھرے جا سکتے میرے وسیع تجربات نے زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔

اُن دنوں لندن کے ایک اُردو مشاعرہ میں مجھے دوسرے شاعروں کے ساتھ مدعو کیا گیا۔

گل جاناں مجھے ایک سٹور میں کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی نظر آئی۔ وہاں جہاں ہر عورت ایک کہانی بن جاتی ہے گل جاناں بھی ایک کہانی سی تھی اس کا چہرہ بدلا اور بہت کچھ جھیلا ہوا لگتا تھا۔

ہم دونوں ہاتھ پکڑے کھڑے رہے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے جھلملا رہی تھیں۔ . . . کہنے لگی.... میں جانتی تھی تم زندگی کے کسی موڑ پر مجھے ضرور ملو گے آخر وہ موڑ آ ہی گیا۔

میں اسے خاموش دیکھ رہا تھا میرے دل میں اس کے لئے محبت نہیں تھی، میں اس وقت اپنی بہترین پرفارمنس دینا چاہتا تھا میں جانتا تھا اپنے ٹوٹے بت کی کرچیاں چنتے چنتے اس کی انگلیاں فگار ہوں گی۔ اس کا دل بوجھل ہوگا۔

جذباتی رشتوں کی ڈور کا سرا اس کے ہاتھوں سے پھسل چکا ہے۔

شام کو ڈیوٹی کے بعد ہم دونوں برسوں کے بعد ہاتھ پکڑے ایک پارک کی روش پر چل رہے تھے بہار کی ہوائیں ہمارے گرد رقصاں تھیں۔ بادل آسمان پر محوِ پرواز تھے اور پھولوں کی باس ہمارے وجودوں سے لپٹ رہی تھی۔

گل جاناں کچھ تو بولو۔ کوئی داستاں کوئی آپ بیتی۔ بہت برس گزرے۔ میں نے تمہیں چاہا۔ پوری سچائی کے ساتھ تم پر فدا ہوا۔ اور آج بھی تم ہی تم میرے دل کے نہاں خانہ میں بس رہی ہو"۔ میں اس کو روش پر روک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

وہ زور سے ہنسنے لگی لیکن اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں ظہیر خاناں تمہارا جھوٹ بڑا ہی دل بہلانے والا ہوتا ہے کوئی بھی غمزدہ عورت تمہارے جال میں پھنس سکتی ہے کیونکہ تم دل کے تشنہ حصے کو الفاظ کی پھوار سے سیراب کرنے کا گر خوب جانتے ہو۔ ٹوٹی ہستی کی دراڑیں وقتی طور پر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ تم ایک معمولی ایکسٹرا کو ایکٹرس بنا دیتے ہو۔ میں تمہاری مشکور ہوں میں بہت دنوں بعد پورے دل سے ہنس رہی ہوں۔

تم مجھ پر زیادتی کر رہی ہو گل جاناں"... میں ہنس کر بولا۔

"نہیں ظہیر۔ میں زیادتی صرف اپنی ذات پر کرتی رہی ہوں۔ ہر بار ایک ہی خواہش کا تعاقب کرنے لگتی ہوں۔ سوچتی ہوں وقت نہ نکل جائے۔ میں بھی ویسا ہی گھر چاہتی تھی۔ اپنی ماں کے گھر جیسا۔ جس کی دیواریں کچی تھیں جس کا فرش کچا تھا لیکن اس میں میری ماں کا پیار تھا کاش میں بڑی نہ ہوتی کاش ماں نہ مرتی کاش میرا باپ بہت سارا دلوا کر مجھے کسی بوڑھے خان کے ساتھ ہی بیاہ دیتا۔ لیکن اس نے مجھے سونے کا انڈا دینے والی مرغی بنا ڈالا"... لیکن یہاں سونے کا انڈا دینا بڑا مشکل ہے دیکھو میری زندگی میں کتنے کاش اکٹھے ہو گئے ہیں جب میرے خواب ٹوٹتے ہیں اور کوئی سہارا دینے والا نہیں ہوتا تو تم مجھے بہت یاد آتے تھے وہ رو رہی تھی۔

وہ طوائف ہونے پر اکتفا کیوں نہیں کرتی اس کے اندر کیسی کھوج تھی جو اسے بے چین رکھے ہوئے تھی۔ یقیناً اس نے اپنی زندگی میں آنے والے بہت سے مردوں سے آس لگائی ہوگی۔ بہت سی آنکھوں میں جھانکا ہوگا۔ لیکن سب صرف اس کے جسم کے گاہک نکلے۔ اور میں... میں تو سب سے بڑا فراڈ تھا جو اس کے جسم اور دل پر پورا قبضہ چاہتا تھا۔ شروع زندگی کا محبت کا تصور نہ جانے کہاں اور کیونکر دم توڑ گیا میں ایک عورت کو محبت کرنے یا اس سے محبت کروانے سے مطمئن، نہیں ہوتا تھا میرے لئے تو ہر راہ میں آئی عورت میری محبوبہ تھی اور میں چاہتا تھا کہ اس کا محبوب صرف میں ہی ہوں۔ لیکن وہاں کھڑا میں اس کے آنسوؤں کی سچائی کے سامنے شرمندہ ہو رہا تھا۔

میں نے اس فلم پروڈیوسر کے بارے میں پوچھا... وہ میرا سب سے امیر گاہک تھا۔ اس نے میرے لئے بہت نقصان [illegible] لے آیا۔ جب اس کا نقصان پورا ہو گیا تو وہ واپس چلا گیا میں وہاں

جا کر کیا کرتی۔ لیکن یہاں دھندا کرتی ہر ملک کی عورتوں کی کمی نہیں... یہاں تو لذتوں کی تلاش میں سرگرداں عورتیں مردوں کے پیچھے بھاگتی ہیں اور میں قیمت لیتی تھی، میری قیمت کون دیتا۔

اور اب تم.... تم اب بھی خوبصورت ہو"۔ میں اس کو ہمیشہ کی طرح خوش کرنا چاہتا تھا تم کسی مشرقی مرد سے شادی کر سکتی تھیں"۔

لیکن یہاں مردوں کو شادی کی ضرورت نہیں وہ جنس کے حوالے سے محبت کا کھیل کھیلتے ہیں.... یہ سارا ملک جسم کی منڈی بنا ہوا ہے میں نے قسم کھائی ہے مجھے اپنے جسم سے تعفن کی بو آتی ہے۔ مردوں کی باہوں کی گرمی بھی میری روح کی سردی کو نہیں مٹا سکتی تھی... اور اب ایک سیلز گرل ہوں.... میں نے دھندا چھوڑ دیا ہے یہاں کی عورتوں نے ہم جیسی عورتوں کو ہرا دیا ہے وہ یکایک ہنسنے لگی۔ اپنے آپ پہ۔ پھر بولی۔ دیکھو۔ میں کتنی باتیں کر سکتی ہوں۔ مجھے باتیں کرنے کا ڈھنگ آگیا ہے لیکن باتیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں.... اس کا چہرہ تیزی کے ساتھ اداسی کی زردی میں ڈوب گیا.... وہ ہولے ہولے ہانپ رہی تھی۔ جیسے اس کی اندرونی طاقت ختم ہو گئی ہو۔ ہم ٹھنڈے بنچ پر بیٹھ گئے۔ اس کے ہاتھ یخ ہو رہے تھے اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔۔ میں نے اپنے بازو اس کے گرد دائرہ کر دیے لیکن وہ ابھی بھی ہانپ رہی تھی شاید اندرونی سردی سے۔

"مجھے گھر لے جاؤ" وہ آہستہ سے بولی... اس کا فلیٹ ٹھنڈا اور اندھیرا تھا اس نے گیس میٹر میں سکے ڈالے کمرہ آہستہ آہستہ گرم ہونے لگا مدقوق بلب کی روشنی میں وہ اور بھی زرد نظر آ رہی تھی تیز کافی پینے پر اس کے بے رنگ رخسار آہستہ آہستہ سرخ ہونے لگے... ہم ایک دوسرے کے پاس پاس بیٹھے تھے۔ ہمارے جسم چھو رہے تھے... میرے اندر ایک خواہش جاگ رہی تھی میں عورت اور مرد کے بنیادی فرق کو جانتا ہوں مرد کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی اور ایک خاص عمر کے بعد عورت بغیر خواہش کے جھکنا نہیں چاہتی۔

لیکن میرے لاشعور میں اس کا تصور ایک طوائف ہی کا تھا... حالانکہ زندگی کے جذباتی لمحوں میں، میں نے اس سے چھوٹے چھوٹے وقفوں کے لئے محبت کی تھی۔ اُسے اپنی شدید محبت کا یقین دلایا تھا... میں ہمیشہ اپنی ہمدردیوں کا معاوضہ وصول کرتا تھا میرا اپنا طریقہ تھا... اور پھر میں اس کا محبوب رہا تھا میرے ہاتھ کی گرفت اس کے ہاتھ پر سخت ہو گئی۔

"دیکھو.... میں نے قسم کھائی ہے۔ بہت دنوں سے۔ "بہت مہینوں سے".... وہ بے بسی سے بتا رہی تھی۔ لیکن باہر موسم کی پہلی برف باری ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اکیلے پن کا کرب اتر رہا تھا۔ یادوں کا عذاب پیچھے اکیلے رہ جانے کا دکھ، بہت کچھ کھو دینے کا غم... اور میں خوبصورت محبت بھرے الفاظ کا نشہ اس کے کانوں میں انڈیل رہا تھا.... اس کی محبت کا اعتراف کر رہا تھا۔ رات کی ملگجی روشنی پارک کے درختوں کی پھننگوں سے جھانکتی رہی.... ہوا آوارہ جپسی کی طرح نم گھاس پر لوٹ لگاتی رہی اور ہم دو چاہنے والوں کی طرح ایک دوسرے کی موجودگی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے ساتھ ساتھ بیٹھے رہے۔

ظہیر خاناں... خدا نے مجھے عورت بنایا... عورت جس سے محبت کی جاتی ہے۔ لیکن میرے باپ نے مجھے جسم بیچنے والی بنا دیا وہ جو میرا شوہر بنا۔ اسے مجھ سے زیادہ پیسوں سے محبت تھی۔ اور وہ فلم پروڈیوسر۔ میرا سب سے امیر چاہنے والا... اسے عورت سے زیادہ طوائف بھاتی تھی میرے اندر کی عورت کی کسی کو ضرورت نہیں تھی... اور تم... تمہارا میرا رشتہ ابھی تک طے نہیں ہوا... معلوم نہیں تم مجھے طوائف سمجھتے ہو یا عورت...

میں اسے کیا جواب دیتا مجھے تو خود معلوم نہیں تھا کہ میں عورت کے اندر عورت کی تلاش میں تھا یا میں نے ہر عورت کو ایک

رہا ہے۔ اسی لئے ہی شاید میں دوسروں کے ٹوٹے پندار کو الفاظ کی مرہم سے مندمل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اور میں اس کے پندار کو بھی الفاظ کی گوند سے جوڑنا چاہتا تھا۔

وہ ہنس پڑی... ظہیر... میں اب بہت آسانی سے تمہاری ذات کا تجزیہ کر سکتی ہوں.... تم ایک بڑے فراڈ ہو۔ بڑے دھوکا باز... لیکن فراخ دل... میں خاموش بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا ہم دونوں ایک دوسرے کے آئینے سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے.. وہ کہیں سے ایک شیمپین کی بوتل نکال لائی۔ اور شفاف سنہری شیمپین میری اور اس کی رگوں میں دوڑ کر محرومیوں کے دھندلکے کو گلابی جانفزا روشنی میں بدل رہی تھی جھلملاہٹوں کے پردے تان رہی تھی۔ پھر وہ اُٹھ کر دیوار میں لگے بڑے سے آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی... اس کی آنکھیں سوتج میں ڈوبی اُسے گھور رہی تھیں۔ دیکھو میں ایک عورت ہوں... لیکن تمہاری آنکھیں... تمہاری آنکھیں میرے اندر صرف ایک جسم فروش طوائف کو دیکھ رہی ہیں طوائف جس کی تمہیں ضرورت ہے جس کی ہر مرد کو ضرورت ہے تمہارے الفاظ ایک دھوکا ہیں۔ تم ایک جگلر ہو۔ جو لفظوں کے بدلے اپنے آپ کو بیچتے رہے ہو۔ اور اس وقت بھی تم اپنی قیمت ادا کر رہے ہو... الفاظ کے جھوٹے سکوں سے۔ تمہاری قیمت کیا ہے لذتوں کی ایک ساعت۔ میں بھی ایک طوائف ہوں۔ اور میں تمہاری نوازشوں کا معاوضہ ایک ہی صورت میں چکا سکتی ہوں۔

آؤ... ظہیر... مسٹر ظہیر... میں تمہیں ظہیر خاناں نہیں کہوں گی۔ کیونکہ اس وقت تم سے مجھے اپنے محبوب کے جسم کی بو نہیں آ رہی صرف بدبو آ رہی ہے جسم بیچنے والے جگلر کی طرح۔ لیکن پھر بھی میں تمہیں باہر دھکیل کر نہیں نکالوں گی صبح جب تم میرے ہاتھ کی بنائی ہوئی کافی۔ میرے ٹوسٹر میں سینکے ہوئے ٹوسٹ جام اور مکھن لگا کر کھاؤ گے تو دل ہی دل میں میری معصومیت پہ ہنسو گے اور کہو گے حرافہ سمجھتی تھی میرے جال سے آسانی سے نکل جائے گی"... لیکن تم مجھ سے بھی بڑے حرافہ ہو۔ دلوں کو جگاتے ہو۔ تماشا دیکھتے ہو اور پھر چلے جاتے ہو۔ تعاقب کرتے ہو اور پھر اوجھل ہو جاتے ہو یہ ساری دنیا بھی ایک دھوکا ہے تمہاری طرح"۔

وہ آتشدان کی مدہم ہوتی روشنی کے سامنے جھک گئی۔ اس کی آنکھوں کے آنسو گالوں کو بھگوتے سامنے قالین پر گر رہے تھے۔ اس نے میرے کردار کے لبادے کو کھینچ کر اتار دیا۔ میں برہنہ کھڑا تھا۔ لیکن پھر بھی میرا ذہن کچھ بھی سوچ نہیں رہا تھا۔

وہ کون تھی... میں کون تھا۔ یہ جگہ کہاں تھی.. نشہ میرے حواسوں کو سن کر رہا تھا وہ صرف ایک عورت تھی اور میں مرد۔

مسٹر ظہیر آپ کی تمام نوازشوں کا شکریہ ادا کرنا تو واجب تھا"۔ اس نے مجھے صبح کی مٹیالی روشنی میں خدا حافظ کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔

سرد خاموش گلیوں میں اندھیرا تنا ہوا تھا فلیٹوں کی بند کھڑکیوں سے اندرونی روشنی کی لکیریں کہیں کہیں سیاہی کو قطع کر رہی تھیں۔

چلتے چلتے مجھے لگا جیسے میں ایک سرد سل ہوں جو اپنی ہی ٹھوکروں سے لڑکھڑا کر پاتال میں گرتا جا رہا ہوں۔ میرے دل میں خلا ہی خلا تھا۔ زندگی بھر کی چاہتوں کے رنگ ایک قدم مٹیالے پڑ چکے تھے.... گل جاناں نے ٹھیک کہا تھا... میں تو ایک جگلر تھا۔ ایک مرد طوائف۔

کئی دن تک میں گل جاناں کے سٹور میں نہ گیا لیکن اب جب بھی میں جاتا.... وہ دُور سے مسکراتی... اور پھر کام میں مصروف ہو جاتی اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں ہو رہے تھے.... اس کا سفید گلابی رنگ زرد نظر آتا۔

اور پھر اسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔۔۔ سٹور کیپر نے بتایا تھا کہ ایک دن وہ کام کرتے کرتے بے ہوش ہو گئی تھی۔

ہسپتال کے سفید بستر پر بیٹھی ہوئی وہ بے حد کمزور لگ رہی تھی۔ میں نے پھولوں کا گلدستہ اس کے سرہانے رکھ دیا۔ مجھے اُس سے بات کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ اس نے آنکھوں کی جنبش سے میرا شکریہ ادا کیا۔ جلد ہی میری ملاقات کا وقفہ ختم ہو گیا۔ میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔۔۔ لیکن شائد اب وقت نہیں تھا

"خدا حافظ ظہیر خاناں"۔۔۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔

اور مجھے لگا جیسے میری ہستی کے خلا میں ظہیر خاناں کا نفظ شور پیدا کرتا گردش کر رہا ہو۔ اُسے بھر رہا ہو۔ میں واپس پاکستان آنا تھا لیکن ہسپتال کی انتظامیہ نے ملنے نہ دیا۔ البتہ پھولوں کا گلدستہ اس تک پہنچ گیا ہوگا۔۔۔ وہ کیسی ہو گی۔۔۔۔ اس کی خوبصورت بھوری آنکھوں میں کس یاد کا عکس لرزاں ہو گا۔۔۔ میں ظہیر خاناں۔۔۔ میں جو اس کا محبوب بننے کا حقدار نہیں تھا شاید وہ اپنے دل کے خلا کو بھرنا چاہتی تھی۔۔۔۔ یا وہ سارا بیج تھا جو عورت کے دل میں بھرا ہوتا ہے۔ جس کے سہارے وہ زندہ رہتی ہے۔۔۔۔ لیکن وقت کے تیز قدم اس کی گونج کو مجھ سے پرے دھکیل رہے تھے۔ شاید میں ابھی بھی خود پسند تھا۔۔۔۔ لیکن میں محبت کی چند سچی ساعتوں کے ساتھ اس کے ادھورے خوابوں کی تکمیل کرنا چاہتا تھا۔۔۔ لیکن اب اس سے کوئی بھی مل نہیں سکتا تھا۔ اُسے ایڈز تھا

پاکستان آ کر میں اسے خوبصورت محبت بھرے خط لکھتا رہا میں جانتا تھا وہ جواب نہیں لکھ سکتی۔۔۔ کیا اس نے تمام زندگی مجھے اس جذبے سے نہیں نوازا جس کا میں حقدار نہیں تھا۔۔۔ عورتوں سے ملتے۔ محبتوں کا سوانگ رچاتے۔۔۔۔ فون پر دلوں کا سودا کرتے ایک نفظ میرے کانوں۔ میرے دل میں گونجتا رہتا۔ ظہیر خاناں۔۔۔۔ اور مجھے لگتا۔۔۔۔ جیسے گل جاناں بند گلی کے پار بیٹ سے لگی۔ مجھے دیکھ کر ہنستی جا رہی ہو۔۔۔ اور میں نہ جانے کیونکر اس نفظ کی تکرار میں قید ہو رہا تھا جیسے یہ نفظ بھی بند گلی ہو جس سے آگے کوئی راستہ نہ جاتا ہو جس سے پلٹنے کے لئے کوئی جگہ نہ ہو اور میں نہ جانے کب سے اس نفظ کی بند گلی سے ٹیک لگائے سا کر کھڑا ہوں۔۔۔۔

بکری، شیر اور گھاٹ

منشا یاد

آپ نے دریا پار کرنے کے سلسلے کا وہ معما یا پہیلی ضرور پڑھی سنی ہو گی، جس میں ایک شخص کے پاس ایک شیر، ایک بکری اور گھاس کا ایک گٹھا ہوتا ہے اور اُسے دریا پار کرنا ہوتا ہے مگر کنارے پر ایک چھوٹی سی کشتی ہے جس میں صرف اتنی گنجائش ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک چیز ہمراہ لے کر دریا عبور کر سکتا ہے۔ وہ شیر اور بکری یا بکری اور گھاس کو بھی ایک طرف نہیں چھوڑ سکتا۔

یہ معما بہت پرانا ہے اور معلوم ہوتا ہے اگلے وقتوں میں شیر اور بکری مالک کے بہت وفادار ہوتے تھے، وہ باندھ کر نہیں رکھتا تھا پھر بھی ان کے بھاگ جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا اور وہ کم از کم اس کی موجودگی میں ایک گھاٹ پر پانی پی لیتے تھے۔ شیر بکری کو کھانا ضرور چاہتا تھا مگر لگتا ہے ان دنوں شیر کی آنکھ میں حیا تھی کہ وہ مالک کے سامنے بکری کو چیرتا پھاڑتا نہیں تھا اور بکری بھی اتنی فرماں بردار اور صابر ہوتی تھی کہ اُسے بھوک لگی ہوتی مگر مالک منع کر دیتا تو منع ہو جاتی اور کم از کم اس کی نظروں کے سامنے منہ نہیں مارتی تھی۔

آپ جانتے ہیں کہ اس پہیلی یا معمّے کو حل کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ آدمی سب سے پہلے بکری کو اپنے ساتھ لے جائے اور دوسرے کنارے پر چھوڑ آئے بشرطیکہ وہاں کوئی دوسرا شیر، چیتا یا بھیڑیا پہلے سے گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ اس طرح پہلے کنارے پر شیر اور گھاس کا گٹھا رہ جائیں گے۔ ظاہر ہے شیر خواہ کتنا ہی بھوکا کیوں نہ ہو گھاس نہیں کھا سکتا۔ گھاس بری چیز نہیں ہے ہم میں سے زیادہ تر لوگ گھاس پھونس کھا کر ہی زندگی گزارتے ہیں مگر آپ جانتے ہیں کہ شیر ایسا نہیں کر سکتا۔ اُسے معلوم ہے کہ جس روز اس نے گھاس کھا لی وہ دھاڑنا بھول جائے گا اور صرف ہنہنا کر رہ جائے گا۔ بہر حال جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ معمّا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ البتہ اس میں شیر، بکری اور گھاس کو حفاظت سے دوسرے کنارے پر لے جانے کے لیے سات مرتبہ دریا پار کرنا پڑتا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ سات چکر کچھ زیادہ ہوتے ہیں، اصل مسئلہ تو حفاظت سے پار اُترنے کا ہوتا ہے۔ سو یعقوب علی عرف توبا بھی حفاظت سے دریا پار کرنا چاہتا ہے مگر پڑھا لکھا نہ ہونے کی وجہ سے ترکیب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔

یوں توبے کا مسئلہ شیر، بکری اور گھاس والے معمّے سے ذرا مختلف بھی ہے اس کے پاس گھاس بہت ہے مگر اُسے یہ گھاس کہیں لے جانی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی بکریاں گھاس کھا سکتی ہیں۔ اس کے پاس دو بکریاں ہیں اور شیر اس نے چڑیا گھر میں دیکھا ہے۔ لیکن اسے ایک اَن دیکھے شیر کا خوف ضرور پریشان کرتا رہتا ہے جو اس کے خیال میں پہیلی والے پالتو شیر جیسا اصیل نہیں ہے۔ کہیں آس پاس کھلا پھرتا ہے یا گھات لگائے بیٹھا ہے کہ اِدھر اُس کی آنکھ

لگے اور ادھر وہ کسی ایک بکری پر جھپٹے۔ صرف ایک بکری پر اس لیے کہ شیر خواہ کتنا ہی خونخوار اور وحشی ہو ایک وقت میں دو بکریوں کو قابو نہیں کر سکتا۔ دونوں پہیلیوں میں ایک فرق یہ ہے کہ توتے کی بکریوں کو جن کے نام شبداں اور مہراں ہیں۔ ایک دوسری سے اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں، جیسا شیر، بکری اور گھاس والے شخص کو درپیش تھا کہ گھاس لے کر جاتا ہے تو پیچھے شیر بکری کو کھا جاتا ہے اور شیر کو ہمراہ لے جاتا ہے تو بکری گھاس چٹ کر جاتی ہے۔ بلکہ توتے کی بکریاں تو ایک دوسرے کی رکھوالی کرتی رہتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بات کی شکایت اس تک پہنچاتی ہیں اور یوں ان دونوں کی نگرانی خود بخود ہو رہی ہے۔ وہ انھیں ایک دوسری کے حوالے کر کے سارا دن مزدوری کرنے چلا جاتا ہے اور اُسے کسی قسم کی فکر نہیں ہوتی۔

یُوں بظاہر توتے کو کوئی دریا بھی پار نہیں کرنا ہے سوائے زندگی کے اس دریا کے جو ہر زندہ شخص کو خواہ وہ کسی بھی وجہ سے دنیا میں آگیا ہو درپیش ہوتا ہے اور جسے بعض لوگ تو موٹر بوٹ یا سٹیمر میں بیٹھ کر عبور کر لیتے ہیں مگر بعض چپو چلا چلا کر ہلکان ہوتے رہتے ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ دریا مشکیزوں اور گھڑوں کے ذریعے پار کرنا پڑتا ہے۔ ہاں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں پکے گھڑے بھی میسر نہیں آتے۔ مگر ان کا پار جانا ضروری ہو تو وہ کچے گھڑوں پر بھی ٹھل پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کچے گھڑے دریا میں تھوڑی دُور جا کر گھُر جاتے ہیں تاہم ان کے جذبوں کی صداقت اور وفا کبھی نہیں گھُرتی اور زیادہ پختہ ہو جاتی ہے۔ خُوشبُو بن کر دُور دُور تک پھیل جاتی ہے۔ صدیوں پر محیط ہو جاتی ہے۔ دریا تو کیا — توتے کو تو وہ گندا نالہ بھی پار کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی، جس کے کنارے وہ کئی برسوں سے رہ رہا ہے اور اگر کبھی اسے یہ نالہ پار کرنا پڑ جائے تو اُسے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس نالے پر کئی جگہ سیمنٹ کنکریٹ کی سلوں کے فٹ بُرج سے بنے ہوئے ہیں اور پھر عام دنوں میں وہ زیادہ چوڑا اور گہرا نہیں ہوتا — نہ ہی اس کی رفتار تیز ہوتی ہے، وہ شہر کے ایک تہائی حصے کی گندگی اور تعفن سمیٹے چُپ چاپ اپنے پختہ کناروں کے اندر نظر نہ آنے والی رفتار سے بہتا رہتا ہے۔ صرف برسات کے دنوں میں اس میں طغیانی آتی ہے اور وہ اس بہانے قریبی گلیوں اور مکانوں میں جھانک آتا ہے۔

عام دنوں میں اس کے دونوں کناروں پر بھینسیں بندھی رہتی ہیں، کیچڑ اور گوبر کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ اطراف کی دیواریں اُپلوں سے اَٹی رہتی ہیں، مکھیوں اور مچھروں کی بھرمار رہتی ہے اور بدبُو کے بھبھوکے اُٹھتے رہتے ہیں مگر یہ گندا نالہ شروع سے گندا نالہ نہیں تھا۔ گندگی اور غلاظت تو اس میں بعد میں پھینکی جانے لگی۔ اور اسے گندا کر دیا گیا۔ اس میں سیوریج کے پائپ اور گندی موریاں ملا دی گئیں۔ اور چھتوں سے گندگی لے کر اُترنے والے پرنالے اِس میں ڈال دیے گئے اور اگر دیکھا جائے تو گندی نالیاں اور پرنالے بھی خود گندے کہاں ہوتے ہیں انھیں گندا کر دیا جاتا ہے۔ جب پہلے پہل نالی بنائی، پائپ بچھایا اور پرنالے کو پورٹ لینڈ سیمنٹ اور دریا کی ریت سے پلستر کر کے گرمالگایا جاتا ہے تو وہ کتنا پاک صاف اور شفاف ہوتا ہے۔ گندگی تو ان سب پر اُوپر سے تھوپی جاتی ہے۔ سو یہ گندا نالہ بھی کبھی اچھا نالہ رہا ہوگا، پہاڑوں، جنگلوں اور کھیتوں سے برساتی پانی لے کر بڑے نالے میں پہنچاتا ہوگا۔ مگر اب یہ اَن گنت مکانوں، نالیوں اور گٹروں کی غلاظت سمیٹے زیرِ زمین

چلتا رہتا ہے اور اس کے اُوپر چلنے پھرنے والوں کو احساس تک نہیں ہوتا کہ ان کے پاؤں کے نیچے کیسی کیسی خوفناک مخلوق اور کیا کیا غلاظتیں بہتی چلی جا رہی ہیں۔ پھر اس جگہ سے جہاں توبا اس کے کنارے ایک تنگ سی گلی میں رہتا ہے۔ یہ نالہ اچانک ایک پُل کے نیچے سے نمودار ہو جاتا ہے اور ایک پختہ اوپن ڈرین کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ توبا ایک عرصے سے گندے نالے کے کنارے رہتا ہے۔ مگر وہ گندگی اور بدبُو سے ابھی تک سمجھوتہ نہیں کر پایا۔ وہ نالے کی طرف بہت کم جاتا ہے اور جب بھی اس کا ادھر سے گزر ہوتا ہے اُسے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ گندے پانی میں کوئی پتھر نہ پھینک دے۔ اگر کبھی کوئی چھینٹا اس پر آن پڑے تو ناپاکی کا احساس اس کے ذہن سے کئی روز تک چپکا رہتا ہے۔ وہ عموماً سڑک کی طرف سے آتا اور اسی طرف سے کام پر جاتا ہے۔ اس کی گلی پُل سے کچھ فاصلے پر پکّی سڑک سے شروع ہوتی ہے پھر بل کھاتی ہوئی جلد ہی نالے میں اُتر جاتی ہے جہاں لوگوں نے کوڑا پھینک پھینک کر ڈھلوان سی بنا دی ہے جو گزرنے والوں کے لیے سیڑھی کا کام دیتی ہے۔ نالے کے آس پاس رہنے والوں کے لیے یہ گلی ایک شارٹ کٹ کا کام دیتی ہے اور اگرچہ یہ نہایت ہی تنگ سی گلی ہے اور اس میں گنتی کے چند ایک دروازے بھی کھلتے ہیں، مگر اس کے عین وسط میں ایک موڑ سا ہے جہاں تھوڑی سی کشادہ جگہ ہے۔ اور اس طرح وہاں ایک جھونپڑی کی گنجائش نکل آئی ہے۔ مگر چونکہ گزرنے والوں کے لیے تین چار فٹ چوڑا راستہ چھوڑنا ضروری ہے اس لیے جھونپڑی دو غیر مساوی حصّوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک طرف دو چارپائیوں کے برابر مثلث نما ٹکڑا ہے اور دوسری طرف ایک چارپائی کی جگہ مثلث نما حصّے پر کڑیوں کی پھٹیوں، ٹین کی چادروں اور گھاس پھونس کی مدد سے چھت ڈال دی گئی ہے مگر گلی کے اس پار ایک چارپائی والے حصّے کی چھت کا کام قریبی مکان کا چھجّا دیتا ہے۔ تین سے زیادہ چارپائیوں کی نہ وہاں گنجائش ہے اور نہ ہی چوتھی چارپائی کی انھیں ضرورت ہے۔ یہ تین چارپائیاں بھی گرمیوں میں صرف رات کو بچھائی جاتی ہیں اور شاید رات کو بھی وہ چارپائیاں کبھی نہ بچھاتے، اگر نالہ اس قدر گندا اور قریب نہ ہوتا۔ اب وہاں رات کو اکثر سانپ سرسراتے، بچھو رینگتے، مینڈک پھدکتے، چوہے دوڑتے اور چھچھوندریں چیختی پھرتی ہیں۔ سانپ کے بارے میں انھیں بھی خوش فہمی ہے کہ اُسے چارپائی پر چڑھنے اور ڈسنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگرچہ بعض سانپ نافرمان بھی ہو سکتے ہیں مگر خوش فہمیاں بعض اوقات زندگی کو کتنا آسان بنا دیتی ہیں۔

وہ تین ہی ہیں۔ ایک توبا اور دو اُس کی بکریاں۔ شیداں اور مہراں۔ وہ شیداں کو اپنے قریب سُلانا چاہتا ہے۔ اور مہراں کو فاصلے پر۔ ہاں سردیوں میں سانپ بچھو کا ڈر کم ہو جاتا ہے تو وہ تینوں مثلث نما حصّے میں صف بچھا کر اور گدّے ڈال کر زمین پر سو جاتے ہیں۔ درمیان میں شیداں سوتی ہے۔ پھر بھی اُسے خوف رہتا ہے۔ کہیں سوتے میں اس کا ہاتھ شیداں کی بجائے مہراں سے نہ چھُو جائے۔

مہراں اس سے آٹھ برس چھوٹی ہے اور پچھلے آٹھ دس برسوں سے جوان چلی آتی ہے۔ اس کے بر ملتا ہے نہ وہ بوڑھی ہو چکی ہے۔ سویا اور مرا ہوا آدمی ایک برابر ہوتا ہے۔ اُسے ہر صبح جاگ کر دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے لحاف میں ہے یا نہیں کئی بار شیداں منہ اندھیرے درمیان میں سے اُٹھ کر رفع حاجت کے لیے نالے کی طرف چلی جاتی ہے تو

مہراں سوتے میں کروٹ بدل کر شیداں کے بستر پر آجاتی ہے۔ دو ایک بار وہ اسے شیداں سمجھ کر چھو بیٹھا تھا۔ اس کے بعد وہ شیداں سے بھی بدکنے لگ گیا ہے۔ اور جب کبھی کھلے موسم میں مہراں اپنی چارپائی پر علیحدہ سو رہی ہوتی ہے اس وقت بھی وہ شیداں سے پوچھ لینا ضروری سمجھتا ہے۔

"تم شیداں ہی ہونا؟"

کچھ عرصہ سے اُسے مہراں کے بارے میں اُلٹی سیدھی رپورٹیں مل رہی ہیں وہ خود بھی محسوس کرتا ہے کہ وہ تھکی تھکی، اکتائی اکتائی اور بپھری بپھری سی نظر آتی ہے۔ پہلے وہ شیداں سے ڈرتی تھی اور اس کے سامنے تو دم نہیں مارتی تھی مگر اب بہت سی باتیں سُنی ان سنی کر دیتی ہے۔ یُوں لگتا ہے جیسے کسی روز بیٹھے بٹھائے قہقہے لگانے لگے گی۔ پھر کپڑے پھاڑ کر دوڑتی ہوئی گندے نالے کی ڈھلوان اُتر جائے گی۔ گھر کے اندر سے طرح طرح کے لوگ گزرتے ہیں۔ وہ ہر راہگیر کو یُوں دیکھتی ہے جیسے مُدت بعد کسی آدم زاد کی صورت دیکھ رہی ہو۔ بعض اوقات اُسے ڈر لگتا ہے۔ وہ گلی میں سے گزرنے والے کسی کمزور یا اکّا دُکّا آدمی پر حملہ نہ کر دے۔

شیداں اس کے استفسار پر ہوں ہاں کرتی ہے تو بھی اس کی تسلی نہیں ہوتی۔ وہ دوبارہ پوچھتا ہے تو وہ کبھی جل کر اور کبھی ہنس کر سرگوشیوں میں جواب دیتی ہے۔

"ہاں میں شیداں ہی ہوں تیری زنانی۔"

اس کے باوجود اسے بلا وجہ بُرے بُرے خیالات ستاتے رہتے ہیں جن دنوں وہ بھٹّے پر کام کرتا تھا۔ دوپہر کو منشی اللہ جوایا ان سب کو کتاب سے پڑھ کر پنڈت کوکا کے کارنامے اور نازیوں کے چلتر سُنایا کرتا تھا۔ جن کو سُن کر اس کا دماغ اُلٹ گیا تھا۔ اگلے روز وہ پلستر کے لیے مسالہ بناتے یا گونک اینٹیں اُٹھا کر لے جاتے ہوئے پریشان ہو ہو کر سوچا رہتا ہے کہ کیا سچ مچ وہ شیداں ہی تھی؟

گرمیوں میں وہ درمیان والی چارپائی پر سوتا ہے۔ مہراں کی چارپائی ایک چارپائی کے برابر راستہ چھوڑ کر بچھی ہوتی ہے مگر اُسے یہ فاصلہ دریا کے پاٹ کے برابر لگتا ہے اور جب آدمی خود ایک کنارے پر ہو تو اُسے کیا پتہ چلتا ہے کہ دوسرے کنارے پر بکری کس حال میں ہے۔ وہ رات بھر جاگتا اور بدک بدک کر اُٹھ بیٹھتا ہے اور چارپائی کے برابر چھوڑی ہوئی جگہ کو ہاتھ سے ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا ہے کہ کہیں کوئی چوتھی چارپائی تو آپ ہی آپ وہاں نہیں بچھ گئی۔ جُونہی کسی کے قدموں کی آہٹ سُنائی دیتی ہے اُسے لگتا ہے ابھی کوئی آدم خور حملہ کر دے گا اور اس کے منع کرتے کرتے اور ہتھیار سنبھالتے سنبھلتے بکری کو بھنبھوڑ کر جنگل کی راہ لے گا۔

مہراں کا رنگ گندمی اور شکل و صورت نہایت معمولی ہے مگر اس کا میلا کچیلا اور بدبودار لباس بھی اُس کے مُنہ زور بدن کی خوشبو کو نہیں چھپا سکتا۔ وہ دن بھر اُپلے تھاپتی، نالیاں صاف کرتی اور کیچڑ میں لت پت رہتی ہے اور اس کے پاس سے بساند سی آتی ہے۔ بشرطیکہ آدمی گندے نالے کی طرف ہو کر نہ آیا ہو یا وہاں کا رہنے والا نہ ہو — پھر بھی وہ سوچتا

ہے کہ جس معاشرے میں جوان لڑکیوں کی بے حرمتی کا اُن کے مرنے کے بعد بھی خطرہ ہو وہاں بد بُو کا حصار کہاں تک تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔ خصوصاً جب ایک جوان غیر شادی شدہ اور بولائی ہوئی عورت عین گلی کے اندر بے سُدھ ہو کر سوتی ہو اور جہاں سے طرح طرح کے بھیڑیے آدمیوں کا گزر ہوتا ہو۔ بھیڑیا شکار کو ہڑپ نہ بھی کر سکے اسے زخمی اور لہولہان تو کر سکتا ہے۔ پنجہ مار کر نہ مٹنے والے نیل اور داغ تو ڈال سکتا ہے۔ پھر اس آبادی کے اکثر اوباش لڑکوں کے ہاتھ ان کے قابو میں نہیں ہیں۔

وہ بے حد تھکا ماندہ ہوتا ہے، اُسے سخت نیند آ رہی ہوتی ہے مگر کسی کے تیز یا آہستہ قدموں کی چاپ اس کی نیند اُ دیتی ہے۔ راہگیر عموماً دونوں جانب بچھی چارپائیوں سے بچنے کے لیے رفتار آہستہ کر لیتے یا لمحہ بھر کے لیے رُک جاتے ہیں تو اس کی بند ہوتی آنکھیں چوپٹ کھُل جاتی ہیں۔ پھر بدقسمتی سے دو ایک سینما ہاؤس قریب ہی واقع ہیں اور اس آبادی کے لفنگوں کو آخری شو دیکھنے کی عادت اور شوق ہے۔ چنانچہ رات بھر آہٹیں آتی جاتی رہتی ہیں اور وہ رات کے پھیلے ہوئے دریا میں ہاتھ پاؤں مار مار کر نڈھال ہوتا رہتا ہے۔

ایک بار شیداں کو پتہ نہیں کیا سُوجھی۔ اُس نے گلی کے مثلث نما حصّے اور گلی کے درمیان ایک موٹا سا پردہ لٹکا دیا، پہلے تو اُسے عجیب راحت آمیز تخلیے کا احساس ہوا مگر جب مٹی کے تیل کا دیا بُجھا اور رات کا اندھیرا پھیلا تو اُسے لگا مہراں ا دُور جا پڑی ہے۔ جیسے اس کے اور مہراں کے درمیان گھنا تاریک جنگل اُگ آیا ہو، اگر شیر، چیتا یا بھیڑیا حملہ کر دے، کوئی نافرمان سانپ چارپائی پر چڑھ آئے تو اس کی کراہ تک سُنائی نہ دے۔ اس نے شیداں کو پردہ ہٹا دینے کا مشور دیا۔ مگر بعض خنک اور چاندنی راتوں میں اس کا خود جی چاہتا ہے وہ پردہ اور موٹا اور گہرا ہو جائے پختہ دیوار میں تبدیل ہو جائے

اس نے کئی بار سوچا ہے کہ ان دونوں کو ایک طرف چھوڑ کر خود گلی کے ایک چارپائی والے حصّے میں سونا شروع کر دے مگر ا ے کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا، گزرنے والوں کے لیے گلی کے اِس یا اُس پار ایک جتنا فاصلہ ہے۔ ہاں اگر مہراں مثلث حصّے کی دیوار کے ساتھ سونا شروع کر دے تو دوسری بات ہے مگر اس طرح شیداں کو درمیان والی چارپائی پر سونا پڑے گا او وہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر شیداں کے بدن سے ہَوا کا جھونکا بھی چھو جائے تو وہ بپھر جاتا ہے۔

شیداں کی رنگت اگرچہ کالی ہے مگر اُس کے چہرے کے خدوخال دلکش اور اُس کا جسم نہایت بھرا بھرا، گداز او متناسب ہے اس نے جب اُسے اس کی ماں کی کُٹیا میں پہلی بار دیکھا تھا وہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ وہ اُسے دیکھ کر شش رہ گیا تھا ــــ وہ دن بھر سڑکوں اور بازاروں میں اُجلی، گوری اور گلابی عورتوں کو دیکھتا تھا، مگر اس نے اتنی کالی حسی عورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ آٹا گوندھ رہی تھی اور کسی پہلی توَن سے بچا کر رکھے ہوئے دو پیڑے یُوں تھرک رہے جیسے پارے میں گندھے ہوئے ہوں۔ اس کی آنکھیں چمک دار اور سیاہ تھیں۔ بنانے والے کو تو پتہ ہی تھا کہ اُسے کا میسر نہیں ہو گا۔ شاید اسی خیال سے اس نے ہمیشہ چمکتے رہنے والا قدرتی کاجل اس کی آنکھوں میں بھر دیا تھا۔

اُسے یہ سوچ کر اکثر ہول آتا ہے کہ اگر کسی نے آتے جاتے اندھیرے یا اُجالے میں دل لگی یا شرارت کے خیال سے اُسے چھو لیا تو ــــ یقیناً وہ اس صدمے سے جانبر نہیں ہو سکے گا۔

ایک بار شیداں نے ایک نہایت مفید مشورہ دیا کہ مہراں کو کسی کوٹھی میں نوکر کرا دیا جائے جہاں وہ مزے سے پچھے سرونٹ کوارٹر میں رہے گی، اچھا کھائے اور پہنے گی، مگر ہر غریب آدمی کی طرح توبے کی حمیت کی رگ بھی بہت پھڑکتی ہے۔ اس نے اس قیمتی مشورہ پر عمل نہ کیا ورنہ اُسے آئے دن چار پائیوں کی ترتیب بدل بدل کر اپنی الجھن کا حل تلاش نہ کرنا پڑتا۔ اب ــــ کبھی شیداں درمیان والی چار پائی پر سوتی ہے کبھی مہراں اور کبھی وہ خود ــــ مگر مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ پچھلے دنوں انھوں نے شیداں کے ایک اور مشورے پر عمل کرنا چاہا جس کے مطابق چار پائیوں کو رُخ بدل کر بچھایا جا سکتا تھا مگر اس سے ایک تو پائنتیاں مغرب کی طرف ہو جاتی تھیں دوسرے مہراں نظروں سے مزید اوجھل ہو جاتی تھی۔

سو توبا بڑی مشکل میں ہے۔ یُوں سمجھیے اس کے پاس دو بکریاں ہیں اور ایک ان دیکھے شیر کا خوف ــــ جو کھلا پھرتا ہے اور جس کی آنکھ میں حیا نام کو نہیں ہے ــــ توبا دریا پار کرنا چاہتا ہے مگر حفاظت کے ساتھ ــــ کہ اِسے ہر زندہ شخص کی طرح اس کا سامنا ہے۔ وہ کشتی میں صرف ایک بکری کو سوار کر سکتا ہے اور اب تو آپ اس بکری کے نام سے بھی واقف ہو چکے ہیں۔ وہ دوسری بکری کو دوسرے کنارے پر اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا کہ اُس کے شیر کے لقمہ تر بن جانے کا خدشہ ہے۔ توبا پڑھا لکھا آدمی نہیں ہے، اس لیے اُس نے یہ معما حل کرنے کے لیے ہم سب سے مدد مانگی ہے۔ میں بھی غور کرتا ہوں، آپ بھی سوچیں اور اگر کوئی مناسب حل ذہن میں آ جائے تو توبے کو براہِ راست خط کے ذریعے کسی بھی شہر کے گندے نالے کی معرفت بھیج دیں ــــ اسے خط مل جائے گا۔

صراطِ مستقیم

عرفان علی شاد

روشنی جو کچھ کر رہی تھی، ضرورت کے تحت کر رہی تھی اور چونکہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، اس لیے اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے اس نے بہت سی محبتیں ایجاد کر لی تھیں۔ یہ کام اُس جیسی جوان اور خوبصو لڑکی کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ شروع شروع اُسے کچھ مشکلات ضرور ہوئیں، مگر رفتہ رفتہ وہ زمانے تقاضوں کو سمجھ گئی اور سارے داؤ پیچ سیکھ گئی —— اب وہ ایک کہنہ مشق کاریگر کی طرح محبتیں تراشتی تھی اب وہ آگے آگے تھی اور پیچھے پیچھے اس کی محبتیں پالتو جانوروں کی طرح دُم ہلاتی چل رہی تھیں۔ سب محبتوں کی ناک میں نکیل تھی۔ سب اس کی غلام تھیں اور سب کی ڈوری ایک ہی ہاتھ میں تھی —— اس کے اپنے ہاتھ میں۔ یہ ہا جتنے مضبوط آج تھے اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔ وہ مُڑ کر ان محبتوں کی طرف دیکھتی تو فتح مندی کے احساس سرشار ہو جاتی۔ اسے یُوں لگتا جیسے وہ ایک تالی بجائے گی کہ ساری کی ساری محبتیں ہاتھ باندھے اس کے سا آن کھڑی ہوں گی۔ پھر وہ کسی ملکہ کی طرح حکم چلائے گی اور جس محبت کو جس انجام تک پہنچانا چاہے گی، پہنچا دے چاہے وہ پاتال کی آخری گہرائی ہی کیوں نہ ہو!

دفتر میں اس کی میز بالکل کھڑکی کے برابر تھی۔ ٹائپ کرتے کرتے جب اس کی انگلیاں تھک جاتیں کرسی کی پُشت سے ٹیک لگا کر سگریٹ سلگا لیتی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی۔ آٹھویں فلور سے جب وہ سڑک پر چلتی ہوئی ٹریفک کو دیکھتی تو یہ سارے کا سارا ہجوم اسے کیڑے مکوڑوں کی طرح دکھائی دیتا۔ وہ سوچتی خ بہت اُوپر ہے، ساتویں آسمان پر، وہ جب اتنی بلندی سے اس دھرتی کو دیکھتا ہوگا تو اُسے ہم کیا نظر آتے ہ —— محض رینگتے ہوئے کیڑے۔ اپنا اپنا رزق تلاش کرتے ہوئے، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دو بوکھلائے اور گھبرائے ہوئے کیڑے جو اپنی اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے طرح طرح کی ایجادات کے تع میں ہیں اور ضرورتیں ہیں کہ اس ہوشربا مہنگائی میں پُورا ہونے نہیں دیتیں۔ سب کی چادر چھوٹی ہے۔ سر ڈھا تو پاؤں باہر نکل جاتے ہیں اور پاؤں ڈھانپتے ہیں تو سر ننگا ہو جاتا ہے۔ کیسی ننگی ضرورتیں ہیں آج کے انسا —— کسی طرح دار طوائف کی طرح کہ جو گرفت میں نہیں آتی، ہاتھ میں آ آ کر پھسل جاتی ہے اور پھر دور کھ مسکراتی ہے۔

تین سال پہلے جب وہ اس شہر میں آئی تھی تو بالکل گئو تھی، سیدھی سادی، ہر کھوٹ کپٹ ۔

اسی لیے جب وہ اس بڑے شہر کے طور طریقے دیکھتی، لوگوں کے رویے دیکھتی، ملمّع کی ہوئی کاروباری مسکراہٹوں اور جھوٹی خوشامدوں کو دیکھتی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ جاتیں۔ کتنی باتیں تھیں، کتنے چہرے تھے —— مگر ان میں کوئی چہرہ بھی ایسا نہیں تھا جس کا اعتبار کیا جا سکے جسے اپنا کہا جا سکے، جس کے سامنے اپنے دل کے سارے دکھ سکھ کہے جا سکیں اور جسے دل میں بٹھایا جا سکے۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس راز کو پا گئی کہ بڑے شہروں میں ایسے چہرے بہت کم ہوتے ہیں، اور ہوتے بھی ہیں تو گمنام ہوتے ہیں، کونوں کھدروں میں منہ چھپائے پڑے رہتے ہیں اور اتفاق سے اگر وہ سامنے آجائیں تو پبلک ڈنڈے لے کر ان کے پیچھے دوڑ پڑتی ہے اور وہ سرپٹ بھاگنے لگتے ہیں۔ آج کی دُنیا میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے —— اس لیے اے چھوٹے سے قصبے کی نادان لڑکی روشی! تجھے جینا ہے تو اپنی سوچ کے ڈھنگ بدلنے ہوں گے، تو ذرا سانولی ہے تو کیا ہے تیرے نقش تو تیکھے ہیں تجھے اس سیدھی سادی لمبی چوٹی کو کٹوا کر اپنی زلفوں کو شانوں پر پھیلانا ہوگا۔ بلاؤز کو اونچا اور چُست کرنا پڑے گا۔ بھنوؤں کی تھریڈنگ کروا کر ان کے گھماؤ کو خنجر کی دھار کی طرح تیکھا اور تیز کرنا پڑے گا، پلکوں کو یُوں جھکانا ہوگا مسکراہٹ کو کمرشل بنانا ہوگا، زندگی سے ہر لطیف جذبے کو نکال کر باہر پھینکنا ہوگا اور ہاتھ میں صرف ایک ترازو پکڑنا ہوگی اور جب جب موقع ملے گا، ڈنڈی مارنی ہوگی تاکہ تو ایک کامیاب تاجر بن سکے، کیونکہ دُنیا انہی لوگوں کے قدم چُومتی ہے جو تجارت کرنا جانتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اسے جینے کے انداز آتے گئے —— اور آج وہ اس شہر کی ایک کامیاب تاجر تھی، آج وہ کسی چھوٹے سے قصبے کی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی نہیں تھی جس کے لیے یہ چیختا چنگھاڑتا شہر کبھی اجنبی تھا، خطرات سے پُر تھا اور جہاں وہ ہر رات اکیلے میں ڈرا کرتی تھی۔ پرانی روشی کہیں کھو گئی تھی اب نئی روشی تھی، نئی زندگی تھی، وہ اس شہر کا ایک پُرزہ تھی اور شہر کی مشین میں بڑی کامیابی سے چل رہی تھی!

دفتر کا وقت بہت دیر پہلے ختم ہو چکا تھا۔ چند ایک کے سوا سب ہی لوگ جا چکے تھے۔ روشی نے خالی میزوں کو دیکھا تو اسے سناٹے کا احساس ہوا، اُسے ایسا لگا جیسے وُہ بھی انہی خالی میزوں کی طرح اکیلی ہے، ویران ہے۔ بہت دیر تک وُہ کھڑکی میں کھڑی نیچے دیکھتی رہی اور سگریٹ کے کش لیتی رہی، کھڑکی کے شیشے سے ٹکرا کر دُھواں اُوپر اٹھتا رہا —— سورج غروب ہو چکا تھا، اندھیرا دھیرے دھیرے روشنی کو نگل رہا تھا۔ سڑک پر دُودھیا ٹیوب لائٹس روشن ہو چکی تھیں اور ٹریفک اُسی طرح رواں دواں تھی۔ سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھا کر اس نے گھڑی دیکھی۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب اسے چلنا چاہیے۔ باتھ رُوم جا کر اس نے مُنہ دھویا، بال ٹھیک کئے اور کندھے پر پرس لٹکائے وہ لفٹ سے نیچے اُتر کر دفتر سے باہر نکل آئی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر اس نے پرس سے ڈائری نکالی اور آج کی APPOINTMENTS کو دیکھنے لگی۔ ڈرائیور نے میٹر ڈاؤن کر کے گاڑی کو گیئر میں ڈالتے ہوئے پُوچھا:

"کدھر جانے کا ہے میم صاحب؟"

"پارلے ہوٹل!"

اس نے ڈائری بند کر کے پرس میں ڈال دی۔

سگریٹ سُلگاتے ہوئے اُس نے سوچا آج پھر بور کرے گا کم بخت! —— چلو بُھگت لوں گی۔ کم از کم آج تو بھگتنا ہی پڑے گا کیونکہ کل ہی اس نے میرے بینک اکاؤنٹ میں موٹی رقم جمع کروائی ہے۔ بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر گاڑی کی سیٹ سے ٹیک دیا۔ شیشے کُھلے تھے، ٹھنڈی ہواؤں کے بھیگے بھیگے جھونکے اس کے چہرے پر تھپکیاں دینے لگے اور سگریٹ اس کی نازک انگلیوں میں سُلگتا ہی رہ گیا!

پارلے ہوٹل کی مدھم روشنیوں میں نامدار کونے کی میز پر خالی جام کی طرح بیٹھا تھا۔ روشنی شیشے کا دروا کھول کر تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگی۔ نامدار نے اُسے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی، بالک ایسا لگا جیسے یسوع کی ٹھوکر سے کوئی مُردہ جی اُٹھا ہو۔

روشنی نے کہا: "ہیلو!"

نامدار نے کچھ نہیں کہا۔ چہرہ اُٹھا کر روشنی کو دیکھتے ہوئے وہ جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ اس نے کہیں غل نشانہ تو نہیں لگایا۔ چڑیا پھنسے گی یا دانہ کھا کر پھر سے اُڑ جائے گی؟

روشنی بولی —— "کیا سوچ رہے ہو؟"

"تم بہت بور کرتی ہو، ایک گھنٹے سے اکیلا بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"ساری ڈارلنگ! دراصل آفس میں کام بہت ہے۔"

حالانکہ کوئی کام نہیں تھا۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی، اور اس طرح بول رہی تھی کہ وہ بالکل سچ لگ رہا ت —— نامدار کو بھی اور خود اُسے بھی ——!

اور یہی جھوٹ اب اس کی زندگی کا سب سے بڑا سچ بن چکا تھا۔ ضرورت پڑنے پر تو لوگ گدھے باپ بنا لیتے ہیں، اُس نے تو صرف جھوٹ کو سچ بنایا تھا۔ اس میں کون سا پاپ ہے۔ دنیا کا کاروبار اسی طر چلتا ہے۔ چار پیگ پینے کے بعد اس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ آسمان میں اُڑ رہی ہو۔ اُس کا چہرہ سُر ہو رہا تھا اور سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی، ایک آگ سی اس کے پورے جسم میں رینگ رہی تھی، سر چکرا رہا لیکن نامدار کو دیکھ دیکھ کر وہ پھر بھی مسکرا رہی تھی۔ نامدار سمجھا شراب اثر کر گئی۔ اُس نے روشنی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: "روشنی! آج رات تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔" لیکن وہ بھی اناڑی تو تھی نہیں، پ کھلاڑی تھی۔ اس لیے بڑی خوب صورتی سے طرح دے گئی اور کچھ ایسی باتیں کیں کہ نامدار نے ایک ہزار کے نوٹ زبردستی اس کے پرس میں ڈال دیئے —— اونچی ایڑی کے سینڈل کے ساتھ وہ ہوٹل کے چکنے

فرش پر مشکل سے چل رہی تھی لیکن ایک بار بھی اس کا پاؤں نہیں پھسلا۔ نامدار نے سوچا کبھی نہ کبھی تو اس کا پاؤں ضرور پھسلے گا اور یہ خود بخود میری باہوں میں آ جائے گی ——— ہر شکاری شکار کھیلتے ہوئے یہی سوچتا ہے ک شکار ضرور پھنسے گا لیکن کبھی کبھی شکار اتنا ہوشیار اور چوکنا ہوتا ہے کہ دانہ و دام پڑے رہ جاتے ہیں اور شکار صاف نکل جاتا ہے۔ نامدار کو ابھی تک ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے وہ روشی کے معاملے میں بھی بہت پُر اُمید تھ ہوٹل سے باہر نکل کر اس نے روشی کو ٹیکسی میں بٹھا دیا، ٹیکسی چلی گئی تو اس نے سگریٹ سُلگا لیا اور پھر کار میں بیٹھ کر شہر کی سڑکوں میں گم ہو گیا۔

روشی نے سبحانی سے کہا: "میں چار پیگ پہلے ہی پی چکی ہوں۔ اب پیوں گی تو چڑھ جائے گی۔ اس لیے تم پیو اور میں تمہیں دیکھتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے پرس سے آئینہ نکالا اور اپنی لپ سٹک ٹھیک کرنے لگی۔ سُبحانی اُسے دیکھ کر مُسکرایا، وہ بھی مُسکرائی اور سبحانی نے اپنی انگلیوں میں بلوریں پیالے کو نچاتے ہوئے کہا: "آج کی شام اس اکیلے جام کے نام!"

"کبھی کبھی جام کو اکیلے بھی چلنا چاہیے۔"

"تم تو فلاسفر ہوتی جا رہی ہو۔"

"فلاسفر کوئی آسمان سے تو نہیں اُترتے، ہر شخص جو زندگی اور اس کے تقاضوں کو سمجھتا ہے فلاسفر ہے" روشی نے ہونٹوں میں دبے سگریٹ کو سلگاتے ہُوئے کہا

"تو پھر تم میرے تقاضوں کو کب سمجھو گی؟"

"جب وقت آئے گا تو تمہارا تقاضا بھی پورا کر دوں گی ڈارلنگ!"

"لیکن کب ——— کب؟" سبحانی چیخ پڑا

"بہت جلد!"

سبحانی بولا: "ہمیشہ یہی کہتی ہو، ایک مدت گزر گئی ہے اسی طرح، روز ملتی ہو پھر بھی لگتا ہے جیسے کبھی نہیں ملتی ہو، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ تم رہتی کہاں ہو!"

روشی نے زور سے ہنستے ہوئے کہا: "بڑی جلدی دل چھوٹا کر لیتے ہو، سب باتوں کا پتا ایک دم نہیں چلتا، اس کے لیے وقت درکار ہوتا ہے!"

"مگر اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا، ایک رات ہی تو مانگی ہے تم سے، دے دو نا!" سبحانی بچوں کی طرح ضد کرنے لگا۔

"لگتا ہے تمہیں چڑھ رہی ہے۔"

سبحانی روشنی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا: "ابھی میں نے پی ہی کہاں ہے جو چڑھ جائے گی۔"

ایسے موقعوں کے لیے شرم و حیا کی جو دلربا قاتل ادا روشنی کی اداؤں میں ماسٹر پیس تھی، وہی اد اس نے آزمائی تو سبحانی بالکل فلیٹ ہو گیا۔ دوسرا جام بھرتے ہوئے اس نے کہا:

"تمہاری اداؤں کے نام!"

جام پر جام بھرتے رہے۔ تلی ہوئی مچھلی اور آلو کے چپس چلتے رہے اور سبحانی کی آنکھیں سرخ ہو چلی گئیں۔ پھر اسے ہچکیاں آنے لگیں۔ اگلا جام بھرنے کے لیے جب اس نے اپنا ہاتھ بوتل کی طرف بڑھایا روشنی اسے سہارا دے کر ہوٹل سے باہر لائی مگر چند قدموں کے اس فاصلے میں سبحانی نے اس کے گلے ایک قیمتی لاکٹ پہنا ہی دیا۔ روشنی نے لاکٹ چھو کر اس کی قیمت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا، "دل توڑنا میرا نہیں ہے، اس لیے رکھ لیتی ہوں، جب چاہو واپس لے لینا۔"

سبحانی بولا: "میں ایک بیوپاری ہوں قیمت وصول کرنا جانتا ہوں۔"

روشنی نے کہا: "پھر شرارت پر اتر آئے؟"

سبحانی نے اس کے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "ابھی تو شرارت شروع بھی نہیں ہوئی!"

"اور اس کی نوبت بھی کبھی نہیں آئے گی بے وقوف گدھے!" روشنی نے دل ہی دل میں کہا اور الوداع کہہ کر فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی بھیڑ میں کھو گئی۔

پکچر شروع ہو چکی تھی اور گلزار بیقراری سے روشنی کا انتظار کر رہا تھا لیکن وہ نہیں آئی۔ گلزار نے جھلا کے ٹکٹ پھاڑ دیے اور پاؤں پٹختا ہوا سینما سے باہر نکل آیا۔

روشنی سڑک پار کر جب اپنی گلی میں مڑی تو اس نے سوچا گلزار انتظار کرتے کرتے ضرور چلا گیا ہوگا —— ا محبتوں کو بالکل پالتو جانوروں کی طرح پالا تھا۔ کبھی جانور کو پچکارو، اسے پیار کرو، اور کبھی کبھی اسے دھتکار بھی دو وہ تڑپے، ترسے، غصے میں پیچ و تاب کھائے اور اسے مالک کی اہمیت کا علم ہو جائے، پھر کچھ روز لاتعلق اور تھوڑا وقفہ دینے کے بعد اسے پھر پچکار لو۔ اب وہ زیادہ گرم جوشی کے ساتھ دُم ہلاتا آئے گا —— یہ بھی عجب ایک حربہ ہے جو عورت کے ہاتھ میں ہو تو وہ ہر محبت میں کامیاب ہوتی ہے۔ روشنی نے کہا گلزار جا اور دارو غم غلط کر لے، پھر گھر چلا جا اور اپنی بیوی کے پہلو میں سو جا، مجھے یاد کر اور بیوی سے پیار جتا —— پھر ایک جب میں تجھے آواز دوں گی، تو دوڑا چلا آئے گا، جا اب چلا جا۔

اب وہ اپنی گلی میں چل رہی تھی۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا ر وہ اس گلی کے لوگوں سے بہت ڈرتی تھی کیونکہ ان کی نظر میں وہ ایک آوارہ اور بدچلن لڑکی تھی۔ صبح آفس جا جب وہ گھر سے نکلتی تو بہت سی بھوکی نگاہیں اس کے تعاقب میں ہوتیں۔ کچھ منچلے اسے دیکھ کر سیٹیاں

کچھ آوازے کستے، کسی کو بلا وجہ کھانسی آنے لگتی اور کوئی دل پر ہاتھ رکھ کے کہتا ——— "ہائے جانی!" ۔ وہ سب خاموشی سے سہہ رہی تھی اور خون کے گھونٹ پی رہی تھی ۔ وہ سوچنے لگی کتنی ٹینشن ہے آج کی زندگی میں ۔ ہر چیز کاروباری اور کھوکھلی ہے ۔ ہر نیا دن آدمی کی ذات سے کچھ نہ کچھ ضرور چرا لیتا ہے ۔ لیکن اس سرِ عام چوری کے خلاف کسی تھانے میں رپٹ درج نہیں کروائی جا سکتی، کوئی عدالت ایسی نہیں جو ذات کے اس چور کو پکڑ سکے اور چوری کا مال برآمد کروا سکے!

روشی ہر رات کچھ ایسا ہی محسوس کرتی تھی جیسے اس کی ذات کا کوئی نہ کوئی حصّہ کم ہو گیا ہو ۔ شہر کی بھیڑ میں کہیں کھو گیا ہو ۔ وہ لائٹ بجھا کر جب اپنے بستر پر لیٹتی تو خیالات کا ایک ہجوم اُسے گھیر لیتا ۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہتی لیکن نیند نہیں آتی تھی ۔ اُن دنوں وہ شراب نہیں پیتی تھی اس لیے جب اس کی بے چینی حد سے بڑھ جاتی تو وہ نیند کی گولی لینے پر مجبور ہو جاتی اور آخر کار سو جاتی ۔ مگر اب وہ باہر ہی سے پی آتی تھی اس لیے بستر پر گرتے ہی اسے ہوش نہیں رہتا تھا، صبح ہی آنکھ کھلتی تھی ——— لیکن وہ راتیں اس پر بہت بھاری ہو جاتی تھیں جب وہ شام کی ساری رنگینیوں کو چھوڑ کر دفتر سے سیدھی گھر آ جاتی ۔ ان راتوں میں اسے نیند نہیں آتی تھی ۔ وہ کبھی رسالے پڑھتی تو کبھی میوزک سنتی، کبھی ماں کو خط لکھتی، کبھی پرانی البم دیکھتی لیکن نیند کسی صورت سے نہیں آتی تھی ۔ پھر وہ ہار کر الماری سے بوتل نکالتی اور وھسکی کے کڑوے گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگتی ۔ وھسکی پیتے ہوئے اسے اپنے گھر والے بہت یاد آتے تھے ۔ ماں کا خیال آتا تھا جو فالج کی ماری ایک دور دراز شہر کے ہسپتال میں زیرِ علاج تھی ۔ چھوٹا بھائی یاد آجاتا جو میڈیکل کے تیسرے سال میں پڑھ رہا تھا ۔ ایک بیوہ بہن تھی جس کے دو بچے تھے اور جو ٹریفک کے ایک حادثے میں اپنی ایک ٹانگ کھو بیٹھی تھی اور اب اسکول میں معمولی نوکری کر کے زندگی کے دن پورے کر رہی تھی ۔ وہ سوچتی اگر آج میرا باپ زندہ ہوتا تو مجھے یہ پاپڑ کیوں بیلنے پڑتے ۔ اِن لمحوں میں وہ بہت اداس ہو جاتی اور اس کی آنکھیں بھر آتیں، لیکن زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے، اور وہ بڑی بہادری کے ساتھ حالات کا مقابلہ کر رہی تھی اگرچہ وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گئی تھی لیکن اس کے باوجود اپنے گھر والوں کے لیے وہ کسی دیوی سے کم نہیں تھی ۔

کتنی زندگیاں اُس سے وابستہ تھیں، کتنے لوگ صرف اسی کے سہارے چل رہے تھے ۔ اخراجات بہت زیادہ تھے اور دفتر سے جو تنخواہ اُسے ملتی تھی، وہ اتنی کم تھی کہ اس سے وہ اپنا خرچ بھی ٹھیک سے پورا نہیں کر سکتی تھی ۔ اِسی لیے وہ سیدھی راہ سے تھوڑا سا ہٹ گئی تھی ——— اس راہ سے ہٹ کر جہاں اس نے کچھ پایا تھا وہاں بہت کچھ کھو بھی دیا تھا ۔ اسی لیے ہر رات اُسے یُوں لگتا تھا جیسے اس کے اندر سے اُس کی ذات کا کوئی حصّہ کم ہو گیا ہو!

لیکن کچھ دن سے ایک خوشبو سی اُس کے آس پاس لہرا رہی تھی ۔ ایک چہرہ اس کے دل پر پھوار بن کر برس رہا تھا ۔ اسے لگتا جیسے وہ چہرہ اس کی ذات کے ساتھ یوں جڑ گیا ہو جیسے قلم سے سیاہی جڑی ہوتی ہے ۔ راتوں کے

گھنے اندھیروں میں وہی چہرہ اس کے لیے روشنی کی ایک کرن بن گیا تھا جسے اُس نے اپنے دل کے ویران طاق میں دِیے کی طرح سجا لیا تھا ——— وہ ایک غریب کہانی کار تھا۔ کبھی کبھی اس کے دفتر بھی چلا آتا تھا۔ یونہی، بس باہر کی گرمی سے ذرا بچنے کے لیے، تھوڑی سی دیر اے۔ سی میں بیٹھنے کے لیے، پل بھر کو دم لینے کے لیے، کُرتا پاجامہ پہنے، کندھے پر تھیلا لٹکائے وُہ پسینہ پُونچھتا ہُوا آتا اور ستانے کی خاطر روشنی کے پاس بیٹھ جاتا۔ کبھی اپنی کوئی تازہ کہانی بھی اسے سنا دیتا، کبھی کوئی رسالہ بھی اسے دے دیتا۔ روشنی اس سے روایتی انداز میں ملتی تھی، چائے پلا دیتی تھی، حال چال پُوچھ لیتی تھی اور اس درمیان دفتر کا کام بھی نمٹاتی جاتی تھی مگر اس کے جانے کے بعد نہ جانے کیوں اسے یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے وُہ شرمیلا سا کہانی کار اس کی رُوح کو اپنے ساتھ ہی لے گیا ہو جبکہ وہ اس سے کچھ نہیں مانگتا تھا لیکن اس کی جھکی جھکی خاموش نگاہوں میں روشنی کے لیے جو پسندیدگی تھی وُہ روشنی پر بھی ظاہر ہو چکی تھی۔ اُس کے دل میں جو چنگاری سلگ رہی تھی اس کی حرارت روشنی کے دامن سے یُوں لپٹ جاتی تھی کہ اُسے اپنا پُورا وجود دہکتا ہُوا محسوس ہوتا تھا ——— اسی ادھیڑبُن میں دن گزرتے چلے گئے، راتیں آتی رہیں، جاتی رہیں ———!

کئی مہینے گزر چکے تھے اور اب روشنی کی زندگی اس مقام پر آ گئی تھی کہ اُسے شہر سے اپنا تبادلہ کروا لینا چاہیے تھا ورنہ وہ نام نہاد عاشق جو اس سے راتوں کے اندھیروں میں ملتے تھے اور پھر اندھیرے ہی کا حصہ بن کر غائب ہو جاتے تھے کسی نہ کسی دن اپنی قیمت سود سمیت وصول کر لیں گے۔ اسی ڈر سے اس نے تبادلے کے لیے کوشش شروع کر دی اور کافی انتظار کے بعد ایک روز ہیڈ آفس سے اس کے تبادلے کے آرڈر آ ہی گئے۔ اس نے سوچا اب نیا شہر ہوگا نئی زندگی ہوگی اور نئے عاشق ہوں گے۔ اس کھیل میں وُہ ایک شاطر چالباز بن چکی تھی لہٰذا اس کی کامیابی یقینی تھی۔

انہی دنوں جب ایک روز وُہ آفس پہنچی تو اس کی سہیلی نے بتایا کہ وُہ تیرا رائٹر آیا تھا۔ تجھے پوچھ رہا تھا جب مَیں نے اسے بتایا کہ تیرا تبادلہ ہو گیا ہے اور تو دو چار دن میں یہاں سے جانے والی ہے تو اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ بہت دیر تک اپنے ناخن کاٹتا رہا، بار بار پسینہ پُونچھتا رہا۔ میں نے چائے دی تو پیالی لیتے ہُوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ شاید اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے ——— سچ روشنی! مجھے بڑا ترس آیا اس پر۔ روشنی نے پوچھا "کچھ کہہ رہا تھا؟" "ہاں!" کہہ رہا تھا: "میں تو ایک معمولی لکھنے والا ہُوں، آمدنی نہ ہونے کے برابر ہے پھر بھی میں نے روشنی جیسی امیر لڑکی کو اپنے من میں بسا لیا، مجھے اتنا اونچا خواب نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔"

اس روز رات کو جب روشنی اپنے بستر پہ لیٹی تو اُسے احساس ہُوا جیسے اس سے کوئی بہت بڑا گنا سرزد ہو گیا ہو، جیسے اس نے اس کہانی کار کی زندگی ہمیشہ کے لیے برباد کر دی ہو۔ پھر ضبط کے سارے بندھ ٹوٹ گئے اور وُہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی ——— ارے پگلے! تو نے مجھے امیر کیسے سمجھ لیا؟ میں تو تیری ہی طر ایک غریب لڑکی ہوں، حالات کی ماری ہُوئی، زندگی سے لڑتی ہوئی، تھکی ہاری، میں تو خود طوفانوں میں ہوا پگلے! ——— تو نے طوفانوں کا خواب کیوں دیکھ لیا؟ تو نے یہ کیا کیا؟ تو نے یہ کیا کیا؟

روشنی کو رات دس بجے والی ایکسپریس ٹرین پکڑنا تھی، وُہ جب پلیٹ فارم پر پہنچی، اُس نے دیکھا، وہ ایک ستون کے سہارے کندھے پر تھیلا لٹکائے، غم میں ڈوبا کھڑا تھا، سر جھکائے، بالکل گُم صُم، بالکل خاموش، پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اس کا شیو بڑھا ہُوا تھا، بال اُلجھے ہُوئے تھے، آنکھیں بے خواب تھیں، کُرتہ پاجامہ بالکل مَیلا ہو چکا تھا اور واسکٹ بھی ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی —— اسے دیکھ کر روشنی کو محسوس ہُوا جیسے اس وقت وہ اپنے خوابوں کی چتا میں آگ لگانے آیا ہو —— اور شمشان میں اکیلا کھڑا ہو —— بالکل اکیلا، بے بس، بے یار و مددگار!

اُسے یُوں دیکھ کر روشنی کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وُہ دوڑ کر جائے اور اسے گلے سے لگا لے، اُسے سب کچھ بتا دے اور پھر اس کے کندھے سے لگ کر اتنا روئے کہ اس کے دل کا بوجھ ہمیشہ کے لیے آنسوؤں میں بہہ جائے اور پھر ایک نئی زندگی مسکرا کر اسے اپنے آغوش میں لے لے، اس کے تصوّر میں ایک چھوٹا سا گھر یُوں پھیلنے لگا جیسے بھیگی آنکھوں میں کاجل پھیلتا ہے، اس کا اپنا گھر، اپنا شوہر، اپنی زندگی —— یہ کمزور لمحے اس کی زندگی میں بالکل اس طرح آئے جیسے ساحل پر سمندر کی کوئی لہر جھاگ اُڑاتی آتی ہے اور چٹانوں سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہے۔ اُس نے اپنی بھیگتی ہُوتی آنکھوں کو فوراً پونچھ لیا، اپنے دل کو سمجھا لیا اور اپنے سب سے خوبصورت خواب کو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اندھیری وادی میں لڑھکا دیا —— کیونکہ ابھی اس کا سفر بہت لمبا تھا، بڑا کٹھن تھا اور منزل کہیں دُھند میں گم تھی۔ وہ اس سے اسی روایتی انداز میں ملی جیسے ہمیشہ ملتی تھی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے ہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔

گاڑی کی روانگی کا وقت آیا تو اسے الوداع کہہ کر اپنے ڈبّے کی طرف بڑھ گئی —— لیکن نہ جانے کیوں ٹرین میں سوار ہونے کے لیے جب اس نے اپنا پاؤں پائدان پر رکھا تو جیسے اچانک اس کی منزل بدل گئی اور اُسے محسوس ہُوا جیسے یہ پاؤں اس کا اپنا پاؤں نہیں ہے، بلکہ کوئی اجنبی پاؤں ہے جو صراطِ مستقیم پر چلنا چاہتا ہے۔

باوفا/بے وفا

وحید رضا بھٹی

نواز کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی، منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا، شدتِ جذبات سے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں جلتی ہوئی لکڑی پکڑے وہ ہذیان بک رہا تھا اور کود کود کر اصغری کی جانب لپکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی زبان پر ایک ہی رٹ تھی: "تمھارے پارچے کر کے رکھ دوں گا۔ لوٹی بوٹی کر کے چیلوں کو ڈال دوں گا۔ بے شرم، بے حیا، بے غیرت، چھنال، دم گھسیٹی... اس کو سنبھالنے والے اسے کہہ رہے تھے "ہوش کرو نواز، ہوش کرو، کیوں جگ ہنسائی کا سامان بن رہے ہو؟"

ابھی کچھ ہی دیر پہلے سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ آج نواز اور اصغری کے سب سے چھوٹے اور آخری بیٹے کا ولیمہ تھا بیاہ بخیریت انجام پا گیا تھا، اس سے پہلے وہ دو بیٹے اور دو بیٹیوں کے بیاہ رچا چکے تھے۔ یہ آخری لڑکا، حامد بیرونِ ملک تعلیم حاصل کر گیا ہوا تھا اور پچھلے مہینے ہی لوٹا تھا۔ چنانچہ آج اس کے والدین اس آخری فرض یعنی حامد کی شادی خانہ آبادی سے بھی سبکدوش ہو گئے تھے۔ اور اپنے آپ کو یوں ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے جیسے ان کے سروں پر سے بھاری گٹھڑیاں اتار لی گئی ہوں۔ لیکن نواز تئیں مکمل فراغت تب ہی میسر ہونا تھی جب وہ اور اصغری فریضۂ حج سے بھی سرخرو ہو جائیں گے۔ انہی سوچوں میں گم وہ صحن میں آ کر بیٹھ گیا۔ بہت سے مہمان اپنے اپنے گھروں کو سدھار چکے تھے بقیہ کوچ کرنے کی تیاریوں میں تھے۔ اندر کمروں میں ان کے ٹرنکوا کے گھسیٹے جانے، کھلنے اور بند ہونے کی بیزار کن آوازیں صحن میں پہنچ رہی تھیں۔ نواز نے شامیانہ کھلوانے کے لیے کہہ دیا تھا اور کر پر آئی ہوئی کراکری اور دیگر سامان وغیرہ اٹھوانے کے لیے آدمی بھی دوڑا دیا تھا تاکہ خواہ مخواہ اس شام کا کرایہ بھی ادا نہ کرنا پڑ جائے صحن میں اب اکا دکا بکھرے لوگ بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو مقامی تھے یا ہمسائیگی میں رہتے تھے اور جنھیں گھر جانے کی چنداں جلدی نہ تھی۔ پھر بھی ان میں سے چند ایک حضرات کو ان کی بیویوں نے، ماؤں نے دوسرے اہلِ خانہ نے دو چار بار اوپر تلے بلاوا کر بھری محفل سے اٹھا کر گھر کی راہ دکھا دی تھی۔

نواز نے ایک اچٹتی نگاہ صحن پر ڈالی تو دور ایک کونے میں اصغری کو ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ کھڑے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا۔ اس شخص کو اس نے پہلے کبھی اپنے کسی بھی لڑکے یا لڑکی کی کسی تقریب پر نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں کون ہے؟ خیر اسے کیا؟ اٹھ کر دیگوں کی طرف چلا گیا اور حساب لگانے لگا کہ کتنی دیگوں کا سامان بچ رہا تھا۔ دو دیگیں پلاؤ کی، ایک زردے کی، اور آدھ شوربے کی بچ رہی تھی۔ ان کے علاوہ دو دیگوں کا خشک سامان الگ بچ رہا تھا جسے حفظِ ماتقدم کے طور پر الگ رکھا ہوا تھا لیکن جسے پکانے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ شادی کی تقریب میں متوقع آمد میں کمی کی وجہ مہنگائی تھی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچ پانے کے لیے بھاڑے کے علاوہ دولہا، دلہن کو سلامی کی رقم یا کچھ نہ کچھ تحفے کی صورت میں دینے کے لیے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ پھر سہرہ بند

بنائی جیسی رسموں پر بھی کچھ نہ کچھ گرہ سے نکالنا ہی پڑتا ہے۔ آج کل لوگوں کی روزمرہ گزر اوقات ہی بمشکل ہو رہی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ ئی نہ کوئی بہانہ کرکے پنڈ چھڑا لیتے ہیں۔ کسی کے مقدمے کی تاریخ ٹھیک اسی روز آن پڑتی ہے، کسی کے لڑکے یا لڑکی کا امتحان سر آن پہنچتا ہے، بلکہ انہی دنوں میں جاری ہوتا ہے یا پھر کسی نے باپ کو ہسپتال میں داخل کرایا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ان تمام صورتوں ں ان کا اپنے شہر میں ٹھہرے رہنا از حد ضروری ہوتا ہے۔ نواز کو اگر پہلے سے یہ بھنک پڑ جاتی تو وہ خوردنوش کے اتنے سامان کا ردہی نہ کرتا۔ خیر اب کیا ہو سکتا تھا۔ ہاں البتہ محلے کے وہ گھر جنہیں شادی پہ مدعو کرنا یاد نہ رہا تھا یا مدعو کرنا مناسب نہ سمجھا گیا تھا، ن کے ہاں ایک ایک تھال چاولوں کا بھیج دینا مناسب رہے گا۔ اس طرح رزق کی بے حرمتی بھی نہیں ہوگی اور رعب الگ بیٹھ ئے گا۔ اسی سوچ میں گم نواز دیگوں سے ہٹ کر واپس کرسی پر آبیٹھا تو خواہ مخواہ اس کی نظر پھر اصغری کی جانب اٹھ گئی۔ اس نے یکھا کہ اصغری پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کھرچ رہی تھی اور اس کے چہرے کا رنگ گلنار ہو رہا تھا۔ برسوں پہلے جب نواز اصغری بیاہ کر اس گھر میں لایا تھا تو اس وقت وہ ایک چھوٹی موٹی سی لڑکی تھی اور بات بات پر شرما جایا کرتی تھی اور شریر نواز اسے تنگ کرنے کے لیے ابا اماں کی موجودگی میں ان کی نظریں اور کان بچا کر اصغری سے بے وقت کسی ایسی ویسی بات کا مطالبہ کر بیٹھتا تو ہ "اوئی اللہ! شرم نہیں آتی" کہہ کر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر اور گول گول آنکھیں نکال کر ایک بار تو نواز کی جان ہی نکال لیتی۔ یکن اپنے اس عمل پر فوراً ہی شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتی اور پھر دیر تک دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کو کھرچتی رہتی۔ نواز ر وہ سماں یاد آیا تو ایک لمحے کے لیے تو اس کی آنکھیں نشے سے بھاری ہو کر مندہ سی گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے اچانک اس کو کرنٹ سا لگا۔ یہ ابھی ابھی اصغری پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کیوں کھرچ رہی تھی؟ یہ سفید کنپٹیوں والا شخص کون ہے؟ نواز سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آہستگی کے ساتھ کرسی پر سے اٹھا اور بظاہر ٹہلتا ہوا اس ٹکڑی کی جانب آہستہ آہستہ اس طرح چلنے لگا گویا بلا مقصد مٹرگشت کر رہا ہو۔ جوں جوں وہ ٹکڑی کی جانب بڑھ رہا تھا اس کی رفتار دھیمی پڑتی جا رہی تھی، لیکن اس کی ساری حسیں کانوں میں سمٹ آئی تھیں۔ خراماں خراماں ٹہلتا وہ عین دونوں کے سروں پر پہنچ گیا، لیکن وہ سر جھکائے باتوں میں اس قدر مگن تھے کہ مافیہا سے بے خبر ہو چکے تھے۔ مدھر بھری آواز میں جس سے اس سے پہلے نواز کے کان قطعاً نا آشنا تھے، اصغری کہہ رہی تھی "وہ تو ابھی تک میں نے سینے سے لگا کر رکھی ہوئی ہے۔ اسی کو دیکھ دیکھ کر، اسی کے سہارے تو پہاڑ جیسی زندگی کاٹ پائی ہوں........"

نواز کو چکر آ گیا۔ اس میں مزید کچھ سننے کی تاب نہ رہی۔ اتنا بڑا دھوکا، اتنی لمبی چال۔ تیس برس بیت گئے۔ کئی نشیب و فراز آئے۔ کٹھن گھڑیاں آئیں اور کسی نہ کسی طور کٹ گئیں۔ بچے ہوئے، ان کو پالا پوسا جوان کیا، حتیٰ کہ بیاہ ڈالا، لیکن اس ماں کی جائی، دم گھسیٹی نے ایک بار بھی تو اپنے من کا بھید نہ دیا۔ مجھے صرف ایک بار سرسری بتا دیتی، ہلکا سا اشارہ ہی کر دیتی۔ خدا کی قسم اگر کبھی جتا جاتا تو اپنے باپ کی اولاد نہ ہوتا۔ آخر انسان خطا کا پتلا ہی تو ہے۔ لیکن اس مکار خرافہ نے مجھ پر اعتبار ہی نہ کیا۔ تیس برس اعتبار نہ کیا۔ مجھے دھوکا ہی دیتی رہی، اداکاری کرتی رہی۔ تمام عمر اداکاری ہی میں بتا دی۔ چھنال کہیں کی۔ سانپ کی اولاد ۔۔۔ حرام زادی!" نواز کی آواز یک لخت اونچی ہوتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، منہ سے جھاگ بہنے لگا۔ وہ بھاگتا ہوا دیگوں کی

جانب گیا اور جلتی ہوئی لکڑی گھسیٹ کر اصغری کی طرف لپکا لیکن اُونچی آواز میں ہذیان بکنے اور بھاگ دوڑ سے مہمان چونکتے ہوئے تھے انھوں نے نواز کو راستے ہی میں جا لیا۔ اصغری حیران پریشان کھڑی نواز کا منہ تک رہی تھی، جو اُسے عمر بھر میں پہلی بار زندگی کا دے رہا تھا۔ ان کے تین بیٹے، دو بیٹیاں، تین بہوئیں اور دونوں داماد بچے کھچے مہمانوں کے ہمراہ کھڑے معاملے کو سمجھنے کی ناکا کوشش کر رہے تھے۔ اس بھیڑ بھاڑ کا فائدہ اُٹھا کر وہ سفید کنپٹیوں والا شخص نہ جانے کدھر غائب ہو گیا تھا۔

اپنا اپنا قرض

خورشید عالم

کل ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ پل بھر کے لیے بھی سکون نہیں ملا ہے۔ وقت ہمیشہ آگے ہی نہیں چلتا کبھی یہ پیچھے بھی چلنے لگتا ہے۔ جیسے چلتے ہوئے ہاتھ سے کوئی چیز گر پڑی ہو اور بڑی دور نکل جانے کے بعد پھر اس چیز کی یاد آئی ہو اور کوئی پھر اسے ڈھونڈنے کے لیے چل پڑا ہو۔ کل سے میں نے ایک بار بھی بیوی کی طرف نہیں دیکھا ہے اور اپنے ہی بچے کو پیار کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ حالانکہ رات روز آتی ہے، جوگی کے پھیرے کی طرح۔ سپنوں کی بھیک مانگتی ہے۔ کوئی دے دے تو واہ وا۔ نہ دے تو کھڑی نہیں رہتی، چلی جاتی ہے۔ اب تک میں کئی بار کپڑے بدل چکا ہوں، لیکن ہر ایک سے وہی بو آتی ہے جس کے لیے میں کرونا کو کوسا کرتا تھا۔ عجیب کیفیت ہے کہ سردیوں میں بھی کپڑے بدن سے چپکنے لگتے ہیں جیسے کولتار کی سڑک پر تیز دھوپ لگی ہو۔

کرونا نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا "ہمارے یہاں شادیاں ناکام کیوں ہوتی ہیں، اسے مجھ سے بہتر تم جانتے ہوگے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ان شادیوں کی بنیاد جسم پہ ہوتی ہے اس لیے بے معنی ثابت ہو جاتی ہیں، اور محبت اپنی تمازت اور مقناطیسیت اس لیے کھو دیتی ہے کہ جسم کے آس پاس یاسیت منڈلانے لگتی ہے۔ یہ جسم بڑی عجیب چیز ہے۔ اس سے گزرے بغیر عشق کامیاب نہیں ہوتا اور اس پہ ٹھہر جانے سے محبت ختم ہونے لگتی ہے۔ میرے پچھلے خط سے جو حقیقت تم تک پہنچی، اسے جاننے کے بعد تمھارے اندر جو کچھ ہوا اسے تم ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ سکے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمھیں دکھ نہیں پہنچا، ٹھیس لگی ہے اور ٹھیس تمھیں اس لیے لگی ہے کہ حقیقت کو تم نے نیم اندھیرے اور نیم روشنی میں دیکھا ہوگا۔ تمھیں لگا ہوگا کہ میں دو کے درمیان تقسیم عورت ہوں۔ پوری روشنی کا سچ یہ ہے کہ کسی کو محبت کے بغیر جسم سونپنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا مطلب تو تب ہوتا ہے جب اس کے پس منظر میں کوئی مجبوری نہ ہو۔ مجبوری اسی دنیا کا سچ ہے جس میں ہم جی رہے ہیں یہ جاننے کے بعد بھی کہ تم رما کے شوہر ہو۔ میں خود کو ذرا بھی قصوروار نہیں سمجھ رہی ہوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ تم سے محبت کر کے رما سے اس کا حق چھین رہی ہوں۔ اگر رما کا حصہ اسے نہیں مل پا رہا ہے تو اس کی ذمہ داری مجھ پہ کیوں؟ وہ تمھیں اتنا کیوں نہیں دے پاتی ہیں کہ تمھاری چاہت ان پہ مرکوز ہو جائے۔ ٹھیک یہی حالت میرے لیے بھی ہے۔"

یہ ایک عجیب سا خط تھا جسے پڑھ کر لگا کہ میں جگہ جگہ سے زخمی ہو گیا ہوں۔ میں شروع سے ہی شاید

اپاہج رہا ہوں۔ بغیر سہارے کے نہ کھڑا ہو پاتا ہوں اور نہ ٹھیک ڈھنگ سے سوچ سمجھ پاتا ہوں۔ ایک بیساکھی پانے کی چاہ میرے اندر میرے جنم کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی تھی شاید۔ کرونا سے پہلے میں نے یہ بیساکھی رما میں تلاش کی تھی۔ اپنے خطوط میں اس نے ایسا احساس بھی کرا دیا تھا کہ وہ میری بیساکھی بن سکتی ہے اور میں اس کے سہارے پربت پار کر سکتا ہوں۔ آسانی سے وشواس کرنے کے ناتے اور جب ہم ایک ہو گئے تو میں پورے کا پورا ایک چیخ میں بدل گیا تھا۔ رما صرف لینا جانتی ہے، محبت میں دینا بھی ہوتا ہے، کھونا بھی ہوتا ہے۔ اس بات کا اسے احساس ہی نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی پتنی تھی جس کا انتخاب بیشک میں نے کیا تھا، لیکن نکلی وہ ایک عام بیوی جیسی۔ جس نے مجھے خطوط لکھے اور جس نے مجھ سے شادی کی یہ دو رمائیں تھیں۔ اتنا بنیادی فرق کہاں سے آیا؟ میں سوچتا او الجھ جاتا۔ خطوط والی رما اور بیوی بن کر آئی رما کے درمیان جو چھتیس کا رشتہ تھا اس نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔

اور یہ کرونا تھی جو مجھ سے ملنے شہر آئی تھی۔ ایک شادی شدہ عورت ایک شادی شدہ مرد سے ملنے آئی تھی۔

”کیا ہمیں اتنی دور جانے کا حق ہے جہاں سے لوٹنا ممکن نہ ہو؟“ کرونا کے اندر کی عورت نے اپنا چہرہ دکھایا۔

”حق .... ؟“ مجھے یہ لفظ چبھ گیا ”ہمیں کتنی دور جانا ہے، اس کے لیے کسی کی اجازت نہیں ہوگی

”ہاں — !“ کرونا نے کہا تو میرا ماتھا تپنے لگا۔

”کس سے، تمہارے شوہر سے؟“

”نہیں، رما سے!“ کرونا شانت تھی

”اس لیے کہ وہ میری بیوی ہے؟“

”نہیں! اس لیے کہ وہ بھی تمہیں اتنا ہی پیار کرتی ہے جتنا کہ میں۔ میں حق کو تو نظر انداز کر سکتی ہوں؛ محبت کو نہیں“

”لیکن رما مجھ سے محبت کرتی ہے، یہ تمہیں کس نے بتایا؟“

”رما نے!“

”رما نے؟“ میں کانپ گیا ”وہ تمہیں کہاں ملی؟“

”ملی نہیں، اس کے خطوط ہیں میرے پاس!“

”رما کے خطوط؟“ میں لڑکھڑا گیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ کرونا سے رما کے لکھے گئے خطوط کی عبار جاننا خود کو چھوٹا اور کمتر ثابت کرنا ہوگا۔ میں رک نہیں سکا اور پوچھ ہی بیٹھا ”اس نے کیا لکھا تھا؟“

"ایسا کچھ نہیں جو تمھیں مجروح کرے۔"

مجھے لگا کہ یہ جواب دے کر کرونا نے مجھے چھوٹا کر دیا ہے۔

"لیکن اسے تمھارا پتا کہاں سے ملا؟"

"تمھاری ڈائری سے!"

"ڈائری بھی پڑھی اس نے!" میں حیرت زدہ تھا "یہ تو دغا بازی ہے۔ بہت چھوٹی نکلی وہ۔"

"نہ یہ دغا بازی ہے اور نہ ہی وہ چھوٹی ہے۔" کرونا جیسے رما کی لڑائی لڑ رہی تھی۔" اس نے مجھے لکھا تھا رمیں تمھارا جسم لے لوں لیکن دل اسی کے لیے رہنے دوں۔ چھوٹی عورت ایسی خواہش نہیں کر سکتی۔ رما نا سمجھ نرور ہے لیکن چھوٹی نہیں ہے۔"

"تو، اب تم کیا کہتی ہو؟"

"میں فوراً کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ میں ایک کمزور عورت ہوں — تمھاری طرح میں بھی کبھی کبھی ٹوٹتی بکھرتی ہوں۔ ساری پریشانیوں کو میں ہی کیوں حل کروں؟ تم مرد ہو کر بھی نہیں لڑ سکتے تو مجھ سے یہ امید کیوں کرتے ہو کہ میں اپنی بھی لڑائی لڑوں اور تمھاری بھی!" کرونا کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں

"کیا ہے جو تمھیں سونے نہیں دے رہا ہے!" یہ رما تھی جو بغل کے بستر پر پڑی میرے ساتھ ساتھ جاگ رہی تھی شاید۔

"کرونا کا ماضی!" میں نے جواب دیا اور اندھیرے میں رما کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔

"کون کرونا؟" رما نے حیرت کا مظاہرہ کیا

"اب بنو مت!" میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔" اُس نے شکایت نہیں کی، تمھاری تعریف کی ہے"۔ میں نے چڑھ کر کہا

"وہ بڑی عورت ہیں!" رما شانت تھی

"ہاں، وہ بڑی عورت ہے۔ ہر کوئی تمھاری طرح چھوٹا نہیں ہوتا۔" میں اُکھڑ گیا

"لیکن چھوٹا آدمی بڑا بن تو سکتا ہے!" رما ابھی تک شانت تھی

"اب دیر ہو چکی ہے رما!" میں نے ایک سرد آہ بھری

"نہیں! بالکل دیر نہیں ہوئی ہے۔" اور اس جواب کے ساتھ ہی کھٹ کر کے بجلی جل گئی۔ اسی درمیان رما میرے بستر پر چلی آئی تھی۔

"سنو! مجھے کرونا سے کوئی تکلیف نہیں ہے۔" رما نے کہا" اگر وہ تمھارے ساتھ آ کر رہنا چاہیں تو میں خاموشی سے تمھاری زندگی سے دُور چلی جاؤں گی۔"

رما کی خود سپردگی سے مجھے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن میں گہرے دکھ سے بھر اُٹھا۔ یہ محبت ہے یا رحم کا جذبہ؟ میں نے سوچا اور رما کی آنکھوں میں جھانکا جو بہت دُور تک خالی تھیں۔

"کہاں چلی جاؤں گی!" میں نے پُوچھا

"دنیا بہت بدلی ہے!" رما کے اندر اچانک ایک مضبوط عورت نے جنم لے لیا "کیا مجھے ایک بھی آدمی ای نہیں پاتا جو مجھے میرے راہل کے ساتھ اپنا سکے؟"

"آدمی؟ راہل؟" میرے منہ سے نکلا اور فوراً ہی مجھے پتا چل گیا کہ کتنے کمزور اور غلط الفاظ میرے منہ سے نکلے ہیں۔

رما نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ رما کے چلے جانے کا مطلب ہے راہل کا چلے جانا — راہل جو کہ میرا اور رما کا بیٹا ہے۔ تب مجھے احساس ہُوا کہ میں ایسا گوتم ہُوں جسے ابھی "نروان" نہ ملا ہے۔

"میں اب سونا چاہتا ہُوں"۔ میں نے اپنی بے بسی ظاہر کی

"اب تم کبھی سو نہیں پاؤ گے!" رما نے بے دردی سے کہا۔ کم از کم میں نے ایسا ہی محسوس کیا۔ رما بند کر کے واپس اپنے بستر پر چلی گئی تھی، راہل کے بغل میں اور میں اپنے بستر پر تنہا رہ گیا تھا — رما، راہل اور کر کے باوجود۔

میں علی بابا نہیں تھا، شاید قاسم تھا جو غار میں کسی طرح داخل تو ہو گیا تھا اور وہاں موجود تمام اسباب میں بھر چکا تھا۔ لیکن جب لوٹنے کا وقت ہُوا تو بھُول گیا کہ کیا کہنے سے غار کا دہانہ کھُلتا ہے۔ میں نے کرونا پالیا تھا لیکن اس پانے کے ساتھ ہی خود کو اندر تک خالی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس پانے کا کوئی مطلب نہیں تھا کیونکہ جو کچھ میں نے پایا تھا وہُ میرے ساتھ جانے والا نہیں تھا یہ ایسی دولت تھی جو تب تک بے معن جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس پر میرا اور صرف میرا حق ہے۔ وقت ہو چکا تھا اور میں بھُول چکا تھا کہ کیا سے دروازہ کھُلتا ہے؟ تھوڑی ہی دیر بعد میں چار ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا جاؤں گا اور غار کے چار گوشوں میں دیا جاؤں گا۔

یہ تھا میرا انجام۔ کوئی بھی اس نتیجے تک پہنچنا نہیں چاہتا۔ میں نے بھی نہیں چاہا تھا۔ لیکن صرف سے کیا ہوتا ہے؟

"مجھ سے شادی کرو گے؟" یہ سیدھا سوال کرونا نے کیا تھا میرے اس سوال کے جواب میں کہ "کیا نہیں ہو سکتا کہ تم واپس نہ جاؤ؟"

[illegible] جیسے ٹھنڈے پانی کا چھینٹا مار دیا گیا ہو۔

"لیکن رما کا کیا ہوگا؟"

"اُسے چھوڑ دینا!" کرونا نے جس لاپروائی سے کہا تھا اُس سے مَیں کانپ گیا تھا۔

"چھوڑ دوں؟"

"ہاں!" کرونا کی لاپروائی برقرار تھی "آخر میں بھی تو اپنے پتی کو چھوڑ کر ہی یہاں رہ سکتی ہوں۔"

"لیکن تمھارے پتی اور رما میں فرق ہے۔" میں نے ایک جھوٹی دلیل کا سہارا لیا۔ "انھیں کوئی دوسری عورت ل جائے گی لیکن رما کو دُوسرا آدمی نہیں ملے گا!"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"مجھے معلوم ہے!"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تم یہ برداشت ہی نہ کر پا رہے ہو کہ رما کسی دوسرے آدمی کی آغوش گرم کرے!"

"ہو سکتا ہے!" میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"تو کیا تم نے مجھے کھلونا سمجھ رکھا ہے؟" کرونا غصّے سے کانپ رہی تھی۔

"کرونا!" میرے منہ سے چیخ نکل گئی

شاید یہی وُہ لمحہ تھا جب میرا رُواں رُواں کہہ اٹھا تھا "کھل جا سم سم۔" اور غار کا دہانہ کھُل گیا تھا!!

"فاختہ"

انیق احمد

ہمارے گھر کے سامنے سے وہ چبوترا صاف دکھائی دیتا ہے جس پر قربان صاحب نے انٹینا گاڑ رکھا ہے۔ ا انٹینے پر ایک بھورے رنگ کی چھوٹی سی فاختہ دھوپ سینکنے آیا کرتی تھی۔ اس کے پر بھورے اور آنکھیں شربتی تھیں اور یُوں لگتا تھا جیسے وُہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کسی خوف کے تحت کچھ کہہ نہیں پاتی۔

میرا نام ارسلان ہے۔ میری عمر اٹھارہ برس ہے اور میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتا ہوں۔ میرے پاس دو نیلی جین اور ایک چوکور ڈبی دار لال رنگ کی قمیض ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں جینز ایک ہی رنگ کی ہیں۔ اور دو ا بائیں گھٹنے سے ذرا اوپر تھوڑی سی پھٹی ہوئی ہیں۔ جب کبھی میں جینز اپنی بہن کو دھونے کے لیے دیتا ہوں تو وہ ایک بار ضرور کہتی ہے:

"ابھی یہ کل ہی تو دھوئی تھی۔"

میرا گھر لاہور کے اندرون شہر میں ایک دو منزلا عمارت میں ہے۔ اس عمارت کو مالک مکان رحمت بلڈ کہتا ہے لیکن اس کے زینے، دیواریں رنگ و روغن سے کسی طرح بھی مالک مکان کی رحمت ظاہر نہیں ہوتی۔ کھڑکی سے پچھلا احاطہ نظر آتا ہے۔ اس چھوٹے سے کنویں نما احاطے میں پرانے کھوکھے، کوڑا کرکٹ، خارش کُتے اور حریص بلیاں وقت بے وقت لڑتی نظر آتی ہیں۔ برساتوں میں ادھر سے آنے والی ہواؤں میں میوہ منڈ گلے سڑے پھلوں کی خوشبو بھی آتی رہتی ہے۔

ہم جس مکان میں رہتے ہیں وہ صرف دو کمروں پہ مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ او غسل خانہ بھی ہے۔ جو غسل خانہ کم ہے اور باکس روم زیادہ ہے۔ بڑا کمرہ ہمارا ڈرائنگ روم ہے جسے وقت میری بہن نقلی پھولوں سے سجاتی رہتی ہے۔ اور دُوسرا کمرہ ہمارے سونے کا کمرہ ہے۔ یہ دونوں کمرے او اختتامی منزل پر ہیں اور ان دونوں کے درمیان دس فٹ کا فاصلہ ہے۔ یہ خلیج مالک مکان نے کچھ ایسی بے رکھی ہے کہ اس پر نہ دالان کا شُبہ ہوتا ہے نہ گیلری کا۔ ہم سارا دن ان ہی دو کمروں کے درمیان زندگی گ پھر بھی یہ فاصلہ کبھی طے نہیں ہو پاتا۔ الگ تھلگ رہتا ہے جیسے کمروں کے مابین کوئی سڑک چل رہی ہو۔ دو پ کے درمیان ریلوے لائن بچھی ہو۔ غالباً یہ فاصلہ اس خیال سے رکھا گیا ہے کہ یہاں پر ایک اور کمرہ بنا اور یہ منفرد کمرے ایک ہو جائیں اور ہمیں رہنے میں آسانی ہو اور ہمارے کرائے میں بھی اضافہ ہو جائے۔

ون سے ایسا سُننے میں آتا ہے کہ اوپر کی منزل میں ہماری طرف تیسرا کمرہ مکمل ہونے والا ہے مگر ابھی تک ایسا نہیں سکا۔ دراصل میری ماں بھی نہیں چاہتی کہ کمرہ مکمل ہو جائے۔ اسے خوف ہے کہ پھر مالک مکان کرایہ بڑھا دے گا م لوگ وہ اضافی کرایہ کیسے ادا کریں گے ——— پتا نہیں ماں جو کچھ چاہتی رہتی ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوتا۔ ، جو چھوٹی چھوٹی گزارشات اس کے دل سے گزرتی ہیں وہ عام طور پر پوری ہو جاتی ہیں۔

میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میرا نام ارسلان ہے حالانکہ نام بتائے بغیر بھی میں آپ کو اس فاختہ کے متعلق سکتا تھا جو قربان صاحب کے انٹینے پر دھوپ سینکنے آیا کرتی تھی۔ یہ نام میرے دادا نے رکھا تھا۔ دادا کا خیال تھا نکہ اس کی ساری عمر ڈرتے گزری اس لیے اس کے گھر میں کوئی شیر ضرور ہونا چاہیے۔ میری ماں بتاتی ہے کہ ے پیدا ہونے سے بہت پہلے دادا نے یہ نام تجویز کر لیا تھا۔ وہ بیساکھیوں کا سہارا لے کر کہتا:

"بہو! تم فکر نہ کرو بیٹا ہی ہوگا اور ہم اس کا نام ارسلان رکھیں گے جانتی ہو ارسلان کے معنی ہوتے ہیں ر ———"

دادا کا خیال تھا کہ ناموں کا شخصیتوں پر گہرا اثر ہوتا ہے اس لیے میرا دل دماغ ذہن سب شیر سے ہ ہوگا۔ اسی لیے میرا نام ارسلان رکھا گیا۔ بھلا اس کے علاوہ اور کیا نام رکھا جا سکتا تھا؟

میرے دو کمروں پر مشتمل گھر میں میرے ساتھ ایک ماں اور ایک بہن رہتی ہے۔ میرے والد صاحب کے ال کو اب چھ سال گزر گئے ہیں۔ میری ماں جو بڑی سپاٹ اور بے رنگ زندگی گزارتی ہے اس نے میرے ی تصویر کو گھر کے بڑے کمرے میں کارنس کے اوپر سجا رکھا ہے۔ اس تصویر پر ایک گوٹے والا ہار بھی لٹک ہے، جس نے وقت کے ساتھ نہ صرف والد صاحب کی تصویر پر اپنا عکس مرتب کر لیا ہے بلکہ کسی حد تک د صاحب کی شبیہ بھی اس کے پیچھے چھپی رہتی ہے۔ مجھے بڑا اطمینان ہے کہ میرے والد صاحب اس ہار کی ے ہم سب سے بہت خوش ہیں۔ اور مجھے یہ بھی احساس رہتا ہے کہ اس ہار ڈالنے کی وجہ سے انھیں اماں سے کوئی شکایت نہیں رہی۔

ہمارے ان دو کمروں کے سامنے جس طرف سے سورج نکلتا ہے اور جدھر جاپان کا صبح خیز ملک ہے ین کمرے ہیں۔ یہاں قربان صاحب رہتے ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ ایک نا تواں کمانے دوبئی گیا ہے وسرا ہمارے کالج میں ہی فورتھ ایئر کا طالب علم ہے۔

کالج والا لڑکا انٹینے پر بیٹھنے والی فاختہ کی طرح خاموش اور گم صم رہتا ہے۔ قربان صاحب ہم سے کرایہ دیتے ہیں اور ان کا حصہ ہمارے گھر سے زیادہ صاف ستھرا اور ماڈرن ہے۔ پہلے ان کا گھر بھی ے جیسا ہوتا تھا پھٹی رضائیاں، ڈھیلی چارپائیاں، ادھ کھلے بکسوں سے جھانکتے بے نور کپڑے، ، لوٹا کہیں کُرسی، مگر جب سے قربان صاحب کا بڑا بیٹا کاروں کا مکینک ہو کر دوبئی گیا ہے۔

قربان صاحب کو خوب آرام پہنچایا ہے۔ دو کروں کا بے معنی گندا سا گھر چمکنے لگا ہے۔ نہ صرف جلد ہی قربان صاحب کے ہاں تیسرے کمرے کا اضافہ ہوا بلکہ سارے گھر کی مرمتیں بھی ایک ساتھ ہو گئیں۔ اب سیڑھیوں میں قربان صاحب نے سو واٹ کا بلب بھی لگا دیا ہے اور کسی سے بجلی کے بل میں اضافے کی بات آج تک نہیں کی۔

ماں اور میری بہن ایک سی ہیں، صرف ایک کی شکل بیس سال پرانی ہے اور دوسری کی چالیس سال بوسیدہ۔ دونوں کے جسموں میں خون کی کمی ہے۔ دونوں کی رنگت چھپکلی جیسی سبزی مائل زرد ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے دونو کی ہڈیوں سے آوازیں سی نکلتی ہیں۔ میلی میلی، اَن دھوئی، بُجھی بُجھی رُوحیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اپنی ماں مجھے اچھی لگتی ہے میرا جی چاہتا ہے کہ کبھی وہ زور سے ہنسے، کبھی وہ کوئی چیز کھانے پر اصرار کرے، کبھی وہ میرا انتظا کرنے سے پہلے سو جائے ——— لیکن مجھے اپنی بہن سے بڑی سخت چڑ ہے وُہ مجھ سے دو سال چھوٹی ہے او اس نے پچھلے مہینے دسویں کا امتحان دیا ہے۔ قریباً ایک مہینے سے وُہ فارغ ہے اور کچھ زیادہ کھاتی بھی نہیں۔ ا باہر جانا بھی دشوار ہے اسی لیے وُہ دونوں کمروں کے درمیان لیٹے ہُوئے فاصلے کو الانگتی رہتی ہے اور چڑچڑ نظر آتی ہے حالانکہ کم آمیزی کی وجہ سے اس نے کبھی اکتاہٹ اور ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔

میں نے اپنی بہن کو جاننے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وُہ باقی تمام حالات کی طرح ساتھ ہے۔ میں ن کبھی اپنی بہن سے اظہارِ جنگ کیا ہے نہ تشہیرِ محبت۔ میرے اور اس کے درمیان جیسے کچھ ہے ہی نہیں نہ ٹھنڈا نہ گرم ——— نہ میٹھا نہ کڑوا ——— بس ایک پھیکا پن ہے ——— میری ماں مجھے روز یہ کہتی کہ مجھے اپنی بہن کا احساس ہونا چاہیے مجھے اس کے لیے زندہ رہنا چاہیے اور اسی کے لیے جان دی پر تیار رہنا چاہیے۔ مجھے ماں کی باتیں بے معنی اور مہمل سی لگتی ہیں حالانکہ جس وقت ماں یہ باتیں کرتی مجھے نہ ماں مہمل لگتی ہے نہ بے معنی۔

پچھلے دنوں قربان صاحب کا بیٹا دوبئی سے آیا۔ وہ نہ صرف اپنے گھر والوں کے لیے تحفے لایا بلک میری ماں کے لیے بھی ایک اُونی ولایتی چادر لے آیا۔ قربان صاحب کے گھر سے بڑی خوش کن آواز آتی ہیں۔ اور فورتھ ایئر کا کم گو لڑکا خاکی لفافوں میں مٹھائیاں پھل لاتا نظر آتا ہے اس گھر کی خوشیاں آئینے منعکس ہونے والی روشنی کی طرح ہمارے گھر میں چھلکتی رہتی ہیں۔ قربان صاحب کا یہ بیٹا کم پڑھا لکھا ہے اس بول چال سادہ اور نظریئے روایتی ہیں۔ وُہ چھوٹی مونچھوں اور تنگ قمیصوں کی وجہ سے بیوقوف نظر آتا ہے۔ ا وہ پڑھا لکھا ہوتا تو دوبئی کی جگہ امریکہ جاتا انجینئر ہوتا۔ پھر بیس سال بعد پاکستان آتا میری ماں کے لیے کیا گھر والوں کے لیے بھی کچھ نہ لاتا اور رشتہ داروں میں بیٹھ کر بار بار پُوچھتا:

”ڈیڈ! وقت پر ڈالروں کا ڈرافٹ مل جاتا ہے نا!“

قربان صاحب کا دوسرا بیٹا ایسا نہیں ہے وُہ سادہ دل اور شریف انسان ہے۔ وُہ

ں باپ کو سب کچھ سمجھتا ہے اور بھائی کی تعلیم کے لیے فکرمند رہتا ہے۔ وہ پاکستان صرف اس لیے آیا ہے کہ ماں باپ
ی پسند کی شادی کہیں کر دیں۔ قربان صاحب اور ان کی بیوی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ دوبئی پلٹ کے پاس صرف
مرہ دن ہیں۔ لیکن انھیں لڑکی ڈھونڈنے کی کوئی جلدی نہیں۔ لڑکے کے دل میں کسک ہے کہ کاش اس بار وُہ
ئی ساتھی لے کر واپس جائے تاکہ اکیلے میں بیوی تنہائی کم کر سکے۔ اور وہ ماں باپ کی خدمت تو کرتا رہے
ن تنہائی کے ان لمبے وقفوں سے بچ جائے جو دوبئی میں اسے پیش آتے رہتے ہیں۔

کچھ دن ہُوتے بیگم قربان ہمارے گھر آئی تھیں۔ وُہ میری ماں کو مختلف لڑکیوں کے بارے میں بتا رہی تھیں
ر میری بہن ہر لڑکی کے ذکر پر چونک کر ان کی طرف دیکھتی تھی۔ بیگم قربان ہر لڑکی کا ذکر ایسے کرتی جیسے بات پکّی ہو چکی ہو۔
ر تھوڑی دیر بعد جب وہ لڑکی کو برطرف کرتی تو میری ماں کا چہرہ اس طرح اداس ہو جاتا جیسے کسی نے اس کی بیٹی کو
پسند کر دیا ہے۔

لیکن میری بہن کہتی ہے کہ قربان صاحب کے بیٹے کی شادی نہیں ہو سکتی۔ اس کا خیال ہے کہ اگر شادی
لئی تو قربان صاحب اور بیگم قربان اپنے بیٹے کی کمائی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور فورتھ ایئر میں تعلیم پانے والا لڑکا
بھی امریکہ نہ جا سکے گا۔ میری بہن کہتی ہے کہ ظاہر ہے جب بہو آ جائے گی تو اپنے خاوند کے پیسوں کی مالک ہو گی۔
ے چاہے گی استعمال کرے گی، جس کو چاہے گی دے گی۔ ایسے جملے بولتے ہوئے میری بہن کی زرد گالوں کا
ت سُرخی مائل ہو جاتا ہے ایسے لگتا ہے جیسے وُہ قربان صاحب کے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ یہ
ادی وُہ اس لیے نہیں کرنا چاہتی کہ اس کا خیال ہے کہ قربان صاحب اپنے بیٹے کی ناجائز آمدنی کھا رہے ہیں۔
نہیں کیوں میری بہن کا خیال ہے کہ اب ان لوگوں کا دوبئی پلٹ کی کمائی پر حق نہیں بنتا —— غالباً اس کا
مہ جائز ہے کیونکہ اس نے کبھی تانویں کی پینگ پر بیٹھ کر نہیں دیکھا اور قربان صاحب ایک عرصے سے اس کے
رنٹے لے رہے ہیں۔

یہ جمعرات ساری رحمت بلڈنگ کے لیے اہم رہی۔ قربان صاحب کے بیٹے کی مہندی تھی۔ لڑکی کا چناؤ،
ادی کا انتظام، رسومات کا عمل آناً فاناً ہو گیا۔ مجھے مہندی کی رسم سے بھی بڑی چڑ ہے، حالانکہ سبھی کہتے ہیں
ہندی کی رسم میں رنگ و بُو کا سیلاب آ جاتا ہے۔ لڑکیاں جب موتیے کے ہار بالوں میں لٹکائے پرانے
پڑوں سے پسینے کی خوشبو کے بھپارے دیتی گھٹے سے گھٹا ٹا کم سُروں میں گیت گاتی ہیں تو مجھے عجیب فحاشی
حساس ہوتا ہے۔ اس منظر کو فحش سمجھنے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن جس طرح میں اپنی بہن سے چڑتا ہُوں ایسے
مجھے مہندی کی رسم اچھی نہیں لگتی۔

پتا نہیں کیوں قربان صاحب کا دوسرا بیٹا اس دُھوم دھڑکے سے خوفزدہ ہو کر اپنے ایک ساتھی کے پاس
سٹا چلا گیا۔ اس کا بہانہ [illegible]

قربان صاحب کا ساتھ دینا میری قسمت میں لکھا گیا اور میری گردن ہی چھری تلے آئی۔

مہندی اور ڈھولک کی رسم بھی قربان صاحب کے گھر ہی رکھی گئی۔ لڑکی والے بھی اپنی صلاحیتوں کو منوا یہیں آئے اور بے تال بے سُرتالیاں بجا کر ہار کر چلے گئے۔ میں جب بھی تیسرے کمرے میں بے تالی اور بار پسینوں والی پریوں کے پاس سے گزرتا۔ آنکھیں بند کر لیتا تاکہ کوئی روشنی، کوئی بُو، کوئی تازہ ہوا میرے ا نہ گھس جائے۔

۱۸ر اکتوبر کا دن میرے لیے بہت اہم ہے کیونکہ میں نے اس روز زندگی کا ایک اہم سبق سیکھا۔ م نام ارسلان ہے اور دادا کا خیال ہے کہ جس کا نام شیر ہو وہ کبھی بزدل نہیں ہُوا کرتا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جمعرا کی رات جب اکتوبر کی اٹھارہ تاریخ تھی، میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ کبھی بھی انسان کے نام کا اس کی طبیعت اثر نہیں ہو پاتا۔

میں کھانا کھلانے پر مامور تھا۔ تین گھنٹے سے بے سری کم تالی لڑکیاں ہلڑ مچاتی رہیں۔ میری بہن جو سبزی مائل رنگ کی مدقوق سی لڑکی ہے رنگ لیڈر بنی ہر طرف دندناتی پھرتی ہے۔ لڑکی والیاں مہندی کے تھال لیے سو کے بلب میں اوپر جا رہی ہیں۔ ان کے قہقہے اونچے اور لباس شوخ ہیں۔

وہ ان ہی سب میں چھوٹا سا تھال اٹھائے آتی ہے۔ اس کے گوٹے جڑے تھال کی تمام موم بتیاں یں بجھ گئی ہیں۔ صرف اس کا چہرہ پورنماشی کے چاند کی طرح روشن ہے۔ وہ ابھی ابھی اوپر آئی ہے میں نے لڑکی نہیں دیکھی۔ نارنجی، سرخ، آتشی گلابی کپڑوں کے سیلاب میں اس کے کپڑے فاختہ رنگے ہیں۔ اس کے کُھلے، گھنے اور کُولھوں تک لمبے ہیں۔ شنیل کے سیاہ کپڑے کی طرح چمکیلے۔ میرا دل اسے دیکھ کر دھک سے بند اور فرنی کی ٹھوٹھی میرے ہاتھ سے گرتی گرتی بچی۔ یک دم مجھے خیال آیا کہ میرے پاس تو صرف دو جینز ہیں رنگ بھی بدقسمتی سے ایک سا ہے۔

وُہ مجھ سے بیس گز دُور بُت بنی بیٹھی رہی۔ اب کمرے سے نہ بُو اُٹھ رہی ہے نہ لڑکیاں بے تال بجا رہی ہیں۔ رنگ و بُو کے ہالے میں وہ سب سے خوب صورت لگ رہی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ آنکھوں کا وہی مرکز ہے۔ میں بار بار سوچتا رہا کہ اس سے کیا بات کروں! کاش ہم علیٰحدہ مل سکیں وہ قربا کے انٹیلنے کے پاس آ سکے۔

پھر وہ اگلے دن آہستہ آہستہ آئی۔ جیسے خواب میں ہو۔ اس قاتلا نے آ کر کہا "دُلھن کا کھ دے دیں جی!"

دُلھن کا کھانا اٹھا کر مجھے ساتھ چلنا ہے۔ کُل تین کمروں کا فاصلہ —— وُہ ساتھ ہے اور آہستہ چل [illegible] رات جیسی [illegible] نہیں۔ اٹھارہ اکتوبر گزر چکی ہے میں شیر سے گیدڑ بن چکا

نے کاڑسے دروازے میں مجھ سے پکڑتے ہُوئے پُوچھتی ہے ؛

"کیا آپ کے پاس ایک ہی جینز ہے جی ؟"

سے ڑسے لے کر کُہنی سے دروازہ بند کرتی ہے میں اپنی جینز دیکھتا ہوں حالانکہ یہ وہی پتلون نہیں ہے جو ی کی رات میں نے پہنی تھی۔ لیکن میں آپ کو بتا چکا ہُوں کہ دونوں جینز کا ایک ہی رنگ ہے اور بائیں گھٹنے ا اوپر تھوڑی تھوڑی پھٹی ہُوئی ہیں۔

میں اور میری بہن ہر روز قربان صاحب کے گھر جاتے ہیں۔ میں کسی سے کہہ نہیں سکتا کہ مجھے اس فاختہ کی ہے۔ میری بہن کے دل میں ایک تجسس ہے کہ کیا اب بھی قربان صاحب کو ان کا بیٹا دوبئی سے پیسے بھیجتا ہے ں! —— نہ میں نے اپنی خواہش کا کبھی اظہار کیا ہے نہ میری بہن نے اپنے اندر اُٹھنے والا سوال کسی چھا ہے۔

لیکن مجھے لگتا ہے کہ وُہ فاختہ جو قربان صاحب کے انٹینے پر بیٹھا کرتی تھی اسے کسی طرح ہم دونوں کے دل کا لوم ہو گیا ہے —— اسی لیے تو وُہ شادی والے دن کے بعد کبھی آئی ہی نہیں۔

میرزا ادیب

ایک تفصیلی
مطالعہ

لاوُپُتّر

شہر کا وہ حصّہ کم و بیش نصف میل کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا اور اپنی آبادی کے لحاظ سے واضح طور پر ایک تضاد کی نشان د ر رہا تھا۔ یہ تضاد اس بنا پر تھا کہ اس کے مشرقی حصّے میں تو شاندار بنگلے تھے۔ وسیع لانوں والی کوٹھیاں تھیں اور اُونچے اُو مکانات تھے اور اس حصّے کے سامنے مغرب کی طرف سینکڑوں چھوٹے چھوٹے گھر آباد تھے۔ یہ گھر دور سے دیکھنے پر مٹی کے تودو ایک سلسلہ دکھائی دیتے تھے جو زمین کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پھیل گیا ہو۔

پندرہ بیس برس پہلے دونوں حصّوں میں کوئی خاص فرق نہیں تھا، یہاں ایک جیسے مکان کھڑے تھے۔ ان کے بیشتر مکی کی حالت بھی قریب قریب ایک جیسی تھی پھر یہ ہوا کہ خلیجی ریاستوں کو ایسے ہُنرمندوں کی ضرورت پیش آئی کہ جو ان کے شہروں کی تعم امنگوں اور خوابوں کو مادّی صورت دے سکیں۔ اتفاق سے مشرقی حصّے میں مختلف قسم کے ہُنرمند دور و نزدیک جاکر محنت مزدوری کر قوتِ لایموت بڑی مشکل سے حاصل کرتے تھے۔ اُنھوں نے جب سُنا کہ ان ملکوں میں ہُنرمندوں کی شدید ضرورت ہے تو اُنھوں نے مو کو غنیمت جانا۔ چند دنوں کے اندر اندر ریاستوں میں داخل ہونے کے اجازت نامے مل گئے اور یہ ہنرمند جوق در جوق وہاں روانہ

یہ ہنرمند رات دن محنت کرکے دولت اکٹھی کرنے لگے اور اس دولت کا زیادہ حصّہ اپنے اپنے گھروں کو بھیجنے لگے۔ اس نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے غربت خوشحالی میں بدلنے لگی۔ کچے پکّے مکان بنگلوں کی صورت اختیار کرنے لگے۔ اور یہ حصہ وہ کچھ ا جو دولت کی فراوانی بنانے پر قادر ہے۔

یہ دو الگ الگ دنیائیں تھیں۔ ایک تو خوشحال لوگوں کی دنیا تھی اور دوسرے پسماندہ لوگوں کی۔ ہر دُنیا اپنے اپنے حال میں تھی۔ ان کے درمیان بظاہر کوئی رابطہ یا تعلق نہیں تھا۔ ہر ایک کے اپنے اپنے مسائل تھے اور اپنے اپنے طور پر ان مسائل کو حل کرتے

پسماندہ آبادی میں ایک بوڑھا آدمی بابا نیمو بھی رہتا تھا۔ ماں باپ نے پینسٹھ برس پہلے، جب یہ دنیا میں آیا تھا، اس نعمت اللہ رکھا تھا جو ہوتے ہوتے نیمو رہ گیا اور جب بڑھاپے کی دہلیز پار کرنے لگا تو بابا نیمو بن گیا اور اس کے جاننے والے احتراماً بابا ہی کہتے تھے۔

بابا کو ردّی فروشی کا پیشہ اپنے باپ سے ملا تھا۔ باپ نے اس کی تعلیم کی بجائے یہ پسند کیا کہ اُس کا بیٹا اس کا سات آمدنی میں اضافہ کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ردّی فروش کا بیٹا ردّی فروش ہی رہا۔

نیمو نے اپنے باپ کے برعکس اپنے دونوں بیٹوں کو تعلیم دلوائی۔ بیٹے جوان ہوئے تو اُنھوں نے یہ پسند نہ کیا کہ ا باپ ایسا فضول پیشہ برقرار رکھے۔ اُنھوں نے کہا:

"ابّا یہ پیشہ عزت کا پیشہ نہیں ہے۔ چھوڑیے اِسے۔"

نیمو بولا۔

"یہ عزت کا پیشہ ہے یا نہیں ہے پر مت بھولو اسی پیشے نے تمھیں عزت دی ہے۔"

بیٹوں نے باپ کو بہت سمجھایا مگر باپ نے فیصلہ کرلیا تھا کہ بیٹے جو چاہیں کریں، وہ اپنا پیشہ ترک نہیں کرے گا اور بیٹوں کی محتاجی بھی قبول نہیں کرے گا۔

بڑے بیٹے کو اس کے ایک دوست نے امریکا بُلوا لیا اور اپنی بہن کی اُس سے شادی کرادی۔ اُسے امریکا بُلوانے کا یہی تو مقصد تھا۔ آصف امریکا گیا اور وہیں کا ہوگیا۔

دوسرا بیٹا بجلی کا کام کرتا تھا وہ دوبئی چلا گیا اور ایسا گیا کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا۔

آصف کبھی کبھی باپ کو خط لکھ دیتا تھا مگر دوسرے بیٹے کو اس کی بھی توفیق نہیں ہوتی تھی۔

ایک روز بابا نیمو تنور سے روٹی سالن لاکر کھا رہا تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔

بابا نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک بڑھیا سُوٹ پہنے ہوئے لڑکا کھڑا تھا۔

بابا اُسے دیکھ ہی رہا تھا کہ لڑکے نے آگے بڑھ کر نیمو کو اپنی باہوں کے حلقے میں لے لیا۔

ابّا! پہچانا نہیں مجھے۔ میں آصف ہوں۔"

"آصف — تم"، بابا کو اُس کی بات پر یقین نہ آیا۔

آصف باپ کو حیرت میں گُم صُم چھوڑ کر اندر جانے لگا۔ اس کے ساتھ اُس کی خوبصورت، زیورات میں لدی پھندی بیوی بھی تھی اور اولاد بھی۔ ایک بچہ — بچہ گاڑی میں تھا۔ اُس کے باپ نے جب اُسے گاڑی سے نکال کر گود میں اُٹھایا تو نیمو نے دیکھا کہ وہ اپاہج تھا۔ نیمو کو قدرتاً دُکھ ہوا مگر اس کے بارے میں اپنے بیٹے سے ایک لفظ تک نہ کہا۔

پُرلطف شب و روز گزرنے لگے۔ آٹھویں روز آصف نے باپ سے مخاطب ہوکر کہا۔

"ابّا جی! میری ڈیوٹی کا معاملہ ہے۔ پرسوں مجھے وہاں حاضر ہوجانا چاہیے — ورنہ ملازمت ختم ہوجائے گی۔"

"اتنی جلدی جا رہے ہو؟" باپ نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا کیا جائے ابّا جی! نوکری کی مجبوری نہ ہوتی تو مہینہ بھر رہتا۔"

بیٹے کا معذرت خواہانہ انداز دیکھ کر وہ خاموش رہا۔

"ہاں ابّا جی! ایک تکلیف دے رہا ہوں۔ یہ لال دین یہاں رہے گا۔"

یہاں رہے گا — یہ؟"

بابا نیمو نے اپاہج بچے کو دیکھتے ہوئے استعجاب انگیز لہجے میں پوچھا۔

"بڑا نیک بچہ ہے، کوئی تکلیف نہیں دیتا" لال دین کی ماں بولی۔

بابا اس بات پر خوش تھا کہ اُس کے بیٹے نے کسی میم کی بجائے ایک مسلمان لڑکی سے شادی کی تھی۔ اس لیے وہ اس کی بات رَد نہ کر سکا۔ بظاہر چپ رہا مگر اُس کے دل میں یہ سوال اُٹھ چکا تھا کہ اس کا بیٹا اور بہو اپنے بیٹے کو یہاں کیوں چھوڑے جا رہے ہیں۔ اپاہج ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو ان کی اولاد نا۔

بابا کی خاموشی کو ان دونوں نے رضامندی پر محمول کیا اور بار بار شکریہ ادا کیا۔

"اباجی! میں ہر ماہ باقاعدگی سے پیسے بھیجتا رہوں گا۔ چودھری ذکاءاللہ کو آپ جانتے ہیں نا؟"

بابا چودھری صاحب کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ خوشحال دنیا کے ایک دولت مند آدمی تھے۔

"جانتا ہوں" بابا نے جواب دیا۔

"پیسے آپ وہاں سے لیا کریں گے۔"

مہمان چلے گئے اور اپاہج بچہ بابا کے گھر میں رہ گیا۔

بیٹے، بہو اور اُن کے باقی بچوں کے جانے کے بعد بابا نے پہلی مرتبہ اپنے اپاہج پوتے پر گہری نظر ڈالی۔ وہ چارپائی پر چپ بیٹھا اُوپر چھت کو گھورے جا رہا تھا۔

"اللہ مجھے تو اس بڑھاپے میں ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ یہ میرا کیا سہارا بنے گا، مجھے اس کا سہارا بننا پڑے گا" نے بچے کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

"میں نے اسے اپنے یہاں رکھنے پر کیوں ہامی بھر لی۔ انکار کر دینا چاہیے تھا۔ یہ میں نے کیا کیا ہے۔ ایک جنجال پالنا پڑے گا"

وہ سوچتا رہا لیکن اس وقت سوچنے سے کیا ہو سکتا تھا، تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔

"لالو" بابا کے منہ سے بے اختیار لال دین کی بجائے لالو نکل گیا۔

لالو نے اس کی آواز سُنی نہیں تھی۔ وہ بدستور چھت کو گھور رہا تھا۔ بابا اپنی چارپائی سے اُٹھ کر اُس کے پاس چلا گیا۔ اُس بازو پکڑ کر ہلایا۔ "لالو"

لالو نے چھت سے نظریں ہٹا کر اپنے دادا کی طرف دیکھا۔ اس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔

نہ جانے وہ کونسا جذبہ تھا جو ایک گرم رَو کی طرح اُس کی نَس نَس میں سرایت کر گیا تھا۔ بابا رہ نہ سکا۔ اُس نے جھک کر کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اُس کے پاس بیٹھ گیا۔

"لالو کیا بات ہے پُتر"

لالو نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"بولو نا۔ ابا امی یاد آ گئے ہیں؟"

لالو نے نہ منہ سے کچھ کہا، اور نہ سر کے اشارے سے اثبات یا نفی میں جواب دیا۔ البتہ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ا

باباکو اُس کا خاموش رہنا اور خاموشی سے آنسو بہانا عجیب سا لگا، مگر اِس سے وہ بہت متاثر ہوا۔ وہ سوال جو چند لمحے اُس کے ل میں سر اُٹھا کر اُسے پریشان کر چکا تھا، اب نہ جانے کہاں دب گیا تھا۔ بابا کے بازو اپاہج بچّے کی طرف بڑھنے لگے اور دوسرے ہی لمحے میں وہ اُس کی گود میں تھا۔

بچّہ ٹکٹک اُسے دیکھ رہا تھا اور نہ جانے دل میں کیا سوچ رہا تھا، تاہم اُس کے ماتھے کی سلوٹوں میں ایک ایسا سوال اُبھر ہا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ میرے ماں باپ مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے ہیں، کب آئیں گے۔ میں کب اُن کے ساتھ جاؤں گا؟

بابا نمو نے اُس کی پیشانی چوم لی۔ "یہ ہے تو میرا پوتا نا" اپاہج ہے تو کیا ہوا؟

لالو شام تک خاموش رہا۔ اُس نے اپنے دادا سے کچھ بھی نہ کہا۔ دادا بار بار پوچھتا "بھوک لگی ہے، دودھ پیو گے؟" ہ کوئی جواب نہیں دیتا تھا۔

رات ہونے کو آئی تو بابا نمو نے گلاس میں دودھ ڈال کر گلاس اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"پی لو لالو بیٹے۔ پی لو۔"

کئی لمحے اُس کے ہونٹ آپس میں جُڑے رہے، پھر اُس نے چند گھونٹ پی لیے۔

بابا نے رات اُسے اپنے پہلو میں سُلایا۔ لگتا تھا بچّے کو سخت تھکاوٹ ہو چکی ہے۔ پہلے تو وہ پندرہ بیس منٹ بے قرار ہا، اس کے بعد اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ گہری نیند سو گیا۔

اُس کے سوتے ہی بابا چارپائی سے اُٹھ کر گھر کی واحد کرسی میں بیٹھ گیا۔ اُس کی نگاہیں لالو کے چہرے سے ہٹتی ہی نہیں تھیں۔ ہ چہرہ زرد تھا، زندگی کی توانائیوں سے محروم محسوس ہوتا تھا۔ وقفے وقفے بعد اس پر سیاہی سی چھا جاتی تھی اور خود ہی غائب ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ کانپنے لگتا تھا۔ بابا بے چین ہو کر اس کی طرف اپنی باہنیں بڑھاتا تھا مگر اُس سے پہلے کہ اس کے ن کو چھوئے وہ یہ سوچ کر ایک قدم پیچھے ہٹ جاتا تھا کہ کہیں اس کی نیند اُچاٹ نہ ہو جائے اور وہ رونے نہ لگ جائے۔

"شاید یہ اندر ہی اندر رو رہا ہے" بابا نے سوچا "آخر اس کے ماں باپ اِسے چھوڑ گئے ہیں، ضرور دکھ محسوس کرتا ہو گا۔"

کرسی پر بیٹھے بیٹھے بابا نے پہلی مرتبہ اس کے سراپا پر نظر ڈالی۔

اس کی باہنیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ یہی حال ٹانگوں کا تھا۔ چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ گڑھے تھے۔ ناک پچکی ہوئی۔

"میں اسے کیسے سنبھال سکوں گا؟"

بابا نے خود سے سوال کیا۔

"میں اُسے لکھ دوں گا کہ اپنی سوغات لے جاؤ۔"

یہ فقرہ اُس نے غصّے سے کہا، مگر اُس کے غصّے کا جذبہ جلد ہی پانی کی سطح پر پھیلی ہوئی صابن کی جھاگ کی طرح تحلیل ہو گیا۔ وہ خود سے ہہ رہا تھا۔ مجھے تو اس کا پتا ہی معلوم نہیں ہے۔ خط لکھوا کر کیسے بھیجوں گا۔"

وہ بے تابی کے زیرِ اثر کرسی سے اُٹھ بیٹھا۔

میں کتنا بے وقوف آدمی ہوں۔ پتا پوچھا ہی نہیں۔ اسے کچھ ہوگیا تو کیا ہوگا؟“

اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اس کے پوتے نے چیخ ماری ہے —— اس کا بدن کانپنے لگا۔

”کیوں لالو —— میرے بچے! کیا ہوا؟“

لالو نے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔

”کیا ہوا“

”امّی“ لالو کے ہونٹوں سے ہلکی سی آواز نکلی۔

نیمو نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔

”وہ آجائیں گے لالو“

لالو رونے لگا۔

”نہ رو پُتّر! نہ رو، لالو پُتّر! نہ رو“

نیمو اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

”امّی، ابّو“

وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ بابا اِسے گود میں لیے کمرے میں چلتا رہا اور جب دیکھا کہ بچے کی سسکیاں ہلکی پڑگئی ہیں ت
آہستگی سے بستر پر لٹا دیا، اور خود بھی اس کے پاس لیٹ گیا۔

دن چڑھا۔ بابا کی آنکھ کُھلی تو اُس نے اپنے پوتے کے چہرے پر نظر ڈالی، وہ ابھی سو رہا تھا۔ اُس کے گالوں پر
دھبے پڑے ہوئے تھے۔ یہ اُس کے آنسوؤں کے نشان تھے۔ بابا کو یہ محسوس کرکے دُکھ ہوا کہ بچہ اس کی بے خبری
آنسو بہاتا رہا ہے۔

چند لمحے لالو کو مسلسل دیکھنے کے بعد اُس نے کوٹھڑی میں جا کر کُرتے کی جیب میں سے ایک کُنجی نکالی، دائیں
چھوٹی سی الماری کو کھولا، برتنوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھیلے کو اُٹھایا، اُس میں سے کچھ نوٹ نکال کر کُرتے کی جیب میں ڈال
کوٹھڑی سے باہر آگیا۔

لالو گہری نیند سو رہا تھا۔

”کیا اِسے تنہا چھوڑ کر بازار چلا جاؤں؟“ اُس کے دل میں یہ سوال اُٹھا۔ اصل میں اُسے ڈر تھا کہ اگر لالو اس ک
میں جاگ پڑا تو اپنے پاس اُسے نہ پاکر پریشان ہو جائے گا اور رونا شروع کردے گا، مگر اُس کے لیے ناشتے کا انتظام
اس نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔ جلدی جلدی قدم اُٹھا کر گلی سے نکل کر بازار میں آگیا۔ پوریاں خرید
اُسے خیال آیا کہ دُودھ کے لیے وہ برتن تو لایا ہی نہیں، پوریاں لے کر پوری قوت سے کام لیتے ہوئے تیز رفتاری سے گھر

وہ اُسی طرح سو رہا تھا۔

بابا نے پوریاں چنگیر میں رکھ دیں، گلاس اُٹھایا اور دوبارہ بازار چلا گیا۔ دُودھ لے کر لوٹا تو اُس نے دیکھا کہ لالو بستر پر بیٹھا ہُوا حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔

"لالو پُتّر!"

لالو نے کوئی جواب نہ دیا۔ بدستور چاروں طرف دیکھتا رہا۔

"پُوریاں کھاؤ گے؟"

لالو نے اُسے اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اُس کی بات سمجھ ہی نہیں سکا۔ اُس کی نظروں میں ایک سوال اُلجھا ہوا تھا۔

"پوریاں پُتّر" اور یہ کہہ کر وہ چنگیر اُٹھا لایا،

"یہ دیکھو۔ کھاؤ گے نا؟"

لالو خاموش رہا۔

"میں ابھی چائے بناتا ہوں، مزے سے کھائیں گے۔ پہلے ٹھیک ٹھاک ہو جاؤ نا۔"

وہ اُسے گود میں اُٹھا کر دروازے کے باہر نالی کے پاس لے گیا۔ اُس کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ایک ماں اپنے شیر خوار بچّے کے لیے کرتی ہے۔ اس سے فارغ ہو کر اُس کا مُنہ دھلایا اور پھر اُسے چارپائی پر لِٹا کر چُولھا جلا کر چائے بنانے لگا۔

یہ کام کرتے ہوئے اُسے ایک مبہم سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا، مگر اس نئے تجربے میں اپنی ایک لذّت بھی تھی۔

لالو آہستہ آہستہ اپنی نئی زندگی کے معمولات سے مانوس ہونے لگا۔ وہ کچھ کچھ باتیں بھی کرنے لگا، اپنی ضرورتوں کا اظہار بھی کرنے لگا۔ چارپائی سے نیچے اس کا دادا اُسے بٹھا دیتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی باہوں کے سہارے، اپنی بے جان، کمزور ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا ایک دیوار سے دوسری دیوار تک پہنچ جاتا تھا۔

اُسے اس طرح گھسٹتے ہوئے دیکھ کر بابا کے دل میں بے اختیار یہ آرزو پیدا ہو جاتی تھی کہ کاش اس کا پوتا عام بچّوں کی طرح ہوتا۔ وہ اُوپر چھت کی طرف دیکھنے لگتا اور اس کی بوڑھی آنکھیں بے اِختیار آنسوؤں سے چھلک اُٹھتیں۔

ایک مہینہ بیت گیا۔ بابا کو اخراجات کے لیے کسی قسم کی دقت پیش نہ آئی۔ بیوی کے مرنے اور لڑکوں کے باہر چلے جانے کے بعد اس کا روزمرہ کا خرچ بہت کم رہ گیا تھا۔ دونوں وقت قریبی تندور پر جا کر پیٹ بھر لیتا تھا۔ کپڑوں کے چار جوڑے کوٹھڑی میں موجود تھے۔ تن ڈھانکنے کے لیے اُسے پریشان نہیں ہونا پڑتا تھا۔

لالو کے آنے سے پیشتر اُس کی مصروفیت صرف یہ تھی کہ تنور سے روٹی کھا کر اپنی پُرانی سائیکل کے اُوپر ترازو اور بٹّے رکھ کر "ردّی والا آیا" کہتے ہوئے گلیوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ پُرانے اخبارات، بے کار کاغذ، گھی کے خالی ڈبے وغیرہ سستے داموں حاصل کر کے بازار کے کونے پر واقع ردّی کی ایک بڑی دکان پر اپنا سارا مال کبھی تھوڑے اور کبھی اچھّے خاصے نفع پر بیچ کر واپس گھر آ جاتا تھا۔ یہی تھا اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ ——— روزانہ خرچ آٹھ دس آنے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ باقی جتنی رقم بچتی

ملتی وہ کوٹھڑی کی الماری کے تھیلے میں ڈال دیتا تھا اور یوں تھیلے میں سکوں اور نوٹوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو چکی تھی۔

دوسرا مہینہ بھی ختم ہو گیا۔ لالو کا چہرہ جو ماں باپ کی جدائی کی وجہ سے بجھا بجھا سا رہتا تھا، اب اس پر کچھ رونق آگئی تھی، جب اس کا دادا اپنا کام نپٹا کر اس کے لیے مٹھائی، بسکٹ کھٹی مٹھی گولیاں لے کر آتا تھا تو وہ خوش ہو جاتا تھا۔ دادا یہ ساری چیزیں تھال میں ڈال کر اُس کے سامنے رکھ دیتا تھا تو وہ اُنھیں رغبت اور شوق سے کھانے لگتا تھا۔

دادا جب صبح سویرے اسے ناشتا کروا کر اپنی سائیکل باہر نکالتا تھا، اُس پر ترازو اور بٹے رکھنے لگتا تھا تو وہ اپنی باریک آواز میں کہتا تھا۔

"بابا!"

"جی میرے پُتر"

"نیچے اُتار دو"

بابا اُسے گود میں لے کر ردّی پر بٹھا دیتا۔ بابا نے گھر میں جتنی چادریں اور دریاں تھیں، ان سب کو زمین کے اُوپر بچھا دیا تھا تاکہ اس کے پوتے کو کوئی چیز نہ چُبھے اور وہ آسانی سے کمرے کے اندر گھسٹتا پھرے۔

اُدھر بابا گلیوں میں گھومتا رہتا تھا "ردّی والا آیا ہے" کی آواز مشینی انداز میں اُس کے گلے سے نکلتی رہتی مگر اس کا دل لالو ہی کے گرد چکر لگاتا رہتا اور جب وہ محسوس کرتا کہ دُھوپ میں تیزی آگئی ہے اور اُس کی جیب میں چند سکّے محفوظ ہو گئے ہیں تو وہ اپنی سائیکل کا رُخ گھر کی طرف پھیر لیتا۔ لالو سائیکل کی گھنٹی کی آواز سُن کر دروازے پر آجاتا "بابا" کہہ کر اپنے دادا کا خیر مقدم کرتا۔

دوپہر بابا کا دل چاہتا تو دو تین گھنٹے گلیوں میں گھوم پھر لیتا۔ دل نہ چاہتا تو پوتے ہی سے کھیلتا رہتا، باتیں کرتا رہتا اور شام آتی تو اُسے گود میں اُٹھا کر یا گاڑی میں بٹھا کر گھنٹہ پون گھنٹہ بازاروں کی سیر کراتا رہتا۔ گھر واپس آتا تو تھک چکا ہوتا، مگر جیسے ہی لالو کو چارپائی پر بٹھا کر اس کا مسرور چہرہ دیکھتا تو اُس کی ساری تھکاوٹ دُور ہو جاتی اور اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے اندر نئی زندگی آگئی ہے۔ اس کے اردگرد روشنیاں ہی روشنیاں پھیل گئی ہیں — وہ اب ایک نئے، توانا جذبے سے جی رہا ہے۔

تیسرے مہینے کے چھ دن گزرے تھے کہ چودھری ذکا، اللہ کے نوکر نے ایک صبح اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

وہ لالو کو ناشتا کروا کر چند منٹ پہلے فارغ ہوا تھا اور اپنا سائیکل ایک میلے کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔

دروازہ کھولا تو چودھری صاحب کے نوکر کو پہچان لیا۔

"چودھری صاحب کہتے ہیں۔ پیسے لینے کیوں نہیں آئے؟"

بابا کو یاد آگیا کہ اس کے بیٹے نے کہا تھا "میں ہر مہینے چودھری ذکا۔ اللہ کو رقم بھیجتا رہوں گا۔ وہاں سے وصول کر لیتے رہنا۔"

"یہ لو دو مہینے کی رقم" نوکر نے ایک لفافہ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"دیکھ لو" نوکر نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ شکریہ۔"

نوکر جانے لگا۔ دو قدم چل کر رُک گیا اور بولا۔

"بابا! چودھری صاحب نے پوچھا ہے۔ برخوردار کا جی لگ گیا ہے؟"

بابا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"روتا دھوتا تو نہیں ہے؟"

"آؤ دیکھ لو۔ کیسا لگتا ہے۔"

بابا اُسے اندر لے گیا۔ لالو ابھی چارپائی کے اُوپر ہی دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھا تھا۔

"بابا تم کس طرح اس کی پرورش کر رہے ہو؟"

بابا کا سینہ یہ لفظ کہتے ہوئے پھُول گیا۔

"پوتا ہے میرا۔ کوئی غیر تو نہیں ہے۔"

نوکر کے جانے کے بعد بابا نے وہ لفافہ لالو کے آگے رکھ دیا۔

تمھارے باپ نے روپے بھیجے ہیں" تمھارے لیے۔"

لالو، لگتا تھا، یہ لفظ سُن کر خوش نہیں ہوا۔ اُس نے لفافے کی طرف ہاتھ بھی نہ بڑھایا۔

سُورج ہر روز طلوع ہوتا تھا اور اُس کی پہلی شعاعیں دیکھتی تھیں کہ بابا نیمو اپنی چارپائی سے اُٹھتا ہے۔ بسم اللہ پڑھ کر اپنے سوئے ہوئے پوتے کے منہ پر پھونک مارتا ہے، اس کی خیر خیریت کی دُعا کرتا ہے، پھر دروازے کے باہر سے کُنڈی لگا کر بازار چلا جاتا ہے۔ تازہ دودھ، مکھن، بند لے کر لوٹ آتا ہے۔ لالو جاگ اُٹھتا ہے تو اُسے بڑی نرمی سے اُٹھا کر باہر نالی کے اُوپر لے جاتا ہے۔ واپس لا کر اُس کا منہ دُھلاتا ہے۔ توے پر بند گرم کر کے اس پر مکھن لگاتا ہے اور بڑے پیار سے اُسے ناشتا کراتا ہے۔

سُورج کی شعاعیں یہ منظر ہر صبح دیکھتی تھیں اور وقت بیت رہا تھا۔

بابا کو اپنے ان کاموں سے ایسی محبت ہوگئی تھی کہ وہ سمجھنے لگا تھا اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اُس کی زندگی ادھوری رہ جائے گی۔

اُس دوپہر کو بابا اپنی پہلی ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد چارپائی پر ذرا آرام کر رہا تھا اور لالو کسی رسالے کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ یہ تصویروں والا رسالہ بابا کو ردی میں ملا تھا۔

اور وہ اُسے بیچنے کی بجائے پوتے کے دل بہلاوے کے لیے گھر لے آیا تھا۔

"بابا!" لالو نے دادا کو پکارا۔

نیمو فوراً اُٹھ بیٹھا۔

"کیوں پتر کیا بات ہے؟"

"باہر کوئی ہے" لالو نے اُسے مطلع کیا۔

نیمو باہر آیا۔ اُس کے سامنے چودھری ذکا اللہ کھڑے تھے۔

"چودھری جی! کیوں تکلیف کی ہے، مجھے حکم دیتے، حاضر ہو جاتا۔"

"کوئی بات نہیں بابا! یوں کرو۔ اپنے پوتے کو اُٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔"

یہ لفظ سُن کر نیمو حیران رہ گیا۔ چودھری کرنا کیا چاہتا ہے۔ میں اپنے پوتے کو اُٹھا کر کیوں اُس کے ساتھ چلوں معاملہ کیا ہے؟

چودھری صاحب نے بابا کو کشمکش و پیچ کی کیفیت میں دیکھا تو بولے۔

"گھبراؤ نہیں بابا! اچھے کام کے لیے کہہ رہا ہوں۔"

"اچھا جی"

نیمو کچھ نہ سمجھتے ہوئے اندر گیا۔ لالو دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔

"کون ہے بابا!"

"وہ اپنے چودھری صاحب ہیں۔"

یہ کہہ کر بابا نے پوتے کو جلدی سے نیا لباس پہنایا۔ اس دوران دونوں ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے رہے۔

بابا لالو کو گود میں اُٹھا کر باہر آ گیا۔

گلی کے باہر چودھری صاحب کی گاڑی کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ بابا اور لالو بیٹھ گئے چودھری صاحب اگلی سیٹ پر چلے گئے۔

لالو کے لیے گاڑی میں بیٹھنا کوئی نیا تجربہ نہیں تھا۔ امریکا میں اُسے بارہا گاڑی میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ البتہ بابا کے لیے یہ ایک نیا واقعہ تھا۔ مگر وہ اِس تجربے سے کوئی لطف نہیں اُٹھا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے باطن میں ایک کھلبلی سی مچی تھی۔ بار بار اُس کے ذہن میں یہ سوال اُٹھتا تھا: "آخر ہمیں لے جایا کہاں جا رہا ہے اور کیوں لے جایا جا رہا ہے۔"

گاڑی ایک شاندار بنگلے کے پورچ میں رُک گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی سے نکل کر کال بیل پر اُنگلی رکھی اور کسی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد دروازے پر ایک عورت آئی، ڈرائیور نے اُسے کچھ کہا۔

نیمو بدستور اپنی اُلجھن میں گرفتار تھا اور لالو کی حالت بھی اپنے دادا کی کیفیت سے کچھ مختلف نہیں تھی۔

ایک بھاری بھرکم، اعلیٰ قسم کے سُوٹ میں ملبوس آدمی آ گیا۔ چودھری صاحب جو گاڑی سے باہر آ چکے تھے، فوراً اُن کی طرف لپکے اور مصافحہ کرتے ہوئے انھوں نے کچھ کہا۔ اُس کے جواب میں آنے والے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دو تین منٹ گزرے ہوں گے کہ بابا، لالو، چودھری صاحب اور وہ صاحب ایک بہت شاندار ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے تھے۔

اور وہی عورت جس نے دروازہ کھولا تھا، چائے کی ٹرالی لا رہی تھی۔

ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے بعد چودھری صاحب نے میزبان کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر بابا کو مخاطب کیا۔

"بابا یہ ہیں سیٹھ حاکم علی صاحب۔ ہمارے ملک کے بڑے نیک آدمی ہیں۔ بھلائی کے کام کرتے رہتے ہیں، سارا ملک ان کی عزت کرتا ہے۔ انھوں نے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ ساتھ والی کوٹھی میں۔ اِس میں وہ بچے پرورش پاتے ہیں جو لالو جیسے ہیں میرا مطلب سمجھ گئے ہونا۔"

بابا نے سر خم کر کے خاموشی سے جواب دے دیا۔

"اِس ادارے میں کوئی پندرہ بچے ہیں ——"

"پندرہ نہیں بائیس" سیٹھ صاحب نے چودھری صاحب کے فقرے کی تصحیح کی۔

"اچھا" چودھری صاحب کے لہجے میں تحسینی پہلو غالب تھا۔ "پچھلی مرتبہ جب میں یہاں آیا تھا تو پندرہ تھے۔ اللہ کے فضل سے آپ کی نیکی کا کام بڑھتا جا رہا ہے۔"

"بس اُس کا کرم ہے۔" سیٹھ صاحب نے اپنے دائیں ہاتھ کی اُنگلی اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

چودھری صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"یہ بچے بڑے اچھے ماحول میں رہتے ہیں۔ نوکر چاکر ہر وقت اِن کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کا علاج معالجہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ بابا! تمھارے لیے لالو کی پرورش مشکل ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس بچے کو یہاں داخل کر دو۔"

بابا کے ذہن میں یہ کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ وہ اپنے پوتے کو کہیں چھوڑ کر گھر چلا جائے گا۔ وہ فوری طور پر اپنے ذہنی ردِعمل کا اظہار نہ کر سکا۔

"میری مانو بابا! اس میں تمھارے لیے اور لالو کے لیے ہر طرح بہتری ہے۔"

آدھ گھنٹہ باتوں میں گزر گیا۔ آخر میں بابا اپنے پوتے کو سیٹھ صاحب کے اِدارے کے سپرد کرنے پر نیم رضامند ہو چکا تھا۔

وہ جب تنہا دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں آیا تو چارپائی پر لالو کو نہ پا کر اُس کا دل ڈوبنے لگا۔

اُس روز وہ شام تک چارپائی پر لیٹا رہا اور رات آئی تو کچھ کھائے بغیر سو گیا۔

صبح طلوع ہوئی۔ اُس کی اوّلین شعاعوں نے غیر مرئی ہاتھوں سے اُس کے دروازے پر دستک دی، مگر وہ نہ اُٹھا۔ لیٹا ہی رہا۔

تین بار سورج طلوع ہوا، اور غروب ہوا۔ بابا کا دل کسی کام میں بھی نہیں لگتا تھا۔ روٹی کھاتے ہوئے، سائیکل کو کوٹھڑی میں سے باہر نکالتے ہوئے، گلیوں میں سے گزرتے ہوئے، لمبے لمبے وقفے سے "ردّی والا آیا" کی آواز نکالتے ہوئے لالو کی صورت بار بار اُس کی آنکھوں تلے آ جاتی تھی، اور وہ دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔

اِن تین دنوں میں اُس نے محسوس کیا کہ اس کا جیون اُدھورا ہو گیا ہے۔ وہ کوئی ایسی شے کھو چکا ہے کہ اس کی زندگی میں ایک لمحہ بہ لمحہ وسیع ہوتا ہوا خلا پیدا ہو گیا ہے۔

چوتھے روز وہ تیسرے پہر سیٹھ صاحب کے دروازے پر تھا اور ان سے جب کہہ رہا تھا۔

"سیٹھ صاحب! میرا لالو مجھے دیں۔" اس کی ساری روح اس ایک فقرے میں تحلیل ہو کر رہ گئی تھی۔

"لے جاؤ مگر بابا! یہ اچھا نہیں کر رہے۔ تمہاری مرضی، تمہاری امانت ہے۔ میں روکوں گا نہیں۔"

بابا اپنے لالو کو واپس لے آیا۔

بابا کے فرائض کا سلسلہ از سر نو شروع ہو گیا۔ وہ نئی امنگوں کے ساتھ پوتے کے لیے ہر وہ ذمہ داری نبھانے لگا جو پہلے نبھایا کرتا تھا۔ اس کے لیے اچھی اچھی کھانے پینے کی چیزیں لانے لگا، نئے نئے لباس خریدنے لگا۔ ہر شام اسے بچہ گاڑی میں بٹھا کر سیر کرانے لگا مگر وہ نہ جانے کیوں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا پوتا پہلے جیسا خوش نہیں ہے۔

"لالو پتر!"

"بابا!"

"یار! بات کیا ہے، تو ——— پت ——— ر، بتا نا"

لالو خاموش رہا۔

"بتا نا ——— میرے پتر"

لالو کی خاموشی قائم رہی۔

آخر بابا نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"وہاں جانا چاہتے ہو؟" بابا کی مراد سیٹھ صاحب کے ادارے سے تھی۔

لالو خاموش رہا، مگر یہ خاموشی پہلی خاموشی سے مختلف تھی۔

وہ رات بابا نے کروٹیں بدل بدل کر گزار دی۔ سورج طلوع ہوا، اور اس کی شعاعیں بجھنے لگیں تو بابا پوتے کے لیے ناشتا لایا جسے پوتے نے اس انداز سے کھایا جیسے مجبوری کے عالم میں گھٹے حلق سے اتار رہا ہے۔ اس کے ایک گھنٹے بعد وہ لالو کے ساتھ سیٹھ کے ڈرائنگ روم میں تھا۔

"سیٹھ جی! یہ ——— یہاں ——— رہے گا۔"

"میں نے تو پہلے ہی تم سے کہہ دیا تھا کہ اسے واپس لے جا کر اچھا نہیں کر رہے۔ یہاں بچوں میں ہر بچے کا دل بہل جاتا ہے۔"

بابا نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور سیٹھ صاحب کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ رقم اس کے باپ نے بھیجی تھی ——— اب یہ پیسے آپ کو ملتے رہیں گے۔"

"کیوں بابا؟"

بابا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ لالو کو گلے سے لگا کر اسے بار بار چوما اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا گویا ایک ایسا جسم ہے جس کی روح اس میں سے نکل گ

گریٹ مین

میرزا ادیب

آدھی رات سے کچھ وقت گزرا ہوگا کہ نوراں اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی اور اندھیرے میں ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ شاید وہ اس تاریکی میں کسی ایسی کرن کی تلاش میں تھی جو اس کی آنکھوں کے راستے دل میں اُتر جائے۔

یہ پہلی رات نہیں تھی جب وہ اس درجہ بے تاب ہو گئی تھی کہ آدھی رات سے زیادہ لیٹ ہی نہیں سکی تھی۔ ایسی کئی راتیں آئی تھیں اور ان راتوں میں یا تو وہ سارا وقت کروٹیں بدلتی رہی تھی یا اُٹھ کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی، اور پھر ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں سکی تھی۔

وہ ایک غریب بیوہ تھی، دنیا میں اس کا کوئی بھی سہارا نہیں تھا۔ گھر کا خرچ چلانے کی خاطر وہ محلے کے گھروں میں کام کرنے پر مجبور تھی۔ اس کا اسے دُکھ ضرور تھا مگر یہ کوئی ایسا دُکھ نہیں تھا کہ وہ پوری پوری رات آنکھوں میں گزار دے۔ اس کے دُکھ کی اصل وجہ اس کا بیٹا تھا، چھبیس سال کا نواب جو اندر کمرے میں سو رہا تھا۔

نواب سے اُسے یہ شکایت نہیں تھی کہ وہ کچھ پڑھ لکھ نہیں سکا تھا، کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا۔ گھر کی ذمے داریوں میں کوئی حصہ نہیں لیتا تھا، ایسی باتوں کا گلہ تو اسے اس وقت ہوتا جب نواب ایک نارمل انسان ہوتا اور وہ نارمل انسان تھا ہی نہیں۔

ماں نے جب اس کا نام نواب رکھا تھا تو وہ غیر شعوری طور پر چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر دولت مند بنے۔ آپ کھائے ماں کو کھلائے اور وہ نواب تو بنا مگر خیالی دنیا کا۔ اس کے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑا آدمی ہے اور سب کے سب اس کی عزت کرتے ہیں اور اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ خود کو گریٹ مین تصور کرتا تھا اور یہ اس بناء پر کہ چراغ دین ٹھیکیدار کا بڑا لڑکا جو کسی کالج میں پڑھتا تھا اس نے نواب کو بتایا تھا کہ تم گریٹ مین ہو۔ یہ لفظ سن کر نواب ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگا تھا

"ارے میاں تم گریٹ مین ہو۔ گریٹ مین کا مطلب ہے بڑا آدمی، تم بڑے آدمی ہو یعنی گریٹ مین ہو۔ سمجھے؟"

نواب نے یہ لفظ یاد کر لیے تھے اور انھیں بلا محل اور بلا ضرورت اپنے ہونٹوں پہ لے آتا تھا۔ محلے میں اکثر لوگ مذاقاً اسے گریٹ مین کہہ کر ہی پکارتے تھے اور اس طرح پکارے جانے پر وہ پھولا نہیں سماتا تھا۔ پہلے پہل ماں نے سوچا تھا، ابھی چھوٹا ہے یہ نہیں سوچ سکتا کہ لوگ گریٹ مین کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں جب بڑا ہو جائے گا تو اصل حقیقت سمجھ لے گا مگر اس کی یہ اُمید خاک میں مل گئی کیونکہ نواب دوسروں کے مذاق کو مذاق سمجھ ہی نہ سکا۔ وہ خیال کرتا تھا کہ محلے کے چھوٹے بڑے جو مسکرا مسکرا کر جھک جھک کر اس کو سلام کرتے ہیں اور گریٹ مین کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو یہ سب کے سب واقعی اس کا احترام کرتے ہیں اور

حقیقتاً اسے کریٹ میں ہی تصور کرتے ہیں اور یوں وہ زیادہ سے زیادہ ابنارمل ہوتا چلا گیا۔

نوراں صرف یہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا بے شک ایک پھوٹی کوڑی بھی کما کر گھر میں نہ لائے، دن بھر گھر میں بے کار بیٹھا رہے مگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کام کرنے کے لیے جس گھر میں بھی جائے، گھر کے لوگ ہنس ہنس کر اس سے پوچھیں۔

"نوراں! کیا حال ہے تیرے نواب کا، یہ تیرا گریٹ مین کیا کر رہا ہے؟"

وہ اس طنز کو خوب سمجھتی تھی اور یہی احساس اس کے لیے اس قدر اذیت ناک ہو گیا تھا کہ اس کا جی چاہتا تھا کاش اس کا بدبخت بیٹا مر جائے تاکہ ہر روز اسے زہر کے گھونٹ تو نہ پینے پڑیں۔

محلے کے لڑکے آئے دن اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی واردات کر دیتے تھے۔ اسے کسی محفل میں صدر بنایا جاتا تھا، اور جب وہ بیٹھنے لگتا تھا تو کرسی کھسکا کر اسے گرا دیا جاتا تھا اور پھر معافی مانگ لی جاتی تھی۔ اُسے ایسی مٹھائی کھلائی جاتی تھی جس میں نمک بھرا ہوتا تھا۔ اس کی شان میں ایسے قصیدے پڑھے جاتے تھے کہ جن میں اس کا جی بھر مذاق اُڑایا جاتا تھا۔ لیکن وہ تھا کہ اس سارے مذاق کو اپنی شان میں اظہارِ عقیدت ہی سمجھتا تھا۔

اگلے دن اس کے گلے میں ایک بڑا سا ہار ڈالا گیا تھا جس میں پھولوں کے ساتھ کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی شے بھی تھی۔ نواب یہ ہار پہن کر بڑی آن بان شان سے گھر کی طرف جا رہا تھا اور محلے کے بچے اس کے پیچھے تالیاں بجا رہے تھے جب وہ گھر کی دہلیز پر پہنچا تو ماں نے اس کا ہار نوچ لیا اور کپڑے میں لپٹا پرانا جوتا نکال کر اُسے تالیاں بجانے والے بچوں پر دے مارا اور کم از کم آدھ گھنٹہ تک اُنھیں بددُعائیں دیتی رہی۔

اس کا بیٹا کتنا احمق ہو گیا ہے کہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ لوگ اُسے ذلیل کر رہے ہیں، یہ بات اس کے لیے سوہانِ رُوح بن گئی تھی اور وہ اپنی ذلت کے احساس سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی مگر اس کا بے حیا بیٹا تھا کہ ماں سے لڑ رہا تھا۔

"ماں تو پاگل ہو گئی ہے یہ میری عزت کرتے ہیں۔"

"عزت کرتے ہیں، عزت کرنے کے لیے گلے میں جوتے ڈالے جاتے ہیں؟" اور اس نے بیٹے پر اس زور سے دوہتڑ مارا کہ وہ بلبلا اُٹھا۔

نوراں کے گھر میں جب بھی ایسا ہنگامہ برپا ہوتا تھا تو عموماً اماں لبائی بھاگتی ہوئی آ جاتی تھی اور وہ وہی فقرہ کہتی تھی جو وہ کئی بار کہہ چکی تھی۔

"نوراں وہ تو پگلا ہے، تُو بھی پاگل ہو گئی ہے۔"

اور نوراں اُس کے جواب میں اپنے کُرتے کا دامن پھیلا کر اُوپر دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہتی۔

"اللہ! اسے کسی کی آئی آ جائے یا مجھے اُٹھا لے۔"

اس دن بھی اس نے یہی دُعا کی تھی اور نواب یہ کہہ کر دروازے میں سے نکل گیا تھا۔

"اب میں اس گھر میں کبھی نہیں آؤں گا۔"

مگر حسبِ معمول وہ شام کو گھر آ گیا تھا اور اس وقت اندر کمرے میں سو رہا تھا۔

نوراں کے ذہن میں تلخی بھر گئی۔ اُس نے چارپائی سے نیچے اُتر کر گھڑے میں سے ٹھنڈے پانی سے مٹی کا وہ پیالہ بھرا جس سے گھڑے کو ڈھانپا گیا تھا۔ سرد پانی جب اس کے حلق سے نیچے اُترا، اُسے ذرا سا سکون مل گیا۔ مگر یہ سکون عارضی تھا، کیونکہ اُسے پھر ایک بات یاد آ گئی تھی جس نے اُسے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

میاں نور محمد کے ہاں جو عورت برتن مانجھا کرتی تھی وہ بیمار ہو کر اپنے گاؤں چلی گئی تھی اور میاں صاحب کی بیوی نے نوراں کو کہلوا بھیجا تھا کہ وہ اس کے ہاں کام کیا کرے۔ نوراں کو تو کام کرنا تھا۔ کہیں بھی ہو۔ وہ میاں صاحب کے ہاں چلی گئی۔

جس لمحے وہ دالان سے گزر کر کمرے میں پہنچی میاں صاحب اپنی کھچڑی داڑھی میں کنگھی پھیر رہے تھے۔

نوراں نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ نوراں بہن! کیا حال چال ہے" میاں صاحب نے کنگھی میز پر رکھ کر سُرمہ دانی اُٹھائی اور آنکھوں میں سُرمہ ڈالتے ہوئے یہ سوال کیا۔

"اللہ کا شکر ہے میاں جی!"

"ہاں شکر ہی ادا کرنا چاہیئے ——— پر بندہ بڑا ناشکرا ہے"

"جی میاں جی"

"کیا کام ہے نوراں بی بی؟"

"وہ جی آپ کی بیگم نے بُلایا ہے۔ فاطمہ بیمار ہو کر چلی گئی ہے نا"

میاں صاحب نے نوراں کو ذرا غور سے دیکھا۔

"تو تم فاطمہ کی جگہ کام کرو گی؟"

نوراں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پر نوراں بہن! تیرا بیٹا تو گریٹ مین ہے۔ گریٹ مین کی مائیں دوسروں کے برتن نہیں مانجھا کرتیں"

نوراں کے ذہن میں جیسے شعلہ سا بھڑک اُٹھا اور اس شعلے کی حرارت اس کے سارے بدن میں سرایت کر گئی۔

میاں صاحب مُسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے، یہ مُسکراہٹ اسے زہر لگی اور وہ ایک لمحہ بھی وہاں نہ ٹھہر سکی۔ اس وقت خاموش رہی تھی۔ مگر اب جو اُسے یہ بات یاد آ گئی تو وہ میاں صاحب کو بد دُعائیں دینے لگی۔

میاں تیرا جنازہ اُٹھے، تجھے سانپ ڈس جائے۔

وہ بد دُعائیں دے رہی تھی اور اُس کے اپنے الفاظ اس کے کانوں میں اس طرح اُتر رہے تھے، جیسے ان میں گرم گرم تیل ڈالا رہا ہے۔ ایک مرتبہ اور اُس نے بھرا ہُوا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا اور تین چار لمبے لمبے گھونٹ بھرے۔ آدھا پانی ٹھوڑی پر سے گزر کر ان کو چھوتا ہوا گریبان تک جا پہنچا اور وہ پیالہ ہاتھ میں لیے یونہی سامنے دیوار کو گھورتی رہی۔

آسمان میں ستارے پھیکی پھیکی روشنی دے رہے تھے اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسے میں جب میاں نور محمد کے کوٹھے سے مرغے کی ککڑوں کوں کھنچتی ہوئی آواز بلند ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔

مرغا بانگ پر بانگ دے رہا تھا اور نوراں کا جی چاہتا تھا کہ وہ اگر اس کے قریب ہوتی تو اس کی گردن ہی مروڑ ڈالتی۔ اس نے میاں صاحب کی بیوی کو دل ہی دل میں گالیاں دیں جس نے اسے پال پوس کر اتنا طاقت ور بنا دیا تھا کہ اس کی آواز محلے میں دور دور تک گونج اٹھتی تھی۔

نوراں کو معلوم تھا کہ جب مرغا بانگ دیتا تھا تو اس سے تھوڑی دیر بعد مسجد سے اذان کی آواز بھی آنے لگتی۔ مگر اس صبح صرف مرغا ہی ساری فضا پر چھایا ہوا تھا۔ اذان کی آواز نہیں آئی تھی۔ شاید مؤذن سو گیا تھا یا مرغے نے وقت سے پہلے ہی لوگوں کو جگانا شروع کر دیا تھا۔

نوراں گھڑے کے پاس کھڑی رہی۔ پیالہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس نے پیالہ اوندھا کر کے گھڑے کے منہ پر رکھ دیا اور پھر برآمدے کا دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ یہ کمرہ نواب کا ڈرائنگ روم بھی تھا۔ کامن روم بھی اور خوابگاہ بھی۔ دیواروں پر پرانے کیلنڈر، انگریزی اور دیسی ایکٹرسوں کی تصویریں اور وہ ہار لٹکے ہوئے تھے جو نواب کے بزعم خویش عقیدت مندوں نے خاص خاص موقعوں پر اس کے گلے میں ڈالے تھے۔ ان کے پھول مرجھا کر ذروں کی صورت میں نیچے گرے ہوئے تھے۔

نوراں نے اندر قدم رکھا تو سب سے پہلے اس کی نظر چارپائی کے نیچے فوجی بوٹ پر پڑی۔

یہ بھاری بھرکم بوٹ غلام احمد قریشی صراف کے بیٹے نے نواب کو دیئے تھے اور یہ کہہ کر دیئے تھے کہ گریٹ مین ایسے بوٹ ہی پہنا کرتے ہیں۔

نواب کو بھلا ایسے بوٹ پہننے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے بڑی شان سے بوٹ لیے۔ شدید گرمی کی وجہ سے اس کو محسوس ہوا، جیسے اس کے پیروں کو گرم گرم شکنجے میں کس دیا گیا ہے لیکن گریٹ مین کو تو سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔

اس کے پاس یہ خوفناک بوٹ دیکھ کر نوراں کے اندر بیزاری کی لہر دوڑ گئی۔

”توبہ میرے اللہ“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس وقت اس کی نظر بیٹے کے چہرے پر پڑی۔ اس کا چہرہ پیلا پیلا دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس پر جابجا پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

نوراں کو محسوس ہوا کہ اس کے ہونٹ حرکت کر رہے ہیں، وہ کیا کہہ رہا تھا — نوراں کو سنائی نہیں دے رہا تھا مگر وہ جا تھی کہ وہ سوتے میں بھی کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کرتا، ایک دو بار جب وہ دالان میں سویا ہوا تھا، اس نے بیٹے کو بڑبڑاتے ہو پایا تھا اور جب اپنے کان اس کے ہونٹوں کے قریب لے گئی تھی۔ تو اس نے سنا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ اماں! میں گریٹ مین ہوا اماں! تم نہیں سمجھتیں کہ میں کیا ہوں۔ گریٹ مین، گریٹ مین، اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھ ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔

نواب کا ماتھا سُوجا ہوا تھا۔ اور مچھر اس کے چہرے پر اُڑ رہے تھے۔

نوراں بے قرار ہو گئی اور اس کے ہاتھ بے اختیاری کے عالم میں بیٹے کی طرف بڑھنے لگے اُس نے زور زور سے اُس کے کندھوں کو ہلایا۔ نواب نے پریشان ہو کر آنکھیں کھول دیں۔

"کیا ہے اماں ؟"

"مردار منہ پر مچھر مکھیاں اُڑ رہی ہیں ۔"

نواب نے زہرناک نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"اماں! تجھے ہزار بار کہا ہے، ذرا ادب سے بات کیا کرو۔"

"کیوں وے ادب سے بات کیوں کروں ۔ تو میرا جنا ہے یا تو نے مجھے جنا ہے ۔"

"اماں" نواب نے ہاتھ سے مچھروں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ "تو جانتی نہیں، میں گریٹ مین ہوں ۔"

نوراں نے زور سے زمین پر تھوکا۔

"لکھ لعنت تیری گریٹ مینی پر۔ سب تجھے مکھول کرتے ہیں ۔ تُو نے میرے گھر کی خاک اُڑا دی ہے ۔"

نواب اب اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اپنی انگلیاں ماتھے پر پھیر رہا تھا۔

اماں" تو نہیں مانتی۔ میں گریٹ مین ہوں۔ گریٹ مین۔ بڑا آدمی۔ لوگ میری عزت کرتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہیں تو فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سُنا تو نے۔ لوگ مجھے آتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اسی وقت اُٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ میں گریٹ مین ہوں ایسی عزت گریٹ مین ہی کی کی جاتی ہے۔ نواب کا چہرہ جوشِ بیان سے سُرخ ہو گیا تھا۔ اس کے نتھنے متحرک تھے اور وہ اس وقت بڑا مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا پھر نہ جانے کیوں ماں کی ممتا جاگ اٹھی۔ اُسے اپنے بیٹے کا وہ چہرہ دکھائی دے رہا تھا جو برسوں پہلے اس کی چھاتی سے دودھ پیتے پیتے چھاتی پر دانت مار دیتا تھا اور وہ درد سے بے قرار ہو جاتی تھی۔ چھاتی اس کے منہ سے نکال لیتی تھی لیکن جب وہ رونے لگتا تھا تو اسے سینے سے چمٹا کر پھر چھاتی اس کے منہ میں ڈال دیتی تھی۔

اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے سر کے سخت بالوں پر پھیرا اور یہ احساس کر کے کہ ان بالوں میں تیل نہیں لگایا گیا اس کا دل اور دُکھی ہو گیا۔

"نہ نہ نہ پُتر نہ ۔"

نواب کچھ سمجھے بغیر اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

"تو سمجھتا کیوں نہیں ——— اللہ ان کو سانپ کاٹے۔ ان کے جنازے نکلیں ۔"

نواب جانتا تھا کہ اس کی ماں کن لوگوں کو بددُعائیں دے رہی ہے ۔

"نہیں اماں۔ وہ میری عزت کرتے ہیں ۔" وہ بولا۔

[illegible]

نوراں نے اپنا ہاتھ بیٹے کے سر سے ہٹا لیا تھا۔

"اماں! وہ آج میرا جلوس نکالیں گے۔ میرے گلے میں ——"

"جوتیوں کے ہار ڈالیں گے، منہ پر تھوکیں گے، زور زور سے ہنسیں گے قہقہے لگائیں گے —— بے شرم۔ بے حیا ——"

دو ہتڑ مارنے کے لیے اس کے ہاتھ اُوپر اُٹھے اور پھر واپس آ گئے۔

"اماں تو پاگل ہو گئی ہے۔"

نوراں کے ہونٹ تھر تھرانے لگے۔

"وے میں پاگل ہوں کہ تو پاگل ہے تیرا دماغ پھر گیا ہے عزت بے عزتی میں فرق ہی نہیں کرتا اللہ کرے تجھ کسی کی آئے تجھے ہیضہ ہو جائے۔"

بیٹے سے بحث کے اختتام پر وہ اسی قسم کے فقرے کہتی تھی اور بار بار ماتھے پر ہاتھ مار کر قسمت کو کوستی تھی۔

وہ دروازے کی طرف مڑی فوراً پلٹ آئی۔

"میں کہتی ہوں تو آج گھر سے نہیں نکلے گا۔" اُس نے حکم دے دیا۔

نواب سر ہلانے لگا گویا کہہ رہا ہے "جو دل میں آئے کہہ دے ہو گا وہی جو میں پسند کرتا ہوں۔"

"میں کہتی ہوں تو گھر سے نہیں نکلے گا۔ ورنہ ——"

"میرا جنازہ نکلے گا۔" "نکلنے دو اماں! جنازہ ہی نکلنے دو۔"

وہ برداشت نہ کر سکی نواب پر پل پڑی۔ اُسے دھکا دے کر چارپائی پر گرا دیا اور اس کے ہاتھ اس کے چہرے، سینے اور پیٹ پر برستے رہے۔ تھک ہار کر دروازے سے باہر نکل، کنڈی لگائی اور لسی لانے کے لیے میاں نور محمد کے گھر جانے لگی۔

اس روز وہ دوپہر تک گھروں میں کام کرتی رہی اور یہ بھول ہی گئی کہ وہ نواب کو کمرے میں بند کر آئی ہے۔ دو بجے کے لگ بھگ وہ لوٹی۔ شیخ اللہ دتا کے گھر سے وہ تنخواہ نہیں لیتی تھی، اپنا اور بیٹے کا کھانا لیتی تھی۔ اور اس روز وہ چار روٹیاں اور ایک برتن میں ساگ لیے وہ گھر میں آئی۔ روٹیاں اور سالن کا برتن اُس نے چولھے کے پاس رکھ دیا۔ بند دروازہ دیکھ کر "ہائے وے میرے ربا" اس کے منہ سے نکلا۔ اور جلدی سے اس نے دروازہ کھولا اور دیکھا کہ نواب چارپائی پر آنکھیں بند کیے پڑا ہے۔

"نواب وے نواب" اس نے بیٹے کو پکارا۔

نواب نے کوئی حرکت نہ کی۔

"کیا مزے سے سو رہا ہے۔"

نواب پر اس فقرے کا بھی کوئی اثر نہ ہُوا۔

نوراں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یک لخت اُسے محسوس ہوا کہ اس نے اپنے بیٹے پر ہاتھ نہیں، چولھے پر رکھا ہوا توا پکڑ لیا ہے۔

"نواب پتر نواب"

نواب نے آنکھیں کھول دیں۔

"جلوس والے آ گئے ہیں" وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے ہی لمحے لڑکھڑا کر گر پڑا۔

تین دن گزر گئے اور اس کا بخار نہ اُترا۔ چوتھے روز وہ بے ہوش ہو گیا اور اس کے ٹھیک ساتویں روز بعد وہ چارپائی کے اوپر بے حس و حرکت، نحیف و نزار جسم کی صورت میں پڑا تھا۔

نواب مر گیا۔ نواب مر گیا۔

ہر شخص دوسرے سے کہتا تھا، دراصل وہ دوسرے کو خبر سُنا رہا تھا کہ محلے کی تفریح کا ایک بہت بڑا ذریعہ ختم ہو گیا ہے۔

نوراں خاموش تھی۔ اس کے سامنے اس کے بیٹے کو نہلایا گیا، کفنایا گیا، اس نے تو زبان سے ایک لفظ کہا اور نہ آنکھ سے ایک آنسو تک بہایا۔

محلے کی عورتیں مُنہ جوڑ جوڑ کر کہتی تھیں۔

"ہائے کیسی ظالم ماں ہے نہ روتی ہے نہ بَین کرتی ہے۔"

اور نوراں بالکل نہ روئی۔ محلے کی عورتیں اپنے مرے ہوئے عزیز یاد کر کے روتی رہیں۔

چار مردوں نے جنازہ کندھوں پر اُٹھایا اور قبرستان کی طرف چلنے لگے، جنازے کے ہمراہ صرف سات آدمی تھے۔ اور ان میں چار جنازہ اُٹھانے والے بھی شامل تھے۔ آٹھویں نوراں تھی جو اس طرح چل رہی تھی جیسے خواب میں قدم اُٹھا رہی ہے۔

جنازے کے ساتھ جانے سے اُسے کسی نے بھی نہیں روکا تھا، دراصل اُس کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں کی تھی۔

جنازہ گلی سے باہر نکل آیا۔

امجد علی ٹھیکیدار کی حویلی میں کوئی تقریب تھی۔ حویلی کے باہر دس بارہ آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے، اُنھوں نے جنازے کو آتے دیکھا تو سب کے سب احتراماً کھڑے ہو گئے، نوراں نے انھیں کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا اور یک لخت اُس کے قدم رُک گئے۔

اس نے زور سے اپنے سینے پر دوہتڑ مارا اور ہائے وے لوگو! میرا گریٹ مین مر گیا، ہائے وے میرا گریٹ مین مر گیا" اور یہ الفاظ کہتے ہوئے تیورا کر زمین کے اوپر گر پڑی۔

دو بہنیں (ایک تمثیل ریڈیو تکنیک میں)

کردار جس ترتیب سے آتے ہیں۔

راحیل —— شاہینہ کا کلاس فیلو۔ عمر چوبیس برس
شاہینہ —— ایک خوبرو، وفا شعار لڑکی۔ راحیل سے محبت کرنے والی
عمر اکیس سال
نگہت —— شاہینہ کی عزیز ترین ہم عمر سہیلی
ناجیہ —— شاہینہ کی چھوٹی بہن
سرور جان —— شاہینہ اور ناجیہ کی ماں
طلعت —— راحیل کی ماں
رلشیاں —— رشتے کرانے والی اماں
ایک خاتون

منظر :- ایک مخلوط تعلیم کا کالج
پوسٹ گریجوایٹ کلاس کا آخری دن
طلبہ اور طالبات کالج کے برآمدوں اور گراؤنڈ میں ایک دوسرے سے ملاقاتوں میں منہمک ہیں
شاہینہ کتابوں کا ایک بنڈل اُٹھائے گراؤنڈ کے ایک گوشے میں کھڑی ہے۔
راحیل، جو شاہینہ کا کلاس فیلو ہے، وہاں آتا ہے۔

راحیل : بھئی کمال ہے۔ سارے کالج میں ڈھونڈ مارا ہے تمھیں اور محترمہ یہاں مزے سے کھڑی ہیں۔

شاہینہ : راحیل تمھیں خبر تو ہے میں یا تو لائبریری میں ہوتی ہوں یا کالج گراؤنڈ میں۔

راحیل : تو یہاں ہو کیا رہا ہے ؟

شاہینہ : انتظار۔

راحیل : مجھے افسوس ہے تمھیں انتظار کرنا پڑا۔ وہ کم بخت ریاض ہے نا۔ اُس نے روک لیا تھا، نوٹس کی ضرورت تھی اُسے۔ ساری شاہینہ۔

شاہینہ : اچھا معاف کر دیا۔ اب تمھیں میرا انتظار کرنا پڑے گا۔

راحیل : وہ کیوں ؟

شاہینہ : دیکھ نہیں رہے کتابوں کا بوجھ اُٹھائے کھڑی ہوں۔

راحیل : لائبریری کی ہیں۔

شاہینہ : جی اور آج واپسی کا آخری دن ہے۔ کیونکہ آج کالج میں آخری دن ہے۔ کچھ دوستوں سے بھی ملنا ہوگا۔ بعد میں نہ جانے کب ان سے ملاقات ہو۔

راحیل : یہ سب کچھ ہو جائے گا، فی الحال میرے ساتھ چلو۔

شاہینہ: کیوں ؟

راحیل: بہت ضروری معاملہ ہے۔

شاہینہ : بہت ضروری معاملہ! کیا مطلب ؟

راحیل : بہت ضروری معاملے کا مطلب نہیں سمجھتیں، کچھ کہنا سُننا ہے۔

شاہینہ : یہ تو یہاں بھی ہو سکتا ہے کہیں جانے کی ضرورت کیا ہے ؟

راحیل : یہاں نہیں ہو سکتا مس شاہینہ اکبر، یہاں ہم چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔

شاہینہ : (ہنس کر) گھرے ہوئے ہیں، یعنی ان لڑکوں اور لڑکیوں نے ہمارا محاصرہ کر رکھا ہے۔

راحیل : یہی سمجھ لو۔ آدھ پون گھنٹے کے لیے ان سے الگ تھلگ رہ کر گفتگو کر لیں تو کیا حرج ہے۔

شاہینہ : حرج کیا ہوگا۔

راحیل : (جلدی سے) کالج ابھی چار گھنٹے کھُلا رہے گا، بہتیرا وقت ہے لوٹ آئیں گے۔!!

شاہینہ : راحیل یہ تمھاری بڑی بُری عادت ہے۔ اپنی بات منوا لیتے ہو۔ دیکھو نا، اب میں رضیہ — ساجدہ۔ رخشندہ کو کب کا کب سے اِنتظار کر رہی ہوں۔ مجھے نہیں پائیں گی تو پریشان ہو جائیں گی۔

راحیل : کہا جو ہے جلد لَوٹ آئیں گے۔ "وہ بالکل پریشان نہیں ہوں گی"۔

شاہینہ : اچھا بابا۔

راحیل : شکریہ۔

ذرا سا وقفہ جس میں موٹر سائیکل سٹارٹ کی جاتی ہے۔

بازار کی گہما گہمی۔

یہ گہما گہمی ایک آبشار اور پرندوں کے چہچہوں میں منتقل ہو جاتی ہے۔

کار کے رُکنے کی آواز اس کے دروازہ بند ہونے کی آواز۔

شاہینہ : کہو اب کیا معاملہ ہے

راحیل : شاہینہ میں نے تمھیں بتایا نہیں تھا کہ میں نے امریکا کی ایک یونیورسٹی کے سکالرشپ کے لیے APPLY کر دیا تھا۔ بالکل توقع نہیں تھی کہ یہ سکالرشپ مل جائے گا۔

شاہینہ : تو مل گیا ہے مبارک ہو۔

راحیل : تم سے مشورہ کرنا ہے۔

شاہینہ : مجھ سے مشورہ۔ قبول کرو گے میرا مشورہ؟

راحیل : بالکل۔

شاہینہ : میں ذاتی طور پر مخالفت نہیں کروں گی۔ ایک گولڈن چانس مل رہا ہے تمھیں کیوں ضائع کیا جائے؟

راحیل : مگر میں اپنے ذہن میں تذبذب سا محسوس کر رہا ہوں۔

شاہینہ : وجہ؟

راحیل : شاہینہ! مجھ سے پوچھ رہی ہو وجہ۔ کیا تم نہیں جانتیں، تم سے دُور ہونا میرے لیے کتنی تکلیف دہ اور اذیت ناک بات ہے۔

شاہینہ : ٹھیک ہے۔ مگر

راحیل : جاؤں یا نہ جاؤں، ساری رات سوچتا رہا ہوں اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

شاہینہ : جانا چاہتے ہو تو ضرور بالضرور جاؤ تمھاری ترقی کا سوال ہے، شاندار کیریئر کا مسئلہ ہے۔ میں کیسے مخالفت کر سکتی ہوں۔

راحیل : تو مجھے جانا چاہیے۔؟

شاہینہ : کہہ تو چکی ہوں۔

راحیل : لیکن میرے جانے کا انحصار تم پر ہے۔

شاہینہ : اگر مجھ پر ہے تو میں ہی اپنی رائے بتا چکی ہوں۔

راحیل : صرف یہ کافی نہیں ہے۔

شاہینہ : تو کافی کیا ہے۔

راحیل : ایک وعدہ کرنا ہو گا تمھیں۔

شاہینہ : وعدہ؟ کیا وعدہ؟

راحیل : تم میرا انتظار کرو گی۔

راحیل : ہم ہی ایک دوسرے کے شریکِ حیات بنیں گے اور یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب تک میں امریکا سے لوٹ نہ آؤں تم میرا انتظار کرو گی۔

شاہینہ : یہ کیسے ممکن ہے۔

راحیل : (لہجے میں گھبراہٹ) کیا کہنا چاہتی ہو تم۔

شاہینہ : راحیل! اگر میں زندہ ہی نہ رہی تو۔ کون انتظار کرے گا تمھارا۔

راحیل : خدا کے لیے ایسا مت کہو، مت کہو شاہینہ۔

شاہینہ : زندگی اور موت پر کسی کو اختیار ہے راحیل۔

راحیل : بہر حال تم مجھے یقین دلاؤ۔

شاہینہ : کیسے؟

راحیل : وعدہ کر کے، اس بات کا وعدہ کہ میرا انتظار کرو گی۔

شاہینہ : اگر میں وعدہ کرتی ہوں تو تمھیں بھی ایک وعدہ کرنا ہو گا۔

راحیل : میں سمجھ گیا ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔

شاہینہ : سمجھ گئے ہو تو ـــــ بس کوئی وضاحت نہیں کروں گی۔

راحیل : میں جلد سے جلد لوٹ کر آ جاؤں گا،

شاہینہ : وعدہ؟

راحیل : ہاں۔ مکمل وعدہ، اور تمھاری طرف سے،

شاہینہ : وعدہ۔ مکمل وعدہ۔

راحیل : خدا کا شکر ہے۔ میری پریشانی دُور ہو گئی ہے۔

شاہینہ : تو چلیں اب۔؟

راحیل : ہاں چلتے ہیں۔

کار سٹارٹ ہوتی ہے،

کار کے سٹارٹ ہونے کا تاثر،

ایئر پورٹ : یہ آواز ہوائی جہاز کے پنکھوں کے شور میں گُم ہو جاتی ہے۔

راحیل : خُدا حافظ شاہینہ!

شاہینہ : خُدا حافظ! اللہ تمھیں اپنی حفاظت میں رکھے۔

پنکھوں کا تیز شور جہاز کی گڑگڑاہٹ جو آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے، ہلکی ہلکی موسیقی سے فیڈ ان۔

منظر : ——— شاہینہ کا گھر

ایک کمرہ ، شاہینہ اور اس کی عزیز سہیلی نگہت مصروفِ گفتگو ہیں ،

نگہت : آج کتنے دن ہوگئے ہیں اُسے گئے ہوئے ۔

شاہینہ : چوبیس روز ،

نگہت : ان چوبیس دِنوں میں خط آسانی سے پہنچ سکتا تھا ۔

شاہینہ : راحیل نے کہا تو تھا کہ جاتے ہی خط لکھے گا ۔ بہت مصروف ہوگیا ہے ۔

نگہت : مصروفیت اپنی جگہ مگر اپنی خیریت کی اِطلاع تو دے دینا ۔ ویسے BY THE WAY تمہارا کیا خیال ہے ؟

شاہینہ : میرا کیا خیال ہوگا نگہت ! سمجھتی ہوں نیا ملک ہے ۔ سو کام ہوں گے وہاں SETTLE ہونے کے لیے ۔ فرصت ملے گی تو ضرور لکھے گا ۔

نگہت : گھر خط بھیجا ہے ۔

شاہینہ : صبح فون کیا تھا ۔ ایک روز پہلے خط مل گیا تھا خالہ جان کو ۔

نگہت : گھر خط لکھ دیا اور ادھر لکھنا بھُول گیا ۔

شاہینہ : بے وقوفی کی بات کر رہی ہو ۔ کہا ہے نا پرائے دیس میں بڑے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے خط آج یا کل مِل جائے ۔

(شاہینہ کی چھوٹی بہن ناجیہ آتی ہے)

ناجیہ : (دروازے پر سے) باجی ! ایک قیمتی چیز ،

شاہینہ : کیا ہے ناجیہ

ناجیہ : بُوجھ لیں یہ وہ چیز ہے جس کا اِنتظار کرتی رہتی ہیں آپ ۔

نگہت : اِنتظار تو یہ راحیل کے خط کا کرتی رہتی ہے ، خط ہے نا ؟

ناجیہ : یہی ہے وہ چیز (ناجیہ خط دکھاتی ہے)

شاہینہ : دو مُجھے ،

ناجیہ : انعام ،

شاہینہ : مِل جائے گا انعام بھی

ناجیہ : کیا ؟

شاہینہ : جو کہو گی ۔

نگہت : ناجیہ اس وقت تو جو مانگو گی مل جائے گا مانگ کر تو دیکھو ۔

شاہینہ : اب دے بھی دو ۔

ناجیہ : کوئی شاندار فونٹین پن لے دیں گی ۔؟

شاہینہ : اگلے مہینے تنخواہ ملے گی تو ضرور لے دوں گی ۔

ناجیہ : اچھا یہ لیجئے ۔

[وقفہ جس میں شاہینہ خط پڑھتی ہے]

نگہت : کیا لکھا ہے ۔؟

شاہینہ : تاخیر سے خط لکھنے پر معذرت چاہی ہے ۔ اپنے مسائل کا ذکر کیا ہے ۔ لکھا ہے دل بہت اُداس رہتا ہے رزلٹ کی ڈیٹ پوچھی ہے ، امّی کو بہت بہت سلام لکھا ہے — مختصر ہے ۔

نگہت : اب وہ بات تو تم نے بتائی ہی نہیں ۔

شاہینہ : کونسی بات ؟

نگہت : وہ بات کہ تم بہت یاد آتی ہو ۔

(دونوں ہنس پڑتی ہیں)

شاہینہ : ناجیہ نے امّی کو خط کی اطلاع دے دی ہوگی ۔ آ رہی ہوں گی اِدھر — میں جاتی ہوں چائے بنا کر لاتی ہوں ۔

نگہت : چائے کی ضرورت نہیں شاہینہ — ارے سُنو تو —

(شاہینہ کی امّی سرور جان آتی ہیں)

نگہت : سلام علیکم چچی جان !

سرور جان : وعلیکم السّلام ، جیتی رہو شاہینہ کہاں ہے ؟ سُنا ہے خط آیا ہے راحیل کا ۔

نگہت : جی آیا ہے ،

سرور جان : ذرا دیر سے آیا ہے مگر آیا تو ہے ، خیر خیریت لکھی ہوگی ۔ ؟

نگہت : جی چچی جان !

سرور جان : یہ سکالرشپ کتنی مدّت کا ہوتا ہے ؟

نگہت : مُدّت کا انحصار اپنے اُوپر بھی ہوتا ہے ۔ دو تین سال تو لگ ہی جاتے ہیں ۔

سرور جان : تین سال ؟

نگہت : وہ چاہے تو جلدی بھی آسکتا ہے ۔

سرور جان : میری بیٹی گھبرانے والی یا کم حوصلہ نہیں ہے، مصروفیت کے لیے اس نے ایک ٹیوشن سنٹر میں ملازمت کر لی ہے۔ وقت گزر ہی جائے گا۔!

نگہت : چچی جان! ایک بات کہوں!

سرور جان : میری اجازت کی کیا ضرورت ہے بیٹی؟

نگہت : بہتر یہ تھا کہ جانے سے پہلے شادی ہو جاتی اور شاہینہ ساتھ جاتی۔

سرور جان : میں نے یہی سوچا تھا مگر تمہاری سہیلی مانی نہیں۔

نگہت : خیر ٹھیک ہے، اللہ بہتری کرے گا۔

سرور جان : (نگہت کے لفظ دہراتے ہوئے) اللہ بہتری کرے گا۔

(شاہینہ اور ناجیہ آتی ہیں)

ناجیہ : امی جان! باجی مجھے بڑا شاندار پن لے کر دیں گی۔

سرور جان : بس تمہیں تو اپنی ہی پڑی رہتی ہے۔

سرور جان : شاہینہ بیٹی! کیا لکھا ہے راحیل نے۔

شاہینہ : لکھا ہے! پہنچ گیا ہوں، کلاس میں ADMISSION مل گئی ہے۔ ہوسٹل بھی جائن کر لیا ہے۔

سرور جان : دیر سے خط کیوں لکھا؟

شاہینہ : کام بہت تھے، فرصت نہیں ملی۔

سرور جان : جواب دو تو میری طرف سے ضرور لکھنا کہ خیر خیریت کا خط جلدی لکھا کرے۔

شاہینہ : اچھا امی، ناجیہ! تم اُدھر کیا کر رہی ہو، چائے بنا کر دو۔

[برتنوں کی کھنکھناہٹ]

منظر :- طلعت کا گھر۔

[طلعت راحیل کی ماں ہے شاہینہ کی ماں سرور جان آتی ہے]

طلعت : سرور بہن! یہ کوئی ایسی بات تو نہیں ہے کہ آپ پریشان ہو جائیں۔

سرور جان : آپ کے لیے پریشانی کی نہیں ہے، مگر میرے لیے تو ہے۔ باپ سر پر ہے نہیں، برخوردار راحیل کو گئے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔ دوسری بیٹی بھی اب بچی نہیں رہی۔

طلعت : تو ہوا کیا ہے۔ کئی لڑکیوں کے باپ مر جاتے ہیں اُن کی مائیں ہی سارے کام سنبھال لیتی ہیں۔

سرور جان : تین ماہ سے اُس کا کوئی خط بھی نہیں آیا۔

طلعت : وہ تو ہمیں بھی نہیں آیا۔ یہ کوئی حرج یا پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بہت زیادہ مصروف ہو گیا ہوگا۔

سرورجان : ہم نے دو خط لکھے ہیں کسی کا بھی جواب نہیں ملا۔

طلعت : نہیں ملا تو مل جائے گا۔

سرورجان : کب؟

طلعت : میں نے کہا نا ان دنوں بڑا مصروف ہے، رات دن محنت کر رہا ہے۔

سرورجان : وہ تو خیر ٹھیک ہے، مگر خط لکھنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔

طلعت : وقت کا سوال نہیں ہے سرور بہن! موڈ نہیں بنتا ہوگا۔ آج کل تو بس پڑھائی کا موڈ ہے۔

سرورجان : ایسا موڈ بھی کیا جس سے دوسروں کو تکلیف ہو۔ سُنا ہے کہ دو سال میں کورس مکمل ہو جاتا ہے۔

طلعت : تین سال بھی لگ سکتے ہیں اور تین سال کی مدت ——— کوئی بڑی مدت نہیں ہے، آپ بالکل پریشان نہ ہوں میں آج ہی راحیل کو خط لکھتی ہوں۔ ہو سکا تو فون پر بھی گفتگو کر لوں گی۔

سرورجان : شکرگزار ہوں آپ نے میری پریشانی سمجھ لی ہے۔

طلعت : سمجھوں گی کیوں نہیں۔ آپ ماں ہیں ——— میں بھی ماں ہوں ——— گھبرا کیوں رہی ہیں ——— چائے

سرورجان : پھر سہی، میں آپ کے فون کی منتظر رہوں گی۔

منظر :- [شاہینہ کا گھر۔ شاہینہ اور اُس کی ماں سرورجان گفتگو کریں گی)

سرورجان : شاہینہ!

شاہینہ : جی امّی!

سرورجان : کیا بات ہے، آج سکول نہیں جاؤ گی۔

شاہینہ : جاؤں گی کیوں نہیں امّی! دس بارہ منٹ تک تیار ہو جاؤں گی۔

سرورجان : طبیعت ناساز ہے! تو مت جاؤ نگہت آ رہی ہے، لے جائے گی تمہاری عرضی۔

شاہینہ : امّی! میں ٹھیک ہوں۔

سرورجان : تو کہتی ہے تو ٹھیک ہی کہتی ہے مگر میں کہتی ہوں تُو ویسی نہیں ہے جیسا کہ ایک صحت مند آدمی ہوتا ہے۔ تو پہلی جیسی نہیں ہے۔

شاہینہ : نہیں امّی! مجھے کچھ نہیں ہوا۔ اندر ناجیہ اپنے سُوٹ پر استری کر رہی ہے۔ فارغ ہوتی ہے تو میں بھی یہ کام کر لوں گی۔

(ناجیہ کی اندر سے آواز)

ناجیہ : باجی!

شاہینہ : فارغ ہو گئی ہے۔ جاتی ہوں (ناجیہ باہر آتی ہے)

سرور جان : تُو نے تو ابھی ناشتا بھی نہیں کیا؟

شاہینہ : کرلوں گی، ذرا کپڑوں سے نپٹ لوں۔

ناجیہ : اِستری کر دی ہے باجی۔

شاہینہ : شکریہ!

ناجیہ : ارے —— باجی! چھوٹی بہن کا شکریہ!

شاہینہ : کیوں چھوٹی بہن کا شکریہ کیوں نہیں ادا کیا جاتا؟

سرور جان : شاہینہ! ناشتا کر جا کر —— میز پر پڑا ہے۔

ناجیہ : تُو بھی جا بیٹی! ناشتا تجھے بھی کرنا ہے۔ (نگہت آتی ہے)

نگہت : السلام علیکم چچی جان!

سرور جان : وعلیکم السّلام۔ تم تیار ہو کر آگئی ہو، اسے بھی تیار ہونا ہے۔

نگہت : کوئی بات نہیں، سکول لگنے میں سات آٹھ منٹ باقی ہیں۔

نگہت : اُدھر سے کوئی ٹیلیفون (ذرا سی خاموشی)

سرور جان : پرسوں آیا تھا۔

نگہت : راحیل کی امّی نے کیا تھا۔!

سرور جان : ہاں!

نگہت : کہا کچھ؟

سرور جان : وُہی —— حوصلہ رکھو۔ اب خط کی بجائے خود ہی آجائے گا۔

نگہت : خود آنا ہوتا تو خط لکھ کر اطلاع نہ دیتا۔ کورس تو کب کا ختم ہو چکا ہوگا۔ آپ نے کیا سوچا ہے چچی جان!

سرور جان : مَیں کیا سوچوں گی، دیکھ رہی ہوں، میری بیٹی اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہی ہے۔ غضب خدا کا پورے تین سال بیت
گئے ہیں۔ پہلے سال خط آئے، پھر خاموشی، یہ بھی تو معلوم نہیں کہ کر کیا رہا ہے۔ کیا ارادے ہیں اُس کے کیوں
اندھیرے میں رکھ رہا ہے ہمیں؟

نگہت : چھوٹا منہ بڑی بات کرنے والی ہوں —— مُعاف کر دیں چچی جان!

سرور جان : کہو بیٹی! جیسی شاہینہ ویسی تُو۔

نگہت : ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ لڑکے باہر جاتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ راحیل سے ایسی اُمید تو
نہیں ہے، لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ اُس نے کچھ غیر ذمے داری کا ثبوت دیا ہے۔
(ذرا سی سرگوشی کے انداز میں) چچی جان! میں فکر مند ہوں شاہینہ کی طرف سے۔

سرورجان : مجھے یہ فکر مارے دے رہی ہے ہُوراں رُوح بنی ہوئی ہے۔ میری شاہینہ اس کے رویّے کو بُری طرح محسوس کر رہی ہے۔ زبان سے کچھ کہتی نہیں مگر میں جانتی ہوں اُس پر کیا بیت رہی ہے۔

نگہت : مجھے اور فکر ہے۔

سرورجان : کیا؟

نگہت : ہمارے معاشرے میں لڑکی کی عمر بڑھ جائے تو ماں باپ کے لیے اُس کی شادی کا مسئلہ بہت بڑا مسئلہ بن جاتا ہے!

سرورجان : (جیسے گہری سوچ میں ڈُوب کر) ہاں ـــــ یہ تو ہے بیٹی۔

نگہت : آپ ذرا اُس کے اندر جھانک کر دیکھیں۔

سرورجان : یہ کام میں نہیں تم کر سکتی ہو۔

نگہت : تو آج سکول میں کروں گی۔

(موسیقی جو سکول کی گھنٹی میں ڈُوب جاتی ہے۔)

نگہت : شاہینہ آؤ ذرا میرے ساتھ۔

شاہینہ : یہ لڑکیاں مجھے چھوڑیں تو جاؤں کہیں،

نگہت : میں اُن سے کہے دیتی ہوں ـــ دیکھو بھئی تم کھیلو کُودو، یہ آدھی چھٹی کا وقت ہے، تمھاری اُستانی ابھی آجاتی ہیں۔

(لڑکیوں کا شور آہستہ آہستہ تھم جاتا ہے)

شاہینہ : قصّہ کیا ہے۔

نگہت : شاہینہ! میں کچھ سنجیدگی سے کہنا چاہتی ہوں۔

شاہینہ : تو کون منع کرتا ہے تمھیں۔

نگہت : تم بھی سنجیدگی سے سُنو۔

شاہینہ : اچھا۔

نگہت : راحیل کو گئے ہوئے کتنے سال ہو گئے ہیں۔

شاہینہ : اوہو، گھر میں بھی یہی بات، باہر بھی یہی گفتگو۔ دنیا میں اور کوئی موضوع نہیں ہے۔

نگہت : فی الحال یہی ایک موضوع ہے۔

شاہینہ : کوئی اور بات کرو۔

نگہت : نہیں شاہینہ۔!

شاہینہ : خدا کے لیے خاموش رہو پلیز ـــــ

نگہت (جلدی سے) شاہینہ! میں تو خاموش رہوں مگر یہ صرف تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ میرا مسئلہ بھی ہے کہ تم میری عزیز ترین سہیلی ہو۔ یہ تمہاری امی کا مسئلہ بھی ہے کہ تمہارے ابو کے انتقال کے بعد تمہاری ہر ذمے داری ان پر عاید ہوتی ہے۔ یہ تمہاری چھوٹی بہن ناجیہ کا مسئلہ بھی ہے۔ چھوٹی بہن کو اپنی بڑی بہن کی شادی کا بڑا شوق ہوتا ہے، اب بتاؤ کیا میں خاموش رہوں؟

شاہینہ: کم از کم یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس مسئلے میں تم سب مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

نگہت: اور تم بیٹھی انتظار کرتی رہو اور وقت چپ چاپ گزرتا چلا جائے۔ تین سال بیت چکے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے تم نے اس کے انتظار کا وعدہ کر رکھا ہے مگر اس میں یہ بات تو شامل نہیں تھی کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بتائے گا ہی نہیں اور تم انتظار کیے جاؤ گی سن رہی ہو۔

شاہینہ: سن رہی ہوں۔

نگہت: یہ یک طرفہ انتظار مجھے بالکل پسند نہیں۔

شاہینہ: یک طرفہ انتظار کا کیا مطلب؟

نگہت: مطلب نہیں سمجھتیں، تم انتظار کیے جاؤ اور وہ ——

شاہینہ: اور وہ ——!

نگہت: کیا پتا وہ کیا کر رہا ہے۔ بالکل اندھیرے میں رکھا ہوا ہمیں۔

(شاہینہ خاموش رہتی ہے)

نگہت: بولتی کیوں نہیں ہو۔ خاموش کیوں ہو گئی ہو!

(شاہینہ اب کے بھی خاموش رہتی ہے۔)

نگہت: شاہینہ!

شاہینہ: ہوں۔

نگہت: کیا کہہ رہی ہوں میں۔

شاہینہ: کیا کہنا چاہتی ہو تم۔

نگہت: شاہینہ! معاف کرنا، صاف صاف کہوں گی۔ مجھے اس کی یہ طویل خاموشی مجرمانہ لگتی ہے۔ تم اسی معاشرے میں رہتی ہو، جس میں میں رہتی ہوں۔ ارد گرد کیا ہو رہا ہے، میری طرح تم بھی جانتی ہو۔ تمہیں کچھ بتلانے کی کیا ضرورت ہے، وہاں۔ اس دنیا میں جس میں وہ تین سال سے ہے۔ ایسا بہت کچھ ہے۔ جو انسان کو مسخر کر لیتا ہے، جو انسان کو اپنا وعدہ بھلا دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ایسی کئی مثالیں پیش کر سکتی ہوں، اگر وہ اپنا وعدہ بھول چکا ہے تو تم بھی انسان ہو فرشتہ نہیں ہو۔ تمہارا وعدہ پتھر کی لکیر کیوں بن جائے۔

شاہینہ : (ذرا غصے سے) نگہت!

نگہت : بُری لگی ہے میری بات۔ سچی بات بُری ہی لگتی ہے۔

شاہینہ : خدارا اس موضوع کو یہیں ختم کر دو۔

نگہت : میرے ختم کرنے سے کیا یہ مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا تعلق صرف تمھاری ذات سے نہیں ہے جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں، اس کا تعلق چچی جان کی ذات سے بھی ہے، ناجیہ کی ذات سے بھی ہے۔

شاہینہ : خدارا خاموش ہو جاؤ۔ (گھنٹی بجتی ہے)

نگہت : چند منٹ اور رُک جاؤ۔

شاہینہ : لڑکیاں کلاس میں پہنچ رہی ہیں۔ مجھے نہ پاکر خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔

منظر :- شاہینہ کا گھر۔ سرور جان اور نگہت مصروفِ گفتگو ہیں۔

نگہت : چچی جان۔ شاہینہ میری سب سے پُرانی سہیلی ہے۔ بڑی خوبیاں ہیں اس میں مگر کبھی کبھی اس کا رویہ بے لچک ہو جاتا ہے۔

سرور جان : تمھارا تو بڑا REGARD کرتی ہے۔

نگہت : کرتی ہے مگر اس معاملے میں نہیں۔

سرور جان : معلوم تو کرنا چاہیے وہ کیا کر رہا ہے امریکا میں۔

نگہت : میری ایک سہیلی جو شاہینہ کی سہیلی بھی ہے، کچھ مدّت سے امریکا میں ہے وہ راحیل سے بھی واقف ہے۔

سرور جان : اُس سے پتا لگ سکتا ہے۔

نگہت : فون کروں گی اُسے۔

سرور جان : مہربانی ہو گی بیٹی۔

نگہت : چچی جان! آپ ایسے الفاظ کہہ کر مجھے شرمندہ کر دیتی ہیں۔

سرور جان : بیٹی کون کسی کی پریشانی بانٹتا ہے تم بانٹ رہی ہو۔ اللہ تمھارا بھلا کرے۔ سدا سُکھی رہو۔

نگہت : یہ تو میرا فرض ہے چچی جان۔

سرور جان : شاہینہ ابھی تک سکول سے آئی کیوں نہیں۔

نگہت : پرچے دیکھ رہی ہے کہتی تھی ایک گھنٹے تک آ جاؤں گی امّی سے کہہ دینا — چچی جان!

سرور جان : کہو نگہت بیٹی۔

نگہت : مجھے یقین ہے مان جائے گی۔

سرور جان : مان جائے تو میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اُتر جائے گا۔

نگہت : اُتر جائے گا چچی جان! میرا مشورہ یہ ہے کہ اس TOPIC پر آپ اس سے کچھ مدت گفتگو نہ کریں۔ خواہ مخواہ چڑ
جائے گی۔ میں مائی ریشماں کو آپ کے ہاں بھیج دوں گی سمجھدار عورت ہے۔ اُسی نے میرا رشتہ کروایا تھا،
آپ کے کام بھی آئے گی ان شاء اللہ!

سرور جان : اچھا جو خدا کو منظور۔

نگہت : اب میں چلتی ہوں۔ ممکن ہے آج شام ہی وہ آپ کے پاس آجائے۔

سرور جان : بہتر،

دوسرے دن، وہی منظر ——— ریشماں اور سرور جان باتیں کر رہی ہیں۔

سرور جان : نگہت نے تمھیں بتا دیا ہوگا۔

ریشماں : بتا دیا ہے، بی بی شاہینہ کو تو میں نے کئی بار نگہت بی بی کے ہاں دیکھا۔ چار پانچ سال پہلے کی بات ہے۔

سرور جان : یہ بھی اچھا ہوا اُسے دیکھ چکی ہو۔

ریشماں : رشتے تو میرے پاس بہت ہیں، آپ۔

سرور جان : (جلدی سے ریشماں کی بات سمجھ کر) نیک ہو، اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہو، تعلیم یافتہ ہو،
گھر کا خرچ چلا سکتا ہو، یہ خود بھی پڑھاتی ہے۔

ریشماں : جانتی ہوں۔ نگہت کے سکول میں پڑھاتی ہے۔

سرور جان : بس اور کچھ نہیں چاہیے۔

ریشماں : ٹھیک ہے دو تین لڑکے ہیں میری نظر میں، پہلے بات کر لوں۔ پھر معاملہ طے ہوگا۔

سرور جان : اب کب آؤگی۔

ریشماں : اللہ نے چاہا تو جلد آجاؤں گی۔

منظر : ۔ چند روز بعد : شاہینہ ہی کا گھر۔

ریشماں : معاف کرنا۔ ایک بات پوچھ رہی ہوں۔

سرور جان : پوچھو۔

ریشماں : دیکھو نا بڑی بی بی! اُلٹا زمانہ آگیا ہے۔ پہلے جس لڑکے کے گھر میں جاتی تھی وہاں پوچھتے تھے، لڑکی
گھر گرہستن ہے، کتنی پڑھی لکھی ہے، خاندان کیسا ہے، بات کرنے کا کیسا ڈھنگ ہے! پر اب
پہلے ہی پوچھتے ہیں لڑکی کی عمر کتنی ہے۔

سرور جان : لڑکی کی عمر پوچھتے ہیں۔

ریشماں : جی،

سرور جان : میری بیٹی معمولی پڑھی لکھی نہیں ہے، وہ ایم اے کر چکی ہے، کئی ٹرافیاں بھی جیت چکی ہے۔

ریشماں : یہ سب کچھ ٹھیک ہے پر —— عمر بتا دیں۔

سرور جان : اکتیس

ریشماں : اکتیس؟

سرور جان : اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔

ریشماں : کوئی بات نہیں ہے جی۔ کئی برس پہلے دیکھا تھا ماشاء اللہ۔ اچھا جاتی ہوں۔

منظر :- شاہینہ اپنے کمرے میں اپنی چھوٹی بہن ناجیہ سے باتیں کر رہی ہے۔

ناجیہ : باجی!

شاہینہ : ہوں۔

ناجیہ : اب تو وہ چلی گئی ہے۔

شاہینہ : کون چلی گئی ہے۔

ناجیہ : وہ۔ جس کی وجہ سے آپ کمرے میں بند تھیں۔

شاہینہ : میں کسی کی وجہ سے کمرے میں بند نہیں تھی، مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ وہ کون تھی۔

ناجیہ : تو میں بتاتی ہوں۔ جناب وہ اماں ریشماں تھی۔

شاہینہ : کون اماں ریشماں۔

ناجیہ : جس نے آپا نگہت کا رشتہ کروایا تھا۔

شاہینہ : تو یہاں کیا کرنے آئی تھی۔

ناجیہ : رشتہ کروانے والی کسی کے گھر کیوں جاتی ہے؟

شاہینہ تو یہاں۔ اچھا اچھا سمجھ گئی ہوں۔

ناجیہ : غلط سمجھی ہیں آپ، وہ آپ کے لیے آئی تھی۔

شاہینہ : میرے لیے؟

ناجیہ : اور کس کے لیے بھلا۔

(سرور جان آتی ہے)

سرور جان : کہاں گم ہو گئی تھیں تم۔ یہ چپ چاپ کمرے میں بند رہنا ٹھیک نہیں ہے بیٹی!

شاہینہ : امی! میں پوچھتی ہوں یہ اماں ریشماں کیوں آئی تھی۔

سرور جان : اس کی ضرورت تھی۔

شاہینہ : کیا ضرورت تھی؟

سرورجان : آؤ میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ۔

شاہینہ : امّی! میں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ اگر یہ میرے معاملے کے لیے آئی ہے تو ــ یہ اچھا نہیں۔

سرورجان : کیوں اچھا نہیں بیٹی۔

شاہینہ : فضول ہے۔ بے کار ہے امّی۔

سرورجان : کیا کہہ رہی ہے تُو۔ بیٹیاں ماں باپ کے گھروں میں بیٹھی نہیں رہتیں تمھاری ساری کی ساری سہیلیاں اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں بیٹی! تمھیں بھی اپنا گھر بسانا ہے۔

شاہینہ : (لہجے میں ذرا تلخی) امّی! میں آپ سے کہہ چکی ہوں، میرے متعلق مت سوچیے۔

(شاہینہ اُٹھ کر جانے لگتی ہے)

سرورجان : سنو تو ——— شاہینہ ——— شاہینہ بیٹی۔

منظر :۔ نگہت کا گھر

(شاہینہ کی امّی سرورجان آتی ہے)

نگہت : چچی جان! آپ نے کیوں تکلیف فرمائی ہے؟

سرورجان : تم سکول میں نہیں آ رہیں۔ پتا چلا تھا تمھارا چھوٹا بیٹا بیمار ہے۔

نگہت : جی چچی جان۔ خاصا پریشان کیا ہے اُس نے۔

سرورجان : اب کیسا ہے۔

نگہت : ٹھیک ہے اب تو۔ کوئی نئی بات۔

سرورجان : ہفتہ ہوا راحیل کی ماں آئی تھی کھُل کر تو بات نہیں کی اُس نے مگر لگتا تھا دل میں شرمندہ ہے۔ راحیل نے گھر بھی مدّت سے کوئی خط نہیں لکھا۔

نگہت : مطلب یہ کہ اس کا مزید انتظار نہ کرو۔

سرورجان : کہنا تو یہی چاہتی تھی۔

نگہت : چچی جان! مجھے اپنی سہیلی کے ذریعے جو تازہ اطلاع ملی ہے وہ یہ ہے کہ راحیل امریکہ میں نہیں ہے۔

سرورجان : امریکہ میں نہیں ہے؟

نگہت : میں نے بتایا تھا کہ میری سہیلی اُس سے واقف ہے۔ اس کا شوہر بھی اُسے جانتا ہے۔

(ذرا سی خاموشی)

سرورجان : ساڑھے پانچ برس ہو گئے ہیں۔

نگہت : ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں، چچی جان، یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔

سرورجان : میری بیٹی کی دنیا تو اُجڑ گئی نا۔

نگہت : یہ ایک دُکھ بھری کہانی ہے۔ عورت کی فطرت میں وفاداری ہے اور یہ وفاداری بھی کبھی اُسے کہیں کا بھی نہیں چھوڑتی۔

سرورجان : میں نے تو اس مسئلے پر اُسے کچھ کہنا سُننا ہی چھوڑ دیا ہے۔

نگہت : اور کیا کیا جا سکتا ہے، چچی جان۔

سرورجان : میں نے آپ سے اجازت لیے بغیر اماں ریشماں کو ناجیہ کے لیے کہہ دیا ہے۔

نگہت : اچھا کیا ہے کئی ہفتوں سے آئی نہیں۔ شاہینہ کے رویے سے مایوس ہو گئی ہو گی۔

سرورجان : لگتا یہی ہے۔

(کال بیل)

نگہت : ایک منٹ۔ (ریشماں آتی ہے)

ریشماں : سلام علیکم۔ بڑی بی بی! گھر فون کیا تھا کسی نے اُٹھایا ہی نہیں تھا۔

نگہت : اُٹھایا نہیں تھا۔ دونوں کہاں چلی گئی تھیں؟

سرورجان : شاہینہ تو اپنے کمرے میں پڑھ رہی ہو گی۔ ناجیہ کسی سہیلی کے گھر گئی تھی مگر گھر میں ہو تو وہی ٹیلیفون سُنتی ہے۔

نگہت : کیوں اماں! بات بنی؟

ریشماں : بنی ہے تو فون کیا تھا نا۔

نگہت : کون ہیں وہ لوگ۔

ریشماں : یہ کاغذ پڑھ لو۔

(نگہت کاغذ لے کر پڑھتی ہے)

نگہت : نام ظفر علی تعلیم ایم اے، ایس ڈی او محکمہ انہار۔ جدی جائیداد بھی ہے۔ والد صاحب ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس کرتے ہیں، ذاتی بنگلہ ہے۔

ریشماں : میں دیکھ چکی ہوں لڑکا۔ واہ وا پیاری شکل والا ہے۔

نگہت : رہائش کہاں ہے۔

ریشماں : شادمان کالونی میں۔

نگہت : کچھ ملنے ملانے کے بارے میں کہا اُنھوں نے؟

ریشماں : ہاں جی۔ لڑکے کی ماں نے پوچھا ہے کہ کس روز آتے۔

نگہت : چچی جان بتایئے۔

سرورجان : کسی روز بھی آجایئے۔

نگہت : کوئی دن بتا دیں۔

سرورجان : آج ہے جمعرات۔ اتوار شام چار بجے۔

نگہت : مناسب ہے۔ اماں رلتیاں کہہ دینا اُن سے۔

رلتیاں : آج ہی کہہ دُوں گی نگہت بی بی۔

منظر :- شاہینہ ہی کا گھر۔ پہلے منظر کو کئی روز گزر چکے ہیں۔

شاہینہ : ناجیہ!

ناجیہ : جی باجی۔

شاہینہ : کر کیا رہی ہو تُم۔

ناجیہ : کتاب دیکھ رہی تھیں باجی۔

شاہینہ : یہ کتاب دیکھنے کا وقت ہے۔ مہمان آنے ہی والے ہیں۔ امی باورچی خانے میں ہیں۔ مجھے بھی ان کا ہاتھ بٹانا ہے۔

ناجیہ : جاتی ہوں۔

شاہینہ : تمھیں کہیں نہیں جانا۔ تیار رہنا ہے۔ وقت کم ہے ناجیہ۔

(ناجیہ خاموش رہتی ہے)

شاہینہ : ناجیہ۔

ناجیہ : جی

شاہینہ : تیار ہو جاؤ۔ مَیں نے تمھارا سُوٹ الماری سے نکال دیا ہے۔ جی چاہو تو پہن لو، ورنہ الماری میں سے اپنی پسند کا نکال لو۔ جاؤ نا۔

ناجیہ : آپ ۔ باجی! مجھے اپنی بات کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔

شاہینہ : ناجیہ! جو تم کہنا چاہتی ہو وہ میں جانتی ہوں۔ میرا معاملہ میرا معاملہ ہے، اس کی ذمہ دار میں خود ہوں۔ تم نہیں ہو۔ اب جاؤ اُدھر۔

ناجیہ : آپ کا معاملہ میرا بھی تو معاملہ ہے۔ ایک گھر میں دو بہنیں۔ آپ بڑی، میں چھوٹی۔

شاہینہ : اوہو۔ تم بھی عام لوگوں کی طرح سوچنے لگیں۔ یُوں مت سوچو ناجیہ۔

(باہر سے سرورجان کی آواز)

سرورجان : شاہینہ ـ

شاہینہ : جی امی! (مدھم لہجے میں) دیکھو امی پریشان ہوں گی۔ جلدی جاؤ اپنے کمرے میں (بلند آواز میں) ٹھیک ہے امی۔

ناجیہ : آپ میری اُلجھن نہیں سمجھ سکیں۔

شاہینہ : ارے الجھن کیسی۔ بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ میں باورچی خانے میں جا رہی ہوں۔

منظر :۔ (کمرے میں سرور جان، نگہت، ایک خاتون، اماں رشیماں)

خاتون : آپ نے بتایا ہے ایم۔اے پچھلے سال کیا ہے۔

سرور جان : جی ہاں۔

نگہت : فسٹ کلاس میں پوری یونیورسٹی میں دوسرے نمبر پر آئی ہے۔

خاتون : ماشاءاللہ۔ دو بہنیں ہیں، بھائی نہیں ہے۔

سرور جان : بھائی کوئی نہیں۔

خاتون : آج کل گھر کے کاموں میں آپ کا ہاتھ بٹاتی ہوگی۔

سرور جان : دونوں نے گھر کا سارا کام سنبھال رکھا ہے۔ پھر پڑھاتی بھی ہیں۔

خاتون : ملازمت کرتی ہیں۔

نگہت : گھر کے کاموں سے کافی وقت بچ جاتا ہے۔

سرور جان : یہ سسرال کی مرضی پر ہوتا ہے کہ لڑکی ملازمت کرے یا چھوڑ دے۔

خاتون : بہن! بہت کچھ پوچھ لیا ہے۔ بُلوائیں لڑکی کو۔

سرور جان : ادھر آجائیے۔ چائے۔

خاتون : یہ کیا تکلیف کی آپ نے۔

شاہینہ اور ناجیہ : (بیک وقت) سلام علیکم (ذرا سا وقفہ)

خاتون : وعلیکم السلام، یہ بڑی بہن ہے، شادی نہیں ہوئی۔

سرور جان : جی ـــــ وُہ

خاتون : (ٹالنے کے لیے) خیر۔

(برتنوں کی کھنکھناہٹ)

خاتون : یہ بھی اِدھر ہی رہتی ہیں۔

سرور جان : (جیسے متذبذب ہوں) جی

نگہت : میں نے آپ کو بتایا تھا نا میری (COLLEAGUE ہے۔

خاتون : اچھا اچھا۔ کیا نام ہے بیٹی تمہارا۔

ناجیہ : ناجیہ۔

خاتون : ماشاءاللہ خوبصورت نام ہے۔ کیا پڑھاتی ہو؟

ناجیہ : سائنس

خاتون : تو ایم ایس سی کی ہے۔

ناجیہ : جی ہاں۔

خاتون : دونوں بہنیں ایک ہی اسکول میں ہوں گی؟

ناجیہ : جی نہیں، میں الگ سکول میں ہوں۔

نگہت : اگلے سال کالج میں چلی جائے گی۔

خاتون : ماشاءاللہ۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔

سرورجان : آپ نے بڑا تکلف کیا ہے۔ کچھ کھایا نہیں۔

ریشماں : اللہ نے چاہا تو کھانے پینے کے موقعے ملتے رہیں گے۔

(خاتون اس کا کوئی جواب نہیں دیتی)۔

خاتون : خداحافظ۔

سرورجان : خداحافظ۔

(وقفہ)

نگہت : یہ شاہینہ اور ناجیہ انتظار کر رہی تھیں کہ وہ جائے اور یہ بھاگیں یہاں سے۔

سرورجان : (لہجے میں فکرمندی) اس کے رویے سے کچھ ظاہر نہیں ہوا۔

نگہت : ریشماں ساتھ گئی ہے، اپنا عندیہ یہ بتا دے گی اسے۔ آپ مایوس کیوں ہیں چچی جان!

سرورجان : ریشماں نے کہا اب کھانے پینے کے موقعے ملتے ہی رہیں گے تو وہ بالکل خاموش رہی۔

نگہت : یہ تو ہوتا ہی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے چچی جان کہ جو بھی آئے پسند کر کے ہی جائے۔ ہماری لڑکی میں سو خوبیاں ہیں، کوئی بدنصیب ہی اسے نہ پسند کرے گا۔ آپ دل میں اچھی امیدیں رکھیں، ان شاء اللہ بہتری ہوگی۔

سرورجان : اسی امید پر تو زندہ ہوں۔

نگہت : آپ کہاں چلیں چچی جان۔

سرورجان : ان دونوں نے کچھ کھایا بھی نہیں۔

نگہت : بلائیے انہیں۔

سرورجان : اسی لیے تو جا رہی ہوں۔

(سرورجان دروازے پر پہنچ کر آواز دیتی ہیں)

(شاہینہ اور ناجیہ آجاتی ہیں)

سرورجان : او لڑکیو!

سرورجان : چلی کیوں گئی تھیں دونوں۔

ناجیہ : امی! میں تو اس خاتون کی باتوں سے پریشان ہو گئی تھی۔

شاہینہ : پریشان میں بھی ہو گئی تھی۔

نگہت : تم سے تو ایک آدھ سوال پوچھا تھا۔

شاہینہ : مگر میری طرف بار بار گھور کر دیکھنے لگتی تھیں۔

سرورجان : کیوں؟

منظر :- تین روز بعد ——— نگہت کا گھر۔

(نگہت مائی رلشیاں سے باتیں کر رہی ہے۔ گفتگو کا ابھی آغاز ہوا ہے۔)

نگہت : اماں! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

رلشیاں : کونسی بات بی بی؟

نگہت : تم ناجیہ کے لیے کئی رشتے لے کر گئیں۔ مگر نتیجہ نہیں بتایا کسی کا۔

رلشیاں : نتیجہ بی بی -!

نگہت : یہ تو بتانا چاہیے تاکہ رشتے کے لیے جو آتا ہے وہ لڑکی کے گھر آکر اور اُس سے مل کر کہتا کیا

رلشیاں : کیا کہوں بی بی! بات بنتی تو کہتی نا۔

نگہت : کیا نقص نظر آتے ہیں اُنھیں ہماری لڑکی میں۔

رلشیاں : بی بی! جو ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ ہوا دو عورتیں آئی تھیں اُن سے پوچھا تو بولیں۔ سوچ کر بتائیں گے۔

نگہت : یہ سوچ ہی رہی ہیں اور اُن سے پہلے جو آئی تھیں۔

رلشیاں : اُنھیں لڑکی میں کوئی نقص نظر نہیں آیا پر -

نگہت : پر کیا؟

رلشیاں : اُنھوں نے مجھ سے تو صاف صاف نہیں کہا پر اُس کی باتوں سے پتا لگتا تھا کہ اُنھیں بڑی کی
شادی نہ ہونے پر اعتراض ہے۔

نگہت : اُنھیں اس سے کیا کہ بڑی بہن کی شادی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔

رلشیاں : بی بی ! پتا نہیں کیسا زمانہ آگیا ہے۔ لوگ اس طرح سوچتے ہیں کہ بڑی بہن کی شادی جو نہیں ہوئی، کیا پتا کیا نقص ہے اس میں۔ چھوٹی بہن میں بھی یہ نقص ہو سکتا ہے۔ کیا کہوں کیسا بُرا زمانہ آگیا ہے۔

نگہت : بڑی بہن نے تو خود شادی نہیں کی۔

رلشیاں : یہ تو تم جانتی ہو، اور بھی کچھ لوگ جانتے ہوں گے مگر رشتے کے لیے جو آتے ہیں وہ نہ جانے دلوں میں کیسے کیسے شک شُبے پالتے پھرتے ہیں۔ کہا نہ بی بی ! بڑا بُرا زمانہ آگیا ہے۔

نگہت : خُدا کی پناہ۔

رلشیاں : اللہ ہی رحم کرے۔ دس کم چالیس برس سے یہ دھندہ کر رہی ہوں۔ آج کل تو سمجھ میں نہیں آتا، کہ آجکل کے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔

نگہت : چچی جان، بار بار فون کر چکی ہیں، اب کیا کہوں اُن سے۔

رلشیاں : سچی بات کہوں گی۔ ان کی لڑکی لاکھوں میں ایک ہے۔

نگہت : اس لیے اس کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے۔

رلشیاں : میں کیا کہوں نگہت بی بی !

(رلشیاں کو ایک دم کچھ یاد آجاتا ہے)

رلشیاں : ہاں بی بی ! یاد آگیا۔ بس سمجھو تو تمھاری چچی کی مشکل آسان ہو گئی۔

نگہت : کیسے !

رلشیاں : کل اس گھر گئی تھی۔ وہ ناجیہ کو جاننے والی نکل آئی۔

نگہت : کون ناجیہ کو جاننے والی نکل آئی ؟

رلشیاں : لڑکے کی بہن کسی زمانے میں اس کے ساتھ پڑھی ہو گی۔ لڑکے کی ماں تو بے تاب ہو گئی۔ کہنے لگی، جلدی بتاؤ۔ بی بی، اللہ نے چاہا تو یہ رشتہ ہو کر رہے گا۔

نگہت : اچھی خبر ہے۔

رلشیاں : لڑکے کی ماں نے خود جلد ملنے کی خواہش کی ہے۔

نگہت : شام شاہینہ کے گھر جا رہی ہوں، کہہ دوں گی چچی جان سے۔

منظر :- شاہینہ کا گھر

(سرور جان اور نگہت باتیں کر رہی ہیں)

سرور جان : ناجیہ تو باہر آتی ہی نہیں تھی، بڑی مشکل سے اُسے باہر لائی۔

نگہت : خُدا کا شکر ہے وہ ناجیہ سے مل کر بڑی خوش ہوئی تھی۔ اس کی بیٹی ناجیہ کے ساتھ پڑھ چکی ہے نا،

سرورجان : مگر چار دن ہوگئے ——— کچھ کہا نہیں اُس نے ۔

نگہت : خالہ جان! مجھے پورا پورا یقین ہے ہماری ناجیہ ضرور دُلہن بنے گی ۔

سرورجان : اللہ تیری زبان مُبارک کرے ۔

نگہت : سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔ میں نے ریشماں کو پیغام بھیجا ہے کہ جلدی آکر اطلاع دے ۔

(کال بیل)

نگہت : لگتا ہے ریشماں ہوگی ۔

سرورجان : اللہ کرے (بلند آواز سے) ناجیہ! دیکھنا کون ہے!

(ذرا سا وقفہ)

نگہت : آؤ اماں! بڑی دیر سے آئی ہو ——— ہاں کہو ۔

ریشماں : اُنھیں لڑکی بہت پسند آئی ہے ۔

سرورجان : شکر ہے اللہ تیرا ۔

ریشماں : پر ———

نگہت : پر ——— یہ پر کیا!

ریشماں : وُہ ——— لڑکے کی ماں نے کہا ہے ——— ناجیہ کی عمر ——— میرے بیٹے سے زیادہ ہے ———
اِس لیے ———

سرورجان : او میرے اللہ ۔

نگہت : (سخت گھبراہٹ کے عالم میں) خالہ جان! ——— خالہ جان ۔

(شاہینہ اور نازیہ بھاگ کر آتی ہیں)

شاہینہ اور ناجیہ (بیک آواز) امّی!

(شاہینہ اور ناجیہ کی چیخیں)

○

لہو اور قالین

افراد : بابا — — — — — — — — نوکر
تجمل — — — — — — — — ایک سرمایہ دار
اختر — — — — — — — مصوّر
رؤف — — — — — — — — تجمل کا پرائیویٹ سیکرٹری

منظر : "سردار تجمل حسین کی کوٹھی "النشاط" کا ایک وسیع کمرہ ، یہ کمرہ اختر سٹوڈیو کے طور پر استعمال کرتا ہے، نہایت اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ ، فرش پر قالین ، دیواروں پر مشہور مصوّروں کے شاہکار ، ایک طرف ریڈیو سیٹ ، کچھ فاصلے پر صوفہ اور کرسیاں ، شمالی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی دونوں الماریوں میں مجلّد کتابیں ، کارنیس اور تپائیوں کے اوپر تر و تازہ پھولوں سے مزین گلدان ، دروازے اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے ، وسط میں ایزل ، ایزل پر کینوس جو ابھی تک سادہ اور صاف ہے ۔ قریب ایک تپائی پر رنگوں کے ڈبے ، چینی کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں ، طرح طرح کے قلم اور مصوّری کا دوسرا سامان ، گرمیوں کے ابتدائی زمانے کی ایک صبح روشندانوں میں سے دھوپ اندر آ رہی ہے ۔ جب پردہ اُٹھتا ہے تو بابا جھاڑن سے کمرے کی چیزیں صاف کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ دو چار لمحوں کے بعد تجمل آتا ہے ، تجمل کی عمر ۴۰ اور ۴۵ کے درمیان ہوگی بہت اچھی جسم پر قیمتی سُوٹ ۔

تجمل : یہ اختر کہاں ہے بابا ؟

بابا : اُدھر باغ میں ہیں سرکار !

تجمل : ابھی تک باغ میں ۔ وہاں کیا کر رہے ہیں ؟

بابا : ٹہل رہے ہیں ۔ میں نے کہا بھی سرکار ناشتا تیار ہے اندر آجائیں ، مگر اُنھوں نے تو مجھے جھڑک دیا ۔ ابھی تک دھوپ میں ٹہل رہے ہیں ۔ رات سرکار (خاموش ہو جاتا ہے)

تجمل : رات کیا ؟

بابا : میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ ہوا یہ سرکار کہ میری اچانک آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ باغ میں کوئی شخص گھوم رہا ہے۔ سمجھا چور ہے۔ شور مچانے ہی والا تھا کہ اختر میاں کے ہاتھ میں ان کی چھڑی نظر آگئی۔

تجمل : اس قسم کے لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے، ہر طرف کسی نہ کسی سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں، الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔

بابا : سرکار! میں تو نہ خود یہاں آتا ہوں اور نہ کسی کو یہاں آنے دیتا ہوں۔ ذرا صفائی کے لیے پانچ دس منٹ کے لیے آجاتا ہوں۔ میں نے کہا سرکار!

تجمل : کیا ہے؟

بابا : شاید کچھ ایسے ویسے ہی چند روز سے۔

تجمل : پھر وہی بات ایک بار کہہ جو دیا، تم فن کاروں کو نہیں سمجھ سکتے، یہ ہر وقت یونہی پریشان رہتے ہیں۔

بابا : (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) اچھا سرکار!

تجمل : بلاؤ انھیں، جلدی کرو۔

بابا : بہتر!

(بابا کمرے سے نکل جاتا ہے، تجمل آگے بڑھ کر کینوس کو دیکھنے لگتا ہے۔ اختر آتا ہے۔
ادھیڑ عمر کا شخص، سر کے بال بکھرے ہوئے۔ آنکھیں شب بیداری کی وجہ سے سرخ لباس پاجامہ اور قمیص، آستینیں چڑھی ہوئی، آنکھوں کے گرد حلقے زیادہ نمایاں)

اختر : (تجمل کی طرف دیکھے بغیر) کہیے!

تجمل : بڑی دیر تک ٹہلتے رہے ہو آج۔

اختر : جی ہاں۔

تجمل : ایک بہت بڑی خوشخبری سنانے آیا ہوں تمھیں۔ ابھی ابھی میرے ایک دوست نے فون کیا ہے۔ جنوں نے تمھاری تصویر کو اوّل انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔ میں نے تفصیل معلوم کرنے کے لیے رؤف کو بھیج دیا ہے۔ ابھی آجائے گا۔

اختر : مجھے اخبار سے معلوم ہو چکا ہے۔

تجمل : (اختر کی بے نیازی پر متعجب) تمھیں اس کا علم تھا اور۔

اختر : اخبار صبح سویرے مل جاتا ہے۔

تجمل : تمھیں یہ خبر سن کر اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی، میرا خیال ہے، یہ تمھارا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

(اختر خاموش ہے)

تم نے ملک کے تمام مصوروں کے مقابلے میں یہ انعام جیتا ہے، یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں ہے۔ میں نے اس خوشی پر آج شام چائے کا اہتمام کیا ہے۔ تمھیں مبارکباد دینے

(اختر خاموش ہے)

کیا کہا؟

اختر: کچھ نہیں۔

تجمل: کچھ نہیں (اختر کے چہرے کو غور سے دیکھ کر) شاید بابا نے غلط نہیں کہا تھا معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا؟

اختر: جی نہیں،

تجمل: اس نے کہا تھا (مسکرا کر) ہمارے مصور کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے۔ ان دنوں۔ تمھارا کیا خیال ہے اپنا۔؟

اختر: صحیح کہا تھا اس نے!

تجمل: یعنی کہ

اختر: یہی کہ یہاں سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔

تجمل: کیا کہا؟ (لہجے میں حیرت) رخصت ہونے کی ضرورت؟

اختر: میرا دل چاہتا ہے۔

تجمل: کوئی شکایت؟ کوئی تکلیف؟؟

اختر: کوئی شکایت نہیں۔

تجمل: پھر بات کیا ہے؟ اگر کوئی تکلیف ہے تو صاف کیوں نہیں کہہ دیتے۔ تمھارے لیے کیا کچھ نہیں کیا گیا۔ اور کیا کچھ
نہیں کیا جائے گا۔؟

اختر: میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں، پھر بھی۔

تجمل: پھر بھی کا کیا مطلب؟

اختر: مجھے جانا ہی چاہیئے۔

تجمل: بے وقوف نہ بنو اختر۔ یہ بیٹھے بیٹھے آج تمھیں کیا ہو گیا ہے؟

اختر: اس کا جواب دے چکا ہوں۔

تجمل: اگر تمھیں کچھ نہیں ہوا تو اس بے وقوفی کی وجہ؟ ذرا سوچ لو۔ یہاں آکر تم نے کتنے بڑے کارنامے انجام دیئے ہا
کتنی زبردست قدرومنزلت حاصل کی ہے۔ اس سے بڑی عزت کیا ہوگی کہ آج تم ملک کے بہترین مصور سمجھے جا
ہو، اور کیا چاہیئے تمھیں؟

اختر: اس لیے میں آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تجمل: مجھے شکریئے کی ضرورت نہیں صاف صاف بتاؤ تمھیں کیا تکلیف ہے، کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے،

اختر: مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ رخصت ہونے کی اجازت دیجئے۔

تجمل: اس پاگل پن کی اجازت کیوں کر دے سکتا ہوں؟

اختر: آخر کیوں؟

تجمل: اس کی وجہ تم نہیں جانتے کیا؟

(اختر خاموش رہتا ہے)

سنا ہے آرٹسٹوں پر کبھی کبھی دورے بھی پڑتے ہیں۔ شاید (اختر کی طرف مسکرا کر دیکھتا ہے۔ اختر کا چہرہ بدستور سنجیدہ ہے) کچھ اس قسم کی بات معلوم ہوتی ہے۔

اختر: مجھے مجبور نہ کیجئے۔

تجمل: کیا حماقت ہے، ایک شخص کو دلدل سے نکالا جاتا ہے اور جب وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر اسی دلدل میں چھلانگ لگانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

اختر: میرے فن کی بہتری اسی میں ہے کہ یہاں سے چلا جاؤں۔

تجمل: فن کی بات کرتے ہو، یہاں آنے سے پہلے بھی تمہارے پاس فن تھا، اور —— آج بھی ہے۔ مگر دونوں میں کتنا فرق ہے؟ تم خود نہیں جانتے یہ فرق؟

اختر: کیا آپ سمجھتے ہیں میں آپ کا شکر گزار نہیں ہوں!

تجمل: اختر

اختر: فرمائیے۔

تجمل: اگر تم سنجیدگی سے بات کر رہے ہو تو سن لو میں تمہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ میری توہین ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟

اختر: لوگوں کو میرے اور آپ کے ذاتی معاملے سے کیا واسطہ۔

تجمل: تم دنیا سے الگ تھلگ رہ کر مصوری کرتے رہتے ہو تمہیں معلوم نہیں لوگ اس قسم کے واقعے پر کیا کچھ کہتے ہیں سب کہیں گے ایک غریب اور قلاش مصور کو جھونپڑی میں سے نکال کر لایا دکھاوے کے لیے اور پھر اسے واپس بھیج دیا، کیا یہ میری توہین نہیں ہے؟

اختر: (بھونچکا ہو کر) توہین کیسی؟

تجمل: اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟

اختر: صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ نے مجھے خرید لیا ہے اور اب میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔

تجمل: یہ بات نہیں ہے اختر (ملامت سے) غور تو کرو کتنی عجیب حالت ہو گی [illegible]

دعوت دے دی ہے۔ وہ ضرور شام کو آئیں گے۔

اختر : میرے جانے یا نہ جانے سے اس دعوت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے ؟

تجمل : میں سمجھتا ہوں تا فرق پڑتا ہے۔ اب اس پاگل پن کو چھوڑ دو اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔

اختر : آپ مجھے اس طرح روک نہیں سکتے۔

تجمل : روک نہیں سکتے۔ خوب جس شخص کو میں اپنا سمجھ رہا ہوں اس پر مجھے اتنا بھی حق نہیں ہے کہ اسے کسی پاگل پن سے روک سکوں ؟ آج تم اتنی بلندیوں پر پہنچ گئے ہو۔ اس لیے جانا چاہتے ہو۔ تمھیں اس بات کا احساس نہیں کہ تمھیں ان بلندیوں تک پہنچانے میں میں نے بھی کچھ حصہ لیا ہے۔

اختر : آپ اصرار کرتے ہیں تو سنیئے۔ جس اختر کو آپ ایک تنگ و تاریک کوٹھری سے نکال کر اپنے محل میں لائے تھے وہ مصوّر اختر مر چکا ہے اور جو شخص آپ کے سامنے کھڑا ہے اور جس کے لیے یہ شاندار سٹوڈیو بنایا گیا ہے۔ وہ اس کی چلتی پھرتی لاش ہے۔

تجمل : معلوم ہوتا ہے دورہ بہت شدید ہے مجھے ڈاکٹر کو فون کرنا چاہیئے۔

(تجمل جانے لگتا ہے۔ اختر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔)

اختر : (لہجے میں کسی قدر تحکم) ٹھہریئے اور سب کچھ سنتے جائیے۔ میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت بیان کر دی ہے۔

تجمل : یہ سب سے بڑی حقیقت ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ ڈاکٹر کو کرنا چاہیے۔

اختر : آپ ابھی تک اسے ایک مذاق سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ میں بالکل نارمل ہوں — آپ تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھ رہے ہیں، اور اب اس کا دوسرا رُخ دیکھئے جو اتنا خوفناک ہے کہ آپ کے تصورات کا شیش محل ابھی زمیں بوس ہو جائے گا۔ گزشتہ ڈیڑھ برس میں جتنی تصویریں میرے نام کے ساتھ اس شاندار محل سے باہر گئی ہیں، ان میں سے ایک بھی میری نہیں ہے۔

تجمل : (اختر کو گھورتے ہوئے) معاملہ اتنی دُور تک جا پہنچے گا مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا، اختر میرا مشورہ یہ ہے، کہ اس وقت آرام کرو تمھیں مکمل آرام کی سخت ضرورت ہے۔

اختر : ذرا تحمل سے کام لیجئے۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے کہنے دیجئے۔

تجمل : تم پاگلوں کی سی باتیں کر رہے ہو تحمل سے کام خاک لوں۔!

اختر : جب آپ کو پوری حقیقت معلوم ہو جائے گی اُس وقت فیصلہ کیجئے کہ یہ پاگل پن ہے یا کچھ اور۔

تجمل : یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے آخر گزشتہ دو سال سے تم میرے مہمان ہو۔ اس دوران میں تم نے کئی تصویریں بنائی ہیں جو شہر کے معزز لوگوں کی کوٹھیوں میں آویزاں ہیں۔ ان میں سے اکثر میں نے تحفۃً اپنے دوستوں کو دی ہیں۔ یہ سب کی سب تمھاری ہیں۔ تمھاری اپنی تخلیق ہیں۔ لیکن آج تم کہہ رہے ہو ان میں سے ایک بھی میری نہیں ہے۔ کوئی اور سنے گا تو کیا کہے گا ؟

اختر: مجھے اس کی پروا نہیں کہ کوئی سُنے گا تو کیا کہے گا۔ میرے لیے یہ کشمکش ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے۔ اس خلش نے مجھے بے قرار کر دیا ہے۔ یہ فریب اب زندہ نہیں رہ سکتا۔

تجمل: فریب؟ آج تمھیں کیا ہو گیا ہے اختر۔ کاش میں کچھ سمجھ سکتا کہ تمھاری اس پریشانی کی وجہ کیا ہے، ڈاکٹر کو تم بلانے نہیں دیتے۔ میں کیا سمجھوں آخر؟

اختر: آپ سب کچھ سمجھ جائیں گے، یہ کوئی معمّا نہیں ہے۔ سُنیے جیسا کہ آپ جانتے ہیں، آج سے دو سال پہلے میں ایک تنگ و تاریک گلی کے ایک خستہ اور بدنما مکان میں رہتا تھا۔ بہت کم لوگ مجھے جانتے تھے، انھیں میرے متعلق صرف یہی معلوم تھا کہ میں ایک مفلس، قلاش اور گمنام مصوّر ہوں، میں نے بے شمار تصویریں بنائی تھیں، مگر وہ تمام کی تمام کباڑیوں یا نیلام گھروں میں بیچ کر کوڑیوں کے بھاؤ بک چکی تھیں، زندگی اسی حالت میں گزر رہی تھی کہ اتفاقاً تصویروں کی ایک نمائش گاہ میں میری آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے میری تصویروں میں دلچسپی لی اور مجھے اسی شام کو اپنے ہاں چائے پر بُلا لیا۔ میں اپنے ہزاروں ہم پیشہ بھائیوں کی طرح غربت کی چکّی میں پس رہا تھا، یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو چھپی رہ سکتی۔ آپ نے میری حالت کا اندازہ لگا لیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ میں اپنے غربت کدے سے نکل کر آپ کے ہاں آ جاؤں تاکہ اطمینان کے ساتھ فن کی خدمت کر سکوں۔ آپ نے میرے لیے یہ کمرہ وقف کر دیا اور مجھے زندگی کی ضروریات سے بے نیاز کر دیا۔

تجمل: ان باتوں کے ذکر کی کیا ضرورت ہے؟

اختر: میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے سلوک نے مجھ پر کیا اثر ڈالا۔ میں سمجھنے لگا، آپ نہایت اُونچے درجے کے انسان ہیں، دولت مند ہونے کے باوجود آپ کے پہلو میں ایک ایسا دل دھڑک رہا ہے جو انسانیت نواز ہے۔ جس میں ساری دنیا کا درد سمایا ہوا ہے، آپ نے اپنے دوستوں کو بُلا کر انہیں میری تصویریں دکھائیں۔ آپ نے بڑے بڑے اداروں کے دفتروں میں میری تصویریں آویزاں کرائیں۔ آپ نے میری شہرت کے لیے میری تخلیقات رسائل و جرائد میں چھپوائیں۔ سچ مچ اس وقت آپ میری نظروں میں ایک دیوتا تھے، ایک فرشتہ تھے، ایک ایسی ہستی تھے جس کی تعریف ہمارے قصوں اور کہانیوں میں کی گئی ہے۔

تجمل: میں نہیں سمجھ سکتا، اس ذکر سے تمھارا کیا مقصد ہے؟

اختر: مگر تھوڑے عرصے بعد ہی ایک بھیانک خیال اپنا منحوس سایہ میرے ذہن میں ڈالنے لگا۔ محسوس ہونے لگا کہ میں نے آپ کی ذات کے بارے میں جو کچھ سوچا ہے وہ محض میری خوش فہمی ہے حقیقت کچھ اور ہے۔

تجمل: کیا مطلب؟

اختر: مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آپ کی سرپرستی تو محض ایک اشتہار ہے آپ کی مصوّر نواز شخصیت کا اور اس کی سرپرستی میں آپ کا ایک خاص مقصد چھپا ہوا ہے۔

تجمل: کیا کہہ رہے ہو تم؟

اختر: آپ مجھے نواز رہے تھے مگر ایک خاص مقصد کی خاطر اور وہ مقصد یہ تھا کہ آپ سوسائٹی کو بتانا چاہتے تھے "دیکھو

کتنا اچھا ہوں، میں نے ایک غریب اور مفلس مصوّر کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ اب یہ جو کچھ بنا رہا ہے۔ محض میری سرپرستی کا نتیجہ ہے، میں نے اس کی صلاحیتوں کو زندہ رکھا ہے ورنہ یہ کب کی ختم ہو چکی ہوتیں۔ جس طرح بڑی بڑی دکانوں کے دروازوں پر انسانی پیکروں کو نہایت خوبصورت اور شفاف لباس پہنا کر اُنھیں الماریوں کے اندر سجا دیا جاتا ہے تاکہ لوگ ان حسین و جمیل مجسموں کو دیکھ کر دکانداروں کے اعلیٰ ذوق اور ان کی شان و شوکت سے مرعوب ہو جائیں۔ اسی طرح آپ بھی اپنی امارت اور اپنی شخصیت کی نمائش کے لیے میری ذات اور میرے فن کو استعمال کر رہے تھے۔

تجمل: (غصے سے) یہ جھوٹ ہے ——سراسر جھُوٹ ہے۔

اختر: اور آپ کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔ مگر بلند آواز سے حقیقت نہیں بدل سکتی، آپ کے یہاں میری یہی حیثیت تھی۔ اور جس وقت مجھے اس کا احساس ہوا مجھے محسوس ہوا، جیسے میری اہلیتوں پر برف کی تہ جم گئی ہے۔ میرے سینے میں ایک بھی شرارہ باقی نہیں رہا، یہ احساس میرے لیے سوہانِ رُوح ثابت ہو رہا تھا کہ اپنے جگر کا خون دے دے کر میں نے فن کی شمع کو اب تک روشن رکھا ہے۔ اس کا مقصد آپ کی شاندار کوٹھی اور آپ کی شخصیت کو جگمگانے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں، ایک فنکار یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا فن اپنا اعلیٰ جوہر کھو کر کسی کے لیے محض ایک ذریعۂ شہرت بن کر رہ جائے۔ انہی دنوں مجھے ایک ہم پیشہ دوست مل گیا۔ جو بدستور غربت کی چکی میں پس رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی ذہنی کیفیت بتائی اور التجا کی کہ وہ مجھے اپنے ہاں رہنے کی جگہ دے دے۔ یہ سن کر اُس نے کہا۔ دیکھو اگر تم آج کل تصویریں نہیں بنا سکتے تو کوئی حرج کی بات نہیں، تمھارے لیے میں تصویریں بناتا رہوں گا۔ تم مجھے اتنے پیسے دے دیا کرو کہ میں اور میرا خاندان عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہ سکے۔ یہ تجویز میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی مگر اس کا اصرار کم نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح وہ کھیل شروع ہو گیا جو دنیا کا سب سے گندہ اور ذلیل کھیل ہے۔ مجھے یہاں روپے حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ یہ روپے میں اُسے دے دیتا تھا اور وہ مجھے اپنی تصویریں۔

تجمل: ان تصویروں کو تم ۔

اختر: اپنی تخلیق بنا کر پیش کر دیتا تھا۔

(تجمل اس انداز سے اختر کو دیکھتا ہے جیسے ان الفاظ سے اسے دھچکا سا لگا ہو)

تجمل: تم مجھے دھوکہ دیتے رہے اب تک۔

اختر: دھوکہ یا کچھ اور۔ بہرحال واقعہ یہ ہے کہ نیازی کو وقتاً فوقتاً سکے ملتے رہے، مجھے بنی بنائی تصویریں اور آپ کو فن کی قدر افزائی اور مصوّر نوازی کے لیے سوسائٹی میں عزت و احترام——

تجمل: میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی پست سطح پر اُتر چکے ہو۔

اختر: میں نے خود کبھی نہیں سوچا تھا لیکن اس پست سطح پر اُترنے کے لیے مجبور تھا۔ نیازی نے مجھے کئی تصویریں دی ہیں۔ یہ تصویریں آج آپ جیسے معزز لوگوں کے ڈرائنگ رُوموں کی زینت ہیں۔ وہ پہلے کی طرح مفلس نہیں ہے وہ

اپنی بہن کی شادی کر چکا ہے۔ اسے روٹی اور کپڑے کی بھی تکلیف نہیں۔ اب مالک مکان بھی اسے پریشان نہیں کرتا۔ مگر میں جانتا ہوں اس کے دل کی کیا کیفیت ہے۔ اپنی اولاد کو چند سکوں کے عوض دوسروں کو سونپ دینا ایک ایسا تکلیف دہ واقعہ ہے، جس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے۔ آج جب اس نے سنا ہوگا کہ اس کی بنائی ہوئی تصویر اوّل انعام کی مستحق قرار پائی ہے۔ تو اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی، وہ کیا سوچے گا، اسے کتنا دکھ ہوگا۔ میں اس تصور ہی سے کانپ جاتا ہوں۔

تجمل: تو اب تک تم نے ہمیں دھوکے میں رکھا۔ اپنی نالائقی چھپاتے رہے۔ میں نے اتنی آسائشیں لیے کا رہتیا کی تھیں۔

اختر: آپ ان کی قیمت وصول کر چکے ہیں ہمیشہ کی طرح اس سودے میں آپ ہی کو فائدہ ہوا ہے۔

تجمل: اس قدر فریب دینے کے بعد اپنے محسن کو جلی کٹی سناتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی۔؟

اختر: مجھے شرم کیوں آئے گی۔ شرم تو آپ لوگوں کو آنی چاہیئے جو بلندیوں پر پہنچنے کے لیے ہزاروں انسانوں کو اپنی سیڑھی بنا لیتے ہیں۔ جو ایک فن کار کی سرپرستی بھی کرتے ہیں تو اپنے مطلب کے لیے۔

تجمل: اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تم کیا ہو، احسان فراموش، چور، مجرم۔

اختر: میں سب کچھ ہوں مگر تم۔ تم کیا ہو۔ یہ بھی تو کہو؟

تجمل: میں؟

اختر: ہاں تم —— بتاؤ، خاموش کیوں ہو، بتاتے کیوں نہیں۔ دوسروں کے جرم دیکھ لیتے ہو۔ دوسروں کو مجرم کہتے ہو، مگر اپنے متعلق کچھ نہیں کہتے۔ بتاؤں کون ہو تم؟

(رؤف آتا ہے۔ دونوں خاموش ہو جاتے ہیں)

رؤف: وہ خبر بالکل درست ہے جناب۔ پہلا انعام اختر صاحب ہی کو ملا ہے۔ یہ رہا اخبار (بغل سے اخبار نکالتا ہے) آپ ......
...... دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے)

تجمل: تم جاؤ اس وقت۔

رؤف: بہتر جناب (رؤف دروازے کی طرف جانے لگتا ہے، پھر ٹھہر جاتا ہے۔ اوہ یاد آ گیا مسٹر اختر آپ کا کوئی واقف کار راستے میں ملا تھا۔ اس نے ایک پیغام دیا ہے آپ کے نام۔ آپ کا کوئی مصور دوست تھا۔ نیازی۔)

اختر: ہاں کیا ہوا اسے، جلدی بتاؤ؟

رؤف: افسوس آج صبح اس نے خودکشی کر لی۔

اختر: خودکشی!

رؤف: جی ہاں۔ ہسپتال جانے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔

اختر: (تجمل سے) سنا تم نے ابھی پوچھ رہے تھے۔ میں کیا ہوں۔ اب تو تمھیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ تم کیا ہو، تم قاتل ہو۔

یہ قتل تم نے کیا ہے۔

تجمل : (غصے سے گرج کر) بکواس بند کرو۔

اختر : قانون تمھیں کچھ نہیں کہے گا۔ مگر انسانیت کی نظروں میں تم قاتل ہو۔ تم نے دو قتل کئے ہیں۔ ایک مصور کے فن کو موت کے گھاٹ اُتارا ہے اور دوسرے مصور کی جان لے لی ہے۔ یہ قتل نہیں تو اور کیا ہے۔ اور قتل کیا ہوتا ہے؟

تجمل : نکل جاؤ یہاں سے کمینے پاجی، احسان فراموش!

اختر : میری زبان رُک نہیں سکتی۔ میں چیخ چیخ کر کہوں گا، دیکھو لوگو! یہ قاتل ہے، اس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہ سوسائٹی کا خوفناک مجرم ہے یہ ——

تجمل : کھڑے کیوں ہو۔ اس پاجی کو دھکے دے کر نکال دو۔ لے جاؤ اسے پاگل خانے میں۔ پولیس کو ٹیلیفون کرو۔ یہ پاگل ہوگیا ہے۔ خطرناک پاگل ہے۔

(رؤف اختر کو دھکے مار کر باہر نکالنے لگتا ہے۔ اختر چیخ
چیخ کر کہہ رہا ہے "تم قاتل ہو۔ تم نے قتل کیا ہے۔ میں خاموش
نہیں رہوں گا۔" یہ آواز آہستہ آہستہ ڈُوبنے لگتی ہے۔ تجمل
دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں سے پیشانی کا پسینہ پونچھتا ہے۔
پردہ گرتا ہے)

ابن بطوطہ

کمبھو کرن کے نام سے ہندوستان میں جو میلہ لگتا ہے اس میں بھارت ورش کے اَن گنت باشی شریک ہوتے ہیں، کیا جوان کیا بڈھے، کیا مرد کیا عورتیں۔ ملک کے چپّے چپّے سے لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ پر اب کے جو میلہ لگا وہ پچھلے کئی برسوں کے میلوں سے بازی لے گیا، اس کا ایک کارن تو یہ کہ لوگ بہت زیادہ آئے۔ پھر ایک اور بات بھی سُنی گئی۔ کہا گیا کہ اس سال ایک ایسا مہاپُرش آیا ہے جس نے برسوں ہمالیہ کی کسی چوٹی پر بیٹھ کر دن رات تپسیا کی ہے۔ یہ مہاپُرش جدھر سے گزرتا تھا سب یاتری سر جھکا کر اس کا سواگت کرتے تھے۔ رکھنے والے کہتے تھے کہ اس مہاپُرش کا رُوپ سروپ شری کرشن کے روپ سروپ سے ملتا ہے۔

میلے میں ایک پُرانے پیڑ کے نیچے دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک نے اپنا منہ دوسرے کے کان سے لگاتے ہوئے کہا،

"وہ دیکھو مہاپُرش"

دوسرے آدمی نے ایک طرف دیکھا۔ جدھر دیکھا اُدھر ایک منش چلا آ رہا تھا۔ گیروا دھوتی پہنے ہوئے، پاؤں میں کھڑاویں اور دھوتی کے اُوپر سارے تن پر بھبھوت ملی ہوئی۔ ایک ہاتھ میں سنکھ اور دوسرے میں ایک گڑوی۔

جب یہ مہاپُرش ان دونوں کے قریب آیا تو دونوں نے سیس نوائی۔

مہاپُرش ذرا رُکا۔ گڑوی میں اُنگلیاں ڈالیں اور ان پر چھینٹے مار کر آگے چلا گیا۔

وہ جدھر سے بھی گزرتا تھا اسی طرح چھینٹے مارتا تھا جس پر ایک چھینٹا بھی پڑ جاتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ پوتّر ہو گیا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ مہاپُرش سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کوئی کہتا تھا واپس ہمالیہ کی چوٹی پر تپسیا کے لیئے چلا گیا ہے، کسی کا خیال تھا کہ گنگا مائی کی گود میں سما گیا ہے اور کوئی یہ بھی کہتا تھا کہ وہ یہیں کہیں ہے پر دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ اِسے دیکھ سکتا ہے جو آپ مہا ودوان ہو۔

وہ دونوں آدمی اُسے ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اس سے اشیرباد لینا چاہتے تھے پر وہ کہیں بھی نہیں مل رہا تھا، کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کہاں چلا گیا تھا وہ مہاپُرش۔ اسے ہزاروں آنکھیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ پر وہ کہیں نظر ہی نہ آتا تھا۔

اگر کچھ دن بعد یہ آدمی پاکستان میں آ جاتے، پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں پہنچ جاتے اور بازاروں، سڑکوں پر سے ہوتے ہوئے بندر روڈ کے تھیوسوفیکل ہال کی سیڑھیاں طے کر کے دائیں جانب ایک ایسے کمرے میں پہنچ جاتے جہاں چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں ترتیب کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں تو وہ میز کے ایک سرے پر اس مہاپُرش کو پا لیتے اگر

یہ مگر بہت اہمیت رکھتا ہے وہ اس لیے کہ یہاں وہ مہاپُرش بالکل اور ہی رنگ میں نظر آتا ہے۔

بہت شاندار سوٹ پہنے ہوئے۔ یہ سوٹ اس نے پچھلے دنوں جب یورپ گیا تھا تو لندن کے ایک بازار سے خریدا تھا۔

وہ دو آدمی تو اپنے مہاتپسوی کو اس رنگ ڈھنگ میں دیکھ کر فوراً بیہوش ہو جاتے اور پھر شاید گنگا جمنا کے سنگم کے پانی سے چھینٹے مارنے پر بھی ہوش میں نہ آتے، مگر ہمارا یہ حال نہیں ہو سکتا، کیونکہ ابن انشا کو کبھی وہ سمجھا ہی نہیں جو کمبھ کرن کے میلے کے یاتری اسے سمجھے تھے۔ تو یہ ابن انشا تھے جو مہاپُرش بن کر کمبھ کے میلے میں چلے گئے تھے۔

جی ہاں !

اخباروں میں یہ خبر چھپتی تو یہ اُس سال کی غالباً سب سے بڑی سنسنی خیز خبر سمجھی جاتی۔ ابن انشا کا مہاتپسوی کے روپ میں کمبھ کے میلے میں چلا جانا ان ہونی بات ہے۔

یقیناً ان ہونی بات ہے اور میں بھی اُسے شاید اَن ہونی ہی کہتا، لیکن ایک دو باتیں ہیں ایسی کہ میں اَن ہونی کو ہونی ہی کہہ سکتا ہوں یا سمجھ سکتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ ابن انشا اس زمانے کا غالباً سب سے بڑا سیاح ہے جو نگری نگری پھر چکا ہے، مگر گھر کا راستہ کبھی نہیں بھولا۔

ساری دنیا میں گھوم کر وہ ثابت کر چکا ہے کہ دُنیا چپٹی نہیں گول ہے۔

وہ چین میں بھی جا چکا ہے اور یہ نعرہ بھی لگا چکا ہے کہ چلتے ہو تو چین کو چلیے۔

اس نے بہت آوارہ گردی کی ہے۔ اس کی ڈائری بھی لکھ دی ہے کہ سند رہے، اور اپنے اور دوسروں کے کام آئے۔

یہی نہیں وہ آنجہانی ابن بطوطہ کا بھی تعاقب کرتا رہا ہے اور اس تعاقب میں خدا جانے کیسے کیسے ”ہفت خوانوں“ سے گزرا ہے۔

ایسے شخص کے لیے ایک ہمسایہ ملک میں چلے جانا کیا کوئی مشکل کام ہے۔؟

دوسری بات یہ کہ جب ابن انشاء کا ذہنی مرشد، رچرڈ برٹن آف الف لیلہ فیم ایک عرب بن کر حج کر سکتا ہے۔ اور ہزا حاجیوں کے ساتھ اس طرح گھل مل سکتا ہے کہ کوئی اسے پہچان ہی نہ سکے تو اس کے شاگرد میں یہ خوبی نہیں ہو سکتی کہ وہ ذرا بھیس بد کمبھ کے میلے میں چلا جائے؟ اس میں آخر مشکل کیا ہے۔ جیسا اُستاد ویسا شاگرد۔

مجھے تو اس میں کوئی ناممکن چیز نظر نہیں آتی۔

رچرڈ برٹن الحاج رچرڈ برٹن ہو سکتا ہے تو ابن انشا کمبھ کے میلے کا مہاتپسوی کیوں نہیں ہو سکتا۔ جب کہ اس کے چہرے کا رنگ کرشن مہاراج کے رنگ سے بہت ملتا ہے۔ میں مسئلہ تناسخ کا قائل نہیں ویسے بھی ابن انشا نہ تو منٹو کا بابو گوپی ناتھ ہے اور ن گوپی قسم کی چیز سے کبھی تعلقِ خاطر رہا ہے اور پھر وہ مکھن بھی نہیں چُراتا۔

آپ کہیں گے ایسا نہیں ہوا، اور میں بھی کہتا ہوں ایسا نہیں ہوا، مگر اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہو تو سکتا

ویسے ابن انشا کس ناممکن کو ممکن نہیں بنا سکتے؟ سوچنے والی بات ہے! شاعری کر سکتے ہیں، مزاحیہ اور طنزیہ کالم لکھ سکتے ہیں۔ ساری دنیا کی سیر و سیاحت کر سکتے ہیں اور چاند سے عشق بھی فرما سکتے ہیں۔

چاند کے عشق سے یاد آیا کہ "اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا" اس نے بھی چاند سے عشق کیا تھا مگر تھا بیچارہ بدقسمت۔ پاگل ہو گیا۔ لیکن ابن انشا ٹھہرے خوش قسمت۔ اُنھوں نے چاند سے عشق کیا تو روز بروز نکھرتے چلے گئے۔ زیادہ سے زیادہ عقل مند ہوتے چلے گئے۔

اپنی اپنی قسمت ہے!

ابن انشا نے صرف۔ چاند ہی کے لیے اپنا دل اپنا جگر وقف نہیں کیا ان کا دل بےحد وسیع ہے، اتنا وسیع کہ اس کی وُسعتوں میں جو بھی آتا ہے سما جاتا ہے۔ پیار ان کا دین اور محبت ان کا ایمان ہے اور یہ پیار، یہ محبت ہر ایک کے لیے ہے۔ اپنوں کے لیے بھی اور بیگانوں کے لیے بھی۔

لاہور میں آتے ہیں تو اپنے سب چاہنے والوں کو سلام محبت دینے لگتے ہیں۔ ہاتھ میں ان کے ایک چھوٹی سی کاپی ہوتی ہے اور سامنے نیشنل بک کونسل کا ٹیلیفون دھرا ہوتا ہے۔

'تابش صاحب سلام کریں گے تو وہ اپنے خیالوں میں اتنے ڈوبے ہوتے ہیں کہ سلام کا جواب بھی نہیں دیتے۔

"ہیلو ـــ میں ہوں ـــ بھلا بوجھو تو کون ہوں۔ جی جی۔ اچھا ہوں بھئی آپ سے ایک شکایت ہے۔ الفلاح میں بیٹھی ہوئی ایک صاحبہ فلاح دارین پاتی رہتی ہے اور ایک ہم ہیں آوارہ گرد، سیلانی۔ لاہور اور لاہور والوں کو سلام عرض کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ سلام کر کے چلے جائیں گے۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔ ہی ہی ہی ہی ہی ہی۔ ضرور ہو گی۔ آج شام حاضر ہو جاؤں گا دفتر میں یا:"

ہیلو!

اس دفتر میں ہمارے ایک پرانے جاننے والے ہوتے ہیں نام ان کا انتظار حسین۔ وہی جو آج کل کہانیاں لکھ لکھ کر طلسم ہوش ربا کا طلسم باندھ رہے ہیں۔

ارے آپ ہیں جگ جگ جیو! صاحب! ہم نے کیا خطا کی ہے کہ آپ پوچھتے نہیں۔ سر آنکھوں پر آیئے! منتظر ہوں۔ انتظار حسین کا!

"ہیلو وہ جو اپنے اشفاق احمد ہیں۔ ذرا کہیے۔ کراچی سے ان کا ایک چاہنے والا آیا ہے۔

کیا نہیں ہیں۔ اوہو۔ یہ کمبخت کبھی دفتر میں نہیں ہوتا۔

اشفاق احمد نہیں ملے تو موڈ ذرا بگڑ گیا ہے اور انھیں یک لخت یاد آ جاتا ہے کہ جب وہ دفتر میں آتے تھے اور اپنی جیب سے ذاتی ٹیلیفون ڈائریکٹری نکال رہے تھے تو تابش صاحب کے ہونٹ ہلے تھے۔

"کیا کہنا تھا تابش صاحب!"

"کچھ نہیں سر!"

"کچھ کہا تو تھا۔ جب میں آیا تھا۔ آپ کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی تھی۔ میں نے یہ حرکت دیکھ لی تھی۔"

"سر وہ تو میں نے سلام کیا تھا۔"

"وعلیکم السلام! یار معاف کرنا۔ جواب دے ہی نہ سکا۔"

"میں جانتا ہوں سر۔"

ذوالفقار احمد تابش کا مسکراتا ہوا شگفتہ چہرہ انشاجی کا موڈ بحال کر دیتا ہے اور "ہیلو ہیلو" شروع ہو جاتا ہے۔ ادھر سے نجانے کیا جواب ملتا ہے۔

"آواز پہچان لی آپ نے۔ خوب۔" انشاجی کا چہرہ مسکراہٹوں میں ڈوب جاتا ہے۔ سانولے چہرے پر مسکراہٹوں کا چمکتا ہوا غبار ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے۔ آج ہی آیا ہوں، ملاقات بڑی ضروری ہے۔ جب کہیں جہاں کہیں بندہ بشر حاضر ہو جائے گا، بندے کس کے ہیں حضور۔"

اب کے لہجہ کافی مؤدبانہ ہے۔ کیونکہ انشاجی اس وقت کسی بے تکلف دوست سے نہیں، مولانا حامد علی خان سے مخاطب ہیں۔

گفتگو ختم کر کے وہ ریسیور رکھ دیتے ہیں۔ چند سیکنڈ کے بعد دوبارہ اٹھاتے ہیں مگر کسی کو مخاطب نہیں کرتے۔ اب کے ریسیور کچھ بلندی سے اپنے جائے قیام کی طرف جاتا ہے۔ "ٹھک" کی آواز پر انشاجی ذرا چونکتے ہیں۔ میز پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور پیپر ویٹ ایک خاص انداز سے اٹھا لیتے ہیں، پھر ایک لمحہ توقف کیے بغیر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی پیشانی کو ذرا غور سے دیکھتے ہیں، مرکزِ نظر کسمسا کر غیر ارادۃً اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھ دیتا ہے۔ انشا، اس منظر سے لطف اندوز ہو کر پیپر ویٹ ٹیلیفون کے پہلو میں اس آہستگی سے رکھیں گے جیسے ماں اپنے سوئے ہوئے بچے کو بڑی احتیاط سے چارپائی پر لٹا دیتی ہے۔ خطرے کے پیشِ نظر پیشانی پر ہاتھ رکھنے والا شخص ذرا شرمندہ ہو کر مسکرانے لگتا ہے اور انشاجی تو پہلے ہی مسکرا رہے ہیں۔

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں اور انشاجی کے ہاں بھی سکون کا گزر ممکن نہیں۔ ان کے اردگرد کچھ لوگ بیٹھے ہیں جو معنی خیز نظروں سے انھیں دیکھ رہے ہیں۔

"تو صاحب آپ کا کیا حال ہے!" انشاجی ایک صاحب سے غالباً تیسری بار دریافت حال کرتے ہیں، مگر اس سے پہلے کہ ان کا مخاطب کوئی روایتی فقرہ کہے ان کا چہرہ تابش صاحب کی طرف مڑ جاتا ہے۔

"قاسمی صاحب سے بات کر لی تھی۔"

"کر لی تھی وہ ——"

"آجائیں گے وہ۔"

انھوں نے فرمایا ہے آج کل۔۔

انشاجی جلدی جلدی اپنا بریف کیس کھولیں گے، ایک لفافہ نکالیں گے اور اس میں سے پی آئی اے کا ٹکٹ نکال کر اس کا جائزہ لیں گے۔

"تابش صاحب" انشاجی ٹکٹ تابش صاحب کے حوالے کر دیتے ہیں۔

"آپ ۱۳ کو نہیں جا رہے —" تابش صاحب ہنس کر پوچھتے ہیں۔

"ہاں بھیے — یہ بکنگ کینسل کر دیں اور"

"۱۴ کی صبح کی فلائٹ — ؟"

"ٹھیک ہے"

تابش صاحب جلدی سے کاپی نکال کر پی، آئی اے کا نمبر دیکھتے ہیں اور ڈائل گھمانے لگتے ہیں۔

"ذرا ٹھہر جائیے" انشاجی کاغذ کے اشارے سے تابش صاحب کو روک دیتے ہیں۔

ڈائل کرتا ہوا ہاتھ رُک جاتا ہے۔

"قاسمی صاحب نے کیا کہا تھا؟"

انھوں نے کہا تھا کہ میٹنگ میں چار کے بجائے پانچ بجے آسکتے ہیں"

"اس کا مطلب ہے کہ میں کل ہی جا سکتا ہوں"

"آپ کی یہ مرضی ہے سر کیا کہا جا سکتا ہے"

"نہیں تاریخ بدلوا دیں۔ ٹرائی کیجیے کہنے کیا ہیں" انشاجی کچھ سوچ کر تیسرے دن ہی جانے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔

تابش صاحب ٹرائی کرتے ہیں۔ پی آئی اے والے مان جاتے ہیں۔ تابش صاحب ستار صاحب کو بلاتے ہیں اور ٹکٹ اُن کے حوالے کر کے صورت حال واضح کر دیتے ہیں۔

ستار ٹکٹ لے کر واپس نکل جاتے ہیں۔ "سر میٹنگ پانچ بجے ہوگی"

تابش صاحب کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا، کیونکہ انشاجی اپنے پروگرام پر غور کر رہے ہیں۔ ان کی زندگی میں دو فکریں بڑی اہم ہیں۔ فکرِ سخن اور فکرِ پروگرام، فکرِ سخن کرتے وقت ان کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے اور فکرِ پروگرام کے وقت پی آئی اے کا ٹکٹ

"اشفاق صاحب آگئے ہوں گے سر!"

"کون ٹکٹ لے کر گیا ہے!" انشاجی نے پروگرام پر غور کر لیا ہے۔

"ستار"

"رمضان کو کہیے کہ ستار کو واپس لے آئے"

"تو سر —"

[illegible]

انشاجی مطمئن ہیں، مگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو ایسے عالم میں ان کے چہرے پر پریشانی کے باقیات واضح طور پر نظر آجائیں گے۔

"فون کر دیں۔ AS IT IS"

سید سجاد حیدر یلدرم ہی کے زمانے میں ایک اور رُومانی ادیب تھے تخلیقی دہلوی۔ ان کی شگفتہ تحریروں کے مجموعے کا نام ہے 'ادلبتان' ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے۔

"اس سے پہلے کہ میں سفر پر سوار ہوؤں، سفر مجھ پر سوار ہوجاتا ہے۔" کچھ ایسا ہی فقرہ ہے۔ انشاجی کا بھی یہی حال ہوتا ہے' لیکن وہ سفر کا بارِگراں ہر وقت اپنے کندھوں پر رہنے نہیں دیتے۔ کھسکاتے رہتے ہیں اور یہ بارِگراں ان کے عملے کے کندھوں کی زینت بنا رہتا ہے۔

میرے لیے یہ مسئلہ اُلجھن پیدا کرتا رہتا تھا کہ انشاجی پر تو ہر وقت سفر سوار رہتا ہے وہ شاعری کیونکہ کرتے اور اپنے پُرلطف کالم کیونکر لکھ پاتے ہیں۔

یہ سوال اُن سے پوچھا۔

"شاعری ختم ہوگئی —— اور کالم —— بس کالم ہوتے ہیں"

ایک بار کراچی میں ان کے ہاں پہنچا دفتر میں تو اس سوال کا جواب مل گیا۔

انشاجی اپنی کرسی پر براجمان تھے۔ اِردگرد تین چار دوست بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں ان کے پین تھا اور سر جھکا ہوا تھا ایک کاغذ پر۔ چہرے پر حسبِ معمول مسکراہٹ تھی۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

ریسیور اُٹھایا گیا "جی جی۔ پانچ منٹ میں مکمل ہو جائے گا۔ آدمی بھیج دیجئے۔ بہت اچھا"

معلوم ہوا کہ کالم لکھا جا رہا ہے اور کس طرح لکھا جا رہا ہے؟ احباب سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ بار بار پتلون کی کریز بھی درست کی جارہی ہے، عینک کے شیشے بھی صاف کیے جارہے ہیں اور قلم بھی کاغذ سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہے' کوئی مزے دار فقرہ لکھتے ہیں تو یار دوستوں کو سُنا کر فرمائشی داد بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ فرمائشی داد حاصل کرنے میں شاعروں ———— کی طرح انشاجی بھی بڑے ماہر ہیں۔ اگر داد نہ دی جائے تو انشاجی اسے اپنے حق میں بیداد سمجھتے ہیں۔

انشاجی نے اپنے حالات کبھی نہیں بتائے۔ سُنا گیا ہے کہ جس زمانے میں مشرقی پنجاب کے مشہور شہر لدھیانے میں زیرِ تعلیم تھے تو ان کے ہم سبق تھے۔ ساحر لدھیانوی اور حمید اختر۔

تینوں نے ہی ادب اور صحافت میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔

[illegible] شاعر بن کر [illegible] صحافت کر کے، سفر نامے لکھ کر نیشنل بک کونسل کے ناظم بن کر اور مزاحیہ، طنزیہ کا

لکھ کر، ساحر لدھیانوی نے شاعری کر کے ترقی پسند تحریک میں بھرپور حصہ لے کر اور بمبئی جا کر۔

حمید اختر نے ادب میں نام پیدا نہیں کیا مگر وہ ہیں بڑی خوب چیز۔ ان کی شہرت کے کئی سرچشمے ہیں۔ مثلاً وہ بڑے پیارے دوست ہیں۔ ایک اخبار کے ساتھ بھی ایک طویل مدت سے وابستہ ہیں۔ سیمنٹ کا کاروبار بھی کرتے ہیں اور ایک اور بات بھی ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ فلم اسٹاروں سے ان کے تعلقات بڑے گہرے ہیں۔ ان کے پاس اپنی کار بھی ہے ـــــ کاروباری بھی ہیں اور صاحبِ کار بھی۔ سونے پر سہاگا اسی کو کہتے ہیں۔

ان تینوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو ایرانِ قدیم کے بھی تین دوست یاد آجاتے ہیں۔

یہ تین دوست، حکیم عمر خیام، حسن بن صباح اور نظام الملک طوسی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ان تینوں نے آپس میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا وعدہ کر رکھا تھا، چنانچہ روایت ہے کہ نظام الملک نے عمر خیام کو ایک نہایت خوبصورت باغ بنوا دیا تھا جس میں وہ ایسی کارروائی کرتا تھا جو عمر خیام کے مصور ایڈیشن میں چیختے چلاتے رنگوں کے ذریعے بتائی گئی ہے۔

ابن انشا، ساحر لدھیانوی اور حمید اختر نے آپس میں کوئی معاہدہ یا وعدہ نہیں کیا تھا، اس لیے ان کی دوستی ابھی تک سلامت ہے۔

میں نے ایک روز پوچھا شیر محمد قیصر صاحب!

ان کا سانولا چہرہ گلاب سُرخ بن گیا۔

چلیئے آپ شیر محمد قیصر ہیں یا ابن انشا ہیں۔ مگر آپ اُردو ادب میں غالباً دوسرے شیر محمد ہیں۔ پہلے شیر محمد اختر ہیں۔

"شیر محمد اختر میرے بزرگ اور دوست ہیں۔" ارشاد ہوا۔

"وہ اختر کیوں اور آپ قیصر کیوں۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟"

"اس کی ایک وجہ ہے۔"

"کیا وجہ!"

"وہ شیر محمد اختر اس وجہ سے ہیں کہ وہ شیر محمد اختر ہیں۔"

"اور آپ شیر محمد قیصر اس بنا پر ہیں کہ آپ شیر محمد قیصر ہیں۔"

شیر محمد کے سانولے چہرے پر مُسکراہٹوں کا نور بکھر گیا۔

یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ شیر محمد اختر کو اختر کی نسبت سے آسمانی مخلوق کے ساتھ تعلق ہونا چاہیئے تھا، مگر اختر شناسی سے اُنھیں دُور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ وہ بلندیوں پر چمکتے ہوئے ستاروں سے آگاہی حاصل کرنے کے بجائے انسانی ذہن کی گہرائیوں میں جھانکتے رہتے تھے۔ اور یوں ماہرِ نفسیات کہلاتے تھے۔ شیر محمد قیصر کے جدِ امجد نے قیصرِ ہند ملکہ وکٹوریہ کے دربار میں رسائی حاصل کی تھی اور قیصرِ روم سے اُنھیں کسی قسم کی نسبت برقرار رکھنے کا موقع ملا تھا۔ علاوہ ازیں ان کا خاندان کبھی کسی قصر میں بھی آتش پذیر

نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ قیصر کرنیکر بن گئے۔ صاحب بن گئے کیا کیا جاتے۔ بننے والے کچھ نہ کچھ بن ہی جاتے ہیں۔ شبیر محمد قیصر نہ ابن انشاؔ کی بات کرتے ہیں تو کہیے وہ اور کیا کچھ بنیں گے۔ یہی دیکھیے۔ خود کہتے ہیں۔

کبھی میر فقیر کے بیتوں سے کبھی غزلوں سے انشا صاحب کی
ان برہا کی بےکل راتوں میں ہم جوت جگاتے ہیں فن کی

ویسے تو انشا جی میر کے بڑے معتقد بنتے ہیں، مگر یہاں خود کو میر صاحب کے پہلو میں کھڑا کر لیا ہے۔ گویا ان دونوں میں کوئی فرق ہی نہیں۔ فرق ہے صاحب۔ فرق کیوں نہیں۔ میر بےچارے فقیر اور یہ انشا صاحب۔ سبحان اللہ! عقیدت ہو تو ایسی ہو!

میں ابن انشا کا نام استعمال کرتا رہا ہوں مگر نہ جانے کس سطر سے انشا جی شروع کر دیا ہے۔ اصل میں کچھ قصور میرا بھی نہیں۔ انشا جی اپنے کلام میں ہر مقام پر بالعموم انشا جی ہی نظر آتے ہیں ملاحظہ ہو۔

انشا جی پھر اتنے سویرے صبر کا دامن چھوڑ رہے ہو
پچھلی رات کا درد ابھی سینے سے مٹنے نہیں پایا

اور تو اور اپنے مجموعے میں پوری ایک غزل لکھ دی ہے۔ جس کی ردیف ہے "انشا نے" یہاں جی کیوں بھول گئے۔ میرا خیال ہے یہاں شاید انھیں کچھ حیا آ گئی۔ اس غزل میں دوسرا شعر یوں ہے:

قیس کی سنت تجدید وفا میں پھر اس شخص نے زندہ کی
ہم کو بھی پہلے یقیں نہیں آیا انشا نے ہاں انشا نے

جو شخص قیس ثانی بننے کا دعویٰ کر رہا ہو اُسے "جی" کہلانے کی بھلا کیا حاجت رہتی ہے۔؟ پھر ملاحظہ فرمائیے اپنے نام پر کتنا زور دیا ہے۔

"انشا نے، ہاں انشا نے" گویا بھولیے مت قیس کی سنت تجدید وفا میں انشا نے اور صرف انشا نے زندہ کی ہے۔ شدتِ جوش میں وہ یہ بھی بھول گئے کہ وہ خود انشا نہیں ہیں۔ ابنِ انشا ہیں۔ دل میں جوشِ فراواں ہو تو انسان کیا کچھ نہیں کہہ جاتا

انشا جی یہ سطریں پڑھیں گے تو مسکرا کر کہیں گے۔ آخر میر نے بھی تو اپنے نام کے ساتھ "صاحب" لگایا ہے۔ میں نے لگا لیا ہے تو حرج کیا ہو گیا ہے اور وہ بطور سند کے کہیں گے۔

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

کتنی معقول توجیہہ ہے، مگر ان کی خدمت میں یہ بھی تو عرض کیا جا سکتا ہے کہ میر صاحب کو یہ حق حاصل تھا کیونکہ ان کے سر پر دستار رہتی تھی آپ کے سر پر کیا ہے؟

انشا اور میر صاحب کا مقابلہ کرتے وقت انھوں نے حد درجہ انکساری سے بھی کام لیا ہے۔

اک بات کہیں گے انشا جی تمھیں ریختہ کہتے عمر ہوئی
تم ایک جہاں کا علم پڑھے کوئی میر سا شعر کہا تم نے

خیر یہاں وہ جانیں یا میر صاحب جانیں، مگر انشا جی نے یہ بات بالکل درست کہی ہے۔ "تم ایک جہاں کا علم پڑھے۔" انشا جی واقعی بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ میں تو ادب کے موضوعات پر بات کرتے ہوئے اُن کے سامنے ہیبت زدہ رہتا ہوں۔ اُردو کے سارے کلاسیکی لٹریچر کے ہفت خواں طے کر چکے ہیں۔ فارسی اور عربی خوب جانتے ہیں۔ ہندی میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ گورمکھی میں بھی دسترس حاصل ہے۔ انگریزی زبان و ادب پر انھیں ایسی قدرت حاصل ہے کہ امریکی مصنف ایڈگر ایلن پو کی کہانیاں اُنھوں نے صرف چند روز میں ترجمہ کر دی تھیں اور یہ کہانیاں اُردو میں "اندھا کنواں" کے نام سے چھپی تھیں۔ بڑے عالم فاضل آدمی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انشا جی ہیں بڑی خوبیوں کے مالک آدمی۔ ان کی بے شمار خوبیوں میں ایک ایسی خوبی بھی ہے جو دنیائے ادب میں صرف انہی کی ذات سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ دنیا کے شاید کسی شاعر نے کبھی اپنے کلام میں اپنی عمر کا اعلان نہیں کیا۔ یا کیا ہے تو مجھے اس کا علم نہیں ہے مگر انشا جی نے کیا ہے اور پورے زور سے کیا ہے۔

انشا جی چھبیس برس کے ہو کے یہ باتیں کرتے ہو۔
انشا جی! اس عمر کے لوگ تو بڑے سیانے ہوتے ہیں۔

بتائیے یہ خوبی کسی اور شاعر میں نظر آتی ہے۔ ویسے عرض یہ ہے کہ اُنھوں نے بڑی انکساری سے کام لیا ہے۔ اس عمر میں ہی نہیں، اس عمر سے پہلے بھی وہ بڑے سیانے تھے۔ تو یہ شعر انھوں نے چھبیس برس کی عمر میں کہا تھا۔ اس کی ضرورت انھیں کیوں پیش آئی۔ شاید وہ کسی کو بتانا چاہتے تھے کہ میں چھبیس برس کا ہو چکا ہوں اس کے بعد ستائیس برس کا ہوں گا۔ پھر اٹھائیس برس کا۔ زندگی کی گاڑی آگے آگے بڑھتی جائے گی۔ اس لیے اے وہ ہستی کہ تو میری عمر سے ناواقف ہے جان لے کہ میں چھبیس برس کا ہو چکا ہوں۔ اس لیے "آنا ہے اگر تو آ جاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم"

لیکن یُوں بھی تو سوچا جا سکتا ہے کہ انشا جی نے آنے والے ادبی مورخوں کو بتایا ہے کہ فلاں سن میں میری عمر چھبیس برس کی ہو گئی تھی۔ اب حساب لگا لو کہ اسی نوے برس بعد میری عمر کیا ہو گی۔ خدانخواستہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انشا جی اسی نوے برس اور جئیں گے۔ توبہ۔ توبہ۔

میری تو دلی دُعا ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہاں ایک اور پہلو بھی میرے سامنے آ جاتا ہے۔ انشا جی قیس سے اپنا مقابلہ کرتے ہیں۔ مقابلہ نہیں، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے قیس کی سنّت زندہ رکھی ہے، مگر قیس کے بارے میں تو سُنا جاتا ہے سمجھا جاتا

ایک بار ہی عشق کیا اور انشا جی نے اس چھبیس برس کی عمر میں نہ جانے کتنے عشق کر لیے۔

انشاؔ نے پھر عشق کیا   انشاؔ صاحب دیوانے
اپنے بھی وہ دوست ہوئے   ہم بھی چلیں گے سمجھانے

یہ حادثہ "قریب قریب اس عمر کی منزل پر رونما ہوا تھا، کیونکہ یہ نظم جس میں انشا جی نے اپنے بار بار کے عشق کا اعلان کیا ہے، اسی مجموعے میں شامل ہے جس میں انہوں نے اپنی عمر بتائی ہے۔ دو تین سال کی کمی بیشی ممکن ہے۔

صاحب کسی شخص کا اپنی عمر کے بارے میں صحیح معلومات کا اظہار کرنا بڑا مشکل ہے۔ عورتیں بدنام ہیں کہ صحیح عمر نہیں بتاتیں، مگر مرد کب بتاتے ہیں۔ بالخصوص خدا کی وہ مخلوق جسے شاعر کہتے ہیں کب صحیح عمر بتاتی ہے؟ شاعروں سے ان کی عمر پوچھیے تو باستثنائے چند سب کے سب شرما جاتے ہیں۔

شاعر جب اپنی تصویروں کے ذریعے اپنی عمر بناتے یا بتانے کی کوشش کرتے ہیں تو کیسے کیسے 'معجزے' وقوع پذیر ہو جاتے ہیں۔ میں کسی اور شاعر کا نام نہ لوں گا۔ مجھ میں جھگڑا کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ اپنے پیارے اور مہربان دوست بخاری کی مثال دیتا ہوں' لگتا ہے پندرہ بیس برس کی عمر میں انہوں نے درجنوں کے حساب سے اپنے فوٹو تیار کروا لیے تھے اور پھر فوٹو کھنچوانے کی زحمت سے عمر بھر کے لیے فراغت پا لی تھی۔ اس کے بعد چالیس پچاس برسوں میں جس مدیر رسالہ نے بھی فوٹو مانگا۔ انہوں نے اپنی البم نکالی، اس میں سے ایک فوٹو کا انتخاب کیا، فوٹو کی پشت پر لکھا فارغ بخاری اور ایڈیٹر صاحب کو بھیج دیا۔ اس کو کہتے ہیں ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ چوکھا آئے۔

اب وہ لوگ جو اُن سے ملتے رہتے ہیں، اُن کا فوٹو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

خامہ اور ناطقہ جو چاہے لکھتا پھرے، کہتا پھرے کہ فارغ بخاری تو یہی ہیں۔ بالکل یہی ہیں جو اس سے تیس پینتیس برس پہلے تھے۔!

لاہور ایک بہت پُرانا شہر ہے۔ بہت پُر رونق شہر ہے۔ اس کے مختلف مقامات ہیں اور ان مختلف مقامات کی مختلف روایات ہیں۔ میں ان مقامات کا ذکر نہیں کروں گا۔ اس تذکرے کی ضرورت بھی نہیں۔ لاہور کی تاریخ تو نہیں لکھ رہا، مگر ایک مقام کا ذکر ناگزیر ہے اور اس وجہ سے ناگزیر ہے کہ یہاں ایک پیگوڈا ہے اور اس پیگوڈا کو یہ فخر حاصل ہے کہ لدھیانے سے یہاں وارد ہونے کے بعد انشا جی نے سب سے پہلے اس پیگوڈا کو، اپنا مامن قرار دیا تھا۔

قیام پاکستان سے پیشتر یہ مقام لاہور کی ایک مشہور و معروف سڑک میکلوڈ روڈ کے ایک جانب واقع ہے 'چوپاٹی' کہلاتا تھا۔ چوپاٹی بمبئی میں ہے اور اس بنا پر برصغیر میں شہرت رکھتا تھا کہ یہاں فلمی شخصیتیں گھومتی پھرتی رہتی ہیں اور لا

[illegible] پاکستان وجود پذیر ہوا تو لاہور کے باسی چوپاٹی کا لفظ بھول گئے مگر یہ اس

مقام کی خوبی ہے کہ اس نے اپنی روایت کو بدستور زندہ رکھا ہے یعنی یہاں آج بھی وہ لوگ جن کی پرچھائیں ہم "پردہ سکرین" پر دیکھتے ہیں، بغیر میک اپ کے اِدھر اُدھر آپس میں باتیں کرتے ہوئے یا باتیں کرنے کے لیے اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈتے ہوئے دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ جیسے جیسے شام قریب آتی جاتی ہے، اس مقام کی رونق میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

اس علاقہ میں نشاط سینما کے سامنے وہ عمارت کھڑی ہے جسے یار لوگ پگوڈا کہتے تھے اور ممکن ہے کچھ لوگ آج بھی اسے پگوڈا ہی کہتے ہوں۔

۱۹۴۷ء کے قرب وجوار میں جب انشا جی لاہور پہنچے تو لاہور کی سڑکوں اور بازاروں میں سے گزرتے ہوئے شاندار عمارتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سیدھے یہاں پہنچے اور ایک لمحہ تامل کیے بغیر اس پگوڈا کے اندر داخل ہو گئے جیسے خواب میں کسی بزرگ نے انھیں اس عمارت کی بشارت دی تھی اور کہا تھا "جا بیٹا! داخل ہو جا اس مکان میں بھاگ لگ جائیں گے"۔ انشا جی نے بزرگ کے بتائے ہوئے مکان کا نقشہ اپنے ذہن میں جما لیا تھا۔ وہ بغیر کسی کو بتائے اس کی تلاش کرتے رہے اور جیسے ہی یہ مکان ان کے سامنے آ گیا تو وہ ایک لمحہ تامل کیے بغیر بسم اللہ کہہ کر چلے گئے اس کے اندر۔

دیکھنے والے حیران تھے کہ انشا جی نے لاہور کے گلی کوچوں میں اتنے نفیس مکان چھوڑ کر ایک پگوڈے میں رہنا کیوں پسند کیا۔ وہ چاہتے تو لاہور کے کسی محلے میں بھی کسی بھی عالیشان مکان کا قفل توڑ کر اس کے "الاٹی" بن سکتے تھے۔ آخر انھیں یہ کیا سوجھا۔

میں نے بزرگ کی بشارت والا قصہ کیوں بتایا ہے، اس سلسلے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ایک شام جب میں نے اس پگوڈا میں انشا جی کے چھوٹے بھائی سردار محمود کی لائی ہوئی چند کھجوریں کھا کر اوپر سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا تھا تو انشا جی سے پوچھا تھا "آپ کو یہ پگوڈا کیوں پسند آیا ہے؟"

میرا یہ سوال سن کر اُن کے چہرے پر ایک عجیب و غریب مسکراہٹ آ گئی، ایسی مسکراہٹ جو کرشن کنھیا کے سانولے چہرے پر اُس وقت پھیلی ہو گی جب اُنھوں نے غالباً پہلی مرتبہ رادھا کی گگریا سے مکھن چرایا ہو گا۔ انشا جی کی مسکراہٹ میں کچھ تقدس بھی تھا، کچھ شرارت بھی اور کچھ ایسی کیفیت بھی جیسے بزبان خاموشی کہہ رہے ہوں "یہ راز کی باتیں ہیں۔ ہر ایک کو نہیں بتائی جا سکتیں"۔ اور واقعی اُنھوں نے مجھے کچھ نہ بتایا۔ یہ میرا وجدان کہتا ہے کہ اُنھیں کسی بزرگ نے بشارت دی ہو گی۔

ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ لاہور میں آنے سے پیشتر وہ جس جگہ رہتے تھے وہ بڑی بے رونق تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہا ہے:

آج تو اپنی ایک ڈگر ہے اپنے سبھی یاروں سے جُدا
اپنا جہاں اپنا جہاں ہے یا جادو کا گنگ محل!

تو انشا جی کسی گنگ محل میں رہتے تھے۔ لاہور میں آئے تو اُنھوں نے سوچا کہ اب وہ کسی گنگ محل میں نہیں رہیں گے ایسی جگہ رہیں گے جہاں ہر وقت شور و ہنگامہ برپا ہو اور اُنھوں نے یہ مکان پسند کر لیا جس کے اردگرد سینماؤں کی ایک دنیا آباد ہے جس سے کچھ دُور فلمی لوگ عام انسانوں کی طرح ہنستے بولتے ہیں۔ یہ مکان پا کر وہ بہت خوش ہوئے اگر کو [illegible] جگہ سے

بھری ہوئی چاٹی بھی انھیں دے دیتی تو وہ اس قدر خوش نہ ہوتے۔

پگوڑا انشا جی کی رہائش گاہ بن گیا تو ان کے دوستوں کے مزے ہو گئے۔ وہ یوں کہ ان کے احباب دن کے کسی وقت بھی اور رات کے کسی لمحے میں بھی بغیر کسی تکلف کے وہاں چلے جاتے تھے اور انشا جی ہر آنے والے کا بڑی خندہ جبینی سے استقبال کرتے تھے ان کے چہرے پر کبھی ملال نہیں آتا تھا۔ اپنے آرام کا ذرہ برابر خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کے پگوڑا کا دروازہ ہر ایک کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔

ان آنے والوں میں نمایاں نام یہ تھے۔ احمد راہی، ابراہیم جلیس، حمید اختر، شیر محمد اختر اور منیر نیازی، ان میں احمد راہی ا ابراہیم جلیس انشا جی سے بہت بے تکلف تھے۔ باقی لوگ بہت حد تک ادب آداب ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ میں اپنا نام لکھنا تو بھول ہی گیا مگر میں ٹھہرا خاموش طبع آدمی، میری موجودگی اور عدم موجودگی قریب قریب برابر ہوتی تھی۔

میں جب بھی انشا جی کو دیکھتا تھا یاروں کی محفل ہی میں دیکھتا تھا۔ خواہش تھی کہ انھیں کسی دن تنہا دیکھوں اور یہ معلو کرنے کی کوشش کروں اور ایک دن میری یہ آرزو پوری ہو گئی۔ انشا جی جھلنگا چارپائی پر اکیلے بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں ان کے پنسل تھی او ایک ضخیم سی کتاب پر ایک کاغذ بھی نظر آ رہا تھا۔ ان کے ہونٹوں سے ایک مدھم سی آواز نکل رہی تھی۔ پہلے خیال آیا ورد ہیں، پھر سوچا نہیں گا رہے ہیں۔ بہرحال کچھ ایسی ہی حرکت کر رہے تھے۔ میں ایک طرف کھڑا رہا۔ چند منٹ بعد انھوں نے کاغذ تہ کیا اور اُسے کمرے کے ایک سوراخ میں رکھ دیا۔ اس سے فارغ ہو کر تکیے کو ہٹایا، گنڈیریاں نکالیں اور مز سے چوسنے لگے۔

گنڈیریوں سے یاد آیا کہ انشا جی عام لوگوں کی خاطر تواضع عام طور پر دو چیزوں سے کرتے تھے۔ گنڈیریوں سے کھجوروں سے۔ گنڈیریاں وہ خود بازار سے خرید کر لاتے تھے اور کھجوریں اُن کے چھوٹے بھائی سردار محمود۔

احمد راہی کہتے "انشا، کچھ کھلاؤ یار!" انشا جی کے تکیے سے کچھ نہ نکلتا تو وہ سردار محمود سے کہتے "سردار! یہ بیچا بھوکا ہے لاؤ کچھ" اور جب سردار محمود بھوکے کے لیے کچھ لاتا تو ہمیں معلوم ہوتا کہ لفافے کے اندر کیا ہے۔ سردار محمد نے ہم کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ کھجوریں لے کر ہی آیا تھا۔

ایک روز احمد راہی نے کہا "یار خدا کے لیے آج تو کچھ اور لا" انشا جی تاکیداً بولے "بازار میں بہت سا پھل ہے لے کر آ" اور سردار محمود چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"کیا لائے" احمد راہی نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

"کیلے"

"اور!" ابراہیم جلیس نے سوال کیا۔

"گنڈیریاں"

"اور"

"کھجوریں"

اصل میں انشا جی بڑے سادا ہیں، لیکن ان کی سادگی میر تقی کی سی سادگی نہیں ہے۔ میر تقی کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ جس کی خاطر بیمار ہوئے تھے اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے تھے۔ انشا جی کی سادگی اپنے رنگ کی سادگی ہوتی تھی۔ اس سادگی میں انتہائی خلوص ہوتا تھا وہ جو ہمیں گنڈیریاں کھلاتے تھے وہ ان کے خلوص ہی کی طرح میٹھی ہوتی تھیں۔

ان کے خلوص اور سادگی کا ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آگیا ہے۔

مجھے جب ادبِ لطیف کے سالنامے کے لیے مضامین فراہم کرنے کی خاطر پہلی مرتبہ کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں انشا جی بحیثیت سرکاری ملازم ایک سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔ اسمبلی میں مترجم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ میں انشا جی کے علاوہ اور کہاں جا سکتا تھا۔

انشا جی نے سر آنکھوں پر جگہ دی، اتنا نوازا مجھے کہ ان دنوں کی یاد آج بھی میرے لیے نسیمِ سحر کا ہی ایک جھونکا بن کر آتی ہے۔ وقت صرف کر کے ایک ایک ادیب کے ہاں لے کر گئے اور ذاتی دلچسپی لے کر مضامین کی فراہمی کا کام کیا۔

ایک دن انشا جی کے گھر پر کھانے سے فارغ ہوا تو بولے۔

"سویٹ ڈش لاؤ۔"

چند منٹ بعد انشا جی کا چھوٹا بھائی ریاض محمود ایک پلیٹ میں بہت سارے بیر لے کر آ گیا۔

"یہ بیر ہماری اپنی بیری کے ہیں، شوق فرمائیے۔"

بعد میں انشا جی نے کراچی کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں مجھے کھانے کی دعوت دی، مگر وہ بیر اُن کی تو بات اور ہے!

انشا جی نے لاہور آتے ہی کسبِ حلال کے لیے تگ و دو شروع کر دی تھی اور اسی تگ و دو کا نتیجہ تھا کہ وہ لاہور ریڈیو کے نیوز کے شعبے میں بہ حیثیت مترجم کے کام کرنے لگے تھے۔ میں بھی ریڈیو سے وابستہ تھا اور ایک مدت سے وابستہ تھا۔ انشا جی لاہور ریڈیو کی پرانی عمارت میں اسٹوڈیوز کا درمیانی راستہ طے کرنے کے بعد بائیں رو کے آخری کمرے میں بیٹھتے تھے، ان کی ڈیوٹی ایک بجے شروع ہوتی تھی۔ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں فارغ ہو جاتے تھے۔ میں اس عمارت کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھ کر اپنی مخصوص ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ میرے ذمے دو کام تھے۔ ایک کام یہ کہ گانے والوں اور گانے والیوں کو ان کی مطلوبہ غزلیں اور نظمیں مہیا کروں اور دوسری ذمے داری تھی ان لوگوں کا تلفظ درست کرنا، کام بڑی آسانی سے ہو جاتا تھا، کیونکہ ریڈیو میں نقل نویسوں کا ایک مکمل محکمہ موجود تھا۔ ان سے غزلوں اور گیتوں کی نقلیں لے لیتا تھا۔ اور فن کاروں کے حوالے کر دیتا تھا، مگر دوسری ذمے داری بہت مشکل تھی۔ فن کار ہر روز تلفظ کے معاملے میں نئے نئے گُل کھلاتے رہتے تھے اور مجھے کم و بیش روزانہ دفتر آتے ہی متعلقہ افسر کے سامنے جواب دہی کرنا پڑتی تھی۔ لاکھ کوشش کرتا کہ زینت بیگم کدو کو کدّو نہ کہے، مگر اس مرحوم مغنیہ کو تو نہ جانے کدّو کہنے میں کیا مزہ ملتا تھا۔ ایک بار ایک نامور مغنیہ نے جو بڑی

خوش لہجہ بھی تھیں اور خوش شکل بھی اور اس وجہ سے بلبل کہلاتی تھیں انھوں نے اقبالؒ کے اس شعر میں ۔

رو رہی ہے آج اِک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

مینا کو مینا کہہ دیا ، افسر نے لکھ کر جواب طلبی کی۔ میں ہر روز جواب طلبی سے تنگ آ چکا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے لکھا۔ "جناب یہ گانے والی بلبل کہلاتی ہے اور بلبل کو مینا سے گہرا تعلق ہے۔ دونوں ہم صفیر ہیں۔ اس لیے انھوں نے مینا کو مینا کہہ دیا۔" توقع تھی افسرِ اعلیٰ کی حسِ ظرافت ضرور متاثر ہوگی اور مجھے کمرے میں بلا کر داد دی جائے گی۔ خوش خوش بیٹھا تھا کہ چپراسی نے جواب طلبی کا کاغذ میرے سامنے رکھ دیا۔ آدھے صفحے پر لکھا تھا، WHAT ۔

وہ تو خیر ہوئی کہ اس افسر کے بھی بڑے افسر کراچی سے آ کر ان کے کمرے میں رونق افروز ہو گئے۔ اور معاملہ دب گیا ورنہ اس WHAT کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ ؟

اس قسم کی تلخیاں زندگی میں آتی ہی رہتی ہیں اور ایسے موقع پر انشاجی کا دم بہت غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ میں بڑی بے صبری سے ایک بجے کا انتظار کرتا اور ادھر گھڑی ایک بجے کا اعلان کرتی میں سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگتا۔

انشاجی یا تو کمرے میں داخل ہو رہے ہوتے یا داخل ہو کر جیب سے قلم نکال کر اس انگریزی تحریر کو بغور دیکھ رہے ہوتے، جسے وہ اردو میں منتقل کرنے والے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے مسکراتے اور حسبِ معمول پوچھتے "کیا حال ہے ؟" اس کے بعد گفتگو بھی ہوتی رہتی اور وہ ترجمہ بھی کرتے رہتے۔ یہاں مشکل یہ تھی کہ انشاجی ہر روز نہیں آتے تھے ہفتے میں غالباً چار دن آتے تھے۔ باقی دنوں میں مختار صدیقی یا خلیل احمد ترجمے کا کام کرتے تھے۔ ایک دن میں دیر سے نیچے پہنچا۔ انشاجی اکیلے بیٹھے تھے بظاہر کام ختم کر چکے تھے اور نیوز ریڈر نیوز کا ترجمہ لے کر اسٹوڈیو میں جا چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے سامنے بہت سے کاغذ کے چھوٹے بڑے پرزے پڑے ہیں اور وہ پرزوں کے اس ڈھیر سے ایک ایک پرزہ اٹھاتے ہیں اور غور سے دیکھ کر دوبارہ وہیں رکھ دیتے ہیں۔ انھیں ایسے پرزوں سے کیا تعلق ہے۔ اور مجھے یک لخت یاد آ گیا کہ ایک بار انھوں نے تنہائی کے لمحوں میں ایک کاغذ کا پرزہ کمرے کی دیوار میں بھی محفوظ کر دیا تھا۔ یہ کوئی کھیل تو نہیں ہو سکتا جسے وہ تنہائی میں دل بہلانے کے لیے کھیلتے ہوں۔ یہ تو ان کا کوئی راز ہے۔ میں نے دل میں سوچا اور اس واقعہ کو کئی روز گزر گئے اور یہ راز اس وقت کھلا جب ایک شام ان کی زبانی اس بات کا ہوا کہ وہ اپنی نظم کاغذ کے پورے صفحے پر نہیں لکھتے، کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھتے ہیں اور یہ ٹکڑے وہ جمع کرتے جاتے ہیں۔ آخری مصرع شعر یا بند آخری ٹکڑے یا پرزے پر ہوتا ہے۔

میں نے پوچھا۔

"آپ نے بغداد کی رات سات برسوں میں لکھی ہے ؟"

"ہاں لکھی ہے !

"تو کیا سات برس تک آپ یہ پرزے جمع کرتے رہے !"

"نہیں پُرانے پُرزے پھاڑتا رہا اور ان کے بجائے نئے پُرزے داخل کرتا رہا۔"

"داخل کہاں کرتے رہے؟"

"جہاں پُرانے پُرزے ہوتے تھے۔"

"یعنی کمرے کی دیواروں میں۔"

"ہاں، دیواروں میں، جیبوں میں، صندوقوں میں، بکسوں میں۔"

حیرت ہے انشا جی کو کیسے یاد رہتا ہے کہ فلاں پُرزہ اُنھوں نے فلاں جگہ محفوظ کیا ہے۔

اب تو وہ شاعری سے بہت دُور چلے گئے ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھی ہیرا پھیری کر لیتے ہیں، مگر اب کالم نگاری کی وجہ سے ان کی پُرزہ بازی کی عادت میں پہلی سی 'باقاعدگی' باقی نہیں رہی۔

پُرزہ بازی ہی کا ایک اور واقعہ بھی مجھے یاد ہے۔

ادبِ لطیف کے سالنامے کے لیے مضامین کی فراہمی کے سلسلے میں جب پہلی مرتبہ کراچی گیا تھا تو انشا جی نے اس معاملے میں میری بہت مدد کی تھی، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ میرا سارا کام اُنھوں نے ہی کیا تھا۔ آخری دن جب میں لاہور آنے کی تیاری کر رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ میرے معزز میزبان نے لوگوں سے مضامین تو لے دیئے ہیں خود کچھ نہیں دیا تو پوچھا۔

"انشا جی آپ کی نظم!"

ٹال گئے۔ "کیا ضرورت ہے۔ کافی تعداد میں بہت اچھی چیزیں جمع ہو گئی ہیں۔"

"تاہم آپ کی چیز تو لازماً ہونی چاہیئے۔"

وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر اُٹھے نہ جانے کہاں سے ایک سیاہ رنگ کا بیگ لے آئے۔ اسے کھولا۔ ایک رومال نکالا، رومال کھولا اور میرے اور ان کے درمیان کاغذ کے پُرزوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔

"رات نقل کر دوں گا صبح مل جائے گی۔"

"بہت اچھا۔"

صبح ناشتے کی میز پر اُنھوں نے میرے ہاتھ میں کاغذوں کا ایک پلندہ تھما دیا۔ ان میں پوری نظم درج تھی اور یہ وہی نظم تھی جو "چاند نگر میں مضافات" کے عنوان سے شامل کی گئی ہے۔

حالی نے مرزا غالب کو 'حیوانِ ظریف' کہا تھا۔ یہی رائے انشا جی کے بارے میں بھی دی جا سکتی ہے۔ مزاحیہ کالم تو وہ کچھ برسوں سے لکھ رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی وہ اکثر و بیشتر خود کو حیوانِ ظریف کہلوانے کے حق بجانب تھے۔

مثلاً ایوبی دور میں مغربی پاکستان کے اہلِ قلم مشرقی پاکستان کے عوام سے روابط محبت قائم کرنے کی خاطر ڈھاکہ گئے تھے تو انشا جی نے دو معرکے کی باتیں کہی تھیں جو اسی وقت مشہورِ خاص و عام ہو گئی تھیں۔

مغربی پاکستان کے تمام اہلِ قلم کو ایک ایسی عمارت میں ٹھہرایا گیا تھا جس میں پچاس کمرے تھے اور کچھ مدت پہلے یہاں

ارکانِ اسمبلی رہتے تھے۔

ہر کمرے میں دو دو ادیبوں کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔

ایک روز انشا جی نے بتایا "جس کمرے میں مجھے قیام کرنا تھا وہ مقفل تھا۔ چوکیدار کو بلایا گیا کہ تالا کھول دے۔ وہ فوراً پچاس چابیوں کا گچھا لے کر آ گیا۔

پہلی چابی لگائی گئی۔ بے کار ثابت ہوئی۔ دوسری چابی کو آزمایا۔ وہی نتیجہ نکلا تیسری چابی بھی اپنے مقصد میں ناکام رہی۔ یہاں تک کہ انچاس چابیاں تالے کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ آخر جب پچاسویں چابی لگائی گئی تو تالا کھل گیا۔

"تو اتنی دیر تک آپ کیا کرتے رہے" کسی نے پوچھا۔

"مزے کا تماشا تھا دیکھتا رہا"

یہ بات یار دوستوں نے مزے لے لے کر ایک دوسرے کو سنائی۔

ناصر کاظمی مرحوم اور پروفیسر شہرت بخاری میں گاڑھی چھنتی تھی۔ ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے اور ایک ہی کمرے میں فروکش تھے۔ ایک دن کسی نے ان کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"اس میں کون لوگ رہتے ہیں۔!"

انشا جی نے جواب دیا۔

"یہاں اردو ادب کے نزاکت علی سلامت علی رہتے ہیں"

انشا جی اپنے ذاتی معاملات میں بڑے موٹے موٹے پردے ڈالے رکھتے ہیں۔ کیا مجال جو یہ پردے معاملات کے کس ایک گوشے سے بھی سرک جائیں۔ اگر کوئی بے تکلف دوست انھیں ٹٹولنے کی ذرہ برابر بھی کوشش کرتا ہے تو ایک لمحہ تام کیے بغیر اس کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔

ایک دن یارانِ سرِپل میں ان باتوں کا ذکر ہو رہا تھا جو شیخ سعدی نے گلستان کے باب پنجم میں لکھی ہیں۔

"انشا جی کچھ آپ بھی" کسی نے کہا۔

"کیا کروں!"

"زلف کی، رخسار کی باتیں کریں"

انشا جی جھینپ گئے، مگر کافی مدت بعد ہم رائٹرز گلڈ کی دعوت پر کراچی کے جبیس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے او ابھی ڈائننگ ہال میں کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے۔ انشا جی کے اندر کوئی پُراسرار جذبہ ایکا ایکی جاگ اٹھا، اور کہنے لگے۔

اس مکان میں صرف ہم دو آدمی رہتے تھے میں اور محمد حسین ——— میں تعلیم کے لیے وہاں مقیم تھا اور محمد حسین نوکر تھا، مگر اصل میں بے تکلف دوست تھا۔ اور بے تکلفی کے باوجود بڑی محبت سے میری خدمت کرتا تھا۔ مجھے کسی ق

تکلیف بھی نہیں ہونے دیتا تھا۔ تو میں نے دیکھا کہ کچھ دنوں سے وہ مجھ پر کچھ زیادہ ہی والہ و شیدا ہو گیا ہے۔

ایک رات چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ میں نہ سو سکا۔ بستر سے اٹھ بیٹھا۔ نہ جانے مجھے یہ خیال کیوں ستانے لگا کہ آج اس
میں دو کے بجائے تین آدمی موجود ہیں۔ یہ تیسری ہستی کون ہے یہ سوال میرے ذہن میں بے قرار تھا۔

اِدھر اُدھر دیکھا۔ سیڑھیوں پر چاندنی کچھ پُر اسرار سے اشارے کر رہی تھی۔ میں اُوپر چلا گیا۔ اُوپر ایک چھوٹا سا
جو بالعموم بند رہتا تھا۔ محمد حسین نے گھر کا بے کار سامان اس میں ڈال رکھا تھا اور چونکہ اس سامان کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑتی
اس لیے اس کا دروازہ ہمیشہ مقفل رہتا تھا۔

مَیں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں قفل نہیں تھا۔ حیرت ہوئی آج یہ قفل کے بغیر کیوں ہے ؟

اچانک میرے قدم دروازے کی طرف اُٹھنے لگے۔ دروازہ کھولا اور اندر دیکھا، ایک ٹوٹے ہوئے ٹرنک کے اُ
لڑکی گھور گھور کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، مگر ایک اجنبی کو دیکھ کر ان میں حیرت اور خوف کی کوئی کیفیت محسوس
ہوتی تھی۔ اِتنے میں مَیں نے دیکھا کہ محمد حسین ہاتھ باندھ کر میرے سامنے کھڑا ہے۔

انشا جی نے بات یہیں تک سُنائی تھی، اور مسکرا کر قصّہ ختم کر دیا تھا۔ اُن کی مُسکراہٹ کہہ رہی تھی "دوستو! تم
سوچو، مگر ہماری تردامنی کے بارے میں کیا کہتے ہو"

"دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں"

اور میں فرشتوں کو وضو کرتے ہوئے چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا، مگر رہ رہ کر خیال آ رہا تھا انشا جی نے صرو
کرتب دکھایا ہے۔

یہ لڑکی جس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں، آئی کہاں سے تھی۔ کیا عجیب اتفاق ہے۔ مثنوی سحر البیان کا ہیرو بے نظی
کے گھوڑے پر اُڑتا اُڑتا بدرِ منیر کے مکان میں داخل ہو گیا تھا۔ یہاں یہ بڑی بڑی آنکھوں والی حسینہ نہ جانے کس طر
کس ذریعے سے انشا جی کے گھر میں آ گئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ انشا جی تمہید کے بجائے واقعے کی جزئیات کا خیال کرتے

برس پندرہ ایک سا سن و سال
نہایت حسین اور صاحب جمال

مگر اُنھوں نے تو مکان کی صورت نگاری اور محمد حسین کی سیرت نگاری پر سارا زورِ بیان صرف کر دیا اور اصل
منٹ میں سُنا کر بزبانِ حال اِعلان کر دیا تھا۔

"ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے"

اس معاملے میں انشا جی سے بہت کچھ سُننے کی تمنّا تھی، مگر جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، انھیں بہرصورت ان فرشتو
فکر رہتی ہے جو وضو کرنے کے لیے ہر وقت ان کے دامن کو دیکھتے رہتے ہیں۔

انشا جی نے [illegible]

پیش نہیں آئی، کیونکہ وہاں کے پردوں کے باہر ہی بڑی خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کر لیتے ہیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ پردوں
کے پیچھے کیا ہے۔ آخر معلوم کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

مجھے انشا جی سے ایک شکایت ہے اور اس کا اظہار میں نے ان سے کبھی نہیں کیا۔ وہ بہت اچھے مزاحیہ کالم لکھ
ہیں اور آج کل انہی کالموں کی وجہ سے ہر جگہ ان کی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ ہر جگہ سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے ہیں۔ یار لو
توقع ہوتی ہے کہ انشا جی کبھی ان کا ذکر بھی اپنے کسی کالم میں کر دیں گے۔ یہ سب کچھ ہے، مگر وہ شاعر ابنِ انشا گم ہو گ
ہے جس نے "بغداد کی ایک رات" جیسی لازوال نظم لکھی تھی۔ اور جس نے یہ بھی کہا تھا۔

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے، کچھ نے کہا چہرا ترا

اور یہ شعر بھی تو اسی ابنِ انشا نے کہے تھے۔

دل نے ہمارے بیٹھے بیٹھے کیسے کیسے روگ لگائے
تم نے کسی کا نام لیا اور آنکھوں میں اپنے آنسو آئے
جتنی زبانیں اتنے قصے اپنی اداسی کے کارن کے
لیکن لوگ ابھی تک یہ سادہ سی پہیلی بوجھ نہ پائے

اور میں بھی تو یہ سادہ سی پہیلی بوجھ نہیں پایا کہ شاعر ابنِ انشا مکمل طور پر مزاح نگار انشا کیوں بن گیا ہے۔ کیسے
آدمی ہیں۔ بیٹھے بٹھائے ابن بطوطہ کا تعاقب شروع کر دیتے ہیں، مگر اس بنتِ بوطیقا کا ذرہ برابر خیال نہیں کرتے جو مسلسل ان
کر رہی ہے۔

انشا جی کو ان کی شاعری کی طرح میں نے بڑا خوبصورت آدمی پایا ہے۔ نہایت خلیق، نہایت ہمدرد اور مرنجاں مرنج آ
ایک خاص خوبی جو میں نے ان میں دیکھی ہے وہ یہ ہے کہ کسی پر احسان کرتے ہیں تو ہلکے سے اشارے سے بھی اس کا ذکر نہیں
کسی پر احسان کر کے وہ اسے بالکل بھول جاتے ہیں یہ خوبی اس وسعت کے ساتھ میں نے اور کسی شخص میں نہیں دیکھی۔

خلوص اور محبت ان کا شیوہ ہے۔ گھر میں کسی کو نہیں بلاتے۔ مگر اپنے دفتر میں ہر آنے والے کو کشادہ پیشانی سے
اس انداز سے اس کی پذیرائی کرتے ہیں جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہے تھے۔

انشا جی کے بارے میں یہ بات وثوق اور اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے ا
کے کس کس چشمے پر نہیں پہنچے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے راوی کو نہیں بھولے۔ راوی کے پانی کی خصوصیت بھرپور خلو
یہ پانی ان کی رگوں میں آج بھی خالص کا خالص ہے۔ یورپ کے چشموں کا "آبِ زلال" انھیں اپنے اندر جذب نہیں کر سکا، او
کر سکے گا۔

(یہ مضمون ابن انشا کی زندگی

ایک خوبصورت انسان

محمد طفیل، مدیر "نقوش"

پھول کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً گلاب کا پھول، اس ایک پھول کے سو رنگ ہیں۔ یہی حال شخصیتوں کا ہے، انسان ایک اس کے رُوپ سو، کہاں کہاں انسان ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ بس اسی نازک سے فرق کے اظہار کے لیے میں کبھی قلم اُٹھا لیتا ہوں۔

میں عموماً اپنے خاکوں کے عنوان متعین نہیں کرتا کیونکہ عنوان تجویز کر لینے کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے شخصیت کو جان لیا۔ میں یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا اس کے باوجود میرا دل چاہتا ہے کہ آج کی زیرِ بحث شخصیت کو ایک عنوان کے تحت لکھوں۔ سوچوں تو میرے اس مضمون کا عنوان ہوگا "ایک خوبصورت انسان"!

اگر خوبصورت کا معیار چہرہ مہرہ ٹھہرے تو پھر میرزا صاحب خوبصورت انسانوں میں شامل نہ ہو سکیں گے۔ اگر ما
اوصاف ہوں تو پھر کسی کو میرزا صاحب کے بالمقابل کھڑا کر دیکھیے۔ مقابلہ حُسن خوب ہوگا۔

میرزا ادیب کے ڈراموں کے ایک مجموعے کا نام ہے خاک نشین۔ خاک نشین اس کتاب کا ایک ڈرامہ ہے جو کہ ایک
کے گرد گھومتا ہے۔ جو قربانیوں کا مجسمہ ہے جو انسانیت کی معراج ہے۔

جب میں نیاز علی کردار کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسے لگتا ہے کہ جیسے وہ نیاز علی نہ ہو، دلاور علی ہو جسے زیادہ تر لوگ
کے نام سے جانتے ہیں۔

یہ ڈرامہ نگار جس کی اپنی زندگی میں کوئی ڈرامہ نہیں جو دھیرے دھیرے زندگی گزارنے کا چلن جانتا ہے۔ جو خاموش
کچھ نہ کہو کی عبادت میں مصروف نظر آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھیں کچھ اپنی کہیں کچھ اُن کی سُنیں۔

رسالے کے مدیر کا کام، دوسروں کے مضامین حاصل کرنا ہوتا ہے۔ جب کوئی مجھ سے مضمون مانگتا ہے تو میں سمجھتا ہوں
امام مسجد کے اپنے گھر میں مولود شریف ہوگا کیونکہ مولوی حضرات دوسروں کے گھروں ہی میں مولود شریف پڑھنے کو ثواب کا کام جا
ادارت کو بھی میں ایک بے ڈھنگا سا شغل گردانتا ہوں یعنی طعنے مہنے دو اور طعنے مہنے لو۔ مگر اس کے ساتھ اوٹ پٹ
حرکت یہ کرتا ہوں کہ خاکے لکھتا ہوں۔ جس کا خاکہ لکھا یہ جان کر لکھا کہ درست ہے مگر عموماً ہوتا یہ ہے کہ جب خاکہ حاضر کرتا ہوں
غائب ہو جاتے ہیں۔

خدا گواہ ہے میں خاکے لکھنا نہیں جانتا۔ ترنگ میں آکر تھوڑے سے خاکے ضرور لکھے۔ اس کے بعد جو مجھ سے خاکہ لکھ
ہے وہ میرے لیے پریشانیوں کا باعث ہوئی ہے۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ دوست اصرار کرتے ہیں کہ خاکہ لکھوں ان سے کہتا ہوں

لکھاؤ۔ دوستی کو کمیاب چیز جانو۔ مگر کوئی مانتا ہی نہیں، کہتے ہیں جو جیا ہو لکھو۔ مگر میں جو چاہتا ہوں۔ وہ نہیں لکھتا تو بھی دوست ناراض ہو جاتے ہیں۔ کیا کروں؟ مجھ سمیت آج تک ایک آدمی بھی ایسا پیدا نہیں ہوا۔ جسے آئینہ دیکھنے کا سلیقہ ہو۔

میں نے آج تک جتنے دوستوں کے خاکے لکھے اُن کے ساتھ خاصی رعایت برتی۔ مثلاً دوستی کے صدقے میں جو لیکچرر ہوتے ہیں انھیں پروفیسر بنا دیتا ہوں۔ جو پروفیسر ہوتے ہیں انھیں پرنسپل بنا دیتا ہوں۔ خود ہی بتائیں، اس سے بھی زیادہ لفظی ترقیاں کیسے دوں۔؟

خاکہ نویسی بڑا مشکل فن ہے یعنی خدائی حدود میں قدم رکھنے کو خاکہ نویسی کہتے ہیں۔ مثلاً جو کچھ آپ کو خدا نے بنایا ہے عین بن اس کے اظہار کو خاکہ نویسی جانتے۔ ایک طرف یہ تقاضے، دوسری طرف مراسم کا پھندا۔ کوئی کیا کرے کیا نہ کرے۔!

ان حالات میں اگر میں میرزا ادیب صاحب کی شخصیت پر مضمون لکھوں گا تو بے شک میرزا ادیب صاحب مجھ سے قطع تعلق نہ کریں گے۔ مگر ان کی خاموش گفتگو، پرے پرے رہنے والی قربت، میری زندگی کو اجیرن بنا سکتی ہے۔

میں نے ایک مضمون منٹو پر لکھا تھا وہ مجھے اچھا لگا کیونکہ منٹو کی زندگی دھوپ ہی تھی۔ دھوپ چھاؤں ہی چھاؤں۔ اس کا دل مومن تھا، دماغ کافر، وہ وضو کا اخلاقاً قائل تھا۔ اشنان کا عادتاً، وہ تیرنے کا قائل نہ تھا۔ ڈوب جانا ان کے مزاج کا خاصا تھا۔ وہ شریف آدمی بھی تھا۔ وہ محمد بھائی بھی تھا۔

اب اپنے میرزا ادیب کی سنیے۔ یہ اول تا آخر شریف آدمی ہیں شرافت کی بھی آخری حد پہ جہاں شریف کم نیک زیادہ ہوتے۔ میرا خیال ہے کہ خود میرزا ادیب صاحب کو بھی اپنی شرافت کا حدود اربعہ معلوم نہیں، اگر معلوم ہوتا تو اولیائی کا دعویٰ کر چکے ہوتے۔

پنجابی میں ایک محاورہ ہے "بھولے بادشاہ" کا، میں نے صرف محاورہ سنا تھا مگر بھولے بادشاہ کو دیکھا نہ تھا۔ اپنے محلے میں ڈھونڈا، اپنے سکول میں ڈھونڈا، اپنے بازار میں ڈھونڈا، مگر مجھے بھولا بادشاہ نہ ملا۔

جب میں نے ادب کی وادی میں قدم رکھا تو مجھے بھولا بادشاہ مل گیا۔ وہ کون؟ وہ اپنے میرزا ادیب اور کون؟ میں ادیبوں اور شاعروں میں "بھولے بادشاہ" کم دیکھتا ہوں۔ مگر دیکھے ضرور ہیں! نام گنوانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے کہ میں مضمون میرزا ادیب پر لکھ رہا ہوں۔ بہرحال میں نے میرزا ادیب صاحب کا قلمی زائچہ بنایا ہے۔ دیکھیں گے کہ لفظی ستارے کیا کہتے ہیں۔

میرزا ادیب نے شاعری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ سکول کے زمانے میں شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ پہلے عاصی تخلص، پھر ادیب۔ اس کے بعد میرزا ادیب بن گئے۔ بہرحال اس وقت مجھے آپ کو یہ بتانا ہے کہ یہ شاعر تھے، تائب ہو کر ادیب بنے۔

اسکول کے زمانے میں جو انھوں نے پہلی نظم لکھی اس کے ایک دو شعر آپ بھی سن لیں۔ طبع آزمائی کی تھی بکری پر، ایک شریف قسم کا جانور! بہرحال شعر سنیے:

میں نے دیکھی ہے آج ایک بکری   دُودھ دیتی ہے گھاس کھاتی ہے
پیار سے میرے پاس آتی ہے   جب پکڑتا ہوں بھاگ جاتی ہے

میرزا صاحب نے بکری پر نظم کیا لکھی کہ اپنی ساری زندگی اس نیک سرشت مخلوق کی طرز پر گزار دی۔ ذبح کر ڈالیے ذ واللہ۔ مگر نامرد اور سے گر دلاوری سے کوئی رشتہ ناطہ نہیں۔

بہ حیثیت ادیب ان کا مرتبہ خاصا اُونچا ہے۔ ہزاروں لکھنے والے ان کے قلم کی سحر آفرینیوں سے متاثر ہوئے ہوں گے۔ اندازہ ملاحظہ ہو۔ صرف ایک پیرا جو انھوں نے اپنی آپ بیتی حسرت تعمیر میں لکھا ہے۔

” ماضی تو ہمارے لیے ایک ایسا تودۂ برف ہے، جس کا صرف ایک حصّہ سمندر کی سطح کے اُوپر دکھائی دیتا ہے اور باقی اس کا سارا وجود نیچے گہری اور منجمد تاریکیوں میں ڈوبا رہتا ہے۔ اور پھر یہ بھی دیکھیے کہ یہ تودۂ برف ہے جو ہر آن غیر محسوس طور پر اپنا آپ پانیوں میں گم کرتا رہتا ہے۔ وقت کے سمندر میں ماضی کا بڑے سے بڑا پہاڑ بھی چپ چاپ نیچے ہی نیچے ڈوبتا رہتا ہے “

یہاں ایک سوال یہ ذہن میں اُبھرتا ہے کہ آخر انھوں نے اپنی آپ کا نام حسرت تعمیر ہی کیوں تجویز کیا۔ وہی بات کہ ہر بات میں قنوطیت! قنوطیت بُری چیز ہوگی مگر یہ وصف ہر شریف آدمی کا مقدّر کیوں؟

ادب میں دو تین مرزا پہلے بھی گزرے ہیں۔ ایک مرزا غالب دوسرے مرزا یگانہ، اور بھی مرزا ہوئے ہوں گے۔ مگر ہمارا کام دو تین مرزاؤں کے حوالے سے بھی چل جائے گا۔ مرزا غالب جو تھے وہ ہر چیز کا روشن پہلو ہی سامنے رکھتے تھے۔ قنوطیت نام کی چیز نہ تو ان کے کلام میں ملتی ہے اور نہ اُن کے افعال میں وہ تو ایک دبدبے کے آدمی تھے۔ جو کبھی لڑتے تھے اور ہی نہ کرتے تھے۔ مرزا یگانہ جو تھے وہ چنگیزی تھے۔ وہ بھی اپنے جلال اور تند خوئی کی بنا پر خاصے بدنام تھے۔ بلکہ نیک نام تھے۔ ہر وقت انگارے ان کی زبان پر تھے۔ بھڑا دو ساری دُنیا سے وہ تیار۔ مگر یہ اپنے مرزا صاحب کیسے مرزا ہیں؟ پہلے مرزاؤں کی بھی اپنی نرم روی، اپنی صلح جوئی کی بنا پر ناک کٹوا کے رکھ دی۔!

سُنا ہے مرزا صاحب اپنی بیگم سے ڈرتے ہیں، جب یہ بات پھیلی اور مرزا صاحب کی بیگم نے ذرا تیوروں کے ساتھ، مرزا صاحب سے باز پُرس کر ڈالی کہ یہ کیا تم میرے خلاف پراپیگنڈہ کرتے رہے ہو؟“ تو مرزا صاحب کا فدویانہ جواب یہ تھا:” عجو کی ماں! میں کوئی آپ سے ڈرتا ہوں، جو لوگوں سے کہوں گا کہ ڈرتا ہوں۔“

مرزا صاحب اپنی بیگم سے ڈرتے ہیں یا نہیں، اللہ جانے یا مرزا جانے۔ مگر انھیں بیگم سے محبت ہے بے پناہ! جب وہ ایک بار بیمار ہوئیں۔ شدید بیمار تو بیگم سے زیادہ یہ خود بیمار نظر آنے لگے۔ چوبیس گھنٹوں کی بجائے پچیس گھنٹے تیمارداری کی۔ چوبیس گھنٹے سب کے سامنے۔ ایک گھنٹہ عالم خیال میں دُعائیں مانگ مانگ کر بیگم کو عالمِ بالا سے واپس لے ہی آئے۔ قدرت کو ان کی تپسیا پر پیار آ گیا۔

ایڈیٹروں کے رُومان بڑے مشہور ہیں۔ کچھ سچے کچھ جھوٹے۔ بہرحال یہ برادری اس میدان میں نیک نام ضرور ہے۔ اپنے مرزا صاحب کو بھی ”ادب لطیف“ کی ایڈیٹری کے پہلے ہی دن عشق قسم کی چیز لاحق ہو گئی تھی۔ واقعہ انھی کی زبانی سُنیے:

جب تک آدمی جاگتا رہتا ہے دن بھر کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے ہیں اور میرے ذہن میں بھی یہی مناظر آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ اسی اثنا میں دفتر کا خیال آگیا اور اس خیال کے آتے ہی وہ دلیا روالا چہرہ آنکھوں تلے پھر گیا۔ چند لمحے ہی تو اُسے دیکھا۔ چند لمحوں میں کوئی کسی کو کیا دے سکتا تھا۔ مگر یہ چہرہ میرے سامنے آیا تو میں اُسے بڑے غور سے دیکھنے لگا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لڑکی گونگی تھی۔ جو ان کے کئی افسانوں کا کردار بنی۔ قصّہ یہ ہے کہ ان کے عشق کے ساتھ کوئی نہ کوئی ٹریجڈی

ضرور ہوتی رہتی ہے۔ یہ میرا گمان ہے، یہ میرا مشاہدہ نہیں۔

میں نے 'نقوش' کا کوئی خاص نمبر چھاپا۔ بڑے فخر سے میرزا صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ رسالے کی ورق گردانی کرتے رہ جب میں نے محسوس کیا کہ اب انھیں مندرجات وغیرہ سے رسالے کے معیار کا اندازہ ہو گیا ہوگا تو میں نے دریافت کیا کیسا رہا پرچہ؟

جواب یہ تھا "ٹائٹل اچھا ہے۔"

میں اس تبصرے پر تلملا کے رہ گیا۔ کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ جونیئر اور سینیئر کا معاملہ تھا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ کچ کے بعد یہ ادبِ لطیف کا سالنامہ لے کے آ گئے۔ معاً میرے ذہن میں اُن کا وہ فقرہ آن دھمکا۔ دل نے کہا کاش میرزا صاحب بھی م پوچھ لیں کہ پرچہ کیسا ہے؟ چنانچہ انھوں نے پوچھ ہی لیا "پرچہ کیسا ہے؟" میں نے اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کر ڈالا۔ "اس کا تو ٹائٹل بھی اچھ

ایسی چہلیں اپنی جگہ، مگر جب میں اسکول میں پڑھتا تھا، ان دنوں دو رسالوں کی بڑی دھوم تھی۔ ایک رسالہ "نیرنگِ خیال" دوسرا "ا یوں تو رسائل اور بھی بہت سے تھے۔ ہمایوں، شاہکار، ادبی دنیا، عالمگیر یہ سب رسائل اپنی جگہ قدر و قیمت رکھتے تھے۔ میں تو اپنی کر رہا ہوں کہ مجھے ان سب رسائل میں نیرنگِ خیال اور عالمگیر اور ادبِ لطیف سے دلچسپی تھی، یا ادھر نیاز فتحپوری کے "نگار" سے۔

نگار کیوں پسند تھا؟ وہ اس لیے کہ نیاز تنہا ایسا شخص تھا جو مُلّا سے لڑ سکتا تھا۔ پھر اس کے قلم میں جادو تھا۔ نیرنگِ خیا اس لیے پسند تھا کہ اس کی پالیسی میں وہ اعتدال تھا جو سب کے لیے قابلِ قبول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کے بڑے بڑے ا کی شاہکار تحریریں اس میں چھپیں۔

'ادبِ لطیف' کا گرویدہ اس لیے تھا کہ وہ نقیب تھا مستقبل کا، جنم داتا تھا اس تحریک کا۔ ادبِ لطیف نے ذہنو بخشا تھا۔ ادبِ لطیف نے حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔ ادبِ لطیف نے ادب کو گل و بلبل کے پیکر سے نکال کر دار کی ضرورت کا احساس دلا دیا تھا۔

پہلے پہل وہ راستہ میرزا ادیب نے ہی دکھایا تھا خود راہیں کاٹی تھیں۔ خود لہولہان ہوا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد م والے اس راستے پر دندناتے چلے مگر ابتدا میں ادب کی یہ کھیتی میرزا ادیب ہی نے اپنی خون سے سینچی تھی۔

یہ ضروری نہیں کہ جو پودا لگاتے وہ اس کا پھل بھی کھاتے۔ بے شک کچھ کاریگر لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پودا ہی اس ن لگاتے ہیں کہ پھل بھی خود کھائیں گے۔ ان میں ایسی ہوشمندی ہے ہی نہیں۔ یہ تو دوسروں کی ہوشمندیوں کا نشانہ بنتے آئے ہیں اس لیے کھاتا ہے کہ دوسرے اپنی فتح مندیوں کے جھنڈے گاڑ سکیں۔ یہ شخص پیچھے اس لیے ہٹتا ہے تاکہ دوسرے آگے بڑھ یہ مرنجان مرنج قسم کا شخص جو آپ کے سامنے بیٹھا ہے اردو ادب کا دیوتا ہے اور مجھ ایسے کئی اس کے پجاری۔!

میرزا صاحب مُوڈ کے آدمی ہیں۔ مگر موڈ ہمیشہ مائل بہ شائستگی ہی ہوتا ہے۔ وہ مواقع کم آتے ہیں کہ جیسے "مُردہ بولے۔ پھاڑے" کہتے ہیں۔ مگر بات یہ بھی نہیں کہ صرف درگزر کے پیغمبر ہوں۔ رُوبرو کھری بات کہتے ہیں اور دھڑلے سے کہتے ہیں۔ نتیجے تلخیاں ہی جھولی میں کیوں نہ پڑ جائیں۔

ایک شاعر نے ایسے ہی موقع پر ایک شعر کے بارے میں کہہ دیا کہ ان کی ترقی کا راز عورتیں ہیں کہ جنھیں زینہ بنا کر بامِ شہر

اس وقت میرزا صاحب کا مفہوم نہ جانے کیا تھا۔ کوئی بھلا ہی ہوگا اس لیے کہ میرزا صاحب شر پسند انسان نہیں۔ غالباً ان کا مفہوم یہ ہوگا کہ مشہور گانے والیوں نے ان کی غزلیں گائیں اور وہ بامِ شہرت تک پہنچے۔ یہ فقرہ اُن کی زبان سے ادا ہونا تھا کہ زندگی بھر کے لیے ٹھن گئی وہ خفا یہ حیران!

مندرجہ بالا حوالہ تو ایک دوسری ہستی سے متعلق ہے۔ ایک واقعہ اس فدوی سے متعلق بھی ہے کہیے تو وہ بھی سُنا دوں؟ دوسروں ہی کی بات کیوں؟ اپنی کیوں نہیں؟

قصہ یہ ہے کہ میرزا صاحب کے ذہن میں کوئی بات بیٹھ جائے تو پھر آپ کی نہیں سُنیں گے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ان کے ذہن میں یہ بٹھا دے کہ خدا نہیں ہے تو پھر اُنھیں خدا بھی قائل نہ کرسکے گا۔ سچے اور سچے ہیں، بس خدا نہیں ہے تو نہیں ہے۔

ایک میٹنگ میں مختلف مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی اور وہ گفتگو ریکارڈ ہو رہی تھی۔ اُس دن ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میرزا صاحب زندگی بھر کی باتیں مجھ سے آج ہی کہیں گے۔ میں چُپ: میں حیران!

پھر وہ معاملہ ایجنڈے میں بھی نہ تھا۔ بھلا ایک خاتون کا معاملہ ایجنڈے میں کیسے آسکتا تھا۔ ہُوا یہ کہ ایک خاتون لاہور قسم کی شئے نے ان کے کان بھر دیئے چنانچہ یہ مناظرے کے لیے تیار! میرزا صاحب کی ایک ادا یہ بھی ہے کہ یہ صنفِ لطیف کو جھوٹا سمجھ ہی نہیں سکتے۔

اپنا ایمان دارانہ خیال یہ ہے کہ اس صنف کی تو ساری شان ہی لگائی بجھائی میں ہے۔ اس وصف کو نظرانداز کر دیجیے گا، یا چھوں کا مارجن نہ دیجیے گا تو پھر عورت، عورت نہ رہے گی مرد بن جائے گی۔

میں کہتا تھا: ”میرزا صاحب معاملہ یُوں ہے“

میرزا صاحب کہتے تھے: ”بھلا خاتون جھوٹ بول سکتی ہے“

بہرحال! میں نے یہ کہا تھا۔ خاتون یہ کہتی تھی۔ اس بحثا بحثی میں کافی وقت گزر گیا۔ میں نے تنگ آکر، بہ طور قصّہ کوتاہ یہ کہا ”میرزا صاحب نہ اس عورت سے میرا نکاح ہوسکتا ہے اور نہ آپ کا، پھر یہ تکرار کیسی؟“ اس پر میرزا صاحب لجا کر مُسکرا دیئے اور بہت سا مُسکرا کر خاموش ہوگئے۔

میرزا صاحب عموماً چائے پینے سے اِنکار کر دیتے ہیں۔ اگر اصرار کیا جاتے تو ایسی لجاجت سے منتیں کرتے ہیں۔ جیسے ان سے چائے کے لیے نہیں بلکہ شراب کے لیے کہا جا رہا ہو۔

ایک دن تشریف لائے۔ مَیں نے کسی سے چائے لانے کے لیے کہا۔ اُنھوں نے پھر منّت آمیز انداز میں اِنکار کر دیا۔ میں نے کہا ”آج تو چائے پلا کے چھوڑوں گا“

میرزا صاحب نے وضاحت کی: ”میں صبح سے تین کپ پی چکا ہوں“

میرا جواب یہ تھا: ”آپ کو چوتھا کپ بھی پینا پڑے گا“

اگر تیور خطرناک ہوں تو پھر میرزا صاحب میدان میں نہیں ٹکتے۔ مطلب یہ کہ چوتھا کپ پینا پڑتا ہے۔

میرزا صاحب فطرتاً قنوطی ہیں، اعلیٰ پائے کے قنوطی، ملال اور خوف ہر وقت مسلط۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا ہو جائے کے چکر میں، مگر کبھی کبھی اپنے اوپر خوش دلی کا نقاب اوڑھ لیتے ہیں۔ پھر اتنے قہقہے لگاتے ہیں کہ مجلس میں سب سے اونچے قہقہے اس صحرانورد کے ہوتے ہیں۔

موڈ میں ہوں تو یہ بھی کہتے ہیں۔ "اٹھو بھئی! آج تمھیں عیش کرادوں۔"

"عیش؟"

"ہاں عیش!"

چنانچہ کسی ہوٹل میں لے جائیں گے۔ بیرے سے کہیں گے "سموسے لاؤ۔"

بیرا پوچھے گا "کتنے؟"

میرزا صاحب کا جواب یہ ہوگا کہ "ایک تو میں کھاؤں گا (پھر مخاطب سے) آپ کتنے؟"

ایسے ہی ایک موقع پر ایک چلبلی دوست نے کہہ دیا "بیس"!

"اکٹھے بیس!؟ یہ صحیح ہے کہ مجھے ریڈیو اسٹیشن سے ۲۵ روپے کا چیک ملا ہے اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم اکٹھے بیس سموسے کھا جاؤ۔"

میرزا صاحب کے لیے وعدہ ایفائی زندگی کا ایک چلن ہے جس کی تکمیل ضروری چاہتے ہیں کہ جو وعدہ کیا جائے اسے پورا کیا جائے خواہ اس کے لیے زحمت ہی کیوں نہ اٹھانی پڑے۔ وہ اس راہ میں ہر قدم پر ثابت قدم!

مجھ سے انھوں نے ایک بار وعدہ کیا کہ ایک ہفتہ تک مضمون پہنچا دوں گا۔ جب وہ دن آیا تو اس دن لاہور میں کرفیو اور مارشل لاء دونوں ہی تشریف فرما تھے۔ بقول غالب جرنیلی بندوبست تھا۔ خوف و ہراس کی اس فضا میں چند گھنٹوں کے لیے کرفیو میں نرمی برتی جاتی تھی تاکہ جس کا کوئی مر گیا ہے وہ اسے دفنا دے یا جسے زندہ رہنے کے لیے کوئی ضروری چیز خریدنا ہو تو وہ خرید سکے۔ دیکھا کہ میرزا صاحب موجود، بڑی خوشی سے بغلگیر ہوئے۔ کہا وعدہ کر رکھا تھا۔ کرفیو کی پابندی نرم ہوئی تو مضمون لے کر حاضر ہو گیا ہوں۔

میں نے کہا "بھائی! مضمون پھر آ جاتا۔"

کہا "وعدہ کر رکھا تھا۔"

اس دور میں ایسے لوگ کمیاب ہیں۔ جو اپنی ذات میں اتنے گڈو ہوں۔ گڈو کا لفظ میں نے گڈ کے خاندان کا ایک رشتہ دار جا کر لکھا تھا۔ ویسے یہ پیار میں گڈو اپنے نواسے کو کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں عمر کے اتنے فرق کے باوجود دونوں میں لمبا چوڑا فرق نہ دونوں کی خواہشیں چھوٹی چھوٹی، دونوں کی آرزوئیں معصوم معصوم!

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرزا صاحب کرفیو اور مارشل لاء میں بھی مضمون لے کر آ گئے۔ ظاہر ہے کہ اس موضوع پر گفتگو: ہونا تھی، سو ہوئی!

ہم لوگ جو ادیب ہوتے ہیں عجیب ہوتے ہیں "ہم میں سوائے ہم" کے باقی خیر ہی خیر ہے ہم آتے ہیں تو فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔ سر سید احمد خان اتنے بڑے آدمی تھے کہ شاید و باید۔ پاک و ہند کی تاریخ میں مسلمانوں کے حصے دو چار ہی تو چاند آئے۔ ان میں ایک سر سید احمد خان!

قوم نے ان پر لاکھوں روپے نچھاور کیے۔ پائی پائی انھوں نے بھی قوم کی بہبود پر صرف کر دی۔ جب انتقال ہوا تو کفن کے لیے کوڑی تک نہ تھی۔ نواب محسن الملک نے سر سید احمد خان کو "آخری چندہ" کہہ کر پچاس روپے دیئے تاکہ کفن دفن کا انتظام ہو سکے۔

ہاں تو صاحب، ملک کی موجودہ فضا پر بات ہوئی۔ بیچ میں قصہ اور نکل آیا (ایک دردمند ادیب کا) اس لیے کہ ادیب ماحول سے بے نیاز ہو کر نہ ادبی طور پر زندہ رہ سکتا ہے اور نہ جسمانی طور پر وہ بُرے حالات میں گھُٹتا ہے اور گھُٹتا ہی رہتا ہے۔

"یار مسجد میں گھُس کر مسلمانوں کو مارا گیا۔ متعدد لوگ مر گئے۔"

"بھائی! وہ واقعہ بھی سُنا کہ میکلوڈ روڈ پر ایک دفتر کو آگ لگا دی گئی۔ کئی لوگ بھسم ہو گئے۔"

ہم بغیر رو رعایت اور بغیر کسی پارٹی کی طرف داری کے "انسان پارٹی" کے طرفدار تھے۔

جو کوئی مر رہا تھا وہ کسی کا باپ تھا، بیٹا تھا، بھائی تھا ـــ اور ان سب سے ہمارا رشتہ تھا۔

یہ سب ہنگامہ کیوں؟ مارشل لا کیوں؟ ہُوا یہ کہ ملک میں انتخابات ہوئے، ایک پارٹی نے کہا "ہم نے الیکشن جیت لیا" دوسری نے کہا "دھاندلی ہوئی"۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ گولیاں کھانے لگے۔"

ایک طرف حکومت ہے دوسری طرف حزبِ اختلاف کُرسی پر نظر دونوں کی ہے۔ مگر انسان کے خون پر نظر کسی کی بھی نہیں۔ مسلمان کا خون ہمیشہ سے سستا رہا ہے اس دور میں بے حد سستا ہے۔ سُنا ہے خون کا سب سے بڑا بیوپاری امریکہ ہے۔

خون سے یاد آیا اور ایک قصاب نے بتایا کہ وہ قصائی جو منڈی میں روز بکرے ذبح کرتا ہے وہ چار پانچ برس کے بعد اندھا ہو جاتا ہے، پھر دوسرا قصائی آتا ہے وہ بھی چار پانچ برس کے بعد اندھا ہو جاتا ہے۔

مَیں نے پوچھا "بھئی کیوں؟"

"خون دیکھ دیکھ کر!"

پھر اُس نے یہ بھی بتایا کہ ہر قصائی کی آخری عمر بڑی کسمپرسی میں گزرتی ہے۔ چارپائی پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گزرتی ہے، مگر اُس کی جان نہیں نکلتی!

میں نے مزید معلومات کی خاطر پوچھا۔ بھائی! سارے قصائیوں کا تو یہ حال نہ ہوتا ہوگا؟"

اس نے بتایا کہ عموماً سارے قصائیوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ وہ مرنا چاہتے ہیں مگر مر نہیں سکتے۔ وہ قصائی اس حال سے نہیں گزرتا وُہ لوگوں کی نفرتوں کا نشانہ بنتا ہے۔ اور خاندان کا ایک ایک فرد اُس سے نفرت کرتا ہے۔ انجام بہر حال بخیر نہیں ہوتا۔

اُفوہ! میں تو مضمون لکھ رہا تھا میرزا ادیب پر جو اتنا رقیق القلب ہے کہ ایک چیونٹی کے گلے پر بھی چھُری نہیں پھیر سکتا، مگر ذکر آن نکلا خون کا، قصائی کا، آپس میں کیا مناسبت؟ کیا تُک، دیکھا جائے تو دنیا میں کسی بات کی تُک ہے، جو یہاں تُک کی پریشانی میں

مبتلا ہو جاتے۔ اس دور میں ہر شخص کے ہاتھ میں چھری ہے۔ چاہے وہ کوئی ہو، دکاندار ہو، دفتر کا بابو ہو، کارخانہ دار ہو، مزدور ہو، ہو، کرسی نشین ہو۔!

یہ قوم جس کا ماضی بڑا شاندار تھا آج کل ایک بہت بڑی کٹھالی میں پڑی ہے۔ کندن بننے سے پہلے بھسم ہونا پڑتا ہے۔ کیا ہم بھسم ہونے کے عمل سے گزر رہے ہیں؟

جس طرح بُرے لوگوں سے اچھائیوں کی اُمید نہیں ہوتی، اُسی طرح اچھے دوستوں سے بُرائیوں کی توقع نہیں ہوتی۔ میرزا ادیب ایسے دوست ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے بُرائی کی توقع رکھنا ایسے ہی ہے، جیسے پانی کو آگ لگ

صرف اسمبلیوں کے الیکشن نہیں ہوتے۔ رائٹرز گلڈ کے بھی الیکشن ہوتے ہیں بالکل انھی بنیادوں پر جن بنیادوں پر اسمبلیوں کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے بھی الیکشن لڑا تھا۔ میں نے "مرکزی اسمبلی" کا، میرزا صاحب نے "صوبائی اسمبلی" کا۔!

حریف عجیب نکلے، یعنی ہر حرکت روا، ہر حرکت ایمان، چونکہ وقت گزر چکا ہے اس لیے میں گڑے مُردوں کو نہ کہوں گا کہ تم بیان دو۔ چونکہ الیکشن کے ایک واقعہ سے میرزا صاحب کے کردار کا واسطہ ہے اس لیے بیچ بچا کے عرض کروں گا۔

ہمارے الیکشن کے دنوں میں مخالف فریق نے ایک سُبک حرکت یہ کی کہ میرزا صاحب کی طرف سے اخباروں میں ایک بیان نکلوا دیا کہ میں یعنی میرزا ادیب رائٹرز گلڈ کی مجلس عاملہ سے مستعفی ہوتا ہوں اس لیے کہ دھاندلیاں ہو رہی ہیں۔

یہ خبر اخباروں میں چھپی۔ چونکہ میں سیکرٹری جنرل کا اُمیدوار تھا اور میرزا ادیب ایسے مخلص ارکان نے مجھے اس امر پر آمادہ انتخاب لڑوں اس لیے یہ خبر بڑی حیرت سے پڑھی گئی۔ جس نے پڑھا اُس نے مجھ سے ہمدردی کی اور میرزا صاحب سے شکایت۔ سب سے کہتا رہا "یہ خبر مخالف فریق کی طرف سے چھپوائی گئی ہوگی، چونکہ میرزا صاحب کی ذات پر اعتماد تھا، اس لیے مطمئن تھا اور میرے ساتھی سارے پریشان! چنانچہ طے پایا کہ اُٹھو اور میرزا صاحب سے چل پوچھیں۔

جب ہم میرزا صاحب کے ہاں پہنچے تو وہ بے شک پریشان تھے، اُنھوں نے کہا کہ "مجھے اس بات سے بھی دُکھ ہوا سے ایک غلط خبر چھاپی گئی اور اس وقت مجھے اس بات کا بھی دُکھ ہوا کہ دوستوں کو میرے خلوص پر شبہ ہوا۔"

میرزا صاحب بہت پیدل چلتے ہیں۔ یہ عادت اُن کی صحت کا باعث بھی ہے اور روپے پیسے کی بچت کا بھی۔ یہ ایک پیدل نہیں چلتے، بلکہ میلوں میل اور ریل سو چل!

عموماً یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس مارچ میں ان کا کوئی ساتھی بھی ہو۔ جو لوگ جانتے ہیں کہ میرزا صاحب چلا کے ملکان وہ "سیر" کے نام پر بھی کنی کاٹ جاتے ہیں۔

ایک دن ایک نیا شخص پھنسا، اتفاق سے وہ میرا دوست بھی تھا اس کی حالت کافی غیر تھی، میں نے پوچھا "خیریت؟" کہنے لگے۔ "میرزا صاحب نے سیر کرا دی۔" میں معاملہ بھانپ گیا۔ پھر بھی خوشدلی کے لیے پوچھا "آخر؟" کہنے لگے "میرزا بھاٹی گیٹ کے چوک میں مل گئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی زور کا نعرہ لگایا" اخاہ! خوب ملے۔ مجھے آپ سے ایک ضروری کام تھا۔

"میرزا صاحب!" کیا کام؟"

کہنے لگے: "میرے ساتھ چلیے بتاتا ہوں"۔ میں ان کے ساتھ ہولیا۔ جب میو ہسپتال کے پاس پہنچ گیا تو میں نے عرض کیا: "خیر خیریت آپ نے پوچھ لی۔ مالی حالت کے بارے میں آپ نے استفسار کرلیا، لکھنے لکھانے کے متعلق آپ نے دریافت فرمالیا — اب تو بتا دیجیے، آپ کو مجھ سے کیا کام تھا؟"

"ابھی بتاتا ہوں، ابھی بتاتا ہوں" کہتے ہوئے پھر ساتھ لے لیا۔ جب میں میکلوڈ روڈ کے پاس جا کر رُک گیا تو میں نے کہا "پہلے کام بتا دیجیے پھر آگے چلوں گا"۔ تو میرزا صاحب نے مجھے "گھسیٹتے" ہوئے کہا "بس ابھی بتاتا ہوں"۔ ساتھ ہی نکتہ یہ بھی سمجھایا کہ آپ کا یوں رُکنا اور میرا اس طرح گھسیٹنا بہت سی غلط فہمیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ چنانچہ میں میرزا صاحب کی باتوں میں پھر آگیا اور چلتا چلا گیا۔ چلتے چلتے جب ریڈیو سٹیشن قریب آگیا تو میرزا صاحب نے مجھ سے ہاتھ ملا دیا۔

میں نے ہکّا بکّا ہو کر پوچھا "یہ کیا مطلب؟"

میرزا صاحب کا جواب یہ تھا "بس مجھے یہیں تک پہنچنا تھا۔"

میرزا ادیب صحیح معنوں میں ادیب ہیں۔ اس ملک میں کوئی شاعر ہے اور کوئی افسانہ نویس اور مضمون نگار۔ مگر ادیب برائے نام ہیں، میں ادیب اُسے سمجھتا ہوں جو نگارش کی جملہ اصناف پر حاوی ہو۔ جیسے غلام رسول مہر یا نیاز فتح پوری۔ میں یہاں مرتبوں کی بات نہیں کر رہا، جہتوں کی بات کر رہا ہوں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرزا ادیب مکمل ادیب نہیں۔ اس لیے کہ شاعر نہیں ہیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ میرزا ادیب شعر کہہ سکتے ہیں، مگر نہیں کہتے بالکل اسی طرح جس طرح بعض شاعر شعر نہیں کہہ سکتے مگر کہتے ہیں۔

میرزا ادیب کیا ہیں اور ان کا ادبی مقام کیا ہے؟ اس کا اندازہ ابھی تک نہیں لگایا جا سکا۔ ابھی تو اندازہ انہی ادیبوں کا لگایا جا سکا ہے جو سرکار دربار میں رسائی رکھتے ہیں۔ یہ دور ان کا ہے یہ دور میرزا ادیب کا نہیں۔ کیونکہ سچے ادیب کا المیہ یہ ہے کہ ان کی زندگی کا تعین، ان کی موت کے بعد ہوتا ہے۔

میرزا صاحب کو زمانے بھر سے شکایتیں ہیں۔ شکایتوں کا پشتارہ ہلکا نہیں ہو رہا، بلکہ بھاری ہی ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی کچھ کہے، میں تو اُن کو شکایتوں میں حق بجانب ہی پاتا ہوں اس لیے کہ زمانے نے اُن کو یاد کیا ہے۔ یہ اس دور میں فٹ نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ زمانہ کسی کو بھی اس کا حق نہیں دیتا۔ یہ دَور تو اپنا حق بہ زور منوانے کا ہے۔ یہ دَور مانگنے کا نہیں، چھین لینے کا ہے۔ یہ دور انکساری کا نہیں، طنطنے کا ہے۔ جو یہ کچھ نہیں کر سکتا وہ میرزا ادیب بن جاتا ہے۔

ویسے میرزا صاحب بھی عجیب آدمی ہیں اُنھیں اکثر عجائب گھر میں جاتے دیکھا گیا ہے۔ یاروں نے ٹوہ لگائی آخر یہ عجائب گھر جا کر کیا کرتے ہیں؟ معلوم ہُوا کہ یہ اس ہال میں پہنچ جاتے ہیں جہاں مہاتما بدھ کے مجسّمے پڑے ہیں۔ سماں یہ ہوتا ہے کہ بُت کے سامنے بُت بنے بیٹھے ہیں۔ جب اُن سے دریافت کیا گیا کہ آخر آپ یہاں اتنا زیادہ کیوں آتے ہیں؟ تو ان کا یہ جواب تھا کہ "مجھے یہاں سکون ملتا ہے۔"

آخر ایک دن مہاتما بدھ کا مجسّمہ بول ہی پڑا۔ ہو سکے تو میرے بُت کو اُٹھاؤ اور مجھے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں مجھے بھی سکون مل سکے۔

حباب آسا

ڈاکٹر انور سدید

مجھے جب کبھی میرزا ادیب کے پیکر کو لفظوں میں مصور کرنے کا خیال آتا ہے تو وہ مجھے ہمیشہ ایک معصوم بچے کی صورت میں ہی نظر آتا ہے۔ یہ معصوم صورت بچہ صابن کی جھاگ سے بلبلے بنا کر مسلسل ہوا میں اڑا رہا ہے۔ بلبلہ فضا کی بلندیوں کو چھونے لگتا ہے تو اس پر مسرت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ زور زور سے تالیاں بجاتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق بہت اونچا پرواز کر رہی ہے اور اس کے ہمعصر اس کی رفعتوں پر انگشت بدنداں ہیں لیکن جونہی کوئی بلبلہ ہوا کا اندرونی دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور جھاگ کے پیالے ہی میں معدوم ہو جاتا ہے تو اس پر مایوسی اور پژمردگی کی اتنی ہی شدید کیفیت طاری ہو جاتی ہے پھر وہ روتا ہے بسورتا ہے، اپنی تخلیق کی ناکامی پر جھنجھلاتا ہے اور اپنے معاصرین کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھنے سے بھی گریز نہیں کرتا اور بعض اوقات تو وہ جھاگ سے لبالب پیالے کو بھی توڑ ڈالتا ہے۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ میرزا ادیب کے بارے میں یہ تاثر کیوں کر پیدا ہوا اور اس کے پس پشت کون سے محرکات پوشیدہ تھے تاہم اس تاثر کو اتنا دوام حاصل ہے کہ اب اس کے بغیر میرے ذہن میں میرزا ادیب کی تصویر مکمل نہیں ہوتی اور یہ تصویر اس تصویر سے یکسر مختلف ہے جسے میں نے اپنے لڑکپن میں مرتب کیا تھا اور جس کا اجمالی تذکرہ آگے آئے گا۔

میرزا ادیب کو جب میں نے پہلی دفعہ پڑھا تو میں دسویں جماعت کا امتحان دے کر نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ میری زندگی کا وہ رومانی دور تھا جب خواب زندگی کی دہلیز سے آگے کا منظر دکھاتے ہیں لیکن حقیقت دہلیز سے آگے جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں اس وقت طلسم ہوشربا، داستان امیر حمزہ، قصہ چہار درویش اور گل بکاؤلی وغیرہ کا مکمل کر چکا تھا۔ زندگی کا کوہ ندا مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا اور میں اس سے آنکھیں چرا کر ٹوٹے ہوئے تارے اور "طلسم خیال" کی سحر انگیز رومانیت میں پناہ تلاش کر رہا تھا۔ اس منزل پر میری ملاقات میرزا ادیب کے لازوال کردار صحرانورد سے ہوئی تو گویا پیاس کے صحرا میں مجھے ایک چشمۂ صافی مل گیا۔ قدیم داستانوں کے مافوق الفطرت ماحول سے نکل کر میں ایک ایسے نخلستان میں آ گیا تھا جہاں خواب بنتے اور بکھر جاتے، بلبلے ہوا میں پرواز کرتے اور ٹوٹ جاتے، پتنگیں اڑتیں اور پہنائیوں میں گم ہو جاتیں۔ سچی بات یہ ہے کہ صحرانورد کے خطوط میں آرزوؤں کے بننے اور بگڑنے کی جو جھلمل کیفیت ہے اس نے مجھے ایک عجیب سی ذہنی آسودگی عطا کی تھی چنانچہ میں نے "ادب لطیف" کے وہ سب پرچے ڈھونڈ نکالے جن میں یہ خطوط شائع ہوئے تھے اور پھر انہیں بار بار پڑھا۔ یہ اعتراف حقیقت پر مبنی ہے کہ قدیم داستانوں کے گمنام مصنفین کے بالمقابل میرزا ادیب وہ اولیں زندہ مصنف تھا جس نے میرے نگر خیال پر سب سے پہلے شب خون مارا اور پھر ایک طویل عرصے تک اپنے سحر میں اسیر رکھا۔

اس دور میں میرزا ادیب کی ایک خیالی تصویر میرے ذہن کی سطح پر خود بخود نقش ہونا شروع ہو گئی۔ اب جبکہ میں میرزا ادیب کو مرتبہ مل چکا ہوں اور اس کے خد و خال اپنی اصلی صورت کے ساتھ مجھے یاد ہو گئے ہیں تو میں اس قدیم تصویر کو دوبارہ زندہ نہیں

سکتا۔ لیکن اس اظہار میں مجھے تامل نہیں کہ جب انڈس ہوٹل میں ڈاکٹر وزیر آغا کے کمرے میں میری ملاقات پہلی دفعہ میرزا ادیب سے ہوئی تو میں ایک عجیب قسم کے احساسِ شکست سے دوچار ہوا۔ اس وقت جس میرزا ادیب سے میں مل رہا تھا وہ بلاشبہ صحرانورد کے خطوط کا خالق تھا لیکن میں نے جو تصویر صحرانورد کے خطوط کو پڑھ کر مرتب کی تھی وہ حقیقی اور گوشت پوست کے میرزا ادیب سے بالکل مختلف تھی۔ وہ خیالی نقش جو میں نے اپنے ذہن میں مرتب کر رکھا تھا بے حد خوبصورت تھا لیکن جو میرزا ادیب اب میرے سامنے انکسار، لجاجت اور محبت کا مجسمہ بنا بیٹھا تھا وہ تو خود مجھ سے مرعوب نظر آتا تھا اور اس خیالی تصویر کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ میں جس مایوسی سے دوچار ہوا اسے شاید میرزا ادیب بھی کبھی سمجھ نہ پائے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ آپ نے اس حقیقت کو ضرور پالیا ہوگا کہ صحرانورد کے خطوط کا مصنف کس طرح اپنے قاری کو اسیر کر چکا تھا۔ اور اسی تاثر نے مجھے مختلف اوقات میں اس کی طرف بڑھنے کا موقعہ دیا۔

اب یہاں اس واقعے کا تذکرہ غیر ضروری معلوم نہیں ہوتا جسے پڑھ کر آپ پہلے ہی تھوڑا سا مسکرائیں گے اور پھر میرزا ادیب کی طرف اسی حیرت سے دیکھیں گے۔ جیسے آج کل کچھ ادبا داظہر جاوید کی طرف دیکھتے ہیں، تاہم اس واقعے سے مجھے میرزا ادیب سے اپنی قربت اور موانست کا تذکرہ کرنا ہے اس لئے میں اس کے اظہار کے لئے پیشگی معذرت پیش کرتا ہوں کہ مقصود اس سے ترک محبت ہرگز نہیں ہے ہوا یوں کہ میرے ایک دوست شیخ اعراف اختر کو بھی میری ہی طرح ادب کا چسکا لگا ہوا تھا، لیکن اس کی دلچسپی کی جہت قدرے مختلف تھی شیخ اعراف اختر ادب سے زیادہ ادیبوں سے تعلقات بنانے اور ان سے خط وکتابت کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا چنانچہ وہ ہر دوسرے چوتھے کسی مشہور و معروف ادیب کو عاجزانہ خط لکھتا، مہینوں انتظار کرتا اور جب کسی جانب سے بھی جواب نہ آتا تو مایوس ہو جاتا۔ اعراف اختر کے سوادِ خط میں نسوانی رنگ موجود تھا، اس لئے میں نے اسے مشورہ دیا کہ لڑکی بن کر خط لکھو پھر دیکھو محبت کا جواب کتنی جلدی آتا ہے۔ اعراف اختر کو یہ تجویز اچھی لگی اور اس نے نجم العالیہ راز کا نقاب اوڑھ کر میرے محبوب مصنف میرزا ادیب کو بھی ایک خط لکھ ڈالا، چوتھے روز میرزا ادیب کا جواب آگیا اس خط میں التفات اور شفقت کی ایک خاص نہایت موجود تھی جس سے ہم دونوں متاثر ہوئے اور اس کا لطف اٹھاتے رہے۔ اس حوصلے پر نجم العالیہ راز نے یکے بعد دیگرے کئی خطوط میرزا ادیب کو لکھے اور سلوک کی کئی منزلیں چشم زدن میں طے کر ڈالیں۔ آج شیخ اعراف اختر زندگی کی دوڑ میں خدا جانے کہاں سرپٹ دوڑ رہا ہوگا، لیکن نجم العالیہ راز کے خطوط اب بھی محفوظ ہیں اور ان ادیبوں کی یاد تازہ کرتے ہیں جنہوں نے مریم زمانی بیگم اور طاہرہ دیوی شہزادی جیسی خواتین سے اظہار بے تکلفی کر کے ان خیالی خواتین کو بھی ادب میں حیاتِ دوام دے دی تھی میں بلاتامل عرض کرتا ہوں کہ میرزا ادیب سے پہلی ملاقات ہوئی تو نجم العالیہ راز کا خیالی پیکر بھی میرے سامنے موجود تھا مجھے میرزا ادیب اس پیکر کے سامنے بالکل اجنبی اور بے جوڑ نظر آیا، تاہم میں نے سوچا کہ میرزا ادیب اگر اس اجنبی خاتون کو خطوط نہ لکھتا تو معصومیت کا یہ پیکر میرے سامنے کیونکر مجسم صورت اختیار کرتا جو حسن کی ایک ازلی اور ابدی جھلک دیکھنے اور صرف ایک روشن کرن پکڑنے کے لئے نگری نگری صحرا صحرا بھٹک رہا تھا۔ حسن کا جویا تو میرزا ادیب کے داخل میں موجود تھا اور یقیناً خوبصورت ہوگا۔

میرزا ادیب کو رومانی تحریک کی آخری آواز قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے رومانی تخیل آفرینی کو داستان کے فنی قرینے سے پیش کرنے کی کوشش کی، اردو ادب میں داستان کو مافوق الفطرت عناصر کا مرقع کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں جب خواص کے لئے تفریح کا اور کوئی سامان نہیں تھا تو داستان گوئی سے ذہنی عیاشی کا کام لیا جاتا تھا۔ میرزا ادیب کی داستانوں میں بھی سحر انگیزی اور تحیر کو تو پورا عمل دخل

حاصل ہے تاہم اس نے چونکہ داستان کہنے کا فریضہ بیسویں صدی میں سرانجام دیا ہے اس لئے وہ اس دور کے حقیقی تقاضوں کو نظر انداز نہیں کر سکا میرزا ادیب کی داستانیں زندگی کی موجودہ حقیقتوں کے اثبات کا اظہار ہیں اور خیر و شر کی ازلی و ابدی آویزش، پابند اور مجبور انسانوں کی جدوجہد اور آزادی کے لئے قربانی وغیرہ اس کے اساسی موضوعات ہیں، بلاشبہ میرزا ادیب نے فن کے جمالیاتی اظہار کے لئے روح کی بے کراں وسعتوں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی، تاہم اس نے صحرانورد کا کردار جو اس کی سپرایگو کا مظہر ہے اس عمدگی سے تخلیق کیا کہ اب اس کردار کی روح زمان و مکان کی وسعتوں پر حاوی نظر آتی ہے۔ اس سب کے ساتھ میرزا ادیب کے تخیل نے غربت اور امارت، ملوکیت اور غلامی کی ثنویت کو اہمیت دی اور اس کے تضادات کو ابھارنے کے لئے ایک ایسی دنیا تخلیق کی جو بے حد پراسرار ہے اور جس میں بپا ہونے والے واقعات و حادثات قاری کو روحانی مسرت سے ہمکنار کر دیتے ہیں، بیسویں صدی کے عشرۂ چہارم میں، میں اسے میرزا ادیب کی بہت بڑی کامیابی تصور کرتا ہوں۔

پروفیسر عرش صدیقی نے لکھا ہے کہ میرزا ادیب نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی اور جب زندگی کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے قابل ہوا تو اس نے اپنے چاروں جانب دکھوں اور مصیبتوں کا ایک سمندر پایا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ میرزا ادیب کی رومانیت درحقیقت اس کی غربت اور ازلی محرومی ہی کا رد عمل ہے اس کے ہاں حسین خوابوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے، آرزوؤں کو پالنے، مہم آزمائی کرنے اور تخیل کی دنیا میں کھوئے رہنے کا رجحان غالب ہے۔ اس کی دو کتابیں "صحرانورد کے خطوط" اور "صحرانورد کے رومان" میرزا کے اسی اساسی رد عمل کا مظہر ہیں "صحرا نورد جو بقول وزیر آغا حرکت و عمل کی علامت ہے" شاید میرزا ادیب کی اپنی شخصیت کا خیالی عکس ہے۔ عرش صدیقی نے اسے میرزا ادیب کے تخیل کی خارجی اور مادی صورت قرار دیا ہے۔ فطرت کے اصول تلافی کے تحت یہ کردار میرزا ادیب کی بہت سی محرومیوں کا ازالہ کرتا ہے اور اسے ان محاربات تخیل میں کامرانی حاصل کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو اس کی نجی زندگی میں کبھی نہیں آئے اور کبھی آئے ہیں تو میرزا ادیب نے ان کا مقابلہ ڈٹ کر کھلے میدان میں کبھی نہیں کیا۔ اس ضمن میں یہ واقعہ حیرت انگیز نہیں ہوگا کہ ایک دفعہ میرزا ادیب نے ایک ادبی مجلس میں قتیل شفائی ک قدرے سچا خاکہ پڑھا، اب حقیقت تو یہ ہے کہ میرزا ادیب ہزار کوشش سے بھی تلخ مضمون لکھیں تو اس میں ملاوٹ اور شیرینی کی آمیزش ضرور موجو ہوتی ہے لیکن قتیل شفائی کو اس کا یہ صادق انداز بھی پسند نہ آیا اور کچھ اس انداز میں للکارا کہ میرزا ادیب نے فوری معذرت میں ہی عافیت سمجھی چنانچہ میرزا ادیب کا یہ سچا خاکہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ خدا جانے نقصان دوزخی کا ہوا ہے یا عصمت چغتائی کا میرزا ادیب رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری کی حیثیت میں سالانہ انتخابات کا اہتمام کر رہے تھے۔ تو میں نے مبینہ دھاندلیوں کے پیش نظر بعض انتظامات پر اعتراض کیا۔ میرزا ادیب کو میر خط ملا تو وہ پریشان ہوگئے اور مجھے جواباً لکھا کہ میں اس خط کو پڑھ کر ساری رات سو نہیں سکا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے فی الفور لاہور آنے او بالمشافہ گفتگو کا مشورہ دیا سجاد نقوی صاحب نے ایک دفعہ ترقی پسند تحریک سے میرزا ادیب کی علیحدگی کا تذکرہ "اوراق" میں لکھا تو میرزا ا نے ترقی پسندوں کے سیاسی کردار کی وضاحت کی اور یہ بھی لکھا کہ ترقی پسند ادبا پاکستان کے جھنڈے کو سلام کرنے سے گریزاں تھے اسی وجہ سے میرزا نے اس تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی میرزا ادیب کا یہ بیان اتنا اہم تھا کہ اسے اوراق میں چھاپنا ضروری سمجھا گیا۔ لیکن خط چونکہ نجی تھا ا سجاد نقوی نے اس کی اجازت طلب کی تو میرزا ادیب گھبرا گیا اور لکھا کہ اس سے خوف فساد خلق پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ میرزا ادیب کا یہ خط "اوراق" کے دفتر میں ابھی تک محفوظ ہے اور اسے زمانے کی ہوا نہیں لگ سکی ان واقعات سے میرے اس بیان کی توثیق پوری طرح ہو ہے کہ میرزا ادیب خواب تو خوش اسلوبی سے بنتے ہیں لیکن حقیقت کا سامنا نہیں کر پاتے یہ انسانی کمزوری ہے لیکن میں اسے میرزا ادیب

شرافت سے منسوب کرتا ہوں۔

میرزا ادیب کی رومانیت میں فاصلے کو زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ تصور کو قریب سے دیکھنے کے بجائے اسے دور سے دیکھتا ہے اور پھر موجود اور ناموجود کے درمیان وقت کی دیوار کھڑی کر دیتا ہے وہ موجود کی غربت اور زہرناکی کو اجاگر کرنے کے لئے ماضی کے شاندار محلات استوار کرتا ہے اور ان کے گرد دردشینوں اور سایوں کا جال سا بن جاتا ہے۔ اس ماحول میں میرزا ادیب نے جن کرداروں سے زندگی کی لہر پیدا کی ہے، ان کے نام بھی رومانی ہیں اور یہ حجاب امتیاز علی کے کرداروں کی طرح نامانوس ہیں۔ چنانچہ سیمرا، پاشا، بابا جوزی سمارٹ، جوشی اور مہری وغیرہ ایسے کردار ہیں جنہیں میرزا ادیب کے تخیّل نے جنم دیا ہے تاہم قاری ان کے اعمال و حرکات میں گہری دلچسپی ضرور محسوس کرتا ہے اور میں اسے میرزا ادیب کا کمال سمجھتا ہوں کہ اس نے تخیّل کے جادے حقیقت سے ملا دیئے ہیں

میرزا ادیب کی داستانوں کی محرک قوت عشق ہے عشق پوری وارفتہ خیالی سے حسن کو حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے اور عقل کو بالائے طاق رکھ کر کمند افگنی پر اتر آتا ہے یہ بھی ملحوظ رہے کہ میرزا ادیب کی داستان نگاری میں "صحرا" خود بھی ایک روحانی کردار ہے اس میں ہیبت اور عظمت ہے اس کی خاموشی محیر العقول اور اس کی گویائی تحیر آفرین ہے یہ موت اور زندگی کے ساتھ مسلسل آنکھ مچولی کھیل رہا ہے اور قاری پر نہ صرف رعب جلال قائم کرتا ہے بلکہ اسے اکثر اوقات خوفزدہ بھی کر دیتا ہے۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ فاصلہ جب تک قائم رہے یہ خوف اور تحیر بھی قائم رہتا ہے لیکن جونہی فاصلہ مٹ جاتا ہے تو تحیر ختم ہو جاتا ہے اور اکثر اوقات خود مصنّف پر نفرت اور خوف طاری نظر آنے لگتا ہے۔ یہ رویہ خالصتاً رومانی ہے، چنانچہ میرزا ادیب زیادہ تر انہیں دو نہائتوں پر سفر کرتے ہیں، کبھی شدید محبت اور کبھی شدید ترین خوف اور نفرت۔

میرزا ادیب کے ہاں دردمندی کا احساس نمایاں ہے بالخصوص داستان کے مظلوم کرداروں کی عکاسی میں میرزا ادیب کا قلم قاری کے جذبات کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہو جاتا ہے جس دور میں میرزا ادیب نے یہ داستانیں لکھیں وہ ہر طبقے کے محبوب مصنّف شمار ہوتے تھے، اور بعض لوگوں نے تو آزادی کے احساس کو بیدار کرنے میں میرزا ادیب کے افسانوں اور داستانوں کو بھی بالواسطہ طور پر محرک قوت شمار کیا ہے اس دور میں میرزا ادیب اتنے مشہور ہو گئے تھے کہ ان کی پہچان ہی صحرانورد کے خطوط سے ہونے لگی، عرش صدیقی نے درست لکھا ہے کہ اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگوں میں جب میرزا ادیب کے بعض اعلیٰ افسانوں کا ذکر کیا تو اکثر لوگوں نے ان سے واقفیت ظاہر نہیں کی لیکن جونہی انہوں نے صحرانورد کا نام لیا تو ان کی زبان سے فوراً میرزا کا نام اور کلمۂ ہائے تحسین ادا ہونے لگے۔ میرزا ادیب کی اس رومانی مقبولیت سے انکار ممکن نہیں، ادب میں یہ معراج بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ میرزا ادیب کی رومانیت اکتسابی نہیں بلکہ خود اس کی فطرت سے پھوٹی ہے، تحسین فراقی صاحب نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ "میرزا ادیب کا خاندان پرانی رسموں کا بری طرح اسیر تھا اس کا باپ کبھی مدرسے نہیں گیا والدہ پڑھی لکھی نہیں تھی باپ جتنا سخت گیر تھا ماں اتنی ہی نرم دل اور نیک خو تھی" یہ دونوں متضاد دھارے میرزا ادیب کی ذات میں جمع ہو گئے تو باپ کے خلاف ایک مخصوص قسم کی روحانی بغاوت پرورش پانے لگی لیکن جب بھی اس بغاوت کے اظہار کی صورت پیدا ہوئی تو ماں کی فطری حلاوت اس پر شبنم بکھیر دیتی۔ میرزا ادیب کے فن پر یہ دونوں زاویے پوری طرح جلوہ فگن ہیں، اس کی ذاتی زندگی بھی ان دو کناروں میں پابند آب جو کی طرح بہہ رہی ہے اس کی پدری وراثت اسے آگے بڑھنے اور فتح یاب ہونے پر آمادہ کرتی ہے چنانچہ وہ آرزوؤں کی صدا پر بے اختیار لپکتا

چلا جاتا ہے لیکن جب حوادث سامنا کرتے ہیں تو شفقتِ مادری اسے پسپائی پر مجبور کر دیتی ہے اور وہ راستہ بدل کر دوسری گلی میں داخل ہو جاتا ہے چنانچہ دیکھئے کہ میرزا ادیب کے ہاں مسلسل سلگنے اور دھواں پھیلانے کی کیفیت نمایاں ہے وہ شعلہ کبھی نہیں بنا بلکہ ہر وقت دھوئیں سے ہی نبرد آزما ہے کبھی ایک مقام پر اور کبھی دوسرے مقام پر۔ طویل داستان سے مختصر افسانے کی طرف اور پھر مختصر افسانے سے ڈرامے کی طرف میرزا ادیب کا فنی سفر اس کے اسی مزاج کی نشان دہی کرتا ہے۔

صحرانورد کی تخلیق نے بلاشبہ اسے حیاتِ دوام عطا کر دی ہے، رومانی ادب میں میرزا ادیب کا ایک مستقل مقام ہے طویل داستانوں سے میرزا ادیب مختصر افسانے کی طرف آیا تو اس نے سارٹ کا قیدی، سیلِ حوادث اور دردِ دل تیرگی جیسے افسانے لکھے اور ”ماٹی پچاتاں“ جیسا کردار تخلیق کیا پھر جذباتی توجّہ اسے ڈرامے کی صنف کی طرف لے گیا۔ آغا حشر کی وفات کے بعد یہ میدان قریباً خالی پڑا تھا۔ لے دے کے حوالے کے طور پر امتیاز علی تاج کا ڈرامہ ”انار کلی“ پیش کیا جاتا تھا میرزا ادیب نے اُردو ڈرامے کی کمی کو اپنے لئے چیلنج تصور کیا اور افسانے کو خیرباد کہہ کر ڈرامے سے لو لگائی اور پھر اس لق و دق صحرا میں ہر قد و قامت کے اتنے ڈرامے لکھے کہ پھر اہلِ ادب کو ڈرامے کی کمی کی شکایت نہ رہی اگرچہ پاکستانی اسٹیج نے میرزا ادیب پر کچھ زیادہ التفات نچھاور نہیں کیا اور یہ بحث بھی ابھی تک فیصلہ طلب ہے کہ کھیلا جانے والا ڈرامہ پڑھے جانے والے ڈرامے سے افضل کیوں ہے؟ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اُردو ڈرامے کے تذکرے سے میرزا ادیب کا ذکر خارج کر دیا جائے تو ڈرامے کی پوری تاریخ لولی لنگڑی نظر آنے لگے گی پنجاب پبلک لائبریری میں اُردو ڈرامے کی ذیل میں سب سے زیادہ میرزا ادیب کی کتابیں دستیاب ہیں، ٹیلی ویژن پر ایک ایکٹر کو میرزا ادیب کے ڈرامے ”شتر مرغ“ سے حیاتِ دوام حاصل ہو گئی تھی اور اب یہ کردار ٹی وی پر اب بھی خاصا مقبول ہے ان کی نسل سے فریدہ میرزا کی صورت میں اُردو ادب کو ایک ہونہار افسانہ نگار ملی ہے۔

میرزا ادیب اس لحاظ سے بھی بہت خوش قسمت ادیب ہے کہ اب تک اس کی جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے بیشتر پر رائٹرز گلڈ یا نیشنل بک سنٹر کا انعام مل چکا ہے، ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر عرش صدیقی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ستار طاہر اور تحسین فراقی جیسے مصنفین نے میرزا ادیب کے فن پر مستقل نوعیت کے مضامین لکھے ہیں۔ ادبِ لطیف کی ادارت میرزا ادیب کی زندگی کا ایک عہد آفریں کارنامہ ہے۔ ادبِ لطیف کو جس عروج پر میرزا ادیب نے پہنچایا تھا یہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے لیکن ایسا عروج ”ادبِ لطیف کو“ پھر حاصل نہیں ہو سکا۔ بچوں کے ادب میں میرزا ادیب نے معتدبہ اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ اس بچے کی طرح کہانیاں تخلیق کی ہیں جو جھاگ کے بلبلے اُڑا رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے اسماعیل میرٹھی کا نام اب بہت سے بچے نہیں جانتے لیکن میرزا ادیب کا نام نئے دور کے بیشتر بچوں کی زبان پر فوراً آ جاتا ہے میں اس کامیابی کو حیرت اور رشک سے دیکھتا ہوں۔

اس سب کے باوجود اکثر اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرزا ادیب زمانے کی عطا پر کچھ زیادہ مطمئن نہیں۔ اسے شکوہ ہے کہ نا اس کی کتابیں نہیں چھاپتے آج کا نقّاد اس کے فن سے اغماض برت رہا ہے ریڈیو نے اس ڈرامے کا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ ٹی وی اس کا سننے کا روادار نہیں۔ بڑے بڑے ادبی رسالے اس کی تخلیقات کے بغیر شائع ہو جاتے ہیں۔ ڈرامے کے نبّاض ڈرامے کی تاریخ سے اس کا خارج کر رہے ہیں عظیم ترین میرزا ادیب کی کتابیں جب چھپتی ہیں تو تبصرے سے محروم رہتی ہیں اور اب ایک عرصے سے اُردو ادب یہ شہرۂ آفاق مصنف کالم نگاری کر کے گویا ادبی دنیا میں اپنی حاضری لگوا رہا ہے۔ آج اس کا ہر بنِ مو احتجاج کر رہا ہے وہ اپنے آ

تنہا محسوس کرتا ہے اور اس کا ایقان ہے کہ پبلک ریلیشنگ کرنے والے کمتر ادبا اس پر سبقت لئے جا رہے ہیں

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ جب میرزا ادیب ایک شاعر کی ساٹھویں سالگرہ کے جشن میں مضمون پڑھ کر واپس آ رہا تھا تو وہ اسی قسم کی روحانی مایوسی سے دوچار تھا مجھے علم تھا کہ میرزا ادیب کبھی کا ساٹھواں عبور کر چکا ہے۔ ادب میں اس کی خدمات کسی دوسرے ادیب سے کم نہیں لیکن کسی نے کبھی اس کا جشن سالگرہ نہیں منایا، کسی رسالے نے اس پر خاص نمبر شائع نہیں کیا۔ درد کی ایک لہر میرزا ادیب کے دل سے میرے دل کی طرف مسلسل دوڑ رہی تھی لیکن ہم دونوں خاموشی سے الفلاح سے وائی ایم سی اے کی طرف آہستہ آہستہ چل رہے تھے میں نے ہمت کی لیکن الفاظ میرا ساتھ نہ دے سکے کہ اس سے دریافت کروں بڑے ادیب اور مقبول ادیب میں کیا فرق ہوتا ہے" یہی سوال آج بھی میرزا ادیب سے کرنا چاہتا ہوں لیکن میری ہمت آج بھی مجھے جواب دے رہی ہے۔ ایک معصوم بچہ میرے سامنے موجود ہے، وہ جھاگ سے بلبلے اڑا رہا ہے، یہ بلبلے کبھی ہواؤں میں اونچا اڑ رہے تھے اور آج جھاگ کی پیالی میں ہی دم توڑ رہے ہیں میں اس معصوم بچے کو چھیڑنے یا چڑانے کے بجائے بہلانے میں طمانیت محسوس کر رہا ہوں اور بے اختیار کہہ رہا ہوں، پانی کا یہ بلبلہ کتنا عظیم ہے۔

فتح مُبین

منظور الٰہی

مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوہ
مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ (رُومی)

جزیرہ نما عرب کے تپتے ہوئے ریگستان اور سنگلاخ وادیوں میں کھجور اور پانی میسر آنا ایک نعمت تصور ہوتا تھا، عرب کا ایک تہائی حصہ ریگستان تھا، کوئی ندی ایسی نہیں تھی جو سال بھر رواں رہتی ہو، البتہ چند روز کی مسافت پر عراق کے دریائی علاقے تھے اور درختوں کے جھنڈ سے ڈھکی ہوئی لبنان کی پہاڑیوں پر گندم کی فصل سر اُٹھائے کھڑی تھی، جنوب میں سنگترے پک جاتے، خودرو پھولوں کی کثرت ہوتی، ہوا کی تازگی حیاتِ نو کا پیام لاتی اور مخمور فضاؤں میں گھٹا جھومتی۔

بازنطینی اور ایرانی سلطنتیں ایک عرصے سے برسرِ پیکار رہی تھیں، دو غنیموں کے درمیان ایک بے آب و گیاہ چٹیل میدان تھا یا لامتناہی ریگستان جس کے محافظ عرب تھے، رسولِ خدا صلعم نے عربوں کو اسلام کی دعوت دے کر اتحاد اور مساوات کا سبق دیا اور نئے مذہب کے جوش سے سرشار تنومند جری عرب ایک حیران کُن سلسلۂ فتوحات پر نکل کھڑے ہوئے، کون کہہ سکتا تھا کہ پسماندہ عرب قیصر و کسریٰ کا تختہ اُلٹ دیں گے اور سو برس کے اندر یہ انا پسند، خود آگاہ لوگ ایک وسیع علاقے پر قابض ہوں گے۔ جو ہسپانیہ سے سمرقند اور سندھ تک پھیلا ہوگا۔

شام بازنطینی سلطنت کا حصہ تھا، معرکۂ یرموک میں نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے بدو بگولوں میں سے تیر کی طرح نکلے اور مبہوت بازنطینیوں پر غالب آ گئے، عراق ایران کے زیرِ نگیں تھا، ایک سال نہیں گزرا تھا کہ یہ صحرائی لوگ ریگِ رواں سے نمودار ہوئے اور قادسیہ کے مقام پر ایرانی فوج کو شکست دی جو مشرق کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی، گرد آلود سیاہ خیموں میں رہنے والے عرب راتوں رات حلب ایسے قدیم شہروں کے مالک بن گئے، معرکۂ نہاوند میں ایرانیوں نے پھر مُنہ کی کھائی اور ایک ہزار برس قدیم سلطنت کا غرور خاک میں مل گیا، عربوں کی یہ فتح فردوسی کو ایک آنکھ نہ بھائی، قومی عصبیت گزشتہ چند صدیوں کی بات نہیں۔

چو بختِ عرب بر عجم چیرہ شُد، ہمی بختِ ساسانیاں تیرہ شد
ہماں زشت شُد خوب، شد خوب زشت شدہ راہِ دوزخ پدید از بہشت
ز شیرِ شتر خوردن و سوسمار عرب را بجائے رسید است کار
کہ تاجِ کیاں را کند آرزُو تفو باد بر چرخِ گردوں تفو

ساتویں صدی میں عرب ایک سیل کی مانند عرب سے نکلے اور مشرقِ وسطیٰ کو زیر کر کے دو سمتوں میں بڑھے، مشرق۔ اُنھوں

نے وسطی ایشیا اور شمالی ہند کی طرف پیش قدمی کی اور چین کی حد تک جا پہنچے، مغرب میں مصر فتح کیا اور اپنی سلطنت کو شمالی افریقہ کے آخری سرے تک وسعت دی، حتیٰ کہ بحرِ اوقیانوس نے اُن کے قدم روک لیے۔ شمالی افریقہ کے پہاڑی، میدانی اور نیم صحرائی علاقے میں بسنے والے بربر جفاکش اور جنگجو لوگ تھے جنھیں رُومی پورے طور پر مطیع نہیں کر سکتے تھے، شروع میں انھوں نے عربوں کے خلاف مزاحمت کی تھی، گاہے گاہے بغاوتیں بھی ہوئیں، مگر بالآخر انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور برضا و رغبت نیا مذہب قبول کر لیا اور جوق در جوق اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

شام کو فتح کرنے کے بعد بازنطینی حملوں کی روک تھام کے لیے مصر کی تسخیر ناگزیر تھی۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں مصر فتح ہوا تھا۔ بیس برس بعد مصر کی حفاظت سرِفہرست تھی۔ سپہ سالار عقبہؓ بن نافع نے شمالی افریقہ اموی خلافت میں شامل کر لیا تھا۔ افریقہ کے ساحل پر آج کے دور کا شاداب تیونس مسلم فتوحات کی آخری حد تھی۔ عقبہؓ بن نافع شمالی افریقہ کی مغربی حد تک فتح کا نقارہ بجاتا ہوا بحرِ اوقیانوس کے ساحل تک پہنچ گیا اور گھوڑے کو مہمیز لگا کر دندناتا ہوا سمندر میں گھس گیا۔ جب پانی گھوڑے کے پیٹ سے آ لگا تو اُس نے آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر شکوہ کیا:

"اے اللہ! میری زمین ختم ہو گئی ہے، راستے میں سمندر حائل نہ ہوتا تو تیرے نام پر میں مغرب کی انجانی مملکتیں فتح کرتا جو تیرے سوا دوسرے خداؤں کی پرستش کرتی ہیں۔"

اقبالؒ کا مصرع

؎ بحرِ ظلمات میں دَوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

مبالغے سے پاک ہے۔ عقبہؓ بن نافع، طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر ایسے پاک نفوس ہی ان اشعار کے حقدار ہو سکتے تھے:

الٰہی یہ تیرے پُراسرار بندے   جنھیں تُو نے بخشا ہے ذوقِ خُدائی
دونیم اِن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا،   سِمٹ کر پہاڑ اِن کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو   عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن   نہ مالِ غنیمت نہ کشور کُشائی

اقبالؒ

شمالی افریقہ میں عرب مقبوضات کی دیکھ بھال کے لیے سپہ سالار عقبہ رضؓ نے قرطاجنہ[لہ] کے جنوب میں قیروان کے مقام پر ایک فوجی اڈے کی بنا ڈالی جو عالمِ اسلام کا ایک اہم شہر بنا۔ مصر سے بحرِ اوقیانوس تک کا علاقہ عربوں نے فتح کر لیا تھا اور یُوں مشرقی اور مغربی بحیرۂ رُوم پر ان کا پھریرا لہرا رہا تھا، اب دو ہی راستے تھے، جنوب میں اندرونِ افریقہ پیشقدمی کی جائے

[لہ] CARTHAGE -

آبنائے عبور کر کے شمال میں ہسپانیہ پر حملہ کیا جائے، جس کی دُھند سے ڈھکی ہوئی وادیاں شمالی افریقہ کے حکمرانوں کو دعوتِ تسخیر دے رہی تھیں، اس لحاظ سے ہسپانیہ پر حملہ اتفاقی حادثہ نہیں تھا، بلکہ بڑی حد تک یہ اقدام ناگزیر تھا۔ ۷۱۱ء میں ہسپانیہ کی فتح بنو امیہ کا آخری کارنامہ تھا۔

> “اے اُندلس والو! سبحان اللہ کیا بات ہے تمہاری! پانی ہے، سایہ ہے، نہریں ہیں
> اور درخت ہیں، جنت الخلد اگر کہیں ہے تو تمہارے ملک میں ہے۔

— — — — — — — — —

(ابو اسحاق بن خفاجہ (نفح الطیب)

آٹھویں صدی سے پندرھویں صدی عیسوی تک عرب اور بربر ہسپانیہ اور پرتگال کے بیشتر حصے پر حکمران رہے، یہ خطہ مغرب میں سیرا مورینا اور اوقیانوس سے لے کر مشرق میں بحیرہ روم تک ہسپانیہ کا جنوبی حصہ ہے جو اُندلس کہلایا، دریاؤں کے درمیان وادی الکبیر ایسی زرخیز وادیاں ہیں، جنوب میں اُونچے پہاڑ ہیں، سیرا نوادا کی چوٹی ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ گو دامنِ کوہ میں نیشکر کی کاشت ہوتی ہے۔ شفاف نیل فام آسمان، نیلگوں سمندر، پھلوں سے لدے ہوئے اشجار، خوبرو عورتیں، بجا طور پر یہ ملک جنت نظیر مشہور تھا، بحیرہ رُوم پر آباد دوسرے ملکوں کی طرح یہاں مختلف اقوام اور ثقافتیں شیر و شکر ہوئیں۔ دسویں صدی قبل مسیح فنیقیوں نے نو آبادیاں قائم کیں۔ یُونانیوں نے جزیرہ نما کو آئی بیریا کا نام دیا۔ گو ان کی آبادیاں جنوب مشرق اور مشرقی ساحل تک محدود تھیں اور اندرونِ ملک کے ساتھ رابطہ برائے نام تھا، پہلی صدی قبل مسیح میں ہسپانیہ رُوما کا صوبہ بنا اور وہاں لاطینی زبان اور رُومی قانون اور رسم و رواج رائج ہوئے۔ عسکری مدافعت ختم ہونے کے بعد ہسپانیہ میں رُومی اثرات کا نفوذ سُرعت کے ساتھ ہوا۔ رُوما کے سپاہی اور انتظامیہ کے اراکین رُومی اثرات پھیلانے میں ممد ہوئے۔ امیفی تھیٹر اور پبلک عمارات کے کھنڈر رُومی فنِ تعمیر کے شاہد ہیں، سی گوویا کا آب رساں آج بھی زیرِ استعمال ہے۔ دنیا بھر میں اپنی نوعیت کی یہ واحد قدیم تعمیر ہے جو صحیح حالت میں ہے، رُوما کے ٹریجن اور ہاڈریان ایسے عظیم شہنشاہ اور سینیکا ایسا فلاسفر ہسپانوی نژاد تھے، عربوں کی آمد سے پہلے نسلی اور معاشرتی لحاظ سے رُوما نے گہرے نقوش چھوڑے۔ رُومی اقتدار رُو بہ زوال ہوا تو ملک وینڈال اور گاتھ ایسے قبیلوں کے رحم و کرم پر تھا۔

مغربی مؤرخین کو اقرار ہے کہ جزیرہ نما ہسپانیہ میں اسلام نجات دہندہ کے رُوپ میں آیا، صدیوں سے یہ ملک ظالم فاتح اور وحشی قبائل کی آماجگاہ تھا، چھ سو برس تک ہسپانیہ سلطنتِ رُوما کا حصہ رہا، اپنی استعمار طلب حکمتِ عملی کے تحت اس صوبے کی لُوٹ کھسوٹ رُومی سرداروں کے لیے سامانِ تعیش مہیا کرتی رہی، ایک طرف بڑے بڑے جاگیردار اور اُمرا اور دوسری طرف پسے ہوئے عوام اور غلام کسی کو اُنگلی اُٹھانے کا یارا نہ تھا، متعدد مراعات سے بہرہ مند امیر اور طاقتور ٹیکس سے مستثنیٰ تھا، مختصر متوسط طبقہ ٹیکس کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا، صرف یہی طبقہ ٹیکس ادا کرتا تھا، باقی غلام تھے یا مزارعے، اُن کی حالت غلاموں سے قدرے بہتر تھی مگر اُن کی قسمت زیرِ کاشت زمین سے وابستہ تھی، جسے وہ چھوڑ نہیں سکتے تھے

زمین کا مالک زرعی زمین کے ساتھ مزارعوں کو بھی بیچ ڈالتا تھا[1]۔ امراء اپنے محلوں میں ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ فارس اور آسوری منقش پردے، خدمت کے لیے غلام، ضیافتیں روزمرّہ کا معمول تھا، لذیذ کھانے، شرابِ کہنہ کے رطلِ گراں، زرّیں مسندوں پر ٹیک لگائے ہوئے مہمان مطرب کے نغموں سے لطف اندوز ہوتے۔ رقص کناں مہ وشیں دلوں کو لبھاتیں، یہ جنّتِ نگاہ اور وہ فردوسِ گوش!

پانچویں صدی میں مغربی سلطنتِ روما کے زوال پر اوپر تلے وحشی قبائل کی دو موجوں نے ہسپانیہ کو روندا، خطرہ سر پہ منڈلا رہا تھا مگر اخلاق باختہ رومی پست حوصلہ ہو چکے تھے، مقابلہ کرنے کی بجائے وہ ہمت ہار بیٹھے، مؤرخ ڈوزی رقمطراز ہے:

"وحشی قبائل شہروں میں داخل ہو رہے تھے اور بدمست امراء رقص و سرود کی محفلیں گرم کیے ہوئے تھے، اُن کے لرزاں ہونٹ خوبرو کنیزوں کے عُریاں شانوں پر بوسے ثبت کر رہے تھے۔"

؎ یک دست جامِ بادہ و یک دست زلفِ یار
رقصِ چنیں میانۂ میدانم آرزوست
رومی

دفاع کے لیے ایک شہر بھی قلعہ بند نہ ہوا، تلوار نیام میں ہی رہی، ہر جا وحشیوں کے لیے دروازے کھول دیے گئے، محض خون آشام حس کی تسکین کے لیے بے مقصد خونریزی کا وہ بازار گرم ہوا کہ الاماں والحفیظ، وحشی قبائل نے بے تحاشہ لوٹ مار کی اور عمارتوں کو دیا سلائی دکھلا دی۔

اہلِ ہسپانیہ کے لیے ونڈال کی آمد قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھی، ملک کی تاریخ میں شاید یہ تاریک ترین باب تھا، ہسپانیہ کی ہزار سالہ محکومی کا دورِ ابتلاء ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ چنگیز خاں کی خون آشام سپاہ ان وحشیوں کے مقابلے میں رحمدل تھی۔ شہرۂ آفاق کتاب "سلطنتِ روما کا انحطاط و زوال" میں گبن ہسپانوی باشندوں کی حالتِ زار پر خون کے آنسو رویا، قیصرانِ روم کی ستمگاری کسی ضابطے کے تحت تھی مگر ونڈال کا اندھا دھند سیل راستے میں تباہی مچاتا ہوا گزر رہا تھا، شہر اور دیہات یکساں طور پر اس کی لپیٹ میں آئے تھے۔ ورثے کے طور پر انھوں نے لغت میں ایک ناقابلِ رشک لفظ کا اضافہ کیا ——— ونڈلیزم[2]" بمعنی بے مقصد تباہی و بربادی، اُن کی نسبت سے ملک "ونڈلیوسیا" کہلایا جو عربی میں الاندلس ہوا، ہسپانوی آج بھی اس وسیع جنوبی خطے کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔

---

[1] معروف روسی مصنف کاؤنٹ ٹالسٹائی لکھتا ہے: "ہمارے حلقۂ احباب میں غلام مزارعین کی آزادی کا کبھی ذکر نہیں ہوا بلکہ غلام مزارعوں کا وراثت میں منتقل ہونا زندگی کا معمول تھا۔" ۱۸۴۹ء میں ٹالسٹائی جوئے میں ایک بھاری رقم ہار گیا، اس نے اپنے بھائی کو لکھا کہ اس کی زرعی جائیداد میں سے ایک موضع فوراً بیچ ڈالے جو بمعہ مزارعین کے بیچ دیا گیا۔

وِسی گاتھ ایک المانوی قبیلہ تھا، اُن کی آمد وسیع پیمانے پر لوگوں کی ہجرت نہیں تھی، بلکہ یہ محض ایک حکمران طبقہ تھا۔ اُس وقت فرانس اور ہسپانیہ مغربی سلطنتِ رُوما کے تباہ حال صوبے تھے جن پر وِسی گاتھ قابض ہو گئے، بربریت میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اُن کے ظلم و ستم کی وجہ سے بغاوتیں ہوئیں جو سختی سے کچل دی گئیں۔ لوگوں کو اُمید تھی کہ وِسی گاتھ بادشاہت کے طفیل وحشی قبائل سے نجات ملے گی مگر اِس دَور میں بھی ایذا رسانی اور سفاکانہ قتل و غارت روزمرہ کا معمول تھا، اُن کی حکومت رُومی ظلم و تعدی اور قبائلی چپقلش کا مرکب تھی۔

چھٹی صدی کے اواخر میں حکمران طبقے نے کیتھولک عقیدہ قبول کر لیا، ملک کو متحد کرنے میں کلیسا نے اہم کردار ادا کیا۔ حکمتِ عملی طے کرنے کے لیے مجلسِ مشاورت کے اجلاس میں بادشاہ کے علاوہ وسی گاتھ امرا اور اہلِ کلیسا شریک ہوتے، اُمرا اور اہلِ کلیسا بڑی بڑی جاگیروں پر قابض تھے۔ عملی زندگی میں اُن کے اِختیارات پر کوئی قدغن نہیں تھی، ملک بڑا تھا اور ذرائع آمد و رفت محدود، اصلاحات بے سُود ثابت ہوتیں، مزارعین مزدور اور غلام محرومی کا شکار رہتے، ہر طور سے ان کا استحصال جائز تھا، امیر اور غریب طبقات کی تقسیم منجمد ہو کے رہ گئی تھی، محروم طبقے کے لیے اپنی حالت سُدھارنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مزارعین اور غلاموں کی حالت سُدھرنے کی بجائے بدتر ہوتی گئی، ظالمانہ طور طریقوں کو قانونی حیثیت دے دی گئی، رُومی قانون کے تحت بیوی کو خاوند سے اور بچّوں کو ماں باپ سے علیحدہ کرنے کی ممانعت تھی مگر وسی گاتھ دَور میں کوئی آقا کی اجازت کے بغیر شادی کر لیتا تو میاں بیوی کو جبراً علیحدہ کر دیا جاتا اور بچّے آقا کی ملکیت ہوتے، وسی گاتھ نے مسیحیت قبول کی تو اربابِ کلیسا کاروبارِ سلطنت میں دخیل ہو گئے۔ اہلِ کلیسا نے وعدہ کیا تھا کہ حصولِ اقتدار کے بعد وہ مزارعین اور غلاموں کی بہبُود کے لیے کوشاں ہوں گے مگر سنہرے اصُول دھرے کے دھرے رہ گئے، ستم یہ تھا کہ زیادتیاں کلیسا کی شہ پر ہوتیں یا کلیسا چشم پوشی کرتا۔ ہر کلیسا کے ساتھ وسیع زرعی جائیداد منسلک تھی جہاں مزارعین کی کثیر تعداد کام کرتی تھی، بڑے عہدوں پر مامور پادری شان و شوکت کے ساتھ غلاموں سے معمور محلات میں رہتے تھے۔

فطرت کی ستم ظریفی تھی یا نیرنگیٔ زمانہ کہ اربابِ کلیسا کے جَور و ستم نے پُرانے عہد کی یاد بُھلا دی، کسی پادری کی علالت بھی غلام کی نظرِ بد یا جادُو سے منسوب کی جاتی، ایذا رسانی کے نِت نئے طریقے ایجاد کیے گئے، لاٹ پادری کو انتباہاً کہنا پڑا کہ جنونی کیفیت میں اربابِ کلیسا آپے سے باہر نہ ہوں اور غلاموں کے عضو کاٹنے سے احتراز کریں۔!

یہودیوں کو ستانے میں وِسی گاتھ بادشاہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے، اُنھیں طرح طرح سے تنگ کیا جاتا، وہ رُومی دور میں آکر آباد ہوئے تھے، کاروبار اور تجارت میں اُن کا ایک مقام تھا، ایک بادشاہ نے حکم دیا کہ یہودیوں کو بالجبر بپتسمہ پہنایا جائے، نہ مانیں تو جلاوطن کر دیئے جائیں اور اُن کی جائیداد ضبط کر لی جائے، دوسرے نے انھیں بندرگاہ پر جانے اور تجارت کرنے سے منع کر دیا۔ طویل اندھیری رات صبحِ صادق کی نوید لے کر نہیں آئی بلکہ ایک لامتناہی تاریکی چھا گئی، گھٹا ٹوپ اندھیرا جس سے کوئی مفر نہ ہو، طلُوع کے لیے طویل جاں گسل انتظار باقی تھا، حکومت سے

دیرپا اثرات اس تناظر میں دیکھنے چاہئیں۔

وِسی گاتھ بادشاہت میں خاندانی وراثت کا قانون رائج نہیں تھا، بادشاہ کے مرنے پر اُمرا اپنے حلقے سے ایک ایسا شخص چُن لیتے جسے کلیسا کی اعانت بھی حاصل ہو، یُوں جانشینی کا مسئلہ نزاعی صورت اختیار کر لیتا اور اس سے ریشہ دوانیاں اور سازشیں جنم لیتیں۔ لہٰذا اوقات بادشاہ رؤسا کے رحم و کرم پر ہوتا، تاریخ کا کُلیہ ہے کہ بالجبر حکومت کرنے کے لیے حکمران طبقے کا متحد ہونا ضروری ہے مگر دوسو برس کی حکمرانی کے بعد وِسی گاتھ حکومت نفاق کا شکار رہتی۔ جانشینی کا مسئلہ ٹیڑھی کھیر تھا۔ ایسے موقع پر فساد برپا ہوتا، سابق بادشاہ کے مرنے پر اُمرا کی جماعت نے راڈرک کے حق میں فیصلہ دیا تھا' اُس کی رگوں میں شاہی خون نہیں تھا مگر نامور جرنیل راڈرک رسالے کا سپہ سالار تھا، وہ عسکری مہارت اور سیاست میں سُوجھ بُوجھ کی وجہ سے معزز تھا مگر ایک اہم گروہ نے اس چناؤ کی مخالفت کی تھی۔

فتحِ اُندلس اس لحاظ سے اہم تھی کہ عام لوگ جنگ کے قبیح اثرات سے محفوظ رہے۔ وہ خونریزی اور بربادی مفقود تھی جو عسکری حملوں سے منسوب ہوتی ہے، ملک کو تہس نہس نہیں کیا گیا نہ ہی رعایا کا قتلِ عام کیا گیا، کلیساؤں کی بے حُرمتی نہیں کی گئی۔ معاشیات کو تہ و بالا نہیں کیا گیا، عورتوں کی آبرو محفوظ رہی، امن و آشتی کا دَور دورہ ہوا، نظم و ضبط بحال کر کے خوشحالی کی بِنا ڈالی گئی اور معاشرے کی تطہیر کی گئی، ہسپانیہ کی تاریخ نے ایک نیا ورق اُلٹا، پہلی بار ایک تابندہ دَور کا آغاز ہوا، صدیوں سے اس خوبصورت اور زرخیز ملک کا استحصال روا رکھا گیا تھا، وُہ ایک نئے مذہب کے علمبرداروں کا منتظر تھا۔

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خُلقِ عَظیم" صاحبِ صدق و یقین
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں
اقبالؔ

گاتھ مملکت میں دستور تھا کہ درباری آداب سیکھنے کے لیے اُمرا اپنے بچوں کو شاہی دربار میں بھیج دیتے تھے، اُن کی رہائش بھی محل میں ہوتی تھی، اسی مقصد کے لیے کاؤنٹ جولیاں نے اپنی بیٹی طلیطلہ بھیجی تھی۔ شمالی افریقہ میں سبتہ[1] کا گورنر کاؤنٹ جولیاں گاتھک مملکت کا نمائندہ اور اعیانِ سلطنت میں سے تھا، ایک روایت کے مطابق حاکمِ وقت راڈرک نے جولیاں کی نوخیز اور حسین بیٹی کو دریائے تاجہ میں نہاتے ہوئے دیکھ لیا اور اس کی خوبصورتی پر مر مٹا۔ سفلی جذبات سے مغلوب ہو کر وہ امانت میں خیانت کا مرتکب ہوا۔ جب کاؤنٹ جولیاں کو اس فعلِ شنیع کی خبر ملی تو غصّے کے مارے وہ آگ بگولا ہو گیا اور بادشاہ کو اس کی کرتُوت کا مزہ چکھانے کی ٹھان لی، جولیاں نے کہا:

"اس وحشی گاتھ کی یہ مجال کہ وہ ایک شہزادی کی عزت کے ساتھ کھیلے، یسوع مسیح کی قسم! میں اس کا تخت کھوکھلا کر دوں گا اور اُس کی سلطنت برباد کر کے دَم لوں گا۔"

کچھ عرصے بعد جولیاں کی بازیابی ہوئی تو راڈرک کو گمان تک نہ تھا کہ وہ اس راز سے باخبر ہے، راڈرک کو شکار کا شوق تھا۔ ایک مرتبہ وہ فرمائش کر چکا تھا کہ جولیاں افریقہ سے باز بھجوائے۔ آخری مُلاقات کے دوران جولیاں نے کہا: "عالی قدر! اگلی مرتبہ میں اتنے باز لے کر آؤں گا کہ آپ دنگ رہ جائیں گے۔" یہ ہزاروں بربروں کے لیے ایک استعارہ تھا جو جولیاں کی ہمراہی میں سرزمینِ اُندلس پر اُترنے والے تھے۔

مغربی مصر کے نخلستانوں سے لے کر اوقیانوس تک بربر آباد تھے۔ ان کا تعلق ایک قبیلے سے نہیں تھا بلکہ وہ قبائل و شعوب میں بٹے ہوئے تھے، تنومند وجیہہ، مرد مضبوط اور خوبصورت عورتیں، یہ جنگجو لوگ آدابِ رزم سے آگاہ تھے، انھیں اپنے قبیلے پر فخر تھا اور وہ سردار کا حکم بے چُون و چرا بجالاتے، وہ دوستوں کے دوست تھے اور دشمن کو ناقابلِ عفو سمجھتے تھے، بربر صحرائی اور کوہستانی مردانِ حُر کی خوبیوں سے متصف تھے۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کُہستانی　　　اقبالؔ

ساتویں صدی میں عربوں نے شمالی افریقہ فتح کیا اور بازنطینی حکمرانوں کو نکال باہر کیا، موسیٰ بن نصیر نے قیروان کو مرکز بنا کر بربروں کے خلاف خونریز جنگیں لڑیں اور ہوشمندی سے کام لے کر اُنھیں تابع کیا۔ تاریخ کی سٹیج پر پہلی بار انھیں اپنی خوابیدہ صلاحیتیں دکھانے کا موقع مل رہا تھا، اسلام کے نام پر اُنھوں نے ہسپانیہ جیسا ملک فتح کیا، بعد میں دو بربر خاندان ہسپانیہ پر حکمران ہوئے۔

مشرقی مراکو اور مغربی الجیریا پر مشتمل رُومی صوبے کا نام مارلیطینیا تھا، رُومی یہاں کے باشندوں کو اہلِ مغرب یا مُور کہتے تھے، لاطینی زبان کا یہ لفظ یورپ کی زبانوں میں مستعمل ہوا جو بعد میں شمالی افریقہ کے بربروں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ بلکہ عرب اور ہسپانیہ کے نومسلم بھی 'مورو' اور 'موریسکو' کہلائے۔

جولیاں نے شمالی افریقہ کے والی موسیٰ بن نصیر کو ان الفاظ میں ہسپانیہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔

"ہسپانیہ کی خوبصورت اور زرخیز سرزمین پیداوار کے لحاظ سے منفرد ہے، وہاں پھل دار اشجار اور آبِ مصفّا کی فراوانی ہے، ہسپانیہ کے باشندے عیش و عشرت کے دلدادہ ہیں اور باہمی نفاق سے کمزور ہو چکے ہیں۔" اس نے یقین دلایا کہ آبنائے عبور کرنے کے لیے وہ مسلمانوں کی رہنمائی کرے گا اور اس مقصد کے لیے چار چھوٹے جہاز فراہم کرے گا۔"

اُموی خلیفہ ولید بن عبدالمالک کی اجازت سے موسیٰ بن نصیر نے ہسپانیہ فتح کرنے کا ارادہ کیا اور سُن گُن لینے کے لیے اپنے موالی طریف کی سرکردگی میں سو سوار اور چار سو پیادہ کا دستہ روانہ کیا۔ طریف ہسپانیہ کے جنوبی ساحل پر اُترا، وہ مقام اس کی نسبت سے طریفہ کہلایا۔ کسی مزاحمت کے بغیر وہ جزیرہ نما کے جنوب میں ایک حصّے پر قابض رہا، حالات کا

جائزہ لیا اور خاصا مالِ غنیمت لے کے لوٹا، استطلاعی مہم کی کامیابی نے موسیٰ بن نصیر کی ہمت بندھائی اور اس نے طارق کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔

سرد و گرم زمانہ چشیدہ موسیٰ ایک تجربہ کار جرنیل تھا، اُس کی نظر میں اس مہم کی نوعیت اوّلین پنجہ آزمائی کی تھی سات ہزار سپاہیوں پر مشتمل پیادہ فوج میں گنتی کے گھڑسوار تھے، چند عربوں کے سوا سبھی بربر تھے۔ یہ تعداد ایک ملک کو فتح کرنے کے لیے قطعاً ناکافی تھی، موسیٰ ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی تھا۔ اُس کے پاس عرب سپاہ بھی تھی مگر فی الحال وہ گاتھ مملکت کے خلاف فیصلہ کن جنگ کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے برعکس طارق ایک نڈر جرنیل تھا جس کے جوہر میدانِ جنگ میں کھلتے تھے۔ وہ ہر دم نبرد آزما ہونے کے لیے تیار رہتا۔ ایک مردِ مومن جس کے لیے طبلِ جنگ شہادت کی نوید تھا، مہم جُو، گرم دمِ جستجو، میدانِ جنگ میں سرخرو ہونے کا متمنی، اسلام کی سربلندی کے لیے کوشاں، اُس کی حرمت پر نثار، قد آور، جنگ کی بھٹی میں ڈھلا ہوا مضبوط جسم، کھلتا ہوا رنگ اور سُرخ بال، اُس کی پیشانی سے غیر معمولی ذہانت ٹپکتی تھی طارق بن زیاد موسیٰ کا موالی تھا، آزاد کردہ غلام مگر غلام ابنِ غلام نہیں، وہ معزز نفزہ قبیلے کا چشم و چراغ تھا اور اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک جنگ میں مالِ غنیمت کے طور پر موسیٰ کے ہاتھ آیا تھا، انصائے مغرب کو زیر کرنے کی مہمات میں طارق بے جگری سے لڑا تھا، اُس نے طنجہ فتح کیا، پھر اطلس کے پہاڑوں سے گزر کر موجودہ مراکو پر قبضہ کیا، اب دو برس سے وہ طنجہ[1] اور ملحقہ علاقے کا والی اور عسکری سردار تھا۔

طارق کی بربر سپاہ بیشتر نو مسلم تھی۔ راسخ الاعتقاد اور دھن کے پکے بربر جنگ کی مشقتوں سے آشنا تھے، مجاہدوں کے سینے پیش آنے والی جنگ کے تصور سے فروزاں تھے :

؎ آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں — اقبالؔ

موسمِ بہار کی ایک خوبصورت صبح کو یہ مبارک سفر شروع ہوا، ساحلِ افریقہ کی کٹی پھٹی پہاڑیوں کو یورپ سے علیحدہ کرنے والی کھاڑی پر سورج چمک رہا تھا، اُس پار ایک عظیم سنگین چٹان سمندر سے سر نکالے کھڑی تھی، عہدِ قدیم میں لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ہرکولیس کا ایک ستون ہے، انجانی دنیا کی جانب پہلا قدم، اِس کے اُس پار جانا خداوندوں کی ناراضگی مول لینا ہے۔ ہسپانیہ کے ساحل پر پہاڑیوں کی سُرمئی لکیر واضح تھی، کشتیوں کے بادبان بادِ نسیم کے جھونکوں سے ہلکورے لے رہے تھے، سب سے اگلے جہاز میں طارق ایک ایسی مہم کی سربراہی کر رہا تھا جس نے صدیوں تک مغرب کی تاریخ بدل کے رکھ دی۔ اپریل ۷۱۱ء کی پہلی تاریخ تھی جب طارق نے اُندلس کی سرزمین پر قدم رکھا۔ سال کے اِس حصّے میں موسمِ بہار اور خزاں کی رعنائیاں یکجا ہو جاتی ہیں، دشت و دمن شگوفوں سے پٹ جاتے ہیں۔ یہ منظر دمشق کی یاد دلاتا تھا جو عربوں کے نزدیک زرخیزی کا استعارہ ہے، طارق نے اُس مقام پر قدم رکھا جو جبل الطارق کے نام سے موسوم ہوا۔ طارق نے ہی اس چٹان پر پہلا قلعہ اور محل تعمیر کیا جس کے آثار جبرالٹر شہر سے نظر آتے ہیں۔ ربِّ جلیل کی رِدائے رحمت میں وہ لمحہ کتنا عظیم ہوگا جب غازیانِ دین

---

[1] TANGIERS

کا پہلا دستہ ساحلِ اندلس پر لنگر انداز ہوا، فتح مندی کی اوّلین موج کے جلو میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا تھا جسے ہسپانیہ کے کوہ و دمن سے گزر کر زیریں فرانس تک جا پہنچنا تھا۔ یہ وُرودِ مسعود سات سو برس کے تغلب کا نقطۂ آغاز تھا، بلکہ کچھ بعید نہ تھا کہ عرب اور بربر مغربی یورپ پر قابض ہو جاتے اور کلیساؤں سے گھنٹیوں کی بجائے مساجد سے مؤذن کی صدا بلند ہوتی۔

طارق کی درخواست پر موسیٰ نے بعد میں پانچ ہزار بربر بطور کمک بھجوائے، طارق فتح یاب ہونے یا شہادت پانے کا عزم کیے ہوئے تھا، ہسپانیہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوتے ہی اُس نے کشتیاں جلا دینے کا حکم دیا، حصولِ مقصد کے لیے اپنا سب کچھ تج کے یکسوئی سے متوجہ ہونے کے لیے کشتیاں جلا دینا[1] ہر زبان میں بطور محاورہ مستعمل ہوا، بے باک جرأت کے لیے ایک استعارہ، جب انسان ماضی کو پسِ پُشت ڈال دے۔ فرار کے امکانات تلف کر کے غنیم کے سامنے سینہ سپر ہو جائے اور نصب العین کے حصول کے لیے جان کی بازی لگا دے، دُنیائے ادب میں اقبالؔ کے اشعار نے یہ واقعہ زندۂ جاوید کر دیا:

طارق چو بر کنارۂ اُندلس سفینہ سوخت — گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم؟ — ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر بُرد و گفت — ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

کنارِ اُندلس سفینہ سوختن، ایک رمز، ایک کنایہ، طارق کا یہ اقدام تیرہ سو برس سے تاریخ کے اوراق منوّر کر رہا ہے اُس نے پامردی، خود سپُردگی اور ایثار کی ایسی مثال قائم کی جو ہر دَور کے جانبازوں کے لیے منارۂ نُور ہو، میدانِ کارزار میں جہاں دست بدست لڑائی میں جیالے ایک دوسرے کو للکارتے ہیں طارق کا ولولہ انگیز کارنامہ دلوں کو گرماتا رہے گا

---

[1] فتحِ اندلس کے آٹھ سو برس بعد فاتح میکسیکو ہسپانوی کورٹیز وسطی امریکہ کے ساحل پر اُترا، اُس نے طارق کی روایت باندازِ دگر تازہ کی، بحری بیڑا غرقاب کرنے سے پہلے مشہور کر دیا کہ جہاز سفر کے قابل نہیں رہے اور یُوں راہِ فرار مسدُود کر دی، دو معترضین کو دار پر کھینچ دیا اور متعدد شر پسندوں کو کوڑے لگوائے، اس طور متوقع بغاوت کا سدِّباب کیا۔ رسوائے زمانہ کورٹیز کی وعدہ شکنی، سفاکی اور سازش کی داستان طویل ہے، ایزٹیک قوم کے بادشاہ موکٹیزوما نے ہسپانوی سردار کو ٹھوس سونے کی طشتریاں، طلائی جانور، بیش قیمت زیورات اور رنگین ملبوسات بطور تحائف بھجوائے تھے اور مہمان نوازی کا حق ادا کیا تھا مگر کورٹیز نے حیلے سے بادشاہ کو حراست میں لے لیا اور اس کے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا، دارالحکومت جسے دیکھ کر ہسپانوی سپاہی ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ یہ بیداری ہے یا عالمِ خواب؟ ایک جگمگاتی جھیل کے وسط میں چار مربع میل پر پھیلا ہوا شہر جس کے بلند و بالا دمکتے ہوئے معبد، آبی شاہراہیں اور پُر رونق بازار ایک قدیم تہذیب کی شہادت دیتے تھے۔ کورٹیز نے ایزٹیک تمدن غارت کر دیا، معبد ڈھا دیئے اور ایک "غلط فہمی" کی بنا پر تین ہزار پُجاریوں کو

[illegible]

اُس وقت راڈرک شمالی پہاڑوں میں باسق قبیلے کی بغاوت فرو کر رہا تھا

نصرانی ہسپانیہ کے ایک قابل جرنیل نے جبل الطارق کے قریب طارق کی پیشقدمی رُکنے کی کوشش کی مگر پیچھے دھکیل دیا گیا، تُدمیر نے ان الفاظ میں راڈرک کو مسلمانوں کی آمد کی اطلاع دی "خدا معلوم یہ لوگ آسمان سے گرے ہیں یا یہ زمین سے اُبھرے ہیں"

حملے کی خبر سُن کر راڈرک بعجلت طلیطلہ لوٹا اور ایک لشکرِ جرار کے ساتھ مقابلے کے لیے بڑھا، اُس کے چند حلیفوں کی وفاداری مشکوک تھی، سابق بادشاہ وِٹی زا کے بیٹے اپنی جگہ پریشاں تھے، وہ سمجھتے تھے کہ تخت پر اُن کا حق فائق تھا، نیز راڈرک نے اُن کی زرخیز جاگیریں ضبط کر کے شہزادوں کی دُشمنی مُول لی تھی، سابق بادشاہ کا بھائی اوپاس طلیطلہ اور اشبیلیہ کا لاٹ پادری تھا، وہ بھی شہزادوں کا ہم خیال تھا؛

دفاع کے لیے پہاڑی علاقہ موزوں تھا مگر سمندر اور پہاڑیوں کا قدرتی حصار چھوڑ کر طارق کھُلے میدان میں خیمہ زن ہُوا۔ اُس کے لیے جان کی حفاظت مقدم نہیں تھی، اسلام کے لیے ہسپانیہ فتح کرنا مقصدِ اوّلین تھا۔

؎ خیابان میں ہے منتظر لالہ کب سے
حِنا چاہیئے اِس کو خُونِ عرب سے — اقبالؔ

طارق کی پیادہ فوج کے مقابلے میں چالیس ہزار کی گاتھ فوج بیشتر گھُڑسوار تھی اور زرہ بکتر پہنے ہوئے بہترین سپاہیوں پر مشتمل دستہ فوج کے آگے آگے تھا، ان کے ہاتھوں میں بھاری بھرکم الانوی تبر تھے، جن کی زد سے غنیم کا بچ نکلنا محال تھا۔

گاتھ سردار اطلس و دیبا میں ملبوس تھے۔ لباس اور ہتھیاروں میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ رُتبے کے لحاظ سے سرداروں کی انگوٹھیاں چاندی کی تھیں۔ راڈرک کے سر پر موتیوں کا تاج تھا اور شانوں پر ارغوانی چادر جس کا طلائی حاشیہ موتیوں سے مزین تھا، روپہلی چپل میں بھی یاقوت جڑے تھے، بھاری ہتھیاروں سے لیس ہسپانوی فوج دو پہئی گھوڑوں پر سوار تھی۔ طلیطلہ اور اشبیلیہ کا لاٹ پادری اوپاس اور سابق بادشاہ وِٹ زا کے بیٹے یمنی دلیسار کے نگران تھے۔

قطار در قطار منظم بربر ایک دیوار کی مانند آگے بڑھ رہے تھے، پیادہ فوج کے ساتھ بہت کم گھوڑے تھے، یُوں بھی ہسپانوی فوج کے مقابلے میں ایک اور تین کی نسبت تھی، طارق کی عقابی نگاہ نے جنگ کے لیے ایک ایسا مقام چُنا تھا جو پیادہ فوج کے لیے موزوں تھا اور جہاں گھُڑسواروں کے لیے چابکدستی سے مڑنا مشکل تھا؛

صبح کے وقت جنگ شروع ہوئی، سہ پہر ہونے تک موسم گرم ہو گیا۔ میدانِ کارزار ایک ہیبت ناک منظر پیش کر رہا تھا۔ لوہے سے لوہا ٹکرایا، شمشیر و سناں اور تیغ و تبر تلے کشتوں کے پشتے لگ گئے، بھاری بھرکم گھوڑوں کے سُموں تلے زمین کا سینہ دہل رہا تھا، میدانِ کارزار کا شور تھا اور بانگِ دُہل، کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی، دوسرے روز بھی جنگ اسی شدت سے جاری رہی، تیسرے روز عسکرِ اسلام میں تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی، طارق نے سوچا اگلے روز نصرانی تازہ دم ہو کر لوٹیں گے، میدانِ جنگ میں حشر کا سماں ہو گا، مسلمان مدافعت پر مجبور ہوں گے مگر جنگ میں دفاعی وضع

اپنانا بر بر فطرت کے خلاف تھا، سپاہیوں کی بہادری میں کلام نہیں تھا مگر ان کے اعصاب مضمحل ہو رہے تھے، طارق نے اپنی سپاہ سے خطاب کرنے کا فیصلہ کیا، وہ گھوڑے پر سوار ہوا، اور رکاب میں کھڑے ہو کر ایک ولولہ انگیز خطبہ دیا:

"اے لوگو! سمندر ہمارے پیچھے ہے اور دشمن سامنے، خدا کی قسم ایمان اور سعیٔ پیہم کے سوا تمہارا کوئی سہارا نہیں، اور یہ ناقابلِ تسخیر ہیں، تعداد میں کمی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی، اس جزیرے میں تمہاری موجودگی ایک بن بلائے یتیم کی سی ہے، دشمن ہتھیاروں سے لیس ہے، اُس کے ذخائر وافر ہیں اور تمہارے پاس تلوار کے سوا کچھ نہیں، تم نے کچھ نہ کر دکھایا تو تمہارا بھرم کُھل جائے گا۔ دلوں سے خوف نکال دو، میں تمہیں جس چیز کی دعوت دے رہا ہوں اُس کی طرف سب سے پہلے میرا قدم اُٹھے گا، جہاں جان کا خطرہ ہو وہاں سب سے پہلے میں خود موجود ہوں گا، جیسے ہی دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوگی، میں خود ان لوگوں کے متکبر سرغنہ پر حملہ آور ہوں گا، اگر میں راڈرک تک پہنچنے سے پہلے مر جاؤں تو میری جگہ اس منصوبہ کو تم اپنا لینا اور خود اس پر حملہ کرنا۔"

طارق نے حور شمائل حسیناؤں کے متعلق چند الفاظ کہے۔

"اس مُلک میں چشمِ غزال رکھنے والی روشن جبیں حسینائیں ہیں جنہیں عقد میں لا کر تم ہسپانوی شہزادوں کے داماد اور بہنوئی بنو گے، ساتھ ہی اللہ کی راہ میں جہاد کر کے ایک اجنبی سرزمین میں اُس کے نام کا بول بالا کرو گے، اور یوں اُس کی رضا اور خوشنودی کے سزاوار ہو گے۔"

طارق کے الفاظ میں بجلی بھری تھی، زخموں سے چُور غازی تازہ دم ہو گئے، سب کا ایک جواب تھا، "ہم تمہارے ساتھ ہیں، جنگ میں ہم پیش پیش ہوں گے۔"

؎ کیا تُو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں اقبالؔ

فضا میں فتح کی نوید تھی،

سابق بادشاہ وِٹی زا کے بیٹوں کے ساتھ طارق نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ راڈرک کا ساتھ نہ دیں تو اُن کی ضبط شُدہ جاگیریں بحال کر دی جائیں گی، ایک نازک موقع پر میمنہ اور میسرہ پر متعین شہزادے اپنے دستوں کے ساتھ میدان چھوڑ گئے۔ دایاں اور بایاں بازو بے آسرا رہ گیا، اگلے روز مسلمانوں کے حملے میں تُندی آ گئی، سیکڑوں گاتھ اُن کی آہنی ضربوں تلے لقمۂ اجل بنے۔ مگر مرکز جم کر بربروں کی یورش روکنے کی سر توڑ کوشش کرتا رہا، سُورج کی کرنوں میں اُبھرتے ڈوبتے تبر و سناں کی چمک خیرہ کُن تھی، غوغائے رزم اور جنگ کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا، لاشوں کے انبار لگ گئے۔ آخری ہلّے میں میمن، میسرہ اور مرکز سے مسلمان پوری قوت سے حملہ آور ہوئے، بالآخر گاتھ فوج کا زور ٹوٹنے لگا۔ طارق سفید عمامہ اور زرہ بکتر پہنے ہوئے تھا، وہ اور اُس کے ساتھی محافظ دستوں کو تہ و بالا کرتے ہوئے راڈرک تک جا پہنچے جو حریری پردوں والی شاہی رتھ میں تخت نشین تھا، اس کے ساتھ ہی مرکز کی قوتِ مدافعت ختم ہو گئی اور میدانِ جنگ سے پسپائی شروع ہوئی۔ نصرانی فوج نے منتشر ہو کر راہِ فرار اختیار کی اور مسلمانوں نے

اُس کا تعاقب کیا، دریائے بربط کی جنگ یُوں ختم ہوئی، اِس جنگ نے آئندہ پانچ سو برس کے لیے اہلِ ہسپانیہ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

دریائے بربط کے کنارے راڈرک کا گھوڑا "اوریلیا" ملا، گھوڑے کے پاس کیچڑ میں لت پت بادشاہ کا ایک چپل تھا جس میں موتی اور یاقوت جڑے تھے، پھر اُس کا نام و نشاں نہ ملا، اغلب ہے کہ میدانِ جنگ سے بھاگ کر اس نے دریا کی لہروں میں پناہ لے لی ہو اور زرہ بکتر کے بوجھ تلے ڈُوب گیا ہو۔

رہے نام اللہ کا،

ایک خونریز جنگ میں مسلمانوں کو فتحِ مُبین حاصل ہوئی، لشکرِ اسلام نے تعداد میں تین گنا غنیم کو شکستِ فاش دی، ہسپانیہ کی عسکری قوت پر ضربِ کاری لگی اور مغرور گاتھ کا تکبر خاک میں مل گیا، تاریخ ملل میں یہ ایک فیصلہ کُن جنگ تھی، جزیرہ نما میں اور لڑائیاں بھی ہوئیں مگر ایسی کوئی جنگ نہیں تھی جس کے مضمرات اتنے دُور رس ہوں، ایک اندازے کے مطابق غنیم کی ایک چوتھائی فوج میدان میں کھیت رہی، دس ہزار جنگی قیدی غلام بنائے گئے۔ اسلام قبول کرنے والے آزاد کر دیئے گئے، بُربَاط کا میدان شکستہ تلواروں، ریزہ ریزہ نیزوں اور کٹے پھٹے اجسام سے پٹا پڑا تھا، مسلم شہداء کی تعداد تین ہزار تھی۔

تعجب ہے کہ ایک حملہ شکست کا موجب کیونکر ہوا اور بیرونی حملہ آوروں کی اقلیت کیسے پوری قوم پر غالب آ کے رہی؟ وِسی گاتھ سپاہ تربیت یافتہ تھی، وہ جنگی مشقوں سے واقف اور آلاتِ حرب سے آشنا تھی، پیادہ فوج کے علاوہ گھڑسوار کے دافر دستے تھے، مزاحمت کا پُختہ ارادہ ہوتا تو وسائل کی کمی نہیں تھی، جزیرہ نما کے جنوبی کنارے پر طارق کی گرفت ایسی مضبوط نہیں تھی، وہ ایک چھوٹے سے حصے پر بمشکل قدم جما پایا تھا، عسکری لحاظ سے وِسی گاتھ ایک طاقتور مملکت تھی، غنیم کی اخلاقی اور عسکری ابتری اس کی شکست کا موجب ہوئی، بربروں نے اسلام کا جھنڈا سرزمینِ اُندلس میں گاڑ دیا جو کم و بیش پانچ سو برس وہاں فخر سے لہراتا رہا۔

جنگ میں کامرانی کا سہرا طارق کے سر ہے جس کی عسکری قابلیت اور بے خوف قیادت نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا، اُس کی ولولہ انگیز قیادت اللہ کے دین کے لیے وقف تھی، گو تکمیل موسیٰ بن نصیر کے ہاتھوں ہوئی مگر فاتح ہسپانیہ کا لقب طارق کو زیب دیتا ہے، طارق۔ - - - جس کی مبارزت میں بجلی کی چمک اور بادل کی گرج تھی۔ راہِ شوق کا سفیر، بادِ مخالف میں ہمائے گرم پرواز، دوستوں کے حق میں صادق الوَلا، دشمن کے مقابل تیغِ عربدہ جُو، تاریخِ اسلام کا رومانوی ہیرو، بے مثال جرأت و شہامت میں خالد بن ولید اور عقبیؓ بن نافع کا ہم پلہ، اُس کی جانبازی نے شام کی جانب خالدؓ کے پُرخطر سفر کی یاد تازہ کی، جب اُس کا رہوار لق و دق صحرا کا سینہ چیرتا چلا گیا تھا، ممتاز عسکری اکابرین کی کتابِ طلائی میں طارق کا نام جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔

ماخذ :

1. THE MUSLIM CONQUEST OF SPAIN. BY LIEUT GENERAL
A. I. AKRAM.

2 ANDALUS : SPAIN UNDER THE MUSLIMS.
BY EDWYN HOLE

روشنی کی لکیر

ڈاکٹر آغا سہیل

جیسے ہی اندھیری رات اترتی ہے، میری آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھ جاتی ہے، کمرے کے تمام دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے کھینچ دیئے جاتے ہیں اور چونکہ اندر بلیک آؤٹ ہوتا ہے، لہٰذا اندھیرا ایسا ہوتا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا، بس پھر میں بھی چادر اوڑھ کر لیٹ جاتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ کائنات سے میرا وہ رشتہ ٹوٹ گیا جس کا تعلق بصارت سے ہے اور اسی مقام سے میری سوچ اور فکر کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ سوچ پر کوئی قدغن نہیں اس لیے میں کچھ سوچتا ہوں جو بیان نہیں کر سکتا۔ اور جو میں بیان کرتا ہوں وہ، وہ نہیں ہوتا یا عین مین وہ نہیں ہوتا جو میں سوچتا ہوں، ابھی تک میری سوچ بیگانہ اور طفلانہ ہے یا میری خواہشیں طفلانہ ہیں، میری سوچ سب سے پہلے پڑوس میں رہنے والی خوبصورت عورت کے کمرے میں نقب لگا کر پہنچتی ہے، پھر میری خواہشوں کا تانا بانا اس کے وجود کے گرد جال بنتا ہے اور اپنے حسب مرضی اسے جس طرح اور جس ڈھب پر چاہتا ہوں اُٹھاتا بٹھاتا اور اس کی پرستش کرتا ہوں۔ اور اس کے ایک ایک عضو بدن پر تفصیلی روشنی ڈالتا ہوں اور ایک ایک موئے بدن پر فدا ہوتا ہوں۔ معاً میری سوچ زقند بھر کے دوسرے پڑوس میں پھلانگ جاتی ہے۔ جہاں ایک طوائف خفیہ طور پر روزانہ دو تین گاہکوں کو نمٹاتی ہے اور اپنے ناتواں اور کمزور شوہر کے نشے پانی کا بندوبست کرتی ہے۔ اور جب ایک بار پورے ایک ہفتے تک کوئی گاہک میسر نہ آسکا تھا تو وہ رات کے اندھیرے میں میرے پاس آئی تھی کہ کچھ روپے اسے اس کے جسم کے عوض دے دوں۔ اور جب میں نے جسم کے بجائے ویسے ہی اُسے روپے دینے چاہے تو وہ مجھے ایک غلیظ سی گالی دے کر اور روپے میرے منہ پر مار کر چلی گئی تھی۔ اس کے بعد سے آج تک اس نے میرے گھر کا رُخ نہ کیا۔ یہاں سے ہمارے روابط کا خاتمہ ہوا، لیکن میری سوچ کا لامتناہی سفر کہاں ختم ہوا وہ تو اب بھی جاری ہے۔ بلکہ میرے لاشعور کے نہاں خانوں میں دبے پاؤں میری سوچ کب چپکے سے اُترتی ہے۔ مجھے خبر بھی نہیں ہوتی اور لاشعور کے کباڑ خانے سے کیسی کیسی یادیں برآمد ہوتی ہیں کہ جن کا پہلے سے سان وگمان بھی نہیں ہوتا اور جب میں لاشعور کے ہاتھوں بُری طرح تھک جاتا ہوں تو شعور کی سطح پر جو چیز سب سے پہلے اُبھرتی ہے، بند کھڑکی کی جھری سے اندر داخل ہو کر دیوار پر پڑنے والی روشنی کی ایک باریک لکیر ہے۔ نہایت مُنحنی اور کمزور سی لکیر جو پہلے تو ایک جگہ پر قائم نظر آتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ اس میں تھرتھراہٹ اور کپکپاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ یوں جیسے پانی کی سطح پر روشنی مرتعش نظر آتی ہے۔ لیکن دراصل یہ لہروں کا ارتعاش ہوتا ہے، اسی طرح یہ دراصل ہماری سوچ کی لرزش اور ارتکازِ نظر کی کپکپاہٹ ہوتی ہے، یہی وہ وقت ہوتا ہے جب مجھے خبر ہو جاتی ہے کہ سامنے والے مکان میں مالک مکان آچکا ہے اور اب وہ اپنے کمرے میں بتی جلا کر اپنے کاموں میں منہمک ہو چکا ہے اور یہ اس روشنی کی باریک سی لکیر ہے جو میرے کمرے میں در آتی ہے۔

مجھے اس پُراسرار شخصیت سے دلچسپی بھی ہے اور میں اس سے خائف بھی ہوں۔ پُراسرار اس لیے کہ آج تک یہ نہ کھل سکا کہ وہ کون ہے اور کہاں غائب رہتا ہے اور یوں رات گئے آتا ہے اور راتوں رات غائب ہو جاتا ہے۔ دن کو دیکھو تو ایک جنید سا تالا دروازے کے کُنڈے میں پڑا رہتا ہے کبھی کبھار اگر کوئی تعطیل ہوتی تو میں دن بھر اس ٹوہ میں لگا رہتا کہ دن کی روشنی میں شاید وہ نظر آجائے کہ میں اس کا حُلیہ رنگ رُوپ ناک نقشہ دیکھ سکوں اور قریب سے نہ سہی تو دُور ہی سے کوئی شناسائی حاصل کروں مگر توبہ کیجیے یہ ایں خیال است محال است و جنوں کے مصداق، مطلقاً ایسی کوئی صورت نہ نکلی۔ میں نے بھی سوچا کہ جو تجسّس مجھے اس کے بارے میں ہے کیا، دوسرے پڑوسیوں کو بھی ہے۔ مثلاً شیخ جی سے شطرنج کھیلتے ہوئے میں نے کئی بار پوچھا، ذرا اپنے پڑوسی کا حال چال بھی تو بتائیے" فرمانے لگے "کوئی ذی رُوح ہو تو اس کا ذکر کیجیے بھلا کسی چھلاوے جن بھوت سائے کو کسی نے دیکھا ہے ؟" اسی طرح ایک روز راہ چلتے چودھری صاحب سے عرض کی "قبلہ چودھری صاحب کچھ ہمارے پڑوسی کے کردار پر روشنی ڈالیے" ادھر اُدھر دیکھ کر چپکے سے میرے کان کے پاس منہ لگا کر بولے "بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا، بزرگوں سے سُنا ہے کہ یہ کوئی شہید مرد ہے" میں نے کہا "نہیں جناب اس زمانے میں بھلا یہ کہیں یقین کرنے والی باتیں ہیں" بولے "آپ نئی روشنی کے آدمی ہیں ہم تو قرآن و حدیث کو حرف حرف صحیح مانتے ہیں" میں نے کہا "یہ کیونکر یقین ہو کہ وہ عورت ہے کہ مرد؟" بولے "مرد سو فیصدی مرد" عرض کی "یہ کیسے علم ہوا؟" فرمایا "اس کا سایہ دیکھا ہے جو بہرحال ایک مرد کا سایہ ہے ــــ سر پر پگڑی صاف نظر آتی ہے" میں نے چودھری صاحب سے از راہ مزاح المومنین کہا "قبلہ، بھابی صاحبہ جب غسل فرما کر سر سے تولیہ لپیٹ کر میکسی پہن کر گھر سے برآمد ہوتی ہیں تو کیا ان کا حُلیہ عین مین یہی نہیں ہوتا" چودھری صاحب بُرا مان گئے۔ سلام علیکم کہہ کر غڑاپ سے اپنے گھر میں اور دھڑاک سے دروازہ بند کر کے اعتکاف میں بیٹھ گئے، چاروناچار ایمان لانا پڑا، کہ بھئی ہوگا چلو مرد ہی ہوگا، مگر یہ کیسا مرد کا بچّہ ہے کہ نہ گھر میں عورت ذات نہ آس پاس کی توبہ شکن حسین عورتوں کی تاک جھانک۔ ایک روز مجھ سے ضبط نہ ہوا تو قریب کے مکان میں جو ایک ریٹائرڈ ایس پی رہا کرتے تھے اُن کے پاس کسی بہانے سے پہنچ گیا اور باتوں باتوں میں کہا کہ "میاں جی اس ذاتِ شریف کے بارے میں کچھ علم ہو تو فرمائیے کہ کوئی سمگلر ہے ڈاکو ہے چور ہے کیا ہے کیا؟ کہیں کسی تخریبی کاروبار میں ملوث تو نہیں" موصوف نے پہلے تو ایک زوردار قہقہہ ارشاد فرمایا، پھر اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر تاؤ دیا اور میرے کندھے پر اس زور کا دھمکا رسید کیا کہ میری ہڈی پسلی ہل کر رہ گئی بولے "برخوردار شاہین کی نگاہ ہے میری، تیس سال پولیس کی نوکری کی ہے بھاڑ نہیں جھونکا، سارے خفیہ ریکارڈ چھان مارے، سب صاف ہے، میرا خیال ہے کہ یہ کوئی پاگل واگل ہے جوانی میں عشق وشق ہوا ہوگا، ناکام ہو گیا، بس معشوقہ مر کھپ گئی ہوگی۔ اسی کی قبر دبر پر مجاوری کرتا ہوگا، رات آکر یہاں پڑ رہتا ہے، بس جی کسی دن خود بھی مر کھپ جائے گا، چلو معاملہ صاف ہے" میں نے کہا "میاں جی کھانا، کپڑا، نائی دھوبی، مکان، پانی، بجلی، اڑوس پڑوس، آخر معاشرہ ہے، سماج ہے یا معاشرے میں رہتے ہوئے بھی حضرت روبن سن کروسو بن کر رہ رہتے ہیں" ایس پی صاحب نے نہایت سنجیدگی سے فلسفیانہ انداز میں کہا "پتر یہ زندہ آدمی نہیں ہے ــــ یہ زندہ مُردہ ہے اور مُردہ زندہ" میاں جی کا یہ فلسفہ مطلقاً میرے پلے نہیں پڑا لیکن مزید فلسفہ بگھارنے کا میں نے انھیں

موقع نہیں دیا اور اتنی ہی معلومات پر قناعت کر کے بیٹھ رہا اور سوچا کہ ہر چہ بادا باد، اب از خود جو کچھ معلوم ہوگا، ہوگا ورنہ کبھی ہم نہ مغز پچی کریں گے اور نہ بھیجا کھپائیں گے۔ ہاں ایک آدھ بار یہ ضرور ہوا کہ مشکوک چال چلن والی عورت اور اس پُراسرار آدمی کے مابین رشتے کی کھوج لگائی مگر نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں اپنی اپنی منزل کے راہی ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے مطلقاً بے نیاز ہیں؛ حسین اور خوبصورت عورت اپنے عائلی لواحقین میں اس درجہ مستغرق تھی کہ اس باب میں سوچنا ہی فضول تھا۔

ایک رات میں بے خبر سو رہا تھا کہ سڑک پر شدید ہنگامے کے سبب آنکھ کھل گئی۔ دروازے اور کھڑکیوں سے بار بار جھانک کر دیکھا تو سمجھ میں یہ آیا کہ مشکوک چال چلن کی عورت چیخ چنگھاڑ رہی ہے۔ بہت سے لوگ منہ پر ڈھانٹے باندھے ہاتھوں میں رائفلیں لیے کھڑے ہیں اور گاہے گاہے ہوائی فائر کرتے ہیں، عورت کو زدوکوب کرتے ہیں اور بالوں سے پکڑ کر کھینچتے ہیں۔ باہر سڑک کی کمزور روشنی میں بس اتنا ہی دکھائی دیا۔ عورت جب کبھی چیختی چلاتی مدد کے لیے ہم میں سے ہر ایک کا باری باری نام لیتی ہوئی ہمارے دروازوں کی طرف بھاگتی دوڑتی تو غنڈے اُسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتے۔ کبھی وہ میرا نام لیتی کبھی میاں صاحب کو پکارتی، کبھی چودھری صاحب کو اور کبھی شیخ جی کو، مگر ہم میں سے کسی کو باہر نکلنے اور غنڈوں سے اُسے بچانے کی توفیق نہ ہوئی۔ ہر شخص سُون کھینچے اندر دُبکا پڑا رہا، مسلح غنڈوں سے نمٹنے کی کسی میں ہمت نہ ہوئی، لیکن اچانک میرے سامنے والے مکان کا دروازہ کھلا اور ایک سیاہ سا یہ دوڑتا ہوا عورت کی مدد کو گیا، کچھ فائر ہوئے اور منہ پر ڈھانٹے باندھے ہوئے رائفلوں سے مسلح غنڈے اپنی اپنی موٹر سائیکلوں پر بھاگ گئے، البتہ عورت کے زور زور سے رونے اور دُہائی دے کر فریاد کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ جب سب اہل محلہ کو ڈاکوؤں کے چلے جانے کا مکمل یقین ہوگیا تو باری باری ایک ایک دروازہ کھلنے لگا اور لوگ باگ باہر آ آ کر عورت کو جھوٹی تسلیاں دینے لگے۔ سب سے آخر میں، میں باہر نکلا۔ مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ حیرت زدہ کیا وہ میرے اسی پڑوسی کی لاش تھی جو ہمیشہ میرے لیے اور دیگر اہل محلہ کے لیے اپنی زندگی میں پُراسرار بنا رہا تھا، وہ آج بھی پُراسرار موت مر گیا۔ اس کا چہرہ تیزاب سے جھلس کر مسخ ہو چکا تھا جو مسلح غنڈوں نے عورت پر پھینکنا چاہا تھا اور اس کا سارا جسم گولیوں سے چھلنی تھا اور عورت سسک رہی تھی۔

"بیس سو بیس" (طنز و مزاح)

ارشد میر

۱۹۸۷ء کا سورج طلوع ہوئے چند ماہ ہو گئے یعنی ابھی ابتدائے عشق ہے اور ہم نے اپنے مضمون کے لیے عنوان تجویز کر لیا ہے "بیس سو بیس"، خدانخواستہ اس کا بدنام عدد چار سو بیس سے کوئی رشتہ یا واسطہ نہیں ہے۔ ویسے یہ ناہنجار عدد ذہنی اُفق پر اسی طرح مسلط ہو گیا ہے۔ جیسے اسرائیل عرب ممالک کے اعصاب پر سوار ہے۔

سوچتا ہوں جب ہم اس عدد کی لپیٹ میں آ ہی چکے ہیں تو پھر آج سے تینتیس برس بعد کا تصور تخمیناً ہی ذہن میں لانے کی سعی کیوں نہ کریں، یعنی بقول اقبال

فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں

گویا ٹھیک بیس سو بیس یا ہو سکتا ہے اس سے دو چار برس اِدھر یا اُدھر ہی کوئی دھماکہ ہو جائے اور کرۂ ارض نیست ونا ہو جائے یا پھر انسان کوئی ایسے معرکے سر کر لے کہ خود ہی ورطۂ حیرت میں ڈوب جائے اور عرشِ معلیٰ پر ملائکہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں

مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

(ہمیں اس تنکے سے اُمید نہ تھی کہ یہ کارِ نمایاں کرے گا)

دیکھا جائے تو اس وقت بھی قیامتِ صغریٰ کی چند ایک بظاہر انہونی اور کئی ایک جانی پہچانی نشانیاں ضرور کانو میں بھنک ڈال دیتی ہیں، لیکن فی الحال یا مستقبل قریب میں "اصلی تے وڈی قیامت" کی حتمی تاریخ کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا ا موجودہ نسل کی کارستانیاں دیکھ کر سادہ لوح اور خدا ترس حضرات مصر ہیں کہ موجودہ حالات کو قیامتِ صغریٰ کے تمہیدی مرحل تسلسل کی ایک کڑی میں شامل کیا جائے لیکن سرِدست ہمیں کوئی ایسی تشویشناک صورت نظر نہیں آتی، کیونکہ خود رو بے لگام نس کی من مانی کارروائیوں کے باوجود صورتحال ابھی تک اتنی نہیں بگڑی۔ اگرچہ حالات پر بزرگوں کی معزول شدہ بزرگی کی گرفت ذ ڈھیلی پڑ گئی ہے جس کے ایک لحاظ سے وہ خود بھی ذمہ دار ہیں۔

میں گلہ کرتا ہوں اپنا تو نہ سن غیروں کی بات
ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں،

لیکن نامساعد حالات کے باوجود سپر پاور کا گیئر انہی کے قبضۂ قدرت میں ہے لیکن بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منا کرنا خلعت نسل تو اپنے موجودہ اور سابقہ اسلاف کے اپریشن کلین اَپ کے منصوبے کو آخری شکل دے چکی ہے۔

اگر حقائق سے پردہ پوشی کو وتیرہ نہ بنالیا جائے تو موجودہ صدی بھی اب تھکی ماندی ہسکتی، بلکتی منڈلاتے خطرات سے بچتی بچاتی اور سر چھپاتی پھرتی ہے اور اپنی خیریت کے متعلق خاصی پریشان ہے کہ کہیں اس کے سر تیسری عالمگیر جنگ بھی نہ تھوپ دی جائے اور یوں سابقہ صدیوں کے جملہ ریکارڈ توڑ کر کلنک کا ٹیکہ ہمیشہ کے لیے اس کے چہرے کو داغ دار کر جائے۔ شاید اسی حوالے سے موجودہ صدی ہفتوں اور مہینوں کا کام لمحوں میں ختم کرکے ہر لحظہ پابہ رکاب ہے۔

مدت سے سرِ برق ہے کاشانہ ہمارا
ہر لحظہ یہ عالم ہے کہ ہیں اور نہیں ہیں

اور یوں خاتمہ بالخیر کی متلاشی ہے جس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس صدی کے باقی ماندہ تیرہ برس بڑی عجلت اور تیزی سے گذر جائیں گے ادھر ان کی دیکھا دیکھی اگلے بیس برس بھی پلک جھپکنے میں ہی بیت جائیں گے۔ جہاں قبل ازیں ہزاروں صدیاں اپنا کام تمام کروا چکی ہیں وہاں ان گنتی کے سالوں کی مبلغ حیثیت کیا ہے۔ کہ انھیں خواہ مخواہ سرخاب کا پر لگاتے پھریں اور ویسے بھی ہمیں وقت کی کونسی قدر و منزلت ہے جو گھبراتے پھریں، کہ چشم بد دور طبعاً بے پروا اور عادتاً بے نیاز مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہاں تو ذکرِ خیر اس زمانے کا تھا جسے ہم نے ٹارگٹ بنایا ہوا ہے اس وقت شاید ہم بقیدِ حیات ہوں یا ہوسکتا ہے راہی ملکِ عدم ہو چکے ہوں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لگے ہاتھوں اور نہیں تو کچھ پیشگوئیاں ہی کرتے جائیں۔ ممکن ہے آپ کسی ترنگ میں آکر پوچھ لیں کہ کیا ہم علم نجوم کے ماہر ہیں۔ یا پامسٹری سے شُدبُد رکھتے ہیں یا پھر ہمیں کالے علم یا ٹونے ٹوٹکے سے شناسائی ہے تو اس ضمن میں بندہ پرور ہم آپ کو آگاہ کیے دیتے ہیں کہ اس نوع کے سوال پوچھنے سے اجتناب کیجیے تاکہ آپ کی حوصلہ شکنی نہ ہو۔ وقتی طور پر ہم ان سوالوں کے جواب میں مکمل سکوت اور خاموشی ہی اختیار کریں گے یا بطورِ جواب آں غزل آپ سے استفسار کریں گے۔ کہ یہ جو ہر سال قومی اور بین الاقوامی سطح پر بے پناہ پیشگوئیاں بڑے دھڑلے سے کی جاتی ہیں اور اکثر سو فیصدی غلط ثابت ہوتی ہیں یا بالفرضِ محال کوئی ایک آدھ کلیتاً یا جزوی طور پر اگرچہ اتفاقاً ہی سہی، درست ثابت ہو جائے، تو ذرائع ابلاغ وہ طوفان (بلکہ طوفانِ بدتمیزی کہنا زیادہ موزوں ہے) سر پر اُٹھاتے ہیں کہ الامان والحفیظ لیکن وہ پیشگوئیاں جو بادی النظر میں ہی بے سروپا اور مضحکہ خیز ہوتی ہیں، صریحاً غلط ثابت ہوتی ہیں اور نتیجۃً دل کی دھڑکن بڑھانے کا باعث بنتی ہیں چہرے پر ہوائیاں اُڑاتی ہیں، نروس سسٹم بریک ڈاؤن کرتی ہیں۔ بلڈ پریشر کو تھوک کے حساب سے پروان چڑھاتی ہیں۔ سر کو لٹو کی طرح گھمانے اور آنکھوں کے آگے اندھیرے کی لامتناہی پرچھائیاں لانے کا سبب بنتی ہیں یا بڑی شانِ دلربائی سے خوف و ہراس کی فضا پیدا کرتی ہیں، کیا ان کے خلاف کبھی کسی نے ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ کسی قانونی نوٹس دینے کی زحمت گوارا کی ہے کبھی ازالہ حیثیت عرفی کا دعوے دائر کرنے کا سوچا ہے کسی حاکم وقت نے اُسے توہین اور تذلیل انسانیت کا مرتکب ٹھہرایا ہے۔ اگر ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو پھر اگر ہم اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے پر تول رہے ہیں تو پھر آپ قلم بردار بر وزن لٹھ بردار ہم پر کیوں سوالات کی بوچھاڑ کرنے کی ٹھان چکے ہیں۔ چلیے ہم آپ کو امتحان میں نہیں ڈالتے، بلکہ

وسوسوں کا شکار ہونے سے بھی بچا لیتے ہیں اور برملا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم پیشہ ور نجومی تو کجا عملاً اس علم سے ہی مخاصمت رکھتے ہیں۔ البتہ گاہے گاہے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ادب کو تھوڑا بہت منہ ضرور مار لیتے ہیں بلکہ اس کی بقاء اور پاسداری میں بھی پیش پیش ہیں۔ اس لیے جب ہم دیکھتے ہیں کہ جونہی سائنس والوں نے چاند پر پہنچ کر اس کا کچا چٹھا کھولا تو پوری دنیا میں ان کی اس والہانہ انداز میں پذیرائی ہوئی کہ باید و شاید اور پھر جو سائنس والوں کو چاند کی طرف پرواز کا خیال آیا تو یہ سارا تصور علامہ اقبال مرحوم کا ہے۔ کیونکہ انھوں نے یہ چغلی نہیں کھائی تو نشان دہی جو کر دی -

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

تو بس وہ جو کہتے ہیں کہ "دیوانہ وار ہوئے بس است" یعنی دیوانوں کو جنون کے دورے کے لیے بس ٹھوکر دینا کافی ہے۔ سائنس والوں نے فضائے آسمانی کے چکر لگانے شروع کر دیئے اور اب اس خلائی جاسوسی ہی سے نسلِ انسانی کو فنا کرنے کے لیے فضا میں مورچے قائم کرنے بلکہ فیکٹریاں قائم کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں۔ بہرحال اب ان کے حوصلے بلند ہیں، بلکہ کل کلاں کو ان کے مبارک ہاتھوں سے ستاروں کا بھی چاند سے ملتا جلتا حشر بپا ہونے والا ہے۔ ظاہر ہے اس وقت پھر انھی سائنس والوں کے لیے باجماعت مبارک سلامت کی آوازیں سننے سنانے میں آئیں گی۔ اگر فی الواقع ایسا ہوا تو یہ شعر و ادب کے پروانوں کے لیے دعوتِ فکریہ ہے۔ کیونکہ چاند کے معاملے میں تو شاعروں نے انتہا پسندی اور مبالغہ آرائی میں خاصی کوتاہیاں برتی تھیں۔ لیکن ستاروں کے متعلق ان کا رویہ خاصہ معتدل اور حقیقت پسندانہ ہے۔ بلکہ غالب نے تو انھیں بڑی مہارت اور چابکدستی سے دلچسپ پیرایہ میں بازی گر بنا دیا ہے۔ اس لیے اگر سائنسدانوں نے ستاروں کے بارے میں جلد یا بدیر کوئی چاند سے ملتا جلتا انکشاف کیا تو اس کا کریڈٹ ہرگز انھیں نہیں لینے دیں گے۔ بلکہ اس کا سہرا بالعموم دانشوروں اور بالخصوص حضرتِ غالب کے سر ہی بندھوائیں گے۔ اگر ممکن ہوا تو اس مؤقف کو نہ ماننے کی صورت میں عالمی عدالت انصاف تک لے جانے سے بھی دریغ نہیں کیا جائے گا اور غالباً یہ واحد مسئلہ ہو گا جس میں بھارت بھی ہمارا ہمنوا یعنی مصرعہ ثانی ہو گا۔ بلکہ دامے، درمے، قدمے سخنے دستِ تعاون بڑھائے گا۔ کیونکہ وہ ہمہ وقت عالمی رائے عامہ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا مشاق اور مشتاق ہے اور اس کے پیشِ نظر نام نہاد سیکولر حکومت کی کرشمہ سازیاں بھی ہوتی ہیں جن کو ثابت کرنے کے لیے وہ اقلیتوں کو رُلا کر ان کی اشک شوئی بھی کرتا ہے۔ اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے کوئی نہ کوئی چکر چلائے رکھتا ہے بلکہ اس کا تو قومی نشان ہی چکر ہے۔

غالب کی صد سالہ برسی بھی غالباً اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ بلکہ ان کی دیکھا دیکھی روس نے اپنے ہاں ایک پھول کا نام غالب رکھ کر حقِ دوستی بھی نبھایا تھا۔ البتہ یہاں ایک چیز تشویش کا باعث ضرور بن سکتی ہے۔ کہ اگر ستاروں کے ضمن میں کہیں روس کو امریکہ پر برتری حاصل ہو گئی تو پھر روسی کسی نسبت پر بھی غالب کی دال نہیں گلنے دیں گے اور وجہ ظاہر ہے کہ اگر یہ صورت بنی تو بھارت بھی سرِ تسلیم خم کر دے گا، کیونکہ روسیوں کے زیر بار :

"یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں" اُسے"

ان حالات میں پھر اس مسئلہ کو یو۔ این۔ او ہی میں لیجایا جا سکے گا۔ کیونکہ وہ بھی تو اب ایک نمائشی ادارے کا روپ دھار چکا ہے'

جس کی خاص طور پر سپر طاقتوں کے سامنے کوئی پیش نہیں جاتی ۔ کہنے کو تو اس نے سعدی شیرازی کے

بنی آدم اعضائے یک دیگرند

نظم کے مشہور اشعار کو اپنے چارٹر کا حصہ بنا کر دیواروں پر جلی حروف میں لکھوا بھی لیا ہے ، لیکن عملاً ان اعضاء کی بین الاقوامی سطح پر جو قطع و برید ہو رہی ہے ۔ قتل و غارت سے ان کا جس طرح قیمہ اور تکے بن رہے ہیں ۔ انسانیت کی جو تذلیل اور بے حرمتی ہو رہی ہے ۔ وہ کسی سے مخفی نہیں ۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ شعلے انسانیت کا منہ چڑا رہے ہیں ۔ انسانیت سوز مظالم پر بیچاری کُبڑی دنیا جس کا غازہ بھی اب اُتر چکا ہے ، بلکہ جس نے برقی اور جوہری توانائی کو زندگی کے لیے سانس سے بھی زیادہ لازمی بنا لیا ہے بقول شاعر :- ؎

آشیاں برق کے پہلو میں بنا رکھا ہے
جانے ان جلوہ پرستوں کو خبر ہے کہ نہیں

اعضاء کی بات چلی ہے تو ہو سکتا ہے ۔ اس دور کی نسل بڑی حیرت کا اظہار کرے کہ گزشتہ صدی کے لوگ کتنے جاہل ، احمق اور بے علم تھے ۔ کہ انھیں نہ تو اعضاء کی پیوندکاری کا پوری طرح علم تھا اور نہ اس حقیقت سے ہی کما حقہٗ واقف تھے ، ک ان اعضاء کو معذوروں کے لیے بطریقِ احسن کام میں لایا جا سکتا ہے ۔ حتٰی کہ جب بیسویں صدی کے دوران یورپی ممالک می اس فن کا اچھا خاصہ چرچا ہوا ۔ تو پھر بھی اپنے ہاں کے لوگوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور وہ اپنے اسلاف کی مانند اپنے اعضاء سے بسترِ مرگ یا مرنے کے بعد بھی جدائی برداشت کرنے پر رضامند نہ ہوئے ۔ اور یوں اپنی جہالت ، حماقت اور خود غر سے کئی قیمتی جانوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کا باعث بنے ۔ انھیں خود تو جانوروں کا گوشت چٹخارے لے لے کر کھانے ا ان کے حصے بخرے کرا کر احباب کو بُلا کر کھلانے کا شوق تھا ، لیکن وہ اعضاء کے علاوہ اپنے خون کے ایک ایک قطرے پر بھ دیوانہ وار فدا تھے ۔ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ مرنے کے بعد بھی اپنے اجسام کو خوشبوؤں کے چھڑکاؤ سے آراستہ کراتے تھے او بڑے تزک و احتشام سے من و عن مُردہ حالت میں بھی چارپائی پر دراز ہو کر یا ارتھی پر لے جا کر دفنائے اور جلائے جاتے تھ حد یہ ہے کہ یہ ان کے لواحقین بھی اتنے سعادت مند اور احمق الذین تھے کہ وہ بھی انہی کے کہنے پر عمل پیرا تھے اور ان کی پر بھی ان کے جسم کا کوئی حصہ اپنے کسی قرابت دار کو کسی قیمت پر یا تحفتاً کسی دوست کو دینے کے لیے آمادہ نہ ہوتے تھے ۔

توقع کی جاتی ہے کہ اکیسویں صدی کا روشن خیال اور الٹرا ماڈرن طبقہ سنِ بلوغت کو پہنچتے ہی اپنے اعضاء وقف علی الانتقال کر دیا کرے گا ، بلکہ کئی ایک اعضاء سے محروم معاملہ فہم حضرات تو اپنے جگری دوستوں سے تقاضا کریں گے انھیں مختار نامہ یا حلف نامہ تحریر کر دیں تاکہ وہ حسبِ منشاء بغیر کسی رکاوٹ کے انکی وفاتِ حسرت آیات (یعنی جن۔ مرنے کی دوسروں کو حسرت تھی) پر اعضاء کا صحیح مصرف کر سکیں ۔ کئی ایک خدا ترس بذاتہٖ وصیت نامہ کی رُو سے مستحق ا کے لیے اپنے اعضاء کی تقسیم کر جایا کریں گے ۔ تاکہ ان کے وارثان ان کے اعضاء کو غیر محفوظ یا غلط ہاتھوں میں منتقل نہ یا ان کے دام ، اتنے لگا دیں جو کوئی خرید ہی نہ سکے ۔ لہٰذا امکانِ غالب ہے کہ اس زمانے میں خون کی تبدیلی یا خون کا ہ

کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ بلکہ تازہ خون کی دکانیں بھی عام کھل جائیں گی اور یوں لوگ بے اثر خون فروخت کرنے والے پیشہ وروں کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے)

اس زمانے کے بچے بڑی حیرت سے پڑھا کریں گے کہ ربع صدی پہلے تک بازار میں انسانی گردے، دل، پھیپھڑے، ناک، کان، ہونٹ، بازو ٹانگوں، سر یا پاؤں وغیرہ کے بکنے کا تصور تک نہ تھا۔ یاد رہے کہ یہ بچے بکتر بند گاڑیوں میں علم حاصل کرنے کے لیے مدرسوں میں جایا کریں گے اور ٹینکوں کے سائے میں پڑھائی ہوا کرے گی اور یوں علامہ اقبال رح کے کئی دیگر مصرعوں کی طرح یہ مصرعہ بھی بہ تصرف ادنیٰ الہامی ثابت ہو گا۔

توپوں کے سائے میں ہم پڑھ کر جواں ہوئے ہیں)

لے دے کر بس مصنوعی دانتوں اور بالوں کا سسٹم رائج تھا، اور پھر دانت بھی ایسے کہ ہاتھی کی طرح کھانے اور دکھانے کے اور ہوتے تھے۔ جو کئی مرتبہ بھری محفل میں پوری بتیسی گر کر ہوش و حواس اڑانے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ بعض اوقات کھانے کی میز پر کسی کے مصنوعی دانت بوٹی کے ساتھ باہر آ کر دوسرے نازک مزاجوں کا کھانا پینا حرام کر دیتے تھے۔ جہاں تک مصنوعی بالوں کی وگ کا تعلق تھا، وہ ہزاروں میں سے کسی ایک کو سجتی تھی، ورنہ اکثریت کی اشکال کو سنوارنے کی بجائے بگاڑنے کا سبب بنتی تھی۔ البتہ اس کی گرتی ہوئی ساکھ کو ایک حد تک ججوں نے ضرور سہارا دیا تھا۔

اعضاء کا ذکر خیر ہو رہا تھا تو اس وقت تک ان کو تا دیر محفوظ رکھنے کے لیے بھی اچھا خاصہ انتظام و انصرام ہو جائے گا ہو سکتا ہے ان کے لیے گارنٹی شدہ خصوصی کولڈ سٹوریج بھی بن جائیں۔ البتہ اعضاء کی منتقلی میں انتہائی محتاط ہونا پڑے گا اور کوئی بھی عضو لینے سے پہلے اس کے اصل مالک کا حسب نسب دریافت کرنا ہو گا اور خاص طور پر اس کے مزاج و اطوار کی جانچ پڑتال ضروری ہو گی تاکہ نو وارد اعضاء کی انسان کے پیدائشی اعضاء سے خانہ جنگی کی صورت نہ بن جائے۔

کہا جاتا ہے کہ ہر عضو قیامت کے دن انسان کے حق میں یا خلاف واشگاف الفاظ میں گواہی دے گا بلکہ اپنی تمام تر کوتاہیوں اور لغزشوں کا بھی اسے ہی ذمہ دار ٹھہرائے گا۔ اگر کسی عضو کا سابقہ ریکارڈ درست نہ ہو تو اسے کسی قیمت پر بھی نہیں جڑوانا چاہیے۔ کیونکہ ہمیشہ ایک مچھلی ہی پورے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے اس لیے احتیاط لازم ہے تاکہ نووارد عضو کی آمد سے ،

خود تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

والی کیفیت پیدا نہ ہو جائے۔

جہاں تک ان اعضاء کا مردہ جسم سے زندہ جسم میں لگنے کا مسئلہ ہے، تو ظاہر ہے وہ اپنے تئیں خاصے مسرور ہوں گے کیونکہ اس طرح وہ مزید ایک عرصہ تک چلنے یا خاک بسر ہونے سے بچ جائیں گے دوسرے وہ چار اور رنگ ڈھنگ کے آدمیوں سے چمٹ کر بوقلموں تجربوں سے بہرہ ور ہو سکیں گے۔ لوگ شعرا بلا میر الرحمٰن کی پیشگوئی کی صداقت سے کیسے انکار کر سکتے ہیں اس وقت کے جاہل سامعین اس شعر کا مطلب نہ سمجھے، پر اب سمجھ جائیں گے ،

ہم نے اُن کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا دل رکھ دیا سر رکھ دیا

یہ شعر جب ہمارے ایک واجب الاحترام مرنجاں مرنج اور سخن فہمی میں یکتا بزرگ کے سامنے پڑھا گیا۔ تو وہ فوراً بولے واہ یہ آدمی جاپانی میڈ مین کے پُرزوں کا بنا ہُوا ہے۔ یہاں ایک سوال بار بار ذہن میں اُبھرتا ہے کہ اگر کسی سرپھرے نے متذکرہ فارمولے پر عمل نہ کیا اور بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بغیر دیکھے بھالے کسی بے مروت کی آنکھ، پتھر دل کا کلیجہ، بے غیرت کا پتہ، متلون مزاج کا بھیجا، لائی لگ کے کان، سوختہ سامان جگر، مکھی نہ بٹھانے والا ناک، تیوری چڑھی پیشانی کو بھی آمنّا وصدّقنا کہہ کر قبول کر لیا (چونکہ اعضاء زنانہ بھی ہوں گے، اس لیے ایجاب و قبول کی ترکیب بھی بعض صورتوں میں بے محل نہ ہوگی) تو اس سے جو سنگین نتائج برآمد ہوں گے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، ایسی پیوندکاری سے تو انسان لنڈورا ہی بھلا! البتہ وائس ورسا میں خندہ پیشانی، کشادہ دلی، یاقوت ہونٹ، غزال چشم، مخروطی انگلیاں، ستواں ناک، سڈول پنڈلیاں وغیرہ نصب ہو جائیں تو پھر کیا کہنے۔

اعضاء کے اس دھندے میں کراماً کاتبین اور منکر نکیر کا کام خاصہ بڑھ جائے گا کیونکہ بعض اوقات ایک ہی شخص کے کئی مرتبہ اعضاء تبدیل ہونے پر علیحدہ علیحدہ کھاتے کھولنے پڑیں گے۔ بلکہ سابقہ ریکارڈ پر بھی کڑی نگاہ رکھنی ہو گی۔ شاید وہ ان حالات میں اللہ میاں سے اوور ٹائم کے لیے عرضی بھی گزار دیں، کیونکہ تقاضا یا مطالبہ کی جرأت کرنے سے تو قاصر ٹھہرے۔ اسی طرح ہڑتال کی دھمکی دینا بھی ان کے بس کا روگ نہیں ہوگا، غالباً یہ تو ان کے دائرۂ اختیار میں نہیں ہوگا (یہ سوغات تو خالص زمینی ہے۔) خیر چلیے یہ تو کراماً کاتبین یا نکیرین کے ذاتی مسائل ہیں اور ہم کیوں پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑاتے پھریں ہو سکتا ہے کہ اسی اندیشہ کے پیشِ نظر کسی دُور بین عاقبت اندیش شاعر نے زندگی ہی میں نکیرین کو یہ دھمکی دے دی ہے۔

قسم خدا کی کہ ہم بے نقط سُنائیں گے
لحد میں ہم سے نکیرین گر سوال کریں

(ویسے یہ دھمکی نکیرین کی سمجھ میں نہ آئے گی کیونکہ اردو محاورے میں بے نقط کے اور معنی ہیں اور عربی کے لحاظ سے بے نقط کلمہ شریف ہے۔ دھمکی تو ہے لیکن ذو معنی ہے) یہاں مغل شہنشاہ اکبر کے اہم ترین رتن فیضی یاد آ گئے جنھوں نے قرآن پاک کی بے نقط تفسیر لکھی تو یار لوگوں نے کہ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس پر کفر کا فتوے صادر کر دیا۔ جب فیضی مرحوم کی جواب طلبی ہوئی، جس نے بھری محفل میں اپنی صفائی میں بس اتنا کہا کہ اگر خاکم بدہن بے نقط تفسیر کفرانہ فعل ہے تو پھر کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اور فضلائے عظام بارے کلمہ طیبہ کے جس پر سبھی لاجواب ہو کر رہ گئے تو صاحبو اگر فتووں کی بات چھڑیں گے اس ضمن میں ہم قطعاً پیش گوئی کرنے کی پوزیشن میں نہیں کہ آیا آنے والے مقررہ وقت پر ان کی مانگ بڑھے گی یا کساد بازاری کا شکار رہیں گے اس لیے کہ ہر دو صورتوں میں

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

ہونے کا اندیشہ لاحق ہے جو ہمیں ہی نہیں شاید آپ کو بھی قابلِ قبول نہ ہو۔

البتہ اس وقت لوگ یہ جان کر خندۂ استہزا کا اظہار ضرور کریں گے کہ گزشتہ صدی کے آخری عشرہ تک اچھے خاصے معقول اور ذہین و فطین لوگ بھی زبان دکھا کر اور نبض پر ہاتھ رکھوا کر نسخہ لکھواتے تھے۔ ہسپتال کا نام سنتے ہی پورے جسم پر کپکپی طاری کر لیتے تھے۔ اور بڑی خود اعتمادی سے چارپائی پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان جانِ آفریں کے سپرد کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

اسی طرح یہ حقیقت جان کر بھی خاصی مایوسی کا اظہار کریں گے کہ ہمارے سادہ لوح بزرگ اچھے خاصے رجعت پسند، دقیانوسی اور لکیر کے فقیر تھے۔ جو اپنے ہاں منکوحہ بیویاں رکھتے تھے۔ اُن کے ہاں کسی گرل فرینڈ یا لواتے فرینڈ کا تصور ہی نہ تھا اور اگر کوئی آزاد منش لڑکا فرسودہ روایات کے بندھن توڑ کر کسی نٹ کھٹ لڑکی سے یا کوئی روشن خیال لڑکی کسی آوارہ خرام لڑکے سے محبت کی پینگیں بڑھا لیتے تو اگلے وقتوں کے یہ لوگ سیخ پا ہو کر ان بچوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے بلکہ ان پر اس قدر ستم روا رکھے جاتے کہ گھر کا ماحول تھانے کی اذیت گاہ سے بھی بدتر دکھائی دیتا، حالانکہ آج کل تو امریکہ میں مصنوعی بیویاں محض گرین کارڈ کی شرائط پوری کرنے کے لیے رکھنا ایک عام فیشن بن چکا ہے۔

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اختتام پر مہنگائی اور خوراک کی کمی کا مسئلہ بھی شدت اختیار کر سکتا ہے۔ اس وقت شاید سمندری خوراک ڈوبتے کے لیے تنکے کا سہارا بنے۔ گو موجودہ دور میں بھی اس خوراک کی جانب خاصی پیش رفت ہوئی ہے، بلکہ اس رجحان نے غذائی بحران پر خاصے صحت مندانہ اثرات چھوڑے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود دنیا کا کوئی نہ کوئی خطہ بُری طرح قحط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے آنے والے پیغمبری وقت کا سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ممکن ہے اس وقت کوئی ایسی گیس ہی برآمد ہو جائے جو مکمل خوراک کا نعم البدل ثابت ہو۔ اگر فی الواقع کوئی ایسی صورت بن گئی تو پھر پٹرول پمپوں کی طرح جابجا اس گیس کے پمپ بھی لگ جائیں گے بلکہ گھروں میں سوئی گیس سے ملتے جلتے میٹروں کی تنصیب بھی ہو جائے گی۔ پھر ہو سکتا ہے مشروبات کی طرح بند ڈبوں اور بوتلوں میں بھی اس کی وافر سپلائی شروع ہو جائے اور آدمی (INHAILER) کی طرح اسے سانس کے ذریعہ بڑی آسانی سے معدے تک پہنچا سکے۔ یوں گھریلو عورتیں باورچی خانہ کی جملہ قباحتوں سے بھی خلاصی پا لیں گی۔ شاید ایسی گیس بھی نکل آئے جو انسان کو گیس بھرے غبارے کی مانند فضا میں پرواز کرانا شروع کر دے اور یوں انسان کے مجسم پرندہ بننے کی ازلی خواہش (حالانکہ اگر وہ پرندہ ہوتا تو شکار ہونے سے بچنے اور عیش کرنے کے لیئے انسان بننے کی آرزو کرتا) کی تکمیل ہو جائے۔

پروازی گیس خواہ دستیاب ہو نہ ہو لیکن ہماری چھٹی حس کا اتنا اشارہ ضرور ہے کہ اشک آور گیس جس نے حکومتوں کے استحکام اور عوام کے استحصال میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، بلکہ گولی اور لاٹھی چارج سے بھی زیادہ مؤثر اور کارگر ثابت ہوئی ہے، کے خلاف مہذب ممالک میں منظم پیرائے میں صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہے اور اُسے غیر انسانی فعل کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ اگرچہ فی الحال دنیا کی سبھی حکومتیں اس گیس سے دستکش ہونے یا کنارہ کشی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ آئندہ صدی کے اوائل میں ہی اسے ترقی یافتہ ممالک مہلک ہتھیار اور انسان دشمن دقیانوسی گیس قرار دے کر ترک

رنے پر مجبور ہو جائیں گے اور دوسری دہائی کے اختتام تک ترقی پذیر ممالک بھی حسب روایت ان کی پیروی کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھیں گے کیونکہ اس امر کے امکانات خاصے روشن اور تابناک ہیں کہ مسکراہٹیں بکھیرنے والی موسومہ (LOUGHING) گیس ظہور پذیر ہو جائے گی جو اتنی تیر بہدف ہوگی کہ مقدار کی مناسبت سے زیر لب مسکراہٹ سے فلک شگاف قہقہوں کو لگانے کا باعث بنے گی (ہو سکتا ہے اس کی برآمدگی مزاح نگاروں پر بجلی بن کر گرے کہ اس کی موجودگی میں پھر ان کا کون پرسانِ حال ہوگا) پھر اس کا ایک اور خوش کن پہلو یہ ہے کہ شگفتہ اور قہقہہ بار گیس منہ بسورتے لوگوں اور جنگ و جدل میں مصروف رہنے والے گھرانوں کی بھی کایا پلٹ دے گی اور بڑی خوبصورتی سے برانگیختہ جذبات پر دبیز پردے ڈال دے گی۔ اور پھر خواہ جلسہ گاہ میں آئے ہوئے لوگ یا جلوس نکالنے والے حکومت کے خلاف کتنا ہی اپنے جذبات کا اظہار کریں، اس گیس کی برکت سے ٹی وی کی سکرین پر بھی ناظرین کو مجمع غیر قانونی بھی ہنستا مسکراتا نظر آئے گا جو حکومت کی ہر دلعزیزی کا منہ بولتا ثبوت ہوگا۔

اور ہاں یاد آیا یہ پیش گوئی بھی پورے وثوق اور اعتماد سے کی جا سکتی ہے کہ اس وقت اشاروں کی زبان بھی عوام و خواص میں اچھی خاصی مقبول ہو چکی ہوگی اور غالباً اسی تاثر کے تحت ٹیلیویژن نے بھرپور انداز میں اس پروگرام کا آغاز بھی کر دیا ہے۔ بلکہ اس پروگرام کے کرتا دھرتا کوئی ٹی، وی ایوارڈ کا حق دار بھی ٹھہرایا گیا ہے۔ شاید اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہو کہ ٹیلیویژن مستقبل کے حالات سے پوری طرح بلکہ دوسرے ذرائع ابلاغ سے زیادہ ہی باخبر ہے۔ ڈاکٹر صاحبان نے بھی متفقہ طور پر اپنی قیمتی رائے (معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں کی عام رائے بھی بلا قیمت نہیں ہوتی) دے دی ہے کہ بولنے سے اچھی خاصی انرجی ضائع ہو جاتی ہے (کیا پتہ کہ کل کلاں کو انرجی کا واحد ذمہ دار بھی قوت گویائی کے ذریعے انرجی کے ضائع ہونے کو ہی ٹھہرایا جائے)

اگر کہیں اشاروں کی زبان کا اتنا تسلط ہو گیا کہ لوگ اپنی اپنی بولی بولنے سے اجتناب کرنے لگے تو اس وقت نہ صرف امن عالم کا خواب دیکھا جا سکے گا بلکہ ایک مرتبہ پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرا کر پتھر کے زمانہ کی یاد تازہ کر دے گی۔

آخر میں اس وقت تک روبوٹ (مشینی انسان) اس حد تک اپنا تسلط جما چکے ہوں گے کہ عام انسانوں کی ہر شعبہ جات میں اُن کے سامنے دال نہیں گل سکے گی۔ چنانچہ وہ اپنی عافیت اسی میں سمجھیں گے کہ خلاء میں کالونیاں تعمیر کریں، تاکہ فطرت کی رعنائیوں سے لطف اندوز بھی ہوں اور اڑتے پرندوں کے پر گننے کی بجائے پکڑ کر سورج کی تپش سے بھون کر ہڑپ کر جائیں لیکن یہاں یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا اس وقت تک کوئی پرندہ سلامت رہ گیا ہوگا، کہ اسلحہ کی اندھا دُھند سپلائی کے پیشِ نظر یہ کام تو اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی پایۂ تکمیل کو پہنچنے والا ہے۔ لیکن صاحب ہمیں اتنی دُور کی کوڑی لانے کی کیا پڑی ہے کہ حکمائے نزدیک پیش از مرگ واویلا کرنا جچتا بھی تو نہیں۔ بزرگوں کا یہ قول گانٹھ باندھ لیجئے:

"مترس از بلائے کہ شب درمیاں است"

پرانے نمبر

(۱) غزل نمبر — (مئی ۱۹۵۳ء)	قیمت : ۱۰۰ روپے
(۲) افسانہ نمبر — (دسمبر ۱۹۵۵ء)	قیمت : ۱۰۰ روپے
(۳) بیاضِ غالب نمبر — (اکتوبر ۱۹۶۹ء)	قیمت : ۱۰۰ روپے

مندرجہ بالا نمبر

نایاب تھے، مگر اب ان کے نئے ایڈیشن چھپ گئے ہیں

○

اسٹاک میں یہ نمبر بھی موجود ہیں۔

(۱) خطوط نمبر (۲) ادبی معرکے نمبر (۳) انیس نمبر (۴) اقبال نمبر
(۵) عصری ادب نمبر (۶) سالنامے

محمدؐ طفیل مرحوم کے خاکوں کا مکمل سیٹ سٹاک میں موجود ہے۔

صاحب - جناب - محترم - مکرّم - معظّم - محبّی - مخدومی
آپ

ادارۂ نقوش لاہور
اُردو بازار

۱

حمد و نعت

۲

نظمیں غزلیں

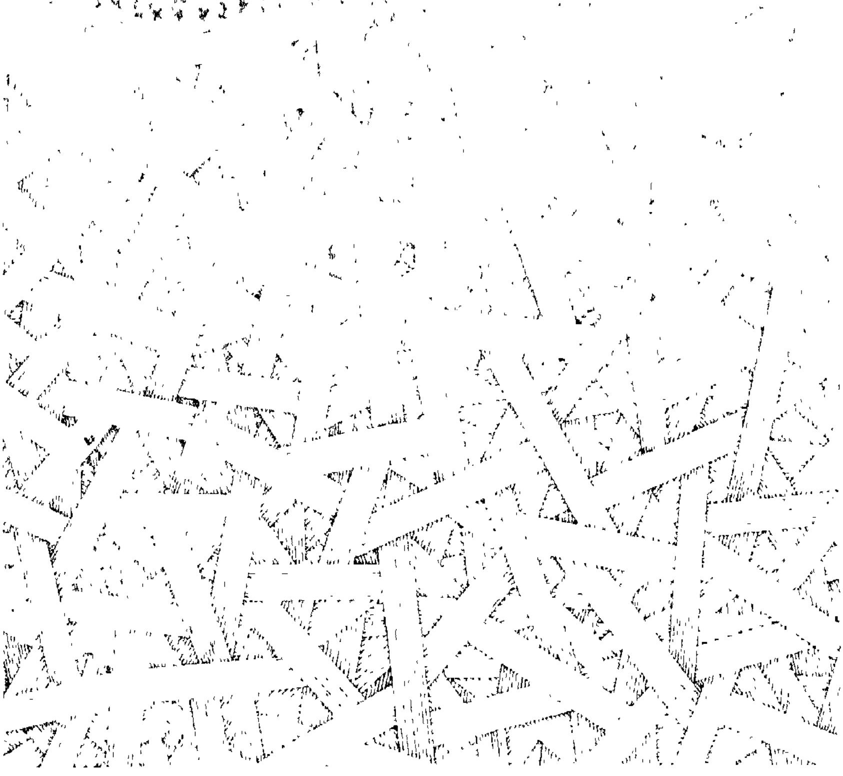

حافظ لدھیانوی

حمدِ باری تعالیٰ

پتّے پتّے میں ہے قدرت تیری   ہے لبِ گُل پہ حکایت تیری
سایۂ لطف میں ہے اک عالم   ایک عالم پہ ہے رحمت تیری
کوئی معبود نہیں تیرے سوا   سبھی کرتے ہیں عبادت تیری
سانس لیتا ہُوں کرم سے تیرے   ہے ہر اک سانس عنایت تیری
ہے ترے تابعِ فرماں عالم   ہے ہر اک شے پہ حکومت تیری
دل کو تسکین تُو ہی دیتا ہے   یہ عطا کردہ ہے راحت تیری
شعلۂ جاں ہے فروزاں تجھ سے   زندگی میں ہے حرارت تیری
تیرے انوار ہیں گلشن گلشن   غنچے غنچے میں ہے نکہت تیری
ذکر میں تیرے عجب لذّت ہے   رُوح پرور ہے اطاعت تیری
ہے زمانے میں وہ سب سے ممتاز   جس کو حاصل ہے رفاقت تیری
تُو کسی سے ہے نہ کوئی تجھ سے   سب پہ آئینہ ہے وحدت تیری
کوہساروں سے بیابانوں سے   ہے عیاں شانِ جلالت تیری
اشکِ غم بھی ہے ترا سرمایا   دل کی دھڑکن بھی ہے دولت تیری

ہے مرے فکر میں تیرا جلوا   ہے تخیّل میں لطافت تیری
مُجھ کو ہر آن نظر آتی ہے   اِک نئی عظمت و قدرت تیری
تیری تمثیل نہیں ہو سکتی   کوئی صورت نہیں صورت تیری
میرے دل میں رہیں یادیں تیری   میرے لب پہ رہے مدحت تیری
کوئی جو دے نہ سکے تیرے سوا   وہ گراں مایہ ہے نعمت تیری
وُہ ہر اک چیز سے ہے مستغنی   جس کے دل میں ہے محبّت تیری
اس کو کیا غم کہ ہُوئی ہو جس پر   ایک پل چشمِ عنایت تیری
شفقِ شام میں ہے رنگ ترا   مطلعِ صبح میں طلعت تیری
حمد گوئی کا دیا ہے منصب   ہے یہ بخشی ہوئی عظمت تیری

وجہِ تسکیں ہے ترا ذکرِ جمیل
لبِ حافظ پہ ہے مدحت تیری

○

حافظ لدھیانوی

حمدِ باری تعالیٰ

جو بھی منظر ہے وہ قدرت کا نشاں ٹھہرا ہے
حمد کا قافلۂ شوق کہاں ٹھہرا ہے

مجھ کو ہر سانس میں آئی ہے محبّت کی مہک
مظہرِ لطف و کرم گلشنِ جاں ٹھہرا ہے

بستی بستی میں سناتا ہے فسانے تیرے
تیرا پیغام رساں ابرِ رواں ٹھہرا ہے

میرے ہر لفظ میں ہوتا ہے ثنا کا آہنگ
ایسا معیار مرا حُسنِ بیاں ٹھہرا ہے

تیری یادوں سے مری خلوتِ جاں ہے روشن
وجہِ شادابیِ جاں ربطِ نہاں ٹھہرا ہے

اک تری یاد ہے جو وجہِ سکوں ٹھہری ہے
اک ترا ذکر ہے جو راحتِ جاں ٹھہرا ہے

ہر طرف تیری تجلّی نظر آئی اس کو
تیرا حافظ، ترا مدّاح جہاں ٹھہرا ہے

○

حافظ لدھیانوی

حمد باری تعالیٰ

آئینۂ نشاط فزا تیری حمد ہے
جو میری رُوح کی ہے غذا تیری حمد ہے

مُردہ دلوں کو زیست ملی تیری حمد سے
مضمر ہے جس میں رازِ بقا تیری حمد ہے

ہے تیری یاد وجہِ سکون و قرارِ جاں
میرے ہر ایک غم کی دوا تیری حمد ہے

ہر ایک شے کے لب پہ مناجات تیرے ہی
ہر اک کا کام صبح و مسا تیری حمد ہے

ہیں حمد ہی کی شکل مرے دل کی دھڑکنیں
آنسو جو خوف سے ہے گرا تیری حمد ہے

اعلان ہے اذان میں توحید کا تری
بعد از نماز حرفِ دعا تیری حمد ہے

تیرا کوئی شریک نہیں ہے جہان میں
عالم کی جو ہے راہنما تیری حمد ہے

دنیائے ہست و بود میں آنے کے ساتھ ہی
آتی ہے کان میں جو صدا تیری حمد ہے

حافظ کے شعر کا ہے جو مقصود و مدّعا
نعتِ رسولِ پاک ہے یا تیری حمد ہے

فضا ابن فیضی

حمد

میری ساری خواہش اس کی   بادل اس کے، بارش اس کی
شفق، شگوفہ، جگنو اس کے   شجر، حجر، آرائش اس کی
سبزہ، شبنم، اس کی نزہت   نالہ و سنبل، نازش اس کی
ماہ و کواکب، عشوہ اس کا   سحر، ستارہ، تابش اس کی
نقش و نگار و نجم و نگینہ   طرز، طراز، طرازش اس کی
بادل، بجلی، آتش، خرمن   آویزش، انگیزش اس کی
کنج، کہستاں، باغ، بیاباں   پاشش اور اندوزش اس کی
بادِ وزیدہ، ابرِ چکیدہ   خیزش اس کی، ریزش اس کی
صرصر، سیل، کرشمہ اس کا   زلزلے، طوفاں، رامش اس کی
رنگ، نمو، شادابی، خوشبو   ابیزش اس کی، بالش اس کی
مٹی اس کی، سونا اس کا   شاخ، ثمر، افزائش اس کی
ظاہر، باطن، دھوپ، دریچہ   ما نائی و نمائش اس کی
آنکھ، پلک، نظارہ اس کا   رُوح، بدن، گنجائش اس کی
سنگ و میزاں، ساغر و سنداں   سنجش اور سگالش اس کی
خندۂ امکاں، شعلۂ فاراں   ٹھنڈک اس کی، سوزش اس کی
جوہر شیوہ، زنگار اس کا   شیشہ شیشہ، زوائش اس کی
بے خطِ ساغر، نشہ اس کا   بے صفتِ مینا، جوشش اس کی
وہ بے ابر، ترشح اس کا   وہ بے آب، تراوش اس کی

شبنم و خور، اندیشہ اس کا   شعلہ و خس، آویزش اس کی
اس سے تپش اندوز دو عالم   آہن اس کا، آتش اس کی
پچھم، پورب، اُتّر، دکّھن   آب و ہوا سے سازش اس کی
سارے موسم، سارے تغیّر   پالائش، پیرائش اس کی
اس کی شوخی تیشہ تیشہ   ناخن ناخن، کاوش اس کی
آنکھ کا پردہ، روح کا روزن   اس کا جسم، اور پوشش اس کی
انفس" تا آفاق کشادہ   دیدش اور پژوہش اس کی
کرسی، عرش، جہت، بے جہتی   لوح و قلم، بالائش اس کی
نیستی، ہستی، عُنصر اس کا   بود و نبود، آمیزش اس کی
قدر و قضا کا نقطۂ آخر   بسکہ گریز و گزینش اس کی
عرش، امکاں، پیمانہ اس کا   ازل، ابد، پیمائش اس کی
زندگی، اس کا خندۂ رحمت   مرگِ بدن، فہمائش اس کی
ذوقِ نفس کو برنائی دے   سینہ سینہ، کاہش اس کی
خود کُوزہ گر، خود گِلِ کوزہ   چاک میں سب کے گردش اس کی
خود ہی مطرب، خود ہی بربط   "کُن فیکوں" فرمائش اس کی
خلوت، جلوت، چم خم اس کا   وحدت، کثرت، شورش اس کی
صورت، پیکر، جلوہ، اس کا   حُسن، بصیرت، بینش اس کی
کشفِ حقائق، ادراک اس کا   درسِ یقیں، آموزش اس کی
جبریل، اس کے باغ کا طوطی   نغمہ جس کا، گزارش اس کی
آیتِ رحمت "قرآں" اس کا   حرفِ بشارت، پرسش اس کی
"حُور و ملائک"، "کوثر و طوبیٰ"   اس کا غمزہ، گرائش اس کی
کون و مکاں سے برتر، پھر بھی   ارضِ روم و مراقش اس کی

سب اس کی شطرنج کے مُہرے
بازی اس کی، بازش اس کی
خطِ جلی میں اس کو لکھے
پھر بھی خفی پیدائش اس کی
جس کی آنکھ میں ہے خواب اس کا
راحتِ بستر، بالش اس کی
جانِ لطف، تغافل اس کا
شانِ عفو، نکوہش اس کی
میرے دل میں اس کی دھڑکن
درد مرا، آرائش اس کی
میرے ہونٹ، وظیفہ اس کا
میری رُوح، ستائش اس کی
میری جبیں میں سجدہ اس کا
میرے سر میں نیائش اس کی
پتوار اس کی، کشتی میری
بازو میرے، کوشش اس کی
پتھر میرا، تیشہ اس کا
جُرم مرا، آمُرزش اس کی
آنسو میرے، دامن اس کا
لغزش میری، بخشش اس کی
میرا سینہ، سفینہ اس کا
میری لوح، نگارش اس کی
ذہن مرا، اس کی خلاقی
جذبے میرے، بُرش اس کی
میری عبارت، مفہوم اس کا
میرے فقرے، بندش اس کی
میرے لفظ میں معنی اس کے
میرے قلم میں، جنبش اس کی
میرے شعر میں، اس کی حکمت
میرے فن میں، دانش اس کی
میری حمد، تعارف اس کا
میرے حرف، سفارش اس کی

اُس کے آگے سب بے قیمت
کس سے پُوچھوں؟ ارزش اس کی

◆

حفیظ تائب

مناجات

الٰہی! شاد ہُوں میں تیرے آگے ہاتھ پھیلا کر
مری اِس کیفیت کو اپنی رحمت سے پذیرا کر

دعائے سیّدِ سادات سینے میں فروزاں ہے
حسیں کر دے مری دُنیا، حسیں تر میری عقبا کر

بھٹکتی آنکھ کو مرکوز فرما صبغۃ اللہ پر
دلِ بے تاب کو خوشبوئے یٰس سے شکیبا کر

مری بھیگی ہُوئی پلکیں مخاطب ہیں تو بس تجھ سے
مری تقدیر کے تاریک غاروں میں اُجالا کر

مرے چاروں طرف ہے رقصِ وحشت روک دے اِس کو
مرے اندر جو دشمن بڑھ رہا ہے اُس کو پسپا کر

رسولِ پاکؐ کے رستے سے ہٹ کر خوار ہے اُمّت
اسے پھر سے فلاح و خیر کا ضامن خدایا کر

مری قسمت میں بھی ہو دیکھنا احیا شریعت کا
پریشاں آدمیّت پر کرم کا باب پھر وا کر

ترے محبوبؐ کی توصیف میں لب کھولتا ہُوں میں
الٰہی! غیرتِ گلشن مری سوچوں کا صحرا کر

زوال آمادہ ہیں ہر چند اعصاب و قویٰ پھر بھی
جواں رکھ میرے جذبوں کو، مرے لفظوں کو اُجلا کر

○

حفیظ تائب

نعت

لب کھلے جب نبیؐ کی مدحت میں پھول کھلنے لگے طبیعت میں
پائی ہر تلخیٔ الم سے نجات کھو کے تذکارِ شہؐ کی لذت میں
کیا طلب اور اب کروں حق سے نعتِ خیر الوریٰ ہے قسمت میں
نورِ منشور اُس نے بخشا ہے سیرتِ مصطفیٰؐ کی صورت میں
دین و دنیا کا امتزاجِ حسیں نظر آیا اُنہی کی سیرت میں
ارتقا آشنا ہوئیں قومیں آپ کی جانفزا قیادت میں
مستنیر آپ کی حیات سے ہے شان جو بھی ہے آدمیت میں
حسن اور سادگی کے سب جوہر ہُوئے یکجا رسولِؐ رحمت میں
پہلی ساری نبوتوں کے کمال جمع تھے آخری رسالت میں
دو جہاں کی سعادتیں پنہاں میرے سرکارؐ کی اطاعت میں
ایک سے ہیں تونگر و نادار محسنِ خلق کی عدالت میں
کس محبت کا درد شامل ہے اُن کے پیرایۂ ہدایت میں
چارہ سازی اُنہی کو زیبا تھی دلنوازی تھی اُن کی فطرت میں
کون ثانی مرے حضورؐ کا ہے خُلق میں، صدق میں، امانت میں
کون ہمسر شہِؐ انام کا ہے عدل و احساں میں، خیر و برکت میں
آسماں کی نظر نے کب دیکھا عابد اُن سا زمیں کی وسعت میں
آپ کی یاد نے سکوں بخشا میں گھرا جب کسی مصیبت میں
آپ کا چہرہ ماہتاب بنا میری ہر ایک شامِ عسرت میں
وہی پُرسانِ عاصیاں ہوں گے پرسشِ عرصۂ قیامت میں
فقرا ان کے ہم قدم ہوں گے جب وہ جائیں گے باغِ جنت میں
جو خزف اُن کی راہگزار کا ہے وہ گہر سے فزوں ہے قیمت میں
قریۂ رنگ اُن کا شہرِ حسیں جلوہ گر ہے جو اشکِ حسرت میں
پھیلے دُنیا میں جو دھنک بن کر سمٹ آئے جو دل کی خلوت میں

رکھ امیدِ قبول اے تائبؔ !
پیش کر عجز اُن کی خدمت میں

◆

حمایت علی شاعر

نعت

اک شخص، کائنات کا محور کہیں جسے
بندہ ہے، لیک، بندۂ اکبر کہیں جسے

جس کی زباں سے میرے خدا نے سخن کیا
اُمّی تھا ایسا وہ کہ سخنور کہیں جسے

وہ جس نے مُشتِ خاک کو انساں بنادیا
وہ نا خدا، خدائی کا مظہر کہیں جسے

تخلیقِ کائنات کا وہ نقشِ اوّلیں
روحِ ازل کا آخری پیکر کہیں جسے

اک لفظ، اک جہانِ معانی کا آئینہ
اک عکس، اک کتابِ مصوّر کہیں جسے

اک آدمی کہ خاک نشیں اور فلک مقام
اک روشنی کہ ذاتِ پیمبر کہیں جسے

فضا ابن فیضی

اُمّی حرف آشنا

سرور و صدر انبیا، کون! محمدؐ کریم   خواجۂ بزمِ دوسرا، کون! محمدؐ کریم
عالم علم کبریا، کاملِ فنِ ارتقا   اُمّیِ حرف آشنا، کون! محمدؐ کریم
جس کی جبیں کی ہر لکیر، لوحِ تتمۂ کتاب   حاصلِ حرف و ماجرا، کون! محمدؐ کریم
آدم و خُلد کی مراد، دستِ کلیم کا عصا   رُوحِ خلیلؑ کی دُعا، کون! محمدؐ کریم
جس نے بہ پیشِ جبرئیل، زانوِ درس تہہ کیا   فاضلِ مکتبِ حرا، کون! محمدؐ کریم
خوشۂ خرمنِ ازل، خندۂ چشمِ مُطّلب   سنبلِ باغِ آمنہ، کون! محمدؐ کریم
ناقۂ جادۂ مبیں، محملِ اُسوۂ حسیں   لیلیِ کعبۂ صفا، کون! محمدؐ کریم
ارضِ حرم کی روشنی، کُنجِ حرا کی چاندنی   شمعِ حریمِ اولیا، کون! محمدؐ کریم
جس کے نفس سے مشک مشک دانشِ اولیں کا پھول   دامنِ بادِ جانفزا، کون! محمدؐ کریم
عارضِ عدل کی چمک، گیسوئے صدق کی مہک   ناخنِ قدس کی حنا، کون! محمدؐ کریم
صبحِ یقیں کی خاوری، شامِ جنوں کی دلبری   حق نگر و حق آشنا، کون! محمدؐ کریم
آئنۂ جمالِ حور، حُسنِ کمالِ عرش و طور   چہرۂ رحمتِ خدا، کون! محمدؐ کریم
جس سے عیاں، شفقِ سحر، جلوۂ سرِّ لا الٰہ   شیشۂ زانوِ حرا، کون! محمدؐ کریم
حاملِ وحیِ کردگار، رمز نگار و ریزہ کار   نکتہ فروش و نکتہ زا، کون! محمدؐ کریم

مصرعِ کاینات کا ، عیبِ شکستِ ناروا　　حسن میں جس نے ڈھل گیا، کون ! محمدؐ کریم
زینتِ اعتبارِ ذات ، زیورِ حُسنِ کائنات　　نقش و نگینہ و نوا ، کون ! محمدؐ کریم
ہائے، وہ جنبشِ حسیں ، دستِ قمر شگاف کی　　نقطۂ اوجِ معجزہ ، کون ! محمدؐ کریم
حل ہُوا، جس کے لطف سے مسئلۂ زنانِ دہر　　حجلہ فروز ماریہ ، کون ! محمدؐ کریم
جس کی حدیث، جس کا فعل، جس کا شعورِ حق نما　　دونوں جہاں کا آئنا، کون ! محمدؐ کریم

گو، کہ حیات وقت کے، جبر سے دُھول دُھول ہُوں
میں بھی، اسی رسولؐ کے باغ کا ایک پھُول ہُوں

◆

تحسین فراقی

نعت

آنکھ کا روزن بند کریں اور دل کا دریچہ باز کریں
یادِ نبیؐ میں آؤ ہم بھی نعتِ نبیؐ آغاز کریں

سب سے اعلیٰ سب سے بالا ان کے نور کا جالا ہے
اس اجلالِ نور سے پیدا ہم بھی سوز و ساز کریں

پلکوں پر اشکوں کو سجا کر چھیڑیں راگ جدائی کا
دل کی لحظہ لحظہ دھڑکن کو ان کا ہمراز کریں

پُورے شہرِ وجود میں گونجے نامِ محمد صلِّ علیٰ
رُوح کے گنبد میں اک لحہ پیدا یہ آواز کریں

ہم بھی آپؐ کی اُمت میں ہیں ہم بھی آپ سے بیعت ہیں
اس خوش اقبالی پر اُتنا کم ہے جتنا ناز کریں

آنکھیں سبز ہرے گنبد کی روز تلاوت کرتی ہیں
ہم کو اذنِ حضوری دے کر حضرتؐ اور اعزاز کریں

آپؐ کے نقشِ کفِ پا سے جو بستی مایہ دار ہُوئی
ہم بھی اس میں سر کے بل چل کر سر کو افراز کریں

فہرستِ خدام میں بے شک سب سے نچلا درجہ دیں
لیکن ہم کو پاس بلا کر مستقلاً ممتاز کریں

○

قتیل شفائی

○

اگر چاہو تم اپنی حسرتوں کو تازہ دم رکھنا
تمنّاؤں کی ہر وادی میں آہستہ قدم رکھنا
حسینوں کی وہ محفل ہو کہ دربارِ شہنشاہی
کہیں اچھّا نہیں ہوتا سرِ تسلیم خم رکھنا
دلوں میں پیار ہے اپنا، دلوں میں اُس کا سرمایا
عدو کے سامنے یا رب! تُو ہی میرا بھرم رکھنا
اُسے میں ڈھانپ لینا چاہتا ہوں اپنی پلکوں میں
الٰہی! اُس کے آنے تک مری آنکھوں میں دم رکھنا
یہی کچھ درمیانِ دین و دُنیا ہم نے دیکھا ہے
لگانا لو خدا سے اور پہلو میں صنم رکھنا
قتیلؔ اب بھی مسیحائی کا دعویٰ ہے اُنھیں لیکن
کرم کی آس اپنے قاتلوں سے پھر بھی کم رکھنا

○

رہبری کے نشاں سارے کے سارے برمحل رکھنا
جہاں چھنکی ہوں زنجیریں وہیں زلفوں کے بل رکھنا
تمہیں بے کیف کرنے کو نہ جانے کب بدل جائیں
اُن آنکھوں کا تُم اپنے پاس نعم البدل رکھنا
رہا ہے ربط میری شاعری کا اس کے ہونٹوں سے
مکر جائے تو اس کے سامنے میری غزل رکھنا
کبھی اپنی جفا پر وہ پشیماں ہو بھی سکتا ہے
مگر تم فیصلہ ترکِ محبّت کا اٹل رکھنا
ہزاروں آرزوؤں کو بسا بیٹھے ہو کیوں دل میں
نہیں آسان گھر میں اتنے مہماں آج بھی رکھنا
ہواؤں سے بھی پڑ جاتے ہیں اکثر دائرے جس میں
قتیلؔ اُس جھیل میں ہولے سے یادوں کے کنول رکھنا

○

جگن ناتھ آزاد

○

نہ جانے ہم فقیروں کو یہ کس نے بد دُعا دی ہے
کہ ہم نے زندگی سڑکوں پہ چل چل کر گنوا دی ہے
فروزاں ہے ازل سے ایک شمعِ آرزو دل میں
خطا کیا ہے وُہ، تُو نے جس خطا کی یہ سزا دی ہے
زمانہ تو نہ تھا یہ شعر کہنے کا، مگر پھر بھی
اِسی پردے میں ہم نے داستانِ دل سُنا دی ہے
اُتر بھی جائے یہ دریا تو کیا حاصل مجھے، اِس نے
مِرے کھلیان پر جب ریت تہَ در تہَ بچھا دی ہے
ہمارے دل کی چنگاری کے تیور ہی کچھ ایسے تھے
ادھر لمحاتِ فُرقت نے بھی کچھ اِس کو ہوا دی ہے
تفکر کی کوئی گُتھی سُلجھنے ہی نہیں پاتی
یہ فطرت نے مجھے کس جُرم کی آخر سزا دی ہے
اگر دو رُخ ہیں اِک تصویر کے خیر اور شر دونوں
تو پھر مذہب نے کیوں دیوار دونوں میں اُٹھا دی ہے
خوشی کا رنگ گہرا ہو گیا جس روز سے ہم نے
خوشی کی رُوح میں اک درد کی دُنیا بسا دی ہے
سنائی جب نہ دے پُوری طرح پھر اس کو کیا سمجھوں
نہ جانے کس نے اتنی دُور سے مجھ کو صدا دی ہے

○

○

دیدۂ بے نیازِ دوست! یُوں مری زندگی نہ دیکھ
دیکھ شرابِ ناب بھی، شیشہ و جام ہی نہ دیکھ

تُجھ کو ہے ذوقِ دید اگر، پردۂ ظاہری نہ دیکھ
شعر میں ہے جو کرب دیکھ رُخ پہ ہے جو ہنسی نہ دیکھ

جسم کی تشنگی کا درد، جسم کی تشنگی سے پُوچھ
نطقِ جمیل پر نہ جا، شوق کی تازگی نہ دیکھ

کم نگہی تری مجھے شکوہ سرا نہ کر سکی
تجھ سے گِلے کا کیا سوال تو مجھے آج بھی نہ دیکھ

○

جگن ناتھ آزاد

○

زندگی میں ہر قدم پر مات کھاتا رہ گیا
شوق کا جذبہ کہ حالِ دل سُناتا رہ گیا

شعر میں نعرے لگا کر تُو نے بازی جیت لی
اور مَیں لہجے کی نرمی آزماتا رہ گیا

دُھوپ میں چلنے کا میں عادی تھا چلتا ہی رہا
سبز پیڑوں کا گھنا سایہ بلاتا رہ گیا

حاکموں کے تم قصیدے پڑھ کے شاعر بن گئے
اپنا نغمہ اپنے دل کو میں سناتا رہ گیا

سب سے ارفع بات بھی زورِ بیاں جس بزم میں
میں وہاں حُسنِ بیاں کے ناز اٹھاتا رہ گیا

رزم میں بھی عقل نے ہر وار کو دل پر لیا
بزم میں بھی عشق سر پر زخم کھاتا رہ گیا

جب کہ اے آزاد! ساحل پر تھے ہنگامے بپا
میں کہیں گہرائی میں طوفاں اٹھاتا رہ گیا

○

○

اے دلِ ناداں ، نہ کر تو نکتہ آرائی بہت
سامنے اہلِ نظر کے ہیں تماشائی بہ

خونِ دل قطرہ بہ قطرہ رائیگاں بہت گیا
سچے جھُوٹے آنسوؤں نے آبرو پائی بہ

تیری بیگانہ روی سے دل بڑی اُلجھن میں ہے
میں یہ سمجھا تھا کہ ہے تجھ سے شناسائی بہ

آزما اِک بار اب تُو ہم فقیروں کا بھی ظرف
طُور پر تو ہو چکی ہے جلوہ فرمائی بہ

ہر قدم پر تھی سہارا میری نادانی مجھے
کر گئی برباد داناؤں کو دانائی بہت

اب نگاہوں میں ہے انجامِ گُل و انجامِ خار
سیکھ لی دل نے جو طرزِ ناشکیبائی بہ

فصلِ گُل آتے ہی گویا لائے آتش دیدہ تھی
اہلِ گلشن نے مجھے زنجیر پہنائی بہ

رومی و اقبال خود ہوتے ہیں مجھ سے ہم کلام
کیوں نہ ہو محبوب مجھ کو میری تنہائی بہ

یُوں تو اے آزاد! میری شاعری میں کچھ نہ تھا
اہلِ دل، اہلِ نظر نے کی پذیرائی بہت

○

مظہر امام

○

بے آب آئینے تھے، شجر بے لباس تھے
دنیا بہت اُداس تھی، جب ہم اداس تھے

سوئے ہوؤں کے خواب دریدہ لباس تھے
جاگے ہوؤں کے سچ بھی فریبِ قیاس تھے

دنیا تھی آنسوؤں میں نہائی ہوئی کتاب
بھیگے ہُوئے ورق کا ہم اک اقتباس تھے

اک خوش ادا کے قُرب سے روشن تھیں لذّتیں
لیکن وُہ وسوسے جو مرے آس پاس تھے!

یہ راہِ خار و سنگ مرا انتخاب تھی
جو مرحلے بھی آئے، وہ حسبِ قیاس تھے

○

○

جلی کتاب کا اک اقتباس لگتا ہے
وہ میرا دوست، مرا غم شناس لگتا ہے

گلاب بن میں گلابِ سفید کی صورت
وہ عام سا ہے، مگر دل کو خاص لگتا ہے

ہوا میں خوشبوئے موسم کہیں سوا تو نہ
وہ پاس ہے، یہ بعید از قیاس لگتا ہے

سپردگی کا نشہ بھی عجیب نشّہ ہے
وہ سر سے پاؤں تلک التماس لگتا ہے

ہے اس کے ہاتھ میں سوکھے گلوں کا گلدست
وہ شخص میرا ستارہ شناس لگتا ہے

ذرا میں اپنی نگاہیں تہ نقاب کرد
مرا زمانہ مجھے بے لباس لگتا ہے

○

مظہر امام

○

ہاتھ اُٹھتے ہی کٹا، چلیے یہاں سے چلیے
کیا دعا، کیسی دعا، چلیے یہاں سے چلیے

باز ہے کوئی دریچہ، نہ کوئی در ہے کھُلا
کوئی جلوہ نہ ادا، چلیے یہاں سے چلیے

اُس کے گھر پر بھی وہی شہرِ خموشاں کا سماں
کوئی آہٹ نہ صدا، چلیے یہاں سے چلیے

خواب، خوشبوئے طلب، رنگِ ہوس، نازِ وفا
سارا سرمایہ لٹا، چلیے یہاں سے چلیے

کوئی سایہ نہ شجر، کوئی تمنّا نہ امنگ
اڑ گئی سر سے ردا، چلیے یہاں سے چلیے

اب تو دنیا ہے نہ دیں، کوئی عقیدہ نہ یقیں
کوئی اچھا نہ بُرا، چلیے یہاں سے چلیے

اس چکا چوند میں سکّوں کی پرکھ بے حاصل
کوئی کھوٹا نہ کھرا، چلیے یہاں سے چلیے

خود کو کس طرح بچائیں کہ بہت دیر سے ہے
تاک میں خلقِ خدا، چلیے یہاں سے چلیے

دوستوں ہی کے قبیلے میں یہ کہرام نہیں
دشمنوں نے بھی کہا: چلیے یہاں سے چلیے

○

اُمید فاضلی

◆

آسمانوں سے فرشتے جو اتارے جائیں
سچ کا اظہار کریں وہ بھی تو مارے جائیں
جو بھی رُت آتی ہے ہم سے ہی لہو مانگتی ہے
ہم کہاں تک تری دنیا کو سنوارے جائیں
دل کشادہ نہیں رکھتے ہیں مِرے شہر کے لوگ
ان کے دُکھ بھی مِرے سینے میں اتارے جائیں
میرا ذمہ نہ اگر جل اُٹھیں راہوں میں چراغ
شرط یہ ہے کہ اُسے آپ پکارے جائیں
جس طرف دیکھیے سیلاب بہ کف ہے دُنیا
کشتیاں لے کے کدھر آج کنارے جائیں
یادِ جاناں میں بڑا نشہ ہے لیکن کب تک
ایک ہی نشہ رگ و پے میں اتارے جائیں
آنکھ اب خواب میں ڈھلنے کی سکت کھو بیٹھی
وہ جہاں ہے وہیں ساون کے نظارے جائیں
اس کو ہم قیدِ جنوں سمجھیں کہ آزادیِ فکر
ہم جہاں جا نہ سکیں، خواب ہمارے جائیں
سچ کے مقتل سے گزرنا نہیں منظور تو لوگ
زندگی موت کے مانند گزارے جائیں
جانے کس حال کو پہنچا دیں اسے اہلِ ہوس
زلفِ گیتی کو اگر ہم نہ سنوارے جائیں
عشق پھر عشق ہے یہ رائگاں جاتا ہی نہیں
جیتنا ہے اسے اُمید تو ہارے جائیں

◆

اُمید فاضلی

○

نازکر ناز کہ یہ ناز جدا ہے سب سے
میرا لہجہ مِری آواز جدا ہے سب سے

جُز محبّت کسے معلوم کہ وہ چشمِ حیا
بات تو کرتی ہے انداز جدا ہے سب سے

جس کو بھی مار دیا زندۂ جاوید کیا
حرفِ حق تیرا یہ اعجاز جدا ہے سب سے

مقتل و دار و رسن سب کے مقدر میں کہاں
تیرے فن کار کا اعزاز جدا ہے سب سے

دیکھنا کون ہے، کیا اس کو نہیں جان عزیز
سرِ دربار، اِک آواز جدا ہے سب سے

ٹوٹ جاتا ہے تو سُر اور بھی لو دیتے ہیں
دل جسے کہتے ہیں وہ ساز جدا ہے سب سے

سوچ کر دام بچھانا ذرا اے موجِ ہوا
میرے انکار کی پرواز جدا ہے سب سے

نشۂ دہر و قیامت کا تو کیا ذکر اُمید
وہ مرا سروِ سرافراز جدا ہے کب سے

○

امید فاضلی

”دانائے رازِ عشق وخودی وخود آگہی“

”اقبال“ وہ مفکرِ اسلام و فلسفی   دانائے رازِ عشق وخودی وخود آگہی
اس کی نوائے درد سے پائی جہان میں   شعر و سخن نے آبرو، ملّت نے روشنی

لہجے نے اُس کے خفتہ دلوں کو جگا دیا   ہر راہرو کو جلوۂ منزل دکھا دیا
جو خواب اس نے دیکھا تھا تعبیر کے لیے   اس کو خواب کو شعور کا حاصل بنا دیا

اک دل رکھا ہُوا تھا وہ اسلام کے لیے   سانسیں تھیں وقف دین کے پیغام کے لیے
اس حُرّیت مزاج کے قلب و دماغ کو   خالق نے منتخب کیا الہام کے لیے

ہر گام وُہ مُعلّمِ حُبِّ رسول تھا   یہ مُلک جس کی خوشبو ہے وُہ ایسا پھُول تھا
وہ تاج دارِ شعر، تفکّر کا وُہ امام   دنیائے حرف میں جو یقیں کا نزول تھا

تخئیلِ ارضِ پاک کا سِرِّ نہاں تھا وُہ   اِک آنے والے عہد کا رُوح و رواں تھا وُہ

لب بستگی و جبر و غلامی کی رات میں   سہمے ہُوئے خموش دلوں کی زباں تھا وُہ

وہ حق شناس خاتمِ ملّت کا وُہ نگیں   حُسنِ خلوص و عدل و مساوات کا امیں
درویشی و قلندری و شاعری کا طور   وُہ برقِ عقل و عشق سرِ مطلعِ یقیں

وُہ میرؔ کے دھڑکتے ہُوئے دل کی آبرو   ایماں کا دل، نگارِ صداقت کی آرزو
جس کے سخن سے بڑھ گیا غالبؔ کا اعتبار   داغِ غزل سرا کو کیا جس نے سُرخرو

جذبے جو بے اماں تھے اماں ان کو دے گیا   جو لفظ بے زباں تھے زباں ان کو دے گیا
بے منزلی سے سر بہ گریباں تھے جو خیال   اک منزلِ حسیں کا نشاں ان کو دے گیا

رفعت سلطان

◆

زندگانی میں ہیں آلام بہت
کاش ملتا کہیں آرام بہت
آج بے ساختہ اِک یاد آئی
آج رویا ہُوں سرِ شام بہت
ہے مجھے فخر کہ میرے دم سے
دولتِ درد ہوئی عام بہت
نازنیں، پردہ نشیں، سب سے حَسیں
ایک تُو اور ترے نام بہت
رُوح کا کرب، خلشِ دل کی جلن
مل گئے ہیں مجھے انعام بہت
زلف، رخسار، بہاراں، خوشبُو
حُسن کے اور بھی ہیں نام بہت
خامشی، چاند، ستارے، آنسو
دل کو پہنچاتے ہیں آرام بہت
لفظ مل جائیں تو کچھ عرض کروں
آرزُوئیں تو ہیں بے نام بہت
جا کے انگلینڈ یہ معلوم ہُوا
ہے مِرے دیس میں آرام بہت
جذبۂ دل کی بدولت رفعت
آئے ہیں حُسن کے پیغام بہت

◆

◆

دیکھ کر مجھ کو پریشان بہت
آپ بن جاتے ہیں انجان بہت
صاحبِ درد مگر کوئی نہیں
یُوں تو دنیا میں ہیں انسان بہت
لب کُشائی نہیں ممکن، ورنہ
دل میں بیتاب ہیں ارمان بہت
بے رُخی، وعدہ خلافی، نفرت
آپ کے مُجھ پہ ہیں احسان بہت
شاد و آباد حَسیں دُنیا میں
اِک مِرا دل کہ ہے ویران بہت
محفلِ حُسن، اشارے، غمزے
میرے مرنے کے ہیں سامان بہت
مُجھ کو بھی ناز ہے اپنے فن پر
آپ کے بھی ہیں ثنا خوان بہت
امنِ عالم ہے ضروری، ورنہ
شہر ہو جائیں گے ویران بہت
زندہ رہنے کا ہمیں حق ہے مگر
زندہ رہنا نہیں آسان بہت
وہ نہیں چاہتے رفعتؔ، ورنہ
دِلنوازی کے ہیں عنوان بہت

◆

صدیق کلیم

با معنیٰ

وُہ سب مُنہ پر لیپ لگائے بیٹھے ہیں
دیکھو تو کتنی گہری سوچ ہے ان کی
"امن اور انصاف" ہے نعرہ ان کا
تبدیلی کے خواہاں ؟
تبدیلی سے لرزاں ؟

○

میرے احباب سے پوچھو
اِس چمکیلے بدلتے منظر میں
دُور سے دیکھو گرگٹ کتنے رنگ بدلتا ہے !!
اُس کی بدلتی رنگت میں
کس رنگت پر ہم ناز کریں ؟

○

اُن کے پیارے پیارے لہجے میں
ہلکے بوجھل نغمے
گمبھیر سُروں میں بجتے ہیں
ان سب دھاروں میں اظہار کی رَو ہے
مخفی ہے !!

○

اُن کی باتیں میٹھی میٹھی ہیں
اُن کو کہنے دو جو کہتے ہیں
اُن کی لَے پر سر دُھنتے جاؤ
اُن کی بات کی تہ میں جانا کیا ہے ؟
با معنیٰ میں جانو
معنیٰ کیا ہے ؟

○

صدیق کلیم

درد کی روشنی

شام کے دُکھ بھرے دُھندلکوں میں
راحتوں کے چراغ جلتے ہیں
سرخوشی ہو کہ ہو دل آزاری
روشنی کے ایاغ جلتے ہیں

○

روح کے غم فزا اندھیروں میں
آنسوؤں کی لڑی سے بہتی ہے
رات کے نرم گیں بسیروں میں
فاختہ ہے سسکتی رہتی ہے

○

کتنے خوش ہیں گلاب ہنستے ہیں
بلبلوں کی طلسم آرائی
پتّیاں ہیں بکھرتی جاتی ہیں
ہر طرف جلوہ گر ہے رعنائی

○

ملنے والے ملاپ کرتے ہیں
وصل کی بے خودی میں جنّت ہے
ہر گھڑی خود جدائی بنتی ہے
زیست اک آتشیں حقیقت ہے

○

دل ہے کرب و الم کی دُنیا ہے
مسکراہٹ لبوں پہ طاری ہے
درد کی روشنی میں راحت ہے
غم فزائی ہے غم گساری ہے

○

شہزاد احمد

○

مرے ہمراہ منزل بھی رواں ہے — مسافر مَیں ہُوں یا سارا جہاں ہے
حقیقت تک رسائی ہی کہاں ہے — یقیں جس کو سمجھتے ہو گماں ہے
وہاں پہنچے جہاں جانا نہیں تھا — سفر جتنا کیا سب رائیگاں ہے
وہاں مَیں ڈھونڈتا ہُوں جاودانی — جہاں ہر چیز بے نام و نشاں ہے
بدلتا ہے وہ دن بھر میں کئی رُوپ — فلک شاید چراغوں کا دھواں ہے
عجب آسیب ہے یہ خانۂ دل — مکیں ہوتے ہُوئے خالی مکاں ہے
دہکتا کوئلہ ہے ہر حرفِ مطلب — مگر یہ کوئلہ میری زباں ہے
بچھڑنے کی گھڑی بھی آن پہنچی — مگر اب تک غمِ سُود و زیاں ہے
مرے دل میں چمکتے ہیں ستارے — مرے اندر بھی شاید آسماں ہے
پہنچنا ہے مجھے اپنے خدا تک — مگر ساری خدائی درمیاں ہے
یہ کس کو چُھو لیا شہزاد میں نے
سکت دل میں نہ اب ہاتھوں میں جاں ہے

○

شہزاد احمد

○

اجاڑ ہونے لگیں بستیاں چلا جائے
مگر یہ سوچ رہا ہوں کہاں چلا جائے
سڑک کے دونوں طرف بے شمار منظر ہیں
رکوں تو کیسے رکوں کارواں چلا جائے
نظر اٹھا کے بھی دیکھا نہ تُو نے میری طرف
ترے بھی شہر سے اے مہرباں چلا جائے
بہت سے لوگ مجھے دے گئے بہت سے دکھ
جہاں پہ کوئی نہ ہو اب وہاں چلا جائے
نئے سفر کا ارادہ بھی روز کرتا ہوں
جو کر چکوں وہ سفر رائیگاں چلا جائے
دلِ ستم زدہ کا اب تو فیصلہ ہے یہی
اندھیری رات ہے، آج اس کے ہاں چلا جائے
تمام لوگ وہاں گفتگو میں ہیں مصروف
اس انجمن میں کوئی بے زباں چلا جائے
جو ڈوبنا ہے تو پھر ڈوبنے سے ڈرنا کیا
سمندروں کے اب درمیاں چلا جائے
زمانہ نیند کے عالم میں ہے سنے نہ سنے
کوئی سناتا ہوا داستاں چلا جائے
بس ایک تیری تمنا ہمارے دل میں رہے
ہمارے ہاتھ سے سارا جہاں چلا جائے
نہ جانے کون سے سُورج کی زد میں آ جائیں
ہمارے سر سے اگر آسماں چلا جائے
مجھے خبر ہے شکایت ہے کشتیوں کو بہت
ہوا نہ ہو تو کہاں بادباں چلا جائے
یہ کیا کہ ایک ہی انجمن میں روز و شب گزریں
یقین آئے نہ آئے گماں چلا جائے
مجھے یقیں ہے محبت اسی کو کہتے ہیں
کہ زخم تازہ رہیں اور نشاں چلا جائے
تمام رات برستی ہے بادلوں کی طرح
وہ آنکھ جس کی رگوں میں دھواں چلا جائے
اندھیری رات سہی راستہ تو روشن ہے
چمک رہی ہیں ابھی بجلیاں چلا جائے
تماشا ہونا تھا جو بھی وہ ہو چکا شہزاد
بس اب تو ڈوب چکیں کشتیاں چلا جائے

○

شہزاد احمد

○

شہر کا شہر اگر آئے بھی سمجھانے کو   اس سے کیا فرق پڑے گا ترے دیوانے کو
جس قدر وہم ہیں سب اس کے عطا کردہ ہیں   لیے پھرتا ہُوں کسی اور کے بُت خانے کو
یہ ہُنر وُہ ہے جو دل سے کبھی سیکھا نہ گیا   تُو نے تو جوڑ لیا توڑ کے پیمانے کو
کیا کوئی کھیل ہے بے نام و نشاں ہو جانا   ویسے تو شمع بھی تیار ہے جل جانے کو
وہ عجب شخص تھا کل جس سے ملاقات ہُوئی   میں ملا ہُوں کسی جانے ہوئے انجانے کو
آج کے دُکھ بھی کسی سے نہیں جھیلے جاتے   یاد مت کر کسی بھُولے ہوئے افسانے کو
ایک لمحہ بھی تو بیکار نہیں کٹ سکتا   ایک گُتّھی جو ملی ہے مجھے سُلجھانے کو
دُور تک رات کی آنکھوں میں کہیں نیند نہیں   آتنا سنّاٹا ہے آئے کوئی تڑپانے کو
زندگی بھر میں کوئی شے تو مکمل کر لیں   آؤ لبریز کریں صبر کے پیمانے کو
یہ الگ بات کہ اک بوند مقدر میں نہ تھی   سر پہ سو بار گھٹا چھائی رہی چھلکانے کو

شام ہونے کو ہے جلنے کو ہے شمعِ محفل
سانس لینے کی بھی فرصت نہیں پروانے کو

○

راسخ عرفانی

○

وہ گرد باد تھا کوئی، غبارِ جادہ تھا
وفورِ فکر سے رہبر بھی سر نہادہ تھا
سفر بلند پہاڑوں کا رزق کی خاطر
حجر حجر تری راہ میں ستادہ تھا
مرا قدم تھا جو پہلے پڑا تھا منزل پر
شتر سوار تھے ساتھی مَیں پا پیادہ تھا
ہجومِ زر میں وہ پہچانتے مجھے کیسے
مری بساط دریدہ سا اک لبادہ تھا
مکیں تھے تنگ نظر ایک ساتھ رہ نہ سکے
مکان ورثے کا ورنہ بڑا کشادہ تھا
جو مال چھین کے جھوٹی قسم پہ چھوڑ گیا
وہ راہزن بھی طبیعت کا کتنا سادہ تھا
مَیں اور کیا درِ جاناں سے مانگتا راسخ!
جو مل گیا تھا مجھے وُہ بھی بہت زیادہ تھا

○

○

زندگی کے پہاڑ سر کرنا
جس طرح بھی ہو یہ سفر کرنا
کتنا مشکل ہے مرحلہ یارو
جاگ کر شام سے سحر کرنا
یہ جنوں ہے کہ انتظارِ دوست؟
دن کو روشن چراغِ در کرنا
رکھ رکھاؤ میں کوئی حرج نہیں
پر، بھروسا نہ غیر پر کرنا
کہساروں کے اشک پھوٹ پڑیں
نقش پتھر پہ بھی ہنر کرنا
میرے خُوں پر نہ کوئی حرف آئے
مجھ کو چاہے وطن بدر کرنا
جل کے خود عُود کی طرح راسخ!
دشمنوں کے دلوں میں گھر کرنا

○

جمیل ملک

سلطنت

زمانے کو ایسی ہوا لگ گئی ہے
کہ وہ دوست بھی جن سے برسوں کی یاری ہے
جن کی محبت مجھے جاں سے پیاری ہے
جب بھی مرے شہر آتے ہیں
اُن سے ملاقات ہوتی ہے لیکن بڑے ہوٹلوں میں
کہ تپتے ہوئے موسموں میں
وہاں نرم کُولر کی ٹھنڈی ہوا ہے
کڑکتی ہوئی سردیوں میں
وہاں تیز ہیٹر کی گرمی بہت ہے
مگر میرے کچھ یار دلدار ایسے بھی ہیں
جو بدلتے دلوں کے اِس آشوب میں بھی
مرے شہر میں جب بھی خوشبو کے جھونکے کی مانند اُتریں
مرے دل پہ دستک سی ہوتی ہے جیسے
مرے گھر کا دروازہ برسوں سے اُن کے لیے ہی کُھلا ہے
کوئی ’بھائی‘ کہہ کر بلاتا ہے مجھ کو
کوئی ’میرا عاشق‘ ’مری جان‘ کہہ کر مناتا ہے مجھ کو
مجھے ایسا لگتا ہے

اِن دوستوں کے دلوں میں وُہ گرمی ہے
جو میرے یخ بستہ گھر کو
محبّت کی حدّت سے دہکا رہی ہے
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے
اِن کی نگاہوں میں ایسی خُنک روشنی ہے
جو چاہت کی شدّت کو، گھر کی مسرت
مسرت کو پاکیزہ فرحت میں تبدیل کرتی چلی جا رہی ہے
کہ گھر ہی تو وہ استعارہ ہے جس میں
بہاروں کی خوشبو ہے
یاروں کا جادُو ہے
اپنوں کی چاہت ہے
غیروں کی قدغن نہیں ہے
جہاں حکمرانی ہے دل کی
جہاں ہر طرف رنگ بکھرے ہوئے ہیں
کہ گھر سے بڑی سلطنت اور کوئی نہیں
اور دل سے بڑا کوئی بھی فن نہیں ہے

◆

جمیل ملک

ضمیر کی موت

یہاں جو رہتا تھا ایک بابا
تھے سادھوؤں جیسے بال اُس کے
گھنی گھنی سی بھنّویں تھیں اُس کی
تھا اُس کے چہرے پہ اک تقدس
بڑا عجب تھا خمیر اُس کا
وہ نسل در نسل سب کے اندر
ہزار صدیوں سے جی رہا تھا

ہوا زمانے کی ایسی بدلی
سبھی ہوا و ہوس کے چکّر میں ایسے اُلجھے
کہ اُس کو دل سے نکال بیٹھے
کچھ اِس طرح بھول بھال بیٹھے
کہ جیسے اس کے کروڑوں بیٹوں نے
اُس کی ویران قبر پہ
جا کے فاتحہ بھی نہیں پڑھی ہے
قدم قدم کی غلط روی پہ
وہ سب کو رستہ دکھانے والا

حصولِ زر کی تمازتوں سے
ہزار نسلوں کو اپنے برگد کی
شاخ در شاخ چھتریوں میں پناہ دے کر بچانے والا
خود اپنے بیٹوں کی چیرہ دستی سے مر گیا ہے
اور اُس کی ٹھنڈی، حسین شاخیں بھی کٹ گئیں،
بے شمار حصّوں میں بٹ گئی ہیں

کبھی کبھی مجھ کو یاد آئے تو سوچتا ہُوں
بڑا عجب تھا خمیر اُس کا
کہ مر کے بھی اُس کی رُوح جیسے
یہیں کہیں اُس کی لاش میں ہے
کسے خبر ہے کہ آج بھی
زندگی اُسی کی تلاش میں ہے
—— سُنا ہے مَیں نے
نئے سفر کے مسافروں سے
خطا نہ جائے گا تیر اُس کا
کہ نام بھی تھا ضمیر اُس کا

○

جمیل ملک

○

تو مری ساری تمناؤں کا حاصل ٹھہرے
وہیں منزل نظر آ جائے جہاں دل ٹھہرے
تیرے ہونے سے ہے ہر عقدۂ مشکل آساں
تُو نہ ہو پاس تو آسان بھی مشکل ٹھہرے
تُو وہ جادو ہے جو سر چڑھ کے ہر سُو بولے
کون اب تیرے سوا رونقِ محفل ٹھہرے!
تم ہی بتلاؤ بھلا دل سے جُدا ہو کیسے!
وہ جو اک شخص مرے خون میں شامل ٹھہرے!
موج جب دل سے اُٹھے دل ہی سمندر بن جائے
موج جب دل سے پلٹ جائے تو ساحل ٹھہرے
میں کسی اور کو اِلزام بھی دیتا کیسے!
مرا معیارِ نظر ہی مرا قاتل ٹھہرے
کوہِ آتش کی طرح شعلہ فشاں تیرا وجود
کس میں ہمت ہے کہ اب تیرے مقابل ٹھہرے!
جس کو تکمیل کا سودا ہو، رہے آبلہ پا
جس کے ماتھے پہ ہو محراب، وہ کامل ٹھہرے
فن میں ہوں نُور کے سوتے نہ کبھی خشک جمیلؔ
کوئی خورشید چلے یا مہِ کامل ٹھہرے

○

○

تیری آنکھوں میں گھلاوٹ ہے شرابوں جیسی
اور مری پیاس ہے بے نام سرابوں جیسی
میں بھی سرگشتہ و بیتاب ہوں سیماب صفت
تیری فطرت بھی ہے آوارہ سحابوں جیسی
جتنا مَیں ہاتھ بڑھاؤں یہ پھسلتی جائیں
کیفیت تیری اداؤں کی سرابوں جیسی
تو حقیقت ہے تو پھر خواب مرے سچّے ہیں
ہُو بہو تیری شباہت، مرے خوابوں جیسی
تیری سنجیدہ مزاجی سے مرا حسن و وقار
ترے چہرے پہ متانت ہے کتابوں جیسی
رس میں ڈُوبی ہُوئی خوشبو کی طرح نرم، گداز
میری بے لوث محبت ہے گلابوں جیسی
اپنی گفتار پہ نازاں تو بہت تھے ہم بھی
بات سُوجھی نہ کوئی تیرے جوابوں جیسی
تم کو ملتا رہا میزانِ عدالت کا ثواب
زندگی ہم نے گزاری ہے عذابوں جیسی
میرا فن ہے مرا پردہ، مرا جلوہ بھی جمیلؔ!
جس طرح صورتِ معبود، حجابوں جیسی

○

جمیل ملک

○

خود اپنے بوجھ سے بُت گر کے پاش پاش ہُوئے
ہم اِس ادا سے ضمیرِ جہاں پہ فاش ہوئے
کبھی بہار کی ٹہنی پہ پُھول بن کے کِھلے
صبا کے ساتھ کبھی حُسنِ ارتعاش ہوئے
ہمیں تھے ابلقِ ایّام پر سوار کبھی
نہ جو اٹھائی کسی نے، کبھی وہ لاش ہوئے
جمالِ دوست میں جو ڈوب کر نہیں اُبھرے
کسے خبر کہ سراپا تری تلاش ہُوئے!
تمھارے پاس ہیں سُورج بھی، چاند تارے بھی
مگر وُہ لوگ کہ جو کشتۂ معاش ہُوئے!
خیال و فکر کے پیکر تراشنے والے
نمودِ فن کے لیے خود بھی قاش قاش ہوئے
جمیلؔ عصر کا خُوں پیکروں میں بول اٹھا
ہم اپنے وقت کے ایسے صنم تراش ہُوئے

○

○

یہ تپتے سے دن، یہ سلگتی سی خاموش راتیں
یہاں بن گئیں اپنی جیتیں بھی سنگین ماتیں
کدھر جائیں ہم، زندگی کی مسافت کڑی ہے
لٹیرے ہیں ہر سُو، اِدھر بھی اُدھر بھی ہیں گھاتیں
وہاں زندگی کس کنارے چلے، کون سے گھاٹ اُترے
جہاں پاؤں شل اور ہونٹوں پہ باتیں ہی باتیں
عجب زندگی ہے، عجب کھیل ہیں اِس کے پیارے
کہیں جا رہے ہیں جنازے کہیں آ رہی ہیں براتیں
خدا جانے کس کس کے گھر کا دیا بُجھ گیا ہے
ہمیں چاند راتیں بھی لگتی نہیں چاند راتیں!
محبت کو کانٹوں کی میزان پہ تو نہ تولو
وہ بستی ہے دل کی، جہاں ایک ہیں ساری ذاتیں
جمیلؔ ان کے ٹوٹے گھروندوں میں دلہن کبھی لاؤ
سدا جن کے دل میں اترتی رہی ہیں براتیں

○

علی احمد جلیلی

○

احباب کے خلوص سے جب واسطا پڑا
شیشہ تو میں نہیں تھا مگر ٹوٹنا پڑا
مانا تمام عمر رہی ساتھ زندگی
لیکن تمام عمر اسے ڈھونڈنا پڑا
خود اپنی لاش اپنے ہی ہاتھوں سے دفن کی
یہ دن بھی زندگی میں ہمیں دیکھنا پڑا
ہوتی رہی انھیں پہ عنایت بہار کی
دامن تھا جن کا لالہ و گُل سے بھرا پڑا
احساس اک بچا تھا سفر میں حیات کے
اس کو بھی راستے میں کہیں چھوڑنا پڑا
شعروں کی اوٹ میں تھے جو پیکر چھپے ہوئے
لفظوں کی چلمنوں سے انھیں جھانکنا پڑا
مل تو گئی حیات کی منزل مگر علیؔ
ہر حادثے سے اس کا پتا پوچھنا پڑا

○

مٹ گیا غم، خلش وہی ہے ابھی
بجھ گئی شمع روشنی ہے ابھی
شب کا بستر تو ہے خموش مگر
ہر شکن اس کی بولتی ہے ابھی
اے صلیبو ذرا ٹھہر جاؤ
زندگی راہ میں کھڑی ہے ابھی
دشمنی تو ابھی زبان نہ کھول
دوستی زہر اگل رہی ہے ابھی
ہاتھ تو وہ چھڑا گیا لیکن
انگلی انگلی مہک رہی ہے ابھی
خون کا اور بھی ہو کچھ چھڑکاؤ
دھول گلیوں میں اُڑ رہی ہے ابھی
جس نے رخصت کیا تھا وقتِ سفر
وہ نظر ساتھ چل رہی ہے ابھی
زلف و عارض کا ذکر کیا ہو علیؔ
شاعری زخم بن رہی ہے ابھی

○

احمد ظفر

○

قربت میں بار ہا جسے پتھر سمجھ لیا
دُوری میں کیوں بہار کا منظر سمجھ لیا

گھر کا مکیں تو گھر میں نہیں سوچتا ہوں میں
ہر بے وفا نے دل کو مرے گھر سمجھ لیا

اترا نہ بام سے مہِ تاباں کو کیا کہوں
بس یہ کہ چشمِ تر کو سمندر سمجھ لیا

وُہ بات لب پہ آ نہ سکی دل میں رہ گئی
کہنے سے پیشتر جسے اکثر سمجھ لیا

جینا عذاب تھا مجھے جینا بھی آ گیا
گزری جو دل پہ اس کو مقدر سمجھ لیا

تشنہ لبوں نے زہر پیا ہے بنامِ مے
اپنے لہو کو بادہ و ساغر سمجھ لیا

کافر نے کس لیے مجھے مومن کہا ظفر
مومن کو دیکھیے مجھے کافر سمجھ لیا

○

احمد ظفر

○

قاتل نے مجھے سمجھا مقتل نے مجھے جانا
سمجھا تو نہ تو سمجھا مانا تو نہ تُو مانا
کس موڑ پہ آ ئے ہم تھے وقت کے سائے ہم
تو مجھ کو نہ پہچانا میں تجھ کو نہ پہچانا
وہ میری تمنّا تھی اک اور ہی دُنیا تھی
تہ میں کسی دریا کی دیکھا ہے پری خانہ
پی لے جو لہُو اپنا وُہ لائے سبُو اپنا
سنتے ہیں یہ کہتا ہے ساقیِ سرِ میخانہ
ٹوٹے ہوئے انساں کو آئنہ نما کہہ دو
دیوانوں میں دیوانہ فرزانوں میں فرزانہ
یہ حاصلِ گلشن تھا، وہ حاصلِ مدفن تھا
اس پھول کا ہنس دینا اس پھُول کا مرجھانا
کہتے ہیں ظفؔر تھا وہ پیغامِ سحر تھا وُہ
آباد کیا جس نے ویرانوں میں ویرانہ

○

○

چھُپ کے اُس یارِ طرحدار نے دیکھا مجھ کو
آئینے نے کبھی دیوار نے دیکھا مجھ کو
اس سے پہلے کہ کسی زلف کی خوشبو پھیلے
کیوں مقدّر کی شبِ تار نے دیکھا مجھ کو
دل کے آئینے میں دیکھا ہے اسے محوِ خرام
برق لہرائی کہ تلوار نے دیکھا مجھ کو
میں سمندر کسی صحرا کی طرح پھیل گیا
اتنی اونچائی سے کہسار نے دیکھا مجھ کو
میں سرابوں کا مسافر ہوں عذابوں کا اسیر
کب کسی ابرِ گہر بار نے دیکھا مجھ کو
دُور ہوتی ہُوئی ہر چیز قریب آئی ہے
جانے کس لمحۂ سرشار نے دیکھا مجھ کو
اپنی خواہش کی فصیلوں میں ہوں محصور ظفؔر
میری ہی چشمِ گنہگار نے دیکھا مجھ کو

○

احمد ظفر

بُجھے نہ دِل کا دِیا

جدائیاں تو مقدر ہیں اور بھی کچھ مانگ
دعا سحر کی پرندوں کے چہچہانے کی
نوا میں آتشِ فردا کی آب و تاب کی بات
نمودِ گل سے فروزاں ہو چشمۂ امروز
خزاں رسیدہ چمن میں بہار آجائے
زمیں پہ چاند اتر آئے رات روشن ہو
رواں دواں کسی کشتی میں ہم سفر کوئی
سنائے نغمۂ امید سازِ ہستی پہ
کہ ہجر میں ہیں کیفیت وصال سے
جو ہم سے رُوٹھ گیا وُہ پری جمال ہے
وہ عکس خواب کی مانند پھر دکھائی دے
وہ جس کی زلف کے خم کھل گئے تو ہم محبوس
ازل سے تا ابد پیاس کا کوئی صحرا
ہمارے ساتھ رہا!!

ہمارے دوست بھی دشمن فضا بھی دشمن ہے
ہمارے سامنے دریا ہے اور پیاسے ہم

یہ کس نے زہر ملایا ہے میٹھے پانی میں
شجرِ غنیم کی صُورت دکھائی دیتے ہیں!!
ہوا چراغ بجھاتے ہُوئے دلوں کے گئی
لہو میں ڈوبی ہوئی انگلیاں لکھیں کب تک
وہ داستانِ الم جس کے ہم رہے کردار
ہمیں تھے نوحہ سرا

کھلے گا کب کسی زنداں کا بند دروازہ
پلک پلک پہ بشارت کی آرزو کب تک
لیے پھرے گی ہمیں جنگلوں میں آوارہ
ہمارے ہاتھ نہ آئے گا دامنِ دلدار
یہ سوچ اپنا مقدّر نہ ہو دعا ہے یہی
ہماری جہدِ بقا کے لیے فنا ہے یہی
بُجھے نہ دل کا دیا

○

احمد ظفر

سرِ شاخِ طُوبیٰ

کسی پیڑ کے سایۂ عاطفت میں
کوئی داستاں لکھتے لکھتے
مسافر کڑی دھوپ میں چلنے والے ہمیں یاد آنے لگے ہیں
زمانہ کسی منزلِ شب سے جیسے ہمیں آج آواز دینے لگا ہے
انھیں یاد رکھیں جو ہم میں نہیں ہیں!
مسافر مہ و مہر کو جو دلوں سے لگاتے ہُوئے چل رہے تھے
وہ دن کیسے دن تھے شکستہ پلوں کے تلے کشتیاں جل رہی تھیں
یہاں سے وہاں تک اندھیرے نے خیمے لگائے ہوئے تھے
وہی ایک لمحہ کوئی حرفِ ساکن مقدّر کے ماتھے پہ لکھا ہُوا تھا
مگر ایک آواز نے یہ طلسمِ ستم توڑ ڈالا

بہارِ عمل سے یہاں سے وہاں تک نئے پھُول کھلنے لگے تھے
ستارے ستاروں سے مل کر زمیں کی طرف آ رہے تھے
کہ تقدیمِ عالم نے مفہوم کے باب کھولے ہُوئے تھے
"کہ ہم ایک ہیں ایک تھے ایک ہوں گے"
کسی خواب کو اس کی تعبیر ملنے لگی تھی

ازل سے ابد کی طرف جانے والا کوئی کارواں چلتے چلتے
اسی سمت پھر جادہ پیما ہُوا تھا،
ہمارے اَب و جَد کے سینے منور تھے جس سے
وہ پیمانِ اوّل جو رازِ بقا تھا
وہی راز پرچم کی مانند کھلنے لگا تھا
وہ سائے میں جس کے نہ خوف فنا ہے نہ خوف فنا تھا،
زمیں خطۂ گل کے مانند حدِ نظر تک ہمیں اپنے آغوش میں لوریاں دے رہی ہے
کہ ہر برگِ گل پر سنہرے دنوں کا تصوّر ہمارے مقدّر میں لکھا گیا ہے
فضاؤں میں اڑتی ہُوئی تتلیوں کی عبارت کا منظر گزرتے ہُوئے ان دنوں کا صلہ ہے
جنہیں یاد رکھا ہے ہم نے ، جنہیں یاد رکھا گیا ہے !
وُہ صحرا جہاں آبلہ پا مقدس امانت کو دل سے لگائے ہُوئے چل رہے تھے
ہمیں یاد آتا رہے گا ،
یہ ہم جو گلستاں میں آئے ہُوئے ہیں
نئی زندگی کے امیں ہم وہی حرفِ سادہ سرِ شاخِ طُوبیٰ لکھیں گے

○

احمد ظفر

اپنے آپ سے ایک مکالمہ

اُن خلاؤں میں اترتا ہُوا پاگل میں ہُوں
چاند ہی جن میں نہ اُترا ہے ستارہ کوئی !
شب کے جنگل میں بکھرتا ہُوا پاگل میں ہوں
پُھول جس طرح ہو زندہ کسی خوشبو کے بغیر
جو نہ برسے وہ گزرتا ہُوا بادل میں ہُوں

کتنے ہنستے ہوئے چہروں نے مجھے دیکھا ہے
مجھ سے بڑھ کر نہیں عبرت کا نظارا کوئی
کتنی روتی ہُوئی آنکھوں نے مجھے دیکھا ہے
میں سُلگتا ہُوا لمحہ ہُوں سرِ شام فراق
قلعۂ شب کی فصیلاں نے مجھے دیکھا ہے

میں فنا کی کسی منزل میں بقا کی خواہش
مجھ کو منظور نہیں پھر بھی سہارا کوئی

خامشی ایسی زہد جس میں صدا کی خواہش
زندگی وادیٔ پُرخار میں گزری —— پھر بھی
دل سے جاتی نہیں کیوں رقصِ صبا کی خواہش

گرمیٔ رنگ سے پگھلا ہوا پتّھر جیسے
در و دیوار پہ کچھ نقش بنا جاتا ہے !
عشرتِ خواب میں ژولیدہ سا منظر جیسے
صفحۂ زیست پہ پھیلے ہُوئے بے نام حروف
بے ثمر میری دُعاؤں کے شجر ہوں جیسے

○

احمد ظفر

رقمطرازِ بہار

میں اپنی دنیا میں رفتہ رفتہ اُتر رہا ہُوں
محبتوں کے کسی شوالے کا حرفِ آخر
تمام منظر بدل رہا ہے
وہ مہوشوں کے جلو میں مہوش
وہ پیکرِ ہفت رنگ جس نے
نئی رُتوں کا کوئی بلاوا دیا ہُوا ہے

میں سوچتا ہوں، زمیں کی اس انتہا کا لمحہ
سرابِ جاں سے عذابِ جاں تک
بس ایک ہی سانس کا توقف
مرے در و بام پر ستارے سجا گیا ہے
وہ ایک لمحہ، درخت پت جھڑ میں جل رہے تھے
یہ ایک لمحہ، کہ جس کی لَے پر ہزاروں جگنو برس رہے ہیں

اُدھر کئی پھول کھل رہے ہیں
اِدھر کسی شاخ پر پرندے مسرتوں کے سفیر بن کر چہک رہے ہیں
خیالِ ہست و عدم سے آگے کسی جہاں میں
سفر کی ساری نزاکتیں ساتھ دے رہی ہیں
کہ اس کے ہاتھوں میں ہاتھ آئے ہوئے ہیں میرے
یہ ہجرتِ شب ہے یا نمودِ سحر کا عالم
میں کس سے پُوچھوں ؟
یہ کیسی دوشیزۂ طرب ہے کہ بہتے پانی میں چاند جیسے
ہوا کے ہاتھوں میں سبز پتّوں کے دف سے نغمے برس رہے ہیں

یہاں شجر ہیں تو ایک جیسے
دبیز مخمل کے فرش پر پھُول گر رہے ہیں
نہ کوئی نقطہ، نہ کوئی محور نہ دائرہ ہی کوئی فنا کا
یہی مسافت جو لحظہ لحظہ مرا مقدر بنی ہوئی ہے
مرے لیے راز ہے بقا کا
میں روز و شب کے حصار میں سانس گن رہا تھا
اک اجنبی سی فضا سے مانوس ہو گیا ہُوں
کہ وقت کی مہرباں عبارت رقم طرازِ بہار نے بار بار لکھی
کہ اس سے پہلے تو بارشِ گل میں اتنی شدّت کہیں نہیں تھی

○

فضا ابن فیضی

○

بجز 'لاحاصلی' کیا اور بام و در پہ رکّھا ہے   دیا 'بے منظری' کا، طاقِ ہر منظر پہ رکھا ہے
لہو میں 'تیرنا' ہے، ذائقہ اونچی اڑانوں کا   ہوا کا زور سارا، مرے ہی شہپر پہ رکھا ہے
بہت نامعتبر ہے، یہ طلسمِ گردشِ امکاں   بس 'اک ٹوٹا ہوا سا دائرہ'، محور پہ رکھا ہے
جنوں کو آگیا ہے راس شہروں کا گھنا موسم   بیاباں کا اثاثہ، لا کے سب نے گھر پہ رکھا ہے
مقدر ہے ہمارا' سایہ سایہ دھوپ میں رہنا   عجب وہ سائباں ہے جو ہمارے سر پہ رکھا ہے
میں کیا آنکھیں کھُلی رکھتا، کہ میری آگہی نے بھی   مدار اپنا اسی اک حرفِ خواب آور پہ رکھا ہے
بہت ہے، ہم کو تم کو، یہ متاعِ علمِ لاعلمی   کہ سب کچھ منحصر، جہلِ ہُنر پرور پہ رکھا ہے
غنیمت ہے، سحر بختانِ حرف و صوت' اتنا بھی   چراغ اک 'شب گزیدہ سا' ہمارے در پہ رکھا ہے
یہی، بس دیکھنا ہے' اب، لہو مقبول ہو کس کا   سبھوں نے ہاتھ اپنا، وقت کے خنجر پہ رکھا ہے
معانی بھی نجات اس کرب سے، اب کیا دلائینگے   حریرِ لفظ ہو نمیں، جو ابھی پتھر پہ رکھا ہے
ہوئے جب شعر، تو احساس کی سطحیں چمک اٹھیں   یہ لگتا ہے، قلم نے پاؤں، تختِ زر پہ رکھا ہے
بہت بے عافیت ہیں، گُل رُخانِ شہر بھی، لوگو!   ہوس کے لمس کا شعلہ، ہر اک پیکر پہ رکھا ہے
فضاؔ! اپنے قلم کو، کس لیے شاخِ انا سمجھوں
عجب 'الزام اس نے، مجھ سے دانش گر پہ رکھا ہے

○

اُسے پڑھنا ہے مشکل، جو کچھ آئینے پہ لکھا ہے   بڑی اُلجھی ہوئی تحریر میں، چہرے پہ لکھا ہے
وہ' خود سے ملنے، اس دھوکے میں اکثر میرے گھر آیا   اسی کا نام میں نے' اپنے دروازے پہ لکھا ہے

ہُوئی مدّت، کہ میں نے چند غزلیں اس کو بھیجی ہیں
مجھے خط اس نے، کاغذ کے اسی ٹکڑے پہ لکھا ہے
جو، پڑھنا ہے انہیں، آنکھوں میں سورج کی کرن بھر لو
کہاں تم کو خبر، کیا اوس نے سبزے پہ لکھا ہے
ہُوا اکثر یہی، حالات رستا کاٹ جاتے ہیں
مقدّر، کب سفر کا، طے شدہ رستے پہ لکھا ہے
گزشتہ سال ہی، دراصل مرنے کا ارادہ تھا
بجا ہے، 'موت کا یہ سال'، جو کتبے پہ لکھا ہے
خبر، اخبار میں تو ہے، کئی شہروں کے جلنے کی
ہوا نے پُورا کالم، ایک ہی شعلے پہ لکھا ہے
معاون ہو، جدید اسلوب کی تفہیم میں شاید
جو اس نے طنز، میرے بے ضرر جملے پہ لکھا ہے
یہ مطلب ہے نظر پڑنے نہ پائے، عام قاری کی
ہمارا نام اس نے، آخری صفحے پہ لکھا ہے
بس، اتنی بات ہے، کیا تجربہ اور آگہی کیسی
فضاؔ نے زندگی کے مختلف گوشے پہ لکھا ہے

○

کسی بشکستہ آئینے کا ٹکڑا بھیج دینا
ثمر، مجھ کو، مری خود بینیوں کا بھیج دینا
بہت نازاں ہیں، اپنی خوابناکی پر وُہ آنکھیں
انھیں اک دن، تہِ سنگِ تماشا بھیج دینا
در و دیوار کی ویرانیاں کم ہو چکی ہیں
ہمارے پاس بھی، کچھ رختِ صحرا بھیج دینا
اندھیروں میں بھی کر لیں گے کسی صُورت گزارا
اسی کو اب، ہماری چشمِ بینا بھیج دینا
نئی دانش، تو نازل ہو چکی سب، اس کے اوپر
مجھے، اب کوئی بوسیدہ صحیفا بھیج دینا
اسی کو، شیشۂ زنگار آمادہ مبارک
مری خاطر، کوئی پتھر کا چہرا بھیج دینا
جو، کم شیوہ ہیں، کیا جانیں بھلا، ترسیل و ابلاغ
ہمارے نام، یہ سارا تقاضا بھیج دینا
ذرا چکھ لے تو وُہ بھی، لفظ ہونے کا مزا کچھ
کبھی اس کو، سرِ دہلیزِ معنیٰ بھیج دینا
پرانے دور کے بیمار خانے میں فضاؔ کو
بنا کر، معنیِ نو کا مسیحا، بھیج دینا

○

زخموں کو گلاب لکھ رہا ہُوں   خوشبو کی کتاب لکھ رہا ہوں
الفاظ، نشّے میں جھُومتے ہیں   معنی کو شراب لکھ رہا ہوں
ہے تابِ نفس، فروغِ خامہ   انجیلِ شباب لکھ رہا ہوں
اک حرف، ورق ورق، اکیلا   اپنا انتخاب لکھ رہا ہوں
نام اس کے، جو آج تک ہے بے نام   جملہ انتساب لکھ رہا ہوں
ایسا نہ ہو، خود ہی ٹوٹ جاؤں   پانی پر، حباب لکھ رہا ہوں
وُہ، خواب کو موت کہہ رہا تھا   میں، موت کو خواب لکھ رہا ہوں
بال اب سفید ہو رہے ہیں   ماضی کا حساب لکھ رہا ہوں
اب ہوگی شروع اک کہانی   میں آخری باب لکھ رہا ہُوں
اونچی ہے سروں سے، موج، پھر بھی   ہستی کو سراب لکھ رہا ہوں
آندھی میں لگا رہا ہُوں خیمہ   سانسوں کو طناب لکھ رہا ہوں
وہ قحط ہے، اب کے خال و خط کا   چہروں پر نقاب لکھ رہا ہوں
ہیں اس کے لیے، یہ سب اضافی   جتنے بھی خطاب لکھ رہا ہوں
الجھی ہے دھنک سی، انگلیوں میں   کس خط کا جواب لکھ رہا ہوں
اپنا ہی اقتباس ہے وہ، جس کو   کہہ کر اکتساب لکھ رہا ہوں
یہ طنز، خود اپنے آپ پر ہے   حضرت کو جناب لکھ رہا ہوں
اس دور کی ساری برکتوں کو   دانش کا عذاب لکھ رہا ہوں

مشکل ہے فضا! خود احتسابی
اچھا، یا خراب، لکھ رہا ہُوں

○

محسن احسان

○

فولاد میں ڈھل رہی ہے دنیا
ملبوس بدل رہی ہے دنیا
شعلوں کی زباں میں بولتی ہے
بارود اگل رہی ہے دنیا
افلاس کی دھوپ سے نکل کر
سرمائے میں جل رہی ہے دنیا
اک سود و زیاں کی کشمکش ہے
ہر لحظہ پھسل رہی ہے دنیا
کانٹوں کا سجا کے تاج سر پہ
غنچوں کو مسل رہی ہے دنیا
راتوں کو اجالنے کی خاطر
خورشید نگل رہی ہے دنیا
یا خواب بکھر گئے ہیں اس کے
یا نیند میں چل رہی ہے دنیا
بارش کی دعائیں مانگتی ہے
کس دھوپ میں جل رہی ہے دنیا
محسن یہ تضادِ ارتقا ہے
اک پاؤں پہ چل رہی ہے دنیا

○

○

کرن، شبنم کو پی کر خوشبوؤں پر پاؤں دھرتی ہے
ہوا، دوشیزہ پتوں کے بدن چھو کر گزرتی ہے

زوالِ موسمِ سرما کی آہٹ ہے پہاڑوں پر
صدائے آب جھرنوں میں سمٹتی ہے بکھرتی ہے

فلک سے مریم ابرِ رواں آہستہ آہستہ
مسیحا بارشیں آغوش میں لے کر اترتی ہے

بہار آتی ہے جب بھی گلستاں میں ایسے لگتا ہے
زمیں اپنے ولادت کے دنوں کو یاد کرتی ہے

○

محسن احسان

○

چلا ہے اوڑھ کے زرکار پیرہن مہتاب
جگر جگر ہیں ستارے کرن کرن مہتاب
فلک پہ تان گیا کوئی شامیانۂ ابر
اِدھر اُدھر سے زمیں پر ہے ضوفگن مہتاب
میں اِس کی چاندنی، پلکوں سے چُن رہا ہوں کہ ہے
مرے لیے مرا ہر قریۂ وطن مہتاب
شجر حجر کے بدن ہو گئے ہیں مہتابی
جلا گیا یہاں قندیل ہر بدن مہتاب
پہن کے پاؤں میں سیال جھانجنیں، سرِ شام
کنیزِ شب کو چلا ہے جھنن جھنن مہتاب
نہ آفتاب یقیں ہے، نہ ماہتاب گماں
گہن گہن مرا سورج، گہن گہن مہتاب
برونِ لفظ کہاں ہے تجلیِ معنی
ہے حرف حرف ستارہ سخن سخن مہتاب

○

○

ذہن اور دل کی کشاکش میں گرفتار ہیں ہم
اپنی ہی ذات سے اب برسرِ پیکار ہیں ہم
اتنی افراطِ زرِ حرص و ہوس کی ہے کہ بس
جنسِ بے مایہ کی صورت سرِ بازار ہیں ہم
لہلہاتے ہیں ابھی سبزۂ نورس کی طرح
اک ذرا تیز ہوا آئی تو ہموار ہیں ھ
خندہ زن پہلے تھے ہر خشتِ مکاں پر، لیک
اب تو یوں لگتا ہے گرتی ہوئی دیوار ہیں ھ
ثبت ہے اپنے لبوں پر ازلی سنا
یوں تو ہر حرفِ صداقت کے علمدار ہیں ھ
ہم کیسے دشمنِ محرابِ حرم ٹھہرائ
جو ہو خود شمرِ تقدس وہ گنہگار ہیں ھ
ہم سے رکھنا ہے تعلق تو ذرا سوچ کے
جتنے آسان ہیں ہم اتنے ہی دشوار ہیں ھ
صدفِ حرف، معانی سے ہے خالی مگ
سرِ دربارِ سخن پھر بھی گہربار ہیں ھ

○

کسریٰ منہاس

○

کرو دل کو تم فروزاں، ہو اگر سحر کے پیا سے
کہ نہ ہوگی دُور ظلمت، کسی شمع کی ضیا سے
یہ قدم نہ ہٹ سکیں گے، کبھی جادۂ وفا سے
مجھے مل گیا یہ نکتہ، کسی دوست کی رضا سے
مجھے ہے فقط یہ شکوہ دلِ رمز آشنا سے
وہ ہوئے نہ ہونگے واقف تری عظمتِ وفا سے
کہیں مرکزِ وفا سے، تجھے دُور لے نہ جائے
جو ٹپک رہی ہے حسرت تری چشمِ التجا سے
رہی چشمِ ماسوا سے چھپی اِس طرح حقیقت
جو بھی وقت کے تھے رہزن نظر آئے رہنما سے
یہی ٹھان لی ہے کشتی، کبھی ڈوب کر نہ اُبھرے
مرے دل کی بات کہہ دے کوئی جا کے ناخدا سے
ابھی تک بہار پر ہیں، ابھی تک مشامِ جاں میں
کبھی پھُول جو چُنے تھے، ترے گلشنِ وفا سے
ابھی اور ہوگا کیا کیا؟ ابھی دیکھنا ہے کیا کیا؟
ملے کب نجات دیکھیں ہمیں دورِ ابتلا سے
غمِ عشق کے منازل کبھی طے ہُوئے ہیں کسریٰ!
کہیں آہِ نارسا سے، کہیں بے اثر دعا سے

⊙

ڈاکٹر مظفر حنفی

○

غم ترا وقت کے دریا میں بہا جاتا ہے
میرا سایہ تو کنارے پہ رہا جاتا ہے
زندگی تھی کہ سجائی گئی آنسو آنسو
اور وہ شیش محل ہے کہ ڈہا جاتا ہے
گونجنے لگتی ہیں کچھ گرم لہو کی بوندیں
دل ہو زخمی تو کہیں شعر کہا جاتا ہے
پیٹھ پر تیر چلے ہیں ، مجھے رونا ہوگا
دوست کا وار تو سینے پہ سہا جاتا ہے
ڈوبتے دل میں اُبھرتی ہے تری یاد کی لہر
اور پھر اُس میں یہ پھُول نہا جاتا ہے
شعر کہہ کر بھی مظفرؔ نے بہت رنج کیا
ہاتھ سے کیا گُہرِ بیش بہا جاتا ہے

○

آلامِ روزگار سے فرصت نہیں ملی
آئینے سے بھی ہم کو محبّت نہیں ملی
کیسے کہوں کہ خُون کا بازار گرم ہے
مُجھ کو کسی دُکاں پہ مروّت نہیں ملی
مسرور ہوں بساطِ تمنّا لپیٹ کر
اچّھا ہُوا خلوص کی قیمت نہیں ملی
جب سے خلا نورد ہوئے ، سرد ہے بدن
اک سانس بھر کہیں سے حرارت نہیں ملی
کیا ظلم ہے کہ میرا رجز پڑھ گئے عدو
مجھ کو مدافعت کی اجازت نہیں ملی
وہ گاؤں تھا کہ ہاتھ سے جاتی رہی زمیں
یہ شہر ہے کہ سر کے لیے چھت نہیں ملی
کاوش تو خُوب کی ہے مظفرؔ کے رنگ میں
لیکن ہمارے شعر کو شہرت نہیں ملی

○

ڈاکٹر مظفر حنفی

○

آخر آخر وُہ کافر بھی اِس نکتے کو مان گیا
پربستہ ہوں لیکن میرا شعر تو پاکستان گیا
دل کی راہیں تو ملتی ہیں، سمتیں لاکھ مخالف ہوں
گردِ سفر میں وہ مجھ کو اور میں اُس کو پہچان گیا
روشن ہو کر تیرے، میرے، سب کے چہرے ایک ہوئے
پیار کے آئینہ خانے میں جو آیا، حیران گیا
اُس کے مظہر، گاتی چڑیاں، روتی شبنم، ہنستے پھول
رعد نے اُس کا ڈنکا پیٹا، کُہرا پردہ تان گیا
اتنی پتلی دیواریں ہیں، اتنے سارے روزن ہیں
گھر میں کوئی راز نہیں ہے اور پڑوسی جان گیا
یاری کا لینا دینا کیوں میزانوں پر لائے تھے
تجھ کو بھی سَودے میں گھاٹا، مجھ کو بھی نقصان گیا
کل تک ان کی تکراروں سے تیری غزلیں زخمی تھیں
آج مظفّر نقادوں کے جھگڑے میں دیوان گیا

○

○

جب سے دن بھر دل تھامے تُو بیٹھا رہتا ہے
میری چھاتی پر بھی بچھّو بیٹھا رہتا ہے
تھر کا کرتی ہے ہونٹوں پر چنچل تتلی سی
اُن آنکھوں میں جِھل مِل جگنو بیٹھا رہتا ہے
جی ڈرتا ہے اس کا مکھڑا دیکھ نہ آیا ہو
کس کی دُھن میں گُم سُم سادھو بیٹھا رہتا ہے
کیسے اُن کو پرچا پھینکوں، کیسے بات کروں
بالکنی میں بوڑھا بابُو بیٹھا رہتا ہے
آنکھوں سے بہ جانے دینا، پینا ٹھیک نہیں
موتی جیسا تہ میں آنسو بیٹھا رہتا ہے
تیز ہوائیں مستولوں پر سازش کرتی ہیں
لمبے ہاتھ سمیٹے چپّو بیٹھا رہتا ہے
دشمن بن کر لکھتا ہوں میں خود اپنے اعمال
لاکھ فرشتہ آزو بازو بیٹھا رہتا ہے

○

اقبال ساجد

○

کل شب دلِ آوارہ کو سینے سے نکالا
یہ آخری کافر بھی مدینے سے نکالا

یہ بھیڑ نکلتی تھی کہاں خانۂ دل سے
یادوں کو نہایت ہی قرینے سے نکالا

ہم خُوں بہا کر بھی ہوئے باغ میں رُسوا
اُس گل نے مگر کام پسینے سے نکالا

ٹھہرے زرِ حسن کے حقدار تماشائی
اور مارِ سیہ ھم نے دفینے سے نکالا

یہ سوچ کے ساحل پہ سفر ختم نہ ہو جائے
باھر نہ کبھی پاؤں سفینے سے نکالا

○

○

لگا دی کاغذی ملبوس پہ مہرِ ثبات اپنی
بشر کے نام کر دی ہے خدا نے کائنات اپنی

خلا کے آر بھی مَیں ہُوں خلا کے پار بھی میں ہوں
عبورِ اِک پل میں کرتا ہُوں حدودِ ممکنات اپنی

جیوں گا اپنی مرضی سے مروں گا اپنی مرضی سے
مرے زیرِ تسلط ہے فنا اپنی حیات اپنی

لکھی ہے مَیں نے اپنے ہاتھ پہ تحریرِ آین
مری اپنی وراثت ہے قلم اپنا دوات اپ

میں خود پر آزماؤں گا خود اپنا آخری دا
خبر ہے مجھ کو ساجد جیت بن جائے گی مات اپ

○

شبنم شکیل

○

گو ایک پل بھی اس سے الگ اب بسر نہ ہو
اس بات کی مگر اُسے دیکھو خبر نہ ہو
اس کی گزارشات کو کیسے کروں قبول
جب دل مرا نظر میں مری معتبر نہ ہو
تاریکیوں کی جس کو علامت سمجھ لیا
وہ آنے والی صبح کا پیغام بر نہ ہو
اپنی سلامتی کا تو ضامن رہے گا وُہ
اچھا ہی ہے جو ہاتھ میں کوئی ہنر نہ ہو
میں جس میں رہ کے ایک مسلسل سفر میں ہوں
اک واہمہ سا ہے کہ وہی میرا گھر نہ ہو
غافل ہُوا جو شہر بھنبھور اُس کا لُٹ گیا
اتنا بھی اس جہان سے دل بے خبر نہ ہو
اے مستقل ہراس کی شب اب گزر بھی جا
لا وُہ سحر کہ جس میں کوئی سا بھی ڈر نہ ہو

○

○

دوستوں کا ذکر کیا دشمن ہیں جب بدلے ہوئے
شہر میں تو اب نظر آتے ہیں سب بدلے ہوئے
زیست کے ادوار کتنے مختلف سے ہو گئے
سال و مہ ٹھہرے ہُوئے اور روز و شب بدلے ہوئے
کس کی دلجوئی کریں کس کو مبارک باد دیں
جب خوشی اور غم کے ہوں یکسر سبب بدلے ہوئے
اک پُرانا راستہ اب کس طرح ڈھونڈے کوئی
شہر بھر کے سب گلی کُوچے ہوں جب بدلے ہوئے
روز و شب کی گردشیں دل کو بدل پائیں نہیں
آئینے میں گرچہ ہیں رُخسار و لب بدلے ہُوئے

○

ناصر زیدی

○

میں ایک پیکرِ نادیدہ کے حصار میں ہُوں
نجانے کون ہے وہ کس کے انتظار میں ہُوں

وہ خشمگیں ہی سہی، احترام لازم ہے
یہ کم شرف ہے کہ اب تک نگاہِ یار میں ہوں

کرو قبول کہ نفرت سے مجھ کو ٹھکرا دو
تمہارے پاس ہوں اور پورے اختیار میں ہوں

میں اپنی ہمتِ پرواز کھو چکا شاید
خزاں سے خوف زدہ موسمِ بہار میں ہوں

تمام شہر مخالف ہُوا کرے ناصؔر
میں مطمئن ہُوں کہ اُس حلقۂ نگار میں ہُوں

○

○

اِس توقّع پہ کُھلا رکّھا گریباں اپنا
جانے کب آن ملے جانِ بہاراں اپنا
لمحے لمحے کی رفاقت تھی کبھی وجہِ نشا
موسمِ ہجر ہوا اب سروساماں اپ
نِت نئے خواب دکھاتا ہے اُجالوں کے لیے
وہ کہ ہے دشمنِ جاں، دشمنِ ایماں اپنا
نکہتِ گُل ہی نہیں خاک بھی ہے ہمکو عز
اپنا صحرا ہے، چمن اپنا، خیاباں اپ
دیکھ لیتی ہے جہاں عزم ویقیں کے پیکر
رُخ بدلتی ہے وہاں گردشِ دوراں اپنا
یہ تو مانا کہ ہوئی عشق میں رُسوائی بہ
ہوگیا نام، غزل میں تو نمایاں اپ
اُس سے بچھڑے ہیں تو محسوس ہوا ہے ناصؔر!
حال اِتنا تو نہ تھا، پہلے پریشاں اپنا

○

ناصر زیدی

○

دل و نگاہ کو تسکین عمر بھر نہ ملی
سفر کا شوق ملا ، منزلِ سفر نہ ملی
تیرے بغیر کلی دل کی کس طرح کھلتی؟
خزاں کی زد میں بہاروں کی کچھ خبر نہ ملی
زمانہ حُسن کی تصویر بن گیا ، لیکن
تلاش جس کی تھی وہ صورتِ بشر نہ ملی
بس ایک بار ملی اُس کی رہگزر مجھ کو
پھر اُس کے بعد کوئی اور ، رہگزر نہ ملی
میری حیات میں مہتاب بن کے آ جاؤ
ملی جو مہلتِ شب آج ، کل ، اگر ، نہ ملی
حریمِ ناز پہ موقوف کچھ نہیں ناصر!
کہاں کہاں پہ فغاں مجھ کو بے اثر نہ ملی

○

○

جس کے جلووں سے مری شام اُجالی جائے
بات اُس شخص کی کیسے کوئی ٹالی جائے
جس کی یادوں سے مہکتی ہے مری شامِ فراق
اُس سے ملنے کی کوئی راہ نکالی جائے
میرے مسلک میں نہیں بَیر کسی سے رکھنا
میرے دشمن سے یہ تصدیق کرا لی جائے
خود کو تقسیم کروں مَیں زرِ گُل کی مانند
در سے خالی نہ کبھی کوئی سوالی جائے
کوئی آندھی نہ بجھائے کسی مفلس کا چراغ
دوستو! ایسی کوئی رسم بھی ڈالی جائے
سر بکف آج غزل خواں ہے تمہارا ناصر!
دستِ نازک میں ذرا تیغ سنبھالی جائے

○

ناصر زیدی

○

کہیں تاب لا نہ پائے، مرے دل، ذرا سنبھل کے
وہ نظر کے سامنے ہیں، نئے زاویے بدل کے

مَیں جہاں جہاں سے گزرا، تری دید کی طلب میں
کوئی ہے جو آ کے دیکھے انھیں راستوں پہ چل کے

مرے ہم نفس عزیزو! مرا حال تم نہ پوچھو
غمِ دل ٹپک نہ جائے کہیں آنسوؤں میں ڈھل کے

جو کبھی تھے جانِ محفل، جو تھے شاعری کا حاصل
وہ ہیں آج تک پشیماں مری بزم سے نکل کے

کہے مَیں نے جس کی خاطر، ہوں پسند اُس کو ناصر!
مرے خونِ دل کے قطرے، مرے شعر اس غزل کے

○

○

رُوح اور جسم کا وصال کرے
کوئی آئے مجھے نہال کرے

ہے کوئی جو بھرے زمانے میں
میرے زخموں کا اِندمال کرے

پھر کوئی داغ دے جُدائی کا
پھر مرے فن کو لازوال کرے

کون ہُوں کیا ہُوں اور کیسا ہوں؟
کاش! مجھ سے وہ یہ سوال کرے

شرط ہے صرف کوششِ پیہم
پھر جو، وہ ربِّ ذوالجلال کرے

جس کو دعویٰ ہو آدمیت کا
پیش اُس کی کوئی مثال کرے

وُہ جو بچھڑا تو کیا گلہ، ناصر!
اس قدر کیوں کوئی ملال کرے!

○

ناصر زیدی

○

وہ میرے دل کی ہر اک بات جان لیتا ہے
یہ وہم ہے اُسے، اونچی اُڑان لیتا ہے

میں اپنی جان کے دشمن سے پیار کیوں نہ کروں
جو، ہر قدم پہ میرا، امتحان لیتا ہے

روایتوں کو جنم دینے والے خواب ہوئے
حکایتوں کے مزے قصّہ خوان، لیتا ہے

رہے گا وُہ تہی دامن خِرد کی دولت سے
غموں کی دُھوپ میں، چادر جو تان لیتا ہے

وہ ایک شخص کہ ناصؔر بھی ہے سخنور بھی
اُسی کا نام تو سارا جہان لیتا ہے

○

○

مہک اُٹھے ہیں دہکتے گلاب آنکھوں میں
اُبھر رہا ہے یہ کس کا شباب آنکھوں میں

یہ روشنی کا سمندر کہاں سے آیا ہے؟
بکھر رہے ہیں کئی آفتاب آنکھوں میں

وُہ زندگی کی بہار و خزاں کو کیا کرتا؟
جو کھو چکا تھا، تری خواب خواب آنکھوں میں

کرے گا زیر و زبر جو نظامِ عالم کو،
میں دیکھتا ہُوں وہی انقلاب آنکھوں میں

کہاں وُہ حرف جسے آگہی کہوں، ناصؔر!
کُھلی ہُوئی ہے غموں کی کتاب آنکھوں میں

○

ناصر زیدی

○

دل میں جو آنکھ کے رستے سے سمایا جائے
سامنے سے وہی چہرہ نہ ہٹایا جائے
مجھ سے برتر ہے تو تسلیم کروں گا دشمن
میرے دشمن کو مرے سامنے لایا جائے
تیری پہچان اگر ہے تو مرے نام سے ہے
تُو بھی مٹ جائے اگر مجھ کو مٹایا جائے
میں وُہ مجرم ہوں جو ہر دَور میں سچ بولتا ہے
اِس خطا پر مجھے سُولی پہ چڑھایا جائے
رُوح بن کر مرے پیکر میں سمانے والے
زندگی بھر نہ تری یاد کا سایا جائے
جس سے روشن ہیں ابھی تک مری یادوں کے چراغ
کیسے ممکن ہے کہ وُہ شخص بھلایا جائے
نقش بن کر جو ترے دل پہ سجا ہے، ناصر!
یہ کوئی حرفِ غلط ہے کہ مٹایا جائے

○

○

صدائیں دی ہیں بہاروں میں تتلیوں نے مجھے
شبِ سیہ میں پکارا ہے جگنوؤں نے مجھے

کروں شمار تو حدِّ شمار سے گزروں
کچھ ایسے زخم لگائے ہیں دوستوں نے مجھے

میں بے ہُنر تھا مگر صحبتِ ہنر میں رہا
شعور بخشا ہمہ رنگ محفلوں نے مجھے

یہ اَور بات کہ ثابت قدم رہا، ورنہ
بہت فریب دیئے چند قربتوں نے مجھے

خیال و خواب ہُوئیں ساری منزلیں، ناصر!
شکستہ حال کیا اِن مُسافتوں نے مجھے

○

پروین شاکر

* * *

باب حیرت سے مجھے اِذنِ سفر ہونے کو ہے
تہنیت اے دل کہ اب دیوار، در ہونے کو ہے
موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے دل میں کیوں
کیا محبت سے بہت خالی یہ گھر ہونے کو ہے
کھول دیں زنجیرِ در اور حوض کو خالی کریں
زندگی کے باغ میں اب سہ پہر ہونے کو ہے
گرد راہ بن کر کوئی حاصل سفر کا ہو گیا
خاک میں مل کر کوئی لعل و گہر ہونے کو ہے
اک چمک سی تو نظر آئی ہے اپنی خاک میں
مجھ پہ بھی شاید توجہ کی نظر ہونے کو ہے
گمشدہ بستی مسافر لوٹ کر آتے نہیں
معجزہ ایسا مگر بارِ دگر ہونے کو ہے
گھر کا سارا راستہ اس سرخوشی میں کٹ گیا
اس سے اگلے موڑ کوئی ہم سفر ہونے کو ہے

* * *

دیکھنے کا جسے کل رات میں ڈھنگ اور ہی تھا
صبح جب آئی تو اُس چشم کا رنگ اور ہی تھا
شیشۂ جاں کو مرے اتنی ندامت سے نہ دیکھ
جس سے ٹوٹا ہے یہ آئینہ وہ سنگ اور ہی تھا
خلق کی بھیجی ہوئی ساری ملامت اک سمت
اُس کے لہجے میں چھپا تیر و تفنگ اور ہی تھا
کیا غرض اس سے کہ کس گوشۂ عزلت میں رہا
شمع کے آگے جب آیا تو پتنگ اور ہی تھا
لو چراغوں کی بجھانے سے ذرا سا پہلے
میرے سردار کا اندازۂ جنگ اور ہی تھا

* * *

اکبر کاظمی

○

لوگ جو تجھ سے لو لگاتے ہیں
حادثوں میں بھی مسکراتے ہیں
راہرو کس قدر پریشاں ہیں
راستے کتنے جگمگاتے ہیں
مرنے والے غمِ محبت میں
زندگی کے دِیے جلاتے ہیں
ساری دنیا کو بھول جاتا ہوں
آپ جس وقت یاد آتے ہیں
کتنی بے رنگ خواہشوں کے چراغ
میری راتوں میں جگمگاتے ہیں
جو ستارے فلک سے ٹوٹ پڑیں
وہ خلاؤں میں ڈوب جاتے ہیں
کاظمی میری تیرہ بختی پہ
میرے احباب مسکراتے ہیں

○

○

بھلانا چاہوں تجھے خود کو بھول جاؤں میں
یہ واقعہ ہے مگر کس طرح سناؤں میں
جو دوستوں سے ملیں ہنس کے زخم کھاؤں میں
زمانے تجھ کو نہ یہ آئینے دکھاؤں میں
میں چھین لوں تجھے دنیا سے کیا ضروری ہے
کچھ اختیار اگر ہو تو مر نہ جاؤں میں
غرورِ حسن سے جس نے تجھے نوازا ہے
اُسی کے در پہ نہ کیوں سر بھلا جھکاؤں میں
ملا تو کر ترے بارے میں لوگ پوچھتے ہیں
کسے کسے بھلا داغِ ستم دکھاؤں میں
ہر ایک شعر میں رکھ دی ہے داستاں میں۔
تو پڑھ کے دیکھ ترے دل میں گنگناؤں میں
اے کاظمی یہ مقدر کی بات ہوتی ہے
جفا کرے وہ وفا سے نہ باز آؤں میں

○

اکبر کاظمی

○

حالِ دل ان کو سنانا چاہوں
زخم کو پھول بنانا چاہوں
حشر تک حُسنِ تغافل دیکھوں
حشر تک ان کو منانا چاہوں
عام ہو دولتِ کردار و عمل
ہائے میں کیسا زمانا چاہوں
تیرہ و تار جہاں میں رہ کر
چار سُو رنگ اڑانا چاہوں
تیری پلکوں میں بسیرا کرلوں
تیری سانسوں میں سمانا چاہوں
آہ لب پر ہو ترا نام نہ لُوں
درد اُٹھے تو چھپانا چاہوں
ورقِ دل پہ لکیریں کھینچوں
کوئی تصویر بنانا چاہوں
کوفہ و شام کے بازاروں میں
ایک آواز لگانا چاہوں
اُس کے نقشِ کفِ پا کو چوموں
کہکشاؤں میں ٹھکانا چاہوں
کاظمی جو نہ تصور میں بھی آئے
میں اسے دل میں بسانا چاہوں

○

جب بھی جھونکا ہوا کا آیا ہے
تیری تصویر ساتھ لایا ہے
کس نے دل کا دیا جلایا ہے
آج پھر کون یاد آیا ہے
لذتِ قُرب سے ہوا محسوس
عشق پر بھی ہوس کا سایا ہے
پا لیا اس نے زندگی کا خلوص
تیرا غم جس کو راس آیا ہے
لوگ کہتے ہیں چاندنی جس کو
تیرے سیمیں بدن کا سایا ہے
اس میں کچھ زخم بھی فروزاں ہیں
پھول کالر پہ جو سجایا ہے
کاظمی میں نے قصۂ غمِ دل
اپنے اشعار میں سُنایا ہے

○

سلمان سعید

◆

جب بھی تیرے نگر میں آتا ہُوں
غم کی بارش میں بھیگ جاتا ہُوں

ٹُوٹتا ہُوں بکھرتا ہُوں دِن بھر
خواب ہر شب نئے سجاتا ہُوں

صُبح ہونے سے شام ہونے تک
اپنے ہونے کا دُکھ اُٹھاتا ہُوں

دل کی طرح اداس لگتے ہیں
پُھول گُلداں میں جب سجاتا ہُوں

میں ہُوں بچہ، یہ وقت ہے ساحل
ریت پر بیٹھا گھر بناتا ہُوں

◆

چُپ چُپ رہنا سِیکھ لیا ہے
ہر دُکھ سہنا سیکھ لیا ہے

اشکوں کی موجوں نے دل کے
اندر بہنا سیکھ لیا ہے

پتّھر جیسے لوگوں کو بھی
اچّھا کہنا سیکھ لیا ہے

جیون کی تپتی راہوں پر
چلتے رہنا سیکھ لیا ہے

◆

سلمان سعید

○

اُفق پر شمس ڈھلتا جا رہا تھا
سفر لیکن میں کرتا جا رہا تھا

جسے میں جانتا تھا دوست اپنا
وہ دشمن میرا بنتا جا رہا تھا

جو ہر دُکھ سہ رہا تھا خامشی سے
وہ اندر سے بکھرتا جا رہا تھا

لہو میں تر بہ تر تھا اِک کبوتر
مسلسل پھر بھی اُڑتا جا رہا تھا

فلک پر دُور تک چھائے تھے بادل
مگر سب شہر جلتا جا رہا تھا

○

○

جب سے اُس کو پایا ہے
دِل کا چین گنوایا ہے
ہاتھ نہیں آتا ہے جو
خواب ہے یا اِک سایا ہے
باغ میری اُمیدوں کا
یہ کس نے مہکایا ہے
دِل کے سب دُکھ دُور ہوئے
ساون پھر سے آیا ہے
اُس کی یادوں نے ہر سُو
عجب سا رنگ جمایا ہے
پیڑ جو کل تک سُوکھا تھا
سبزہ اُس پہ آیا ہے

○

سلمان سعید

اپنے شہر کا ایک منظر

نہر کے کنارے پہ
حدِ نظر تک
درختوں سے لپٹی خزاں کی اُداسی
مدھر گیت گاتے ہُوئے پانی میں زرد پتّوں کی آہیں،
اُفق پہ
پہاڑوں پہ،
بادل کے ٹکڑوں میں
چُھپتے ہُوئے شمس کے سُرخ آنسو،
پریشاں پریشاں پرندوں کی ڈاریں
تصوّر کی مانند
چُپ چاپ
خاموش!

○

ایک نظم

جیون کی اِس دُھوپ کڑی میں
اُس کی یاد بہت آتی ہے
اندھی رات کے جگراتوں میں
آنکھوں میں آنسو لاتی ہے

کاش میں دل میں چُھپی محبت
اُس سے کُھل کر کہہ سکتا
اپنا اُسے بنا سکتا
اپنے بچّے کی آنکھوں میں
اُس کا چہرہ پا سکتا!

○

تحسین فراقی

○

نہاں نظر سے نہے اور دُو بدُو پکارتا ہے
یہ کون ہے جو مجھے سُو بسُو پکارتا ہے

نہ اس سے رشتۂ جاں ہے نہ اس سے ربطِ نظر
تو کس لیے اسے میرا لہو پکارتا ہے

یہ کس کی نیزہ صفت لَے فضا کو چیرتی ہے
یہ کون دل زدہ راتوں کو "ہو" پکارتا ہے

ہوا ہے ہجر میں وُہ خوگرِ صدا ایسا
کہ عینِ وصل مجھے رُو برو پکارتا ہے

عجیب شہرِ شکم ذات میں گھرا ہُوں جہاں
ہر ایک حرف کلُوا واشربُوا پکارتا ہے

عجب دوراہے پہ قسمت نے لا کے چھوڑا ہے
کہ ہم نفس تو ہے گم اور عدو پکارتا ہے

لکھی ہے دشت نوردی نصیب میں پھر سے
کوئی اُسی کی طرح ہُو بہو پکارتا ہے

○

ڈاکٹر طارق عزیز

○

زیادہ کیا بھلا اب حُسن کی تفصیل میں ہوگا
کوئی دم ہے کہ یہ دل آپ کی تحویل میں ہوگا

بہت بے خواب رہتے ہو، بہت بیدار پھرتے ہو
یقیناً درد کوئی خواب کی تکمیل میں ہوگا

پلٹ آئے ہیں ساحل پر جیسے سب جاکر منزل
وہ شعلہ سا تمھارے چہرے کی قندیل میں ہوگا

میں سب سے بھاگ سکتا ہُوں مگر خود سے کہاں بھاگوں
مرا دشمن، مرا ہی روپ، ہر تمثیل میں ہوگا

میں سُورج کو پکڑنے کا ارادہ کر تو لیتا ہُوں
یہ کارِ جانفشانی کیا مِری تحصیل میں ہوگا؟

نہیں ملتے جو میرے پاؤں، رستے میں بِچھے ہوں گے
جو میرا سر نہیں ملتا، مری زنبیل میں ہوگا

مِری انگشتری کھوئی، تمھارے ہات میں ہوگی
تمھارا پھُول جو گم ہے وہ میری جھیل میں ہوگا

○

○

دن کٹ گیا سفر کا، پھر شام لوٹ آئی
خالی ہُوا ہے رستا، پھر شام لوٹ آئی

کیوں بے مکاں پرندے سُورج کو جھوٹ سمجھے
اِس بات ہی کا ڈر تھا، پھر شام لوٹ آئی

یہ کون سا عمل ہے دن گھُل گیا ہے جس میں
ہے سُرمئی دھُواں سا، پھر شام لوٹ آئی

پہلے تمازتوں میں دِکھتا نہیں تھا کچھ بھی
یہ مرحلہ بھی گزرا، پھر شام لوٹ آئی

کیسے اکیلے اتنے سائے سمیٹتے ہم
سو شام کو پکارا، پھر شام لوٹ آئی

دِکھلا کے دھُوپ منظر، آنکھیں بٹور لی ہیں
کیا کھیل تم نے کھیلا، پھر شام لوٹ آئی

ہم شام کو سفر کے عادی سے ہو چکے ہیں
یہ بھی ہُوا ہے اچھا، پھر شام لوٹ آ

پہلے تو حیرتوں نے سُورج کو دیکھا گرتے
پھر دن کا خواب ٹوٹا، پھر شام لوٹ آئی

○

ڈاکٹر طارق عزیز

نظم

زمیں زادے، چلو باتیں کریں شہرِ تمنّا کی
یہاں تو شام سے پہلے ہی سُورج ڈوب جاتا ہے
یہاں ہر خواب سے پہلے ہی نیندیں چونک اُٹھتی ہیں
بہاریں یُوں گزرتی ہیں
کہ جیسے وقت سے ان کی کوئی ازلی عداوت ہو
کوئی بادل نہیں رُکتا، ہوائیں بے مروّت ہیں

زمیں زادے، یہ چھوٹے چھوٹے سر اور ہاتھ میں رسّی
خبر ہے کس نے ذہنوں سے ارادے نوچ ڈالے ہیں؟
تمھیں معلوم ہے ہونٹوں پہ کیسی چُپ کے تالے ہیں؟
'نہیں ہم شاہ دولہ کی زیارت سے نہیں آئے'
زمیں زادے تمھاری ہی امیدوں کی قسم تم کو
گواہی دو کہ ہر لب پہ گواہی لوٹ آئی ہے

ہوئیں صدیاں کہ آنکھوں میں کوئی سُورج نہیں چمکا
کوئی شبنم نہیں اُتری، کوئی موتی نہیں دمکا
چلو یہ تو ہماری کم نگاہی کی سزا ٹھہری
مگر ہم خواب نہ دیکھیں تو نیندیں بے ثمر اپنی
سماعت بے خبر اپنی، صدا نا معتبر اپنی

زمیں زادے، چلو باتیں کریں شہرِ تمنا کی
یہ باتیں جو سُلگتی ہیں مگر کرنیں نہیں بنتیں
اِنہیں روشن اگر کر پاؤ تو کتنے سخی ٹھہرو
مگر کیا کر سکو گے تم، مگر کیا کر سکیں گے ہم
کہ ہم اس شہر میں بے خواب راتوں کے حوالے ہیں
زمیں زادے، زمیں پہ بلنے والے تھکنے والے ہیں۔

○

منوّر ہاشمی

◆

زمانہ میرے قدموں میں پڑا تھا
مگر میں اس سے بچ کر چل رہا تھا
جو لایا تھا بہاروں کا سندیسہ
وہ لمحہ میری قسمت سے جدا تھا
عجب تھی صورتِ حالات یارو
میں اپنے آپ سے ڈرنے لگا تھا
اندھیرے میں جو اک شعلہ سا بھڑکا
وہ تُو تھا یا ترا سایہ تھا، کیا تھا
کسے محسوس ہوتی زندگانی
کوئی میری طرف کب دیکھتا تھا
کہاں لمحے وہ جن کی جستجو میں
زمانہ خاک اپنی چھانتا تھا
منوّر تھا وہاں خورشید لیکن
اندھیرا شہر پہ چھایا ہُوا تھا

◆

◆

سوچتا ہُوں حاصلِ احساس کیا کیا رہ گیا
جاں تڑپتی رہ گئی اور جسم جلتا رہ گیا
جانے والا جا چکا تھا اور میری آنکھ میں
اک ستارہ سا لرزتا، جھلملاتا رہ گیا
میں بھی پابندِ انا تھا وہ بھی مجبورِ خودی
میں بھی پیاسا رہ گیا اور وہ بھی پیاسا رہ گیا
میری آنکھوں کے لیے حُسنِ بصارت کا سبب
میرے آنگن میں ترا نقشِ کفِ پا رہ گیا
ہم صداقت کے علمبردار ہیں لیکن یہاں
جُھوٹ جو کہتا رہا وہ شخص اچھّا رہ گیا
گو بظاہر کوئی تبدیلی نہیں ماحول میں
اس کے جانے سے مگر کوئی اکیلا رہ گیا
اک چھناکا سا منوّر کانچ کے گھر میں ہوا
کرچیاں مَیں خواب کی پلکوں سے چُنتا رہ گیا

◆

①

یادِ رفتگان

②

تبصرے

زندگی کی شام (خواجہ احمد عباس کے نام)

وحید انور

اب زندگی کی شام آہستہ آہستہ دبے دبے قدموں سے اپنی سیاہ چادر تانے مسافر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد اسے اپنی چادر میں سمیٹ لینا چاہتی تھی۔

آج کی رات مسافر پر بہت بھاری تھی۔
وُہ پچھلے چند دنوں سے اپنی زندگی سے لڑ رہا تھا — اس سے ڈٹ کے مقابلہ کر رہا تھا۔

آج کی رات کیسے کٹے گی ؟
درد اور تکلیف کی یہ رات !

پچھلے پانچ چھ سال سے مسافر بڑی تکلیف کی زندگی گزار رہا تھا — پہلے تو دھیرے دھیرے اس کی بینائی غائب ہونے لگی — پھر اُس کے پاؤں مفلوج ہو گئے۔ چلنا پھرنا اس کے لیے دُوبھر ہو گیا۔ بڑی مشکل سے وہ کسی کے سہارے چل سکتا تھا — آہستہ آہستہ کچھوے کی چال — اور پھر بلڈ پریشر کی شکایت بھی اسے ہو گئی تھی — ذرا ذرا سی اور معمولی بات پر وُہ غصّہ میں آجاتا تھا اور بے قابُو ہو کے چلّانے لگتا تھا۔

زندگی جیسے ایک عذاب ہو گئی تھی — ایک جہنّم — اور وہ جیسے جہنم کی اس آگ میں جل رہا تھا — بھُن رہا تھا۔

”میں نے تو کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا — کسی کا دل نہیں توڑا — کسی کو دُکھ نہیں دیا — پھر یہ عذاب مجھ پر کیوں نازل ہُوا ؟“ وہ سوچنے لگا — لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا تھا۔

شاید یہی اس کی تقدیر تھی۔ اُس کے کرموں کا پھل — شاید اُس کی قسمت میں زندگی کا یہ ظلم برداشت

کرنا لکھا تھا —— حالانکہ وُہ کبھی بھی تقدیر یا قسمت کا قائل نہیں تھا —— لیکن اب اس کا یقین متزلزل ہوتا نظر آتا تھا۔

ایسے لگتا تھا اب اُسے دکھ جھیلنے اور ظلم برداشت کرنے کی عادت ہوگئی تھی —— یُوں وُہ چُپ چاپ دکھ برداشت کر رہا تھا —— لیکن زبان سے اُف تک نہیں کرتا تھا۔

زندگی کے ٹیڑھے میڑھے کھُردرے راستوں پر اُسے ابتدا ہی سے چلنے کی عادت ہوگئی تھی۔ وہ چلا جا رہا تھا —— اپنی منزل کی طرف —— اُس نے پیچھے پلٹ کے کبھی نہیں دیکھا —— راستے میں رُکنے یا دم لینے کا نام تو وُہ جانتا ہی نہیں تھا۔

اس کی طبیعت سیماب صفت تھی —— بس ہر وقت وُہ اپنے کام میں مصروف رہتا تھا —— بیکار بیٹھنا تو جیسے وُہ جانتا ہی نہیں تھا —— نئی نئی منزلوں کی کھوج میں نکل جانے کو بے قرار رہتا تھا۔

اوائل عمر ہی میں اُس نے دُنیا کا پہلا سفر کیا تھا —— زندگی کے اس پہلے سفر کا حال اُس نے لکھا تھا "مسافر کی ڈائری"۔

اُس وقت سے وہ مسلسل "سفر" میں تھا —— رواں دواں۔

لیکن اب وہ کچھ عجیب حالات کا شکار ہو گیا تھا۔

وقت کے بے رحم ہاتھوں میں وُہ بے بس ہو گیا تھا۔ حالات کے غیر متوقع تھپیڑوں نے اُسے کمزور اور نڈھال کر دیا تھا —— وُہ جسمانی طور پر ٹوٹ رہا تھا —— کھوکھلا ہوتا جا رہا تھا —— زندگی جیسے رینگنے لگی تھی —— اپاہج ہوگئی تھی —— لیکن پھر بھی وہ حسبِ معمول کام کر رہا تھا —— اُس کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا —— وہ اسی لگن —— اسی گرمی —— اور اسی جوش سے کام کر رہا تھا۔ اُسے اس بات کی فکر نہیں تھی کہ اُس کا جسم ٹوٹ رہا ہے —— اُس کے اعضا جواب دے رہے ہیں۔

لکھنا ہی مسافر کی زندگی تھی —— اُس کی روٹی روزی تھی۔ صبح سے شام تک وُہ لکھتا رہتا تھا۔ اب یہ اس کی مستقل عادت ہوگئی تھی۔ لکھے بغیر اُسے چین نہیں پڑتا تھا —— چاہے گھر ہو ٹیکسی ہو —— ٹرین ہو یا ہوائی جہاز ہو —— اُس کا قلم اُس سے کبھی جُدا نہیں ہوتا تھا۔

اُس کا دماغ الگ الگ خانوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان خانوں میں سے جو بھی چیز وہ چاہتا نکال لیتا —— اس کا دماغ اچھا خاصا کمپیوٹر تھا جس سے الفاظ ڈھل ڈھل کے نکلتے تھے۔

وہ اکثر کہتا: "وقت بہت کم ہے اور کام زیادہ" اس لیے اس نے وقت کی قدر کی، کبھی وقت ضائع نہیں کیا۔ جیسے وقت کو اس نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا — ایک ایک پل کو جکڑ لیا تھا۔

وہ سوتے میں بھی جاگتا تھا اور اُس کا دماغ سوچ کے تانے بانے بُنتا رہتا تھا۔

بہت پہلے ہی اُس نے انسانوں سے پیار کرنا سیکھ لیا تھا۔ دراصل بچپن کے ایک واقعہ نے اُس کی زندگی کا رُخ موڑ دیا تھا۔

اُن دنوں وُہ ابھی بچہ تھا۔ ایک دن ایسے ہی اُس نے گھر کے ملازم کو کچھ بُرا بھلا کہہ دیا تھا۔ اُس سے بدسلوکی کی تھی۔ جب اِس بات کی اطلاع اُس کے ابّا تک پہنچی تو اُنہوں نے اُس کو بڑی سخت سزا دی۔ اُنہوں نے فوراً اُسے ایک کمرے میں بند کر دیا — دن بھر اُسے کمرے میں بند رہنا پڑا — اور وہ بھی بھُوکا پیاسا — شام کو جب اُسے کمرے سے نکالا گیا تو بھُوک کے مارے اُس کا بُرا حال ہو گیا تھا۔

"چلو معافی مانگو اس سے۔" ابّا نے اُسے ملازم سے معافی مانگنے کا حکم دیا۔

جب اُس نے ملازم سے معافی مانگ لی تو اُسے معاف کر دیا گیا۔

پھر اس کے ابّا نے سمجھایا "یاد رکھو ہر انسان سے اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ اُس سے خوش اخلاقی سے پیش آنا چاہیے خواہ وہ کتنا ہی حقیر یا چھوٹا کیوں نہ ہو اُس کی عزّت کرنی چاہیے۔"

اُس نے اپنے ابّا کی یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ اُس دن سے اُس نے انسانوں سے پیار کرنا اور ان کی عزت کرنا سیکھ لیا اور بھید بھاؤ، اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کے فرق کو مٹا دیا۔

ہائی سکول کا امتحان پاس کرتے ہی اُسے اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں یونیورسٹی میں اُس نے اپنا مقام پیدا کر لیا اور پھر وہاں اُس کا شمار مقبول طالب علموں میں ہونے لگا۔

اعلیٰ درجے میں اُس نے بی۔ اے اور پھر ال۔ بی کے امتحان پاس کیے اور تعلیم مکمل کر کے دہلی چلا آیا۔ کچھ عرصہ دہلی میں رہنے کے بعد وہ بمبئی آ گیا۔ شروع ہی سے اُسے جرنلزم سے فطری لگاؤ تھا۔ یہاں بمبئی میں اُسے ایک انگریزی اخبار "بمبئی کرانیکل" (BOMBAY CHRONICLE) میں کام مل گیا بڑی محنت اور لگن سے اُس نے اخبار میں کام کرنا شروع کیا۔

ایک دن اتفاق سے اُسے اخبار کا فلمی صفحہ لکھنے کا موقع مل گیا۔ اُس کا لکھا ہُوا یہ پہلا صفحہ اس قدر مقبول ہُوا کہ ساری فلمی دُنیا میں آن کی آن میں اُس کی شہرت ہو گئی۔ ایک مشہور کمپنی نے اسے اپنا پی۔ آر۔ او نامزد کر دیا۔ یہ کوئی چالیس پینتالیس سال پہلے کی بات ہے۔

اب وہ کھولی[1] سے نکل کے فلیٹ میں آ گیا تھا — شیواجی پارک کے علاقے میں اُسے

---

[1] بمبئی کی زبان میں کھولی ایک نہایت مختصر سے کمرے کو کہتے ہیں جس میں دو تین آدمی بہ مشکل رہ سکتے ہیں۔

ایک فلیٹ مل گیا۔

اُن دنوں بمبئی میں اچانک فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا تھا۔ شہر میں ہر طرف ابتری اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی گھر لُوٹے اور جلائے جا رہے تھے۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اگر کوئی ہندو مسلمانوں کے محلّے میں چلا جاتا تو وہ وہاں سے بچ کے نہیں آ سکتا تھا۔ اور اگر کوئی مسلمان ہندوؤں کی بستی میں چلا جاتا تو اس کا وہاں سے بچ کے آنا مشکل تھا۔

دراصل مذہب کی آڑ میں یہ فساد غنڈے پھیلا رہے تھے ——— غنڈے جن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ——— ہندو غنڈے ——— اور مسلمان غنڈے۔

مسافر ہندوؤں کے محلّے شیواجی پارک میں رہ رہا تھا جو ان لوگوں کا گڑھ سمجھا جاتا تھا ——— لیکن وہاں رہتے ہُوئے اُسے کوئی ڈر یا خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ چاہتا تو مسلمانوں کے کسی محفوظ علاقے میں منتقل ہو سکتا تھا۔ لیکن اُس نے اپنا فلیٹ نہیں چھوڑا۔ ایسے نازک وقت میں وُہ رات دیر گئے ایک دو بجے اخبار کے دفتر سے گھر لوٹتا، حالانکہ یہ دفتر گھر سے کافی دُور فونٹین کے علاقے میں واقع تھا۔

کرفیو کی وجہ سے رات کی ڈیوٹی کرنے والوں کو پاس جاری کئے گئے تھے اور دوسرے لوگوں کے آنے جانے پر پابندی تھی۔

ایک رات وُہ تھکا ماندہ کام کر کے دفتر سے گھر لوٹ رہا تھا ——— جب وہ شیواجی پارک کے قریب پہنچا اور اپنے گھر کی طرف چلنے لگا تو اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ایک لمحے کے لیے وہ رک گیا۔ پلٹ کے دیکھا تو پیچھے ایک آدمی چلا آ رہا تھا ——— مسافر آگے بڑھ گیا ——— آدمی بدستور اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

"اب تو جان کی خیر نہیں! اُس نے دل میں سوچا۔ ضرور کوئی غنڈہ ہو گا۔ اور فوراً اُسے چھُرا گھونپ کے ختم کر دے گا۔"

خاموش دم سادھے ہمّت کر کے وہ پھر آگے بڑھنے لگا۔ اُس کے پاؤں جیسے منوں بھاری ہو گئے تھے آہستہ آہستہ اُس کے قدم اُٹھ رہے تھے ——— دِل خوف سے کانپ رہا تھا۔

"عبّاس بھائی!" پیچھے سے اچانک آواز آئی

مسافر نے پلٹ کے دیکھا ——— اجنبی اُس کے بہت قریب آ چکا تھا۔

"عبّاس بھائی!" اجنبی اس سے مخاطب ہوا" میں ایک مل مزدور ہُوں۔ آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ اخبار میں کام کرتے ہیں نا!"

مسافر کو سخت تعجب ہُوا۔ ایک لمحے کے لیے جیسے وُہ سوچ میں پڑ گیا۔

"عباس بھائی!" مِل مزدور بولا "دراصل بات یہ ہے کہ ہم لوگ بستی میں فساد کو روکنے کے لیے ایک امن کمیٹی بنانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں آج رات شیواجی پارک میں ایک میٹنگ رکھی ہے آپ کو بھی وہاں چلنا ہے، اور کچھ بولنا ہے۔"

"ہاں! — اچھا — اچھا — تو چلو۔" مسافر بغیر سوچے سمجھے فوراً بولا۔ اور پھر مل مزدور کے ساتھ شیواجی پارک کے میدان کی طرف چل پڑا

میدان میں اچھا خاصا مجمع تھا۔ جہاں زیادہ تر مِل مزدور، چھوٹا موٹا دھندا کرنے والے اور متوسط طبقے کے لوگ جمع تھے۔

مختلف لوگوں نے فسادات کو روکنے کے لیے تجاویز پیش کیں اور امن کمیٹی قائم کرنے کے لیے زور دیا جب مسافر کی باری آئی تو اُس نے ایک دُھواں دھار تقریر کی۔ جب اُس کی تقریر ختم ہُوئی تو سارے لوگوں نے نہایت گرمجوشی سے تالیاں بجا کے اس کا سواگت کیا۔

یہ واقعہ مسافر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ تھا۔ اس کا مسافر کی زندگی پہ گہرا اثر پڑا۔ اس واقعہ نے مسافر کی زندگی کا رُخ عام لوگوں کی طرف موڑ دیا۔

اور پھر ایسے کتنے ہی واقعات اس کی زندگی میں آتے اور وہ عوام اور محنت کش مزدوروں کے قریب آتا گیا، اُن کی طرف کھنچتا گیا۔ اب وہ اپنے آپ کو اِن ہی میں کا ایک فرد سمجھنے لگا۔ اُن کے رہن سہن، دُکھ سُکھ، آرزوؤں اور خوشیوں کو اُس نے اپنے سینے سے لگا لیا — اور پھر وہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے ہجوم میں کھو گیا۔ ان کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔

دُور دراز سے لوگ اُسے میٹنگوں میں بُلاتے اور وُہ اُن کے ساتھ چلا جاتا — ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک — ہر جگہ وُہ پہنچ جاتا کیونکہ اب وہ انسانوں سے اٹوٹ پیار کرنے لگا تھا — اُسے انسان کی عظمت پہ پُورا یقین تھا — وہ انسان سے مایوس نہیں تھا۔

اُس نے اپنی زندگی میں روپے پیسے کو کبھی اہمیت نہیں دی — روپیہ پیسہ اُسے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ دولت اور جائداد رکھنے کے وہ سخت خلاف تھا۔ جب بھی اس کے پاس پیسہ آجاتا تو وہ اسے دوستوں، ضرورتمند غریبوں اور طالب علموں میں بانٹ دیا کرتا۔ لاکھوں روپے اس نے کمائے اور سب ان لوگوں میں بانٹ دیا۔

اُس کے پاس صرف ایک ہی دولت تھی — وہ تھی علم کی دولت — وہ اس علم کی دولت کو ہر جگہ پھیلانا چاہتا تھا — دُور دُور تک —

اپنی کہانیوں کے ذریعے۔

اپنے کالموں اور مضامین کے ذریعے ۔

اپنی فلموں کے ذریعے ۔

وہ روشنی کا ایک مینار تھا جس سے انسانیت، سچّائی، ہمدردی اور پیار کی روشنی ہر وقت پھُوٹتی تھی۔ زندگی بھر وُہ یہ روشنی دوسروں کو دیتا رہا تھا لیکن اب یہ روشنی اُس سے چھینی جا رہی تھی دھیرے دھیرے اُس سے غائب ہوتی جا رہی تھی ـــــ اس کی بجائے اُس کے اطراف فضا میں اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔

"وہ بھی کیا دن تھے !" وُہ سوچنے لگا "ہر وقت لوگ اُسے گھیرے رہتے تھے ۔ اس کے ایک اشارے پر آگے پیچھے دوڑتے تھے ـــــ اُس کی تعریف کے پُل باندھتے تھے (حالانکہ وُہ جانتا تھا اس میں کتنا جھُوٹ شامل ہے) اور ایک آج کا دن تھا ـــــ وُہ ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم کے ایک چھوٹے سے کمرے میں بستر پر پڑا موت و حیات کے درمیان لٹک رہا تھا ـــــ اپنی سانسوں کا ایک ایک پَل ـــــ ایک ایک گھڑی گن رہا تھا ـــــ کمزور ـــــ بے بس ـــــ اور ایک اپاہج انسان ۔

کہاں چلے گئے تھے وہ لوگ جو اُس کی دوستی کا دم بھرتے تھے ـــــ جو اُس کی زندگی کے ساتھی اور دوست بنے ہوئے تھے ؟

کہاں تھے وُہ لوگ جو دامے درمے سخنے اُس سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے ؟

کہاں تھے وہ رشتے دار ـــــ اُس پر اپنا حق جتانے والے ـــــ جو اس طرح اُسے یہاں اکیلا چھوڑ کے چلے گئے تھے ؟

وہ اس وقت اپنے آپ کو ALIEN محسوس کر رہا تھا ـــــ رشتے ناطوں کی بھیڑ میں اپنے آ کو بالکل تنہا محسوس کر رہا تھا ـــــ یہ سب لوگ ـــــ دوست ـــــ ساتھی اور رشتے دار اب اُسے اجنبی لگ رہے تھے ـــــ کوئی بھی اس وقت اُس کی دلجوئی کرنے والا نہ تھا ـــــ اُسے تسلّی دینے وا نہ تھا ۔ ہمدردی اور پیار کے دو بول بولنے والا نہ تھا ۔

اُس کے چہرے پر اک گہرے کرب کے آثار نمایاں تھے ۔

"اُف یہ زندگی !" اُس نے سوچا "کیا اس طرح گھُٹ گھُٹ کے مرنے کا نام زندگی ہے !"

زندگی کے کتنے ہی دلچسپ واقعات اور حادثات اُس کے دماغ میں جیسے گڈمڈ ہو گئے ۔ کتنی ہ رنگین کہانیاں اُس کی آنکھوں کے سامنے تیزی سے گھوم گئیں ـــــ یکے بعد دیگرے ۔

کتنی محنت کی تھی اُس نے اپنی زندگی کو بنانے میں ـــــ کس قدر کام کیا تھا !

کام ہی اُس کے لیے عبادت تھی ـــــ ہر وقت وُہ کتابوں اور اخباروں کے انبار میں گھرا ہُوا ہوتا اُس کے ہاتھ میں قلم ہوتا ـــــ اور یہ قلم کاغذ کے صفحات پر اس طرح دوڑتا جیسے رُکے گا نہیں ۔

اپنی تحریروں سے اُس نے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کیا ـــــ اُن کے دماغ میں جِلا پیدا کی ـــــ انسانی قدروں کا پرچار کیا ۔

اپنے پرچار کی خاطر بعض وقت اُسے انتہا پسندوں سے بُرا بھلا سننا پڑا ـــــ یہاں تک کہ گالیاں بھی کھانی پڑیں ۔

مسافر نے اس کی کوئی پروا نہیں کی ـــــ وہ کبھی دل برداشتہ نہیں ہُوا ۔ بس چپ چاپ اپنا کام کرتا رہا ۔

لیکن اس وقت وہ نرسنگ ہوم کے بستر پر پڑا خود اپنے آپ کے بارے میں سوچ رہا تھا ـــــ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کا کام ادھورا رہ گیا ۔ کتنے ہی کام اُسے کرنا تھے ـــــ لیکن یہ زندگی ! ـــــ زندگی نے اُس سے وفا نہ کی ـــــ آخر کیوں ؟ ـــــ کیوں ! ـــــ کیوں ؟ ـــــ اس کے دماغ میں بار بار یہ سوال اُٹھ رہا تھا ۔

اُس نے زندگی کو کیا کچھ نہیں دیا تھا ـــــ اپنے سُکھ آرام اور خوشیوں کو تیاگ کے زندگی کو سنوارنا چاہا تھا ـــــ خوشیاں دینا چاہا تھا ـــــ لیکن یہی زندگی اب اسے دُکھ دے رہی تھی ـــــ اُس کا گلا گھونٹ رہی تھی ۔

یہ زندگی آج مجھ سے کیوں بے وفائی کر رہی ہے ؟
" میں جو زندگی کے زہر کی ایک ایک بوند آج تک پیتا رہا ہُوں ۔
میں جو زندگی کی صلیب کو اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتا رہا ہوں ۔
میں جو زندگی کے ساتھ ساتھ ہر جگہ سائے کی طرح چلتا رہا ہُوں ۔
کس قدر ظالم ہے یہ زندگی ! "

آج وُہ اپنے ناتوان اور کمزور جسم کے پنجر کو لیے نرسنگ ہوم کے اس چھوٹے سے کمرے میں بستر پہ پڑا موت کی گھڑیاں گِن رہا ہے ۔

ایک مفلس ـــــ قلاش ـــــ مجبور انسان ۔

وہ ہاتھ جس نے لاکھوں روپے ضرورت مندوں اور محتاجوں میں بانٹ دیئے آج وہ ہاتھ خالی ہیں

——— دوا دارو اور نرسنگ ہوم کا بِل چُکانے کے لیے تک اُس کے پاس پیسے نہیں ہیں !

"کیا یہی میرا مقدر ہے ——— کیا یہی زندگی بھر کے کام کا صلہ اور انعام ہے !"

اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پیدا ہُوئی ——— جیسے آج وہ اِس زندگی کو چبا کے تھوک دینا چاہتا تھا۔

"نہیں نہیں ———" دُوسرے ہی لمحے اِس نے سوچا "زندگی کوئی اتنی معمولی چیز نہیں ہے کہ اسے چبا کے تھوک دیا جائے ——— زندگی بہت قیمتی چیز ہے اس کی قدر کرنی چاہیے ——— اے زندگی ! میں تیری قدر کرتا ہُوں ——— آج تک تُو نے میرا ساتھ دیا۔ لیکن آج میں تجھے چھوڑ کے جا رہا ہُوں ——— تجھ سے جُدا ہو رہا ہُوں ——— لیکن میں تجھ سے مایوس نہیں ہُوں ——— مجھے تجھ سے جدائی کا کوئی غم نہیں ہے ——— دُکھ نہیں ہے ——— میں پھر آؤں گا ——— اِس دھرتی پر دوبارہ جنم لوں گا ——— ہاں دوبارہ جنم لوں گا۔

"معصوم بچوں کی مسکراہٹوں میں۔
کڑیل نوجوانوں کے بازوؤں کی طاقت میں۔
کنواریوں اور عورتوں کے وقار اور ان کی آن بان میں۔
بڑے بوڑھوں کی ذہانت اور ان کی دور رس نگاہوں میں۔"

"میں ہر دور ——— ہر زمانے میں جنم لُوں گا ——— اور ظلم و ستم کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوں گا ——— ہر قسم کی نا انصافی کے خلاف اپنی آواز اٹھاؤں گا ——— میں انسانی حقوق کے لیے ہر جگہ سینہ سپر ہو جاؤں گا۔"

مسافر کی آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہونے لگیں ——— بہت ہی آہستہ اور مری ہُوئی آواز میں اس کے پھڑپھڑاتے ہوئے ہونٹوں سے آواز نکلی ——— الوداع ——— الوداع اے زندگی !

زندگی کا وہ آخری لمحہ ——— وہ آخری پل ! ——— اور پھر زندگی کا سارا کھیل تماشہ ختم !

مسافر ہمیشہ کے لیے اِس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

زندگی کے سٹیج پر وُہ آیا ——— ایک چھوٹا سا اداکار ——— کہنے کو وہ ایک چھوٹا سا اداکار تھا لیکن اُس نے کتنا بڑا کردار ادا کیا تھا ——— زندگی کا سب سے بڑا کردار ——— سب سے اہم کردار !

آنے والے زمانے میں زندگی کے اس سٹیج پر اور بھی کئی اداکار آئیں گے ——— اپنا اپنا کردار ادا کر کے رخصت ہو جائیں گے۔ لیکن مسافر نہیں آئے گا ——— شاید اس کا کردار کوئی ادا نہ کر سکے گا ———

—— پچاس سال میں نہیں —— آئندہ سو سال میں بھی نہیں۔
لوگ اُس کے کردار کو بھول نہیں پائیں گے —— اس کا کردار ہمیشہ زندہ رہے گا —— اُس کی یادوں
خوشبو زندگی کے سطح پر ہمیشہ مہکا کرے گی۔
اُس کی یادیں لوگوں کا مسلسل پیچھا کرتی رہیں گی —— مسلسل ! —— مسلسل ! ! ——
مسلسل ! ! !

ابنِ حسن برنی

منظور الٰہی

ایک خط میں برنی صاحب نے لکھا تھا :

" اردو مرکز میں قدرت اللہ شہاب اور مختار مسعود اپنے مضامین پڑھ چکے ہیں، اب آپ کی باری ہے، جب لندن آنا ہو ایک شام اِس تقریب کا اہتمام ہوگا۔"

اردو مرکز کی طرف سے لندن آنے کی دعوت ملی۔ مگر یہ سان گمان نہ تھا کہ مضمون کا عنوان 'ابنِ حسن برنی' ہوگا۔ حافظ کا یہ شعر میرے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا : ؎

دوش بر یادِ حریفاں بخرابات شدم
خُمِ مے دیدم و خون در دل و پا در گِل بُود

[دوستوں کی یاد میں کل رات میں میخانے کی جانب گیا، شیشے میں مے باقی دیکھ کر میرا جی بھر آیا
دل خون ہوگیا اور پاؤں کیچڑ سے لت پت ہوگئے]

اس شعر کا ترجمہ یُوں بھی ہوسکتا تھا :

جب آہ اُن احباب کو   میں یاد کر اُٹھتا ہوں جو
یُوں مجھ سے پہلے اُٹھ گئے   جس طرح طائر باغ کے
یا جیسے پھُول اور پتّیاں   گر جائیں سب قبل از خزاں
اور خشک رہ جائے شجر

دیکھتے دیکھتے اجل کا سیلِ رواں ایک متحرک شخصیت کو بہالے گیا، دوستوں اور عزیزوں کے لیے یہ ایک ہوش رُبا حادثہ تھا، وہ منفرد اور عزیز ہستی تھی

ڈھونڈو گے اگر مُلکوں مُلکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

کے مصداق انمول خوبیوں سے مرصّع تھی، برنی کا تعلق اُس طائفے سے تھا جس کے متعلق کسی نے کہا تھا : ؎

باآں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند
ز ما سلام رسانید ہر کجا ہستند

وہ عوام و خواص میں یکساں مقبول تھے، اُن کے دوستوں اور عقیدت مندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، دلپذیر

صفات کی رنگا رنگ ٹکڑیاں ایک ہشت پہلو شخصیت میں جگمگا رہی تھیں، ایک جاذب شخصیت جو بیک وقت مثبت اور دلپذیر تھی۔

خون کا رشتہ ایک حادثہ ہے مگر دو دلوں کا رشتۂ مودّت میں منسلک ہونا ایک اختیاری امر ہے، ایک لحاظ سے یہ باہمی کشش بھی اپنے اختیار میں نہیں، انجانے طور پر ہم ایک شخص کو پسند کرنے لگتے ہیں، تعلقِ خاطر پیدا ہونے کے بعد ہم اپنے دوست کی خوبیاں تلاش کرتے ہیں یا یہ کہ اُس کی خوبیاں ہی ہمیں اس کا گرویدہ بناتی ہیں، لاریب بے لوث محبت قدرت کا گرانقدر عطیہ ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔

آئی۔سی۔ایس۔ اور سی۔ایس۔پی کے افسرِ اعلیٰ اور میرے محسن آئی۔یُو۔خان بڑے بااخلاق اور بامروّت انسان تھے، اُن کے ہاں چائے کی دعوت پر برنی صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی تھی بلکہ اُنھوں نے خود ہی اپنا تعارف کروایا تھا، یہ صُوبہ مغربی پاکستان کی تشکیل کے دن تھے جسے کم و بیش تیس برس ہونے کو آئے، ان کی شخصیت میں مٹھاس تھی، دل موہ لینے والی جاذبیت تھی، دو چار ملاقاتوں میں ہی واقفیت دوستی میں بدل گئی، انھیں اردو ادب اور شعروشاعری سے دلچسپی تھی جو ایک قدرِ مشترک بن گئی، ناصر کاظمی اور دُوسرے شعرا کا کلام سُننے کے لیے اکٹھے آتے جاتے، جمیل نشتر مرحوم کا لاہور آنا ہوتا تو برنی ادبی نشست کا اہتمام کرتے، تواضع کا انداز ایسا ہوتا جیسے ہم اُن پر احسان کر رہے ہوں، بینکاروں کے چھوٹے بڑے کام خوش دلی کرتے، یاد نہیں پڑتا کہ اُنھوں نے مجھے کوئی کام کہا ہو۔

لاہور میں یونائیٹڈ بینک کا علاقائی دفتر کھُلے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ کارپردازان کو پڑھے لکھے طبقے کے اکاؤنٹ حاصل کرنے کا خیال آیا کہ یُوں بینک کی ساکھ بڑھے گی، وُکلا، ڈاکٹر، اساتذہ، انتظامیہ کے افسران وغیرہم، اس مقصد کے لیے چند افسران کا انتخاب کیا گیا، ایک ایسے نوآموز نے برنی صاحب سے شکوہ کیا کہ بیٹھنے کے لیے اُسے کمرہ نہیں دیا گیا، نہ ہی اُس کے پاس کوئی فون ہے، خدا جانے برنی کس مٹّی کے بنے ہوئے تھے، فور کہنے لگے؛

"صاحب! یہ آپ ہی کا کمرہ ہے، آپ میرے کمرے میں بیٹھئے، یہی فون استعمال کیجیے۔"

بینک میں نووارد بے یقینی کے عالم میں اُن کا مُنہ تکنے لگا، آج کل کے دور میں یہ بات ناقابلِ یقین سمجھی جائے گی کیونکہ ہم گریڈ اور مراتب کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔

نوجوان مسعود نے جوش و خروش کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا مگر شومیٔ قسمت سے وہ ایک RIEFLESS LAWYER کے ہاں جا پہنچا جو بد دماغ بھی تھا، کچھ ردّ و قدح کے بعد اُس نے اپنا اکاؤنٹ کھولنے کے لیے پا روپے کا چیک دیا، وہ بھی حیدرآباد کے کسی بینک کا، مصروفیت کی وجہ سے مسعود چند روز چیک نہ بھیج سکا تو وکیل برنی صاحب پر برس پڑے اور فون پر جلی کٹی سنائیں، برنی تحمل سے اُس کی بات سنتے رہے اور معذرت خواہانہ اند میں "جی۔جی... درست فرمایا" کہتے رہے۔ اس گفتگو کے دوران مسعود کمرے میں موجود تھا مگر اُس کے حُسنِ اخا

نے گوارا نہ کیا کہ وکیل صاحب سے کہیں کہ مسعود اِسی کمرے میں موجود ہے، اُس سے بات کر لیجیے۔ علاقائی انچارج کی خوش اخلاقی نے اِس نوجوان کے دل میں گھر کر لیا اور وہ انھیں ایک "ہیرو" کے روپ میں دیکھنے لگا۔ مسعود کا کہنا تھا کہ اُس نے زندگی میں ایسا شیریں کلام شخص نہیں دیکھا، اُن کی گفتگو میں شاعری کی گھلاوٹ ہوتی۔ فرائض منصبی کی ادائیگی میں مسعود کو بسا اوقات برنی صاحب کے ہمراہ باہر جانے کا اتفاق ہوتا، اُس نے بتلایا تھا کہ برنی بڑے مخیّر تھے۔ راستے میں جو سائل مل جاتا اُسے عام روش سے بڑھ کر دیتے بلکہ کسی نادار کی خستہ حالی دیکھ کر اُس زمانے میں پانچ دس روپے بھی دے دیتے، کبھی یُوں بھی ہُوا کہ کوئی مانگنے والا دیکھ کر مسعود نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور برنی صاحب نے روک دیا:

"اِس سائل کو دیکھ کر مَیں نے دینے کی نیّت کر لی تھی، آپ کسی اور کو دے دیجیے۔"

کردار کا ایک اور پہلو اُن کی زبردست قوتِ ارادی تھی، وُہ کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتے تھے، کچھ کرنے کا عزم کر لیتے تو اُسے مکمل کر کے دم لیتے۔

"مسعود صاحب! فلاں شخص باہر سے لوٹ آیا ہے، آپ وہاں پہنچ جائیں، ملاقات طے ہو جائے تو مجھے فون کر دیں۔"

"جناب! وہ آج ہی لاہور واپس آیا ہے، کار بھی نہیں ہے، کل صبح جانا مناسب نہ ہوگا؟"

"نہیں، ہمیں یہ کام آج ہی کرنا ہے۔ آپ میری گاڑی لے جائیے، میں چھوٹی گاڑی لے کر پہنچتا ہُوں۔"

بھلائی اُن کی سرشت میں تھی، احسان جتلائے بغیر وہ ضرورت مندوں کے کام کرتے تھے، دوستوں کی فرمائش پر 'نہ' کا لفظ اُن کی لُغت میں نہیں تھا۔

"برنی صاحب! ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکا مدّت سے بیکار ہے، بڑا پریشان ہے۔"

"کوئی بات نہیں اُسے میرے پاس بھجوا دیجئے۔"

"برنی صاحب! فلاں نوجوان بڑا غریب ہے اور اپنے خاندان کا واحد سہارا ہے۔"

"ہو جائے گا صاحب!"

یہ اور بات ہے کہ یونین کے صدر کی حیثیت سے اِسی صاحبزادے نے پَر پُرزے نکالے، برخوردار کو شیخی بگھارنے کا موقع ہاتھ آیا اور ووٹ دہندگان کو مرعوب کرنے کے لیے منیجر کے کمرے کا دروازہ ہاتھ سے کھولنا عار سمجھنے لگا، بالآخر انجام وہی ہُوا جو تکبّر کا ہوتا ہے۔

عمر بھر برنی صاحب نے بے شمار لوگوں کی دستگیری کی، چند برس بعد اُن کے ایک ہم عصر سے واسطہ پڑا جسے ہمسری کا دعویٰ بھی تھا مگر انسان دوستی کے ضمن میں موصوف بالکل کورے تھے، کبھی ایسا ذکر ہوتا تو اِدھر اُدھر کی بات کر کے ٹال جاتے۔

ون یونٹ کے خاتمے پر سابق صوبوں کی تجدید ہوئی۔ میں کراچی میں تعینات ہوا، ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا مگر برنی اور یونائیٹڈ بینک لازم و ملزوم تھے۔ ادارے سے وفاکیشی کا یہ عالم تھا جیسے ذات اور ادارے کا مکمل ادغام ہو، بے پناہ مصروفیتیں انھیں گھیرے رہتیں، عموماً رات گئے گھر لوٹتے، وہ جانتے تھے کہ کامیابی کے لیے مسلسل محنت شرطِ اوّلین ہے، اِسی کی بدولت اُنھوں نے ترقی کا زینہ سُرعت کے ساتھ طے کیا گو چند برس بعد خرابیِ صحت کی صورت میں اُس کی کڑی قیمت ادا کرنا پڑی، بینک کے پریذیڈنٹ آغا حسن عابدی کے ساتھ اُن کا رشتہ محض ایک جُونیئر اور سینئر کا نہ تھا بلکہ اُس میں بے پایاں عقیدت، نیازمندی اور وفاکیشی کی جھلک تھی، اُن کا ہر حکم پتھر پر لکیر تھا اور اُن کی ہر خواہش وہ بلا تامّل اور بکمال عجلت پُوری کرنا چاہتے تھے، بینک کی ترقی اور توسیع کے سلسلے میں آغا صاحب عملے کے ہر فرد کا بھرپور تعاون چاہتے تھے، اس حکمتِ عملی کو بروئے کار لانے میں برنی صاحب کی کلیدی حیثیت تھی۔ مصروفیت کے باوجود وہ اِس ٹوہ میں رہتے کہ مل بیٹھنے کا موقع ہاتھ آئے، دعوت کرنے کا کوئی جواز ہو ؎

اے عزیزاں غنیمت است لقا ذوقِ دیدارِ یک دگر گیرید
دوستاں در عزیمتِ سفرند یک زماں لذّتِ نظر گیرید

[اے عزیزو! پیار سے ایک دوسرے کو دیکھو اور اسے غنیمت جانو۔
دوست رخصت ہونے کو ہیں، انھیں ایک بار جی بھر کے دیکھ لو]

کراچی میں احباب کی چوکڑی برنی صاحب کے ہاں جمتی یا یوسفی صاحب کے گھر پر، چند اور دوست شریک ہو جاتے۔ باہر سے کوئی مہمان آجاتا تو فرازکوہ پر واقع شیزان ہماری پسندیدہ جگہ ہوتی۔ ایک ہی مضمون پر مختلف شعرا کے اشعار دہرائے جاتے، کبھی ادبی شخصیتیں زیرِ بحث آتیں، کبھی کوئی تازہ کتاب یا افسانہ، سیاست پر اظہارِ خیال تو خیر ہم لوگوں کی گھٹی میں ہے، دنیاوی جھمیلوں سے دُور دو تین گھنٹے ہنسی خوشی گزر جاتے۔ انسان کو یہ خوش فہمی رہتی ہے کہ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا، زندگی اِسی طور آگے بڑھتی رہے گی، دوست احباب کی محفل جمی رہے گی اور ایسی خوش وقتی کبھی ختم نہیں ہوگی۔

ادب اور شعر و شاعری کا ذکر چل نکلا ہے تو معذرت کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بینکاری سے اِس کا رشتہ نہیں جُڑتا، عام تاثر یہ ہے کہ بینکار صبح و مسا جمع و تفریق کے چکّر میں رہتا ہے اور دن بھر کی تھکن اسے فنونِ لطیفہ کے قریب پھٹکنے نہیں دیتی، یہ کلیہ صحیح ہو یا غلط چند ہستیاں بہرحال مستثنیٰ ہوتی ہیں، برنی اردو ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے، وہ رسائل اور ماہنامے بالاستیعاب دیکھتے تھے، بہت برس پہلے بلونت سنگھ کا طویل افسانہ ”رات، چور اور چاند“ نقوش میں قسط وار چھپا تھا، افسانہ نگار نے اُس کا اختتام ایسے ڈرامائی انداز میں کیا تھا کہ قاری چونک اُٹھے، برنی ملے تو کہنے لگے ”آخری صفحہ پڑھ کے مَیں لرز اُٹھا تھا“ اور حقیقت بھی یہی تھی، وہ بڑے بینکار نہ ہوتے تو ذوق اور وسعتِ مطالعہ کی بدولت بڑے ادیب اور انشا پرداز ہوتے۔

متعدد ادیبوں اور شاعروں سے اُن کے ذاتی مراسم تھے۔ حفیظ ہوشیارپوری سے بھی یاد اللہ تھی، ایک مشترک دوست نے اُن سے حفیظ کی شدید علالت کا ذکر کیا اور بتلایا کہ چند ادویات کی سخت ضرورت ہے جو صرف ہانگ کانگ اور سوئٹزرلینڈ سے دستیاب ہو سکتی ہیں، برنی صاحب نے فوراً منگوانے کا انتظام کر دیا اور متعدد بار بیمار پرسی کی، ایک شام وہ حفیظ کو دیکھنے کے لیے ہسپتال گئے، غالب نے عیادت کو "خوشا اقبال رنجوری" سے تعبیر کیا تھا، حفیظ نے سپاسِ عیادت کا حق یوں ادا کیا: ؎

درِ دل پر یہ کس نے دستک دی ، کوئی تو یارِ مہرباں آیا
دیکھتا کیا ہوں میں کہ ابنِ حسن ، طرب انگیز و گل فشاں آیا
جانے کس کس کی یاد تازہ ہوئی ، ذکرِ احباب درمیاں آیا

حفیظ نے صحیح کہا تھا' یاسیت سے کوسوں دُور برنی ہمیشہ پُرامید دکھائی دیتے تھے، بشاشت کی کرنیں اُن کے بُشرے سے پھوٹتی تھیں، اُن کی ہفت رنگی شخصیت میں منفی عُنصر کا دخل نہ تھا اور ایک فکری خود اعتمادی ماحول پر اثرانداز ہوتی تھی، وجیہہ، سروقامت۔ خوش وضع قطع، خوش لباس، مسکراتا کھلتا چہرہ، لہجے میں شائستگی، ہر لحاظ سے ایک نستعلیق صاف سُتھری شخصیت جو محفل کو گرماتی تھی، وہ جس جگہ ہوتے زینتِ محفل ہوتے۔

اُن کی روزمرہ زندگی میں بھی جمالیاتی حِس کی جھلک نظر آتی تھی، ایک بار اُن کے ہاں بیٹھے ہوئے کوئی یادداشت لکھنے کے لیے میں نے جیب سے معمولی قسم کا بال پوائنٹ نکالا، اُسے دیکھ کر برنی پریشان سے ہو گئے، کہنے لگے: "آپ کے لیے بہتر قلم ہونا چاہیے" اور غالباً کراس کا بال پوائنٹ لا کر مجھے دیا۔

برنی شہاب صاحب کے مدّاح اور اُن کی نیکیِ طبع کے معترف تھے مگر شہاب عام ڈگر سے ہٹ کر مختلف قسم کے آدمی تھے، اُنہوں نے ضروریاتِ زندگی بتدریج محدود کر لی تھیں اور بڑی حد تک علائقِ دُنیا سے بے نیاز ہو گئے تھے جب کہ برنی آب و خاک کی اِس دنیا سے رشتہ استوار رکھتے تھے، وُہ دنیاوی خوشیوں اور راحتوں سے لُطف اندوز ہونے کا ڈھنگ جانتے تھے، ابنِ حسن کا مزاج شاہانہ اور ٹھاٹھ امیرانہ تھا، انہیں اُجلی چیزوں سے محبت تھی، سفید بے داغ قمیص پر نفیس ریشمی نکٹائی، نکلتے ہوئے قد پر پھبتا ہُوا نیلا سُوٹ، چمکتے سیاہ مُقیشن، وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی اُسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے،

اللہُ جمیلٌ ویحب الجمال
[اللہ خود جمیل ہے اور حُسن پسند کرتا ہے]

اُنھوں نے بھرپور زندگی بسر کی مگر سفلی آلائشوں سے پاک رہے اور اپنے عقیدے میں راسخ الاعتقاد، کراچی میں ماہِ صیام میں برنی پورے روزے رکھتے مگر شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ افطاری کے وقت اہلِ خانہ اور مہمانوں کو عمدہ چیزیں کھانے کی ترغیب دیتے۔

دُنیاوی معاملات میں برنی کی بیدار مغزی مسلّم تھی مگر بعض اوقات وہ ناقابلِ یقین بات پر یقین کر لیتے تھے ، جس پر اعتبار کر لیا اُس کی ہر بات پر آمنّا و صدقنا کہہ دیتے ، یہ سادہ دلی تھی یا انسانی فطرت کے تضاد سے صرفِ نظر؟

شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو کہ اُنھوں نے اپنے گرد ایک نشاط انگیز ماحول کی تشکیل کی تھی جس میں گراوٹ یا عامیانہ پن کا گزر نہ تھا ، اُن کی شائستگی اور شگفتہ مزاجی کسی ہلکی بات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی ، مزاح کی چاشنی طنز سے مبرّا تھی۔ وہ روایتی اخلاقیات کا مرقع تھے ، اگر کسی سے تکلیف پہنچی یا بوجوہ دل آزاری ہوئی تو کبھی شکوہ نہیں کیا ، کسی بات پر شکر رنجی کی نوبت آتی تو مجال ہے جبیں شکن آلود ہُوئی ، ملنے کے لیے وہی کشادہ بازو ، سلوک میں وہی وسعتِ قلبی ، خاطر مدارات میں وہی دریادلی۔

خاندانی وراثت پر فخر و مباہات ہماری قومی کمزوری بن چکی ہے ، ضیاء الدین برنی عہدِ تغلق کے مشہور مورخ تھے جنھوں نے ہر واقعہ لکھنے سے پہلے اُس کی چھان پھٹک کی اور اپنے تاثر کے ساتھ اُسے سادہ الفاظ میں رقم کیا ، بزرگوں میں ایسی عبقری شخصیت کا ہونا بجائے خود ایک قابلِ فخر بات تھی جس کا ذکر اُنھوں نے کبھی نہیں کیا۔ بلکہ مجھے چند ماہ پیشتر علم ہُوا کہ نامور محقق اور مقالہ نگار سید حسن برنی آپ کے والد تھے ، کسرِ نفسی کا یہ عالم تھا کہ کبھی بھُولے سے بھی بات نہیں کی ، ایک دو مرتبہ الیاس برنی کا ذکر ضرور ہُوا تھا جنھوں نے اپنے قویٰ اور اثاثہ ردِّ احمدیت پر ایک مبسوط کتاب مرتب کرنے میں صرف کر دیے تھے اور وُہ بھی میرزا صاحب کی نگارشات کے حوالے سے ، چند روز پیشتر مجھے معلوم ہُوا کہ وہ برنی صاحب کے چھوٹے ماموں تھے۔

کراچی میں قیام کے دوران حکومتِ پاکستان کی طرف سے مجھے خطاب ملا ، اتوار کی صبح اخبارات میں اعلان ہوا ، صبح صبح احباب اور جاننے والوں کا جمگھٹا لگ گیا مگر جو گرم جوشی برنی صاحب کے معانقے میں تھی اُس کی تپش آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

کراچی سے میرا تبادلہ ہُوا تو آناً فاناً حج کی ادائیگی کا پروگرام بن گیا ، دو روز میں انتظامات مکمل ہو گئے اور ہم برنی صاحب کی معیت میں ایئرپورٹ کی جانب رواں تھے ، کمال اور ندیم حبیب پبلک سکول میں زیرِ تعلیم تھے ، اُن کے امتحان ہونے میں ابھی وقفہ تھا ، برنی اُنھیں اپنے گھر لے گئے ، مسز برنی نے اپنے بچّوں کی طرح ان کی دیکھ بھال کی ، وہ بھی اپنے ہمجولیوں سے گھُل مل گئے اور کھیل کُود اور شرارت میں برابر کے شریک ہو گئے۔ تیرنے کے لیے کلب جا تو کمال برنی اور ندیم برنی بن جاتے۔

انسان سونا چاندی تو لوٹا سکتا ہے مگر احسان کا قرض عُمر بھر نہیں اُتار سکتا۔

کچھ عرصے بعد برنی صاحب کو ایک بڑا صدمہ پہنچا ، بیمار بیوی اور خورد سال بچے پیچھے چھوڑ کر چھوٹا بھائی آناً فا دنیا سے گزر گیا ، اُس کا یُوں اُٹھ جانا برنی صاحب کو بےحد شاق گزرا مگر اُن کی فعال شخصیت خالی ہمدردی کی قائل نہیں بھابی اور بچّوں کی رہائش کے لیے اپنے مکان پر دوسری منزل تعمیر کروائی ، بچیوں کی شادیاں کیں اور حتی الوسع ان

کفالت اور نگہداشت کی۔

برنی کراچی میں تھے تو فون پر بات ہو جاتی تھی، لندن چلے گئے تو خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا ، اُن کی نفاست پسندی کا اظہار خطوط کے ذریعے ہوتا، اعلیٰ درجے کی سٹیشنری ، لفافے پر گھر کے پتے کی سنہری چھاپ ، دلکش طرزِ تحریر اور اُبھرتی ڈوبتی موجوں میں سموئی ہوئی ایک خاص انداز کی خوشنویسی جیسے لڑی میں پروئے ہوئے موتی ہوا میں ڈول رہے ہوں۔

احباب سے مل کر انھیں دلی مسرّت ہوتی تھی، لندن میں 'بائی پاس' کا مرحلہ طے کرکے رخصت پر کراچی آئے تو خوش و خرّم نظر آ رہے تھے، ایئر پورٹ پر میں نے طبیعت کا حال پُوچھا تو کہنے لگے ،" دوستوں سے مل کر جی خوش ہو گیا، میں بالکل ٹھیک ہوں "۔

آپریشن کے سات آٹھ برس بعد اُن کی صحت اچھی رہی ۔ اُن دنوں ایک بار ہمارا امریکہ جانا ہُوا، لندن میں بمشکل دو تین روز کا قیام تھا، بی۔سی۔سی۔آئی کے دفتر میں ہم برنی صاحب کے آنے کا انتظار کرتے رہے ، دو تین بار فون کیا، معلوم ہوا کہ ابھی نہیں پہنچے ، پرائیویٹ سیکرٹری نے گھر پر اطلاع کر دی ہو گی ، مجال ہے برنی صاحب کی طرف سے چوک ہُوئی ہو ، ہم یوسفی صاحب کے ہاں ٹھہرے ہُوئے تھے ، سرِ شام میاں بیوی وہاں آ گئے ، برنی کہنے لگے :

" ایلرجی سے چہرے پر خارش ہونے لگتی ہے ، ڈاکٹر کہتا ہے دُھوپ میں باہر نہ نکلو ، بھلا یہ کیسے ممکن ہے ؟ "

اُسی شام یوسفی صاحب نے ایک ناخواندہ مہمان کا ذکر چھیڑ دیا جو کسی واقف کی معرفت مع بچّوں کے آ دھمکے تھے اور گلے کا ہار ہو کر رہ گئے تھے ، یوسفی صاحب حسبِ معمول پھلجھڑیاں چھوڑ رہے تھے ، کہنے لگے کراچی جانے سے پہلے بیگم کھانے کی چیزیں ڈیپ فریز میں رکھ گئی تھیں تاکہ چند روز کھانا پکانے کی زحمت نہ ہو، ڈیپ فریز میں پڑے رہنے سے کھانے کی ماہیت بدل جاتی ہے ۔ مہمان ایک ایک ڈش نکال کر اُسے بغور دیکھتے جیسے عجوبۂ روزگار ہو۔ اور واپس رکھ دیتے ، پھر میکڈانلڈ سے ہیمبرگر منگوانے کے لیے آپس میں مشورہ کرتے ۔ ذکر اِک بلائے جان کا تھا اور بیان یوسفی صاحب کا ، ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ۔

برنی صاحب کو علم ہو گا کہ بیگم کی غیر حاضری میں گھر کا کام کاج یوسفی خود سنبھالتے ہیں ۔ کھانا پکانا، صفائی ستھرائی اور اِس میں کسی کی مدد لینا گوارا نہیں کرتے ۔ اُس پر مستزاد اپنے جُوتے پالش کرنا ، بنیان اور جُراب دھونا اور قمیص استری کرنا تو خیر عمر بھر کی عادت ہے جو فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے مگر دوستوں کے ساتھ بھی برنی ایک تکلّف ملحوظ رکھتے تھے ۔ اُن کی جبلّی شرافت کا تقاضا تھا کہ حجاب کا مہین سا پردہ باقی رہ جائے ۔ ورنہ کہہ دیتے :

" میاں! کس جھنجھٹ میں پڑے ہو ، یہ کام کسی اور کے سپرد کرو اور فارغ وقت تخلیقی کام میں صرف کرو۔ "

اُٹھتے ہوئے برنی اگلے روز دوپہر کے کھانے کی دعوت دے گئے ۔

یوسفی صاحب کے علاوہ 'کُندن' ریستوران میں فیض صاحب ، زہرا نگاہ اور ماجد مدعو تھے ۔ فیض صاحب

متانت کی تصویر تھے، دُکھ بھرے انداز میں بیروت کی تباہی اور فلسطینیوں کی حالتِ زار کا ذکر کرتے رہے، "لوٹس" کی اشاعت کے لیے شمالی افریقہ کا ایک ملک اُن کی نظر میں تھا، آمر حکمراں کے زمانے میں انصاف کے تقاضے زیرِ بحث آ گئے، ماجد مُصر تھے کہ حکومت کا نامزد قاضی القضاۃ بے لاگ فیصلہ نہیں دے سکتا اور تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہُوا، زہرا اپنی ہم نام زہرا نگاہ کے ساتھ باتوں میں مصروف رہیں، کھانا لذیذ تھا اور صحبت پُر لطف، برنی تواضع میں بچھے جا رہے تھے "آپ ایک روز اور ٹھہر جائیں تو مکمل طبّی معائنہ کروا دوں، وہ ایک یادگار نشست تھی مگر برنی صاحب کا جی نہیں بھرا، دوسرے روز سرِ شام آ گئے، کہنے لگے، "آج آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دیں گے، چند قدم پر ایک ریستوران ہے وہاں کھانا کھائیں گے"۔ وہاں جا کر بھی بس نہیں چلتا تھا کہ کیا کیا چیز کھلا دیں، یہ تھے ابنِ حسن برنی !

پھر پتا چلا کہ اُس جانِ ناتواں پر عارضوں کی یلغار ہُوئی، فالج کا شدید حملہ ہُوا، دل کی تکلیف بڑھی تو اس کے ساتھ مشین منسلک کر دی گئی، انہوں نے ہر بیماری کا مقابلہ بڑی پامردی کے ساتھ کیا، لندن جانا ہُوا تو دیکھا برنی لڑکھڑاتے ہُوئے چلے آ رہے ہیں، وُہ اپنے بدلے ہُوئے انداز سے بخوبی آگاہ تھے مگر اسے اعصاب پہ سوار نہیں ہونے دیا، اپنی چال پر خود ہی پھبتی کسنے کہ لُولا لنگڑا ہو گیا ہُوں، جب تک ہمّت نے ساتھ دیا دفتر جا کر کام کرتے رہے۔ احباب سے تعلقات نبھاتے رہے، اُن دنوں ایک روز ہمارے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے وفاقی محتسب کی آمد کا ذکر کیا، میں نے کہا بھی دوپہر کے وقت وہ ہوٹل میں کہاں ملیں گے، کہنے لگے: کارڈ چھوڑ آؤں گا۔ آخری دنوں میں ادا جعفری کے لیے لندن میں دو تین نشستیں ہُوئیں، ادا بہن نے اردو مرکز کی تقریب میں آنے سے منع کیا کہ ناحق تکلیف ہو گی، وہ مان کر نہیں دیئے، "واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کی تقریب ہو اور میں غیر حاضر رہوں!" یہ وضعداری آخر دم تک قایم رہی۔

آخری علالت سے چند روز قبل میرے خط کا فوری جواب آیا، میں بہت خوش ہُوا اور متعجب بھی۔ بیساختہ غالب کا یہ شعر جواب کا عنوان ہُوا ؎

ما لذّتِ دیدار ز پیغام گرفتیم
مشتاقِ تو دیدن ز شنیدن نشناسد

[چاہنے والے کے لیے تمہارا پیغام لذّتِ دید سے کم نہ تھا، پیغام کیا ملا یُوں محسوس ہُوا جیسے تمہیں دیکھ رہا ہُوں، ہم دیکھنے اور سُننے میں فرق روا نہیں رکھتے]

افسوس ابنِ حسن بہت دُور چلے گئے، اب دید ہو گی نہ شنید، دل گرفتہ دوستوں کے دل میں بیتے دنوں کی سہانی یاد ہو گی اور پُر کیف صحبتوں کی حسرتِ بازیافت، ایک خوشگوار عہد کی بازیافت، ممکن ہے اِس احساسِ زیاں میں خود پسندی کا پہلو بھی ہو، ڈھلتے سالوں میں ہم پہ اپنی خامیاں عیاں ہوتی ہیں اور یہ سوچ کر دل جذبۂ تشکر سے لبریز ہو جاتا ہے کہ اِن کوتاہیوں کے باوجود دوستوں نے ہمیں اپنایا تھا۔

اواخر مارچ میں ایک ڈبہ الماری میں نظر آیا، کھول کے دیکھا تو برنی صاحب کے خطوط تہ بہ تہ قرینے سے دھرے تھے دوبارہ پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی، اُسے جُوں کا توں وہیں رکھ دیا۔ اِس بار وہ ڈبہ تو ڈھونڈنے سے نہ ملا البتہ پُرانے کاغذ کھنگالتے ہوئے دس برس پہلے کے لکھے ہوئے دو خطوط ملے:

لندن میں مکان خریدنے کے متعلق لکھا تھا:

”ایک نکڑ پر کونے کا مکان ہے، تین طرف چمن آرائی کا اہتمام ہے، بائیں باغ میں سوئمنگ پول بھی ہے، دفتر سے تیرہ چودہ میل کا فاصلہ ہے، راستے میں ہرے بھرے کھیت، سرسبز میدان، پُراشجار جنگل پڑتے ہیں، آج کل کھیتوں میں سرسوں پھُولی ہے، پاکستان کی یاد ستاتی ہے، وطن جس کے لیے آج کل ہر وقت دعائیں ہیں“، خط کی تاریخ ہے ۱۲ جون ۱۹۷۷ء، جب پی۔ پی۔ پی اور قومی اتحاد کے مابین محاذ آرائی عروج پر تھی۔

آخری فقرہ وطن سے دُور رہنے والوں کی دلی کیفیت کا آئینہ ہے، ملک کے حالات دِگرگوں ہوں تو اہلِ وطن پر جو گزرتی ہے سو گزرتی ہے مگر تارکینِ وطن کے لیے غیر یقینی کی کیفیت، صحیح خبروں کا فقدان اور عزیز و اقربا کے لیے پریشانی دوگنا عذاب ہے۔

دوسرا خط ملکہ معظمہ کی سلور جوبلی کے متعلق تھا، انگریز قوم کی سائیکی میں تضادات پر بحث تھی، شاہی خاندان سے بے اعتنائی اور شاہ پرستی، ایک دیرینہ اور مستحکم جمہوریت مگر ملکہ کے لیے جذبۂ عقیدت، سلور جوبلی کی ہر تقریب میں شمولیت کے لیے لوگوں کا ذوق و شوق مگر تنظیم اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ، خط کا یہ حصہ تین صفحوں پر محیط ہے مگر برنی ایک حساس دل رکھتے تھے، جشن کی رنگینیاں اُن کی افسردگی کم نہ کر سکیں، خط کا آخری حصہ دلی کیفیت کا غماز ہے جہاں جذبات کا آبگینہ چھلک پڑا ہے، لکھا ہے:

”پچھلے دنوں طبیعت بہت افسردہ رہی، میرے ایک خالہ زاد بھائی تھے جن سے بہت دوستی اور وابستگی تھی، اِس بار کراچی گیا تو مجھ سے ملنے کے لیے وہ پہلی مرتبہ پاکستان آئے اور اس قدر ٹوٹ کے ملے کہ دل و جان میں پیوست ہوگئے، خوب لطف رہا، طویل شبینہ نشستیں ہوئیں، بیتے ہوئے دنوں کی باتیں، بچھڑے ہوؤں کی یادیں، مَیں اِدھر آیا اور وہ ہندوستان واپس چلے گئے، مشکل سے تین چار مہینے گزرے ہوں گے کہ خبر آئی کہ وہ رخصت ہوگئے۔“

آخری دنوں میں بھی برنی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، اُن کا خیال تھا کہ آخری بحران سے بھی وہ سبکسار گزر جائیں گے مگر قویٰ جواب دے رہے تھے، ڈوبتے سورج کی کرنوں سے گردوپیش ایک مضمحل تابندگی کا سمے تھا، اِس حال میں بھی وہ مایوس نہیں تھے، عیادت کے لیے آنے والے اُن کے حوصلے کی داد دیتے، پھر ایک روز جب سردی پورے شباب پر تھی برنی برف کی براق چادر اوڑھ کے سوگئے، ہمیں اِس جدائی کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا، بیماریوں کی یورش ایسی تھی کہ ہر آن دھڑکا لگا رہتا تھا، کبھی خیال ہوتا کہ ممکنات کی دنیا میں کیا کچھ ممکن نہیں، شاید انسان دائمی جدائی سے سمجھوتہ نہیں کر پاتا اور یوں موت کی حقیقت کو جھٹلاتا ہے۔

ایک لحاظ سے نہ ہوتے ہوئے بھی برنی ہمارے درمیان موجود ہیں اُس بھینی خوشبو کی مانند جو کاروانِ رنگ و بُو گزر جانے کے بعد فضا میں معلق رہ جاتی ہے۔ کسی کارِ خیر کی یاد، اُس گرم جوشی کی یاد جس میں اخلاص کی بُو باس تھی، سالِ نو اور عید کے موقع پر دُعاؤں سے معمور تہنیت ناموں کی یاد، پیچھے رہ جانے والوں کے لیے بھی اُن کا یہی پیغام ہوتا، "مسکراتے رہو اور پُر اُمید اپنا دامن پھولوں سے بھر لو، تر و تازہ خوش رنگ پھول، کچھ آسودگیاں اپنے ارد گرد بانٹ دو۔" اُس محبِ گرامی کی یاد میں ہمیں اُن خوبیوں کی یاد تازہ کرنی چاہیے جو اُس پہلو دار شخصیت میں یکجا ہو گئی تھیں، خوش خلقی، صلۂ رحمی، مروّت اور رواداری، دوستوں کی دلداری، بیکسوں کی اشک شوئی، ؏

با دوستاں تلطّف با دشمناں مدارا

تجدیدِ اُلفت کے اِس پیمان سے اِبنِ حسن کی رُوح یقیناً شاد کام ہوگی۔

جب تک جان میں جان ہے انسان سلسلۂ روز و شب کے چکر سے آزاد نہیں ہو سکتا، زندگی اپنے ڈگر پر چلتی رہتی ہے، بالآخر چند یادیں ہی باقی رہ جاتی ہیں، وُہ یادیں محبت اور رفاقت کا سرمایہ ہیں، البتہ یہ حسرت رہ جاتی ہے کہ اُن لمحوں میں ہمیشگی نہیں تھی اور اِس جہانِ گزراں میں انھیں دوام بخشنا اپنے بس میں نہ تھا، اب احساسِ محرومیِ دل پر شبخوں مارتا ہے، پچھلے پہر کے سناٹے میں بے نام خیال ذہن کے دریچے میں پھڑپھڑاتے ہیں اور شام کی گہری اداسی میں حریفانِ رفتہ کے داغ بھڑک اُٹھتے ہیں۔

ابوالفضل صدّیقی صاحب مرحوم؟

انور سدید

ابھی ابھی اخبار" امروز" نے اطلاع دی ہے کہ

> "(پ۔ پ۔ ا) معروف افسانہ نویس ابوالفضل صدّیقی ۱۶ ستمبر کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔ انھیں دو ہفتے قبل دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ ایک مقامی ہسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ ان کے پسماندگان میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ وہ چھ کتابوں کے مصنّف تھے۔ انہوں نے تین صد سے زیادہ افسانے لکھے جن پر انھیں ادبی ایوارڈ بھی ملے۔ انھیں پاپوش نگر کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کی رسمِ سوئم جمعہ کو ہادی مارکیٹ ناظم آباد میں ہوگی۔"

خبر نمایاں طور پر چھپی ہے۔ بے حد مفصّل اور بامعنی ہے لیکن میں سوچ رہا ہُوں کہ "کیا بڑا ادیب واقعی مر سکتا ہے اور کیا جمعہ کو رسمِ سوئم کے بعد ہم ابوالفضل صدّیقی کو واقعی اس دنیا سے خارج اور اپنی یادوں سے حذف کر دیں گے؟" یہ سوچ کر میرے جسم میں کپکپی کی لہر سی دوڑ گئی ہے اور میں اپنے آپ کو یقین دلا رہا ہُوں کہ سچّا ادیب کبھی مر نہیں سکتا۔ وہ اپنی تخلیقات میں اور اپنی کتابوں میں زندہ رہتا ہے اور ابوالفضل صدّیقی تو بڑے ادیب ہی نہیں بڑے انسان بھی تھے۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے ایک ادبی جلسہ انجمن ترقی اردو کراچی نے ۲۹ مارچ ۱۹۸۷ء کو منعقد کیا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، مختار زمن، شمیم احمد اور مشرف احمد نے ان کی شخصیّت اور فن پر مضامین پڑھے تھے اور اس صداقت کی بازیافت کی تھی جس کا اظہار ابوالفضل صدیقی نے اپنے افسانوں میں کیا تھا اور جو ان کے باطن میں مشکِ نافہ کی طرح ہر وقت موجود رہتی تھی۔ بلا شبہ یہ جلسہ غیر معمولی تھا اور ابوالفضل صدیقی کو ان کے شایانِ شان خراجِ تحسین ادا کیا گیا تھا لیکن میں سمجھتا ہُوں کہ یہ معمول کی ایک کارروائی تھی جس کی ابوالفضل صدیقی کے نزدیک شاید کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ان کی شان تو اس بے نیازی میں تھی جو ان کی فطرت کا حصّہ تھا۔ ان کا وقار تو اُس استغنا میں تھا جو وہ نام و نمود کے حربوں سے اجتناب کر کے ظاہر کرتے تھے۔ ان کی عظمت اس درویشی میں تھی جو عارف پور نوادہ کے چودھریوں کا فرزند ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی طویل عملی زندگی میں ظاہر کی۔ انھوں نے اپنا پیرہن کاغذ کے بے خوشبو پھولوں سے نہیں سجایا اور عظمت کا جعلی لبادہ زیبِ تن نہیں کیا۔ چنانچہ انہیں ملنے کے بعد کبھی یہ احساس نہ ہُوا کہ میں کسی بڑے ادیب سے یا کسی عظمت مآب سے مل کر آ رہا ہُوں۔ بلکہ وہ ہمیشہ دوسروں کو عظمت کا احساس دلاتے اور انھیں ایک بڑے امتحان میں ڈال کر

خود اپنے اوپر انکسار کی گلیم ڈال لیتے۔ اب جبکہ ان کا جسم خاکی اس دنیا میں موجود نہیں اور وہ پیوندِ خاک ہو چکے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی حقیقی معنوں میں عظیم انسان بھی تھے اور عظیم ادیب بھی۔ اور ایسے ہی لوگوں کی رحلت سے بساطِ ادب ویران اور دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔

ابوالفضل صدیقی کی زندگی اور ان کی افسانہ نگاری پر نظر ڈالیں تو وہ ہر لحاظ سے ایک بامعنی، منفرد اور مثبت کردار کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ وہ ۱۹۰۸ء میں بدایوں کے جاگیردارانہ ماحول میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب ایہام کے ممتاز شاعر غلام مصطفیٰ یک رنگ سے جاملتا ہے جو مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد تھے[1] اصغر علی صدیقی ضابط ان کے خاندان کے ایک اور شاعر تھے جن کا زمانہ ۱۸۴۲ء تا ۱۸۹۲ء ہے۔ ابوالفضل صدیقی کے والد چودھری ابوالحسن صدیقی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے اور عدالتِ دیوانی میں وکالت کرتے تھے۔ شاعری کا ذوق انھیں بھی تھا اور وہ بصیر تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے ابوالفضل کو ابتدائی تعلیم سینٹ جارجز اسکول مسوری میں دلائی لیکن سینئر کیمبرج کے بعد علی گڑھ بھیج دیے گئے۔ لیکن وہاں دل نہ لگا اور وہ اپنی جاگیر عارف پور نوادہ میں مقیم ہو گئے۔ انگریزی مدرسے اور علی گڑھ کے عارضی قیام نے انہیں روشن مزاجی عطا کی، حقیقت کو سائنسی انداز میں دیکھنے کا رویّہ اور انسان دوستی سکھائی۔ دوسری طرف دیہات کے ماحول نے انھیں فطرت شناس بنایا۔ سیر و شکار کی عادت ڈالی۔ باغبانی اور کاشتکاری سے محبت بڑھانے کا سلیقہ سکھایا۔ ان کی شخصیت اور فن کے پسِ پشت بدایوں ایک اہم عقبی دیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن روشن مزاجی اور زندہ دلی کے آثار سینٹ جارج اسکول اور علی گڑھ نے پیدا کیے۔ وہ بہ یک وقت قدیم بھی تھے اور جدید بھی۔ قدامت سے انہوں نے صحت مند روایات کے تسلسل کو قایم رکھنے کا سبق سیکھا اور جدیدیت سے انہوں نے ہر نئے تجربے اور خیال سے بامعنی انداز میں استفادہ کی کاوش کی اور ان عناصر سے ابوالفضل صدیقی کا جو کردار مرتب ہوا اس کی صفات انوکھی اور جاذبِ نظر تھیں، یہ کردار ان کے افسانوں کے عقب سے بھی جھانکتا ہے اور وہ اپنی شخصیت سے ہی نہیں اپنی تحریروں سے بھی الگ پہچانے جاتے ہیں۔ شکار ان کی شخصیت کا زاویہ ہے۔ کاشتکاری اور باغبانی ان کی تخلیق کے زاویے ہیں اور افسانہ نگاری میں ان سب کا عکس موجود ہے اور دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ ان کے آباء و اجداد میں شاعری کا ذوق موجود تھا لیکن انھوں نے پہلی محبت افسانے سے کی اور شاعری کی طرف زندگی بھر نہیں دیکھا۔

ان کی افسانہ نگاری کی ابتدا کی شہادت مختار زمن صاحب نے فراہم کی ہے اور لکھا ہے کہ

> "سب افسانہ نگار افسانہ لکھنا شروع کرتے ہیں۔ ابوالفضل صدیقی نے افسانہ کہنے سے شروعات کی۔ رات کا وقت ہے۔ سارا گھر سو رہا ہے۔ دس برس کا لڑکا ابوالفضل لحاف اوڑھے

---

[1] بحوالہ "قومی زبان" کراچی۔ اپریل ۱۹۸۷ء۔ ص ۱۷

> لیٹا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اپنے سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کی پردادی جسے وہ "میّاں" کہتے تھے آکر دیکھتی ہیں" —— "اے ہے! ابوالفضل یہ کس سے باتیں کر رہا ہے تو؟"
>
> "میّاں! کسی سے نہیں۔ یہاں کون بیٹھا ہے؟"
>
> واقعہ یہ تھا کہ صدیقی صاحب خود اپنے دل سے کہانیاں گھڑ کر اپنے کو سنایا کرتے تھے۔"[1]

خود ان کا قول تھا کہ "میرے لیے افسانہ ایک وہبی اور پیدائشی چیز ہے۔" لیکن ان کا پہلا مضمون افسانہ نہیں تھا بلکہ یہ ردِ عمل تھا ممبرانِ اسمبلی کے غیر سنجیدہ رویّے کے خلاف جو انھوں نے طوائفیت کے پیشے کے زیرِ بحث بل پر اختیار کر رکھا تھا۔ ان کا یہ مضمون دیوان سنگھ مفتون نے اپنے رسالہ "ریاست" میں شائع کیا اور اس کی گونج دور دور تک سُنی گئی۔ ابوالفضل صدیقی کا پہلا افسانہ مولانا صلاح الدین احمد کے ادارتی نوٹ کے ساتھ ۱۹۴۰ء میں رسالہ "ادبی دنیا" میں شائع ہُوا۔ مولانا کے ابتدائی تعریفی اور تعارفی جملے اتنے موثر ثابت ہُوئے کہ ابوالفضل صدیقی مستقل طور پر افسانے کی وادی میں آگئے اور پھر اسی کو اپنے ادبی تشخص کا وسیلہ بنا لیا۔

ابوالفضل نے اپنی زندگی میں کم و بیش تین سو افسانے لکھے اور ان میں سے بیشتر اعلیٰ درجے کے افسانے شمار ہُوئے، ان کا آخری افسانہ "نقوش" میں شائع ہُوا اور اس پر "نقوش ایوارڈ" دیا گیا۔[2] ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "احرام" ۱۹۴۵ء میں اور ناول "تعزیر" ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ وُہ اپنے سانحۂ ارتحال تک "ادبی دنیا" سے کبھی غیر حاضر شمار نہیں ہُوئے۔ افسانے تو ان پر بارش کے قطروں کی طرح مُوسلا دھار برستے تھے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ابوالفضل صدیقی نے انہیں کتابی صورت دینے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ گزشتہ سال کا یہ ادبی واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ مشفق خواجہ نے ان کے افسانوں کے تین مجموعے "آئینہ"، "انصاف" اور "جوالا مکھ" بیک وقت شائع کر دیے۔ میں نے "آئینہ" کا پہلا افسانہ پڑھنا شروع کیا جب کراچی سے رخصت ہونے کے بعد میں شالیمار ایکسپریس میں بیٹھ چکا تھا اور "جوالا مکھ" کا آخری افسانہ پڑھ کر کتاب بند کی تو شالیمار لاہور میں داخل ہو رہی تھی میں نے گھر پہنچتے ہی مشفق خواجہ کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اس دفعہ مجھے کراچی سے لاہور تک کا طویل سفر ابوالفضل صدیقی کی معیّت میں کرنے کا موقعہ دیا۔ اس سفر کے دوران ابوالفضل صدیقی مجھے روہیل کھنڈ، بدایوں کھیڑا نوادہ اور عارف پور نوادہ اور نہ جانے کہاں کہاں لیے پھرتے رہے۔ اور اپنے مشاہداتِ شیریں سے نوازتے اور سیراب کرتے رہے۔

مجھے احساس ہُوا کہ ابوالفضل صدیقی بنیادی طور پر داستاں نگار ہیں۔ وہ اگر واجد علی شاہ کے عہد میں ہو۔

---

[1] مختار زمن۔ ابوالفضل صدیقی ایک تاثر۔ حوالہ ایضاً۔ ص ۱۸

[2] افسانے کا عنوان

تو اس دور کے سب سے بڑے داستان سرا شمار ہوتے۔ ان کا ایک محبوب مشغلہ شکار تھا۔ چنانچہ ان کی زدِ نگاہ میں انسانی تہذیب کے تین ارتقائی زاویے یعنی جنگل، دیہات اور شہر آئے ہیں اور انھوں نے جنگلی ذی روح، دیہاتی آدمی اور شہری انسان تینوں کو موضوع بنا کر بے حد موثر افسانے لکھے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر دیہات بھی تھا اور دیہات کی تہذیب بھی۔ ابوالفضل صدیقی نے ان دونوں پر اپنی توجہ زیادہ مرکوز کی اور اس تہذیب کو تمثیلی افسانوں کے ذریعے پیش کیا۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں اہمیت انسان کو دی ہے اور دیہات کو اس انسان کی فطرت اُجاگر کرنے کے لیے ہی استعمال کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں تعلقہ دار، کسان، جاگیردار، بنئے، جُلاہے، وید، حکیم اور متعدد دوسرے ٹائپ کردار صرف اپنی جھلک ہی نہیں دکھاتے بلکہ اپنے مثالی کردار کی تمام جزئیات کی نقاب کشائی کر دیتے ہیں۔

ابوالفضل صدیقی نے دیہات کے ماحول کو تین قسم کے عناصر سے زندگی عطا کی ہے :

اول : وُہ جاگیردار جو تعلقے کا مالک اور تعلقے میں بسنے والے لوگوں کے سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ یہ بظاہر سخت گیر اور جابر ہے۔ لیکن بہ باطن نرم دل اور ہمدرد خلائق ہے۔[1]

دوم : وہ پالتو آدم زاد جو اس جاگیردار کے دسترخوان سے ریزے چنتے ہیں اور خدا سے زیادہ جاگیردار کا شکر بجا لاتے ہیں۔ ان کی وفاداری اور خلوص پر کبھی کسی کو شک نہیں ہُوا اور جاگیردار ان کی جاں نثاری کو اپنے تحفظ کے لیے استعمال کرتا ہے۔

سوم : وُہ کسان، مالی اور کاشتکار جو بظاہر کمزور اور بے آسرا ہیں لیکن جن کے اندر بغاوت کی آگ آہستہ آہستہ سلگ رہی ہے۔ ابوالفضل صدیقی نے دیہاتی زندگی کے ان تین زاویوں کو زندگی کے اعلیٰ شعور اور نفسیاتی پیچیدگی کی کامل آگہی سے پیش کیا ہے۔ اور یوں خیر و شر، گناہ اور ثواب اور عدل و انصاف کی دائم صداقتوں کو اجاگر کیا ہے۔

تخلیقی اعتبار سے ابوالفضل صدیقی کی خوبی یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے اپنا مشاہدہ دیہات کے خارج تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انھوں نے بعض ایسے واقعات بھی لکھے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے دیہات کے باطن میں اتر کر بالآخر اس جنگل کو دریافت کر لیا جو اپنے قوانین خود وضع کرتا ہے۔ خود ہی ان کا نفاذ کرتا ہے اور جس میں تعلقہ دار شیر ہے اور کسان معمولی بکری کی زندگی گزارتا ہے۔ ابوالفضل صدیقی کے دیہات میں عظمت بھی ہے اور ہیبت بھی۔ یہ دلآویز بھی ہے اور پُراسرار بھی۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں جاں کاہ جراحت کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ زخموں پر مرہم کا پھاہا بھی رکھ دیتے ہیں اور یہ مثبت عمل انہیں اپنے بہت سے معاصر افسانہ نگاروں سے ممتاز بنا دیتا ہے۔[2]

---

[1]

[2] اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش۔ (انور سدید) ۔ ص ۱۵۰۔ اردو رائٹرز گلڈ الہ آباد۔ ۱۹۸۳ء

مختار زمن نے خیال ظاہر کیا ہے کہ "ان کے افسانے بہت طویل، جزئیات بہ کثرت اور جملہ ہائے معترضہ بیشمار ہوتے ہیں۔" اور بعض اوقات تو ابو الفضل صدیقی کی طوالت افسانے پر بوجھ سا بن جاتی ہے۔ لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ ابو الفضل صدیقی بنیادی طور پر داستان نگار تھے۔ ان کا مشاہدہ وسیع اور گہرا تھا۔ چنانچہ جب تک وُہ اجمال کی پُوری تفصیل کو سامنے نہ لے آتے انھیں چین حاصل نہ ہوتا۔ یُوں محسوس ہوتا ہے کہ وُہ افسانہ لکھتے لکھتے نہ صرف اس میں کھو جاتے بلکہ اس سے خود بھی مزا لینے لگتے اور ایک مضمون کو سَو رنگ میں باندھ چکنے کے بعد بھی سیر نہ ہوتے۔ چنانچہ مختار زمن نے لکھا کہ

> "افسانے کا اصل پلاٹ ایک پُرشور چوڑے پاٹ کے دریا کی طرح رواں رہتا ہے۔ لیکن اس میں سے جٹیکلوں کی چھوٹی چھوٹی شاخیں اور ندی نالے بھی نکلتے رہتے ہیں۔ افسانے میں ایک دنیا بسی رہتی ہے۔"

مولانا صلاح الدین احمد نے نصف صدی پہلے لکھا تھا کہ

> "دیہات کے موضوعات پر لکھنے والوں میں پریم چند کے بعد ابو الفضل صدّیقی دوسرے اہم لکھنے والے نئے افسانہ نگار ہیں لیکن ساتھ ساتھ نثر نگار کی حیثیت سے وہ پریم چند سے بہتر لکھنے والے ہیں اور ان کا جمالیاتی شعور انھیں ایک مختلف افسانہ نگار بنا دیتا ہے۔ فی الحقیقت یہی ابو الفضل صدیقی کی انفرادیت اور یہی ان کا امتیاز ہے۔"

اور ہمارے عہد کے نقّاد ڈاکٹر جمیل جالبی نے حال ہی میں یہ رائے دی ہے کہ

> "ابو الفضل نے ۱۹۳۲ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۹۳۹ء سے وہ مسلسل لکھ رہے ہیں، جب ان کا افسانہ "سماج کا شکار" "ادبی دنیا" لاہور میں شائع ہُوا تو اس وقت دنیائے ادب میں دو رجحان نمایاں تھے۔ ایک رومانوی رجحان اور دوسرا حقیقت نگاری کا رجحان۔ رومانوی رجحان کے افسانوی ادب کے نمائندہ سجاد حیدر یلدرم، ل۔ احمد، سلطان حیدر جوش اور نیاز فتحپوری وغیرہ تھے اور حقیقت نگاری کے نمائندہ پریم چند تھے۔ ابو الفضل نے اپنے معاصرین علی عباس حسینی اور اعظم کریوی کی طرح یہ دونوں اثرات قبول کیے ہیں لیکن ۱۹۳۶ء کی تحریک کے زیرِ اثر رومانوی اثر کم ہو گیا ہے اور سماجی شعور، طبقاتی تقسیم اور حقیقت نگاری کے اثرات غالب آ گئے ہیں۔ ابو الفضل نے اس میں یہ اضافہ اور کیا کہ نثر کو کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ ملا دیا ہے۔ اس لیے وہ دوسرے افسانہ نگاروں سے پہلے بھی مختلف تھے اور آج بھی مختلف ہیں اور وہ اردو زبان کے بڑے افسانہ نگار ہیں۔"

شمیم احمد نے ان کے فن کے دائرۂ اثر کی وسعت کی طرف اشارہ کیا اور لکھا ہے کہ

"ان (ابوالفضل صدیقی) کی کہانیوں میں صرف اس معاشرے کی عکاسی ہی نہیں بلکہ اس پورے نظام کی ہر کمزوری اور استحصال کے شعور کے ساتھ انسانی اقدار اور اجتماعی شعور کی طرف بڑھتے ہوئے عمل کو بھی پیش کرنا ان کا مقصد رہا ہے۔ انہوں نے برصغیر کی آبادی کی اکثریت کے معاشی ڈھانچے، زرعی نظام، زرعی نظام کے مظاہروں، زرعی نظام کے جانوروں، وسیلوں اور طبقاتی تعلقات کے ہر اس پہلو کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے جس کو ایک بھرپور زندگی کا مطالعہ کہا جا سکتا ہے۔ اس مطالعہ میں صدیقی صاحب نے اپنی زندگی کے تقریباً ۵۵ سال لگا دئیے۔"

یہ چند اقتباسات اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے فن کا اثبات ان کی تخلیقی زندگی کی ابتدا میں بھی کیا گیا تھا اور اس کا اعتراف مارچ ۱۹۸۷ء میں عوامی سطح پر ایک بڑے جلسۂ عام میں بھی کیا گیا جب ان کی عمر ۸۰ برس کی ہو چکی تھی اور جب انھوں نے ایک مخصوص دھمک سننے کا اعلان بھی کرنا شروع کر دیا تھا۔

"دھمک" کا ذکر آیا ہے تو اس واقعے کی وضاحت ضروری ہے جسے ڈاکٹر جمیل جالبی اور مختار زمن نے بیان کیا ہے اور جن کی شہادت میں ابن الحسن اور سلمیٰ زمن شامل ہیں۔ میں یہ واقعہ یہاں مختار زمن کی زبان میں پیش کرتا ہوں:

> "یہ غالباً ۱۹۷۴ء کا قصہ ہے۔ ایک دن میرے پاس آئے اور کہنے لگے: "دیکھو میاں! دھمک سن رہا ہوں۔ بس آیا ہی چاہتا ہے۔" پوچھا: "کون آیا چاہتا ہے؟" بولے: "موت کا فرشتہ اور کون؟" میں نے کہا: "بڑے بھائی! کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ابھی تو آپ بہت دن جئیں گے!" بولے: میاں! معلوم ہے! میرا زائچہ بنا رکھا ہے۔ بدایوں میں ایک پنڈت گوپی ناتھ تھے۔ ۸۰ برس کا بڈھا برہمن۔ سفید جھلک داڑھی۔ وہ ہمارے سب گھر والوں کے زائچے بنایا کرتا تھا اور اکثر باتیں صحیح نکلتی تھیں۔ میری پیدائش کے وقت اس نے والد سے کہا، "وکیل صاحب! ذرا بچے کو جا کر دیکھو اس کے بائیں ہاتھ پر پدم (مسّہ) ہے یا نہیں۔ والد صاحب جھٹ زچہ خانے میں گئے۔ دیکھا تو پدم موجود تھا۔ دیکھو اب بھی ہے۔ اس نے زائچہ بنا کر کہا: "میں رائٹر بنوں گا اور ۶۶ سال بعد ۱۹۷۴ء میں فلاں تاریخ کو مر جاؤں گا۔" میں نے کہا: چھوڑیئے۔ آپ بھی کس وہم میں پڑ گئے۔" بولے: "میاں! اب تک اکثر باتیں صحیح نکلیں۔ یوں پل بہ پل کے فرق سے غلطی ہو سکتی ہے۔" مجھے خیال ہوا کہ کہیں ان پر کوئی نفسیاتی ردِ عمل نہ ہو جائے۔ چنانچہ میں نے اور جمیل جالبی صاحب نے مشورہ کیا کہ اس خاص تاریخ کو ۱۲ بجے رات تک ہم انھیں اپنے ساتھ رکھیں گے۔ جب تاریخ گزر جائے گی تب چھوڑیں گے۔"

اب کیا مضائقہ ہے کہ اس "دھمک" کی بقیہ کہانی ڈاکٹر جمیل جالبی کی زبان میں پیش کی جائے۔ جالبی صاحب لکھتے ہیں:

> "۳۱ مئی کی رات کو بارہ بجے ہم ان کے ہاں پہنچے اور کہا کہ "ہم موت کے فرشتے کی تلاش میں آئے ہیں۔ کیا وہ آ چکا ہے یا آنے والا ہے! وہاں کے اور یہاں کے وقت میں تو کچھ فرق نہیں ہے؟ بہت

ہنسے۔ پھر ہمارے ساتھ گھر کے باہر سڑک پر ٹہلتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سر کا بوجھ اُتر گیا ہے۔ اور وُہ اب ہلکے پھلکے ہو گئے ہیں۔"

پنڈت گوپی ناتھ کا زائچہ واقعی غلط تھا اور زندگی نے انھیں مزید بارہ برس دے کہ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو کہانیوں کا رُوپ دے سکیں اور زندگی اور معاشرے سے انھوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اسے افسانوں کی صورت میں زندگی اور معاشرے کو واپس کر دیں۔ ابو الفضل صدیقی نے اس قرض کو ایک دیانت دار ادیب کی طرح ادا کیا اور اس عرصے میں اپنے فن کی ایک ایسی جہت بھی دریافت کی جس کی طرف کسی نقاد نے تاحال توجہ نہیں دی حالاں کہ یہ ان کی افسانہ نگاری ہی کی طرح اہم ہے۔ میری مراد ابو الفضل صدیقی کی خاکہ نگاری سے ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد سے لے کر محمد طفیل تک اردو خاکہ نگاری نے متعدد مدارج طے کیے ہیں۔ ابتدا میں یہ فن شخصیت کا مرقع تیار کرنے کا فن شمار ہوتا تھا۔ فرحت اللہ بیگ اور عصمت چغتائی نے اس میں شخصیت کے منفی پہلوؤں کو اس محبت سے پیش کرنے کی کاوش کی کہ شخصیت خامیوں کے باوجود پیاری محسوس ہونے لگی۔ مولوی عبد الحق اور رشید احمد صدیقی کے شخصیت نامے ایک دفعہ پھر اس فن کو مرقع نگاری کے مدار میں لے گئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ممدوح تہذیبی زاویوں سے دریافت کرنے اور اسے رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکانے کی روش عام ہو گئی۔ منٹو کے خاکے اس رجحان سے بغاوت اور انحراف کی مثالیں ہیں۔ انھوں نے حقیقت کو اس جراحت سے پیش کیا جس جراحت کو انھوں نے شخصیت سے دمِ ملاقات محسوس کیا تھا۔ چنانچہ اب خاکہ نگاری سے عفو و درگزر کا زاویہ معدوم ہو گیا اور خاکہ نگار نے شخصیت پر غالب آنے کی کوشش شروع کر دی۔ محمد طفیل نے خاکہ نگاری میں چاول پر "قل ہو اللہ" لکھنے کا عمل اختیار کیا اور جراحت آمیز حقیقت کو چھپانے کے بجائے اسے زیرِ سطح اور بین السطور رکھنے کی کاوش کی اور دوہرا ذائقہ پیدا کیا۔ ان کے خاکے سے ممدوح ناراض نہیں ہوتا لیکن قاری شخصیت کے بعض معکوس زاویوں سے بھی روشناس ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ وہ ایسی کفایتِ لفظی سے کرتے ہیں کہ "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ابو الفضل صدیقی کی خاکہ نگاری میں اجمال کو تفصیل سے پیش کرنے کی روش نمایاں ہے۔ وہ شخصیت کو دریافت نہیں کرتے۔ اس کے گرد و پیش کی بازیافت بھی کرتے ہیں۔ اور اس عمل میں شخصیت کا خاندان، بیوی بچے اور آبا و اجداد ہی زیرِ بحث نہیں آتے بلکہ شخصیت کے دوست، ان کے اہلِ خانہ، محلّہ دار اور محلّے کے دکاندار بھی ان کے خاکے کے مدار میں بے محابا داخل ہو جاتے ہیں اور یہ ابو الفضل صدّیقی کی تہذیبی شخصیّت کا وصف تھا کہ جو شخص بھی ان کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھاتا وہ اسے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چائے پلائے بغیر جانے نہیں دیتے تھے اور ان کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ جس سے ایک دفعہ ہاتھ ملاتے اس سے ملاقات کی تمام جزئیات کو ذہن میں محفوظ رکھتے اور دمِ ضرورت ان جزئیات کو خاکے میں مناسب مقام پر جگہ دے دیتے۔ چنانچہ ان کا خاکہ محض خاکہ نہیں ہوتا یہ شخصیت کی پوری تاریخ ہوتا ہے۔ اور ہم ایک خاکے میں بیک وقت کئی شخصیات کے ظاہر اور باطن سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد، سیّد سجاد ظہیر،

ڈاکٹر جمیل جالبی اور ضیا جالندھری پر ان کے مضامین اس نوعیت کے ہیں کہ انھیں خاکے کہنے کے بجائے ان شخصیات کے عہد نامے قرار دینا چاہیے۔ ابوالفضل صدیقی کے اس عمل میں بھی ان کی داستان سرائی کا فن اپنا جادو جگاتا ہے۔ وہ شخصیت کو داستان کا کردار تصور کرتے ہیں اور پھر اپنی معلومات کو اس طریقے سے پیش کرتے ہیں کہ شخصیت کے ساتھ اس کا عہد اور گرد و پیش بھی روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری کا یہ انداز ہمیں شاہد احمد دہلوی کے ہاں بھی نظر آتا ہے لیکن اس انداز کو عروجِ فن یقیناً ابوالفضل صدیقی نے عطا کیا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے شخصیت کو ادب کی داستان کا ہیرو بنا دیتے تھے اور خاکے کو سوانحی داستان!

میں نے اس مضمون کی ابتدا میں لکھا ہے کہ ابوالفضل صدیقی میں ایک انوکھے کردار کی خوبیاں موجود تھیں۔ وہ اہلِ دنیا سے مختلف قسم کے انسان نظر آتے تھے اور وضع قطع سے ہی نہیں عادات و اوصاف کے اعتبار سے بھی ان کا انداز جداگانہ تھا۔ میں ان کا خاصا پرانا قاری اور شیدائی تھا۔ لیکن ان سے پہلی ملاقات چند سال قبل اہلِ قلم کانفرنس میں ہوئی اور اپنا تعارف نام لے کر کرایا تو حیران رہ گیا کہ وہ میرے نام ہی سے نہیں کام سے بھی واقف تھے اور انھیں یہ بھی یاد تھا کہ میں نے "اردو زبان" کے کسی ابتدائی پرچے میں لکھا تھا کہ اسلامیہ کالج لاہور میں ضیا جالندھری میرے انگریزی کے استاد تھے۔ اس کانفرنس میں انتظامیہ نے ادیبوں کے قیام اور طعام کا بہت اعلیٰ انتظام کیا تھا۔ ایک پانچ ستارہ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کھانے کی میز سجی تھی۔ پاکستان کے عظیم ادبا انواع و اقسام کھانوں سے یوں نبرد آزما تھے جیسے پانی پت کے میدان میں مغل لودھیوں کے ساتھ نبرد آزما ہوئے تھے۔ ہر ادیب اس کھانے کو اپنی زندگی کا آخری کھانا سمجھ کر جھپٹ رہا تھا اور پلیٹ پر پہلے کھانے کا قطب مینار کھڑا کرتا۔ اس قطب مینار کو پیٹ میں اتارتا اور پھر دوبارہ میز پر جھپٹ پڑتا۔ ابوالفضل صدیقی ہجوم کی اس نفسا نفسی کو ایک طرف کھڑے ہو کر دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک خالی پلیٹ تھی۔ بہت دیر تک یہ پلیٹ خالی ہی رہی اور انھیں میز کی طرف جانے کی ہمت نہ ہوئی تا آنکہ ادبائے کرام نے پسپائی اختیار کی اور کھانے سے بھری ہوئی میزیں ان کا منہ چڑانے لگیں۔ تب ابوالفضل صدیقی صاحب نے پلیٹ میں تھوڑا سا سلاد ڈالا۔ کچھ دہی لیا۔ پلیٹ کے ایک کونے میں تھوڑا سا سالن انڈیلا اور نان کا آدھا ٹکڑا لے کر ایک طرف ہو گئے۔ ایک نوجوان ادیب نے دریافت کیا:

"صدیقی صاحب! بس اتنا سا کھانا!"

اور وہ بڑے اطمینان سے بولے:

"میاں! زندہ رہنے کے لیے تو اتنا ہی کافی ہے۔"

پھر کہنے لگے کہ:

"انسان کا ظرف کھانے کی میز پر سامنے آتا ہے۔ بیشتر لوگ صرف کھانے کے لیے زندہ ہیں، وہ زندہ رہ

کے لیے نہیں کھاتے۔"

اچھا کھانا ابوالفضل صدیقی کا ذوق تھا۔ وہ بہت خوش خوراک بھی تھے۔ اچھے کھانے سے ان کا عشق بہت گاڑھا تھا لیکن کھانے کی میز پر جب طرزِ تپاک اہلِ دنیا دیکھتے تو بس مسکرا کر رہ جاتے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا کھانا عام ڈگر سے ہٹا لیا تھا۔ فجر کے وقت ایک پیالی چائے کے ساتھ دو توس لیتے۔ گیارہ بجے چپاتی سالن کے ساتھ کھاتے۔ اور شام کا کھانا چار بجے کھا لیتے تھے۔ آخری دنوں میں کچے پپیتے کو بطور سبزی استعمال کرنے لگے تھے۔ ذیابیطس نے یلغار کر دی تو بیسن کی روٹی کھانے لگے۔ ذیابیطس کی شکایت رفع ہو گئی تو مختار زمن نے ایک جملے میں اس واقعے کو یوں سمیٹا:

> "اُن کے بے پناہ زمیندارانہ ڈنڈے کے آگے شکر کی ذرّیات نہیں ٹھہر سکیں۔"

ڈاکٹر جمیل جالبی نے "طرح مصرع" کے طور پر لکھا ہے کہ "ان کے پاس ۱۲۲ قلم ہیں جن کے وہ بلا شرکتِ غیرے مالک ہیں۔" اس "طرح" پر ان کے ایک ہم جلیس نے مرصّع غزل لکھ دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

> "لکھتے وقت ان کے پاس لکڑی کا ایک بڑا صندوقچہ رکھا رہتا ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ "بڑے بھائی! کسی نہ کسی دن مجھے آپ کا صندوقچہ چرانا ہے۔" اپنے خاص انداز میں مسکرا کر کہتے ہیں: "میاں! صندوقچے کے پاس میرا پستول بھی رکھا رہتا ہے۔ وہ دیکھا ہے؟ "آپ کو معلوم ہے اس صندوقچے میں کیا ہے؟ اس میں تقریباً پونے تین سو فاؤنٹین پن رکھے ہیں۔" صاحبِ قلم تو کیا وسیع قلمرو کے کسی حکمران کے پاس بھی شاید اتنے قلم نہ ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ جب سے فاؤنٹین پن ایجاد ہوئے ہیں صدیقی صاحب نے انھیں خرید کر جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ پارکر، بلیک برڈ، مونٹ بلانک، شیفر، ہر ماڈل، ہر رنگ اور ہر سائز کے قلم اس صندوقچے میں بھرے ہوئے ہیں۔ بعض لیلیٰ کی انگلیوں کی مخروطی اور نازک۔ بعض سہارن پوری پونڈے (گنّے) کی طرح بانس کے بانس۔ صدّیقی صاحب باری باری سب سے لکھتے ہیں۔ ہمیشہ بڑھیا کاغذ استعمال کرتے ہیں۔ خط اتنا خوب صورت جیسے کاغذ پر موتی رول رہے ہوں۔ لیکن اندازِ تحریر کچھ اس قسم کا ہے کہ اس خط کا پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے سُچّے موتیوں کا حاصل کرنا۔ یہ ہر معمولی کاتب کے بس کا کام نہیں۔ ان کے خاص کاتب ہیں!"

مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی پر انھوں نے معرکہ آرا سوانحی خاکہ لکھ کر ڈاکٹر وزیر آغا کو بھجوایا تو "اوراق" کے کاتب تمکین شیرازی ہزار کوشش کے باوجود اسے پڑھ نہ سکے اور یہ کراچی کے اس خاص کاتب سے لکھوانا پڑا جو ان کا سوادِ خط پڑھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ ان کا خط بے حد پختہ تھا۔ لیکن پکّے گانے کی طرح اس خط کے ساتھ لمبے ریاض کے بعد ہی موانست پیدا ہوتی تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ "ابھی تک ابوالفضل صدّیقی کی صرف

دس فیصد تحریریں کتابی صورت میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کی تحریروں کے غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ صدیقی صاحب خطِ شکستہ میں لکھتے تھے اور ان کا مسودہ نئی نسل کے بے علم کاتب عام طور پر پڑھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسی لیے ان کی اشاعت مدیرانِ کرام کے لیے ایک لاینحل مسئلہ بن کر رہ گئی۔"

ابوالفضل صدیقی کے کردار کی ایک اور خوبی ان کی بذلہ گوئی اور بذلہ سنجی تھی۔ ان کا جملہ بظاہر سادہ اور بے رنگ ہوتا لیکن اس کے پس منظر میں خود کوئی واقعہ ہوتا اور اس واقعے سے ہی جملہ نہ صرف جگمگا اٹھتا بلکہ اس سے بشاشت مزاح بھی پھوٹ نکلتی اور ان جملوں سے ان کی زندگی بھر کا تجربہ بھی ضرب المثل کی طرح عکس فگن ہو جاتا۔ ڈاکٹر جمیل جا نے ان کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ

"ایک دن کہنے لگے "میاں! دیکھو مُرغا دو طرح سے اذان دیتا ہے۔ عام مرغا کہتا ہے: "داتا گاؤں، داتا گاؤں"۔ لیکن بعض مُرغے منحوس ہوتے ہیں اور جب اذان دیتے ہیں تو کہتے ہیں "چوپٹا گاؤں، چوپٹا گاؤں"۔ جو مرغا "چوپٹا گاؤں" کی بانگ لگاتا ہے تو اس کے مالک سے نہ صرف مرغا لے لیا جاتا ہے بلکہ چاول، گھی اور نمک یا بھی لیا جاتا ہے تاکہ وباؤں کے تدارک کے لیے اس منحوس مرغے سے نجات حاصل کر لی جائے۔ اور میاں دیکھو! عام طور پر کسان کا مرغا "چوپٹا گاؤں" کی بانگ لگاتا ہے اور زمیندار کا مرغا "داتا گاؤں" کی!"

ان کا یہ جملہ ضرب المثل کی طرح مشہور ہے کہ:

"میاں! گھوڑا اور پھوڑا ہاتھ پھرنے سے بڑھتا ہے!"

لوگوں کو کرکٹ کی کمینٹری سُننے کے لیے ریڈیو اور ٹیلی وِژن کے گرد بیٹھا دیکھتے تو بے اختیار کہتے:

"شکاری شکار کھیلیں اور احمق پیچھے پیچھے پھریں۔"

مختار زمن کو بتا رہے تھے کہ "وہ علی گڑھ بھیج دیے گئے تو وہاں ان کا دل نہ لگا۔" زمن صاحب کو شرارت سُو اور بقول شخصے اُنھوں نے ان کی خدمت میں گستاخ ہو کر پُوچھا: "پھر دل کہاں لگا؟"

بولے "بس صفدری اور جعفری سے!"

زمن نے کہا: "بہت خُوب، چُپڑی اور دو دو! یہ محترمائیں آپ کو کہاں مل گئیں؟"

ابوالفضل بولے: "میاں! دو بندوقیں تھیں، بارہ بور کی۔ بڑی اچھی مار تھی ان کی۔ میرے ہاتھ پر چڑھی ہوئی تھیں!"

آموں سے ابوالفضل صدیقی کی محبت کے قصے مشہور رہیں۔ کہا کرتے تھے کہ "ہمارے گھر کی کوٹھڑی میں آم بھرے رہتے تھے۔ میں صبح سے اُٹھ کر کھانا شروع کر دیتا تھا۔ دن بھر کھاتا۔ رات کو چارپائی کے پاس دونوں طرف آموں سے بھری ہوئی بالٹیاں رکھوا لیتا اور اکثر آم کا رس بھری چارپائی پر اور بدن پر مل لیتا تاکہ آموں کی خوشبو بسی رہے۔"

مختار زمن نے ایک دفعہ اپنے گھر میں آم کے دو تین پودے لگائے تو صدیقی صاحب بہت خوش ہوئے۔ پودوں کو دیکھا۔ ہر پودے کے پتّے کو توڑا، مسلا اور سونگھا۔ پھر ایک پودے کے متعلق بولے:

"آمن ہے!"

زمن حیران ہوئے کہ یہ "آمن" کیا ہوتا ہے؟ پوچھا: "بڑے بھائی! کیا فرمایا؟"

ابوالفضل بولے: "یہ آمن ہے یعنی مادین ہے!"

زمن صاحب نے کہا: "بڑے بھائی! کمال ہے آپ آموں میں بھی جنس لے آئے۔" نہایت سنجیدگی سے بولے "یس فیملی ہے۔ سمجھا کرو۔ لنگڑا، فجری، سفیدہ، چونسا، گلاب خاص وغیرہ آم ہیں۔ دسہری، انگوری، عروس آمن ہیں۔"

زمن صاحب نے پوچھا: "آخر فرق کیا ہے؟"

بولے: "دیکھو آم میں کیف زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن آمن کی خوشبو اور رس زیادہ لطیف ہوتا ہے۔"

زمن صاحب نے خوش ہو کر نعرہ لگایا: "جنسِ لطیف زندہ باد!"

ابوالفضل صدیقی شکار کے بہت رسیا تھے۔ رات رات بھر جاگتے اور شکار کا پیچھا کیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیند ان سے بیزار ہو گئی۔ نیند سے تعلقات کی کشیدگی کو دُور کرنے کے لیے ان کے گھر میں تین بستر لگتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اوّل شب باہر لیٹتے تھے، نصف شب کے قریب برآمدے کے بستر پر استراحت کرتے اور آخرِ شب کمرے میں آ لیٹتے۔ ۱۵ اور ۱۶ ستمبر ۸۷ء کی درمیانی شب کو بھی ان کے گھر میں تین بستر آراستہ کیے گئے تھے۔ لیکن اس روز وُہ مرضِ قلب کی وجہ سے ہسپتال کے بستر پر لیٹے ہوئے تھے اور پھر یُوں ہُوا کہ نیند انھیں خود منانے آ گئی۔ عمر بھر کے کشیدہ تعلقات درست ہو گئے۔ ابوالفضل صدیقی نے نیند کی زلفیں اپنے شانوں پر بکھیر لیں اور وہ سو گئے اور ابھی تک جاگے نہیں۔ اخبار "امروز" نے کتنی غلط خبر دی ہے کہ "ابوالفضل صدیقی انتقال کر گئے ہیں۔"

صادقین ، خورشید مثال شخص

رشید نثار

صادقین ! پاکستان کی تہذیبی پہچان اور ثقافتی دبستان تھا۔ اُس کے فن کی عظمت اتنی بلند تھی کہ بعض اوقات نگاہیں اس کا طواف کرنے سے بھی قاصر ہوجاتی تھیں۔ کیونکہ اس کی رفعت تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔

صادقین ! موضوع، ہیئت اور زندگی کے بہت سے پہلو رکھتا تھا مگر اُس نے پاکستانی ثقافت کو اتنا فروغ دے دیا تھا کہ اس کا نام "پاکستانی فیشن" کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ تصویر، تحریر اور شاعری ایک مثلث بنا کر اُس کی زندگی کے بہت سے زاویے تراشتی تھی۔ مثلاً اس کی تصویر، مصوری کا ایک الگ دبستان بناتی ہے۔ جب کہ تحریر ایک مخصوص "خط" کی شناخت بنتی ہے۔ جس طرح خطِ کوفی، خطِ ثلث اور نستعلیق وغیرہ الگ الگ زاویوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ بعینہٖ صادقین اپنے منفرد خط کی بنا پر دبستانِ خطاطی میں اہم تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لہٰذا "خطِ صادقین" عظیم خطاطی کے دبستان میں روحانی سکون اور اطمینان کے اعتبار سے ایک واضح تصور رکھتا ہے اور اب اس کا شمار بیسویں صدی کے نامور خطاطوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ تقابل اور اہمیت کی دوڑ میں صادقین کا اپنے آپ کو عظیم خطاط کی حیثیت میں منوا لینا نہ صرف پاکستانی ثقافت کا ایک روشن باب ہے بلکہ اس کی عظمت کا ایک اہم پہلو بھی کہ وہ ادب کے راستے مصوری تک پہنچا اور مصوری نے اُسے خطاطی کی منزل تک پہنچا د اس کا یہ سفر دشوار بھی تھا کٹھن بھی اور جانہار بھی، مگر اس سفر میں اُس نے شخصی سطح پر رُوحانی ارتفاع حاصل کیا اور پرسکون موت مر پاکستانی ثقافت کو ایک ہیجان میں مبتلا کر گیا۔ اس طرح صادقین کی موت کے سکون کے برعکس پاکستانی عوام کا ہیجان بڑے اچھو ردِ عمل کا اظہار ہے۔ جسے محسوس کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ صادقین پاکستان تھا اور پاکستان صادقین ! کے بغیر نامکمل ہے۔ لہٰ

صادقین پاکستانی تناظر میں ہمیشہ موجود رہے گا۔

صادقین کے رُوحانی ارتفاع کا ایک الگ معاملہ ہے۔ اُس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارا اپنا معاشرہ رُوحانی افلاس شکار ہے۔ لہٰذا روحانی مفلسی ایک بلند رُوحانی انسان سے قدرتی طور پر فیض یاب ہونا چاہتی ہے کہ آج صداقت، امن اور ا کے معانی سے نابلد لوگ اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے کے لیے کسی عظیم بزرگ شخصیت کی شفقت میں پناہ لینا چاہتے ہیں مگر صادقین کی ذات میں کوئی پناہ گاہ تھی۔ کیا وہ برگزیدہ معاشرے کو پناہ دینے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا؟ —— میرے خیال : صادقین کا روحانی سکون اور شعری اطمینان صداقت اور نا آشنا معاشرے کو ایک پیغام ضرور دیتا تھا کہ "جنگ" کے خلاف ا پیغام، انسان دوستی اور رُوحانی روشنی میں مضمر ہے۔ اس کے باوصف صادقین مصوّر اور خطّاط کی حیثیت سے زرپرست معاش کے ڈرائنگ روموں کی زینت تھا، جہاں قرآنی آیات کی خطّاطی ایک فیشن کا درجہ رکھتی تھی، کسی رُوحانی کیف کا نہیں۔

صادقین نے بہت سی تصاویر کو تجریدی انداز میں ظلمت و نور کے تقابل کے طور پر پیش کیا ہے۔ مگر آرٹ کے رسیا ذہنوں نے اُس کے منورِ نظریے کو کبھی پرکھا نہیں اور نہ ہی اُس کے بارے میں سوچا ہے۔ بلکہ انھوں نے اپنے گھر کی دیواروں کو اس کی تصاویر اور خطاطی سے سجایا تاکہ کمرہ رنگوں کے امتزاج اور روحانی تقدس سے جگمگاتا رہے۔ چنانچہ پاکستان میں صادقین کی قدر و قیمت کا عام اندازہ یہی تھا۔ اور اس کی پذیرائی بھی اسی سطح پر ہوتی تھی۔ جب کہ پاکستان سے باہر اس کی پرستش ہوتی تھی اور یہ پرستش پاکستانی عظمت میں اضافے کا باعث بنتی تھی۔ بلکہ پاکستانی ثقافت کی فنی بلندی کا ایک اعتراف بھی بلند سطح پر ہوتا تھا۔ اب صادقین ہمارے درمیان نہیں رہا تو پاکستانی عوام کو بھی اس کی عظمت کا احساس ہوا ہے۔ شاید ہمارے درمیان رہ کر اس کے قرب نے اس کی عظمت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اور شاید لمحۂ فراق نے پاکستانی ذہنوں کو اُس کے نظریے سے ہم آہنگ کر دیا ہے اور اب یہی اُس کی عظمت اور بلندی کی دلیل ہے۔ صادقین مزاج اور فن کے اعتبار سے اس دنیا کا انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے لباس اور ہیئت کذائی سے پتا چلتا تھا کہ اُس کی روح کسی آسمان سے اُتر کر آئی ہے یا وہ بُدھ کا بھکشو ہے جس کے نزدیک "صداقت" فن سے الگ نہیں ہے اور نہ ہی اُسے اس دنیا کے فانی پیمانوں سے ناپا جا سکتا ہے۔ وہ تو از خود ایک زندہ، متحرک اور مجسم فن تھا، بالکل شانت، خاموش اور گہرا —— لہٰذا ایسے مجسمے کی پرستش ہی کی جا سکتی ہے کہ اُس کا ظاہر و باطن دونوں ایک تھے اور اسی اکائی نے اُسے محبت کا اسم اور روح کا پُرسکون جسم بنا دیا تھا۔

پاکستان صنعتی انقلاب کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اس تناظر میں سکون و اطمینان کے پیمانے بھی بتدریج تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس لیے اب سکون کا باعث اخلاق نہیں ہوگا اور اطمینان کی بنیاد روحانی ارتفاع نہ ہو سکے گی۔ لہٰذا صادقین کی پذیرائی اگر ہوگی تو محض مجرد آرٹ کی بنیاد پر —— اس کے باوصف آرٹ کے شیدا مجرد آرٹ کو صنعتی تہذیب کے تناظر میں نہ دیکھ سکیں گے۔ بلکہ ان کے نزدیک عیسیٰؑ کی مظلومیت، بدھ کی دکھی آتما اور حسین کی مجروح آتما سب مل کر صادقین کی اہمیت بڑھاتے رہیں گے اور یہی اقدار اُس کے فن کی اساس بنتی رہیں گی۔

صادقین کے پاس اطمینان اور سکون کی جو دولت تھی وہ اُس نے فن کے ذریعے پیدا کی تھی اور اس کا فن آفاقی ہونے کے ناطے مذہبی اور روحانی تناظر بھی رکھتا تھا۔ جس طرح عیسوی دینیات کے مبلغ، نقاش اور مصور آفاقی سطحوں پر پہچانے جاتے ہیں، صادقین بھی اسی حوالے سے آفاقی سطح پر پہچانا جائے گا۔ صادقین نے اپنے فن کے لیے "کرن"، "لکیر" اور "تنکے" کو بھرپور انداز میں برتا ہے۔ اُس کا نظریہ تھا کہ "ظلمت کی رونمائی کو کچھ نور چاہیے تاکہ سفیدی باہر آئے۔" اس طرح "کرن" کو مجسم کرنے کے لیے اُس نے کبھی سنگِ مرمر کا انتخاب کیا ہے اور ظلمت کے تناظر کے لیے کالا چہرہ اُس کے فن کی آماجگاہ بنا ہے۔ یاد رہے کالا چہرہ چغتائی کے فن کا بھی حصہ تھا۔ مگر صادقین نے صرف چند اشیاء پر اکتفا نہیں کیا۔ اُس نے پتے، پتھر، کاغذ، کپڑے، گتے، لکڑی، شیشے، کینوس، لوہے اور اینٹوں کو بھی فن کی آماجگاہ بنائے رکھا جن پر اُس کے فن کے سفر کی داستان لکھی ہوئی ہے لہٰذا اتنا بڑا مصور اس صدی پر دھرتی نے پیدا نہیں کیا ہے۔

صادقین بیسویں صدی کا پُرگو شاعر اور مصوّر ہے۔ اس نے شاعری کو مصوّری کا قالب دیا اور مصوّری کو شاعری کی زبان دی ہے۔

چنانچہ اُس کے اشعار بھی کسی ایک تصویر پر منتج ہوتے ہیں — اور تصویر کے اندر شاعرانہ امتزاج بڑی خوبصورتی سے جھلکتا رہتا ہے۔ بلکہ بظاہر فطرت کو اُس نے خطاطی کے پس منظر کے طور پر برتا اور ان مظاہر کو فطرت کی زبان بخش دی تو شاعرانہ مصوری اور خطاطی کا یہ نیا اسلوب ہے۔ جسے "پاکستانی اسلوب" کہا جائے تو درست ہوگا۔ صادقین نے اپنی مصوری میں اُس انسان سے اِبتداء کی ہے۔ جس نے روشنی کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اس اِبتدائی انسان کو روشنی نے حیرتوں کے لامتناہی سلسلے بخش دیئے تھے۔ یہیں سے آغاز کرتے ہوئے وہ خطاطی کی تہذیبی منزل تک آتا ہے۔ چنانچہ اُس کی مصوری، شاعرانہ خیال کے ساتھ ساتھ اپنے دامن میں ایک کہانی بھی رکھتی ہے اور یہ عنصر اُس کا تیسرا پہلو بنتا ہے۔ جب کہ اُس کے بیشتر معاصرین اور بزرگ پیشروؤں کی اکہری اور دوہری سطحیں رکھتے ہیں، لیکن صادقین صرف دو سطحوں پر خود کو قائم بالذات نہیں بناتا، بلکہ شش جہات کو وہ اپنی ذات اور کائنات کا مستقل موضوع بنا دیتا ہے اور اتنی سطحیں شاید آج کسی دوسرے مصور اور خطاط کے پاس موجود نہیں ہیں۔ البتہ اُنیسویں صدی کے بہت سے مصورین سے زیادہ جہتیں رکھتے تھے۔ اُنھوں نے تصویر کے لیے موضوع اور موضوع کے لیے نظریے کو بہت زیادہ اہمیت دی تھی۔ اس اعتبار سے صادقین موضوع کے تناظر میں اُنیسویں صدی کے "مصورین" کا ہم سفر، لیکن شاعری اور خطاطی میں ایک سے زیادہ عناصر کے امتزاج کی بنا پر صادقین بیسویں صدی کے تقریباً تمام مصوروں سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ صادقین نے مصوری میں بیانیہ انداز اور رسم و روایات کی پابندی کے خلاف بہت بڑا جہاد کیا ہے۔ اُس نے تصویر کو تجرید سے چھٹکارا دلایا، خیال کو مصور کیا اور تجریدی صورت میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر کے علامتی اظہار کو اپناتے ہوئے اپنا الگ دبستان قائم کر دیا ہے، چنانچہ یہ دبستان تصویر کے پس منظر میں داستان، موضوع اور نظریے کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس طرح صادقین کو ایک الگ دبستان کے بانی کی حیثیت سے پکاسو، سیزان، ماتیس اور رواو کے تقابلی مطالعے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب مصور فرانسیسی دبستان کے مشاہیر میں سے ہیں اور صادقین کے ہاں بھی کہیں کہیں فرانسیسی چھاپ موجود ہے مگر صادقین نے "قوس" اور "لکیر" کو جو صورت دی ہے اس پر صادقین کی اپنی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ خطاطی کے جس عہد میں صادقین نے اِبتداء کی ہے اس وقت خارجی عنصر کو نمایاں حیثیت دینے والے فن کے خالص مشاہیر بہت سے تجربات کر رہے تھے۔ ان میں مولانا حافظ یوسف سدیدی (مرحوم)، رشید بٹ، آذر زوبی، عبدالمجید دہلوی، موجد، اسلم کمال قابلِ ذکر ہیں — مگر یہ بات تصویر کے انداز میں کہنا اور خارجی عنصر کی بجائے تصویر کو داخلی کیف دے کر رنگوں کو نفسیات بخشنا یہ صرف صادقین ہی کا کمال ہے (صادقین کے اس وصف کو پاکستان سے باہر غیر ممالک میں پاکستانی اسلوب کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے) اپنے اس کمال کا صادقین کو بھی احساس تھا اس لیے اُس نے فن کی تفہیم کے لیے الوان و خطوط کا ایک الگ اسلوب تراشا جس سے صادقین کے کیف و جذب کا ادراک حاصل ہوتا ہے۔

صادقین کے لیے مذہب ایک زمانے میں ثانوی حیثیت رکھتا تھا اور انسانِ دانا کے برعکس وحشی، نیم برہنہ اور جنگل کا

[illegible] باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے

انسان بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ انسان کو یکتائی کی حالت میں دیکھنے کی خواہش صادقین کے ہاں بڑی شدّت سے پائی جاتی ہے۔ اور اسی تناظر میں وہ اپنے فن کے ایوان میں کسی آلائش کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ آلائش غیر ملکی نظریات کی ہو سکتی تھی، نیز اس اسلوب کو جس کا تصویری اظہار اپنے ملکی نظریات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ صادقین نے خالص پاکستانی اسلوب کو ایک جذبہ دے دیا اور پیغام بھی، جس میں پاکستانی ذہن کے لیے ایک نئی وسعت تھی۔ اُس کا نظریہ فن کچھ یوں تھا:۔

- فن اپنی نظر میں محض معلق شے نہیں ہے۔
- زندگی اور معاشرے سے فن اس طرح پھوٹتا ہے جس طرح زمین سے درخت۔
- انسانیت کی اُمنگ، حوصلے کا ادراک، امتیازِ حق و باطل کی اہلیّت۔
- نیک و بد میں تفریق کرنے کی صلاحیت، یہ سارے عناصر ایک فن کار کے دل و دماغ کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہیں۔

پاکستانی معاشرے میں صادقین کے نظریئے سے پیشتر مذہبی اندازِ نظر موجود نہیں تھا۔ بلکہ تجرید، علامت اور صنمیاتی انداز کی مصوری فروغ پا رہی تھی اور رنگوں میں زرد، نارنجی اور سلیٹی رنگ سب رنگوں پر حکومت کر رہے تھے لیکن صادقین نے مصوری میں سیاہ رنگ کو مذہبی تناظر میں بڑی اہمیت دی اور سبز رنگ کو رُوحانی ارتفاع کی علامت کے طور پر برتا جس سے غیر شعوری طور پر پاکستانی تحریک کی طرف سفر کا آغاز ہوا۔ چنانچہ یہ امر کہ پاکستان ایک رُوحانی ارتفاع کی تخلیق ہے کسی دانشور اور کسی بڑے فن کار کے لیے باعثِ نزاع نہیں ہے اور اس چھوٹے سے تصور سے پاکستانی عوام صوفی اور مذہبی انسان بخوبی واقف ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب بھی رُوحانیت سے الگ کسی نظریاتی تناظر میں ادب اور معاشرت کو ہم آہنگ کیا گیا ہے تو وہ فطری انجام سے پیشتر ہی ناکام ہو گیا لیکن جب بھی رُوحانی ارتفاع کو فن کے ذریعے پیش کیا گیا، اُسے نئے رجحان کے طور پر قبول کیا گیا ہے، اور اب صادقین کو رُوحانی ارتفاع کے حوالے سے پہچانا جا رہا ہے، تو موجودہ صدی اس کی اپنی رُوحانی صدا ہے۔ اُس نے رُوحانی خلاء کو پورا کرنے کے لیے جن رنگوں کو مستحکم کیا ہے۔ اُن میں خصوصی طور پر کلیجی رنگ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس رنگ میں رُوح کا تعلق دل سے بنتا ہے، لہٰذا صادقین نے رُوح اور دل کو مصوری، خطاطی اور شاعری کا حاکم بنا دیا ہے۔

صادقین نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ اُس نے فن کی دیوی سے شادی رچالی تھی۔ اس لیے اس کا سارا وقت عروسِ فن کو سنوارنے اور بنانے میں صرف ہوتا رہا۔ اُس کے فنی ارتقاء کی داستان بہت طویل ہے مگر اس ارتقاء میں اس کی تنہائی نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ چنانچہ اُس کے فن پاروں میں جہاں کہیں خلاء موجود ہے اس کی بنیاد بھی وہی ازلی تنہائی ہے جس نے اُسے فن کی دیوی پر قربان کر دیا تھا۔ اگر صادقین تنہا نہ ہوتا تو اُس کے ہاں اُمید کی کرن کا نور نہ پھوٹتا بلکہ مایوسی، ابہام اور شک سب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا لیکن خطاطی تک آتے آتے اس نے ایک مدہوش قلندر بن کر بڑی طویل ریاضت کی ہے۔
(ر۔ن)

ل کر اُسے گھیر لیتے اور وہ تنہائی کی گپھا میں بیٹھا سسکیاں لیتا رہتا۔ لیکن اُس کی تنہائی ہی اُس کی اپنی کائنات تھی۔ اُس نے اس کائنات کو فن پاروں سے سجا دیا تھا۔ بلکہ اُس کی زندگی کے کرب نے تنہائی کو ایک حُسن بخش دیا تھا۔ لہٰذا تنہائی، حُسن اور وجود اُس کے لیے بامعنی ہو گئے تھے۔

صادقین کی قوتِ تخلیق میں بجلیوں کی سی سُرعت تھی۔ وہ چوبیس گھنٹے ایک نقطۂ اتصال پر رُک کر اَن گنت دن اور بے نام راتیں گزار دیتا تھا۔ اُس نے لمحے کی جبریت کو کبھی قبول نہیں کیا تھا، لہٰذا "لمحہ" اُس کے لیے بامعنیٰ اور "ساعت" اُس کے لیے زمان و مکاں کی قید سے رہائی کے مترادف تھی۔ اُس نے فن کو وجود و عدم کے تصوّر سے بھی ماوراء بنا دیا تھا۔ اگر لمحہ اُسے قید کر سکتا تو صادقین آج فنا ہو کر وقت کی گرد میں دب کر گُم ہو چکا ہوتا، لیکن بیسویں صدی میں صرف صادقین ہی ایک ایسا فن کار ہے، جو لمحے سے آزاد اور رنگینی کی ساعتوں سے ماوراء دکھائی دیتا ہے۔ صادقین اپنی تنہائی کے عصر میں خود اپنے سامنے رہتا تھا۔ وہ دوسری ذات سے "الرجک" تھا۔ صرف اپنی ذات کے گرد حاشیہ لگا کر بیٹھا رہتا تھا۔ یہ حاشیہ اُسے اپنی ذات کے خول سے باہر نہیں نکلنے دیتا تھا۔ بلکہ حج کے موقع پر جب اُس کے دوستوں نے اُسے پکڑ دھکڑ کر حج کرا دیا تو اُس وقت بھی اس کی آنکھ بند تھی۔ جب اُس کے دوستوں نے پوچھا کہ صادقین حج کیسا رہا تو اُس نے جواب دیا "ہم نے تو آنکھ کھول کر اُسے دیکھا ہی نہیں" تو یہ استفسار اپنی جگہ بے حد اہم ہو جاتا ہے کہ وہ پھر کس کو دیکھتا رہا؟ اس اعتبار سے بھی صادقین قبیلۂ فقیراں ہی سے تعلق رکھتا تھا، لہٰذا اس کی آنکھیں اس کے اندر کی طرف کھُلتی تھیں ـــــ اور جس فن کار کی آنکھ اپنے باطن میں کھُلتی ہو وہی فن کار ظلمت کے درون سے نور کا سورج طلوع کر سکتا ہے۔ لہٰذا صادقین نے "کعبہ" کو بھی آنکھ کھول کر نہیں دیکھا۔ تو جس حاشیے کو اُس نے اپنی تصویروں کے گرد کھینچ رکھا تھا وہی حاشیہ نظارۂ کعبہ کے وقت بھی اُس کے گرد کھنچا ہوا تھا۔ یقیناً صادقین ایک سادھو اور فقیر کی حیثیت میں خانۂ کعبہ کے طواف کو گیا تھا (فقیر تو خدا کے ساتھ معانقہ کرتا ہے) اور اپنی ذات کو ضم کر کے سمندر بن جاتا ہے۔ مگر صادقین فقیر کے ساتھ ساتھ ایک فن کار بھی تھا اور فن کار اپنی ذات کو کسی دوسری ذات میں ضم نہیں کرتا۔ بلکہ اُسے دوسری ذات سے بھی خوف آتا ہے۔ لہٰذا صادقین کا فنکار اپنی ذات میں ضم رہا۔ ایک فنکار کی فنی عظمت کی یہ علامت بھی ہے اور اُس کے فلسفے کی تصدیق بھی۔

صادقین فقیر یا سادھو کی حیثیت سے ایک عارف بھی تھا۔ اس کا عارفانہ نظام گیروے رنگ کے لباس تک محدود نہیں تھا، بلکہ "حرف" کو صوت اور صوت کو صورت عطا کرنے کے لیے اس نے فقیرانہ نظام کے تحت تخلیقی جست لگائی تھی۔ وہ فقیر کیوں تھا۔ کیا وہ اپنے معاصرین کی طرح جدیدیت کے تناظر میں خود کو "ماڈرن" نہیں بنا سکتا تھا۔ یقیناً وہ ایسا کر سکتا تھا۔ مگر اُس کے خون اور فکر میں اپنے آباؤ اجداد کا تخلیقی ہنر گردش کرتا رہتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے فن کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اپنے بزرگوں کے فن کو بھی گلے سے لگائے رکھا۔ مثلاً اُس کے والد بہت خوبصورت سلام نگار اور مرثیہ گو تھے، اس کے بھائی "کاظمین" بہت اچھے صحافی، شاعر اور فن کے پرستار تھے۔ چنانچہ تہذیبی طور پر اُس کے تجربات میں خاندانی عطا بھی شامل تھی۔ لہٰذا اس نے کالجوں، سکولوں، لائبریریوں، تاریخی عمارات اور عجائب گھروں میں اپنے فن کو آباد کیے رکھا اور اُس کے ساتھ ساتھ دوستوں،

رہا اور اس کی عقیدت کا گراف بھی بڑھتا رہا۔

ہمارے موجودہ عہد میں وہ فن کار خوش نصیب گردانا جاتا ہے جسے اپنی زندگی میں عزت نصیب ہوئی ہو۔ انہی فن کاروں میں صادقین بھی شامل تھا۔ جس کی عظمت کا اعتراف نہ صرف اس کی زندگی میں وسیع پیمانے پر ہوا بلکہ حکومت کی طرف سے اس کے نام کی گیلری کا قیام ایک نئی روایت کے اجرا کے مترادف ہے (خدا کرے یہ روایت ہمیشہ قائم رہے۔)

صادقین کی خطاطی گہرے نیلے رنگ سے شروع ہوتی تھی۔ یہ رنگ امن، آشتی کا مزاج متعین کرتا ہے لیکن صادقین اس رنگ کو آفاق کے تناظر میں استعمال کرتا تھا جس میں وسعت اور گہرائی دونوں موجود تھے۔ وہ خود بھی ایک گہرا انسان تھا۔ اس لیے آفاق اُسے بے حد پسند تھا۔ چنانچہ آفاق پر منور آیات لکھ کر وہ اسلامی تہذیب کو آشکار کرتا تھا اور یہ بھی بتاتا تھا کہ آفاق پر آیات کی روشنی کی وجہ سے چاند اور ستارے چمکتے ہیں اور اگر آیاتِ ربانی نہ ہوں تو دونوں عالم ظلمت کدے کا رُوپ اختیار کر جائیں۔ چنانچہ فنونِ لطیفہ کے باب میں صادقین کا فطری منطقہ رُوحانی اور مابعد الطبیعاتی بنتا ہے اور اسی بنیاد پر اس کا فن آفاقی حدوں کو چھوتا ہوا دونوں عالم کو محیط ہوجاتا ہے۔ میں یہاں اُس کی عظمتوں کا گراف نہیں پیش کرنا چاہتا کہ وقت خود اس کی عظمتوں کا معترف اور نگہبان ہے لہٰذا وقت کے دوش پر اس کی شہرت دُور دور تک پھیل رہی ہے اس کے باوصف میں صرف اتنا کہوں گا کہ کراچی، لاہور اور اسلام آباد اس کے فن کے دبستان تھے جہاں نیول ہیڈکوارٹرز، عجائب گھر، سپورٹس کامپلیکس اور بہت سے ادارے اس کی محبتوں کے اسیر اور اس کے خلوص کے سفیر ہیں۔ صادقین نے جتنے "میورل" جتنے مخطوطے، جتنی تختیاں اور بے حساب گردپوش بنائے اُس کی رفتار کا اندازہ یوں بھی لگایا جا سکتا ہے کہ لکیریں کھینچ کھینچ کر، نقطے بنا بنا کر، قوسیں اور حاشیے مصوّر کرتے کرتے اُس کی اُنگلیاں ٹیڑھی ہوگئی تھیں۔ وُہ ان ٹیڑھی اُنگلیوں سے بھی کوئی نہ کوئی تصویر بنا لیا کرتا تھا (مصوّر جو ٹھہرا) لہٰذا ٹیڑھی اُنگلیوں سے وہ ہاتھ پھیلا کر برش اور رنگوں سے آزاد لفظ "اللہ" بنا کر اپنے پرستاروں کو دکھایا کرتا تھا۔ سچ ہے فن کی آبیاری مکمل زندگی سے کی جاتی ہے اور صادقین تو تھا ہی پیکرِ فن — مجسّم محبّت — اور مکمل مصوّر! اس اعتبار سے صادقین کا کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا۔ وہ اگر رنگوں کے دائرے سے باہر نکل کر کہیں اور چلا جاتا تھا تو شعر کی دیوی سرسوتی اس پر مہربان ہوجاتی تھی — اور شعر بھی وہ جسے رُباعی[1] کی پیچیدہ ہئیت میں گرفتار کرنا بہت ہی مشکل عمل ہے۔

---

[1] چند رباعیات دیکھیے:۔

فن کی چال تو رہی ہے ٹیڑھی یارب   سطریں لکھتا ہوں بڑی ٹیڑھی میڑھی یارب
لکھتے ہوئے آیاتِ جنوں بچپن سے   اب اُنگلیاں ہو چکی ہیں ٹیڑھی یارب

نقش تھے پامال بنائے میں نے   پھر اُلجھے ہوئے بال بنائے میں نے
تخلیق کے کرب کی جو کھینچی تصویر   تو اپنے خدوخال بنائے میں نے

بہت ہی بے تکے ہیں مرے ہاتھ   کب شکل نگاری میں رُکے ہیں مرے ہاتھ   بچپن سے شبانہ روز لکھتے لکھتے   اس عمر میں سُوج چکے ہیں مرے ہاتھ

صادقین کو اپنے عصر پر ایک فوقیت حاصل ہے کہ وہ جتنی آسانی سے رُباعی کہہ لیتا تھا اُتنی آسانی سے اُس کے معاصرین نہیں کہہ سکتے تھے۔ (وہ بھی پنجابی زبان میں) — اور مصوری میں خیال، جذبے کے ساتھ ساتھ وہ "اشاریت" کے نظام کا پابند ہو کر معانی کا ایک جہان آباد کرتا تھا، اور خطاطی کے ذریعے وہ عقیدے کو اپنے اسلوب کا امتیازی وصف بنا کر اسے اپنی زندگی کی "معجزانہ نوعیت" بنا دیتا تھا۔ چنانچہ صادقین دوسرے الفاظ میں ازلی راہب کی شکل میں نہ صرف عظیم عقیدے کا پرچارک تھا بلکہ "رحم و کرم" کے علامتی اظہار کو رزمیاتی پیکر بھی عطا کر دیتا تھا، اس لیے صادقین کے فن کو فنا نہیں۔ بلکہ مصوری میں اُس نے جن نئی اقدار کو جنم دیا ہے، اُس میں نرمی، ہمدردی، عبودیت اور احساس کا رچاؤ تہ در تہ امتزاجی پرتیں رکھتا ہے۔ چنانچہ اُس کا فن جسم کے جہنم سے آزادی کا اعلامیہ اور صبحِ ازل کی وجدانی کیفیت کا دوسرا نام ہے۔ اس اعتبار سے صادقین سادھو بھی ہے، قلندر بھی، فنکار بھی، تغزل کا سکون شعار بھی اور انکساری کا معصومیت آثار بھی۔ چنانچہ انسانی وجود میں معانی کے اتھاہ سمندر کو لے کر زندگی کرنا شیوۂ پیغمبری ہی ہے۔ لیکن اس عہد میں ولیِ کامل کے بغیر فن کی دُنیا میں قیادت فراہم کرنا ایک جوکھم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تاہم صادقین اپنے فن کا ولی تھا اور مدہوش قلندر بھی اور یُوں وہ خورشید مثال شخص تھا جس کے پاس ولایتِ فن کی شخصی سند بھی تھی اور رُوح کے جلال و جمال کا بیکراں عنصر بھی۔

صادقین روشنی کا غیر مبہم کشیدکار تھا۔ اُس نے نُور کی پرستش کی تھی۔ لہٰذا ایسا شخص نُور کا حصہ بن کر ظلمتوں میں جگمگاتا رہتا ہے۔ یقیناً صادقین دُنیا کے لیے ایک تمثال (LEGEND) اور فن کا ایک مجسمہ ہے، جو مستقبل میں متھ (MYTH) کا درجہ حاصل کر لے گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) صادقین نے اُردو کے علاوہ پنجابی میں بھی اُردو کے وزن پر رُباعیات کہی ہیں اور وہ بھی اتنی آسانی سے کہ اس کی قادرالکلامی پر سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔ (ر ن)

فکر تونسوی کا مزاح

انور سدید

فکر تونسوی نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی تھی۔ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ آزادی سے پہلے "ہیولے" کے عنوان سے شائع ہوا تھا اور اس پر ایک تحسین آمیز مضمون کنہیا لال کپور نے سویرا میں لکھا تھا۔ اتنی عمدہ اٹھان اور اتنی اعلیٰ پذیرائی کے باوجود عجیب اتفاق یہ ہے کہ انہوں نے شاعری سے وفادارانہ سلوک نہیں کیا اور آزادی کے بعد جب نئے ماحول میں انہیں توافق کی تلاش ہوئی تو انہوں نے طنز و مزاح کو اپنے مزاج کے زیادہ مطابق سمجھا اور پھر معاشرے کی بوالعجبیوں اور ناہمواریوں کو اس صداقت بیانی سے پیش کیا کہ آتش بازی کے انار کی طرح مسکراہٹیں پھوٹتی چلی گئیں اور آخر طنز و مزاح ہی ان کے ادبی تشخص کا وسیلہ بن گیا اور شاعری یک سر پس منظر میں چلی گئی۔

مجھے مقبول احمد مقبول بتا رہے تھے کہ فکر تونسوی کو ابتدائے حیات میں معاشی ناآسودگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان کے والد تونسہ شریف میں کریانے کی دکان کرتے تھے جو کنبے کی پوری طرح کفیل نہیں تھی۔ چنانچہ فکر تونسوی اپنی خواہش کے مطابق تعلیم بھی حاصل نہ کر سکے۔ باپ چاہتے تھے کہ فکر دکان میں ان کا ہاتھ بٹائیں لیکن فکر کو نون تیل کی فروخت کا پیشہ پسند نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اپنے والد کی مرضی کے خلاف ایک روز تونسہ شریف چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ رختِ سفر کے بغیر گھر سے نکلے اور لاہور پہنچ گئے[1]۔ لاہور کا قیام معاشی اور اقتصادی لحاظ سے فکر کے لیے اچھا تجربہ نہیں تھا۔ یہاں انہیں نانِ جویں حاصل کرنے کے لیے کئی پاپڑ بیلنے پڑے۔ ادب کی پہلی معزز نوکری انہیں رسالہ "ادب لطیف" میں ملی اور انہوں نے "سویرا" کی ادارت میں بھی حصہ لیا۔ لیکن ذہنی سکون کا یہ دور بہت مختصر ثابت ہوا اور آزادی کے بعد انہیں جالندھر کو جہاں ان کا دوست گور بخش سنگھ مخمور جالندھری مقیم تھا اپنی پناہ گاہ بنانا پڑا۔ لیکن جالندھر بھی عارضی ٹھکانا ثابت ہوا اور وہ دہلی چلے گئے جہاں قلم اور قرطاس ان کا وسیلۂ زندگی بن گئے اور شاعری کی جگہ طنز و مزاح نے لے لی۔ اس اسلوب کو فکر نے تادمِ آخر اختیار کیے رکھا اور جب ۱۲ ستمبر ۱۹۸۷ء کو دنیا سے رخصت ہوئے تو "پیاز کے چھلکے" "آدھا آدمی" "آخری کتاب" اور "فکریات" وغیرہ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔

فکر تونسوی کے یہ شنیدہ حالاتِ زندگی اگرچہ مختصر ہیں تاہم ان سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ زندگی ان

---

[1] "بھگوان کی لیلا" میں لکھتے ہیں "مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس بڑے شہر میں تنہا ہوں، ممتا کے بغیر سانس لے رہا ہوں۔"

پر کچھ زیادہ مہربان نہیں ہُوئی۔ انہیں بچپن میں جس اقتصادی نامساعدت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ قیامِ دہلی کے دوران اگرچہ نظر نہیں آتی ہے لیکن انہیں آسودہ حال تصوّر کرنا شاید مناسب نہیں۔ حالات کی اس نامساعدت نے ہی فکر تونسوی کے داخل میں ردِ عمل پیدا کیا اور پھر وُہ لمحہ بھی آیا جب دولت کی اس غیر منصفانہ تقسیم پر وہ اپنی خلوت میں ہنسنے لگے اگرچہ یہ ایک مفکر کا قہقہہ تھا اور اس میں پاگل پن کا عنصر نظر نہیں آتا لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ فکر تونسوی کے طنز و مزاح کے بیشتر سوتے اس معاشی ناہمواری سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان آبادیوں کا تبادلہ ہوا تو اس کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات نے بھی جنم لیا۔ ذہنی انتشار کی اس کیفیت میں اقدار کی شکست و ریخت بھی عمل میں آئی اور معاشرے کی وہ ہم جہتی بھی پارہ پارہ ہوئی جو ایک طویل عرصے سے قائم تھی اور اعتمادِ باہمی جس کی اساس تھی۔ فکر تونسوی بھی آگ، خون، قتل، غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کے اس گھمسان سے گزرے جو خطِ آزادی کے دونوں طرف بلا تمیز مذہب و ملت برپا تھا۔ توقع تھی کہ فسادات کا یہ ابال اور جذبات کا یہ الاؤ جب رُو بہ اعتدال ہوگا تو ایک متوازن معاشرہ معرضِ تخلیق میں آ جائے گا۔ لیکن المیہ یہ ہُوا کہ قدروں کی شکستگی نے معاشرے کو ایک نئے زوال سے دوچار کر دیا۔ چنانچہ اب جبلی الاٹمنٹوں، چور بازاری، لوٹ کھسوٹ، رشوت اور سفارش کا بازار گرم ہو گیا جس نے ناآسودگی پیدا کی، معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کو جنم دیا اور سماجی تضادات کی نئی جہت زندگی کی عام سطح پر ابھار دی۔ فکر تونسوی نے آزادی سے پہلے کے دور میں سماجی انصاف اور معاشرتی انصاف کا خواب دیکھا اور ایک مثالی نظام کو نئے ملک میں رائج کرنے کی آرزو کی تھی۔ آزادی کے بعد ان کا یہ آدرش ٹوٹ گیا۔ چنانچہ ان کے ہاں جو مجسم مایوسی اور دبیز بے چارگی نظر آتی ہے وہ ان حالات ہی کی زائیدہ ہے اور اس کے شدید ردِ عمل نے ہی انہیں معاشرے کا مذاق اڑانے پر آمادہ کیا اور وہ سنجیدہ شاعری سے طنز و مزاح کی طرف آ گئے۔ اب ان کی حیثیت ایک ایسے ناظر کی تھی جو سب کچھ دیکھتا ہے، بظاہر بے بس ہے۔ لیکن خون کے آنسو پی رہا ہے اور جب بات اختیار میں نہیں رہتی تو نوکِ قلم سے نشتر کا کام لینے لگتا ہے اور ہنسی ہنسی میں وہ کام کر گزرتا ہے جو بڑے بڑے مصلح بھی سرانجام نہیں دے سکتے۔ چنانچہ یہ کہنا شاید درست ہو کہ فکر تونسوی نے طنز و مزاح سے حیوانِ ظریف بننے اور جسم کی فاضل قوت کو ہنسی اور مذاق میں صرف کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ طنز و مزاح سے سماجی اصلاح کے موثر حربے کا کام لیا ہے اور یہ حربہ اس لیے کارگر نظر آتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں پورے ہندوستان کی نظریں فکر تونسوی کی طرف دیکھنے لگیں کہ کسی مخصوص واقعے پر وہ اپنا ردِ عمل کس طرح ظاہر کرتے ہیں اور معاشرتی ناہمواری کو کس طرح عیاں کر دیتے ہیں۔ اس عالم میں فکر تونسوی کی حیثیت بالعموم اس بچے جیسی ہوتی جو بھرے دربار میں مصاحبوں کی موجودگی میں بادشاہ سلامت کو بے لباس یا ننگا کہنے کی جرأت کر سکتا تھا۔ اس قسم کی معصومیت سے فکر تونسوی کے بارے میں دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

اوّل: یہ کہ فکر تونسوی زندگی اور معاشرے کی ناہمواریوں کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ ان کا ذہن اس ناہمواری پر شدید ردِ عمل پیدا کرتا ہے لیکن وہ اس پر برہم نہ ہوتے بلکہ اس ناہمواری سے ہمدردانہ رویّہ پیدا کر لیتے تھے۔

دوم: ان میں اتنی جرأت اور عالی حوصلگی بھی تھی کہ وہ اس پر اپنا شوخ و شنگ تبصرہ بھری مجلس میں پیش کر دیتے تھے۔ چنانچہ وہ بیک وقت زندگی کے ہجوم میں شامل بھی ہوتے، دھکّے بھی کھاتے اور پھر اپنی پریشانیوں اور پشیمانیوں کو چھپانے یا ان پر خلوت میں نادم ہونے کے بجائے ان میں دوسروں کو بھی شریک کر لیتے تھے۔

ان دو زاویوں سے دیکھئے تو احساس ہوتا ہے کہ مسلسل ناکامیوں اور پیہم نامرادیوں کے باوجود فکرؔ تونسوی نے لمبا چوڑا غم پالنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے معاشرتی دکھ کو اپنی ذات کا روگ نہیں بنایا۔ شدید کرب محسوس کیا لیکن خون نہیں تھوکا اور احساس کو کسی گہرے بحران سے دوچار نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ پُوری زندگی انہیں بازیچۂ اطفال نظر آتی ہے اور وہ اس کی ہر کروٹ سے کھیلتے اور لطف اُٹھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے مزاح کی جو صورت پیدا ہوتی ہے یہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے عیاں ہے۔

"چتر بخن کے عشق کی کہانی ہسپتال بھر میں مشہور ہو چکی ہے۔ دنیا میں کئی باتیں خواہ مخواہ مشہور ہو جاتی ہیں جیسے ہاپوڑ کے پاپڑ مشہور ہیں میں نے ایک دفعہ ایک ہاپوڑ نواسی سے پوچھا تھا:

"بھائی صاحب! ہاپوڑ کے مشہور پاپڑ یہاں کے کس بازار میں ملتے ہیں؟"

وہ بولا:

"میں نہیں جانتا" اور یہ کہہ کر وہ ہانک لگانے لگا:

"کشمیر کے سیب لے لو، چار روپے کلو۔"

حالاں کہ وہ ہماچل کے سیب تھے۔ اور مجھے یُوں لگا جیسے وہ سیب نہیں بیچ رہا۔ مشہوری بیچ رہا ہے بلکہ کشمیر بیچ رہا ہے۔" (آدھا آدمی)

"جنازہ بڑی نیچرل چیز ہے بشرطیکہ دوسروں کا ہو۔ مثلاً ہمارا سیاسی لیڈر بُوڑھا ہو جائے ہاتھ اور لاٹھی دونوں بیک وقت کانپنے لگیں تو خدمتِ قوم میں اس کا اعتقاد اور بھی پختہ ہو جاتا ہے اور جنازے میں اعتقاد کم ہو جاتا ہے حالانکہ قوم اپنے مستقبل کی قسم کھا کر اس سے بار بار وعدہ کرتی ہے کہ ہم آپ کے جنازے میں لاکھوں کی تعداد میں شریک ہوں گے۔ آپ جنازے کی طرف قدم تو بڑھائیے مگر لیڈر اصرار کرتا ہے کہ میں وزیرِ اعظم بنے بغیر جنازہ نہیں اٹھواؤں گا۔ ہاں۔ جنازہ نیچرل چیز ہے۔ لیکن لیڈر ان نیچرل بن کر رہنا چاہتا ہے، وزیرِ اعظم بن کر رہنا چاہتا ہے۔" (بوڑھوں کا سال)

"میں نے ایک صاحب سے کہا:

"براہِ کرم مجھے دو چار گالیاں دے دیجئے۔"

انہوں نے فائل سے عینک اٹھائے بغیر کہا:

"ساری! میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ اس خدمت کے لیے کسی اور کے پاس جائیے!"

اس صاحب نے کسی اور کا ایڈریس بھی نہیں دیا اور نہ میں نے پوچھنا مناسب سمجھا۔ جب گالی ایسی لذیذ شے کے لیے اس کے پاس ٹائم نہیں تھا تو "ایڈریس" ایسی بے رس شے کے لیے وہ ٹائم کہاں سے نکالتا۔ میں نے سوچا: "ان صاحب سے تو وہ آدمی بہتر تھا جس نے کسی سے ایک مرتبہ پوچھا تھا:

"جناب! آپ بتا سکتے ہیں کہ میونسپل کارپوریشن کا دفتر کہاں ہے؟"

وہ بولا:

"یہ بتانے کے لیے میں پچاس پیسے چارج کروں گا۔"

ضرورت مند نے پچاس پیسے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے اور اس نے بتایا کہ:

"جس جگہ آپ کھڑے ہیں وہی میونسپل کارپوریشن کا دفتر ہے۔"

فکر معاشرے کے زیرک ناظر تھے۔ چنانچہ انہوں نے اکثر ایسے واقعات کے بیان میں زیادہ دل چسپی لی ہے جن
معاشرتی ناہمواریاں سطح پر بے ساختہ انداز میں ابھر آتی ہیں۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ واقعے کو ٹیڑھی آنکھ سے
نہیں دیکھتے۔ نہ ہی واقعہ نگاری میں مبالغہ آرائی کی کوشش کرتے ہیں۔ تخلیقِ مزاح میں ان کا حربہ وہ جملہ ہے جو فکر تونسو
بیانِ واقعہ کے بعد آہستہ سے لڑھکا دیتے ہیں اور جس سے سارا واقعہ اچانک ایک لطیفے کی طرح کھلکھلا اٹھتا ہے۔ اس لحا
دیکھیے تو واقعے کا بیان مزاح کے لیے زمین ہموار کرتا ہے۔ فکر تونسوی واقعے کو غبارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اس
آہستہ آہستہ ہوا بھرتے ہیں اور جب غبارے کا پیٹ پھول جاتا ہے تو ایک ہلکی سی چبھن سے اسے پھاڑ دیتے ہیں۔ بظا
غبارہ پھٹ جاتا ہے لیکن حقیقتاً یہ دبے ہوئے جذبات کا کتھارسس کرتا ہے اور تشنج کو رفع کر ڈالتا ہے۔ مضمون "صبح کی
میں لکھتے ہیں:

"میں کئی بار سوچتا ہوں کہ اگر کوئی محبوبہ صبح کی اس سیر میں میرا بھی ساتھ دیتی تو ناتوانیِ عشق میں ہماری پوزیشن بھی اس مدراسی جوڑے سے کچھ کم نہ ہوتی۔ تاریخِ عشق ہم پر بھی دُہرائی جاتی۔ ڈاکٹروں کے مشورے بدستور بیکار جاتے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ڈاکٹر نے مجھے بھی مشورہ دیا تھا کہ صبح کی آکسیجن کھایا کرو۔ غمِ دوراں سے نجات مل جائے گی۔"

میں نے پوچھا: "کیا بیوی کو بھی ساتھ لے جایا کروں؟"

وہ بولا: "پھر تو ایک چیز سے ہی نجات ملے گی، غمِ دوراں سے یا بیوی سے۔"

> چنانچہ میں تنہا ہی آکسیجن کھانے کے لیے سیر پر نکل جاتا ہُوں ـــــ مگر ہر مرتبہ آکسیجن کے بجائے ایک ٹرک سے ملاقات ہوتی ہے جو اینٹوں اور مٹی روڑے سے بھرا ہوتا ہے۔ اس میں سے قریباً ایک کوئنٹل گرد و غبار اڑ کر میرے اندر چلا جاتا ہے۔ ایک دن میں نے ڈاکٹر سے پُوچھا: "میڈیکل سائنس کے اعتبار سے یہ دُھول مٹی کیسی ہوتی ہے؟"
>
> وہ بولا: "یہ ماڈرن دَور کی آکسیجن ہے۔"

ایک ظرافت آمیز صورتِ واقعہ (HUMOROUS SITUATION) فکر تونسوی کے مضمون "قصہ ٹیلی فون کا" میں یُوں سامنے آتی ہے:

> "حالت کافی دردناک تھی۔ اچھا ٹیلی فون لگوایا ہے جو صرف رانگ نمبروں سے ہی ڈیل کرتا ہے۔ محبوبہ سے ملاؤ تو جہنّم سے جا ملتا ہے۔ ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ سے ملاؤ تو کسی دفترِ زراعت سے جا جڑتا ہے۔ تیسری مرتبہ ایک ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا جو میرے نروس سسٹم کا علاج کرتا تھا۔ ٹیلی فون ڈاکٹر کے بجائے کسی دفتر میں ایک خاتون سے بھِڑ گیا جو شاید خاوند کو جھڑک کر مشورہ دے رہی تھی۔ "بچّہ رو رہا ہے تو میں کیا کروں! لوری کا ریکارڈ لگا دو، چُپ ہو جائے گا۔"
>
> اور شوہر کہہ رہا تھا:
>
> "ریکارڈ مل نہیں رہا، تم ٹیلی فون پر ہی اسے لوری سُنا دو ناں!"
>
> خاتون نے چِڑ کر کہا:
>
> "میرے دفتر کی فائلوں میں لوری کی موسیقی ڈھونڈتے ہو؟ میں لوری نہیں دے سکتی۔ یہ تم ہی لوری دے دو ناں! گھڑی بھر کے لیے ممی بن جاؤ۔"
>
> "ڈارلنگ! میں تو ڈیڈی بننے سے بھی کتراتا تھا اور تم ممی بننے کا حکم دے رہی ہو!"
>
> مگر پھر ایک آہِ سرد کے ساتھ مردانہ لوری کی آواز بھی سُنائی دینے لگی۔ میں نے بیچ میں چیخ کر ٹوکا:
>
> "اجی، بند کیجئے یہ لوری شوری، مجھے لوری نہیں چاہیے۔ وٹامن بی کمپلیکس چاہئیں۔"

فکر تونسوی افسانہ نگار نہیں تھے لیکن جس تخلیقی انداز میں انہوں نے مزاحیہ واقعات تخلیق کیے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وُہ اگر افسانہ نگار بننے کی کوشش کرتے تو اس صنف میں بھی اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیتے۔ ان کے بعض مضامین میں صورتِ واقعہ ہی نہیں افسانوی فضا بھی موجود ہے۔ اور جب کردار سامنے آتے ہیں تو محض ظرافت ہی پیدا نہیں کرتے بلکہ حرکات و سکنات سے اپنی شخصیّت کا واضح نقش بھی چھوڑ جاتے ہیں۔ یہاں ان کا مضمون "آدھا آدمی" کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جو بظاہر ایک مزاح پارہ ہے لیکن اس میں افسانے کی خصوصیات بھی موجود ہیں۔

فکر تونسوی کی خُوبی یہ ہے کہ ان کی ظرافت میں طنزِ لطیف فطری طور پر شامل ہوتی چلی جاتی ہے اور بعض اوقات تو ان

تبصرہ اتنا کٹیلا ہوتا ہے کہ معاشرے کی سفاکی کے لیے تیز نشتر سے کم ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ فکر تونسوی مزاح نگاروں کے اس محدود قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو مزاح اور طنز میں حدِ فاصل قائم نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر:

"یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہمارے محلہ کو صرف ایک دو ٹیلی فون نصیب ہوئے تھے۔ ایک تو چرنجی لال سوداگر چوب نے اپنے گھر لگوا لیا تھا اور ٹیلی فون لگنے کے بعد چرنجی لال کہلانے لگے تھے۔ وہ ایک دفعہ اسمبلی الیکشن میں کھڑے ہو گئے تھے اور کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ کیونکہ انہیں لکڑی اور سیاست دونوں کے بھاؤ معلوم تھے۔ ٹیلی فون لگنے سے دو نتیجے نکلے۔ ایک تو ان کا سوشل اسٹیٹس بڑھ گیا اور دوسرے لکڑیوں کے دام چڑھ گئے۔ دوسرا ٹیلی فون ایک حکیم صاحب کے چوبی کھوکھے میں تھا۔ کوئی بھی ان کے ہاں ٹیلی فون کرنے جاتا تو وہ آٹھ آنے چارج کر لیتے۔ سرکاری ریٹ چار آنے تھا۔ ان کی طبی پریکٹس کم چلتی تھی ٹیلی فون زیادہ چلتا تھا۔ وہ ٹیلی فون کال کو گلِ بنفشہ کی پڑیا سمجھ کر بیچتے تھے۔ شکایت کیا کرتے تھے:

"اجی! کیا کریں، سالی ایلوپیتھی کا زور ہے۔ گلِ بنفشہ بکتا ہی نہیں۔"

ممبر اسمبلی کی لکڑیاں بکتی تھیں اور حکیم صاحب کی کالیں۔ ایک مرتبہ مارکیٹ میں گلِ بنفشہ کا ریٹ بڑھ گیا تو انہوں نے بھی کال ریٹ آٹھ آنے کی بجائے دس آنے کر دیا۔ میں نے بھی محسوس کیا کہ میرے گھر ٹیلی فون لگنے سے لوگ آتے جاتے مجھے سلام کرنے لگے ہیں۔ میری بیوی کو مندر کا پجاری دوسروں سے زیادہ پرشاد دینے لگا ہے حتیٰ کہ سکول میں میرے نالائق ترین بیٹے کو پرنسپل نے مانیٹر بنا دیا۔ میں نے پرنسپل سے کہا:

"آپ نے یہ ناشائستہ حرکت کیوں کی، میرا بیٹا تو انتہائی اجڈ ہے۔"

وہ بولے:

"اجی! اس لڑکے کے اندر جھانکیے، بے پناہ صلاحیتیں ملیں گی۔"

میں نے اس کے اندر جھانک کر دیکھا تو ہیلو، ہیلو کی صدائیں آ رہی تھیں۔ پرنسپل صاحب وہ صدائیں سُن لیتے تھے، مگر میں بہرہ تھا۔"

میں عرض کر چکا ہوں کہ فکر تونسوی معاشرے کے طبقاتی تضادات کو شدت سے محسوس کرنے والے ادیب تھے چنانچہ جب وہ غریب کی بے بسی اور ناداری کا مشاہدہ کرتے تو بے حد جذباتی ہو جاتے اور اپنے ساتھ پڑھنے والوں کو ہیجان میں مبتلا کر دیتے۔ اس قسم کے مواقع پر ان کے لہجے میں دردمندی پیدا ہو جاتی، آواز لرزنے لگتی اور الفاظ آنسو میں بھیگے ہوئے نظر آتے۔ لیکن پھر اچانک ہی ایک ایسا لمحہ بھی آ جاتا جب طنز کا شگوفہ کھل اُٹھتا اور پرچارک فکر تونسوی اچانک دبیز اندھیرے میں جگنو سا چمکا دیتا۔ مثال ملاحظہ کیجئے جس سے فکر تونسوی کا نظریۂ مزاح بھی آشکار ہوتا۔

> "دراصل ہماری قوم کے پاس ہنسنے کے لیے ٹائم نہیں ہے بلکہ ہمارے پاس ہنسنے کا تمدّن ہی نہیں ہے۔ یہاں ہنسنا بدتہذیبی سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کسی میاں بیوی کو ایک دوسرے کے سامنے ہنستے نہیں دیکھا۔ اگر بدقسمتی سے ہنس بھی رہے ہوں تو بچوں کے آتے ہی چُپ ہو جاتے ہیں کہ کہیں وُہ بُرا نہ مان جائیں۔ بس اسی خطرے اور اسی سنجیدگی کے بارے میں ہماری قوم اپنے آپ کو لپیٹے ہُوئے ہے۔ فنِ مزاح میں بھی شاید اسی لیے ہم اور جنل نہیں بن سکے۔ ہم ایک سہمی ہُوئی مگر سنجیدہ تہذیب کے نمایندے ہیں سچ کا پرچار کرتے ہیں مگر سچ کہنے سے کنّی کاٹ جاتے ہیں۔ ہم چور کو بھی چور نہیں کہتے مبادا وہ کسی وزیر کا پی اے۔ نکل آئے!" (میرا پہلا اور آخری صدارتی خطبہ)

آپ نے دیکھا کہ اس طویل تقریر میں چھوٹے سے آخری جملے نے کیسی طنزیہ صورت پیدا کی ہے اور کس طرح سارے اقتباس کا تناظر تبدیل کر دیا ہے۔ فکر تونسوی کا یہی فن ہے کہ معمولی سے جملے سے طنز کا افق وسیع تر کر دیتے ہیں اور اپنے مشاہدے ہی کی نہیں دانش کی دھاک بھی قایم کر دیتے ہیں۔

دانش کا ذکر آیا ہے تو یہاں ان چھوٹے چھوٹے مفرد جملوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو بظاہر مزاحیہ ہیں لیکن ان کا باطن تجربے کی دانش سے معمور ہے اور ان میں ظرافت میں طنز کی سبک سی کیفیت اور لطیف سی چبھن بھی موجود نظر آتی ہے۔ اس قسم کے جملوں میں فکر تونسوی نے خلیل جبران بننے کی کوشش نہیں کی تاہم انھوں نے موضوع کا گھونگھٹ اُلٹنے اور اس کے عقب سے ایک مسکراتی ہوئی صورت کو ہویدا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ چند جملے ملاحظہ کیجئے:

۱۔ "شریف النفس انسانوں کا المیہ یہی ہوتا ہے کہ وہ سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔"

۲۔ "میرے ایک دوست ہیں کہ جن کی دوستی اچھی نہ جن کی دشمنی اچھی۔ کیونکہ وہ محکمہ پولیس میں افسر ہیں۔"

۳۔ "ماڈرن بیوی ہو تو وہ سر درد ہوتی ہے۔ پرانے زمانے کی بیوی ہو تو وہ سر درد کی ٹکیہ ہوتی ہے۔"

۴۔ "زندگی بھر اگر آپ نے ایک جھوٹ بھی نہیں بولا تو بے شک آپ انسان ہیں مگر غیر فطری۔"

۵۔ "ایک بڑھیا ہر روز چھت پر جا کر چڑیوں کو دانا دنکا ڈالا کرتی تھی۔ بڑھیا مر گئی تو چڑیوں نے چھت بدل لی۔"

۶۔ "بے ایمانی کوئی عیب نہیں بلکہ سماج کی ضرورت ہے۔ اگر بے ایمان نہ ہوں تو ایمانداروں کے پاس کوئی کام نہ رہ جائے۔"

۷۔ "پچھتاوا کیا ہے؛ ایک خوشی آئی اور چلی گئی مگر اس کا علم بعد میں ہوا۔"

۸۔ "مکھی کو مارنے میں آپ کو وہ لطف نہیں آتا جو لطف مکھی کو آپ کے کاٹنے میں آتا ہے۔

۹۔ "لیڈر ایک ایسا چیک ہے جس پر عوام دستخط کریں تو کیش ہو جاتا ہے ورنہ "ڈِس آنر"

ہو جاتا ہے۔"

۱۰۔ "انسان جس جانور کو کھانا چاہتا ہے اسے پالتا ہے۔ جانور جسے کھانا چاہتا ہے اسے پالتا نہیں۔"

۱۱۔ "کنوارا لڑکا ـــــ سرتاپا غلطیاں
شادی شدہ مرد ـــــ سرتاپا جدّوجہد
بوڑھا ـــــ سرتاپا معافی"

۱۲۔ "پرانے خطوط کو پڑھنے میں سب سے بڑا لطف یہ ہوتا ہے کہ ان کا جواب نہیں لکھنا پڑتا۔"

مزاح اور ہنسی چونکہ لازم و ملزوم ہیں اس لیے فکر تونسوی نے ہنسی کو تحریک دینے کے لیے بیشتر کارآمد اور آزم حربے استعمال کرنے کی کاوش بھی کی ہے۔ اس کی ایک صورت تو میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ وہ واقعے کو اختتام پ اس طرح بل دیتے ہیں کہ واقعہ لطیفے کی طرح مسکرا اٹھتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ واقعے یا بیان کی روانی میں اگ کوئی ترشا ہوا لطیفہ تخلیقِ مزاح میں معاون بن جاتا ہے تو وہ اس کا ہاتھ بھی نہیں جھٹکتے بلکہ اسے اس طرح اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں کہ لطیفہ ان کے بیانیہ کا فطری جزو نظر آنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے مضمون "موت کے بارے میں" حسبِ ذ دلچسپ لطیفے استعمال ہوئے ہیں۔

"ایک پریشان بوڑھے نے خدا سے دعا مانگی: "اللہ تعالیٰ میرے لیے موت بھیج دے۔"
دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ بوڑھے نے پوچھا: "کون ہو؟"
جواب آیا: "میں موت ہوں، آپ نے مجھے ابھی بلایا تھا۔"
بوڑھا گھبرا گیا۔ بولا: "مگر میں نے تو اپنے بیٹے کو بلایا تھا۔"
جواب آیا: "میں آپ کا بیٹا ہی تو ہوں۔"

ایک دفعہ ایک سردار صاحب تیزی سے دوڑتے جا رہے تھے کسی نے پوچھا: "سردار نیتا سنگھ جی! خیریت تو ہے کدھر جا رہے ہیں؟"
وہ بولا: "ایک چور چوری کر کے بھاگا ہے اسے پکڑنا ہے۔"
"مگر چور کہاں ہے؟"
"وہ میرے پیچھے رہ گیا ہے۔"

فکر تونسوی نے طنز و مزاح سے اپنے عہد کی منافقت، کمینگی اور اخلاقی کج روی پر ضرب لگانے کی کاوش کی ہے اور اس صحت مند عمل میں انہوں نے برّصغیر کے سیاسی مزاج پر بھی طبع آزمائی کی اور تنگ نظری، دوغلاپن اور بے انصا

سماجی انسان کے زاویے سے طنز کی۔ فکر تونسوی اس زمانے کے مزاح نگار تھے جب دُنیا کی سرحدیں سمٹ گئی تھیں۔ ذرائع ابلاغ و آمدورفت نے پُوری دنیا کو ایک کنبہ بنا دیا تھا اور ایک ملک کا واقعہ فوری طور پر دوسرے ملک کے حالات پر اثر انداز ہوجاتا تھا چنانچہ ان کے سیاسی مزاح کا دائرہ صرف برصغیر تک محدود نہیں بلکہ اس کے مدار میں پُوری دُنیا آجاتی ہے۔ فکر تونسوی تلاطم پیدا نہیں کرتے بلکہ وقت کے دریا میں ایک چھوٹا سا پتھر پھینک کر بس ایک لمحاتی سا تحرک پیدا کر دیتے ہیں اور خود فاصلے پر کھڑے ہو کر مسکراتے رہتے ہیں۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں :

”میں نے دعویٰ کیا تھا کہ میں نے ماں کے دُودھ کے بعد کوئی دُودھ نہیں پیا۔ ادھر فریقِ مخالف یعنی میری بیوی کا بھی یہی دعویٰ تھا۔ میں نے کہا ”اگر دونوں کے دعوے صحیح ہیں تو پھر دُودھ کون پی جاتا ہے اور جو بھی پی جاتا ہے وہ تمہارے ہی زیرسایہ پی جاتا ہے۔“ مثال کے طور پر ممکن ہے کہ یہ بلّی پی جاتی ہو۔ میں نے کونے میں بیٹھی ہُوئی بلّی کی طرف اشارہ کیا۔ جیسے وہ بلّی نہ ہو اسرائیل ہو جو امریکہ کے زیرسایہ پروان چڑھ رہا ہے۔“

”جو سرکار عوام سے ہر وقت قربانی کا مطالبہ نہیں کرتی وُہ خود ایک دن عوام کے ہاتھوں قربان ہوجاتی ہے۔“

”میں نے ایک سیاستدان کو سٹیج پر آنسو بہاتے دیکھا اور اسٹیج سے آ کر انہیں اپنے ہی آنسوؤں پر مسکراتے دیکھا۔“

” انکل نے مجھے بتایا کہ ایک بار میرے ایک لاکھ روپے کی تھیلی ایک صاحبِ اقتدار لیڈر کے پیچھے تین مہینے تک بھاگتی رہی کیونکہ اس لیڈر کے قلم کی جنبش سے مجھے دس لاکھ روپے کا منافع ہو سکتا تھا میں نے پوچھا :

”پھر منافع ہُوا ؟“

وہ بولے : ”ہوا۔“

مگر میں نے پھر سوال کیا :

”انکل ! روپیہ لیڈر کے پیچھے بھاگا نا ! میں پُوچھنا چاہتا ہُوں کہ کبھی روپیہ آپ کے پیچھے بھی بھاگا ؟“

ہاں ! روپیہ ہی نہیں۔ وُہ لیڈر بھی ہفتوں میرے پیچھے بھاگتا رہا اور کہتا رہا : بھائیہ صاحب ! ذرا میری بات تو سُنیئے، میرے قلم کو جنبش میں لائیے۔ منافع کے لاکھوں روپے آپ کے پیچھے

بھاگنے کے لیے تیار ہیں۔" (ایک روپے کا نوٹ)

اس قسم کے واقعات سے فکر تونسوی نے زندگی اور معاشرے کے ان گنت بھیانک چہرے اور ان چہروں کے پسِ پردہ پروان چڑھنے والی منافق اور کریہہ رُوحوں کو بے حد تیکھے اور موثر انداز میں بے نقاب کیا ہے اور ایک ایسے معاشرے میں جہاں محرومی، عدمِ مساوات، بےانصافی اور نارسائی کا احساس روز افزوں ترقی پا رہا ہے چند لمحوں کے لیے فرد کو مسکرانے کا موقعہ فراہم کر دیا ہے۔

فکر تونسوی کے بیشتر مزاح پارے اخباری کالموں میں شائع ہُوئے۔ یُوں ان کا خطاب براہِ راست عوام سے تھا اور انہیں روزانہ کثرت سے مسکراہٹیں فراہم کرنا ان کے منصبی فرائض میں شامل ہو گیا تھا۔ فکر تونسوی کی یہ بات خاص طور پہ متاثر کرتی ہے کہ وہ صحافت کی تگ و تاز میں تو شریک رہے لیکن انہوں نے اپنے کالموں کو صرف ہنگامی واقعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اکثر ایسی معاشرتی خرابیوں کو ہدف بنایا جو سرطان کی طرح ان کی قوم کے جسم میں سرایت کر گئی تھیں اور جن کے فوری علاج کی توقع نہیں تھی۔ ان کے موضوعات میں رشوت، سفارش، چور بازاری، اقربا پروری، ملاوٹ، رُوپے پیسے کی لُوٹ کھسوٹ، جعل سازی، بے ایمانی، دروغ گوئی، ایمان فروشی وغیرہ کو مستقل حیثیت حاصل رہی۔ مرورِ ایام کے ساتھ چونکہ معاشرتی معائب کو بھی فروغ ملا اور اقدامِ واردات کے بھی نئے نئے طریق ایجاد ہوتے چلے گئے اس لیے فکر تونسوی نے ان موضوعات پر دو غزلے، سہ غزلے کہنے میں عار محسوس نہیں کیا اور جب بھی قلم اٹھایا ایک نئی کیفیت پیدا کی وُہ بظاہر لوگوں کو ہنسا رہے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر روتے رہے۔ ان کے طنز و مزاح کی کتابیں ان کے مجسم آنسوؤں ہی کا مجموعہ ہیں۔ افسوس کہ یہ شمع جو جلتی بھی تھی اور روتے روتے مسکرانے بھی لگتی تھی ۱۲ ستمبر ۱۹۸۷ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

دو نمبر (۲)

- ایک نمبر اقبال پر جو ان کی غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل ہے ــــــ اور دوسرا نمبر غالب پر، جو ان کی غیر مطبوعہ اور کمیاب تحریروں پر مشتمل ہے۔

- یہ دونوں نمبر کتابت شدہ صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ پوری کوشش ہوگی کہ انھیں جلد منظر عام پر لایا جا سکے ـــــ

ہماری کتابیں جو دستیاب ہیں

(۱) مخدومی	محمد طفیل	۲۵ روپے
(۲) مجتبی	محمد طفیل	۲۵ روپے
(۳) معظم	محمد طفیل	۲۵ روپے
(۴) سلسلۂ روز و شب	منظور الٰہی	۲۵ روپے
(۵) درِ دلکشا	منظور الٰہی	۲۵ روپے
(۶) خیر البشرؐ کے حضور	ممتاز حسن	۱۸ روپے
(۷) سرکشیدہ	ادیبہ یزمی	۱۰ روپے
(۸) زمین	خدیجہ مستور	۳۰ روپے
(۹) نابدولت	شوکت تھانوی	۱۰ روپے
(۱۰) قاضی جی تین حصے	"	۳۰ روپے
(۱۱) وغیرہ وغیرہ	"	۱۰ روپے
(۱۲) مضامین شوکت	"	۱۰ روپے
(۱۳) من آنم	فراق گورکھپوری	۲۵ روپے
(۱۴) ندیم نامہ	مرتبہ محمد طفیل	۵۰ روپے
(۱۵) بادۂ شبانہ	اختر انصاری دہلوی	۱۵ روپے

ادارہ فروغ اردو، ۱۱- ایبک روڈ، انار کلی لاہور

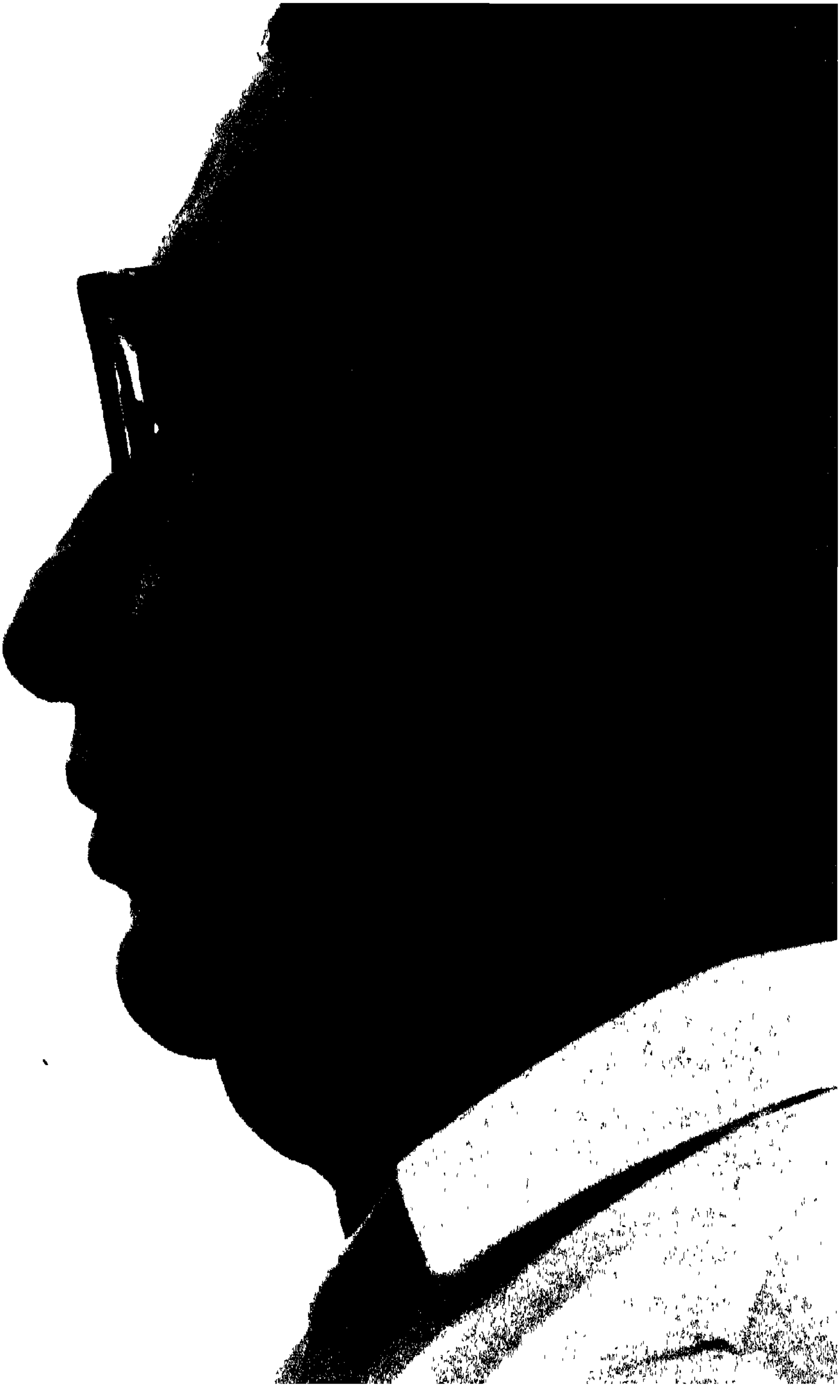

عظمت شیخ

محمد طفیل

بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے اظہار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً سُورج دن کو نکلے گا اور چاند رات کو۔ کچھ ایسا ہی معاملہ عظمت شیخ کی تصویر کشی کا ہے۔ یہ جس تصویر کو بھی کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کریں گے وہ ضرور قابلِ ذکر ہوگی۔ جیسے غالب کی غزل، جیسے اقبال کا شعر!

کسی زمانے میں، میرے ہاتھ میں بھی کیمرہ تھا اور میں ٹک ٹک کرتا رہا۔ یہ مشغلہ برسوں استوار رہا۔ تصویروں سے گھر بھر گیا۔ اُن پرنٹوں میں پاکستان اور ہندوستان کے اکثر ادیبوں کی تصویریں تھیں۔ اس لیے بظاہر آسان مگر مشکل ترین فن کا کچھ اتا پتا مجھے بھی ہے۔ نقوش کے لاہور نمبر میں بھی میری اتاری ہوئی کئی تصویریں چھپی ہیں۔ مگر جسے فن کہتے ہیں وہ بات کہاں تھی! یہی وجہ ہے کہ میں نے باوجود خاصا وقت بلکہ خاصے برس صرف کرنے کے بعد اس فن کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ کیونکہ کسی بھی فن میں، اگر کمال حاصل نہ ہو سکے تو ضروری نہیں کہ اُسے جان کا آزار بنایا جائے!

میرے نزدیک جس شخص کے بارے میں کوئی کلمہ کہا جائے پہلے اس کو دیکھنا چاہیے۔ اس کے فن پر گفتگو بعد میں کرنی چاہیے۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ اپنی موج کے آدمی ہوتے ہیں مگر اس طرح فن کار کے فن پر دسترس حاصل کرنے میں کسر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ آدمی پہلے اور فن بعد کا شعبدہ ہے۔ میں نے فن کو شعبدہ کہا ہے۔ شاید زیادتی ہو مگر میرے نزدیک کمالِ فن کی پہچان یہی ہے کہ وہ مبہوت کر دے۔ کوئی سمجھنا چاہے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آئے اور یہ کہنے پر مجبور ہو کہ ایسا ہو نہیں سکتا تھا جو ہو گیا۔

عظمت شیخ نے اپنی زندگی کے منصوبوں کو ترتیب وار آراستہ کر رکھا ہے۔ ترجیحات مقرر کر رکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے انہوں نے خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کی تصویریں اتاریں۔ اس کے بعد اپنے وطن کی۔ پھر دنیا بھر کے اسلامی آثار کی۔ آثار والی تصویریں ابھی منظرِ عام پر نہیں آئیں مگر آئیں گی ضرور! کیونکہ صادق جذبے حالات کو پچھاڑ دیتے ہیں۔

یوں پہلے خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ پھر اپنے وطن کی شادابیوں میں کھو گئے۔ اس کے بعد عالمِ اسلام سے اپنا رشتہ استوار کیا۔ اس طرح منزل بہ منزل چلیں گے کیونکہ کوئی بھی شخص پہلی منزل کے بعد تیسری منزل پر نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وُہ اپنے قدم دوسری منزل پر نہ

ان کی تصویروں میں کشش کیوں ہے؟ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلے، تمام تصویروں کو اپنے دل پہ اتارا، اس کے بعد کاغذ پر اُبھارا۔ درمیانی مرحلے جو ہیں انھیں مَیں اور آپ سمجھ نہ سکیں گے۔ یہی مرحلے بندے کو خدا کے نزدیک کر دیتے ہیں۔ پھر اس کے بعد ہی فن میں یکتائی کی شان پیدا ہوتی ہے۔ عشق کی وارفتگی کو کوئی نہیں جان سکا۔ اس کی قوت کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ فن کو جاننے سے پہلے فن کار کو پہچاننا چاہیے۔ اُس سلسلے کا ایک اور واقعہ، ایک اور مکالمہ یاد آیا۔ میں لاہور میوزیم میں داخل ہوا کیونکہ وہاں شیخ صاحب کی حرمین شریفین سے متعلق کھنچی ہوئی تصویریں آویزاں تھیں۔ قبل ازیں میری ان سے کوئی ملاقات نہ تھی۔ نہ صورت دیکھی تھی نہ گفتگو سنی تھی۔

تصویریں دیکھیں تو دیکھتا رہ گیا۔ تصویروں نے پہلے حیران پھر مبہوت کر دیا۔ وہاں شیخ صاحب سے رسمی سی گفتگو ہوئی۔ دل کی بات کو زبان پر نہ لایا۔ میں عموماً دل کی باتوں کو زبان پر نہیں لاتا۔ خواب چکنا چُور ہو جاتے ہیں۔ شیخ صاحب دوبارہ ملے تو میں نے حرفِ مدعا کہہ دیا کیونکہ مجھ میں ضبط کا یارا نہ تھا۔ میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"میں دس پندرہ جلدوں میں نقوش کا رسولؐ نمبر چھاپ رہا ہُوں، چاہتا ہُوں کہ آپ کی تصویروں سے ان نمبروں کو آراستہ کروں!"

جواب: "کتنی تصویریں چاہییں؟"

میں گویا ہوا: "میرا جواب آپ سُن نہ سکیں گے، مجھے پچاس سے زیادہ تصویریں چاہییں۔"

"یعنی میرا کل سرمایہ؟"

"جی ہاں!"

شیخ صاحب نے کچھ سوچا، دو چار سوالات کیے۔ اس کے بعد فیصلہ کر دیا۔ جواب یہ تھا: "اگر یہ معاملہ عشقِ رسولؐ کا ہے تو میرا سب کچھ حاضر ہے!"

یہ تقریب، شیخ صاحب کی تصاویر "مناظرِ پاکستان" سے متعلق ہے۔ میں نے آپ کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں بہت الجھایا۔ اگر میں اِدھر اُدھر کی باتیں نہ کرتا تو میرا یہ ادھورا مضمون، مزید ادھورا رہ جاتا۔ کیونکہ میرے نزدیک کوئی شخص، اپنے کسی ایک کارنامے پر بڑا آدمی نہیں بنتا بلکہ اس کے بڑے پن میں بے شمار ریاضتوں کی فقیری شامل ہوتی ہے۔

پاکستان ہی کے موضوع پر محمد امین کی کتاب "جرنی تھرو پاکستان" اور "دی بیوٹی فُل پاکستان" بھی ہے اُن کی کتابوں کی اپنی خوبیاں ہیں، اِس کتاب کی اپنی طرح داریاں، بڑے فن کار جو ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہمعصروں میں، اپنی چند منفرد خوبیوں کی وجہ ہی سے ممتاز ہوتے ہیں۔ میں آپ کو اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔

میں نے خانہ کعبہ میں جا کر دیکھا کہ وُہ ماحول اور وُہ دنیا ہم سے بالکل ہی مختلف ہے۔ میں جب بھی خانہ کعبہ

میں داخل ہُوا۔ مجھے نُور ہی نُور دکھائی دیا۔ اب اِس نُور کو کون اپنی تصویروں میں دکھاتا! اُس مرحلے سے بھی ایک فوٹو گرافر گزر گیا۔ فوٹو گرافر کا نام عظمت شیخ ہے۔ تصویر کا نام "خانہ کعبہ کا ایک منظر" ہے۔

اپنی اپنی سوچ اور اپنے اپنے زاویے کی بات ہوتی ہے۔ میں اِن تصویروں کو کسی اور زاویے سے دیکھوں گا، دوسرا کسی دوسرے زاویے سے۔ باور کیجیے کہ مجھے تو عظمت شیخ کی تصویریں تلاوت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

"مناظرِ پاکستان" کے نام سے جو شیخ صاحب نے کتاب پیش کی ہے وہ خوب ہے، دلکش ہے، دلآویز ہے، خوب صورت پاکستان کی خوبصورت عکاسی! پہاڑوں کے جلال کو جوں کا توں مقید کر دکھایا۔ جھیلوں کے جمال کو بعینہٖ اجاگر کر دیا۔ ملک کے چاروں صوبوں کے باسیوں کے رہن سہن اور رسم و رواج کو آنکھوں کے سامنے سجا دیا غرض تاریخی عمارتوں کی تاریخ ساز تصویریں اتاریں!

یہ کتاب قدرت کے حُسن اور فوٹو گرافی کے حُسن کا تقابلی مطالعہ پیش کرتی ہے۔ کبھی قدرت کی فیاضیوں پر سبحان اللہ کہنے کو جی چاہتا ہے، کبھی عکاس کی فنی مہارت پر مرحبا! یہ کتاب قدرت کی فیاضیوں اور فن کی باریکیوں کی داستان ہے جو سُنی اور سنائی جا سکتی ہے، جو دیکھی اور دکھائی جا سکتی ہے!

میرے نزدیک، بڑے فن کار کا فن عطیۂ خداوندی ہوتا ہے۔ لازوال کاموں میں اگر قدرت کی تھپکی حاصل نہ ہو تو کوئی ادیب، کوئی مورخ کسی کے بھی فن پر ہمیشہ زندہ رہنے کی مُہر نہیں لگا سکتا!

آئیے، میں آپ کو اپنی وادی میں لے چلوں، کتابوں کی دنیا میں، کیونکہ میں اسی "جرم" کی پاداش میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔

میں نے عبدالرزاق کانپوری کی کتاب "البرامکہ" کو اٹھایا، وہ اہلِ علم اور اہلِ کمال کی قدردانیوں سے بھری پڑی ہے۔ میں نے محمد حسین آزاد کی کتاب "دربارِ اکبری" کو اٹھایا وہ بھی اہلِ فن کے اعتراف سے مزیّن ہے۔ میں نے صباح الدین عبدالرحمان کی کتاب "بزمِ تیموریہ" کو اٹھایا۔ وہ بھی اہلِ کمال کی حوصلہ افزائیوں سے آراستہ ہے۔ اس کے بعد میں نے فردوسی کے شاہنامہ کی تخلیق کے بارے میں پڑھا۔ محمود غزنوی سے فردوسی کا یہ طے ہوا تھا کہ وہ فی شعر ایک اشرفی دے گا۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ یہ انعام فردوسی کو مل سکتا۔ کیونکہ محمود غزنوی نے جب ساٹھ ہزار اشرفیاں روانہ کیں تو شہر کے ایک دروازے سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا، دوسرے دروازے سے اشرفیاں پہنچیں۔

اہلِ کمال کے سلسلے میں یہ مثال عظمت شیخ پر صادق نہیں آتی کیونکہ خدا نے انہیں بہت کچھ دے رکھا ہے فن کی دولت کے ساتھ من کی دولت بھی، پھر من اور فن کی دولت کے ساتھ بہت سے دنیاوی سکّے بھی۔ اس کی و
یہ ہے کہ مقاماتِ مقدسہ کی تصویر کشی کی وجہ سے ان کا معاملہ براہِ راست ہے، بیچ میں کوئی دنیاوی بادشاہ نہیں! میں قلم کا مسافر ہوں۔ اگر میں حاکمِ وقت ہوتا تو انہیں سونے سے تول دیتا۔ انعام کا مسئلہ ضرورت کا م

نہیں ہوتا بلکہ اعترافِ فن کا مسئلہ ہوتا ہے۔ چونکہ میں حاکمِ وقت نہیں ہُوں صرف قلمکار ہُوں، اس لیے انہیں سونے کے سے لفظوں سے تولنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر وائے افسوس کہ اس کی بھی قدرت نہیں رکھتا!

میری ان سے چند ملاقاتیں ہیں۔ مگر وُہ چند ملاقاتیں انہی کی وجہ سے ہیں۔ جب بھی کویت سے پاکستان آتے ہیں تو خود ملنے میں پہل کرتے ہیں۔ اگر وہ پاکستان آئیں اور چُپ چاپ واپس چلے جائیں تو ہمیں علم بھی نہ ہو۔ مگر وہ یہاں آتے ہی دوستوں کو ڈھونڈتے ہیں، اُن کی خیر خیریت پُوچھتے ہیں۔ اگر ہم انہیں چائے یا ٹھنڈے پانی کے لیے پُوچھیں گے تو وہی اکلوتا جواب دیں گے، ابھی پی کے آیا ہُوں، ابھی خواہش نہیں!

اگر آپ ان کے گھر پہنچ جائیں تو ان کا اصرار ہوگا یہ بھی کھائیے وہ بھی کھائیے۔ اگر آپ کہیں گے کہ ابھی کھا پی کے آیا ہُوں تو ان کا جواب ہوگا: پھر کیا ہُوا، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اتنا اصرار کریں گے کہ وُہ نعمتیں خاصی پریشانی کا باعث بنیں گی!

یہ بھی ان کا تکیۂ کلام ہے، میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔

یہ فقرہ ان کا رسمی نہیں ہوتا، خلوصِ دل سے نکلا ہوتا ہے۔ غرض جو کام بھی ان کے تکیہ کلام کی پاداش میں ان کے ذمہ کریں گے اسے دیر سویر ضرور پورا کریں گے۔ دیر سویر اس لیے ہو جاتی ہے کہ یہ اپنے ٹھکانے سے اکثر اِدھر اُدھر ہوتے ہیں۔ کبھی فن کے شوق میں، کبھی کاروبار کے سبب!

جیسے یہ دل کے اچھّے ہیں ویسے ہی یہ صورتاً بھی خوش وضع ہیں۔ سفید سرخ رنگ جسے جلال پور جٹاں کا رنگ روپ نہیں کہا جا سکتا۔ اونچا لمبا قد، سفید بال، متجسس آنکھیں، متناسب جسم، غرض ایک بارعب شخصیت، جو متاثر کرے۔ عموماً آرٹسٹ حضرات کی یہ ”شب“ یہ وضع قطع نہیں ہوتی۔ اللہ فن دیتا ہے تو ضروری نہیں کہ ڈھانچہ بھی ویسا ہی فراہم کرے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے دونوں خوبیوں سے نوازا۔

جو معاملہ ان کے دل کا ہے وہ بھی کسی کسی کو نصیب ہوگا۔ ہر ایک کی مدد کرنا ان کا وظیفۂ حیات ہے۔ کبھی کبھی یہ بڑی آزمائشوں میں پڑ جاتے ہیں مگر اُن پر بھی پُورا اترتے ہیں۔ ان کا خیال ہے جو کچھ ہمارے پاس ہے اس میں سب کا حصّہ ہے۔

ان کے کچھ ایسے واقعات کا مجھے علم ہے۔ اگر میں انہیں بیان کر دوں تو ان کی شخصیت میں مزید نکھار پیدا ہو۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس سے شیخ صاحب کو رنج ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنی خوبیوں پر چادر ڈال رکھی ہے۔ تاکہ کوئی دیکھ نہ لے، کوئی سُونگھ نہ لے۔ اگر کوئی سونگھ یا دیکھ لے گا تو اس کی منتیں کریں گے خدا کے لیے اس واقعہ کا ذکر کسی دوسرے سے نہ کرنا!

ان کا دل بیحد گداز ہے۔ ذرا سی دیر میں آنکھیں چھلک جاتی ہیں۔ ایک اس موقع پر کہ جب ذکرِ رسولؐ ہو، دوسرے کسی کی بے بسی کے موقعہ پر!

یہ ان کی زندگی کے سیدھے سے واقعات ہیں، جنہیں میں نے سیدھے لفظوں میں بیان کر دیا۔ ورنہ انسان تو گورکھ دھندا ہے۔ اسے سمجھنا آسان مسئلہ نہیں ہوتا۔ آج کے تہ در تہ انسانوں میں کسی ایسے شخص کا مل جانا کچھ کم عجوبے کی بات نہیں!

ایک دن اخبار میں پڑھا کہ شیخ صاحب اپنے دوستوں کے لیے لاہور کی فوٹوگرافی کریں گے۔ جو چند دنوں کے لیے وطن آیا ہو اس کا لمحہ لمحہ مسائل سے بندھا ہوتا ہے۔ والدین کے لیے، رشتہ داروں کے لیے، دوستوں کے لیے، ذاتی کاموں کے لیے، پھر ان لمحات میں فوٹوگرافی کے لیے وقت نکالنا آسان کام نہیں ہوتا۔

میں نے اُن سے اس سلسلے میں بات کی۔ آپ نے ایک بار پھر لاہور کی فوٹوگرافی کے لیے وقت نکالا۔ بڑی بات ہے یہ۔

"کوئی بڑی بات نہیں!"

"بڑی بات تو ہے۔"

"دوستوں کی فرمائشوں کو پورا کرنا بھی تو انسانیت ہی کا ایک حصہ ہے!"

"اس انسانیت میں کتنا وقت صرف ہوا؟"

"ایک دن لگ گیا۔"

"اسے دوستانہ کھاتے میں ڈالیں گے یا کسی اور خانے میں؟"

اسے میرے شوق کے خانے میں ڈالیے، میں دوستوں کی خدمت کو نماز روزے کی ادائیگی جیسا مسئلہ، یا اس سے تھوڑا سا کم درجہ دیتا ہوں۔ پھر میرا شوق پورا ہوا۔ دوست بھی خوش، میں بھی خوش!!

محمد طفیل، میرا دوست

رشید اختر ندوی

جولائی ۱۹۳۸ء کی کوئی یہی سات یا آٹھ تاریخ تھی، جب میں تھوڑی مدت پہلے حمایتِ اسلام ہفتہ وار اخبار کا چودھری محمد حسین مرحوم کی نگاہ شناسی کے سبب ایڈیٹر مقرر ہوا تھا۔ ابھی میری شادی نہیں ہوئی تھی اور میں حضرت حفیظ جالندھری کے پاس ماڈل ٹاؤن میں رہتا تھا کہ شام کے سات بجے کے قریب حفیظ صاحب سے ملنے کے لیے دو نوجوان۔ لطیف فاروقی اور محمد طفیل ان کے مکان پر آئے۔ دونوں میری طرح دُبلے پتلے، شرمیلے اور آنکھیں نیچی کرکے باتیں کرنے والے تھے۔ اُنھوں نے مجھ ہی سے پوچھا۔

حضرت حفیظ جالندھری گھر پر ہیں۔

میں نے جواب دیا:

ہیں تو سہی مگر سو رہے ہیں، آٹھ بجے اُٹھیں گے۔

مجھے یاد نہیں یہ محمد طفیل نے یا لطیف فاروقی نے مجھ سے اجازت چاہی کہ کیا اس وقت تک وہ میرے پاس بیٹھ سکتے ہیں، جب تک حضرت حفیظ جالندھری بیدار ہوں۔

میں نے اُنھیں اجازت دے دی کہ یہ دونوں دُبلے پتلے نوجوان مجھے بہت اچھے لگے۔

پھر مجھ میں اور اُن میں تعارف ہوا، اور یہ تعارف کچھ اس انداز میں ہوا کہ جب اُن دونوں نے مجھے دعوت دی، کہ کل دوپہر کا کھانا میں اور حضرت حفیظ جالندھری لطیف فاروقی کے گھر میں لوہاری دروازہ کے اندر کھائیں تو میں نے بار بار ان دونوں کے چہروں کی طرف دیکھا۔ اُن دونوں کے چہروں پر عجیب معصومیت جھلک رہی تھی۔ وہ دونوں مجھے اچھے لگے۔ ا
جب حفیظ صاحب سونے کے کمرے سے اُٹھ کر باہر باغیچہ میں آئے اور ہم تینوں اُن کے احترام میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور ان دونو
نے حفیظ صاحب کو فرشی سلام کیے تو میں بہت حیران ہوا اور میں نے بڑے تعجب سے ان سے کہا۔

لکھنؤ اور دہلی میں تعلیم پا کر تو میں آیا ہوں اور فرشی سلام تم کر رہے ہو۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، محمد طفیل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی بے باکی سے کہا:

کیا زبان کی طرح مؤدبانہ سلام پر بھی لکھنؤ اور دہلی کی اجارہ داری ہے؟

تو حفیظ صاحب بہت خوش ہوئے اور ان کی یہی خوشی تھی، جس کے باعث وہ دوسرے دن دوپہر کو لطی
فاروقی کے ہاں کھانا کھانے کے لیے لوہاری دروازہ کے اندر تشریف لے گئے۔

پھر اکثر ایسا ہونے لگا کہ محمد طفیل، لطیف فاروقی اور میں لطیف فاروقی کے ہاں اکٹھے ہوتے۔

یہاں تک کہ ۱۹۴۱ء میں اُردو بک سٹال واقع لوہاری دروازہ نے میرا پہلا ناول سازِ شکستہ چھاپا اور میری رہائش کے لیے لوہاری دروازہ میں ایک دو کمرے کا مکان کرایہ پر لیا۔ یہیں محمد طفیل نے ایک بڑے خوش نویس کی شاگردی اختیار کی۔ میں اس وقت شہباز اخبار میں نیوز ایڈیٹر تھا۔ مجھ میں اور محمد طفیل میں ایسا رشتہ استوار ہوا کہ جب تک ۱۹۴۲ء میں اخبار شہباز بند نہیں ہوا، اور میں نے دہلی کا سفر اختیار نہیں کیا، محمد طفیل اور میں روزانہ ایک دوسرے سے ملتے۔ کبھی ناغہ نہ ہوتا۔

دہلی پہنچ کر میں نے اخبار انصاری کی ایڈیٹری اپنے ذمہ لے لی اور محمد طفیل سے میرا رابطہ کٹ گیا۔

دہلی سے میں ۱۹۴۲ء کے آخر میں بمبئی چلا گیا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں پھر لاہور آنا ہوا، تو جس شخص کے پاس میں سب سے پہلے پہنچا وہ یہی محمد طفیل تھے جو اب ایک دارالاشاعت ادارہ فروغِ اُردو کے مالک تھے اور ایبک روڈ پر ان کا دفتر تھا۔ چھ سال کے وقفے نے گو دونوں کو خاصا بدل ڈالا تھا۔ لیکن جب گلے ملے تو ایسا لگا "جیسے کبھی بچھڑے ہی نہ تھے۔ اس وقت میں لُٹا پٹا بمبئی سے آیا تھا اور میرے پاس سوائے پندرہ اگست ناول کے مسودہ کے جو میں نے کچھ ہفتے پہلے مکمل کیا تھا، میرے پاس کچھ نہ تھا۔

محمد طفیل نے جنھیں میں اب طفیل صاحب کہہ رہا ہوں، شیخ عبدالسلام، علاء الدین اور ملک مبارک کو اپنے دفتر میں چائے کی دعوت دی اور میرے ناول ۱۵/ اگست کو چھاپنے کا پروگرام بنایا۔ یہ اُنھوں نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ اُنھوں نے پندرہ اگست اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کوئی دس ہزار کی تعداد میں چھاپا اور مجھے اتنی رائلٹی دی کہ میں نے لاہور کی بجائے کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔

محمد طفیل کا "نقوش" اس وقت ابتدائی مراحل میں تھا۔ یہ طفیل صاحب کی حد درجہ محنت، ذہانت، معاملہ فہمی تھی کہ نقوش نے جو ترقی اور جو ادبی خدمت، ان کی وفات کے دن تک کی، پاکستان اور ہندوستان کا کوئی دوسرا ادبی پرچہ نہیں کر سکا۔ یہ ایک بڑی حقیقت ہے اور اسے کوئی بھی ادیب یا پبلشر جھٹلا نہیں سکتا کہ محمد طفیل جیسے ذہین، طباع، معاملہ فہم ایڈیٹر، اُن سوا نہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور نہ پاکستان میں۔

بہت بڑے بڑے لوگوں نے، ادبی رسالے نکالے ہیں۔ مگر جس استقلال، پامردی، ہمت، دلیری اور محنت سے محمد طف صاحبِ "نقوش" نے اپنے پرچے کو منزل بہ منزل آگے بڑھایا اور اسے ایک عظیم ادارہ کی شکل دی، مجھے ان بڑے لوگوں می کوئی دوسرا نظر نہیں آ رہا۔

مجھے اِن بڑے لوگوں کی گستاخی حاشا وکلا مطلوب نہیں ہے، ان میں میرے کئی محسن اور اُستاد تھے۔ ان میں کئی اُردو اد کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مگر محمد طفیل جو بھاٹی دروازہ کے اندر کی ایک چھوٹی سی گلی کے اندر کا رہنے والا تھا، بخدا ان سب سے بازی لے گیا۔

میرا یار طُفیل

(ایسا کہاں سے لاؤں کہ تُجھ سا کہیں جسے)

جگن ناتھ آزاد

یہ ۲؍ جولائی کی بات ہے۔ مَیں نے طفیل کے نام مندرجہ ذیل خط لکھا :

برادرِ عزیز ، السّلام علیکم

آپ کے پہلے عنایت نامے کی رسید اور مکمل جواب میں نے دے دیا تھا ، خاص نمبر کے بارے میں اپنی رائے کا بھی اظہار کر دیا تھا۔ اُمید ہے کہ یہ مفصل خط موصول ہو گیا ہو گا۔

اس کے بعد اگلے دن آپ کا ایک اور عنایت نامہ ملا جس میں آپ نے اطلاع دی کہ خاص نمبر سے پہلے ایک عام نمبر بھی زیرِ ترتیب ہے۔ آپ نے اس کے لیے مقالے کی فرمائش کی تھی۔ ایک غیر مطبوعہ مقالہ رف لکھا ہوا موجود تھا۔ میں نے سوچا پہلے مقالہ صاف کر لوں تو اُس کرم نامے کی رسید دُوں۔

مقالہ اب قریب قریب صاف ہو چکا ہے۔ دو ایک دن میں اس خط کے ساتھ ڈاک کے حوالے کر دیا جائے گا زیرِ تصنیف کتاب " روداد اقبال " کا ایک غیر مطبوعہ باب ہے ـــــ ابھی تو ساری کتاب ہی غیر مطبوعہ ہے۔ یہاں اتنی ضخیم کتاب ، ہزاروں صفحات پر مشتمل ، کون چھاپے گا ، اس لیے آپ اس باب کو اطمینان سے چھاپیے۔ ان شاء اللہ یہ مدتوں غیر مطبوعہ ہی رہے گا۔

اس دوران میں آپ کا خوبصورت عید کارڈ ملا۔ سراپا سپاس ہوں۔ خدا آپ کو خوش رکھے کہ مجھے اکثر یاد کرتے رہتے ہیں۔

[ہاں ایک خط میں آپ نے لکھا تھا کہ 'نقوش' ہی کے بارے میں "نقوش" کا ایک خاص نمبر شائع ہو رہا ہے ، یعنی "نقوش" کا نقوش نمبر۔ اس کے لیے آپ نے مجھ سے میرے پسندیدہ موضوع پر لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ میں اس خاص نمبر کے لیے "نقوش" کے اقبال نمبروں پر لکھوں گا۔ آپ مجھے ازراہِ کرم یہ بتائیں کہ کس تاریخ تک یہ مقالہ آپ کو مل جانا چاہیے۔]

فروری میں ایک خط میں مَیں نے آپ کو لکھا تھا کہ بحرین میں "نقوش" کا ایک شمارہ دیکھا جو مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ اس کا مہینہ اور سال تو یاد نہیں لیکن بہت پُرانا نہیں ہے۔ گزشتہ دو ایک برس ہی کا ہے۔

پہچان یہ ہے کہ اس میں میری بہت سی غزلیں ہیں۔ اس کا مجھے انتظار ہے۔

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

بھابی کو آداب، بچوں کو پیار اور دُعا

نیازمند
جگن ناتھ آزاد

پس نوشت:۔

خط کشیدہ حصّے کے جواب کا انتظار رہے گا

آزاد

چونکہ مضمون مکمل طور پر ابھی تک صاف نہیں ہو سکا تھا، اِس لیے سوچا کہ دو ایک دن تک جب مذکورہ مضمون (کیمبرج میں اقبالؒ کے اساتذہ) صاف ہو جائے گا تو یہ خط اور مضمون دونوں اکٹھے ان کو بھیج دوں گا۔

رات کو حسبِ معمول میں اور میری بیوی پاکستان ٹیلیویژن دیکھ رہے تھے[1] کہ اچانک ایک اعلان ٹیلیوژن پر آیا:

محمد طفیل کی یاد میں

کل رات دس بج کر دس منٹ پر

میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ بیوی نے میرے چہرے کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے مجھ سے پوچھا یہ کون محمد طفیل ہوں گے؟ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا، لیکن میرا خیال اپنے دوست محمد طفیل کی طرف تھا۔ میری بیوی میرے دل کی کیفیت بھانپ گئی۔ بولی خدا نہ کرے یہ آپ کے دوست محمد طفیل ہوں۔ میں اب بھی خاموش تھا۔ جیسے میری قوتِ گفتار سلب ہو گئی ہو۔ بیوی نے بات جاری رکھی اور کہنے لگی کہ پاکستان ٹیلیوژن میں باقاعدہ دیکھتی ہوں۔ گھر میں پاکستان کے اخبارات اور رسائل بھی آتے ہیں۔ میں نے کسی اور طفیل محمد کا نام کہیں نہیں دیکھا۔" مجھے خاموش دیکھ کر اُس نے کہا کہ ابھی تھوڑی دیر میں پاکستان سے نیشنل ہک اپ پر خبریں نشر ہوں گی اُن خبروں سے تفصیل معلوم ہو جائے گی۔

---

[1] پاکستان ٹیلیویژن کا معاملہ یہ ہے کہ میں اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود پاکستان ٹیلیویژن کا ڈراما دیکھنے کے لیے وقت نکال لیتا ہوں، اور اِس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پاکستان ٹیلی وژن کا ڈراما ہندوستانی وقت کے مطابق ساڑھے آٹھ نو بجے ٹیلی وژن پر آتا ہے۔ کھانے کا وقت ہم لوگوں نے وہی طے کر رکھا ہے۔ ہم دونوں (میں اور میری بیوی) ساڑھے آٹھ یا نو بجے، جو بھی ڈرامے کا وقت ہو، کھانا ٹیلی وژن والے کمرے میں لگا لیتے ہیں۔ ڈراما اور کھانا دونوں کے ختم ہوتے ہی میں اپنے کمرے میں اپنا لکھنے پڑھنے کا کام کرنے چلا جاتا ہوں اور بیوی اُسی کمرے میں جب تک اُن کا جی چاہے ٹیلیوژ

خبروں میں ابھی دیر تھی لیکن میں پاکستان کے نیوز بلیٹن کے انتظار میں وہیں بیٹھا رہا۔ خبریں شروع ہوئیں اور ختم ہوگئیں لیکن کسی محمد طفیل کا نام کسی خبر میں نہیں تھا۔ بیوی نے کہا شاید کل کسی محمد طفیل کا انتقال ہوا ہو اور اس صورت میں یہ خبر کل کے نیوز بلیٹن میں آچکی ہوگی۔

میں اٹھ کے اپنے کمرے میں آگیا لیکن کام میں جی نہ لگا۔ سونے کے لیے سامنے کے کمرے میں چلا گیا لیکن دیر تک نیند نہ آئی۔ میرا خیال بار بار پاکستان ٹیلیویژن کے اعلان کی طرف جا رہا تھا۔

محمد طفیل کی یاد میں

کل رات دس بجکر دس منٹ پر

اور میرے دل سے آواز آ رہی تھی کہ یہ خبرِ بد ہمارے اپنے محمد طفیل ہی کے بارے میں ہو سکتی ہے ـــــ ابھی جنوری ہی میں تو اُن کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ اچھے بھلے تھے۔ یہ خبر ان کے متعلق نہیں ہوگی ـــــ لیکن زندگی کا کیا بھروسا۔ یہ خبر انہی کے متعلق ہوگی۔

دوسرے دن بھی کچھ پتا نہ چلا۔ خبروں میں مجھے کون اس خبر کے بارے میں بتاتا۔ دلی میں ہوتا تو لاہور ٹیلیفون ہو سکتا تھا۔ بلکہ اب تک دلی میں یہ اطلاع پہنچ چکی ہوگی لیکن مجھے کہیں بھی ٹیلیفون کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ مالک رام، شمس الرحمٰن فاروقی، محمد حسن، غلام ربانی تاباں، قمر رئیس، رشید حسن خان، نثار احمد فاروقی، خلیق انجم، فکر تونسوی ـــــ اب میں ان میں سے کسی کو ٹیلیفون بھی کروں تو کیا پوچھتا

بہرطور جوں توں کرکے دن کاٹا اور رات کو میں حسبِ معمول ٹیلیویژن کے سامنے آکے بیٹھ گیا۔ ہندوستانی وقت (دس بجکر چالیس منٹ) کے مطابق "محمد طفیل کی یاد میں" پروگرام شروع ہوا، اور عنوان ہی میں تفصیل دے دی گئی ـــــ "محمد طفیل مدیر نقوش"

اب تو گویا مجھ پر بجلی سی گری، اگرچہ میں اس خبر کے لیے خاصی حد تک تیار ہو چکا تھا مگر:

اللہ تیری ذات بڑی بے نیاز ہے![1]

(۲)

تقسیمِ ہند سے پہلے کی بات ہے۔ لاہور میں زریں رقم خوش نویس اپنی بیٹھک میں شاگردوں کو کتابت کا فن سکھایا کرتے تھے۔ محمد طفیل نے اسی بیٹھک میں زریں رقم کے شاگرد کے طور پر اُن سے کتابت کا فن سیکھا۔ میں اُس زمانے میں راولپنڈی سے لاہور آچکا تھا۔ یہاں میں نے مختلف طرح کی ملازمتیں بھی کیں مثلاً ملاپ، جے ہند، ٹریبیون اور تحریکِ رفاقت کے دفتر میں اور ایم اے کا امتحان بھی پاس کیا۔ اس دوران میں شاید دو یا تین بار میں زریں رقم کی بیٹھک میں کسی دوست کے ساتھ گیا۔ محمد طفیل سے سلام علیک بھی ہوئی لیکن ۴۷ء تک اس واقفیت کا حدود اربعہ یہیں تک رہا کہ میں جانتا تھا یہ محمد طفیل ہیں اور طفیل جانتے تھے کہ میں جگن ناتھ ہوں۔ بلکہ اس زمانے میں لاہور میں زیادہ تر لوگ مجھے محروم صاحب کے فرزند کے طور پر جانتے تھے۔ میری اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اگر راہ چلتے محمد طفیل سے کبھی

---

[1] پروگرام پر لیفٹیننٹ جنرل صدیق سالک نے کہا کہ میں نے گزشتہ ہفتے کے روز راولپنڈی اخبار میں جب یہ خبر پڑھی...... تو میں نے سوچا کہ گزشتہ ہفتے کے روز ۵ جولائی تھی۔ گویا انتقال ۴ جولائی کو ہوا ہوگا۔ اب بھی میرا اندازہ یہی ہے کہ اگرچہ صحیح تاریخِ انتقال معلوم نہیں۔

ملاقات ہوگئی تو علیک سلیک ضرور ہوتی تھی، لیکن مراسم اس سے آگے نہیں بڑھے اور اُس وقت مجھے یہ خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ ایک دف ہم دونوں میں دوستی کا رشتہ قائم ہو جائے گا اور وہ بھی اُن حالات میں جب کہ تقسیمِ ملک کے بعد میں لاہور چھوڑ کر دہلی آجاؤں گا اور طف بدستور لاہور ہی میں رہیں گے۔

دراصل رشتۂ مودت کی اُستواری میں میرے پاکستان کے سفروں کو بھی خاصا دخل ہے۔ جن کی ابتدا ۱۹۴۸ء ہی سے ہوگ تھی اور ۱۹۶۵ء تک جن کی تعداد اتنی زیادہ رہی (اور خدا کے فضل و کرم سے اب بھی کچھ کم نہیں ہے) کہ احباب لاہور کے سا میرے مراسم کا رشتہ کبھی منقطع نہ ہونے پایا۔

(۲)

محمد طفیل کا "نقوش" ۱۹۴۸ء میں شروع ہوا تو اُس کے اوّلین ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی تھے۔ اُن کے ساتھ شاید نائب مدیر کے طور پر ہاجرہ مسرور کا نام آتا تھا۔ طفیل اُس زمانے میں "نقوش" کے منیجر یا منتظم تھے۔ لیکن میرے ساتھ اُن کی خط و کتابت کا سلس اسی زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔

کچھ مدت بعد "نقوش" اپنی ترقی پسندانہ پالیسی کے باعث حکومت کے عتاب کی زد میں آگیا اور بند ہوگیا۔ ایک آدھ کے بعد جب یہ جاری ہوا تو محمد طفیل خود اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس وقت تک ان کی دکان ادارہ فروغِ اُردو[۱] اچھی چل نکلی تھ انھوں نے کتابیں خاصی تعداد میں چھاپ لی تھیں۔ غالباً شوکت تھانوی کی تصانیف کا پورا سیٹ انھوں نے چھاپا تھا لیکن وہ ابھی تک خود مصنف کے طور پر منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔

لاہور سے دہلی ہجرت کے بعد میرا لاہور کا پہلا سفر ۱۹۴۸ء ہی میں ہوا۔ اُس سفر میں طفیل سے ملاقات نہ ہو سکی۔ یوں تو ا کاٹن ملز کے مشاعرے میں شرکت کے لیے ہر سال میں لائل پور جاتا رہا اور لاہور سے ہو کر، لیکن طفیل سے بھرپور ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی کے ایک مشاعرے میں ـــ یہ مشاعرہ یونیورسٹی ہال میں منعقد ہوا۔ سید عابد علی عابد مرحوم کی صدارت میں۔ مجھے اس مشاع کی زیادہ باتیں یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ حکیم احمد شجاع بھی اس مشاعرے میں موجود تھے۔ اُنھوں نے بھی اپنا کلام پڑھا۔ جب مشاعرہ گاہ میں داخل ہوا تو اُستادِ محترم سید عابد علی عابد بڑی محبت سے میرے ساتھ بغلگیر ہوئے اور مجھے ڈائس پر حکیم احمد ش کے ساتھ ہی جگہ ملی۔[۲] میں جب اپنی کرسی پر بیٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحبِ صدر کی کرسی کے پیچھے ڈائس پر محمد طفیل صا

---

[۱] ادارہ فروغِ اُردو سے یاد آیا کہ اسی نام کا ایک ادارہ لکھنؤ میں بھی ہے۔ مجاز مرحوم لاہور گئے، طفیل سے اُن کی ملاقات طفیل کی طبیعت میں مزاح تو تھا ہی کہنے لگے، مجاز صاحب سُنا ہے لکھنؤ میں ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے "ادارہ دروغِ اُ مجاز کہاں چوکنے والے تھے۔ فوراً ہی اُنھوں نے کہا کہ دروغ برگردنِ راوی اور راوی لاہور میں ہے۔

[۲] [illegible] مشاعرہ [illegible] منعقد [illegible] سے زیادہ ہوگا [illegible] لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے اس میں اپنی طویل نظم "وطن میں اجنبی" کا ایک

بیٹھے ہیں[1]۔ میں انھیں دیکھ کر اپنی کرسی چھوڑ ان کے پاس جا بیٹھا، اور مشاعرے کے خاتمے تک اُن کے ساتھ ہی بیٹھا رہا۔ وہ بعض شعراء کے کلام پر فقرہ بازی بھی کرتے رہے لیکن سرگوشی کے انداز میں اور ڈائس پر بھی کسی کو اس بات کا احساس نہ ہوا۔

دوسرے دن میں ان کی دکان (ادارہ فروغ اردو ایبک روڈ لاہور) پر اُن سے ملنے گیا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے اپنی مطبوعات سے مجھے لاد دیا اور ساتھ ہی مٹھائی کا ڈبہ دیتے ہوئے کہا کہ تمھیں تو ہم لاہور سے اس طرح رخصت کرتے ہیں جیسے بیٹی کو گھر سے رخصت کیا جاتا ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے سبھی لوگوں نے اس جملے پر قہقہہ لگایا اور بعض افسردہ خاطر ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اس جملے میں افسردہ خاطری کا پہلو بھاری تھا۔

(۴)

اب مجھے ہر واقعے کی صحیح تاریخ تو یاد نہیں لیکن قاری اِن واقعات کے پیشِ نظر کسی حد تک تاریخوں کا تعین بھی کر سکتے ہیں۔ شاید "نقوش" کو جاری ہوئے دس برس ہوئے تھے کہ طفیل صاحب نے "نقوش" کا دس سالہ جشن منانے کا پروگرام بنایا۔ مجھے اس سلسلے میں انھوں نے لکھا کہ اس موقع پر ایک مخصوص شعری نشست منعقد کرنے کا ارادہ ہے (مشاعرہ نہیں) آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں۔ میں چاہتا ہوں ہندوستان سے جوش صاحب، فراق صاحب اور آپ آئیں۔ جوش صاحب اور فراق صاحب کو میں پانچ پانچ سو روپیہ دے سکوں گا۔ آپ کو کچھ نہیں دوں گا لیکن ان دونوں کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ غالباً اس میں یہ جملہ بھی تھا کہ یہ میری آبرو کا سوال ہے[2]۔ میں نے جوش صاحب سے بات کی۔ انھوں نے پانچسو روپیہ سنتے ہی ناک سکوڑ لی۔ اور کہا پانچ سو روپے میں نہیں جاتا۔ انھوں نے عرش سے مشورہ کیا۔ عرش نے بھی عدم شرکت کے حق میں رائے دی۔ عرش بھی شاعر تھے۔ مشاعروں کے شاعر۔ جس مشاعرے میں وہ خود مدعو نہ ہوں۔ اس میں وہ جوش کی شرکت کا مشورہ کیسے دے سکتے تھے اور جوش صاحب کو پانچ سو روپے پر آمادہ کرنا میرے لیے واقعی ایک مشکل کام تھا۔ ادھر طفیل پر یہ رعب گانٹھنا بھی چاہتا تھا کہ میں جوش صاحب کو پانچ سو روپے پر آمادہ کر سکتا ہوں۔ میرے لیے بھی یہ آبرو کا سوال تھا۔

فراق صاحب الٰہ آباد میں تھے۔ انھیں میں نے خط لکھا۔ وہ فوراً آمادہ ہو گئے۔ خط میں اُنھوں نے لکھا، طفیل کو لکھو کہ الٰہ آباد سے دہلی تک اور دہلی سے الٰہ آباد تک کا طیارے کا کرایہ اور دہلی میں قیام و طعام کے اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔ میں نے فراق صاحب کو لکھا کہ الٰہ آباد سے دہلی تک طیارے کی سروس تو نہیں ہے۔ میں یہ غلط بات طفیل کو کیسے لکھ سکتا ہوں، اور

---

[1] طفیل صاحب کا مشاعروں میں جا کے بیٹھنے کا شوق زیادہ عرصے تک نہ رہا۔ بعد میں تو انھوں نے مشاعروں میں جانا یعنی مشاعرے سننے کا شغل بالکل ترک کر دیا۔

[2] طفیل کے خطوط جن کی تعداد خاصی زیادہ ہے میرے پاس محفوظ ہیں لیکن ان خطوط کے انبار فائلوں میں بند ہیں اور فائلوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اس وقت ان کے خطوط تلاش کرنا انتہائی دشوار کام ہے۔ لیکن چونکہ میں اپنے پاس رکھے ہوئے تمام خطوط انجمن ترقی اُردو (ہند) کے حوالے کر رہا ہوں اور وہاں اُن خطوط کی باقاعدہ فہرستیں بنائی جا رہی ہیں اس لیے دو تین برس تک ان شاء اللہ ایسی صورت ہو جائے گی کہ میرا خطوط کا یہ خزانہ انڈکس سمیت اُردو کے ہر اُس شائق کی دسترس میں ہو گا جو اُن خطوط کو دیکھنا چاہے گا یا اُن پر کام کرنا چاہے گا۔

جہاں تک دلی میں قیام وطعام کا تعلق ہے آپ حسب دستور میرے مہمان ہوں گے۔ آپ ہر حالت میں آئیں گے ریل سے اور اگر آپ کہیں تو ریل کا کرایہ آمد و رفت کا میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ یہ چھوٹی سی بات میں طفیل صاحب کو نہیں لکھ سکتا۔

گویا فراق صاحب کا مسئلہ تو حل ہو گیا اور یہ مسئلہ کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں۔ فراق صاحب پاکستان بہت کم بلائے گئے ہیں۔ ہندوستان کے شعراء میں پاکستان کے لیے مقبول ترین شاعر جگر تھے ۔۔ نہ جوش نہ فراق۔ ویسے جوش کا ڈنکا اس زمانے میں بہت زیادہ تھا ـــ اور ابھی تک فراق کا قد یوسف ظفر کے دیباچے اور حسن عسکری کی تحریروں کے باوجود کم از کم ہندوستان میں جوش اور جگر کے مقابلے میں کوتاہ تھا۔ فراق کو خود اس بات کی شکایت رہتی تھی۔ انھوں نے خود مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ ان مسلموں کو دیکھو یہ مجھے نمبر ۲ سمجھتے ہیں۔ چونکہ یہ بات انھوں نے بغیر کسی سیاق و سباق کے کہی تھی اس لیے میں نہ سمجھا کہ کیا کہہ رہے ہیں اور یہی ان کا طریقہ تھا۔ ناشتے کے بعد کمرے میں چہل قدمی کر رہے ہیں، سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہے ہیں، سوچ میں غرق ہیں کہ اچانک ان کی زبان سے میں یہ جملہ سنتا ہوں ''ان مسلموں کو دیکھو مجھے نمبر ۲ سمجھتے ہیں۔'' میں نے کہا میں نہیں سمجھا۔ انھوں نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور اپنا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ مجھ سے کہتے ہیں آیئے نمبر ۲ صاحب تشریف لائیے۔'' اب میں بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ اور میں نے کہا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کے سامنے منہ سے ایسا کون کہہ سکتا ہے کہ آیئے نمبر ۲ صاحب تشریف لائیے۔ یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ کہنے لگے ان کے دل میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ منہ سے یہ چاہے ایسا نہ کہیں۔ میں نے کہا۔ فراق صاحب، یہ ہندو یا مسلم کی بات نہیں ہے۔ ادب اور شاعری میں پرانی قدروں کا حامل جو طبقہ ہے خواہ وہ ہندوستان میں ہے خواہ پاکستان میں اُس کے نزدیک جوش اور جگر کا مرتبہ آپ سے بلند ہے لیکن YOUNGER GENERATION جو پرانی اقدار سے بیزار ہے اور شاعری میں نیاپن اور شگفتگی دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کے نزدیک آپ کا مرتبہ آج کے تمام شعراء سے بلند ہے۔ جو YOUNGER GENERATION کل ادب میں حاوی ہوگی۔ اس وقت آپ کو جوش اور جگر سے بہتر شاعر سمجھا جائے گا ـــ اب دیکھیے آج، غزل کے اربعہ عناصر کا ذکر اکثر ہوتا ہے۔ اس فہرست میں فانی، حسرت، اصغر اور جگر کے نام لیے جاتے ہیں۔ فراق اور یگانہ کا نام کوئی نہیں لیتا۔ حالانکہ فراق اور یگانہ کے بغیر غزل کا ذکر مکمل ہی نہیں ہے جس قصر غزل کی یہ لوگ بات کرتے ہیں وہ چار ستونوں پر نہیں بلکہ چھ ستونوں پر قائم ہے۔ یہ تو صرف نئی اور پرانی اقدار کی بات ہے ہندو یا مسلمان کی بات نہیں۔

فراق صاحب سے جواب نہ بن پڑا لیکن یہ کیسے تسلیم کرتے کہ اُن کے مقابلے میں کوئی معقول بات بھی کہہ سکتا ہے۔ پہلے تو انھوں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا، پھر مجھے ڈانٹ کے چپ کرا دیا۔ یہ کہہ کے کہ تم انھیں نہیں جانتے میں جا ہوں لیکن دل میں انھیں اس بات کا یقین رہا ہوگا کہ ان کا تجزیہ غلط ہے اور میرا صحیح۔

خیر میں بات طفیل صاحب کی شعری نشست کی کر رہا تھا تو اس شعری نشست کی تاریخ مقر سے بہت دن قبل فراق دلی آ گئے۔ صبح صبح انھیں اسٹیشن پر لینے گیا۔ آپ شاید تھرڈ کلاس یا انٹر کا

پہنچے[1] جوش صاحب فراق صاحب کو دیکھ کے باغ باغ ہو گئے ۔

فراق صاحب کے دس بارہ روز قبل دہلی پہنچنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ انھوں نے جوش صاحب کو لاہور جانے پر آمادہ کر لیا ۔ میں اس بات سے بہت خوش تھا ۔ طفیل نے میرے ذمے بہت مشکل کام لگا دیا تھا اور یہ مشکل میری کوشش سے آسان نہیں ہو رہی تھی ۔ فراق صاحب کی کوشش سے یہ آسان ہو گئی ۔ مجھے یہ خوشی تھی کہ طفیل کے سامنے اب میری سُبکی نہیں ہو گی اور میں ڈینگ مار سکوں گا کہ مجھے واقعی جوش صاحب کا قُرب حاصل ہے اور میں اُن کی مرضی کے خلاف اُن سے فیصلہ کرا سکتا ہوں ۔ لیکن دراصل مجھے یہ خدشہ ضرور تھا کہ ہو سکتا ہے جوش آخری وقت پر غچہ دے جائیں ، کیونکہ پانچ سو روپے پر جوش کا لاہور جانا مجھے ذرا انہونی سی بات نظر آ رہی تھی ۔

خیر اب آگے سنیے ـــــ انہی دنوں میں غالباً جنرل ایوب خان کی حکومت آ گئی اور پاکستان میں مارشل لاء لگ گیا ۔ شاید اس خصوصی نشست کے اندر مشاعرہ چھپا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کا انعقاد مشکل ہو گیا ـــــ اب طفیل کا مجھے تار ملا کہ مارشل لاء کے باعث خصوصی نشست منسوخ وغیرہ وغیرہ ۔ میں نے یہ تار فراق صاحب کو دکھایا ۔ وہ تو اُسے پڑھتے ہی آگ بگولا ہو گئے اور کف در دہن ہو کر طفیل کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا ۔ میں نے ہزار کہا کہ اس میں طفیل صاحب کی کیا خطا ۔ ملک بھر میں مارشل لاء لگ گیا ہے اب اس طرح کے جلسے ، مشاعرے وغیرہ کچھ مدت کے بعد ہی شروع ہو سکیں گے ۔ شروع میں تو فوج جب حکومت سنبھالتی ہے تو جلسے جلوس سب بند ہو جاتے ہیں لیکن ان کا غصہ بدستور رہا اور اُسی غصے کے عالم میں اُنھوں نے کہا طفیل کو لکھو کہ اس وقت تک فراق صاحب کا دہلی کے سفر میں آٹھ نو سو روپیہ خرچ ہو چکا ہے ۔ یہ روپیہ مجھے ملنا چاہیے ۔ میں نے کہا لکھ دوں گا ، آپ مطمئن رہیں اور یہ روپیہ آپ کو مل جائے گا ۔ اس زمانے میں آٹھ نو سو روپے بڑی رقم تھی اور فراق صاحب کا خرچ اس کا دسواں یا پندرھواں حصہ بھی نہیں ہوا ہو گا ۔

دوسرے دن دفتر جا کر میں نے جوش صاحب کو طفیل کا تار دکھایا ۔ جوش تار پڑھ کے بہت خوش ہوئے ۔ دراصل وہ اس خصوصی نشست میں شرکت کے لیے آمادہ نہیں تھے ۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا ۔ جوش کی جان میں جان آئی ۔

وہاں سے اُٹھ کے فراق میرے ساتھ میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے کہ ابھی طفیل کو خط لکھو ۔ میں نے کچھ آئیں بائیں شائیں کی کہ لکھ دوں گا ضرور لکھ دوں گا لیکن فراق کہاں ماننے والے تھے ۔ کہنے لگے تم لکھو ۔ میں تمھیں لکھواتا ہوں ۔ یہ خط تمھاری طرف سے ہو گا ـــــ اور اُنھوں نے لکھوانا شروع کر دیا ۔

اس خط میں طفیل کو بُرا بھلا کہنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور یہ خط میری طرف سے تھا ۔ فراق صاحب نے یہ جملہ بھی لکھوا دیا ، کہ "میں تمھیں لڑکپن سے جانتا ہوں ، تم کمینے ہو ذلیل ہو" وغیرہ وغیرہ ۔

اب اِدھر تو میں یہ خط لکھ رہا تھا اور اُدھر میری رُوح فنا ہو رہی تھی کہ اگر یہ خط لیٹر بکس میں ڈال دیا گیا تو میرا کیا حشر ہو گا

---

[1] ماہنامہ آج کل کا دفتر پبلیکیشنز ڈویژن جہاں جوش صاحب ایڈیٹر تھے اور میں عرش ملسیانی اور بلونت سنگھ اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے

اس میں یہ بھی تھا کہ الٰہ آباد سے دہلی تک اور دہلی میں قیام کے سلسلے میں فراقؔ صاحب کا اتنا روپیہ خرچ ہو چکا ہے (یہ روپیہ اس وقت تک ایک ہی دن میں، آٹھ نو سو سے بڑھ کر ہزار سوا ہزار تک پہنچ گیا تھا) اس کا کون ذمہ دار ہوگا......

جب اس طرح کی لغویات سے لبریز خط مکمل ہو گیا تو اُن کا حکم ہوا کہ اسے لفافے میں بند کرو اور پتا لکھو۔ میں نے دونوں ارشادات کی تعمیل کی لیکن دراصل میری حالت یہ تھی کہ ظ : 'کاٹو تو لہو نہیں بدن میں' اور میں یہ فیصلہ کرنے پر بھی تیار ہو چکا تھا کہ پہلے تو انہیں سمجھاؤں گا کہ ایسا خط نہیں جانا چاہیے اور اگر وہ نہ مانے تو میں اس خط کو چاک کر دوں گا۔ اس کے بعد جو ہو سو ہو۔ فراقؔ کی کس کے ساتھ لڑائی نہیں ہوئی۔ میرے ساتھ بھی ہو جائے گی تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا۔

اب لفافہ بند ہو گیا۔ اس پر پتا لکھا گیا۔ فراقؔ صاحب نے خود ہی چپراسی کو آواز دی۔ وہ اندر آیا —

یہ ایک عجیب لمحہ تھا۔ لیکن ہر شخص کی عزت و آبرو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ فراقؔ صاحب کے ہاتھ میں ہوتی تو کس کی عزت و آبرو محفوظ نہیں تھی۔ مذکورہ لفافہ میرے سامنے رکھا تھا۔ دو چار لفافے اور بھی رکھے تھے جو ڈاک میں میرے نام آئے تھے اور ابھی تک بند تھے۔ میں نے اصل لفافے کو نظر انداز کر کے اُن میں سے ایک لفافہ اُٹھا کے چپراسی کو دے دیا کہ ڈاک میں ڈال دو۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس پر تو میرا نام پتا لکھا ہے یہ تو مجھے کل کی ڈاک میں پھر آ ملے گا۔ چپراسی وہ لفافہ لے کے چل دیا اور فراقؔ صاحب مطمئن ہو گئے کہ آزاد کا گالیوں بھرا خط طفیل کے نام، طفیل کو مل ہی جائے گا۔ میں اپنی جگہ مطمئن تھا کہ بلا ٹل گئی۔

اب فراقؔ صاحب نے کیا کیا۔ رات کو تنہائی میں بیٹھ کر طفیل کے نام ایک خط لکھا کہ آزاد بڑا خراب آدمی ہے وہ تمہیں گالیاں دے رہا ہے اور اس نے تمہیں میرے روکنے کے باوجود ایک بہت سخت خط لکھا ہے۔ وغیرہ وغیرہ[1]

اُس زمانے میں فراقؔ صاحب کے خطوط "نقوش" میں چھپ رہے تھے۔ یہ خط بھی چھپ گیا جسے دیکھ کر مجھے بڑا غصہ آیا اور میں نے طے کر لیا کہ میں فراقؔ صاحب سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لوں گا، لیکن فراقؔ صاحب کی شخصیت میں بعض خوبیاں ایسی بھی تھیں کہ اُن سے قطع تعلق کرنا آسان بھی نہیں تھا۔ اُن سے قطعِ تعلق کے معنی تھے اچھی گفتگو سے محروم رہنا۔

کچھ مدت کے بعد ملتان میں ایک مشاعرہ تھا، ہندوستان سے اُس مشاعرے میں صرف میں ہی مدعو تھا۔ میرا طریقہ یہ تھا کہ جب پاکستان جاتا تھا اور بالخصوص جب لاہور سے گزرنا ہوتا تھا تو طفیل کو لکھ دیتا تھا کہ یہاں سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے لکھیے۔ طفیل اُس زمانے میں ٹوما استعمال کرتے تھے، شاید وہ پاکستان میں نہیں ملتا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ ٹوماہی کی فرمائش کرتے تھے۔ اب کے بھی اُنھوں نے ٹوماہی کی فرمائش کی۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں دہلی سے امرت سر تک ریل سے جا رہا تھا۔ امرتسر سے لاہور تک سڑک کے ذریعے سے اور لاہور سے ملتان تک پھر ریل سے۔ لاہور سے ملتان تک ریزرویشن کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں سکا تھا کیونکہ دفتر سے چھٹی ملنے میں دیر ہو گئی تھی اور ریزرویشن کے بارے میں ملتان کے منتظمینِ مشاعرہ کو میں خط نہیں لکھ سکا تھا چنانچہ میں

---

[1] فراقؔ صاحب کے اس خط کی عبارت مجھے یاد نہیں، لیکن یہ خط چونکہ "من آنم" میں چھپا ہے اس لیے تفصیلی طور

نے طفیل کو لکھا کہ میں بس اسٹینڈ سے سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچوں گا۔ آپ میرے لیے لاہور سے ملتان تک کی ریزرویشن کروا لیں، ٹکٹ مجھے لاہور ریلوے اسٹیشن پر دے دیں۔ آپ فرسٹ کلاس کے ویٹنگ رُوم میں میرا انتظار کریں۔ میں وہیں آپ سے ملوں گا۔

چنانچہ فرسٹ کلاس کے ویٹنگ رُوم میں جب میں پہنچا تو طفیل صاحب وہاں میرے منتظر تھے۔ ابھی ریل کی روانگی میں بہت وقت تھا۔ اس لیے اطمینان سے باتیں ہوئیں۔ میں نے طفیل سے پوچھا کہ حضرت یہ بتائیے۔ میں نے لغویات سے لبریز کون سا خط آپ کو لکھا؟ کہنے لگے۔ میں بھی اس بات پر حیران تھا کہ آپ کا تو کوئی خط ایسا مجھے نہیں ملا۔ پھر فراقؔ نے نہ جانے یہ سب کیسے لکھ دیا۔ میں نے کہا۔ سوال یہ ہے کہ جب فراقؔ کا خط بے بنیاد تھا تو آپ نے اُسے 'نقوش' میں چھاپا کیوں؟ طفیل سے جواب نہ بن پڑا۔ کہنے لگے، خیال تھا یہ حصہ نکال دوں گا۔ لیکن فراقؔ کے دوسرے خط کے ساتھ یہ بھی کاتب کو دے دیا گیا اور چھپ گیا۔ مگر ساتھ ہی انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ یہ خط "مَن آنم" میں نہیں چھپے گا ـــ میں مطمئن ہوگیا ـــ لیکن کچھ مدت کے بعد جب "من آنم" چھپ کے آئی تو کیا دیکھتا ہوں، کہ یہ خط اس میں بھی موجود ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ طفیل میرے ساتھ کیا ہوا وعدہ بھول گئے ہوں اور 'نقوش' میں مطبوعہ تمام خطوط اس ہدایت کے ساتھ کاتب کو دے دیئے گئے ہوں کہ اب کتابی سائز پر ان کی کتابت کرو۔ چنانچہ اُس خط کی بھی کتابت ہوگئی اور وہ چھپ گیا۔ دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طفیل فراقؔ کی شاعری اور نثر کے عاشق تھے۔ انھوں نے سوچا ہوگا۔ کہ فراقؔ کا ایک ایک لفظ محفوظ ہو جائے۔ کسی خط کا کوئی حصہ حذف نہ کیا جائے ـــ اور میں اس کی زد میں آگیا۔

میرے دل میں اس واقعے کا تکدّر کچھ مدّت تک رہا، لیکن انجام کار ختم ہوگیا اور میں یہ بات بھول ہی گیا ـــ اور اب جبکہ میں ماضی کی راکھ کریدنے بیٹھا ہوں تو اس میں سے یہ سب کچھ، تلخیاں اور کسیلا پن، برآمد ہو رہا ہے۔

(۵)

ہاں تو میں ریلوے اسٹیشن پر طفیل کے ساتھ اپنی ملاقات کا ذکر کر رہا تھا۔ ابھی ریل نہیں چلی تھی کہ میرے ایک عزیز دوست خلیفہ اقبال حسین مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسٹیشن پر آ نکلے۔ وہ اپنی گاڑی ساتھ لائے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ میں ریل سے نہ جاؤں، بلکہ ان کی گاڑی میں ان کے ساتھ ملتان چلوں۔ خلیفہ اقبال حسین ایک بڑی محبوب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا تعلق پٹیالے کے خلیفہ خاندان سے تھا۔ تقسیم ملک کے وقت ہجرت کرکے لاہور چلے گئے تھے۔ تقسیم سے قبل ان کے ساتھ میرے مراسم نہیں تھے۔ تقسیم کے بعد پہلی بار ملاقات ہوئی اور پتا چلا کہ میری شاعری کے عاشق ہیں۔ انھیں میرے سیکڑوں اشعار زبانی یاد تھے۔ لاہور میں جب بھی گیا ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ میں اُن کے یہاں قیام کروں۔ ایک دفعہ لائل پور کے ایک مشاعرے سے واپس آتے ہوئے میں نے اور غلام ربانی "تاباں" نے ان کے دولت کدے پر قیام کیا۔

خلیفہ اقبال حسین میری 'تواضع' کے لیے اپنی گاڑی میں اسکاچ وسکی کی متعدد بوتلیں رکھ کے لائے تھے جن پر ملتان میں عدم صاحب نے ہاتھ صاف کیا اور مشاعرے سے پہلے ہی اُن کی حالت غیر ہوگئی تھی۔

گویا طفیل صاحب کا خریدا ہوا ٹکٹ خلیفہ اقبال حسین نے استعمال نہ کرنے دیا اور ملتان تک کا سفر خلیفہ صاحب کی گاڑی میں ہوا۔ یہ گاڑی منٹگمری کے قریب پہنچ کر خراب ہوگئی اور انجام کار ہمیں لاہور سے آنے والی اُسی ریل کا انتظار کرنا پڑا جس کے

لے جمیل صاحب نے میرا ٹکٹ خریدا تھا اور جسے مجید کے ہم کاری سے روانہ ہو آئے تھے۔

اب یہ کار ڈرائیور کے سپرد ہوئی جس نے کہا کہ اسے ٹھیک کرا کے میں ملتان لے آؤں گا، اور ہم نے پلیٹ فارم پر ریل کا انتظار شروع کیا۔ وہاں اتفاقیہ طور پر مجید امجد سے ملاقات ہو گئی۔ یہ ان کے ساتھ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی اور یہ اس سفر کا بہت بڑا حاصل تھا۔ بات یہ تھی کہ اُس ریل سے لاہور اور راولپنڈی کے شعراء سفر کر رہے تھے۔ مجید امجد خود تو مشاعرے میں مدعو نہیں تھے، لیکن ان میں سے بعض شعراء سے ملنے اسٹیشن پر آئے تھے۔

اب یہاں ملتان کے مشاعرے کا ذکر تو مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن ابھی گزشتہ فروری میں جب پنجاب کے گورنر مخدوم سید سجاد حسین صاحب سے گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں ملنے کا اتفاق ہوا تو انھیں وہ مشاعرہ یاد تھا اور ملاقات میں انھوں نے خاص طور سے اس کا ذکر کیا۔ مخدوم صاحب قبلہ اُس وقت شاید پنجاب اسمبلی کے سپیکر تھے یا رکن تھے اور مشاعرہ انہی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔

(۶)

پرانی بات ہے۔ ابھی "نقوش" کو جاری ہوئے دو تین برس ہی ہوئے ہوں گے۔ مجھ سے طفیل صاحب نے کہا کہ اُن کا ارادہ یہ ہے کہ "نقوش" دہلی سے بھی جاری کیا جائے۔ غالباً کلکتے کے کسی تاجر کتب کے ساتھ اُن کی بات ہوئی تھی۔ انھوں نے اس تاجر کتب کی بہت تعریف کی اور کہا کہ بہت ایمان دار آدمی ہے۔ اِس وقت میری مطبوعات کا بہت سا روپیہ اس کے ذمے ہے۔ وہ یہ روپیہ لاہور نہیں بھیج سکتا۔ اس لیے پوچھتا ہے کہ ہندوستان میں میرے کسی دوست کو بھیج دے۔ میں چاہتا ہوں اُسے آپ کا پتا دے دوں۔ وہ روپیہ آپ کو بھیج دے اور آپ یہ اپنے پاس محفوظ رکھیں اور میں جب بھی دہلی آؤں آپ سے لے لوں۔ میں نے کہا مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس تاجر کتب کو طفیل صاحب نے میرا پتا دے دیا اور اُس نے طفیل صاحب کا روپیہ میرے نام بھیج دیا۔ طفیل نے مجھے خط لکھا کہ میں دہلی آ رہا ہوں اور آپ سے ملوں گا۔ میں ان دنوں بیمار تھا۔ خط کا جواب نہ دے سکا۔ طفیل نے دوبارہ خط لکھا۔ میں اس کا بھی جواب نہ دے سکا، علالت کی وجہ سے۔ آخر ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ طفیل صاحب غریب خانے پر موجود ہیں۔ میں بیماری کی حالت میں باہر صحن میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھ سے لپٹ گئے اور اسی مزاح بھرے لہجے میں کہنے لگے کہ خط کا جواب غالباً تم نے اس لیے نہیں دیا کہ میرا روپیہ مار لینا چاہتے ہو۔ مجھے ہنسی آ گئی اور میں نے کہا "کسی کی جان گئی اور آپ کی ادا ٹھہری" آپ کا روپیہ محفوظ ہے۔ اتنے میں چائے آ گئی اور بعد میں جب میں اندر سے اُن کا روپیہ لانے کے لیے اُٹھا تو مجھ سے چلا نہ گیا۔ خود طفیل نے مجھے سہارا دیا۔ اور اُسی لہجے میں کہنے لگے۔ یار تم تو واقعی بیمار ہو۔ میں سمجھا تھا مذاق کر رہے ہو۔

لیکن "نقوش" کو کلکتے یا دہلی سے جاری کرنے کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ حالانکہ ان کا خیال یہ تھا کہ بٹر پیپر پر کتابت شدہ مضامین نظم نثر ہندوستان بھیج دیے جایا کریں گے۔ اور جیسا یہ پاکستان میں چھپتا ہے ویسا ہی ہندوستان میں چھپ جایا کرے گا۔

(۷)

۱۹۸۱ء میں پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کی دعوت پر میں پاکستان گیا۔ وہاں چار یونیورسٹیوں میں مجھے لیکچر دینا تھے۔ پنجاب

یونیورسٹی لاہور، کراچی یونیورسٹی کراچی، پشاور یونیورسٹی پشاور اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔ اس سفر میں میری پہلی منزل لاہور تھی۔ چونکہ میں اپنے احباب کے لیے اپنی تصانیف کی جلدیں لے کے گیا تھا جس کے باعث سامان کا وزن بہت بڑھ گیا تھا۔ اس لیے یہ سفر میں نے سڑک کے ذریعے سے کیا۔ واہگہ پر محب گرامی قدر جناب صبیح الدین احمد صدیقی ڈائریکٹر جنرل پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز خود موجود تھے۔ انھوں نے ملتے ہی کہا کہ آپ کے ایک دوست آپ کے لیے یہاں واہگہ آئے ہوتے ہیں اور وہ کسٹم کے دفتر میں بیٹھے ہیں، آپ بتائیے وہ کون ہیں۔ میں نے کہا صدیقی صاحب یہ تو آپ نے بڑا مشکل سوال کیا ہے۔ کیونکہ لاہور میں میرے عزیز دوست تو لیکن کے دوست ایک سے زیادہ ہیں۔ انھوں نے پھر بھی اصرار کر کے نام پوچھنا چاہا۔ میں نے کہا۔ میں ترتیب کے بغیر کم از کم پانچ سات نام لوں گا، ایک نام لینا تو بڑا مشکل ہے۔ انھوں نے کہا کہیے۔ میں نے کہا طفیل، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی۔ ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ وہ بول اُٹھے بس آپ نے صحیح کہا ہے۔ آپ کو لینے کے لیے احمد ندیم قاسمی آئے ہوئے ہیں۔ طفیل صاحب کے بارے میں انھوں نے کہا کہ وہ رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری ہیں اور رائٹرز گلڈ کی جانب سے آج شام ہی کو آپ کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا جا رہا ہے، طفیل صاحب اس جلسے کی تیاری میں مصروف ہیں ورنہ وہ میرے اور قاسمی کے ساتھ ضرور آتے۔

صدیقی صاحب مجھے اپنے ساتھ مال روڈ پر انٹرکانٹینینٹل ہوٹل میں لے گئے، جہاں میرے قیام کا انتظام تھا۔ تھوڑی دیر بعد رائٹرز گلڈ کے ایک نمائندے آئے اور میں ان کے ساتھ رائٹرز گلڈ کے دفتر پہنچ گیا۔ جہاں لاہور کے اہلِ قلم ادیب، شعرا کافی تعداد میں موجود تھے۔ پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی، آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں، نئے دوست ملے۔ مرزا ادیب کی فرمائش پر میں نے سفرِ برما کی داستان سُنائی۔ جہاں میں کوئی دس پندرہ روز قبل حلقۂ احمر رنگون اور اسلامک سنٹر برما کی دعوت پر گیا تھا۔ سوال جواب کا سلسلہ ختم ہونے ہی کو تھا کہ ایک صاحب نے کہا۔ مدت سے آپ کا کوئی شعری مجموعہ نہیں چھپا۔ اگرچہ اس دوران میں آپ کی نثری تصانیف خاصی تعداد میں چھپی ہیں۔ پاکستان میں بھی آپ کی بہت کتابیں چھپی ہیں لیکن یہ سب آپ کی نثری تصانیف ہیں۔ نہ جانے مجھے کیا سُوجھی، میں نے طفیل صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ میرا مجموعہ کلام چھاپنا ہی نہیں چاہتے۔ اب یہ پیچھے تو کیسے طفیل جھینپ گئے۔ کہنے لگے ضرور چھاپوں گا۔ میں نے اُسی رَو میں کہا۔ یہ آپ کے سامنے کہہ رہے ہیں چھاپوں گا، لیکن بعد میں مجھ سے کہدیں گے نہیں چھاپتا۔ اس پر سامعین میں ایک قہقہہ سا بلند ہوا۔

بعد میں طفیل مجھ سے کہنے لگے ـــــ اچھا تم اب مجھے جرگے کے سامنے لے گئے۔ میں نے کہا بھئی جب میرا نیا مجموعۂ کلام نہیں چھپا ہے تو کچھ نہ کچھ تو جواب میں کہنا ہی تھا۔

لاہور سے میں کراچی چلا گیا، وہاں سے اسلام آباد، اسلام آباد سے میانوالی اور عیسیٰ خیل، عیسیٰ خیل سے پھر اسلام آباد اور اسلام آباد سے پشاور ـــــ پشاور میں زندگی میں پہلی بار گیا تھا۔ وہ دو ایک دن کا قیام زندگی میں ہمیشہ نسیمِ جانفزا کی طرح خوشبو برساتا رہے گا۔

پشاور سے میں پھر اسلام آباد آیا۔ یہاں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں میرا لیکچر تھا۔ یہاں صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس سے قبل ملاقات لاہور میں ہو چکی تھی اور جب اسلام آباد کی ملاقات کے بعد میں قصرِ صدر سے

رخصت ہوا تو میری زبان پر اقبال کا یہ مصرع تھا۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا

خیر میں اپنے موضوع سے ہٹ گیا ہوں۔ کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ اسلام آباد کے لیکچر کے دوسرے روز مجھے دہلی واپس روانہ ہونا تھا۔ چنانچہ اسلام آباد سے میں پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کے آفس سپرنٹنڈنٹ کی معیت میں کتابوں کے تحائف سے لدا پھندا میں لاہور آیا۔ چونکہ شام سے پہلے ہی کتابوں کے بکسوں سمیت واگہ کی سرحد کو عبور کرنا تھا اور وقت بہت کم تھا۔ اس لیے طیارے سے اترتے ہی اپنے دو دوستوں سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ ایک چودھری عبدالحمید پروپرائیٹر مکتبۂ کارواں اور دوسرے محمد طفیل۔ چودھری عبدالحمید کے ساتھ گپ شپ کے بعد نقوش پریس (اُردو بازار) کا رُخ کیا۔ طفیل وہاں نہیں تھے۔ بیٹے پرویز نے بتایا کہ گھر پر ہیں، چنانچہ پرویز کی رہنمائی میں، میں مسلم ٹاؤن پہنچا۔ وہاں طفیل کے ساتھ تھوڑی دیر محفل جمی۔ بھابی سے اور بچوں سے ملاقات ہوئی۔ چائے آئی۔ چائے کے ساتھ جتنی چیزیں تھیں سب ویجیٹیرین یعنی سموسے، بسکٹ۔ دال موٹھ وغیرہ۔ میں نے کہا یار اگر یہی چیزیں کھانا تھیں تو تم نے پاکستان کیوں بنایا۔ یہ سب تو ہندوستان میں بھی مل سکتا تھا۔ اس پر گھر کے سب لوگوں کو ہنسی آگئی۔ طفیل صاحب نے کہا پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم لاہور کو چھوڑ کے دہلی کیوں چلے گئے۔ میں لاجواب ہو گیا اور جواب بھی کیا دیتا۔ اگر نازش رضوی مرحوم اور شیخ عبدالشکور مجھے یہ کہہ کر زبردستی ہندوستان کو نہ دھکیلتے کہ اب تم ہمارے لیے مصیبت بن گئے ہو۔ حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ اب تمہاری حفاظت ہم نہیں کر سکتے۔ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ اور وہ مجھے خود ہی ریفیوجی کیمپ میں نہ پہنچا آتے تو ہو سکتا تھا کہ میں لاہور ہی میں رہتا۔ حالات تو آخر ٹھیک ہو ہی گئے تھے۔

(۸)

میں بے ترتیبی کے ساتھ واقعات سُناتے سُناتے ۸۰ء تک پہنچ گیا حالانکہ درمیان میں کچھ ایسی باتیں مجھے کہنا تھیں جن کا تعلق ۱۹۷۷ء سے ہے۔ نومبر ۷۷ء میں پہلی اقبالؒ انٹرنیشنل کانگرس لاہور میں منائی گئی۔ میرے لیے اس کانگرس کی اہمیت یوں بھی بہت زیادہ تھی کہ میں بارہ برس کے بعد لاہور جا رہا تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد مجھے پاکستان جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس مدت میں مشاعروں اور سیمیناروں کے چند دعوت نامے آئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی منسوخی کی اطلاع بھی آتی چلی گئی۔ ایک عجیب بے بسی اور گھٹن کا عالم تھا۔ کیونکہ یا تو یہ صورت تھی کہ ۴۷ء سے ۶۵ء تک سال میں ایک یا دو یا تین چکر پاکستان کے جس میں مشرقی پاکستان بھی شامل تھا لگتے تھے۔ اور اب بارہ برس میں ایک بار بھی وہاں جانے کا موقع نہ ملا۔ بہرطور یہ جمود اقبال انٹرنیشنل کانگرس کی بدولت ٹوٹا اور میں اس کانگرس کی دعوت پر لاہور پہنچ گیا۔ اس سفر کی یوں تو قابلِ ذکر باتیں بہت ہیں اور اُن میں سے اکثر کا ذکر میں اپنی مختلف تحریروں میں کر بھی چکا ہوں۔ لیکن جن باتوں کا ذکر نہیں کیا۔ ان سب کی گنجائش اب اس مضمون میں نہ نکل سکے گی۔ کیونکہ اس میں صرف طفیل ہی سے متعلق باتوں کا ذکر ہے۔

جب لاہور میں اقبال کانگرس کے سیمینار اور جلسوں کا پروگرام ختم ہو گیا تو آخری اجلاس سیالکوٹ میں منعقد ہوا میرا ارادہ اس کے بعد دو تین روز لاہور میں قیام کرنے کا تھا، کیونکہ کانگرس کے پروگراموں نے اتنا مصروف رکھا تھا کہ شہر میں

گھوم کے احباب سے ملنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس دوست کے گھر میں قیام کروں۔ پیشکش اکثر احباب کی طرف سے تھی۔ مثلاً برادرم قتیل شفائی، جناب نذیر احمد سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور، عزیزم مسعود شورش، لیکن قرعۂ فال طفیل ہی کے نام پڑا۔ وہ ایک دن کانٹی نینٹل ہوٹل میں کمرے میں آئے اور تحفے میں ملی ہوئی کتابوں کے انبار ـــــ فرش پر، صوفے پر، تپائی پر، پلنگ کے ایک حصے پر دیکھ کے حیران رہ گئے۔ کہنے لگے آخر تم ہو تو متعصب ہندو، پاکستان کے دشمن، تم نے سوچا کہ اور تو کسی طرح پاکستان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، یہاں کی تمام کتابیں ہی سمیٹ کے لے جاؤں۔ کچھ تو پاکستان کا نقصان ہو گا۔ یونیورسٹی کے بعض طلبہ اُس وقت میرے کمرے میں بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے اس فقرے کا لُطف اُٹھایا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس لطیفے کے پسِ پشت وہ تکلیف دہ عنصر ضرور ہے جس نے ہندوستان اور پاکستان کو ابھی تک ایک دوسرے کا سچا پڑوسی ملک نہیں بننے دیا، لیکن اس جُملے میں جو ORIGINALITY تھی، اُس نے مجھے بھی طلبہ کے ساتھ قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا۔

اقبال انٹرنیشنل کانگرس کا آخری پروگرام سیالکوٹ میں مشاعرہ تھا۔ راقم التحریر کی صدارت میں۔ اب صدر بے چارے کے لیے مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ مشاعرے کو درمیان میں چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتا۔ مشاعرہ صبح کے ایک ڈیڑھ بجے ختم ہوا۔ یوں تو میں اقبال انٹرنیشنل کانگرس کا مہمان تھا، لیکن سیالکوٹ میں صحیح معنی میں میرے میزبان ریٹائرڈ کرنل شاد تھے۔ وہاں کی کوکا کولا کمپنی کے مالک۔ مجھ سے ملنے کے لیے سیالکوٹ میں والدِ محترم کے شاگرد امیر عبداللہ خاں روکڑی بھی تشریف لے آئے تھے۔ دوسری صبح مجھے تمام کتابوں کی پیکنگ مکمل کر کے طفیل صاحب کے گھر منتقل ہونا تھا۔ مشاعرے کے بعد چائے کا دور ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد لاہور پہنچ جاؤں۔ اور تھوڑی دیر کے لیے سو لوں۔ اُسی روز دس بجے بیگم عبادت بریلوی کے کالج میں ہم لوگوں کے اعزاز میں ایک اجلاس بھی تھا، لیکن کرنل شاد کے یہاں تاخیر ہو رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ بار بار چائے کا دور کیوں چل رہا ہے۔ آخر صبح چار بجے کرنل شاد نے کہا، کہ آپ تیار ہو جائیے، گاڑی آپ کو لاہور لے جانے کے لیے تیار ہے ـــــ اور مجھے خلوت میں لے جا کے کہا کہ یوں تو میرے پاس اور کئی گاڑیاں اور کئی ڈرائیور موجود ہیں، لیکن میں آپ کو اپنے ایک خاص ڈرائیور کے ساتھ لاہور بھیجنا چاہتا تھا، اور وہ ڈرائیور گوجرانوالہ میں تھا۔ اُسے ٹیلیفون کر کے بُلوایا ہے۔ اس لیے کچھ دیر ہو گئی ہے۔ آپ اس کے ساتھ جائیں گے تو مجھے اطمینان رہے گا۔ یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ یہ میزبانی رسمی میزبانی نہیں ہے۔ جو محض کھانے کی عمدہ دعوت تک محدود ہو بلکہ اس میزبانی میں ایک ایسا سچا خلوص اور سچی محبت شامل ہے جس کی بدولت انسانیت آج بھی زندہ ہے۔ چونکہ رات کا سفر تھا سیالکوٹ سے لاہور تک، اس لیے نہ جانے کرنل شاد کے دل میں کیا کیا گمان گزرے ہوں اور اُنھوں نے سوچا کہ کوئی حقیقی خطرہ نہ ہونے کے باوجود آزاد کے اس سفر کا ایسا انتظام ہونا چاہیے۔ جو ہر طرح کے اندیشے سے پاک ہو۔

آج کرنل شاد ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے ہیں، لیکن میرے دل میں اُن کی یاد ہمیشہ کے لیے زندہ ہے۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔!

گاڑی میں دو شعرا اور بھی تھے۔ انھیں رستے میں اُن کے شہروں میں پہنچایا گیا۔ اُن کے گھروں تک اور میں کوئی سات آٹھ بجے کے قریب ہوٹل انٹرنیشنل میں پہنچا۔ اُس وقت نیند تو آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی، لیکن اپنا اثر یوں چھوڑ گئی کہ بے خوابی کے باعث

سر پھٹ رہا تھا۔ میں نے ابھی بڑی مشکل سے ہاتھ منہ دھویا تھا اور کپڑے بدلے تھے کہ طفیل صاحب، عزیزم پرویز اور جاوید کو ساتھ لے کے آ گئے۔ کتابوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد انھوں نے پرویز سے کہا کہ اب مجھے اور آزاد کو گھر پہنچا آؤ، وہاں آزاد اور میں رُک جائیں گے، ناشتا کریں گے اور تم اس کے بعد بازار سے تین چار بڑے بڑے ٹرنک لوہے کے خرید کے ان تمام کتابوں کو ان میں بھر کے گھر لے آنا۔ طفیل اُس وقت اردو بازار والے مکان میں رہتے تھے۔ مسلم ٹاؤن کا مکان اُن دنوں زیرِ تعمیر تھا۔

اس دن طفیل بہت مصروف تھے۔ شام کو شیزان ہوٹل میں "نقوش" کے اقبال نمبر کی رسم رُونمائی ہونا تھی جس میں لاہور کے قریباً تمام ادیبوں، شاعروں اور دوسرے فن کاروں کے علاوہ باہر سے آئے ہوئے متعدد ڈیلیگیٹ مدعو تھے۔

ناشتے کے بعد میں نے طفیل کو بتایا کہ آج بیگم عبادت بریلوی نے کالج میں چند بیرونی مندوبین کو ایک جلسے میں شرکت ک دعوت دی ہے۔ میں بھی مدعوئین میں شامل ہوں۔ تو دس بجے ہم دونوں وہاں چلیں گے۔ آپ کو بھی دعوت ملی ہوگی۔ طفیل جواب میں تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر بولے دعوت کو تو خیر چھوڑو، ملی ہے یا نہیں ملی ایک ہی بات ہے۔ میں تمھارے جانے انتظام کر دوں گا۔ لیکن خود نہیں جاؤں گا۔ میں سمجھا شاید انھیں بُلاوا نہیں ہے۔ اب میں انھیں مجبور کیوں کروں۔ لیکن کسی طرح ا کی زبان سے نکل ہی گیا کہ عبادت اور اُن کے درمیان کچھ شکر رنجی ہے، اس لیے وہ نہیں جائیں گے۔ میں جان گیا کہ دعو تو انھیں ملی ہے لیکن کترا رہے ہیں۔ اب میں اَڑ گیا کہ آپ کو دعوت تو مسز عبادت بریلوی نے دی ہے اپنے کالج میں آنے کے ل اس دعوت سے ڈاکٹر عبادت بریلوی کا کیا تعلق۔ آپ کو چلنا ہوگا۔ آخر وہ مان گئے۔ مجھے لے کے وہاں پہنچے۔ جلسہ شروع ہوا سرور صاحب نے تقریر کی۔ راقم التحریر نے بھی، پروفیسر رلیف رسل کی تقریر باقی تھی۔ جلسے نے طول کھینچا تو ہم دونوں اجاز لے کے آ گئے، اس لیے کہ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا، اور طفیل شیزان ہوٹل کی دعوت کے انتظام کی طرف تو کرنا چاہتے تھے۔

گھر پہنچے تو انھوں نے کہا کہ اب آپ سو جائیں۔ آپ رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں۔ لیکن میرے لیے بے وقت سونا دشوار ہے۔ میں نے کہا چلیے میں بھی آپ کے ساتھ شیزان ہی چلتا ہوں۔ کہنے لگے اس وقت آپ کے دوستوں میں سے کوئی نہ آیا ہوگا۔ ابھی تو بیرے خانسامے میزیں لگا رہے ہوں گے۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں، بیروں، خانساموں ہی سے باتیں کریں۔ چنانچہ ہم دونوں نے اُن کی موٹر میں شیزان کا رُخ کیا۔ وہاں جاتے ہی میں ایک صوفے پر لیٹ گیا اور طفیل انتظام میں مصر ہو گئے۔

اب میری خوش قسمتی دیکھیے کہ تھوڑی ہی دیر میں (جلسہ شروع ہونے کے، وقت سے بہت قبل) محب گرامی قدر ش عبدالشکور تشریف لے آئے۔ انھوں نے زینے ہی میں سے طفیل کو آواز دی۔ اگرچہ میں یہ آواز تیس برس کے بعد سُن رہا تھا، ا میں نے یہ آواز پہچان لی۔ اور طفیل سے کہا کہ یہ شیخ عبدالشکور کی آواز ہے۔ طفیل نے زینے ہی میں ان کا استقبال کرتے کہا شیخ صاحب آزاد نے آپ کی آواز پہچان لی ہے اور شیخ صاحب ابھی زینے ہی میں تھے کہ انھوں نے وہیں سے میرے گفتگو شروع کر دی ——— پہلا جملہ ان کا اس قدر لبریزِ محبت تھا کہ دل میں اُتر گیا۔ اگر اس جملے کو نقل کرنے سے میری خود ستا

پہلو نہ نکلتا تو ضرور یہاں نقل کرتا۔

"نقوش" کی رسمِ رونمائی کے اس جلسے میں متعدد حضرات نے تقریریں کیں۔ پروفیسر آلِ احمد سرور، الیساندرو بوسانی، ڈاکٹر محمد باقر اور متعدد دوسرے حضرات نے "نقوش" اور "محمد نقوش" دونوں کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ راقم التحریر سے بھی تقریر کی فرمائش ہوئی۔ اگرچہ تقریر فی البدیہہ تھی لیکن چونکہ ٹیپ ریکارڈ ہوئی اس لیے محفوظ رہ گئی اور اس کا متن مجھے لاہور سے ملا تو یہاں ہندوستان کے اکثر اخباروں میں شائع ہوا۔ شاید یہ تقریر "نقوش" میں شائع نہیں ہوئی۔ دراصل یہ تقریر دوسری تقریروں کے ساتھ "نقوش" اقبال (۴) میں شائع ہونا تھی۔ غالباً یہ نمبر ابھی تک چھپا ہی نہیں ہے۔ اس وقت "تعمیرِ حیات" (پندرہ روزہ) لکھنؤ کا ۱۰؍ جون ۱۹۷۸ء کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ اس میں یہ تقریر چھپی ہے اور چونکہ یہ طفیل اور "نقوش" کے ذکر سے معمور ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اسے زیرِ نظر تحریر کا حصہ بنانے میں کوئی حرج نہیں چنانچہ میں اسے یہاں حرف بحرف تعمیرِ حیات سے نقل کر رہا ہوں۔

"نقوش" (اقبال نمبر) کا لاہور میں اجراء
پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تقریر

صدرِ محترم اور معزز خواتین و حضرات!

سینکڑوں سال کے واقعات مل کر تاریخ کا ایک لمحہ بناتے ہیں اور سینکڑوں سال کی تاریخ روایت کے ایک لمحے کو جنم دیتی ہے لیکن اس کلیّے میں مستثنیات بھی ہیں، جیسے دنیائے اردو میں "نقوش" جو اپنے پہلے شمارے کے ساتھ ہی تاریخِ ادب کا ایک حصہ بن گیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک روایت بنتا گیا۔ "نقوش" کے بغیر اردو کی تاریخِ ادب نامکمل ہے ـــ" "نقوش" کے بغیر جرائد کا ذکر ادھورا ہے"۔ آج اس قسم کے جملے ہندوستان میں ہر اس جگہ سننے میں آتے ہیں جہاں اردو کے چار ادیب مل بیٹھتے ہیں۔

پاکستان میں تو ایسی لائبریریاں اور ایسے گھروں کی تعداد بہت ہوگی جہاں "نقوش" کی فائل پہلے شمارے سے تازہ ترین شمارے تک موجود ہو۔ لیکن ہندوستان میں بھی ایسے مرکزوں کی کمی نہیں جہاں آپ "نقوش" کا جو شمارہ چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔ خود اس خاکسار کی ذاتی لائبریری میں ایک مدت تک یہی کیفیت رہی اور جب ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۷ء تک کے قیامِ سرینگر کے دوران میں اس کا پانچ ہزار کتابوں پر مشتمل دہلی کا ذخیرۂ کتب دیمک کی زد میں آیا تو اکثر نادر اور قیمتی کتابوں کے ساتھ "نقوش" کے بھی متعدد شمارے ضائع ہو گئے جن میں "پطرس نمبر"، "شوکت تھانوی نمبر"، "مکاتیب نمبر" اور "لاہور نمبر" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

خیر یہ تو "نقوش" کی ادبی حیثیت کے ایک پہلو کی بات ہے جو میں کہوں یا نہ کہوں، اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ کہنا مجھے اس وقت یہ ہے کہ "نقوش" آج اس منزل سے آگے نکل چکا ہے جب اس کا کوئی خاص شمارہ شائع ہو تو اسے اس کی رسمِ اجرا کی ضرورت محسوس ہو ــــــــ

"نقوش" کے خاص شماروں کی رسمِ اجراء پہلے بھی ادا ہوتی رہی ہے، اور اس کی روداد پڑھ کے

ہمیشہ مجھے یہ خیال آتا رہا ہے کہ میر صاحب کے اس رسمی تعارف کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں اور غالباً "مدیر نقوش" خود اس مصرعے کی معنویت کے قائل ہوں گے۔

لیکن میں آج کی رسمِ اجراء سے بہت خوش ہوں کیونکہ اگر "مدیر نقوش" "محمد طفیل المعروف بہ محمد نقوش" رسمِ اجراء کے بہانے یہ محفل نہ سجاتے تو دنیا بھر سے آئے ہوئے ادیب اور بالخصوص ہندوستان سے آئے ہوئے چار یار سرور جعفری، صباح الدین عبدالرحمٰن اور یہ خاکسار پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں سے اس طرح کیسے مل سکتے جیسے اس محفل میں مل رہے ہیں۔ مجھے تو اس وقت ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کائنات مل گئی ہو۔ اس بہانے کیسے کیسے پرانے یار احباب مل گئے ۔۔ جی چاہتا ہے یہ نشست اسی طرح برسوں تک رہے۔

اور ہاں یاد آیا "نقوش" نے ۱۹۴۸ء سے لے کر اس وقت تک کتنے ہی نمبر نکالے تھے جو جادۂ ادب پر سنگِ میل بھی بنتے چلے گئے اور چراغِ راہ بھی۔ لیکن "اقبال نمبر" نہیں نکالا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ "نقوش" کے کارناموں میں یہ ایک کمی رہ گئی تھی۔ کیا مبارک لمحہ تھا وہ جب محمد طفیل کو اس کمی کا احساس ہوا۔ اور پھر اس کی تلافی کی تو اس شان سے کہ یکے بعد دیگرے تین نمبر نکالے اور اب چوتھا "اقبال نمبر" شائع ہونے والا ہے۔ میں جب اقبال عالمی کانگرس کے کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو ان میں وہ چار ضخیم جلدیں (سائیکلو اسٹائل کیے ہوئے انگریزی اور اُردو مقالات پر مشتمل جو سیمینار میں پڑھے گئے) سب سے وقیع کارنامہ نظر آتا ہے اور عالمی کانگرس سے باہر کے کام پر نظر ڈالتا ہوں تو "نقوش" کے چار "اقبال نمبر" (جن میں سے ایک میں ابھی تک اپنے تصور ہی میں دیکھ رہا ہوں) سب سے زیادہ بلند، سب سے زیادہ بڑا اور سب سے زیادہ باوقار کام نظر آتا ہے۔ اس موقع پر "مدیر نقوش" کی اس ادبی دیانت کی داد دیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ "نیرنگِ خیال" کے "اقبال نمبر" کی اشاعت کو وہ اپنا کارنامہ قرار نہیں دے رہے ہیں۔ اور "نقوش" کے "اقبال نمبروں" کی مجموعی تعداد کو چار نہیں بلکہ تین بتا رہے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۲ء میں "نیرنگِ خیال" کے اقبال نمبر کا شائع ہونا ایک معجزہ نہیں تھا۔ آج اس لعلِ گم شدہ کو ماضی کی گہرائیوں سے باہر نکال کے لے آنا اور اُسے اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ جوہریانِ ادب کے سامنے پیش کرنا ایک معجزہ ہے۔

ہماری دنیائے اُردو ایسے معجزوں سے آشنا نہیں ہے۔ اس لیے میرے نزدیک "نقوش" کے اقبال نمبروں کی تعداد تین نہیں بلکہ چار ہے جس کے لیے میں سارے ہندوستان کی طرف سے "مدیر نقوش" اور ان کے رفقائے کار کو مبارکباد دیتا ہوں اور یہ بھی توقع رکھتا ہوں کہ "نقوش" کے اقبالؒ نمبروں کا یہ سلسلہ نمبر چار (یا بقول طفیل نمبر ۳) کے بعد بھی ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ اقبالؒ پر صحیح معنی میں کام تو اب شروع ہوا ہے۔

میں نے طفیل کے گھر کوئی تین چار روز قیام کیا اور اس کے بعد دہلی روانہ ہو آیا۔ اگرچہ صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی

پیش کش موجود تھی کہ اگر میں عیسیٰ خیل اور میانوالی جانا چاہوں تو وہ مجھے طیارے سے بھجوا دیں گے اور میرے یہ کہنے پر کہ جنرل صاحب ابھی تک میرے گاؤں عیسیٰ خیل میں تو شاید ایئرپورٹ ہی نہ بنا ہو تو جنرل صاحب نے فرمایا تھا کہ آپ جانا چاہیں تو میں آپ کو ہیلی کاپٹر سے بھجوا دوں گا۔ لیکن اس وقت عیسیٰ خیل اور میانوالی کا دانہ پانی مقدر میں نہ تھا۔ یہ صورت تین برس بعد ۱۹۸۱ء میں پیدا ہوئی۔

رات کو علی گڑھ کے ایک سابق طالب علم جناب صابری کسٹم آفیسر کے ہاں ڈنر تھا۔ اب صورت یہ تھی کہ رات بھر کا جاگا ہوا میں تھا، لیکن مجھ سے زیادہ طفیل تھک گئے تھے۔ چنانچہ وہ مجھے اس ڈنر میں پہنچا کے واپس چلے گئے۔

اس سفر میں مجھے بعض کتابوں کی تلاش تھی جو میرے پاس نہیں تھیں۔ ایک مکتوباتِ اقبال (نذیر نیازی) اور دوسری THE RECONST RUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM کا اُردو ترجمہ (تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ) یہ ترجمہ بھی سید نذیر نیازی کا ہی کیا ہوا ہے۔ طفیل کہنے لگے یہ کتابیں تو اب شاید نہ مل سکیں۔ آؤٹ آف پرنٹ ہیں۔ اس کے باوجود انھوں اِدھر اُدھر ٹیلیفون کیا اور جاوید کو بھیجا، لیکن یہ کتابیں دستیاب نہ ہو سکیں۔ آخر کہنے لگے یار اب میں اپنے دل پر پتھر رکھ کے "مکتوباتِ اقبال" کا اپنا ذاتی نسخہ تمھیں دیتا ہوں۔ میں نے اُوپر اُوپر سے کہا نہیں اپنا ذاتی نسخہ تو تمھیں اپنے پاس محفوظ رکھنا چاہیے۔ نادر کتاب ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن خواہش میری یہی تھی کہ طفیل اپنا نسخہ مجھے دے دیں اور جب انھوں نے برضا و رغبت "مکتوباتِ اقبال" کی اپنی ذاتی جلد مجھے دے دی تو میں نے جھوٹ موٹ تکلف کی باتیں کیں۔ طفیل بھانپ گئے۔ کہنے لگے۔ اب بیکار باتیں نہ کرو۔ دل میں تو خوش ہو کہ یہ نادر کتاب مل گئی۔ اب خواہ مخواہ کی باتیں بنا رہے ہو اور حقیقت بھی یہی تھی۔

اتفاق کی بات ہے کہ روانگی سے ایک روز قبل جب میں برادرم احمد ندیم قاسمی سے ملنے گیا اور انھوں نے بزمِ اقبال اور ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی کتابوں سے نوازا تو میں نے "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کا ذکر کیا کہ تلاشِ بسیار کے باوجود کہیں سے نہیں ملی۔ کیا کیا جائے تو ان کا جواب بھی وہی تھا۔ کہنے لگے یہ کتاب تو OUT OF PRINT کہیں نہیں ملے گی۔ میرے پاس اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ وہ میں آپ کو دے دیتا، لیکن اس کی جلد اتنی خراب اور بوسیدہ ہو چکی ہے کہ کتاب کسی دوست کو دینے کے قابل نہیں رہی۔ میں نے کہا قاسمی صاحب۔ اگر آپ کے پاس اس نایاب کتاب کی ایک ہی جلد ہے تو میں اس کا مطالبہ تو نہیں کروں گا۔ کیونکہ آپ کو اس کی ضرورت ہو گی۔ لیکن اگر میرے اور اس کے رستے میں صرف جلد کی خرابی حائل ہے تو میں جلد کے بغیر بھی بصد شکریہ قبول کرنے کو تیار ہوں۔ قاسمی صاحب ہنس پڑے۔ انھوں نے کتاب نکال کے مجھے عنایت کر دی۔ جلد اس کی بے شک نئی نہیں تھی، لیکن کوئی ایسی خرابی بھی نہیں تھی۔ اب اس بات کو دس سال ہونے کو آئے ہیں اور یہ اُسی جلد کے ساتھ میرے پاس موجود ہے۔

اگلے دن میری روانگی کا پروگرام تھا۔ اقبال عالمی کانگرس (پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے) ریاض صاحب گاڑی لے کے آئے۔ لیکن کتابوں کے بکس دیکھ کے حیران رہ گئے۔ فوراً واپس تشریف لے گئے اور تھوڑی دیر میں ایک بہت بڑی وین لے کے آ گئے۔ اُس وین میں کتابوں کے گیارہ بکس (لوہے کے بڑے بڑے ٹرنک اور گتے کے بڑے بڑے ڈبے) رکھے گئے۔ طفیل صاحب

کی گاڑی میں ہم چار دوست بیٹھے۔ تین چار گاڑیاں اور تھیں جن میں دوسرے احباب تھے۔ بلوچستان کے ایک مہمان شاعر جن کا نام میں بدقسمتی سے بھول گیا ہوں۔ پروفیسر صابری تبریزی (اسکاٹ لینڈ) اور دوسرے احباب اور اس طرح یہ قافلہ واگہ کو روانہ ہوا۔ روانگی سے قبل بھابی (بیگم طفیل) نے میری بیوی کے لیے تحائف دیئے اور میں نہ جانے کتنی محبت بھری یادیں لے کے لاہور سے رخصت ہوا۔

(۹)

سنہ ۸۳ء میں پاکستان میں جانے کا اتفاق تین بار ہوا۔ پہلے تو کراچی میں انجمن سادات امروہہ کا مشاعرہ تھا، پھر میری کتاب IQBAL ! MIND AND ART کی لاہور میں رسم رونمائی۔ پھر دو تین ماہ بعد لاہور میں دوسری اقبال انٹرنیشنل کانگرس منعقد ہوئی۔ مشاعرے کے لیے میں کراچی جانے کے لیے لاہور سے گزرا۔ (اپنے محترم دوست نوابزادہ خان عبدالغفور خان صاحب کے یہاں قیام کرنے کے بعد) تو طفیل لاہور میں نہیں تھے کوئٹہ گئے ہوئے تھے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ بزم سادات امروہہ کے مشاعرے کے بعد جب میں جبیس ہوٹل سے منتقل ہو کر پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد کے یہاں اُٹھ آیا تو طفیل کوئٹہ سے واپسی پر اسی جبیس ہوٹل میں آ کے مقیم ہوئے۔ مجھے پتا چلا کہ ہوٹل سے میری روانگی سے تھوڑی دیر بعد طفیل صاحب اُس ہوٹل میں آ کر قیام پذیر ہوئے۔ چنانچہ میں پروفیسر حمید الدین شاہد کے ساتھ انھی قدموں واپس اُن سے ملنے کے لیے گیا۔ میں نے کہا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ یہیں آ کے قیام کرنے والے ہیں تو میں یہاں سے منتقل ہی نہ ہوتا۔ میں تو اس لیے منتقل ہوا کہ یہاں اکیلا رہ گیا تھا۔ تمام دوست احباب چلے گئے تھے۔ انہوں نے بہت کہا کہ اب پھر واپس آ جاؤ۔ پرسوں اکٹھے لاہور چلیں گے اور وہاں سے تم دلی چلے جانا۔ لیکن میں دوسرے روز ہی لاہور روانہ ہو رہا تھا اور اس طرح بار بار انتقالِ مکانی مجھ ایسے کاہل آدمی کے لیے آسان بھی نہیں تھا۔

اقبال عالمی کانگرس میں پھر طفیل سے ملاقات ہوئی۔ سرور صاحب، بیگم سرور اور میں، ہم اُن سے ملنے اُن کے اُردو بازار والے دفتر گئے۔ ہم تینوں کے ساتھ وہ تپاک سے ملے۔ اگرچہ کچھ مدت سے میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کم گو ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ دوسرے دن انھوں نے سرور صاحب اور راقم خاکسار کی دعوت کی۔ اپنے نئے مکان میں۔ وہاں احباب لاہور سے ملاقاتیں ہوئیں اور بہت دیر تک یہ محفل جمی رہی۔

آخری ملاقات اسی سال کے شروع میں ہوئی۔ لاہور میں ہندوستان کے اُردو ادیبوں اور شاعروں کا ڈیلیگیشن راولپنڈی سے لاہور پہنچا تو ایئرپورٹ پر تشریف لانے والے احباب میں طفیل بھی موجود تھے۔ یہ ملاقات خاصی مختصر رہی۔ اس کے بعد ہم لوگ دو روز لاہور میں رہے لیکن طفیل سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اصل میں یہ سفر تو "رشتہ در گردنم افگندہ دوست" والا معاملہ تھا۔ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز نے پروگرام ایسا کھچا کھچ اور بھرپور بنایا کہ ہم لوگوں کو اپنا ہوش بھی نہ رہا۔ اور بارہ، سے بعد سفرِ پاکستان کے بعد میں دلی پہنچا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی خواب ٹوٹ گیا ہو۔ بہ قولِ جگر

دیکھا تھا کبھی خواب سا معلوم نہیں کیا اب بھی اثرِ خواب ہے معلوم نہیں کیا

(۱۰)

یہاں اگرچہ اس ذکر کی ضرورت نہیں لیکن بیان کرنے میں حرج بھی کوئی نہیں کہ اگرچہ طفیل صاحب مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ پبلشر بھی تھے اور میں صرف مصنف لیکن مجھ میں ان میں تجارتی تعلقات کبھی نہیں رہے۔ مجموعہ کلام والی بات ذہنی مذاق میں ختم ہوگئی تھی۔ ہاں جب میں نے "اقبالؒ اور مغربی مفکرین" لکھی تو میری خواہش تھی کہ یہ لاہور سے بھی چھپے۔ میں نے طفیل کو اس سلسلے میں خط لکھا، لیکن فوراً ہی جنگ شروع ہوگئی اور خط وکتابت کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ہاں لندن کے راستے خط آجاسکتے تھے لیکن یہ ایک طولِ اَمل والا معاملہ تھا۔ طفیل نے مجھے براستہ لندن خط لکھا کہ ساری کتاب کا مسودہ بہ یک وقت (مختلف حصوں میں نہیں) مجھے بھجوا دیجیے میں انھیں چھوٹے چھوٹے لفافوں میں کتاب کا ایک ایک باب بھیجنا چاہتا تھا معلوم نہیں کیوں۔ اب یاد نہیں آرہا، لیکن اُس وقت میرے لیے سارا مسودہ انھیں بیک وقت بھیجنا بہت مشکل نظر آیا۔ حالانکہ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ آخر اس میں کیا مشکل تھی۔ بہرطور، یہ مسودہ اُن تک نہ پہنچ سکا۔ اور بارہ برس تک دونوں ملکوں کے درمیان ڈاک اور خط وکتابت کی جو حالت رہی اُس سے وہ لوگ بخوبی واقف ہیں جو اس مشکل سے گزرے ہیں۔

(۱۱)

یہ ڈاک والے حالات بارہ برس بعد کہیں آکے سدھرے۔ اور سب سے پہلے طفیل صاحب کا جو خط مجھے ملا وہ ایک خوبصورت عید کارڈ تھا جس میں اُن کے قلم سے کچھ اس طرح کا جملہ درج تھا ــــ .... میں تو اس مدت میں بہت اُداس رہا (یہ عید کارڈ اس جملے سمیت کاغذات میں محفوظ رکھا ہے لیکن اس وقت سامنے نہیں ہے۔)

اب میں کیا بتاؤں کہ اس جملے نے مجھے کس قدر متاثر کیا۔ بہرطور، اس خط کا جواب جو میں نے دیا وہ یہاں نقل کر رہا ہوں اور اسی پر میری یہ تحریر ختم ہو رہی ہے اس مصرعے کے ساتھ کہ ؏ :

تمھاری نیکیاں زندہ، تمھاری خوبیاں باقی

اب خط کا جواب ملاحظہ کیجیے :

تین برس کی طویل مدت کے بعد لاہور سے طفیل کا خط اور عید کارڈ ملنے پر

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے   (غالب)

یہ پھر راوی کے ساحل سے مبارک بادِ عید آئی   کہ یا اُجڑے گلستاں کو بہاروں کی نوید آئی
مبارک باد کا پیغام خود دیوانہ وار آیا   مگر بن کر مری بیتابیِ جاں کا قرار آیا
طفیل اک حرف میں تیرے عجب اک سوزِ پنہاں تھا   کہ میری ظلمتِ شب میں چراغاں ہی چراغاں تھا
گزشتہ دور اُبھرا اس طرح چشمِ تماشا میں   تصور لے گیا مجھ کو مری یادوں کی دنیا میں
نگاہوں نے تجھے اس طرح اپنے روبرو پایا   کہ لب پہ شعر یہ بے ساختہ اقبالؒ کا آیا

بیا ساقی! نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد، نگار آمد، قرار آمد
بہ قیدِ ہوش ہے پیارے مرا دیوانہ پن اب تک   کہ تیری یاد سے خلوت میں ہوں اک انجمن اب تک
خدا جانے سبب اس کا ہے سناٹا کہ ویرانی   مرے صحرائے دل پر رشک کرتا ہے چمن اب تک
کسی کو کیا بتاؤں میرے دل پر کیا گزرتی ہے   سنا ہے یاد کرتا ہے مجھے میرا وطن اب تک
سنا ہے آج بھی راوی مجھے آواز دیتا ہے   چھپا پائے نہیں اس راز کو گنگ و جمن اب تک
دکن جا کر بھی اک لاہور یاد آتا رہا مجھ کو   مٹا پائی نہیں اس یاد کو ارضِ دکن اب تک
میرے دل میں ابھی آباد ہیں وہ یار، یارانے
"پریشاں جلوہ چوں ماہتاب اندر بیابانے"
میں اکثر سوچتا ہوں دشت کی وسعت کہاں تک ہے   سنا یہ ہے کہ میری زندگی کے امتحاں تک ہے
سماتا کس طرح الفاظ میں سوزِ دروں میرا   جو دنیا کی زبانوں تک ہے میرے استخواں تک ہے
یقیں کا اور گماں کا فرقِ باطل مٹ چکا پیارے!   کہ اب میرا یقیں باقی فقط میرے گماں تک ہے
مرے احباب یا اغیار شاید سوچتے ہوں گے   کہ میرا دردِ پنہاں میرے اندازِ بیاں تک ہے
پھر اس کے بعد اس کی جستجو بے کار شے ہو گی   متاعِ درد کا سودا ہے بازارِ جہاں تک ہے
"دریں حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم
زفیضِ دل طپیدن کے خروشِ بے نفس دارم"

م۔ط۔ شخصیت و کردار (خطوط کے آئینہ میں)

ڈاکٹر نثار احمد

دنیا میں انسانوں کا شمار نہیں۔ بظاہر انسان سب ایک جیسے ہوتے ہیں سب کا خمیر ایک، ایک سا ڈھانچہ، ایک سی فطرت۔ ایک جبلت، ایک ہیولا، ایک سا خاکہ، شکل و صورت بھی تقریباً یکساں، بس کوئی ذرا ایسا کوئی ذرا ویسا۔ ہاں البتہ کچھ آدمی، کچھ اشخاص ایسے بھی ہوتے ہیں جو ظاہری خد و خال میں دوسروں کی طرح ہوتے ہوئے بھی دوسروں سے الگ، دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور مختلف اس لیے ہوتے ہیں کہ اُن کے "اندر کا آدمی" دوسرا ہوتا ہے، اُن کا باطن جدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو تلاش کر لیتے ہیں۔ اور اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اپنا آئینہ خود دیکھ سکیں۔ ایسے لوگ زیادہ نہیں ہوتے مگر ہوتے ہیں "یادگارِ زمانہ"۔ اُن کو یاد نہیں کیا جاتا، وہ خود بخود یاد آتے ہیں اور پردۂ شعور پہ مسلسل جگمگاتے رہتے ہیں۔ طفیل صاحب کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جن کو یاد کیا نہیں جاتا بلکہ وہ خود بخود یاد آتے ہیں اور اب بھی یاد آ رہے ہیں۔!!

میرے ان کے درمیان تعلقات کی "کہانی" بہت لمبی چوڑی نہیں، پر کبھی لمبی بے مزہ کہانی سے زیادہ لطف چھوٹی سی حکایت میں آتا ہے۔ چار سال[1] بھلا کیا ہوتے ہیں؟ مگر نہیں، یادیں تو چار لمحوں کی بات ہوتی ہیں۔ بلکہ کبھی تو ایک لمحہ بھی "عرصۂ دراز" کا بدل بن جاتا ہے۔

م۔ط کا نام برسوں پہلے سے سُن رکھا تھا۔ ہم نے کیا، سُنا۔ اُردو زبان، ادب و انشا، صحافت اور ادبی رجحانات سے معمولی دلچسپی رکھنے والا کون سا شخص ایسا ہے جو اس سے واقف نہ ہوگا۔ وہ فاتحِ زمانہ جس کے "نقوش" کی ۳۰، ۳۵ سال سے دھوم ہے۔ جس نے اپنی علمی ادبی "فتوحات" سے بڑے بڑے کشور کشانِ ادب کو گوشہ نشین بنا دیا۔ جس کے "نمبروں"[2] نے علم و آگہی کے خزانے بکھیرے، اُس سے بہرحال واجبی سی "واقفیت" مجھے بھی تھی۔ کچھ نمبروں کو دیکھا تھا، پڑھا تھا، کچھ پاس بھی تھے، مگر "محمد نقوش"[3] سے سابقہ کبھی پیش نہ آیا تھا۔ آتا بھی کیسے؛ میرا راستہ الگ تھا اور اُن کا راستہ الگ۔ ہاں جب وہ راستہ بدل کے "میری گلی" میں نکل آئے تو پھر

---

[1] برادرِ مرحوم طفیل صاحب کا میرے نام جو پہلا خط آیا وہ ۲۷ر مارچ ۱۹۸۳ء کا لکھا ہوا تھا اور آخری خط ۱۴ر جون ۱۹۸۶ء کا لکھا ہوا انتقال سے کوئی دو ہفتہ پہلے ملا۔ بسم اللہ انھوں نے کی اور اس دوران کُل ۲۹ خطوط لکھے۔ میرے جوابی خطوط کی تعداد بھی ۲۹ ہے۔ یادوں کا یہ سرمایہ میرے پاس محفوظ ہے۔

[2] "نقوش" کے یادگار نمبر بہت سے نکلے، ان کی صحیح تعداد مجھے بھی نہیں معلوم۔ نمایاں ترین غزل نمبر، افسانہ نمبر، بیاضِ غالب نمبر، خطوط نمبر، ادبی معرکے نمبر، انیس نمبر، میر نمبر، اقبال نمبر، منٹو نمبر، لاہور نمبر، آپ بیتی نمبر وغیرہ، لیکن سب کا سرتاج "رسول نمبر" ہے۔

[3] بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کا عطا کردہ نام۔

ایک دن ایسا ہوا کہ کشفی بھائی[1] ہم دونوں کے درمیان واسطہ بن گئے۔ یہ بھی اچانک ہوا۔ مجھے پتا نہ چلا کہ کشفی بھائی کب ہندوستان گئے جاتے جاتے لاہور میں م۔ط سے کیا کہہ گئے۔ انکشاف اس وقت ہوا جب طفیل صاحب کا پہلا رقعہ میرے نام یوں آیا:

"محترم! سلام مسنون!

مجھے محبی ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے بتایا کہ آپ نے "عہد نبوی میں ریاست کا نشو و ارتقا" کے عنوان سے مقالہ لکھا ہے اور انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مقالہ ڈاکٹر حمید اللہ کے معیار سے بڑھ کر ہے[2]۔ یہ سب کچھ سن کر بہت خوشی ہوئی۔

"ہم نے رسولؐ نمبر کی چار جلدیں پیش کی ہیں۔ باقی چھ اس سال مکمل کرنے کی دھن ہے۔ اگر آپ اپنا قیمتی مقالہ (خواہ کتنا بھی طویل) نقوش کے لیے عنایت فرمائیں گے۔ تو وہ نقوش کی بھی اہمیت کو بڑھائے گا۔ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کر سکیں گے۔ وہ کہیں: کیا ایسا ممکن ہے؟ براہ کرم جواب عنایت فرمائیے گا تاکہ یکسوئی ہو[3]۔"

یہ تھی "چنگاری" جو "شعلہ" بنی اور پھر اس کی تپش "دونوں کو برابر گرماتی" رہی۔

ہمارا پہلا تعارف گویا رسمی سا تھا لیکن "یہ حوالہ" کی برکت تھی یا اُن کا "جذبِ دروں" کہ آٹھ مہینے بھی نہ گذرے! یہ "دل کا معاملہ" بن گیا اور دل پہ اختیار کسے ہے؟ آغاز ہوا تو تخاطب تھا "محترم! پھر محب مکرم، محبی، محب گرامی کے تکلفات سے نکل کر "برادرم" بھائی جان، بندہ نواز ہو گیا، اور جو مقابل آئینہ تھا، اس نے لکھا — مکرم و محترم، برادر محترم، برادر معظم! صاحب ذرہ نواز، پھر اس سے بھی دل نہ بھرا تو — برادرم، عزیزم، حبیبم!!

م۔ط کم گو، کم آمیز تو تھے ہی، تحریر میں بھی یہی شان رکھی۔ "مختصر نویسی" میں انھیں کمال حاصل تھا۔ یہ ان پر سجتا بھی تھا اور یہ اسلوب کا حسن، ادب کا اعجاز۔ مگر "معاملاتِ دل" سے تو ہر حال لگا نہیں کھاتا تھا! اس لیے لکھنے والے نے لکھا:

"آپ کی بے پناہ مصروفیت کا مجھے اندازہ ہے مگر یہ کیا؟ تعلق کی چنگاری کو شعلہ بنایا۔ دل میں اترے اور چل دیے۔ تشنگی دانستہ چھوڑ دیتے ہیں، کہ شوق اور فزوں ہو۔ چار حرف لکھتے ہیں تو تسلی نہیں ہوتی[4]۔"

پھر انھوں نے اپنے "حرفوں" کی تعداد بڑھا دی مگر — "چور چوری سے نہ گیا!" وہ اختصار پہ قائم رہے اور میں تفصیل پر! اس کمی بیشی سے "کیفیت و کم" پر فرق نہ پڑا بلکہ وہ اور سوا ہو گیا۔ یہ بیتابی ہی تو تھی، لکھا:

"میں کراچی آئندہ ماہ حاضری دے رہا ہوں۔ سلام کرنے پہنچوں گا۔ یہ بھی بتاؤں گا کہ بعد ورق گردانی مسودہ کو چوم لیا تھ

---

[1] پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی، حال صدر شعبۂ اُردو، جامعہ کراچی، کراچی۔

[2] برادرِ مکرم ڈاکٹر کشفی صاحب کی اس رائے کی ذمہ داری ان ہی پر ہے۔ وہ بڑے ہیں، جہاندیدہ ہیں۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ البتہ یہ حقیقت ہے ہم جیسے طالب علموں نے تو محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی کتابوں، تحریروں اور مقالوں کو پڑھ کر ہی لکھنا پڑھنا سیکھا ہے۔

[3] بحوالہ خط مرقومہ، ۲۷ مارچ ۱۹۸۳ء (موصولہ ۲ اپریل ۸۳ء)

[4] خط مرقومہ ۱۷ اپریل ۱۹۸۳ء۔ [5] خط مرقومہ ۲۵ اپریل ۸۳ء

——— "میں کراچی آیا تو آپ سے ملے بغیر واپس نہ آؤں گا۔ یہ اشتیاق میرا ہے[1]" پھر واقعی وہ کراچی آ گئے۔ ملے مگر پہلی بار نہیں ہے۔ ایسا لگا جیسے پہلے بھی ملے ہیں، بلکہ برسوں سے آشنائی" ہے۔" اختصار کے بند ٹوٹ گئے۔ باتیں ہی باتیں۔ گھنٹوں، پہروں گزر گئے۔ گھڑی کی ٹک ٹک نے اٹھایا جو آگ لگا کے گئے تھے، اُسے بجھانے کے لیے لکھا:۔

"معلوم ہی نہ ہوا کہ پہلی بار مل رہے ہیں۔ ایسے باتیں کیں کہ جیسے مدتوں کے بچھڑے کرتے ہیں[2]۔"

پھر رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آیا کہ کچھ دنوں کا ناغہ بھی بار بن گیا۔ کچھ دنوں خط پہ خط لکھا مگر جواب نہ آیا تو بے کلی بڑھی، اس لیے کہا گیا۔ "آپ نے چپ چاپ کا روزہ شاید پھر رکھ لیا ہے[3]؟"

جواب آیا ———

"میں دو ماہ پاکستان سے باہر رہا۔ یہ قدم اپنی گرتی ہوئی صحت کے لیے اُٹھایا تھا مگر دوبارہ جانے کی آخری شرط پر واپس آ گیا۔ کیونکہ ایک مرحلہ پر اتنا زیادہ وقت نہیں نکال سکتا تھا۔ یہی سبب ہوا کہ آپ کے خط کا جواب نہ دے سکا۔ خطوط کی بجائے خط کا لفظ میں نے جان بوجھ کر لکھا ہے۔ کچھ لفظی ہیر پھیر تو مجھے بھی آتا ہے[4]۔"

اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ دن گزر گئے میں خط نہ لکھ سکا۔ کچھ بیماری کچھ مصروفیت۔ موقع نہ ملا مگر ان کا پیمانۂ صبر چھلک ہی پڑا۔ صرف اتنا ہی لکھا:

"کیا ڈاکٹروں نے بولنے سے منع کر رکھا ہے[5]۔"

پھر وہ آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ میرے "ذاتی معاملات" میں بھی دخیل ہو گئے۔ اُن کا دل بھی تو ایسا تھا۔ احساس دل! کسی کے پھانس چبھتی تو بے چین وہ ہوتے، کرب وہ محسوس کرتے۔ میری والدہ کا انتقال ہوا۔ یہ حادثہ میرا تھا۔ غم میرا تھا مگر محسوس انھوں نے کیا اور لکھا:

——— والدہ ماجدہ کے انتقال کی اطلاع پا کر بے حد دُکھ ہوا۔ والدہ کیا نعمت ہیں۔ اس کا اندازہ میں بخوبی کر سکتا ہوں، اس لیے کہ میری ذات اور میرا کام، صرف والدہ محترمہ کی دُعاؤں کا نتیجہ ہے۔ ورنہ میں کچھ نہ تھا۔ آپ کو یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ آپ نے والدہ کی خدمت کی۔ کیونکہ وہ کافی عرصہ سے شدید بیمار تھیں۔ یہیں تو یہ موقع بھی نہ ملا۔ میں کتنا بدقسمت ہوں۔ میں تو کام صرف اس وجہ سے کرتا ہوں کہ میرے ماں باپ کا نام عزت

---

[1] خط مرقومہ (مئی ۸۳ء)

[2] خط مرقومہ ۲۸ رجون ۸۳ء

[3] خط مرقومہ ۲۱ رجولائی ۸۴ء

[4] خط مرقومہ ۲۵ رستمبر ۸۴ء

[5] خط مرقومہ ۴ رمارچ ۸۵ء

سے لیا جائے۔ اگر ہم اچھے کام کریں گے، دوسرے اُن کی رُوح کو ثواب پہنچائیں گے تو وہ ہم سے کبھی جُدا نہ ہوں گے۔ وہ سدا ہمارے ساتھ رہیں گے۔ کیا آپ کو یقین نہیں؟[1] "

——— دیکھیے میں ایک بار پھر کہتا ہوں۔ والدہ ماجدہ کی رُوح کو خوش کرنے کے لیے باقی زندگی بیکار نہیں بسر کرنی چاہیے۔ اُمید ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہوگا…… کبھی کبھی خط لکھتے رہیں ورنہ میرا بُرا حال ہو جائیگا۔[2] "

ان کی بے پایاں محبت، ان کی تسلی کا جواب بجز حرفِ سپاس اور کیا تھا۔؟

وقت گذر جاتا ہے، بات رہ جاتی ہے۔ والدہ کے سانحۂ رحلت پر معلوم ہوا کہ کتنے ہی "ہمدرد" دراصل "بے درد" نکلے اور کتنے ہی دعویدارِ غمخواری کھوکھلے ثابت ہوئے بلکہ اس "شہرِ بے مہر" میں، اندازہ یہ ہوا کہ جب تک تعزیت وصول کرنے نہ جائیں کسی کے ہونٹ نہیں ہلتے۔ غمگساری تو دُور کی بات ہے۔[3] !!

——— "آپ درد آشنا تھے سب یہ بازی لے گئے اور آپ کے بروقت محبت نامہ نے بڑی ہمت بڑا حوصلہ بخشا۔ آدمی دھوپ میں چل رہا ہو تو ذرا سا سایہ بھی کتنا بھلا لگتا ہے۔ کیسا سکون دیتا ہے۔[4] "

یہ دُنیا پھر دُنیا ہے۔ دنیاوی معاملات میں اُتار چڑھاؤ ہوتا ہی رہتا ہے۔ مگر انھیں گوارا نہ تھا کہ میرے "معاملات" بگڑ جائیں۔ اس لیے تفتیشِ حال بھی کرتے، مشورہ بھی دیتے اور "ایڑ" بھی لگاتے۔ ایک موقع پر بڑی شفقت سے لکھا:

"یہ صحیح ہے کہ آج کل حق دار کو حق نہیں دیا جاتا، ذرا اپنی روئیداد…… کو تو سنا دیجیے۔ کوئی سبیل نکالیں گے۔ اللہ نے انھیں اچھے کاموں کی توفیق دی ہے۔ میری طرف سے بھی کہیے گا کہ طفیل نامی شخص جھک کر سلام عرض کر رہا ہے اور کچھ کہہ رہا ہے۔[5] "

کچھ ہی دِنوں بعد صورتِ حال کو تاڑ گئے پھر لکھا:

"یقیناً آپ اپنی قناعت پسندی کی وجہ سے…… نہ ملے ہوں گے۔ بے شک اللہ پر بھروسا کرنا چاہیے مگر اللہ نے کچھ باتیں بندوں پر بھی چھوڑ دی ہیں۔[6] "

بات ذرا لمبی ہو گئی مگر اس پر میرا کیا اختیار؟ یادوں کے دوش پر نہ جانے کہاں نکل گئے۔ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ مختصراً کہنا یہ تھا کہ ہمارے اُن کے تعلقات کی دنیا "رسول نمبر" کے سائے میں آباد ہوئی، شاداب ہوئی اگر وہ "رسول نمبر" نہ نکالتے تو شاید ہم سے بھی ملاقات نہ ہوتی۔!

---

[1] خط مرقومہ ۱؍اپریل ۸۵ء (میری والدہ صاحبہ کا انتقال ۱۱؍اپریل ۱۹۸۵ء کو ہوا، اور ان کا خط پہلے ہفتہ ہی میں آگیا)

[2] خط مرقومہ ۲۸؍اپریل ۸۵ء

[3] خط مرقومہ ۳۰؍اپریل ۸۵ء۔

[4] خط مرقومہ ۳۰؍اپریل ۸۵ء

[5] خط مرقومہ ۲۳؍جولائی ۸۵ء،

[6] خط مرقومہ ۱۰؍اگست ۱۹۸۵ء۔

اُس زمانہ میں انھیں نقوش کے "رسولؐ نمبر" کے سوا کسی چیز کا ہوش نہ تھا، اُن کی ساری دلچسپیاں، اُن کے ظاہر و باطن کا ارتکاز، ان کا اوّل، ان کا آخر "رسولؐ نمبر" ہی تھا۔ وہ اس کی خاطر سب کچھ کرنے، لینے دینے کو تیار تھے۔ ہر حد سے گزر جانا چاہتے تھے۔ اور اس سلسلے میں اُنھیں چھوٹے بڑے، معروف مجہول، بلند پست، کسی کی پروا نہ تھی اور حسبِ ضرورت منت خوشامد، ترغیب، تحریص، مطالبہ، تقاضہ، ڈانٹ ڈپٹ، دھمکی، معذرت کسی سے عار نہ تھی۔ شاید اسی لیے وہ اس "حقیر فقیر" تک بھی پہنچ گئے۔ اور بڑے مترنم لہجے میں یہ لکھا۔ بھی کیا، کیا کیا نہ لکھا:

—— "میرا دل یہ چاہتا ہے کہ مجھے آپ کا قلمی تعاون حاصل ہو اور حاصل رہے تاکہ سیرت کے موضوع پر ایک کارنامہ انجام دیا جا سکے۔ جسے اس موضوع پر انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکے[1]۔"

—— "گرامی نامہ ملا، مضامین ملے۔ آپ کا کرم، برادرم کشفی صاحب کا احسان کہ آپ سے تعارف کرایا۔ آپ نے مجھے مرعوب کر دیا۔ ایسا میری زندگی میں کم ہوا تھا[2]۔"

—— "میں آپ کی صلاحیتوں کا معترف ہو گیا۔ چاہیں تو پکّے کاغذ پر لکھ دوں، خدا مجھے اور آپ کو خوش رکھے[3]۔"

—— "اگر ممکن ہو تو سیرت کے کسی اہم موضوع پر کوئی اور چیز بھی لکھ ڈالیں۔ میں آپ کو تنگ اس لیے بھی کرتا رہوں گا کہ آپ اتنے باصلاحیت کیوں ہیں، لہٰذا سزا بھگتیں[4]۔"

—— "اسی طرح اپنے قلم کو بھی حرکت دیجیے۔ دو تین مضامین بھیج دیجیے۔ اگر آپ کے مضامین انھی دنوں نہ پہنچے تو ......

بہر حال میں نے سب حال لکھ دیا ہے۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میں آپ کو بار بار یاد دہانیاں نہ کراؤں گا۔ کیونکہ کام سمیٹنے میں لگ گیا ہوں[5]۔"

—— "میں آپ سے نہ ملتا تو اچھا ہوتا۔ غالباً نہ رُعب میں کام کرتے۔ عاشقانِ رسولؐ کا میلا ہوتا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ منت سماجت سب بیکار رہے[6]۔"

---

[1] خط موصولہ ۳ / اپریل ۱۹۸۳ء

[2] خط مرقومہ ۱۰ / اپریل ۱۹۸۳ء

[3] خط مرقومہ ۲۵ / اپریل ۸۳ء

[4] خط موصولہ جون ۸۳ء

[5] خط مرقومہ ۳۱ / جولائی ۱۹۸۳ء

[6] خط مرقومہ ۱۱ / ستمبر ۸۳ء

"آپ سے کُٹی۔ وہ بھی پکّی"[1]

چند لفظوں، چند حرفوں میں، انھوں نے جو کچھ کہا، جو کچھ لکھا، اس کے ادبی محاسن پر، تو ادب والے، نقد والے غور کریں، پر بین السطور جو سیلِ جذبات رواں دواں ہے۔ اُسے تو ہم آپ دونوں دیکھ سکتے ہیں نا!

تعلقات کی یہ نوعیت جو مجھ سے تھی اور نہ جانے کتنوں سے ہوگی کہ ہر ایک ان کا گرویدہ تھا اور ہر شیدا و متوالا یہی سمجھتا تھا کہ سب سے بڑا "طفیلی" وہی ہے۔ بہرطور اُن کے چاہنے والوں کی صحیح تعداد شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔

ان کا کمال یہ دیکھیے کہ بادی النظر میں تو وہ ایک زندگی آموز، زندگی آمیز ادبی پرچے کے لیے محض ایک مضمون کا "خشک تقا کرتے تھے، لیکن پھر اسی خشک کو "تر" بنا دیتے۔ پھر اُسے سمندر کی گہرائی عطا کر کے رگِ جاں سے ہم آہنگ کرتے۔ رشتوں کو نبھا وضعداری قائم رکھتے اور اپنی "تمنائے مختصر" کی "تمہید طولانی" کہنے کے لیے چمن چمن سے نکہتوں کو جمع کرکے "جشنِ بہاراں" کا اہتما کرتے، خود بھی خوش ہوتے اور دوسروں کو بھی خوش کرتے۔

جہاں تک میں نے دیکھا، میں نے جانا، طفیل صاحب کی شخصیت کا مناسب ترین مرکزی حوالہ "عشقِ رسول" ہی تھا۔ ا کے اندر "مذہبیت" بڑی گہرائی میں اُتری ہوئی تھی، جسے انھوں نے لاکھ چھپانا چاہا مگر بالآخر چھپ نہ سکی۔ دیکھیے نا، پیرہن تبدیلی سے "سبوئے جاں" کی ماہیت کیسے بدل جاتی ہے! ہو سکتا ہے کچھ لوگوں کے ذہن میں اُن کی تصویر مختلف ہو اور وہ تیس سال والے "محمد طفیل" کو جانتے ہوں اور ممکن ہے کہ "کتابت سے ادارت" تک کا سفر طے کرتے ہوئے جن لوگوں نے انھ دیکھا ہے اور جو ان کی روایت پرستی، ترقی پسندی اور جدیدیت کے رجحانات سے واقف ہیں انکار کر دیں اور "نہ جام" کسی "دُرد" کو تلاش کریں، مگر میرا تاثر بالکل مختلف ہے۔ میرے نزدیک "جذبِ اندروں" اور "تڑپ" کے بغیر، جذبوں کی صداقت بغیر بارگاہِ رحمۃ للعالمین میں ایسی "سوغات" پیش نہیں کی جا سکتی تھی اور نہ ایسا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جا سکتا تھا۔ آرز تمنائیں رکھنے والے الگ ہوتے ہیں اور محض شہرت و دولت چاہنے والے اور۔ رسول نمبر کے لیے سارا انتظام، سارا اہتمام ان کا "سف تھا اور تمام تر دلچسپیاں بس مشامِ جاں کو معطر کرنے کے لیے تھیں، نذر کے لیے تھیں۔ وہ خود بھی اپنی زندگی کا "ماحصل" اسے گردانتے تھے اور یہ ان کے "نقوش" سے، ان کے "صحیفۂ دل" کی "سطر سطر" سے عیاں ہے:-

——— "میری گنہ گاری اپنی جگہ، توفیقِ ایزدی اپنی جگہ، مگر سوال یہ ہے، کہ میرے اس سفرِ شوق کا حال کچھ میرے رسولؐ کو بھی معلوم ہے؟ میں حاضر ہوں یا رسول اللہؐ!"[2]

——— "جب وہ نمبر شائع ہوا[3] تو دنیا بھر سے توصیفی خطوط آئے اور مجھے باور کرایا گیا کہ اس سے بہتر پرچ

---

[1] خط مرقومہ ۲۰ ر اکتوبر ۸۳ء

[2] "طلوع" — جلد اوّل (رسولؐ نمبر)

[3] یعنی "آپ بیتی نمبر" ۱۹۶۴ء

چھپانا ناممکن ہے۔ مگر میرے دل میں کوئی اور ہی "ارمان" تھا۔ کوئی اور ہی تھا۔ آج ۱۹۸۲ء[1] میں پورے اٹھارہ برس کے بعد اپنی محنت کے اعتبار سے، اپنی لگن کے اعتبار سے وہ "حاصلِ زندگی نمبر" پیش کر رہا ہوں کہ جو میرا "منتہا" تھا[2]۔

"آج میری وہ آرزو پوری ہوئی جس کے لیے برسوں بے کل رہا[3]۔"

"بچپن کی بات کہ جب میرے دینیات کے اُستاد نے کہا: "ہمارے رسولؐ دنیا کی ایسی ہستی تھے کہ ان میں ہر خوبی موجود تھی"۔ یہ بات ذہن میں جم کر رہ گئی تھی...... بچپن کی اس ذات نے میرا پیچھا زندگی بھر نہ چھوڑا۔ تحت الشعور کی بات "رسولؐ نمبر" میں چھلک پڑی[4]۔"

"آج جب میں سیرتِ رسولؐ کے مطالعہ سے گذر رہا ہوں۔ دنیا کی ساری آسائشیں میری گود میں ہیں، پھر بھی میرا دل چاہتا ہے کہ کاش میں حضورؐ کے زمانہ میں ہوتا۔ میرا شمار بھی "اصحابِ صُفّہ" میں ہوتا[5]۔"

"کسی طرح اور کسی کے فیض سے سیرت کے موضوع پر "دس" جلدیں مکمل ہوگئیں۔ یہ وہ خواب تھا جو میں نے دیکھا، زندگی بھر دیکھا تھا۔ خواب سب دیکھتے ہیں، تعبیر کوئی کوئی دیکھتا ہے...... غرض جس "عبادت" کی ابتدا تینیس برس پہلے کی تھی وہ ایک "بڑے کام" کے لیے بطور "مشق" کام آئی[6]۔"

"میں پہلے ادب کی چوکھٹ پر کھڑا تھا۔ اب حضورؐ کی بارگاہ میں ہوں۔

...... ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کا ایک شعر......

وبحق جاھك انّنی بك مغرم
واللّٰه یعلم انّنی اھواك

(مجھے آپ کی عزت و عظمت کی قسم! میں آپ سے بے پناہ محبت رکھتا ہوں اور اللہ میری اس والہانہ محبت کا گواہ ہے)"

دعویٰ کرنے والے دعویٰ کرتے ہیں۔ میرا دعویٰ کوئی نہیں۔ میں تو صرف "عاشقانِ رسولؐ" کی صف

---

[1] رسولؐ نمبر کی کتابت کا آغاز ۱۹۷۲ء میں ہوا تھا۔

[2] طلوع ــــ جلد چہارم

[3] ایضاً

[4] جلد ششم (اس شمارے میں)

[5] طلوع ــــ جلد ہشتم

[6] جلد دہم ــــ عجز و تشکر ص ۷۵۶

میں کھڑا ہونا چاہتا ہوں وہ بھی سب سے آخر میں۔!"

آدمی جب کسی میں "اتنا ڈوب جائے تو خود اُسے کہاں کا ہوش رہتا ہے؟ مگر شاید یہ کوتاہ ظرفوں کا معاملہ ہو جو رَج کے پی لیں وہ ایسے ہوش مند ہو جاتے ہیں کہ "گرتوں کو تھام" لیتے ہیں۔ انھیں دیکھیے مضامین کا تقاضا بھی انتخاب بھی، خطوط اور خطوط کا جواب بھی، کاروبار کی دیکھ بھال بھی، بال بچوں، پوتی پوتوں کی خبرگیری، دوا دارو بھی، کتابت کی نگرانی، ڈاک بلٹی پارسل کی ہدایت بھی۔ مگر کیا مجال کہ "چمن بندی" سے غافل ہو جائیں۔ یا خوب سے خوب تر کی تلاش میں نہ رہیں جیسے وہ خود تھے پسند بھی اُسی درجہ اعلا تھی۔ رسول نمبر ہزار تحریروں کا انتخاب ہے۔ نئے سے نئے پہلو تلاش کرتے۔ موزوں سے موزوں آدمی ڈھونڈ نکالتے اور لکھواتے، چاہے خوشامد کرنی پڑے، چاہے ادائگی، چاہے دھمکی۔ انھیں دُھن سوار ہو جاتی تو پھر نہ اُترتی۔ شروع شروع کی بات ہے، کراچی آئے، کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ہوٹل جبیس میں قیام تھا۔ مجھے بلایا اور ایک بڑا موٹا تازہ بھیم شحیم سا مسودہ دکھایا کہنے لگے چھپنا ہے رائے دو۔ رائے دے دی گئی "ظاہری حجم زیادہ ہے معنوی وزن کم" بس پھر کیا تھا، تقاضے شروع ہو گئے اور "وار پہ وار" کرنے لگے۔ میں نے "منہ بند کرنے کے لیے" جلدی جلدی مکمل کر کے ایک "قسط" بھیج دی۔ مگر وہ "اصل معاملہ" بھانپ گئے۔ بغیر مہلت دیے لکھا:

> —— پی آئی اے والوں نے ٹیلیفون کیا کہ کراچی سے ایک پیکٹ آیا ہے وہ لے جائیے۔۔۔۔۔۔ میں مسودہ لینے خود پہنچا۔ وہیں کھولا، طبیعت خوش ہوئی۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہوں گا کہ جو مال اچھا ہے وہ آپ نے الگ باندھ کے رکھ لیا یعنی دوسری قسط!۔۔۔۔۔۔ اگر آپ کا مضمون یونہی سا ہوتا تو اصرار نہ کرتا، اب تو بہ اصرار کہوں گا، بہ منت کہوں گا مضمون مکمل کیجیے، براہ کرم مضمون مکمل کیجیے۔ اگر خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے تو صبر بھی بہت کر لیا۔۔۔۔۔۔"

مجھے یقین ہے کہ شوق و شغف، شیفتگی و وارفتگی اور حد درجہ مستعدی اُنھوں نے "رسول نمبر" کے لیے دکھائی اور جی جان لگا کر "لالہ کی حنابندی" کی وہ اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ "میں تو ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہوں چاہے کباڑا ہی کیوں نہ ہو جائے۔ میں تو تخت یا تختہ" کا قائل ہوں[1]۔ غالباً اسی لیے "نقوش" کے تمام نمبر دوسروں پر بازی لے گئے۔ اُن کا مرتب خود بھی کام کرنا جانتا تھا اور دوسروں سے کام لینا بھی اسے خوب آتا تھا۔ یہ کام ہر ایک نہیں کر سکتا۔ تاہم "رسول نمبر" چونکہ حاصل زندگی تھا[2] اس لیے ان کے جذبوں کی "آنچ" اس میں تیز ہوئی، تیز ہوئی اور تیز ہوئی۔ یہاں تک کہ "شعلہ" آخری بار بھڑکا اور یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ "میرے ایک دوست نے کہا تھا سیرت پر خدمت گزاری۔ ہر ایک کو راس نہیں آ

---

[1] خط موصولہ جون ۸۳ء

[2] برادرزادہ عزیزم جاوید طفیل کی روایت ہے کہ "رسول نمبر" کے بعد وہ خواہاں تھے کہ "نقوش" کا کاروبار بند کر دیا جائے اور پھر یہی نمبر ان کی زندگی کا آخری نمبر ثابت ہوا۔

شبلی نعمانی نے کام شروع کیا وہ مر گئے۔ قاضی سلیمان منصور پوری کا مفصل کتاب لکھنے کا ارادہ تھا وہ مر گئے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ اطمینان لکھنے کا ارادہ تھا وہ مر گئے لہٰذا تم بجو امیر احراب تھا زہے نصیب"!![1]

مطلب صاف ہے کبھی وجدان دور کا منظر قریب کر دیتا ہے۔ وہ واقعی خوش نصیب نکلا۔ اندر بھی سچا باہر بھی سچا، اندر سُندر، اُوپر سُندر، وہ چُھپ گیا وہ چلا گیا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ اپنے "فانوسِ الفاظ" میں وہ موجود بھی تو ہے، اس نے بہت پہلے کہا تھا۔

"میں بھی جب غار میں جا کر چُھپ جاؤں گا اور صدیاں بیت جائیں گی، تو میرے بال سفید ہو چکے ہوں گے مگر میرے پیش کردہ الفاظ جو میرے رسولؐ کی زبان سے نکلے ہوں گے جوں کے توں ہوں گے۔ سچے الفاظ کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔"[2]

اُن کی یادیں تو بھی "جوں کی توں" ہیں۔ یادیں بھی تو کبھی "بوڑھی" نہیں ہوتیں!!

کوئی کیا جانے میں اور وہ
اب کس دنیا میں رہتے ہیں

---

[1] طلوع ——— جلد ششم

[2] طلوع ——— جلد نہم

احمد ظفر

نذرِ جناب محمد طفیل مدیر نقوش

کارواں در کارواں کچھ لوگ جانے کیا ہُوئے
منزلوں کے رازداں کچھ لوگ جانے کیا ہُوئے

بے خبر انجام سے چلتے تھے جو چلتے رہے
کون تھے آئے کہاں کچھ لوگ جانے کیا ہوئے

خواب میں بھی ذکر ان کا خواب کی صورت ہوا
کل ہمارے درمیاں کچھ لوگ جانے کیا ہوئے

جو فنا کو بھی بقا کے ولولے دیتے رہے
محرمِ رنگِ جہاں کچھ لوگ جانے کیا ہوئے

بول تھے انمول جن کے وہ سخن کی آبرو
محفلوں میں گلفشاں کچھ لوگ جانے کیا ہوئے

آسمانِ علم و فن کے راستوں کے شہسوار
سرزمینِ مہوشاں کچھ لوگ جانے کیا ہوئے

ہم شکستِ دیدہ و دل کی عبارت ہیں ظفرؔ
حاصلِ صد کہکشاں کچھ لوگ جانے کیا ہوئے

◆

سیّد قدرت نقوی

قطعاتِ تاریخ وفات محمد طفیل مرحوم

تھا ادب کا وُہ ایک بطلِ عظیم   نیک تھا عزم اس کا عزمِ صمیم
"صاحب وصف" تھا کہی تاریخ   "ہے مقامِ طفیل خلدِ نعیم"
۲۷۷   ۱۱۲۹ + ۲۷۷ = ۱۴۰۶

تھی ادب میں طفیل کی تعظیم   اور رسالہ نقوش نقشِ سلیم
لے سرِ "بعد" یہ کہی تاریخ   "انتقالِ طفیل رنجِ عظیم"
+۲   ۱۹۸۴ + ۲ = ۱۹۸۶

چھُپ گیا اب جو تھا ادب کا سہیل   بڑھ گئی اور بھی وہ ظلمتِ لیل
"تازہ غم" ہے رہے "بہم" نہ نجوم   رنج کوہِ گراں ہے مرگِ طفیل
۱۴۵۳- ۴۷ = ۱۴۰۶

اب نہیں ہے طفیل، نظم نہیں   اور کسی میں وہ پختہ عزم نہیں
بزم درہم کرو! "بہم" کیوں ہو؟   "تازہ غم" ہے کہ میر بزم نہیں
۴۷-   ۱۴۵۳ - ۴۷ = ۱۴۰۶

مرگِ طفیل کی تھی خبر جب ملی   تاریخ کی تھی فکر سو تاریخ یہ کہی
درہم ہو "بزم" ہائے "سرِ بزم" اب کہاں   "غم تازہ" ہے کہ ہو گئی رحلت طفیل کی
۴۹- ۲   ۱۴۵۳ - ۴۹ + ۲ = ۱۴۰۶

چودہ سو چھ تھا ہجری کا سن اِس جہان میں   "رحلت ہوئی طفیل کی جن کی نہیں نظیر"
سن ایک ہزار نو سو چھیاسی تھا عیسوی   جنت گئے طفیل کہ ماہر تھے اک مدیر

○

غزل نما

مصنفہ ادا جعفری
ناشر: انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔
قیمت ایک سو روپے

غزل نما قدیم شعرا کا تذکرہ ہے جسے انجمن ترقی اردو پاکستان نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ یہ ۴۷۷ صفحات کو محیط ہے۔ اس میں ۳۷ قدیم شعرا کے مختصر و جامع حالات کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کا مختصر نمونہ بھی دیا ہوا ہے۔ اس تذکرے کا پہلا شاعر محمد قلی قطب شاہ (متوفی ۱۰۰۰ھ/۱۶۱۱ء) اور آخری شاعر میاں داد خاں (متوفی ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء) ہے چونکہ اس تذکرہ کی ترتیب شاعروں کے سالِ وفات کے حساب سے قائم کی گئی ہے اس لیے ہم اسے ۱۶۱۱ سے ۱۹۰۷ء تک کے چند نمائندہ شاعروں کا تذکرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ابتدائی دور کے ان شعرا سے اردو کی بتدریج ترقی اور عہد بہ عہد کی شاعرانہ موشگافیوں کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ اردو زبان علاقائی زبانوں کو کس طرح ساتھ لے کر چلی اور اپنی فطری ملنساری، کشش اور جاذبیت سے کس طرح ان میں گھل مل گئی۔ رفتہ رفتہ کس طرح ان کو متاثر کیا اور آخر ان پر چھا گئی۔ ہر دور کے شاعروں نے اس کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں کیا کیا رول ادا کیا؛ کس طرح ایک نئے ماحول کی بنیاد ڈالی گئی اور جو وقت کے ساتھ ساتھ ہر دلعزیز اور مانوس ہوتی گئی؛ اس کے علاوہ محترمہ ادا جعفری کے پیشِ نظر یہ بھی تھا کہ مذکورہ قدیم دور کے وہ شعرا جو اپنے اپنے وقت میں نامور اور استادی کے درجے پر فائز تھے اور جو آج عام قاری کے ذہنوں سے اُتر گئے ہیں ان کا بھی مجملاً تعارف ہو جائے، اور شیدایانِ علم و ادب سے ملک کے اہلِ قلم کو ان کے کارناموں سے آگاہ کیا جائے۔ یہی وہ جذبہ ہے کہ جس سے سرشار ہو کر مصنفہ نے غزل نما کی شکل میں یہ تذکرہ مرتب کیا جو اپنی افادیت کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہے جس کا تعلق حال سے کہیں زیادہ مستقبل سے ہے۔ کیونکہ زمانہ جتنا آگے بڑھتا جائے گا اس کی قدر و قیمت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جائے گا اور آنے والے رہ روانِ ادب اس سے روشنی حاصل کرتے رہیں گے۔

مصنفہ چونکہ خود اعلیٰ درجہ کی کہنہ مشق شاعرہ ہیں اور شعر کی باریکیوں سے بخوبی آشنا۔ اس لیے شعروں کے انتخاب میں انھوں نے جس ژرف نگاری اور محنتِ شاقہ سے کام لیا ہے اس سے ان کی بالغ نظری اور شعر شناسی کی خصوصیتیں جھلکتی ہیں اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں شعر کے پرکھنے کا ملکہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ غزل نما میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے مختلف شعرا کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ غزل کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس میں ہر قسم کے عاشقانہ، موعظانہ، رندانہ، فلسفیانہ خیالات کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی مسائل پر بھی اس میں کھل کر بات

کرنے کی گنجائش ہے اور شعرا اپنی غزلوں میں مذکورہ موضوعات کے علاوہ بھی مختلف جذبات پر خامہ فرسائی کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ غزل اپنی وسعت کے اعتبار سے تمام اصنافِ سخن پر بھاری ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ شعرا غزل میں اپنے لیے نئے نئے موضوع و مضمون تلاش کرتے رہتے ہیں اور یہ کسی حد اور قید کے پابند نہیں۔

تذکروں میں عام طور سے خوبیاں کم اور کمزوریاں زیادہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ شاعروں کے حالات، ان کے سالِ پیدائش و وفات اور ان کے عہد کا خیال کم رکھا جاتا ہے۔ زیرِ نظر تذکرہ میں راقم الحروف نے مذکورہ اندراج میں سے جب چند ایک کی پڑتال کی تو ان کو صحیح پایا جس سے مصنّفہ کی تحقیق اور ان کی دیدہ وری کی داد دینا پڑتی ہے بعض غیر شاعرو کے مرتّبہ انتخابِ کلام میں بھی کئی قسم کے سقم دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک شاعر کے اشعار دوسرے شاعر کے کلام میں ڈال دیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہی شعر مختلف شاعروں سے منسوب کر دیا جاتا ہے لیکن زیرِ نظر تذکرے میں کہیں ایسی صورت نظر نہیں آئی۔ ادا جعفری صاحبہ مشہور شاعرانہ ذوق رکھنے والے اہلِ قلم میں سے ہیں۔ اس تذکرے کی تصنیف میں انہوں نے جس انہماک، کوشش اور سلیقے سے کام لیا ہے اہلِ نظر اسے ہمیشہ سراہیں گے۔ حالات کی ترتیب میں تفصیل کی بجائے ایجاز نویسی سے کام لیا گیا ہے جسے ان کے قلم کا اعجاز کہنا چاہیے۔ یہ تذکرہ اس وقت زیادہ مفید ثابت ہوگا جب کبھی تقابلی مطالعہ میں اسے پرکھا جائے گا۔

اس تذکرہ کا تعارف ملک کے مشہور محقّق و نقّاد جناب جمیل الدین عالی کے قلم کا مرہونِ منّت ہے "غزل نما" ک کتابی شکل میں چھاپنے کا فیصلہ محترم قدرت اللہ شہاب کے ایما پر کیا گیا ہے جو آج ہمارے سامنے ہے۔ پیش لفظ خو محترمہ ادا جعفری صاحبہ نے لکھا ہے جس میں انہوں نے متن کی تیاری، حوالہ جات کی فراہمی اور دوسرے کٹھن مشکلات ک تفصیلی ذکر کیا ہے، ساتھ ہی انہوں نے جناب مشفق خواجہ کا نام بہت احترام سے لیا ہے اور ان کی اعانت کی بے حد تعریف کی ہے۔ یہ ایک قیمتی اور نادر اشاعت ہے۔ امید ہے کہ اہلِ نظر اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے تاکہ جس ادبی مقصدِ وحید کے پیشِ نظر یہ تذکرہ منصّۂ شہود پر آیا ہے وہ بخیر و خوبی پورا ہو سکے۔

(ک۔ م)

ہمسفر بگولوں کا — "ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت اور فن کا مطالعہ"

ناصر زیدی

از: ڈاکٹر طاہر تونسوی، ضخامت: ۳۳۲ صفحات، قیمت: ۵۷/- روپے، ناشر: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

آج کی زیرِ تبصرہ نئی کتاب "ہمسفر بگولوں کا" ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں پاکستان کے ممتاز و منفرد اور نامور نقاد، ادیب، محقق اور افسانہ نگار ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت اور فن کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر بنیادی طور پر ایک تخلیقی فنکار ہیں اگرچہ اُن کی شہرت بحیثیت نقاد زیادہ ہے۔ اُن کی ایک تنقیدی کتاب "اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" تو گویا ان کے نام کا لاحقہ بن چکی ہے۔ اُنھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگار سے کیا اور وہ ادب کی دنیا میں اپنی پہلی تنقیدی کتاب "نگاہ اور نقطے" کے ذریعے متعارف ہوئے، تاہم وہ افسانہ بھی لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ اُن کے افسانوں کا کوئی مجموعہ ہنوز شائع نہیں ہوا مگر ایک ناولٹ "ضبط کی دیوار" کے عنوان سے شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذ حاصل کر چکا ہے۔ "کلام نرم و نازک" کے نام سے اُن کی ایک طنزیہ مزاحیہ تصنیف بھی اُن کے شعبۂ ادب میں اہمیت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی زیادہ تر مطبوعات تنقید و تحقیق کے زُمرے میں آتی ہیں جن میں "اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کو بیسٹ سیلر (BEST SELLER) کا درجہ حاصل ہے اور اس کتاب کے اب تک لگ بھگ ایک درجن ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ پاکستان میں سی ایس ایس کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ آج تک کسی تنقیدی کتاب کو اس قدر مقبولیت حاصل نہ ہوئی کہ وہ چودہ برس کے عرصے میں بارہ تیرہ مرتبہ شائع ہو سکے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی اس معرکتہ الآرا کتاب کے علاوہ دیگر معروف تصنیفات میں "ادب اور لاشعور"، "تنقیدی دبستان"، "ادب اور کلچر"، "افسانہ حقیقت سے علامت تک"، "تخلیق اور لاشعوری محرکات"، "شعور اور لاشعور کا شاعر، غالب" وغیرہ شامل ہیں۔ اِن کے علاوہ ڈاکٹر سلیم اختر کا ایک اور خاص موضوع اقبالیات بھی ہے اور اس ضمن میں ان کی بہت سی کتابوں میں "فکرِ اقبال کا تعارف"، "اقبال اور ہمارے فکری رو "فکرِ اقبالؒ کے منور گوشے"، "اقبال شعاعِ صد رنگ"، "اقبالؒ ممدوحِ عالم" اور "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کو تنقید و تحقیق کے علاوہ نفسیاتی موضوعات سے بھی خاص لگاؤ رہا ہے، ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع بھی "اُردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان" تھا۔

زیرِ نظر کتاب "ہمسفر بگولوں کا" ڈاکٹر سلیم اختر کے تمام ادبی کارناموں اور فکر و فن کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کتاب کے مصنف

ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر سلیم اختر کے شاگردِ رشید ہیں اور اُنھوں نے اپنے اُستاد کے ہمہ جہت اور ہمہ رنگ ادبی کاموں کے بارے میں یہ کتاب لکھ کر فی الحقیقت شاگردی کا حق ادا کیا ہے۔ عموماً اس قسم کی کتابوں کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ ممدوح خود ہی اپنے بارے میں قصیدۂ مدحیہ" لکھ کر اپنے کسی شاگرد یا دوست کے نام سے شائع کرا دیتے ہیں مگر زیرِ تبصرہ کتاب "ہمسفر بگولوں کا" میں یہ تاثر ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی ایک ذمہ دار ادیب اور نقاد ہیں۔ اُنھوں نے اس سے پہلے بھی تنقید و تحقیق کے میدان میں خاصا کام کیا ہے، اُن کی یہ کتاب بھی بلاشُبہ ان کے تنقیدی و تحقیقی کام میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنی کتاب "ہمسفر بگولوں کا" میں جو چند عنوانات قائم کیے ہیں وہ یوں ہیں :

"لفظوں کی مالا ——— بگولے کا اضطراب"۔ "تنقید میں مرکز کا داعی"۔ "ادبی تاریخ کے خارزاروں میں"۔ "اقبال شناسی میں نئی جہت"۔ "باطن کی تاریکی میں روشنی کا متلاشی"۔ "مزاح کے پھول میں طنز کا خار"۔ "نفسیات اور جنس کے تنے رستے پر"۔ "ہر اک مقام سے آگے نکل گیا مہِ نو" ——— وغیرہ!

اِن عُنوانات پر ایک نظر ڈالنے سے ہی مصنف کے ممدوح کی شخصیت کے متنوع ہونے کا سُراغ مل جاتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے، ڈاکٹر سلیم اختر کے فکر و فن کی اِبتدار سے لے کر عروج تک کی داستان کو حوالوں کے ساتھ خُوبی و خوبصورتی کے ساتھ رقم کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے فن اور شخصیت کے متعلق جہاں بھی اور جو کچھ بھی لکھا گیا، اُس سے استفادہ کرتے ہوئے ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ایک مربوط تذکرہ لکھ دیا ہے جو نہ صرف ڈاکٹر سلیم اختر کے تنقیدی، تحقیقی اور تخلیقی کاموں پر روشنی ڈالتا ہے، بلکہ ان کے فن اور شخصیت پر آئندہ چل کر کام کرنے والوں کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

"نقشِ تحریر" کے عنوان سے ایک خاصہ معتبر حصّہ ڈاکٹر سلیم اختر کی تحریروں سے انتخاب پر مبنی زیرِ نظر کتاب "ہمسفر بگولوں کا" میں شامل ہے۔ کچھ منتخب مضامین کے عنوان یہ ہیں :۔

"غزل میں تصورِ محبُوب" ——— "بکری"۔ "بشیرے دی ہوزرو"۔ "کھجوروں کا موسم"۔ "پکار"۔ "دیوانِ غالب کی تقریبِ رونمائی"۔ "قصّہ ہیر رانجھا بطرزِ جدید"۔ "زنانہ کرکٹ میچ پر کمنٹری"۔ "گھر داماد" وغیرہ۔

کتاب کے آخر میں ڈاکٹر سلیم اختر کے غیر مدوّن مضامین کا اِشاریہ کتابیات کے عُنوان سے مرتب کر کے شامل کیا گیا ہے ——— عرش صدیقی نے فلیپ پر جو رائے لکھی ہے اُس سے اتفاق کیے بنا چارہ نہیں کہ :۔

اِس کتاب کا ہر باب ڈاکٹر سلیم اختر کے بُنیادی نظریات کی نشان دہی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی یہ تصنیف اُردو کے ایک اہم نقاد اور افسانہ نگار کے فکری ارتقاء اور اُس کے افکار کی روشنی میں آج کے انسان، معاشرے اور عصر کی تفہیم میں معاون ثابت ہو گی۔ یہ تصنیف، محبت اور عقیدت کا ثمر ضرور ہے، لیکن اس کے ساتھ مصنف کی بالغ نظری اور اس کے اعلیٰ تنقیدی شعور کا ثبوت بھی ہے۔"

مجموعی اعتبار سے ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تصنیفِ لطیف "ہمسفر بگولوں کا" ایک قابلِ ستائش کاوش ہے۔ اس کتاب سے زندہ شخصیات پر اُن کی زندگی ہی میں اعترافِ فن اور اعترافِ عظمت کی خوشگوار روایت مستحکم ہوتی نظر آتی ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت، گردپوش، جلد بندی، سب کچھ معیاری ہے اور قیمت ۷۵/- روپے مناسب۔

کاکلِ غم ـــ اطہر صدیقی

جیلانی کامران

ہمارے شعری ماحول میں غزل کی پذیرائی اس امر کی طرف اشارہ ضرور کرتی ہے کہ غزل کو سننے اور پڑھنے والے اس شعری روایت کی برابر پاسداری کر رہے ہیں اور شاعری کے نئے رویوں نے غزل کو بدستور اپنے درمیان مقام دیا ہے تاہم اس پذیرائی کی ایک عمرانی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمارے دور میں وہ سارے اجزا برابر موجود ہیں جن سے غزل کی شاعری رونما ہوتی رہی ہے ایک ایسا زمانہ جو حسب حال نظر نہیں آتا ایسے انسان جن سے کم و بیش کوئی بھی شخص خوش نہیں ہے اور ایسے واقعات جو پریشانیوں کو نئی پریشانیاں ہی دیتے ہیں یہ تین اجزا یعنی خراب زمانہ خراب لوگ اور خراب حالات ہر دور میں اپنے عہد کی غزل کو استعارے، انداز کرب اور انسان کے بارے میں اچھی یا بری رائے فراہم کرتے رہے ہیں ہمارے عہد کی غزل نے اس ماحول میں احتجاج کے رویوں کو بھی نمایاں کیا ہے فرد کے انسان ہونے کے تصور کے ضائع ہونے کا ذکر بھی کیا ہے اور غم کے لہجے کو مناظر فطرت کے ساتھ جوڑتے ہوئے فطرت کو بھی شاعر کے کرب میں شامل کیا ہے جن اہل نظر نے اس عہد کی غزل کو سنجیدگی کے ساتھ دیکھا ہے انہوں نے اپنے اپنے انداز میں غزل کے بارے میں رائے بھی دی ہے اور عموماً کہا ہے کہ غزل اپنے عہد کی دستاویز بن رہی ہے یعنی غزل میں بھی وہی زمانہ جھانکتا ہے جس میں شاعر کے ساتھ بے شمار دوسرے لوگ برابر جی رہے ہیں تاہم دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر زمانہ لوگ اور حالات تینوں کی صورت دگرگوں اور خراب ہے تو نہ صرف غزل اس کیفیت کو استعاروں میں محفوظ کرتی ہے بلکہ آسمان اور مناظر فطرت تک کی وسعتوں کو بھی ایسے ہی رنگوں میں ملوث کرتی ہے دوسرے لفظوں میں ایسی غزل کا شاعر اپنے تاریک تاثر کو کائنات کی دوریوں تک پھیلانے کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے اور ہر جانب احتجاج کے سلسلے کی تصویر ثبت کرتا ہے۔ ایسے ماحول میں اطہر صدیقی کی غزل کچھ نئے رویوں کی نشان دہی کرتی ہے اور کچھ نئے گوشے ظاہر کئے ہیں۔

پہلی بات جو اس غزل نے اپنے انداز میں کہی ہے یہ ہے کہ جنت سے بچھڑنے کا جو حادثہ انسان پر گزرا تھا اس سے کہیں بڑھ کر اور شدت میں غالباً کہیں زیادہ سنگین حادثے اس پر دورِ دنیا کے دوران گزرے ہیں اور شاید ایسا ہی سنگین حادثہ ایسی صورت میں اترا بھی ہے جہاں زمانے، لوگوں اور واقعات ان تینوں کی حالت خراب اور دگرگوں ہے۔ اطہر صدیقی ایسے حادثے کو اپنی نسل کے دائرہ عمر کے ساتھ منسوب کرتے ہیں لیکن یہ بات تو ہر کوئی کہتا ہے اور کہنے کا حق رکھتا ہے اطہر صدیقی نے جو فکری جہت اس کیفیت میں شامل کی ہے وہ ایسے سنگین حادثے میں انسان کے بارے میں ہے کہ وہ ایسی دگرگوں کیفیت میں کیسے جی سکتا ہے؟ اس اعتبار سے میں اس شعری مجموعے کی اس غزل کو مرکزی لہجے کی غزل خیال کرتا ہوں جس کی ردیف سیکھ ہے اور قافیہ سنبھلنا جلنا اور چلنا ہے . . .

ان پر رونق ویرانوں میں میری جان سنبھلنا سیکھ
اطہر روشن تاریکی میں سنبھل سنبھل کر چلنا سیکھ

(صفحہ ۱۱۱)

؎ چارہ گردوں سے بات نہ کر
اور اپنی آگ میں جلنا سیکھ

اس غزل کا محسوساتی جغرافیہ بھی کچھ عجیب سا ہے۔ شاعر نے ویرانوں کو پُر رونق بتایا ہے اور تاریکی کو بھی روشن کیا ہے.... تاہم یہ جغرافیہ، چاند اور اسٹرونائٹس کے اشاروں کو بھی اپنے دائرے میں شریک کرتا ہے اور اس حوالے سے شاعر اپنے آپ کو ان اسٹرونائٹس کے انسانی تشخص میں شامل کرتا ہے جو سطحِ ماہتاب پر اترے تھے.... اس کتاب کا فلیپ لکھنے والوں نے غالباً اس حوالے سے شاعر کو انسان کا نمائندہ بھی قرار دیا ہے شاعر کا خیال ہے کہ تیرہ بختی کے اندھیاروں میں من کی جوت ہی میں جلنے سے انسان کی ان پریشانیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے جن سے وہ گزر رہا ہے یہ غزل شاعر کے پردے میں اطہر صدیقی کو اور اطہر صدیقی کے پردے میں اہلِ درس و تدریس کو نمایاں کرتی ہے اور کچھ ایسے انداز میں سرگوشی کرتی ہے کہ چاند پر جو انسان اترے ہیں وہ بھی مجھ سے مختلف نہیں ہیں' اور ممکن ہے کہ اگر ہم بھی اپنے دل کی آگ میں جلنے کا انداز اپناتے رہیں تو وہ رفعتیں ہم تک ضرور پہنچ پائیں گی جن کی تمنا میں ہمارے شب و روز جل رہے ہیں اطہر صدیقی کا فلسفہ کچھ اس انداز میں تلقین کرتا ہے کہ درد کی ٹیسوں میں ہی اطہر جینے والوں نے زندگی پائی.... اگر جو کچھ میں نے کہا ہے درست ہے تو یہ کہنا بھی قابلِ غور ہے کہ اطہر صدیقی کی غزل اضطراب کی غزل ہے جو احتجاج اور غمِ دوراں کے بعد آنے والے مقامات کا دھندلا سا علم بھی دیتی ہے! تاہم اضطراب کا رویہ اس غزل کا اور اس مجموعے کا مرکزی اور بنیادی رویہ دکھائی دیتا ہے!

لیکن اضطراب کیوں اور کس بات کا؟ یہ سوال شاعر کے حوالے سے ضروری دکھائی دیتا ہے....

معلوم نہیں شاعر نے یہ اور اس طرح کے دوسرے اشعار کس مفہوم کو ملحوظ رکھ کر کہے ہیں....

؎ ڈوبتے چاند کی کرنوں کی صدا کون سُنے
لوگ تو ڈوب چلے وقت کے طوفانوں میں
کرتا ہے آسمان بھی اُفق پر مجھے سلام
گردوں کی سمت آنکھ مری جب ذرا اٹھے
جب یک رو چمن میں تھی اہلِ نظر کی بات
ہر گوشۂ چمن سے کئی ہم نوا اُٹھے
ہر چند پُر وقار تھی رودادِ دلبری
لیکن وہ جذبِ شوق سے ناآشنا رہی

ان چند اشعار میں جو باتیں کہی گئی ہیں اُن کو عموماً شکایتِ زمانہ اور احتجاجِ دوراں کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے لیکن مجھے ان میں اضطراب کی کیفیت دکھائی دیتی ہے مثلاً ڈوبتے چاند کی کرنوں کو صدا بنا کر شاعر نے لوگوں کی توجہ کو اس سلگنے کی جانب مبذول کروایا ہے۔ چاند جو آسمان پر چمکتا ہے وہ ڈوبتا اور نکلتا ہے لیکن بہت کم صدا بنتا ہے؟ اس لئے یہ سوال ابھرتا ہے کہ کون سا چاند ڈوب رہا ہے اور کیوں اس کی ڈوبتی کرنوں کی صدا سننا ضروری ہے؟ یہ مصرعہ ایک دوسری کیفیت کو بھی اپنے محسوسات

میں شریک کرتا ہے کہ لوگ تو زمانے کے سیلاب ہی میں ڈوب چلے ہیں! کہیں یہ شعر اُن قوموں کی حقیقت حال کی جانب تو اشارہ نہیں کرتا ہے جن کے پرچموں پر چاند کی علامت نظر آتی ہے! شاعر کا اضطراب جو دوسرے اشعار میں بھی برابر کارفرما ہے غالباً اس لئے ہے کہ خرابیٔ دوران نے انسان سے اعلیٰ مقامات کی معرفت چھین لی ہے.... شاعر کا یہ دکھ قابل توجہ ہے!

لیکن اطہر صدیقی کا انسان جغرافیے سے بے نیاز نہیں ہے. کیونکہ جو اسٹرونائٹس، خلاء پیمائی اور چاند کی تسخیر کرنے گئے تھے وہ جن تمدنوں کے نمائندے ہیں وہ تمدن غالباً انسان کے اعلیٰ ذہنی مقامات سے محروم نہیں ہیں. اور اگر کوئی واقعی محروم ہے تو وہ شاعر کے اپنے تمدن کا انسان ہے اطہر صدیقی کا اضطراب اس اعتبار سے اپنے ہی کے تمدن کے بارے میں ہے اور وہ اپنے ہی انسان کے لیے پریشان ہے کہ یہ انسان جذبِ شوق سے روز بروز ناآشنا ہو رہا ہے.

اطہر صدیقی کی غزل میں مثالی انسان کی تلاش کا ذکر بھی کیا گیا ہے. میں اس بارے میں کچھ یوں کہوں گا کہ اطہر صدیقی کی غزل میں جو دکھ اور جو آرزو برآمد ہوئی ہے اس کے مجموعے سے امکانات کا سفر ایک شکل اختیار کرتا ہے میں البتہ اس سلسلے میں ایک مختلف پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اطہر صدیقی نے بار بار کہکشاں کو رہگزر کہا ہے جب کیا ہے کسی نے عزم سفر کہکشاں بن گئی ہے راہ گزر. . . . اس غزل میں اسی اشارے کو دوسرے اشعار بھی نمایاں کرتے ہیں. شاعر نے اس غزل میں لوک کلچر کو کچھ اس طرح استعمال کیا ہے کہ کہکشاں اور راہ گزر کے اشارے عروج اور عظمت کے اشارے بن گئے ہیں اور عام لوگوں کی یادداشت میں بھی یہ امر برابر زندہ ہے کہ کون تھا وہ جس کے گرد راہوار سے کہکشاں نے راستے کی صورت پائی تھی بچے آج کل بھی عموماً اپنی بوڑھی اور بزرگ خواتین سے پوچھتے ہیں کہ معراج کی رات کو کن کی سواری کہکشاں سے گزری تھی؟ اطہر صدیقی نے ان اشاروں کو کھولا نہیں ہے. اپنی غزل میں مخفی رکھا ہے. کیوں کہ اہل نظر اور آئینہ دار شمس و قمر اس مخفی امر سے بخوبی واقف ہیں. اپنی غزل کی مدد سے شاعر نے اپنے عہد کو عروج سفر کی یاد سے آباد رکھنے کی سعی بھی کی ہے.

اطہر صدیقی کی غزل میں اور خوبیاں بھی ہیں جن کی جانب پڑھنے والے راغب ہوتے رہیں گے میں نے جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے انہیں بھی اس ذیل میں شامل کیا جا سکتا ہے.

"دخل در معقولات" ایک نظر میں

احمد ظفر

تنقید کرنا نہ تو آسان کام ہے اور نہ ہی یہ جلد ہضم ہوتی ہے ۔ مگر بعض اصحاب ایسے بھی ہیں جو اپنے تنقیدی شع کی 'لٹھ' کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور ایک ایسی چھڑی کو ہاتھ میں لے کر جھٹکنا شروع کر دیتے ہیں جس سے ش کی بجائے پھول جھڑتے ہیں ۔ اس طرح ادب میں نہ تو دخل در معقولات کا طعنہ ملتا ہے اور نہ ہی کسی کی جائز ناجا نارا" کا خطرہ رہتا ہے اس کے باوجود دخل در معقولات پر کچھ نہ کچھ بات کرنے کی گنجائش رہتی ہے ۔

ارشد میر صاحب نے دخل در معقولات لکھ کر کچھ ایسے بسورتے ہوئے ہونٹوں کو گلفشاں کرنے کی کوش کی ہے جو برسوں سے اپنے مقدر کو رو رہے ہیں ۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ رونے والوں کو ہنسانا کوئی اچھی بات نہیں 'با درست فرمایا آپ نے ' جس طرح چھپ کر بات کرنے سے منہ پر بات کرنا اچھی بات نہیں اسی طرح ارشد میر کارنامے 'دخل در معقولات' یا ارشد میر کی دخل در معقولات کو بھی برا نہیں کہا جائے گا ۔ کارنامہ مذکر ہے اس ارشد میر کے دخل در معقولات کتاب مونث ہے ۔ چنانچہ ارشد میر کی دخل در معقولات دونوں صیغے اپنی جگ درست ہیں ۔ کتاب اور کتاب کے مصنف کے نام کی تکرار بار بار اس لیے کی ہے تاکہ کچھ دیر کے لیے یہ دونوں مضمون آپ یاد رہ جائیں ۔

اردو ادب میں پطرس طنز و مزاح لکھنے والوں کے قافلہ سالار ہیں اور اس قافلے کے دوسرے ش رشید ، شوکت ، شفیق ، یوسفی اور کچھ وغیرہ وغیرہ قسم کے حضرات شامل ہیں ۔ اب ان انگلیوں پر گنے جاسکنے وا چند ناموں میں ایک اور نام کا اضافہ ہوا ہے ۔ ارشد میر وہی ارشد میر جن کا ذکر ادب میں بار بار ہو چکا ہے ع

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے

مگر اتنا یاد رہے کہ ارشد میر نہ تو 'ہم تم' ہیں اور نہ ہی اس کی زلف کے اسیر ہیں بلکہ ارشد میر نے دخل در م میں زلف کو زنجیر اور اچھے بھلے آزاد منش کو اسیر کہنے سے گریز کیا ہے ۔

ارشد میر کی مزاح نگاری کا در اصل مقصد ہی یہ ہے کہ دوسرے کے معاملات میں دخل دینے سے گریز کیا جائے ۔ چنانچہ وہ اپنی شگفتہ تحریر میں نہ صرف اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں بلکہ بہت سوں بے قرار کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں ۔

نقاد ، شاعر ، خطیب ، محقق ، سیاست دان ، وکیل غرضیکہ زندگی کے کسی بھی اہم شعبے کا

کتنا ہی اہم فرد کیوں نہ ہو۔ ارشد میر ہنسی ہنسی میں اسے انتہائی مخیر اہم شخص بنا دیتے ہیں۔ یہ کمال نہیں تو اور کیا ہے!

ارشد میر دخل در معقولات میں خندۂ بے جا یا نوحۂ استہزا سے کام نہیں لیتے بلکہ ان کا کمال یہ ہے کہ آئینے کے سامنے بیٹھتے تو ضرور ہیں مگر عکس کسی اور کا دکھا جاتے ہیں۔ آپ کہیں گے یہ تو شعبدہ گری ہے۔ جی ہاں آپ کا قول درست ہے۔ مگر یہ بھی تو دیکھیے کہ طنز و مزاح ہو یا ادب کی کوئی اور صنف لفظوں کی شعبدہ گری ہی تو ہے بقول فیض صاحب:

> "جسے یہ فن آجاتا ہے وہ کامیاب، اور دوسرا عمر بھر اس دشت کی سیاحی کے ساتھ ساتھ اس کی خاک بھی چھانتا رہتا ہے۔"

اب آیئے ان موضوعات کی طرف جن میں ارشد میر نے "تجاوز" یا "دخل در معقولات" کا ثبوت دیا ہے۔ "غالب کا بستر" میں ارشد میر نے بہت سی اہم اور سرکردہ شخصیتوں کا بستر گول کر دیا ہے اور اس طرح ایک مختصر سے مضمون میں ـــــ اردو ادب کا نقاد جو "غیر منصبی فرائض" انجام دے رہا ہے اس کی تصویر کھینچی ہے اور کیا خوب کھینچی ہے "منکہ ایک شاعر" میں میرے ہی قبیلے کا ذکر ہے اور میرے قبیلے کا ایک ایک فرد حصول شہرت کے لیے جان دینے تک کے جن مرحلوں سے گزر رہا ہے اس کی ایک بار پھر تصدیق ہو جاتی ہے

ع کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

تیزی سے ترقی کرتے ہوئے معاشرے میں سائیکل کی کیا اہمیت ہے۔ یہ جاننے کے لیے ارشد میر کی 'دیہاتی سائیکل' سے استفادہ کیجیے۔ 'عینک اور عینکیے' میں بغض معاویہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا قلع قمع کیا گیا ہے۔ 'شوشہ' میں ضرورت سے زیادہ چھاتی نکال کر چلنے والوں کا ذکر ہے۔ 'تکیہ کلام'، 'تاش اور تاشے'، 'لفافہ' اور 'تعمیراتی جن' میں فرد اور معاشرے کی بے شمار الجھنوں کا تذکرہ ہے۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارا آج کا دور بے شمار نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے۔ 'داد' ' میں بیداد' اور ادب میں بے ادبی کے بروشیر ادب کو جس طرح چاٹ رہے ہیں بلکہ چٹ کر رہے ہیں اس کی تفصیل ارشد میر کی زد میں آئی ہے۔

ارشد میر نے نہ صرف میرے، آپ کے اور اپنے SENSE OF HUMOUR کو قائم رکھا ہے۔ بلکہ کچھ اس قسم کے لوگوں کی ضیافتِ طبع کا سامان بھی کیا ہے جو لطیفہ سننے کے بعد کہتے ہیں "پھر کیا ہوا؟" اور حسِ مزاح کے بارے میں میں صرف یہی کہوں گا کہ جو شخص اس لطیف شے سے محروم ہے۔ وہ دانشور تو ہو سکتا ہے کبھی معاشرے کا اہم فرد نہیں ہو سکتا۔ دانش کی اس غیر ضروری بہتات کو کچھ ہماری حسِ طنز و مزاح ہی کم کر سکتی ہے اسی لیے ارشد میر نے بہت سے رونے والوں کو نہ صرف مسکرانے پر مجبور کیا ہے بلکہ بعض مقامات پر ان کے نالۂ شیون کو مکالموں میں تبدیل کر دیا ہے اور جب ایک چیختا چنگھاڑتا شخص مکالمہ آرائی پر اُتر آئے تو اس کی تہذیب کا

آغاز ہوتا ہے۔

یہی کام ارشد میر نے اپنی تصنیف میں کیا ہے۔ بعض عینکئے ارشد میر کے اس کام کو 'دخل در معقولات' گردانتے ہوئے کہیں گے یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ تو آپ میرے مقولے کو ایک بار پھر پیش نظر رکھیں۔ ہر اچھی بات شروع میں اچھی نہیں لگتی۔ جس طرح ارشد میر کو پہلی بار دیکھ کر آپ پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے بالکل ایسے ہی دخل در معقولات کا دیدار پہلے تو آپ پر ہیبت طاری کر دے گا۔ اور پھر اس کا مطالعہ کرتے ہوئے کبھی آپ مسکرائیں گے کبھی خندۂ بے جا پر اتر آئیں گے۔ اور کبھی اس زور سے قہقہہ لگائیں گے کہ سننے والے اسے دخل در معقولات کہیں گے۔

ردو گیت

سلیم اختر

کتاب کا نام : "اُردو گیت"
مصنفہ : بسم اللہ نیاز احمد
ناشر : مکتبہ نیا دور، کراچی

صفحات : ۷۸۴
قیمت : ۱۰۰ روپے

○

پی ایچ ڈی کے لیے لکھے گئے تحقیقی مقالات کا کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو، لیکن اتنا ضرور ہے کہ جس موضوع پر قلم اُٹھایا جاتا ہے اس کے بارے میں معلومات، کوائف اور مختلف ناقدین کی آرا یقیناً جمع ہو جاتی ہیں کہ ہمارے ملک میں تحقیق کا یہی انداز مرغوب ہے لیکن جہاں تک ذاتی سوچ سے کام لے کر کسی معیارِ نقد کی ساخت اور پھر اس پر موضوعِ تحقیق کی جزئیات کا محاکمہ کرنا تو س نقطۂ نظر سے پی۔ ایچ ڈی کے لیے لکھے گئے بیشتر تحقیقی مقالات خالی برتن کی طرح نظر آتے ہیں۔ یہ خوبی بھی ہو سکتی ہے اور امی بھی۔ فرق نقطۂ نظر سے پڑتا ہے۔ جب بیگم بسم اللہ نیاز احمد کے "اُردو گیت" پر تحقیقی مقالہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ مقالہ بھی پ، ایچ ڈی کے مقامی معیار کے عین مطابق نظر آتا ہے۔ سرورق پر ہی ہمیں یہ خوش خبری سنائی جاتی ہے کہ یہ کتاب "پاکستان اور ہندوستان کے اُردو ادب میں اپنی نوعیت کا نقشِ اوّل" ہے۔ اس ضمن میں صرف مولانا حالی کا یہ مصرعہ ہی پڑھا جا سکتا ہے :

یہ کہہ دو دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجیے گا،

اس لیے کہ ڈاکٹر قیصر جہاں کی کتاب "اُردو گیت" (۱۹۷۱ء) بھارت میں چھپ چکی ہے۔ حال ہی میں پاکستان میں نفیس اقبال کی "پاکستان میں اُردو گیت نگاری" طبع ہوئی ہے۔ قیصر جہاں نے بھی پی، ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ قلم بند کیا تھا، جب کہ نفیس اقبال نے ایم اے اُردو کے لیے مقالہ لکھا تھا ——— ویسے یہ عجب اتفاق ہے کہ گیت زیادہ تر مردوں نے لکھے، لیکن اس موضوع پر تحقیق عورتوں نے کی ہے۔ حالانکہ صنفِ نازک ہونے کی بنا پر معاملہ برعکس ہونا چاہیے تھا یعنی عورتیں گیت لکھتیں اور مرد تحقیق کرتے، لیکن شاید عورتوں کو گیت لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں ہوتی کہ وہ تو گیت کا موضوع ہوتی ہیں۔

اب جہاں تک محترمہ بسم اللہ نیاز احمد کے اس دعویٰ کا تعلق ہے تو اس ضمن میں مزید یہ بھی عرض کیا جا سکتا ہے کہ کس موضوع یا

مسئلہ پر قلم اٹھا کر محض اولیت کا شرف حاصل کرنا بذات خود چنداں اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ کام کے معیار اور نقد و نظر کے زاویل کی بنا پر کتاب حوالے اور سند کا درجہ پاتی ہے۔ اگر کتاب میں جان ہوگی تو وہ زندہ رہے گی ورنہ گردِ راہ میں تبدیل ہو جائے گی۔

جہاں تک "اردو گیت" کے بارے میں کوائف، معلومات اور حوالے جمع کرنے کا تعلق ہے تو مصنّفہ نے یقیناً بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ چنانچہ گیتوں کے مجموعوں کا تذکرہ بھی ہے، اور گیت نگاروں کے فن پر روشنی بھی ڈالی گئی ہے، کہیں مفصلاً کہیں مجمل۔

گیت کی ابتدا کے ضمن میں مصنفہ نے جو بحث کی ہے وہ اچھی ہے اور جس طرح سے انھوں نے سنسکرت اور ہن روایات کی جڑوں کا کھوج لگایا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے اور بھگتی کال کے گیت نگاروں کے گیتوں اور اسلوب پر بحث بھی دلچسپ ہے اور اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ گیت محض جسم کی پکار اور جنسی جذبات کا اظہار نہیں بلکہ وہ بھجن بن کر روحانی اظہار میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے، البتہ مصنفہ نے صوفیائے کرام سے جو گیت منسوب کیے ہیں، ان کا گیت ہونا محل نظر ہے۔ اسی طرح صوفیاء کے گیتوں کے بارے میں ان کا یہ ارشاد "ان میں سے کچھ گیت تو غزلوں کی شکل میں ہیں جو مختلف راگ راگنیو میں گائے جاتے ہیں" (صفحہ ۱۷۰) اپنے اندر جو منطقی تضاد رکھتا ہے غالباً اس کی طرف مصنفہ کی نگاہ نہیں گئی۔ گیت غزل کیسے بن سکتا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ اصناف ہیں اور اُن کی تکنیک کے جداگانہ تقاضے ہیں۔ انھوں نے صوفیاء کے گیتوں کی جو مثا پیش کی ہیں وہ گیت کم اور دوہے زیادہ ہیں۔

قیامِ پاکستان سے پہلے دیویندر ستیارتھی نے لوک گیت جمع کرنے کے لیے کوشش کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ دیویندر ستیار نے ڈاڑھی بڑھالی تھی اور وہ گاؤں گاؤں جا کر گیت جمع کرتا تھا، ایسے گیت جو ادیبوں کی شعوری تخلیقات نہ تھے، بلکہ خودرو پھولوں کی مانند لوک رس میں ڈوبے ہوئے صحیح معنوں میں عوامی گیت تھے۔ گیتوں کا یہ مجموعہ "گائے جا ہندوستا کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مصنفہ نے کتابیات میں "میں ہوں خانہ بدوش" کا ذکر تو کیا، لیکن وہ "گائے جا ہندوستان" نام سے بے خبر نظر آتی ہیں۔ اتنے بڑے کام میں ایسی فروگذاشتیں ہو جاتی ہیں، تاہم دیویندر ستیارتھی کا مفصل تذکرہ ضرور ہونا چا تھا، کیونکہ اس نے سرکاری اداروں کی اعانت کے بغیر یہ کام ایک جذبہ سے کیا، ایک اور چیز جو مجھے بہت کھٹکی ہے یہ ہے انھوں نے فیض احمد فیض کو زبردستی گیت نگار ثابت کر دیا ہے۔ ان کی دانست میں "فیض" کی ایک مشہور نظم "مجھ سے محبت میرے محبوب نہ مانگ" اب گیت بن گئی ہے۔ کیونکہ وہ پاکستان کی مشہور مغنیہ نورجہاں کے گلے کی پُرسوز آواز میں کر گیت بن کر گونج رہی ہے" (ص ۴۴۱) اسی طرح اُنھوں نے فیض کی نظم "رقیب" اور بعض دوسری نظموں کو بھی جو زبرد گیت بنا دیا تو اُسے مصنفہ کا کمالِ تحقیق ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ پی، ایچ، ڈی کے لیے لکھے گئے تحقیقی مقالے میں ایسی فروگ نہیں ہونی چاہیے ————

مصنفہ نے فیض کی نظم "میرے ہمدم میرے دوست" نقل کرنے کے بعد اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے :-

> " فیضؔ نے اس نظم میں گیت کے مفہوم میں بڑی وسعت اور گیت کے دامن میں بڑی کشادگی پیدا کر دی ہے۔ فیضؔ کے نزدیک غزل بھی گیت اور نغمہ ہے۔ نظم بھی گیت اور نغمہ ہیں، گیت تو گیت اور نغمہ ہوتے ہی " (ص، ۴۵۴)

مصنفہ اس ضمن میں مزید رقمطراز ہیں :-

> "فیضؔ کے احاطہ فن میں صحیح معنوں میں گیت کہلائے جانے والے گیت نہیں ملتے سوائے ان نظموں کے جو گائے جانے اور مقبولِ عوام ہوجانے کے باعث گیت کی تعریف میں آسکتی ہیں"۔ (ص، ۴۵۵)

اس اقتباس سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ کے پیشِ نظر نہ تو گیت کا کوئی فنی معیار ہے اور نہ ہی کوئی تکنیکی مفہوم؛ اگر نورجہاں کوئی نظم گا دے تو وہ گیت بن جاتی ہے یا وہ گائے جانے کے باعث "مقبول عوام" ہوجائے تو گیت بن جاتی ہے۔ واضح رہے کہ بحیثیت ایک صنفِ سخن گیت کی یہ تعریف قابلِ قبول نہیں ہوسکتی اور نہ ہی گائے جانے کے باعث کوئی بھی شعری ہیئت گیت کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے۔ انھوں نے گیت کی تعریف میں جن ناقدین کی آرا کے حوالے دیئے ہیں، اگر عملی تنقید میں انھیں ہی ملحوظ رکھا ہوتا تو بعض گیت نگاروں کے مطالعے میں رائے کی جو افراط و تفریط ملتی ہے، اس سے بچا جا سکتا تھا۔

نوٹ :- پی، ایچ ڈی کے لیے قلم بند کیے گئے اس تحقیقی مقالے کے نگران ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تھے۔